معارف القرآن
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ
مفتی اعظم پاکستان
مکتبۂ معارف القرآن
(Quranic Studies Publishers)

معارف القرآن

جلد

۸

سورۂ محمدؐ سے آخرِ قرآن تک

پارہ ۲۶ رکوع ۵ تا آخرِ قرآن

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مفتی اعظم پاکستان

مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴

ادارۃ المعارف کراچی ١٤
احاطہ دارُالعلوم کراچی پوسٹ کوڈ ٧٥١٨٠
فون: ٥٠٤٩٧٣٣، ٥٠٣٢٠٢٠

باہتمام : محمد مشتاق سنّی
طبع جدید : ربیع الثانی ١٤٢٩ھ - اپریل ٢٠٠٨ء
مطبع : شمس پرنٹنگ پریس کراچی
ناشر : اِدارۃ المعارف کراچی ١٤
فون : 5049733 - 5032020
ای میل : i_maarif@cyber.net.pk

ملنے کے پتے:

* اِدارۃ المعارف کراچی ١٤
فون: 5049733 - 5032020

* مکتبہ معارف القرآن کراچی ١٤
فون: 5031565 - 5031566

فہرست مضامین "معارف القرآن جلد ہشتم"

سُورَۃ مُحَمَّد صلی اللہ علیہ وسلم

سُوْرَةُ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وسلم مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ ثَمَانٌ وَّثَلٰثُوْنَ اٰيَةً وَّاَرْبَعُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ محمد مدینہ میں نازل ہوئی اور اسمیں اڑتیس آیتیں ہیں اور چار رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ﴿۱﴾ وَالَّذِيْنَ

جو لوگ کہ منکر ہوئے اور روکا اوروں کو اللہ کی راہ سے کھو دیئے اللہ نے انکے کئے کام اور جو

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ

یقین لائے اور کئے بھلے کام اور مانا اس کو جو اُترا محمدؐ پر اور وہی ہے سچا دین

مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ﴿۲﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ

انکے رب کیطرف سے اُن پر سے اُتاریں اُن کی بُرائیاں اور سنوارا اُن کا حال یہ اس لئے کہ

الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ

جو منکر ہیں وہ چلے جھوٹی بات پر اور جو یقین لائے انھوں نے مانی سچی بات

مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ﴿۳﴾

اپنے رب کیطرف سے یوں بتلاتا ہے اللہ لوگوں کو اُن کے احوال

خلاصۂ تفسیر

جو لوگ (خود بھی) کافر ہوئے اور (دوسروں کو بھی) اللہ کے راستہ سے روکا (جیسا رؤسائے کفار کی عادت تھی کہ جان و مال سے ہر طرح کی کوشش اسلام کا راستہ روکنے میں کرتے تھے سو) خدا نے انکے عمل کالعدم کردیئے (یعنی جن کاموں کو وہ نیک سمجھ رہے ہیں بوجہ عدم ایمان کے وہ مقبول نہیں بلکہ اُن میں سے بعضے کام اور اُلٹے موجب عتاب ہیں جیسے اللہ کے راستے پر چلنے سے روکنے میں خرچ

کرنا، کما قال تعالیٰ فَسَيُنْفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً الخ) اور (برخلاف انکے) جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے اچھے کام کئے اور (انکے ایمان کی کیفیت تفصیلی یہ ہے کہ) وہ اس سب پر ایمان لائے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل کیا گیا ہے اور وہ (جو نازل کیا گیا ہے وہ) اُنکے رب کے پاس سے (آیا ہوا) امر واقعی (بھی) ہے (جسکا ماننا ہے بھی ضروری سو) اللہ تعالیٰ انکے گناہ اُن پر سے اُتار دیگا (یعنی معاف کردیگا) اور (دونوں جہان میں) اُن کی حالت درست رکھے گا (دُنیا میں تو اسطرح کہ اُن کو اعمالِ صالحہ کی توفیق بڑھتی جاویگی اور آخرت میں اس طرح کہ ان کو عذاب سے نجات اور جنت میں داخلہ ملے گا اور) یہ (جو مؤمنین کی خوشحالی اور کفار کی بدحالی بیان کیگئی) اس وجہ سے ہے کہ کافر تو غلط راستہ پر چلے اور اہلِ ایمان صحیح راستہ پر چلے جو اُن کے رب کیطرف سے (آیا) ہے، (اور غلط راستہ کا موجب ناکامی ہونا اور صحیح راستہ کا سبب کامیابی ہونا ظاہر ہے اسلئے وہ ناکام ہوئے اور یہ کامیاب ہوئے۔ اور اگر اسلام کے صحیح راستہ ہونے میں کوئی شبہ ہو تو مِنْ رَبِّهِمْ سے اسکا جواب ہوگیا کہ دلیل اسکی صحیح ہونیکی یہ ہے کہ وہ من جانب اللہ ہے اور من جانب اللہ ہونا تمام معجزات نبویہ سے بالخصوص اعجاز قرآنی سے ثابت ہے اور) اللہ تعالیٰ اسی طرح (جیسے یہ حالت بیان فرمائی) لوگوں کے (نفع و ہدایت کے) لئے اُن (مذکورین) کے حالات بیان فرماتا ہے (تاکہ ترغیب و ترہیب کے دونوں طریقوں سے ہدایت کی جائے)

معارف و مسائل

سورۂ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کا دوسرا نام سورۂ قتال بھی ہے کیونکہ جہاد و قتال کے احکام اس میں بیان ہوئے ہیں۔ ہجرتِ مدینہ کے فوراً بعد ہی یہ سورت نازل ہوئی یہانتک کہ اس کی ایک آیت كَأَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ کے متعلق حضرت ابن عباسؓ سے یہ منقول ہے کہ وہ مکی آیت ہے کیونکہ اسکا نزول اسوقت ہوا ہے جبکہ آپؐ ہجرت کی نیت سے مکہ معظمہ سے نکلے اور مکہ مکرمہ کی بستی اور بیت اللہ پر نظر کرکے آپنے فرمایا کہ ساری دُنیا کے شہروں میں مجھے تو ہی محبوب ہے، اگر اہلِ مکہ مجھے یہاں سے نہ نکالتے تو میں خود اپنے اختیار سے مکہ مکرمہ کو نہ چھوڑتا، اور اصطلاح مفسرین کیمطابق جو آیات سفر ہجرت مدینہ کے دَوران میں نازل ہوئی ہیں وہ مکی کہلاتی ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ سورت ہجرت مدینہ کے فوراً بعد نازل ہوئی ہے اور یہیں پہنچکر کفار سے جہاد و قتال کے احکام نازل ہوئے ہیں۔

صَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللهِ، سبیل اللہ سے مُراد اسلام ہے أَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ میں ان کفار کے وہ اعمال مراد ہیں جو فی نفسہٖ نیک کام ہیں جیسے مساکین کی امداد و اعانت، پڑوسی کی حمایت و حفاظت، سخاوت اور صدقہ خیرات وغیرہ کہ یہ اعمال اگرچہ اپنی ذات میں نیک اور اچھے عمل ہیں

لیکن آخرت میں ان کا فائدہ ایمان لانے کیساتھ مشروط ہے کافروں کے ایسے نیک اعمال آخرت میں انکے کچھ کام نہ آئیں گے البتہ دنیا میں ہی ان کو انکے نیک کاموں کے بدلے میں راحت وآرام دیدیا جاتا ہے۔

وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ، اگرچہ پہلے جملے میں ایمان اور عمل صالح کا ذکر آچکا ہے جسمیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آپ پر نازل ہونیوالی وحی بھی شامل ہے مگر اس دوسرے جملے میں اسکو بالتصریح ذکر کرنے میں یہ بتلانا منظور ہے کہ ایمان کی اصل بنیاد اس پر ہے کہ خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم کی تمام تعلیمات کو صدق دل سے قبول کیا جائے۔

وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ، لفظ بال کبھی شان اور حال کے معنی میں آتا ہے اور کبھی قلب کے معنی میں یہاں دونوں معنے لئے جاسکتے ہیں، پہلے معنی لئے جاویں تو مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے حال کو یعنی دُنیا و آخرت کے تمام کاموں کو درست کردیا اور دوسری صورت میں معنی یہ ہونگے کہ اللہ تعالیٰ نے انکے قلوب کو درست کردیا حاصل اسکا بھی وہی ہوگا کہ تمام کام درست کردیئے کیونکہ کاموں کی درستی قلب کی درستی کیساتھ لازم وملزوم ہیں۔

فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰٓی اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ

سُو جب تم مقابل ہو منکروں کے تو مارو گردنیں یہانتک کہ جب خوب قتل کرچکو اُن کو

فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰی تَضَعَ

تو مضبوط باندھ لو قید پھر یا احسان کیجیو اور یا معاوضہ لیجیو جب تک کہ رکھ دے

الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا

لڑائی اپنے ہتھیار

مع ۱۳

خُلاصۂ تفسیر

(اُوپر کی آیات میں اہلِ ایمان کا مصلح ہونا اور کفار کا مفسد ہونا بیان ہوا ہے اسکی مناسبت سے کفر وکفار کا فساد رفع کرنے کے لئے اس آیت میں احکامِ جہاد کا ذکر ہے) سو جب تمہارا کفار سے مقابلہ ہوجائے تو اُن کی گردنیں مارو، یہاں تک کہ جب تم اُن کی خوب خونریزی کرچکو (جسکی حد یہ ہے کہ کفار کی شوکت وقوت ٹوٹ جائے اور قتال بند کرنے سے مسلمانوں کی مضرت یا کفار کے غلبہ کا خوف نہ رہے) تو (اسوقت کفار کو قید کرکے) خوب مضبوط باندھ لو پھر اسکے بعد (تم کو دو باتوں کا اختیار ہے) یا تو بلامعاوضہ چھوڑ دینا اور یا معاوضہ لیکر چھوڑ دینا (اور یہ قید اور قتل کا حکم اُسوقت تک ہے) جبتک کہ لڑنے والے (دشمن) اپنے ہتھیار نہ رکھدیں (مراد اس

سے اسلام یا استسلام ہی یعنی یا تو اسلام قبول کرلیں یا مسلمانوں کا ذمی ہوکر رہنا قبول کرلیں تو پھر نہ قتل جائز ہے نہ قید۔

معارف و مسائل

اس آیت سے دو باتیں ثابت ہوئیں، اوّل یہ کہ جب قتال کے ذریعہ کفار کی شوکت و قوت ٹوٹ جائے تو اب بجائے قتل کرنے کے ان کو قید کرلیا جائے پھر ان جنگی قیدیوں کے متعلق مسلمانوں کو دو اختیار دیئے گئے، ایک یہ کہ اُن پر احسان کیا جائے بغیر کسی فدیہ اور معاوضہ کے چھوڑ دیا جائے دوسرے یہ کہ اُن سے کوئی فدیہ لیکر چھوڑا جائے۔ فدیہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہمارے کچھ مسلمان انکے ہاتھ میں قید ہوں تو اُن سے تبادلہ کرلیا جائے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کچھ مال کا فدیہ لیکر چھوڑا جائے۔ یہ حکم بظاہر اس حکم کے خلاف ہے جو سورۂ انفال کی آیت میں گزر چکا ہے جس میں غزوۂ بدر کے قیدیوں کو معاوضہ لیکر چھوڑ دینے کی رائے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عتاب ہوا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمارے اس عمل پر اللہ تعالیٰ کا عذاب قریب آگیا تھا اگر یہ عذاب آتا تو اس سے بجز عمر بن خطابؓ اور سعد بن معاذؓ کے کوئی نہ بچتا کیونکہ اُنھوں نے فدیہ لیکر چھوڑنے کی رائے سے اختلاف کیا تھا جس کی پوری تفصیل معارف القرآن جلد چہارم میں صفحہ ۲۸۲ سے ۲۸۸ تک لکھی گئی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ آیت انفال نے بدر کے قیدیوں کو فدیہ لیکر چھوڑنا بھی ممنوع کردیا تو بلا معاوضہ چھوڑنا بدرجہ اولیٰ ممنوع ہوگا۔ اور سورۂ محمد کی آیتِ مذکورہ نے ان دونوں چیزوں کو جائز قرار دیا ہے اسلئے اکثر صحابہ اور ائمہ فقہاء نے فرمایا کہ سورۂ محمد کی اس آیت نے سورۂ انفال کی آیت کو منسوخ کردیا تفسیر مظہری میں ہی کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حسن اور عطاء اور اکثر صحابہ وجمہور فقہاء کا یہی قول ہے اور ائمہ فقہاء میں سے ثوری، شافعی، احمد، اسحاق رحمہم اللہ کا بھی یہی مذہب ہے اور ابن عباسؓ نے فرمایا کہ غزوۂ بدر کے موقع پر مسلمانوں کی قلت تھی اسوقت منّ وفداء کی ممانعت آئی اور پھر جب مسلمانوں کی شوکت و تعداد بڑھ گئی تو سورہ محمد میں منّ وفداء کی اجازت دیدی گئی۔ تفسیر مظہری میں حضرت قاضی ثناء اللہ رحؒ نے اس کو نقل کرکے فرمایا کہ یہی قول صحیح اور مختار ہے کیونکہ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اسپر عمل فرمایا اور آپکے بعد خلفائے راشدین نے اسپر عمل فرمایا اسلئے یہ آیت سورۂ انفال کی آیت کے لئے ناسخ ہی۔ وجہ یہ ہے کہ سورۂ انفال کی آیت غزوہ بدر کے وقت نازل ہوئی جو ہجرت کے دوسرے سال میں ہوا ہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ۶ سنہ ہجری غزوۂ حدیبیہ میں جن قیدیوں کو بلا معاوضہ آزاد فرمایا ہی وہ سورۂ محمد کی اس آیتِ مذکورہ کے مطابق ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ اہلِ مکہ میں سے اسّی آدمی اچانک جبل تنعیم

سے اُترے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ کو بے خبر پاکر قتل کرنے کا ارادہ کر رہے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو زندہ گرفتار کر لیا پھر بلا معاوضہ آزاد کر دیا۔ اسی پر سورۃ فتح کی یہ آیت نازل ہوئی وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم بِبَطْنِ مَكَّةَ مِن بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ، امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مشہور مذہب اُن کی ایک روایت کیمطابق یہ ہے کہ جنگی قیدیوں کو بلا معاوضہ یا معاوضہ لیکر آزاد کرنا جائز نہیں اسی لئے علماء حنفیہ نے سورہ محمد کی آیت مذکورہ کو امام اعظم کے نزدیک منسوخ اور سورۃ انفال کی آیت کو ناسخ قرار دیا ہے مگر تفسیر مظہری نے یہ واضح کر دیا کہ سورۃ انفال کی آیت پہلے اور سورۃ محمد کی آیت بعد میں نازل ہوئی ہے اسلئے وہی ناسخ اور انفال کی آیت منسوخ ہے اور امام اعظم کا مختار مذہب بھی جمہور صحابہ و فقہاء کیمطابق آزاد کر دینے کے جواز کا نقل کیا ہے جبکہ مسلمانوں کی مصلحت اسمیں ہو، اور فرمایا کہ یہی اصح اور مختار ہے۔ علمائے حنفیہ میں سے علامہ ابن ہمام فتح القدیر میں اسی طرف مائل ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ قدوری اور ہدایہ کی روایت کیمطابق امام اعظم کے نزدیک قیدیوں کو فدیہ لیکر آزاد نہیں کیا جاسکتا اور یہ ایک روایت ہے امام اعظم ابوحنیفہؒ سے، مگر اُنہی سے دوسری روایت سیر کبیر میں جمہور کے قول کیمطابق جواز کی منقول ہے اور یہی ان دونوں روایتوں میں اظہر ہے اور امام طحاوی نے معانی الآثار میں اسی کو ابوحنیفہؒ کا مذہب قرار دیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ سورۃ محمد اور سورۃ انفال کی دونوں آیتیں جمہور صحابہ و ائمہ کے نزدیک منسوخ نہیں، مسلمانوں کے حالات اور ضرورت کے تابع امام المسلمین کو اختیار ہے کہ انمیں جس صورت کو مناسب سمجھے اختیار کرلے۔ قرطبی نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عمل سے یہ ثابت کیا ہے کہ جنگی قیدیوں کو کبھی قتل کیا گیا ہے اور کبھی غلام بنایا گیا اور کبھی فدیہ لے کر چھوڑا گیا اور کبھی بغیر فدیہ کے آزاد کر دیا گیا۔ فدیہ لینے میں یہ بھی داخل ہے کہ انکے بدلے میں مسلمان قیدی آزاد کرائے جائیں اور یہ بھی کہ اُن سے کچھ مال لیکر چھوڑا جائے، دونوں قسم کی صورتیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عمل سے ثابت ہیں اس تفصیل کو نقل کرنے کے بعد انھوں نے فرمایا کہ اس سے معلوم ہوا کہ اس معاملہ میں جن آیتوں کو ناسخ منسوخ کہا گیا درحقیقت وہ سب محکم ہیں ان میں سے کوئی منسوخ نہیں، اسلئے کہ جب کفار قید ہو کر ہمارے قبضے میں آئیں تو امام المسلمین کو چار چیزوں کا اختیار ہے کہ مناسب سمجھے تو قتل کر دے اور مصلحت مسلمانوں کی سمجھے تو ان کو غلام اور لونڈی بنالے، اور فدیہ لیکر چھوڑنے میں مصلحت ہو تو فدیہ مال کا یا مسلمان قیدیوں کا لیکر چھوڑ دے یا بغیر کسی معاوضہ کے آزاد کر دے۔ قرطبی نے یہ تفصیل نقل کر کے لکھا ہے وھذا القول یروی من اھل المدینۃ والشافعی وابی عبید وحکاہ الطحاوی مذھبا

عن ابی حنیفۃ والمشھور ما قدمناہ، یعنی علمائے مدینہ کا یہی قول ہے اور یہی قول امام شافعیؒ اور ابو عبیدؒ کا ہے اور امام طحاویؒ نے ابو حنیفہؒ کا بھی یہی قول نقل کیا ہے اگرچہ مشہور مذہب ان کا اسکے خلاف ہے (قرطبی ص ۲۲۸ ج ۱۶)

جنگی قیدیوں کے متعلق امام المسلمین کو چار اختیار مذکور الصدر تقریر سے واضح ہوگیا کہ جنگی قیدیوں کے قتل اور استرقاق یعنی غلام بنالینے کا جو امام المسلمین کو اختیار ہے اسپر تو تمام اُمت کا اجماع ہے اور فدیہ لے کر یا بلا معاوضہ آزاد کرنے میں اگرچہ کچھ اختلافات ہیں مگر جمہور کے نزدیک یہ دونوں صورتیں بھی جائز ہیں۔

اسلام میں غلامی کی بحث یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنگی قیدیوں کو آزاد چھوڑ دینے میں تو فقہاءً کا کچھ اختلاف ہے بھی، قتل کرنے اور غلام بنانے کی اجازت میں کوئی اختلاف نہیں سب کا اجماع ہے کہ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں، پھر قرآنِ کریم میں ان دو صورتوں کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا؟ اور صرف آزاد چھوڑنے کی دو صورتوں ہی کا بیان کیوں کیا گیا ہے؟ اس سوال کا جواب امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں یہ دیا ہے کہ یہاں صرف اُن دو صورتوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ہر جگہ اور ہر وقت جائز ہوں، غلام بنانیکا ذکر اسلئے نہیں کیا گیا کہ عرب کے جنگی قیدیوں کو غلام بنانیکی اجازت نہیں ہے، اور قتل بھی اپاہجوں وغیرہ کا جائز نہیں اسکے علاوہ قتل کا ذکر اوپر آبھی چکا ہے (تفسیر کبیر ص ۵۰۸ ج ۷)

دوسری بات یہ ہے کہ جہانتک قتل کرنے اور غلام بنانیکا تعلق ہے اسکا جواز بہت معروف و مشہور تھا، سب کو معلوم تھا کہ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں اسکے برخلاف آزاد چھوڑ دینے کو غزوۂ بدر کے موقع پر ممنوع کردیا گیا تھا، اب اس مقام پر آزاد چھوڑنے کی اجازت دینا ہی مقصود تھا اسلئے اسی کی دو صورتوں یعنی منّ اور فدا کا ذکر کردیا گیا، اور جو صورتیں پہلے سے جائز تھیں انھیں اس موقع پر بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، اسلئے ان آیات میں اُن سے سکوت اختیار کیا گیا، لہٰذا ان آیات سے یہ نتیجہ نکالنا کسی طرح درست نہیں ہے کہ ان آیات کے نزول کے بعد قتل یا غلام بنانے کی اجازت منسوخ کردی گئی ہے، ورنہ اگر غلام بنانیکا حکم منسوخ ہوگیا ہوتا تو قرآن و حدیث میں کسی ایک جگہ تو اس کی ممانعت مذکور ہوتی، اور اگر یہ آیت ہی ممانعت کے قائم مقام تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپکے بعد قرآن و حدیث پر جان دینے والے صحابۂ کرامؓ نے بیشمار غزوات میں جنگی قیدیوں کو غلام کیوں بنایا؟ روایاتِ حدیث و تاریخ میں غلام بنانے کا ذکر اس کثرت اور معنوی تواتر کیساتھ آیا ہے کہ اسکا انکار مکابرہ کے سوا کچھ نہیں۔

رہا یہ اشکال کہ اسلام، جو حقوقِ انسانیت کا سب سے بڑا محافظ ہے، اُس نے غلامی کی اجازت کیوں دی؟ سو درحقیقت یہ اشکال اسوجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کی جائز

کی ہوئی غلامی کو دیگر مذاہب اقوام کی غلامی پر قیاس کرلیا گیا ہے حالانکہ اسلام نے غلاموں کو جو حقوق عطا کئے اور معاشرے میں ان کو جو مقام دیا اسکے بعد وہ صرف نام کی غلامی رہ گئی ورنہ حقیقت میں وہ بھائی چارہ بن گیا ہے، اور اگر اس کی حقیقت اور روح پر نظر کیجائے تو بہت سی صورتوں میں جنگی قیدیوں کیساتھ اس سے بہتر سلوک ممکن نہیں، مشہور مستشرق موسیو گستاؤ لیبان اپنی کتاب تمدن عرب میں لکھتا ہے :-

"غلام کا لفظ جب کسی ایسے یورو پین شخص کے سامنے بولا جاتا ہے جو تیس سال کے دوران لکھی ہوئی امریکی روایتوں کو پڑھنے کا عادی ہے تو اس کے دل میں اُن مسکینوں کا تصور آجاتا ہے جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، ان کے گلوں میں طوق پڑے ہیں اور انھیں کوڑے مار مار کر ہنکایا جا رہا ہے، ان کی غذا انکی سدِ رمق کے لئے بھی کافی نہیں اور انھیں رہنے کے لئے تاریک کوٹھڑیوں کے سوا کچھ میسر نہیں، مجھے یہاں اس سے بحث نہیں کہ یہ تصویر کس حد تک درست ہے اور انگریزوں نے چند سالوں سے امریکہ میں جو کچھ کیا ہے یہ باتیں اس پر صادق آتی ہیں یا نہیں؟ ... لیکن یہ بالکل یقینی بات ہے کہ اہلِ اسلام کے یہاں غلام کا تصور نصاریٰ کے یہاں غلام کے تصور سے بالکلیہ مختلف ہے۔"

(منقول از دائرۃ المعارف القرآن العشرین الفرید وجدی، ص ۲۷۹ ج ۴ مادہ "استرقاق")

حقیقت یہ ہے کہ بہت سی صورتیں ایسی ہوتی ہیں جن میں قیدیوں کو غلام بنانے سے بہتر کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوتا، کیونکہ اگر غلام نہ بنایا جائے تو تین ہی صورتیں عقلاً ممکن ہیں، یا قتل کر دیا جائے، یا آزاد چھوڑ دیا جائے یا دائمی قیدی بنا کر رکھا جائے، اور بسا اوقات تینوں صورتیں مصلحت کے خلاف ہوتی ہیں، قتل کرنا اس لئے مناسب نہیں ہوتا کہ قیدی اچھی صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے - آزاد چھوڑ دینے میں بعض مرتبہ یہ خطرہ ہوتا ہے کہ دار الحرب میں پہنچکر وہ مسلمانوں کے لئے دوبارہ عظیم خطرہ بن جائے، اب دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں، یا تو اسے دائمی قیدی بنا کر آجکل کی طرح کسی الگ تھلگ جزیرے میں ڈالدیا جائے یا پھر غلام بنا کر اس کی صلاحیتوں سے کام لیا جائے اور اس کے حقوقِ انسانی کی پوری نگہداشت کی جائے، ہر شخص سوچ سکتا ہے کہ ان میں سے بہتر صورت کونسی ہے؟ بالخصوص جبکہ غلاموں کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر وہ ہے جو ایک معروف حدیث میں سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے بالفاظ ذیل بیان فرمایا ہے:

اخوانکم جعلھم اللّٰہ تحت ایدیکم فمن کان اخوہ تحت یدہ فلیطعمہ مما یاکل ولیلبسہ مما یلبس ولا یکلفہ	تمھارے غلام تمھارے بھائی ہیں جنھیں اللہ نے تمھارے زیر دست کر دیا ہے، پس جسکا بھائی اسکے زیر دست ہو اسے چاہئے کہ اسکو بھی اسی میں سے کھلائے جو وہ خود کھاتا ہے اور اسی

مَا يَغْلِبُہٗ فَاِنْ كَلَّفَہٗ مَا يَغْلِبُہٗ فَلْيُعِنْہٗ
(بخاری، مسلم، ابوداؤد وغیرہ)

میں سے پہنائے جسے وہ خود پہنتا ہے اور اسکو ایسے کام کی زحمت نہ دے جو اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو، اور اگر اسے ایسے کام کی تکلیف دے تو خود بھی اس کی مدد کرے۔

معاشرتی اور تمدنی حقوق کے اعتبار سے اسلام نے غلاموں کو جو مرتبہ عطا کیا وہ آزاد افراد کے قریب قریب مساوی ہے، چنانچہ دوسری اقوام کے برخلاف اسلام نے غلاموں کو نکاح کی نہ صرف اجازت دی بلکہ آقاؤں کو اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ والی آیت کے ذریعہ اسکی تاکید کی گئی ہے یہانتک کہ وہ آزاد عورتوں سے بھی نکاح کرسکتا ہے، مالِ غنیمت میں اسکا حصّہ آزاد مجاہدین کے برابر ہے اور دشمن کو امان دینے میں اسکا قول اسی طرح معتبر ہے جس طرح آزاد افراد کا، قرآن و حدیث میں ان کیساتھ حُسنِ سلوک کے اتنے احکام آئے ہیں کہ ان کو جمع کرنیسے ایک مستقل کتاب بن سکتی ہے، یہانتک کہ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ سرکار دوعالم صلے اللہ علیہ وسلم کے جو الفاظ آخری وقت تک زبانِ مبارک پر جاری تھے اور جس کے بعد آپؐ خالقِ حقیقی سے جاملے، وہ یہ الفاظ تھے: اَلصَّلٰوۃَ الصَّلٰوۃَ، اِتَّقُوا اللّٰہَ فِيْمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ

ترجمہ، نماز کا خیال رکھو، نماز کا خیال رکھو، اپنے زیر دست غلاموں کے بارمیں اللہ سے ڈرو (ابوداؤد۔ باب فی حق المملوک)

غلاموں کے لئے تعلیم و تربیت کے جو مواقع اسلام نے فراہم کئے ہیں ان کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں اسلامی سلطنت کے تقریباً تمام صوبوں میں علم و فضل کے مرجعِ اعلیٰ سب کے سب غلاموں میں سے تھے جسکا واقعہ متعدد کتبِ تاریخ میں مذکور ہے، پھر اس نام کی غلامی کو بھی رفتہ رفتہ ختم یا کم کرنے کے لئے غلاموں کو آزاد کرنیکے اتنے فضائل قرآن و حدیث میں وارد ہوئے ہیں کہ شاید ہی کوئی نیکی اس کی ہمسری کرسکے۔ مختلف فقہی احکام میں غلاموں کو آزاد کرنے کے لئے بہانے ڈھونڈے گئے ہیں۔ کفّارۂ صوم، کفّارۂ قتل، کفّارۂ ظہار، کفّارۂ یمین ان تمام صورتوں میں سب سے پہلا حکم یہ مذکور ہے کہ کوئی غلام آزاد کیا جائے، یہانتک کہ حدیث میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اگر کسی نے غلام کو ناحق تھپڑ مار دیا تو اسکا کفّارہ یہ ہے کہ اسے آزاد کردیا جائے۔ (صحیح مسلم۔ باب صحبۃ الممالیک) چنانچہ صحابۂ کرامؓ جس کثرت کیساتھ غلام آزاد کیا کرتے تھے اس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ صاحب النجم الوہاج نے بعض صحابہؓ کے آزاد کردہ غلاموں کی یہ تعداد نقل کی ہے

حضرت عائشہؓ	۶۹	حضرت عباسؓ	۷۰
حضرت حکیم بن حزامؓ	۱۰۰	حضرت عبداللہ بن عمرؓ	۱۰۰۰
حضرت عثمان غنیؓ	۲۰	حضرت ذوالکلاع حمیریؓ	۸۰۰۰ (صرف ایک دن میں)

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ ۳۰۰۰۰ (فتح العلّام شرح بلوغ المرام از نواب صدیق حسن خاں صاحب ج ۲ ص ۲۳۲ کتاب العتق)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف سات صحابہؓ نے انتالیس ہزار دو سو انسٹھ غلام آزاد کئے، اور ظاہر ہے

کہ دوسرے ہزاروں صحابہؓ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد اس سے کہیں زائد ہوگی۔ غرض اسلام نے غلامی کے نظام میں جو ہمہ گیر اصلاحات کیں جو شخص بھی انھیں بنظر انصاف دیکھے گا وہ اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اسے دوسری اقوام کے احکام غلامی پر قیاس کرنا بالکل غلط ہے، اور ان اصلاحات کے بعد جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کی اجازت ان پر ایک عظیم احسان بن گئی ہے۔

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کا حکم صرف اباحت اور جواز کی حد تک ہے یعنی اگر اسلامی حکومت مصالح کے مطابق سمجھے تو انھیں غلام بنا سکتی ہے ایسا کرنا مستحب یا واجب فعل نہیں ہے بلکہ قرآن و حدیث کے مجموعی ارشادات سے آزاد کرنیکا افضل ہونا سمجھ میں آتا ہے اور یہ اجازت بھی اسوقت تک کے لئے ہے جب تک اس کے خلاف دشمن سے کوئی معاہدہ نہ ہوا اور اگر دشمن سے یہ معاہدہ ہوجائے کہ نہ وہ ہمارے قیدیوں کو غلام بنائینگے نہ ہم اُن کے قیدیوں کو، تو پھر اس معاہدہ کی پابندی لازم ہوگی۔ ہمارے زمانے میں دُنیا کے بہت سے ملکوں نے ایسا معاہدہ کیا ہوا ہے، لہٰذا جو اسلامی ممالک اس معاہدے میں شریک ہیں ان کے لئے غلام بنانا اسوقت تک جائز نہیں جب تک یہ معاہدہ قائم ہے۔

ذٰلِكَ ۛ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا۟ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ

یہ سُن چکے اور اگر چاہے اللہ تو بدلہ لے اُن سے پر جانچنا چاہتا ہے تمھارے ایک سے دوسرے کو

وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ﴿۴﴾ سَيَهْدِيْهِمْ

اور جو لوگ مارے گئے اللہ کی راہ میں تو نہ ضائع کریگا وہ ان کے کئے کام ان کو راہ دیگا

وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ﴿۵﴾ وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ﴿۶﴾ يٰۤاَيُّهَا

اور سنوارے گا ان کا حال اور داخل کریگا اُن کو بہشت میں جو معلوم کرادی ہے ان کو اے

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ﴿۷﴾

ایمان والو اگر تم مدد کرو گے اللہ کی تو وہ تمھاری مدد کریگا اور جمادے گا تمھارے پاؤں

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ﴿۸﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ

اور جو لوگ کہ منکر ہوئے وہ گرے منہ کے بل اور کھودیئے ان کے کئے کام یہ اس لئے کہ انکو پسند

كَرِهُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴿۹﴾ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي

نہ ہوا جو اُتارا اللہ نے پھر اکارت کردیئے ان کے کئے کام کیا وہ پھرے نہیں

الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ دَمَّرَ

مُلک میں کہ دیکھیں کیسا ہوا انجام اُن کا جو اُن سے پہلے تھے ہلاکی

اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۖ وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ﴿۱۰﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى

ڈالی اللہ نے اُن پر اور منکروں کو ملتی رہتی ہیں ایسی چیزیں یہ اس لئے کہ اللہ رفیق ہے اُن کا

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ﴿۱۱﴾ ع

جو یقین لائے اور یہ کہ جو منکر ہیں اُن کا رفیق نہیں کوئی

ع ۱۱ / ۵

خلاصۂ تفسیر

یہ حکم (جہاد کا جو مذکور ہوا) بجالانا اور (جو بعض صورتوں میں کفار سے انتقام لینے کیلئے طریقہ جہاد کا مقرر کیا، یہ خاص حکمت کیوجہ سے ہے ورنہ) اگر اللہ چاہتا تو اُن سے (خود ہی آسمانی اور زمینی عذابوں کے ذریعہ) انتقام لے لیتا (جیسے پچھلی اُمتوں سے اسی طرح انتقام لیا، کسی پر پتھر برسے کسی پر ہوا کا طوفان آیا، کسی کو غرق کیا گیا، اگر ایسا ہوتا تو تم کو جہاد نہ کرنا پڑتا) لیکن (تمکو جہاد کرنیکا حکم اسلئے دیا) تاکہ تمھارا ایک دوسرے کے ذریعہ امتحان کرے (مسلمانوں کا امتحان یہ کہ کون حکمِ الٰہی پر اپنی جان کو ترجیح دیتا ہے، اور کفّار کا امتحان یہ کہ قتال و جہاد کی تکلیف سے متنبہ ہوکر کون حق کو قبول کرتا ہے) اور (جہاد میں جیسے کفار کا قاتل ہونا کامیابی ہے اسی طرح مقتول ہونا بھی ناکامی نہیں کیونکہ) جو لوگ اللہ کی راہ (یعنی جہاد) میں مارے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کے اعمال کو (جن میں یہ عمل جہاد بھی داخل ہے) ہرگز ضائع نہ کریگا (جیسا کہ ظاہر میں سمجھا جاسکتا ہے کہ جب وہ کافروں پر غالب نہ آسکا یہ خود مقتول ہوگیا تو گویا اسکا عمل بیکار گیا مگر واقعہ یوں نہیں کیونکہ اسکے اس عمل پر دوسرا نتیجہ جو ظاہری کامیابی سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے اس کو حاصل ہوگیا وہ یہ کہ) اللہ تعالیٰ اُن کو (منزل) مقصود تک (جسکا بیان آگے آتا ہے) پہنچا دیگا اور اُن کی حالت (قبر اور حشر اور پُل صراط اور تمام مواقع آخرت میں) درست رکھے گا (کہیں کوئی خرابی اور مضرت اُن کو نہ پہنچے گی) اور (اس منزلِ مقصود تک پہنچنے کا بیان یہ ہے کہ) اُن کو جنت میں داخل کریگا جس کی اُن کو پہچان کرا دیگا (کہ ہر جنتی اپنے اپنے مقررہ مکان پر بغیر کسی تلاش تفتیش کے بے تکلف جا پہنچے گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ جہاد میں ظاہری ناکامی یعنی خود مقتول ہوجانا بھی بڑی کامیابی ہے۔ آگے جہاد کے دُنیوی فوائد و فضائل کا ذکر کرکے اسکی ترغیب ہے کہ) اے ایمان والو اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کریگا (جسکا نتیجہ دنیا میں بھی دشمنوں پر غالب آنا ہے خواہ ابتداءً ہی یا کچھ عرصہ کے بعد انجام کار ہی۔ اور بعض مؤمنین کا مقتول ہوجانا یا کسی معرکہ میں وقتی طور پر مغلوب ہوجانا اسکے منافی نہیں) اور (اسی طرح دشمنوں کے مقابلہ میں) تمھارے قدم

جما دیگا (اسی طرح کا مطلب یہ ہے خواہ ابتدا ہی سے یا وقتی پسپائی کے بعد انتہا میں ثابت قدم رکھ کر کفار پر غالب کریگا جیسا کہ بار بار اسکا مشاہدہ دنیا میں ہو چکا ہے یہ تو مسلمانوں کا حال بیان کیا گیا) اور جو لوگ کافر ہیں انکے لئے (دنیا میں جبکہ مؤمنین سے مقابلہ کریں) تباہی (اور مغلوبیت) ہے اور (آخرت میں) انکے اعمال کو خدا تعالیٰ کالعدم کر دیگا (جیسا کہ شروع سورت میں بیان ہوا۔ غرض کفار دونوں جہان میں خسارے میں رہے اور) یہ (کفار کا خسارہ اور اعمال کی بربادی) اس سبب سے ہوئی کہ انھوں نے اللہ کے اُتارے ہوئے احکام کو ناپسند کیا (عقیدۃً بھی اور عملاً بھی) سو اللہ نے انکے اعمال کو (اوّل ہی سے) اکارت کر دیا (کیونکہ کفر کا جو اعلیٰ درجہ کی بغاوت ہے یہی اثر ہے اور یہ لوگ جو عذابِ الٰہی سے نہیں ڈرتے) کیا یہ لوگ مُلک میں چلے پھرے نہیں اور اُنھوں نے دیکھا نہیں کہ جو لوگ اُن سے پہلے ہو گزرے ہیں اُن کا انجام کیسا ہوا کہ خدا تعالیٰ نے اُن پر کیسی تباہی ڈالی (جو اُنکے اُجڑے ہوئے محلات و مکانات سے ظاہر ہے تو اُن کو بھی اس سے بے فکر نہ ہونا چاہیئے کہ اپنے کفر سے باز نہ آئے تو) ان کافروں کے لئے بھی اسی قسم کے معاملات ہونے کو ہیں (آگے فریقین کے حال کا اجمالی ذکر ہے کہ) یہ (مسلمانوں کی کامیابی اور کافروں کی تباہی) اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کا کارساز ہے اور کافروں کا کوئی (ایسا) کارساز نہیں (کہ خدا کے مقابلہ میں انکے کام بنا سکے اسلئے وہ دونوں جہان میں ناکام رہتے ہیں اور مسلمانوں کو اگر کبھی دُنیا میں وقتی ناکامی بھی ہو جائے تو انجام کار کامیابی ہوگی، اور آخرت کی فلاح تو ظاہر ہی ہے اسلئے مسلمان ہمیشہ کامیاب اور کافر ناکام رہتا ہے)

معارف و مسائل

مشروعیت جہاد کی ایک حکمت | وَلَوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ ، اس آیت میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اس اُمت میں کفار سے جہاد و قتال کی مشروعیت درحقیقت ایک حکمت سے ہے۔ کیونکہ وہ آسمانی عذابوں کے قائم مقام ہے کیونکہ کفر و شرک اور اللہ سے بغاوت کی سزا پچھلی قوموں کو آسمانی اور زمینی عذابوں کے ذریعہ دی گئی ہے اُمتِ محمدیہ میں ایسا ہو سکتا تھا مگر رحمۃٌ للعالمین کی برکت سے اس اُمت کو ایسے عام عذابوں سے بچا لیا گیا، اسکے قائم مقام جہاد شرعی کو کر دیا گیا جس میں بہ نسبت عذابِ عام کے بڑی سہولتیں اور مصلحتیں ہیں۔ اوّل تو یہ کہ عذابِ عام میں پوری قومیں مرد، عورت، بچے سبھی تباہ ہوتے ہیں اور جہاد میں عورتیں بچے تو مامون ہیں ہی، مرد بھی صرف وہی اسکی زد میں آتے ہیں جو اللہ کے دین کی حفاظت کرنیوالوں کے مقابلہ پر قتال کے لئے آ کھڑے ہوں، پھر اُس میں بھی سب مقتول نہیں ہوتے، اُن میں بہت سے لوگوں کو اسلام و ایمان کی توفیق نصیب ہو جاتی ہے نیز جہاد کی مشروعیت کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اسکے ذریعہ جہاد و قتال کے دونوں فریق، مسلمان

اور کافر کا امتحان ہو جاتا ہے کہ کون اللہ کے حکم پر اپنی جان و مال نثار کرنے کو تیار ہو جاتا ہے اور کون سرکشی اور کفر پر جما رہتا ہے یا اسلام کے روشن دلائل کو دیکھ کر اسلام قبول کر لیتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ، شروع سورت میں ذکر تھا کہ جو لوگ کفر و شرک پر جمع ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی اسلام سے روکتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اُن کے نیک اعمال کو بھی اکارت اور ضائع کر دیا یعنی صدقہ خیرات اور رفاہِ عام کے نیک کام جو وہ کرتے ہیں کفر و شرک کی وجہ سے اللہ کے نزدیک آخرت میں ان کا کوئی ثواب نہیں، اسکے بالمقابل اس آیت میں فرمایا کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید ہوتے ہیں انکے اعمال ضائع نہیں ہوتے یعنی اگر انھوں نے کچھ گناہ بھی کئے ہوں تو اُن کے گناہوں کیوجہ سے اُن کے نیک اعمال پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ بسا اوقات اُن کے نیک اعمال اُن کے گناہوں کا کفارہ بن جاتے ہیں۔

سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ، اس میں شہید فی سبیل اللہ کے لئے دو نعمتوں کا ذکر ہے ایک یہ کہ اللہ ان کو ہدایت کر دیگا۔ دوسرے اُن کے سب حالات درست کر دیگا۔ حالات سے مُراد دُنیا و آخرت دونوں جہان کے حالات ہیں۔ دنیا میں تو یہ کہ جو شخص جہاد میں شریک ہوا اگرچہ وہ شہید نہ ہوا سلامت رہا وہ بھی شہید کے ثواب کا مستحق ہوگیا، اور آخرت میں یہ کہ وہ قبر کے عذاب سے محشر کی پریشانی سے نجات پائے گا اور اگر کچھ لوگوں کے حقوق اسکے ذمہ رہ گئے ہیں تو اللہ تعالیٰ اصحابِ حقوق کو اس سے راضی کر کے اسکی خلاصی کرا دیں گے۔ (کما ورد فی حدیث ابی نعیم والبزار والبیہقی۔ مظہری) اور موت کے بعد ہدایت کر دینے سے مراد ان کی منزلِ مقصود یعنی جنت پر پہنچا دینا ہے جیسا کہ قرآن میں اہلِ جنت کے متعلق آیا ہے کہ جنت میں پہنچکر کہیں گے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا۔

وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ، یہ ایک تیسرا انعام ہے کہ اُن کو صرف یہی نہیں کہ جنّت میں پہنچا دیا جائیگا بلکہ انکے دِلوں میں خود بخود جنّت کے اپنے اپنے مقام اور اسمیں ملنے والی نعمتوں حور و قصور سے ایسی واقفیت پیدا کر دی جائے گی جیسے وہ ہمیشہ سے انہی میں رہتے اور ان سے مانوس تھے اگر ایسا نہ ہوتا تو جنّت ایک نیا عالم تھا اسمیں اپنا مقام تلاش کرنے میں وہاں کی چیزوں سے مناسبت اور تعلق قائم ہونے میں وقت لگتا، اور ایک مدت تک اجنبیت کے احساس سے قلب مطمئن نہ ہوتا۔

حضرت ابو ہریرہ رضؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس نے مجھے دینِ حق دے کر بھیجا ہے کہ تم دُنیا میں جس طرح اپنی بیبیوں اور گھروں سے واقف اور مانوس ہو اس سے بھی زیادہ اپنے جنّت کے مقام اور وہاں کی بیبیوں سے واقف اور مانوس ہو جاؤ گے (رواہ ابن جریر والطبرانی وابو یعلی والبیہقی۔ مظہری) اور بعض روایتوں میں ہے کہ ایک فرشتہ ہر ایک جنتی کے لئے مقرر کر دیا جائیگا جو انکا اپنے مقام جنت اور وہاں کی بیبیوں سے تعارف کرائیگا واللہ اعلم۔

وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ، یہاں الکافرین کا الف لام عہد کے لئے ہے اور مراد کفارِ مکہ ہیں مراد ان کو ڈرانا ہے کہ جس طرح پچھلی اُمتوں پر عذاب آئے ہیں تم پر بھی آسکتے ہیں بے فکر نہ رہنا چاہیئے۔

وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ، لفظ مولیٰ بہت سے معانی کے لئے مستعمل ہوتا ہے ایک معنی کارساز کے ہیں جو اس جگہ مراد ہیں اور ایک معنی مالک کے ہیں۔ قرآن میں دوسری جگہ کفار کے بارے میں آیا ہے رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ، اسمیں اللہ تعالیٰ کو کفار کے لئے بھی مولیٰ قرار دیا ہے کیونکہ مولیٰ کے معنی مالک کے ہیں اور مالکیت اللہ تعالیٰ کی عام ہے مومن کافر کوئی اُس سے خارج نہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ

مقرر اللہ داخل کریگا اُن کو جو یقین لائے اور کئے بھلے کام باغوں میں جن کے

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا

نیچے بہتی ہیں نہریں اور جو لوگ منکر ہیں برت رہے ہیں اور کھاتے ہیں جیسے

تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ﴿۱۲﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ

کہ کھائیں چوپائے اور آگ ہے گھر اُن کا اور کتنی تھیں بستیاں جو

اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ ۚ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا

زیادہ تھیں زور میں اس تیری بستی سے جس نے تجھ کو نکالا ہمنے ان کو غارت کردیا پھر

نَاصِرَ لَهُمْ ﴿۱۳﴾ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ

کوئی نہیں اُن کا مددگار، بھلا ایک جو چلتا ہے واضح رستہ پر اپنے رب کے برابر ہے اسکے جسکو بھلا دکھلایا

سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ﴿۱۴﴾ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ

اُسکا بُرا کام اور چلتے ہیں اپنی خواہشوں پر احوال اس بہشت کا جس کا وعدہ ہوا ہے

الْمُتَّقُوْنَ ؕ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ

ڈرنے والوں سے اسمیں نہریں ہیں پانی کی جو بو نہیں کر گیا اور نہریں ہیں دودھ کی جسکا مزہ

يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ

نہیں پھرا اور نہریں ہیں شراب کی جسمیں مزہ ہے پینے والوں کے واسطے اور نہریں ہیں

عَسَلٍ مُّصَفًّى ؕ وَلَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ؕ

شہد کی جھاگ اُتارا ہوا ، اور اُن کے لئے وہاں سب طرح کے میوے ہیں اور معافی ہے اُن کے رب سے

كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ ﴿۱۵﴾

یہ برابر ہے اسکے جو سدا رہے آگ میں اور پلایا جائے ان کو کھولتا پانی تو کاٹ نکالے ان کی آنتیں

خلاصۂ تفسیر

بیشک اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور اُنھوں نے اچھے کام کئے (جنت کے) ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہونگی اور جو لوگ کافر ہیں وہ (دُنیا میں) عیش کر رہے ہیں اور اس طرح (آخرت سے بے فکر ہو کر) کھاتے (پیتے) ہیں جس طرح چوپائے کھاتے ہیں (کہ وہ نہیں سوچتے کہ ہم کو کیوں کھلایا پلایا جاتا ہے اور ہمارے ذمہ اسکا کیا حق واجب ہے) اور جہنم اُن لوگوں کا ٹھکانا ہے (اور اوپر جو کفار کے دُنیا میں عیش کرنیکا ذکر ہوا اُس سے آپکے مخالفین کو دھوکہ نہ کھانا چاہیئے، اور نہ آپ کو اُن کی اس غفلت پر کچھ حزن و ملال ہونا چاہیئے، جو اُن کی مخالفت کا سبب بنی ہوئی ہے یہاں تک کہ انھوں نے آپ کو تنگ کر کے مکہ میں بھی نہیں رہنے دیا کیونکہ) بہت سی بستیاں ایسی تھیں جو قوت (جسم اور قوت مال و جاہ) میں آپ کی اس بستی سے بڑھی ہوئی تھیں جس کے رہنے والوں نے آپکو گھر سے بے گھر کر دیا کہ ہم نے ان کو (عذاب سے) ہلاک کر دیا سو اُن کا کوئی مددگار نہ ہوا (تو یہ بیچارے کیا چیز ہیں ان کو مغرور نہ ہونا چاہیئے، کیونکہ جب اللہ تعالےٰ چاہیں ان کی صفائی کر سکتے ہیں اور آپ ان کے چند روزہ عیش سے مغموم نہ ہوں کیونکہ اللہ تعالےٰ اپنے مقرر وقت پر اُن کو بھی سزا دینے والے ہیں) تو جو لوگ اپنے پروردگار کے واضح (ثابت بالدلیل) راستہ پر ہوں کیا وہ اُن شخصوں کیطرح ہو سکتے ہیں جن کی بدعملی ان کو بھلی معلوم ہوتی ہو اور جو اپنی نفسانی خواہشوں پر چلتے ہوں (یعنی جب ان دونوں فریق کے اعمال میں تفاوت ہے تو انکے مآل اور انجام میں بھی تفاوت ضروری ہے، اہل حق ثواب کے اور اہل باطل عقاب و عذاب کے مستحق ہیں جسکا بیان یہ ہے) جس جنت کا متقیوں سے وعدہ کیا جاتا ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ اسمیں بہت سی نہریں تو ایسے پانی کی ہیں جس میں ذرا تغیر نہیں ہوگا (نہ بُو میں نہ رنگ میں نہ مزے میں) اور بہت سی نہریں دودھ کی ہیں جن کا ذائقہ ذرا بدلا ہوا نہ ہوگا، اور بہت سی نہریں ہیں شراب کی جو پینے والوں کو بہت لذیذ معلوم ہوگی اور بہت سی نہریں ہیں شہد کی جو بالکل (میل کچیل سے پاک) صاف ہوگا اور انکے لئے وہاں ہر قسم کے پھل ہونگے اور (اسمیں داخل ہونے سے پہلے) انکے رب کی طرف سے (گناہوں کی) بخشش ہوگی کیا ایسے لوگ اُن جیسے ہو سکتے ہیں جو ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے، اور کھولتا ہوا پانی اُن کو پینے کو دیا جاویگا تو وہ اُن کی انتڑیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا۔

معارف و مسائل

چونکہ دُنیا کا پانی کبھی رنگ میں کبھی بُو میں کبھی ذائقہ میں متغیر ہو جاتا ہے اسی طرح دُنیا کا

دودھ بگڑ جاتا ہے اسی طرح دُنیا کی شراب بدمزہ و تلخ ہوتی ہے صرف بعض منافع کی خاطر پی جاتی ہے جیسے تمباکو کڑوا ہونیکے باوجود کھایا جاتا ہے پھر عادت پڑ جاتی ہے ۔ جنّت کے پانی اور دودھ اور شراب کے بارمیں بتلا دیا گیا کہ وہ سب ان تغیرّات اور بدمزگی کی آفات سے خالی ہیں اور جنّت کا دوسری مضرتوں اور مفاسد سے خالی ہونا سورۂ صافات کی آیت میں آیا ہے لَا فِيهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُونَ ۔ اسی طرح دُنیا کے شہد میں موم اور میل کچیل ملا ہوتا ہے جنّت کی نہر میں شہد کا پاک صاف ہونا بتلایا گیا ۔ صحیح بات یہ ہے کہ انہار جنّت کی چاروں قسمیں ، پانی ، دودھ ، شراب ، شہد اپنے حقیقی معنی میں ہیں بلا وجہ مجازی معنے لینے کی ضرورت نہیں ، البتہ یہ بات کھلی ہوئی ہے کہ جنّت کی چیزوں کو دُنیا کی چیزوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا وہاں کی ہر چیز کی لذت و کیفیت کچھ اور ہی ہو گا جس کی دُنیا میں کوئی نظیر نہیں ۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ إِلَيْكَ ۚ حَتّٰىٓ إِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا

اور بعضے ان میں ہیں کہ کان رکھتے ہیں تیری طرف یہاں تک کہ جب نکلیں تیرے پاس سے کہتے ہیں ان کو

لِلَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ۟ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ

جن کو علم ملا ہے کیا کہا تھا اس شخص نے ابھی ، یہ وہی ہیں جن کے دلوں پر مہر لگادی ہے

عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا أَهْوَآءَهُمْ ﴿١٦﴾ وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ

اللہ نے اور چلتے ہیں اپنی خواہشوں پر اور جو لوگ راہ پر آئے ہیں ان کو اور بڑھ گئی

هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ﴿١٧﴾ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ إِلَّا السَّاعَةَ أَنْ تَأْتِيَهُمْ

اس سے سوجھ اور ان کو اس سے ملا بچکر چلنا اب یہی انتظار کرتے ہیں قیامت کا کہ آ کھڑی ہو اُن پر

بَغْتَةً ۚ فَقَدْ جَآءَ أَشْرَاطُهَا ۚ فَأَنّٰى لَهُمْ إِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ ﴿١٨﴾

اچانک سو آ چکی ہیں اس کی نشانیاں پھر کہاں نصیب ہوگا ان کو جب وہ آ پہنچے اُن پر سمجھ پکڑنا

خُلاصۂ تفسیر

اور (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) بعض آدمی ایسے ہیں (مراد منافقین ہیں) کہ وہ (آپکی تبلیغ و تعلیم کے وقت ظاہر میں تو) آپ کیطرف کان لگاتے ہیں (لیکن دل سے بالکل متوجہ نہیں ہوتے) یہانتک کہ جب وہ لوگ آپکے پاس سے (اُٹھ کر مجلس سے) باہر جاتے ہیں تو دوسرے اہلِ علم (صحابہ) سے کہتے ہیں کہ حضرت نے ابھی (جب ہم مجلس میں تھے) کیا بات فرمائی تھی (اُن کا یہ کہنا بھی ایک قسم کا استہزا ہی تھا کہ اس سے یہ جتلانا تھا کہ ہم آپ کی گفتگو کو قابلِ التفات نہیں سمجھتے ، یہ بھی ایک شعبہ نفاق ہی کا تھا) یہ وہ لوگ ہیں کہ حق تعالیٰ نے اُن کے دلوں پر مہر کر دی ہے (ہدایت سے دُور ہو گئے)

اور اپنی نفسانی خواہشوں پر چلتے ہیں اور (انہی کی قوم میں سے) جو لوگ راہ پر ہیں (یعنی مسلمان ہو چکے ہیں) اللہ تعالیٰ ان کو (احکام سننے کے وقت) اور زیادہ ہدایت دیتا ہے (کہ وہ ان احکام جدیدہ پر بھی ایمان لاتے ہیں یعنی ان کی ایمانیات کی تعداد بڑھ گئی یا یہ کہ ان کے ایمان کو اور زیادہ قوی اور پختہ کر دیتے ہیں جو عمل صالح کا خاصہ ہے کہ اس سے ایمان میں مزید پختگی پیدا ہوتی ہے) اور ان کو ان کے تقویٰ کی توفیق دیدیتا ہے (آگے ان منافقین کے لئے وعید ہے کہ یہ جو قرآن اور احکام الٰہیہ سن کر بھی متاثر نہیں ہوتے) سو (معلوم ہوتا ہے کہ) یہ لوگ بس قیامت کے منتظر ہیں کہ وہ اُن پر دفعۃً آپڑے (یہ بطور زجر و توبیخ کے فرمایا کہ اب بھی متاثر نہیں ہوتے تو کیا قیامت میں تذکّر اور ہدایت حاصل کریں گے) سو (یاد رکھو کہ قیامت بھی نزدیک ہے چنانچہ) اسکی (متعدد) علامتیں تو آچکی ہیں (چنانچہ از روئے حدیث خود خاتم النّبیین کی بعثت و نبوت بھی علاماتِ قیامت میں سے ہے اور شقِ قمر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہونے کے علاوہ قیامت کی علامات میں سے بھی ہے۔ یہ سب علامات زمانہ نزول قرآن میں موجود ہو چکی تھیں، آگے اسکا بیان ہے کہ ایمان لانے اور ہدایت پانے میں قیامت کا انتظار کرنا محض جہالت ہے کیونکہ وہ وقت سمجھنے اور عمل کرنے کا نہیں ہوگا۔ فرمایا) تو جب قیامت اُن کے سامنے آکھڑی ہوئی اُس وقت اُن کو سمجھنا کہاں میسّر ہوگا (یعنی مفید نہیں ہوگا)

معارف و مسائل

اشراط، کے معنے علامات کے ہیں اور علاماتِ قیامت کی ابتدا رخود خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ہو جاتی ہے کیونکہ ختم نبوّت بھی قربِ قیامت کی علامت ہے۔ اسی طرح شقِّ قمر کے معجزہ کو بھی قرآن میں اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃُ کیساتھ فرماکر اس طرف اشارہ کر دیا کہ یہ بھی علاماتِ قیامت میں سے ہے۔ یہ تو علامات ابتدائیہ ہیں جو خود نزولِ قرآن کے وقت میں ظاہر ہو چکی تھیں دوسری علامات قریبہ احادیث صحیحہ میں ثابت ہیں ان میں سے ایک حدیث حضرت انسؓ سے منقول ہے کہ میں نے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ علاماتِ قیامت یہ ہیں۔

علم[۱] اُٹھ جائیگا، جہل[۲] بڑھ جائیگا، زنا[۳] کی کثرت ہوگی، شراب[۴] خوری کی کثرت ہوگی، مرد[۵] کم رہ جائیں گے، عورتیں[۶] بڑھ جائیں گی، یہانتک کہ پچاس عورتوں کا متکفل ایک مرد ہوگا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ علم گھٹ جائے گا اور جہل پھیل جائے گا (بخاری و مسلم)

اور حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب[۱] مالِ غنیمت کو شخصی دولت سمجھ لیا جائے اور[۲] امانت کو مالِ غنیمت قرار دے لیا جائے (کہ حلال

سمجھ کر کھا جائیں) اور زکوٰۃ کو تاوان سمجھا جائے (یعنی اسکی ادائیگی میں دل میں تنگی محسوس ہو) اور علم دین اغراضِ دُنیوی کے لئے حاصل کیا جانے لگے، اور مرد اپنی بیوی کی اطاعت اور ماں کی نافرمانی کرنے لگے، اور دوست کو اپنے قریب کرے اور باپ کو دُور کردے، اور مساجد میں شور و شغب ہونے لگے۔ اور قوم کا سردار اُن سب میں کا فاسق بدکردار آدمی ہو جائے، اور قوم کا نمائندہ ان سب میں کا رذیل ہو جائے، اور شریر آدمی کا اکرام صرف اس لئے کرنا پڑے کہ اسکا اکرام نہ کریں گے تو یہ ستائیگا اور گانے والی عورتوں کا گانا عام ہو جائے، اور مزامیر باجے گاجے پھیل جائیں اور شرابیں پی جانے لگیں، اور اس اُمت کے آخری لوگ اپنے اسلاف پر لعنت کرنے لگیں تو اسوقت تم لوگ انتظار کرو ایک سرخ آندھی کا اور زلزلہ کا اور لوگوں کے زمین میں دھنس جانے کا اور صورتیں مسخ ہو جانے کا اور آسمان سے پتھر برسنے کا اور دوسری علامات قیامت کا جو یکے بعد دیگرے اس طرح آئیں گی جیسے موتیوں کی لڑی کو کاٹ دیا جائے اور موتی ایک ایک کرکے نیچے آگرتے ہیں۔

فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ

سو تو جان لے کہ کسی کی بندگی نہیں سوائے اللہ کے اور معافی مانگ اپنے گناہ کے واسطے اور ایماندار مردوں

وَالْمُؤْمِنٰتِ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ ﴿۱۹﴾ ع

اور عورتوں کے لئے اور اللہ کو معلوم ہے بازگشت تمہاری اور گھر تمہارا

۲۶۸

خلاصۂ تفسیر

(جب آپ خدا تعالےٰ کے مطیع و فرمانبردار بندوں اور سرکشوں دونوں کا حال و مآل سُن چکے) تو آپ اسکا (اکمل طریقہ پر) یقین رکھئے کہ بجز اللہ کے اور کوئی قابل عبادت نہیں (اسمیں دین کے تمام اُصول و فروع آگئے، کیونکہ علم سے مراد علم کامل اکمل ہے اور علم کامل کے لئے لازم ہے کہ تمام احکامِ الٰہیہ پر پُورا عمل ہو۔ حاصل یہ ہے کہ تمام احکامِ الٰہیہ پر مداومت رکھو) اور (اگر کبھی کوئی خطا سرزد ہو جائے جو آپ کی عصمتِ نبوت کی بنا پر درحقیقت گناہ نہیں بلکہ صرف ترکِ افضل ہی ہوگا مگر آپ کی شانِ ارفع کے اعتبار سے صورۃً خطا ہے اس لئے) آپ اپنی (اُس ظاہری) خطا کی معافی مانگتے رہیئے اور سب مسلمان مردوں اور سب مسلمان عورتوں کے لئے بھی (بخشش کی دُعا مانگتے رہیئے) اور (یہ بھی یاد رہے کہ) اللہ تعالیٰ تمہارے چلنے پھرنے اور رہنے سہنے کی (یعنی سب اعمال و احوال کی) خبر رکھتا ہے۔

معارف و مسائل

اس آیت میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آپ سمجھ لیجئے کہ اللہ کے سوا اور کوئی قابلِ عبادت نہیں، اور ظاہر ہے کہ یہ علم تو ہر مؤمن مسلمان کو بھی حاصل ہے سید الانبیاء کو کیوں حاصل نہ ہوتا پھر اس علم کے حاصل کرنے کا حکم دینا یا تو اس پر ثابت قدم رہنے کے معنی میں ہے اور یا اسکے مقتضیات پر عمل کرنا مراد ہے جیسا کہ قرطبی نے نقل کیا ہے کہ سفیان بن عُیَینہؒ سے کسی نے علم کی فضیلت کا سوال کیا تو انھوں نے فرمایا کیا تمنے قرآن کا ارشاد نہیں سُنا، فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ، کہ اسمیں علم کے بعد عمل کا حکم دیا ہے اسی طرح دوسری جگہ فرمایا اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ اور پھر فرمایا سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ اسی طرح انفال میں فرمایا وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ اور تغابن میں فرمایا فَاحْذَرُوْهُمْ، ان سب مقامات میں اوّل علم پھر اُس کے مقتضا پر عمل کی تلقین فرمائی گئی ہے یہاں آیتِ مذکورہ میں بھی اگرچہ یہ علم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو پہلے سے حاصل تھا مگر مقصود اس سے اس کے مقتضیٰ پر عمل ہے اسی لئے اسکے بعد وَاسْتَغْفِرْ کا حکم دیا گیا، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بوجہ عصمتِ نبوّت کے اسکے خلاف کرنیکا اگرچہ احتمال نہیں تھا مگر انبیا علیہم السلام سے معصوم ہونے کے باوجود بعض اوقات اجتہاد میں خطا ہو جاتی ہے اور اجتہادی خطا قانون شرع میں گناہ نہیں بلکہ اُس پر بھی اجر ملتا ہے مگر انبیاء علیہم السّلام کو اس خطا پر متنبہ ضرور کر دیا جاتا ہے اور ان کی شانِ عالی کے اعتبار سے اس کو لفظ ذنب سے بھی تعبیر کر دیا جاتا ہے جیسا کہ سورۂ عبس میں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایک قسم کا عتاب نازل ہوا وہ بھی اسی خطاءِ اجتہادی کی ایک مثال تھی جس کی تفصیل سورۂ عبس میں آئے گی کہ وہ اجتہادی خطا اگرچہ کوئی گناہ نہ تھا بلکہ ایک اجر اسپر بھی ملنے کا وعدہ تھا مگر آپ کی شانِ عالی کے لئے اس کو پسند نہیں کیا گیا اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا۔ آیتِ مذکورہ میں اسی طرح کا ذنب مراد ہوسکتا ہے۔

فائدہ حضرت صدیق اکبرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور استغفار کی کثرت کیا کرو کیونکہ ابلیس کہتا ہے کہ میں نے لوگوں کو گناہوں میں مبتلا کر کے ہلاک کیا تو اُنھوں نے مجھے کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کہہ کر ہلاک کر دیا، جب میں نے یہ دیکھا تو میں نے ان کو ایسے خیالات باطلہ کے پیچھے لگا دیا جن کو وہ نیکی سمجھ کر کرتے ہیں جیسے عام بدعات کا یہی حال ہے۔ اس سے اُن کو توبہ کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔

مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ، متقلّب کے لفظی معنی لوٹ پوٹ ہونے یا اُلٹ پلٹ ہونے

کے اور مثویٰ کے معنی جائے قرار کے ہیں، اس کی مراد میں مختلف احتمالات ہو سکتے ہیں اسی لئے حضرات مفسرین نے مختلف معنی بیان کئے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ وہ سب ہی مراد ہیں کیونکہ ہر انسان پر دو قسم کے حالات آتے ہیں، ایک وہ جن میں عارضی اور وقتی طور پر اشتغال ہوتا ہے دوسرے وہ جن کو وہ مستقل اپنا مشغلہ سمجھتا ہے، اسی طرح بعض مکانات میں انسان کا قیام عارضی ہوتا ہے بعض میں مستقل، تو آیت میں عارضی کو متقلب کے لفظ سے اور مستقل کو مثویٰ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اس طرح تمام احوال کا اللہ تعالیٰ کے علم میں ہونا اس آیت کا مفہوم ہے

وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُورَةٌ ۖ فَإِذَا أُنْزِلَتْ سُورَةٌ
اور کہتے ہیں ایمان والے کیوں نہ اُتری ایک سورت پھر جب اُتری ایک سورت

مُحْكَمَةٌ وَذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ ۙ رَأَيْتَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ
جانچی ہوئی اور ذکر ہوا اسمیں لڑائی کا تو تُو دیکھتا ہے اُن کو جن کے دل میں روگ ہے

يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۖ فَأَوْلَىٰ لَهُمْ ﴿٢٠﴾
تکتے ہیں تیری طرف جیسے تکتا ہے کوئی بیہوش پڑا ہوا مرنے کے وقت سو خرابی ہے اُن کی

طَاعَةٌ وَقَوْلٌ مَعْرُوفٌ ۚ فَإِذَا عَزَمَ الْأَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللَّهَ
حکم ماننا ہے اور بھلی بات کہنا پھر جب تاکید ہو کام کی تو اگر سچے رہیں اللہ سے

لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ ﴿٢١﴾ فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي
تو اُن کا بھلا ہے پھر تم سے یہ بھی توقع ہے کہ اگر تم کو حکومت ملجائے تو خرابی ڈالو

الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ ﴿٢٢﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ
ملک میں اور قطع کرو اپنی قرابتیں ایسے لوگ ہیں جن پر لعنت کی اللہ نے پھر کر دیا انکو بہرا

وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ ﴿٢٣﴾ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ
اور اندھی کر دیں ان کی آنکھیں کیا دھیان نہیں کرتے قرآن میں یا دلوں پر لگ رہے ہیں

أَقْفَالُهَا ﴿٢٤﴾ إِنَّ الَّذِينَ ارْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ
انکے قفل بیشک جو لوگ اُلٹے پھر گئے اپنی پیٹھ پر بعد اسکے کہ ظاہر ہو چکی

لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطَانُ سَوَّلَ لَهُمْ وَأَمْلَىٰ لَهُمْ ﴿٢٥﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ
اُن پر سیدھی راہ شیطان نے بات بنائی انکے دل میں اور دیر کے وعدے کئے یہ اسواسطے کہ انھوں

قَالُوا لِلَّذِينَ كَرِهُوا مَا نَزَّلَ اللَّهُ سَنُطِيعُكُمْ فِي بَعْضِ الْأَمْرِ ۖ وَاللَّهُ
نے کہا اُن لوگوں سے جو بیزار ہیں اللہ کی اُتاری کتاب سے ہم تمھاری بات بھی مانیں گے بعضے کاموں میں اور اللہ

يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ﴿٢٦﴾ فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ
جانتا ہے اُن کا مشورہ کرنا پھر کیسا ہوگا حال جبکہ فرشتے جان نکالیں گے اُن کی مارتے جاتے ہوں

وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ﴿٢٧﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ
انکے منہ پر اور پیٹھ پر یہ اس لئے کہ وہ چلے اس راہ جس سے اللہ بیزار ہے

وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴿٢٨﴾ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيْ
اور ناپسند کی اسکی خوشی پھر اُسنے اکارت کردیئے انکے کئے کام کیا خیال رکھتے ہیں وہ لوگ جن کے

قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ ﴿٢٩﴾ وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ
دلوں میں روگ ہے کہ اللہ ظاہر نہ کردیگا اُن کے کینے اور اگر ہم چاہیں تجھ کو دکھلادیں

فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۭ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ﴿٣٠﴾
وہ لوگ، سو تو پہچان تو چکا ہے انکو انکے چہرے سے اور آگے پہچان لیگا بات کے ڈھب سے اور اللہ کو معلوم ہیں تمہارے سب کام

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۙ وَنَبْلُوَا اَخْبَارَكُمْ ﴿٣١﴾
اور البتہ ہم تم کو جانچیں گے تا معلوم کرلیں جو تم میں لڑائی کرنیوالے ہیں اور قائم رہنے والے اور تحقیق کرلیں تمہاری خبریں

خلاصۂ تفسیر

اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ (تو ہمیشہ اس بات کے مشتاق رہتے ہیں کہ کلام الٰہی اور نازل ہو تاکہ ایمان تازہ ہو اور احکام جدید آویں تو اُن کا ثواب بھی حاصل کریں اور اگر احکام سابقہ کی تاکید ہو تو اور زیادہ ثبات حاصل ہو اور اس اشتیاق میں) کہتے رہتے ہیں کہ کوئی (نئی) سورت کیوں نہ نازل ہوئی (اگر نازل ہو تو تمنا پوری ہو) سو جس وقت کوئی صاف صاف (مضمون کی) سورت نازل ہوتی ہے اور (اتفاق سے) اُس میں جہاد کا بھی (صاف صاف) ذکر ہوتا ہے تو جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کی) بیماری ہے آپ ان لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ آپ کی طرف اس طرح (بھیانک نگاہوں سے) دیکھتے ہیں جیسے کسی پر موت کی بیہوشی طاری ہو (اس طرح دیکھنے کا سبب خوف اور بزدلی ہے کہ اب اپنے دعوائے ایمان کو نبھانے کے لئے جہاد میں جانا پڑا اور مصیبت آئی اور وہ جو اس طرح خدا کے حکم سے جی چراتے ہیں) سو (اصل یہ ہی کہ) عنقریب اُن کی کم بختی آنیوالی ہے (خواہ دنیا میں بھی کسی وبال میں گرفتار ہوں ورنہ بعد موت کے تو ضروری ہی ہے اور گو فرصت میں یہ بہت باتیں اطاعت اور خوشامد کی بنایا کرتے ہیں لیکن) ان کی اطاعت اور بات چیت (کی حقیقت) معلوم ہے (جس کا اب نزول حکم قتال کے وقت ان کی حالت سے سب ہی پر ظہور ہوگیا) پھر (بعد نزول حکم جہاد کے) جب سارا کام (اور

سامان لڑائی کا) تیار ہی ہو جاتا ہے تو (اُسوقت بھی) اگر یہ لوگ (دعوی ایمان باللہ میں) اللہ سے سچے رہتے (یعنی دعوی ایمان کے مقتضا پر عمل کرتے جس میں تمام احکام شرعیہ عموماً اور حکم جہاد خصوصاً شامل ہے اور صدق دل سے جہاد کرتے) تو اُن کے لئے بہت ہی بہتر ہوتا (یعنی ابتداءً میں اگر منافق تھے تو اخیر ہی میں نفاق سے تائب ہو جاتے تب بھی ایمان مقبول ہو جاتا اور انتہار کو اس میں منحصر نہ سمجھا جاوے کیونکہ وقت موت تک صدق دل سے توبہ مقبول ہے، آگے جہاد کی تاکید اور اُس سے پیچھے رہنے والوں کو خطاب کر کے ترکِ جہاد پر بیان فرماتے ہیں کہ تم لوگ جو جہاد سے کراہت کرتے ہو) سو (اس میں ایک دُنیوی مضرت بھی ہے چنانچہ) اگر تم (اور اسی طرح سب جہاد سے) کنارہ کش رہو تو آیا تم کو یہ احتمال بھی ہے (یعنی ہونا چاہیئے) کہ تم (یعنی تمام آدمی) دُنیا میں فساد مچا دو اور آپس میں قطع قرابت کر دو (یعنی جہاد سے بڑا فائدہ اقامت عدل و اصلاح و امن کا ہے اگر اس کو چھوڑ دیا جاوے تو مفسدین کا غلبہ ہو جاوے اور کوئی انتظام جسمیں تمام لوگوں کے مصالح کی حفاظت ہو نہ رہے اور ایسے انتظام نہ ہونے کے لئے فساد عام اور اضاعۃ حقوق لازم ہے پس جس جہاد میں دُنیوی منفعت بھی ہو اُس سے پیچھے ہٹنا اور بھی عجیب ہے، آگے ان منافقین مذکورین کی تقبیح ہے کہ) یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے اپنی رحمت سے دُور کر دیا (اس لئے اسکے احکام پر عمل کی توفیق نہ رہی) پھر (رحمت سے بعید کرنے پر یہ امر مرتب ہوا کہ) اُن کو (بگوش قبول احکام الٰہیہ سُننے سے) بہرا کر دیا اور (راہِ حق کے دیکھنے سے) اُنکی (باطنی) آنکھوں کو اندھا کر دیا (آگے ان پر توبیخ ہے کہ باوجودیکہ قرآن میں جہاد اور دیگر احکام کا وجوب مع دلائل حقانیت قرآن کے اور ان احکام کے مصالح و منافع اخرویہ لازماً اور دنیویہ بھی احیاناً اور ان احکام کی مخالفت پر وعیدیں مذکور ہیں پھر جو یہ لوگ اُس طرف التفات نہیں کرتے) تو کیا یہ لوگ قرآن (کے اعجاز اور مضامین) میں غور نہیں کرتے (اس لئے ان کو انکشاف نہیں ہوتا) یا (غور کرتے ہیں مگر) دلوں پر (غیبی) قفل لگ رہے ہیں (یہ منع الخلو ہے، یعنی ان دونوں میں سے ایک بات کا ہونا ضروری ہے اور دونوں جمع ہوں یہ بھی ہو سکتا ہے، اور واقع میں یہاں دونوں باتیں مجتمع ہیں، اوّل اُنکی طرف سے ایک فعل ہوا یعنی انکار کیوجہ سے قرآن میں غور نہ کرنا پھر اسکے وبال میں قفل لگ گیا جسکو طبع اور ختم (یعنی مہر لگا دینا) بھی کہا گیا ہے اور دلیل اس ترتیب کی یہ آیت ہے ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اور اس مجموعہ پر فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ مرتب ہے، آگے اس عدم تدبر کی وجہ فرماتے ہیں کہ) جو لوگ (حق سے) پشت پھیر کر ہٹ گئے بعد اس کے سیدھا راستہ اُن کو (دلائل عقلیہ مثل اعجاز قرآن اور دلائل نقلیہ مثل پیشین گوئی کتب سابقہ سے) صاف معلوم ہو گیا شیطان نے ان کو چقمہ دیا ہے اور اُن کو دُور دُور کی سوجھائی ہے (کہ ایمان لانیسے فلاں فلاں مصلحتیں

موجودہ یا جو آئندہ متوقع ہیں فوت ہو جاویں گی، حاصل یہ ہوا کہ اس عدم تدبّر کی وجہ عناد ہے کہ ہدایت کے واضح ثبوت کے بعد پھر یہ اُلٹے پاؤں لوٹے جارہے ہیں اور اس عناد کے بعد تسویل شیطانی ہوئی، یعنی شیطان نے ان کی نظروں میں اس غلط اور مہلک عمل کو مزین کر کے دکھلایا اور اس تسویل سے عدم تدبّر ہوا اور عدم تدبّر سے ختم اور طبع یعنی دلوں پر مہر ہوئی پھر) یہ (ہدایت سامنے آجانے کے باوجود اس سے لوٹنا اور دُور ہونا) اس سبب سے ہوا کہ ان لوگوں نے ایسے لوگوں سے جو کہ خدا کے اُتارے ہوئے احکام کو (حسداً) ناپسند کرتے ہیں (مراد اس سے رؤسائے یہود ہیں، جو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے حسد کرتے تھے اور باوجود معرفت حق کے اتباع سے عار کرتے تھے، حاصل یہ کہ ان منافقین نے رؤسائے یہود سے) یہ کہا بعضی باتوں میں ہم تمھارا کہنا مان لیں گے (یعنی تم جو ہمکو اتباع محمد صلے اللہ علیہ وسلم سے منع کرتے ہو اسکے دو جزء ہیں ایک عدم اتباع ظاہراً دوسرا عدم اتباع باطناً سو جزو اوّل میں تو ہم بمصلحت تمھارا کہنا نہیں مان سکتے لیکن جزو ثانی میں مان لیں گے کیونکہ عقائد میں ہم تمھارے ساتھ ہیں، کما قال اِنَّا مَعَكُمْ، مطلب یہ ہوا کہ حق سے پھرنے کا سبب قومی تعصّب اور کورانہ تقلید ہے، غرض ابتدار سلسلہ کی اس سے ہے اور انتہا ختم وطبع پر) اور (گو اس قسم کی باتیں یہ منافقین خفیہ کرتے ہیں مگر) اللہ تعالیٰ ان کی خفیہ باتیں کرنے کو (خوب) جانتا ہے (اور بعض اُمور پر وحی سے آپ کو مطلع کردیتا ہے، آگے وعید ہے جو کہ اولیٰ لہم کی تفسیر کے طور پر ہوسکتی ہے یعنی یہ جو ایسی حرکتیں کر رہے ہیں) سو ان کا کیا حال ہوگا جبکہ فرشتے ان کی جان قبض کرتے ہونگے اور ان کے مونہوں پر اور پشتوں پر مارتے جاتے ہونگے (اور) یہ (سزا) اس سبب سے (ہوگی) کہ جو طریقہ خدا کی ناراضی کا موجب تھا یہ اُسی پر چلے اور اس کی رضا (یعنی اعمال موجبہ رضا) سے نفرت کیا کئے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُن کے سب اعمال (نیک ابتدا ہی سے) کالعدم کر دیئے (پس اس سزا کے مستحق ہوگئے اور کسی کے پاس کوئی عمل مقبول ہو تو اُس کی برکت سے عقوبت میں کچھ تو کمی ہو جاتی ہے آگے وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ کے مضمون کی شرح کے طور پر ہے کہ) جن لوگوں کے دلوں میں مرض (نفاق) ہے (اور وہ اُس کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں) کیا یہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کبھی ان کی دلی عداوتوں کو ظاہر نہ کریگا (یعنی یہ ان کو کیسے اطمینان ہوگیا جبکہ حق تعالیٰ کا عالم الغیب ہونا ثابت اور مسلّم ہے) اور ہم (تو) اگر چاہتے تو آپ کو انکا پورا پتہ بتلادیتے سو آپ اُن کو اُنکے حلیہ سے پہچان لیتے (پورے پتہ کا مطلب یہی ہے کہ ہر ایک کا پورا حلیہ بتادیتے) اور (گو بمصلحت ہم نے اس طرح نہیں بتلایا لیکن) آپ اُن کو طرزِ کلام سے (اب بھی) ضرور پہچان لیں گے (کیونکہ اُن کا کلام صدق پر مبنی نہیں اور آپکو نورِ فراست سے اللہ تعالیٰ نے صدق وکذب کی پہچان دی تھی کہ صدق کا اثر قلب پر اور ہوتا تھا اور کذب

کا اور جیسا کہ حدیث میں ہے کہ صدق اطمینان بخش ہوتا ہے اور جھوٹ دل میں شک پیدا کرتا ہی) اور (آگے مومنین و منافقین سب کو خطاب ہیں جمع کر کے بطور ترغیب و ترہیب کے فرماتے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ تم سب کے اعمال کو جانتا ہے (پس مسلمانوں کو ان کے اخلاص پر جزا اور منافقین کو ان کے نفاق اور دھوکہ پر سزا دیگا) اور (آگے احکام شاقہ مثل جہاد وغیرہ کی ایک حکیمانہ حکمت ارشاد ہے جیسا اوپر فَهَلْ عَسَيْتُمْ الخ میں ایک حکیمانہ **حکمت ارشاد** فرمائی تھی یعنی) ہم (ایسے اُمور شاقہ کا حکم دے کر) ضرور تمھاری سب کی آزمائش کریں گے تاکہ ہم (ظاہری طور پر بھی) ان لوگوں کو معلوم (اور ممیز) کریں جو تم میں جہاد کرنے والے ہیں اور جو (جہاد میں ثابت قدم رہنے والے ہیں، اور تاکہ تمھاری حالتوں کی جانچ کرلیں (یہ اسلئے بڑھا دیا کہ علاوہ حکم جہاد کے اور احکام بھی داخل ہو جاویں اور علاوہ حالت مجاہدہ و صبر کے دوسرے حالات بھی داخل ہو جاویں)

معارف و مسائل

سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ، محکمہ کے لفظی معنی مضبوط و مستحکم کے ہیں اس لغوی معنی کے اعتبار سے تو قرآن کی ہر سورت محکمہ ہے لیکن اصطلاحِ شرع میں محکم بمقابلہ منسوخ استعمال ہوتا ہے، یہاں سورۃ کے ساتھ محکمہ کی قید کا اضافہ اسلئے ہے کہ عمل کا شوق تو جبھی پورا ہو سکتا ہی جبکہ وہ سورت منسوخ نہ ہو۔ اور قتادہ رح نے فرمایا کہ جتنی سُورتوں میں قتال و جہاد کے احکام آئے ہیں وہ سب محکمہ ہیں۔ یہاں چونکہ اصل مقصود حکم جہاد اور اُس پر عمل ہے اسلئے سورت کیساتھ محکمہ کا لفظ بڑھا کر ذکر جہاد کی طرف اشارہ کر دیا جس کی آگے تصریح آرہی ہے۔ (قرطبی)

اَوْلٰى لَهُمْ کے معنی اصمعی کے قول کے مطابق یہ ہیں قَارَبَهٗ مَا يُهْلِكُهٗ یعنی اسکی ہلاکت کے اسباب قریب آچکے ہیں (قرطبی)

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ

لفظ تولّی کے لغت کے اعتبار سے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک اعراض دوسرے کسی قوم و جماعت پر اقتدار حکومت۔ اس آیت میں بعض حضرات مفسرین نے پہلے معنی لئے ہیں جسکو اوپر خلاصہ تفسیر میں لکھا گیا ہے۔ ابو حیان نے بحر محیط میں اسی کو ترجیح دی ہے اس معنے کے اعتبار سے مطلب آیت کا یہ ہے کہ اگر تم نے احکام شرعیہ الٰہیہ سے روگردانی کی جن میں حکم جہاد بھی شامل ہے تو اسکا اثر یہ ہوگا کہ تم جاہلیت کے قدیم طریقوں پر پڑ جاؤ گے جسکا لازمی نتیجہ زمین میں فساد اور قطع ارحام ہے جیسا کہ جاہلیت کے ہر کام میں اسکا مشاہدہ ہوتا تھا کہ ایک قبیلہ

دوسرے قبیلہ پر چڑھائی اور قتل و غارت کرتا تھا، اپنی اولاد کو خود اپنے ہاتھوں زندہ درگور کردیتے تھے۔ اسلام نے ان تمام رسوم جاہلیت کو مٹایا اور اسکے مٹانے کے لئے حکم جہاد جاری فرمایا جو اگرچہ ظاہر میں خونریزی ہے مگر درحقیقت اسکا حاصل سڑے ہوئے عضو کو جسم سے الگ کر دینا ہے تاکہ باقی جسم سالم رہے، جہاد کے ذریعہ عدل و انصاف اور قرابتوں اور رشتوں کا احترام قائم ہوتا ہے۔ اور روح المعانی قرطبی وغیرہ میں اس جگہ تولّی کے معنے حکومت و امارت کے لئے ہیں تو مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ تمھارے حالات جسکا ذکر اوپر آچکا ہے اُن کا تقاضا یہ ہے کہ اگر تمھاری مراد پُوری ہو، یعنی اسی حالت میں تمھیں ملک و قوم کی ولایت اور اقتدار حاصل ہو جائے تو نتیجہ اسکے سوا نہیں ہوگا کہ تم زمین میں فساد پھیلاؤ گے اور رشتوں قرابتوں کو توڑ ڈالو گے۔

صلہ رحمی کی سخت تاکید اور لفظ ارحام رحم کی جمع ہے جو ماں کے پیٹ میں انسان کی تخلیق کا مقام ہے۔ چونکہ عام رشتوں قرابتوں کی بنیاد وہیں سے چلتی ہے اسلئے محاورات میں رحم بمعنی قرابت اور رشتہ کے استعمال کیا جاتا ہے تفسیر روح المعانی میں اس جگہ اسپر تفصیلی بحث کی ہے کہ ذوی الارحام اور ارحام کا لفظ کن کن قرابتوں پر حاوی ہے۔ اسلام نے رشتہ داری اور قرابت کے حقوق پورے کرنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ اور دوسرے دو اصحاب سے اس مضمون کی حدیث نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو شخص صلہ رحمی کریگا اللہ تعالیٰ اس کو اپنے قریب کرینگے اور جو رشتہ قرابت قطع کریگا اللہ تعالیٰ اسکو قطع کر دینگے جس سے معلوم ہوا کہ اقرباء اور رشتہ داروں کے ساتھ اقوال و افعال اور مال کے خرچ کرنے میں احسان کا سلوک کرنے کا تاکیدی حکم ہے حدیث مذکور میں حضرت ابوہریرہؓ نے اس آیتِ قرآن کا حوالہ بھی دیا کہ اگر چاہو تو یہ آیت پڑھ لو۔ اور ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ کوئی ایسا گناہ جس کی سزا اللہ تعالیٰ دُنیا میں بھی دیتا ہے اور آخرت میں اسکے علاوہ، ظلم اور قطع رحمی کے برابر نہیں (رواہ ابوداؤد والترمذی، ابن کثیر) اور حضرت ثوبانؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص چاہتا ہو کہ اس کی عمر زیادہ ہو اور رزق میں برکت ہو اسکو چاہئیے کہ صلہ رحمی کرے یعنی رشتہ داروں کے ساتھ احسان کا معاملہ کرے۔ احادیث صحیحہ میں یہ بھی ہے کہ قرابت کے حق کے معاملہ میں دوسری طرف سے برابری کا خیال نہ کرنا چاہئیے اگر دوسرا بھائی قطع تعلق اور ناروا سلوک بھی کرتا ہے جب بھی تمھیں حسنِ سلوک کا معاملہ کرنا چاہئیے۔ صحیح بخاری میں ہے لیس الواصل بالمکافی ولکن الواصل الذی اذا قطعت رحمہ وصلھا۔ یعنی وہ شخص صلہ رحمی کرنے والا نہیں جو صرف برابر کا بدلہ دے بلکہ صلہ رحمی کرنیوالا وہ ہے کہ

جب دوسری طرف سے قطع تعلق کا معاملہ کیا جائے تو یہ ملانے اور جوڑنے کا کام کرے (ابن کثیر)

اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ، یعنی ایسے آدمی جو زمین میں فساد پھیلائیں اور رشتوں قرابتوں کو قطع کریں اُن پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے یعنی ان کو اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے حضرت فاروق اعظمؓ نے اسی آیت سے ام الولد کی بیع کو حرام قرار دیا، یعنی وہ مملوکہ کنیز جس سے کوئی اولاد پیدا ہو چکی ہو اس کو فروخت کرنا اس اولاد سے قطع رحمی کا ذریعہ ہے جو موجب لعنت ہے، اسلئے امّ ولد کی فروخت کو حرام قرار دیا (رواہ الحاکم وصححہ وابن المنذر عن بریدہ)

کسی معین شخص پر لعنت کا حکم اور لعن یزید کی بحث

اور حضرت امام احمد کے صاحبزادے عبداللہ نے اُن سے یزید پر لعنت کرنے کی اجازت کے متعلق سوال کیا تو فرمایا کہ اُس شخص پر کیوں لعنت کی جائے جس پر اللہ نے اپنی کتاب میں لعنت کی ہے۔ صاحبزادے نے عرض کیا کہ میں نے تو قرآن کو پورا پڑھا اس میں کہیں یزید پر لعنت نہیں آئی آپ نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا کہ یزید سے زیادہ کون قطع ارحام کا مرتکب ہوگا جس نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے رشتہ و قرابت کی بھی رعایت نہیں کی، مگر جمہور اُمّت کے نزدیک کسی معیّن شخص پر لعنت کرنا جائز نہیں جب تک کہ اس کا کفر پر مرنا یقینی طور پر ثابت نہ ہو۔ ہاں عام وصف کیساتھ لعنت کرنا جائز ہے جیسے لعنۃ اللہ علی الکاذبین، لعنۃ اللہ علی المفسدین ولعنۃ اللہ علی قاطع الرحم وغیرہ، روح المعانی میں اس جگہ اس مسئلہ پر مفصّل بحث کی ہے (روح صـ۷۲ ج ۲۶)

اَمْ عَلٰي قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا، دل پر قفل لگ جانے کے وہی معنی ہیں جسکو دوسری آیتوں میں ختم اور طبع یعنی مہر لگ جانے سے تعبیر کیا گیا اور مراد اس سے دل کا سخت اور ایسا بے حس ہو جانا ہے کہ اچھے کو بُرا اور بُرے کو اچھا سمجھنے لگے۔ بے پروائی کے ساتھ مسلسل گناہ میں لگا رہنا عموماً اسکا سبب ہوتا ہے نعوذ باللہ منہ،

اَلشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ۭ وَاَمْلٰى لَهُمْ، اسمیں شیطان کی طرف دو کاموں کی نسبت کی گئی۔ ایک تسویل جس کے معنی تزیین کے ہیں کہ بُری چیز یا بُرے عمل کو کسی کی نظروں میں اچھا اور مزیّن کر دے۔ دوسرا املار جس کے معنے امہال اور مہلت دینے کے ہیں مراد یہ ہے کہ شیطان نے اوّل تو انکے بُرے اعمال کو اُن کی نظروں میں اچھا اور مزیّن کر کے دکھلایا پھر ان کو ایسی طویل آرزوؤں اور اُمیدوں میں اُلجھا دیا جو پوری ہونے والی نہیں۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ، اضغان جمع ضغن کی ہے جس کے معنی مخفی عداوت اور حسد وکینہ کے ہیں۔ منافقین جو اسلام کا دعویٰ اور ظاہر میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے محبت کا اظہار اور باطن میں عداوت وکینہ رکھتے تھے

اُن کے بارے میں نازل ہوا کہ یہ لوگ اللہ رب العالمین کو عالم الغیب جانتے ہوئے اسبات سے کیوں بے فکر ہیں کہ اللہ تعالیٰ انکے باطنی راز اور مخفی عداوت کو لوگوں پر ظاہر کردیں۔ ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ برأت میں انکے ایسے اعمال وافعال اور حرکتوں کا پتہ دیدیا جن سے منافقین کے نفاق کا پتہ چل جائے اور وہ پہچانے جائیں، اسی لئے سورۂ برأت کو فاضحہ بھی کہا جاتا ہے یعنی رُسوا کرنے والی کیونکہ اسنے منافقین کی خاص خاص علامتیں ظاہر کردی ہیں۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ، یعنی اگر ہم چاہیں تو آپ کو بالتعیین منافقین کو دکھلادیں اور ان کا ایسا حلیہ بتلا دیں جس سے آپ ہر ایک منافق کو شخصی طور پر پہچان لیں قرآن نے اس مضمون کو بحرف لَوْ بیان کیا ہے جسکا استعمال ایسی شرط کے لئے ہوتا ہے جسکا وقوع نہوا ہو، اسلئے معنے آیت کے یہ ہوتے ہیں کہ اگر ہم چاہتے تو ہر منافق کو آپ کو شخصی طور پر متعین کرکے بتلا دیتے مگر ہمنے بحکمت ومصلحت اپنے حلم وبردباری سے ان کو اس طرح رُسوا کرنا پسند نہیں کیا تاکہ ضابطہ یہ قائم رہے کہ تمام اُمور کو انکے ظاہر پر محمول کیا جائے اور باطنی حالات اور قلبی مضمرات کو صرف علیم وخبیر اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا جائے، البتہ آپ کو ایسی بصیرت ہم نے دیدی ہے کہ آپ منافق کو خود انھیں کے کلام سے پہچان لیں، وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ کا یہی مفہوم ہے (ابن کثیر)

حضرت عثمان بن عفان رضؓ نے فرمایا کہ جو شخص کوئی چیز اپنے دل میں چھپاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اُس کے چہرے سے اور سبقتِ لسانی سے ظاہر کردیتے ہیں یعنی دورانِ گفتگو اس سے کچھ ایسے کلمات نکل جاتے ہیں جس سے اسکا دلی راز ظاہر ہوجائے۔ ایسی ہی ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ جو شخص اپنے دل میں کوئی بات چھپاتا ہے اللہ تعالیٰ اسکے وجود پر اُس چیز کی چادر اُڑھا دیتے ہیں۔ اگر وہ چیز کوئی اچھی بھلی ہے تو وہ ظاہر ہوکر رہتی ہے اور بُری ہے تو وہ ظاہر ہوکر رہتی ہے۔ اور بعض روایاتِ حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ منافقین کی ایک جماعت کا آپ کو شخصی طور پر بھی علم دیدیا گیا تھا جیساکہ مسند احمد میں عقبہ ابن عمرو رضؓ کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ میں خاص خاص منافقین کے نام لیکر ان کو مجلس سے اُٹھا دیا اسمیں چھتیس ۳۶ آدمیوں کے نام شمار کئے گئے ہیں (ابن کثیر)

حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ، اللہ تعالیٰ کو تو ازل سے ہر شخص کے اعمال وافعال کا علم محیط ازلی ابدی ہے۔ یہاں علم سے مراد ظہور ووقوع ہے۔ یعنی جو چیز اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے تھی اسکا وقوع وظہور ہوکر واقعاتی علم ہوجائے (ابن کثیر) واللہ اعلم

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ
جو لوگ منکر ہوئے اور روکا انھوں نے اللہ کی راہ سے اور مخالف ہوگئے رسُول سے

مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيُحْبِطُ

بعد اسکے کہ ظاہر ہو چکی اُن پر سیدھی راہ نہ بگاڑ سکیں گے اللہ کا کچھ اور وہ اکارت کر دیگا

اَعْمَالَهُمْ ﴿۳۲﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ

ان کے سب کام اے ایمان والو حکم پر چلو اللہ کے اور حکم پر چلو رسول کے

وَلَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ

اور ضائع مت کرو اپنے کئے ہوئے کام جو لوگ منکر ہوئے اور روکا لوگوں کو اللہ کی راہ

اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ﴿۳۴﴾ فَلَا تَهِنُوْا وَ

سے پھر مر گئے اور وہ منکر ہی رہے تو ہرگز نہ بخشے گا ان کو اللہ سو تم بودے نہ ہوئے جاؤ

تَدْعُوْۤا اِلَى السَّلْمِ ۖۗ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ۖۗ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ

اور لگو پکارنے صلح اور تم ہی رہو گے غالب اور اللہ تمہارے ساتھ ہے اور نقصان نہ دیگا تم کو

اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۵﴾ اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ؕ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَ

تمہارے کاموں میں یہ دُنیا کا جینا تو کھیل ہے اور تماشا اور اگر تم یقین لاؤ گے اور

تَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَلَا يَسْـَٔلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ ﴿۳۶﴾ اِنْ يَّسْـَٔلْكُمُوْهَا

بچکر چلو گے دے گا تم کو تمہارا بدلہ اور نہ مانگے گا تم سے مال تمہارے اگر مانگے تم سے وہ مال

فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَيُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ ﴿۳۷﴾ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَاۤءِ تُدْعَوْنَ

پھر تم کو تنگ کرے تو بخل کرنے لگو اور ظاہر کرکے تمہارے دل کی خفگیاں، سنتے ہو تم لوگ، تم کو بُلاتے ہیں

لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا

کہ خرچ کرو اللہ کی راہ میں پھر تم میں کوئی ایسا ہے کہ نہیں دیتا اور جو کوئی نہ دے گا سو

يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاۤءُ ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا

نہ دیگا آپ کو اور اللہ بے نیاز ہے اور تم محتاج ہو اور اگر تم پھر جاؤ گے

يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ ﴿۳۸﴾ ع

تو بدل لے گا اور لوگ تمہارے سوائے، پھر وہ نہ ہوں گے تمہاری طرح کے

ع ۴ / ۱۰ / ۸

خلاصۂ تفسیر

بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور انھوں نے (اوروں کو بھی) اللہ کے رستہ (یعنی دین حق) سے روکا اور رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت کی بعد اسکے کہ ان کو (دین کا) راستہ (دلائل عقلیہ سے مشرکین کے لئے اور نقلیہ سے بھی اہل کتاب کے لئے) نظر آچکا تھا یہ لوگ اللہ

(کے دین) کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے (بلکہ یہ دین ہر حال میں پورا ہو کر رہے گا چنانچہ ہوا) اور اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو (جو دینِ حق کے مٹانے کے لئے عمل میں لا رہے ہیں) مٹا دے گا اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور (چونکہ رسول صلے اللہ علیہ سلم اللہ ہی کا حکم تبلاتے ہیں خواہ خاص طور پر وحی الٰہی میں اسکا حکم ہوا ہو یا وحی الٰہی میں کُلّی ضابطہ بیان فرمایا گیا ہو، اور اس خاص حکم کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ سلم نے اس ضابطہ میں داخل ہونے کی بنا پر حکم دیا ہو اس لئے) رسول (صلے اللہ علیہ سلم) کی (بھی) اطاعت کرو اور (کفار کی طرح اللہ و رسول کی مخالفت کرکے) اپنے اعمال کو برباد مت کرو (اس کی تفصیل معارف و مسائل میں آئے گی) بیشک جو لوگ کافر ہوئے اور انھوں نے اللہ کے رستہ سے روکا پھر وہ کافر ہی رہ کر مر (بھی) گئے، سو خدا تعالیٰ ان کو کبھی نہ بخشے گا (عدم مغفرت کے لئے کفر کے ساتھ صدّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰہِ شرط نہیں بلکہ صرف کَفَرُوْا اِلَى الموت تک کا ہی اثر ہے لیکن زیادتِ تشنیع کے لئے یہ قید واقعی بڑھا دی کہ اسوقت کے رؤسائے کفار میں یہ امر بھی متحقق تھا، آگے مؤمنین کے مدایح اور کفار کے قبایح پر بطور تفریع کے فرماتے ہیں کہ جب معلوم ہو گیا کہ مسلمان خدا کے محبوب اور کفار مبغوض ہیں) تو (اے مسلمانو) تم (کفار کے مقابلہ میں) ہمت مت ہارو اور (ہمت ہار کر ان کو) صلح کیطرف مت بلاؤ اور تم ہی غالب رہوگے (اور وہ مغلوب ہونگے کہ تم محبوب ہو اور وہ مبغوض ہیں) اور اللہ تمھارے ساتھ ہے (یہ تو تم کو دُنیا کی کامیابی ہوئی) اور (آخرت میں یہ کامیابی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ) تمھارے اعمال (کے ثواب) میں ہرگز کمی نہ کریگا (یہ تو ہمت افزائی کرکے جہاد کی ترغیب تھی آگے دُنیا کے فانی ہونے کا ذکر کرکے جہاد کی ترغیب اور انفاق فی سبیل اللہ کی تمہید ہے کہ) یہ دنیوی زندگی تو محض ایک لہو و لعب ہے (اگر اس میں جان اور مال کو اپنے فائدہ کے لئے بچانا چاہے تو وہ فائدہ ہی کتنے دن کا ہے اور کیا اسکا حاصل) اور اگر تم ایمان اور تقوی اختیار کرو (جس میں جہاد بالنفس والمال بھی آگیا) تو (تم کو تو اپنے پاس سے نفع پہنچا دیگا اس طرح کہ) تم کو تمھارے اجر عطا کریگا اور (تم سے کسی نفع کا طالب نہ ہوگا چنانچہ) تم سے تمھارے مال (تک بھی جو کہ جان سے اہون ہے اپنے نفع کے لئے) طلب نہیں کریگا (جب تم سے ایسی چیز نہیں طلب کرتا جسکا دینا آسان ہے تو جان جسکا دینا مشکل ہے وہ تو کیوں طلب کریگا چنانچہ ظاہر ہے کہ ہمارے جان و مال کے خرچ کرنے سے اللہ تعالیٰ کا کوئی نفع نہیں اور نہ یہ ممکن ہے وَلٰہذا کقولہ تعالیٰ وَہُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ چنانچہ) اگر (امتحاناً) تم سے تمھارے مال طلب کرے پھر انتہا درجہ تک تم سے طلب کرتا رہے (یعنی سب مال طلب کرنے لگے) تو تم (یعنی تم میں سے اکثر) بخل کرنے لگو (یعنی دینا گوارا نہ کرو) اور (اسوقت) اللہ تعالیٰ

تمہاری ناگواری ظاہر کردے (یعنی نہ دینے سے کہ فعل ظاہری ہے باطنی ناگواری کھل جاوے اس لئے یہ فرد ممکن بھی واقع نہیں کی گئی اور) ہاں تم لوگ ایسے ہو کہ تم کو اللہ کی راہ میں (جس کا نفع تمہاری طرف عائد ہونا یقینی ہے تھوڑا سا حصہ مال کا) خرچ کرنے کے لئے بلایا جاتا ہے (اور بقیہ اکثر تمہارے قبضہ میں چھوڑ دیا جاتا ہے) سو (اس پر بھی) بعضے تم میں سے وہ ہیں جو بخل کرتے ہیں، اور (آگے اس فرد واقع پر بخل کی مذمت ہے کہ) جو شخص (ایسی جگہ خرچ کرنے میں) بخل کرتا ہے تو وہ (درحقیقت) خود اپنے سے بخل کرتا ہے (یعنی اپنے ہی کو اس کے نفع دائمی سے محروم رکھتا ہے) اور (نہیں تو) اللہ تو کسی کا محتاج نہیں (تاکہ احتمال اسکے ضرر کا ہو) اور (بلکہ) تم سب (اسکے) محتاج ہو (اور تمہاری اس احتیاج کی رعایت سے تم کو انفاق کا حکم کیا گیا کیونکہ آخرت میں تم کو ثواب کی حاجت ہوگی اور طریق اس کا یہی اعمال ہیں اور) اگر تم (ہمارے احکام سے) روگردانی کروگے تو خدا تعالیٰ تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کردے گا (اور) پھر وہ تم جیسے (روگردانی کرنے والے) نہ ہونگے (بلکہ نہایت فرمانبردار ہونگے، یہ کام اُن سے لیا جاویگا اور اس طرح وہ حکمت پوری ہو جاوے گی)

معارف و مسائل

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، یہ آیت بھی منافقین اور یہود بنی قریظہ و بنی نضیر کے متعلق نازل ہوئی ہے اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ اُن منافقین کے متعلق ہے جنہوں نے غزوۂ بدر کے موقع پر کفار قریش کی امداد اس طرح کی کہ انمیں سے بارہ آدمیوں نے اُنکے پورے لشکر کا کھانا اپنے ذمہ لے لیا تھا، ہر روز اُن میں سے ایک آدمی لشکر کفار کے کھانیکا انتظام کرتا تھا۔

وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ، یہاں حبطِ اعمال سے مراد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُنکی اسلام کیخلاف کوششوں کو کامیاب ہونے دے بلکہ اکارت کردے جیسا کہ خلاصۂ تفسیر میں لکھا گیا ہے اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ اُنکے کفر و نفاق کیوجہ سے انکے نیک عمل مثل صدقہ خیرات وغیرہ کے سب کارت ہوجائینگے قابلِ قبول نہونگے لَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ، قرآن کریم نے اس جگہ حبطِ اعمال کے بجائے ابطالِ اعمال کا لفظ استعمال فرمایا ہے جسکا مفہوم بہت عام ہے کیونکہ ابطال کی ایک تو وہ صورت ہے جو کفر کی وجہ سے پیش آتی ہے جس کو اوپر آیت میں حبطِ اعمال کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے کیونکہ کافر اصلی کا تو کوئی عمل بوجہ کفر کے مقبول ہی نہیں اور جو اسلام لانے کے بعد مرتد ہوگیا تو زمانہ اسلام کے اعمال اگرچہ لائقِ قبول تھے مگر اسکے کفر و ارتداد نے ان سب اعمال کو بھی اکارت کردیا۔

دوسری صورت ابطالِ اعمال کی یہ بھی ہے کہ بعض اعمالِ صالحہ کے لئے کچھ دوسرے اعمالِ

صالحہ شرط ہیں تو جس شخص نے اُس شرط کو ضائع کر دیا تو اسکا یہ عمل صالح بھی ضائع ہو گیا جو اس شرط کے ساتھ مشروط تھا۔ مثلاً ہر عمل صالح کے قبول ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ خالص اللہ کے لئے ہو، ریا وسُمعہ اسمیں نہ ہو یعنی محض لوگوں کے دکھانے یا سُنانے کے لئے یہ عمل نہ کیا ہو۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ اور دوسری جگہ فرمایا اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ تو جس شخص کے نیک اعمال ریا ونمود کے لئے ہوں وہ عمل اللہ کے نزدیک باطل ہو جائے گا۔ اسی طرح صدقات کے بارے میں خود قرآن نے تصریح فرمادی لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى یعنی اپنے صدقات کو احسان جتلا کر یا غریب کو ایذا دیکر باطل نہ کرو۔ معلوم ہوا کہ جس نے صدقہ دیکر غریب پر احسان جتلایا یا اُسے کوئی اور ایذا پہنچائی اسکا صدقہ باطل ہے۔ یہی مفہوم ہو سکتا ہے حضرت حسن بصری کے قول کا جو انھوں نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ اپنی نیکیوں کو گناہوں کے ذریعہ باطل نہ کرو، جیسا کہ ابن جریج کا قول ہے یعنی بِالرِّيَآءِ وَالسُّمْعَةِ اور مقاتل وغیرہ نے فرمایا بِالْمَنِّ، کیونکہ باتفاق اہل سنت والجماعت کفر وشرک کے علاوہ کوئی گناہ اگرچہ کبیرہ ہو ایسا نہیں جو مومن کے تمام اعمال صالحہ کو حبط اور باطل کر دے مثلاً کسی شخص نے چوری کرلی اور وہ نماز روزہ کا پابند ہے تو شرعاً اسکو یہ نہیں کہا جائیگا کہ تیری نماز اور روزہ بھی باطل ہو گئے اسکی قضا کر۔ اسلئے ابطال اعمال بالمعاصی سے مراد وہی معاصی ہونگے جن کے نہ کرنے پر عمل کی مقبولیت کا مدار ہے جیسا ریا ونمود کا نہ ہونا ہر عمل صالح کی مقبولیت کی شرط ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت حسن بصریؒ کے قول میں ابطال اعمال سے مراد اعمال صالحہ کی برکات سے محرومی ہو نفس عمل کا ضائع ہو جانا مراد نہ ہو تو یہ تمام معاصی کے لئے شرط ہے۔ جس شخص کے اعمال میں معاصی کا غلبہ ہو تو اسکے تھوڑے سے نیک اعمال میں بھی وہ برکت نہیں ہوتی کہ عذاب سے بچالے بلکہ وہ اپنے اعمال کی سزا قاعدہ کیمطابق بھگتے گا مگر بالآخر اپنے ایمان کی برکت سے سزا بھگتنے کے بعد انجام کار نجات پائے گا۔

مسئلہ - تیسری صورت ابطال عمل کی یہ بھی ہے کہ کوئی نیک عمل کر کے اسکو قصداً فاسد کر دے مثلاً نفل نماز یا روزہ شروع کرے پھر بغیر کسی عذر کے اسکو قصداً فاسد کر دے یہ بھی اس آیت کے ذریعہ ناجائز قرار پایا، امام اعظم ابوحنیفہؒ کا یہی مذہب ہے کہ جو اعمال صالحہ ابتداءً فرض یا واجب نہیں تھے مگر کسی نے ان کو شروع کر دیا تو اب انکی تکمیل اس آیت کی رو سے واجب ہو گئی تاکہ ابطال عمل کا مرتکب نہ ہو، اگر کسی نے ایسا عمل شروع کر کے بلا عذر کے چھوڑ دیا یا قصداً فاسد کر دیا تو وہ گناہگار بھی ہوا اور اسکے ذمہ قضا بھی لازم ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک نہ تو قضا لازم ہے اور نہ اسکے فاسد کرنے کا گناہگار ہو گا کیونکہ جب ابتداءً یہ عمل فرض یا واجب نہیں تھا تو بعد میں بھی فرض وواجب نہیں جس کے ترک یا افساد سے گناہ لازم آئے مگر حنفیہ کے نزدیک آیت مذکورہ کے الفاظ عام ہیں ہر عمل صالح کو شامل ہیں خواہ پہلے فرض وواجب ہو یا نفلی طور پر کرنا شروع کر دیا ہو تو شروع کرنے سے وہ نفلی

عمل بھی واجب ہو گیا، تفسیر مظہری میں اسجگہ احادیث کثیرہ سے اس بحث کو مفصل لکھا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ، انھیں الفاظ کے ساتھ ایک حکم ابھی پہلے آیا ہے، مکرر ذکر یا تو اسلئے ہے کہ پہلی آیت میں کفار کے خسارہ دنیوی کا بیان ہوا ہے اور اس آیت میں انکا اُخروی نقصان بتلانا منظور ہے جیسا کہ خلاصۂ تفسیر میں نقل کیا گیا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلی آیت میں تو عام کفار کا ذکر تھا جن میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو بعد میں مسلمان ہو گئے انکا حکم تو یہ آیا کہ جو اعمالِ صالحہ انھوں نے بحالتِ کفر کئے تھے وہ سب کارت گئے اسلام لانیکے بعد بھی ان کا ثواب نہیں ملیگا اور اس آیت میں ایسے کفار کا خاص ذکر ہے جو مرتے دم تک کفر و شرک ہی پر جمے رہے کہ انکا حکم یہ ہے کہ آخرت میں انکی ہرگز مغفرت نہیں ہوگی واللہ اعلم

فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ، اس آیت میں کفار کو صلح کی دعوت دینے کی ممانعت کی گئی ہے اور قرآن کریم میں دوسری جگہ ارشاد ہے وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا یعنی اگر کفار صلح کی طرف مائل ہوں تو آپ بھی مائل ہو جایئے جس سے صلح کی اجازت معلوم ہوتی ہے اس لئے بعض حضرات نے فرمایا کہ اجازت والی آیت اس شرط کیساتھ ہے کہ کفار کیطرف سے صلح جوئی کی ابتدا ہو اور اس آیت میں جس کو منع کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کیطرف سے صلح کی درخواست کیجائے اسلئے دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں مگر صحیح یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے ابتداءً صلح کر لینا بھی جائز ہے جبکہ مصلحت مسلمانوں کی اسمیں دیکھی جائے محض بزدلی اور عیش کوشی اسکا سبب نہو اور اس آیت نے شروع میں فَلَا تَهِنُوْا کہہ کر اسطرف اشارہ کر دیا کہ ممنوع وہ صلح ہے جسکا منشا بزدلی اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے فرار ہو اسلئے اسمیں بھی کوئی تعارض نہیں کہ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ کی آیت کے حکم کو اُس صورت کیساتھ مقید کیا جائے جس میں صلح جوئی کا سبب وہن اور سستی بزدلی نہ ہو بلکہ خود مسلمانوں کی مصلحت کا تقاضا ہو۔ واللہ اعلم

وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ، یعنی اللہ تعالیٰ تمھارے اعمال کی جزا میں کوئی کمی نہیں کریگا، اشارہ اس طرف ہے کہ دنیا میں کوئی تکلیف بھی پہنچ گئی تو اسکا اجرِ عظیم آخرت میں ملنے والا ہے اسلئے مؤمن تکلیف کی حالت میں بھی ناکام نہیں۔

اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا، چونکہ جہاد سے روکنے والی چیز انسان کے لئے دُنیا کی محبت ہی ہو سکتی ہے جس میں اپنی جان کی محبت، اہل و عیال کی محبت مال و دولت کی محبت سب داخل ہیں اس آیت میں یہ تبلا دیا گیا ہے کہ یہ سب چیزیں بہرحال ختم اور فنا ہونیوالی ہیں اسوقت انکو بچا بھی لیا تو پھر کیا، دوسرے وقت یہ چیزیں ہاتھ سے نکلیں گی اسلئے ان فانی اور ناپائیدار چیزوں کی محبت کو آخرت کی دائمی پائیدار نعمتوں کی محبت پر غالب نہ آنے دو۔

وَلَا يَسْئَلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ ، اس آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے تمہارے مال طلب نہیں کرتا مگر پورے قرآن میں زکوٰۃ و صدقات کے احکام اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنیکے بیشمار مواقع آئے ہیں اور خود اسکے بعد ہی دوسری آیت میں انفاق فی سبیل اللہ کی تاکید آرہی ہے اسلئے بظاہر ان دونوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے اسلئے بعض حضرات نے لَا يَسْئَلْكُمْ کا یہ مفہوم قرار دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اموال تم سے کسی اپنے نفع کے لئے نہیں مانگتا بلکہ تمہارے ہی فائدہ کے لئے مانگتا ہے جسکا ذکر اسی آیت میں بھی يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ کے الفاظ سے کر دیا گیا ہے کہ تمسے جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کیلئے کہا گیا وہ اس لئے ہے کہ آخرت میں جہاں تمھیں سب سے زیادہ ضرورت نیکیوں کی ہوگی اسوقت یہ خرچ کرنا تمہارے کام آئے وہاں تمھیں اسکا اجر ملے۔ مذکور الصدر خلاصۂ تفسیر میں اسی مفہوم کو اختیار کیا گیا ہے، اسکی نظیر یہ آیت مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ ہے یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم تم سے اپنے لئے کوئی رزق نہیں لیتے نہ اسکی ہمیں حاجت ہے اور بعض حضرات نے اس آیت کا مفہوم یہ قرار دیا ہے کہ لَا يَسْئَلْكُمْ سے مراد پورا مال طلب کر لینا ہے (ہو قول ابن عیینہ قرطبی) اسکا قرینہ اگلی آیت ہے جسمیں فرمایا ہے اِنْ يَّسْئَلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ کیونکہ يُحْفِ احفار سے مشتق ہے جسکے معنی مبالغہ اور کسی کام میں آخر تک پہنچ جانیکے ہیں۔ اس دوسری آیت کا مفہوم سب کے نزدیک یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمسے تمہارے اموال پورے طلب کرتا تو تم بخل کرنے لگتے اور اس حکم کی تعمیل تمھیں ناگوار ہوتی یہانتک کہ ادائیگی کے وقت تمہاری یہ ناگواری ظاہر ہو جاتی۔ خلاصہ یہ ہے کہ پہلی آیت میں لَا يَسْئَلْكُمْ سے مراد وہی ہے جو دوسری آیت میں فَيُحْفِكُمْ کی قید کیساتھ آیا ہے تو مطلب ان دونوں آیتوں کا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ مالی فرائض زکوٰۃ وغیرہ تم پر عائد کئے ہیں اول تو وہ خود تمہارے ہی فائدہ کیلئے ہیں اللہ تعالیٰ کا کوئی اپنا فائدہ نہیں، دوسرے پھر ان فرائض میں اللہ تعالےٰ نے اپنی رحمت سے تمہارے مال کا اتنا تھوڑا سا جزو فرض کیا ہے جو کسی طرح بارِ خاطر نہ ہونا چاہئیے زکوٰۃ میں چالیسواں حصّہ زمین کی پیداوار میں دسواں یا بیسواں حصّہ، سو بکریوں میں سے ایک بکری، تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے پورے اموال تو طلب نہیں کئے جنکا دینا ناگوار اور بارِ خاطر طبعاً ہوتا بلکہ اسکا قدرِ قلیل طلب فرمایا ہے اسلئے تمہارا فرض ہے کہ اسکو خوشدلی کیساتھ ادا کیا کرو۔ اور اس دوسری آیت میں جو ارشاد ہے يُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ اسمیں اضغان جمع ضِغْن کی ہے جس کے معنی مخفی کینہ اور مخفی کراہت کے ہیں اس جگہ بھی مخفی کراہت و ناگواری مراد ہے یعنی طبعی طور پر انسان کو اپنا پورا مال بخشش کر دینا ناگوار ہوتا ہے جسکو وہ ظاہر بھی نہ کرنا چاہے تو ادائیگی کے وقت ٹال مٹول وغیرہ سے یہ ناگواری کھل ہی جاتی ہے تو حاصل ارشاد کا یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ تم سے پورے اموال کا مطالبہ کر لیتا تو تم بخل کرنے لگتے اور بخل کیوجہ سے جو ناگواری اور کراہت تمہارے دلوں میں ہوتی

وہ لا محالہ ظاہر ہو جاتی۔ اسلئے اُس نے تمہارے اموال میں سے ایک حقیر اور قلیل حصّہ تم پر فرض کیا ہے تم اسمیں بھی بخل کرنے لگے اسی کا بیان آخری آیت میں اس طرح فرمایا ہے کہ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ، یعنی تم کو تمہارے اموال کا کچھ حصّہ فی سبیل اللہ خرچ کرنے کیطرف دعوت دیجاتی ہے تو تم میں سے بعض اسمیں بھی بخل کرنے لگتے ہیں اسکے بعد فرمایا کہ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ، یعنی جو شخص اسمیں بھی بخل کرتا ہے وہ کچھ اللہ کا نقصان نہیں کرتا بلکہ خود اپنی جان کا نقصان اس بخل کے ذریعہ کرتا ہے کہ آخرت کے ثواب سے محرومی اور ترکِ فرض کا وبال ہے۔ پھر اسی بات کو زیادہ وضاحت سے فرمادیا وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاۗءُ یعنی اللہ تو غنی ہے تم ہی حاجتمند ہو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا خود تمہاری حاجت کا پورا کرنا ہے وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ، اس آیت میں حق تعالیٰ کے غنی الاغنیاء ہونے کو اس طرح واضح کیا ہے کہ اللہ کو تمہارے اموال کی تو کیا خود تمہارے وجود کی بھی کوئی ضرورت نہیں، اگر تم سب کے سب ہمارے احکام کی تعمیل چھوڑ دو تو جبتک ہمیں دنیا کو اور اسمیں اسلام کو باقی رکھنا ہے ہم اپنے دینِ حق کی حفاظت اور اپنے احکام کی تعمیل کیلئے دوسری ایسی قوم پیدا کر دیں گے جو تمہاری طرح احکامِ شرعیہ سے گریز اور اعراض نہ کریگی بلکہ ہماری مکمل اطاعت کریگی۔ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ مراد اس سے عجمی لوگ ہیں، اور حضرت عکرمہؒ نے فرمایا کہ اس سے مراد فارس اور روم ہیں اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت صحابۂ کرام کے سامنے فرمائی تو صحابۂ کرام نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ وہ ایسی کونسی قوم ہے کہ اگر ہم (خدانخواستہ) احکامِ دین سے روگردانی کرنے لگیں تو وہ ہمارے بدلے میں لائی جائے گی اور پھر وہ ہماری طرح احکام سے روگردانی نہیں کریگی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان فارسیؓ (جو مجلس میں موجود تھے) کی ران پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ یہ اور اسکی قوم، اور اگر (بالفرض) دینِ حق ثریا ستارے پر بھی ہوتا (جہاں لوگوں کی رسائی مشکل ہوتی) تو فارس کے کچھ لوگ وہاں بھی پہنچکر دین کو حاصل کرتے اور اسپر عمل کرتے (رواہ الترمذی والحاکم وصححاہ وابن حبان مظہری)

شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی کتاب جو ابو حنیفہؒ کے مناقب میں لکھی ہے اسمیں فرمایا ہے کہ اس سے مراد ابو حنیفہ اور انکے اصحاب ہیں کیونکہ ابناء فارس میں کوئی جماعت علم کے اُس مرتبہ پر نہیں پہنچی جس پر ابو حنیفہ اور انکے اصحاب پہنچے ہیں (حاشیہ تفسیر مظہری)

تمّت بحمد اللہ تعالیٰ وعونہ سورۃ محمّد (صلے اللہ علیہ وسلم) للرّابع عشر من شعبان سنہ ۱۳۹۲ھ یوم السبت بعد العصر

سُورَۃُ الفَتح

سُوْرَةُ الْفَتْحِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ تِسْعٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً وَّاَرْبَعُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ فتح مدینہ میں نازل ہوئی اسکی اُنتیس آیتیں ہیں اور چار رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ﴿۱﴾ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ

ہم نے فیصلہ کردیا تیرے واسطے صریح فیصلہ تا معاف کرے تجھ کو اللہ جو آگے ہو چکے تیرے

ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۙ﴿۲﴾

گناہ اور جو پیچھے رہے، اور پورا کردے تجھ پر اپنا احسان اور چلائے تجھ کو سیدھی راہ

وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ﴿۳﴾

اور مدد کرے تیری اللہ زبردست مدد

خُلاصۂ تفسیر

بیشک ہم نے (اس صلح حدیبیہ سے) آپ کو ایک کُھلّم کُھلا فتح دی (یعنی صُلح حدیبیہ سے یہ فائدہ ہوا کہ وہ سبب ہوگئی ایک فتح مطلوب یعنی فتح مکّہ کا، اس لحاظ سے یہ صُلح ہی فتح ہوگئی۔ اور فتح مکّہ فتح مبین اسلئے کہا گیا کہ فتح سے مقصود شریعتِ اسلام میں کوئی حکمرانی نہیں بلکہ دینِ اسلام کا غلبہ مقصود ہوتا ہے، اور فتح مکّہ سے یہ مقصود بڑی حد تک حاصل ہوگیا، کیونکہ تمام قبائلِ عرب اس بات کے منتظر تھے کہ اگر آپ اپنی قوم پر غالب آگئے تو ہم بھی اطاعت کرلیں گے۔ جب مکہ فتح ہوا تو چاروں طرف سے عرب کے قبائل اُمنڈ پڑے اور خود یا بواسطہ اپنے وفود کے اسلام لانا شروع کیا (رواہ البخاری عن عمرو بن سلمہ) چونکہ غلبۂ اسلام کے بڑے آثار فتح مکّہ سے نمایاں ہوئے اسلئے اس کو فتح مبین فرمایا گیا، اور صلح حدیبیہ

اس فتح مکہ کا سبب اور ذریعہ اس طرح ہوگئی کہ اہلِ مکہ سے آئے دن لڑائی رہا کرتی تھی جس کی وجہ سے مسلمانوں کو اپنی قوت اور سامان بڑھانے کی مہلت و فرصت نہ ملتی تھی۔ حدیبیہ کے واقعہ میں جو صلح ہوگئی تو اطمینان کیساتھ مسلمانوں نے کوشش کی جس سے بہت سے نئے آدمی مسلمان ہوگئے اور مجمع مسلمانوں کا بڑھ گیا اور فتح خیبر وغیرہ سے سامان بھی درست ہوگیا اور ایسے ہوگئے کہ دوسروں پر دباؤ ڈال سکے، پھر قریش کیطرف سے عہد شکنی ہوئی تو آپ دس ہزار صحابہ کرام کیساتھ مقابلے کے لئے چلے۔ اہلِ مکہ اسقدر مرعوب ہوئے کہ زیادہ لڑائی بھی نہیں ہوئی اور اطاعت قبول کرلی اور جو لڑائی ہوئی بھی تو اتنی کم اور خفیف کہ اہلِ علم کا اسمیں اختلاف ہوگیا کہ مکہ مکرمہ صلح کیساتھ فتح ہوا یا جنگ سے، غرض اس طرح یہ صلح سبب فتح ہوگئی اسلئے مجازی طور پر اس صلح کو بھی فتح فرما دیا گیا جس میں فتح مکہ کی پیشین گوئی بھی ہے۔ آگے اس فتح کے دینی اور دنیوی ثمرات و برکات کا بیان ہے کہ یہ فتح اسلئے میسّر ہوئی تاکہ (تبلیغ دین اور دعوتِ حق میں آپ کی کوششوں کا نتیجہ اس طرح ظاہر ہو کہ کثرت سے لوگ اسلام میں داخل ہوں اور اس سے آپ کا اجر بہت بڑھ جائے اور کثرتِ اجر و قُرب کی برکت سے) اللہ تعالیٰ آپکی سب اگلی پچھلی (صوری) خطائیں معاف فرما دے اور آپ پر (جو اللہ تعالیٰ) اپنے احسانات (کرتا آتا ہے مثلاً آپ کو نبوّت دی، قرآن دیا، بہت سے علوم دیئے بہت سے اعمال کا ثواب دیا اُن احسانات) کی (اور زیادہ) تکمیل کردے (اس طرح کہ آپکے ہاتھ پر بہت سے لوگ اسلام میں داخل ہوں جس سے آپکا اجر اور مقام قرب اور بلند ہو یہ دو نعمتیں تو آخرت سے متعلق ہیں) اور (دو نعمتیں دُنیوی ہیں ایک یہ کہ) آپ کو بغیر کسی روک ٹوک کے (دین کے) سیدھے راستہ پر لے چلے (اور اگرچہ آپکا صراطِ مستقیم پر چلنا پہلے سے یقینی ہے مگر اسمیں کفار کی مزاحمت ہوتی تھی اب یہ مزاحمت نہیں رہے گی) اور (دوسری دُنیوی نعمت یہ ہے کہ) اللہ آپ کو ایسا غلبہ دے جس میں عزّت ہی عزّت ہو (یعنی جسکے بعد آپکو کبھی کسی سے دبنا نہ پڑے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ تمام جزیرۃ العرب پر آپ کا تسلّط ہوگیا)

معارف و مسائل

جمہور صحابہ و تابعین اور ائمہ تفسیر کے نزدیک سورۂ فتح ۶ سنہ ہجری میں اُس وقت نازل ہوئی جبکہ آپ بقصدِ عمرہ مکہ مکرمہ مع جماعت صحابہ کے تشریف لے گئے اور حرم مکہ کے قریب مقام حدیبیہ تک پہنچکر قیام فرمایا مگر قریشِ مکہ نے آپ کو مکّہ میں داخل ہونیسے منع کیا پھر اسپر صلح کرنے کے لئے تیار ہوئے کہ اس سال تو آپؐ واپس چلے جائیں اگلے سال اس عمرہ کی قضا کریں، بہت سے صحابہ کرام خصوصاً فاروقِ اعظمؓ اس طرح کی صلح سے ناراض تھے مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے باشاراتِ ربّانی اس صلح کو انجام کار مسلمانوں کے لئے ذریعۂ کامیابی سمجھ کر قبول فرمالیا جس کی تفصیل آگے آتی ہے

جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنا احرام عمرہ کھولدیا اور حدیبیہ سے واپس روانہ ہوئے تو راستہ میں یہ سورت پوری نازل ہوئی جسمیں بتلا دیا کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا خواب سچّا ہی ضرور واقع ہوگا مگر اُسکا یہ وقت نہیں بعد میں فتح کے وقت ہوگا اور اس صلح حدیبیہ کو فتح مبین سے تعبیر فرمایا کیونکہ یہ صلح ہی درحقیقت فتح مکہ کا سبب بنی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ اور بعض دوسرے صحابۂ کرام نے فرمایا ہے کہ تم لوگ تو فتح مکہ کو فتح کہتے ہو اور ہم صلح حدیبیہ کو فتح سمجھتے ہیں۔ اسی طرح جابرؓ نے فرمایا کہ ہم صلح حدیبیہ ہی کو فتح سمجھتے ہیں اور حضرت براء بن عازب رضؓ نے فرمایا کہ تم لوگ تو فتح مکہ ہی کو فتح سمجھتے ہو اور کوئی شک نہیں کہ وہ فتح ہے لیکن ہم تو واقعہ حدیبیہ کے وقت بیعتِ رضوان کو اصلی فتح سمجھتے ہیں جسمیں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حاضرین صحابہؓ جن کی تعداد چودہ سو تھی ایک درخت کے نیچے جہاد کرنے پر بیعت لی تھی جیسا کہ اسی سورت میں اُس بیعت کا ذکر بھی آگے آرہا ہے (ملخص از ابن کثیر) اور جبکہ یہ معلوم ہوگیا کہ یہ سُورت واقعہ حدیبیہ میں نازل ہوئی ہے اور اس واقعہ کے بہت سے اجزار کا خود اس صورت میں تذکرہ بھی ہے اسلئے مناسب معلوم ہوا کہ اس واقعہ کو پہلے ذکر کر دیا جائے۔ تفسیر ابنِ کثیر میں اس کی بڑی تفصیل ہے اور اُس سے زیادہ تفسیر مظہری میں اس جگہ چودہ صفحات میں یہ قصّہ اوّل سے آخر تک مفصّل اور مرتب مستند کتب حدیث کے حوالہ سے بیان کیا ہے جو بہتُ سے معجزات اور نصائح اور علمی۔ دینی سیاسی فوائد وحِکَم پر مشتمل ہے اسمیں سے یہاں اس قصّہ کے صرف وہ اجزار لکھے جاتے ہیں جن کا ذکر خود اس سورت میں کیا گیا ہے یا جن سے اسکا گہرا تعلق ہے تاکہ آگے اُن آیتوں کی تفسیر سمجھنا آسان ہو جائے جو اس قصّہ سے متعلق ہیں اور یہ سب بیان تفسیر مظہری سے لیا گیا ہے اور جو کسی دوسری تفسیر سے لیا ہے اسکا حوالہ دیدیا ہے۔

واقعۂ حُدیبیہ حُدَیْبِیَہ، ایک مقام مکہ مکرمہ سے باہر حدود حرم کے بالکل قریب ہے جس کو آج کل شمیسہ کہا جاتا ہے یہ واقعہ اس مقام پر پیش آیا ہے۔

جزء اوّل رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا خواب اس واقعہ کا ایک جزء بروایت عبد بن حمیدؒ وابن جریر وبیہقی وغیرہ یہ ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیّبہ میں یہ خواب دیکھا کہ آپؐ مکہ مکرمہ میں مع صحابۂ کرام کے امن و اطمینان کیساتھ داخل ہوئے اور احرام سے فارغ ہوکر کچھ لوگوں نے حسب قاعدہ سر کا حلق کرایا، بعض نے بال کٹوالئے اور یہ کہ آپؐ بیت اللہ میں داخل ہوئے۔ اور بیت اللہ کی چابی آپکے ہاتھ آئی، یہ اس واقعہ کا ایک جزء ہے جسکا ذکر اسی سُورت میں آنیوالا ہے (انبیاء علیہم السّلام کا خواب وحی ہوتا ہے اسلئے اس صورت کا واقع ہونا یقینی ہوگیا مگر خواب میں اس واقعہ کے لئے کوئی سال یا مہینہ متعین نہیں کیا گیا، اور درحقیقت یہ خواب فتح مکہ کے وقت پُورا ہونے والا تھا۔ مگر جب رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کو خواب سُنایا تو وہ سب

کے سب مکہ مکرمہ جانے اور بیت اللہ کا طواف کرنے وغیرہ کے ایسے مشتاق تھے کہ ان حضرات نے فوراً ہی تیاری شروع کر دی اور جب صحابہ کرام کا ایک مجمع تیار ہو گیا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ سلم نے بھی ارادہ فرما لیا کیونکہ خواب میں کوئی خاص سال یا مہینہ متعین نہیں تھا تو احتمال یہ بھی تھا کہ ابھی یہ مقصد حاصل ہو جائے (کذا فی بیان القرآن بحوالہ روح المعانی)

جزو دوم، آپکا صحابہ کرام اور دیہات کے مسلمانوں کو ساتھ چلنے کے لئے بلانا اور بعض کا انکار کرنا۔ ابن سعد وغیرہ کی روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے عمرہ کا ارادہ فرما لیا تو آپ کو یہ خطرہ سامنے تھا کہ قریش مکہ ممکن ہے کہ ہمیں عمرہ کرنے سے روکیں اور ممکن ہے کہ مدافعت کے لئے جنگ کی صورت پیش آجائے اسلئے آپؐ نے مدینہ طیبہ کے قریبی دیہات میں اعلان کر کے ان لوگوں کو ساتھ چلنے کی دعوت دی، ان میں سے بہت سے اعراب (دیہات) نے ساتھ چلنے سے عذر کر دیا اور کہنے لگے کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اور انکے اصحاب ہمیں قریش مکہ سے لڑوانا چاہتے ہیں جو ساز و سامان والے اور طاقتور ہیں ان کا انجام تو یہ ہونا ہے کہ یہ اس سفر سے زندہ واپس نہ لوٹیں گے (مظہری)

جزو سوم، مکہ کی طرف روانگی امام احمد و بخاری، ابو داؤد و نسائی وغیرہ کی روایت کیمطابق روانگی سے پہلے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے غسل فرمایا اور نیا لباس زیب تن فرمایا اور اپنی ناقہ قصویٰ پر سوار ہوئے، اُم المومنین حضرت اُم سلمہؓ کو ساتھ لیا اور آپکے ساتھ مہاجرین و انصار اور دیہات کے آنے والوں کا بڑا مجمع تھا جن کی تعداد اکثر روایات میں چودہ سو بیان کی گئی ہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خواب کیوجہ سے انمیں کسی کو شک نہیں تھا کہ مکہ اسیوقت فتح ہو جائے گا، حالانکہ بجز تلواروں کے انکے ساتھ اور کچھ اسلحہ نہ تھا۔ آپؐ مع صحابہ کرام کے شروع ماہ ذیقعدہ میں پیر کے دن روانہ ہوئے اور ذوالحلیفہ میں پہنچکر احرام باندھا (مظہری ملخصًا)

جزو چہارم، اہل مکہ کی مقابلے کیلئے تیاری دوسری طرف جب اہل مکہ کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ایک بڑی جماعت صحابہ کیساتھ مکہ کے لئے روانہ ہونے کی خبر ملی تو جمع ہو کر باہم مشورہ کیا کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اپنے اصحاب کیساتھ عمرہ کے لئے آرہے ہیں اگر ہمنے ان کو مکہ میں آنے دیا تو تمام عرب میں یہ شہرت ہو جائے گی کہ وہ ہم پر غلبہ پاکر مکہ مکرمہ پہنچ گئے حالانکہ ہمارے اور انکے درمیان کئی جنگیں ہو چکی ہیں سب نے عہد کیا کہ ہم ایسا ہرگز نہیں ہونے دیں گے اور آپؐ کو روکنے کے لئے خالد بن ولید (جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) کی سرکردگی میں ایک جماعت کو مکہ سے باہر مقام کُراع الغمیم پر بھیجدیا اور آس پاس کے دیہات والوں کو بھی ساتھ ملالیا اور طائف کا قبیلہ بنو ثقیف بھی انکے ساتھ لگ گیا، انھوں نے مقام بَلدَح پر اپنا پڑاؤ ڈال لیا، ان سب نے آپس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں داخل ہونے سے روکنے اور آپکے مقابلے میں جنگ کرنے کا عہد کر لیا۔

خبر رسانی کا ایک عجیب سادہ طریقہ ان لوگوں نے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حالات سے باخبر رہنے کے لئے یہ انتظام کیا کہ مقام بلدح سے لیکر اُس مقام تک جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہنچ چکے تھے پہاڑوں کی چوٹیوں پر کچھ آدمی بٹھادیے تاکہ آپکے پُورے حالات دیکھ کر آپکے متصل پہاڑ والا باآوازِ بلند دوسرے پہاڑ والے تک وہ تیسرے تک وہ چوتھے تک پہنچاوے اس طرح چند منٹوں میں آپ کی نقل و حرکت کا بلدح والوں کو علم ہوجاتا تھا۔

رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خبر رساں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بشر ؓ ابن سفیان کو آگے مکہ مکرمہ بھیجدیا تھا کہ وہ خفیہ اہلِ مکہ کے حالات جاکر دیکھیں اور آپؐ کو اطلاع کریں۔ وہ مکہ سے واپس آئے تو اہل مکہ کی ان جنگی تیاریوں اور مکمل مزاحمت کے واقعات کی خبر دی۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ افسوس ہے قریش پر کہ متعدد جنگوں نے ان کو کھالیا ہے پھر بھی وہ جنگ سے باز نہیں آتے، اُن کے لئے تو اچھا موقع تھا کہ وہ مجھے اور دوسرے اہلِ عرب کو آزاد چھوڑ دیتے اگر یہ عرب لوگ مجھ پر غالب آجاتے تو اُن کی مُراد گھر بیٹھے حاصل تھی اور میں اُن پر غالب آجاتا تو یا تو پھر وہ بھی اسلام میں داخل ہوجاتے اور اگر یہ نہ کرتے اور جنگ ہی کرنے کا ارادہ ہوتا تو وہ تازہ اور قوی ہوتے اور پھر وہ میرے مقابلے پر آجاتے، معلوم نہیں کہ یہ قریش کیا سمجھ رہے ہیں قسم ہے اللہ کی کہ میں اُس حکم پر جو اللہ نے مجھے دیکر بھیجا ہے ہمیشہ انکے خلاف جہاد کرتا رہونگا یہانتک کہ تنہا میری گردن رہ جائے۔

جز و پنجم، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ناقہ کا راستہ میں بیٹھ جانا اس کے بعد رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو جمع کرکے خطبہ دیا اور مشورہ لیا کہ اب ہمیں یہیں سے ان عربوں کے خلاف جہاد شروع کردینا چاہیئے یا ہم بیت اللہ کیطرف بڑھیں، پھر جو ہمیں روکے اُس سے قتال کریں حضرت ابوبکر صدیق ؓ اور دوسرے صحابہ نے مشورہ دیا کہ آپؐ بیت اللہ کے قصد سے نکلے ہیں کسی سے جنگ کے لئے نہیں نکلے اسلئے آپ اپنے قصد پر رہیں ہاں اگر کوئی ہمیں مکہ سے روکے گا تو ہم اُس سے قتال کرینگے، اسکے بعد حضرت مقداد بن اسودؓ اُٹھے اور عرض کیا یا رسول اللہ، ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں کہ آپ سے یہ کہدیں اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ (یعنی جائیے آپ اور آپکا رب لڑ بھڑ لیجئے ہم تو یہاں بیٹھے ہیں) بلکہ ہم ہر حال میں آپکے ساتھ قتال کریں گے۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ سُنکر فرمایا، بس اب اللہ کے نام پر مکہ کیطرف چلو۔ جب آپؐ مکہ مکرمہ کے قریب پہنچے اور خالد بن ولید اور اُن کے ساتھیوں نے آپؐ کو مکہ کیطرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو اپنے لشکر کی صفوف جانب قبلہ کیطرف مستحکم کرکے کھڑا کردیا۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے عباد بن بشر کو ایک دستہ فوج کا امیر بناکر آگے کیا، اُنھوں نے خالد بن ولید کے لشکر کے بالمقابل صفوف بنالیں، اسی حالت میں نماز ظہر کا وقت آگیا حضرت بلال ؓ نے اذان کہی اور

رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابۂ کرام کو نماز پڑھائی - خالد بن ولید اور اُنکے سپاہی دیکھتے رہے - بعد میں خالد بن ولید نے کہا کہ ہمنے بڑا اچھا موقع ضائع کر دیا جب یہ لوگ سب نماز میں تھے اُسوقت ہم اُن پر ٹوٹ پڑتے مگر کچھ بات نہیں اب اُن کی دوسری نماز کا وقت آنے والا ہے اسکا انتظار کرو مگر جبرئیل علیہ السلام صلوٰۃ الخوف کے احکام لیکر نازل ہوگئے اور رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ان کے ارادوں سے باخبر کر کے نماز کے وقت لشکر کو دو حصّوں میں تقسیم کرنے کا طریقہ بتلا دیا اور ان کے شر سے محفوظ رہے -

جزو ششم، مقام حدیبیہ میں ایک معجزہ | مگر جب رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کے قریب پہنچے تو آپ کی اونٹنی کا ہاتھ پھسل گیا وہ بیٹھ گئی صحابۂ کرام نے اُٹھانا چاہا تو نہ اُٹھی لوگوں نے کہا کہ قصوٰی بگڑ گئی آپؐ نے فرمایا قصوٰی کا قصور نہیں نہ اُس کی ایسی عادت ہے بلکہ اُس کو تو اُس ذات نے روکدیا ہے جس نے اصحاب فیل کو روکدیا تھا (غالباً اسوقت رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ اندازہ ہوگیا کہ جو واقعہ خواب میں دکھلایا گیا ہے اسکا یہ وقت نہیں ہے) آپؐ نے یہ دیکھ کر فرمایا کہ قسم ہے اُس ذات کی جسکے ہاتھ میں محمد کی جان ہے آج کے دن قریش مجھ سے جو بات بھی ایسی کہیں گے جسمیں شعائر الٰہیہ کی تعظیم ہو تو میں اسکو ضرور مان لونگا - پھر آپؐ نے اونٹنی پر ایک آواز لگائی تو اُٹھ گئی - رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خالد بن ولید کیجانب سے ہٹ کر حدیبیہ کی دوسری جانب قیام فرمایا جہاں پانی بہت ہی کم تھا - پانی کے مواقع پر خالد بن ولید اور بلدح والے قابض ہو چکے تھے - یہاں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ معجزہ ظاہر ہوا کہ ایک کنواں جسمیں پانی کچھ کچھ رستا تھا اُسمیں آپ نے کُلّی کردی اور اپنا ایک تیر دیا کہ اسکے اندر گاڑ دو، یہ عمل ہوتے ہی اُسکا پانی جوش مار کر کنویں کی مَن کے قریب پہنچ گیا کنویں کے اوپر والوں نے اپنے برتنوں سے پانی نکالا اور سیراب ہوگئے -

جزو ہفتم، اہلِ مکہ کیساتھ بواسطہ وفود بات چیت | اس طرح سب صحابہ مطمئن ہو کر یہاں مقیم ہوئے اور اہلِ مکہ سے بواسطہ وفود بات چیت شروع ہوئی - پہلے بدیل بن ورقاء (جو بعد میں مسلمان ہوگئے) اپنے ساتھیوں کے ساتھ حاضر ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر خواہانہ عرض کیا کہ قریشِ مکہ پوری قوت کیساتھ مقابلے کے لئے نکل آئے ہیں اور پانی کی جگھوں پر انھوں نے قبضہ کر لیا ہے وہ ہرگز آپؐ کو نہ چھوڑیں گے کہ آپؐ مکہ میں داخل ہوں - رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم کسی سے جنگ کرنے نہیں آئے البتہ اگر کوئی ہمیں عمرہ کرنے سے روکے گا تو ہم قتال کریں گے پھر آپؐ نے اُسی بات کا اعادہ فرمایا جو پہلے جاسوس بشرؓ کے سامنے کہی تھی کہ قریش کو متعدد جنگوں نے کمزور کر دیا ہے اگر وہ چاہیں تو کسی معیّن مدت تک کیلئے ہم سے صلح کرلیں تاکہ وہ بے فکر ہو کر اپنی تیاری میں لگ جائیں اور ہمیں اور باقی عرب کو چھوڑ دیں، اگر وہ مجھ پر غالب آگئے تو انکی مراد گھر بیٹھے پوری ہو جائیگی

اور اگر ہم غالب آگئے اور وہ اسلام میں داخل ہونے لگے تو ان کو اختیار ہوگا کہ وہ بھی اسلام میں داخل ہوجاویں یا ہمارے خلاف جنگ کریں اور اس عرصہ میں وہ اپنی قوت محفوظ رکھ کر بڑھا چکے ہونگے اور اگر قریش اس بات سے انکار کریں تو بخدا ہم اپنے معاملہ پر اُن سے جہاد کرتے رہیں گے جبتک کہ میری تنہا گردن باقی ہے۔ بُدَیل یہ کہکر واپس ہوگئے کہ میں جاکر قریشی سرداروں سے آپکی بات کہدیتا ہوں۔ وہاں پہنچے تو کچھ لوگوں نے تو اُن کی بات ہی سننا نہ چاہا بلکہ جنگ کے جوش میں رہے پھر کچھ لوگوں نے کہا کہ بات تو سُن لیں، یہ کہنے والے عروہ بن مسعود اپنی قوم کے سردار تھے، جب بات سُنی تو عروہ بن مسعود نے قریشی سرداروں سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو بات پیش کی ہے وہ درست ہے اسکو قبول کرلو اور مجھے اجازت دو کہ میں جاکر اُن سے بات کروں، چنانچہ دوسری مرتبہ عروہ بن مسعود گفتگو کے لئے حاضر ہوئے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ اگر اپنی قوم قریش کا صفایا ہی کردیں تو یہ کونسی اچھی بات ہوگی، کبھی دُنیا میں آپ نے سُنا ہے کہ کوئی شخص اپنی ہی قوم کو ہلاک کردے۔ پھر صحابہ کرام سے آپکی نرم و گرم باتیں ہوتی رہیں، اسی حال میں عروہ صحابہ کرام کے حالات کا مشاہدہ کرتے رہے کہ اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تھوکا بھی تو صحابہ نے اسکو اپنے ہاتھوں میں لیکر اپنے چہروں سے مل لیا۔ اور جب آپنے وضو کیا تو وضو کے گرنے والے پانی پر صحابہ کرام ٹوٹ پڑتے اور اپنے چہروں کو ملتے تھے اور جب آپ گفتگو فرماتے تو سب اپنی آوازیں پست کرلیتے۔ عروہ نے واپس جاکر قریشی سرداروں سے یہ حال بیان کیا کہ میں بڑے بڑے شاہی درباروں قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے پاس جاچکا ہوں، خدا کی قسم میں نے کوئی بادشاہ ایسا نہیں دیکھا جسکی قوم اُس پر اس طرح فدا ہو جیسے اصحابِ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اُن پر فدا ہیں اور وہ ایک صحیح بات کہہ رہے ہیں میرا مشورہ یہ ہے کہ تم ان کی بات مان لو، مگر لوگوں نے کہا ہم یہ بات نہیں مان سکتے بجز اسکے کہ اس سال تو آپ لوٹ جائیں پھر اگلے سال آجائیں۔ جب عروہ کی بات نہ مانی گئی تو وہ اپنی جماعت کو ساتھ لیکر واپس ہوگئے اسکے بعد ایک صاحب حلیس بن علقمہ جو اعراب کے سردار تھے وہ آپکی خدمت میں حاضر ہوئے اور صحابہ کرام کو احرام کیحالت میں قربانی کے جانور ساتھ لئے دیکھا تو واپس ہوکر اُسنے بھی اپنی قوم کو سمجھایا کہ یہ لوگ بیت اللہ کے عمرہ کیلئے آئے ہیں انکو روکنا کسی طرح درست نہیں، لوگوں نے اسکا کہنا نہ سُنا تو یہ بھی اپنی جماعت کو لیکر واپس ہوگیا۔ پھر ایک چوتھا آدمی آپ سے بات کرنے کے لئے آیا اور آپ سے گفتگو کی تو آپنے اپنی وہی بات پیش کردی جو اس سے پہلے بُدَیل اور عروہ ابن مسعود کے سامنے پیش کی تھی اسنے جاکر آپکا جواب قریش کو سُنادیا۔

جزو ہشتم، حضرت عثمان رضؓ کو اہلِ مکہ کے لئے پیغام دیکر بھیجنا امام بیہقی نے حضرت عُروہ سے روایت کی ہے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ میں پہنچکر قیام فرمایا تو قریش گھبرا گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ کیا کہ انکے پاس اپنا کوئی آدمی بھیجکر بتلادیں کہ ہم جنگ کرنے نہیں عمرہ کرنے آئے ہیں ہمارا راستہ نہ روکو۔ اس کام کے کیلئے حضرت عمر رضؓ کو بُلایا انھوں نے عرض کیا کہ یہ قریش میرے سخت دشمن ہیں۔

کیونکہ اُن کو میری عداوت و شدت کا حال معلوم ہے اور میرے قبیلہ کا کوئی آدمی ایسا مکہ میں نہیں جو میری حمایت کرے اسلئے میں آپکے سامنے ایک ایسے شخص کا نام پیش کرتا ہوں جو مکہ مکرمہ میں اپنے قبیلہ وغیرہ کی وجہ سے خاص قوت و عزت رکھتے ہیں یعنی عثمان بن عفان رضؓ، آپ نے حضرت عثمانؓ کو اس کام کے لئے مامور فرما کر بھیجدیا اور یہ بھی فرمایا کہ جو ضعفار مسلمین مرد اور عورتیں مکہ مکرمہ سے ہجرت نہیں کر سکے اور مشکلات میں پھنسے ہوئے ہیں انکے پاس جاکر تسلی کر دیں کہ پریشان نہ ہوں انشاراللہ مکہ مکرمہ فتح ہو کر تمہاری مشکلات کے ختم ہونیکا وقت آگیا ہے۔ حضرت عثمان غنیؓ پہلے اُن لوگوں کے پاس پہنچے جو مقام بَلدح میں حضورؐ کا راستہ روکنے اور مقابلے کے لئے جمع ہوئے تھے اُن سے جاکر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وہی بات سُنادی جو آپ نے بُدَیل اور عروہ ابن مسعود وغیرہ کے سامنے کہی تھی، ان لوگوں نے کہا کہ ہم نے پیغام سُن لیا آپ جاکر اپنے بزرگ سے کہدو کہ یہ بات ہرگز نہیں ہوگی۔ ان لوگوں کا جواب سُن کر آپ مکہ مکرمہ کے اندر جانے لگے تو ابان بن سعید کی (جو بعد میں مُسلمان ہو گئے تھے) ان سے ملاقات ہوئی انھوں نے حضرت عثمانؓ کا گرمجوشی سے استقبال کیا اور اپنی پناہ میں لیکر اُنسے کہا کہ مکہ میں اپنا پیغام لیکر جہاں چاہیں جاسکتے ہیں اسمیں آپ کوئی فکر نہ کریں پھر اپنے گھوڑے پر حضرت عثمانؓ کو سوار کر کے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے کیونکہ اُن کا قبیلہ بنو سعید مکہ مکرمہ میں بہت قوی اور عزت دار تھا، یہاں تک کہ حضرت عثمانؓ مکہ مکرمہ میں قریش کے ایک ایک سردار کے پاس پہنچے اور حضورؐ کا پیغام پہنچایا کہ ہم کسی سے لڑنے کے لئے نہیں آئے عمرہ کر کے واپس جائیں گے ہاں کوئی ہمارا راستہ روکے گا تو لڑیں گے اور قریش خود جنگوں سے نیم جاں ہوچکے ہیں انکے لئے مناسب یہ ہے کہ ہمیں اور دوسرے اہل عرب کو چھوڑ دیں قریش ہمارے مقابلہ پر نہ آئیں پھر دیکھیں اگر عرب ہم پر غالب آگئے تو اُن کی مُراد پوری ہو جائے گی اور ہم غالب آئے تو اُنھیں پھر بھی اختیار باقی ہوگا اسوقت قتال کر سکتے ہیں اور اس عرصہ میں انکو اپنی طاقت بڑھانے اور محفوظ رکھنے کا موقع بھی ملجائے گا مگر ان سب نے آپ کی بات کو رد کر دیا۔ پھر عثمان غنی رضؓ ضعفار مسلمین سے ملے انکو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچایا وہ بہت خوش ہوئے اور رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو سلام بھیجا۔ جب حضرت عثمانؓ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پیغامات پہنچانے سے فارغ ہوئے تو اہل مکہ نے ان سے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو طواف کر سکتے ہیں۔ عثمان غنی رضؓ نے کہا کہ میں اسوقت تک طواف نہیں کرونگا جب تک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم طواف نہ کریں، عثمان غنی رضؓ مکہ میں تین رات رہے اور رؤسار قریش کو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بات ماننے کیطرف دعوت دیتے رہے۔

جزو نہم، اہل مکہ اور مسلمانوں میں آویزش اور اہل مکہ کے ساٹھ آدمیوں کی گرفتاری	اسی عرصہ میں قریش نے اپنے پچاس آدمی اس کام پر لگائے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچکر موقع کا انتظار

کریں اور موقع ملنے پر (معاذ اللہ) آپ کا قصہ ختم کر دیں۔ یہ لوگ اسی تاک میں تھے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حفاظت و نگرانی پر مامور حضرت محمد بن مسلمہؓ نے ان سب کو گرفتار کر لیا اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں قید کر کے حاضر کر دیا، دوسری طرف حضرت عثمانؓ جو مکہ میں تھے اور انکے ساتھ تقریباً دس مسلمان اور مکہ مکرمہ میں پہنچ گئے تھے۔ قریش نے جب اپنے پچاس آدمیوں کی گرفتاری کا حال سنا تو حضرت عثمان سمیت ان سب مسلمانوں کو روک لیا اور قریش کی ایک جماعت مسلمانوں کے لشکر کیطرف نکلی اور مسلمانوں کی جماعت پر تیر اور پتھر پھینکے اسمیں مسلمانوں میں سے ایک صحابی ابن زنیمؓ شہید ہوگئے اور مسلمانوں نے ان قریشیوں کے دس سواروں کو گرفتار کر لیا، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کسی نے یہ خبر پہنچائی کہ حضرت عثمانؓ قتل کر دیئے گئے۔

جزو دہم، بیعتِ رضوان کا واقعہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر سن کر صحابہ کرام کو ایک درخت کے نیچے جمع کیا کہ سب جمع ہو کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر جہاد کیلئے بیعت کریں، سب صحابہ کرام نے آپکے ہاتھ پر بیعت کی جسکا ذکر آگے اس سورت میں آنے والا ہے احادیث صحیحہ میں اُن لوگوں کی بڑی فضیلت آئی ہے جو اس بیعت میں شریک تھے اور حضرت عثمان غنیؓ چونکہ آپکے حکم سے مکہ گئے ہوئے تھے اسلئے اُن کی طرف سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے ہاتھ پر دوسرا ہاتھ مار کر فرمایا کہ یہ عثمانؓ کی بیعت ہے یہ خصوصی فضیلت حضرت عثمانؓ کی تھی کہ آپؐ نے اپنے ہی ہاتھ کو عثمانؓ کا ہاتھ قرار دیکر اُن کیطرف سے بیعت کرلی۔

جزو یازدہم، حدیبیہ کا واقعہ دوسری طرف اہلِ مکہ پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا رعب مسلط کر دیا اور خود مصالحت پر آمادہ ہو کر انھوں نے اپنے تین آدمی سہیل بن عمرو اور حویطب بن عبد العزیٰ اور مکرز بن حفص کو عذر معذرت کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا، اُن میں سے پہلے دو حضرات بعد میں مسلمان بھی ہو گئے۔ سہیل بن عمرو نے آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپؐ تک جو خبر پہنچی ہے کہ عثمان غنیؓ اور اُنکے ساتھی قتل کر دیئے یہ بالکل غلط ہے ہم اُن کو آپکے پاس بھیجتے ہیں، ہمارے قیدیوں کو آزاد کر دیجئے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کو آزاد کر دیا، مسند احمد اور مسلم میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ اس سورت میں جو آگے آیت آنیوالی ہے ھُوَ الَّذِیْ کَفَّ اَیْدِیَھُمْ عَنْکُمْ، یہ اسی واقعہ سے متعلق ہے اب سہیل اور انکے ساتھیوں نے جاکر بیعتِ رضوان میں صحابہ کرام کی مسارعت اور جاں نثاری کے عجیب و غریب منظر کا حال قریش کے سامنے بیان کیا تو قریش کے صاحب رائے لوگوں نے آپس میں کہا کہ اس سے بہتر کوئی بات نہیں ہے کہ ہم محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) سے اس بات پر صلح کرلیں کہ وہ اس سال تو واپس چلے جائیں تاکہ پورے عرب میں یہ شہرت نہ ہو جائے کہ ہمنے ان کو روکنا چاہا وہ زبردستی مکہ میں داخل ہو گئے، اور اگلے سال عمرہ کے لئے آجائیں اور تین روز

مکہ میں قیام کریں، اُسوقت اپنے جانور قربانی کے ذبح کر ڈالیں اور احرام کھولدیں چنانچہ یہی سہیل بن عمرو یہ پیغام لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیخدمت میں حاضر ہوئے آپؐ نے اُن کو دیکھتے ہی فرمایا کہ اب معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم نے صلح کا ارادہ کرلیا ہے کہ سہیل کو پھر بھیجا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم چہار زانو بیٹھ گئے اور صحابہ میں سے عباد بن بشرؓ اور سلمہؓ ہتھیاروں سے مسلح آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس حفاظت کے لئے کھڑے ہوگئے۔ سہیل حاضر ہوئے تو ادب کے ساتھ حضورؐ کے سامنے بیٹھ گئے اور قریش کا پیغام آپؐ کو پہنچایا۔ صحابۂ کرام عموماً اس پر راضی نہ تھے کہ اسوقت اپنے احرام بغیر عمرہ کئے کھولدیں، اُنھوں نے سہیل سے سخت گفتگو کی، آوازیں کبھی بلند ہوگئیں کبھی پست ہوئیں، عباد بن بشرؓ نے سہیل کو ڈانٹا کہ حضورؐ کے سامنے آواز بلند نہ کر، طویل گفتگو کے بعد آپؐ اُس شرط کو قبول کرکے صلح کرلینے پر راضی ہوگئے، سہیل نے کہا کہ لائیے ہم اپنے اور آپکے درمیان صلحنامہ لکھ لیں۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بُلایا اور فرمایا لکھو، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ سُہیل نے یہیں سے بحث شروع کردی اور کہا کہ لفظ رحمٰن اور رحیم ہمارے محاورات میں نہیں ہے آپؐ یہاں وہی لفظ لکھیں جو پہلے لکھا کرتے تھے یعنی باسمك اللّٰھمّ۔ آپؐ نے اسکو بھی مان لیا اور حضرت علی رضؓ سے فرمایا کہ ایسا ہی لکھدو۔ اسکے بعد آپؐ نے حضرت علی رضؓ کو فرمایا کہ یہ لکھو کہ یہ وہ عہد نامہ ہے جسکا فیصلہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے۔ سہیل نے اسپر بھی ضد کی کہ اگر ہم آپؐ کو اللہ کا رسُول مانتے تو آپؐ کو ہرگز بیت اللہ سے نہیں روکتے (صلحنامہ میں ایسا کوئی لفظ نہیں ہونا چاہیئے جو کسی فریق کے عقیدہ کیخلاف ہو) آپؐ صرف محمد بن عبد اللہ لکھوائیں، رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اسکو بھی منظور فرماکر حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے فرمایا کہ جو لکھا ہے اسکو مٹاکر محمد بن عبد اللہ لکھدو۔ حضرت علی رضؓ نے باوجود سراپا اطاعت ہونے کے عرض کیا میں تو یہ نہیں کرسکتا کہ آپکے نام کو مٹادوں۔ حاضرین میں سے حضرت اُسَید بن حُضَیرؓ اور سعد بن عبادہ رضؓ نے حضرت علی رضؓ کا ہاتھ پکڑ لیا کہ اسکو نہ مٹائیں اور بجز محمد رسُول اللہ کے اور کچھ نہ لکھیں اگر یہ لوگ نہیں مانتے تو ہمارے اور ان کے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی اور کچھ آوازیں ہر طرف سے بلند ہونے لگیں تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صلحنامہ کا کاغذ خود اپنے دستِ مبارک میں لے لیا اور باوجود اسکے کہ آپؐ اُمّی تھے پہلے کبھی لکھا نہیں تھا مگر اسوقت خود اپنے قلم سے آپ نے یہ لکھدیا ھٰذا ما قاضی محمد بن عبد اللہ وسھیل بن عمرو اصلحا علی وضع الحرب عن الناس عشر سنین یأمن فیہ الناس ویکف بعضھم عن بعض، یعنی یہ وہ فیصلہ ہے جو محمد بن عبد اللہ اور سہیل بن عمرو نے دس سال کے لئے باہم جنگ نہ کرنے کا کیا ہے جس میں سب لوگ مامون رہیں ایک دوسرے پر چڑھائی اور جنگ سے پرہیز کریں۔

پھر رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہماری ایک شرط یہ ہے کہ اسوقت ہمیں طواف

کرنے سے نہ روکا جائے، سہیل نے کہا کہ بخدا یہ نہیں ہوسکتا، آپؐ نے اسکو بھی قبول فرمالیا اسکے بعد سہیل نے اپنی ایک شرط یہ لکھی کہ جو شخص مکہ والوں میں سے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر آپکے پاس جائیگا اسکو واپس کردیں گے اگرچہ وہ آپ ہی کے دین پر ہو اور مسلمانوں میں سے جو کوئی قریش کے پاس مکّہ چلا آوے اسکو ہم واپس نہ کریں گے۔ اس پر عام مسلمانوں کی آواز اُٹھی سُبحان اللہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم اپنے مسلمان بھائی کو مشرکین کیطرف لوٹا دیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اسکو بھی قبول فرمالیا اور یہ فرمایا کہ ہم میں سے کوئی آدمی اگر انکے پاس گیا تو اسکو اللہ ہی نے ہم سے دُور کردیا اسکی ہم کیوں فکر کریں اور ان میں کا کوئی آدمی ہمارے پاس آیا اور ہم نے لوٹا بھی دیا تو اللہ تعالیٰ اسکے لئے راستہ سہولت کا نکالدیں گے حضرت براء رضؓ نے اس صلحنامہ کا خلاصہ تین شرطیں بیان کیا ہے، ایک یہ کہ اُن کا کوئی آدمی ہمارے پاس آجائیگا تو ہم اسکو واپس کردیں گے، دوسرے یہ کہ ہمارا کوئی آدمی اُنکے پاس چلا جائیگا تو وہ واپس نہ کریں گے۔ تیسرے یہ کہ اب آئندہ سال عمرہ کے لئے آئیں گے اور تین روز مکّہ میں قیام کریں گے اور زیادہ ہتھیار لیکر نہیں آئیں گے، اور آخر میں لکھا گیا کہ یہ عہد نامہ اہلِ مکہ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک محفوظ دستاویز ہے جس کی کوئی خلاف ورزی نہ کریگا اور باقی سب عرب آزاد ہیں جسکا جی چاہے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے عہد میں داخل ہوجائے اور جسکا جی چاہے قریش کے عہد میں داخل ہوجائے۔ یہ سُن کر قبیلہ خزاعہ اُچھل پڑا اور کہا کہ ہم محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے عقد میں داخل ہیں اور بنو بکر نے آگے بڑھکر کہا کہ ہم قریش کے عقد و عہد میں داخل ہیں۔

شرائطِ صلح سے عام صحابۂ کرام کی ناراضی اور رنج

جب یہ شرائط صلح طے ہوگئیں تو عمر بن خطابؓ سے نہ رہا گیا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، یا رسول اللہ، کیا آپ اللہ کے نبی برحق نہیں ہیں، آپ نے فرمایا کیوں نہیں۔ پھر حضرت عمرؓ نے کہا کہ کیا ہم حق پر اور وہ لوگ باطل پر نہیں ہیں، آپؐ نے فرمایا کیوں نہیں، پھر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ کیا ہمارے مقتولین جنّت اور اُن کے مقتولین جہنّم میں نہیں ہیں، آپؐ نے فرمایا کیوں نہیں، اس پر حضرت عمرؓ نے عرض کیا تو پھر ہم کیوں اس ذلّت کو قبول کریں کہ بغیر عمرہ کئے واپس چلے جائیں جب تک جنگ کیساتھ اللہ تعالیٰ کوئی فیصلہ نہ کردیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "میں اللہ کا بندہ اور اسکا رسول ہوں ہرگز اسکے حکم کیخلاف نہیں کرونگا اور اللہ تعالیٰ مجھے ضائع نہ فرمائیگا وہ میرا مددگار ہے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسُول اللہ، کیا آپنے ہم سے یہ نہیں فرمایا کہ ہم بیت اللہ کے پاس جائیں گے اور طواف کریں گے، آپؐ نے فرمایا کہ بیشک یہ کہا تھا مگر کیا میں نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ کام اسی سال ہوگا تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ یہ تو آپنے نہیں فرمایا تھا تو آپؐ نے فرمایا کہ بس یہ واقعہ جیسا کہ میں نے کہا تھا ہو کر رہے گا کہ آپؐ بیت اللہ کے پاس جائیں گے اور طواف کریں گے۔

حضرت عمر بن خطاب خاموش ہو گئے مگر غم و غصہ نہیں گیا، آپ کے پاس سے حضرت ابو بکرؓ کے پاس گئے اور اسی گفتگو کا اعادہ کیا جو حضورؐ کے سامنے کی تھی، حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا خدا کے بندے محمد صلے اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور وہ اللہ کے حکم کیخلاف کوئی کام نہ کریں گے اور اللہ ان کا مددگار ہے اسلئے تم مرتے دم تک آپؐ کی رکاب تھامے رہو، خدا کی قسم وہ حق پر ہیں، غرض حضرت فاروق اعظمؓ کو ان شرائط صلح سے سخت رنج و غم پہنچا، خود انھوں نے فرمایا کہ واللہ جب سے میں نے اسلام قبول کیا مجھے کبھی شک پیش نہیں آیا بجز اس واقعہ کے (رواہ البخاری) حضرت ابو عبیدہؓ نے سمجھایا اور فرمایا کہ شیطان کے شر سے پناہ مانگو، فاروق اعظمؓ نے کہا میں شیطان سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو میں برابر صدقہ خیرات کرتا اور روزے رکھتا اور غلام آزاد کرتا رہا کہ میری یہ خطا معاف ہو جائے۔

ایک اور حادثہ اور معاہدہ کی پابندی میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا بے نظیر عمل

ابھی ابھی یہ شرائط صلح طے ہوئی تھیں اور صحابہ کرام کی ناگواری اسپر ہو رہی تھی کہ اچانک اسی سہیل بن عمرو کا جو صلحنامہ کا فریق منجانب قریش تھا بیٹا ابو جندل جو مسلمان ہو چکا تھا اور باپ نے اس کو قید کر رکھا تھا اور سخت ایذائیں ان کو دیتا تھا وہ کسی طرح بھاگ کر رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گیا اور آپؐ سے پناہ مانگی، کچھ مسلمان بڑھے اور اسکو اپنی پناہ میں لے لیا مگر سہیل چلا اٹھا کہ یہ پہلی عہدنامہ کی خلاف ورزی ہو رہی ہے اگر اسکو واپس نہ کیا گیا تو میں صلح کی کسی شرط کو نہ مانوں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عہد کر کے پابند ہو چکے تھے اسلئے ابو جندلؓ کو آواز دیکر فرمایا کہ اے ابو جندل تم چند روز اور صبر کرو اللہ تعالےٰ تمھارے لئے اور ضعفاء مسلمین کے لئے جو مکہ میں محبوس ہیں جلد رہائی اور فراخی کا انتظام کرنے والا ہے۔ مسلمانوں کے دلوں پر ابو جندلؓ کے اس واقعہ نے اور زیادہ نمک پاشی کی وہ تو یقین کر کے آئے تھے کہ اسی وقت مکہ فتح ہو گا اور یہاں یہ حالات دیکھے تو انکے رنج و غم کی انتہا نہ رہی قریب تھا کہ وہ ہلاکت میں پڑ جاتے مگر معاہدہ صلح مکمل ہو چکا تھا اس صلحنامہ پر مسلمانوں کی طرف سے ابو بکر و عمر عبدالرحمٰن بن عوف اور عبداللہ بن سہیل بن عمر سعد بن ابی وقاص محمد بن مسلمہ اور علی بن ابی طالب وغیرہ رضی اللہ عنہم کے دستخط ہوئے اسی طرح مشرکین کیطرف سے سہیل کے ساتھ چند دوسرے لوگوں کے بھی دستخط ہو گئے۔

احرام کھولنا اور قربانی کے جانور ذبح کرنا

جب صلحنامہ کی کتابت سے فراغت ہوئی تو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (قرار داد صلح کے مطابق اب ہمیں واپس جانا ہے) سب لوگ اپنی قربانی کے جانور جو ساتھ ہیں اُن کی قربانی کر دیں اور سر کے بال منڈوا کر احرام کھولدیں۔ صحابہ کرام کی مسلسل رنج و غم کیوجہ سے یہ حالت ہو گئی تھی کہ آپ کے فرمانے کے باوجود کوئی اس

کام کے لئے نہیں اٹھا جس سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مغموم ہوئے اور ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کے پاس تشریف لے گئے اور اپنے اس رنج کا ذکر کیا، ام المؤمنینؓ نے بہت مناسب اور اچھا مشورہ دیا کہ آپ صحابۂ کرام کو اس پر کچھ نہ کہیں، ان کو اسوقت سخت صدمہ اور رنج شرائطِ صلح اور بغیر عمرہ کے واپسی کیوجہ سے پہنچا ہوا ہے، آپؐ سب کے سامنے حجام کو بلاکر خود اپنا حلق کرکے احرام کھولدیں اور اپنی قربانی کردیں۔ آپؐ نے مشورہ کے مطابق ایسا ہی کیا، صحابۂ کرام نے جب یہ دیکھا تو سب کھڑے ہوگئے ایک دوسرے کا حلق کرنے لگے اور قربانی کے جانوروں کی قربانی کرنے لگے، آپ نے سب کے لئے دعا فرمائی۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس مقام حدیبیہ میں اُنیس اور بعض روایات کے اعتبار سے بیس۲۰ دن قیام فرمایا تھا، اب یہاں سے واپسی شروع ہوئی اور آپ صحابۂ کرام کے مجمع کیساتھ پہلے مرّ ظہران پھر عسفان پہنچے، یہاں پہنچکر سب مسلمانوں کا زادراہ تقریباً ختم ہوچکا تھا، کھانے کے لئے بہت کم سامان تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک دسترخوان بچھایا اور سب کو حکم دیا کہ جس کے پاس جو کچھ ہے لاکر یہاں جمع کردے اس طرح جو کچھ باقیماندہ کھانے کا سامان تھا سب اس دسترخوان پر جمع ہوگیا۔ چودہ۱۴ سو حضرات کا مجمع تھا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی اور سب کو کھانا شروع کرنے کا حکم دیا۔ صحابۂ کرامؓ کا بیان ہے کہ پورے چودہ۱۴ سو حضرات نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا پھر اپنے برتنوں میں بھر لیا اسکے بعد بھی اتنا ہی کھانا باقی تھا، اس مقام پر یہ دوسرا معجزہ ظاہر ہوا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اسکو دیکھ کر بہت مسرور ہوئے۔

صحابۂ کرامؓ کے ایمان اور اطاعتِ رسولؐ کا ایک اور امتحان اور انکی بے نظیر قوتِ ایمانی

اوپر معلوم ہوچکا ہے کہ صحابۂ کرام پر ان شرائطِ صلح اور بغیر عمرہ اور بغیر جنگ میں اپنے حوصلے نکالنے کے واپسی سخت بھاری اور ناگوار تھی، یہ اُنہی کا ایمان تھا کہ ان سب حالات میں ایمان اور اطاعتِ رسولؐ پر جمے رہے۔ حدیبیہ سے واپسی پر جب آپ مقام کُراع غمیم پر پہنچے تو آپؐ پر یہ سورۂ فتح نازل ہوئی آپؐ نے صحابۂ کرامؓ کو پڑھ کر سنایا، صحابۂ کرامؓ کے قلوب اس طرح کی شرائطِ صلح اور بغیر عمرہ کے واپسی سے زخم خوردہ پہلے ہی سے تھے اب اس سورت نے یہ بتلایا کہ فتح مبین حاصل ہوئی ہے حضرت عمر بن خطابؓ پھر سوال کر بیٹھے کہ یا رسول اللہ کیا یہ فتح ہے، آپ نے فرمایا قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے یہ فتح مبین ہے۔ صحابۂ کرامؓ نے اس پر بھی سرِتسلیم خم کیا اور ان سب چیزوں کو فتح مبین یقین کیا۔

صلح حدیبیہ کے ثمرات و برکات کا ظہور سب سے پہلی بات تو اس واقعہ میں یہ ہوئی کہ قریش مکہ اور انکے بہت سے متبعین پر انکی ضد اور بیجا ہٹ دھرمی واضح ہوکر خود اُنمیں پھوٹ پڑی

بُدَیل ابن ورقا اپنے ساتھیوں کو لے کر ان سے الگ ہوگئے، پھر عروہ ابن مسعود اپنی جماعت کو لیکر الگ ہوگئے۔ دوسرے صحابہ کرام کی بے نظیر جاں نثاری اور رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بے مثال اطاعت ومحبت وعظمت دیکھ کر قریشِ مکہ کا مرعوب ہوجانا اور صلح کیطرف مائل ہونا حالانکہ اُن کے لئے مُسلمانوں کا صفایا کر دینے کا اس سے بہتر کوئی موقع نہ تھا کیونکہ وہ اپنے گھروں میں مطمئن تھے، مُسلمان مسافرت کی حالت میں تھے قریش نے پانی کی جگہوں پر قبضہ کیا ہوا تھا یہ بے آب و دانہ جنگل میں تھے، اُن کی پُوری قوت موجود تھی مسلمانوں کے پاس کچھ زیادہ اسلحہ بھی نہیں تھے مگر اللہ تعالےٰ نے اُنکے دلوں میں رعب ڈالا اور ان کی جماعت کے بہت سے افراد کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مُلاقات اور اختلاط کے مواقع ملکر اُن میں سے بہت سے لوگوں کے دلوں میں اسلام و ایمان راسخ ہوگیا اور بعد میں مُسلمان ہوگئے۔ تیسرے صلح و امان کیوجہ سے راستے مامون ہوگئے دعوتِ اسلام کے لئے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے واسطے راستے کھُل گئے، عرب کے وفود کو آپ کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا، رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اور صحابہ نے گوشہ گوشہ میں دعوتِ اسلام کو پھیلایا، دُنیا کے بادشاہوں کو دعوتِ اسلام دینے کے لئے خطوط بھیجے گئے انمیں سے چند بڑے بڑے بادشاہ متأثر ہوئے جسکا حاصل یہ نکلا کہ واقعہ حُدیبیہ میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ عام اور سب کو عمرہ کے لئے نکلنے کی تاکید کے باوجود ڈیڑھ ہزار سے زیادہ مسلمان ساتھ نہیں تھے اور صلح حدیبیہ کے بعد جوق جوق لوگ اسلام میں داخل ہوئے، اسی عرصہ میں ۷ھ ہجری میں خیبر فتح ہوکر مسلمانوں کو سامان بڑی مقدار میں مِل گیا اور ان کی مادّی قوت مستحکم ہوگئی۔ اور اس صلح پر دو سال گزرنے نہ پائے تھے کہ مُسلمانوں کی تعداد اتنی کثیر ہوگئی جو اس سے پہلے تمام پچھلی مدّت میں نہیں تھی، اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب قریشِ مکّہ نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے معاہدہ توڑ ڈالا اور رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کرنے کی خفیہ تیاری شروع کی تو اس صلحنامہ پر صرف بیس اکیس مہینے گزرے تھے کہ فتح مکہ کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ جانیوالے جاں نثار سپاہی دس ہزار تھے قریشِ مکہ کو خبر لگی تو گھبرا کر ابوسفیان کو عذر معذرت کر کے تجدید معاہدہ پر آمادہ کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیخدمت میں بھیجا آپنے معاہدہ کی تجدید نہ کی اور بالآخر دس ہزار کے اس حزب اللہ کے ساتھ آپ مکہ مکرمہ کیطرف روانہ ہوئے کفار قریش ایسے مغلوب و مرعوب ہوچکے تھے کہ مکہ مکرمہ میں کچھ زیادہ لڑائی کی بھی نوبت نہیں آئی، کچھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حکیمانہ سیاست نے جنگ نہ ہونے کا یہ انتظام کر دیا کہ آپنے مکہ مکرمہ میں اعلان کرا دیا کہ جو شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے وہ مامون ہے جو مسجد میں داخل ہوجائے وہ مامون جو ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے وہ مامون ہے اس طرح سب لوگوں کو اپنی اپنی

فکر پڑگئی اور قتل و قتال کی زیادہ نوبت نہیں آئی اسی لئے ائمہ فقہاء میں یہ اختلاف ہوگیا کہ مکہ مکرمہ صلح سے فتح ہوا یا جنگ سے۔ بہر حال بڑی سہولت کے ساتھ مکہ مکرمہ فتح ہوا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا خواب واقعہ بن کر سب کے سامنے آگیا، صحابہ کرام نے بے خطر ہو کر بیت اللہ کا طواف پھر حلق و قصر کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ بیت اللہ میں داخل ہوئے۔ بیت اللہ کی چابی آپکے ہاتھ آئی اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر بن خطاب کو خصوصاً اور سب صحابہ کو عموماً خطاب کر کے فرمایا کہ یہ ہے وہ واقعہ جو میں نے آپ سے کہا تھا، پھر حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رض کو خطاب کر کے فرمایا کہ یہ تھا وہ واقعہ جو میں نے تم سے کہا تھا۔ حضرت فاروق اعظم رض نے فرمایا کہ بیشک کوئی فتح صلح حدیبیہ سے زیادہ بہتر اور اعظم نہیں ہے۔ صدیق اکبر رض تو پہلے سے فرماتے تھے کہ اسلام میں کوئی فتح صلح حدیبیہ کے برابر نہیں ہے لیکن لوگوں کی رائے اور بصیرت وہاں تک نہ پہنچی جو اللہ تعالیٰ اور اسکے رسُول کے درمیان ایک طے شدہ حقیقت تھی یہ لوگ جلد بازی کرنا چاہتے تھے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی جلد بازی سے متاثر ہو کر جلدی نہیں کرتا بلکہ حکمت و مصلحت کیساتھ ہر کام اپنے صحیح وقت پر انجام پاتا ہے اس لئے سورۂ فتح میں حق تعالیٰ نے واقعہ حدیبیہ کو فتح مبین فرمایا۔ یہ واقعہ حدیبیہ کے اہم اجزاء تھے جن سے اگلی آیات کے سمجھنے میں سہولت ملیگی اب آیات کی تفسیر دیکھئے۔

لِیَغۡفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِکَ وَ مَا تَاَخَّرَ، اسمیں لیغفر کا لام اگر تعلیل یعنی بیان علت کے لئے لیا جائے تو حاصل اسکا یہ ہے کہ یہ فتح مبین آپ کو اس لئے دی گئی ہے تاکہ آپ کو یہ تین کمالات حاصل ہوجائیں جن کا اس آیت میں ذکر ہے، ان میں پہلی چیز تمام اگلی پچھلی لغزشوں اور خطاؤں کی معافی ہے۔ سورۂ محمد میں پہلے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ انبیاء علیہم السّلام گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں ان کی طرف قرآن میں جہاں کہیں ذنب یا عصیان وغیرہ کے الفاظ منسوب کئے گئے وہ انکے مقام عالی کی مناسبت سے ایسے کاموں کے لئے استعمال کئے گئے جو خلاف اولیٰ تھے مگر نبوت کے مقام بلند کے اعتبار سے غیر افضل پر عمل کرنا بھی ایسی لغزش ہے جسکو قرآن نے بطور تہدید کے ذنب و گناہ سے تعبیر کیا ہے اور ما تقدّم سے مراد وہ لغزشیں ہیں جو نبوت سے پہلے ہوئیں اور ما تاخر سے مراد وہ لغزشیں جو رسالت و نبوت کے بعد صادر ہوئیں (مظہری) اور فتح مبین کا اس مغفرت کے لئے سبب ہونیکی وجہ یہ ہے کہ اس فتح مبین سے بہت لوگ جوق جوق اسلام میں داخل ہوں گے اور اسلام کی دعوت کا عام ہوجانا آپکی زندگی کا مقصد عظیم اور آپکے اجر و ثواب کو بہت بڑھانے والا ہے اور اجر و ثواب کی زیادتی سبب ہوتی ہے کفارہ سیئات کی (بیان القرآن)

وَ یَہۡدِیَکَ صِرَاطًا مُّسۡتَقِیۡمًا ، یہ دوسری نعمت ہے جو اس فتح مبین پر مرتب ہوئی، یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ صراط مستقیم پر تو آپ اوّل ہی سے ہیں اور نہ صرف خود صراط مستقیم پر ہیں بلکہ

دُنیا کو اسی صراطِ مستقیم کی دعوت دینا آپ کا رات دن کا مشغلہ ہے تو ہجرت کے چھٹے سال فتح مبین کے ذریعہ صراطِ مستقیم کی ہدایت کے کیا معنی ہیں اسکا جواب سُورۂ فاتحہ کی تفسیر لفظ ہدایت کی تحقیق میں گزر چکا ہے کہ ہدایت ایک ایسا مفہوم عام ہے کہ جس کے درجات غیر متناہی ہیں وجہ یہ ہے کہ ہدایت کے معنی منزلِ مقصود کا راستہ دکھلانا یا اُس پر پہنچانا ہے اور اصل منزلِ مقصود ہر انسان کی حق تعالیٰ کی رضا اور قرب حاصل کرنا ہے اور اس رضا و قرب کے متفاوت درجات بے شمار ہیں، ایک درجہ حاصل ہونے کے بعد دوسرے اور تیسرے درجہ کی ضرورت باقی رہتی ہے جس سے کوئی بڑے سے بڑا ولی بلکہ نبی و رسُول بھی بے نیاز نہیں ہو سکتا، اسی لئے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کی دُعا نماز کی ہر رکعت میں کرنیکی تعلیم جیسے اُمت کو ہے خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہے جس کا حاصل صراطِ مستقیم کی ہدایت یعنی اللہ تعالیٰ کے قربِ رضا کے درجات میں ترقی حاصل کرنا ہی اس فتح مبین پر حق تعالیٰ نے اسی قربِ رضا کا کوئی بہت اعلیٰ مقام آپکو عطا فرمایا جس کو یھدیك کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے

وَيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا، یہ تیسری نعمت ہے جو اس فتح مبین پر مرتب ہوئی کہ حق تعالیٰ کی امداد و اعانت جو آپکو ہمیشہ حاصل رہی ہے اسوقت اس مدد کا ایک بڑا درجہ آپ کو دیا گیا

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا

وہی ہے جس نے اُتارا اطمینان دل میں ایمان والوں کے تاکہ اور بڑھ جائے

اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ۭ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَكَانَ

ان کو ایمان اپنے ایمان کے ساتھ اور اللہ کے ہیں سب لشکر آسمانوں کے اور زمین کے اور اللہ

اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ

ہے خبردار حکمت والا تاکہ پہنچادے ایمان والے مردوں کو اور ایمان والی عورتوں کو باغوں میں

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ

نیچے بہتی ہیں اُن کے نہریں ہمیشہ رہیں ان میں اور اُتار دے اُن پر سے

سَيِّاٰتِهِمْ ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝ وَّيُعَذِّبَ

انکی بُرائیاں اور یہ ہے اللہ کے یہاں بڑی مراد ملنی اور تاکہ عذاب کرے

الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّاۗنِّيْنَ

دغاباز مردوں کو اور دغاباز عورتوں کو اور شرک والے مردوں کو اور شرک والی عورتوں کو جو اٹکلیں کرتے ہیں

بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ۭ عَلَيْهِمْ دَاۗىِٕرَةُ السَّوْءِ ۚ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ

اللہ پر بُری اٹکلیں اُنہی پر پڑے پھیر مصیبت کا اور غصہ ہوا اللہ اُن پر

وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ۚ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۶﴾ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ

اور لعنت کی اُن کو اور تیار کی اُنکے واسطے دوزخ، اور بُری جگہ پہنچے اور اللہ کے ہیں سب لشکر آسمانوں کے

وَالْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۷﴾

اور زمین کے اور ہے اللہ زبردست حکمت والا

خُلاصۂ تفسیر

وہ خدا ایسا ہے جس نے مسلمانوں کے دلوں میں تحمل پیدا کیا (جسکے دو اثر ہیں ایک بیعت جہاد کے وقت اسکی طرف مسابقت اور عزم وہمت جیساکہ بیعت رضوان کے واقعہ میں اوپر ذکر آچکا ہے اور دوسرا اثر کفار کی بیجا ضد کے وقت اپنے جوش اور غیظ و غضب کو قابو میں رکھنا جسکا ذکر اس واقعہ کے جزو دہم میں تفصیل کے ساتھ آچکا ہے اور آگے بھی فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ میں آئے گا) تاکہ اُن کے پہلے ایمان کیساتھ اُن کا ایمان اور زیادہ ہو (کیونکہ دراصل اطاعتِ رسول ذریعہ ہے نورِ ایمان میں زیادتی کا اور اس واقعہ میں ہر پہلو سے مکمل اطاعتِ رسول کا امتحان ہو گیا کہ جب رسول نے دعوتِ جہاد کے لئے بُلایا اور بیعت لی تو بڑی خوشدلی اور مسابقت کے ساتھ سب نے بیعت کی اور جہاد کے لئے تیار ہو گئے اور جب حکمت و مصلحت کے پیشِ نظر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قتال سے روکا اور سب صحابہ جوشِ جہاد میں قتال کے لئے بے قرار تھے مگر اطاعتِ رسول میں سرِ تسلیم خم کر دیا اور قتال سے باز رہے۔) اور آسمان و زمین کے سب لشکر (جیسے ملائکہ اور سب مخلوقات) اللہ ہی کے (لشکر) ہیں (اسلئے کفار کی شکست اور دینِ اسلام کی سربلندی کے لئے اللہ تعالیٰ تمھارے قتال و جہاد کا محتاج نہیں وہ اگر چاہیں تو اپنے فرشتوں کے لشکر بھیجدیں جیساکہ بدر۔ احزاب۔ حنین کے غزوات میں اسکا مشاہدہ ہو چکا، اور یہ لشکر بھیجنا بھی مسلمانوں کی ہمت بڑھانے کے لئے ہے ورنہ ایک فرشتہ بھی سب کیلئے کافی ہے اسلئے تم لوگوں کو نہ تو کفار کی کثرت دیکھ کر جہاد و قتال میں کوئی تردد ہونا چاہیئے اور نہ جسوقت اللہ و رسول کا حکم ترکِ قتال کا ہوا سوقت ترکِ قتال میں بھی کوئی تردد ہونا چاہیئے کہ افسوس صلح ہو گئی اور کفار بچ گئے ان کو سزا نہ ہوئی اور قتال یا ترکِ قتال کے نتائج اور عواقب کو اللہ تعالیٰ ہی زیادہ جانتا ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ (مصلحتوں کا) بڑا جاننے والا حکمت والا ہے (جب قتال میں حکمت ہوتی ہے اسکا حکم دیتا ہے اور جب ترکِ قتال میں مصلحت ہوتی ہے اُسکا حکم فرماتا ہے اسلئے مسلمانوں کو چاہیئے کہ دونوں حالتوں میں اپنے جذبات کو امرِ رسول کے تابع رکھیں جو سبب ہے زیادتِ ایمان کا۔ آگے زیادتی ایمان کے ثمرہ کا بیان ہے یعنی) تاکہ اللہ تعالیٰ

(اس اطاعت کی بدولت) مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو ایسی بہشتوں میں داخل کرے جنکے نیچے نہریں جاری ہونگی جن میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور تاکہ (اس اطاعت کی بدولت) اُن کے گناہ دُور کردے (کیونکہ اطاعتِ رسُول میں گناہوں سے توبہ اور اعمالِ صالحہ سب داخل ہیں جو تمام سیئات اور گناہوں کا کفارہ ہوتے ہیں) اور یہ (جو کچھ مذکور ہوا) اللہ کے نزدیک بڑی کامیابی ہے (اس آیت میں اوّل قلوبِ مؤمنین پر سکینت اور تحمل نازل کرنیکا انعام ذکر فرمایا پھر یہ انعام ایمان کی زیادتی کا بذریعہ اطاعتِ رسُول سبب بنا اور اطاعتِ رسول دخولِ جنت کا سبب بنی اسلئے یہ سب اُمور مؤمنین کے قلوب میں نزولِ سکینت پر مرتب ہوئے، آگے اسی سکینت پر مرتب کرکے منافقین کی اس سے محرومی) اور (اس محرومی کے سبب سے گرفتارِ عذاب ہونا بیان فرماتے ہیں یعنی یہ سکینت مسلمانوں کے قلوب پر نازل فرمائی اور کفار کے قلوب پر نہیں فرمائی) تاکہ اللہ تعالیٰ منافق مردوں اور منافق عورتوں کو اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو (بوجہ ان کے کفر کے) عذاب دے جو کہ اللہ کے ساتھ بُرے بُرے گمان رکھتے ہیں (اس بُرے گمان سے مراد باعتبارِ سیاقِ کلام کے اُن لوگوں کا گمان ہے جن کو عمرہ کے لئے حدیبیہ کے سفر کی دعوت دی گئی اور انھوں نے انکار کردیا اور باہم یہ کہا کہ یہ لوگ اہلِ مکہ سے ہمیں لڑانا چاہتے ہیں ان کو جانے دو یہ انکے ہاتھ سے بچکر نہیں آویں گے ایسا کہنے والے لوگ منافقین ہی ہوسکتے ہیں، اور اپنے مفہومِ عام کے اعتبار سے سارے عقائدِ کفریہ شرکیہ اسی گمانِ بد میں داخل ہیں ان سب کے لئے وعید ہے کہ دُنیا میں) ان پر بُرا وقت پڑنے والا ہے (چنانچہ چند ہی روز کے بعد مقتول اور محبوس ہوئے اور منافقین کی تمام عمر حسرت و پریشانی میں کٹی کہ اسلام بڑھتا تھا اور وہ گھٹتے جاتے تھے یہ تو دُنیا میں ہوا) اور (آخرت میں) اللہ تعالیٰ اُن پر غضبناک ہوگا اور اُن کو رحمت سے دُور کردیگا اور اُن کے لئے اس نے دوزخ تیار کر رکھی ہے اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے اور (آگے اس وعید کی تاکید ہے کہ) آسمان اور زمین کے سب لشکر اللہ ہی کے ہیں اور اللہ تعالیٰ زبردست (یعنی پوری قدرت والا) ہے اگر چاہتا اپنے کسی بھی لشکر سے ان سب کی ایک دم صفائی کر دیتا کہ یہ اسکے مستحق ہیں لیکن چونکہ وہ) حکمت والا ہے (اس لئے بمصلحت سزا میں مہلت دیتا ہے۔)

معارف و مسائل

شروع سُورت کی تین آیتوں میں اُن خاص انعامات کا ذکر ہے جو اس فتح مبین میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر مبذول ہوئے۔ بعض صحابہ جو سفر حدیبیہ میں ساتھ تھے انھوں نے عرض کیا کہ یا رسُول اللہ یہ انعامات تو آپکے لئے ہیں اللہ آپ کو مبارک فرمائے ہمارے لئے کیا ہے

اس پر یہ آیات نازل ہوئیں ان میں اصالۃً حاضرین حدیبیہ اور بیعت رضوان پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کا ذکر ہے اور چونکہ وہ انعامات ایمان اور اطاعتِ رسول کے سبب ملے اس حیثیت سے سب مومنین کو بھی شامل ہے کہ جو بھی ایمان اور اطاعت میں کامل ہوگا وہ ان انعامات کا مستحق ہوگا۔

إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ شَٰهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ﴿٨﴾ لِّتُؤْمِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَ

ہم نے تجھ کو بھیجا احوال بتانے والا اور خوشی اور ڈر سنانے والا تاکہ تم لوگ یقین لاؤ اللہ پر اور

رَسُولِهِۦ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ ۚ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴿٩﴾

اسکے رسول پر اور اسکی مدد کرو اور اسکی عظمت رکھو اور اسکی پاکی بولتے رہو صبح اور شام

إِنَّ ٱلَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ ٱللَّهَ يَدُ ٱللَّهِ فَوْقَ

تحقیق جو لوگ بیعت کرتے ہیں تجھ سے وہ بیعت کرتے ہیں اللہ سے اللہ کا ہاتھ ہے اوپر انکے

أَيْدِيهِمْ ۚ فَمَن نَّكَثَ فَإِنَّمَا يَنكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِۦ ۖ وَمَنْ أَوْفَىٰ

ہاتھ کے پھر جو کوئی قول توڑے سو توڑتا ہے اپنے نقصان کو اور جو کوئی پورا کرے

بِمَا عَٰهَدَ عَلَيْهُ ٱللَّهَ فَسَيُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿١٠﴾ ع

اس چیز کو جس پر اقرار کیا اللہ سے تو وہ اس کو دے گا بدلہ بہت بڑا

ع ۱۰/۹

خلاصۂ تفسیر

(اے محمد صلے اللہ علیہ سلم) ہمنے آپکو (اعمالِ اُمت پر قیامت کے دن) گواہی دینے والا (عموماً) اور (دُنیا میں خصوصاً مسلمانوں کے لئے) بشارت دینے والا اور (کافروں کے لئے) ڈرانے والا کر کے بھیجا ہے (اور اے مسلمانو، ہم نے اُن کو اسلئے رسول بنا کر بھیجا ہے) تاکہ تم لوگ اللہ پر اور اسکے رسول پر ایمان لاؤ اور اُس (کے دین) کی مدد کرو اور اسکی تعظیم کرو (عقیدۃً بھی کہ اللہ تعالیٰ کو تمام کمالات کیساتھ موصوف اور تمام نقائص اور عیوب سے پاک سمجھو اور عملاً بھی کہ اُس کی اطاعت کرو) اور صبح و شام اُسکی تسبیح (و تقدیس میں لگے رہو (اگر اس تسبیح کی تفسیر نماز سے کیجائے تو صبح شام کی فرض نمازیں مُراد ہونگی ورنہ مطلق ذکر اگرچہ مستحب ہی ہو مراد ہوگا۔ آگے بعض حقوق خاصہ کے متعلق ارشاد ہے کہ) جو لوگ آپ سے (حدیبیہ کے روز اس بات پر) بیعت کر رہے ہیں (یعنی بیعت کر چکے ہیں کہ جہاد سے بھاگیں گے نہیں) تو وہ (واقع میں) اللہ تعالیٰ سے بیعت کر رہے ہیں (کیونکہ مقصود آپ سے اس پر بیعت کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام بجا لاویں گے اور جب یہ بات ہے تو گویا) خدا کا ہاتھ انکے ہاتھوں پر ہے پھر (بیعت کے بعد) جو شخص عہد

توڑے گا (یعنی بجائے اطاعت کے مخالفت کریگا) تو اُسکے عہد توڑنے کا وبال اُسی پر پڑیگا اور جو شخص اس بات کو پورا کریگا جس پر (بیعت میں) خدا سے عہد کیا ہے تو عنقریب خدا اُس کو بڑا اجر دیگا۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں اللہ تعالیٰ کے اُن انعامات کا ذکر تھا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپکی اُمت پر خصوصاً بیعتِ رضوان کے شرکار پر مبذول ہوئے، اور چونکہ ان انعامات کا عطا کرنے والا اللہ اور واسطہ عطا نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہیں اسکی مناسبت سے آیاتِ مذکورہ میں ان کے حقوق اور تعظیم و تکریم کا ذکر ہے اوّل رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے آپ کی تین صفات بیان فرمائیں۔ شاہد، بشیر، نذیر۔ شاہد کے معنی گواہ کے ہیں مراد اس کی وہی ہے جو سورۂ نسار کی آیت فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا کی تفسیر میں معارف القرآن جلد دوم صفحہ ۴۱۹ میں گزر چکی ہے کہ ہر نبی اپنی اُمت کی بابت اس بات کی گواہی دیگا کہ اُسنے اللہ کا پیغام اُمت کو پہنچا دیا پھر کسی نے اطاعت کی کسی نے نافرمانی۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اُمت کے متعلق گواہی دیں گے۔ سُورۂ نسار کی آیت کی تفسیر میں قرطبی نے لکھا ہے کہ انبیار کی یہ گواہی اپنے زمانے کے موجود لوگوں کے متعلق ہوگی کہ ان کی دعوتِ حق کو کس نے قبول کیا اور کس نے نافرمانی کی، اسی طرح رسُول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ گواہی اپنے زمانے کے لوگوں کے متعلق ہوگی۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ گواہی تمام اُمت کے اعمال طاعات و سیئات پر ہوگی کیونکہ بعض روایات کے مطابق اُمت کے اعمال صبح شام رسُول اللہ کے سامنے فرشتے پیش کرتے ہیں اسلئے آپ تمام اُمت کے اعمال سے باخبر ہونگے (ذکرہ القرطبی عن سعید بن المسیب رح) اور بشیر کے معنی بشارت دینے والا، نذیر کے معنی ڈرانے والا۔ مُراد یہ ہے کہ آپ اُمت کے مؤمنین اور اطاعت کرنے والوں کو جنت کی بشارت دینے والے ہیں اور کفار فجار کو عذاب سے ڈرانے والے ہیں آگے رسُول کو بھیجنے کا مقصد یہ بتلایا گیا کہ تم لوگ اللہ اور اسکے رسُول پر ایمان لاؤ۔ اور ایمان کے ساتھ مزید تین اوصاف کا ذکر فرمایا ہے جو مومنین میں ہونے چاہئیں تُعَزِّرُوهُ۔ تُوَقِّرُوهُ اور تُسَبِّحُوهُ تُعَزِّرُوهُ، تعزیر سے مشتق ہے جس کے معنی مدد کرنے کے ہیں اور سزا کو جو تعزیر کہا جاتا ہے وہ بھی اسلئے کہ مجرم کی مدد حقیقی اسمیں ہے کہ اس پر سزا جاری کیجائے (مفردات القرآن راغب) اور تُوَقِّرُوهُ، توقیر سے مشتق ہے جسکے معنی ہیں تعظیم، اور تُسَبِّحُوهُ، تسبیح سے مشتق ہے جس کے معنی پاکی بیان کرنے کے ہیں انمیں آخری لفظ تو متعین ہے کہ اللہ ہی کے لئے ہو سکتا ہے اسلئے تسبحوہ کی ضمیر میں بجز اس کے کوئی احتمال نہیں کہ حق تعالیٰ کیطرف راجع ہو اسی لئے اکثر حضرات نے پہلے دونوں جملوں کی ضمیریں بھی اللہ تعالیٰ کیطرف راجع کر کے معنی یہ قرار دیئے ہیں کہ ایمان لاؤ اور اللہ کی یعنی اسکے دین اور رسُول

کی مدد کرو اور اسکی تعظیم کرو اور اسکی تسبیح کرو۔ اور بعض حضرات نے پہلے دو جملوں کی ضمیر رسول کیطرف راجع کر کے مطلب یہ قرار دیا کہ رسول کی مدد کرو اور تعظیم کرو اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرو مگر بعض مفسرین نے فرمایا کہ اسمیں انتشار ضمائر لازم آتا ہے جو بلاغت کے خلاف ہے واللہ اعلم۔ اسکے بعد اس بیعت کا ذکر ہے جسکا واقعہ قصہ حدیبیہ کے جزو دہم میں گزر چکا ہے۔ اس بیعت کے متعلق حق تعالےٰ نے ارشاد فرمایا کہ جن لوگوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر یہ بیعت کی چونکہ مقصود اس سے اللہ کے حکم کی تعمیل اور رضاجوئی ہے اسلئے گویا خود اللہ تعالیٰ سے بیعت کی اور جب انھوں نے رسول کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تو گویا اللہ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ اللہ کا ہاتھ متشابہات میں سے ہے جس کی کیفیت اور حقیقت نہ کسی کو معلوم ہے نہ معلوم کرنے کی فکر میں رہنا درست ہے، اس بیعت کی فضیلت آگے بھی آرہی ہے

لفظ بیعت دراصل کسی خاص کام پر عہد لینے کا نام ہے اسکا قدیم اور مسنون طریقہ باہم عہد کرنے والوں کا ہاتھ پر ہاتھ رکھنا ہے اگرچہ ہاتھ پر ہاتھ رکھنا شرط اور ضروری نہیں۔ بہرحال جس کام کا کسی سے عہد کیا جائے اسکی پابندی شرعاً واجب و ضروری ہے اور خلاف ورزی حرام ہے اسی لئے آگے فرمایا کہ جو شخص اس عہد بیعت کو توڑیگا تو کچھ اپنا ہی نقصان کریگا اللہ اور اسکے رسول کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا اور جو اس عہد کو پورا کریگا تو اس کو اللہ تعالیٰ بڑا اجر دینے والے ہیں۔

سَيَقُولُ لَكَ الْمُخَلَّفُونَ مِنَ الْأَعْرَابِ شَغَلَتْنَا أَمْوَالُنَا وَأَهْلُونَا

اب کہیں گے تجھ سے پیچھے رہ جانے والے گنوار ہم کام میں لگے رہ گئے اپنے مالوں کے اور گھر والوں کے

فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ يَقُولُونَ بِأَلْسِنَتِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۚ قُلْ

سو ہمارا گناہ بخشوا وہ کہتے ہیں اپنی زبان سے جو ان کے دل میں نہیں تو کہہ

فَمَن يَمْلِكُ لَكُم مِّنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ

کس کا کچھ بس چلتا ہے اللہ سے تمھارے واسطے اگر وہ چاہے تمھارا نقصان یا چاہے تمھارا

نَفْعًا ۚ بَلْ كَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿١١﴾ بَلْ ظَنَنتُمْ أَن

فائدہ بلکہ اللہ ہے تمھارے سب کاموں سے خبردار کوئی نہیں تم نے تو خیال

لَّن يَنقَلِبَ الرَّسُولُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَىٰ أَهْلِيهِمْ أَبَدًا وَزُيِّنَ

کیا تھا کہ پھر کر نہ آئے گا رسول اور مسلمان اپنے گھر کبھی اور کھب گیا

ذَٰلِكَ فِي قُلُوبِكُمْ وَظَنَنتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ وَكُنتُمْ قَوْمًا بُورًا ﴿١٢﴾ وَ

تمھارے دل میں یہ خیال اور اٹکل کی تم نے بری اٹکلیں اور تم لوگ تھے تباہ ہونے والے اور

مَن لَّمْ يُؤْمِن بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ فَإِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ سَعِيرًا ﴿١٣﴾

جو کوئی یقین نہ لائے اللہ پر اور اسکے رسول پر تو ہمنے تیار کر رکھی ہے منکروں کے واسطے دہکتی آگ

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ

اور اللہ کے لئے ہے راج آسمانوں کا اور زمین کا بخشے جس کو چاہے اور عذاب میں ڈالے

مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۴﴾

جس کو چاہے اور ہے اللہ بخشنے والا مہربان

خُلاصۂ تفسیر

جو دیہاتی (اس سفر حُدیبیہ سے) پیچھے رہ گئے (شریک سفر نہیں ہوئے) وہ عنقریب (جبکہ آپ مدینہ پہنچیں گے) آپ سے (بات بنانے کے طور پر) کہیں گے کہ (ہم جو آپکے ساتھ شریک نہیں ہوئے وجہ اسکی یہ ہوئی کہ) ہم کو ہمارے مال اور عیال نے فرصت نہ لینے دی (یعنی انکی ضروریات میں مشغول رہے) تو ہمارے لئے (اس کوتاہی کی) معافی کی دُعا کر دیجئے (آگے حق تعالیٰ اُن کی تکذیب فرماتے ہیں کہ) یہ لوگ اپنی زبان سے وہ باتیں کہتے ہیں جو اُن کے دل میں نہیں ہیں (آگے آپ کو تلقین ہے کہ یہ لوگ جب آپ سے یہ عذر پیش کریں تو) آپ کہدیجئے کہ (اول تو یہ عذر اگر سچا بھی ہوتا تو بمقابلہ اللہ و رسُول کے حکم قطعی کے محض عذر لنگ اور باطل ہوتا) سو (ہم پوچھتے ہیں کہ) وہ کون ہے جو خدا کے سامنے تمھارے لئے (نفع و نقصان میں) کسی چیز کا اختیار رکھتا ہو اگر اللہ تعالیٰ تم کو کوئی نقصان یا کوئی نفع پہنچانا چاہے (یعنی تمھاری ذات یا تمھارے مال اور عیال میں جو نفع یا نقصان تقدیر الٰہی میں مقدر ہو چکا ہے اسکے خلاف کرنیکا کسی کو اختیار نہیں۔ البتہ شریعتِ اسلام نے بہت سے مواقع پر اسطرح کے خطرات کا عذر قبول کر کے رخصت دیدی ہے بشرطیکہ وہ عذر واقعی ہو، اور جہاں شریعت نے اس عذر کو قبول نہیں کیا اور رخصت نہیں دی بلکہ حکمِ قطعی کر دیا جیساکہ مسئلہ زیر بحث میں ہے کہ سفر حدیبیہ کے لئے اللہ و رسُول نے گھر بار کے مشاغل کو قابلِ قبول عذر قرار نہیں دیا اگرچہ وہ واقعی ہو۔ دوسرے یہ عذر جو تم کر رہے ہو واقعی اور سچا بھی نہیں جیساکہ آگے آتا ہے اور تم سمجھتے ہو گے کہ مجھ کو اس جھوٹ کی خبر نہیں ہوئی) بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ (نے جو کہ) تمھارے سب اعمال پر مطلع ہے (مجھ کو بذریعہ وحی اطلاع کر دی ہے کہ تمھاری غیر حاضری کیوجہ وہ نہیں جو تم بیان کر رہے ہو) بلکہ (اصل وجہ یہ ہے کہ) تمنے یہ سمجھا کہ رسول اور مؤمنین اپنے گھر والوں میں کبھی لوٹ کر نہ آویں گے (بلکہ مشرکین سب کی صفائی کر دیں گے) اور یہ بات تمھارے دلوں میں اچھی بھی معلوم ہوتی تھی (بوجہ اللہ و رسُول کی عداوت کے تمھاری دلی تمنا بھی تھی) اور تمنے بُرے بُرے گمان کئے اور تم (ان بُرے گمانوں کیوجہ سے جو کہ خیالاتِ کفریہ ہیں) برباد ہونیوالے لوگ ہو گئے اور (اگر ان وعیدوں کو سنکر تم اب بھی دل سے ایمان لے آؤ تو خیر ورنہ) جو شخص اللہ پر

اور اسکے رسُول پر ایمان نہ لاویگا تو ہم نے کافروں کے لئے دوزخ تیار کر رکھی ہے اور (مومن وغیر مومن کے لئے مذکورہ قانون مقرر کرنے سے تعجب نہ کیا جائے کیونکہ) تمام آسمان و زمین کی سلطنت اللہ ہی کی ہے وہ جسکو چاہے بخشدے اور جس کو چاہے سزا دے اور (کافر اگرچہ مستحق عذاب ہوتا ہے لیکن) اللہ تعالیٰ بڑا غفور و رحیم ہے (کہ وہ بھی سچے دل سے ایمان لے آویں تو اُن کو بھی بخشدیتا ہے)

معارف و مسائل

یہ مضمون جو اوپر مذکور ہوا اُن اعراب کے متعلق ہے جن کو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سفر حدیبیہ میں ساتھ چلنے کا حکم کیا تھا مگر اُنھوں نے بہانہ بازی سے کام لیا جسکا بیان قصۂ حدیبیہ کے جزو اوّل میں ہوچکا ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنمیں بعض حضرات بعد میں تائب اور مخلص ہوگئے تھے

سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انْطَلَقْتُمْ إِلَىٰ مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوهَا ذَرُونَا

اب کہیں گے پیچھے رہ گئے ہوئے جب تم چلو گے غنیمتیں لینے کو چھوڑو ہم بھی چلیں

نَتَّبِعْكُمْ ۖ يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللَّهِ ۚ قُلْ لَنْ تَتَّبِعُونَا

تمھارے ساتھ چاہتے ہیں کہ بدلدیں اللہ کا کہا تو کہدے تم ہمارے ساتھ ہرگز نہ چلوگے

كَذَٰلِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِنْ قَبْلُ ۖ فَسَيَقُولُونَ بَلْ تَحْسُدُونَنَا ۚ بَلْ

یوں ہی کہدیا اللہ نے پہلے سے پھر اب کہیں گے نہیں تم تو جلتے ہو ہمارے فائدہ سے کوئی نہیں

كَانُوا لَا يَفْقَهُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿١٥﴾ قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ

پر وہ نہیں سمجھتے ہیں مگر تھوڑا سا کہدے پیچھے رہ جانے والے گنواروں سے

سَتُدْعَوْنَ إِلَىٰ قَوْمٍ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ تُقَاتِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ ۖ

آئندہ تم کو بُلائیں گے ایک قوم پر بڑے سخت لڑنے والے تم اُن سے لڑوگے یا وہ مسلمان ہونگے

فَإِنْ تُطِيعُوا يُؤْتِكُمُ اللَّهُ أَجْرًا حَسَنًا ۖ وَإِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ

پھر اگر حکم مانو گے دیگا تم کو اللہ بدلہ اچھا اور اگر پلٹ جاؤ گے جیسے پلٹ گئے تھے

مِنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٦﴾ لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَىٰ حَرَجٌ

پہلی بار دیگا تم کو ایک عذاب دردناک اندھے پر تکلیف نہیں

وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ ۗ وَمَنْ

اور نہ لنگڑے پر تکلیف اور نہ بیمار پر تکلیف اور جو کوئی

يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ

حکم مانے اللہ کا اور اسکے رسول کا اسکو داخل کریگا باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں

وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿١٧﴾

اور جو کوئی پلٹ جائے اُس کو عذاب دے گا دردناک

خُلاصۂ تفسیر

جو لوگ (سفر حدیبیہ سے) پیچھے رہ گئے وہ عنقریب جب تم (خیبر کی) غنیمتیں لینے چلو گے (مطلب یہ ہے کہ خیبر فتح کرنے کے لئے چلو گے جہاں غنیمت ملنے والی ہے تو یہ لوگ تم سے) کہیں گے کہ ہم کو بھی اجازت دو کہ ہم تمہارے ساتھ چلیں (وجہ اس درخواست کی مالِ غنیمت کی طمع تھی جسکا حاصل ہونا قرائن سے ان کو معلوم اور متوقع تھا بخلاف سفر حدیبیہ کے کہ اسمیں زحمت بلکہ ہلاکت زیادہ متوقع تھی، اسکے متعلق حق تعالیٰ نے فرمایا کہ) وہ لوگ یُوں چاہتے ہیں کہ خدا کے حکم کو بدل ڈالیں (یعنی حکم اللہ کا یہ تھا کہ اس غزوہ میں صرف وہ لوگ جائیں جو حدیبیہ اور بیعتِ رضوان میں شریک ہوئے انکے سوا اور کوئی نہ جائے خصوصاً اُن لوگوں میں جنھوں نے سفر حدیبیہ میں تخلف اختیار کیا اور بہانہ بازی کی سو) آپ کہدیجئے کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے (یعنی تمہاری یہ درخواست ہم منظور نہیں کر سکتے کیونکہ اسمیں حکم خدا تعالیٰ کی تبدیلی کا گناہ ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے پہلے سے یُوں ہی فرما دیا ہے (یعنی حدیبیہ سے واپسی ہی میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیدیا تھا کہ غزوۂ خیبر میں اہل حدیبیہ کے سوا کوئی نہ جائے گا اور یہ حکمِ خداوندی بظاہر قرآن میں مذکور نہیں اس سے معلوم ہوا کہ یہ حکم وحی غیر متلو کے ذریعہ آپ کو ملا تھا جو احادیث کے ذریعہ بیان کی جاتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ حدیبیہ سے واپسی میں جو سورت فتح نازل ہوئی اور اسمیں یہ آیت آئی اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا، اس فتح قریب سے مراد فتح خیبر ہی ہے تو اس آیت نے اشارہ کر دیا کہ یہ فتح خیبر اُنہی اہلِ حدیبیہ کو نصیب ہوگی)، اور جب آپ اُن کو یہ جواب دیں گے) تو وہ لوگ کہیں گے (ظاہر یہی کہ آپکے سامنے کہنا مراد نہیں بلکہ اَوروں سے کہیں گے کہ ہمارے ساتھ نہ لینے کو جو خدا کا حکم بتلایا جاتا ہے بات یہ نہیں) بلکہ تم لوگ ہم سے حسد کرتے ہو (اسلئے ہمارا شریک ہونا گوارا نہیں حالانکہ مسلمانوں میں حسد کا کوئی شائبہ نہیں) بلکہ خود یہ لوگ بہت کم بات سمجھتے ہیں (اگر سمجھ پوری ہوتی تو اللہ کے اس حکم کی حکمت بآسانی سمجھ سکتے تھے کہ حدیبیہ میں ان حضرات نے ایک بہت بڑے خطرہ اور بڑے امتحان کا کام کیا منافقین نے اپنی دُنیوی اغراض کو مقدم رکھا یہ وجہ انکی تخصیص اور انکی محرومی کی ہے۔ یہانتک مضمون خیبر کے متعلق تھا آگے ایک دوسرے واقعہ کے متعلق گفتگو کے لئے ارشاد ہوتا ہے کہ) آپ ان پیچھے رہنے والے دیہاتیوں سے (یہ بھی) کہدیجئے کہ (اگر ایک خیبر میں نہ گئے تو نہ سہی ثواب حاصل کرنے کے اور بھی مواقع آنے والے ہیں چنانچہ)

عنقریب تم لوگ ایسے لوگوں (سے لڑنے) کی طرف بلائے جاؤ گے جو سخت لڑنے والے ہونگے (مراد اس سے فارس و روم کے غزوات ہیں (کذافی الدر عن ابن عباسؓ) کیونکہ ان کی فوجیں تربیت یافتہ اور باسامان تھیں کہ) یا تو اُن سے لڑتے رہو یا وہ مطیع (اسلام) ہو جاویں (خواہ اسلام قبول کر کے یا اسلامی حکومت کی اطاعت اور جزیہ دینا قبول کر کے۔ مطلب یہ کہ تم اس کام کے لئے بلائے جاؤ گے) سو (اُس وقت) اگر تم اطاعت کرو گے (اور اُن سے جہاد کرو گے) تو تم کو اللہ تعالیٰ نیک بدلہ دیگا اور اگر تم (اُسوقت بھی) روگردانی کرو گے جیسا اسکے قبل (حُدیبیہ وغیرہ میں) روگردانی کر چکے ہو تو وہ دردناک عذاب کی سزا دیگا (البتہ دعوتِ جہاد سے معذور لوگ مستثنیٰ ہیں چنانچہ) نہ اندھے پر کوئی گناہ ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی گناہ ہے اور نہ بیمار پر کوئی گناہ ہے اور (اوپر جو مجاہدین کے لئے جنّت و نعمت کے وعدے اور جہاد سے جان چُرانے والوں کے لئے وعیدیں مذکور ہیں انمیں کچھ انہی لوگوں کی تخصیص نہیں بلکہ قاعدہ کلیہ ہے کہ) جو شخص اللہ اور رسُول کا کہنا مانیگا اسکو ایسی جنّتوں میں داخل کریگا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور جو شخص (حکم سے) روگردانی کریگا اس کو دردناک عذاب کی سزا دیگا۔

معارف و مسائل

آیاتِ مذکورہ میں اس واقعہ کا ذکر ہے جو حدیبیہ سے واپسی کے بعد ۷ھ ہجری میں پیش آیا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خیبر کا ارادہ فرمایا تو صرف ان لوگوں کو ساتھ لیا جو سفر حدیبیہ اور بیعت رضوان میں شریک تھے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو خیبر کی فتح اور وہاں سے اموالِ غنیمت ملنے کا وعدہ فرمایا تھا اسوقت دیہات کے وہ لوگ جو سفرِ حُدیبیہ میں باوجود بُلانیکے عذر کر کے پیچھے رہ گئے تھے ان لوگوں نے بھی جہاد خیبر میں ساتھ چلنے کا ارادہ کیا خواہ اس طرح سے کہ اُن کو قرائن سے خیبر کا فتح ہونا اور وہاں مال غنیمت ملنے کی توقع تھی اور یا مُسلمانوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے معاملات اور صلح حدیبیہ کے کچھ برکات دیکھ کر اُن کو جہاد سے پیچھے رہنے پر ندامت ہوئی اور اب شرکتِ جہاد کا ارادہ کیا۔ ان کے جواب میں قرآن نے فرمایا کہ یہ لوگ اللہ کے کلام یعنی اُسکے حکم کو بدلنا چاہتے ہیں۔ يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللَّهِ، اور مراد اس حکم سے غزوۂ خیبر اور اسکے مغانم کا صرف اہلِ حدیبیہ کے ساتھ مخصوص ہونا ہے اور اسکے بعد كَذَٰلِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِنْ قَبْلُ میں بھی یہی تخصیص اہلِ حدیبیہ کا قول ہے مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں تو کہیں اس تخصیص کا ذکر ہے نہیں پھر اس تخصیص کے وعدہ کو کلام اللہ اور قال اللہ کہنا کیسے صحیح ہوا۔

وحیِ الٰہی صرف قرآن میں منحصر نہیں، قرآن کے علاوہ بھی بذریعہ وحی احکام آئے ہیں اور احادیثِ رسول بھی کلام اللہ کے حکم میں ہیں

علماء نے فرمایا کہ یہ تخصیص اہل حدیبیہ کا وعدہ جو اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے اسکا قرآن میں کہیں صراحۃً ذکر نہیں، بلکہ یہ تخصیص اہل حدیبیہ کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے وحی غیر متلو کے ذریعہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سفر حدیبیہ میں فرمایا تھا، اسی کو اس جگہ کلام اللہ اور قال اللہ کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے اس سے معلوم ہوا کہ علاوہ احکام قرآن کے جو احکام احادیثِ صحیحہ میں مذکور ہیں وہ بھی حسب تصریح اس آیت کے کلام اللہ اور قول اللہ میں داخل ہیں۔ جو ملحدین احادیثِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حجتِ دین نہیں مانتے یہ آیتیں انکے الحاد کو کھولنے کے لئے کافی ہیں، رہا یہ معاملہ کہ اسی سورت میں جو سفر حدیبیہ کے شروع میں نازل ہوئی ہے یہ الفاظ قرآن میں موجود ہیں اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا، اور باتفاق مفسرین یہاں فتح قریب سے فتح خیبر مُراد ہے تو اس طرح قرآن میں فتح خیبر کا اور اُس کے غنائم اہلِ حدیبیہ کو ملنے کا وعدہ آگیا وہی اس لفظ کلام اللہ اور قال اللہ کی مُراد ہو سکتی ہے، تو حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں غنیمت کا وعدہ تو ہے مگر اسکا کہیں ذکر نہیں کہ یہ غنیمت اہلِ حدیبیہ کے ساتھ مخصوص ہوگی دوسرے اسمیں شریک نہ ہوسکیں گے یہ تخصیص تو بلاشبہ حدیثِ رسول ہی سے معلوم ہوئی ہے وہی کلام اللہ اور قال اللہ کا مصداق ہے اور بعض حضرات نے جو سورہ توبہ کی آیت کو اسکا مصداق قرار دیا ہے یعنی فَاسْتَأْذَنُوكَ لِلْخُرُوجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوا مَعِيَ عَدُوًّا ۖ اِنَّكُمْ رَضِيتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ تو اس لئے صحیح نہیں کہ یہ آیات غزوہ تبوک کے متعلق آئی ہیں، اور وہ غزوہ خیبر کے بعد ۹ ہجری میں ہوا ہے (قرطبی وغیرہ)

قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا، اس میں جو تاکیدی طور پر متخلفین حدیبیہ سے یہ فرمایا ہے کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں ہوسکتے یہ صرف غزوۂ خیبر کے ساتھ مخصوص ہے آگے کسی اور جہاد میں بھی شریک نہ ہوسکیں یہ اس سے لازم نہیں آتا، یہی وجہ ہے کہ ان متخلفین حدیبیہ میں سے قبائل مزنیہ اور جُہینہ بعد میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیساتھ غزوات میں شریک ہوئے (کما فی الروح عن البحر۔ بیان)

متخلفین حُدیبیہ میں سے بعض لوگ بعد میں تائب ہوکر سچے مسلمان ہوگئے تھے

غزوۂ خیبر کے وقت جتنے متخلفین حدیبیہ تھے سبھی کو اس جہاد کی شرکت سے روکدیا گیا تھا حالانکہ ان میں سب منافق نہیں، بعض مسلمان بھی تھے اور بعض گو اسوقت منافق تھے مگر بعد میں سچے ایمان کی ان کو توفیق ہوگئی تھی اسلئے ایسے لوگوں کی دلجوئی کے لئے اگلی آیات آئیں جنمیں اُن کو تسلی دی گئی ہے کہ اگرچہ غزوۂ خیبر اللہ کے وعدے کیمطابق اہل حدیبیہ کے لئے مخصوص کردیا گیا مگر جو مخلص مسلمان ہیں اور دل سے شرکتِ جہاد چاہتے ہیں اُن کے لئے دوسرے مواقع آنے والے ہیں ان مواقع کو قرآن کریم ایک خاص پیشین گوئی کی صورت میں بیان فرماتا ہے جسکا ظہور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد ہونے

والا ہے۔ ارشاد فرمایا، سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ، یعنی ایک ایسا وقت آنے والا ہے جبکہ تمھیں جہاد کی دعوت دی جائے گی اور یہ جہاد ایک بڑی سخت جنگجو قوم کے ساتھ ہوگا۔ اور تاریخ اسلام شاہد ہے کہ یہ واقعہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں پیش نہیں آیا، کیونکہ اولاً تو آپ کا اس کے بعد اعراب کو کسی غزوہ میں دعوت شرکت دینا ثابت نہیں ثانیاً اسکے بعد کسی ایسی قوم سے مقابلہ بھی نہیں ہوا جسکے بہادر اور سخت ہونیکا قرآن نے ذکر فرمایا ہے کیونکہ غزوۂ تبوک میں اگرچہ مقابلہ ایسی قوم سے تھا مگر نہ اُس غزوہ میں اعراب کو دعوت دینا ثابت ہے اور نہ اسمیں قتال کی نوبت آئی کیونکہ مقابل آدمیوں پر اللہ نے رعب ڈالدیا وہ مقابلہ پر نہیں آئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ بغیر قتال کے واپس آئے اور غزوۂ حنین میں بھی نہ انکو دعوت دینا ثابت ہے اور نہ اُسوقت مقابل کوئی ایسی قوم تھی جو سخت اور ساز وسامان والی ہو۔ اسلئے ائمۂ تفسیر میں سے بعض نے فرمایا ہے کہ مراد اس سے فارس اور روم یعنی کسریٰ و قیصر کی قومیں ہیں جن کیساتھ جہاد حضرت فاروق اعظمؓ کے عہد میں ہوا ہے (ہو قول ابن عباسؓ عطاء و مجاہد و ابن ابی لیلیٰ والحسن قرطبی) اور حضرت رافع بن خدیجؓ نے فرمایا کہ ہم قرآن کی یہ آیت پڑھتے تھے اور ہمیں معلوم نہ تھا کہ اس قوم سے کونسی قوم مراد ہے یہانتک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صدیق اکبرؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں ہمیں بنو حنیفہ اہل یمامہ یعنی مسیلمہ کذاب کی قوم کیساتھ جہاد کرنے کی دعوت دی اسوقت ہم سمجھے کہ یہی قوم اس آیت میں مراد تھی مگر ان دونوں اقوال میں کوئی تضاد و تعارض نہیں ہوسکتا ہے کہ یہ سبھی قومیں اسمیں داخل ہوں۔

امام قرطبیؒ نے اسکو نقل کرکے فرمایا کہ یہ آیت اسکی دلیل ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کی خلافت حق کے مطابق تھی انکی دعوت کا ذکر خود قرآن نے آیتِ مذکورہ میں فرمایا ہے

تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ، حضرت اُبیؓ کی قراءت میں اَوْ يُسْلِمُوْا بغیر نون کے آیا ہے اس لئے قرطبی نے اسکے مطابق حرف اَوْ کو حتّٰی کے معنی میں لیا ہے یعنی اُس قوم سے قتال اسوقت تک ہوتا رہے گا جب تک کہ وہ مطیع فرمانبردار نہ ہوجائیں خواہ اسلام قبول کرکے یا اسلامی حکومت کی اطاعت میں رہنا قبول کرکے۔

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جب اوپر کی آیات میں جہاد کی شرکت سے ہٹنے والوں کے لئے عذاب کی وعید آئی اِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا، تو کچھ معذور لوگ جو صحابۂ کرام میں تھے اُن کو فکر ہوئی کہ ہم تو شرکتِ جہاد کے قابل نہیں، کہیں ہم بھی اس وعید میں شامل نہوں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں اندھے، لنگڑے اور بیمار کو حکم جہاد سے مستثنیٰ کردیا گیا (قرطبی) واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ
تحقیق اللہ خوش ہوا ایمان والوں سے جب بیعت کرنے لگے تجھ سے اس درخت کے نیچے پھر معلوم

مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۱۸﴾
کیا جو اُن کے جی میں تھا پھر اُتارا اُن پر اطمینان اور انعام دیا ان کو ایک فتح نزدیک

وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۹﴾
اور بہت غنیمتیں جن کو وہ لیں گے اور ہے اللہ زبردست حکمت والا

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ
وعدہ کیا ہے تم سے اللہ نے بہت غنیمتوں کا کہ تم ان کو لوگے سو جلدی پہنچا دی تم کو یہ غنیمت اور روک دیا

اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ
لوگوں کے ہاتھوں کو تم سے اور تاکہ ایک نمونہ ہو قدرت کا مسلمانوں کے واسطے اور چلائے تم کو

صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۲۰﴾ وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ۭ
سیدھی راہ اور ایک فتح اور جو تمہارے بس میں نہ آئی وہ اللہ کے قابو میں ہے

وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿۲۱﴾
اور اللہ ہر چیز کر سکتا ہے

خُلاصۂ تفسیر

تحقیق اللہ ان مسلمانوں سے (جو آپ کے ہمسفر ہیں) خوش ہوا جبکہ یہ لوگ آپ سے درخت کے نیچے (جہاد میں ثابت قدم رہنے پر) بیعت کر رہے تھے اور اُن کے دِلوں میں جو کچھ (اخلاص اور عہد کو پورا کرنے کا عزم) تھا اللہ کو وہ بھی معلوم تھا اور (اسوقت) اللہ تعالیٰ نے اُن (کے قلب) میں اطمینان پیدا کر دیا (جس سے اُن کو خدا کا حکم ماننے میں ذرا پس و پیش یا تردّد نہیں ہوا۔ یہ تو معنوی نعمتیں ہوئیں) اور (اسکے ساتھ کچھ محسوس نعمتیں بھی دی گئیں جن میں معنوی نعمتیں بھی شامل تھیں، چنانچہ) اُن کو ایک لگتے ہاتھ فتح دیدی (مراد اس فتح سے فتح خیبر ہے) اور (اس فتح میں) بہت سی غنیمتیں بھی (دیں) جن کو یہ لوگ لے رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑا زبردست (اور) بڑا حکمت والا ہے (کہ اپنی قدرت اور حکمت سے جسوقت جس کے لئے مناسب سمجھتا ہے فتح دیدیتا ہے۔ اور کچھ اسی فتح خیبر پر بس نہیں بلکہ) اللہ تعالیٰ نے تم سے (اور بھی) بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کر رکھا ہے جن کو تم لوگے سو (ان میں سے) سرِدست تم کو یہ دیدی ہے اور (اس کے دینے کے لئے خیبر اور حلفاءِ خیبر کے) لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیئے (یعنی سب کے

دِلوں پر رُعب ڈالدیا کہ اُن کو زیادہ دراز دستی کی ہمت نہ ہوئی اور اس سے تمہارا دُنیوی نفع بھی مقصود تھا تاکہ آرام اور فراغت ملے) اور (دینی نفع بھی تھا) تاکہ یہ (واقعہ) اہلِ ایمان کیلئے (دوسرے وعدوں کے سچے ہونیکا) ایک نمونہ ہوجائے (یعنی خدا کے وعدوں کے سچا ہونے پر اور زیادہ ایمان پختہ ہوجائے) اور تاکہ (اس نمونہ کے ذریعہ) تم کو (آئندہ کے لئے ہر کام میں) ایک سیدھے راستہ پر ڈالدے (مراد اس راستہ سے توکل اور اللہ پر بھروسہ ہے یعنی ہمیشہ کے لئے اس واقعہ کو سوچ کر اللہ پر اعتماد سے کام لیا کرو اس طرح دینی نفع دو ہوگئے ایک علمی اور اعتقادی جس کو ولتکون سے بیان فرمایا ہے، دوسرا عملی واخلاقی جس کو یھدیکم کے الفاظ سے ارشاد فرمایا ہے) اور ایک فتح اور بھی (موعود) ہے جو (اسوقت تک) تمہارے قابو میں نہیں آئی (مراد اس سے فتح مکہ ہے جو اب تک واقع نہیں ہوئی تھی مگر) خدا تعالےٰ اس کو احاطہ (قدرت) میں لئے ہوئے ہے (جب چاہے گا تم کو عطا کردیگا) اور (اسی کی کیا تخصیص ہے) اللہ تعالےٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

معارف و مسائل

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ، اس بیعت سے مُراد بیعتِ حُدیبیہ ہے جس کا ذکر اس سے پہلے بھی اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ میں آچکا ہی یہ آیت بھی اسی سے متعلق اور اس کی تاکید ہے اس آیت میں حق تعالیٰ نے اس بیعت کے شرکاء سے اپنی رضا کا اعلان فرمادیا ہے اسی لئے اسکو بیعتِ رضوان بھی کہا جاتا ہے اور مقصود اس سے اُن شرکاء بیعت کی مدح اور اُن کو اس عہد کے پُورا کرنے کی تاکید ہے۔ صحیحین میں حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ حدیبیہ کے دن ہماری تعداد چودہ سو نفر کی تھی ہم سے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انتم خیر اھل الارض، یعنی تم لوگ تمام روئے زمین کے انسانوں سے بہتر ہو۔ اور صحیح مسلم میں اُمّ بشرؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ لایدخل النّار احد ممّن بایع تحت الشّجرۃ، یعنی جن لوگوں نے اس درخت کے نیچے بیعت کی ہے اُن میں کوئی جہنم میں نہیں جائیگا (مظہری) اس لئے اس بیعت کے شرکاء کی مثال شرکاء غزوۂ بدر کی سی ہے جیسا انکے متعلق قرآن وحدیث میں رضائے الٰہی اور جنّت کی بشارتیں ہیں اسی طرح شرکاء بیعت رضوان کے لئے بھی یہ بشارت آئی ہے۔

یہ بشارتیں اس پر شاہد ہیں کہ ان سب حضرات کا خاتمہ ایمان اور اعمالِ صالحہ مرضیہ پر ہوگا کیونکہ رضائے الٰہی کا یہ اعلان اسکی ضمانت دے رہا ہے۔

صحابۂ کرام پر طعن و تشنیع اور انکی لغزشوں میں غور و بحث اس آیت کیخلاف ہے

تفسیر مظہری میں فرمایا کہ جن خیارِ اُمت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے غفران و مغفرت کا یہ اعلان فرما دیا ہے، اگر اُن سے کوئی لغزش یا گناہ ہوا بھی ہے تو یہ آیت اُس کی معافی کا اعلان ہے۔ پھر انکے ایسے معاملات کو جو مستحسن نہیں ہیں غور و فکر اور بحث و مباحثہ کا میدان بنانا بدبختی اور بظاہر اس آیت کی مخالفت ہے۔ یہ آیت روافض کے قول کی واضح تردید ہے جو ابوبکر و عمر رضؓ اور دوسرے صحابہؓ پر کفر و نفاق کے الزام لگاتے ہیں۔

شجرۂ رضوان

شجرہ، جسکا ذکر اس آیت میں آیا ہے ایک ببول کا درخت تھا اور مشہور یہ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کچھ لوگ وہاں چلکر جاتے اور اس درخت کے نیچے نمازیں پڑھتے تھے۔ حضرت فاروق اعظم رضؓ کو خطرہ ہوا کہ کہیں آئندہ آنے والے جہلا، اسی درخت کی پرستش نہ شروع کر دیں جیسے پچھلی اُمتوں میں اس طرح کے واقعات ہوئے ہیں اس لئے اس درخت کو کٹوا دیا مگر صحیحین میں ہے کہ حضرت طارق بن عبدالرحمٰن فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حج کے لئے گیا تو راستے میں میرا گزر ایسے لوگوں پر ہوا جو ایک مقام پر جمع تھے اور نماز پڑھ رہے تھے میں نے اُن سے پوچھا کہ یہ کونسی مسجد ہے انھوں نے کہا کہ یہ وہ درخت ہے جس کے نیچے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بیعت رضوان لی تھی، میں اسکے بعد حضرت سعید بن مسیب رحؒ کے پاس حاضر ہوا اور اس واقعہ کی خبر اُن کو دی، انھوں نے فرمایا کہ میرے والد ان لوگوں میں سے تھے جو اس بیعتِ رضوان میں شریک ہوئے انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ ہم جب اگلے سال مکہ مکرمہ حاضر ہوئے تو ہمنے وہ درخت تلاش کیا ہمیں بھول ہو گئی اسکا پتہ نہیں لگا۔ پھر سعید بن مسیبؒ نے فرمایا کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہ جو خود اس بیعت میں شریک تھے اُن کو تو پتہ نہیں لگا تمھیں وہ معلوم ہو گیا عجیب بات ہے کیا تم اُنسے زیادہ واقف ہو (روح المعانی) اس سے معلوم ہوا کہ بعد میں لوگوں نے محض اپنے تخمینہ اور اندازہ سے کسی درخت کو متعین کر لیا اور اس کے نیچے حاضر ہونا اور نمازیں پڑھنا شروع کر دیا، فاروق اعظم کو یہ بھی معلوم تھا کہ یہ وہ درخت نہیں پھر خطرہ ابتلائے شرک کا لاحق ہو گیا اسلئے اسکو قطع کرا دیا ہو کیا بعید ہے۔

فتح خیبر

خیبر درحقیقت ایک صوبہ کا نام ہے جسمیں بہت سی بستیاں اور قلعے اور باغات شامل ہیں (مظہری)

وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا، اس فتح قریب سے مُراد باتفاق فتح خیبر ہے جو حدیبیہ سے واپس آنیکے بعد واقع ہوئی ہے بعض روایات کے مطابق تو حدیبیہ سے واپسی کے بعد آپ کا قیام مدینہ منورہ میں صرف دس روز اور دوسری روایت کیمطابق بیس۲۰ روز رہا اسکے بعد خیبر کے لئے روانہ ہو گئے، اور ابن اسحٰق کی روایت کیمطابق آپ ذی الحجہ میں مدینہ طیبہ واپس تشریف لائے اور محرم ۷ سنہ ہجری میں آپ غزوۂ خیبر کے لئے تشریف لے گئے اور ماہ صفر ۷ سنہ ہجری میں خیبر فتح ہوا۔ واقدی کے مغازی میں یہی لکھا ہے اور حافظ ابن حجر رحؒ نے فرمایا کہ یہی راجح ہے (تفسیر مظہری)

بہرحال یہ ثابت ہوا کہ یہ واقعہ فتح خیبر سفر حدیبیہ سے کافی دنوں کے بعد پیش آیا ہے۔ اور سورۂ فتح کا سفر حدیبیہ کے دوران نازل ہونا سب کے نزدیک متفق علیہ ہے البتہ اسمیں اختلاف ہے کہ پوری سورت اُسیوقت نازل ہوئی یا کچھ آیتیں بعد میں آئیں۔ اگر پہلی صورت راجح ہو تو ان آیتوں میں واقعہ خیبر کا بیان بطور پیش گوئی کے ہو اور اسکو بصیغہ ماضی قطعی اور یقینی ہونے کی بنا پر تعبیر کیا گیا، اور اگر دوسرا قول راجح ہو تو یہ ہوسکتا ہے کہ یہ آیتیں بعد وقوع فتح خیبر کے نازل ہوئی ہوں واللہ اعلم۔

وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ، مراد اس سے خیبر کا مالِ غنیمت ہے جس سے مسلمانوں کو سہولت اور فراغ بالی حاصل ہوئی۔

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ ، اس سے مراد تمام اسلامی فتوحات اور انکے غنائم ہیں جو قیامت تک حاصل ہونے والی ہیں۔ پہلے مغانم اہلِ حدیبیہ کے لئے اللہ تعالیٰ کے حکم سے مخصوص کردیئے گئے تھے یہ سب کے لئے عام ہیں۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ تخصیص کا حکم ان آیات میں ذکر نہیں کیا گیا بلکہ وہ جُداگانہ وحی کے ذریعہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بتلایا گیا ہے۔ آپ نے اُس پر عمل کیا اور صحابہ کرام کو بتلایا۔

وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ، اس سے مراد کفار اہلِ خیبر ہیں کہ اُن کو اس جہاد میں کچھ زیادہ زور دکھانے کا موقع اللہ تعالےٰ نے نہیں دیا۔ امام بغوی نے فرمایا کہ قبیلہ غطفان یہود خیبر کا حلیف تھا جب اس قبیلہ نے خبر سُنی کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خیبر پر چڑھائی کی ہے تو یہ لوگ یہود کی مدد کے لئے بڑے ساز و سامان سے نکلے مگر اللہ تعالیٰ نے انکے دلوں میں رعب ڈالدیا اور یہ اس فکر میں پڑگئے کہ اگر ہم اسطرف گئے تو بعید نہیں کہ مسلمانوں کا کوئی لشکر ہمارے پیچھے ہمارے گھروں پر حملہ کردے اسلئے سب ٹھنڈے ہوکر بیٹھ گئے (مظہری)

وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ، اصل ہدایت صراطِ مستقیم کی تو ان حضرات کو پہلے سے حاصل تھی مگر جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے کہ ہدایت کے درجات بیشمار ہیں یہاں وہ درجہ مراد ہے جو پہلے سے حاصل نہ تھا یعنی اللہ پر بھروسہ اور قوتِ ایمان کی زیادتی۔

وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ، یعنی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے اور بہت سی فتوحات کا وعدہ کیا ہے جس پر ابھی اُن کو قدرت نہیں۔ ان فتوحات میں چونکہ سب سے پہلے مکہ مکرمہ کی فتح ہے اس لئے بعض حضرات نے اس سے فتح مکہ مراد لیا ہے مگر الفاظ عام ہیں قیامت تک ہونے والی فتوحات اس میں شامل ہیں (مظہری)

وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّ

اور اگر لڑتے تم سے کافر تو پھیرتے پیٹھ پھر نہ پاتے کوئی حمایتی اور

لَا نَصِيْرًا ﴿۲۲﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۖۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ

نہ مددگار رسم پڑی ہوئی اللہ کی جو چلی آتی ہے پہلے سے اور تو ہرگز نہ دیکھے گا

اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾ وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ

اللہ کی رسم کو بدلتے اور وہی ہے جس نے روک رکھا اُنکے ہاتھوں کو تم سے اور تمھارے ہاتھوں کو اُن سے

بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

بیچ شہر مکہ کے بعد اسکے کہ تمھارے ہاتھ لگا دیا اُن کو اور ہے اللہ جو کچھ تم کرتے ہو

بَصِيْرًا ﴿۲۴﴾ هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

دیکھتا یہ وہی لوگ ہیں جو منکر ہوئے اور روکا تم کو مسجد حرام سے

وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ۭ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ

اور نیاز کی قربانی کو بھی بند پڑی ہوئی اس بات سے کہ پہنچے اپنی جگہ تک، اور اگر نہ ہوتے کتنے ایک مرد ایمان والے

وَنِسَاۗءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَـُٔوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ

اور کتنی عورتیں ایمان والیاں جو تم کو معلوم نہیں یہ خطرہ کہ تم ان کو پیس ڈالتے پھر تم پر انکی وجہ سے

مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوْا

خرابی پڑجاتی بے خبری سے کہ اللہ کو داخل کرنا ہے اپنی رحمت میں جس کو چاہے اگر وہ لوگ ایک

لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۲۵﴾ اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ

طرف ہو جاتے تو آفت ڈالتے ہم منکروں پر عذاب دردناک کی جب رکھی منکروں

كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ

نے اپنے دلوں میں کد نادانی کی ضد پھر اُتارا اللہ نے اپنی طرف کا اطمینان

عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَعَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا

اپنے رسول پر اور مسلمانوں پر اور قائم رکھا ان کو ادب کی بات پر اور وہی تھے

اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۲۶﴾ ع

اس کے لائق اور اس کام کے اور ہے اللہ ہر چیز سے خبردار

ع ۳ ۹ ۱۱

خُلاصۂ تفسیر

اور (چونکہ ان کفّار کے مغلوب ہونے کے مقتضیات موجود تھے جو آگے آتے ہیں اسلئے)

اگر (تم میں یہ صلح نہ ہوتی بلکہ) تم سے یہ کافر لڑتے تو (اُن مقتضیات کی وجہ سے وہ) ضرور پیٹھ پھیر کر بھاگتے، پھر نہ ان کو کوئی یار ملتا نہ مددگار (اور) اللہ تعالیٰ نے (کفار کے لئے) یہی دستور کر رکھا ہے جو پہلے سے چلا آتا ہے (کہ مقابلہ میں اہلِ حق غالب اور اہلِ باطل مغلوب رہے ہیں اور کبھی کسی وقت کسی حکمت مصلحت سے اسمیں تاخیر ہونا اسکے منافی نہیں) اور آپ خدا کے دستور میں (کسی شخص کی طرف سے) ردّ و بدل نہ پاویں گے (کہ خدا تعالیٰ کوئی کام کرنا چاہے اور کوئی اسکو نہ ہونے دے) اور وہ ایسا ہے کہ اس نے انکے ہاتھ تم سے (یعنی تمھارے قتل سے) اور تمھارے ہاتھ اُن (کے قتل) سے عین مکہ (کے قریب) میں (یعنی حدیبیہ میں) روک دیئے بعد اسکے کہ تم کو ان پر قابو دیدیا تھا (یہ اشارہ اس واقعہ کی طرف ہے جو قصہ حدیبیہ کے جزو ہشتم میں شروع میں بیان ہو چکا ہے کہ قریش کے پچاس آدمیوں کو صحابۂ کرام نے گرفتار کر لیا تھا اور پھر کچھ لوگ بھی گرفتار ہو کر مسلمانوں کے قبضہ میں آگئے تھے اسوقت اگر مسلمان انکو قتل کر دیتے تو دوسری طرف مکہ میں حضرت عثمان غنی اور انکے چند ساتھی روک لئے گئے تھے وہ ان کو شہید کر دیتے اس کا لازمی نتیجہ مکمل طور پر جنگ چھڑ جانا ہوتا اور اگرچہ مذکور الصدر آیات کی پہلی آیت میں حق تعالیٰ نے یہ بھی واضح فرما دیا ہے کہ اگر جنگ ہو بھی جاتی تو فتح مسلمانوں ہی کی ہوتی لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں مسلمانوں کی بڑی مصلحت اسمیں تھی کہ اسوقت جنگ نہو اس لئے اس طرف مسلمانوں کے دل میں یہ بات ڈالدی کہ اُنکے قیدیوں کو قتل نہ کریں اس طرح مسلمانوں کے ہاتھ انکے قتل سے روک دیئے دوسری طرف قریش کے دلوں پر اللہ نے مسلمانوں کا رعب ڈالدیا کہ اُنھوں نے صلح کی طرف مائل ہو کر سہیل کو آپ کی خدمت میں بھیجا، اس طرح حق تعالیٰ کی حکمت نے دوطرفہ انتظام جنگ نہ ہونے کا کر دیا) اور اللہ تعالیٰ تمھارے کاموں کو (اُسوقت) دیکھ رہا تھا (اور اُن کاموں کے نتائج کو جانتا تھا اسلئے ایسا کام نہیں ہونے دیا جس سے جنگ چھڑ جائے۔ آگے اسکا بیان ہے کہ اگر جنگ ہو جاتی تو کفار کی مغلوبیت کس طرح اور کیوں ہوتی) یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے کفر کیا اور تم کو (عمرہ کرنے کے لئے) مسجدِ حرام سے روکا (مراد مسجد حرام اور صفا مروہ کے درمیان کا میدان جہاں سعی ہوتی ہے دونوں ہی ہیں مگر چونکہ طواف اصل اور اوّل ہے اور وہ مسجد حرام میں ہوتا ہے اسلئے اُس سے روکنے کے ذکر پر اکتفا کیا گیا) اور قربانی کے جانور کو جو (حدیبیہ میں) رُکا ہوا رہ گیا اس کو اس کے موقع میں پہنچنے سے روکا (جانوروں کی قربانی کا موقع منیٰ ہے ان لوگوں نے جانوروں کو منیٰ تک نہیں جانے دیا، اُن کے ان جرائم) اور (حرم محترم میں بیٹھ کر ایسا ظلم کرنیکا تقاضا یہ تھا کہ مسلمانوں کو جنگ کا حکم دے کر ان کو مغلوب کر دیا جاتا، لیکن بعض حکمتیں اس تقاضے کو پورا کرنے سے مانع ہو گئیں اُن حکمتوں میں سے ایک یہ ہے کہ اُسوقت مکہ میں بہت

سے مسلمان کفار کے ہاتھوں محبوس اور مظلوم تھے جیسا کہ قصۂ حدیبیہ کے جزو دہم میں اس کا ذکر آیا ہے اور اُن میں سے ابو جندل کا حضورؐ کی خدمت میں پہنچکر فریاد کرنا بیان ہو چکا ہے، اگر اسوقت جنگ چھڑ جاتی تو غیر شعوری طور پر ان مسلمانوں کو بھی نقصان پہنچ جاتا اور ممکن تھا کہ ان کے ہاتھ سے ہی وہ قتل ہو جاتے اور عام مسلمانوں کو پھر اس پر ندامت و افسوس ہوتا اسلئے اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا فرما دیئے کہ جنگ نہ ہو۔ اسی مضمون کو آگے فرمایا ہے کہ) اگر (مکّہ میں اسوقت) بہت سے مسلمان مرد اور بہت سی مسلمان عورتیں نہ ہوتیں جن کی تم کو خبر بھی نہ تھی یعنی انکے پس جانے کا احتمال نہ ہوتا جس پر ان کی وجہ سے تم کو بھی بے خبری میں (رنج و افسوس کا) ضرر پہنچتا (اگر یہ بات نہوتی) تو سب قصہ طے کر دیا جاتا، لیکن ایسا اسلئے نہیں کیا گیا تاکہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں جس کو چاہے داخل کرے (چنانچہ جنگ نہونے سے اُن مسلمانوں کی جان بچی اور تم اُن کے قتل کے گناہ اور پھر اسپر رنج و افسوس سے بچے البتہ) اگر یہ (مذکور مسلمان مکّہ سے کہیں) ٹل گئے ہوتے تو ان (اہلِ مکّہ) میں جو کافر تھے ہم اُن کو (مسلمانوں کے ہاتھ سے) دردناک سزا دیتے (اور ان کفار کے مغلوب و مقتول ہونیکا ایک مقتضیٰ اور بھی تھا) جبکہ ان کافروں نے اپنے دلوں میں عار کو جگہ دی اور عار بھی جاہلیت کی (اس عار سے وہ ضد مُراد ہے جو بسم اللہ اور لفظ رسُول اللہ کے لکھنے پر اُنھوں نے مزاحمت کی جیساکہ اوپر صلحنامہ حدیبیہ کے بیان میں اسکا ذکر آچکا ہے) سو (اسکا مقتضا یہ تھا کہ مسلمان جوش میں آکر لڑ پڑتے مگر) اللہ تعالےٰ نے اپنے رسُول کو اور مؤمنین کو اپنی طرف سے تحمل عطا فرمایا۔ (جس کی وجہ سے انھوں نے اس کلمہ کے لکھنے پر اصرار چھوڑ دیا اور صلح ہوگئی) اور (اس وقت) اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کو تقویٰ کی بات پر جمائے رکھا (تقویٰ کی بات سے مُراد کلمہ طیبہ یعنی توحید و رسالت کا اقرار ہے اور مطلب اس پر جمائے رکھنے کا یہ ہے کہ توحید و رسالت کے اعتقاد کا تقاضا اطاعت ہے اللہ اور رسُول کی اور مسلمانوں کا یہ صبر و ضبط اپنے جذبات کیخلاف صرف اسوجہ سے تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ضبط و صبر کا حکم فرمایا تھا ایسے سخت مرحلہ میں اپنے جذبات کے خلاف رسُول کی اطاعت ہی کا نام کلمہ تقویٰ پر جمنا ہے) اور وہ (مسلمان) اُس (کلمۂ تقویٰ) کے (دُنیا میں بھی) زیادہ مستحق ہیں (کیونکہ ان کے قلوب میں طلب حق ہے اور یہ طلب ہی ایمان تک پہنچاتی ہے) اور (آخرت میں بھی) اس (کے ثواب) کے اہل ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

معارف و مسائل

بِبَطۡنِ مَكَّةَ، اس لفظ کے اصلی معنی عین مکّہ کے ہیں مگر یہاں اس سے مراد مقام حدیبیہ ہے اس کو مکہ مکرمہ سے بہت متصل ہونے کی بنار پر بطنِ مکّہ سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔ اور اس سے اُس

بات کی تائید ہوتی ہے جو حنفیہ نے اختیار کی ہے کہ حُدیبیہ کا کچھ حصّہ حرم میں داخل ہے آنْ یَّبْلُغَ مَحِلَّہٗ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محصَر عن الحج والعمرہ یعنی جس کو احرام باندھنے کے بعد کسی وجہ سے دخولِ مکّہ سے روکدیا گیا ہو اُس پر باتفاق یہ تو لازم ہے کہ قربانی کر کے احرام سے حلال ہو لیکن اسمیں اختلاف ہے کہ یہ قربانی اسی جگہ ہوسکتی ہے جہاں وہ روکدیا گیا ہے، یا دوسری قربانیوں کی طرح اسکے لئے بھی حدودِ حرم کے اندر ہونا شرط ہے حنفیہ کے نزدیک اسکے لئے بھی حدودِ حرم شرط ہیں اس آیت سے ان کا استدلال ہے کہ یہاں اس قربانی کے لئے قرآن نے ایک خاص محل قرار دیا ہے جس سے کفار نے مسلمانوں کو روکدیا تھا اس سے معلوم ہوا کہ اس قربانی کے لئے حدودِ حرم میں ہونا شرط ہے۔ رہا یہ معاملہ کہ خود حنفیہ ہی کا یہ قول بھی ہے کہ حُدیبیہ کے بعض حصّے حرم میں داخل ہیں تو پھر حرم سے روکنا کیسے ثابت ہوا، تو جواب یہ ہے کہ اگرچہ اس قربانی کا حدودِ حرم میں کسی بھی جگہ کر دینا شرعاً کافی ہے مگر اُس خاص جگہ میں جو منیٰ کے اندر منحر کے نام سے موسوم ہے اسمیں ہونا افضل ہے۔ کفار مکہ نے اسوقت مسلمانوں کو اس افضل مقام تک قربانی کا جانور لیجانے سے روکدیا تھا۔

فَتُصِيبَكُم مِّنْهُم مَّعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ، لفظ معرّہ کے معنی بعض حضرات نے گناہ کے بیان کئے ہیں اور بعض حضرات نے مطلق مضرّت کے اور بعض نے عیب کے بیان کئے ہیں، اس مقام پر ظاہر یہی آخری معنی ہیں کہ اگر جنگ چھڑ جاتی اور بےخبری کی حالت میں مسلمانوں کے ہاتھ سے مکّہ میں محبوس مسلمان قتل ہوجاتے تو یہ ایک عیب اور عار کی بات بھی تھی کہ کفار ان کو عار دلاتے کہ اپنے ہی دینی بھائیوں کو مار ڈالا اور مضرت بھی، مقتول مسلمانوں کی مضرّت تو ظاہر ہی ہے۔ قاتل مسلمانوں کو جب خبر ہوتی سخت ندامت اور افسوس ہوتا، یہ مضرت عام مسلمانوں کو پہنچتی۔

صحابۂ کرام کو غلطی اور عیب سے بچانے کا قدرتی انتظام

امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ بغیر علم کے اگر کوئی مسلمان کسی مسلمان کے ہاتھ سے مارا جائے وہ گناہ تو نہیں مگر ایک عیب اور عار اور ندامت و افسوس کا سبب ضرور ہے اور قتل خطا پر دیت وغیرہ دینے کے بھی احکام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسُول کے صحابہ کی اس سے بھی حفاظت فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ صحابۂ کرام کے ساتھ حق تعالیٰ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اگرچہ انبیاء کی طرح معصوم تو نہیں مگر عامۃً اُن کو خطاؤں اور عیبوں سے بچانے کا قدرتی انتظام ہوجاتا ہے۔

لِيُدْخِلَ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ مَن يَشَاءُ، یعنی حق تعالیٰ نے اس موقع پر مسلمانوں کے قلوب میں تحمل پیدا کر کے جنگ نہ ہونے کا انتظام اس لئے فرمایا کہ انہیں سے بہت سے لوگوں کا آئندہ اسلام قبول کرلینا اللہ تعالیٰ جانتا تھا اُن پر رحمت کرنے کے لئے نیز جو مسلمان محبوس تھے اُن پر

رحمت کے لئے یہ سارا سامان کیا گیا۔

لَوْ تَزَيَّلُوْا، تزیّل کے معنی اصل میں تفرق کے ہیں مطلب یہ ہے کہ مکہ میں محبوس مسلمان اگر کفار سے الگ اور ممتاز ہوتے کہ مسلمان اُن کو پہچان کر تکلیف سے بچالیتے تو ان کفار کے حالات کا تقاضا یہی تھا کہ اسی وقت ان کو مسلمانوں کے ہاتھوں سزا دلوادی جاتی مگر چونکہ محبوس ضعفار مسلمین مرد اور عورتیں اُنہی کے اندر مخلوط تھے اگر قتال ہوتا تو اُن کو بچانے کی صورت نہ بنتی اسلئے اللہ تعالیٰ نے اس جنگ کو موقوف رکھا۔

وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا، کلمۂ تقویٰ سے مراد اہل تقویٰ کا کلمہ ہے یعنی کلمۂ توحید و رسالت، اس کو کلمۂ تقویٰ اسلئے کہا گیا کہ یہ کلمہ ہی تقویٰ کی بنیاد ہے۔ اور صحابۂ کرام کو اس کلمہ کا احق اور اہل فرما کر اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کی رُسوائی واضح کر دی جو ان حضرات پر کفر و نفاق کا الزام لگاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تو ان کو کلمۂ اسلام کا اہل اور احق فرمائے اور یہ بدبخت اُن پر تبرّا کریں۔

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ
اللہ نے سچ دکھلایا اپنے رسول کو خواب تحقیقی کہ تم داخل ہو رہو گے مسجد

الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ
حرام میں اگر اللہ نے چاہا آرام سے بال مونڈتے ہوئے اپنے سروں کے اور کترتے ہوئے

لَا تَخَافُوْنَ ۭ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا
بے کھٹکے پھر جانا وہ جو تم نہیں جانتے پھر مقرر کر دی اس سے ورے ایک فتح

قَرِيْبًا ﴿۲۷﴾ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ
نزدیک وہی ہے جس نے بھیجا اپنا رسول سیدھی راہ پر اور سچے دین پر

لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۲۸﴾ ۭ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ
تاکہ اوپر رکھے اُسکو ہر دین سے اور کافی ہے اللہ حق ثابت کرنیوالا محمد رسول

اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ
اللہ کا اور جو لوگ اسکے ساتھ ہیں زور آور ہیں کافروں پر نرم دل ہیں آپس میں تو دیکھے اُن کو

رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ
رکوع میں اور سجدہ میں ڈھونڈتے ہیں اللہ کا فضل اور اس کی خوشی نشانی اُن کی انکے

وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ڔ وَ
منہ پر ہے سجدے کے اثر سے یہ شان ہے اُن کی تورات میں اور

مَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ ۚ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ
مثال اُن کی انجیل میں جیسے کھیتی نے نکالا اپنا پٹھا پھر اسکی کمر مضبوط کی، پھر موٹا ہوا
فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۗ وَعَدَ اللَّهُ
پھر کھڑا ہوگیا اپنی نال پر خوش لگتا ہے کھیتی والوں کو تاکہ جلائے ان سے جی کافروں کا وعدہ کیا ہے اللہ نے
الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا ﴿٢٩﴾
اُن سے جو یقین لائے ہیں اور کئے ہیں بھلے کام معافی کا اور بڑے ثواب کا

خُلاصۂ تفسیر

بیشک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسُول کو سچّا خواب دکھلایا ہے جو مطابق واقعہ کے ہے تم لوگ مسجد حرام میں انشاء اللہ ضرور جاؤ گے امن و امان کے ساتھ کہ تم میں کوئی سر منڈاتا ہوگا کوئی بال کترا تا ہوگا تم کو کسی طرح کا اندیشہ نہ ہوگا (چنانچہ سال آئندہ ایسا ہی ہوا، اور اس سال سے تاخیر کی وجہ یہ ہے کہ) سو اللہ تعالیٰ کو وہ باتیں (اور حکمتیں) معلوم ہیں جو تم کو معلوم نہیں (اُن حکمتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ) پھر اس (خواب کے واقع ہونے) سے پہلے تم کو ایک قریبی فتح (خیبر کی) دیدی (تاکہ اُس سے مسلمانوں کو قوت اور سامان حاصل ہو جائے اور وہ پورے اطمینان کیساتھ عمرہ ادا کریں جیسا کہ ایسا ہی واقع ہوا)

وہ اللہ ایسا ہے کہ اُس نے اپنے رسُول کو ہدایت (کا سامان یعنی قرآن) اور سچّا دین (اسلام) دے کر بھیجا ہے تاکہ اُس (دین) کو تمام دینوں پر غالب کر دے (یہ غلبہ حجت و دلیل کے اعتبار سے تو دائمی اور ہمیشہ ہی رہے گا اور شوکت و سلطنت کے اعتبار سے بھی غلبہ ہوگا مگر ایک شرط کے ساتھ وہ یہ کہ اہلِ دین یعنی مسلمان باصلاحیت ہوں۔ جب یہ شرط نہیں ہوگی تو غلبۂ ظاہری کا وعدہ نہیں اور چونکہ صحابۂ کرام میں یہ شرط موجود تھی جیسا کہ اگلی آیات جو صحابہ کے متعلق آرہی ہیں انمیں اس صلاحیت کا ذکر ہے اسلئے اس آیت میں جیسا کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی بشارت ہے ایسا ہی صحابۂ کرام کے لئے فتوحات کی بشارت ہے جیسا کہ مشاہدہ ہوا کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات پر پچیس سال گزرنے نہ پائے تھے کہ اسلام اور قرآن دُنیا کے گوشہ گوشہ میں فاتحانہ طور پر پہنچ گیا) اور (حمیت جاہلیت والے اگر آپکے نام کے ساتھ رسول کا لفظ لکھنے سے گریز کرتے ہیں تو آپ مغموم نہوں، کیونکہ آپکی رسالت پر) اللہ کافی گواہ ہے (جس نے آپ کی رسالت کو دلائلِ واضحہ اور کُھلے ہوئے معجزات سے ثابت کر دکھایا جس سے ثابت ہوگیا کہ) محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسُول ہیں (اس جگہ محمد رسول اللہ کا پورا جملہ لانیسے اسطرف اشارہ ہے کہ حمیت جاہلیت والوں نے انکے نام کیساتھ رسول اللہ لکھنا گوارا نہ کیا تو کیا پرواہ ہے اللہ نے یہ کلمہ آپکے نام کیساتھ لکھدیا جو قیامت

تک پڑھا جائے گا، آگے آپ کی متبعین صحابہؓ کے فضائل و بشارات مذکور ہیں کہ) اور جو لوگ آپ کی صحبت پائے ہوئے ہیں (یہ لفظ تمام صحابہ کرام کو شامل ہے خواہ اُن کی صحبت طویل میسّر ہوئی یا قلیل اور جو صحابہ حُدیبیہ میں آپکے ساتھ تھے وہ اصالۃً اور خصوصاً اسکے مصداق ہیں، حاصل یہ ہے کہ سب صحابہ کرام ان صفاتِ کمال کیساتھ موصوف ہیں کہ) وہ کافروں کے مقابلہ میں تیز ہیں (اور) آپسمیں مہربان ہیں (اور) اے مخاطب تو اُن کو دیکھے گا کہ کبھی رکوع کر رہے ہیں کبھی سجدہ کر رہے ہیں (اور) اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضامندی (یعنی ثواب اور قرب) کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں اُن (کی عبدیت) کے آثار (اُنکے) سجدہ کی تاثیر سے اُنکے چہروں پر نمایاں ہیں (مراد ان آثار سے خشوع و خضوع کے انوار ہیں جو مؤمن متقی کے چہرہ میں عموماً مشاہدہ کیئے جاتے ہیں) یہ اُنکے اوصاف (مذکورہ) توراۃ میں ہیں اور انجیل میں اُن کا یہ وصف (مذکور) ہے کہ جیسے کھیتی کہ اُسنے (اول زمین سے) اپنی سوئی نکالی پھر اُس نے (مٹی پانی ہوا وغیرہ سے غذا پاکر اپنی) اُس (سوئی) کو قوی کیا (یعنی یہ کھیتی قوی ہوگئی) پھر وہ کھیتی اور موٹی ہوئی پھر اپنے تنہ پر سیدھی کھڑی ہوگئی کہ (اپنے ہرے بھرے ہونے سے) کسانوں کو بھلی معلوم ہونے لگی (اسی طرح صحابہ میں اول ضعف تھا پھر روزانہ قوت بڑھتی گئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو یہ نشو و نما اسلئے دیا) تاکہ اُن (کی اس حالت) سے کافروں کو (حسد میں) جلاوے اور (آخرت میں) اللہ نے اُن صاحبوں سے جو کہ ایمان لائے ہیں اور نیک کام کر رہے ہیں (گناہوں کی) مغفرت اور (طاعات پر) اجرِ عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے

معارف و مسائل

جب صلح حُدیبیہ مکمل ہوگئی اور یہ بات طے ہوگئی کہ اسوقت بغیر دخولِ مکہ اور بغیر ادائے عمرہ کے واپس مدینہ جانا ہے اور صحابہ کرام کا یہ عزم عمرہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خواب کی بناء پر ہوا تھا جو ایک طرح کی وحی تھی۔ اب بظاہر اسکے خلاف ہوتا ہوا دیکھ کر بعض صحابہ کرام کے دلوں میں خود یہ شکوک پیدا ہونے لگے کہ (معاذ اللہ) آپ کا خواب سچّا نہ ہوا۔ دوسری طرف کفار و منافقین نے مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ تمھارے رسُول کا خواب صحیح نہ ہوا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی لَقَدْ صَدَقَ اللّٰہُ رَسُوْلَہُ الآیۃ (رواہ البیہقی وغیرہ عن مجاہد)

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰہُ رَسُوْلَہُ الرُّءْیَا بِالْحَقِّ، لفظ صدق بمقابلہ کذب کے اقوال میں استعمال ہوتا ہے۔ جو قول واقعہ کیمطابق ہو اسکو صدق جو مطابق نہ ہو اسکو کذب کہا جاتا ہے اور بعض اوقات یہ لفظ افعال کے لئے بھی بولا جاتا ہے تو اسوقت اسکے معنی کسی فعل کو محقّق اور ثابت کرنے کے

لفظ صدق کا پہلا مفعول رسولہ اور دوسرا رؤیا ہے۔ اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ اللہ نے اپنے رسول کو اپنے خواب میں سچا کر دکھایا (بیضاوی) اور اگرچہ یہ سچا کر دکھانیکا واقعہ آگے آنے والا تھا مگر اسکو بلفظ ماضی تعبیر کر کے اسکے قطعی اور یقینی ہونے کیطرف اشارہ کر دیا چنانچہ آگے بلفظ مستقبل فرمایا گیا کہ لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ ، یعنی آپ نے جو خواب میں دیکھا تھا کہ ہم مسجد حرام میں داخل ہوئے یہ ضرور ہو کر رہے گا مگر اس سال نہیں بلکہ اس سال کے بعد ہوگا۔ خواب میں اُسکا وقت معیّن نہیں تھا، صحابہ کرام نے اپنے اشتیاق کیوجہ سے اسی سال عزم سفر کر لیا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کی موافقت فرمائی جس میں اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمتیں تھیں جن کا ظہور صلح حدیبیہ کے وقت ہوا، جیساکہ صدیقِ اکبرؓ نے اول ہی حضرت عمرؓ کے جواب میں فرمایا تھا کہ آپ کو شک میں نہیں پڑنا چاہیئے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خواب میں کوئی وقت اور سال معین نہیں تھا اگر اسوقت نہیں تو پھر ہوگا (قرطبی)

آئندہ ہونے والے کاموں کیلئے انشاء اللہ کہنے کی تاکید اس آیت میں حق تعالیٰ نے آئندہ ہونے والے داخلہ مسجد حرام کے ساتھ انشاء اللہ کا لفظ استعمال فرمایا حالانکہ اللہ تعالیٰ تو خود اپنی مشیت کے عالم ہیں ان کو اسکے کہنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن اپنے رسول اور سب بندوں کو تعلیم دینے کیلئے اس جگہ حق تعالیٰ نے بھی لفظ ان شاء اللہ استعمال فرمایا (قرطبی)

مُحَلِّقِيۡنَ رُءُوۡسَكُمۡ وَمُقَصِّرِيۡنَ ، صحیح بخاری میں ہے کہ اگلے سال عمرہ قضاء میں حضرت معاویہؓ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک قینچی سے تراشے تھے۔ یہ واقعہ عمرہ قضاء ہی کا ہے کیونکہ حجۃ الوداع میں تو آپ نے حلق فرمایا ہے (قرطبی)

فَعَلِمَ مَا لَمۡ تَعۡلَمُوۡا ، یعنی اللہ کی قدرت میں تو یہ بھی تھا کہ اسی سال تمھیں دخول مسجد حرام اور عمرہ نصیب ہو جاتا مگر اگلے سال تک تاخیر کرنے میں بڑی مصالح تھیں جو اللہ کو معلوم تھیں تم انکو نہ جانتے تھے۔ منجملہ ان مصالح کے ایک یہ بھی تھا کہ اللہ تعالےٰ نے چاہا کہ اس سے پہلے خیبر فتح ہو کر مسلمانوں کی قوت اور سامان میں اضافہ ہو جائے اور وہ فراغت و اطمینان کیساتھ عمرہ ادا کریں اسی لئے فرمایا فَجَعَلَ مِنۡ دُوۡنِ ذٰلِكَ فَتۡحًا قَرِيۡبًا ۔ دُوۡنَ ذٰلِكَ سے مُراد دُوۡنَ الرُّؤۡيَا ہے یعنی اس خواب کے واقع ہونے سے پہلے خیبر کی فتح قریب مسلمانوں کو حاصل ہو جائے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس فتح قریب سے مراد خود صلح حُدیبیہ ہے کہ وہ فتح مکہ اور دوسری تمام فتوحات کا مقدمہ تھی اور بعد میں تو سبھی صحابہ نے اسکو اعظم الفتوحات قرار دیا ہی تو اب مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ اس سال تمھارے عزم سفر اور پھر ناکام ہونے اور صلح ہونے میں جو حکمتیں اور مصالح تھیں وہ تمھارے علم میں نہیں تھیں لیکن اللہ تعالیٰ سب سے واقف تھا وہ چاہتا تھا

کہ تم کو اس خواب کے واقعہ سے پہلے صلح حدیبیہ کے ذریعہ ایک فتح قریب نصیب فرمادے اسی فتح قریب کا یہ نتیجہ سب نے دیکھ لیا کہ صحابہ کرام جن کی تعداد سفر حدیبیہ میں ڈیڑھ ہزار سے زائد نہ تھی اسکے بعد دس ہزار تک پہنچ گئی۔ (از قرطبی)

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ، سابقہ آیات میں جو فتوحات اور غنائم کے وعدے اور اہلِ حُدَیبیہ کے خصوصاً اور تمام صحابہ کے عموماً فضائل اور بشارتیں مذکور ہوئے ہیں اب خاتمہ سورت میں ان مضامین کی تلخیص و تاکید ہے اور چونکہ یہ سب نعمتیں اور بشارتیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور تصدیق کی بنار پر ہوئیں اسلئے اس تصدیق و اطاعت کی مزید تاکید کے لئے نیز منکرین رسالتِ محمدیہ پر رد کرنے کے لئے اور صُلح حُدیبیہ کے وقت جو بعض مسلمانوں کے دلوں میں کچھ شکوک پیدا ہوگئے تھے اُن کے ازالہ کے لئے ان آیات میں آپکی رسالت کا اثبات بلکہ تمام دُنیا کے دینوں پر آپکے دین کو غالب کرنے کی بشارت دی گئی ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ، پورے قرآن میں خاتم الانبیار صلے اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک لینے کے بجائے عموماً آپ کا ذکر اوصاف والقاب کیساتھ کیا گیا خصوصاً نِدا کے موقع پر يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ، يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ، يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ وغیرہ بخلاف دوسرے انبیار کے کہ انکے نام کیساتھ ندا کی گئی، یا ابراہیم یا موسٰی یا عیسٰی۔ پورے قرآن میں صرف چار جگہ آپ کا نام مبارک محمدؐ ذکر فرمایا ہے جہاں اس نام کے ذکر ہی میں کوئی مصلحت تھی۔ اس مقام پر مصلحت یہ تھی کہ حدیبیہ کے صلحنامہ میں آپکے نام کے ساتھ جب حضرت علی رضؓ نے محمد رسُول اللہ لکھا تو کفار قریش نے اس کو مٹا کر محمد بن عبداللہ لکھنے پر اصرار کیا، رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بحکم ربانی اس کو منظور کر لینا قبول کیا۔ حق تعالیٰ نے اس مقام پر خصوصیت سے آپکے نام مبارک کیساتھ رسول اللہ کا لفظ قرآن میں لاکر اس کو دائمی بنا دیا جو قیامت تک اسی طرح پڑھا لکھا جائے گا۔

وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ، یہاں سے آپ کے صحابہ کرام کے فضائل کا بیان ہے۔ اگرچہ اس کے پہلے مخاطب حضرات صحابہ ہیں جو حُدیبیہ اور بیعتِ رضوان میں شریک تھے لیکن الفاظ کے عموم میں سبھی صحابہ کرام شامل ہیں کیونکہ صحبت و معیت سب کو حاصل ہے۔

صحابہ کرام کے اوصاف وفضائل اور خاص علامات

اس مقام پر حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آپکے دین کو سب دینوں پر غالب کرنیکا بیان فرما کر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اوصاف و فضائل اور خاص علامات کا ذکر تفصیل کیساتھ فرمایا ہے۔ اسمیں انکے اس سخت امتحان کا انعام بھی ہے جو صلح حُدیبیہ کے وقت لیا گیا تھا کہ اُن کے قلبی یقین اور قلبی جذبات کیخلاف صلح ہو کر بغیر دخولِ مکہ وغیرہ کے ناکام واپسی کے باوجود اُنکے قدم

متزلزل نہیں ہوئے اور بے نظیر اطاعتِ رسُول اور قوتِ ایمانی کا ثبوت دیا۔ نیز صحابۂ کرام کے فضائل اور علامات کی تفصیل بیان فرمانے میں یہ حکمت بھی ہو تو بعید نہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی اور نبی و رسُول تو مبعوث ہونے والا نہیں تھا آپ نے اپنے بعد اُمت کے لئے کتاب اللہ کے ساتھ اپنے اصحاب ہی کو بطور نمونہ کے چھوڑا ہے اور ان کی اقتدار و اتباع کے احکام دیئے ہیں، اسلئے قرآن نے بھی انکے کچھ فضائل اور علامات کا بیان فرماکر مسلمانوں کو ان کے اتباع کی ترغیب و تاکید فرمادی ہے۔ اس مقام پر صحابۂ کرام کا سب سے پہلا وصف تو یہ تبلایا گیا ہے کہ وہ کفار کے مقابلے میں سخت اور آپس میں مہربان ہیں۔ کفّار کے مقابلہ میں سخت ہونا اُن کا ہر موقع پر ثابت ہوتا رہا ہے کہ نسبی رشتے ناتے سب اسلام پر قربان کر دیئے اور حُدَیبیہ کے موقع پر خصوصیت سے اسکا اظہار ہوا۔ اور آپس میں مہربان اور ایثار پیشہ ہونا صحابۂ کرام کا اسوقت خصوصیت سے ظاہر ہوا جبکہ مہاجرین وانصار میں مواخات ہوئی اور انصار نے اپنی سب چیزوں میں مہاجرین کو شریک کرنے کی دعوت دی۔ قرآن نے صحابۂ کرام کے اس وصف کو مقدم بیان فرمایا کیونکہ درحقیقت اسکا حاصل یہ ہے کہ اُن کی دوستی اور دشمنی، محبت یا عداوت کوئی چیز اپنے نفس کے لئے نہیں بلکہ سب اللہ تعالیٰ اور اسکے رسُول کے لئے ہوتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو ایمانِ کامل کا اعلیٰ مقام ہے صحیح بخاری وغیرہ کی حدیث میں ہے کہ من احبّ للّٰہ و ابغض للّٰہ فقد استکمل ایمانہ یعنی جو شخص اپنی محبت اور بغض وعداوت دونوں کو اللہ کی مرضی کے تابع کر دے اُسنے اپنا ایمان مکمل کر لیا۔ اسی سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ صحابۂ کرام کے کفار کے مقابلہ پر سخت ہونیکا یہ مطلب نہیں کہ وہ کبھی کسی کافر پر رحم نہیں کرتے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس موقع پر اللہ ورسول کا حکم کفار پر سختی کرنے کا ہوتا ہے وہاں اُن کو اپنے رشتے ناتے یا دوستی وغیرہ کے علاقے اس کام میں مانع نہیں اور جہانتک اُن کے ساتھ رحم وکرم کے معاملہ کا تعلق ہے وہ تو خود قرآن نے اسکا فیصلہ کر دیا ہے کہ لَا یَنۡھٰکُمُ اللّٰہُ (الیٰ) اَنۡ تَبَرُّوۡھُمۡ وَتُقۡسِطُوۡۤا اِلَیۡھِمۡ، یعنی جو کفار مسلمانوں کے درپئے آزار اور مقاتلہ پر نہیں اُن کے ساتھ احسان کا سلوک کرنے سے اللہ تعالیٰ منع نہیں کرتا، چنانچہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے بیشمار واقعات ہیں جنہیں ضعیف و مجبور یا ضرورتمند کفار کے ساتھ احسان وکرم کے معاملات کئے گئے ہیں اور انکے معاملہ میں عدل وانصاف کو برقرار رکھنا تو اسلام کا عام حکم ہے۔ عین میدان کارزار میں بھی عدل وانصاف کیخلاف کوئی کارروائی جائز نہیں۔

دوسرا وصف صحابۂ کرام کا یہ بیان کیا گیا ہے کہ اُن کا عام حال یہ ہے کہ وہ رکوع وسجدہ اور نماز میں مشغول رہتے ہیں اُن کو دیکھنے والے اکثر ان کو اسی کام میں مشغول پاتے ہیں۔ پہلا وصف کمال ایمان کی علامت تھی دوسرا وصف کمال عمل کا بیان ہے کیونکہ اعمال میں سب سے افضل

نماز ہے۔ سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ، یعنی نماز ان کا ایسا وظیفہ زندگی بن گیا ہے کہ نماز اور سجدہ کے مخصوص آثار اُن کے چہروں سے نمایاں ہوتے ہیں۔ مراد ان آثار سے وہ انوار ہیں جو عبدیت اور خشوع و خضوع سے ہر متقی عبادتگزار کے چہرہ پر مشاہدہ کیے جاتے ہیں، پیشانی میں جو نشان سجدہ کا پڑ جاتا ہے وہ مراد نہیں۔ خصوصاً نماز تہجد کا یہ اثر بہت زیادہ واضح ہوتا ہے جیسا کہ ابن ماجہ میں بروایت جابرؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے من کثر صلوٰتہ باللیل حسن وجہہ بالنھار یعنی جو شخص رات میں نماز کی کثرت کرتا ہے دن میں اسکا چہرہ حسین پُر نور نظر آتا ہے اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ اس سے مراد نمازیوں کے چہروں کا وہ نور ہے جو قیامت میں نمایاں ہوگا۔

ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنجِيلِ ۚ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ، صحابہ کرام کی جو علامت اوپر بیان فرمائی ہے کہ .... سجدوں اور نمازوں کا نور ان کی پیشانیوں کی علامت ہے اس آیت میں فرمایا کہ اُن کی یہی مثال تورات میں بیان کی گئی ہے پھر فرمایا کہ انجیل میں اُن کی ایک اور مثال یہ دی گئی ہے کہ وہ ایسے ہیں جیسے کوئی کاشتکار زمین میں بیج اُگائے تو اوّل وہ ایک ضعیف سی سوئی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے پھر اسمیں شاخیں نکلتی ہیں پھر وہ اور قوی ہوتا ہو کر پھر اسکا مضبوط تنہ بنجاتا ہے۔ اسی طرح نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب شروع میں بہت کم تھے۔ ایک وقت ایسا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا صرف تین مسلمان تھے مردوں میں صدیق اکبرؓ عورتوں میں حضرت خدیجہؓ، بچوں میں حضرت علیؓ پھر رفتہ رفتہ اُن کی قوت بڑھتی رہی یہانتک کہ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج میں شریک ہونے والوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ کے قریب بتلائی گئی ہے۔ اس آیت میں تین احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ فی التوراۃ پر وقف کیا جائے اور پچھلی مثال یعنی چہروں کا نور، یہ علامت تورات کے حوالہ سے بیان ہوئی آگے مَثَلُهُمْ فِي الْإِنجِيلِ پر وقف نہ کریں بلکہ ملا کر پڑھیں تو معنی یہ ہونگے کہ صحابہ کی مثال انجیل میں اُس کھیتی یا درخت کی ہے جو شروع میں نہایت کمزور ہوتا ہے پھر رفتہ رفتہ قوی تناور ہو جاتا ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ فِي التَّوْرٰىةِ پر وقف نہو بلکہ فِي الْإِنجِيلِ پر وقف کیا جائے تو معنی یہ ہونگے کہ سابقہ نشانی چہروں کے نور کی تورات میں بھی ہے انجیل میں بھی اور آگے كَزَرْعٍ کی مثال کو ایک الگ مثال قرار دیا جائے۔ تیسرا احتمال یہ ہے کہ فِي التَّوْرٰىةِ پر کلام ختم ہو نہ فِي الْإِنجِيلِ پر اور لفظ ذٰلِكَ اگلی مثال کی طرف اشارہ ہو تو معنی یہ ہونگے کہ تورات و انجیل دونوں میں صحابہ کی مثال زَرْعٍ یعنی کھیتی کی دی گئی ہے۔ اگر اس زمانہ میں تورات و انجیل اپنی اصلی حالت میں ہوتیں تو انکو دیکھ کر مراد قرآنی متعین ہو جاتی لیکن انمیں تحریفات کا سلسلہ بے حد و بیشمار رہا ہے اسلئے کوئی یقینی فیصلہ نہیں ہو سکتا، مگر اکثر حضرات مفسرین نے پہلے احتمال کو ترجیح دی ہے جسمیں پہلی مثال تورات

میں اور دوسری انجیل میں ہونا معلوم ہے - امام بغویؒ نے فرمایا کہ صحابہ کرام کی یہ مثال انجیل میں ہے کہ شروع میں قلیل ہونگے پھر بڑھیں گے اور قوی ہو جائیں گے جیسا کہ حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ صحابہ کرام کی یہ مثال انجیل میں لکھی ہوئی ہے کہ "ایک قوم ایسی نکلے گی جو کھیتی کی طرح بڑھے گی اور وہ نیک کاموں کا حکم اور برے کاموں سے منع کیا کریگی (مظہری) موجودہ زمانہ کی تورات و انجیل میں بھی بیشمار تحریفات کے باوجود اسکی پیشین گوئی کے حسب ذیل الفاظ موجود ہیں - تورات باب استثنا ۲۳ : ۱ تا ۳ کے یہ الفاظ ہیں۔

"خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر آشکارا ہوا وہ کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا، دس ہزار مقدسوں کے ساتھ آیا اور اسکے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت انکے لئے تھی وہ اپنے لوگوں سے بڑی محبت رکھتا ہے اسکے سارے مقدس تیرے ہاتھ ہیں اور وہ تیرے قدمونکے پاس بیٹھے ہیں تیری باتمانیں گے"۔

یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ فتح مکہ کیوقت صحابہ کرام کی تعداد دس ہزار تھی جو فاران سے طلوع ہونیوالے اس نورانی پیکر کیساتھ شہر خلیل میں داخل ہوئے تھے - اسکے ہاتھ میں آتشیں شریعت ہوگی کے لفظ سے اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ کیطرف اشارہ پایا جاتا ہے - وہ اپنے لوگوں سے محبت کریگا کے لفظ سے رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کا مضمون سمجھا جاتا ہے اسکی پوری تفصیل مع دوسرے حوالوں کے اظہار الحق جلد سوم باب ششم ص۲۵۶ میں ہے یہ کتاب عیسائیت کی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے پادری فنڈر کے مقابلہ پر تحریر فرمائی تھی اس کتاب میں انجیل کی تمثیل کا اسطرح ذکر ہے - انجیل متی باب ۱۳ آیت ۳۱ میں یہ الفاظ ہیں - اس نے ایک اور تمثیل انکے سامنے پیش کر کے کہا کہ آسمان کی بادشاہی اس رائی کے دانہ کی مانند ہے جسے کسی آدمی نے لیکر اپنے کھیت میں بو دیا، وہ سب بیجوں سے چھوٹا تو ہے مگر جب بڑھتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا اور ایسا درخت ہو جاتا ہے کہ ہوا کے پرندے آکر اسکی ڈالیوں پر بسیرا کرتے ہیں - اور انجیل مرقس ۴ : ۲۶ کے یہ الفاظ ہیں جو الفاظ قرآنی کے زیادہ قریب ہیں۔" اس نے کہا کہ خدا کی بادشاہی ایسی ہے جیسے کوئی آدمی زمین میں بیج ڈالے اور رات کو سوئے دن کو جاگے اور وہ بیج اس طرح اُگے اور بڑھے کہ وہ نہ جانے زمین آپ سے آپ پھل لاتی ہے، پہلے پتی پھر بالیں پھر بالوں میں تیار دانے پھر جب اناج پک چکا تو وہ فی الفور درانتی لگاتا ہے کیونکہ کاٹنے کا وقت آپہنچا (اظہار الحق جلد ۳) باب ششم ص۳۱۰ آسمان کی بادشاہی سے مراد نبی آخر الزماں کا ہونا انجیل کے متعدد مقامات سے ظاہر ہوتا ہے - واللہ اعلم

لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ، یعنی اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو اُن صفات کمال کیساتھ مزین فرمایا اور انکو ضعف کے بعد قوت، قلت کے بعد کثرت بخشی، یہ سب کام اسلئے ہوا تاکہ ان کو دیکھ کر کافروں کو غیظ ہو۔ اور وہ حسد کی آگ میں جلیں - حضرت ابو عروہ زبیری رح فرماتے ہیں کہ ہم حضرت امام مالکؒ کی مجلس میں حاضر تھے ایک شخص نے بعض صحابہ کرام کی تنقیص کے کچھ کلمات کہے تو امام مالکؒ یہ آیت پوری تلاوت کر کے جب لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ پر پہنچے تو فرمایا کہ جس شخص کے دل میں صحابہ کرام میں سے

کسی کیساتھ غیظ ہو تو اس آیت کی وعید اس کو ملے گی (قرطبی) حضرت امام مالکؒ نے یہ تو نہیں فرمایا کہ وہ کافر ہو جاوے گا مگر یہ فرمایا کہ یہ وعید اس کو بھی پہنچے گی۔ مطلب یہ ہے کہ وہ کافروں جیسا کام کرنے والا ہو جائے گا۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا، مِنْهُم کا حرف مِنْ اس جگہ باتفاق مفسرین بیانیہ ہے اور معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ جو ایمان اور عمل صالح کے جامع ہیں اللہ تعالیٰ نے ان سے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ سب صحابہ کرام ایمان اور عمل صالح کے جامع ہیں۔ دوسرے یہ کہ اُن سب سے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ ہے اور یہ مِنْ بیانیہ قرآن میں بکثرت استعمال ہوا ہے جیسے ارشاد ہے فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ تو مِنَ الْاَوْثَانِ بیان ہے لفظ رجس کا، اسی طرح یہاں مِنْهُمْ بیان ہے اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کا۔ اور روافض نے جو اس جگہ حرف من کو تبعیض کے لئے یہ کہہ کر مطلب نکالا ہے کہ انہیں سے جو بعض لوگ ایمان وعمل صالح پر ہیں اُن سے یہ وعدہ ہے یہ سراسر سیاقِ کلام اور اوپر کی آیات کے منافی ہے کیونکہ اس آیت کے مفہوم میں وہ صحابہ کرام تو بلاشبہ داخل، اور آیت کے پہلے مصداق ہیں جو سفر حدیبیہ اور بیعت رضوان میں شریک تھے ان سب کے متعلق اوپر کی آیات میں حق تعالیٰ نے اپنی رضا اور خوشنودی کا اعلان فرما دیا ہے لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ اور رضائے الٰہی کا یہ اعلان اس کی ضمانت ہے کہ یہ سب مرتے دم تک ایمان وعمل صالح پر قایم رہیں گے کیونکہ اللہ تو علیم وخبیر ہے اگر کسی کے متعلق اسکو یہ معلوم ہو کہ یہ کسی وقت ایمان سے پھر جانیوالا ہے تو اُس سے اپنی رضا کا اعلان نہیں فرما سکتے۔ ابن عبدالبر نے مقدمہ استیعاب میں اسی آیت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ ومن رضی اللہ عنہ لم یسخط علیہ ابدًا یعنی اللہ جس سے راضی ہو جائے پھر اس پر کبھی ناراض نہیں ہوتا۔ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اسی آیت کی بناء پر ارشاد فرمایا کہ بیعتِ رضوان میں شریک ہونے والوں میں سے کوئی آگ میں نہ جائیگا تو یہ وعدہ جو اصالۃً انہی کے لئے کیا گیا ہے انمیں سے بعض کا مستثنیٰ ہونا قطعاً باطل ہے اسی لئے اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ صحابہ کرام سب کے سب عادل وثقہ ہیں۔

صحابہ کرام سب کے سب اہل جنت ہیں اُن کی خطائیں مغفور ہیں اُن کی تنقیص گناہِ عظیم ہے

قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں اس کی تصریحات ہیں جنمیں چند آیات تو اسی سورۃ میں آچکی ہیں لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اور اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا، ان کے علاوہ اور بہت سی آیات میں یہ مضمون مذکور ہے يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ۔ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا

عَنۡهُ وَاَعَدَّ لَهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ تَحۡتَهَا الۡاَنۡهٰرُ اور سورۂ حدید میں حق تعالیٰ نے صحابہ کرام کے بارے میں فرمایا ہے وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الۡحُسۡنٰى یعنی ان سب سے اللہ نے حسنیٰ کا وعدہ کیا ہے پھر سورۂ انبیاء میں حسنیٰ کے متعلق فرمایا اِنَّ الَّذِیۡنَ سَبَقَتۡ لَهُمۡ مِّنَّا الۡحُسۡنٰۤى اُولٰٓئِكَ عَنۡهَا مُبۡعَدُوۡنَ یعنی جن لوگوں کے لئے ہماری طرف سے حسنیٰ کا فیصلہ پہلے ہو چکا ہے وہ جہنم کی آگ سے دُور رکھے جائیں گے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

خیر الناس قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم (بخاری)

یعنی تمام زمانوں میں میرا زمانہ بہتر ہے اسکے بعد اُس زمانے کے لوگ بہتر ہیں جو میرے زمانے کے متصل ہیں پھر وہ جو انکے متصل ہیں۔

اور ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ میرے صحابہ کو بُرا نہ کہو کیونکہ (اُن کی قوتِ ایمان کیوجہ سے ان کا حال یہ ہے کہ) اگر تم میں سے کوئی شخص اللہ کی راہ میں احد پہاڑ کی برابر سونا خرچ کر دے تو وہ اُنکے خرچ کئے ہوئے کے ایک مُد کی برابر بھی نہیں ہو سکتا اور نہ نصف مُد کی برابر۔ مُد عرب کا ایک پیمانہ ہے جو تقریباً ہمارے آدھے سیر کی برابر ہوتا ہے (بخاری) اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے صحابہ کو سارے جہان میں سے پسند فرمایا ہے پھر میرے صحابہ میں میرے لئے چار کو پسند فرمایا ہے۔ ابو بکر عمر عثمان علی رضی اللہ عنہم (رواہ البزار بسند صحیح) اور ایک حدیث میں ارشاد ہے۔

اللہ اللہ فی اصحابی لا تتخذوھم غرضا من بعدی فمن احبہم فبحبی احبہم ومن ابغضہم فببغضی ابغضہم ومن اٰذاھم فقد اٰذانی ومن اٰذانی فقد اٰذی اللہ ومن اٰذی اللہ فیوشک ان یاخذہ (رواہ الترمذی عن عبد اللہ بن المغفل از جمع الفوائد)

اللہ سے ڈرو اللہ سے ڈرو میرے صحابہ کے معاملے میں میرے بعد ان کو طعن تشنیع کا نشانہ مت بناؤ کیونکہ جس شخص نے ان سے محبت کی تو میری محبت کیساتھ ان سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا تو میرے بغض کیساتھ ان سے بغض رکھا اور جس نے ان کو ایذا پہنچائی اُسنے مجھے ایذا پہنچائی اور جس نے مجھے ایذا دی اُسنے اللہ کو ایذا پہنچائی اور جو اللہ کو ایذا پہنچانے کا قصد کرے تو قریب ہے کہ اللہ اسکو عذاب میں پکڑے گا۔

آیات و احادیث اسکے متعلق بہت ہیں جن کو احقر نے اپنی کتاب **مقامِ صحابہ** میں جمع کر دیا ہے یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔ تمام صحابہ کرام کے عدل و ثقہ ہونے پر پوری اُمت کا اجماع ہے اور صحابہ کرام کے مابین جو اختلافات جنگ و قتال تک پہنچے اُنکے متعلق بحث و تمحیص اور تنقید و تحقیق یا سکوت کا مسئلہ بھی اس کتاب میں تفصیل کیساتھ لکھدیا گیا ہے اور اسمیں سے بقدر ضرورت سورۂ محمدؐ کی تفسیر میں آچکا ہے اس کو دیکھ لیا جائے۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلان

تَمَّتْ بِحَمْدِ اللّٰهِ وَعَوْنِهٖ سُوْرَةُ الْفَتْحِ لِلتَّاسِعِ وَالْعِشْرِيْنَ مِنْ شَعْبَان سنہ ۱۳۹۲ھ وللہ الحمد اولہ و آخرہ

سُورَۃُ الحُجُرَاتِ

سُوْرَۃُ الْحُجُرٰتِ مَدَنِیَّۃٌ وَّھِیَ ثَمَانِیْ عَشَرَۃَ اٰیَۃً وَّفِیْھَا رُکُوْعَانِ

سُورۂ حجرات مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی اٹھارہ آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاتَّقُوا

اے ایمان والو آگے نہ بڑھو اللہ سے اور اسکے رسول سے اور ڈرتے رہو

اللّٰہَ ط اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ① یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا

اللہ سے، اللہ سُنتا ہے جانتا ہے اے ایمان والو بلند نہ کرو

اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْھَرُوْا لَہٗ بِالْقَوْلِ کَجَھْرِ

اپنی آوازیں نبی کی آواز سے اُوپر اور اُس سے نہ بولو تڑخ کر جیسے تڑختے ہو

بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ②

ایک دوسرے پر کہیں اکارت نہ ہو جائیں تمھارے کام اور تم کو خبر بھی نہ ہو

اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَھُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ

جو لوگ دبی آواز سے بولتے ہیں رسول اللہ کے پاس وہی ہیں جن کے

امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ لِلتَّقْوٰی ط لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّاَجْرٌ عَظِیْمٌ ③ اِنَّ

دلوں کو جانچ لیا ہے اللہ نے ادب کے واسطے اُن کے لئے معافی ہے اور ثواب بڑا جو

الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَکَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ④ وَلَوْ

لوگ پکارتے ہیں تجھ کو دیوار کے پیچھے سے وہ اکثر عقل نہیں رکھتے اور اگر

اَنَّھُمْ صَبَرُوْا حَتّٰی تَخْرُجَ اِلَیْھِمْ لَکَانَ خَیْرًا لَّھُمْ ط وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ⑤

وہ صبر کرتے جب تک تو نکلتا ان کی طرف تو ان کے حق میں بہتر ہوتا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے

خُلاصۂ تفسیر

ربطِ سُورت وشانِ نزول | اس سے پہلی دو سُورتوں میں جہاد کے احکام تھے جس سے اصلاح عالم و آفاق مقصود ہے۔ اس سورت میں اصلاحِ نفس کے احکام وآداب مذکور ہیں، خصوصاً وہ احکام جو آدابِ معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں اور قصہ ان آیتوں کے نزول کا یہ ہے کہ ایک مرتبہ قبیلہ بنو تمیم کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے یہ بات زیرِ غور تھی کہ اس قبیلہ پر حاکم کس کو بنایا جائے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے قعقاع ابن معبد کی نسبت رائے دی اور حضرت عمرؓ نے اقرع بن حابس کے متعلق رائے دی، اس معاملہ میں حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے مابین آپ کی مجلس میں گفتگو ہوگئی اور گفتگو بڑھ کر دونوں کی آوازیں بلند ہوگئیں اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ (رواہ البخاری)

اے ایمان والو اللہ اور رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) (کی اجازت) سے پہلے تم (کسی قول یا فعل میں) سبقت نہ کیا کرو (یعنی جب تک قرائن قویہ سے یا بالتصریح گفتگو کی اجازت نہ ہو گفتگو مت کرو جیسا کہ واقعہ مذکورہ جو سببِ نزول ان آیات کا ہوا اُسمیں انتظار کرنا چاہیے تھا کہ یا تو آپ خود کچھ فرماتے یا آپ حاضرینِ مجلس سے پُوچھتے بدون انتظار کے از خود گفتگو شروع کر دینا درست نہیں تھا کیونکہ گفتگو کا جواز اذنِ شرعی پر موقوف تھا خواہ یہ اذن قطعی ہو یعنی صریح طور پر یا ظنی قرائن قویہ کے ذریعہ غلطی یہ ہوئی انتظار نہیں کیا، اسپر یہ آیت نازل ہوئی) اور اللہ سے ڈرتے رہو بیشک اللہ تعالیٰ (تمھارے سب اقوال کو) سُننے والا (اور تمھارے افعال کو) جاننے والا ہے (اور) اے ایمان والو تم اپنی آوازیں پیغمبر (صلے اللہ علیہ وسلم) کی آواز سے بلند مت کیا کرو اور نہ اُن سے ایسے کُھل کر بولا کرو جیسے آپس میں کُھل کر ایک دوسرے سے بولا کرتے ہو (یعنی نہ بلند آواز سے بولو جبکہ آپکے سامنے آپس میں کوئی بات کرنا ہو اور نہ برابر کی آواز سے بولو جبکہ خود آپ سے خطاب کرنا ہو) کبھی تمھارے اعمال برباد ہو جاویں اور تم کو خبر بھی نہ ہو (اس کا مطلب یہ ہے کہ آواز کا بلند کرنا جو صورۃً بے باکی اور بے پروائی ہے اور بلند آواز سے اس طرح باتیں کرنا جیسے آپس میں ایک دوسرے سے بے تکلف باتیں کرتے ہیں یہ ایک قسم کی گستاخی ہے اپنے تابع اور خادم سے اس طرح کی گفتگو ناگوار اور ایذا دہ ہوسکتی ہے اور اللہ کے رسُول کو ایذا پہنچانا تمام اعمالِ خیر کو برباد کر دینے والا ہے۔ البتہ بعض اوقات جبکہ طبیعت میں زیادہ انبساط ہو یہ امور ناگوار نہیں ہوتے اسوقت عدم ایذاء رسُول کیوجہ سے یہ گفتگو حبطِ اعمال کا موجب نہیں ہو گی لیکن متکلم کو یہ معلوم کرنا کہ اسوقت ہماری ایسی گفتگو ناگوار خاطر اور موجبِ ایذا نہیں ہوگی آسان نہیں ہوسکتا ہے کہ متکلم تو یہ سمجھ کر کلام کرے کہ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا نہیں ہوگی مگر واقع میں اس سے ایذاء پہنچ جائے تو گفتگو اسکے اعمال کو حبط اور برباد کر دے گی اگرچہ اس کو گمان بھی نہ ہو گا کہ

میری اس گفتگو سے مجھے کتنا بڑا خسارہ ہو گیا، اسلئے آواز بلند کرنے اور جہر بالقول کو مطلقاً ممنوع کر دیا گیا کیونکہ ایسی گفتگو کے بعض افراد اگرچہ موجبِ ایذار وحبط اعمال نہیں ہونگے مگر اسکی تعیین کیسے ہو گی اسلئے مطلقاً جہر بالقول کے تمام افراد کو ترک کر دینا چاہیئے یہانتک تو آواز بلند کرنے سے ڈرایا گیا ہے آگے آواز پست کرنے کی ترغیب ہے)

بیشک جو لوگ اپنی آوازوں کو رسول اللہ (صلے اللہ علیہ سلم) کے سامنے پست رکھتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لئے خالص کر دیا ہے (یعنی اُن کے قلوب میں تقویٰ کے خلاف کوئی چیز آتی ہی نہیں، مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس خاص معاملہ میں یہ حضرات کمالِ تقویٰ کے ساتھ متصف ہیں کیونکہ ترمذی کی حدیث مرفوع میں کمال تقویٰ کا بیان اس الفاظ میں آیا ہے لا یبلغ العبد ان یکون من المتقین حتّٰی یدع مالا بأس بہ حذرًا لما بہ بأس، یعنی بندہ کمالِ تقویٰ کو اسوقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ وہ کچھ ایسی چیزوں کو بھی جنمیں کوئی گناہ نہیں اس احتیاط کی بنار پر چھوڑ دے کہ یہ جائز کام کہیں مجھے کسی ناجائز کام میں مبتلا نہ کر دے۔ مراد وہ مشتبہ امور ہیں جن میں گناہ کا خطرہ اور شبہ ہو۔ جیسا کہ آواز بلند کرنے کی ایک فرد ایسی ہے جس میں گناہ نہیں، یعنی وہ جس میں مخاطب کو ایذا نہ ہو۔ اور ایک فرد وہ ہے جس میں گناہ ہے یعنی جس سے ایذا پہنچے، تو کمالِ تقویٰ اسمیں ہے کہ آدمی مطلقاً آواز بلند کرنے کو چھوڑ دے، آگے ان کے عمل کے اُخروی فائدہ کا بیان ہے) اُن لوگوں کے لئے مغفرت اور اجرِ عظیم ہے۔ اور اگلی آیتوں کا قصہ یہ ہے کہ وہی بنو تمیم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ باہر تشریف فرما نہ تھے بلکہ ازواجِ مطہرات کے حجرات میں سے کسی مکان میں تھے۔ یہ لوگ غیر مہذب گاؤں والے تھے باہر ہی سے کھڑے ہو کر آپ کا نام لیکر پکارنے لگے کہ یا محمدؐ اخرج الینا، یعنی اے محمدؐ ہمارے لئے باہر آئیے، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں (کذا فی الدر المنثور بروایۃ ابن اسحٰق عن ابن عباسؓ) جو لوگ حجروں کے باہر سے آپ کو پکارتے ہیں اُن میں اکثروں کو عقل نہیں ہے (کہ عقل ہوتی تو آپ کا ادب کرتے اسطرح نام لیکر باہر سے پکارنے کی جرأت نہ کرتے۔ اور اکثرہم فرمانے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ بعض پکارنے والے فی نفسہٖ جری نہ ہوں گے، دوسروں کیساتھ دیکھا دیکھی لگ گئے اس طرح اُن سے بھی یہ غلطی ہو گئی اور یا اگرچہ سب ایک ہی طرح کے ہوں مگر اکثرہم کا لفظ فرمانے سے کسی کو اشتعال نہیں ہو گا کیونکہ ہر شخص یہ خیال کر سکتا ہے کہ شاید مجھ کو کہنا مقصود نہ ہو۔ وعظ و نصیحت کا یہی طریقہ ہے کہ ایسے کلمات سے احتیاط کیجائے جن سے مخاطب کو اشتعال پیدا ہو) اور اگر یہ لوگ (ذرا) صبر (اور انتظار) کرتے یہانتک کہ آپ خود باہر انکے پاس آجاتے تو یہ انکے لئے بہتر ہوتا (کیونکہ یہ ادب کی بات تھی) اور (اگر اب بھی توبہ کرلیں تو معاف ہو جاوے کیونکہ) اللہ غفور رحیم ہے۔

معارف و مسائل

ان آیات کے نزول کے متعلق روایات حدیث میں بقول قرطبی چھ واقعات منقول ہیں اور قاضی ابوبکر بن عربی نے فرمایا کہ سب واقعات صحیح ہیں کیونکہ وہ سب واقعات مفہوم آیات کے عموم میں داخل ہیں ان میں سے ایک واقعہ وہ ہے جو خلاصۂ تفسیر میں بروایت بخاری ذکر کیا گیا ہے۔

لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ، بَیْنَ الْیَدَیْنِ کے اصل معنے دو ہاتھوں کے درمیان کے ہیں مراد اس سے سامنے کی جہت ہے یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے تقدم اور پیشقدمی نہ کرو کس چیز میں پیشقدمی کو منع فرمایا ہے قرآن کریم نے اسکو ذکر نہیں کیا جس میں اشارہ عموم کیطرف ہے کہ کسی قول یا فعل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشقدمی نہ کرو بلکہ انتظار کرو کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیا جواب دیتے ہیں، ہاں آپ ہی کسی کو جواب کے لئے مامور فرمادیں تو وہ جواب دے سکتا ہے۔ اسی طرح اگر آپ چل رہے ہیں تو کوئی آپ سے آگے نہ بڑھے، کھانے کی مجلس ہے تو آپ سے پہلے کھانا شروع نہ کرے مگر یہ کہ آپکی تصریح یا قرائن قویہ سے یہ ثابت ہو جائے کہ آپ خود ہی کسی کو آگے بھیجنا چاہتے ہیں جیسے سفر اور جنگ میں کچھ لوگوں کو آگے چلنے پر مامور کیا جاتا تھا۔

علمائے دین اور دینی مقتداؤں کے ساتھ بھی یہی ادب ملحوظ رکھنا چاہیئے | بعض علماء نے فرمایا ہے کہ علماء و مشائخ دین کا بھی یہی حکم ہے کیونکہ وہ وارث انبیاء ہیں اور دلیل اسکی یہ واقعہ ہے کہ ایک دن حضرت ابوالدرداءؓ کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ کے آگے چل رہے ہیں تو آپ نے تنبیہ فرمائی اور فرمایا کہ کیا تم ایسے شخص کے آگے چلتے ہو جو دنیا و آخرت میں تم سے بہتر ہے اور فرمایا کہ دنیا میں آفتاب کا طلوع و غروب کسی ایسے شخص پر نہیں ہوا جو انبیاء کے بعد ابوبکر سے بہتر و افضل ہو (روح البیان از کشف الاسرار) اسلئے علماء نے فرمایا کہ اپنے اُستاد اور مرشد کیساتھ بھی یہی ادب ملحوظ رکھنا چاہیئے۔

لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ، یہ دوسرا ادب مجلس نبوی کا بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے آپ کی آواز سے زیادہ آواز بلند کرنا یا بلند آواز سے اس طرح گفتگو کرنا جیسے آپس میں ایک دوسرے سے بے محابا کیا کرتے ہیں ایک قسم کی بے ادبی گستاخی ہے، چنانچہ اس آیت کے نزول سے صحابۂ کرام کا یہ حال ہو گیا کہ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ قسم ہے کہ اب مرتے دم تک آپ سے اس طرح بولوں گا جیسے کوئی کسی سے سرگوشی کرتا ہو (درمنثور عن البیہقی) اور حضرت عمرؓ اسقدر آہستہ بولنے لگے کہ بعض اوقات دوبارہ پوچھنا پڑتا تھا (کذا فی الصحاح) اور حضرت ثابت بن قیسؓ طبعی طور پر بہت بلند آواز تھے، یہ آیت سنکر وہ بہت

ڈرے اور روئے اور اپنی آواز کو گھٹایا (بیان القرآن از دُرِّ منثور)

روضۂ اقدس کے سامنے بھی بہت بلند آواز سے سلام وکلام کرنا ممنوع ہے

قاضی ابو بکر ابن عربی نے فرمایا کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعظیم اور ادب آپ کی وفات کے بعد بھی ایسا ہی واجب ہے، جیسا حیات میں تھا، اسی لئے بعض علماء نے فرمایا کہ آپ کی قبر شریف کے سامنے بھی زیادہ بلند آواز سے سلام وکلام کرنا ادب کے خلاف ہے۔ اسی طرح جس مجلس میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی احادیث پڑھی یا بیان کیجا رہی ہوں اُس میں بھی شور وشغب کرنا بے ادبی ہے کیونکہ آپ کا کلام جسوقت آپؐ کی زبان مبارک سے ادا ہو رہا ہو اسوقت سب کے لئے خاموش ہو کر اسکا سُننا واجب وضروری تھا اسی طرح بعد وفات جس مجلس میں آپ کا کلام سُنایا جاتا ہو وہاں شور وشغب کرنا بے ادبی ہے۔

مسئلہ ۔ جس طرح تقدم علی النبی کی ممانعت میں علمائے دین بحیثیت وارث انبیاء ہونیکے داخل ہیں اسی طرح رفع صوت کا بھی یہی حکم ہے کہ اکابر علماء کی مجلس میں اتنی بلند آواز سے نہ بولے جس سے اُن کی آواز دب جائے (قرطبی)

اَنۡ تَحۡبَطَ اَعۡمَالُكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ ، لفظ اَنۡ تحبط مفعول لہٗ ہے لاترفعوا کا جسمیں حکم کی علت بتلائی گئی ہے۔ بحذف مصدر یعنی خشیۃ ان تحبط معنے آیت کے یہ ہوئے کہ اپنی آواز کو نبیؐ کی آواز پر بلند نہ کرو بسبب اس خطرہ اور خوف کے کہ کہیں تمھارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمھیں خبر بھی نہو اس جگہ کلیات شرعیہ اور اصول مسلّمہ کے اعتبار سے چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ حبط اعمال یعنی اعمالِ صالحہ کو ضائع کر دینے والی چیز تو باتفاق اہل سُنت والجماعت صرف کفر ہے۔ کسی ایک معصیت اور گناہ سے دوسرے اعمالِ صالحہ ضائع نہیں ہوتے اور یہاں خطاب مؤمنین اور صحابہ کرام کو ہے اور لفظ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کے ساتھ ہے جس سے اس فعل کا کفر نہونا ثابت ہوتا ہے تو حبط اعمال کیسے ہوا۔ دوسرے یہ کہ جس طرح ایمان ایک فعل اختیاری ہے جب تک کوئی شخص اپنے اختیار سے ایمان نہ لائے مؤمن نہیں ہوتا اسی طرح کفر بھی امر اختیاری ہے جب تک کوئی شخص اپنے قصد سے کفر کو اختیار نہ کرے وہ کافر نہیں ہوسکتا۔ اور یہاں آیت کے آخر میں یہ تصریح ہے کہ اَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ، یعنی تمھیں خبر بھی نہ ہو تو حبطِ اعمال جو خالص کفر کی سزا ہے وہ کیسے جاری ہوئی۔

سیّدی حضرت حکیم الامۃ رحؒ نے بیان القرآن میں اسکی توجیہ ایسی بیان فرمائی ہے جس سے یہ سب اشکالات و سوالات ختم ہو جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ معنی آیت کے یہ ہیں کہ مسلمانو تم رسول اللہ کی آواز سے اپنی آواز بلند کرنے اور بے محابا جہر کرنے سے بچو، کیونکہ ایسا کرنے میں خطرہ ہے کہ تمھارے اعمال حبط اور ضائع ہو جائیں، اور وہ خطرہ اس لئے ہے کہ رسُولؐ سے پیشقدمی یا اُن کی آواز پر اپنی آواز کو بلند کر کے غالب کرنا ایک ایسا امر ہے جس سے رسُولؐ کی شان میں گستاخی اور بے ادبی ہونیکا بھی

احتمال ہے جو سبب ہے ایذائے رسُول کا۔ اگرچہ صحابۂ کرام سے یہ وہم بھی نہیں ہوسکتا کہ وہ بالقصد کوئی ایسا کام کریں جو آپ کی ایذار کا سبب بنے لیکن بعض اعمال وافعال جیسے تقدّم اور رفع صوت اگرچہ بقصد ایذار نہ ہوں پھر بھی اُن سے ایذار کا احتمال ہے اسی لئے اُن کو مطلقاً ممنوع اور معصیت قرار دیا ہے اور بعض معصیتوں کا خاصہ یہ ہوتا ہے کہ اسکے کرنے والے سے توبہ اور اعمال صالحہ کی توفیق سلب ہوجاتی ہے اور وہ گناہوں میں منہمک ہوکر انجام کار کفر تک پہنچ جاتا ہے جو سبب ہے حبط اعمال کا، کسی اپنے دینی مقتدار استاد یا مرشد کی ایذار رسانی ایسی ہی معصیت ہے جس سے سلب توفیق کا خطرہ ہوتا ہے، اس طرح یہ افعال یعنی تقدم علی النبی اور رفع الصّوت ایسی معصیت ٹھیریں کہ جن سے خطرہ ہے کہ توفیق سلب ہوجائے اور یہ خذلان آخر کار کفر تک پہنچا دے جس سے تمام اعمالِ صالحہ ضائع ہوجاتے ہیں اور کرنے والے نے چونکہ قصد ایذار کا نہ کیا تھا اسلئے اس کو اس کی خبر بھی نہ ہوگی کہ اس ابتلار کفر اور حبط اعمال کا اصل سبب کیا تھا۔ بعض علمار نے فرمایا ہے کہ اگر کسی صالح بزرگ کو کسی نے اپنا مرشد بنایا ہو اسکے ساتھ گستاخی و بے ادبی کا بھی یہی حال ہے کہ بعض اوقات وہ سلب توفیق اور خذلان کا سبب بن جاتی ہے جو انجام کار متاعِ ایمان کو بھی ضائع کردیتی ہے نعوذ باللہ منہ

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ، اس آیت میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ایک تیسرا ادب سکھلایا گیا ہے کہ جس وقت آپ اپنے مکان اور آرام گاہ میں تشریف فرما ہوں اس وقت باہر کھڑے ہوکر آپ کو پکارنا خصوصاً گنوارپن کے ساتھ کہ نام لیکر پکارا جائے یہ بے ادبی ہے عقل والوں کے یہ کام نہیں۔ حجرات، حجرہ کی جمع ہے اصل لغت میں حجرہ ایک چاردیواری سے گھرے ہوئے مکان کو کہتے ہیں جس میں کچھ صحن ہو کچھ مسقّف عمارت ہو۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات مدینہ طیبہ میں نو تھیں اُن میں سے ہر ایک کے لئے ایک حجرہ الگ الگ تھا جن میں آپ باری باری تشریف فرما ہوتے تھے۔

حجرات امہات المؤمنین | ابن سعد نے بروایت عطار خراسانی لکھا ہے کہ یہ حجرات کھجور کی شاخوں سے بنے ہوئے تھے اور اُن کے دروازوں پر موٹے سیاہ اُون کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ امام بخاری نے ادب المفرد میں اور بیہقی نے داؤد بن قیس سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے ان حجرات کی زیارت کی ہے میرا گمان یہ ہے کہ حجرہ کے دروازہ سے مسقّف بیت تک چھ سات ہاتھ ہوگا اور بیت (کمرہ) دس ہاتھ اور چھت کی اونچائی سات آٹھ ہاتھ ہوگی۔ یہ حجرات امہات المؤمنین ولید بن عبد الملک کی حکومت میں اُن کے حکم سے مسجدِ نبوی میں شامل کردیئے گئے۔ مدینہ میں اُس روز لوگوں پر گریہ و بکا طاری تھی۔

سببِ نزول | امام بغوی نے بروایت قتادہ رضؓ ذکر کیا ہے کہ قبیلہ بنو تمیم کے لوگ جو آپ کی خدمت

میں حاضر ہوئے تھے جن کا ذکر اوپر آیا ہے۔ یہ دو پہر کے وقت مدینہ میں پہنچے جبکہ آپؐ کسی حجرہ میں آرام فرما رہے تھے۔ یہ لوگ اعراب آدابِ معاشرت سے ناواقف تھے۔ اُنھوں نے حجرات کے باہر ہی سے پکارنا شروع کر دیا، اخرج الینا یا محمد اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں اس طرح پکارنے کی ممانعت اور انتظار کرنے کا حکم دیا گیا۔ مسند احمد۔ ترمذی وغیرہ میں بھی یہ روایت مختلف الفاظ سے آئی ہے (مظہری)

تنبیہ صحابہ و تابعین نے اپنے علماء و مشائخ کے ساتھ بھی اسی ادب کا استعمال کیا ہے۔ صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ابن عباس رضؓ سے منقول ہے کہ جب ہیں کسی عالم صحابیؓ سے کوئی حدیث دریافت کرنا چاہتا تھا تو انکے مکان پر پہنچکر ان کو آواز یا دروازہ پر دستک دینے سے پرہیز کرتا اور دروازہ کے باہر بیٹھ جاتا تھا کہ جب وہ خود ہی باہر تشریف لاویں گے اسوقت اُن سے دریافت کروں گا، وہ مجھے دیکھ کر فرماتے کہ اے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی، آپ نے دروازہ پر دستک دیکر کیوں نہ اطلاع کر دی تو ابنِ عباس نے فرمایا کہ عالم اپنی قوم میں مثل نبی کے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے نبی کی شان میں یہ ہدایت فرمائی ہے کہ اُن کے باہر آنیکا انتظار کیا جائے۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے فرمایا کہ میں نے کبھی کسی عالم کے دروازہ پر جا کر دستک نہیں دی بلکہ اسکا انتظار کیا کہ وہ خود ہی جب باہر تشریف لاویں گے اسوقت ملاقات کرونگا (روح المعانی)

مسئلہ:۔ آیت مذکورہ میں حَتّٰی تَخْرُجَ اِلَیْھِمْ میں اِلَیْھِمْ کی قید بڑھانے سے یہ ثابت ہوا کہ صبر و انتظار اسوقت تک کرنا ہے جب تک کہ آپ لوگوں سے ملاقات و گفتگو کے لئے باہر تشریف لائیں، اس سے معلوم ہوا کہ آپؐ کا باہر تشریف لانا کسی دوسری ضرورت سے ہو اسوقت بھی آپؐ سے اپنے مطلب کی بات کرنا مناسب نہیں بلکہ اسکا انتظار کریں کہ جب آپؐ اُن کی طرف متوجہ ہوں اسوقت بات کریں۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا اَنْ تُصِیْبُوْا

اے ایمان والو اگر آئے تمھارے پاس کوئی گنہگار خبر لے کر تو تحقیق کر لو کہیں جا نہ پڑو

قَوْمًۢا بِجَھَالَۃٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰی مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ ﴿۶﴾

کسی قوم پر نادانی سے پھر کل کو اپنے کئے پر لگو پچتانے

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو اگر کوئی شریر آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے (جسمیں کسی کی شکایت ہو) تو (بدون تحقیق کے اس پر عمل نہ کیا کرو بلکہ اگر عمل کرنا مقصود ہو تو) خوب تحقیق کر لیا کرو کبھی کسی قوم کو نادانی سے کوئی ضرر نہ پہنچا دو پھر اپنے کئے پر پچتانا پڑے۔

معارف و مسائل

شانِ نزول اس آیت کے نزول کا واقعہ ابن کثیر نے بحوالہ مسند احمد یہ نقل کیا ہے کہ قبیلہ بنی المصطلق کے رئیس حارث بن ضرار ابن ابی ضرار جن کی صاجزادی حضرت جویریہؓ بنت حارث امہات المؤمنین میں سے ہیں یہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے مجھے اسلام کی دعوت دی اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا، میں نے اسلام کو قبول کیا اور زکوٰۃ ادا کرنے کا اقرار کیا اور عرض کیا کہ اب میں اپنی قوم میں جاکر ان کو بھی اسلام اور ادائے زکوٰۃ کی طرف دعوت دوں گا۔ جو لوگ میری بات مان لیں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے میں اُن کی زکوٰۃ جمع کرلوں گا۔ اور آپ فلاں مہینہ کی فلاں تاریخ تک اپنا کوئی قاصد میرے پاس بھیجدیں تاکہ جو رقم زکوٰۃ کی میرے پاس جمع ہو جائے اس کو سپرد کردوں، پھر جب حارث نے حسب وعدہ ایمان لانے والوں کی زکوٰۃ جمع کرلی اور وہ مہینہ اور تاریخ جو قاصد بھیجنے کے لئے طے ہوئی تھی گزر گئی اور آپ کا کوئی قاصد نہ پہنچا تو حارث کو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ شاید رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہم سے کسی بات پر ناراض ہیں ورنہ یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ وعدے کے مطابق اپنا آدمی نہ بھیجتے۔ حارث نے اس خطرہ کا ذکر اسلام قبول کرنے والوں کے سرداروں سے کیا، اور ارادہ کیا کہ یہ سب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوجاویں۔ ادھر واقعہ یہ ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقررہ تاریخ پر ولید بن عقبہؓ کو اپنا قاصد بناکر زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھیجدیا تھا مگر ولید بن عقبہ کو راستہ میں یہ خیال آیا کہ اس قبیلہ کے لوگوں سے میری پرانی دشمنی ہے کہیں ایسا نہو کہ یہ مجھے قتل کرڈالیں اس خوف کے سبب وہ راستہ ہی سے واپس ہوگئے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے جاکر یہ کہا کہ اُن لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کردیا اور میرے قتل کا ارادہ کیا اسپر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو غصّہ آیا اور حضرت خالد بن ولید کی سرکردگی میں ایک دستہ مجاہدین کا روانہ کیا، ادھر یہ دستہ مجاہدین کا روانہ ہوا ادھر سے حارث مع اپنے ساتھیوں کے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے لئے نکلے، مدینہ کے قریب دونوں کی ملاقات ہوئی۔ حارث نے ان لوگوں سے پوچھا کہ آپ کن لوگوں کیطرف بھیجے گئے ہو۔ ان لوگوں نے کہا کہ ہم تمھاری طرف بھیجے گئے ہیں۔ حارث نے سبب پوچھا تو ان کو واقعہ ولید بن عقبہ کے بھیجنے کا اور اُنکی واپسی کا بتلایا گیا اور یہ کہ ولید بن عقبہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ بیان دیا ہے کہ بنی المصطلق نے زکوٰۃ دینے سے انکار کردیا اور میرے قتل کا منصوبہ بنایا۔ حارث نے یہ سُن کر کہا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسولِ برحق بناکر بھیجا ہے میں نے ولید بن عقبہ کو دیکھا تک نہیں اور نہ وہ میرے پاس آئے۔ اس کے بعد حارث جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ کیا تم نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا اور میرے قاصد کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ حارث نے کہا کہ ہرگز نہیں، قسم ہے اُس

ذات کی جسنے آپ کو پیغام حق دیکر بھیجا ہے نہ وہ میرے پاس آئے نہ میں نے انکو دیکھا۔ پھر جب مقررہ وقت پر آپ کا قاصد نہ پہنچا تو مجھے خطرہ ہوا کہ شاید مجھ سے کوئی قصور ہوا جس پر حضور ناراض ہوئے اس لئے میں حاضر خدمت ہوا۔ حارث رضؓ فرماتے ہیں کہ اس پر سورۂ حجرات کی آیت نازل ہوئی (ابن کثیر)

اور بعض روایات میں ہے کہ ولید بن عقبہؓ حسب الحکم بنی المصطلق میں پہنچے، اس قبیلہ کے لوگوں کو چونکہ یہ معلوم تھا کہ اس تاریخ پر حضورؐ کا قاصد آویگا یہ تعظیماً بستی سے باہر نکلے کہ ان کا استقبال کریں۔ ولید بن عقبہؓ کو شبہ ہو گیا کہ یہ شاید پرانی دشمنی کیوجہ سے مجھے قتل کرنے آئے ہیں یہیں سے واپس ہو گئے اور جاکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے گمان کے مطابق یہ عرض کر دیا کہ وہ لوگ زکوٰۃ دینے کے لئے تیار نہیں، بلکہ میرے قتل کے درپے ہوئے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو بھیجا اور یہ ہدایت فرمائی کہ خوب تحقیق کرلیں اسکے بعد کوئی اقدام کریں۔ خالد بن ولیدؓ نے بستی سے باہر رات کو پہنچکر قیام کیا اور تحقیقِ حال کے لئے چند آدمی بطور جاسوس کے خفیہ بھیجدیئے۔ ان لوگوں نے آکر خبر دی کہ یہ سب لوگ اسلام و ایمان پر قایم، نماز و زکوٰۃ کے پابند ہیں اور کوئی بات خلافِ اسلام نہیں پائی گئی، خالد بن ولیدؓ نے واپس آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سارا واقعہ بتلایا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی (یہ ابن کثیر کی متعدد روایات کا خلاصہ ہے)

اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ کوئی شریر فاسق آدمی اگر کسی شخص یا قوم کی شکایت کرے اُنپر کوئی الزام لگائے تو اسکی خبر یا شہادت پر بغیر مکمل تحقیق کے عمل کرنا جائز نہیں۔

آیت سے متعلقہ احکام و مسائل امام جصاصؒ نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ کسی فاسق کی خبر کو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا اسوقت تک جائز نہیں جب تک دوسرے ذرائع سے تحقیق کر کے اسکا صدق ثابت نہ ہو جائے، کیونکہ اس آیت میں ایک قرات تو فتثبتوا کی ہے جس کے معنی ہیں کہ اس پر عمل کرنے اور اقدام میں جلدی نہ کرو بلکہ ثابت قدم رہو جب تک دوسرے ذرائع سے اسکا صدق ثابت نہ ہو جائے۔ اور جب فاسق کی خبر کو قبول کرنا جائز نہ ہوا ...... تو شہادت کو قبول کرنا بدرجۂ اولیٰ ناجائز ہوگا کیونکہ ہر شہادت ایک خبر ہوتی ہے جو حلف و قسم کے ساتھ موکد کیجاتی ہے، اسی لئے جمہور علماء کے نزدیک فاسق کی خبر یا شہادت شرعاً مقبول نہیں۔ البتہ بعض معاملات اور حالات میں فاسق کی خبر اور شہادت کو بھی قبول کرلیا جاتا ہے وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ آیت قرآن میں اس حکم کی ایک خاص علت منصوص ہے یعنی اَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ۔ تو جن معاملات میں یہ علت موجود نہیں وہ آیت کے حکم میں داخل نہیں یا مستثنیٰ ہیں۔ مثلاً یہ کہ کوئی فاسق بلکہ کافر بھی کوئی چیز لائے اور یہ کہے کہ فلاں شخص نے یہ آپ کو ہدیہ بھیجا ہے تو اس کی خبر پر عمل جائز ہے اس کی مزید تفصیل کتب فقہ معین الحکام وغیرہ میں ہے

اور احقر نے احکام القرآن عربی حزب سادس میں اسکی تفصیل لکھدی ہے اہل علم اسمیں دیکھ سکتے ہیں ۔

ایک اہم سوال وجواب متعلقہ عدالتِ صحابہ اس آیت کا ولید بن عقبہؓ کے متعلق نازل ہونا صحیح روایات سے ثابت ہے اور آیت میں اُن کو فاسق کہا گیا ہے اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ میں کوئی فاسق بھی ہو سکتا ہے ۔ اور یہ اُس مسلمہ اور متفق علیہ ضابطہ کیخلاف ہے کہ الصَّحَابَۃ کلّھم عدول ، یعنی صحابۂ کرام سب کے سب ثقہ ہیں ان کی کسی خبر و شہادت پر کوئی گرفت نہیں کیجا سکتی ۔ علامہ آلوسی نے رُوح المعانی میں فرمایا کہ اس معاملے میں حق بات وہ ہی جسکی طرف جمہور علماء گئے ہیں کہ صحابہ کرام معصوم نہیں اُن سے گناہِ کبیرہ بھی سرزد ہو سکتا ہی جو فسق ہے اور اُس گناہ کے وقت اُن کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جس کے وہ مستحق ہیں یعنی شرعی سزا جاری کیجائے گی اور اگر کذب ثابت ہوا تو انکی خبر و شہادت رد کردی جائے گی لیکن عقیدہ اہلِ سنت والجماعت کا نصوصِ قرآن وسنت کی بنار پر یہ ہے کہ صحابی سے گناہ تو ہو سکتا ہے مگر کوئی صحابی ایسا نہیں جو گناہ سے توبہ کر کے پاک نہ ہو گیا ہو۔ قرآنِ کریم نے علی الاطلاق اُن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی رضا کا فیصلہ صادر فرمادیا ہے رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ الآیۃ ، اور رضائے الٰہی گناہوں کی معافی کے بغیر نہیں ہوتی ، جیساکہ قاضی ابویعلیٰ نے فرمایا کہ رضا اللہ تعالیٰ کی ایک صفتِ قدیمہ ہے وہ اپنی رضا کا اعلان صرف انہی کے لئے فرماتے ہیں جن کے متعلق وہ جانتے ہیں کہ اُنکی وفات موجباتِ رضا پر ہوگی (کذا فی الصارم المسلول لابن تیمیہ)

خلاصہ یہ ہے کہ صحابۂ کرام کی عظیم الشان جماعت میں سے گِنے چُنے چند آدمیوں سے کبھی کوئی گناہ سرزد بھی ہوا ہے تو اُن کو فوراً توبہ نصیب ہوئی ہے ۔ حق تعالیٰ نے اُن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے ایسا بنا دیا تھا کہ شریعت اُن کی طبیعت بن گئی تھی ۔ خلاف شرع کوئی کام یا گناہ سرزد ہونا انتہائی شاذ و نادر تھا اُن کے اعمال صالحہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور اسلام پر اپنی جانیں قربان کرنا اور ہر کام میں اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے اتباع کو وظیفۂ زندگی بنانا اور اسکے لئے ایسے مجاہدات کرنا جن کی نظیر پچھلی اُمتوں میں نہیں ملتی ۔ ان بے شمار اعمالِ صالحہ اور فضائل و کمالات کے مقابلے میں عمر بھر میں کسی گناہ کا سرزد ہو جانا اس کو خود ہی کالعدم کر دیتا ہے ۔ دوسرے اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عظمت اور ادنیٰ سے گناہ کے وقت اُن کا خوف خشیت اور فوراً توبہ کرنا بلکہ اپنے آپ کو سزا کے لئے خود پیش کر دینا ، کہیں اپنے آپ کو مسجد کے ستون سے باندھ دینا وغیرہ روایات حدیث میں معروف و مشہور ہیں اور بحکم حدیث گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہو جاتا ہے کہ جیسے گناہ کیا ہی نہیں ، تیسرے حسب ارشاد قرآن اعمال صالحہ اور حسنات خود بھی گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ خصوصاً

جبکہ اُن کے حسنات عام لوگوں کی طرح نہیں بلکہ ان کا حال وہ ہے جو ابو داؤد و ترمذی نے حضرت سعید بن زید سے نقل کیا ہے کہ واللہ لمشھد رجل منھم مع النبی صلے اللہ علیہ وسلم یغبر فیہ وجھہ خیر من عمل احدکم ولو عمر عمر نوح، یعنی خدا کی قسم ان میں سے کسی شخص کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی جہاد میں شریک ہونا جسمیں اُن کے چہرہ پر غبار پڑگیا ہو تمھاری عمر بھر کی طاعت عبادت سے افضل ہے اگرچہ اس کو عمر نوح علیہ السلام دیدی گئی ہو۔ اسلئے ان سے صدور گناہ کے وقت اگرچہ سزا وغیرہ میں معاملہ وہی کیا گیا جو اس جرم کے لئے مقرر تھا مگر اسکے باوجود بعد میں کسی کے لئے جائز نہیں کہ ان میں سے کسی کو فاسق قرار دے، اسلئے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں کسی صحابی سے کوئی گناہ موجب فسق سرزد بھی ہوا اور اسوقت ان کو فاسق کہا بھی گیا تو اس سے یہ جائز نہیں ہو جاتا کہ اس فسق کو انکے لئے مستمر سمجھ کر معاذ اللہ فاسق کہا جائے (کذا فی الروح)

اور آیت مذکورہ میں تو قطعاً یہ ضروری نہیں کہ ولید بن عقبہ کو فاسق کہا گیا ہو سببِ نزول خواہ اُن کا معاملہ ہی سہی مگر لفظ فاسق اُن کے لئے استعمال کیا گیا یہ ضرور نہیں، وجہ یہ ہے کہ اس واقعہ سے پہلے تو ولید بن عقبہ سے کوئی ایسا کام ہوا نہ تھا جس کے سبب ان کو فاسق کہا جائے اور اس واقعہ میں بھی جو انھوں نے بنی المصطلق کے لوگوں کی طرف ایک بات غلط منسوب کی وہ بھی اپنے خیال کے مطابق صحیح سمجھ کر کی اگرچہ واقع میں غلط تھی اس لئے آیت مذکورہ کا مطلب بے تکلف وہ بن سکتا ہے جو خلاصۂ تفسیر میں اوپر گزرا ہے کہ اس آیت نے قاعدہ کلیہ فاسق کی خبر کے نامقبول ہونیکے متعلق بیان کیا ہے اور واقعہ مذکورہ پر اس آیت کے نزول سے اسکی مزید تاکید اس طرح ہوگئی کہ ولید بن عقبہ اگرچہ فاسق نہ تھے مگر ان کی خبر قرائن قویہ کے اعتبار سے ناقابلِ قبول نظر آئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض انکی خبر پر کسی اقدام سے گریز کرکے خالد بن ولید کو تحقیقات پر مامور فرما دیا تو جب ایک ثقہ اور صالح آدمی کی خبر میں قرائن کی بنا پر شبہ ہو جانیکا معاملہ یہ ہے کہ اسپر قبل از تحقیق عمل نہیں کیا گیا تو فاسق کی خبر کو قبول نہ کرنا اور اس پر عمل نہ کرنا اور زیادہ واضح ہے۔ عدالتِ صحابہ کی مکمل بحث احقر نے اپنی کتاب مقامِ صحابہ میں بیان کردی جو شائع ہو چکی ہے اور اسکا کچھ حصہ اگلی آیت وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ الآیۃ کے تحت میں بھی آجائے گا۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۭ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ

اور جان لو کہ تم میں رسُول ہے اللہ کا اگر وہ تمھاری بات مان لیا کرے بہت کاموں میں

لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ

تو تم پر مشکل پڑے پر اللہ نے محبت ڈالدی تمھارے دل میں ایمان کی اور کُھبا دیا اسکو تمھارے دلوں میں اور

كَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ ﴿٧﴾

نفرت ڈالدی تمہارے دل میں کفر اور گناہ اور نافرمانی کی وہ لوگ وہی ہیں نیک راہ پر

فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَنِعْمَةً ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٨﴾

اللہ کے فضل سے اور احسان سے اور اللہ سب کچھ جانتا ہے حکمتوں والا

خلاصۂ تفسیر

اور جان رکھو کہ تم میں رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم تشریف فرما) ہیں (جو خدا کی بڑی نعمت ہیں کما قال اللہ تعالیٰ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ الخ اس نعمت کا شکریہ ہے کہ کسی بات میں تم آپکے خلاف مت کرو گو دُنیوی ہی کیوں نہ ہو اور اس فکر میں مت پڑو کہ اُمورِ دنیویہ میں خود حضورؐ ہماری رائے کی موافقت فرمایا کریں کیونکہ) بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر وہ اُسمیں تمہارا کہنا مانا کریں تو تمکو بڑی مضرت پہنچے (کیونکہ وہ مصلحت کے خلاف ہو تو ضرور اسکے موافق عمل کرنے میں مضرت ہو بخلاف اسکے کہ آپ کی رائے پر عمل کیا جائے کیونکہ امرِ دُنیوی ہونے کے باوجود اسمیں خلاف مصلحت ہونیکا احتمال گو فی نفسہٖ مستبعد اور خلاف شان نبوت نہیں لیکن اوّل تو ایسے امور جن میں ایسا احتمال ہو شاذ و نادر ہوں گے پھر اگر ہوں بھی اور اُن میں مصلحت فوت ہو بھی جاوے تو یہ کتنی بڑی بات ہے کہ اس مصلحت کا نعم البدل یعنی اجر و ثواب اطاعت رسول کا ضرور ہی میسر ہوگا بخلاف اسکے تمہاری رائے پر عمل ہو کہ گو شاذ و نادر ایسے اُمور بھی نکلیں گے جن میں مصلحت تمہاری رائے کے موافق ہو لیکن متعین تو ہیں نہیں اور پھر بہت ہی کم ہونگے زیادہ احتمال مضرت ہی کا ہے پھر اس مضرت کا کوئی تدارک نہیں اور اس تقریر سے فائدہ کثیر کی قید کا بھی معلوم ہو گیا، بہرحال اگر آپؐ تم لوگوں کی موافقت کرتے تو تم بڑی مصیبت میں پڑتے) لیکن اللہ تعالےٰ نے (تم کو مصیبت سے بچا لیا اس طرح سے کہ) تم کو ایمان (کامل) کی محبت دی اور اس (کی تحصیل) کو تمہارے دلوں میں مرغوب کر دیا اور کفر و فسق (یعنی گناہِ کبیرہ) اور (مطلق) عصیان (یعنی گناہِ صغیرہ) سے تم کو نفرت دیدی (جس سے تم کو ہر وقت رضائے رسُول کی جستجو رہتی ہے اور جس سے تم اُن احکام کو مان لیتے ہو جو رضائے رسُول کے موجبات ہیں چنانچہ جب تم کو یہ معلوم ہو گیا کہ اُمورِ دنیویہ میں بھی اطاعت رسُول کی واجب ہے اور بدون اطاعت مطلقہ کے ایمان کامل نہیں ہوتا اور ایمان کامل کی تحصیل کی رغبت پہلے سے موجود ہے پس تم نے فوراً اُس حکم کو بھی قبول کر لیا اور قبول کر کے ایمان کی اور تکمیل کر لی) ایسے لوگ (جو کہ تکمیلِ ایمان کے محب ہیں) خدا تعالیٰ کے فضل اور انعام سے راہِ راست پر ہیں اور اللہ تعالےٰ (نے جو یہ احکام فرمائے ہیں تو وہ انکی مصلحتوں کو) جاننے والا (ہے اور چونکہ) حکمت والا ہے (اس لئے ان احکام کو واجب کر دیا ہے)

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیت میں واقعہ حضرت ولید بن عقبہ اور قبیلہ بنی المصطلق کا مذکور تھا جسمیں ولید بن عقبہ نے بنی المصطلق کے متعلق یہ خبر دی تھی کہ وہ مرتد ہو گئے اور زکوۃ دینے سے انکار کر دیا اسپر صحابۂ کرام میں بھی اشتعال پیدا ہوا، انکی رائے یہ تھی کہ ان لوگوں پر جہاد کے لئے مجاہدین کو بھیجدیا جائے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ولید بن عقبہ کی خبر کو قرائن قویہ کیخلاف سمجھ کر قبول نہ کیا اور تحقیقات کے لئے حضرت خالد بن ولید کو مامور فرما دیا۔ پچھلی آیت میں قرآن کریم نے اسکو قانون بنا دیا کہ جس شخص کی خبر میں قرائن قویہ سے کوئی شبہ ہو جاوے تو قبل از تحقیق اُس پر عمل جائز نہیں۔ اس آیت میں صحابۂ کرام کو ایک اور ہدایت کی گئی ہے کہ اگرچہ بنی المصطلق کے متعلق خبر ارتداد سُن کر تمہارا جوش غیرتِ دینی کے سبب تھا مگر تمہاری رائے صحیح نہ تھی۔ اللہ کے رسول نے جو صورت اختیار کی وہی بہتر تھی (مظہری) مقصد یہ ہے کہ مشورہ طلب امور میں کوئی رائے دیدینا تو درست ہے لیکن یہ کوشش کرنا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تمہاری رائے کیمطابق ہی عمل کریں یہ درست نہیں کیونکہ اُمورِ دُنیویہ میں اگرچہ شاذ و نادر رسُول کی رائے خلاف مصلحت ہونیکا امکان ضرور ہے جو شانِ نبوت کیخلاف نہیں لیکن حق تعالیٰ نے جو فراست اور دانش اپنے رسُول کو عنایت فرمائی ہے وہ تمھیں حاصل نہیں ہے اسلئے اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تمہاری رائے پر چلا کریں تو بہت سے معاملات میں نقصان و مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔ اور کہیں شاذ و نادر تمہاری رائے ہی میں مصلحت ہو اور تم اطاعتِ رسُول کیلئے اپنی رائے کو چھوڑ دو جس سے تمھیں کچھ دُنیوی نقصان بھی پہنچ جاوے تو اسمیں اتنی مضرت نہیں جتنی تمہاری رائے کے تابع ہو کر چلنے میں ہے کیونکہ اس صورت میں اگر کچھ دُنیوی نقصان ہو بھی گیا تو اطاعتِ رسُول کا اجر و ثواب اسکا بہتر بدل موجود ہے اور لفظ عَنِتُّمْ، عَنَت سے مشتق ہے جس کے معنی گناہ کے بھی آتے ہیں اور کسی مصیبت میں مبتلا ہونیکے بھی یہاں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں (قرطبی)

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ

اور اگر دو فریق　مسلمانوں کے آپس میں لڑ پڑیں　تو ان میں ملاپ کرا دو　پھر اگر چڑھا چلا جائے

اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ

ایک اُن میں سے　دوسرے پر　تو تم سب لڑو اُس چڑھائی والے سے یہانتک کہ پھر آئے اللہ کے حکم

اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ

پر　پھر اگر پھر آیا　تو ملاپ کرا دو　اُن میں　برابر　اور　انصاف کرو بیشک

اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ﴿۹﴾ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ فَاَصْلِحُوْا
اللہ کو خوش آتے ہیں انصاف والے مسلمان جو ہیں سو بھائی ہیں سو ملاپ کرادو

بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۰﴾ ع
اپنے دو بھائیوں میں اور ڈرتے رہو اللہ سے تاکہ تم پر رحم ہو

رکوع ۱۰ آیات ۱۳

خلاصۂ تفسیر

اور اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو اُن کے درمیان اصلاح کردو (یعنی جھگڑے کی بنیاد کو رفع کرکے لڑائی موقوف کرادو) پھر اگر (اصلاح کی کوشش کے بعد بھی) اُن میں کا ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے (اور لڑائی بند نہ کرے) تو اُس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو جاوے (حکم خدا سے مراد لڑائی بند کرنا ہے) پھر اگر وہ (زیادتی کرنے والا فرقہ حکم خدا کی طرف) رجوع ہو جاوے (یعنی لڑائی بند کردے) تو اُن دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ اصلاح کردو (یعنی حدود شرعیہ کے موافق اس معاملہ کو طے کردو محض لڑائی بند کرنے پر اکتفا نہ کرو اگر صلح مصالحت نہ ہوئی تو پھر بھی لڑائی کا احتمال رہے گا) اور انصاف کا خیال رکھو (یعنی کسی نفسانی غرض کو غالب نہ ہونے دو) بیشک اللہ تعالیٰ انصاف والوں کو پسند کرتا ہے (اور باہمی اصلاح کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ) مسلمان تو سب (دینی اشتراک جو روحانی اور معنوی رشتہ ہے اس رشتہ سے ایک دوسرے کے) بھائی ہیں اس لئے اپنے دو بھائیوں کے درمیان اصلاح کردیا کرو (تاکہ یہ اسلامی برادری قائم رہے) اور (اصلاح کے وقت) اللہ سے ڈرتے رہا کرو (یعنی حدود شرعیہ کی رعایت رکھا کرو) تاکہ تم پر رحمت کیجاوے۔

معارف و مسائل

ربط سابقہ آیات میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حقوق اور آداب اور ایسے اعمال سے پرہیز کا بیان تھا جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچے، آگے عام معاشرت کے آداب احکام ہیں جن میں اجتماعی اور انفرادی دونوں طرح کے آداب اور باہمی حقوق کا بیان ہے اور سب میں قدر مشترک ایذارسانی سے اجتناب ہے۔

سبب نزول ان آیات کے سبب نزول میں مفسرین نے متعدد واقعات بیان فرمائے ہیں جن میں خود مسلمانوں کے دو گروہوں میں باہم تصادم ہوا اور کوئی بعید نہیں کہ یہ سبھی واقعات کا مجموعہ سببِ نزول ہوا ہو یا نزول کسی ایک واقعہ میں ہوا، دوسرے واقعات کو اس کے مطابق پاکر انکو بھی سبب

نزول میں شریک کر دیا گیا۔ اس آیت کے اصل مخاطب وہ اولوالامر اور ملوک ہیں جن کو قتال و جہاد کے وسائل حاصل ہیں (کذا قال ابو حیان فی البحر و اختارہ فی روح المعانی) اور بالواسطہ تمام مسلمان اسکے مخاطب ہیں کہ وہ اس معاملے میں اولوالامر کی اعانت کریں۔ اور جہاں کوئی امام و امیر یا بادشاہ و رئیس نہیں وہاں حکم یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو دونوں کو فہمائش کر کے ترکِ قتال پر آمادہ کیا جائے، اور دونوں نہ مانیں تو دونوں لڑنے والے فرقوں سے الگ رہے نہ کسی کیخلاف کرے نہ موافقت، کذا فی بیان القرآن۔

مسائل متعلقہ | مسلمانوں کے دو گروہوں کی باہمی لڑائی کی چند صورتیں ہوتی ہیں، ایک یہ کہ دونوں جماعتیں امام المسلمین کے تحت ولایت ہیں یا دونوں نہیں، یا ایک ہے ایک نہیں۔ پہلی صورت میں عام مسلمانوں پر لازم ہے کہ فہمائش کر کے ان کو باہمی جنگ سے روکیں۔ اگر فہمائش سے باز نہ آئیں تو امام المسلمین پر اصلاح کرنا واجب ہے اگر حکومتِ اسلامیہ کی مداخلت سے دونوں فریق جنگ سے باز آگئے تو قصاص و دیت کے احکام جاری ہونگے۔ اور باز نہ آئیں تو دونوں فریق کے ساتھ باغیوں کا سا معاملہ کیا جائے اور ایک باز آگیا دوسرا ظلم و تعدی پر جما رہا تو دوسرا فریق باغی ہے اسکے ساتھ باغیوں کا معاملہ کیا جائے اور جس نے اطاعت قبول کرلی وہ فریق عادل کہلائے گا۔ اور باغیوں کے احکام کی تفصیل کتب فقہ میں دیکھی جاسکتی ہے اور مختصر جامع حکم یہ ہے کہ قبل قتال انکے ہتھیار چھین لئے جاویں گے اور اُن کو گرفتار کر کے توبہ کرنے کے وقت تک قید رکھیں گے اور عین قتال کی حالت میں اور قتال کے بعد اُن کی ذرّیت کو غلام یا لونڈی نہ بنا دینگے اور ان کا مال مالِ غنیمت نہیں ہوگا البتہ توبہ کرنے تک اموال کو محبوس رکھا جائیگا توبہ کے بعد واپس دیدیا جائے گا۔ آیاتِ مذکورہ میں جو یہ ارشاد ہوا ہے فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا، یعنی اگر بغاوت کرنے والا فرقہ بغاوت اور قتال سے باز آجائے تو صرف جنگ بند کر دینے پر اکتفا نہ کرو بلکہ اسبابِ جنگ اور باہمی شکایات کے ازالہ کی فکر کرو تاکہ دلوں سے بغض و عداوت نکل جاوے اور ہمیشہ کے لئے بھائی چارے کی فضا قائم ہو جائے۔ اور چونکہ یہ لوگ امام المسلمین کے خلاف بھی جنگ کر چکے ہیں اس لئے ہو سکتا تھا کہ ان کے بارے میں پورا انصاف نہ ہو اسلئے قرآن نے تاکید فرمائی کہ دونوں فریق کے حقوق میں عدل و انصاف کی پابندی کی جائے (یہ سب تفصیل بیان القرآن سے لی گئی ہے اور اسمیں ہدایہ کے حوالہ سے ہے)

مسئلہ۔ اگر مسلمانوں کی کوئی بڑی طاقتور جماعت امام المسلمین کی اطاعت سے نکل جائے تو امام المسلمین پر لازم ہے کہ اول اُن کی شکایات سُنے ان کو کوئی شبہ یا غلط فہمی پیش آئی ہو تو اسکو دُور کرے اور اگر وہ اپنی مخالفت کی ایسی وجوہ پیش کریں جن کی بناء پر کسی امام و امیر کی مخالفت

شرعاً جائز ہے یعنی جن سے خود امام المسلمین کا ظلم وجور ثابت ہو تو عام مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس جماعت کی مدد کریں تاکہ امام اپنے ظلم سے باز آجائے بشرطیکہ اسکے ظلم کا ثبوت یقینی بلا کسی اشتباہ کے ثابت ہو جائے (کذا قال ابن الہمام۔ مظہری) اور اگر کوئی ایسی واضح وجوہ اپنی بغاوت اور عدم اطاعت کی بیان نہ کرسکیں اور امام المسلمین کیخلاف جنگ کے لئے تیار ہو جائیں تو مسلمانوں کو اُن سے قتال کرنا حلال ہے اور امام شافعی رحمہ نے فرمایا کہ جب تک وہ خود قتال شروع نہ کردیں اسوقت تک مسلمانوں کو اُن سے قتال کی ابتدا کرنا جائز نہیں (مظہری) یہ حکم اسوقت ہے جبکہ اس جماعت کا باغی اور ظالم ہونا بالکل یقینی اور واضح ہو، اور اگر صورت ایسی ہے کہ دونوں فریق کوئی شرعی حجت رکھتے ہیں اور یہ متعین کرنا مشکل ہے کہ ان میں کون باغی ہے کون عادل وہاں جس شخص کو کسی ایک کے عادل ہونے کا ظن غالب ہو وہ اسکی مدد کرسکتا ہے اور جس کو کسی جانب رجحان نہ ہو وہ دونوں سے الگ رہے جیسا کہ مشاجراتِ صحابہ کرام کے وقت جنگ جمل اور صفین میں پیش آیا۔

مشاجرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین

امام ابوبکر بن العربی نے فرمایا کہ یہ آیت قتال بین المسلمین کی تمام صورتوں کو حاوی اور شامل ہے اسمیں وہ صورت بھی داخل ہے جسمیں دونوں فریق کسی حجتِ شرعی کے تحت جنگ کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں صحابہ کرام کے مشاجرات اسی قسم میں داخل ہیں۔ قرطبی نے ابن عربی کا یہ قول نقل کرکے اس جگہ مشاجرات صحابہ جنگ جمل اور صفین وغیرہ کی اصل حقیقت بیان کی ہے اور مشاجرات صحابہ کے بارے میں بعد کے آنیوالے مسلمانوں کے عمل کے متعلق ہدایات دی ہیں۔ احقر نے یہ سب مضامین احکام القرآن میں بزبان عربی اور بزبان اُردو اپنے رسالہ مقامِ صحابہ میں تفصیل کیساتھ لکھدیئے ہیں یہاں اسکا خلاصہ جو تفسیر قرطبی ص۳۲۲ ج۱۶ کے حوالہ سے اس رسالہ میں دیا گیا ہے نقل کرنے پر اکتفار کیا جاتا ہے۔

"یہ جائز نہیں ہے کہ کسی بھی صحابی کیطرف قطعی اور یقینی طور پر غلطی منسوب کی جائے اسلئے کہ ان سب حضرات نے اپنے اپنے طرزِ عمل میں اجتہاد سے کام لیا تھا، اور سب کا مقصد اللہ کی خوشنودی تھی، یہ سب حضرات ہمارے پیشوا ہیں اور ہمیں حکم ہے کہ ان کے باہمی اختلافات سے کفِ لسان کریں اور ہمیشہ ان کا ذکر بہترین طریقے پر کریں کیونکہ صحابیت بڑی حرمت کی چیز ہے اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو بُرا کہنے سے منع فرمایا ہے، اور یہ خبر دی کہ اللہ نے انھیں معاف کر رکھا ہے اور ان سے راضی ہے" اس کے علاوہ متعدد سندوں سے یہ حدیث ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت طلحہ رضہ کے بارے میں فرمایا،

ان طلحۃ شھید یمشی علی وجہ الارض، یعنی طلحہ روئے زمین پر چلنے والے شہید ہیں،

اب اگر حضرت علی رضؓ کے خلاف حضرت طلحہ رضؓ کا جنگ کے لئے نکلنا کھلا گناہ اور عصیان تھا تو اس جنگ میں مقتول ہو کر وہ ہرگز شہادت کا رُتبہ حاصل نہ کرتے، اسی طرح حضرت طلحہ رضؓ کا یہ عمل تاویل کی غلطی اور ادائے واجب میں کوتاہی قرار دیا جا سکتا تو بھی آپ کو شہادت کا مقام حاصل نہ ہوتا، کیونکہ شہادت تو صرف اسوقت حاصل ہوتی ہے جب کوئی شخص اطاعتِ ربّانی میں قتل ہوا ہو۔ لہٰذا ان حضرات کے معاملہ کو اسی عقیدہ پر محمول کرنا ضروری ہے جسکا اوپر ذکر کیا گیا

اس بات کی دوسری دلیل وہ صحیح اور معروف و مشہور احادیث ہیں جو خود حضرت علی رضؓ سے مروی ہیں اور جن میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "زبیر کا قاتل جہنم میں ہے"۔

نیز حضرت علی رضؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ "صفیہ رضؓ کے بیٹے کے قاتل کو جہنّم کی خبر دیدو"۔ جب یہ بات ہے تو ثابت ہو گیا کہ حضرت طلحہ رضؓ اور حضرت زبیر رضؓ اس لڑائی کی وجہ سے عاصی اور گنہگار نہیں ہوئے، اگر ایسا نہ ہوتا تو حضورؐ حضرت طلحہ رضؓ کو شہید نہ فرماتے اور حضرت زبیر کے قاتل کے بارے میں جہنّم کی پیشین گوئی نہ کرتے۔ نیز ان کا شمار عشرۂ مبشرہ میں ہے جن کے جنّتی ہونے کی شہادت تقریباً متواتر ہے۔

اسی طرح جو حضرات صحابہ رضؓ ان جنگوں میں کنارہ کش رہے، انھیں بھی تاویل میں خطاکار نہیں کہا جا سکتا، بلکہ ان کا طرزِ عمل بھی اس لحاظ سے درست تھا کہ اللہ نے ان کو اجتہاد میں اسی رائے پر قائم رکھا جب یہ بات ہے تو اس وجہ سے ان حضرات پر لعن طعن کرنا ان سے برارت کا اظہار کرنا اور انھیں فاسق قرار دینا، ان کے فضائل و مجاہدات اور ان عظیم دینی مقامات کو کالعدم کر دینا کسی طرح درست نہیں۔ بعض علماء سے پوچھا گیا کہ اس خون کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو صحابۂ کرام رضؓ کے باہمی مشاجرات میں بہایا گیا تو انھوں نے جواب میں یہ آیت پڑھ دی کہ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْــَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ، یہ ایک اُمّت تھی جو گزر گئی، اسکے اعمال اسکے لئے ہیں اور تمھارے اعمال تمھارے لئے ہیں، اور تم سے ان کے اعمال کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا۔

کسی اور بزرگ سے یہی سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا، "ایسے خون ہیں کہ اللہ نے میرے ہاتھوں کو ان میں (رنگنے سے) بچایا، اب میں اپنی زبان کو ان سے آلودہ نہیں کروں گا" مطلب یہی تھا کہ میں کسی ایک فریق کو کسی ایک معاملے میں یقینی طور پر خطاکار ٹھہرانے کی غلطی میں مبتلا نہیں ہونا چاہتا۔

علامہ ابن فورکؒ فرماتے ہیں :۔

"ہمارے بعض اصحاب نے کہا ہے کہ صحابۂ کرام رضؓ کے درمیان جو مشاجرات ہوئے انکی مثال

ایسی ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام اور اُن کے بھائیوں کے درمیان پیش آنیوالے واقعات کی، وہ حضرات آپس کے ان اختلافات کے باوجود ولایت اور نبوت کی حدود سے خارج نہیں ہوئے۔ بالکل یہی معاملہ صحابہؓ کے درمیان پیش آنیوالے واقعات کا بھی ہے۔"

اور حضرت محاسبیؒ فرماتے ہیں کہ،

"جہانتک اس خونریزی کا معاملہ ہے تو اسکے بارے میں ہمارا کچھ کہنا مشکل ہے، کیونکہ اس میں خود صحابہؓ کے درمیان اختلاف تھا" اور حضرت حسن بصریؒ سے صحابہؓ کے باہمی قتال کے بارے میں پُوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ،

"ایسی لڑائی تھی جس میں صحابہؓ موجود تھے اور ہم غائب، وہ پورے حالات کو جانتے تھے اور ہم نہیں جانتے جس معاملہ پر تمام صحابہ کا اتفاق ہے ہم اس میں ان کی پیروی کرتے ہیں، اور جس معاملہ میں اُن کے درمیان اختلاف ہے اسمیں سکوت اختیار کرتے ہیں۔"

حضرت محاسبی فرماتے ہیں کہ ہم بھی وہی بات کہتے ہیں جو حسن بصریؒ نے فرمائی، ہم جانتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے جن چیزوں میں دخل دیا ان سے وہ ہم سے کہیں بہتر طریقے پر واقف تھے۔ لہٰذا ہمارا کام یہی ہے کہ جس پر وہ سب حضرات متفق ہوں اس کی پیروی کریں، اور جسمیں اُنکا اختلاف ہو اس میں خاموشی اختیار کریں اور اپنی طرف سے کوئی نئی رائے پیدا نہ کریں، ہمیں یقین ہے کہ ان سب نے اجتہاد سے کام لیا تھا اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی چاہی تھی اس لئے کہ دین کے معاملہ میں وہ سب حضرات شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا

اے ایمان والو ٹھٹھا نہ کریں ایک لوگ دوسرے سے شاید وہ بہتر ہوں

مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّن نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۖ وَلَا تَلْمِزُوا

اُن سے اور نہ عورتیں دوسری عورتوں سے شاید وہ بہتر ہوں ان سے اور عیب نہ لگاؤ

أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ ۖ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ

ایک دوسرے کو اور نام نہ ڈالو چڑانے کو ایک دوسرے کے بُرا نام ہے گنہگاری پیچھے

الْإِيمَانِ ۚ وَمَن لَّمْ يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿١١﴾

ایمان کے اور جو کوئی توبہ نہ کرے تو وہی ہیں بے انصاف

خُلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو نہ تو مردوں کو مردوں پر ہنسنا چاہیئے کیا عجب ہے کہ (جن پر ہنستے ہیں) وہ

ان (ہنسنے والوں) سے (خدا کے نزدیک) بہتر ہوں (پھر وہ تحقیر کیسے کرتے ہیں) اور نہ عورتوں کو عورتوں پر ہنسنا چاہئے کیا عجب ہے کہ (جن پر ہنستی ہیں) وہ اُن (ہنسنے والیوں) سے (خدا کے نزدیک) بہتر ہوں (پھر وہ تحقیر کیسے کرتی ہیں) اور نہ ایک دوسرے کو طعنہ دو اور نہ ایک دوسرے کو بُرے لقب سے پکارو (کیونکہ یہ سب باتیں گناہ کی ہیں اور) ایمان لانے کے بعد (مسلمان پر) گناہ کا نام لگنا (ہی) بُرا ہے (یعنی یہ گناہ کر کے تمہاری شان میں یہ کہا جا سکتا کہ فلاں مسلمان جس سے تم مراد ہو گناہ یعنی خدا کی نافرمانی کرتا ہے نفرت کی بات ہے تو اس سے بچو) اور جو (ان حرکتوں سے) باز نہ آویں گے تو وہ ظلم کرنے والے (اور حقوق العباد کو تلف کرنے والے) ہیں (جو سزا ظالموں کو ملے گی وہی اُن کو ملے گی)

معارف و مسائل

سورۂ حجرات کے شروع میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے حقوق اور آداب کا بیان آیا پھر عام مسلمانوں کے باہمی حقوق و آدابِ معاشرت کا بیان شروع ہوا، سابقہ دو آیتوں میں آپکی اجتماعی و جماعتی اصلاح کے احکام بیان ہوئے، مذکور الصدر آیتوں میں اشخاص و افراد کے باہمی حقوق و آدابِ معاشرت کا ذکر ہے۔ ان میں تین چیزوں کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔ اوّل کسی مسلمان کے ساتھ تمسخر و استہزار کرنا، دوسرے کسی پر طعنہ زنی کرنا، تیسرے کسی کو ایسے لقب سے ذکر کرنا جس سے اسکی توہین ہوتی ہو یا وہ اُس سے بُرا مانتا ہو۔

پہلی چیز سخریہ یا تمسخر ہے۔ قرطبی نے فرمایا کہ کسی شخص کی تحقیر و توہین کے لئے اُس کے کسی عیب کو اس طرح ذکر کرنا جس سے لوگ ہنسنے لگیں اس کو سخریہ، تمسخر۔ استہزار کہا جاتا ہے اور یہ جیسے زبان سے ہوتا ہے ایسے ہی ہاتھ پاؤں وغیرہ سے اسکی نقل اُتارنے یا اشارہ کرنے سے بھی ہوتا ہے اور اس طرح بھی کہ اسکا کلام سُنکر بطور تحقیر کے ہنسی اُڑائی جائے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ سخریہ و تمسخر کسی شخص کے سامنے اسکا ایسی طرح ذکر کرنا ہے کہ اُس سے لوگ ہنس پڑیں اور یہ سب چیزیں بنصِ قرآن حرام ہیں۔

سخریہ کی ممانعت کا قرآنِ کریم نے اتنا اہتمام فرمایا کہ اسمیں مردوں کو الگ مخاطب فرمایا عورتوں کو الگ، مردوں کو لفظ قوم سے تعبیر فرمایا، کیونکہ اصل میں یہ لفظ مردوں ہی کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ اگرچہ مجازاً و توسعاً عورتوں کو اکثر شامل ہو جاتا ہے اور قرآنِ کریم نے عموماً لفظ قوم مردوں عورتوں دونوں ہی کے لئے استعمال کیا ہے مگر یہاں لفظ قوم خاص مردوں کیلئے استعمال

فرمایا اسکے بالمقابل عورتوں کا ذکر لفظ نساء سے فرمایا اور دونوں میں یہ ہدایت فرمائی کہ جو مرد کسی دوسرے مرد کیساتھ استہزاء و تمسخر کرتا ہے اسکو کیا خبر ہے کہ شاید وہ اللہ کے نزدیک استہزاء کرنیوالے سے بہتر ہو، اسی طرح جو عورت کسی دوسری عورت کیساتھ استہزاء و تمسخر کا معاملہ کرتی ہے اسکو کیا خبر ہے شاید وہی اللہ کے نزدیک اس سے بہتر ہو۔ قرآن میں مردوں کا مردوں کیساتھ اور عورتوں کا عورتوں کیساتھ استہزاء کرنے اور اسکی حرمت کا ذکر فرمایا حالانکہ کوئی مرد کسی عورت کیساتھ یا کوئی عورت کسی مرد کیساتھ استہزاء کرے تو وہ بھی اس حرمت میں داخل ہے مگر اسکا ذکر نہ کرنے سے اشارہ اسطرف ہے کہ عورتوں اور مردوں کا اختلاط ہی شرعاً ممنوع اور مذموم ہے جب اختلاط نہیں تو تمسخر کا تحقق ہی نہیں ہوگا۔ حاصل آیت کا یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے بدن یا صورت یا قد و قامت وغیرہ میں کوئی عیب نظر آوے تو کسی کو اسپر ہنسنے یا استہزاء کرنے کی جرأت نہ کرنا چاہیئے کیونکہ اسے معلوم نہیں کہ شاید وہ اپنے صدق و اخلاص وغیرہ کے سبب اللہ کے نزدیک اس سے بہتر اور افضل ہو۔ اس آیت کو سُن کر سلف صالحین کا حال یہ ہوگیا تھا کہ عمرو بن شرحبیل نے فرمایا کہ میں اگر کسی شخص کو بکری کے تھنوں سے منھ لگا کر دودھ پیتے دیکھوں اور اُسپر مجھے ہنسی آجائے تو میں ڈرتا ہوں کہ کہیں میں بھی ایسا ہی نہ ہو جاؤں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ میں اگر کسی کتے کے ساتھ بھی استہزاء کروں تو مجھے ڈر ہوتا ہے کہ میں خود کتا نہ بنا دیا جاؤں (قرطبی)

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ مسلمانوں کی صورتوں اور انکے مال و دولت پر نظر نہیں فرماتا بلکہ اُن کے قلوب اور اعمال کو دیکھتا ہے قرطبی نے فرمایا کہ اس حدیث سے ایک ضابطہ اور اصل یہ معلوم ہوئی کہ کسی شخص کے معاملہ میں اسکے ظاہری حال کو دیکھ کر کوئی قطعی حکم لگا دینا درست نہیں، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ جس شخص کے ظاہری اعمال و افعال کو ہم بہت اچھا سمجھ رہے ہیں اللہ تعالیٰ جو اسکے باطنی حالات اور قلبی کیفیات کو جانتا ہے وہ اسکے نزدیک مذموم ہو اور جس شخص کے ظاہری حال اور اعمال بُرے ہیں، ہو سکتا ہی کہ اسکے باطنی حالات اور قلبی کیفیات اسکے اعمالِ بد کا کفارہ بن جائیں اسلئے جس شخص کو بُری حالت یا بُرے اعمال میں مبتلا دیکھو تو اُس کی اس حالت کو تو بُرا سمجھو مگر اس شخص کو حقیر و ذلیل سمجھنے کی اجازت نہیں۔ دوسری چیز جس کی ممانعت اس آیت میں کی گئی ہے وہ لَمز ہے۔ لمز کے معنی کسی میں عیب نکالنے اور عیب ظاہر کرنے یا عیب پر طعنہ زنی کرنے کے ہیں آیت میں ارشاد فرمایا لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ، یعنی تم اپنے عیب نہ نکالو۔ یہ ارشاد ایسا ہی ہے جیسے قرآن کریم میں ہے، لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ، جس کے معنی یہ ہیں کہ تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو، دونوں جگہ اپنے آپ کو قتل کرنے یا اپنے عیب نکالنے سے مراد یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کرو، ایک دوسرے کو طعنہ نہ دو۔ اور اس عنوان سے تعبیر کرنے میں حکمت یہ بتلانا ہی کہ کسی دوسرے کو قتل کرنا

ایک حیثیت سے اپنے آپ ہی کو قتل کرنا ہے کیونکہ اکثر تو ایسا واقع ہو ہی جاتا ہے کہ ایک نے دوسرے کو قتل کیا دوسرے کے حمایتی لوگوں نے اس کو قتل کر دیا، اور اگر یہ بھی نہ ہو تو اصل بات یہ ہے کہ مسلمان سب بھائی بھائی ہیں اپنے بھائی کو قتل کرنا گویا خود اپنے آپ کو قتل کرنا اور بے دست و پا بنانا ہے یہی معنی یہاں لَا تَلْمِزُوٓا اَنْفُسَكُمْ میں ہیں کہ تم جو دوسروں کے عیب نکالو اور طعنہ دو تو یاد رکھو کہ عیب سے تو کوئی انسان عادۃً خالی نہیں ہوتا، تم اسکے عیب نکالو گے تو وہ تمہارے عیب نکالے گا جیسا کہ بعض علماء نے فرمایا کہ وفیک عیوب وللناس اعین، یعنی تم میں بھی کچھ عیوب ہیں اور لوگوں کی آنکھیں ہیں جو اُن کو دیکھتی ہیں تم کسی کے عیب نکالو گے اور طعنہ زنی کرو گے تو وہ تم پر یہی عمل کرینگے اور بالفرض اگر اسنے صبر بھی کیا تو بات وہی ہے کہ اپنے ایک بھائی کی بدنامی اور تذلیل پر غور کریں تو اپنی ہی تذلیل و تحقیر ہے۔

علماء نے فرمایا ہے کہ انسان کی سعادت اور خوش نصیبی اسمیں ہے کہ اپنے عیوب پر نظر رکھے اُن کی اصلاح کی فکر میں لگا رہے اور جو ایسا کریگا اس کو دوسروں کے عیب نکالنے اور بیان کرنیکی فرصت ہی نہ ملیگی۔ ہندوستان کے آخری مسلمان بادشاہ ظفر نے خوب فرمایا ہے ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر، رہے دیکھتے لوگوں کے عیب و ہنر ۞ پڑی اپنی بُرائیوں پر جو نظر، تو جہان میں کوئی بُرا نہ رہا

تیسری چیز جس سے آیت میں ممانعت کی گئی ہے وہ کسی دوسرے کو بُرے لقب سے پکارنا ہے، جس سے وہ ناراض ہوتا ہو۔ جیسے کسی کو لنگڑا لولا یا اندھا کانا کہہ کر پکارنا یا اس لفظ سے اسکا ذکر کرنا اسی طرح جو نام کسی شخص کی تحقیر کے لئے استعمال کیا جاتا ہو اُس نام سے اُس کو پکارنا۔ حضرت ابو جبیرہ انصاری رضؓ نے فرمایا کہ یہ آیت ہمارے بارے میں نازل ہوئی ہے کیونکہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو ہم میں اکثر آدمی ایسے تھے جن کے دو یا تین نام مشہور تھے اور ان میں سے بعض نام ایسے تھے جو لوگوں نے اس کو عار دلانے اور تحقیر و توہین کے لئے مشہور کر دیئے تھے۔ آپؐ کو یہ معلوم نہ تھا بعض اوقات وہی بُرا نام لیکر آپؐ اس کو خطاب کرتے تو صحابہ عرض کرتے کہ یا رسول اللہ وہ اس نام سے ناراض ہوتا ہے اُس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ آیت میں تنابز بالالقاب سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص نے کوئی گناہ یا بُرا عمل کیا ہو اور پھر اُس سے تائب ہو گیا ہو اسکے بعد اس کو اُس بُرے عمل کے نام سے پکارنا، مثلاً چور یا زانی یا شرابی وغیرہ۔ جس نے چوری زنا، شراب سے توبہ کر لی ہو اس کو اس پچھلے عمل سے عار دلانا اور تحقیر کرنا حرام ہے۔ حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی مسلمان کو ایسے گناہ پر عار دلائے جس سے اُس نے توبہ کر لی ہے تو اللہ نے اپنے ذمہ لے لیا ہے کہ اسکو اسی گناہ میں مبتلا کر کے دُنیا و آخرت میں رُسوا کرے گا (قرطبی)

بعض القاب کا استثناء بعض لوگوں کے ایسے نام مشہور ہو جاتے ہیں جو فی نفسہ بُرے ہیں مگر وہ بغیر اُس لفظ کے پہچانا ہی نہیں جاتا تو اس کو اس نام سے ذکر کرنے کی اجازت پر علماء کا اتفاق ہے بشرطیکہ ذکر کرنے والے کا قصد اس سے تحقیر و تذلیل کا نہ ہو جیسے بعض محدثین کے نام کے ساتھ اعرج یا احدب مشہور ہے اور خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو جس کے ہاتھ نسبتاً زیادہ طویل تھے ذوالیدین کے نام سے تعبیر فرمایا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے دریافت کیا گیا کہ اسانید حدیث میں بعض ناموں کیساتھ کچھ ایسے القاب آتے ہیں مثلاً حمید الطویل۔ سلیمان الاعمش۔ مروان الاصفر وغیرہ، تو کیا ان القاب کے ساتھ ذکر کرنا جائز ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جب تمھارا قصد اس کا عیب بیان کرنے کا نہ ہو بلکہ اس کی پہچان پوری کرنے کا ہو تو جائز ہے (قرطبی)

سُنت یہ ہے کہ لوگوں کو اچھے القاب سے یاد کیا جائے حدیث میں ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کا حق دوسرے مومن پر یہ ہے کہ اسکا ایسے نام و لقب سے ذکر کرے جو اُس کو زیادہ پسند ہو اسی لئے عرب میں کنیت کا رواج عام تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو پسند فرمایا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص خاص صحابہ کو کچھ لقب دیئے ہیں۔ صدیق اکبر کو عتیق اور حضرت عمرؓ کو فاروق اور حضرت حمزہ کو اسد اللہ[1] اور خالد بن ولید کو سیف اللہ فرمایا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ

اے ایمان والو بچتے رہو بہت تہمتیں کرنے سے مقرر بعضی تہمت

الظَّنِّ إِثْمٌ ۖ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا ۚ أَيُحِبُّ

گناہ ہے اور بھید نہ ٹٹولو کسی کا اور بُرا نہ کہو پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو بھلا خوش لگتا ہے

أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ ۚ وَاتَّقُوا

تم میں کسی کو کہ کھائے گوشت اپنے بھائی کا جو مُردہ ہو سو گھن آتا ہے تم کو اس سے اور ڈرتے

اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ﴿١٢﴾

رہو اللہ سے، بیشک اللہ معاف کرنیوالا ہے مہربان

خُلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو بہت سے گمانوں سے بچا کرو، کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں (اس لئے ظن و گمان کی جتنی قسمیں ہیں اُن سب کے احکام کی تحقیق کر لو کہ کونسا گمان جائز ہے کونسا ناجائز، پھر جائز کی حد تک رہو) اور (کسی کے عیب کا) سُراغ نہ لگایا کرو اور کوئی کسی

[1] دیکھئے مجمع الزوائد ص ۲۹۶ ج ۲۔ محمود اشرف عثمانی۔

کی غیبت بھی نہ کیا کرے (آگے غیبت کی مذمت ہے کہ) کیا تم میں کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھالے اس کو تو تم (ضرور) بُرا سمجھتے ہو (تو سمجھ لو کہ کسی بھائی کی غیبت بھی اسی کے مشابہ ہے) اور اللہ سے ڈرتے رہو (غیبت چھوڑ دو توبہ کرلو) بیشک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

معارف و مسائل

یہ آیت بھی باہمی حقوق اور آداب معاشرت کے متعلق احکام پر مشتمل ہے اسمیں بھی تین چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ اوّل ظن جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ دوسرے تجسّس یعنی کسی پوشیدہ عیب کا سُراغ لگانا۔ تیسرے غیبت یعنی کسی غیر حاضر آدمی کے متعلق کوئی ایسی بات کہنا جس کو اگر وہ سُنتا تو اس کو ناگوار ہوتی۔ پہلی چیز یعنی ظن کے معنی گمان غالب کے ہیں، اسکے متعلق قرآن کریم نے اوّل تو یہ ارشاد فرمایا کہ "بہت سے گمانوں سے بچا کرو" پھر اُس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ "بعض گمان گناہ ہوتے ہیں"، جس سے معلوم ہوا کہ ہر گمان گناہ نہیں تو یہ ارشاد سننے والوں پر اس کی تحقیق واجب ہوگئی کہ کونسے گمان گناہ ہیں تاکہ اُن سے بچیں اور جب تک کسی گمان کا جائز ہونا معلوم نہ ہو جاوے اسکے پاس نہ جائیں۔ علماء و فقہاء نے اسکی تفصیلات بیان فرمائی ہیں۔ قرطبی نے فرمایا کہ ظن سے مراد اس جگہ تہمت ہے یعنی کسی شخص پر بغیر کسی قوی دلیل کے کوئی الزام عیب یا گناہ کا لگانا۔ امام ابوبکر جصاص نے احکام القرآن میں ایک جامع تفصیل اس طرح لکھی ہے کہ ظن کی چار قسمیں ہیں ایک حرام ہے دوسری مامور بہ اور واجب ہے تیسری مستحب اور مندوب ہے، چوتھی مباح اور جائز ہے۔ ظنِ حرام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدگمانی رکھے کہ وہ مجھے عذاب ہی دیگا یا مصیبت ہی میں رکھے گا اس طرح کہ اللہ کی مغفرت اور رحمت سے گویا مایوس ہی۔ حضرت جابر رضؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

لا یموتنّ احدکم الّا وھو یحسن الظنّ باللہ	تم میں سے کسی کو اسکے بغیر موت نہ آنی چاہئیے کہ اسکا اللہ کے ساتھ اچھا گمان ہو

اور ایک حدیث میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد آیا ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ انا عند ظنّ عبدی بی، یعنی اپنے بندے کیساتھ ویسا ہی برتاؤ کرتا ہوں جیسا وہ میرے ساتھ گمان رکھتا ہے اب اس کو اختیار ہے کہ میرے ساتھ جو چاہے گمان رکھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کیساتھ حُسنِ ظن فرض ہے اور بدگمانی حرام ہے۔ اسی طرح ایسے مسلمان جو ظاہری حالت میں نیک دیکھے جاتے ہیں اُن کے متعلق بلا کسی قوی دلیل کے بدگمانی کرنا حرام ہے۔ حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایّاکم والظّن فانّ الظّن اکذب الحدیث، یعنی گمان سے بچو کیونکہ گمان جھوٹی بات ہے۔ یہاں ظن سے مُراد باتفاق کسی مسلمان کے ساتھ بلاکسی قوی دلیل کے بدگمانی کرنا ہے اور جو کام ایسے ہیں کہ اُن میں کسی جانب پر عمل کرنا شرعاً ضروری ہے اور اسکے متعلق قرآن وسُنت میں کوئی دلیل واضح موجود نہیں، وہاں پر ظن غالب پر عمل کرنا واجب ہے۔ جیسے باہمی منازعات و مقدمات کے فیصلہ میں ثقہ گواہوں کی گواہی کے مطابق فیصلہ دینا کیونکہ حاکم اور قاضی جسکی عدالت میں مقدمہ دائر ہے اُس پر اسکا فیصلہ دینا واجب ضروری ہے اور اس خاص معاملے کے لئے کوئی نص قرآن وحدیث میں موجود نہیں تو ثقہ آدمیوں کی گواہی پر عمل کرنا اسکے لئے واجب ہے اگرچہ یہ امکان واحتمال وہاں بھی ہے کہ شاید کسی ثقہ آدمی نے اسوقت جھوٹ بولا ہو اس لئے اسکا سچّا ہونا صرف ظن غالب ہے اور اسی پر عمل واجب ہے۔ اسی طرح جہاں سمت قبلہ معلوم نہ ہو اور کوئی ایسا آدمی بھی نہ ہو جس سے معلوم کی جاسکے وہاں اپنے ظن غالب پر عمل ضروری ہے اسی طرح کسی شخص پر کسی چیز کا ضمان دینا واجب ہوا تو اس ضائع شدہ چیز کی قیمت میں ظن غالب ہی پر عمل کرنا واجب ہے، اور ظن مباح ایسا ہے جیسے نماز کی رکعتوں میں شک ہو جاوے کہ تین پڑھی ہیں یا چار تو اپنے ظن غالب پر عمل کرنا جائز ہے۔ اور اگر وہ ظن غالب کو چھوڑ کر امر یقینی پر عمل کرے یعنی تین رکعت قرار دیکر چوتھی پڑھ لے تو یہ بھی جائز ہے اور ظن مستحب و مندوب یہ ہے کہ ہر مسلمان کیساتھ نیک گمان رکھے کہ اس پر ثواب ملتا ہے (جصاص ملخصاً)

قرطبی نے فرمایا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْہُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِہِمْ خَیْرًا، اسمیں حُسنِ ظن بالمؤمنین کی تاکید آئی ہے، اور یہ جو مشہور ہے کہ انّ من الحزم سوء الظّن یعنی احتیاط کی بات یہ ہے کہ ہر شخص سے بدگمانی رکھے اسکا مطلب یہ ہے کہ معاملہ ایسا کرے جیسے بدگمانی کی صورت میں کیا جاتا ہے کہ بدون قوی اعتماد کے اپنی چیز کسی کے حوالہ نہ کرے نہ یہ کہ اس کو چور سمجھے اور اس کی تحقیر کرے۔ خلاصہ یہ ہے کہ کسی شخص کو چور یا غدار سمجھے بغیر اپنے معاملے میں احتیاط برتے۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کے اس قول کا بھی یہی مطلب ہے ؎

نگہ دار و آں شوخ در کیسہ دُر ٭ کہ داند ہمہ خلق را کیسہ بُر

دوسری چیز جس سے اس آیت میں منع کیا گیا ہے تجسّس یعنی کسی کے عیب کی تلاش اور سُراغ لگانا ہے۔ اس میں قراتیں دو ہیں ایک لَا تَجَسَّسُوْا بالجیم دوسرے لَا تَحَسَّسُوْا بالحاء اور حدیث صحیحین میں جو حضرت ابوہریرہ رضؓ سے منقول ہے یہ دونوں لفظ آئے ہیں ارشاد ہے لا تجسّسوا ولا تحسّسوا اور ان دونوں لفظوں کے معنی متقارب ہیں۔ اخفش نے دونوں میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ تجسّس بالجیم کسی ایسے امر کی جستجو اور تلاش کو کہا جاتا ہے جس کو لوگوں نے آپ سے چھپایا ہو اور

تجسُّس بالحاء مطلق تلاش اور جستجو کے معنی میں آتا ہے۔ سورۂ یوسف میں تَحَسَّسُوْا مِنْ یُّوْسُفَ وَ اَخِیْہِ اسی معنی کے لئے آیا ہے، اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ جو چیز تمھارے سامنے آجائے اسکو پکڑ سکتے ہو اور کسی مسلمان کا جو عیب ظاہر نہ ہو اُس کی جستجو اور تلاش کرنا جائز نہیں۔ ایک حدیث میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

لا تغتابوا المسلمین ولا تتبّعوا عوراتھم فان من اتبّع عوراتھم یتبع اللہ عورتہ ومن یتّبع اللہ عورتہ یفضحہ فی بیتہ (قرطبی)

مسلمانوں کی غیبت نہ کرو اور اُن کے عیوب کی جستجو نہ کرو کیونکہ جو شخص مسلمانوں کے عیوب کی تلاش کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کے عیب کی تلاش کرتا ہے اور جس کے عیب کی تلاش اللہ تعالیٰ کرے اُس کو اس کے گھر کے اندر بھی رُسوا کر دیتا ہے

بیان القرآن میں ہے کہ چھپ کر کسی کی باتیں سُننا یا اپنے کو سوتا ہوا بنا کر باتیں سُننا بھی تجسُّس میں داخل ہے البتہ اگر کسی سے مضرت پہنچنے کا احتمال ہو اور اپنی یا دوسرے کسی مسلمان کی حفاظت کی غرض سے مضرت پہنچانے والے کی خفیہ تدبیروں اور ارادوں کا تجسّس کرے تو جائز ہے۔ تیسری چیز جس سے اس آیت میں منع فرمایا گیا ہے وہ کسی کی غیبت کرنا ہے یعنی اس کی غیر موجودگی میں اسکے متعلق کوئی ایسی بات کہنا جس کو وہ سُنتا تو اس کو ایذا ہوتی اگرچہ وہ سچّی بات ہی ہو کیونکہ جو غلط الزام لگائے وہ تہمت ہے جس کی حرمت الگ قرآن کریم سے ثابت ہے اور غیبت کی تعریف میں اس شخص کی غیر موجودگی کی قید سے یہ نہ سمجھا جائے کہ موجودگی کی حالت میں ایسی رنج دِہ بات کہنا جائز ہے۔ کیونکہ وہ غیبت تو نہیں مگر لمز میں داخل ہے جس کی حُرمت اس سے پہلی آیت میں آچکی ہے۔

اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْہِ مَیْتًا، اس آیت نے کسی مُسلمان کی آبروریزی اور توہین وتحقیر کو اسکا گوشت کھانے کی مثل ومشابہ قرار دیا ہے اگر اس کے وہ شخص سامنے ہو تو ایسا ہے جیسے کسی زندہ انسان کا گوشت نوچ کر کھایا جائے، اس کو قرآن میں بلفظ لمز تعبیر کرکے حرام قرار دیا ہے جیساکہ ابھی گزرا لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَکُمْ اور آگے آئیگا وَیْلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَۃٍ لُّمَزَۃٍ اور وہ آدمی غائب ہو اسکے پیچھے اسکے متعلق ایسی بات کہنا جس سے اُس کی آبرو میں خلل آئے اور اُس کی تحقیر ہو یہ ایسا ہے جیسے کسی مُردہ انسان کا گوشت کھایا جائے کہ جیسے مُردہ کا گوشت کھانے سے مُردے کو کوئی جسمانی اذیت نہیں ہوتی ایسے ہی اس غائب کو جب تک غیبت کی خبر نہیں ہوتی اس کو بھی کوئی اذیت نہیں ہوتی، مگر جیسا کسی مُردہ مُسلمان کا گوشت کھانا حرام اور بڑی خسّت ودنارت کا کام ہے اسی طرح غیبت حرام بھی ہے اور خسّت ودنارت بھی کہ پیٹھ پیچھے کسی کو بُرا کہنا کوئی بہادری کا کام نہیں۔

اس آیت میں ظن اور تجسّس اور غیبت تین چیزوں کی حرمت کا بیان ہے مگر غیبت کی حُرمت کا زیادہ اہتمام فرمایا کہ اس کو کسی مُردہ مسلمان کا گوشت کھانے سے تشبیہ دیکر اُس کی حُرمت اور خسّت و دنائت کو واضح فرمایا، حکمت اس کی یہ ہے کہ کسی کے سامنے اُس کے عیوب ظاہر کرنا بھی اگرچہ ایذار رسانی کی بنار پر حرام ہے مگر اس کی مدافعت وہ آدمی خود بھی کرسکتا ہے اور مدافعت کے خطرہ سے ہر ایک کی ہمت بھی نہیں ہوتی اور وہ عادۃً زیادہ دیر رہ بھی نہیں سکتا بخلاف غیبت کے کہ وہاں کوئی مدافعت کرنے والا نہیں ہر کمتر سے کمتر آدمی بڑے سے بڑے کی غیبت کرسکتا ہے اور چونکہ کوئی مدافعت نہیں ہوتی اس لئے اسکا سلسلہ بھی عموماً طویل ہوتا ہے اور اس میں ابتلار بھی زیادہ ہے اس لئے غیبت کی حرمت زیادہ مؤکد کی گئی۔ اور عام مسلمانوں پر لازم کیا گیا کہ جو سُنے وہ اپنے غائب بھائی کیطرف سے بشرطِ قدرت مدافعت کرے اور مدافعت پر قدرت نہ ہو تو کم از کم اسکے سُننے سے پرہیز کرے کیونکہ غیبت کا بقصد و اختیار سُننا بھی ایسا ہی ہے جیسے خود غیبت کرنا۔

غیبت کے متعلق مسائل حضرت میمون رحؒ نے فرمایا کہ ایک روز خواب میں مَیں نے دیکھا کہ ایک زنگی کا مُردہ جسم ہے اور کوئی کہنے والا ان کو مخاطب کرکے یہ کہہ رہا ہے کہ اس کو کھاؤ۔ میں نے کہا کہ اے خدا کے بندے میں اس کو کیوں کھاؤں تو اُس شخص نے کہا اسلئے کہ تو نے فلاں شخص کے زنگی غلام کی غیبت کی ہے۔ میں نے کہا کہ خدا کی قسم میں نے تو اسکے متعلق کوئی اچھی بُری بات کی ہی نہیں تو اُس شخص نے کہا کہ ہاں، لیکن تو نے اس کی غیبت سُنی تو ہے اور تو اس پر راضی رہا۔ حضرت میمونؒ کا حال اس خواب کے بعد یہ ہوگیا کہ نہ خود کبھی کسی کی غیبت کرتے اور نہ کسی کو اپنی مجلس میں کسی کی غیبت کرنے دیتے تھے۔

حدیث میں حضرت انس بن مالک کی روایت ہے کہ شبِ معراج کی حدیث میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے لیجایا گیا تو میرا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ اپنے چہروں اور بدن کا گوشت نوچ رہے ہیں، میں نے جبرئیل امین سے پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے بھائی کی غیبت کرتے اور اُن کی آبرو ریزی کرتے تھے (رواہ البغوی۔ مظہری) اور حضرت ابوسعید اور جابر رضؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، الغیبۃ اشدّ من الزّنا، یعنی غیبت زنا سے بھی زیادہ سخت گناہ ہے صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یہ کیسے، تو آپ نے فرمایا کہ ایک شخص زنا کرتا ہے پھر توبہ کرلیتا ہے تو اسکا گناہ معاف ہوجاتا ہے اور غیبت کرنے والے کا گناہ اسوقت تک معاف نہیں ہوتا جب تک وہ شخص معاف نہ کرے جس کی غیبت کی گئی ہے (رواہ الترمذی و ابوداؤد۔ از مظہری)

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غیبت ایک ایسا گناہ ہے جس میں حق اللہ کی بھی مخالفت ہے

اور حق العبد بھی ضائع ہوتا ہے اسلئے جس کی غیبت کی گئی ہے اُس سے معاف کرانا ضروری ہے اور بعض علماء نے فرمایا کہ غیبت کی خبر جب تک صاحبِ غیبت کو نہ پہنچے اسوقت تک وہ حق العبد نہیں ہوتی اسلئے اُس سے معافی کی ضرورت نہیں (نقلہ فی الروح عن الحسن والخیاطی وابن الصباغ والنووی وابن الصلاح والزرکشی وابن عبدالبر عن ابن المبارک) مگر بیان القرآن میں اسکو نقل کر کے فرمایا ہے کہ اس صورت میں گو اس شخص سے معافی مانگنا ضروری نہیں مگر جس شخص کے سامنے یہ غیبت کی تھی اسکے سامنے اپنی تکذیب کرنا یا اپنے گناہوں کا اقرار کرنا ضروری ہے اور اگر وہ شخص مرگیا ہے یا اسکا پتہ نہیں تو اسکا کفارہ حضرت انسؓ کی حدیث میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان من کفارۃ الغیبۃ ان یستغفر لمن اغتابہ تقول اللّٰھم اغفرلنا ولہ (رواہ البیہقی۔ مظہری) یعنی کفّارہ غیبت کا یہ ہے کہ جس کی غیبت کی گئی ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعائے مغفرت کرے اور یوں کہے کہ یا اللہ ہمارے اور اس کے گناہوں کو معاف فرما۔

مسئلہ۔ بچے اور مجنون اور کافر ذمی کی غیبت بھی حرام ہے کیونکہ انکی ایذا بھی حرام ہے اور جو کافر حربی ہیں اگرچہ انکی ایذا حرام نہیں مگر اپنا وقت ضائع کرنے کیوجہ سے پھر بھی غیبت مکروہ ہے۔

مسئلہ۔ غیبت جیسے قول اور کلام سے ہوتی ہے ایسے ہی فعل یا اشارہ سے بھی ہوتی ہے جیسے کسی لنگڑے کی چال بنا کر چلنا جس سے اُس کی تحقیر ہو۔

مسئلہ۔ بعض روایات سے ثابت ہے کہ آیت میں جو غیبت کی عام حرمت کا حکم ہے یہ مخصوص البعض ہے، یعنی بعض صورتوں میں اس کی اجازت ہوئی ہے مثلاً کسی شخص کی بُرائی کسی ضرورت یا مصلحت سے کرنا پڑے تو وہ غیبت میں داخل نہیں بشرطیکہ وہ ضرورت و مصلحت شرعاً معتبر ہو جیسے کسی ظالم کی شکایت کسی ایسے شخص کے سامنے کرنا جو ظلم کو دفع کرسکے، یا کسی کی اولاد و بیوی کی شکایت اُس کے باپ اور شوہر سے کرنا جو اُن کی اصلاح کرسکے، یا کسی واقعہ کے متعلق فتویٰ حاصل کرنے کے لئے صورتِ واقعہ کا اظہار یا مسلمانوں کو کسی شخص کے دینی یا دُنیوی شر سے بچانے کے لئے کسی کا حال بتلانا، یا کسی معاملے کے متعلق مشورہ لینے کے لئے اسکا حال ذکر کرنا، یا جو شخص سب کے سامنے کھلّم کھلّا گناہ کرتا ہے اور اپنے فسق کو خود ظاہر کرتا پھرتا ہے اس کے اعمالِ بد کا ذکر بھی غیبت میں داخل نہیں مگر بلا ضرورت اپنے اوقات ضائع کرنے کی بناء پر مکروہ ہے (یہ سب مسائل بیان القرآن میں بحوالہ رُوح المعانی بیان کئے گئے ہیں) اور ان سب میں قدر مشترک یہ ہے کہ کسی کی بُرائی اور عیب ذکر کرنے سے مقصود اسکی تحقیر نہو بلکہ کسی ضرورت و مجبوری سے ذکر کیا گیا ہو۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ

اے آدمیو! ہم نے تم کو بنایا ایک مرد اور ایک عورت سے اور رکھیں تمھاری ذاتیں اور قبیلے

لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۳﴾

تاکہ آپس کی پہچان ہو، تحقیق عزت اللہ کے یہاں اُسی کو بڑی جس کو ادب بڑا، اللہ سب کچھ جانتا ہے خبردار

خلاصۂ تفسیر

اے لوگو ہمنے تم (سب) کو ایک مرد اور ایک عورت (یعنی آدم و حوّا) سے پیدا کیا ہے (اسلئے اس میں تو سب انسان برابر ہیں) اور (پھر جس بات میں فرق رکھا ہے کہ) تم کو مختلف قومیں اور (پھر ان قوموں میں) مختلف خاندان بنایا (یہ محض اسلئے) تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرسکو (جسمیں بہت سی مصلحتیں ہیں نہ اسلئے کہ ایک دوسرے پر تفاخر کرو کیونکہ) اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو (اور پرہیزگاری ایسی چیز ہے جسکا پورا حال کسی کو معلوم نہیں بلکہ اسکے حال کو محض) اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا اور پورا خبردار ہے (اسلئے کسی نسب اور قومیت پر فخر نہ کرو)

معارف و مسائل

اُوپر کی آیات میں انسانی اور اسلامی حقوق اور آداب معاشرت کی تعلیم کے سلسلے میں چھ چیزوں کو حرام و ممنوع کیا گیا ہے جو باہمی منافرت اور عداوت کا سبب ہوتی ہیں۔ اس آیت میں ایک جامع تعلیم انسانی مساوات کی ہے کہ کوئی انسان دوسرے کو کمتر یا رذیل نہ سمجھے اور اپنے نسب اور خاندان یا مال و دولت وغیرہ کی بنار پر فخر نہ کرے کیونکہ یہ چیزیں درحقیقت تفاخر کی ہیں نہیں، پھر اس تفاخر سے باہمی منافرت اور عداوت کی بنیادیں پڑتی ہیں اس لئے فرمایا کہ تمام انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہونے کی حیثیت سے بھائی بھائی ہیں۔ اور خاندان اور قبائل یا مال و دولت کے اعتبار سے جو فرق اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے وہ تفاخر کے لئے نہیں بلکہ تعارف کے لئے ہے۔

شانِ نزول | یہ آیت فتح مکہ کے موقع پر اسوقت نازل ہوئی جبکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کو اذان کا حکم دیا تو قریشِ مکہ جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اُن میں سے ایک نے کہا کہ اللہ کا شکر ہے کہ میرے والد پہلے ہی وفات پا گئے اُن کو یہ روزِ بد دیکھنا نہیں پڑا، اور حارث بن ہشام نے کہا کہ کیا محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو اس کالے کوّے کے سوا کوئی آدمی نہیں جُڑا کہ جو مسجد حرام میں اذان دے۔ ابوسفیان بولے کہ میں کچھ نہیں کہتا کیونکہ مجھے خطرہ ہے کہ میں کچھ کہوں گا تو آسمانوں کا مالک ان کو خبر کر دیگا، چنانچہ جبرئیل امین تشریف لائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس تمام گفتگو کی اطلاع دی۔ آپ نے ان لوگوں کو بُلا کر پوچھا کہ تم نے کیا کہا تھا انھوں نے اقرار کرلیا اُسی پر یہ آیت نازل ہوئی جسنے بتلایا کہ فخر و عزت کی چیز درحقیقت ایمان اور تقوی ہے جس سے

تم لوگ خالی اور حضرت بلال آراستہ ہیں اسلئے وہ تم سب سے افضل و اشرف ہیں (مظہری عن البغوی)
حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ فتح مکہ کے روز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر طواف فرمایا (تاکہ سب لوگ دیکھ سکیں) طواف سے فارغ ہو کر آپ نے یہ خطبہ دیا۔

الحمد للہ الذی اذھب عنکم عبیۃ الجاھلیۃ و تکبرھا۔ الناس رجلان بر تقی کریم علی اللہ و فاجر شقی ھین علی اللہ ثم تلا یایھا الناس انا خلقنکم الآیۃ (ترمذی و بغوی)

شکر ہے اللہ کا جسنے فخر جاہلیت کو اور اسکے تکبر کو تم سے دُور کر دیا، اب تمام انسانوں کی صرف دو قسمیں ہیں ایک نیک اور متقی وہ اللہ کے نزدیک شریف اور محترم ہے۔ دوسرا فاجر شقی وہ اللہ کے نزدیک ذلیل و حقیر ہے اس کے بعد اس آیت کی تلاوت فرمائی جو اوپر مذکور ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ دُنیا کے لوگوں کے نزدیک عزت مال و دولت کا نام ہے اور اللہ کے نزدیک تقویٰ کا۔

شُعُوبًا وَّقَبَآئِلَ ، شعوب، شعب کی جمع ہے بہت بڑی جماعت کو شعب کہتے ہیں جو کسی ایک اصل پر مجتمع ہوں پھر اُن میں مختلف قبائل اور خاندان ہوتے ہیں۔ پھر خاندانوں میں بھی بڑے خاندان اور اسکے مختلف حصّوں کے عربی زبان میں الگ الگ نام ہیں۔ سب سے بڑا حصہ شعب اور سب سے چھوٹا حصّہ عشیرہ کہلاتا ہے۔ اور ابو رواق کا قول ہے کہ شعب اور شعوب عجمی قوموں کے لئے بولا جاتا ہے جن کے انساب محفوظ نہیں، اور قبائل عرب کے لوگوں کے لئے جن کے انساب محفوظ چلے آتے ہیں اور اسباط بنی اسرائیل کے لئے۔

نسبی اور وطنی یا لسانی امتیاز میں حکمت و مصلحت تعارف کی ہے قرآنِ کریم نے اس آیت میں واضح کر دیا کہ حق تعالیٰ نے اگرچہ سب انسانوں کو ایک ہی باپ اور ماں سے پیدا کر کے سب کو بھائی بھائی بنا دیا ہے مگر پھر اس کی تقسیم مختلف قوموں قبیلوں میں جو حق تعالیٰ ہی نے فرمائی ہے اُس میں حکمت یہ ہے کہ لوگوں کا تعارف اور شناخت آسان ہو جائے مثلاً ایک نام کے دو شخص ہیں تو خاندان کے تفاوت سے انمیں امتیاز ہو سکتا ہے اور اس سے دُور اور قریب کے رشتوں کا علم ہو سکتا ہے اور نسبی قرب بعد کی مقدار پر ان کے حقوق شرعیہ ادا کئے جاتے ہیں۔ عصبات کا قرب و بعد معلوم ہوتا ہے جس کی ضرورت تقسیم میراث میں پیش آتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نسبی تفاوت کو تعارف کیلئے استعمال کرو تفاخر کے لئے نہیں۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ۭ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا
کہتے ہیں گنوار کہ ہم ایمان لائے، تو کہہ تم ایمان نہیں لائے پر تم کہو ہم مسلمان ہوئے اور ابھی
يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ
نہیں گھسا ایمان تمہارے دلوں میں اور اگر حکم پر چلو گے اللہ کے اور اسکے رسُول کے کاٹ نہ لے گا

مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ

تمہارے کاموں میں سے کچھ اللہ بخشتا ہے مہربان ہے ایمان والے وہ لوگ ہیں

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ

جو ایمان لائے اللہ پر اور اسکے رسول پر، پھر شبہ نہ لائے اور لڑے اللہ کی راہ میں اپنے مال اور

وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾ قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ

اپنی جان سے وہ لوگ جو ہیں وہی ہیں سچے تو کہہ کیا تم جتلاتے ہو

اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ

اللہ کو اپنی دینداری اور اللہ کو تو خبر ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور اللہ

بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۶﴾ يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ۭ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا

ہر چیز کو جانتا ہے تجھ پر احسان رکھتے ہیں کہ مسلمان ہوئے تو کہہ مجھ پر احسان نہ

عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ

رکھو اپنے اسلام لانے کا بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اُسنے تم کو راہ دی ایمان کی

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ

اگر سچ کہو اللہ جانتا ہے چھپے بھید آسمانوں کے اور زمین کے

وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾ ع

اور اللہ دیکھتا ہے جو تم کرتے ہو

ع ۲ ۸ ۱۴

خلاصۂ تفسیر

یہ (بعضے) گنوار (بنی اسد وغیرہ کے آپ کے پاس آکر جو ایمان لانیکے مدعی ہوتے ہیں، یہ اس میں کئی گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں ایک تو کذب کہ بلا تصدیق قلب محض زبان سے) کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، آپ فرما دیجئے کہ تم ایمان تو نہیں لائے (کیونکہ وہ موقوف ہے تصدیق قلبی پر، اور وہ موجود نہیں جیسا عنقریب آتا ہے وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ) لیکن (ہاں) یوں کہو کہ (ہم مخالفت چھوڑ کر) مطیع ہوگئے (اور اطاعت بمعنی ترک مخالفت محض ظاہری موافقت سے بھی متحقق ہوجاتی ہے) اور (باقی) ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا (اس لئے ایمان کا دعویٰ مت کرو) اور (گو اب تک تم ایمان نہیں لائے لیکن اب بھی) اگر تم اللہ و رسول کا (سب باتوں میں) کہنا مان لو (جس میں یہ بھی داخل ہے کہ دل سے ایمان لے آؤ) تو اللہ تمہارے اعمال میں سے (جو کہ بعد ایمان کے ہونگے محض اسوقت کے کفر و کذب کی وجہ سے جو کہ اسوقت کے اعتبار سے

گزشتہ ہوگا) ذرا بھی کم نہ کریگا (بلکہ سب کا پورا پورا ثواب دے گا کیونکہ) بیشک اللہ غفور رحیم ہے (اب ہم سے سُنو کہ کامل مومن کون ہیں تاکہ اگر تم کو مومن بننا ہے تو ویسے بنو سو) پورے مومن وہ ہیں جو اللہ پر اور اسکے رسُول پر ایمان لائے پھر (ایمان پر مستمر بھی رہے یعنی عمر بھر کبھی) شک نہیں کیا اور اپنے مال اور جان سے خدا کے راستہ ہیں (یعنی دین کے لئے) محنت اُٹھائی (جس میں جہاد وغیرہ سب آگیا سو) یہ لوگ ہیں سچے (یعنی پورے سچے اور یوں اگر صرف تصدیق ہی ہو تب بھی نفس صدق ہو جاویگا، بخلاف تمھارے کہ ادنیٰ درجہ کا ایمان کہ تصدیق ہے وہ تک حاصل نہیں اور دعوی کرتے ہیں ایمان کامل کا، پس ایک امر قبیح تو ان سے یہ صادر ہوا یعنی کذب کما قال تعالیٰ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا الیٰ قولہ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ، اور دوسرا امر قبیح یہ ہے کہ یہ دھوکہ دیتے ہیں کما قال تعالیٰ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ سو) آپ (ان سے) فرما دیجئے کہ کیا خدا تعالیٰ کو اپنے دین (قبول کرنے) کی خبر دیتے ہو (یعنی اللہ تعالیٰ تو جانتے ہیں کہ تم نے ایمان قبول نہیں کیا باوجود اسکے جو تم دعوٰے قبول کرنے کا کرتے ہو تو لازم آتا ہے کہ خلاف علم خداوندی خدا تعالیٰ کو ایک بات تبلاتے ہو حالانکہ (یہ محال ہے کیونکہ) اللہ کو تو سب آسمان اور زمین کی سب چیزوں کی (پوری) خبر ہے اور (علاوہ سمٰوٰت والارض کے) اللہ (اور بھی) سب چیزوں کو جانتا ہے (تو اس کو کوئی کیا تبلاویگا اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کو جو تمھارے متعلق علم ہے کہ تم ایمان نہیں لائے وہی صحیح ہے اور تیسرا امر قبیح جس کے یہ مرتکب ہوتے ہیں یہ ہے کہ) یہ لوگ اپنے اسلام لانیکا آپ پر احسان رکھتے ہیں (جو نہایت درجہ گستاخی ہے کہ دیکھئے ہم نہ لڑے نہ بھڑے مسلمان ہو گئے اور دوسرے لوگ بہت پریشان کر کرکے مسلمان ہوئے ہیں سو) آپ کہدیجئے کہ مجھ پر اپنے اسلام لانے کا احسان نہ رکھو (اس لئے کہ قطع نظر گستاخی کے تمھارے اسلام سے میرا کیا نفع ہو گیا اور اسلام نہ لانے سے میرا کیا ضرر ہو گیا اگر تم سچے ہوتے تو تمھاری ہی آخرت کا نفع تھا اور جھوٹے ہونے میں بھی تمھارا ہی دنیا کا نفع ہے کہ قتل و قید سے بچ گئے سو مجھ پر احسان رکھنا محض جہل ہے) بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اُسنے تم کو ایمان کی ہدایت دی بشرطیکہ تم (اس دعوئ ایمان میں) سچے ہو (کیونکہ ایمان بڑی نعمت ہے اور بدون تعلیم و توفیق حق تعالےٰ کے نصیب نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ ایسی بڑی نعمت عطا فرمادی، پس دھوکے اور احسان جتلانے سے باز آؤ اور یہ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ آسمان اور زمین کی سب مخفی باتوں کو جانتا ہے اور (اسی علم محیط کی وجہ سے) تمھارے سب اعمال کو بھی جانتا ہے (اور اُن ہی کے موافق تم کو جزا دیگا پھر اُسکے سامنے باتیں بنانے سے کیا فائدہ)

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں بتلایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت و شرافت کا مدار تقویٰ پر ہے جو ایک باطنی چیز ہے اللہ تعالیٰ ہی اس کو جانتے ہیں کسی شخص کے لئے اپنے تقدس کا دعویٰ جائز نہیں، مذکور الصدر آیات میں ایک خاص واقعہ کی بنا پر یہ بتلایا گیا ہے کہ ایمان کا اصل مدار قلبی تصدیق پر ہے اسکے بغیر محض زبان سے اپنے کو مؤمن کہنا صحیح نہیں، اس پوری سورت میں اوّل نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے حقوق تعظیم و تکریم کا پھر باہمی حقوق اور آدابِ معاشرت کا ذکر آیا ہے ختم سورت پر یہ بتلایا گیا کہ آخرت میں سب اعمال کی مقبولیت کا مدار ایمان اور تصدیقِ قلبی اور اللہ و رسُول کی اطاعت پر ہے۔

شانِ نزول واقعہ اس آیت کے نزول کا امام بغوی رحؒ کی روایت کیمطابق یہ ہے کہ قبیلہ بنی اسد کے چند آدمی مدینہ طیبہ میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک قحط شدید کے زمانے میں حاضر ہوئے، یہ لوگ دل سے تو مؤمن تھے نہیں محض صدقات حاصل کرنے کے لئے اپنے اسلام لانے کا اظہار کیا، اور چونکہ واقع میں مؤمن نہ تھے اسلامی احکام و آداب سے بے خبر اور غافل تھے انھوں نے مدینہ کے راستوں پر غلاظت و نجاست پھیلا دی اور بازاروں میں اشیاء ضرورت کی قیمت بڑھادی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک تو جھوٹا دعویٰ ایمان لانے کا کیا، دوسرے آپ کو دھوکا دینا چاہا، تیسرے آپ پر احسان جتلایا کہ دوسرے لوگ تو ایک زمانہ تک آپ سے برسرِ پیکار رہے آپکے خلاف جنگیں لڑیں پھر مسلمان ہوئے ہم بغیر کسی جنگ کے خود آپ کے پاس حاضر ہو کر مسلمان ہوگئے اسلئے ہماری قدر کرنی چاہیئے جو شانِ رسالت میں ایک طرح کی گستاخی بھی تھی کہ اپنے مسلمان ہو جانیکا احسان آپ پر جتلایا، اور مقصود اسکے سوا کچھ نہ تھا کہ مسلمانوں کے صدقات سے اپنی مفلسی دُور کریں۔ اور اگر یہ واقعی اور سچے مسلمان ہی ہوجاتے تو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر کیا احسان تھا خود اپنا ہی نفع تھا اس پر آیاتِ مذکورہ نازل ہوئیں جن میں اُن کے جھوٹے دعوے کی تکذیب اور احسان جتلانے پر مذمت کی گئی ہے۔

وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا، چونکہ ان کے دلوں ایمان نہ تھا جھوٹا دعویٰ صرف ظاہری افعال کی بنا پر کر رہے تھے اسلئے قرآن نے انکے ایمان کی نفی اور دعوائے ایمان کے غلط ہونیکو بیان کرکے یہ فرمایا کہ تمہارا آمَنَّا کہنا تو جھوٹ ہے تم زیادہ سے زیادہ اسلمنا کہہ سکتے ہو کیونکہ اسلام کے لفظی معنی ظاہری افعال میں اطاعت کرنے کے ہیں اور یہ لوگ اپنے دعوائے ایمان کو سچا ثابت کرنے کے لئے کچھ اعمال مسلمانوں جیسے کرنے لگے تھے اس لئے لفظی اعتبار سے ایک درجہ کی اطاعت ہوگئی اسلئے لغوی معنی کے اعتبار سے اسلمنا کہنا صحیح ہوسکتا ہے۔

اسلام اور ایمان ایک ہیں یا کچھ فرق ہے؟ اوپر کی تقریر سے معلوم ہو گیا کہ اس آیت میں اسلام کے لُغوی معنی مراد ہیں اصطلاحی معنی مُراد ہی نہیں اس لئے اس آیت سے اسلام اور ایمان میں اصطلاحی فرق پر کوئی استدلال نہیں ہو سکتا۔ اور اصطلاحی ایمان اور اصطلاحی اسلام اگرچہ مفہوم و معنی کے اعتبار سے الگ الگ ہیں کہ ایمان اصطلاح شرع میں تصدیق قلبی کا نام ہے یعنی اپنے دل سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسُول کی رسالت کو سچا ماننا، اور اسلام نام ہے اعمالِ ظاہرہ میں اللہ تعالیٰ اور اسکے رسُول کی اطاعت کرنے کا لیکن شریعت میں تصدیقِ قلبی اسوقت تک قابلِ اعتبار نہیں جب تک اسکا اثر جوارح کے اعمال و افعال تک نہ پہنچ جائے جسکا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ زبان سے کلمہ اسلام کا اقرار کرے۔ اسیطرح اسلام اگرچہ اعمالِ ظاہرہ کا نام ہے لیکن شریعت میں وہ اسوقت تک معتبر نہیں جب تک کہ دل میں تصدیق نہ آجائے ورنہ وہ نفاق ہے۔ اس طرح اسلام و ایمان مبدأ اور منتہی کے اعتبار سے تو الگ الگ ہیں کہ ایمان باطن اور قلب سے شروع ہو کر ظاہر اعمال تک پہنچتا ہے اور اسلام افعالِ ظاہرہ سے شروع ہو کر باطن کی تصدیق تک پہنچتا ہے مگر مصداق کے اعتبار سے ان دونوں میں تلازم ہے کہ ایمان اسلام کے بغیر معتبر نہیں، اور اسلام ایمان کے بغیر شرعاً معتبر نہیں، شریعت میں یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص مسلم تو ہو مؤمن نہ ہو یا مؤمن ہو مُسلم نہ ہو مگر یہ کلام اصطلاحی ایمان و اسلام میں ہے لُغوی معنی کے اعتبار سے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص مسلم ہو مؤمن نہ ہو جیسے تمام منافقین کا یہی حال تھا کہ ظاہری اطاعتِ احکام کی بنا پر مسلم کہلاتے تھے مگر دل میں ایمان نہ ہونے کے سبب مؤمن نہ تھے واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم ❖

تمت بحمد اللہ تعالیٰ وعونہ سورۃ الحجرات للثامن
من شعبان سنہ ۱۳۹۲ھ یوم الاحد وللہ الحمد والمنۃ

سُوْرَةُ قٓ

سُوْرَةُ قٓ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ خَمْسٌ وَّاَرْبَعُوْنَ اٰيَةً وَّثَلٰثُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ قٓ مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں ۴۵ آیتیں اور تین رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے،

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ① بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَاۗءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ

ق قسم ہے اس قرآن بڑی شان والے کی، بلکہ ان کو تعجب ہوا کہ آیا اُن کے پاس ڈر سنانے والا انہی میں کا

فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ② ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ

تو کہنے لگے منکر یہ تعجب کی چیز ہے، کیا جب ہم مر گئیں اور ہو جائیں مٹی، یہ

رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ③ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ

پھر آنا بہت دور ہے، ہم کو معلوم ہے جتنا گھٹاتی ہے زمین اُن میں سے اور ہمارے پاس کتاب ہے جس

حَفِيْظٌ ④ بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاۗءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ⑤

میں سب کچھ محفوظ ہے، کوئی نہیں پر جھٹلاتے ہیں سچے دین کو جب اُن تک پہنچا سو وہ پڑ رہے ہیں اُلجھی ہوئی بات میں،

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَاۗءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا

کیا نہیں دیکھتے آسمان کو اپنے اوپر کیسا ہم نے اس کو بنایا اور رونق دی اور اس میں

مِنْ فُرُوْجٍ ⑥ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا

نہیں کوئی سوراخ، اور زمین کو پھیلایا اور ڈالے اس میں بوجھ اور اُگائی

فِيهَا مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ﴿٧﴾ تَبْصِرَةً وَذِكْرَىٰ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ ﴿٨﴾ وَنَزَّلْنَا

اس میں ہر ہر قسم کی رونق کی چیز، سمجھانے کو اور یاد دلانے کو اس بندہ کیلئے جو رجوع کرے، اور اُتارا ہم نے

مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُّبَارَكًا فَأَنبَتْنَا بِهِ جَنَّاتٍ وَحَبَّ الْحَصِيدِ ﴿٩﴾ وَالنَّخْلَ

آسمان سے پانی برکت کا پھر اُگائے ہم نے اس سے باغ اور اناج جس کا کھیت کاٹا جاتا ہے، اور کھجوریں

بَاسِقَاتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيدٌ ﴿١٠﴾ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۖ وَأَحْيَيْنَا بِهِ بَلْدَةً مَّيْتًا ۚ

لمبی اُن کا خوشہ ہے تہہ پر تہہ روزی دینے کو بندوں کے اور زندہ کیا ہم نے اُس سے ایک مُردہ دیس کو

كَذَٰلِكَ الْخُرُوجُ ﴿١١﴾ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَأَصْحَابُ الرَّسِّ

یونہی ہوگا نکل کھڑے ہونا، جھٹلا چکے ہیں ان سے پہلے نوح کی قوم اور کنویں والے

وَثَمُودُ ﴿١٢﴾ وَعَادٌ وَفِرْعَوْنُ وَإِخْوَانُ لُوطٍ ﴿١٣﴾ وَأَصْحَابُ الْأَيْكَةِ وَ

اور ثمود اور عاد اور فرعون اور لُوط کے بھائی اور بن کے رہنے والے اور

قَوْمُ تُبَّعٍ ۚ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيدِ ﴿١٤﴾ أَفَعَيِينَا بِالْخَلْقِ

تبع کی قوم ان سب نے جھٹلایا رسولوں کو پھر ٹھیک پڑا میرا ڈرانا، اب کیا ہم تھک گئے پہلی

الْأَوَّلِ ۚ بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ ﴿١٥﴾

بار بنا کر کوئی نہیں ان کو دُھوکا ہے ایک نئے بنانے میں

ع ۱۵ / ۱۵

خُلاصہ تفسیر

ق (اس کے معنی اللہ کو معلوم ہیں) قسم ہے قرآن مجید کی (یعنی جس کو دوسری کتابوں پر فضیلت و شرف ہے کہ ہم نے آپ کو عذاب قیامت سے ڈرانے کے لئے بھیجا ہے مگر ان لوگوں نے نہ مانا) بلکہ ان کو اس بات پر تعجب ہوا کہ ان کے پاس انہی (کی جنس) میں سے (یعنی انسانوں میں سے) ایک ڈرانے والا (پیغمبر) آگیا (جس نے ان کو قیامت کے دن سے ڈرایا) سو (اس پر) کافر لوگ کہنے لگے کہ (اوّل تو خود) یہ (ایک) عجیب بات ہے (کہ بشر پیغمبر ہو، دوسرے پھر دعویٰ بھی عجیب بات کا کرے کہ دوبارہ زندہ ہوں گے بھلا) جب ہم مرگئے اور مٹی ہوگئے تو کیا دوبارہ زندہ ہوں گے یہ دوبارہ زندہ ہونا (امکان سے) بہت ہی بعید ہے (خلاصہ یہ ہے کہ اوّل تو ہم جیسے انسان ہیں ان کو پیغمبری کا دعویٰ کرنے کا حق نہیں، پھر وہ اپنے دعوے میں ایک محال چیز کا دعویٰ کرتے ہیں، کہ مرنے اور مٹی ہونے کے بعد دوبارہ زندہ کئے جاویں گے، اس کے جواب میں حق تعالیٰ

مرنے کے بعد زندہ ہونے کا امکان ثابت کرکے اُن کے محال کہنے کو رد فرماتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ دوبارہ زندہ ہونے کو تم جو غیر ممکن کہتے ہو اس کی دو وجہ ہو سکتی ہیں، یا تو یہ کہ جن چیزوں کے زندہ ہونے کو کہا گیا ہے ان میں زندہ ہونے کی صلاحیت ہی نہ ہو، یہ تو مشاہدہ سے غلط ہے، کیونکہ وہ اس وقت تمھارے سامنے زندہ موجود ہیں، اگر زندگی کی صلاحیت ہی نہ ہوتی تو اس وقت کیسے زندہ ہیں، دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ فاعل یعنی اللہ تعالیٰ کو دوبارہ زندہ کرنے کی قدرت اس لئے نہ ہو کہ جو اجزاء میّت کے مٹی ہو کر منتشر ہو گئے وہ اس کو معلوم نہ ہوں کہ کہاں بکھرے ہیں، تو اس کے جواب میں فرمایا کہ ہمارے علم کی تو یہ شان ہے کہ) ہم ان کے ان اجزاء کو جانتے ہیں جن کو مٹی (کھاتی ہے اور) کم کرتی ہے اور (یہ نہیں کہ آج سے جانتے ہیں بلکہ ہمارا علم تو قدیم ہے، حتیٰ کہ ہم نے قبل وقوع ہی سب اشیاء کے سب حالات اپنے علم قدیم سے ایک کتاب یعنی لوح محفوظ میں لکھ دیئے تھے اور اب تک) ہمارے پاس (وہ) کتاب (یعنی لوح) محفوظ (موجود) ہے (جس میں ان اجزاءِ منتشر کا مکان اور وضع اور مقدار اور وصف سب کچھ ہے، سو اگر علم قدیم کسی کی سمجھ میں نہ آوے تو یوں ہی سمجھ لے کہ وہ دفتر جس میں سب کچھ ہے، حق تعالیٰ کے سامنے حاضر ہے مگر یہ لوگ پھر بھی بلاوجہ تعجب ہی میں ہیں اور صرف تعجب ہی نہیں) بلکہ سچی بات کو (جس میں مسئلہ نبوت اور آخرت کی دوبارہ زندگی بھی ہے) جبکہ وہ اُن کو پہنچتی ہے جھٹلاتے ہیں، غرض یہ کہ وہ ایک متزلزل حالت میں ہیں (کہ کبھی تعجب ہے، کبھی تکذیب ہے، یہ درمیان میں بطور جملہ معترضہ کے تھا، آگے بیان ہے قدرت کا یعنی) کیا ان لوگوں (کو ہماری قدرت کا علم نہیں ہے اور کیا انھوں) نے اپنے اوپر کی طرف آسمان کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو کیسا (اونچا اور بڑا) بنایا اور (ستاروں سے) اس کو آراستہ کیا اور اس میں (بوجہ مکمل استحکام کے) کوئی رخنہ تک نہیں (جیسا کہ اکثر تعمیرات میں زمانہ کے دراز ہونے کے بعد رخنہ پڑ جایا کرتا ہے، یہ تو آسمان میں ہماری قدرت نمایاں ہے) اور زمین (میں یہ قدرت ظاہر ہے کہ اس) کو ہم نے پھیلایا اور اس میں پہاڑوں کو جما دیا اور اس میں ہر قسم کی خوش نما چیزیں اُگائیں جو ذریعہ ہے دانائی اور بینائی کا (یعنی ہماری قدرت کی معرفت کا) ہر رجوع ہونے والے بندے کے لئے (یعنی ایسے شخص کے لئے جو مصنوعات کو اس نظر سے دیکھے کہ ان کو کس نے بنایا ہے) اور (ہماری قدرت اس سے ظاہر ہے کہ) ہم نے آسمان سے برکت والا پانی برسایا پھر اس سے بہت سے باغ اُگائے اور کھیتی کا غلّہ اور لمبی لمبی کھجور کے درخت جن کے گچھے خوب گندھے ہوئے ہوتے ہیں، بندوں کے رزق دینے کے لئے اور (دوسری نباتات مثل گھاس وغیرہ کے جمانے کے لئے بھی) ہم نے اس (بارش) کے ذریعہ سے مُردہ زمین کو زندہ کیا (بس) اسی طرح (سمجھ لو کہ مُردوں کا) زمین سے نکلنا ہوگا (کیونکہ قدرتِ ذاتیہ کے اعتبار سے تمام مقدورات برابر ہیں بلکہ جو ذات بڑی چیزوں پر قادر ہے اس کا چھوٹی چیزوں پر قادر ہونا اور زیادہ ظاہر ہے، اسی لئے آسمان و زمین کا یہاں ذکر کیا گیا، کہ ان کی تخلیق ایک مُردہ کو دوبارہ زندہ کرنے سے بہت بڑی بات ہے

کما قال تعالیٰ (لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ) تو جب ان بڑے بڑے کاموں پر اللہ تعالیٰ کی قدرت ثابت ہوگئی تو مُردہ کو زندہ کر دینے پر کیوں نہ ہوگی، تو معلوم ہوا کہ مُردوں کو زندہ کرنا محال نہیں، ممکن ہے، اور زندہ کرنے والا فاعلِ مختار بڑی قدرت والا ہے، پھر اس میں تعجب یا تکذیب کی کیا بات ہے، آگے تکذیب کرنے والوں کو ڈرانے کے لئے پچھلی امتوں کے واقعات بتلا کر وعید کی گئی ہے کہ جس طرح یہ لوگ انکارِ قیامت سے رسول کی تکذیب کرتے ہیں اسی طرح) ان سے پہلے قومِ نوح اور اصحاب الرّس اور ثمود اور عاد اور فرعون اور قومِ لوط اور اصحابِ ایکہ اور قومِ تُبّع تکذیب کر چکے ہیں (یعنی) سب نے پیغمبروں کو (یعنی اپنے اپنے پیغمبر کو توحید اور رسالت اور قیامت کے معاملہ میں) جھٹلایا سو میری وعید (ان پر) محقق ہوگئی (کہ ان سب پر عذاب نازل ہوا، اسی طرح ان مکذبین پر عذاب آوے گا، خواہ دنیا میں بھی یا صرف آخرت میں، وعید کے بعد پھر مضمون اوّل کی طرف دوسرے طور پر عود ہے کہ) کیا ہم پہلی بار کے پیدا کرنے میں تھک گئے (کہ دوبارہ زندہ نہ کر سکیں، یعنی ایک مانع یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کام بھی ممکن ہو اور کرنے والے کو قدرت بھی پوری ہو، مگر کوئی عارضی مانع پیش آجائے جیسے کرنے والا تھک گیا ہو، اس لئے یہ کام نہیں کر سکا، اس آیت میں اس کی بھی نفی فرما دی کہ اللہ تعالیٰ اس طرح کے عیوب سے پاک ہے وہ کسی چیز سے متأثر نہیں ہوتا، نہ اس کو تکان ہونے کا کوئی امکان ہے، اس لئے قیامت میں دوبارہ زندہ ہونا دلائل سے ثابت ہوگیا، اور یہ لوگ جو انکار کر رہے ہیں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے) بلکہ یہ لوگ ازسرِنو پیدا کرنے کی طرف سے (محض بے دلیل) شبہ میں (پڑے ہوئے) ہیں (جو دلائل کے سامنے کسی طرح قابلِ التفات نہیں)۔

معارف و مسائل

سورۂ قٓ کی خصوصیات سورۂ قٓ میں بیشتر مضامین آخرت اور قیامت اور مُردوں کے زندہ ہونے اور حساب وکتاب سے متعلق ہیں، اور یہی مناسبت ہے اس کو اس سے پہلی سورۂ حجرات سے کہ اس کے آخر میں انہی مضامین کا ذکر تھا،

سورۂ قٓ کی ایک خاص اہمیت اس حدیث سے معلوم ہوتی ہے کہ اُمِ ہشام بنت حارثہ بن النعمان رضؓ کہتی ہے کہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت قریب میرا مکان تھا) دو سال کے قریب ہمارا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تنور (جس میں روٹی پکتی تھی) ایک ہی تھا، مجھے سورۂ قٓ پوری اس طرح حفظ ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سورت ہر جمعہ کو منبر پر خطبہ میں تلاوت فرماتے تھے (رواہ مسلم از قرطبی)

اور حضرت عمر بن خطابؓ نے ابو واقد لیثیؓ سے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کی نمازوں میں کونسی سورت پڑھا کرتے تھے؟ تو انھوں نے فرمایا: قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ، اور اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ اور حضرت جابرؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز میں بکثرت سورۂ قٓ تلاوت فرماتے تھے،

(یہ سورت خاصی بڑی ہے) مگر اس کے باوجود نماز ہلکی رہتی تھی (قرطبی) یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تلاوت کا خاص اثر تھا کہ بڑی سے بڑی سورت اور طویل سے طویل نماز بھی پڑھنے والوں پر ہلکی رہتی تھی،

کیا آسمان نظر آتا ہے؟ اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَاۗءِ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آسمان نظر آتا ہے، اور مشہور یہ ہے کہ یہ نیلگوں رنگ جو نظر آتا ہے یہ ہوا کا رنگ ہے، مگر اس کی نفی کی بھی کوئی دلیل نہیں، کہ یہی رنگ آسمان کا بھی ہو، اس کے علاوہ آیت میں نظر سے مراد نظر عقلی بمعنی غور و فکر بھی مراد ہو سکتی ہے، (بیان القرآن)

احیاء بعد الموت پر مشہور شبہ کا جواب قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ، کفار و مشرکین جو قیامت میں بعث بعد الموت (یعنی مُردوں کے زندہ ہونے) کا انکار کرتے ہیں ان کی سب سے بڑی دلیل یہ تعجب ہے کہ مرنے کے بعد انسان کے اکثر اجزاءِ جسم مٹی ہو جاتے ہیں، پھر وہ مٹی منتشر ہو کر دنیا میں پھیل جاتی ہے، پانی اور ہوا اس کے ذرّات کہاں سے کہاں پہونچا دیتے ہیں، قیامت میں دوبارہ زندہ کرنے کے لئے ساری دنیا میں بکھرے ہوئے اجزاء کو معلوم رکھنا کہ یہ جزء فلاں کا ہے، یہ فلاں کا، اور پھر ہر ایک کے اجزاء کو الگ الگ جمع کر دینا کس کے بس کی بات ہے؟ قرآن کریم نے اس کا جواب دیا کہ انسان اپنے محدود علم و بصیرت پر اللہ تعالیٰ کے غیر محدود و لا متناہی علم کو قیاس کر کے اس گمراہی میں پڑتا ہے (قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ)، اللہ تعالیٰ کا علم تو اتنا وسیع اور محیط ہے کہ مرنے کے بعد انسان کا ایک ایک جزء اس کی نظر میں ہے، وہ جانتا ہے کہ مُردے کے کس کس حصّہ کو زمین نے کھا لیا ہے، کیونکہ اس کی کچھ ہڈیاں تو اللہ تعالیٰ نے ایسی بنائی ہیں کہ ان کو زمین نہیں کھاتی، اور جن کو زمین کھا کر مٹی کر دیتی ہے پھر وہ مٹی دنیا جہان کے جس گوشہ میں پہنچتی ہے وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی نظر میں ہے، جب وہ چاہے گا سب کو ایک جگہ جمع کر دے گا، اور ذرا غور کرو تو اس وقت ہر انسان کا جسم جن اجزاء سے مرکب چلتا پھرتا نظر آتا ہے اس میں بھی تو ساری دنیا کے مختلف گوشوں کے اجزاء جمع ہیں، کوئی غذا کی صورت سے کوئی دوا کی صورت میں سارے عالم کے مختلف شہروں اور جنگلوں کے اجزاء ہی تو ہیں جن سے یہ موجودہ جسم مرکب ہوا ہے، پھر اس کے لئے کیا دشوار ہے کہ دوبارہ ان اجزاء کو دنیا میں منتشر کرنے کے بعد پھر ایک جگہ جمع کر دے، اور صرف یہی نہیں کہ اب مرنے اور مٹی ہونے کے بعد انسان کے یہ اجزاء اس کے علم میں آئے ہوں، بلکہ انسان کے پیدا کرنے سے پہلے ہی اس کی زندگی کا ہر ہر لمحہ اور اس میں پیدا ہونے والے تغیرات اور پھر مرنے کے بعد اس پر کیا کیا حالات پیش آئیں گے وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس پہلے سے لکھا ہوا لوحِ محفوظ میں موجود ہے،

پھر جو ایسا علیم و بصیر ہے اور جس کی قدرت اتنی کامل اور سب چیزوں پر حاوی ہے اس کے متعلق یہ تعجب کرنا خود قابلِ تعجب ہے، مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ کی یہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ اور مجاہدؒ اور جمہور مفسرین سے منقول ہے (بحر محیط)

فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ، لفظ مَرِیج کے معنی لغت میں مختلط کے ہیں، جس میں مختلف چیزوں کا اختلاط والتباس ہو

اور ایسی چیز عموماً فاسد ہوتی ہے، اسی لئے حضرت ابو ہریرہؓ نے مَرِیج کا ترجمہ فاسد سے فرمایا، اور ضحاک اور قتادہ اور حسن بصری وغیرہ نے مختلط اور ملتبس سے فرمایا ہے، مراد یہ ہے کہ یہ کفار و منکرین رسالت اپنی انکار میں بھی کسی ایک بات پر نہیں جمتے، کبھی آپؐ کو ساحر و جادوگر بتاتے ہیں، کبھی شاعر کہتے ہیں، کبھی کاہن و نجومی کہتے ہیں، اُن کا کلام خود ملتبس اور فاسد ہے، جواب کس کا دیا جائے،

آگے حق تعالیٰ کی قدرت مطلقہ کاملہ کا بیان ہے جو آسمان و زمین اور ان کے اندر پیدا ہونے والی بڑی بڑی چیزوں کی تخلیق کے حوالہ سے کیا گیا ہے اس میں آسمان کے متعلق فرمایا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوجٍ، فروج، فرج کی جمع ہے جس کے معنی شق کے آتے ہیں، مراد یہ ہے کہ آسمان کا اتنا بڑا عظیم الشان کرہ حق تعالیٰ نے بنایا ہو اگر انسان کی بنائی ہوئی چیز ہوتی تو اس میں ہزار جوڑ و پیوند اور شقوق کے نشانات پائے جاتے، مگر تم آسمان کو دیکھتے ہو اس میں نہ کوئی پیوند لگا ہوا ہے نہ کسی جگہ سے جُڑائی اور سلائی کے نشان نظر آتے ہیں اس سے اس کی نفی نہیں ہوتی کہ آسمان میں اللہ تعالیٰ نے دروازے بنائے ہیں، دروازے کو شق نہیں کہا جاتا،

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ، سابقہ آیات میں کفار کی تکذیب رسالت و آخرت کا ذکر تھا، جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذاء پہنچنا ظاہر ہے، اس آیت میں حق تعالیٰ نے آپؐ کی تسلی کے لئے پچھلے انبیاءؑ اور ان کی اُمتوں کے حالات بتلائے ہیں کہ ہر پیغمبر کو منکرین و کفار کی طرف سے ایسی ایذائیں پیش آتی رہی ہیں، یہ سنتِ انبیاء ہے، اس سے آپ شکستہ خاطر نہ ہوں، قومِ نوح علیہ السلام کا قصہ قرآن میں بار بار آیا ہے کہ ساڑھے نو سو برس نوح علیہ السلام ان کی اصلاح کی کوشش کرتے رہے مگر ان کی طرف سے نہ صرف انکار بلکہ طرح طرح کی ایذائیں پہونچتی رہیں،

اصحاب الرس کون لوگ ہیں؟ اصحاب الرّس، لفظ رَسّ عربی زبان میں مختلف معنی کے لئے آتا ہے مشہور معنی یہ ہیں کہ کچے کنویں کو رسّ کہا جاتا ہے، جو اینٹ پتھر وغیرہ سے پختہ نہ کیا گیا ہو، اصحاب الرس سے مراد قوم ثمود کے باقی ماندہ لوگ ہیں جو عذاب کے بعد باقی رہے، ضحاک وغیرہ مفسرین نے ان کا قصہ یہ لکھا ہے کہ جب حضرت صالح علیہ السلام کی قوم (ثمود) پر عذاب آیا تو ان میں سے چار ہزار آدمی جو حضرت صالح علیہ السلام پر ایمان لاچکے تھے وہ عذاب سے محفوظ رہے، یہ لوگ اپنے مقام سے منتقل ہو کر حضرموت میں جاکر مقیم ہوگئے، حضرت صالح علیہ السلام بھی ان کے ساتھ تھے، ایک کنویں پر جاکر یہ لوگ ٹھہر گئے، اور حضرت صالح علیہ السلام کی وفات ہوگئی، اسی لئے اس جگہ کا نام حَضَرَمَوْتُ (یعنی موت حاضر ہوگئی) ہے، یہ لوگ یہیں رہ پڑے، پھر ان کی نسل میں بُت پرستی شروع ہوگئی، ان کی اصلاح کے لئے حق تعالیٰ نے ایک نبی کو بھیجا، جس کو انھوں نے قتل کر ڈالا، اُن پر خدا تعالیٰ کا عذاب آیا، ان کا کنواں جس پر ان کی زندگی کا انحصار تھا وہ بیکار ہوگیا، اور عمارتیں ویران ہوگئیں، قرآن کریم نے اسی کا ذکر اس آیت میں فرمایا ہے: وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيدٍ، یعنی چشمِ عبرت والوں کے لئے ان کا بیکار پڑا ہوا کنواں اور پختہ بنے ہوئے محلات ویران پڑے

ہوئے عبرت کے لئے کافی ہیں۔

ثمود؛ حضرت صالح علیہ السلام کی اُمت ہیں، ان کا واقعہ قرآن میں بار بار پہلے گذر چکا ہے۔

عاد؛ قوم عاد اپنے ڈیل ڈول اور قوت وشجاعت میں ضرب المثل تھی، حضرت ہود علیہ السلام ان کی طرف مبعوث ہوئے، اُن کو ستایا اُن کی نافرمانی کی، آخر کار ہوا کے طوفان کا عذاب آیا، اور سب فنا ہوئے۔

فِرْعَوْن؛ بہت ہی معروف ومشہور مصر کے بادشاہ کا نام ہے۔

اِخْوَانُ لُوْطٍ؛ حضرت لوط علیہ السلام کی اُمت ہے، جن کا قصہ کئی مرتبہ پہلے گذر چکا ہے۔

اَصْحٰبُ الْاَیْکَۃِ، ایکہ گھنے جنگل اور بَن کو کہتے ہیں، یہ لوگ ایسے ہی مقام پر آباد تھے، حضرت شعیب علیہ السلام اُن کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے، انھوں نے نافرمانی کی، بالآخر عذابِ الٰہی سے تباہ و برباد ہوئے۔

وَقَوْمُ تُبَّعٍ، تُبَّعْ یمن کے ایک بادشاہ کا لقب ہے، جس کی ضروری تحقیق جلد ہفتم میں سورۂ دخان کے تحت گذر چکی ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۖۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ

اور البتہ ہم نے بنایا انسان کو اور ہم جانتے ہیں جو باتیں آتی رہتی ہیں اس کے جی میں اور ہم اس سے

اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴿۱۶﴾ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ

نزدیک ہیں دھڑکتی رگ سے زیادہ، جب لیتے جاتے ہیں دو لینے والے داہنے بیٹھا اور بائیں

قَعِيْدٌ ﴿۱۷﴾ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴿۱۸﴾ وَجَآءَتْ

بیٹھا، نہیں بولتا کچھ بات جو نہیں ہوتا اس کے پاس ایک راہ دیکھنے والا تیار، اور وہ آئی

سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ﴿۱۹﴾ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ۭ

بیہوشی موت کی تحقیق، یہ وہ ہے جس سے تو ٹلتا رہتا تھا، اور پھونکا گیا صور

ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ﴿۲۰﴾ وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ ﴿۲۱﴾

یہ ہے دن ڈرانے کا، اور آیا ہر ایک جی اس کے ساتھ ہے ایک ہانکنے والا اور ایک احوال بتلانیوالا

لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ

تو بیخبر رہا اس دن سے اب کھول دی ہم نے تجھ پر سے تیری اندھیری سو تیری نگاہ آج

حَدِيْدٌ ﴿۲۲﴾ وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ﴿۲۳﴾ اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ
تیز ہے ، اور بولا (فرشتہ) اس کے ساتھ والا یہ ہے جو میرے پاس تھا حاضر ، ڈال دو تم دونوں دوزخ میں ہر

كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۲۴﴾ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبِ ﴿۲۵﴾ الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ
ناشکر مخالف کو ، نیکی سے روکنے والا حد سے بڑھنے والا شبہ ڈالنے والا ، جس نے ٹھہرایا اللہ کے ساتھ اور

اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ ﴿۲۶﴾ قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَا
کو پوجنا سو ڈال دو اس کو سخت عذاب میں ، بولا (شیطان) اس کا ساتھی اے رب ہمارے

اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۲۷﴾ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ
میں نے اس کو شرارت میں نہیں ڈالا پر یہ تھا راہ کو بھولا دور پڑا ہوا ، فرمایا جھگڑا نہ کرو میرے پاس

وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ﴿۲۸﴾ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا
اور میں پہلے ہی ڈرا چکا تھا تم کو عذاب سے ، بدلتی نہیں بات میرے پاس اور میں ظلم

بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۲۹﴾
نہیں کرتا بندوں پر ،

ع ۲ ۱۴ ۱۶

خلاصۂ تفسیر

(اوپر قیامت میں مُردوں کے زندہ ہونے کا امکان ثابت ہو چکا ہے آگے اس کے وقوع کا بیان ہے اور وقوع موقوف ہے علم کامل اور قدرت کاملہ پر، اس لئے اوّل اس کو بتلاتے ہیں کہ) اور ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے (جو اعلیٰ درجہ کی دلیل ہے قدرت پر) اور اس کے جی میں جو خیالات آتے ہیں ہم ان (تک) کو (بھی) جانتے ہیں (تو جو افعال ان کے ہاتھ پاؤں اور زبان سے صادر ہوں اُن کو جاننا تو بدرجۂ اَولیٰ ہے) اور (بلکہ ہم کو تو اس کے احوال کا ایسا علم ہے کہ اس کو خود بھی اپنے احوال کا ایسا علم نہیں پس باعتبار علم کے) ہم انسان کے اس قدر قریب ہیں کہ اس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ (جس کے قطع ہونے سے انسان مرجاتا ہے، اور چونکہ لوگوں کی عام عادت میں جانور کی رُوح نکالنے کے لئے گردن کاٹنے ہی کا طریقہ رائج ہے، اس لئے یہ تعبیر اختیار کی گئی، اور یہ گردن کی رگیں وَرِید اور شریان دونوں کو محتمل ہیں، مگر شریان مراد لینا زیادہ مناسب ہے، کیونکہ ان میں رُوح غالب اور خون مغلوب رہتا ہے، اور وَرِید میں بالعکس اور یہاں جس کو روح میں زیادہ دخل ہو اس کا مراد لینا مناسب ہے، اور سورۂ حاقہ میں لفظ وَتِین بمعنی

رگِ دل سے تعبیر کرنا اس کا مؤید ہے، کیونکہ جو رگیں دل سے نکلتی ہیں وہ شرائین ہیں، اور گو قرآن میں لفظ وَرِید ہی مگر معنی لغوی اس کے عام ہیں، جس میں دل سے نکلنے والی رگیں شرائین بھی داخل ہیں اور جگر سے نکلنے والی رگیں وریدہ بھی، پس مطلب یہ ہوا کہ ہم باعتبار علم کے اس کی روح اور نفس سے بھی نزدیک تر ہیں، یعنی جیسا علم انسان کو اپنے احوال کا ہے ہم کو اس کا علم خود اس سے بھی زیادہ ہے، چنانچہ انسان کو اپنی بہت سی حالتوں کا تو علم ہی نہیں ہوتا، اور جن کا علم ہوتا ہے ان میں بھی بعض اوقات نسیان یا ان سے ذہول ہو جاتا ہے، اور حق تعالیٰ میں ان احتمالات کی گنجائش ہی نہیں، اور ظاہر ہے کہ جو علم ہر حالت میں ہو اس کا تعلق بہ نسبت اس کے کہ ایک حالت میں ہو زیادہ ہوگا، غرض علمِ الٰہی کا جمیع احوالِ انسانیہ کے ساتھ متعلق ہونا بھی ثابت ہوگیا، آگے اس کی مزید تاکید کے لئے یہ بیان فرمایا کہ انسان کے اعمال واحوال صرف یہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں محفوظ ہوں بلکہ ظاہری حجت تمام کرنے کے لئے وہ اعمال فرشتوں کے ذریعہ لکھوا کر بھی محفوظ کئے گئے، ارشاد ہے) جب دو اخذ کرنے والے فرشتے (انسان کے اعمال کو جب وہ اس سے صادر ہوتے ہیں) اخذ کرتے رہتے ہیں جو کہ داہنی اور بائیں طرف بیٹھے رہتے ہیں (اور برابر ہر عمل کو لکھتے رہتے ہیں، لقولہ تعالیٰ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ وقولہ تعالیٰ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ یہاں تک کہ سب اعمال میں خفیف انسان کی گفتگو اور کلام ہے، مگر اس کی یہ کیفیت ہے کہ) وہ کوئی لفظ مُنہ سے نہیں نکالنے پاتا مگر اس کے پاس ہی ایک تاک لگانے والا تیار (موجود ہوتا) ہے (اگر وہ نیکی کا کلام ہو تو داہنے والا اس کو ضبط اور تحریر میں لاتا ہے، اگر بدی کا کلام ہو تو بائیں والا، اور جب زبان سے نکلنے والا ایک ایک کلمہ محفوظ ومکتوب ہے تو دوسرے اعمال کیوں نہ ہوں گے) اور (چونکہ آخرت کی زندگی اور اعمال کی جزاء وسزا، سب کا مقدمہ موت ہے، اس لئے انسان کو متنبہ کرنے کے لئے آگے اس کا ذکر ہے، کیونکہ قیامت سے انکار درحقیقت موت سے غفلت ہی کا نتیجہ ہوتا ہے، ارشاد ہے کہ تو ہوشیار ہو جاؤ) موت کی سختی حقیقۃً (قریب) آپہونچی (یعنی ہر شخص کی موت قریب ہی چنانچہ ظاہر ہے) یہ (موت) وہ چیز ہے جس سے تو بدکتا (اور بھاگتا) تھا (موت سے بھاگنا طبعی طور پر تو ہر نیک و بد میں یکساں ہے، اور کافر فاجر کا موت سے بھاگنا بوجہ حُبِّ دنیا کے اور بھی زیادہ واضح ہے، کسی خاص بندہ پر اللہ سے ملنے کے شوق کا غلبہ ہو کر موت کا لذیذ اور مطلوب ہو جانا اس کے منافی نہیں کیونکہ وہ عام عادت انسانی سے مافوق حالت ہے) اور (اس مقدمہ یعنی ذکر موت کے بعد اب وقوعِ قیامت کا بیان ہے، جو کہ مقصود تھا یعنی قیامت کے دن دوبارہ) صور پھونکا جائے گا (جس سے سب زندہ ہو جائیں گے یہی دن ہوگا وعید کا (جس سے لوگوں کو ڈرایا جاتا تھا) اور (آگے قیامت کے ہولناک واقعات اور حالات کا بیان ہے) ہر شخص اس طرح (میدانِ قیامت میں) آوے گا کہ اس کے ساتھ (دو فرشتے ہوں گے جن میں) ایک (تو میدانِ قیامت کی طرف) اس کو اپنے ہمراہ لاوے گا اور ایک (اس کے اعمال کا) گواہ ہوگا (حدیث مرفوع میں ہے کہ یہ سائق اور شہید وہی دو فرشتے ہیں جو زندگی میں انسان کے دائیں اور

بائیں اس کے اعمال کو لکھتے تھے (رواہ فی الدر) اور اگر یہ حدیث موافق شرائط محدثین کے قوی نہ ہو تو احتمال ہر
کہ دو فرشتے اور ہوں جیسا کہ بعض قائل ہوئے ہیں، گو اس صورت میں بھی بوجہ موافقتِ حدیث کے راجح احتمال
اوّل ہی ہوگا اور جب وہ میدانِ قیامت میں حاضر ہوں گے تو ان میں جو کافر ہوں گے ان سے خطاب ہوگا کہ)
تو اس دن سے بے خبر تھا (یعنی اس کا قائل نہ تھا) سو اب ہم نے تجھ پر سے تیرا پردہ (غفلت اور انکار کا) ہٹا دیا
(اور قیامت کا معائنہ کرا دیا) سو آج (تو) تیری نگاہ بڑی تیز ہے (کہ کوئی امر مانع ادراک نہیں، کاش تو دنیا
میں بھی اس مانع غفلت کو رفع کر دیتا تو تیرے دن بھلے ہوتے) اور (اس کے بعد) فرشتہ (کاتب اعمال) جو
اس کے ساتھ رہتا تھا (اور اب بھی ایک قول پر سائق یا شاہد بن کر آیا ہے نامۂ اعمال حاضر کرکے) عرض
کرے گا کہ یہ وہ (روزنامچہ) ہے جو میرے پاس تیار ہے (کذا فسّر ہذا القرین بالملک ابن جریج والقرین الذی
یلیہ بالشیطان رواہ فی الدر) چنانچہ اس روزنامچہ کے موافق کافروں کے بارے میں دو فرشتوں کو خواہ وہ
سائق و شہید مذکور ہوں یا اور دو فرشتے ہوں حکم ہوگا کہ) ہر ایسے شخص کو جہنم میں ڈال دو جو کفر کرنے والا
ہو اور (حق سے) ضد رکھتا ہو اور نیک کام سے روکتا ہو اور حد (عبدیت) سے باہر ہو جانے والا ہو اور
(دین میں) شبہ پیدا کرنے والا ہو، جس نے خدا کے ساتھ دوسرا معبود تجویز کیا ہو سو ایسے شخص کو سخت
عذاب میں ڈال دو (جب کفار کو معلوم ہوگا کہ اب خسارۂ ابدی میں پڑنے والے ہیں اس وقت اپنے بچاؤ
کے واسطے گمراہ کرنے والوں کے ذمہ الزام رکھیں گے کہ ہمارا قصور نہیں ہمیں تو دوسروں نے گمراہ کیا ہے
اور چونکہ ان گمراہ کرنے والوں میں شیاطین بھی داخل ہیں، اس لئے فرمایا کہ) وہ شیطان جو اس کے ساتھ رہتا
تھا کہے گا کہ اے ہمارے پروردگار میں نے اس کو (جبراً) گمراہ نہیں کیا تھا جیسا کہ اس کے الزام رکھنے سے
مفہوم ہوتا ہے کہ اس کے اپنے اختیار کو بالکل دخل نہ ہو لیکن (بات یہ ہے کہ) یہ خود ہی دور دراز کی گمراہی
میں (باختیار خود) تھا (گو اغوا میں نے بھی کیا جس میں کوئی جبر نہ تھا، اس لئے اس کی گمراہی کا اثر مجھ پر
نہ ہونا چاہئے) ارشاد ہوگا کہ میرے سامنے جھگڑے کی باتیں مت کرو (کہ بے سود ہیں) اور میں تو پہلے ہی
تمہارے پاس وعید بھیج چکا تھا (کہ جو کفر کرے گا از خود یا کسی کے اغواء سے اور جو کفر کا حکم کرے گا خواہ اپنی
مرضی سے یا کسی کے جبر سے سب کو جہنم کی سزا علیٰ تفاوت المراتب دوں گا سو) میرے ہاں (وہ) بات
(وعید مذکور کی) نہیں بدلی جاوے گی (بلکہ تم سب دوزخ میں جھونکے جاؤ گے) اور میں (اس تجویز میں)
بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں (بلکہ بندوں نے خود ایسے ناشائستہ کام کئے جس کی سزا آج بھگت
رہے ہیں)۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں منکرین حشر و نشر اور مُردوں کے زندہ ہونے کو بعید از عقل و قیاس

کہنے والوں کے شبہات کا ازالہ... اس طرح کیا تھا کہ تم نے حق تعالیٰ کے علم کو اپنے علم و بصیرت پر قیاس کر رکھا ہے اس لئے یہ اشکال ہے کہ مُردے کے اجزاء مٹی ہو کر دنیا میں بکھرنے کے بعد ان کو کس طرح جمع کیا جا سکتا ہے، مگر حق تعالیٰ نے بتلایا کہ کائنات کا ذرہ ذرہ ہمارے علم میں ہے، ہمارے لئے ان سب کو جب چاہیں جمع کر دینا کیا مشکل ہے، آیات مذکورہ میں بھی علم الٰہی کی وسعت اور ہمہ گیری کا بیان ہے، کہ انسان کے اجزائے منتشرہ کا علم ہونے سے بھی زیادہ بڑی بات تو یہ ہے کہ ہم ہر انسان کے دل میں آنے والے خیالات کو بھی ہر وقت ہر حال میں جانتے ہیں، اور اس کی وجہ دوسری آیت میں یہ بیان فرمائی کہ ہم انسان سے اتنے قریب ہیں کہ اس کی رگِ گردن جس پر اس کی زندگی کا مدار ہے وہ بھی اتنی قریب نہیں، اس لئے ہم اس کے حالات کو خود اس سے بھی زیادہ جانتے ہیں،

اللہ تعالیٰ انسان سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں اس کی تحقیق

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ کا جمہور مفسرین نے یہی مطلب قرار دیا ہے، کہ قرب سے مراد قرب علمی اور احاطۂ علمی ہے قربِ مسافت مراد نہیں، لفظ وَرِید عربی زبان میں ہر جاندار کی وہ رگیں ہیں جن سے خون کا سیلان تمام بدن میں ہوتا ہے، طبی اصطلاح میں یہ دو قسم کی رگیں ہیں، ایک وہ جو جگر سے نکلتی ہیں اور خالص خون سارے بدنِ انسانی میں پہونچاتی ہیں، طبی اصطلاح میں صرف انہی رگوں کو وَرِید اور جمع کو اَوْرِدَہ کہا جاتا ہے، دوسری قسم وہ رگیں جو حیوان کے قلب سے نکلتی ہیں اور خون کی وہ لطیف بھاپ جس کو طبی اصطلاح میں رُوح کہا جاتا ہے، وہ اسی طرح تمام بدنِ انسانی میں... پھیلاتی اور پہونچاتی ہیں ان کو شریان اور شرائین کہا جاتا ہے، پہلی قسم کی رگیں موٹی اور دوسری باریک ہوتی ہیں،

آیتِ مذکورہ میں یہ ضروری نہیں کہ ورید کا لفظ طبی اصطلاح کے مطابق اس رگ کے لئے لیا جائے جو جگر سے نکلتی ہے، بلکہ قلب سے نکلنے والی رگ کو بھی لغت کے اعتبار سے ورید کہا جا سکتا ہے، کیونکہ اس میں بھی ایک قسم کا خون ہی دوران کرتا ہے، اور اس جگہ چونکہ مقصود آیت کا انسان کے قلبی خیالات اور احوال سے مطلع ہونا ہے، اس لئے وہ زیادہ انسب ہے، اور بہرحال خواہ ورید باصطلاحِ طب جگر سے نکلنے والی رگ کے معنی میں ہو یا قلب سے نکلنے والی شریان کے معنی میں، بہر دو صورت جاندار کی زندگی اُن پر موقوف ہے، یہ رگیں کاٹ دی جائیں تو جاندار کی رُوح نکل جاتی ہے، تو خلاصہ یہ ہوا کہ جس چیز پر انسان کی زندگی موقوف ہے ہم اس چیز سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں یعنی اس کی ہر چیز کا علم رکھتے ہیں،

اور صوفیائے کرام کے نزدیک قرب سے مراد اس جگہ صرف قربِ علمی اور احاطۂ علمی ہی نہیں بلکہ ایک خاص قسم کا اتصال ہے، جس کی حقیقت اور کیفیت تو کسی کو معلوم نہیں ہو سکتی، مگر یہ قرب و اتصال بلاکیف موجود ضرور ہے، قرآن کریم کی متعدد آیات اور احادیث صحیحہ اس پر شاہد ہیں، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ، یعنی سجدہ کرو اور ہمارے قریب ہو جاؤ"۔ اور ہجرت کے واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے حضرت ابوبکر صدیق رضؓ سے فرمایا اَللّٰہُ مَعَنَا "یعنی اللہ ہمارے ساتھ ہے"، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا اِنَّ مَعِیَ رَبِّی "یعنی میرا رب میرے ساتھ ہے"، اور حدیث میں ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی طرف سب سے زیادہ قریب اُس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ سجدہ میں ہو، اسی طرح حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "میرا بندہ میرے ساتھ نفلی عبادات کے ساتھ تقرب حاصل کرتا رہتا ہے"،

یہ قرب و تقرب جو عبادات کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے اور انسان کے اپنے کسب و عمل کا نتیجہ ہوتا ہے یہ صرف مؤمن کے لئے مخصوص ہے، اور ایسے مؤمنین اولیاء اللہ کہلاتے ہیں جن کو حق تعالیٰ کے ساتھ یہ تقرب حاصل ہو یہ اتصال و قرب اس قرب کے علاوہ ہے جو حق تعالیٰ کو ہر انسان مؤمن و کافر کی جان کے ساتھ یکساں ہے، غرض مذکورہ آیات و روایات اس پر شاہد ہیں کہ انسان کو اپنے خالق و مالک کے ساتھ ایک خاص قسم کا اتصال حاصل ہے گو ہم اس کی حقیقت اور کیفیت کا ادراک نہ کرسکیں، مولانا رومی نے اسی کو فرمایا ہے ؎

اتصالے بے مثال و بے قیاس ٭ ہست ربّ النّاس را با جانِ ناس

یہ قرب و اتصال آنکھ سے نہیں دیکھا جاسکتا بلکہ فراستِ ایمانی سے معلوم کیا جاسکتا ہے،

تفسیر مظہری میں اسی قرب و اتصال کو اس آیت کا مفہوم قرار دیا ہے، اور جمہور مفسرین کا قول پہلے معلوم ہوچکا ہے کہ اتصال سے مراد اتصالِ علمی اور احاطۂ علمی ہے، اور ابن کثیر نے ان دونوں معنی سے الگ ایک تیسری تفسیر یہ اختیار کی ہے کہ آیت میں لفظ نَحْنُ سے خود حق تعالیٰ کی ذات مراد نہیں، بلکہ اس کے فرشتے مراد ہیں، جو انسان کے ساتھ ہر وقت رہتے ہیں، وہ انسان کی جان سے اتنے باخبر ہوتے ہیں کہ خود انسان بھی اپنی جان سے اتنا باخبر نہیں ہوتا، واللہ اعلم،

ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے

اِذْ یَتَلَقَّی الْمُتَلَقِّیٰنِ، تَلَقِّی کے لغوی معنی اخذ کرنے، لے لینے اور حاصل کرلینے کے آتے ہیں، فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ "یعنی لے لئے اور حاصل کرلئے آدمؑ نے اپنے رب سے چند کلمات"، اس آیت میں مُتَلَقِّیَان سے مراد وہ دو فرشتے ہیں جو ہر انسان کے ساتھ اس کے اعمال لکھنے کے لئے ہر وقت اس کے ساتھ رہتے ہیں، اور اس کے اعمال کو اپنے صحیفوں میں لکھتے رہتے ہیں، عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ "یعنی ان میں ایک اس کے داہنی طرف رہتا ہے (جو اس کے اعمالِ صالحہ کو لکھتا ہے) دوسرا اس کے بائیں جانب (جو اس کی سیئات کو لکھتا ہے) قَعِيْدٌ بمعنی القاعد ہے مفرد و جمع دونوں کے لئے لفظ قعید استعمال ہوتا ہے، اگرچہ قعید بمعنی قاعد ہے، جیسے جلیس بمعنی جالس، مگر ایک فرق یہ ہے کہ قاعد اور جالس تو صرف بیٹھنے کی حالت میں بولا جاتا ہے، اور قعید و جلیس عام ہے جو کسی کے ساتھ ہو خواہ بیٹھے ہوئے یا کھڑے ہوئے یا چلتے پھرتے ہوئے ان کو قعید و جلیس کہیں گے، ان دونوں فرشتوں کا یہی حال ہے کہ وہ ہر وقت ہر حال میں انسان کے ساتھ رہتے ہیں، وہ بیٹھا ہو یا کھڑا، چلتا پھرتا ہو یا سو رہا ہو، صرف ایسی حالت میں جب کہ یہ پیشاب، پاخانہ یا جماع کی ضرورت سے ستر کھولے ہوتا ہے تو یہ فرشتے ہٹ جاتے ہیں، مگر

اللہ نے ان کو اس کا ملکہ دیدیا ہے کہ اس حالت میں بھی وہ کوئی گناہ کریں تو ان کو معلوم ہو جاتا ہے،

ابن کثیر نے احنف بن قیس کی روایت سے لکھا ہے کہ ان دو فرشتوں میں سے صاحب یمین نیک اعمال لکھتا ہے اور وہ صاحبِ شمال یعنی بائیں جانب کے فرشتے کا بھی نگران و امین ہے، اگر انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو صاحبِ یمین صاحبِ شمال سے کہتا ہے کہ ابھی اس کو اپنے صحیفہ میں نہ لکھو اس کو مہلت دو اگر توبہ کرلی تو رہنے دو ورنہ پھر اعمالنامہ میں درج کرو (رواہ ابن ابی حاتم)

اعمالنامہ لکھنے والے فرشتے

حضرت حسن بصریؒ نے آیت مذکورہ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ تلاوت فرما کر کہا:۔

"اے ابن آدم! تیرے لئے نامۂ اعمال بچھا دیا گیا ہے، اور تجھ پر دو معزز فرشتے مقرر کر دیئے گئے ہیں، ایک تیری داہنی جانب دوسرا بائیں جانب، داہنی جانب والا تیری حسنات کو لکھتا ہے اور بائیں جانب والا تیری سیئات اور گناہوں کو، اب اس حقیقت کو سامنے رکھ کر جو تیرا جی چاہے عمل کر اور کم کر یا زیادہ، یہاں تک کہ جب تو مرے گا تو یہ صحیفہ یعنی نامۂ اعمال لپیٹ دیا جائے گا، اور تیری گردن میں ڈال دیا جائے گا، جو تیرے ساتھ قبر میں جائے گا، اور رہے گا، یہاں تک کہ جب تو قیامت کے روز قبر سے نکلے گا تو اس وقت حق تعالیٰ فرمائے گا وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۝ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا یعنی ہم نے ہر انسان کا اعمالنامہ اس کی گردن میں لگا دیا ہے اور قیامت کے روز وہ اس کو کھلا ہوا پائے گا، اب اپنا اعمالنامہ خود پڑھ لے تو خود ہی اپنا حساب لگانے کے لئے کافی ہے"،

پھر حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ خدا کی قسم! اس ذات نے بڑا عدل و انصاف کیا، جس نے خود تجھ کو ہی تیرے اعمال کا محاسب بنا دیا، (ابن کثیر) یہ ظاہر ہے کہ اعمالنامہ کوئی دنیوی کاغذ تو ہے نہیں جس کے قبر میں ساتھ جانے اور قیامت تک باقی رہنے پر اشکال ہو ایک معنوی چیز ہے جس کی حقیقت حق تعالیٰ ہی جانتے ہیں، اس لئے اس کا ہر انسان کے گلے کا ہار بننا اور قیامت تک باقی رہنا کوئی تعجب کی چیز نہیں،

انسان کا ہر قول ریکارڈ کیا جاتا ہے

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ (یعنی انسان کوئی کلمہ زبان سے نہیں نکالتا جس کو یہ نگراں فرشتہ محفوظ نہ کرلیتا ہو، حضرت حسن بصریؒ اور قتادہؒ نے فرمایا کہ یہ فرشتے اس کا ایک ایک لفظ لکھتے ہیں، خواہ اس میں کوئی گناہ یا ثواب ہو یا نہ ہو، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ صرف وہ کلمات لکھے جاتے ہیں جن پر کوئی ثواب یا عتاب ہو، ابن کثیرؒ نے یہ دونوں قول نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ آیتِ قرآن کے عموم سے پہلی ہی بات کی ترجیح معلوم ہوتی ہے، کہ ہر ہر لفظ لکھا جاتا ہے، پھر علی بن ابی طلحہؒ کی ایک روایت ابن عباسؓ ہی سے ایسی نقل فرمائی جس میں یہ دونوں قول جمع ہو جاتے ہیں

اس روایت میں یہ ہے کہ پہلے تو ہر کلمہ لکھا جاتا ہے، خواہ گناہ و ثواب اس میں ہو یا نہ ہو، مگر ہفتہ میں جمعرات کے روز اس پر فرشتے نظر ثانی کر کے صرف وہ رکھ لیتے ہیں جن میں ثواب یا عتاب ہو یعنی خیر یا شر ہو، باقی کو نظر انداز کر دیتے ہیں، قرآن کریم میں یَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ کے مفہوم میں یہ محو و اثبات بھی داخل ہے۔

امام احمدؒ نے حضرت بلال بن حارث مزنیؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :-

"انسان بعض اوقات کوئی کلمہ خیر بولتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے، مگر یہ اس کو معمولی بات سمجھ کر بولتا ہے، اس کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ اس کا ثواب کہاں تک پہونچا، کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے اپنی رضائے دائمی قیامت تک کی لکھ دیتے ہیں، اسی طرح انسان کوئی کلمہ اللہ کی ناراضی کا (معمولی سمجھ کر) زبان سے نکال دیتا ہے اس کو گمان نہیں ہوتا کہ اس کا گناہ و وبال کہاں تک پہونچے گا، اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس شخص سے اپنی دائمی ناراضی قیامت تک کے لئے لکھدیتے ہیں (از ابن کثیر)

حضرت علقمہؒ حضرت بلال بن حارث کی یہ حدیث نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس حدیث نے مجھے بہت سی باتیں زبان سے نکالنے کو روک دیا ہے (ابن کثیر)

سکرات الموت وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ، سکرۃ الموت کے معنی موت کی شدت اور غشی جو موت کے وقت پیش آتی ہے، ابوبکر بن الانباریؒ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت مسروق سے روایت کی ہے کہ جب حضرت صدیق اکبرؓ پر موت کے آثار شروع ہوتے تو صدیقہ عائشہؓ کو بلایا، وہ پہونچیں تو یہ حالت دیکھ کر بلساختہ ایک شعر زبان سے نکلا ؎

اِذَا حَشْرَجَتْ يَوْمًا وَضَاقَ بِهَا الصَّدْرُ

"یعنی جب روح ایک دن مضطرب ہوگی اور سینہ اس سے تنگ ہو جائیگا"

حضرت صدیق اکبرؓ نے سُنا تو فرمایا کہ تم نے فضول یہ شعر پڑھا، یوں کیوں نہ کہا (جَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ حالت پیش آئی تو آپ ... پانی میں ہاتھ ڈالکر چہرہ مبارک پر ملتے اور فرماتے تھے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اِنَّ لِلْمَوْتِ سَكَرَاتٍ، یعنی کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے فرمایا کہ موت کی بڑی شدتیں ہوتی ہیں۔

بِالْحَقِّ، اس میں حرف باء تعدیہ کے لئے ہے، معنی یہ ہیں کہ لے آئی شدتِ موت امر حق کو یعنی موت کی شدت نے وہ چیزیں سامنے کر دیں جو حق و ثابت ہیں، اور کسی کو ان سے فرار کی گنجائش نہیں (مظہری)

ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ، تحید، حید سے مشتق ہے، جس کے معنی مائل ہونے، جگہ سے ہٹ جانے

اور اقرار کرنے کے ہیں، معنی آیت کے یہ ہیں کہ موت وہ چیز ہے جس سے تو بدکتا اور بھاگتا تھا،
ظاہر یہ ہے کہ یہ خطاب عام انسان کو ہے، موت سے بدکنا اور بھاگنا طبعی طور پر پوری نوعِ انسانی میں پایا جاتا ہے، ہر شخص زندگی کو مرغوب اور موت کو آفت و مصیبت سمجھ کر اس سے بچنے کی تدبیریں کرتا ہے، جو شرعاً کوئی گناہ بھی نہیں، لیکن آیت میں بتلانا یہ منظور ہے کہ انسان کی یہ طبعی اور فطری خواہش مکمل طور پر ہرگز پوری نہیں ہو سکتی، ایک ایک دن تو بہرحال موت آنا ہی ہے، خواہ تم اس سے کتنا ہی بھاگنا چاہو،

انسان کو میدانِ حشر میں لانے والے دو فرشتے

وَجَآءَتۡ كُلُّ نَفۡسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيۡدٌ، اس آیت سے اوپر قیامت قائم ہونے کا ذکر ہے، اس آیت میں میدانِ حشر میں تمام انسانوں کے حاضر ہونے کی ایک خاص کیفیت بیان کی گئی ہے کہ ہر انسان کے ساتھ ایک سائق ہوگا، سائق کہتے ہیں اس شخص کو جو جانوروں کے یا کسی جماعت کے پیچھے رہ کر اس کو کسی خاص جگہ پر پہونچانا چاہتا ہے، اور شہید کے معنی گواہ کے ہیں، سائق کا فرشتہ ہونا تو باتفاق روایات سے ثابت ہے، شہید کے بارے میں علماء تفسیر کے اقوال مختلف ہیں بعض کے نزدیک وہ بھی ایک فرشتہ ہی ہوگا، اس طرح سائق اور شہید دو فرشتے ہوگئے، ایک کا کام اس کو میدانِ حشر میں پہونچانا ہے، دوسرے کا کام یہ ہے کہ جب اس کے اعمال پیش ہوں تو وہ اُس پر گواہی دیں یہ دو فرشتے وہ بھی ہو سکتے ہیں جو انسان کے داہنے اور بائیں اعمال کی کتابت کے لئے ہر وقت دنیا میں ساتھ رہتے ہیں، یعنی کرام کاتبین، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے علاوہ اور دو ہوں۔

اور شہید کے متعلق بعض حضرات نے فرمایا کہ وہ انسان کا عمل ہوگا، اور بعض نے خود اسی انسان کو شہید فرمایا، ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ ظاہر آیت سے یہی ہے کہ وہ بھی ایک فرشتہ ہی ہوگا جو اس کے اعمال پر شہادت دے گا، حضرت عثمان غنیؓ نے خطبہ میں یہ آیت تلاوت فرما کر یہی تفسیر فرمائی ہے، اور حضرت مجاہد، قتادہ، ابن زید مفسرین سے بھی یہی منقول ہے، ابن جریر نے اسی کو ترجیح دی ہے۔

مرنے کے بعد آنکھیں وہ سب کچھ دیکھیں گی جو زندگی میں نہ دیکھ سکتی تھیں

فَكَشَفۡنَا عَنۡكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الۡيَوۡمَ حَدِيۡدٌ (یعنی ہم نے تمہاری آنکھوں سے پردہ ہٹا دیا آج تمھاری نگاہ بڑی تیز ہے) اس کا مخاطب کون ہے، اس میں بھی مفسرین کے اقوال مختلف ہیں، مگر راجح یہی ہے کہ عام انسان مخاطب ہیں، جن میں مومن، کافر، متقی، فاسق، سب داخل ہیں، اسی تفسیر کو ابن جریرؒ ابن کثیر وغیرہ نے اختیار فرمایا ہے، اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ دنیا کی مثال خواب کی سی زندگی کی ہے، اور آخرت کی مثال بیداری کی، جیسے خواب میں آدمی کی آنکھیں بند ہوتی ہیں کچھ نہیں دیکھتا اسی طرح انسان اُن حقائق کو جن کا تعلق عالمِ آخرت سے ہے دنیا میں آنکھوں سے نہیں دیکھتا، مگر یہ ظاہری آنکھیں بند ہوتے ہی وہ خواب کا عالم ختم ہو کر بیداری کا عالم آتا ہے، جس میں وہ سارے حقائق سامنے آجاتے ہیں اسی لئے بعض علماء نے فرمایا اَلنَّاسُ نِيَامٌ فَاِذَا مَاتُوۡا انۡتَبَهُوۡا (یعنی آج کی دنیا کی زندگی میں سب انسان سو رہے ہیں جب مرینگے اُس وقت جاگیں گے)

قَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ، یہاں قرین سے مراد وہ فرشتہ ہے جو انسان کے ساتھ اس کے اعمال لکھنے کے لئے رہتا تھا، اور پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ کاتبِ اعمال دو فرشتے ہوتے ہیں، مگر قیامت میں انسان کی حاضری کے وقت ایک کو سائق دوسرے کو شہید اس سے پہلی آیت میں فرمایا ہے، اس لئے نسق کلام سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ کاتبِ اعمال دو فرشتوں کو میدانِ حشر میں اس کی حاضری کے وقت دو کام سپرد کر دیئے گئے ہیں، ایک کے ذمہ اس کے پیچھے رہ کر اس کو میدانِ حشر میں پہونچانا لگایا گیا جس کو آیت میں سائق کا نام دیا گیا ہے دوسرے کے سپرد اس کے نامۂ اعمال کر دیتے گئے، جس کو شہید کے نام سے تعبیر کیا گیا، تو میدانِ حشر میں پہونچنے کے بعد نامۂ اعمال والا فرشتہ یعنی شہید یہ عرض کرے گا هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ یعنی اس کے اعمال میرے پاس لکھے ہوئے موجود ہیں، اور ابن جریر نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ یہاں لفظ "قرین" سائق اور شہید دونوں کو شامل ہے،

اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ، لفظ اَلْقِيَا تثنیہ کا صیغہ ہے جو دو شخصوں کے لئے بولا جاتا ہے، اس آیت میں جن دو فرشتوں کو خطاب ہے وہ کون ہیں، ظاہر یہ ہے کہ یہی دو فرشتے جن کو پہلے سائق اور شہید کہا گیا ہے اس کے مخاطب ہیں، بعض حضرات مفسرین نے دوسری توجیہات بھی لکھی ہیں، (از ابن کثیر)

قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ ، لفظ قرین کے اصلی معنی پاس رہنے والے اور ملے ہوئے کے ہیں، اس معنی کے اعتبار سے پچھلی آیت میں قرین سے مراد وہ فرشتہ یا فرشتے لئے گئے ہیں جو انسان کے اعمال لکھتے ہیں اور انسان کے ساتھ جیسے دو فرشتے قرین بنائے گئے ہیں اسی طرح ایک شیطان بھی ہر انسان کا قرین رہتا ہے، جو اس کو گمراہی اور گناہوں کی طرف بلاتا ہے، اس آیت میں قرین سے یہی شیطان مراد ہے، جب اس شخص کو جہنم میں ڈالنے کا حکم ہو جائے گا تو یہ شیطان اس سے اپنی براءت کا اظہار کرے گا کہ اس کو میں نے گمراہ نہیں کیا، بلکہ یہ خود ہی گمراہ تھا کہ گمراہی کی بات کو قبول کرتا اور نیک بات پر کان نہ دھرتا تھا ظاہر کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہنم میں جانے والا اُس وقت یہ عذر کرے گا کہ مجھے تو اس شیطان نے بہکایا تھا، ورنہ میں نیک کام کرتا، اس کے جواب میں شیطان اپنی براءت ظاہر کرے گا، ان دونوں کے جھگڑے کے جواب میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہوگا:

لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ "یعنی میرے سامنے جھگڑا نہ کرو، میں تو پہلے ہی انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ تمہارے فضول عذر کا جواب دے چکا ہوں اور آسمانی کتابوں کے ذریعہ دلائل واضح کر چکا ہوں، یہ فضول عذر تراشی اور جھگڑا آج نہ چلے گا"،

مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ "میرے پاس قول بدلا نہیں کرتا جو فیصلہ کر دیا ہے وہ نافذ ہوگا، اور ہم نے کوئی کسی پر ظلم نہیں کیا، عین انصاف کا فیصلہ ہے"،

يَوْمَ نَقُولُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُولُ هَلْ مِنْ مَّزِيدٍ ﴿٣٠﴾ وَأُزْلِفَتِ

جس دن ہم کہیں دوزخ کو تو بھر بھی چکی اور وہ بولے کچھ اور بھی ہے ، اور نزدیک لائی جائے

الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ غَيْرَ بَعِيدٍ ﴿٣١﴾ هَٰذَا مَا تُوعَدُونَ لِكُلِّ أَوَّابٍ حَفِيظٍ ﴿٣٢﴾

بہشت ڈرنیوالوں کے واسطے دور نہیں ، یہ ہے جس کا وعدہ ہوا تھا تم سے ہر ایک رجوع رہنے والے یاد رکھنے والے کیواسطے،

مَنْ خَشِيَ الرَّحْمَٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُّنِيبٍ ﴿٣٣﴾ ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ

جو ڈرا رحمٰن سے بن دیکھے اور لایا دل رجوع ہونے والا ، چلے جاؤ اس میں سلامت

ذَٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُودِ ﴿٣٤﴾ لَهُم مَّا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ ﴿٣٥﴾

یہ دن ہے ہمیشہ رہنے کا ، ان کے واسطے ہے وہاں جو چاہیں اور ہمارے پاس ہے کچھ زیادہ بھی ،

خُلاصۂ تفسیر

(یہاں سے محشر کے بقیہ واقعات کا بیان ہے کہ وہ دن لوگوں کو یاد دلایئے) جس دن کہ ہم دوزخ سے (کفار کو اس میں داخل کرنے کے بعد) کہیں گے کہ تو بھر بھی گئی اور وہ کہے گی کہ کچھ اور بھی ہے (یہ پوچھنا شاید کفار کو اور زیادہ ڈرانے کے لئے ہو کہ جواب سُن کر ان کے دل میں دوزخ کی اور بھی زیادہ ہول پیدا ہو جاوے کہ ہم کیسے غضب کے ٹھکانے پر پہونچے ہیں جو سب کو کھا جانا چاہتا ہے، اور جہنّم کی طرف سے هَلْ مِنْ مَّزِيدٍ کا جواب بھی غالباً اسی غیظ و غضب کا مظاہرہ ہے جو جہنّم کو خدا کے دشمن کفار کے ساتھ ہے جس کا ذکر سورۂ مُلک میں ان الفاظ سے آیا ہے وَهِيَ تَفُورُ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ، جہنّم نے جواب میں یہ نہیں کہا کہ میرا پیٹ نہیں بھرا بلکہ مزید کی فرمائش بوجہ غیظ و غضب کے کی، اس لئے قرآن میں دوسری جگہ جو حق تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ (یعنی میں بھر دوں گا جہنم کو جنات اور انسانوں سے) یہ اس کے منافی نہیں، اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدۂ سابقہ لَأَمْلَأَنَّ کے لئے جنات اور انسانوں کو جہنّم میں ڈالتے جاویں گے اور وہ یہی کہتا رہے گا کہ کچھ اور بھی ہے (ابن کثیر) اور (جنت کا بیان یہ ہے کہ وہ) جنّت متقیوں کے قریب کر دی جاوے گی کہ کچھ دور نہ رہے گی (اور متقیوں سے کہا جاوے گا کہ) یہ وہ چیز ہے جس کا تم سے (بایں عنوان) وعدہ کیا جاتا تھا کہ وہ ہر ایسے شخص کے لئے ہے جو (خدا کی طرف دل سے) رجوع ہونے والا (اور رجوع ہو کر اعمال و طاعات کی) پابندی کرنیوالا ہو (غرض یہ کہ) جو خدا سے بے دیکھے ڈرتا ہوگا اور (اللہ کے پاس) رجوع ہونے والا دل لے کر آوے گا (ان کو حکم ہوگا کہ) اس جنّت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ، یہ دن ہے ہمیشہ رہنے (کے لئے حکم ہونے) کا اُن کو بہشت

ہیں سب کچھ ملے گا جو جو چاہیں گے اور ہمارے پاس (ان کی چاہی ہوئی چیزوں سے) اور بھی زیادہ (نعمت) ہے (کہ وہاں تک جنتی کا ذہن بھی نہ پہونچے گا جیسا کہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنّت کی نعمتوں کے متعلق فرمایا کہ وہ ایسی ہیں جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا، اور نہ کسی بشر کے دل میں اس کا خیال آیا، ان نعمتوں میں سے ایک نعمت حق تعالیٰ کا دیدار ہے۔

معارف و مسائل

اوّاب کون لوگ ہیں؟ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ یعنی جنّت کا وعدہ ہر اُس شخص کے لئے ہے جو اوّاب اور حفیظ ہو، اوّاب کے معنی رجوع ہونے والے کے ہیں، مراد وہ شخص ہے جو معاصی سے اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہو،

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور شعبیؒ اور مجاہدؒ نے فرمایا کہ اوّاب وہ شخص ہے جو خلوت میں اپنے گناہوں کو یاد کرے اور ان سے استغفار کرے، اور حضرت عبید بن عمیرؓ نے فرمایا کہ اوّاب وہ شخص ہے جو اپنی ہر مجلس اور ہر نشست میں اللہ سے اپنے گناہوں کی مغفرت مانگے، اور فرمایا کہ ہمیں یہ بتلایا گیا ہے کہ اوّاب اور حفیظ وہ شخص ہے جو اپنی ہر مجلس سے اُٹھنے کے وقت یہ دعا پڑھے: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْٓ اَسْتَغْفِرُكَ مِمَّآ اَصَبْتُ فِيْ مَجْلِسِيْ هٰذَا (پاک ہے اللہ اور اسی کی حمد ہے، یا اللہ میں مغفرت مانگتا ہوں اُس بُرائی سے جو میں نے اس مجلس میں کی ہو)۔

اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اپنی مجلس سے اُٹھنے کے وقت یہ دعا پڑھے اللہ تعالیٰ اس کے وہ سب گناہ معاف فرمادیں گے جو اس مجلس میں سرزد ہوئے، دعا یہ ہے:- سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ (یعنی یا اللہ تو پاک ہے اور تیری حمد و ثنا، ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں، میں تجھ سے مغفرت مانگتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں)

اور حَفِيْظٍ کے معنی حضرت ابن عباسؓ نے یہ بتلائے کہ جو شخص اپنے گناہوں کو یاد رکھے تاکہ ان سے رجوع کر کے تلافی کرے، اور ان سے ایک روایت میں حفیظ کے معنی هُوَ الْحَافِظُ لِاَمْرِ اللّٰهِ کے بھی منقول ہیں، یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کے احکام کو یاد رکھے، اور حضرت ابوہریرہؓ کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص شروع دن میں چار رکعتیں (اشراق کی) پڑھ لے وہ اوّاب اور حفیظ ہے (قرطبی)

وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ، ابوبکر وراقؒ فرماتے ہیں کہ منیب کی علامت یہ ہے کہ وہ حق تعالیٰ جلّ شانہٗ کے ادب کو ہر وقت مستحضر رکھے، اور اس کے سامنے تواضع اور عاجزی سے رہے، اور اپنے نفس کی خواہشات کو چھوڑ دے۔

لَهُم مَّا يَشَآءُونَ فِيهَا، (یعنی اہلِ جنت کو جنت میں ہر وہ چیز ملے گی جس کی وہ خواہش کریں گے) یعنی اہلِ جنت جس چیز کی خواہش کریں گے وہ فوراً حاضر تیار ملے گی، دیر و انتظار کی زحمت نہ ہوگی، مسند احمد میں حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں اگر کسی شخص کو اولاد کی خواہش ہوگی تو حمل اور وضعِ حمل، پھر بچے کا بڑھنا یہ سب ایک ساعت میں ہو جائے گا (ابن کثیر)

وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ، یعنی ہمارے پاس ایسی نعمتیں بھی ہیں جن کی طرف انسان کا وہم و خیال بھی نہیں جا سکتا اس لئے وہ اُن کی خواہش بھی نہیں کرسکتا، حضرت انسؓ اور جابرؓ نے فرمایا کہ یہ مزید نعمت حق تعالیٰ کی زیارت بلاکیف ہے جو اہلِ جنت کو حاصل ہوگی، اس مضمون کی احادیث خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی آیت لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ کی تفسیر میں روایت کی گئی ہیں، اور بعض روایات میں ہے کہ اہلِ جنت کو زیارتِ حق سبحانہٗ وتعالیٰ جمعہ کے روز ہوا کرے گی۔ (قرطبی)

وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّن قَرْنٍ هُمْ أَشَدُّ مِنْهُم بَطْشًا فَنَقَّبُوا فِي الْبِلَادِ ط

اور کتنی تباہ کر چکے ہم ان سے پہلے جماعتیں کہ اُن کی قوت زبردست تھی اُن سے پھر لگے کُریدنے شہروں میں،

هَلْ مِن مَّحِيصٍ ﴿٣٦﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى

کہیں ہے بھاگ جانے کو ٹھکانا، اس میں سوچنے کی جگہ ہے اس کو جس کے اندر دل ہے یا لگائے

السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ ﴿٣٧﴾ وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا

کان دل لگا کر، اور ہم نے بنائے آسمان اور زمین اور جو کچھ اُن کے بیچ میں ہے

فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ۖ وَمَا مَسَّنَا مِن لُّغُوبٍ ﴿٣٨﴾ فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَ

چھ دن میں، اور ہم کو نہ ہوا کچھ تکان، سو تو سہتا رہ جو کچھ وہ کہتے ہیں اور

سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ ﴿٣٩﴾ وَمِنَ

پاکی بولتا رہ خوبیاں اپنے رب کی پہلے سورج کے نکلنے سے اور پہلے ڈوبنے سے، اور کچھ

اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ السُّجُودِ ﴿٤٠﴾

رات میں بول اس کی پاکی اور پیچھے سجدہ کے،

خُلاصۂ تفسیر

اور ہم ان (اہلِ مکہ) سے پہلے بہت سی اُمتوں کو (ان کے کفر کی شامت سے) ہلاک کر چکے ہیں،

جو قوت میں ان سے (کہیں) زیادہ تھے اور (دنیا کا سامان بڑھانے کے لئے) تمام شہروں کو چھانتے پھرتے تھے (یعنی قوت کے ساتھ اسباب معیشت میں بھی بڑی ترقی کی تھی، لیکن جب ہمارا عذاب نازل ہوا تو ان کو) کہیں بھاگنے کی جگہ بھی نہ ملی (یعنی کسی طرح بچ نہ سکے) اس (واقعۂ اہلاک) میں اس شخص کیلئے بڑی عبرت ہے جس کے پاس (فہیم) دل ہو یا (اگر فہیم نہ ہو تو کم از کم یہی ہو کہ) وہ (دل سے) متوجہ ہو کر (بات کی طرف) کان ہی لگا دیتا ہو (اور سننے کے بعد اجمالاً حقانیت کا معتقد ہو کر اس بات کو قبول کر لیتا ہو) اور (اگر قیامت کا انکار اس بنا پر ہے کہ تم اللہ کی قدرت کو اس سے قاصر سمجھتے ہو تو وہ اس لئے باطل ہے کہ ہماری قدرت ایسی ہے کہ) ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اس سب کو چھ دن (کی مقدار کے موافق زمانہ) میں پیدا کیا اور ہم کو تکان نے چھوا تک نہیں (پھر آدمی کا دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے، وھذا کقولہ تعالیٰ فی الاحقاف اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓي اَنْ يُّحْيِيَ الْمَوْتٰى، اور باوجود ان قاطع شبہات جوابوں کے یہ لوگ پھر انکار ہی پر اڑے ہیں) سو ان کی باتوں پر صبر کیجئے (یعنی رنج نہ کیجئے) اور (چونکہ بدون اس کے کہ کسی طرف دل کو مشغول کیا جاوے وہ غم کی بات دل سے نہیں نکلتی، اور بار بار یاد آ کر دل کو محزون کرتی ہے، اس لئے ارشاد فرماتے ہیں کہ) اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے رہئے (اس میں نماز بھی داخل ہے) آفتاب نکلنے سے پہلے (مثلاً صبح کی نماز) اور (اس کے) چھپنے سے پہلے (مثلاً ظہر و عصر) اور رات میں بھی اس کی تسبیح (و تحمید) کیا کیجئے (اس میں مغرب اور عشاء آ گئیں) اور (فرض) نمازوں کے بعد بھی (اس میں نوافل و اوراد آ گئے، حاصل یہ ہوا کہ ذکر اللہ میں اور اس کی فکر میں لگے رہئے تاکہ ان کے اقوالِ کفریہ کی طرف دھیان ہی نہ ہو)۔

معارف و مسائل

نَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ ۭ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ، نقبوا، تنقیب سے مشتق ہے، اس کے اصلی معنی سوراخ کرنے اور پھاڑنے کے ہیں، محاورات میں زمین میں دور دراز ملکوں تک پھرنے چلنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے (ذکرہ فی القاموس)

اور محیص کے معنی جائے پناہ کے ہیں، معنی آیت کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تم سے پہلے کتنی قوموں اور جماعتوں کو ہلاک کر دیا ہے جو قوت و طاقت میں تم سے کہیں زیادہ تھیں، اور جو مختلف ملکوں اور خطوں میں تجارت وغیرہ کے لئے پھرتی رہیں، مگر دیکھو کہ انجام کار ان کو موت آئی اور ہلاک ہوئیں، کوئی خطۂ زمین یا مکان ان کو موت سے پناہ نہ دے سکا،

حصولِ علم کے دو طریقے | لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہاں قلب سے مراد عقل ہے

چونکہ عقل کا مرکز قلب ہی ہے اس لئے اس کو قلب سے تعبیر کر دیا گیا، بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہاں قلب سے مراد حیات ہے، وہ بھی اسی لئے کہ حیات کا مدار قلب ہے، معنی آیت کے یہ ہوئے کہ اس سورت قرآن میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے نصیحت وعبرت کا فائدہ اسی شخص کو پہونچ سکتا ہے جس میں عقل ہو یا زندگی ہو، بے عقل یا مردے کو کیا فائدہ پہنچے گا،

اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ، القاء سمع کے معنی کسی بات کی طرف کان لگانے کے آتے ہیں شہید بمعنی حاضر، معنی یہ ہیں کہ آیات مذکورہ کا فائدہ دو شخصوں کو پہونچتا ہے، ایک وہ جو خود عقل رکھتا ہے، اپنی عقل سے ان سب مضامین کی تصدیق کرتا ہے، یا پھر وہ آدمی جو آیاتِ الٰہیہ کو کان لگا کر سنے اور اس طرح سنے کہ وہ خود حاضر بھی ہو یعنی ایسا نہ ہو کہ کان تو سن رہے ہیں دل حاضر نہیں ہے، تفسیر مظہری میں فرمایا کہ پہلی قسم کاملین امت کی ہے اور دوسری ان کے متبعین اور مریدین مخلصین کی جو اُن کے اعتقاد سے دین کی باتیں مان لیتے ہیں،

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ، سَبِّحْ، تسبیح سے مشتق ہے، اس کے حقیقی معنی اللہ کی تسبیح کرنا یعنی پاکی بیان کرنا ہے، وہ زبانی تسبیح کو بھی شامل ہے اور عبادتِ نماز کو بھی، اسی لئے بعض حضرات نے فرمایا کہ تسبیح قبل طلوع الشمس سے مراد نماز فجر ہے، اور تسبیح قبل الغروب سے مراد نماز عصر ہے، حضرت جریر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک طویل حدیث کے ضمن میں) فرمایا:

اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ لَّا تُغْلَبُوْا عَلٰى صَلٰوةٍ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا، يَعْنِى الْعَصْرَ وَالْفَجْرَ ثُمَّ قَرَأَ جَرِيْرٌ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ (بخاری ومسلم واللفظ لمسلم)

"کوشش کرو کہ تم سے طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب سے پہلے کی نمازیں چھوٹنے نہ پائیں، .... یعنی نماز فجر اور عصر، اور اس پر استدلال کرنے کے لئے آیت مذکورہ تلاوت فرمائی" (قرطبی)

اور آیت کے مفہوم میں وہ عام تسبیحات بھی داخل ہیں جن کے صبح شام پڑھنے کی ترغیب احادیث صحیحہ میں وارد ہوئی ہے، صحیح بخاری ومسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص صبح کے وقت اور شام کے وقت سو سو مرتبہ سبحان اللہ پڑھا کرے قیامت کے روز کوئی آدمی اس سے بہتر عمل لے کر نہیں آئے گا، بجز اس کے کہ وہ بھی یہ تسبیح اتنی یا اس سے زیادہ پڑھتا ہو، اور صحیح بخاری ومسلم ہی کی ایک روایت حضرت ابوہریرہؓ ہی سے یہ بھی ہے کہ جس شخص نے دن میں سو مرتبہ سبحان اللہ وبحمدہ پڑھا اس کے گناہ معاف کر دیئے جاویں گے، اگرچہ وہ سمندر کی موجوں سے بھی زیادہ ہوں (مظہری)

وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ، حضرت مجاہدؒ نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ سجود سے مراد فرض نمازیں ہیں، اور

اَدْبَارَ السُّجُوْدِ ، سے مراد وہ تسبیحات پڑھنا ہے جس کی فضیلت ہر نماز کے بعد حدیث مرفوع میں آئی ہے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ہر فرض نماز کے بعد ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، ۳۳ مرتبہ الحمد للہ، ۳۳ مرتبہ اللہ اکبر اور ایک مرتبہ لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ لہ الملک ولہ الحمد وہو علیٰ کل شیءٍ قدیر، پڑھ لیا کرے تو اس کی خطائیں معاف کردی جائیں گی، اگرچہ وہ دریا کی موجوں کے برابر ہوں (رواہ البخاری ومسلم) اور ادبار السجود سے مراد وہ سنتیں بھی ہوسکتی ہیں جو فرض نماز وں کے بعد احادیث صحیحہ میں آئی ہیں (مظہری)

وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿٤١﴾ يَوْمَ يَسْمَعُوْنَ

اور کان رکھ جس دن پکارے پکارنے والا نزدیک کی جگہ سے ، جس دن سنیں گے

الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ ﴿٤٢﴾ اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَ

چنگھاڑ محقق ، وہ ہے دن نکل پڑنے کا ، ہم ہیں جلاتے اور مارتے اور

اِلَيْنَا الْمَصِيْرُ ﴿٤٣﴾ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ۭ ذٰلِكَ حَشْرٌ

ہم تک ہے سب کو پہنچنا ، جس دن زمین پھٹ کر نکل پڑیں وہ سب دوڑتے ہوئے ، یہ اکٹھا کرنا

عَلَيْنَا يَسِيْرٌ ﴿٤٤﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ۣ قف

ہم کو آسان ہے ، ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ وہ کہتے ہیں اور تو نہیں ہے اُن پر زور کرنے والا

فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴿٤٥﴾ ع

سو تو سمجھا قرآن سے اس کو جو ڈرے میرے ڈرانے سے

۳ ع ۱۶ ۱۷

خلاصۂ تفسیر

اور (اے مخاطب تو اس اگلی بات کو توجہ سے) سن رکھ کہ جس دن ایک پکارنے والا (فرشتہ یعنی اسرافیل علیہ السلام بذریعہ نفخ صور مُردوں کو قبروں سے نکلنے کے لئے) پاس ہی سے پکارے گا (پاس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آواز سب کو بے تکلف پہونچے گی، گویا پاس سے ہی کوئی پکار رہا ہے، اور جیسے اکثر دور کی آواز کسی کو پہونچتی ہے کسی کو نہیں پہونچتی ایسا نہ ہوگا) جس روز اُس چیخنے کو بالیقین سب سُن لیں گے، یہ دن ہوگا (قبروں سے) نکلنے کا ہم ہی (اب بھی) جلاتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہماری طرف

پھوٹ کر آنا ہے (اس میں بھی مُردوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر قدرت کی طرف اشارہ ہے) جس روز زمین ان (مُردوں) پر سے کھل جاوے گی جبکہ وہ (نکل کر میدانِ قیامت کی طرف) دوڑتے ہوں گے یہ (جمع کرلینا) ہمارے نزدیک ایک آسان جمع کرلینا ہے (غرض مکرر در مکرر قیامت کا امکان اور وقوع سب ثابت ہو چکا، مگر اس پر بھی جو لوگ نہ مانیں تو آپ غم نہ کیجئے کیونکہ) جو کچھ یہ لوگ (قیامت وغیرہ کے بارے میں) کہہ رہے ہیں ہم خوب جانتے ہیں (ہم خود سمجھ لیں گے) اور آپ ان پر (منجانب اللہ) جبر کرنے والے (کرکے) نہیں (بھیجے گئے) ہیں (بلکہ صرف مُنذر اور مبلّغ ہیں، جب یہ بات ہے) تو آپ قرآن کے ذریعہ سے (عام تذکیر سے سب کو اور خاص تذکیر نافع سے صرف) ایسے شخص کو نصیحت کرتے رہیے جو میری وعید سے ڈرتا ہو (اس مفعول کی تقیید سے اشارہ ہوگیا کہ آپ اگرچہ تذکیر و تبلیغ عام کرتے ہیں جیسا مشاہدہ ہے لیکن پھر بھی مَنْ یَّخَافُ وَعِیْدِ (یعنی اللہ کی وعید سے ڈرنے والا) کوئی کوئی ہوتا ہے، پس ثابت ہوا کہ یہ آپ کے اختیار میں نہیں جب آپ کے اختیار میں نہیں پھر بے اختیار بات کی فکر کیا)۔

معارف و مسائل

یَوْمَ یُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّکَانٍ قَرِیْبٍ، (یعنی جس دن ایک پکارنے والا فرشتہ پاس ہی سے پکارے گا) ابن عساکر نے زید بن جابر شافعی سے روایت کیا ہے کہ یہ فرشتہ اسرافیل ہوگا، جو بیت المقدس کے صخرہ پر کھڑا ہو کر ساری دنیا کے مُردوں کو یہ خطاب کرے گا کہ:

"اے گلی سڑی ہڈیو! اور ریزہ ریزہ ہوجانے والی کھالو! اور بکھر جانے والے بالو! سن لو! تم کو اللہ تعالیٰ یہ حکم دیتا ہے کہ حساب کے لئے جمع ہوجاؤ" (مظہری)

یہ قیامت کے نفخۂ ثانیہ کا بیان ہے جس سے دوبارہ عالم کو زندہ کیا جائے گا، اور مکان قریب سے مراد یہ ہے کہ اس وقت اُس فرشتے کی آواز پاس اور دُور کے سب لوگوں کو اس طرح پہونچے گی کہ گویا پاس ہی سے پکار رہا ہے، حضرت عکرمہؓ نے فرمایا کہ یہ آواز اس طرح سُنی جائے گی جیسے کوئی ہمارے کان میں آواز دے رہا ہے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ مکان قریب سے مراد صخرۂ بیت المقدس ہے، کیونکہ وہ زمین کا وسط ہے، سب طرف سے اس کی مسافت یکساں ہے (قرطبی)

یَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْھُمْ سِرَاعًا (یعنی جب زمین پھٹ کر یہ سب مُردے نکل آویں گے، اور دوڑتے ہوں گے) حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوڑنا ملکِ شام کی طرف ہوگا، جہاں صخرۂ بیت المقدس پر اسرافیل علیہ السلام ندا کرتے ہوں گے،

جامع ترمذی میں حضرت معاویہ بن حیدہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دستِ مبارک سے ملکِ شام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

مِنْ هٰهُنَا اِلٰى هٰهُنَا تُحْشَرُوْنَ رُكْبَانًا وَّمُشَاةً وَّتُجَرُّوْنَ عَلٰى وُجُوْهِكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ الحدیث (از قرطبی)

"یہاں سے اُس طرف (یعنی شام کی طرف) تم سب اٹھائے جاؤ گے کچھ لوگ سوار کچھ پیدل .... اور بعض کو چہروں کے بل گھسیٹ کر قیامت کے روز اس میدان میں لایا جائے گا"

فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ (یعنی آپ تذکیر و نصیحت فرمائیے قرآن سے اُس شخص کو جو میری وعید سے ڈرتا ہے) مطلب یہ ہے کہ آپ کی تبلیغ اور وعظ و نصیحت اگرچہ عام ہی ہوگی سبھی مخلوق اس کی مخاطب اور مکلّف ہوگی، مگر اس کا اثر قبول وہی کرے گا جو اللہ کے عذاب اور وعید سے ڈرتا ہے،

حضرت قتادہؒ اس آیت کو پڑھ کر یہ دعا مانگتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِمَّنْ يَّخَافُ وَعِيْدَكَ وَيَرْجُوْا مَوْعُوْدَكَ يَا بَارُّ يَا رَحِيْمُ،

"یعنی یا اللہ ہمیں ان لوگوں میں داخل فرما دیجئے جو آپ کی وعید عذاب سے ڈرتے ہیں، اور آپ کے وعدے کے امیدوار ہیں، اے وعدہ پورے کرنے والے اے رحمت والے"

تَمَّتْ

سُوْرَةُ قٓ بِعَوْنِ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ مِنْ ثَانِيْ عَشَرَ رَبِيْعِ الْاَوَّلِ اِلٰى سَابِعِ عَشَرَ رَبِيْعِ الْاَوَّلِ يَوْمَ الْخَمِيْسِ، وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَهُوَ الْمُسْتَعَانُ فِيْ تَكْمِيْلِ الْبَاقِيْ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ،

سُوْرَةُ الذّٰرِيٰتِ

سُوْرَةُ الذّٰرِيٰتِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سِتُّوْنَ اٰيَةً وَّثَلٰثُ رُكُوْعَاتٍ

سورۃ ذاریات مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ساٹھ آیتیں ہیں اور تین رکوع،

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے،

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ① فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ② فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ③

قسم ہے اُن ہواؤں کی جو بکھیرتی ہیں اُڑا کر، پھر اُٹھانے والیاں بوجھ کو، پھر چلنے والیاں نرمی سے،

فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ④ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ⑤ وَّاِنَّ الدِّيْنَ

پھر بانٹنے والیاں حکم سے، بیشک جو وعدہ کیا ہے تم سے سو سچ ہے، اور بیشک انصاف ہونا

لَوَاقِعٌ ⑥ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ⑦ اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ⑧

ضرور ہے، قسم ہے آسمان جال دار کی، تم پڑ رہے ہو ایک جھگڑے کی بات میں،

يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ⑨ قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ⑩ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ

اس سے باز رہی وہی جو پھیرا گیا، مارے گئے اٹکل دوڑانے والے، وہ جو غفلت میں ہیں

غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ ⑪ يَسْـَٔلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ⑫ يَوْمَ هُمْ

بھول رہے، پوچھتے ہیں کب ہے دن انصاف کا، جس دن وہ آگ

عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ⑬ ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ ۭ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ

پر اُلٹے سیدھے پڑیں گے، چکھو مزہ اپنی شرارت کا، یہ ہے جس کی تم جلدی

تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۱۴﴾ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۱۵﴾ اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰىهُمْ
کرتے تھے، البتہ ڈرنے والے باغوں میں ہیں اور چشموں میں، لیتے ہیں جو دیا اُن کو

رَبُّهُمْ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ﴿۱۶﴾ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ
ان کے رب نے وہ تھے اس سے پہلے نیکی والے، وہ تھے رات کو تھوڑا

مَا يَهْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ
سوتے، اور صبح کے وقتوں میں معافی مانگتے، اور ان کے مال میں

حَقٌّ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿۱۹﴾ وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ﴿۲۰﴾
حصہ تھا مانگنے والوں کا اور ہارے ہوئے کا، اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین لانیوالوں کے واسطے

وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَفِي السَّمَاۗءِ رِزْقُكُمْ وَمَا
اور خود تمہارے اندر سو کیا تم کو سوجھتا نہیں، اور آسمان میں ہے روزی تمہاری اور جو

تُوْعَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ فَوَرَبِّ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ
تم سے وعدہ کیا گیا، سو قسم ہے رب آسمان اور زمین کی کہ یہ بات تحقیق ہے جیسے

اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ﴿۲۳﴾ ع
کہ تم بولتے ہو،

ع ۱ - ۲۳/۱۸

خلاصۂ تفسیر

قسم ہے اُن ہواؤں کی جو غبار وغیرہ کو اڑاتی ہیں، پھر اُن بادلوں کی جو بوجھ (یعنی بارش) کو اٹھاتے ہیں پھر ان کشتیوں کی جو نرمی سے چلتی ہیں پھر ان فرشتوں کی جو (حکم کے موافق اہل ارض میں) چیزیں تقسیم کرتے ہیں، (مثلاً جہاں جس قدر بارش کا حکم ہوتا ہے جو مادہ ہے رزق کا وہاں بادلوں کے ذریعہ سے اسی قدر پہونچاتے ہیں، اسی طرح حسب حدیث رحم مادر میں بچے کی صورت میں مذکر و مؤنث پوچھ کر بناتے ہیں، اور سکینہ اور رعب بھی تقسیم کرتے ہیں، آگے ان قسموں کا جواب ہے کہ) تم سے جس (قیامت) کا وعدہ کیا جاتا ہے وہ بالکل سچ ہے اور (اعمال کی) جزاء (وسزاء) ضرور ہونے والی ہے (ان قسموں میں اشارہ ہے استدلال کی طرف یعنی یہ سب تصرفات عجیبہ قدرتِ الٰہیہ سے ہونا دلیل ہے عظمتِ قدرت کی، پھر ایسی عظیم القدرت ذات کو قیامت کا واقع کرنا کیا مشکل ہے، اور تفسیر ان کلمات کی جن کی آیات مذکورہ میں قسم کھائی گئی ہے درمنثور میں حدیث

مرفوع سے اسی طرح نقل کی ہے جو آگے آتی ہے، اور تخصیص ان چیزوں کی شاید اس لئے ہو کہ اس میں اشارہ ہو گیا مخلوق کی اصناف مختلفہ کی طرف چنانچہ ملائکہ سماویات میں سے ہیں اور ریاح وسُفُن (کشتیاں) ارضیات میں سے اور سحاب کائناتِ جو یعنی فضائی مخلوقات میں سے اور ارضیات میں دو چیزیں جن میں ایک آنکھ سے نظر آتی ہے دوسری نظر نہیں آتی، شاید اس لئے آئی ہوں کہ قیامت کے متعلق ایک مضمون پر خود آسمان کی قسم ہے جیسے اوپر سماویات کی تھی یعنی) قسم ہے آسمان کی جس میں (فرشتوں کے چلنے کے) راستے ہیں (کقولہ تعالیٰ وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَائِقَ، آگے جواب قسم ہے) کہ تم (یعنی سب) لوگ (قیامت کے بارے میں) مختلف گفتگو میں ہو (کوئی تصدیق کرتا ہے، کوئی تکذیب کرتا ہے، وہذا کقولہ تعالیٰ: عَنِ النَّبَإِ الْعَظِيمِ الَّذِي هُمْ فِيهِ مُخْتَلِفُونَ" الذی فسرہ قتادۃ کما فی الدر بقولہ مُصَدِّقٌ بِهٖ وَمُكَذِّبٌ، اور آسمان کی قسم سے شاید اس طرف اشارہ ہو کہ جنت آسمان میں ہے اور آسمان میں راستہ بھی ہے، مگر جو حق میں اختلاف کرے گا اس کے لئے راہ بند ہو جاوے گی، اور ان اختلاف والوں میں) اس (وقوعِ قیامت وجزاء کے اعتقاد) سے وہی پھرتا ہے جس کو (بالکلیہ خیر وسعادت ہی سے) پھرنا ہوتا ہے (جیسا کہ حدیث میں ہے مَنْ حُرِمَهٗ فَقَدْ حُرِمَ الْخَيْرَ كُلَّهٗ رواہ ابن ماجہ یعنی جو شخص اس سے محروم رہا وہ ہر خیر سے محروم رہا، اور اختلاف والوں کے دوسرے فریق کا یعنی تصدیق کرنے والوں کا حال اسی کے مقابلہ سے معلوم ہو گیا کہ وہ خیر وسعادت سے پھرے ہوئے نہیں، اب آگے ان پھرنے والوں کی مذمت ہے کہ) غارت ہو جائیں بے سند باتیں کرنے والے (یعنی جو قیامت کا انکار کرتے ہیں بلا اس کے کہ ان کے پاس کوئی اس کی دلیل ہو) جو کہ جہالت میں بھولے ہوئے ہیں (بھولنے سے مراد اختیاری غفلت ہے) اور وہ لوگ بطور استہزاء واستعجال کے) پوچھتے ہیں کہ روزِ جزاء کب ہو گا (آگے جواب ہے کہ وہ اس دن ہوگا) جس دن (کہ) وہ لوگ آگ پر تپائے جائیں گے (اور کہا جاوے گا کہ) اپنی اس سزا کا مزہ چکھو یہی ہے جس کی تم جلدی مچایا کرتے تھے (یہ جواب يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُونَ اس طرز کا ہے جیسے کسی مجرم کے لئے پھانسی کا حکم ہو جاوے، مگر وہ احمق باوجود قیام براہین کے محض اس وجہ سے کہ اس کو تاریخ نہیں بتلائی گئی تکذیب ہی کئے جاوے اور کہے جاوے کہ اچھا وہ دن کب آوے گا، چونکہ یہ سوال محض کج روی کی راہ سے ہے اس لئے جواب میں بجائے تاریخ بتلانے کے یہ کہنا نہایت مناسب ہوگا کہ وہ دن اس وقت آوے گا جب تم پھانسی پر لٹکا دیئے جاؤ گے، آگے دوسرے فریق یعنی مؤمنین ومصدّقین کے ثواب کا ذکر ہے کہ) بے شک متقی لوگ بہشتوں اور چشموں میں ہوں گے (اور) اُن کے رب نے اُن کو جو (ثواب) عطا کیا ہو گا وہ اس کو (خوشی خوشی) لے رہے ہوں گے (اور کیوں نہ ہو؟) وہ لوگ اس کے قبل (یعنی دنیا میں) نکوکار تھے (پس حسب وعدہ هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ کے ان کے ساتھ یہ معاملہ کیا گیا، آگے اُن کی نکوکاری کی قدرے تفصیل ہے کہ) وہ لوگ (فرائض وواجبات سے ترقی کرکے نوافل وتطوعات کے ایسے التزام کرنے والے تھے کہ) رات کو بہت کم سوتے تھے (یعنی زیادہ حصہ رات کا عبادت میں صرف کرتے تھے) اور (پھر باوجود اس کے

اپنی عبادت پر نظر نہ کرتے تھے بلکہ) اخیر شب میں (اپنے کو عبادت میں کوتاہی کرنے والا سمجھ کر) استغفار کیا کرتے تھے (یہ تو عبادتِ بدنیہ میں اُن کی حالت تھی) اور (عبادتِ مالیہ کی یہ کیفیت تھی کہ) اُن کے مال میں سوالی اور غیر سوالی سب) کا حق تھا (یعنی ایسے التزام سے دیتے تھے جیسے اُن کے ذمّہ اُن کا کچھ آتا ہو، مراد اس سے غیر زکوٰۃ ہے (ہکذا فی الدر عن ابن عباس ومجاہد وابراہیم) اور یہ مطلب نہیں ہے کہ جنّات و عیون کا ملنا نوافل پر موقوف ہے، بلکہ یہاں اہلِ درجاتِ عالیہ کا ذکر فرمایا گیا ہے) اور (چونکہ کفار قیامت کی صحت کا انکار کرتے تھے اس لئے آگے اس کی دلیل کی طرف اشارہ ہے کہ) یقین لانے (کی کوشش اور طلب کرنے) والوں کے لئے (قیامت کے ممکن اور واقع ہونے پر) زمین (کے کائنات) میں بہت نشانیاں (اور دلیلیں) ہیں اور خود تمہاری ذات میں بھی (یعنی تمہارے ظاہری و باطنی احوال مختلفہ بھی دلائل ہیں قیامت کے ممکن ہونے کے، کیونکہ امور آفاقیہ وانفسیہ بالیقین داخل تحت القدرت ہیں اور قدرت ذاتیہ کی نسبت تمام ممکنات کے ساتھ یکساں ہے، اور جب کہ قیامت کے ناممکن ہونے کی کوئی دلیل نہیں تو قیامت بھی ممکنات سے ہے، پس وہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے، اور چونکہ ان دلائل کی دلالت بہت واضح تھی، اس لئے توبیخاً فرماتے ہیں کہ جب ایسے دلائل موجود ہیں) تو کیا تم کو (مطلوب پھر بھی) دکھلائی نہیں دیتا اور (رہا تعیّن وقتِ وقوع کا جس کے عدم سے استدلال عدمِ وقوع پر کرتے تھے، سو اُس کی نسبت یہ ہے کہ) تمہارا رزق اور جو تم سے (قیامت کے متعلق) وعدہ کیا جاتا ہے (ان) سب (کا معین وقت) آسمان میں (جو لوح محفوظ ہے اس میں درج) ہے (زمین پر اس کا یقینی علم کسی مصلحت سے نازل نہیں کیا گیا چنانچہ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ میں بھی نہیں بتلایا گیا، اور مشاہدہ بھی ہے کہ یقینی تعیین کسی کو نہیں معلوم، لیکن جب باوجود تعیین وقت کا علم نہ ہونے کے رزق کا وجود یقینی ہے پھر اس عدم تعیین تاریخ سے قیامت کا عدم کیسے لازم آ گیا، اور ایسے استدلال کی طرف اشارہ کرنے کے لئے مَا تُوْعَدُوْنَ کے ساتھ رِزْقُكُمْ بڑھا دیا، آگے اسی پر تفریع فرماتے ہیں کہ جب نفی کی کوئی دلیل نہیں اور اثبات کی دلیل ہے) تو قسم ہے آسمان اور زمین کے پروردگار کی کہ وہ (روزِ جزاء) برحق ہے (اور ایسا یقینی) جیسا تم باتیں کر رہے ہو (کبھی اس میں شک نہیں ہوتا، اسی طرح اس کو یقینی سمجھو)۔

معارف ومسائل

سورۂ ذاریات میں بھی اس سے پہلی سورت قٓ کی طرح زیادہ تر مضامین آخرت وقیامت اور اس میں مُردوں کے زندہ ہونے، حساب کتاب اور ثواب وعذاب کے متعلق ہیں،

پہلی چند آیات میں اللہ تعالیٰ نے چند چیزوں کی قسم کھا کر فرمایا ہے کہ قیامت کے متعلق جن چیزوں کا وعدہ کیا گیا ہے وہ سچا وعدہ ہے، جن چیزوں کی قسم کھائی ہے وہ چار ہیں، الذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ، الْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ،

الْجٰرِیٰتِ یُسْرًا ، الْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ،

ایک حدیث مرفوع میں جس کو ابن کثیر نے ضعیف کہا ہے، اور حضرت فاروق اعظم اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما سے موقوفاً ان چاروں چیزوں کے معنی اور مفہوم یہ بتلایا گیا ہے کہ ذَارِیَاتِ سے مراد وہ ہوائیں ہیں جن کے ساتھ غبار ہوتا ہے، اور حَامِلَاتِ وِقْرًا کے لفظی معنی بوجھ اٹھانے والے کے ہیں، اس سے مراد بادل ہیں جو پانی کا بوجھ اٹھائے ہوتے ہیں، اور جَارِیَاتِ یُسْرًا سے مراد کشتیاں ہیں جو پانی میں آسانی کے ساتھ چلتی ہیں، اور مُقَسِّمَاتِ اَمْرًا سے مراد وہ فرشتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عام مخلوقات میں رزق اور بارش کا پانی اور تکلیف و راحت کی مختلف اقسام تقدیر الٰہی کے مطابق تقسیم کرتے ہیں، تفسیر ابن کثیر، قرطبی اور درمنثور میں یہ روایات موقوفہ و مرفوعہ مذکور ہیں۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ، اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ، حُبُک ، حبیکہ کی جمع ہے، کپڑے کی بناوٹ میں جو دھاریاں ہوجاتی ہیں ان کو حُبُک کہا جاتا ہے، وہ چونکہ رستہ اور سڑک کے مشابہ ہوتی ہیں اس لئے رستوں کو بھی حُبُک کہہ دیا جاتا ہے، بہت سے حضرات مفسرین نے اس جگہ یہی معنی مراد لئے ہیں کہ قسم ہے آسمان کی جو رستوں والا ہے، راستوں سے وہ راستے بھی مراد ہوسکتے ہیں جن سے فرشتے آتے جاتے ہیں، اور اس سے مراد ستاروں اور سیاروں کے راستے اور ان کے مدار بھی ہوسکتے ہیں، جو دیکھنے والوں کو آسمان میں نظر آتے ہیں۔

اور چونکہ یہ بناوٹ کی دھاریاں کپڑے کی زینت اور حُسن بھی ہوتی ہیں، اس لئے بعض حضرات مفسرین نے یہاں حُبُک کے معنی زینت اور حُسن کیلئے ہیں کہ قسم ہے آسمان کی جو حُسن و زینت والا ہے، یہ قسم جس مضمون کے لئے آئی ہے وہ (اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ) میں مذکور ہے، بظاہر اس کے مخاطب مشرکینِ مکہ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مختلف اور متضاد باتیں کہا کرتے تھے، کبھی مجنون، کبھی جادوگر، کبھی شاعر وغیرہ کے لغو خطابات دیتے تھے، اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس کے مخاطب عام اُمت کے لوگ مسلم و کافر سب ہوں، اور قول مختلف سے مراد یہ ہو کہ بعض تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے اور تصدیق کرتے ہیں، بعض انکار و مخالفت سے پیش آتے ہیں (ذکرہٗ فی المظہری)

يُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ، افک کے لفظی معنی پھر جانے، منحرف ہوجانے کے ہیں، اور عَنْهُ کی ضمیر میں دو احتمال ہیں، دونوں کے معنی الگ الگ ہیں، ایک احتمال تو یہ ہے کہ ضمیر قرآن اور رسول کی طرف راجع ہو، اور معنی یہ ہوں کہ قرآن اور رسول سے وہی بدنصیب منحرف ہوتا ہے جس کے لئے محرومی مقدر ہوچکی ہے، اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ ضمیر قول مختلف کی طرف راجع ہو اور معنی یہ ہوں کہ تمہارے مختلف اور متضاد اقوال کی وجہ سے وہی شخص قرآن و رسول کا منکر ہوتا ہے جو بدنصیب محروم ہی ہو۔

قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ، خرّاص کے لفظی معنی اندازہ لگانے والے اور ظن و تخمینہ سے بات کرنے والے کے ہیں

مراد اس سے وہ قول مختلف والے کفار و منکرین ہیں جو بغیر کسی دلیل اور وجہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں متضاد باتیں کہتے ہیں، اس لئے یہاں خرّاصون کا ترجمہ کذّابون سے بھی کر دیا جائے تو بعید نہیں ان کے لئے اس جملے میں بد دعا ہے، جو درحقیقت لعنت کے معنے میں ہے (مظہری) کفار کے ذکر کے بعد مؤمنین متقین کا ذکر کئی آیتوں میں آیا ہے۔

عبادت میں شب بیداری اور اس کی تفصیل

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ، یھجعون، ہجوع سے مشتق ہے جس کے معنی رات کو سونے کے آتے ہیں، اس میں مؤمنین متقین کی یہ صفت بیان فرمائی ہے کہ وہ رات کو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گذارتے ہیں، سوتے کم ہیں، جاگتے زیادہ ہیں، اور وقت نماز و عبادت میں گذارتے ہیں، یہ تفسیر ابن جریر نے اختیار کی ہے، اور حضرت حسن بصریؒ سے یہی منقول ہے کہ متقین حضرات رات کو جاگنے اور عبادت کرنے کی مشقت اٹھاتے ہیں، اور بہت کم سوتے ہیں، اور حضرت ابن عباسؓ، قتادہ، مجاہد وغیرہ ائمہ تفسیر نے اس جملے کا مطلب حرف مَا کو اس میں نفی کے لئے قرار دے کر یہ بتلایا گیا ہے کہ رات کو تھوڑا سا حصّہ ان پر ایسا بھی آتا ہے جس میں وہ سوتے نہیں، بلکہ عبادت نماز وغیرہ میں مشغول رہتے ہیں، اس مفہوم کے اعتبار سے وہ سب لوگ اس کا مصداق ہو جاتے ہیں، جو رات کے کسی بھی حصّہ میں عبادت کرلیں، خواہ شروع میں یا آخر میں یا درمیان میں، اسی لئے حضرت انسؓ اور ابو العالیہؒ نے اس کا مصداق ان لوگوں کو قرار دیا جو مغرب و عشاء کے درمیان نماز پڑھتے ہیں، اور امام ابو جعفر باقرؒ نے فرمایا کہ جو لوگ عشاء کی نماز سے پہلے نہ سوویں وہ بھی اس میں داخل ہیں (ابن کثیر)

حضرت حسن بصریؒ نے احنف بن قیس سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ میں نے اپنے عمل کا اہل جنّت کے اعمال سے موازنہ کیا تو یہ دیکھا کہ وہ ایک ایسی قوم ہے جو ہم سے بہت بلند و بالا اور ممتاز ہے، وہ ایک ایسی قوم ہے کہ ہمارے اعمال ان کے درجہ تک نہیں پہونچتے، کیونکہ وہ لوگ راتوں میں سوتے کم ہیں عبادت زیادہ کرتے ہیں، پھر میں نے اپنے اعمال کا اہل جہنّم کے اعمال سے موازنہ کیا تو دیکھا کہ وہ اللہ و رسول کی تکذیب کرنے والے قیامت کا انکار کرنے والے ہیں (جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں محفوظ رکھا) اس لئے ہمارے اعمال موازنہ کے وقت نہ اصل اہل جنّت کے درجہ کو پہونچتے ہیں اور نہ (بحمد اللہ) اہل جہنّم کے ساتھ ملتے ہیں، تو معلوم ہوا کہ ہمارا درجۂ عمل کے اعتبار سے وہ ہے جن کا قرآن کریم نے ان الفاظ سے ذکر فرمایا ہے: خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا، یعنی وہ لوگ جنھوں نے اچھے بُرے اعمال خلط ملط کر رکھے ہیں، تو ہم میں بہتر آدمی وہ ہے جو کم از کم اس طبقے کی حدود میں رہے۔

اور عبدالرحمٰن بن زید بن اسلمؒ فرماتے ہیں کہ بنی تمیم کے ایک شخص نے میرے والد سے کہا کہ اے ابو اسامہؓ ... ہم اپنے اندر وہ صفت نہیں پاتے جو اللہ تعالیٰ نے متقین کے لئے ذکر فرمائی ہے، یعنی (كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ) کیونکہ ہمارا حال تو یہ ہے کہ قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا نَقُوْمُ، "یعنی رات میں بہت کم جاگتے اور عبادت

کرتے ہیں، میرے والد نے اس کے جواب میں فرمایا:

طوبیٰ لمن رقد اذا نعس واتقی اللہ اذا استیقظ،
(ابن کثیر)

"بشارت ہو اس شخص کے لئے جس کو نیند آوے تو سو جاوے مگر جب بیدار ہو تو تقویٰ اختیار کرے یعنی خلافِ شرع کوئی کام نہ کرے"

مطلب یہ ہے کہ مقبولیت عند اللہ صرف رات کو بہت جاگنے میں منحصر نہیں، جو شخص نیند سے مجبور ہو اور رات میں زیادہ نہ جاگے، مگر بیداری میں گناہ و معصیت سے بچے وہ بھی قابلِ مبارکباد ہے۔

حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بروایت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ یہ منقول ہے،

یٰاَیُّهَا النَّاسُ اَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَصِلُوا الْاَرْحَامَ وَاَفْشُوا السَّلَامَ وَصَلُّوْا بِالَّیْلِ وَالنَّاسُ نِیَامٌ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ (ابن کثیر)

"اے لوگو! تم، لوگوں کو کھانا کھلاؤ، رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرو، اور سلام ہر شخص مسلمان کو کرو اور رات کو اس وقت نماز پڑھو جب لوگ سو رہے ہوں تو سلامتی کیساتھ جنّت میں داخل ہو جاؤ گے"

استغفارِ سحری کی برکات و فضائل

وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ، (یعنی مؤمنین متقین سحر گاہ کے وقت اپنے گناہوں سے استغفار کرتے ہیں، اسحار، سحر کی جمع ہے، رات کے آخری چھٹے حصے کو سحر کہا جاتا ہے اس آخری حصۂ شب میں استغفار کرنے کی فضیلت اس آیت میں بھی ہے، اور دوسری آیت .... وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ میں بھی، صحاح حدیث کی سب کتابوں میں یہ حدیث مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر رات کو آخری تہائی حصہ میں آسمان دنیا پر نزولِ اجلال فرماتے ہیں، (جو ان کی شان کے مناسب ہے، اس کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں) اور اعلان فرماتے ہیں کہ ہے کوئی توبہ کرنے والا جس کی میں توبہ قبول کروں ہے کوئی استغفار کرنے والا کہ میں اس کی مغفرت کروں (ابن کثیر)

یہاں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ اس استغفارِ سحری میں اُن متقین کا بیان ہو رہا ہے جن کا حال اس سے پہلی آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ رات کو اللہ کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں، بہت کم سوتے ہیں، ان حالات میں استغفار کرنے کا بظاہر کوئی جوڑ معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ طلبِ مغفرت تو گناہ سے کی جاتی ہے، جن لوگوں نے ساری رات عبادت میں گذار دی وہ آخر میں استغفار کس گناہ سے کرتے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ ان حضرات کو چونکہ حق تعالیٰ کی معرفت حاصل ہے اللہ تعالیٰ کی عظمتِ شان کو پہچانتے ہیں، اور اپنی ساری عبادت کو اس کے شایانِ شان نہیں دیکھتے، اس لئے اپنی اس تقصیر و کوتاہی سے استغفار کرتے ہیں (مظہری)

صدقہ و خیرات کرنیوالوں کو خاص ہدایت

وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ، سائل سے مراد وہ غریب حاجتمند ہے جو اپنی حاجت لوگوں کے سامنے ظاہر کر دیتا ہے، اور لوگ اس کی مدد کرتے ہیں،

اور محروم سے مراد وہ شخص ہے کہ فقیر و مفلس اور حاجت مند ہونے کے باوجود شرافتِ نفس کے سبب اپنی حاجت کسی پر ظاہر نہیں کرتا، اس لئے لوگوں کی امداد سے محروم رہتا ہے، اس آیت میں مومنین متقین کی یہ صفت بتلائی گئی کہ وہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کے وقت صرف سائلین یعنی اپنی حاجات ظاہر کرنے والوں ہی کو نہیں دیتے بلکہ ایسے لوگوں پر بھی نظر رکھتے اور حالات کی تحقیق سے باخبر رہتے ہیں جو اپنی حاجت کسی سے کہتے نہیں۔

اور ظاہر ہے کہ مقصد آیت کا یہ ہے کہ یہ مومنین متقین صرف بدنی عبادت نماز اور شب بیداری پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ مالی عبادت میں بھی ان کا بڑا حصہ رہتا ہے، کہ سائلین کے علاوہ ایسے لوگوں پر بھی نظر رکھتے ہیں جو شرافت کے سبب اپنی حاجت کسی پر ظاہر نہیں کرتے، مگر اس مالی عبادت کا ذکر قرآن کریم نے اس عنوان سے فرمایا (وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ) یعنی یہ لوگ جن فقراء و مساکین پر خرچ کرتے ہیں ان پر کوئی احسان نہیں جتلاتے، بلکہ یہ سمجھ کر دیتے ہیں کہ ہمارے اموال خداداد میں اُن کا بھی حق ہے، اور حق دار کا حق اس کو پہنچا دینا کوئی احسان نہیں ہوا کرتا، بلکہ ایک حق اور ذمہ داری سے اپنی سبکدوشی ہوتی ہے۔

آفاق و انفس دونوں میں قدرت کی نشانیاں

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ، (یعنی زمین میں بہت نشانیاں قدرت کی ہیں، یقین کرنے والوں کے لئے) پچھلی آیات میں اوّل کفار و منکرین کا حال اور انجام بد بتلایا گیا ہے، پھر مومنین متقین کے حالات وصفات اور ان کے درجات عالیہ کا ذکر فرمایا، اب پھر کفار و منکرینِ قیامت کے حال کی طرف عود اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی نشانیاں ان کے پیش نظر کر کے انکار سے باز آجانے کی ہدایت ہے، تو اس جملہ کا تعلق مذکورہ سابق جملے (انکم لفی قول مختلف) سے ہوا، جس میں قرآن و رسول سے انکار کا ذکر ہے۔

اور تفسیر مظہری میں اس کو بھی مومنین متقین ہی کی صفات میں داخل کیا ہے، اور موقنین سے مراد وہی متقین ہیں، اور اس میں ان کا یہ حال بتلایا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیاتِ قدرت جو زمین و آسمان میں پھیلی ہوئی ہیں ان میں غور و فکر اور تدبر سے کام لیتے ہیں جس کے نتیجہ میں ان کا ایمان و ایقان بڑھتا ہی جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ان کے بارے میں ارشاد ہے (وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ)۔

اور زمین میں جن آیاتِ قدرت کا ذکر فرمایا ہے وہ بے شمار ہیں، زمین میں نباتات اور اشجار و باغات ہی کو دیکھو ان کے اقسام و انواع ان کے رنگ و بو ایک ایک پتہ کی تخلیق میں کمالِ حسن پھر ان میں سے ہر ایک کے خواص و آثار میں اختلاف کی ہزاروں قسمیں، اسی طرح زمین میں نہریں، کنویں اور پانی کے دوسرے مرکز اور اُن سے تیار ہونے والی لاکھوں انواعِ مخلوقات، زمین کے پہاڑ اور غار، زمین میں پیدا ہونے والے حیوانات اور ان کی اَن گنت اقسام و انواع، ہر ایک کے حالات اور منافع مختلف، زمین میں پیدا ہونے والے انسان کے حالات مختلف قبائل اور مختلف خطّوں کے انسانوں میں رنگ اور زبان کا امتیاز، اخلاق و عادات کا اختلاف وغیرہ جن میں آدمی غور کرے تو ایک ایک چیز میں اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کے اتنے مظاہر

پائے گا کہ شمار کرنا بھی مشکل ہے۔

وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ، اس جگہ آیاتِ قدرت کے بیان میں آسمان اور فضائی مخلوقات کا ذکر چھوڑ کر صرف زمین کا ذکر فرمایا ہے جو انسان کے بہت قریب ہی جس پر انسان بستا اور چلتا پھرتا ہے، اس آیت میں اس سے بھی زیادہ قریب یعنی خود انسان کی ذات کی طرف توجہ دلائی کہ زمین اور زمین کی مخلوقات کو بھی چھوڑ و خود اپنے وجود اپنے جسم اور اس کے اعضاء وجوارح ہی میں غور کر لو تو ایک ایک عضو کو حکمت حق تعالیٰ کا ایک دفتر پاؤ گے، اور سمجھ لو گے کہ سارے عالم میں جو آیاتِ قدرت حق تعالیٰ کی ہیں انسان کے اپنے چھوٹے سے وجود میں وہ سب گویا سمٹ آئی ہیں، اسی لئے انسان کے وجود کو عالم اصغر کہا جاتا ہے کہ سارے عالم دنیا کی مثالیں انسان کے وجود میں موجود ہیں، انسان اگر اپنی ابتداء پیدائش سے لے کر موت تک کے پیش آنے والے حالات میں ہی غور و تدبر کرنے لگے تو اس کو حق تعالیٰ گویا اپنے سامنے نظر آنے لگیں۔

کہ کس طرح ایک انسانی نطفہ دنیا کے مختلف خطوں کی غذاؤں اور دنیا میں بکھرے ہوئے اجزاء لطیفہ کا خلاصہ بن کر رحم میں قرار پایا، پھر کس طرح نطفہ سے ایک منجمد خون عَلَقَہ بنا، پھر عَلَقَہ سے مُضْغَہ (گوشت کا ٹکڑا) بنا، پھر کس طرح اس میں ہڈیاں بنائی گئیں، پھر ان پر گوشت چڑھایا گیا، پھر کس طرح اس بے جان پتلے میں جان ڈالی گئی، اور اس کی تخلیق کی تکمیل کر کے اس دنیا میں لایا گیا، پھر کس طرح تدریجی ترقی کر کے ایک بے علم بے شعور بچے سے ایک دانشمند فعال انسان بنایا گیا، اور کس طرح ان کی صورتیں اور شکلیں مختلف بنائی گئیں کہ اربوں پدموں انسانوں میں ایک کا چہرہ دوسرے سے بالکل ممتاز نظر آتا ہے، اس چند انچ کے رقبہ میں ایسے امتیازات رکھنا کس کے بس کی بات ہے، پھر اُن کی طبائع اور مزاجوں میں اختلاف اور اس اختلاف کے باوجود ایک وحدت یہ سب اس قدرت کاملہ کی کرشمہ سازی ہے جو بے مثل و بے مثال ہے۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔

یہ وہ چیزیں ہیں جن کا ہر انسان کہیں باہر اور دور نہیں خود اپنے ہی وجود میں دن رات مشاہدہ کرتا ہے اس کے باوجود بھی اگر وہ اللہ جل شانہ اور اس کی قدرتِ کاملہ کا اعتراف نہ کرے تو کوئی اندھا ہی ہو سکتا ہے جس کو کچھ نہ سوجھے، اسی لئے آخر میں فرمایا اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ "یعنی کیا تم دیکھتے نہیں" اشارہ اس طرف ہے کہ اس میں کچھ زیادہ عقل و سمجھ کا بھی کام نہیں، بینائی ہی درست ہو تو اس نتیجہ پر پہونچ سکتا ہے۔

وَفِي السَّمَاۗءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ، (یعنی آسمان میں ہے تمھارا رزق اور جو کچھ تم سے وعدہ کیا جاتا ہے) اس کی بے غبار و بے تکلف تفسیر وہ ہے جو خلاصۂ تفسیر میں اختیار کی گئی، یعنی آسمان میں ہونے سے مراد آسمان میں لوحِ محفوظ کے اندر لکھا ہونا مراد ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ ہر انسان کا رزق اور جو کچھ اس سے وعدے کئے گئے اور اس کا جو کچھ انجام ہونا ہے وہ سب لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔

حدیث میں حضرت ابو سعید خدری رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم میں سے کوئی شخص اپنے مقررہ رزق سے بچنے اور بھاگنے کی بھی کوشش کرے تو رزق اس کے پیچھے پیچھے

بھاگے گا، جیسے موت سے انسان بھاگ نہیں سکتا ایسے ہی رزق سے بھی فرار ممکن نہیں (قرطبی)

اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ رزق سے مراد بارش ہے، اس صورت میں اس کا آسمان میں ہونا بایں صورت ہوگا کہ آسمان سے مراد یہاں جرم سمٰوٰت نہ ہو بلکہ مافوق مراد ہو جس میں فضائے آسمانی بھی داخل ہے تو بارش جو بادلوں سے برستی ہے اس کو بھی فی السماء کہا جا سکتا ہے، اور مَا تُوْعَدُوْنَ سے مراد جنت اور اس کی نعمتیں ہیں، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ، (یعنی جس طرح تمہیں اپنے اپنے کلام کرنے میں کوئی شبہ نہیں ہوتا اسی طرح قیامت کا آنا بھی ایسا ہی واضح ہے اور کھلا ہوا ہے، اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، انسان کے محسوسات جو دیکھنے، سننے، چکھنے، چھونے اور سونگھنے سے متعلق ہیں، ان سب میں سے اس جگہ نطق یعنی بولنے کو خاص طور سے انتخاب شاید اس لئے کیا کہ مذکورہ سب محسوسات میں کبھی کبھی کسی مرض وغیرہ کے سبب سے التباس ہو جاتا ہے، دیکھنے سننے میں فرق ہو جانا معروف ہے، بیماری میں ذائقہ بعض اوقات خراب ہو کر میٹھے کو کڑوا بتلانے لگتا ہے، مگر نطق و گویائی ایسی چیز ہے کہ اس میں کسی دھوکہ اور تلبیس کا شائبہ نہیں ہو سکتا (قرطبی)

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿۲۴﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ

کیا پہنچی ہے تجھ کو بات ابراہیم کے مہمانوں کی جو عزت والے تھے، جب اندر پہنچے اس کے پاس

فَقَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۲۵﴾ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ

تو بولے سلام وہ بولا سلام ہے یہ لوگ ہیں اوپرے، پھر دوڑا اپنے گھر کو

فَجَاۗءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ﴿۲۶﴾ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۷﴾

تو لے آیا ایک بچھڑا گھی میں تلا ہوا، پھر ان کے سامنے رکھا کہا کیوں تم کھاتے نہیں،

فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۭ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۲۸﴾

پھر جی میں گھبرایا ان کے ڈر سے بولے تو مت ڈر اور خوش خبری دی اس کو ایک لڑکے ہوشیار کی،

فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ﴿۲۹﴾

پھر سامنے سے آئی اس کی عورت بولتی ہوئی پھر پیٹا اپنا ماتھا اور کہنے لگی کہیں بڑھیا بانجھ،

قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۰﴾

وہ بولے یونہی کہا تیرے رب نے وہ جو ہے وہی ہے حکمت والا خبردار

وقف لازم

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ﴿٣١﴾ قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ

بولا پھر کیا مطلب ہے تمہارا اے بھیجے ہوؤ ، وہ بولے ہم کو بھیجا گیا ہے

قَوْمٍ مُّجْرِمِينَ ﴿٣٢﴾ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّن طِينٍ ﴿٣٣﴾ مُّسَوَّمَةً عِندَ

ایک گنہگار قوم پر ، کہ چھوڑیں ہم اُن پر پتھر مٹی کے ، نشان پڑے ہوئے

رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِينَ ﴿٣٤﴾ فَأَخْرَجْنَا مَن كَانَ فِيهَا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٣٥﴾

تیرے رب کے یہاں سے حد سے نکل چلنے والوں کیلئے ، پھر بچا نکالا ہم نے جو تھا وہاں ایمان والا ،

فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿٣٦﴾ وَتَرَكْنَا فِيهَا آيَةً

پھر نہ پایا ہم نے اس جگہ سوائے ایک گھر کے مسلمانوں سے ، اور باقی رکھا ہم نے اس میں

لِّلَّذِينَ يَخَافُونَ الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ﴿٣٧﴾ وَفِي مُوسَىٰ إِذْ أَرْسَلْنَاهُ

نشان اُن لوگوں کے لئے جو ڈرتے ہیں عذاب دردناک سے ، اور نشانی ہے موسیٰ کے حال میں جب بھیجا

إِلَىٰ فِرْعَوْنَ بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ ﴿٣٨﴾ فَتَوَلَّىٰ بِرُكْنِهِ وَقَالَ سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ ﴿٣٩﴾

ہم نے اس کو فرعون کے پاس دیکر کھلی سند ، پھر اس نے منہ موڑ لیا اپنے زور پر اور بولا یہ جادوگر ہے یا دیوانہ

فَأَخَذْنَاهُ وَجُنُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيمٌ ﴿٤٠﴾ وَفِي عَادٍ إِذْ

پھر پکڑا ہم نے اس کو اور اس کے لشکروں کو پھر پھینک دیا ان کو دریا میں اور اس پر لگا الزام ، اور نشانی ہے عاد میں

أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيمَ ﴿٤١﴾ مَا تَذَرُ مِن شَيْءٍ أَتَتْ عَلَيْهِ إِلَّا

جب بھیجی ہم نے ان پر ہوا خیر سے خالی ، نہیں چھوڑتی کسی چیز کو جس پر گزرے کہ

جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيمِ ﴿٤٢﴾ وَفِي ثَمُودَ إِذْ قِيلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوا حَتَّىٰ حِينٍ ﴿٤٣﴾

نہ کر ڈالے اس کو جیسے چُورا ، اور نشانی ہے ثمود میں جب کہا ان کو برت لو ایک وقت تک

فَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّاعِقَةُ وَهُمْ يَنظُرُونَ ﴿٤٤﴾ فَمَا

پھر شرارت کرنے لگے اپنے رب کے حکم سے پھر پکڑا ان کو کڑک نے اور وہ دیکھتے تھے ، پھر نہ

اسْتَطَاعُوا مِن قِيَامٍ وَمَا كَانُوا مُنتَصِرِينَ ﴿٤٥﴾ وَقَوْمَ نُوحٍ مِّن

ہو سکا ان سے کہ اٹھیں اور نہ ہوئے کہ بدلہ لیں ، اور ہلاک کیا نوح کی قوم کو

قَبۡلُ ۖ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَوۡمًا فٰسِقِيۡنَ ﴿۴۶﴾ ع

اس سے پہلے تحقیق وہ تھے لوگ نافرمان ،

خلاصۂ تفسیر

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کیا ابراہیم (علیہ السلام) کے معزز مہمانوں کی حکایت آپ تک پہنچی ہے، (معزز یا تو اس لئے کہا کہ وہ ملائکہ تھے جن کی شان میں ہے بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ اور یا اس لئے کہا کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی عادت کے موافق اُن کا اکرام کیا تھا، اور مہمان کہنا بنا بر ظاہری حالت کے ہے، کہ بشکلِ انسان آئے تھے اور یہ قصہ اس وقت ہوا تھا) جبکہ وہ (مہمان) ان کے پاس آئے پھر اُن کو سلام کیا، ابراہیم (علیہ السلام) نے بھی (جواب میں) کہا سلام (اور کہنے لگے کہ) انجان لوگ (معلوم ہوتے) ہیں (ظاہر تو یہی ہے کہ دل میں سوچا قرینہ اس کا یہ ہے کہ آگے جواب فرشتوں کا مذکور نہیں، اور احتمال بعید یہ بھی ہے کہ بطور پوچھنے کے انہی سے کہدیا ہو کہ آپ لوگوں کو پہچانا نہیں اور انھوں نے جواب نہ دیا ہو، اور ابراہیم علیہ السلام نے جواب کا انتظار نہ کیا ہو غرض یہ سلام و کلام ہو کر) پھر اپنے گھر کی طرف چلے اور ایک فربہ بچھڑا (تلا ہوا لقولہ تعالیٰ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ) لائے اور اس کو ان کے پاس (یعنی سامنے) لاکر رکھا (چونکہ وہ فرشتے تھے، کیوں کھاتے اس وقت ابراہیم علیہ السلام کو شبہ ہوا اور) کہنے لگے کہ آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں (جب پھر بھی نہ کھایا) تو ان سے دل میں خوف زدہ ہوئے (کہ یہ لوگ کہیں مخالفین اور اعداء میں سے نہ ہوں، کما مرّ فی سورۃ ہود) انھوں نے کہا کہ تم ڈرو مت (ہم آدمی نہیں ہیں فرشتے ہیں) اور (یہ کہہ کر) ان کو ایک فرزند کی بشارت دی جو بڑا عالم (یعنی نبی) ہوگا، کیونکہ مخلوق میں سب سے زیادہ علم انبیاء کو ہوتا ہے اور مراد اس سے اسحٰق علیہ السلام ہیں، یہ گفتگو ان سے ہو رہی تھی کہ) اتنے میں ان کی بی بی (حضرت سارہؑ جو کہیں کھڑی سُن رہی تھیں لقولہ تعالیٰ وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ اولاد کی خبر سُن کر) بولتی پکارتی آئیں پھر (جب فرشتوں نے ان کو بھی یہ خبر سُنائی لقولہ تعالیٰ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ تو تعجب سے) ماتھے پر ہاتھ مارا اور کہنے لگیں کہ (اوّل تو میں) بڑھیا (پھر) بانجھ (اس وقت بچہ پیدا ہونا بھی عجیب بات ہے) فرشتے کہنے لگے کہ (تعجب مت کرو لقولہ تعالیٰ اَتَعْجَبِيْنَ) تمہارے پروردگار نے ایسا ہی فرمایا ہے (اور) کچھ شک نہیں کہ وہ بڑا حکمت والا بڑا جاننے والا ہے (یعنی گو فی نفسہ یہ بات تعجب کی ہے مگر تم کہ خاندانِ نبوت میں رہتی ہو اور علم و فہم سے مشرف ہو، یہ معلوم کر کے کہ خدا کا ارشاد ہے تعجب نہ رہنا چاہئے) ابراہیم (علیہ السلام) کو فراستِ نبوت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علاوہ بشارت کے اُن کے آنے سے اور بھی کچھ مقصود ہے تو ان سے کہنے لگے (کہ) اچھا تو یہ بتلاؤ کہ) تم کو بڑی مہم کیا درپیش ہے، اے فرشتو! فرشتوں نے کہا کہ ہم ایک مجرم قوم (یعنی قومِ لوط) کی طرف بھیجے گئے ہیں تاکہ ہم ان پر کنکر کے پتھر برسائیں جن پر آپ کے رب کے پاس (یعنی عالمِ غیب میں) خاص نشان بھی ہے

(جس کا بیان سورۃ ہود میں ہوا ہے اور وہ) حد سے گذرنے والوں کے لئے (ہیں، آگے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب ان بستیوں پر عذاب کا وقت قریب آیا) تو ہم نے جتنے ایمان دار تھے سب کو وہاں سے علٰحدہ کر دیا، سو بجز مسلمانوں کے ایک گھر کے اور کوئی گھر (مسلمانوں کا) ہم نے نہیں پایا، (یہ کنایہ ہے کہ وہاں کوئی اور گھر مسلمانوں کا تھا ہی نہیں، کیونکہ جس چیز کا وجود اللہ کے علم میں نہ ہو وہ موجود ہو ہی نہیں سکتی) اور ہم نے اس واقعہ میں (ہمیشہ کے واسطے) ایسے لوگوں کے لئے ایک عبرت رہنے دی جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں اور (آگے موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قصہ سنو کہ) موسیٰ (علیہ السلام) کے قصہ میں بھی عبرت ہے جب کہ ہم نے ان کو فرعون کے پاس ایک کھلی ہوئی دلیل (یعنی معجزہ) دے کر بھیجا سو اس نے مع اپنے ارکانِ سلطنت کے سرتابی کی اور کہنے لگا کہ یہ ساحر یا مجنون ہیں سو ہم نے اس کو اور اس کے لشکر کو پکڑ کر دریا میں پھینک دیا (یعنی غرق کر دیا) اور اس نے کام ہی ملامت کا کیا تھا اور (آگے عاد کا قصہ سنو کہ) عاد کے قصہ میں بھی عبرت ہے جب کہ ہم نے اُن پر نامبارک آندھی بھیجی جس چیز پر گذرتی تھی (یعنی ان اشیاء میں سے کہ جن کے اہلاک کا حکم تھا جس پر گذرتی تھی) اس کو ایسا کر چھوڑتی تھی جیسے کوئی چیز گل کر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے اور (آگے ثمود کا قصہ سنو) ثمود کے قصہ میں بھی عبرت ہے جبکہ ان سے کہا گیا (یعنی صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ) اور تھوڑے دنوں چین کر لو (یعنی کفر سے باز نہیں آؤ گے تو بعد چندے ہلاک ہو گے) سو (اس ڈرانے پر بھی) ان لوگوں نے اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی، سو اُن کو عذاب نے آلیا اور وہ (اس عذاب کے آثار کو) دیکھ رہے تھے (یعنی یہ عذاب کھلے طور پر آیا) سو نہ تو کھڑے ہی ہو سکے (بلکہ اوندھے مُنہ گر گئے لقولہ تعالیٰ جٰثِمِیْنَ) اور نہ (ہم سے) بدلہ لے سکے اور ان سے پہلے قومِ نوح کا یہی حال ہو چکا تھا (یعنی اس سبب سے کہ) وہ بڑے نافرمان لوگ تھے (ان کو بھی ہلاک کیا تھا)۔

معارف و مسائل

یہاں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلّی کے لئے گذری ہوئی امتوں میں سے چند انبیاء کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔

فَقَالُوْا سَلٰمًا ، قَالَ سَلٰمٌ ، فرشتوں نے سَلَامًا کہا تھا، خلیل اللہ نے جواب میں سَلَامٌ رفع کے ساتھ کہا، کیونکہ مرفوع ہونے کی صورت میں یہ جملہ اسمیہ بنا، جس میں دوام و استمرار اور قوت زیادہ ہے، تو جیسا قرآن کریم میں حکم ہے کہ سلام کا جواب سلام کرنے والے کے الفاظ سے بہتر الفاظ میں ہو اس کی تعمیل فرمائی،

قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ، مُنکَر، بضمِ میم و فتح کاف، اوپرے اور اجنبی کو کہا جاتا ہے، چونکہ گناہ کے کام بھی اسلام میں اوپرے اور اجنبی ہوتے ہیں، اس لئے گناہ کو بھی مُنکَر کہدیا جاتا ہے، مراد جملے کی یہ ہے کہ یہ حضرات فرشتے بشکل بشر آئے تھے، ابراہیم علیہ السلام نے اُن کو پہچانا نہیں، اس لئے

اپنے دل میں یہ کہا کہ یہ اجنبی لوگ ہیں، جن کو ہم نہیں پہچانتے، اور ممکن ہے کہ خود مہمانوں کے سامنے ہی اس کا ذکر بطور استفہام کے کر دیا ہو، اور مقصد ان کا تعارف دریافت کرنا ہو۔

فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ، رَاغ، رَوغ سے مشتق ہے، جس کے معنی کسی جگہ سے کھسک جانے اور خفیہ طور پر چلے جانے کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام مہمانوں کے لئے کھانے کا انتظام کرنے کے لئے گھر میں اس طرح گئے کہ مہمانوں کو ان کے اُٹھ جانے کی خبر نہ ہو، ورنہ وہ کھانا اور مہمانی لانے سے انکار کرتے۔

آدابِ مہمانی | ابن کثیر نے فرمایا کہ اس آیت میں مہمان کے لئے چند آدابِ میزبانی کی تعلیم ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ پہلے مہمانوں سے پوچھا نہیں کہ میں آپ کے لئے کھانا لاتا ہوں، بلکہ چپکے سے کھسک گئے، اور ان کی مہمانی کے لئے اپنے پاس جو سب سے اچھی چیز کھانے کی تھی یعنی بچھڑا ذبح کیا، اس کو بھونا اور لے آئے اور دوسرے یہ کہ لانے کے بعد مہمانوں کو اس کی تکلیف نہیں دی کہ ان کو کھانے کی طرف بُلاتے، بلکہ جہاں وہ بیٹھے تھے وہیں لا کر ان کے سامنے پیش کر دیا (فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ) تیسرے یہ کہ مہمانی پیش کرنے کے وقت انداز گفتگو میں کھانے پر اصرار نہ تھا بلکہ فرمایا اَلَا تَاْكُلُوْنَ (کیا آپ کھائیں گے نہیں) اشارہ اس طرف ہوا کہ اگرچہ آپ کو حاجت کھانے کی نہ ہو، مگر ہماری خاطر سے کچھ کھائیے،

فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ، یعنی ابراہیم علیہ السلام ان کے کھانا نہ کھانے کی وجہ سے ان سے خطرہ محسوس کرنے لگے جس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت شرفاء کا تعامل تھا کہ مہمان کچھ نہ کچھ مہمانی قبول کرتا، اور کھاتا تھا، جو مہمانی اتنی بھی قبول نہ کرے اس سے خطرہ ہوتا تھا، کہ یہ شاید کوئی دشمن نہ ہو جو تکلیف پہنچانے آیا ہو، اس وقت کے چوروں ظالموں میں بھی یہ شرافت تھی کہ جس کا کچھ کھا لیا پھر اس کو نقصان نہیں پہونچاتے تھے، اس لئے نہ کھانا سبب خطرہ کا بنتا تھا۔

فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ، صَرَّۃ کے معنی غیر معمولی آواز کے ہیں، صَرِیر قلم سے نکلنے والی آواز کو کہا جاتا ہے، مراد یہ ہے کہ حضرت سارہؓ نے جب سُنا کہ فرشتے ابراہیم علیہ السلام کو بچے کی پیدائش کی خوش خبری دے رہے ہیں، اور یہ ظاہر تھا کہ بچہ بیوی سے پیدا ہوتا ہے، بیوی حضرت سارہ ہی تھیں، تو سمجھیں کہ یہ خوش خبری ہم دونوں ہی کے لئے ہے، تو غیر اختیاری طور پر اُن کے مُنہ سے کچھ الفاظ حیرت و تعجب کے نکلے، اور کہا عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ، کہ اوّل تو میں بڑھیا، پھر بانجھ یعنی جوانی میں بھی اولاد کے قابل نہیں تھی، اب بڑھاپے میں یہ کیسے ہوگا، جس کے جواب میں فرشتوں نے فرمایا كَذٰلِكِ، یعنی اللہ تعالیٰ کو سب قدرت ہے، یہ کام یونہی ہوگا، چنانچہ جس وقت اس بشارت کے مطابق حضرت اسحٰق علیہ السلام پیدا ہوئے تو حضرت سارہؓ کی عمر ننانوے ۹۹ سال اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر سو ۱۰۰ سال کی تھی، (قرطبی)

اس گفتگو میں جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ معلوم ہوگیا کہ یہ مہمان اللہ کے فرشتے ہیں تو پوچھا کہ آپ کس مہم پر تشریف لائے ہیں، انھوں نے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب نازل کرنے کا تذکرہ کیا کہ ان کی قوم پر پتھراؤ کیا جائے گا، اور پتھراؤ بھی کچھ بڑے بڑے پتھروں سے نہیں، بلکہ مٹی سے بنی ہوئی کنکریوں سے ہوگا، مُسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ، یعنی کنکریاں اللہ کی طرف سے خاص علامت لگی ہوئی ہوں گی، بعض مفسرین نے فرمایا کہ ہر کنکری پر اس شخص کا نام لکھا تھا جس کو ہلاک کرنے کے لئے یہ بھیجی گئی تھی، اور وہ جس طرف بھاگا اس کنکری نے اس کا تعاقب کیا، اور دوسری آیات میں جو اس قوم کا عذاب یہ ذکر کیا گیا ہے کہ جبرئیل امین نے اس پورے شہر کو اٹھا کر پلٹ دیا تو یہ اس کے منافی نہیں کہ پہلے یہ پتھراؤ کیا گیا ہو اس کے بعد پوری زمین کا تختہ اُلٹا گیا ہو۔

قوم لوط کے بعد قوم موسیٰ علیہ السلام اور فرعون وغیرہ کا ذکر فرمایا، اس میں فرعون کو جب موسیٰ علیہ السلام نے پیغام حق دیا تو فرعون کا عمل یہ ذکر فرمایا فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ، یعنی فرعون موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے رُخ پھیر کر اپنی قوت یعنی اپنی فوج اور امراء دولت کی طرف متوجہ ہوگیا، رُکن کے لفظی معنی قوت کے ہیں، حضرت لوط علیہ السلام کے کلام میں (اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ) اسی معنی کے لئے آیا ہے۔

اس کے بعد قوم عاد و ثمود اور آخر میں قوم نوح کا واقعہ بیان فرمایا، یہ واقعات اس سے پہلے کئی مرتبہ گذر چکے ہیں۔

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا

اور بنایا ہم نے آسمان ہاتھ کے بل سے اور ہم کو سب مقدور ہے، اور زمین کو بچھایا ہم نے

فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ

سو کیا خوب بچھانا جانتے ہیں ہم، اور ہر چیز کے بنائے ہم نے جوڑے تاکہ تم

تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۹﴾ فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۰﴾ۚ

دھیان کرو، سو بھاگو اللہ کی طرف میں تم کو اس کی طرف سے ڈر سناتا ہوں کھول کر،

وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۭ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۱﴾ۚ

اور مت ٹھیراؤ اللہ کے ساتھ اور کسی کو معبود میں تم کو اس کی طرف سے ڈر سناتا ہوں کھول کر،

كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ

اسی طرح ان سے پہلے لوگوں کے پاس جو رسول آیا اس کو یہی کہا کہ جادوگر ہے یا

مَجۡنُوۡنٌ ﴿۵۲﴾ اَتَوَاصَوۡا بِهٖ ۚ بَلۡ هُمۡ قَوۡمٌ طَاغُوۡنَ ﴿۵۳﴾ فَتَوَلَّ عَنۡهُمۡ فَمَاۤ

دیوانہ ، کیا یہی وصیت کر مرے ہیں ایک دوسرے کو کوئی نہیں پر یہ لوگ شریر ہیں ، سو تو لوٹ آ ان کی طرف سے

اَنۡتَ بِمَلُوۡمٍ ﴿۵۴﴾ وَّذَكِّرۡ فَاِنَّ الذِّكۡرٰى تَنۡفَعُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۵۵﴾

اب تجھ پر نہیں ہے الزام ، اور سمجھاتا رہ کہ سمجھانا کام آتا ہے ایمان والوں کو ،

خُلاصۂ تفسیر

اور ہم نے آسمان کو (اپنی) قدرت سے بنایا اور ہم وسیع القدرت ہیں اور ہم نے زمین کو فرش (کے طور پر) بنایا سو ہم (کیسے) اچھے بچھانے والے ہیں (یعنی اس میں کیسے کیسے منافع رکھے ہیں) اور ہم نے ہر چیز کو دو دو قسم کا بنایا (اس قسم سے مراد مقابل ہے، سو ظاہر ہے کہ ہر شے میں کوئی نہ کوئی صفت ذاتیہ یا عرضیہ ایسی معتبر ہوتی ہے جس سے دوسری چیز جس میں اس صفت کی نقیض یا ضد ملحوظ ہو، اس کے مقابل شمار کی جاتی ہے، جیسے آسمان و زمین، جوہر و عرض، گرمی و سردی، شیریں و تلخ، چھوٹی و بڑی، خوش نما و بدنما، سفیدی و سیاہی، روشنی و تاریکی، وعلیٰ ہذا) تاکہ تم (ان مصنوعات سے توحید کو) سمجھو (اور اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ان سے فرما دیجئے کہ جب یہ مصنوعات وحدت صانع پر دلالت کر رہی ہیں) تو تم (کو چاہئے کہ ان سے استدلال کر کے) اللہ ہی کی (توحید کی) طرف دوڑو (اور اول تو بوجہ دلائل مذکورہ کے خود عقل ہی اعتقاد توحید کو ضروری بتلا رہی ہے، پھر اوپر سے) میں (بھی) تمہارے (سمجھانے کے) واسطے اللہ کی طرف سے صاف طور پر ڈرانے والا (ہو کر آیا) ہوں (کہ منکرِ توحید کو عذاب ہوگا، پس خوفِ عذاب کے اعتبار سے اعتقادِ توحید اور بھی ضروری ہوگیا) اور (پھر اور زیادہ توضیح سے کہتا ہوں کہ) خدا کے ساتھ کوئی اور معبود قرار نہ دو (پھر تغیرِ عنوان کے ساتھ مضمونِ توحید کی وجہ سے انذار کی پھر تاکید ہے کہ) میں تمہارے (سمجھانے کے) واسطے اللہ کی طرف سے کھلا ڈرانے والا (ہو کر آیا) ہوں (آگے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ آپ واقع میں بلاشبہ نذیر مبین ہیں جیسا ابھی مذکور ہوا، لیکن یہ آپ کے مخالفین ایسے جاہل ہیں کہ نعوذ باللہ آپ کو کبھی ساحر کبھی مجنون بتلاتے ہیں، سو آپ صبر کیجئے کیونکہ جس طرح یہ آپ کو کہہ رہے ہیں) اسی طرح جو (کافر) لوگ ان سے پہلے ہو گذرے ہیں ان کے پاس کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جس کو انہوں نے (یعنی کل نے یا بعض نے) ساحر یا مجنون نہ کہا ہو (آگے کفار کے اس قول (سَاحِرٌ اَوۡ مَجۡنُوۡنٌ) پر متفق ہونے سے تعجب دلاتے ہیں کہ) کیا اس بات کی ایک دوسرے کو وصیت کرتے چلے آئے تھے (یعنی یہ اجماع تو ایسا ہوگیا جیسے ایک دوسرے کو کہتے چلے آئے ہوں کہ دیکھو جو رسول آوے تم بھی ہماری طرح کہنا، آگے ... حقیقتِ واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ تواصی واقع نہ ہوئی تھی، کیونکہ بعض قومیں بعض قوموں سے ملی بھی نہیں)

بلکہ (وجہ اس اجماع واتفاق کی یہ ہوئی کہ) یہ سب کے سب سرکش لوگ ہیں (یعنی سبب اس قول کا سرکشی ہے چونکہ وہ ان سب میں مشترک ہی، اس لئے قول بھی مشترک ہوگیا) سو (جب پہلے لوگ بھی ایسے گذرے ہیں اور سبب اس کا معلوم ہوگیا کہ انہی کا طغیان ہے تو) آپ ان کی طرف التفات نہ کیجئے (یعنی ان کی تکذیب کی پروا اور غم نہ کیجئے) کیونکہ آپ پر کسی طرح کا الزام نہیں (کقولہ تعالیٰ وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ) اور (اطمینان کے ساتھ اپنے منصبی کام میں لگے رہئے فقط) سمجھاتے رہئے کیونکہ سمجھانا (جن کی قسمت میں ایمان نہیں ان پر تو اتمام حجت ہوگا اور جن کی قسمت میں ایمان ہے ان) ایمان (لانے) والوں کو (بھی اور جو پہلے مؤمن ہیں ان کو بھی) نفع دے گا (بہرحال تذکیر میں عام فوائد اور حکمتیں سب کے اعتبار سے ہیں، آپ اس کو کئے جائیے اور کسی کے ایمان نہ لانے کا غم نہ کیجئے)

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں قیامت و آخرت کا بیان اور اس کو نہ ماننے والوں پر عذاب کا ذکر تھا، ان آیات میں بھی حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا بیان ہے جس سے قیامت اور اس میں مُردوں کے دوبارہ زندہ ہونے پر جو تعجب منکرین کی طرف سے کیا جاتا ہے اس کا ازالہ ہے، نیز توحید کا اثبات اور رسالت پر ایمان کی تاکید ہی،

بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ، لفظ اَیْد، قوت و قدرت کے معنی میں آتا ہے، اس جگہ حضرت ابن عباسؓ نے اَیْد کی یہی تفسیر فرمائی ہے۔

فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ، "یعنی دوڑو اللہ کی طرف"، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: مراد یہ ہے کہ اپنے گناہوں سے بھاگو اللہ کی طرف توبہ کے ذریعہ، ابوبکر وراق اور جنید بغدادیؒ نے فرمایا کہ نفس و شیطان معاصی کی طرف دعوت دینے والے ہیں، اور بہکانے والے ہیں، تم اُن سے بھاگ کر اللہ کی طرف پناہ لو تو وہ تمھیں ان کے شر سے بچالیں گے (قرطبی)

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ

اور میں نے جو بنائے جن اور آدمی سو اپنی بندگی کو، میں نہیں چاہتا ان سے

رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ﴿۵۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ

روزینہ اور نہیں چاہتا کہ مجھ کو کھلائیں، اللہ جو ہے وہی ہے روزی دینے والا زور آور

الْمَتِيْنُ ﴿۵۸﴾ فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا

مضبوط، سو اُن گنہگاروں کا بھی ڈول بھر چکا ہے جیسے ڈول بھرا اُن کے ساتھیوں کا اب مجھ سے

يَسۡتَعۡجِلُوۡنِ ﴿۵۹﴾ فَوَيۡلٌ لِّلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ يَّوۡمِهِمُ الَّذِيۡ يُوۡعَدُوۡنَ ﴿۶۰﴾

جلدی نہ کریں، سو خرابی ہے منکروں کو ان کے اس دن سے جس کا اُن سے وعدہ ہو چکا ہے

ع ۱۴ ۳ ۲

خلاصۂ تفسیر

اور میں نے جن اور انسان کو (دراصل) اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں (اور تبعاً و تکمیلاً للعبادۃ جنّ و انس کی پیدائش پر دوسرے منافع کا مرتب ہونا اس کے منافی نہیں، اور اسی طرح بعض جنّ و انس سے عبادت کا صادر نہ ہونا بھی اس مضمون کے منافی نہیں، کیونکہ حاصل اس لِيَعۡبُدُوۡنِ کا ارادۂ تشریعیہ ہے یعنی اُن کو عبادت کا حکم دینا نہ کہ ارادۂ تکوینیہ یعنی عبادت پر مجبور کرنا، اور تخصیص جن و انس کی اس لئے ہے کہ عبادت سے مراد عبادت بالاختیار و ابتلاء ہے، اور ملائکہ میں اگرچہ عبادت ہے ابتلاء نہیں اور دوسری مخلوقات حیوانات و نباتات وغیرہ میں اختیار نہیں، حاصل ارشاد کا یہ ہے کہ مجھ کو مطلوب شرعی ان سے عبادت کرانا ہے باقی) میں اُن سے (مخلوق کی) رزق رسانی کی درخواست نہیں کرتا اور نہ یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ مجھ کو کھلایا کریں اللہ خود ہی سب کو رزق پہونچانے والا ہے (تو ہم کو اس کی ضرورت ہی کیا تھی کہ ہم مخلوقات کی روزی رسانی ان کے متعلق کرتے اور وہ) قوّت والا نہایت قوت والا ہے (کہ اس میں عجز ضعف اور کسی قسم کی احتیاج کا عقلی احتمال بھی نہیں تو ان سے کھانا مانگنے کا کوئی امکان ہی نہیں، یہ ترغیب ہوگئی، آگے ترہیب ہے کہ جب عبادت کا وجوب ثابت ہوگیا اور عبادت کا اہم رکن ایمان ہے تو اگر یہ لوگ اب بھی شرک و کفر پر مُصر رہیں گے) تو (سُن رکھیں کہ) ان ظالموں کی (سزا کی) بھی باری (علمِ الٰہی میں مقرر) ہے جیسے ان کے (گذشتہ) ہم مشربوں کی باری (مقرر) تھی (یعنی ہر مجرم ظالم کے لئے اللہ کے علم میں خاص خاص وقت مقرر ہے، اس طرح نوبت بہ نوبت ہر مجرم کی باری آتی ہے تو وہ عذاب میں پکڑا جاتا ہے، کبھی دنیا و آخرت دونوں میں اور کبھی صرف آخرت میں) سو مجھ سے (عذاب) جلدی طلب نہ کریں (جیسا کہ اُن کی عادت ہے، کہ وعیدیں سُن کر تکذیب کے طور پر استعجال کرنے لگتے ہیں) غرض (جب وہ باری کے دن آویں گے جن میں سب سے اشد یوم موعود یعنی قیامت ہے تو) ان کافروں کے لئے اس دن کے آنے سے بڑی خرابی ہوگی جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے، (چنانچہ خود سورت بھی اسی وعدے سے شروع ہوتی ہے اِنَّمَا تُوۡعَدُوۡنَ لَصَادِقٌ وَّاِنَّ الدِّيۡنَ لَوَاقِعٌ، اور اس سے سورت کے آغاز و انجام کا حُسن ظاہر ہے)۔

معارف و مسائل

جنّ و انس کی تخلیق کا مقصد وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِيَعۡبُدُوۡنِ، یعنی ہم نے جنات اور

انسان کو عبادت کے سوا کسی کام کے لئے نہیں پیدا کیا، اس میں دو اشکال ظاہر نظر میں پیدا ہوتے ہیں، اول یہ کہ جس مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے کسی خاص کام کے لئے پیدا کیا ہے، اور اس کا ارادہ یہی ہے کہ یہ مخلوق اس کام کو کرے تو عقلی طور پر یہ ناممکن و محال ہوگا کہ پھر وہ مخلوق اس کام سے انحراف کر سکے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ و مشیت کے خلاف کوئی کام محال ہے، دوسرا اشکال یہ ہے کہ اس آیت میں انسان اور جن کی تخلیق کو صرف عبادت میں منحصر کر دیا گیا ہے، حالانکہ ان کی پیدائش میں علاوہ عبادت کے دوسرے فوائد اور حکمتیں بھی موجود ہیں۔

پہلے اشکال کے جواب میں بعض حضرات مفسرین نے اس مضمون کو صرف مؤمنین کے ساتھ مخصوص قرار دیا ہے، یعنی ہم نے مؤمن جنات اور مؤمن انسانوں کو بجز عبادت کے اور کسی کام کے لئے نہیں بنایا اور مؤمنین ظاہر ہے کہ عبادت کے کم و بیش پابند ہوتے ہیں، یہ قول ضحاک اور سفیان وغیرہ کا ہے، اور حضرت ابن عباسؓ کی ایک قرارت آیت مذکورہ میں لفظ مؤمنین مذکور بھی ہے، اور قرارت اس طرح ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ اس قرارت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ یہ مضمون صرف مؤمنین کے حق میں آیا ہے، اور خلاصۂ تفسیر میں اس اشکال کو رفع کرنے کے لئے یہ کہا گیا ہے کہ اس آیت میں ارادۂ الٰہیہ سے مراد ارادۂ تکوینی نہیں ہے جس کے خلاف کا وقوع محال ہوتا ہے بلکہ ارادۂ تشریعی ہے، یعنی یہ کہ ہم نے اُن کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ ہم ان کو عبادت کے لئے مامور کریں، امر الٰہی چونکہ انسانی اختیار کے ساتھ مشروط رکھا گیا ہے، اس کے خلاف کا وقوع محال نہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے تو حکم عبادت کا سب کو دیا ہے مگر ساتھ ہی اختیار بھی دیا ہے اس لئے کسی نے اپنے خداداد اختیار کو صحیح خرچ کیا، عبادت میں لگ گیا، کسی نے اس اختیار کو غلط استعمال کیا، عبادت سے منحرف ہوگیا، یہ قول حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بغویؒ نے نقل کیا ہے، اور زیادہ بہتر اور بے غبار توجیہ وہ ہے جو تفسیر مظہری میں کی گئی ہے کہ مراد آیت کی یہ ہے کہ ہم نے ان کی تخلیق اس انداز پر کی ہے کہ ان میں استعداد اور صلاحیت عبادت کرنے کی ہو، چنانچہ ہر جن و انس کی فطرت میں یہ استعداد قدرتی موجود ہے، پھر کوئی اس استعداد کو صحیح مصرف میں خرچ کر کے کامیاب ہوتا ہے، کوئی اس استعداد کو اپنے معاصی اور شہوات میں ضائع کر دیتا ہے، اور اس مضمون کی مثال وہ حدیث ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْ يُمَجِّسَانِهٖ (یعنی ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اس کو (اس فطرت سے ہٹا کر کوئی) یہودی بنا دیتا ہے کوئی مجوسی، فطرت پر پیدا ہونے سے مراد اکثر علماء کے نزدیک دین اسلام پر پیدا ہونا ہے، تو جس طرح اس حدیث میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ہر انسان میں فطری اور خلقی طور پر اسلام و ایمان کی استعداد و صلاحیت رکھی جاتی ہے، پھر کبھی اس کے ماں باپ اس صلاحیت کو ضائع کر کے کفر کے طریقوں پر ڈالتے ہیں، اسی طرح اس آیت میں (اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ) کا یہ مفہوم ہو سکتا ہے کہ جن و انس کے ہر فرد میں اللہ تعالیٰ نے استعداد اور صلاحیت عبادت کی رکھی ہے، واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم،

اور دوسرے اشکال کا جواب خلاصۂ تفسیر میں یہ آچکا ہے کہ کسی مخلوق کو عبادت کے لئے پیدا کرنا اس سے دوسرے منافع اور فوائد کی نفی نہیں کرتا۔

مَآ اُرِیْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ الآیہ یعنی میں جنّ وانس کو پیدا کر کے ان سے عام انسانوں کی عادت کے مطابق اپنا کوئی نفع نہیں چاہتا، کہ وہ رزق پیدا کریں میرے لئے یا اپنے لئے یا میری دوسری مخلوق کے لئے، اور یا یہ کہ وہ مجھے کما کر کھلائیں، یہ سب کلام انسان کی عام عادت پر کیا گیا ہے، کیونکہ بڑے سے بڑا انسان جو غلام خریدتا اور اس پر خرچ کرتا ہے تو اس کا مقصد ان غلاموں سے اپنے کام لینا اپنی ضروریات اور کاموں میں مدد لینا اور کمائی کر کے آقا کو دینا ہوتا ہے، حق تعالیٰ ان سب چیزوں سے پاک اور بالا و برتر ہیں، اس لئے فرمایا کہ ان کو پیدا کرنے سے میرا اپنا کوئی نفع مقصود نہیں۔

ذَنُوْبًا، لفظ ذنوب بفتح الذال اصل میں بڑے ڈول کو کہا جاتا ہے، اور بستی کے عام کنوؤں پر پانی بھرنے کے لئے بغرض سہولت بھرنے والوں کے نمبر اور باری مقرر کرلی جاتی ہے، ہر ایک پانی بھرنے والا اپنی باری میں پانی بھرتا ہے، اس لئے یہاں لفظ ذنوب کے معنی باری اور حصّہ کے لئے گئے ہیں، مراد یہ ہے کہ جس طرح پچھلی امّتوں کو اپنے اپنے وقت میں عمل کرنے کا موقع اور باری دی گئی، جن لوگوں نے اپنی باری میں کام نہیں کیا وہ ہلاک و برباد اور گرفتارِ عذاب ہوئے، اسی طرح موجودہ مشرکین کی بھی باری اور وقت مقرر ہے، اگر اس وقت تک یہ اپنے کفر سے باز نہ آئے تو خدا کا عذاب ان کو کبھی تو اسی دنیا میں اور نہیں تو آخرت میں ضرور پکڑے گا، اس لئے ان کو فرما دیجئے کہ اپنی جلد بازی سے باز آجاؤ، یعنی یہ کفار جو بطور تکذیب و انکار کے یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم واقعی مجرم ہیں اور مجرمین پر عذاب آنا آپ کے قول سے ثابت ہے تو پھر ہم پر عذاب کیوں نہیں آجاتا؟ ان کا جواب یہ ہے کہ عذاب اپنے مقررہ وقت پر اور اپنی باری پر آتا ہے، تمھاری باری بھی آنے والی ہے جلد بازی نہ کرو۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ

سورۂ ذاریات آج دوشنبہ ۱۲ ربیع الاوّل ۱۳۹۱ھ کو پوری ہوگئی!!!

سُوۡرَةُ الطُّوۡرِ

سُوۡرَةُ الطُّوۡرِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ تِسۡعٌ وَّاَرۡبَعُوۡنَ اٰيَةً وَّفِيۡهَا رُكُوۡعَانِ

سورۃ طور مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی انچاس آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے ،

وَالطُّوۡرِ ۙ‏ ﴿۱﴾ وَكِتٰبٍ مَّسۡطُوۡرٍ ۙ‏ ﴿۲﴾ فِىۡ رَقٍّ مَّنۡشُوۡرٍ ۙ‏ ﴿۳﴾ وَّالۡبَيۡتِ

قسم ہے طور کی ، اور لکھی ہوئی کتاب کی ، کشادہ ورق میں ، اور آباد

الۡمَعۡمُوۡرِ ۙ‏ ﴿۴﴾ وَالسَّقۡفِ الۡمَرۡفُوۡعِ ۙ‏ ﴿۵﴾ وَالۡبَحۡرِ الۡمَسۡجُوۡرِ ۙ‏ ﴿۶﴾ اِنَّ عَذَابَ

گھر کی ، اور اونچی چھت کی ، اور اُبلتے ہوئے دریا کی ، بیشک عذاب

رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۙ‏ ﴿۷﴾ مَّا لَهٗ مِنۡ دَافِعٍ ۙ‏ ﴿۸﴾ يَّوۡمَ تَمُوۡرُ السَّمَآءُ مَوۡرًا ۙ‏ ﴿۹﴾

تیرے رب کا ہو کر رہیگا ، اس کو کوئی نہیں ہٹانے والا ، جس دن لرزے آسمان کپکپا کر ،

وَّتَسِيۡرُ الۡجِبَالُ سَيۡرًا ؕ‏ ﴿۱۰﴾ فَوَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ۙ‏ ﴿۱۱﴾ الَّذِيۡنَ هُمۡ

اور پھریں پہاڑ چل کر ، سو خرابی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کو جو باتیں بناتے ہیں

فِىۡ خَوۡضٍ يَّلۡعَبُوۡنَ‏ ﴿۱۲﴾ يَوۡمَ يُدَعُّوۡنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ؕ‏ ﴿۱۳﴾ هٰذِهِ

کھیلتے ہوئے ، جس دن کہ دھکیلے جائیں دوزخ کی طرف دھکیل کر ، یہ ہے وہ

النَّارُ الَّتِىۡ كُنۡتُمۡ بِهَا تُكَذِّبُوۡنَ‏ ﴿۱۴﴾ اَفَسِحۡرٌ هٰذَآ اَمۡ اَنۡتُمۡ لَا تُبۡصِرُوۡنَ ۚ‏ ﴿۱۵﴾

آگ جس کو تم جھوٹ جانتے تھے ، اب بھلا یہ جادو ہے یا تم کو نہیں سوجھتا ،

وقف لازم

اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ

چلے جاؤ اس کے اندر پھر تم صبر کرو یا نہ صبر کرو تم کو برابر ہے وہی بدلہ پاؤ گے

مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ ﴿۱۷﴾ فٰكِهِيْنَ بِمَآ

جو کچھ تم کرتے تھے ، جو ڈرنے والے ہیں وہ باغوں میں ہیں اور نعمت میں ، میوے کھاتے ہوئے

اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۚ وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿۱۸﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا

جو اُن کو دیئے ان کے رب نے ، اور بچایا انکو انکے رب نے دوزخ کے عذاب سے ، کھاؤ اور پیو

هَنِيْۗـــًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾ مُتَّكِـــِٕيْنَ عَلٰي سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَزَوَّجْنٰهُمْ

رچتا ہوا بدلہ ان کاموں کا جو تم کرتے تھے ، تکیہ لگائے بیٹھے تختوں پر برابر بچھے ہوئے قطار باندھ کر اور بیاہ دیں

بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿۲۰﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا

ہم نے ان کو حوریں بڑی آنکھوں والیاں ، اور جو لوگ یقین لائے اور ان کی راہ پر چلی ان کی اولاد ایمان سے پہنچا دیا ہم نے

بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ

ان تک ان کی اولاد کو اور گھٹایا نہیں ہم نے ان سے ان کا کیا ذرا بھی ،

كُلُّ امْرِۍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ﴿۲۱﴾ وَاَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ مِّمَّا

ہر آدمی اپنی کمائی میں پھنسا ہے ، اور تار لگا دیا ہم نے ان پر میووں کا اور گوشت کا جس

يَشْتَهُوْنَ ﴿۲۲﴾ يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ ﴿۲۳﴾

چیز کو چاہیں ، جھپٹتے ہیں وہاں پیالہ نہ بکنا ہے اس شراب میں اور نہ گناہ میں ڈالنا ،

وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿۲۴﴾ وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ

اور پھرتے ہیں ان کے پاس چھوکرے ان کے گویا وہ موتی ہیں اپنے غلاف کے اندر ، اور منہ کیا بعضوں نے

عَلٰي بَعْضٍ يَّتَسَاۗءَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ﴿۲۶﴾

دوسروں کی طرف آپس میں پوچھتے ہوئے ، بولے ہم بھی تھے اس سے پہلے اپنے گھروں میں ڈرتے رہتے ،

فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ

پھر احسان کیا اللہ نے ہم پر اور بچا دیا ہم کو لُو کے عذاب سے ، ہم پہلے سے پکارتے

نَدۡعُوۡهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡبَرُّ الرَّحِيۡمُ ﴿۲۸﴾	۲۸-ع ۳
تھے اس کو بیشک وہی ہے نیک سلوک والا مہربان ،	

خلاصۂ تفسیر

قسم ہے طور (پہاڑ) کی اور اس کتاب کی جو کھلے ہوئے کاغذ میں لکھی ہے (مراد اس سے نامہ اعمال ہے جس کی نسبت دوسری آیت میں آیا ہے کِتٰبًا يَّلۡقٰىهُ مَنۡشُوۡرًا اور جس چیز میں وہ لکھا ہوا ہے اس کو تشبیہاً کاغذ کہہ دیا) اور (قسم ہے) بیت المعمور کی (کہ ساتویں آسمان میں عبادت خانہ ہے فرشتوں کا، کما فی الدر مرفوعًا) اور (قسم ہے) اونچی چھت کی (مراد آسمان ہے، قال تعالیٰ وَجَعَلۡنَا السَّمَآءَ سَقۡفًا مَّحۡفُوۡظًا وقال تعالیٰ اَللّٰهُ الَّذِيۡ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ، وصرح بھذا التفسیر عن علیؓ بسند صحیح کنز العمال عن مستدرک الحاکم) اور (قسم ہے) دریائے شور کی جو (پانی سے) پُر ہے (آگے جواب قسم ہے) کہ بیشک آپ کے رب کا عذاب ضرور ہو کر رہے گا کوئی اس کو ٹال نہیں سکتا (اور یہ اس روز واقع ہوگا) جس روز آسمان تھرتھرانے لگے گا اور پہاڑ (اپنی جگہ سے) ہٹ جاویں گے (مراد قیامت کا دن ہے، اور تھرانا یا تو باعتبار معنی متبادر کے ہو، یا مراد اس سے انشقاق ہو جو دوسری آیت میں مذکور ہے فَاِذَا انۡشَقَّتِ السَّمَآءُ، روح المعانی میں ابن عباسؓ سے دونوں تفسیریں نقل کی ہیں، اور دونوں میں کوئی تعارض نہیں، آگے پیچھے دونوں کا تحقق ہو سکتا ہے، اور یہاں پہاڑوں کا ہٹنا مذکور ہے، اور دوسری آیتوں میں ریزہ ریزہ ہونا پھر اُڑ جانا مذکور ہے، قولہ يَنۡسِفُهَا رَبِّيۡ، قولہ بُسَّتِ الۡجِبَالُ بَسًّا فَكَانَتۡ هَبَآءً، اور ان قسموں میں اس مقصد کو ذہن کے قریب لانا ہے جس کے لئے قسم کھائی گئی اور وہ یہ کہ قیامت کے وقوع کی اصل وجہ جزاء وسزا ہے، اور مجازاۃ میں مدار کار احکام شرعیہ ہیں، پس طور کی قسم کھانے میں اشارہ ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ صاحب کلام واحکام ہے، پھر ان احکام کی مخالفت یا موافقت مبنی ہے مجازاۃ کا، نامۂ اعمال کی قسم کھانے میں اشارہ ہوگیا اس موافقت یا مخالفت کے محفوظ ومنضبط ہونے کی طرف مجازاۃ اس پر بھی موقوف ہے کہ احکام الٰہیہ کی اطاعت ضروری ہو، بیت المعمور کی قسم میں اشارہ ہوگیا کہ عبادت ایسا ضروری امر ہے کہ فرشتوں کو بھی باوجود اس کے کہ ان کے لئے جزاء وسزا نہیں اس سے نہیں چھوڑا گیا، پھر نتیجہ مجازاۃ دو چیزیں ہیں، جنّت اور دوزخ، سماء کی قسم میں اشارہ ہوگیا کہ جنّت ایسی ہی رفعت کا مکان ہے، جیسے آسمان، اور بحر مسجور کی قسم میں اشارہ ہوگیا کہ دوزخ بھی ایسی ہی خوفناک چیز ہے، جیسے سمندر، یہ وجہ تخصیص تقسیم اقسام کی ہوسکتی ہے، اور نفس قسم کی توجیہ سورۂ حجر کی آیت لَعَمۡرُكَ کے ذیل میں اور غایت وغرض کی شروع سورۂ صافات میں گذر چکی ہے، آگے اس یوم کے بعض واقعات ارشاد فرماتے ہیں کہ جب یہ ثابت ہوا کہ مستحقین عذاب

کے لئے عذاب ضرور واقع ہوگا) تو جو لوگ (قیامت کے اور دیگر امور حقہ توحید ورسالت کے) جھٹلانیوالے ہیں (اور) جو (تکذیب کے) مشغلہ میں بیہودگی کے ساتھ لگ رہے ہیں (جس سے وہ مستحق عذاب ہوگئے ہیں) اُن کی اس روز بڑی کم بختی آوے گی جس روز کہ ان کو آتش دوزخ کی طرف دھکے دے دے کر لاویں گے (کیونکہ خوشی سے ایسے جگہ کون آتا ہے، پھر جب اُن کے ڈالنے کا وقت ہوگا تو اس حالت سے پکڑ کے ڈال دیئے جاویں گے فَیُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِیْ وَالْاَقْدَامِ اور اُن کو دوزخ دکھلا کر زجراً کہا جاوے گا کہ) یہ وہی دوزخ ہے جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے (یعنی جن آیتوں میں اس کی خبر تھی ان کو جھٹلاتے تھے اور نیز ان آیات کو سحر کہا کرتے تھے، خیر وہ تو تمھارے نزدیک سحر تھا) تو کیا یہ (بھی) سحر ہے (دیکھ کر بتلاؤ) یا یہ کہ تم کو (اب بھی) نظر نہیں آتا (جیسا دنیا میں نظر نہ آنے کی وجہ سے منکر ہوگئے تھے اچھا تو اب) اس میں داخل ہو پھر خواہ (اس کی) سہار کرنا یا سہار نہ کرنا تمھارے حق میں دونوں برابر ہیں (نہ یہی ہوگا کہ تمھاری ہائے واویلا سے نجات ہوجاوے اور نہ یہی ہوگا کہ تمھاری تسلیم وانقیاد وسکوت پر رحم کر کے نکال دیا جاوے بلکہ ہمیشہ اسی میں رہنا ہوگا اور) جیسا تم کرتے تھے ویسا ہی بدلہ تم کو دیا جائے گا (تم کفر کیا کرتے تھے جو سب سے بڑی نافرمانی اور اللہ تعالیٰ کے حقوق اور کمالات غیر متناہیہ کی ناشکری ہے، پس بدلہ میں دوزخ کا خلود نصیب ہوگا جو کہ عذاب اشد وغیر متناہی ہے، آگے ان کے اضداد کا بیان ہے یعنی) متقی لوگ بلاشبہ (بہشت کے) باغوں اور سامانِ عیش میں ہوں گے (اور) اُن کو جو چیزیں (عیش وآرام کی) اُن کے پروردگار نے دی ہونگی اس سے خوشدل ہونگے، اور اُنکا پروردگار انکو عذابِ دوزخ سے محفوظ رکھے گا (اور جنت میں داخل کر کے فرماوے گا کہ) خوب کھاؤ اور پیو مزہ کے ساتھ اپنے (ان نیک) عملوں کے بدلہ میں (جو دنیا میں کیا کرتے تھے) تکیہ لگائے ہوئے تختوں پر جو برابر بچھائے ہوئے ہیں، اور ہم ان کا گوری گوری بڑی آنکھوں والیوں سے (یعنی حوروں سے) بیاہ کردیں گے (یہ حال تو سب اہلِ ایمان کا ہوا) اور (آگے ان خاص مؤمنین کا ذکر ہے جن کی اولاد بھی موصوف بالایمان تھی پس ارشاد ہے کہ) جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان میں اُن کا ساتھ دیا، (یعنی وہ بھی ایمان لائے گو اعمال میں وہ اپنے آباء کے رتبہ کو نہیں پہونچے، جیسا کہ عدمِ ذکر اعمال اس کا قرینہ ہے، ونیز احادیث میں مصرح ہے کانُوْا دُوْنَہٗ فِی الْعَمَلِ، وَکَانَتْ مَنَازِلُ اٰبَائِھِمْ اَرْفَعَ، وَلَمْ یَبْلُغُوْا دَرَجَتَکَ وَعَمَلَکَ، رواھا فی الدر المنثور، تو گو اُن کے عمل میں کمی کا مقتضا یہ تھا کہ ان کا درجہ بھی کم ہو، لیکن ان آباء مؤمنین کے اکرام اور ان کو خوش کرنے کے لئے) ہم ان کی اولاد کو بھی (درجہ میں) ان کے ساتھ شامل کردیں گے اور (اس شامل کرنے کے لئے) ہم ان (اہلِ جنت متبوعین) کے عمل میں سے کوئی چیز کم نہیں کریں گے، یعنی یہ نہ کریں گے کہ ان متبوعین کے بعض اعمال لے کر اُن کی ذُرّیت کو دے کر دونوں کو برابر کردیں، جیسے مثلاً ایک شخص کے پاس چھ سو روپے ہوں اور ایک کے پاس چار سو اور دونوں کا برابر کرنا مقصود ہو تو

اس کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ چھ سو روپے والے سے ایک سو روپے لیکر اس چار سو والے کو دیدیئے جائیں کہ دونوں کے پاس پانچ پانچ سو ہو جائیں اور دوسری صورت جو کریموں کی شان کے لائق ہے یہ ہے کہ چھ سو والے سے کچھ نہ لیا جائے بلکہ اس چار سو والے کو دو سو روپے اپنے پاس سے دیدیں اور دونوں کو برابر کر دیں، پس مطلب یہ ہو کہ وہاں پہلی صورت واقع نہ ہو گی جس کا اثر یہ ہو تا کہ متبوع کو بوجہ کم ہو جانے اعمال کے اس کے درجہ سے کچھ نیچے لاتے، اور تابع کو کچھ اوپر لے جاتے اور دونوں ایک متوسط درجہ میں رہتے یہ نہ ہوگا، بلکہ دوسری ...... صورت واقع ہوگی اور متبوع اپنے درجۂ عالیہ میں بدستور رہے گا، اور تابع کو وہاں پہونچا دیا جائے گا اور متبوع اور ذریت میں ایمان کی شرط اس لئے ہے کہ اگر وہ ذریت مؤمن نہیں تو آبا، مؤمنین کے ساتھ الحاق نہیں ہو سکتا، کیونکہ کافروں میں سے) ہر شخص اپنے اعمال (کفریہ) میں محبوس (فی النار اور ماخوذ) رہے گا (کقولہ تعالے کُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ إِلَّآ أَصْحٰبَ الْيَمِينِ، فسرہ ابن عباس کما فی الدر، یعنی نجات کی کوئی صورت نہیں، لہٰذا ان کا الحاق آبا، مؤمنین کے ساتھ متصور نہیں، اس لئے الحاق میں ایمان ذریت شرط ہے)

اور (آگے پھر مطلق اہل ایمان و اہل جنت کا بیان ہے کہ) ہم ان کو میوے اور گوشت جس قسم کا اُن کو مرغوب ہو روز افزوں دیتے رہیں گے (اور) وہاں آپس میں (بطور خوش طبعی کے) جام شراب میں چھینا جھپٹی بھی کریں گے کہ اس (شراب) میں نہ بک بک لگے گی (کیونکہ نشہ نہ ہوگا) اور نہ کوئی بیہودہ بات (عقل و متانت کے خلاف) ہوگی اور ان کے پاس (فواکہ وغیرہ لانے کے لئے) ایسے لڑکے آئیں جائیں گے (یہ لڑکے کون ہوں گے اس کی تحقیق تفسیر سورۂ واقعہ میں آئے گی) جو خاص انہی (کی خدمت) کے لئے ہوں گے، (اور غایت حُسن و جمال سے ایسے ہوں گے کہ) گویا وہ حفاظت سے رکھے ہوئے موتی ہیں (کہ اُن پر ذرا گرد و غبار نہیں ہوتا، اور آب و تاب اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے) اور (ان کو رُوحانی مسرت بھی ہوگی، چنانچہ اس میں سے ایک کا بیان یہ ہے کہ) وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر بات چیت کریں گے (اور اثنائے گفتگو میں) یہ بھی کہیں گے کہ (بھائی) ہم تو اس سے پہلے اپنے گھر (یعنی دنیا میں انجام کار سے) بہت ڈرا کرتے تھے سو خدا نے ہم پر بڑا احسان کیا اور ہم کو عذاب دوزخ سے بچا لیا (اور) ہم اس سے پہلے (یعنی دنیا میں) اس سے دعائیں مانگا کرتے تھے (کہ ہم کو دوزخ سے بچا کر جنت میں لیجاوے سو اللہ نے دُعا، قبول کر لی) واقعی وہ بڑا محسن مہربان ہے (اور اس مضمون سے مسرت ہونا ظاہر ہے، اور چونکہ یہ امر دو حیثیت سے نعمت تھا، ایک فی نفسہ عذاب سے بچانا، دوسرے ہم ناکاروں کی ناچیز عرض قبول کر لینا، اس لئے دو عنوانوں سے تعبیر کیا گیا)۔

معارف مسائل

وَالطُّوْرِ، طور کے معنی عبرانی زبان میں پہاڑ کے ہیں جس پر درخت اُگتے ہوں، یہاں طور سے مراد وہ طور سینین ہی جو ارضِ مدین میں واقع ہے، جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ سے

شرفِ ہمکلامی نصیب ہوا، بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ دنیا میں چار پہاڑ جنت کے ہیں ان میں سے ایک طور ہے (قرطبی) طور کی قسم کھانے میں اس کی خاص تعظیم و تشریف کی طرف بھی اشارہ ہے اور اس کی طرف بھی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے لئے کچھ کلام اور احکام آئے ہیں جن کی پابندی اُن پر فرض ہے۔

وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ، لفظ رَقّ دراصل پتلی باریک کھال کے لئے بولا جاتا ہے، جو لکھنے کے واسطے کاغذ کی جگہ بنائی جاتی تھی، مراد اس سے وہ چیز ہے جس پر لکھا گیا ہو، اس لئے اس کا ترجمہ کاغذ سے کردیا جاتا ہے، اور کتاب مسطور سے مراد یا تو انسان کا نامۂ اعمال ہے جیسا کہ خلاصۂ تفسیر میں لکھا گیا ہے اور بعض مفسرین نے اس سے مراد قرآن کریم قرار دیا ہے (قرطبی)

آسمانی کعبہ بیت معمور

وَالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ، بیت معمور آسمان میں فرشتوں کا کعبہ ہے، دنیا کے کعبہ کے بالمقابل ہے، صحیحین کی احادیث میں ثابت ہے کہ شبِ معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ساتویں آسمان پر پہونچے تو آپ کو بیت معمور کی طرف لے جایا گیا، جس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے عبادت کے لئے داخل ہوتے ہیں، پھر کبھی ان کو دوبارہ یہاں پہونچنے کی نوبت نہیں آتی (کیونکہ ہر روز دوسرے نئے فرشتوں کا نمبر ہوتا ہے) ابن کثیر۔

بیتِ معمور ساتویں آسمان کے رہنے والے فرشتوں کا کعبہ ہے، اسی لئے شبِ معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بیت معمور پر پہونچے تو دیکھا کہ ابراہیم علیہ السلام اس کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں، چونکہ وہ دنیا کے کعبہ کے بانی تھے، اللہ تعالیٰ نے اس کی جزا، میں آسمان کے کعبہ سے بھی ان کا خاص تعلق قائم کردیا (ابن کثیر)

وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ، بحر سے مراد سمندر، اور مسجور سجر سے مشتق ہے جو کئی معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک معنی آگ بھڑکانے کے بھی ہیں، بعض حضرات مفسرین نے اس جگہ یہی معنی لئے کہ قسم ہے سمندر کی جو آگ بنادیا جائے گا، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ قیامت کے روز سارا سمندر آگ بنجائیگا، جیسا کہ دوسری آیت میں ہے (وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ) یعنی چاروں طرف کے سمندر آگ بن کر میدانِ حشر میں جمع ہونے والے انسانوں کے محیط ہوجائیں گے، یہی معنی حضرت سعید بن مسیبؒ نے حضرت علیؓ سے نقل کئے ہیں، حضرت ابن عباس اور سعید بن مسیبؒ، مجاہدؒ، عبید اللہ بن عمیرؓ نے بھی یہی تفسیر کی ہے (ابن کثیر)

حضرت علیؓ سے کسی یہودی نے پوچھا کہ جہنم کہاں ہے؟ تو آپ نے فرمایا سمندر ہے، یہودی نے بھی جو کتبِ سابقہ کا عالم تھا اس کی تصدیق کی (قرطبی) اور حضرت قتادہؒ وغیرہ نے مسجور کے معنی مملوٌ کے کئے ہیں، یعنی پانی سے بھرا ہوا، ابن جریر نے اسی معنی کو اختیار کیا ہے (ابن کثیر) یہی معنی خلاصۂ تفسیر میں اوپر بیان ہوئے ہیں۔

اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ مَّا لَهُ مِنْ دَافِعٍ (بیشک آپ کے رب کا عذاب واقع ہو کر رہیگا، اس کو کوئی دفع کرنے والا نہیں) یہ جواب قسم ہے، اوپر طورؔ، صحائف اعمال، بیت المعمور، آسمان، سمندر کی جن مضمون کے لئے قسم کھائی ہے اس کا یہ بیان ہے کہ کفار کے اوپر اللہ کا عذاب ضرور واقع ہوگا۔

واقعہ فاروق اعظمؓ حضرت فاروق اعظمؓ نے ایک روز سورۃ طور پڑھی جب اس آیت پر پہونچے تو ایک آہ سرد بھری، جس کے بعد بیس روز تک بیمار رہے، لوگ عیادت کو آتے، مگر یہ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ بیماری کیا ہے (ابن کثیر)

حضرت جبیر بن مطعمؓ فرماتے ہیں کہ میں مسلمان ہونے سے پہلے ایک مرتبہ مدینہ طیبہ اس لئے آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بدر کے قیدیوں کے متعلق گفتگو کروں، میں پہونچا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کی نماز میں سورۃ طور پڑھ رہے تھے اور آواز مسجد سے باہر تک پہونچ رہی تھی، جب یہ آیت پڑھی اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ مَّا لَهُ مِنْ دَافِعٍ، اچانک میری یہ حالت ہوئی کہ گویا میرا دل خوف سے پھٹ جائے گا، میں نے فوراً اسلام قبول کیا، مجھے اُس وقت یہ محسوس ہو رہا تھا کہ میں اس جگہ سے ہٹ نہیں سکوں گا، کہ مجھ پر عذاب آجائے گا (قرطبی)

يَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَاۗءُ مَوْرًا، لغت میں مضطربانہ حرکت کو مَوْر کہا جاتا ہے، آسمان کی اضطرابی حرکت جو قیامت کے روز ہوگی یہ اس کا بیان ہے۔

بزرگوں کے ساتھ نسبی تعلق آخرت میں بھی نفع دے گا، بشرط ایمان وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ، (یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کی اولاد بھی ایمان میں اُن کے تابع رہی یعنی مؤمن ہوئی تو ہم ان کی اولاد کو بھی جنّت میں انہی کے ساتھ ملحق کردیںگے)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مؤمنین صالحین کی ذرّیت واولاد کو بھی ان کے بزرگ آباء کے درجہ میں پہنچادیں گے، اگرچہ وہ عمل کے اعتبار سے اس درجہ کے مستحق نہ ہوں تاکہ ان بزرگوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں (رواہ الحاکم والبیہقی فی سننہ والبزار وابونعیم فی الحلیۃ وابن المنذر وابن جریر وابن ابی حاتم، از مظہری)

اور طبرانی نے حضرت سعید بن جبیرؒ سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ابن عباسؓ نے فرمایا اور میرا گمان یہ ہے کہ انھوں نے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ جب کوئی شخص جنّت میں داخل ہوگا تو اپنے ماں باپ اور بیوی اور اولاد کے متعلق پوچھے گا (وہ کہاں ہیں)، اس سے کہا جائیگا کہ وہ تمہارے درجہ کو نہیں پہونچے (اس لئے ان کا جنّت میں الگ مقام ہے) یہ شخص عرض کرے گا اے میرے پروردگار! میں نے جو کچھ عمل کیا وہ اپنے لئے اور ان سب کے لئے کیا تھا تو حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے حکم ہوگا کہ ان کو بھی اسی درجہ جنّت میں اُن کے ساتھ رکھا جائے (ابن کثیر)

حافظ ابن کثیرؒ نے روایات مذکورہ نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ آخرت میں ان روایات سے تو یہ ثابت ہوا کہ آباء صالحین کی برکت سے ان کی اولاد کو فائدہ پہونچے گا اور عمل میں ان کا درجہ کم ہونے کے باوجود اپنے آباء صالحین کے درجے میں پہونچا دیئے جائیں گے، اس کا دوسرا رُخ کہ اولاد صالحین کی وجہ سے والدین کو نفع پہونچے یہ بھی حدیث سے ثابت ہے، مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض نیک بندوں کا درجہ جنت میں اس کے عمل کی مناسبت سے بہت اونچا کر دیں گے، تو یہ دریافت کرے گا کہ میرے پروردگار مجھے یہ مقام اور درجہ کہاں سے مل گیا (میرا عمل تو اس قابل نہ تھا) تو جواب یہ دیا جائے گا کہ تمھاری اولاد نے تمھارے لئے استغفار و دعاء کی اس کا یہ اثر ہے (رواہ الامام احمد وقال ابن کثیر اسنادہ صحیح ولم یخرجوہ ولکن لہ شاہد فی صحیح مسلم عن ابی ہریرۃؓ)

وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ، اَلتٌ اور ایلات کے لفظی معنی کم کرنے کے ہیں (قرطبی) معنی آیت کے یہ ہیں کہ صالحین کی اولاد کو ان کے درجۂ عمل سے بڑھا کر صالحین کے ساتھ ملحق کرنے کے لئے ایسا نہیں کیا گیا کہ صالحین کے عمل میں سے کچھ کم کر کے ان کی اولاد کا عمل پورا کیا جاتا بلکہ اپنے فضل سے انکی برابر کر دیا گیا۔

كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ، یعنی ہر انسان اپنے عمل میں محبوس ہوگا ایسا نہیں ہوگا کہ کسی دوسرے کا گناہ اس کے سر ڈال دیا جائے یعنی جس طرح آیت سابقہ میں اولاد صالحین کو صالحین کی خاطر سے درجہ بڑھا دیا گیا یہ عمل حسنات میں تو ہوگا، سیئات میں ایک کے گناہ کا کوئی اثر دوسرے پر نہ پڑیگا (ابن کثیر)

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ﴿۲۹﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ

اب تو سمجھا دے کہ تو اپنے رب کے فضل سے نہ جنوں سے خبر لینے والا ہے اور نہ دیوانہ ، کیا کہتے ہیں

شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ﴿۳۰﴾ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ

یہ شاعر ہے ہم منتظر ہیں اس پر گردشِ زمانہ کے ، تو کہہ تم منتظر رہو کہ میں بھی تمھارے

مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ﴿۳۱﴾ اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ

ساتھ منتظر ہوں ، کیا اُن کی عقلیں یہی سکھلاتی ہیں اُن کو یا یہ لوگ شرارت پر

طَاغُوْنَ ﴿۳۲﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ

ہیں ، یا کہتے ہیں یہ قرآن خود بنا لایا کوئی نہیں پر وہ یقین نہیں کرتے ، پھر چاہئے کہ لے آئیں

مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴿۳۴﴾ اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ

کوئی بات اسی طرح کی اگر وہ سچے ہیں ، کیا وہ بن گئے ہیں آپ ہی آپ یا وہی ہیں

الْخٰلِقُوْنَ ؕ﴿۳۵﴾ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا یُوْقِنُوْنَ ؕ﴿۳۶﴾

بنانے والے ، یا انھوں نے بنایا آسمانوں کو اور زمین کو کوئی نہیں پر وہ یقین نہیں کرتے ،

اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَۜیْطِرُوْنَ ؕ﴿۳۷﴾ اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ

کیا اُن کے پاس ہیں خزانے تیرے رب کے یا وہی داروغہ ہیں ، کیا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے

یَّسْتَمِعُوْنَ فِیْهِ ۚ فَلْیَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ؕ﴿۳۸﴾ اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ

جس پر سن آتے ہیں ، تو چاہیے لے آئے جو سنتا ہو ان میں ایک سند کھلی ہوئی ، کیا اُس کے یہاں بیٹیاں ہیں

وَ لَكُمُ الْبَنُوْنَ ؕ﴿۳۹﴾ اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ؕ﴿۴۰﴾

اور تمہارے لئے بیٹے ، کیا تو مانگتا ہے ان سے کچھ بدلہ سو اُن پر تاوان کا بوجھ ہے ،

اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَیْبُ فَهُمْ یَكْتُبُوْنَ ؕ﴿۴۱﴾ اَمْ یُرِیْدُوْنَ كَیْدًا ؕ فَالَّذِیْنَ

کیا اُن کو خبر ہے بھید کی سو وہ لکھ رکھتے ہیں ، کیا چاہتے ہیں کچھ داؤ کرنا ، سو جو منکر

كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِیْدُوْنَ ؕ﴿۴۲﴾ اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَیْرُ اللّٰهِ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۴۳﴾

ہیں وہی آتے ہیں داؤ میں ، کیا اُن کا کوئی حاکم ہے اللہ کے سوائے وہ اللہ پاک ہے ان کے شریک بنانے سے

وَ اِنْ یَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا یَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ ﴿۴۴﴾ فَذَرْهُمْ حَتّٰی

اور اگر دیکھیں ایک تختہ آسمان سے گرتا ہوا کہیں یہ بادل ہے گاڑھا ، سو تو چھوڑ دے اُن کو یہاں تک کہ

یُلٰقُوْا یَوْمَهُمُ الَّذِیْ فِیْهِ یُصْعَقُوْنَ ﴿۴۵﴾ یَوْمَ لَا یُغْنِیْ عَنْهُمْ كَیْدُهُمْ شَیْـًٔا وَّ لَا هُمْ

دیکھ لیں اپنا اس دن کو جس میں اُن پر پڑے گی بجلی کی کڑک ، جس دن کام نہ آئے گا ان کو اُن کا داؤ ذرا بھی اور نہ اُن کو مدد

یُنْصَرُوْنَ ؕ﴿۴۶﴾ وَ اِنَّ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَ اصْبِرْ

پہنچے گی ، اور ان گنہگاروں کے لئے ایک عذاب ہے اس سے ورے پر بہت ان میں کے نہیں جانتے ، اور تو ٹھہرا رہ منتظر

لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْیُنِنَا وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِیْنَ تَقُوْمُ ﴿۴۸﴾ وَ مِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ وَ اِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴿۴۹﴾ ع ۲

اپنے رب کے حکم کا تو تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور پاکی بول اپنے رب کی خوبیاں جس وقت تو اٹھتا ہے اور کچھ رات میں بول اس کی پاکی اور پیٹھ پھیرتے وقت تاروں کے

خلاصۂ تفسیر

(جب آپ پر مضامین واجب التبلیغ کی وحی کی جاتی ہے جیسے اوپر ہی جنت و دوزخ کے مستحقین

کی تفصیل کی گئی ہے) تو آپ (ان مضامین سے لوگوں کو) سمجھاتے رہئے کیونکہ آپ بفضلہ تعالیٰ نہ تو کاہن ہیں اور نہ مجنون ہیں (جیسا مشرکین کا یہ قول سورۃ والضحیٰ کی شانِ نزول میں ..... منقول ہے قد ترکک شیطانک رواہ البخاری، جس کا حاصل یہ ہے کہ آپ کاہن نہیں ہو سکتے، کیونکہ کاہن شیاطین سے خبریں حاصل کرتا ہو اور آپ کا شیطان سے کوئی واسطہ نہیں، اور ایک آیت میں ہے وَیَقُوْلُوْنَ اِنَّہٗ لَمَجْنُوْنٌ الآیۃ اس میں آپ سے جنون کی نفی کی گئی ہے، مطلب یہ کہ آپ نبی ہیں اور نبی کا کام ہمیشہ نصیحت کرتے رہنا ہے، گو لوگ کچھ ہی بکیں) ہاں کیا یہ لوگ (علاوہ کاہن اور مجنون کہنے کے آپ کی نسبت) یوں (بھی) کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہیں (اور) ہم ان کے بارے میں حادثہ موت کا انتظار کر رہے ہیں (جیسا درمنثور میں ہے کہ قریش دارالندوہ میں مجتمع ہوئے اور آپ کے بارے میں یہ مشورہ قرار پایا کہ جیسے اور شعراء مر کر ختم ہو گئے آپ بھی ان ہی میں کے ایک ہیں، اسی طرح آپ بھی ہلاک ہو جائیں گے تو اسلام کا قصہ ختم ہو جاوے گا) آپ فرما دیجئے کہ (بہتر) تم منتظر رہو سو میں بھی تمھارے ساتھ منتظر ہوں (یعنی تم میرا انجام دیکھو میں تمھارا انجام دیکھتا ہوں، اس میں اشارۃً پیشین گوئی ہے کہ میرا انجام فلاح و کامیابی ہے اور تمھارا انجام خسارہ اور ناکامی ہے، اور یہ مقصود نہیں کہ تم مرو گے میں نہ مروں گا، بلکہ ان لوگوں کا جو اس سے مقصود تھا کہ ان کا دین چلے گا نہیں، یہ مر جاویں گے تو دین مٹ جاوے گا، جواب میں اس کا رد مقصود ہے، چنانچہ یوں ہی ہوا اور یہ لوگ جو ایسی ایسی باتیں کرتے ہیں تو) کیا ان کی عقلیں (جس کے یہ بڑے مدعی ہیں) ان کو ان باتوں کی تعلیم کرتی ہیں یا یہ ہے کہ یہ شریر لوگ ہیں (ان کا مدعی عقل و دانش ہونا ان کے اس قول سے ثابت ہے، لَوْ کَانَ خَیْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَیْہِ، احقاف، اور معالم کی نقل سے اس کی اور تائید ہوتی ہے کہ عظماء قریش لوگوں میں بڑے عقلمند مشہور تھے، پس اس آیت میں ان کی عقل کی حالت دکھلائی گئی ہے کہ کیوں صاحب بس یہی عقل ہے جو ایسی تعلیم دے رہی ہے، اور اگر یہ عقل کی تعلیم نہیں ہے تو نری شرارت اور ضد ہے) ہاں کیا وہ یہ (بھی) کہتے ہیں کہ انھوں نے اس (قرآن) کو خود گھڑ لیا ہے (سو تحقیقی جواب تو اس کا یہ ہے کہ یہ بات نہیں ہے) بلکہ (یہ بات صرف اس وجہ سے کہتے ہیں کہ) یہ لوگ (بوجہ عناد کے اس کی) تصدیق نہیں کرتے (اور قاعدہ ہے کہ جس چیز کی آدمی تصدیق نہیں کرتا ہزار وہ حق ہو مگر اس کی ہمیشہ نفی ہی کیا کرتا ہے، اور دوسرا الزامی جواب یہ ہے کہ اچھا اگر یہ ان کا بنایا ہوا ہے) تو یہ لوگ (بھی عربی اور بڑے فصیح و بلیغ اور قادر الکلام ہیں) اس طرح کا کوئی کلام (بنا کر) لے آئیں اگر یہ (اس دعوے میں) سچے ہیں (یہ سب مضامین رسالت کے متعلق ہیں آگے توحید کے متعلق گفتگو ہے کہ یہ لوگ جو توحید کے منکر ہیں تو) کیا یہ لوگ بدون کسی خالق کے خود بخود پیدا ہو گئے ہیں یا یہ خود اپنے خالق ہیں یا (یہ کہ نہ اپنے خالق ہیں اور نہ بلا خالق مخلوق ہوئے ہیں لیکن) انھوں نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے (اور اللہ تعالیٰ کی صفتِ خالقیت میں شریک ہیں، حاصل یہ کہ جو شخص صفتِ خالقیت صرف حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہونے اور خود اپنے آپ کا بھی محتاج خالق

ہونے کا اعتقاد رکھے تو عقلاً اس پر لازم ہے کہ توحید کا بھی قائل ہو، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک قرار دے، اور توحید کا انکار وہ شخص کرسکتا ہے جو صفتِ خالقیت کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص نہ جانے یا اپنی مخلوقیت کا منکر ہو، اور چونکہ یہ لوگ اپنے عدم غور و فکر کی وجہ سے یہ نہیں جانتے تھے کہ خالق جب ایک ہے تو معبود بھی ایک ہی ہونا لازم ہے، اس لئے آگے ان کے اس جہل کی طرف اشارہ ہے کہ واقع میں ایسا نہیں) بلکہ یہ لوگ (بوجہ جہل کے توحید کا) یقین نہیں لاتے (وہ جہل یہی ہے کہ اس میں غور نہیں کرتے کہ خالقیت اور معبودیت میں تلازم ہے، یہ گفتگو توحید کے متعلق ہوئی، آگے رسالت کے متعلق ان کے دوسرے مزعومات کا رد ہے، چنانچہ وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ اگر نبوت ہی ملنی تھی تو فلاں فلاں رؤسا ءِ مکہ وطائف کو ملتی حق تعالیٰ اس کا جواب دیتے ہیں کہ) کیا ان لوگوں کے پاس تمہارے رب (کی نعمتوں اور رحمتوں) کے (جن میں نبوّت بھی داخل ہے) خزانے ہیں، (کہ جس کو چاہو نبوّت دیدو، کقولہ تعالیٰ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ) یا یہ لوگ (اس محکمۂ نبوّت کے) حاکم ہیں، (کہ جسے چاہیں نبوّت دلوادیں، یعنی دینے دلانے کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ مثلاً خزانہ اپنے قبضہ میں ہو، دوسری یہ کہ قبضہ میں نہ ہو مگر قابضانِ خزانہ اس کے محکوم ہوں کہ اس کے دستخط دیکھ کر دیتے ہوں، یہاں دونوں کی نفی فرمادی، جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ لوگ جو رسالتِ محمدیہ کے منکر ہیں اور مکہ وطائف کے رؤسا کو رسالت کا مستحق قرار دیتے ہیں ان کے پاس اس کی کوئی دلیل عقلی تو ہے نہیں بلکہ خود اس کے عکس پر دلائل عقلیہ قائم ہیں، اور اسی لئے محض استفہام انکاری پر اکتفاء فرمایا، اب آگے دلیل نقلی کی نفی فرماتے ہیں، یعنی) کیا ان لوگوں کے پاس کوئی سیڑھی ہے کہ اس پر (چڑھ کر آسمان کی) باتیں سُن لیا کرتے ہیں (یعنی دلیل نقلی وحی آسمانی ہے اور اس کے علم کے دو طریقے ہیں، یا تو وحی کسی شخص پر آسمان سے نازل ہو، یا صاحبِ وحی آسمان پر چڑھے اور دونوں کا منتفی ہونا ان لوگوں سے ظاہر ہے، آگے اس کے متعلق ایک احتمال عقلی کا ابطال فرماتے ہیں کہ اگر فرضاً یہ لوگ یہ دعویٰ کرنے لگیں کہ ہم آسمان پر چڑھ جاتے اور وہاں کی باتیں سنتے ہیں) تو ان میں جو (وہاں کی) باتیں سُن آتا ہو وہ (اس دعویٰ پر) کوئی صاف دلیل پیش کرے (جس سے ثابت ہو کہ یہ شخص مشرف بہ وحی ہوا ہے، جیسا ہمارے نبی ﷺ اپنی وحی پر دلائلِ خارقہ یقینیہ رکھتے ہیں، آگے پھر توحید کے بارے میں ایک خاص مضمون کے متعلق کلام ہے، یعنی منکرینِ توحید جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دے کر شرک کرتے ہیں تو ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ) کیا خدا کے لئے بیٹیاں ... (تجویز کی جاویں) اور تمہارے لئے بیٹے (تجویز ہوں یعنی اپنے لئے تو وہ چیز پسند کرتے ہو جس کو اعلیٰ درجہ کا سمجھتے ہو، اور خدا کے لئے وہ چیز تجویز کرتے ہو جس کو ادنیٰ درجہ کی سمجھتے ہو، جس کا بیان سورۂ صافات کے اخیر میں مفصل مدلل گذرا ہے، آگے پھر رسالت کے متعلق کلام ہے کہ ان کو جو باوجود آپ ﷺ کی حقانیت ثابت ہوجانے کے آپ ﷺ کا اتباع اس قدر ناگوار ہے تو) کیا آپ ان سے کچھ معاوضہ (تبلیغ احکام کا) مانگتے ہیں کہ وہ تاوان ان کو گراں معلوم ہوتا ہے، (وہذا کقولہ تعالیٰ اَمْ تَسْئَلُهُمْ خَرْجًا الخ۔ آگے قیامت اور جزاء کے متعلق کلام ہے کہ وہ لوگ جو کہتے ہیں

کہ اول تو قیامت ہوگی نہیں، اور اگر بالفرض ہوگی تو ہم وہاں بھی اچھے رہیں گے، کما فی قولہ تعالیٰ وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰی رَبِّیْٓ اِنَّ لِیْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰی، تو ہم اس کے متعلق ان سے پوچھتے ہیں کہ) کیا ان کے پاس غیب (کا علم) ہے کہ یہ (اس کو محفوظ رکھنے کے واسطے) لکھ لیا کرتے ہیں (یہ احقر کے نزدیک کنایہ ہے یَحْفَظُوْنَ سے کیونکہ کتابت طریقہ ہے حفظ کا، پس حاصل یہ ہوا کہ جس امر پر اثباتاً یا نفیاً کوئی دلیل عقلی قائم نہ ہو وہ غیب محض ہی، اس کا دعویٰ اثباتاً یا نفیاً وہ کرے جس کو کسی واسطہ سے اس غیب پر مطلع کیا جاوے اور پھر مطلع ہونے کے بعد وہ اس کو محفوظ بھی رکھے، اس لئے کہ اگر معلوم ہونے کے بعد محفوظ نہ ہو تب بھی حکم اور دعویٰ بلا علم ہوگا، پس تم جو قیامت کی نفی اور اپنے لئے حُسنیٰ کے قائل ہو تو کیا تم کو غیب پر کسی واسطہ سے اطلاع دی گئی ہے جیسا کہ ہمارے نبیؐ کو اثباتِ قیامت اور تم سے اچھی حالت کی نفی کی خبر غیبی بواسطہ وحی دی گئی ہے اور وہ اس کو محفوظ رکھ کر اوروں کو پہونچا رہے ہیں، آگے رسالت کے متعلق ایک اور کلام ہی وہ یہ کہ) کیا یہ لوگ (صاحبِ رسالتؐ کے ساتھ) کچھ بُرائی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں (جس کا بیان دوسری آیت میں ہے وَاِذْ یَمْکُرُ بِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْکَ اَوْ یَقْتُلُوْکَ اَوْ یُخْرِجُوْکَ) سو یہ کافر خود ہی (اس) بُرائی (کے وبال) میں گرفتار ہوں گے (چنانچہ اس قصد میں ناکام ہوئے اور بدر میں مقتول ہوئے، آگے پھر توحید کے متعلق کلام ہی کہ) کیا ان کا اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہے اللہ تعالیٰ اُن کے شرک سے پاک ہے اور (آگے پھر رسالت کے متعلق ایک کلام ہے وہ یہ کہ یہ لوگ نفیِ رسالت کے لئے ایک بات یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ ہم تو آپ کو اس وقت رسول جانیں جب ہم پر ایک آسمان کا ٹکڑا گرا دو، کما قال تعالیٰ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ الیٰ قولہ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ کَمَا زَعَمْتَ عَلَیْنَا کِسَفًا، سو اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو دعویٰ پر خواہ وہ دعویٰ رسالت ہو یا اور کچھ ہو مطلق دلیل کا بشرطیکہ صحیح ہو قائم کر دینا کافی ہے جو کہ دعویٰ رسالت ہی کے وقت سے بلا کسی قدح وجرح کے قائم ہے اور کسی خاص دلیل کا قائم ہونا ضروری نہیں اور نہ اس سے دعویٰ نبوّت میں قدح لازم آتا ہے، تبرعاً کوئی فرمائشی دلیل قائم کی جاوے تو یہ اُس وقت ہے جب اس میں کوئی مصلحت ہو، مثلاً درخواست کنندہ طالبِ حق ہو، تو یہی سمجھا جاوے کہ خیر اسی ذریعہ سے اس کو ہدایت ہو جاوے گی، اور کوئی معتد بہ حکمت ہو، اور یہاں یہ مصلحت بھی نہیں، کیونکہ ان کی یہ فرمائش حق کے لئے نہیں بلکہ محض تعنّت وعناد کی راہ سے ہے، اور وہ ایسے ضدی ہیں کہ) اگر (ان کا یہ فرمائشی معجزہ واقع بھی ہو جاوے اور) وہ آسمان کے ٹکڑے کو دیکھ (بھی) لیں کہ گرتا ہوا آرہا ہے تو (اس کو بھی) یوں کہہ دیں کہ یہ تو تہ بتہ جما ہوا بادل ہے (کقولہ تعالیٰ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِیْهِ یَعْرُجُوْنَ، پس جب مصلحت بھی نہیں ہے اور دوسری مصلحتوں کی نفی کا بھی ہم کو علم ہے بلکہ ان فرمائشی معجزات کا وقوع خلافِ حکمت ہی، پس جب ضرورت نہیں مصلحت نہیں بلکہ خلافِ مصلحت ہے، پھر کیوں واقع کیا جاوے اور نہ اس کے عدمِ وقوع سے نبوّت کی نفی ہوتی ہے، آگے اُن کے غلو فی الکفر پر جو اوپر کی آیتوں سے اور شدّتِ عناد پر جو کہ آخر کی آیت سے معلوم ہوتا ہے بطور تفریع کے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے، فرماتے ہیں کہ جب یہ لوگ ایسے طاغی اور باغی اور غالی ہیں) تو (ان سے توقع ایمان کر کے رنج میں نہ پڑیئے بلکہ) ان کو (انہی کی حالت پر) رہنے دیجئے یہاں تک کہ ان کو اپنے اس دن سے سابقہ (واقع) ہو جس میں انکے ہوش اُڑجاویں گے (مراد قیامت کا دن ہے، اور اس صعق کی تفصیل سورۂ زمر کی آخری آیت وَنُفِخَ الخ کی تفسیر میں گذری ہے، اور معنی حتّٰی کی تحقیق سورۂ زخرف کے آخر میں جہاں حَتّٰى يُلٰقُوْا آیا ہے گذری ہے، آگے اس دن کا بیان ہے، یعنی) جس دن اُن کی تدبیریں (جو دنیا میں اسلام کی مخالفت اور اپنی کامیابی کے بارے میں کیا کرتے تھے) ان کے کچھ بھی کام نہ آویں گی اور نہ (کہیں سے) ان کو مدد ملے گی (نہ تو مخلوق کی طرف سے کہ اس کا امکان ہی نہیں اور نہ خالق کی طرف سے کہ اس کا وقوع نہیں، یعنی اُس روز انکو حقیقت معلوم ہو جاوے گی، باقی اس سے اِدھر ایمان لانے والے نہیں) اور (آخرت میں تو یہ مصیبت اُن پر آوے ہی گی لیکن) ان ظالموں کے لئے قبل اس (عذاب) کے بھی عذاب ہونے والا ہے (یعنی دنیا میں جیسے قحط اور غزوۂ بدر میں قتل ہونا) لیکن ان میں اکثر کو معلوم نہیں (اکثر شاید اس لئے فرمایا ہو کہ بعضوں کے لئے ایمان مقدر تھا اور ان کا عدمِ علم بوجہ اس کے کہ علم سے مبدّل ہونے والا تھا، اس لئے وہ عدمِ علم نہیں قرار دیا گیا) اور (جب آپ کو معلوم ہوگیا کہ ہم ان کی سزا کے لئے ایک وقت معیّن کرچکے ہیں تو) آپ اپنے رب کی (اس) تجویز پر صبر سے بیٹھے رہئے (اور ان لوگوں کیلئے انتقامِ الٰہی کی جلدی نہ کیجئے، جس کو آپ مسلمانوں کی خواہش اور انکی امداد کی حیثیت سے چاہتے تھے، اور نہ اس خیال سے انتقام میں جلدی کیجئے کہ یہ لوگ مدتِ مہلت میں آپکو کوئی ضرر پہنچا سکیں گے سو اس کا بھی اندیشہ نہ کیجئے کیونکہ) کہ آپ ہماری حفاظت میں ہیں (پھر کاہے کا ڈر، چنانچہ یونہی واقع ہوا) اور (اگر انکے کفر کا غم دل پر آوے تو اس کا علاج یہ ہے کہ توجہ الی اللہ رکھا کیجئے، مثلاً یہ کہ) اٹھتے وقت (یعنی مجلس سے یا سونے سے اٹھتے وقت، مثلاً تہجد میں) اپنے رب کی تسبیح و تحمید کیا کیجئے اور رات (کے کسی حصّہ) میں بھی اس کی تسبیح کیا کیجئے (مثلاً عشاء کے وقت) اور ستاروں (کے غروب ہونے) سے پیچھے بھی (مثلاً نماز صبح اور مطلق ذکر بھی اس میں آگیا، اور تخصیص ان اوقات کی بوجوہ خاصہ اہتمام کے لئے ہے، حاصل یہ کہ اپنے دل کو ادھر مشغول رکھئے پھر فکر و غم کا غلبہ نہ ہوگا)۔

معارف و مسائل

فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا، دشمنوں کی دشمنی اور مخالفت و تکذیب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لئے آخر سورت میں پہلے تو یہ فرمایا کہ "آپ ہماری نظروں میں ہیں" یعنی ہماری حفاظت میں ہیں ہم آپ کو ان کے ہر شر سے بچائیں گے، آپ اُن کی کسی بات کی پروا نہ کریں، جیسا کہ دوسری ایک آیت میں ارشاد ہے (وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ) اللہ تعالیٰ لوگوں سے آپ کی حفاظت فرماویں گے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید میں لگ جانے کا حکم فرمایا جو اصل مقصد زندگی بھی ہے، اور ہر مصیبت سے بچنے کا اصلی علاج بھی فرمایا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ، یعنی اللہ کی حمد کی

تسبیح کیا کریں جبکہ آپ کھڑے ہوں، کھڑے ہونے سے مراد سو کر اٹھنا بھی ہو سکتا ہے، ابن جریر نے اسی کو اختیار کیا ہے، اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس کو امام احمدؒ نے حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو شخص رات کو بیدار ہوا اور اس نے یہ کلمات پڑھے تو جو دعا کرے گا قبول کی جائے گی وہ کلمات یہ ہیں: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ، پھر اگر اس نے نماز پڑھنے کا ارادہ کیا اور وضو کر کے نماز پڑھی تو اس کی نماز قبول کی جائے گی (ابن کثیر)

کفارۂ مجلس اور حضرت مجاہد اور ابو الاحوص وغیرہ ائمۂ تفسیر نے فرمایا کہ حِيْنَ تَقُوْمُ سے مراد یہ ہے کہ جب آدمی اپنی کسی مجلس سے اٹھے تو یہ کہے کہ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، حضرت عطاء بن ابی رباح نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ جب تم اپنی مجلس سے اٹھو تو تسبیح و تحمید کرو، اگر تم نے اس مجلس میں کوئی نیک کام کیا ہے تو اس کی نیکی میں زیادتی اور برکت حاصل ہوگی، اور اگر کوئی غلط کام کیا ہے تو یہ کلمات اس کا کفارہ ہو جائیں گے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی مجلس میں بیٹھ اور اس میں اچھی بری باتیں ہوں تو اس مجلس سے اٹھنے سے پہلے اگر وہ یہ کلمات پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ اس کی سب خطاؤں کو جو اس مجلس میں ہوتی ہیں معاف فرما دیں گے، وہ کلمات یہ ہیں:۔ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ، رواہ الترمذی وھٰذا لفظہٗ والنسائی فی الیوم واللیلۃ وقال الترمذی حدیث حسن صحیح (از ابن کثیر)

وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ، یعنی رات میں تسبیح کیجئے، اس میں نماز مغرب و عشاء بھی داخل ہے اور عام تسبیحات بھی، وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ، یعنی ستاروں کے غائب ہونے کے بعد، مراد اس سے نماز فجر اور اس وقت کی تسبیحات ہیں (ابن کثیر)

تمت

سُوْرَةُ الطُّوْرِ بِحَمْدِ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ عَصْرَ يَوْمِ الْاَرْبَعَاءِ لِثَلٰثٍ وَّعِشْرِيْنَ مِنْ رَبِيْعِ الْاَوَّلِ ۱۳۹۱ھ
وَاللّٰهُ الْمَسْئُوْلُ لِاِتْمَامِ الْبَاقِيْ بِعَوْنِهٖ وَحُسْنِ تَوْفِيْقِهٖ

سُورَةُ النَّجْمِ

سُوْرَةُ النَّجْمِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اثْنَتَانِ وَّسِتُّوْنَ اٰيَةً وَّثَلٰثُ رُكُوْعَاتٍ

سورۃ نجم مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی باسٹھ آیتیں ہیں اور تین رکوع ،

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے ،

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ

قسم ہے تارے کی جب گرے ، بہکا نہیں تمہارا رفیق اور نہ بے راہ چلا ، اور نہیں بولتا اپنے نفس

الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝ ذُوْ مِرَّةٍ

کی خواہش سے ، یہ تو حکم ہے بھیجا ہوا ، اس کو سکھلایا ہے سخت قوتوں والے نے ، زور آور نے ،

فَاسْتَوٰى ۝ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝ فَكَانَ قَابَ

پھر سیدھا بیٹھا ، اور وہ تھا اونچے کنارہ پر آسمان کے ، پھر نزدیک ہوا اور لٹک آیا ، پھر رہ گیا فرق

قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝ فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ۝ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا

دو کمان کے برابر یا اس سے بھی نزدیک ، پھر حکم بھیجا اللہ نے اپنے بندہ پر جو بھیجا ، جھوٹ نہیں کہا رسول کے دل نے جو

رَاٰى ۝ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ۝ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۝ عِنْدَ

دیکھا ، اب کیا تم اس سے جھگڑتے ہو اس پر جو اس نے دیکھا ، اور اس کو اس نے دیکھا ہے اترتے ہوئے ایک بار اور بھی ،

سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ۝ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ

سدرۃ المنتہیٰ کے پاس ، اس کے پاس ہے بہشت آرام سے رہنے کی ، جب چھا رہا تھا اس بیری پر

مَا يَغْشٰى ﴿١٦﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ﴿١٧﴾ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿١٨﴾

جو کچھ چھا رہا تھا، بہکی نہیں نگاہ اور نہ حد سے بڑھی، بیشک دیکھے اس نے اپنے رب کے بڑے بڑے نمونے

خلاصۂ تفسیر

قسم ہے ستارہ کی جب وہ غروب ہونے لگے (یعنی کوئی بھی ستارہ ہو، اور اس قسم میں مضمون جواب قسم مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہے، یعنی جس طرح ستارہ طلوع سے غروب تک اس تمام تر مسافت میں اپنی باقاعدہ رفتار سے اِدھر اُدھر نہیں ہوا اسی طرح آپ اپنی عمر بھر ضلال وغوایت سے محفوظ ہیں، اور نیز اشارہ ہے اس طرف کہ جیسے نجم سے ہدایت ہوتی ہے، اسی طرح آپ سے بھی بوجہ عدمِ ضلال و عدمِ غوایت کے ہدایت ہوتی ہے، اور چونکہ ستاروں کے وسطِ سماء میں ہونے کے وقت کسی سمت کا اندازہ نہیں ہوتا، اس لئے اس وقت ستارے سے راستہ کا پتہ نہیں لگتا، اس لئے اس میں قید لگائی غروب کے وقت کی، اور گو قرب من الافق طلوع کے وقت بھی ہوتا ہے، لیکن غروب میں یہ بات زیادہ ہے، کہ اس وقت طالبانِ اہتداء اس کو غنیمت سمجھتے ہیں اس خیال سے کہ اگر استدلال میں ذرا توقف کیا پھر غائب ہو جاوے گا، بخلاف طلوع کے کہ اس میں بے فکری رہتی ہے پس اس میں اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہدایت حاصل کر لینے کو غنیمت سمجھو اور شوق سے دوڑو، آگے جوابِ قسم ہے کہ) یہ تمہارے (ہمہ وقت) ساتھ کے (اور سامنے) رہنے والے (پیغمبر جن کے عام احوال و افعال تم کو معلوم ہیں جن سے بشرط انصاف ان کی راستی اور حقانیت پر استدلال کر سکتے ہو یہ پیغمبر) نہ راہِ (حق) سے بھٹکے اور نہ غلط راستے ہو لئے (ضلال یہ کہ بالکل راستہ بھول کر کھڑا رہ جاوے اور غوایت یہ کہ غیر راہ کو راہ سمجھ کر غلط سمت میں چلتا رہے کذا فی الخازن، یعنی تم جو اُن کو دعوائے نبوّت و دعوت الی الاسلام میں بے راہ سمجھتے ہو یہ بات نہیں ہے، بلکہ آپ نبی برحق ہیں) اور نہ آپ اپنی نفسانی خواہش سے باتیں بناتے ہیں (جیسا تم لوگ کہتے ہو اِفْتَرَاهُ، بلکہ) ان کا ارشاد نری وحی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے (خواہ الفاظ کی بھی وحی ہو جو قرآن کہلاتا ہے خواہ صرف معانی کی ہو جو سنت کہلاتی ہے اور خواہ وحی جزئی ہو یا کسی قاعدہ کلیہ کی وحی ہو جس سے اجتہاد فرماتے ہوں، پس اس سے نفی اجتہاد کی نہیں ہوتی اور اصل مقصود مقام نفی ہے کفار کے اس خیال کی کہ آپ خدا کی طرف غلط بات کی نسبت فرماتے ہیں، آگے وحی آنے کا واسطہ بتلاتے ہیں کہ) ان کو ایک فرشتہ (اس وحی کی منجانب اللہ) تعلیم کرتا ہے جو بڑا طاقتور ہے (اور وہ اپنی کوشش و محنت سے طاقتور نہیں ہوا بلکہ) پیدائشی طاقتور ہے (جیسا کہ ایک روایت میں خود جبرئیل علیہ السلام نے اپنی طاقت کا بیان فرمایا کہ میں نے قومِ لوط کی بستیوں کو جڑ سے اُکھاڑ کر آسمان کے قریب اس کو لے جا کر چھوڑ دیا، (رواہ فی تفسیر سورۃ التکویر من الدر المنثور) مطلب یہ کہ یہ کلام کسی شیطان کے ذریعہ سے آپ تک نہیں

پہونچا کہ کاہن ہونے کا احتمال ہو بلکہ فرشتہ کے ذریعہ سے آیا ہے اور شاید شدید القوی کا ذکر فرمانے میں یہ مقصود ہو کہ اس کا احتمال بھی نہ کیا جاوے کہ شاید اصل میں فرشتہ ہی لے کر چلا ہو مگر درمیان میں کوئی شیطانی تصرف ہو گیا ہو، اس میں اشارہ ہو گیا جواب کی طرف کہ وہ نہایت شدید القویٰ ہیں شیطان کی مجال نہیں کہ ان کے پاس پھٹک سکے، پھر ختم وحی کے بعد خود حق تعالیٰ نے اس کے بعینہٖ ادا کر دینے کا وعدہ فرمایا ہے، اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۔ آگے اس شبہ کا جواب ہے کہ اس وحی لانے والے کا فرشتہ اور جبریل ہونا اس وقت معلوم ہو سکتا ہے، جب آپ ان کو پہچانتے ہوں اور پوری صحیح پہچان موقوف ہے اصلی صورت میں دیکھنے پر تو کیا آپ نے جبرئیل علیہ السلام کو اپنی اصلی صورت پر دیکھا ہے اس کی نسبت فرماتے ہیں کہ ہاں یہ بھی ہوا ہے، جس کی کیفیت یہ ہے کہ چند بار تو دوسری صورت میں دیکھا، پھر (ایک بار ایسا بھی ہوا کہ) وہ فرشتہ (اپنی) اصلی صورت پر (آپ کے روبرو) نمودار ہوا ایسی حالت میں کہ وہ (آسمان کے) بلند کنارہ پر تھا (ایک روایت میں افق شرقی سے اس کی تفسیر آئی ہے، کما فی الدر المنثور، اور افق میں دکھلا دینے کی غالباً یہ حکمت ہے کہ وسط سماء میں دیکھنا خالی از مشقت و تکلف نہیں اور اعلیٰ میں غالباً یہ حکمت تھی کہ بالکل نیچے افق پر بھی پوری چیز نظر نہیں آتی، اس لئے ذرا اونچے پر نظر آئے، اور اس دیکھنے کا قصہ یہ ہوا تھا کہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے خواہش کی کہ مجھ کو اپنی اصلی صورت دکھلا دو، انھوں نے حرا کے پاس وحسب روایت ترمذی محلہ جیاد میں وعدہ ٹھہرایا، آپ وہاں تشریف لے گئے تو ان کو افق مشرق میں دیکھا کہ ان کے چھ سو باز وہیں اور اس قدر پھیلے ہوئے ہیں، کہ اُفق غربی تک گھیر رکھا ہے، آپ بیہوش ہو کر گر پڑے، اس وقت جبرئیل علیہ السلام بصورتِ بشر ہو کر آپ کے پاس تسکین کے لئے اتر آئے جس کا آگے ذکر ہے کذا فی الجلالین، حاصل یہ کہ وہ فرشتہ اوّل صورت اصلیہ میں افقِ اعلیٰ پر نمودار ہوا) پھر (جب آپ بے ہوش ہو گئے تو) وہ فرشتہ (آپ کے) نزدیک آیا پھر اور نزدیک آیا سو (قرب کی وجہ سے) دو کمانوں کے برابر فاصلہ رہ گیا بلکہ (غایت قرب کی وجہ سے) اور بھی کم (فاصلہ رہ گیا، مطلب دو کمانوں کا یہ ہے کہ عرب کی عادت تھی کہ جب دو شخص باہم غایت درجہ کا اتفاق و اتحاد کرنا چاہتے تھے تو دونوں اپنی اپنی کمانیں لے کر ان کے چلّے یعنی تانت کو باہم متصل کر دیتے، اور اس صفت میں بھی بعض اجزاء کے اعتبار سے کچھ فصل ضرور ہی رہتا ہے، پس اس محاورہ کی وجہ سے یہ کنایہ ہو گیا قرب و اتحاد سے، اور چونکہ یہ محض اتفاقِ صوری کی علامت تھی تو اگر رُوحانی و قلبی اتفاق بھی ہو تو وہاں اَوْ اَدْنیٰ بھی صادق آسکتا ہے، پس اَوْ اَدْنیٰ کے بڑھا دینے میں اشارہ ہو گیا کہ مجاورت صوریہ کے علاوہ آپ میں اور جبرئیل علیہ السلام میں رُوحانی مناسبت بھی تھی جو مدارِ اعظم ہے معرفتِ تامہ اور حفظِ صورت کا، غرض یہ کہ ان کی تسکین سے آپ کو تسکین ہوئی اور افاقہ ہوا) پھر (افاقہ کے بعد) اللہ تعالیٰ نے (اس فرشتہ کے ذریعہ سے) اپنے بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر وحی نازل فرمائی جو کچھ نازل فرمانا تھی (جس کی تعیین بالتخصیص معلوم نہیں، اور نہ معلوم ہونے کی حاجت، اور باوجودیکہ اصل مقصود اس وقت وحی نازل کرنا نہیں بلکہ جبرئیل کو ان کی اصلی صورت

ہیں دکھلا کر ان کی پوری معرفت آپ کو عطا کر دی تھی، مگر اسوقت اور بھی وحی نازل فرمانا شاید اس لئے ہو کہ یہ معرفت میں اور زیادہ معین ہو، کیونکہ اس وقت کی وحی کو جس کا منجانب اللہ ہونا جبرئیل علیہ السلام کی اصلی صورت میں ہونے کی وجہ سے قطعی اور یقینی ہے، اور دوسرے اوقات کی وحی جو بواسطۂ صورت بشریہ ہو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں کو ایک شان پر دیکھیں گے تو زیادہ سے زیادہ یقین میں قوت ہو گی کہ دونوں حالتوں میں وحی لانے والا واسطہ یعنی فرشتہ ایک ہی ہے، جیسا کہ کسی شخص کی آواز کے لب و لہجہ اور طرزِ کلام سے خوب آگاہ ہوں تو اگر کبھی وہ صورت بدل کر بھی بولتا ہے تو صاف پہچانا جاتا ہے، آگے اس دیکھنے کے متعلق ایک شبہ کا جواب ہے وہ شبہ یہ ہے کہ صورت اصلیہ میں دیکھنے کے باوجود یہ بھی تو احتمال ہو سکتا ہے کہ قلب کے ادراک و احساس میں غلطی ہو جائے جیسا کہ احساسات میں غلطی ہو جانا اکثر مشاہدہ کیا جاتا ہے، مجنون باوجود سلامتِ حس کے بعض اوقات پہچانے ہوئے لوگوں کو دوسرا شخص بتلانے لگتا ہے، پس یہ رویت رویت صحیحہ تھی یا نہیں، آگے اس شبہ کا جواب ہے یعنی وہ رویت صحیحہ تھی کہ اس کے دیکھنے کے وقت) قلب نے دیکھی ہوئی چیز میں غلطی نہیں کی (رہا یہ کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ قلب نے غلطی نہیں کی سو بات یہ ہے کہ اگر مطلقاً ایسے احتمالات قابلِ التفات ہوا کریں تو محسوسات کا کبھی اعتبار نہ رہے، پھر تو ساری دنیا کے معاملات ہی مختل ہو جاویں، ہاں کسی کے پاس کوئی منشا شبہ کا معتد بہ موجود ہو تو اس پر غور کیا جاتا ہے، اور احتمال خطائے قلبی کا منشا یہ ہو سکتا ہے کہ ادراک کرنے والا مختل العقل ہو، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صحیح العقل، فطین و ذہین، صاحب فراست ہونا مشاہد اور ظاہر تھا، چونکہ باوجود اس اثباتِ بلیغ کے پھر بھی معاندین جدال و خلاف سے باز نہ آتے تھے اسی لئے آگے بطور توبیخ و تعجیب کے ارشاد فرماتے ہیں کہ جب تم نے ایسے شافی کافی بیان سے معرفتِ رویت کا ثبوت سن لیا) تو کیا ان (پیغمبر) سے ان کی دیکھی (بھالی) ہوئی چیز میں نزاع کرتے ہو (یعنی جن چیزوں کا علم و ادراک انسان کو ہوتا ہے ان میں محسوسات جیسی چیزیں شک و شبہ سے بالاتر ہوتی ہیں، غضب کی بات ہے کہ تم حسیات میں بھی اختلاف کرتے ہو، پھر یوں تو تمہاری حسیات میں بھی ہزار دل خدشے نکل سکتے ہیں) اور (اگر یہ جہل خدشہ ہو کہ جس چیز کو ایک ہی بار دیکھا ہو تو اس کی پہچان کیسے ہو سکتی ہے، تو جواب یہ ہے کہ اول تو یہ ضروری نہیں کہ ایک بار دیکھنے سے پہچان نہ ہو اور اگر علی سبیل التنزل شناخت کے لئے تکرار مشاہدہ ہی کی ضرورت ہے تو) انھوں نے (یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے) اس فرشتہ کو ایک اور دفعہ بھی (صورتِ اصلیہ میں) دیکھا ہے (پس اب تو وہ توہم بھی مدفوع ہو گیا، کیونکہ تطابق صورتین سے پوری تعیین ہو گئی کہ ہاں جبرئیل علیہ السلام ہی ہیں، آگے اس دوبارہ دیکھنے کی جگہ بتلاتے ہیں کہ کہاں دیکھا یعنی شبِ معراج میں دیکھا ہے) سدرۃ المنتہیٰ کے پاس (سدرہ کہتے ہیں بیری کے درخت کو اور منتہیٰ کے معنی ہیں انتہاء کی جگہ، حدیث میں آیا ہے کہ یہ ایک درخت ہے بیری کا، ساتویں آسمان میں عالمِ بالا سے جو احکام و ارزاق وغیرہ آتے ہیں وہ اول سدرۃ المنتہیٰ تک پہونچتے ہیں پھر وہاں سے ملائکہ زمین پر لاتے ہیں، اسی طرح

یہاں سے جو اعمال صعود کرتے ہیں وہ بھی سدرۃ المنتہیٰ تک پہونچتے ہیں، پھر وہاں سے اوپر اٹھالئے جاتے ہیں، دنیا میں اس کی مثال ڈاکخانہ کی سی ہے کہ آمد و برآمدِ خطوط وہاں سے ہوتی ہے، اور عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى میں تو امکانِ رویت بتلایا تھا، آگے اس مکان کا شرف بتلاتے ہیں کہ) اس (سدرۃ المنتہیٰ) کے قریب جنت المأویٰ ہے (ماویٰ کے معنی رہنے کی جگہ، چونکہ جنت نیک بندوں کے رہنے کی جگہ ہے اس لئے جنت الماویٰ کہتے ہیں، حاصل یہ کہ وہ سدرۃ المنتہیٰ ایک ممتاز موقع ہے، اب بعد تعیین مکانِ رویت کے رویت کا زمانہ بتلاتے ہیں کہ رویت کب ہوئی، پس فرماتے ہیں کہ) جب اس سدرۃ المنتہیٰ کو لپٹ رہی تھیں جو چیزیں لپٹ رہی تھیں (ایک روایت میں ہے کہ سونے کے پروانے تھے، یعنی صورت پروانہ کی سی تھی اور ایک روایت میں ہے کہ وہ فرشتے تھے، یعنی حقیقت اُن کی یہ تھی، اور ایک روایت میں ہے کہ ملائکہ نے حق تعالیٰ سے اجازت چاہی تھی کہ ہم بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کریں ان کو اجازت ہوگئی، وہ اس سدرہ پر جمع ہوگئے تھے، (الروایات کلہا فی الدر المنثور) اس میں بھی اشارہ ہوسکتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معزز و مکرم ہونے کی طرف، اور باقی وہی تقریر ہے جو تقیید سابق میں بیان کی گئی، اب ایک احتمال یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایسی حیرت انگیز چیزیں دیکھ کر نگاہ چکرا جاتی ہے پوری طرح ادراک پر قدرت نہیں رہتی، پس اس صورت میں جبرئیل علیہ السلام کی صورت کا کیا ادراک ہوگا، جب یہ ادراک ثانی معتبر نہ ہوا تو پھر اس خدشہ مذکورہ کا جو جواب لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى سے دیا گیا ہے وہ کافی نہ ہوا اس احتمال کے رفع کے لئے فرماتے ہیں کہ آپ ان عجائب کو دیکھ کر ذرا نہیں چکرائے اور بالکل متحیر نہیں ہوئے، چنانچہ جن چیزوں کی رویت کا حکم تھا اُن کی طرف نظر کرنے سے آپ کی) نگاہ نہ تو ہٹی (بلکہ اُن چیزوں کو خوب دیکھا) اور (جن چیزوں کے دیکھنے کا حکم جب تک نہ ہوا) نہ (ان کی طرف دیکھنے کو آپ کی نگاہ) بڑھی (یعنی قبل اذن نہیں دیکھا، کذا فی المدارک فی الفرق بین زاغ وطغیٰ، یہ دلیل ہے آپ کے غایت استقلال کی، کیونکہ عجیب چیزوں میں آکر آدمی یہی دو حرکتیں کیا کرتا ہے جن چیزوں کے دیکھنے کو کہا جاتا ہے ان کو تو دیکھتا نہیں اور جن کے لئے نہیں کہا گیا ان کو تکتا ہے، غرض اس میں انضباط نہیں رہتا، آگے آپ کے استقلال کی قوت بیان کرنے کے لئے فرماتے ہیں کہ) انھوں نے (یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے) اپنے پروردگار (کی قدرت) کے بڑے بڑے عجائبات دیکھے (مگر ہر چیز کے دیکھنے میں آپ کی یہی شان رہی مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى، وہ عجائبات احادیثِ معراج میں آئے ہیں، انبیاء علیہم السلام کو دیکھنا ارواح کو دیکھنا جنت وغیرہ کو دیکھنا، پس ثابت ہوا کہ آپ میں غایت استقلال ہے، پس متحیر ہوجانے کا احتمال نہیں پس خدشہ کا جو جواب لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى میں مذکور تھا وہ سالم رہا، غرض تمام تر تقریر سے رویت و معرفت جبرئیلؑ کے متعلق شبہ مندفع ہوکر امر رسالت ثابت اور متحقق ہوگیا جو کہ مقصود مقام تھا)

۱۳

معارف و مسائل

سورۂ نجم کی خصوصیات | سورۂ نجم پہلی سورت ہے جس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ میں اعلان فرمایا (رواہ عبداللہ بن مسعودؓ، قرطبی) اور یہی سب سے پہلی سورت ہے جس میں آیت سجدہ نازل ہوئی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدۂ تلاوت کیا، اور اس سجدہ میں ایک عجیب صورت یہ پیش آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سورت مجمع عام میں تلاوت فرمائی، جس میں مسلمان اور کفار سب شریک تھے، جب آپؐ نے آیت سجدہ پر سجدہ ادا کیا تو مسلمان تو آپؐ کے اتباع میں سجدہ کرتے ہی، سب نے حضورؐ کے ساتھ سجدہ کیا، تعجب کی چیز یہ پیش آئی کہ جتنے کفار و مشرکین موجود تھے وہ بھی سب سجدہ میں گر گئے، صرف ایک متکبر شخص جس کے نام میں اختلاف ہے، ایسا رہا جس نے سجدہ نہیں کیا، مگر زمین سے ایک مٹھی مٹی کی اٹھا کر پیشانی سے لگالی، اور کہنے لگا کہ بس یہی کافی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود راوی حدیث فرماتے ہیں کہ میں نے اس شخص کو کفر کی حالت میں مرا ہوا دیکھا ہے (رواہ البخاری و مسلم و اصحاب السنن، ابن کثیر ملخصاً)

اس سورت کے شروع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسولِ برحق ہونے اور آپ پر نازل ہونیوالی وحی میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہونے کا بیان ہے۔

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى، لفظ نجم ستارے کے معنی میں آتا ہے، ہر ایک ستارے کو نجم اور جمع نجوم بولی جاتی ہے، اور کبھی یہ لفظ خاص طور سے ثریا ستارے کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو چند ستاروں کا مجموعہ ہے، اس آیت میں بھی بعض حضرات نے نجم کی تفسیر ثریا سے کی ہے، فرّاء اور حضرت حسن بصریؒ نے پہلی تفسیر یعنی مطلق ستارے کو ترجیح دی ہے (قرطبی) اسی کو اوپر خلاصۂ تفسیر میں اختیار کیا گیا ہے۔

اِذَا هَوٰى لفظ ہَوٰی، ساقط ہونے اور گرنے کے معنی میں آتا ہے، ستارے کا گرنا اس کا غروب ہونا ہے، اس آیت میں حق تعالیٰ نے ستاروں کی قسم کھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کا حق و صحیح اور شکوک سے بالاتر ہونا بیان فرمایا ہے، سورۂ صافات میں مفصل گزر چکا ہے کہ حق تعالیٰ کو اختیار ہے کہ وہ خاص مصالح اور حکمتوں کے لئے اپنی خاص خاص مخلوقات کی قسم کھاتے ہیں، دوسروں کو اس کی اجازت نہیں کہ اللہ کے سوا کسی کی قسم کھائے، یہاں حق تعالیٰ نے ستاروں کی قسم کھائی جس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ ستارے اندھیری رات میں سمتیں اور راستے بتانے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں اور ان سے سمت مقصود کی طرف ہدایت ہوتی ہے، ایسے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ کے راستے کی طرف ہدایت ہوتی ہے۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى، یہ جواب قسم ہے یعنی وہ مضمون ہے جس کے لئے قسم کھائی گئی ہے معنی اس کے یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس راستے کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں وہ صراط مستقیم

اور منزل مقصود یعنی رضائے الٰہی کا صحیح راستہ ہے نہ آپ راستہ بھولے ہیں اور نہ غلط راستہ پر چلتے ہیں۔

آنحضرتؐ کو لفظ صَاحِبُکُمْ سے تعبیر کرنے کی حکمت

اس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک یا لفظ رسول و نبی ذکر کرنے کے بجائے آپ کی ذات کو لفظ صَاحِبُکُمْ سے تعبیر کرنے میں اشارہ اس طرف ہے کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کہیں باہر سے نہیں آئے، کوئی اجنبی شخص نہیں ہیں جن کے صدق و کذب میں تمہیں اشتباہ رہے بلکہ وہ تمہارے ہر وقت کے ساتھی ہیں، تمہارے وطن میں پیدا ہوئے ہیں یہیں بچپن گذارا، یہیں جوان ہوئے انکی زندگی کا کوئی گوشہ تم سے مخفی نہیں، اور تم نے تجربہ کرلیا ہے کہ انھوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، کسی غلط اور بُرے کام میں تم نے اُن کو بچپن میں بھی نہیں دیکھا، اُن کے اخلاق و عادات، ان کی امانت و دیانت پر تم سب کو اتنا اعتماد تھا کہ پورے مکہ والے آپ کو امین کہا کرتے تھے، اب دعوائے نبوت کے وقت تم ان کی طرف جھوٹ کی نسبت کرنے لگے، جس نے انسانوں کے معاملہ میں کبھی جھوٹ نہ بولا ہو، غضب ہے کہ اس پر یہ الزام لگانے لگے کہ اس نے خدا تعالیٰ کے معاملہ میں جھوٹ بولا ہے، اس لئے آگے فرمایا:

مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى، اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے باتیں بنا کر اللہ کی طرف منسوب کریں اس کا قطعاً کوئی امکان نہیں، بلکہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کیا ہوا ہوتا ہے، وحی کی بہت سی اقسام احادیث بخاری سے ثابت ہیں، ان میں ایک قسم وہ ہے جس کے معنی اور الفاظ سب حق تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتے ہیں، جس کا نام قرآن ہے، دوسری وہ کہ صرف معنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس معنی کو اپنے الفاظ میں ادا فرماتے ہیں اس کا نام حدیث اور سنّت ہے، پھر حدیث میں جو مضمون حق تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے کبھی وہ کسی معاملہ کا صاف اور واضح فیصلہ اور حکم ہوتا ہے، کبھی کوئی قاعدہ کلیہ بتلایا جاتا ہے، جس سے احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اجتہاد سے نکالتے اور بیان کرتے ہیں، اس اجتہاد میں اس کا امکان ہوتا ہے کہ کوئی غلطی ہو جائے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء کی یہ خصوصیت ہے کہ جو احکام وہ اپنے اجتہاد سے بیان فرماتے ہیں ان میں اگر کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی اس کی اصلاح کر دی جاتی ہے وہ اپنے غلط اجتہاد پر قائم نہیں رہ سکتے، بخلاف دوسرے علماء مجتہدین کے کہ ان سے اجتہاد میں خطا ہو جائے تو وہ اس پر قائم رہ سکتے ہیں اور ان کی یہ خطا بھی عنداللہ صرف معاف ہی نہیں بلکہ دین کے سمجھنے میں جو اپنی پوری توانائی وہ خرچ کرتے ہیں اس پر بھی ان کو ایک ثواب ملتا ہے (کما فی الاحادیث الصحیحۃ المعروفۃ)

اس تقریر سے آیت مذکورہ پر اُس شبہ کا جواب بھی ہو گیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے ہیں وہ سب وحی من اللہ ہوتا ہے، تو اس سے لازم آتا ہے کہ آپ اپنی رائے اور اجتہاد سے کچھ نہیں فرماتے، حالانکہ احادیث صحیحہ میں متعدد واقعات ایسے مذکور ہیں کہ شروع میں آپ نے کوئی حکم دیا پھر بذریعہ

وحی اس کو بدلا گیا، جو علامت اس کی ہے کہ یہ حکم اللہ کی طرف سے نہیں تھا، بلکہ آپ کی رائے اور اجتہاد سے تھا، جواب اوپر آچکا ہے کہ بعض اوقات وحی کسی قاعدۂ کلیہ کی شکل میں آتی ہے، جس سے احکام کا استخراج کرنے میں پیغمبر کو اپنی رائے سے اجتہاد کرنا پڑتا ہے، چونکہ یہ قاعدہ کلیہ اللہ کی طرف سے آیا ہے اس لئے ان سب احکام کو بھی وحی من اللہ کہا گیا ہے، واللہ اعلم۔

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى، یہاں سے سترہویں آیت (لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى) تک تمام آیات میں اس کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، یہ اللہ کا کلام ہے، جو آپ کو اس طرح دیا گیا ہے کہ اس میں کسی التباس و تلبیس یا خطاء اور غلطی کا کوئی امکان نہیں رہتا۔

آیات نجم کی تفسیر میں ائمہ تفسیر کا اختلاف

ان آیات کے بارے میں ائمہ تفسیر سے دو تفسیریں منقول ہیں، ایک کا حاصل یہ ہے کہ ان سب آیات کو واقعۂ معراج کا بیان قرار دے کر حق تعالیٰ سے تعلیم بلا واسطہ اور رویت وقرب حق تعالیٰ کے ذکر پر محمول فرمایا، اور شَدِيْدُ الْقُوٰى، ذُوْمِرَّةٍ، فَاسْتَوٰى اور دَنٰى فَتَدَلّٰى سب کو حق تعالیٰ کی صفات وافعال قرار دیا، اور آگے جو رویت ومشاہدہ کا ذکر ہے اس سے بھی حق تعالیٰ کی رویت وزیارت مراد لی، صحابہ کرام میں حضرت انس اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ تفسیر منقول ہے، تفسیر مظہری میں اسی کو اختیار کیا ہے، اور بہت سے حضرات صحابہ وتابعین اور ائمہ تفسیر نے ان آیات کو جبرئیل علیہ السلام کے ان کی اصلی صورت میں دیکھنے کا بیان قرار دیا ہے، اور شَدِيْدُ الْقُوٰى وغیرہ جبرئیل امین کی صفات بتلائی ہیں، اس کی بہت سی وجوہ ہیں، تاریخی حیثیت سے بھی سورۂ نجم بالکل ابتدائی سورتوں میں سے ہے، اور حسب تصریح حضرت عبداللہ بن مسعود سب سے پہلی سورت جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ میں اعلاناً پڑھا ہے یہی سورت ہے، اور ظاہر یہی ہے کہ واقعہ معراج اس سے مؤخر ہے، لیکن اس میں کلام کیا جا سکتا ہے، اصل وجہ یہ ہے کہ حدیث مرفوع میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان آیات کی تفسیر رویت جبرئیلؑ سے منقول ہے، جس کے الفاظ مسند احمد میں یہ ہیں:۔

عَنِ الشَّعْبِيِّ عَنْ مَسْرُوْقٍ قَالَ كُنْتُ عِنْدَ عَائِشَةَ رض فَقُلْتُ اَلَيْسَ اللّٰهُ يَقُوْلُ (وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ، وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى) فَقَالَتْ اَنَا اَوَّلُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْهَا فَقَالَ اِنَّمَا ذَاكَ جِبْرِيْلُ لَمْ يَرَهٗ فِيْ صُوْرَتِهٖ

شعبی حضرت مسروقؓ سے نقل کرتے ہیں کہ وہ ایک روز حضرت صدیقہ عائشہؓ کے پاس تھے (رویتِ باری تعالیٰ کے مسئلہ میں گفتگو تھی) مسروقؒ کہتے ہیں کہ میں نے کہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ، وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى) حضرت صدیقہؓ نے فرمایا کہ پوری امت میں سب سے پہلے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

الَّتِیْ خُلِقَ عَلَیْھَا اِلَّا مَرَّتَیْنِ رَاٰہُ .... مُنْھَبِطًا مِّنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ سَادًّا اِعْظَمِ خَلْقِہٖ مَا بَیْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ، اخرجاہ فی الصحیحین من حدیث الشعبی (ابن کثیر)

اس آیت کا مطلب دریافت کیا ہے، آپؐ نے فرمایا کہ جس کے دیکھنے کا آیت میں ذکر ہے وہ جبرئیل علیہ السلام ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف دو مرتبہ ان کی اصلی صورت میں دیکھا ہے، آیت میں جس رُویت کا ذکر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ نے جبرئیل امین کو آسمان سے زمین کی طرف اُترتے ہوئے دیکھا کہ ان کے جُثّے نے زمین آسمان کے درمیان کی فضا کو بھر دیا تھا۔"

صحیح مسلم میں بھی یہ روایت تقریباً انہی الفاظ سے منقول ہے، اور فتح الباری کتاب التفسیر میں حافظ نے ابن مردویہ سے یہی روایت اسی سند کے ساتھ نقل کی ہے، جس میں صدیقہؓ کے الفاظ یہ ہیں:

اَنَا اَوَّلُ مَنْ سَاَلَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ ھٰذَا، فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ھَلْ رَاَیْتَ رَبَّکَ؟ فَقَالَ لَا اِنَّمَا رَاَیْتُ جِبْرَئِیْلَ مُنْھَبِطًا (فتح الباری، ص ۴۹۳ ج ۸)

"یعنی صدیقہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس آیت کے متعلق سب سے پہلے میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ آپؐ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ میں نے جبرئیلؑ کو اُترتے ہوئے دیکھا ہے"

اور صحیح بخاری میں شیبانی سے روایت ہے کہ انھوں نے حضرت زرؓ سے اس آیت کا مطلب پوچھا (فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی) انھوں نے جواب دیا کہ ہم سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے حدیث بیان کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل امین کو اس حالت میں دیکھا کہ ان کے چھ سو بازو تھے اور ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے آیت (مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی) کی تفسیر میں یہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل امین کو دیکھا اس حالت میں کہ وہ رفرف کے لباس میں تھے، اور زمین و آسمان کی درمیانی فضاء کو ان کے وجود نے بھر رکھا تھا۔

ابن کثیر کی تحقیق یہ سب روایات حدیث ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں نقل کر کے فرمایا ہے کہ سورۂ نجم کی آیات مذکورہ میں رویت اور قرب سے مراد جبرئیلؑ کی رویت اور قرب ہے، یہ قول صحابہ کرام میں سے حضرت ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا اور عبداللہ بن مسعود، ابوذر غفاری، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا ہے، اسی لئے ابن کثیرؒ نے آیات مذکورہ کی تفسیر میں فرمایا کہ:-

"ان آیات میں جس رویت اور قرب کا ذکر ہے وہ رویت و قرب جبرئیل امین کی مراد ہے جبکہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مرتبہ ان کی اصلی صورت میں دیکھا تھا، پھر دوسری مرتبہ شبِ معراج میں سدرۃ المنتہیٰ کے قریب دیکھا، اور یہ پہلی رُویت نبوت کے بالکل

ابتدائی زمانہ میں ہوئی، جبکہ جبرئیل علیہ السلام پہلی مرتبہ سورۂ اقرأ کی ابتدائی آیتوں کی وحی لے کر آئے، اس کے بعد وحی میں فترت یعنی وقفہ پیش آیا جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت غم اور تکلیف تھی، بارہا یہ خیالات دل میں آئے کہ پہاڑ سے گر کر جان دیدیں مگر جب کبھی ایسی صورت ہوتی تو جبرئیل امین غائبانہ ہو اسے آواز دیتے کہ اے محمدؐ آپ اللہ کے رسول ہیں برحق ہیں، اور میں جبرئیل ہوں، ان کی آواز سے آپؐ کا دل ٹھہر جاتا، اور سکون ہو جاتا تھا، جب کبھی ایسا خیال آیا اسی وقت جبرئیلؑ نے اس آواز کے ذریعہ تسلّی دی، مگر یہ تسلّیاں غائبانہ تھیں، یہاں تک کہ ایک روز جبرئیل امین بطحاء کے کھلے میدان میں اپنی اصلی صورت میں اس طرح ظاہر ہوئے کہ ان کے چھ سو باز و تھے اور پورے افق کو گھیر رکھا تھا، پھر جبرئیل امین آپؐ کے قریب آئے اور آپ کو وحیِ الٰہی پہونچائی، اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جبرئیل امین کی عظمت اور اللہ کے نزدیک جلالتِ قدر کی حقیقت روشن ہوئی، (ابن کثیر)

خلاصہ یہ ہے کہ امام ابن کثیر نے خود تفسیر مرفوع اور صحابہ کرام کے اقوال کی بناء پر سورۂ نجم کی آیات مذکورہ کی تفسیر یہی قرار دی ہے کہ اس میں رویت اور قرب جبرئیل کا مراد ہے، اور یہ پہلی رویت ہے جو اسی عالم میں مکہ مکرمہ کے افق پر ہوئی، بعض روایات میں اس رُویت کی یہ تفصیل آئی ہے کہ جبرئیل امین کو پہلی مرتبہ ان کی اصلی صورت میں دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر غشی طاری ہو گئی، تو پھر جبرئیل امین آدمی کی صورت میں آپؐ کے قریب آئے اور بہت قریب آگئے۔

دوسری رُویت کا تذکرہ آگے سورۂ نجم ہی کی آیت وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى میں آیا ہے، جو شب معراج میں ہوئی، مذکور الصدر وجوہ کی بناء پر عامۂ مفسّرین حضرات نے اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے، ابن کثیر کا مضمون تو ابھی اوپر گذرا ہے، قرطبی، ابوحیّان، امام رازی وغیرہ عموماً اسی تفسیر کو ترجیح دے رہے ہیں، سیدی حضرت حکیم الامّتؒ نے بھی اسی کو اختیار فرمایا ہے جو اوپر خلاصۂ تفسیر کے عنوان میں بیان ہو چکا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ سورۂ نجم کی ابتدائی آیات میں حق تعالیٰ کی رُویت کا ذکر نہیں ہے، بلکہ رُویتِ جبرئیل علیہ السلام مذکور ہے، نوویؒ نے شرح مسلم میں اور حافظ نے فتح الباری میں بھی یہی تفسیر اختیار فرمائی ہے۔

ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ، مِرّہ کے معنی قوت کے ہیں، یہ بھی جبرئیل امین کی دوسری صفت قوت وطاقت کی زیادتی بیان کرنے کے لئے ہے، تاکہ کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ وحی لانے والے فرشتے کے کام میں کوئی شیطان دخیل ہو سکتا ہے، کیونکہ جبرئیل امین اتنے قوی ہیں کہ شیطان اُن کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتا، اور فَاسْتَوٰى کے معنی "برابر ہو گئے" مراد یہ ہے کہ اوّل جب جبرئیل امین کو دیکھا تو وہ آسمان سے اُتر رہے تھے، اُترنے کے بعد افق بلند پر مستوی ہو کر بیٹھ گئے، اُفق کے ساتھ اعلیٰ کی قید میں یہ حکمت ہے کہ افق کا وہ حصّہ جو زمین کے ساتھ ملا ہوا نظر آتا ہے وہ عموماً نظروں سے مخفی رہتا ہے اس لئے افق بلند پر جبرئیل امین کو دکھلایا گیا،

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى، دَنٰى کے معنی "قریب ہوگیا"۔ اور تَدَلّٰى کے لفظی معنی "لٹک گیا" مراد جھک کر قریب ہوجانا ہے، فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى، قَابَ، کمان کی لکڑی جہاں دستہ پکڑنے کا ہوتا ہے، اور اس کے مقابل کمان کی ڈور (تانت) ہوتی ہے، ان دونوں کے درمیانی فاصلہ کو قاب کہا جاتا ہے، جس کا اندازہ تقریبی ایک ہاتھ سے کیا جاتا ہے، قَابَ قَوْسَيْنِ، یعنی دو کمانوں کی قاب فرمانے کی وجہ عرب کی ایک خاص عادت ہے کہ دو آدمی اگر آپس میں معاہدہ صلح اور دوستی کا کرنا چاہتے تو جیسی اس کی ایک علامت ہاتھ پر ہاتھ مارنے کی معروف و مشہور ہے، اسی طرح دوسری علامت جس سے دوستی کا مظاہرہ کیا جاتا تھا یہ تھی کہ دونوں شخص اپنی اپنی کمانوں کی لکڑی تو اپنی طرف کر لیتے اور کمان کی ڈور دوسرے کی طرف، اس طرح جب دونوں کمانوں کی ڈوریں آپس میں مل جاتیں تو باہمی قرب و مودّت کا اعلان سمجھا جاتا تھا، اس قرب کے وقت ان دونوں شخصوں کے درمیان دونوں قوسوں کے قاب کا فاصلہ رہتا تھا، یعنی تقریباً دو ہاتھ (یا ایک گز) اس کے بعد اَوْ اَدْنٰى کہہ کر یہ بھی بتلا دیا کہ یہ قرب و اتصال عام رسمی اتصال کی طرح نہیں تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ تھا۔

آیاتِ مذکورہ میں جبرئیلؑ کا بغایت قریب ہوجانا اس لئے بیان فرمایا گیا کہ یہ ثابت ہوجاوے کہ جو وحی انھوں نے پہنچائی ہے اس کے سننے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، اور یہ کہ اس قرب و اتصال کی وجہ سے یہ بھی احتمال نہیں رہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جبرئیل امین کو نہ پہچانیں اور کوئی شیطان مداخلت کر سکے۔

فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى، اَوْحٰى کی ضمیر فاعل حق تعالیٰ کی طرف راجع ہے اور عَبْدِهٖ کی ضمیر بھی، معنی یہ ہیں کہ جبرئیل امین کو معلّم کی حیثیت میں رسول اللہ صلی اللہ کے بالکل قریب بھیج کر حق تعالیٰ نے آپؐ کی طرف وحی نازل فرمائی۔

ایک علمی اشکال اور اس کا جواب

یہاں جو ظاہری شکل میں ایک علمی اشکال یہ محسوس ہوتا ہے کہ اوپر کی آیات میں ضمیریں جمہور مفسرین و محدثین نے جبرئیل امین کی طرف راجع کی ہیں، فَاسْتَوٰى سے لیکر فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى تک سب ضمیریں جبرئیلؑ ہی کی طرف راجع ہیں، اور اگلی آیات میں بھی بقول جمہور مفسرین جبرئیل علیہ السلام ہی کا ذکر ہے، تو صرف اس آیت میں اَوْحٰى اور عَبْدِهٖ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع کرنا نظم و نسقِ عبارت کے خلاف اور انتشارِ ضمائر کا موجب ہے۔

اس کا جواب استاذ محترم حضرت مولانا سید محمد انور شاہؒ نے یہ دیا ہے کہ نہ یہاں نظمِ کلام میں کوئی اختلال ہے نہ انتشار ضمائر، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سورۂ نجم کی شروع آیت میں اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى کا ذکر فرما کر جس مضمون کی ابتداء کی گئی ہے اسی کا نہایت منضبط بیان اس طرح کیا گیا کہ وحی بھیجنے والا تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں، مگر اس وحی کو پہنچانے میں ایک واسطہ جبرئیل کا تھا، چند آیات میں اس واسطہ کی توثیق پوری طرح کرنے کے بعد پھر اَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى فرمایا، تو یہ ابتدائی کلام کا تکملہ ہے، اور اس میں انتشارِ ضمیر اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ اَوْحٰى اور عَبْدِهٖ کی ضمیریں اس کے سوا کوئی احتمال ہی نہیں کہ وہ حق تعالیٰ کی طرف راجع ہو، اس لئے یہ

مرجع پہلے سے متعین ہے، اور مَآ اَوْحٰى یعنی جو کچھ وحی فرمانا تھا" اس کو مبہم رکھ کر اس کی عظمتِ شان کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، صحیح بخاری باب بدأ الوحی کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جو وحی کی گئی وہ سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات ہیں، واللہ اعلم۔

اس پورے نظمِ کلام سے قرآن کریم کی حقانیت اور اس کا ٹھیک کلامِ حق ہونا ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح حضرات محدثین احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سند اپنے سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک مکمل بیان کرتے ہیں، ان آیات میں حق تعالیٰ نے قرآن کی سند اس طرح بیان فرمادی کہ مُوحیٰ یعنی وحی کرنیوالا خود حق تعالیٰ ہے، اور معلّم و مبلّغ جو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان واسطۂ سند ہیں وہ جبرئیل امین ہیں، آیات مذکورہ میں جبرئیلؑ کی جلالتِ شان اور شدید القویٰ ہونا گویا اس واسطۂ سند کی تعدیل ہے۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى، فؤاد کے معنی قلب، اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ آنکھ نے جو کچھ دیکھا ہے قلب نے بھی اس کے ادراک میں کوئی غلطی نہیں کی، اسی غلطی اور خطا کو آیت میں لفظ کذب سے تعبیر کیا ہے کہ دیکھی ہوئی چیز کے ادراک میں قلب نے جھوٹ نہیں بولا، یعنی غلطی اور خطا نہیں کی، اور لفظ مَا رَاٰى کے معنی "جو کچھ دیکھا" قرآن کے الفاظ نے یہ متعین نہیں کیا کہ کیا دیکھا، اس کی تفسیر میں صحابہ و تابعین اور ائمۂ تفسیر کے وہی دو قول ہیں جو اوپر تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں کہ بعض کے نزدیک خود حق تعالیٰ کو دیکھنا مراد ہے (وہو قول ابن عباسؓ) اور بعض کے نزدیک جبرئیل امین کو ان کی اصلی صورت میں دیکھنا مراد ہے (وہو قول عائشہؓ وابن مسعود وابی ہریرۃ وابی ذر الغفاری رضی اللہ عنہم) اس تفسیر کے مطابق لفظ رَاٰى اپنے حقیقی معنی کے مطابق آنکھ سے دیکھنے کے لئے بولا گیا اور دیکھنے کے بعد ادراک و فہم جو قلب کا کام ہے وہ قلب کی طرف منسوب ہوا ہے، رؤیت کو مجازی طور پر رؤیتِ قلبیہ کے معنی میں لینے کی ضرورت پیش نہیں آئی (کما فعلہ القرطبی)

رہا یہ سوال کہ آیت میں ادراک کی نسبت قلب کی طرف کی ہے، حالانکہ مشہور حکماء کا قول ہے کہ ادراک کا تعلق عقل یا نفسِ ناطقہ سے ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کی بہت سی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ادراک و فہم کا اصل مرکز قلب ہے، اس لئے کبھی عقل کو بھی لفظ قلب سے تعبیر کر دیا ہے، جیسے آیت (لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ) میں قلب سے مراد عقل لی گئی ہے، کیونکہ قلب مرکزِ عقل ہے، آیاتِ قرآنیہ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وغیرہ اس پر شاہد ہیں۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى، یہاں بھی رَاٰهُ کی ضمیر میں وہی دو قول ہیں کہ حق تعالیٰ مراد ہیں، یا جبرئیل امین نَزْلَةً اُخْرٰى کے معنی دوسری مرتبہ کا نزول ہے، راجح تفسیر کے مطابق یہ نزول بھی جبرئیل امین کا ہے اور جیسا کہ پہلی رویت کا مقام قرآن کریم نے اسی عالم دنیا میں مکہ مکرمہ کا اُفق اعلیٰ بتلایا تھا، اسی طرح اس دوسری رویت کا مقام ساتویں آسمان میں سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى بتلایا، اور یہ ظاہر ہے کہ ساتویں آسمان پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریف لے جانا شبِ معراج میں ہوا ہے، اس سے اس

دوسری روایت کا وقت بھی فی الجملہ متعین ہوجاتا ہے، سِدرَہ لغت میں بیری کے درخت کو کہتے ہیں اور منتہیٰ کے معنی انتہا کی جگہ، ساتویں آسمان پر عرش رحمٰن کے نیچے یہ بیری کا درخت ہے، مسلم کی روایت میں اس کو چھٹے آسمان پر بتلایا ہے، اور دونوں روایتوں کی تطبیق اس طرح ہوسکتی ہے کہ اس کی جڑ چھٹے آسمان پر اور شاخیں ساتویں آسمان پر پھیلی ہوئی ہیں (قرطبی) اور عام فرشتوں کی رسائی کی یہ آخری حد ہے، اسی لئے اس کو منتہیٰ کہتے ہیں بعض روایات میں ہے احکامِ الٰہیہ اوّل عرشِ رحمٰن سے سدرۃ المنتہیٰ پر نازل ہوتے ہیں، یہاں سے متعلقہ فرشتوں کے سپرد ہوتے ہیں، اور زمین سے آسمان پر جانے والے اعمالنامے وغیرہ بھی فرشتے یہیں تک پہونچاتے ہیں، وہاں سے حق تعالیٰ کے سامنے پیشی کی اور کوئی صورت ہوتی ہے، مسند احمد میں یہ مضمون حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے (ابن کثیر)

عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى، مَاْویٰ کے معنی ٹھکانا اور آرام کی جگہ، جنت کو مَاْویٰ اس لئے فرمایا کہ انسان کا اصل ٹھکانا اور مقام یہی ہے، یہیں آدم و حوّا علیہما السلام کی تخلیق ہوئی ہے، یہیں سے اُن کو زمین پر اُتارا گیا، اور پھر یہیں اہلِ جنّت کا مقام ہوگا۔

جنت و دوزخ کا موجودہ مقام

اس آیت نے یہ بھی بتلا دیا کہ جنّت اس وقت بھی موجود ہے، جیسا کہ جمہور امّت کا عقیدہ یہی ہے کہ جنّت و دوزخ قیامت کے بعد پیدا نہیں کی جائیں گی، یہ دونوں مقام اس وقت بھی موجود ہیں، اس آیت نے جنّت کا محلِّ وقوع بھی بتلا دیا کہ وہ ساتویں آسمان کے اوپر، عرش رحمٰن کے نیچے ہے، گویا ساتواں آسمان جنّت کی زمین اور عرشِ رحمٰن اس کی چھت ہے، دوزخ کا محلِ وقوع کسی آیتِ قرآن یا روایتِ حدیث میں صراحۃً نہیں بتلایا، سورۂ طور کی آیت وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ سے بعض مفسرین نے یہ مفہوم نکالا ہے کہ دوزخ سمندر کے نیچے زمین کے قعر میں ہے، جس پر اس وقت کوئی بھاری اور سخت غلاف چڑھا ہوا ہے، جو قیامت میں پھٹ جائے گا، اور اس کی آگ پھیل کر پورے سمندر کو آگ میں تبدیل کردیگی۔

زمانۂ حال میں یورپ کے بہت سے ماہرین نے جو زمین کو برما کر ایک طرف سے دوسری طرف جانے کا راستہ بنانے کی کوشش سالہا سال جاری رکھی، اور بڑی سے بڑی مشینیں اس کام کے لئے ایجاد کیں، مختلف جماعتوں نے اس پر محنت خرچ کی، سب سے زیادہ جو جماعت کامیاب ہوئی وہ مشینوں کے ذریعہ زمین کی گہرائی میں چھ میل تک پہونچ سکی، مگر چھ میل کے بعد سخت پتھر نے ان کو عاجز کردیا، تو پھر دوسری جگہ سے کھدائی شروع کی، مگر وہی چھ میل کے بعد سخت پتھر سے سابقہ پڑا، متعدد جگہوں میں اس کا تجربہ کرنے کے بعد ان کی تحقیق یہ قرار پائی کہ چھ میل کی گہرائی کے بعد کوئی غلاف حجری پوری زمین پر چڑھا ہوا ہے، جس میں کوئی مشین کام نہیں کرسکتی، زمین کا قطر جو ہزاروں میل کا ہے اس میں سے سائنس کے اس عروج کے زمانہ میں سائنس کی رسائی صرف چھ میل تک ہوسکی، آگے غلافِ حجری کا اقرار کرکے اپنی کوشش چھوڑنا پڑی، اس واقعہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ زمین پوری کسی غلافِ حجری سے بند کی ہوئی ہے، اگر کسی روایتِ صحیحہ سے جہنّم کا محلّ

وقوع اس غلاف کے اندر ہونا ثابت ہو جائے تو کچھ بعید نہیں، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی، یعنی جبکہ ڈھانپ لیا تھا سدرہ کو ڈھانپنے والی چیز نے، صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے یہ روایت ہے کہ اس وقت سدرۃ المنتہیٰ پر سونے کے بنے ہوئے پروانے ہر طرف گر رہے تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس روز سدرۃ المنتہیٰ کو خاص طور سے سجایا گیا تھا جس میں آنے والے مہمان حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اعزاز تھا۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی، زاغ، زیغ سے مشتق ہے، جس کے معنی ٹیڑھا یا بے راہ ہو جانا اور طغٰی طغیان سے مشتق ہے، جس کے معنی حد سے تجاوز کر جانے کے ہیں، مراد ان دونوں لفظوں سے یہ بیان کرنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا اس میں نظر نے کوئی خطا یا غلطی نہیں کی، یہ اس شبہ کا جواب ہے کہ بعض اوقات انسان کی نظر بھی خطا کر جاتی ہے، خصوصاً جبکہ وہ کوئی عجیب غیر معمولی واقعہ دیکھ رہا ہو اس شبہ کے جواب میں قرآن کریم نے دو لفظ استعمال فرمائے، کیونکہ نظر کی غلطی دو وجہ سے ہو سکتی ہے، ایک یہ کہ جس چیز کو دیکھنا چاہتا تھا نظر اُس سے ہٹ کر دوسری طرف چلی گئی، لفظ مَا زَاغَ سے اس قسم کی غلطی کی نفی کی گئی ہے کہ آپ کی نظر کسی دوسری چیز پر نہیں، بلکہ جس کو دیکھنا تھا ٹھیک اسی پر پڑی، دوسری وجہ نظر کی غلطی یہ ہو سکتی ہے کہ نظر پڑی تو اسی چیز پر جس کو دیکھنا مقصود تھا، مگر اس کے ساتھ وہ اِدھر اُدھر کی دوسری چیزوں کو بھی دیکھتی رہی، اس میں بھی بعض اوقات التباس ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے، اس قسم کی غلطی کے ازالہ کے لئے وَمَا طَغٰی فرمایا۔

جن حضرات نے آیاتِ سابقہ کی تفسیر رویتِ جبرئیل علیہ السلام سے کی ہے، وہ اس آیت کا بھی یہی مفہوم قرار دیتے ہیں کہ جبرئیل امین کو دیکھنے میں آنکھ نے کوئی غلطی نہیں کی، اس کے بیان کی ضرورت اس وجہ سے ہوئی کہ جبرئیل علیہ السلام واسطۂ وحی ہیں، اگر آپ ان کو اچھی طرح نہ دیکھیں اور نہ پہچانیں تو وحی شبہ سے خالی نہیں رہتی۔

اور جن حضرات نے آیاتِ سابقہ کی تفسیر رویت حق سبحانہ، سے کی ہے وہ یہاں بھی یہی فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ سبحانہ، کے دیدار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں نے کوئی غلطی نہیں کی، بلکہ صحیح صحیح دیکھا، البتہ اس آیت نے اس بات کو اور مزید واضح کر دیا کہ یہ رُویت بچشم سر ہوئی ہے، صرف دل کی رویت نہیں تھی۔

آیات مذکورہ کی تفسیر میں ایک اور تحقیق مفید

نمونۂ اسلافِ محدثین حضرت استاذ مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہٗ جو بلاشبہ اس زمانہ میں آیۃ من آیات اللہ اور حجۃ اللہ فی الارض تھے، ان کے علوم بلاشبہ حافظ ابن حجر اور ذہبی جیسے ائمۂ حدیث کے علوم کا نمونہ تھے، اور مشکلات القرآن پر آپ کی ایک مستقل تصنیف نہایت دقیق علوم و معارف کا خزانہ ہے، سورۂ نجم کی آیات میں چونکہ صحابہ وتابعین سے لے کر

ائمہ مجتہدین اور محدثین و مفسرین کے مختلف اقوال اور ان میں علمی اشکالات معروف و مشہور ہیں مشکلات القرآن میں آپ نے ان آیات کی تفسیر اس طرح فرمائی کہ بیشتر روایات میں تطبیق ہو جائے۔

پھر احقر کے دوسرے استاذ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رح نے جب صحیح مسلم کی شرح فتح الملہم تحریر فرمائی، اور اسراء و معراج کے بیان میں سورۂ نجم کی ان آیات کا حوالہ آیا تو مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر ان آیات کی تفسیر خود حضرت انور الاساتذہ قدس سرہٗ کے قلم سے لکھوا کر اس کو اپنی کتاب فتح الملہم کا جزء بنایا، اور اپنے فوائد القرآن میں بھی اسی کو اختیار فرمایا، اس طرح یہ تحقیق احقر کے دو بزرگ اساتذہ کی متفقہ تحقیق ہو گئی، اس کے دیکھنے سے پہلے چند باتیں پیش نظر رہنا چاہئے جو تقریباً سب علماء و ائمہ کے نزدیک مسلّم ہیں، اوّل یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل امین کو ان کی اصلی صورت میں دو مرتبہ دیکھا ہے، اور ان دونوں مرتبہ دیکھنے کا ذکر سورۂ نجم کی آیات مذکورہ میں موجود ہے، دوسری مرتبہ کس جگہ کس زمانہ میں دیکھا، اس کو تو انہی آیات میں متعین کر کے بتلا دیا ہے کہ یہ رویت ساتویں آسمان پر سدرۃ المنتہیٰ کے پاس ہوئی ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ ساتویں آسمان پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریف لے جانا صرف لیلۃ المعراج میں ہوا ہے، اس سے اس رویت کی جگہ بھی معلوم ہو گئی، اور وقت بھی، کہ وہ شب معراج میں ہوئی، پہلی رویت کے محل وقوع اور وقت کا تعین ان آیات میں نہیں ہے، مگر صحیح بخاری باب بدء الوحی میں حضرت جابر بن عبداللہ کی حدیث ذیل سے یہ دونوں چیزیں متعین ہو جاتی ہیں۔

قَالَ وَھُوَ یُحَدِّثُ عَنْ فَتْرَۃِ الْوَحیِ فَقَالَ فِیْ حَدِیْثِہٖ بینا اَنَا اَمْشِیْ اِذْ سَمِعْتُ صَوْتًا مِّنَ السَّمَآءِ فَرَفَعْتُ بَصَرِیْ فَاِذَا الْمَلَکُ الَّذِیْ جَاءَنِیْ بِحِرَاءٍ جَالِسٌ عَلٰی کُرْسِیٍّ بَیْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ فرعبت مِنْہُ فَرَجَعْتُ فَقُلْتُ زَمِّلُوْنِیْ فَاَنْزَلَ اللّٰہُ تَعَالٰی یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ اِلٰی قولہ وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ فَحَمِیَ الْوَحیُ وَتَتَابَعَ،

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی میں فترت یعنی وقفہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ (ایک روز) جبکہ میں چل رہا تھا اچانک آسمان کی طرف سے ایک آواز سنی، میں نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ وہی فرشتہ جو حرا میں میرے پاس آیا تھا آسمان و زمین کے درمیان (معلق) ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے، میں اس سے مرعوب ہو کر گھر لوٹ آیا اور کہا کہ مجھے ڈھانپ دو، اس وقت اللہ تعالیٰ نے سورۂ مدثر کی آیات وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ تک نازل فرمائیں، اور اس کے بعد وحی آسمانی مسلسل آنے لگی"۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جبرئیل امین کو ان کی اصلی صورت میں دیکھنے کا پہلا واقعہ فترۃ وحی کے زمانہ میں مکہ معظمہ کے اندر اس وقت پیش آیا جب کہ آپ شہر مکہ میں کہیں جا رہے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ پہلا واقعہ معراج سے پہلے زمین مکہ پر اور دوسرا واقعہ ساتویں آسمان پر شب معراج میں پیش آیا ہے۔

دوسری بات یہ بھی سب کے نزدیک مسلم ہے کہ سورۂ نجم کی ابتدائی آیات میں کم از کم آیت وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى سے لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى تک سب آیتیں واقعہ معراج کے متعلق ہیں۔

امور مذکورہ کے پیش نظر استاذ محترم حجۃ الاسلام حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ نے سورۂ نجم کی ابتدائی آیات کی تفسیر اس طرح فرمائی ہے کہ:

قرآن کریم نے اپنے عام اسلوب کے مطابق سورۂ نجم کی ابتدائی آیتوں میں دو واقعات کا ذکر فرمایا ہے ایک واقعہ جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اصلی صورت میں اس وقت دیکھنے کا ہے جب کہ آپ فترتِ وحی کے زمانے میں مکہ مکرمہ میں کسی جگہ جا رہے تھے، اور یہ واقعہ اسراء و معراج سے پہلے کا ہے۔

دوسرا واقعہ شبِ معراج کا ہے، جس میں جبرئیل امین کو ان کی اصلی صورت میں دوبارہ دیکھنے سے کہیں زیادہ دوسرے عجائب اور اللہ تعالیٰ کی آیاتِ کبریٰ کا دیکھنا مذکور ہے، ان آیاتِ کبریٰ میں خود حق تعالیٰ سبحانہ کی زیارت و رویت کا شامل ہونا بھی محتمل ہے۔

سورۂ نجم کی ابتدائی آیات کا اصل مضمون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آپ کی وحی میں شبہات نکالنے والوں کا جواب ہے کہ ستاروں کی قسم کھا کر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ ارشادات امت کو دیتے ہیں، نہ ان میں کسی غیر اختیاری غلطی کا امکان ہے نہ اختیاری غلطی کا، اور یہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں اپنی کسی نفسانی غرض سے نہیں کہتے، بلکہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی وحی ہوتی ہے، پھر چونکہ یہ وحی حضرت جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے بھیجی جاتی ہے وہ بحیثیت معلم و مبلغ وحی پہونچاتے ہیں اس لئے جبرئیل امین کی مخصوص صفات اور عظمتِ شان کا بیان کئی آیتوں میں ذکر فرمایا، اس میں زیادہ تفصیل کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ مشرکینِ مکہ اسرافیل، میکائیل فرشتوں سے تو واقف تھے، جبرئیل سے واقف نہ تھے، بہرحال جبرئیلؑ کی صفات بیان کرنے کے بعد پھر اصل مضمونِ وحی کو بیان فرمایا فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى، یہاں تک یہ سب گیارہ آیتیں ہیں جن میں وحی و رسالت کی توثیق کے ضمن میں جبرئیل امین کی صفات کا ذکر ہے، اور غور کیا جائے تو یہ سب صفات جبرئیل امین پر بے تکلف صادق آتی ہیں، ان کو اگر اللہ تعالیٰ کی صفت قرار دیا جائے جیسا کہ بعض مفسرین نے کیا ہے تو تکلف و تاویل سے خالی نہیں، مثلاً شَدِيْدُ الْقُوٰى، ذُوْ مِرَّةٍ، دَنٰى فَتَدَلّٰى، فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى، ان کلمات کو تاویل کے ساتھ تو حق تعالیٰ کے لئے کہا جا سکتا ہے مگر بے تاویل و بے تکلف اس کا مصداق جبرئیل امین ہی ہو سکتے ہیں، اس لئے ان ابتدائی آیات میں جس رویت اور قرب و اتصال کا ذکر ہے، وہ سب حضرت جبرئیل علیہ السلام کی رویت سے متعلق قرار دینا ہی اقرب و اسلم معلوم ہوتا ہے،

البتہ اس کے بعد بارہویں آیت مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى، سے لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى، تک جن میں واقعہ اسراء و معراج کا بیان ہو رہا ہے، اس میں بھی جبرئیل امین کا دوبارہ بصورت اصلیہ دیکھنا اگرچہ مذکور ہے، مگر دوسری آیات کبریٰ کے ضمن میں ہے، جن میں رویت باری تعالیٰ کے شامل

ہونے کا احتمال بھی جو مؤید بالا حادیث الصحیح واقوال صحابہ وتابعین ہے اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اس لئے مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى کی تفسیر یہ ہے کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آنکھ سے دیکھا آپ کے قلب مبارک نے اس کی تصدیق کی کہ صحیح دیکھا، اس تصدیق میں قلب مبارک نے کوئی غلطی نہیں کی، اسی کو مَا كَذَبَ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اس میں "جو کچھ دیکھا" کے الفاظ عام ہیں، ان میں جبرئیل امین کا دیکھنا بھی شامل ہے اور جو کچھ شب معراج میں آپ نے دیکھا وہ سب شامل ہے، اور اس میں سب سے اہم خود حق تعالیٰ کی رؤیت وزیارت ہے، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اگلی آیت میں ارشاد ہے اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى، جس میں مشرکین مکہ کو خطاب ہے کہ آپ نے جو کچھ دیکھا یا آئندہ دیکھیں گے وہ جھگڑا اور اختلاف کرنے یا شک شبہ میں پڑنے کی چیز نہیں عین حق وحقیقت ہے، اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا قَدْ رَاٰى، بلکہ عَلٰى مَا يَرٰى بصیغہ مستقبل فرمایا، جس میں اگلی رویت جو لیلۃ المعراج میں ہونے والی تھی اس کی طرف اشارہ اور اس کے بعد کی آیت وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى میں اس کی تصریح ہے، اور اس آیت میں بھی دونوں رویتوں کا احتمال ہے، یعنی رویت جبرئیل علیہ السلام اور رؤیت حق تعالیٰ، جبرئیل علیہ السلام کی رویت تو ظاہر ہے، اور حق تعالیٰ کی رویت کی طرف اشارہ اس طرح پایا جاتا ہے کہ رویت کے لئے قرب عادۃً ضروری ہے، جیسا کہ حدیث میں حق تعالیٰ کا نزول سماءِ دنیا کی طرف آخر شب میں مذکور ہے، عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى کا مفہوم یہ ہے کہ جس وقت آپ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس تھے جو مقام قرب ہے حق تعالیٰ کے ساتھ اس وقت دیکھا، اس میں حق تعالیٰ کی زیارت بھی مراد ہونے پر یہ حدیث شاہد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وَ رَاَيْتُ سِدْرَةَ الْمُنْتَهٰى فَغَشِيَتْنِيْ ضَبَابَةٌ خَرَرْتُ لَهَا سَاجِدًا وَهٰذِهِ الضَّبَابَةُ هِيَ الظُّلَلُ مِنَ الْغَمَامِ الَّتِيْ يَاْتِيْ فِيْهَا اللّٰهُ وَيَتَجَلّٰى،

"میں سدرۃ المنتہیٰ کے پاس پہونچا تو مجھے بادل کی طرح کی کسی چیز نے گھیر لیا، میں اس کے لئے سجدہ میں گر پڑا، قیامت کے روز محشر میں حق تعالیٰ کا ظہور قرآن کریم کی ایک آیت میں اسی طرح مذکور ہے کہ بادلوں کے سایہ کی طرح کی کوئی چیز ہوگی اس میں حق تعالیٰ نزولِ اجلال فرمائیں گے"۔

اسی طرح اگلی آیت مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى کا مفہوم بھی دونوں رویتوں کو شامل ہے، اور اس سے یہ مزید ثابت ہوا کہ یہ رؤیت حالتِ بیداری میں آنکھوں سے ہوئی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن آیات میں لیلۃ المعراج کا ذکر ہے ان میں رؤیت کے بارے میں جتنے الفاظ آئے ہیں ان سب میں رویتِ جبرئیل اور رویتِ حق سبحانہ دونوں محتمل ہیں، اور بعض حضرات نے اُن کی تفسیر رویتِ حق تعالیٰ سے کی ہے، اس کی گنجائش الفاظِ قرآن میں موجود ہے۔

رویتِ باری کا مسئلہ تمام صحابہ وتابعین اور جمہور امت اس پر متفق ہیں کہ آخرت میں اہل جنت و

عام مومنین حق تعالیٰ کی زیارت کریں گے، جیسا کہ احادیث صحیحہ اس پر شاہد ہیں، اس سے اتنا معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی رویت و زیارت کوئی امر محال یا ناممکن نہیں، البتہ عالم دنیا میں انسانی نگاہ میں اتنی قوت نہیں جو اس کو برداشت کر سکے اس لئے دنیا میں کسی کو رویت و زیارت حق تعالیٰ کی نہیں ہو سکتی، آخرت کے معاملہ میں خود قرآن کریم کا ارشاد ہے فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ، یعنی آخرت میں انسان کی نگاہ تیز اور قوی کر دی جائیگی اور پردے ہٹا دیئے جائیں گے، حضرت امام مالکؒ نے فرمایا کہ دنیا میں کوئی انسان اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتا کیونکہ اس کی نگاہ فانی ہے، اور اللہ تعالیٰ باقی، پھر جب آخرت میں انسان کو غیر فانی نگاہ عطا کر دی جائے گی تو حق تعالیٰ کی رویت میں کوئی مانع نہ رہے گا، تقریباً یہی مضمون قاضی عیاضؒ سے بھی منقول ہے، اور صحیح مسلم کی ایک حدیث میں اس کی تقریباً تصریح ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: وَاعْلَمُوا اَنَّكُمْ لَنْ تَرَوْا رَبَّكُمْ حَتّٰى تَمُوْتُوْا (فتح الباری، ص ۴۹۳ ج ۸) اس سے امکان تو اس کا بھی نکل آیا کہ عالم دنیا میں بھی کسی وقت خصوصی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں وہ قوت بخش دی جائے جس سے وہ حق تعالیٰ کی زیارت کر سکیں لیکن اس عالم سے باہر نکل کر جبکہ شب معراج میں آپؐ کو آسمانوں اور جنت و دوزخ اور اللہ تعالیٰ کی خاص آیات قدرت کا مشاہدہ کرانے ہی کے لئے امتیازی حیثیت سے بلایا گیا، اس وقت تو حق تعالیٰ کی زیارت اس عام ضابطہ سے بھی مستثنیٰ ہے کہ اس وقت آپؐ اس عالم دنیا میں نہیں ہیں، ثبوت امکان کے بعد مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ کیا رویت واقع ہوئی یا نہیں؟ اس معاملہ میں روایات حدیث مختلف اور آیات قرآن محتمل ہیں، اسی لئے صحابہ و تابعین اور ائمہ دین میں یہ مسئلہ ہمیشہ زیر اختلاف ہی رہا، ابن کثیرؒ نے ان آیات کی تفسیر میں فرمایا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے رویت حق سبحانہ و تعالیٰ کو ثابت فرماتے ہیں، اور سلف صالحین کی ایک جماعت نے ان کا اتباع کیا ہے، اور صحابہ و تابعین کی بہت سی جماعتوں نے اس سے اختلاف کیا ہے، آگے دونوں جماعتوں کے دلائل وغیرہ بیان کئے ہیں۔

اسی طرح حافظؒ نے فتح الباری تفسیر سورۃ نجم میں اس اختلاف صحابہ و تابعین کے ذکر کرنے کے بعد بعض اقوال ایسے بھی نقل کئے جن سے ان دونوں مختلف اقوال میں تطبیق ہو سکے، اور فرمایا کہ قرطبی نے مُفہِم میں اس بات کو ترجیح دی ہے کہ ہم اس معاملہ میں کوئی فیصلہ نہ کریں، بلکہ توقف اور سکوت اختیار کریں، کیونکہ یہ مسئلہ کوئی عملی مسئلہ نہیں جس کے کسی ایک رُخ پر عمل کرنا ناگزیر ہو، بلکہ یہ مسئلہ عقیدہ کا ہے جس میں جب تک قطعی الثبوت دلائل نہ ہوں کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا، اور جب تک کسی امر میں قطعی بات نہ معلوم ہو حکم ثبوت اور توقف کا ہے، (فتح الباری، ص ۴۹۴ ج ۸) احقر کے نزدیک یہی اسلم و احوط ہے، اس لئے اس مسئلہ کے دو طرفہ دلائل و جوہات کو ذکر نہیں کیا، واللہ سبحانہٗ و تعالیٰ اعلم

أَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ﴿١٩﴾ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرٰى ﴿٢٠﴾ أَلَكُمُ

بھلا تم دیکھو تو لات اور عزّیٰ کو ، اور منات تیسرے پچھلے کو ، کیا تم کو تو

الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنْثٰى ﴿٢١﴾ تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزٰى ﴿٢٢﴾ إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ

ملے بیٹے اور اس کو بیٹیاں ، یہ بانٹا تو بہت بھونڈا ، یہ سب نام ہیں جو

سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ إِنْ

رکھ لئے ہیں تم نے اور تمھارے باپ دادوں نے اللہ نے نہیں اُتاری ان کی کوئی سند محض

يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنْ

اٹکل پر چلتے ہیں ، اور جو جیوں کی امنگ ہے ، اور پہنچی ہے ان کو ان کے

رَبِّهِمُ الْهُدٰى ﴿٢٣﴾ أَمْ لِلْإِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى ﴿٢٤﴾ فَلِلّٰهِ الْآخِرَةُ وَالْأُولٰى ﴿٢٥﴾

ع ۱ ۲۵ ۵

رب سے راہ کی سوجھ ، کہیں آدمی کو ملتا ہو جو کچھ چاہے ، سو اللہ کے ہاتھ ہی سب بھلائی پچھلی اور پہلی

وَكَمْ مِنْ مَلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِنْ بَعْدِ

اور بہت فرشتے ہیں آسمانوں میں کچھ کام نہیں آتی ان کی سفارش مگر جب حکم

أَنْ يَأْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَرْضٰى ﴿٢٦﴾ إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ

دے اللہ جس کے واسطے چاہے اور پسند کرے ، جو لوگ یقین نہیں رکھتے آخرت کا

لَيُسَمُّونَ الْمَلٰئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْأُنْثٰى ﴿٢٧﴾ وَمَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِنْ

وہ نام رکھتے ہیں فرشتوں کے زنانے نام ، اور ان کو اس کی کچھ خبر نہیں ، محض

يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ﴿٢٨﴾

اٹکل پر چلتے ہیں ، اور اٹکل کچھ کام نہ آئے ٹھیک بات میں ،

خُلاصۂ تفسیر

دا ے مشرکو بعد اس کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ناطق بالحق و متبع للوحی ہونا ثابت ہوگیا اور آپ اس وحی سے توحید کا حکم فرماتے ہیں، جو کہ دلائل عقلیہ سے بھی ثابت ہے، اور تم پھر بھی بتوں کی پرستش کرتے ہو تو) بھلا تم نے (کبھی ان بتوں کے مثلاً) لات اور عزّیٰ اور ایک تیسرے منات کے حال میں غور بھی

کیا ہو (تاکہ تم کو معلوم ہوتا کہ وہ قابلِ پرستش ہیں یا نہیں، پس کلمہ فاَ سے یہ فائدہ ہوا کہ آپ کی تنبیہ کے بعد متنبہ ہونا چاہئے تھا، اور توحید کے متعلق ایک اور بات قابلِ غور ہے کہ تم جو ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں قرار دے کر معبود کہتے ہو تو) کیا تمھارے لئے تو بیٹے (تجویز) ہوں اور خدا کے لئے بیٹیاں (تجویز ہوں یعنی جن لڑکیوں کو تم عار و ننگ و قابلِ نفرت سمجھتے ہو وہ خدا کی طرف نسبت کی جاویں) اس حالت میں تو یہ بہت بے ڈھنگی تقسیم ہوئی، (کہ اچھی چیز تمھارے حصے میں اور بُری چیز خدا کے حصہ میں، نعوذ باللہ منہ، یہ بناءً علی العرف فرمایا ورنہ خدا تعالیٰ کے لئے بیٹا تجویز کرنا بھی بے ڈھنگی بات ہے) یہ (معبودات مذکورہ اصنام و ملائکہ بعقیدۂ مذکورہ) نرے نام ہی نام ہیں، (یعنی یہ مسمّیات خدا ہونے کی حیثیت سے کوئی موجود چیز ہی نہیں بلکہ مثل ان اسماء کے ہیں جن کا کہیں کوئی مصداق نہ ہو) جن کو تم نے اور تمھارے باپ دادوں نے (آپ ہی) ٹھہرا لیا ہے، خدا تعالیٰ نے تو ان (کے معبود ہونے) کی کوئی دلیل (عقلی یا نقلی) بھیجی نہیں (بلکہ) یہ لوگ (اس اعتقادِ اُلُوہیتِ غیر اللہ میں) صرف بے اصل خیالات پر اور اپنے نفس کی خواہش پر (جو کہ ان بے اصل خیالات سے پیدا ہوتی ہے) چل رہے ہیں (دونوں میں فرق یہ ہوا کہ ہر عمل سے پہلے ایک عقیدہ ہوتا ہے، اور ایک عزم و ارادہ جو عمل کے لئے محرک ہوتا ہے، پس دونوں سے دونوں کی طرف اشارہ ہے) حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کی جانب سے (بواسطۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جو حق گو اور وحیِ الٰہی کے پیرو ہیں آپ سے) ہدایت (امر واقعی کی) آچکی ہے (یعنی خود اپنے دعوے پر تو کوئی دلیل نہیں رکھتے، اور اس دعوے کی تفصیل پر رسولؐ کے ذریعہ سے دلیل سنتے ہیں، اور پھر نہیں مانتے، یہ تو گفتگو تھی اللہ کے سوا کسی کے معبود ہونے کے ابطال میں، آگے اس کا بیان ہے کہ تم نے جو بُتوں کو اس غرض سے معبود مانا ہے کہ یہ اللہ کے پاس تمھاری شفاعت کریں گے یہ غرض بھی محض دھوکہ اور باطل ہے، سو جو کہ) کیا انسان کو اس کی ہر تمنا مل جاتی ہے (واقعہ ایسا نہیں ہے، کیونکہ ہر تمنا) سو خدا ہی کے اختیار میں ہے، آخرت (کی بھی) اور دنیا (کی بھی ہیں وہ جس کو چاہیں پورا فرمادیں، اور نصِ قطعی میں یہ بتلا دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس تمنائے باطل کو پورا کرنا نہیں چاہیں گے نہ دنیا میں اُن کی دنیوی حاجات میں شفاعت کریں نہ آخرت میں کہ وہاں عذاب سے نجات کی شفاعت کریں اس لئے یقیناً وہ پوری نہ ہوگی) اور (بیچارے بُت تو کیا شفاعت کرتے کہ ان میں خود اہلیت ہی شفاعت کی نہیں، اس دربار میں تو جو لوگ اہل ہیں ان کی بھی بلا اجازت حق کچھ نہیں چلتی چنانچہ) بہت سے فرشتے آسمانوں میں موجود ہیں (شاید اس میں اشارہ ہو علوِ شان کی طرف مگر باوجود اس علوِ شان کے) انکی سفارش ذرا بھی کام نہیں آسکتی (بلکہ خود شفاعت ہی نہیں پائی جاسکتی) مگر بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہیں اجازت دیدیں اور (اس کے لئے شفاعت کرنے سے) راضی ہوں (یرضیٰ اس لئے بڑھایا تاکہ کبھی مخلوق کا اذن بلا رضا بھی کسی دباؤ یا مصلحت سے ہو جاتا ہے، اللہ جلّ شانہ کے معاملہ میں اس کا کبھی دور کا کوئی احتمال نہیں کہ وہ کسی دباؤ سے مجبور ہو کر راضی ہو جاویں، آگے اس کا بیان ہے کہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی

اولاد قرار دیدینا کفر ہے کہ) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے (بلکہ اس کے انکار کی وجہ سے کافر ہیں) وہ فرشتوں کو (خدا کی) بیٹی کے نام سے نامزد کرتے ہیں (ان کی تعبیر بالکفر میں آخرت کی تخصیص سے شاید اس طرف اشارہ ہو کہ یہ سب ضلالتیں آخرت کی بے فکری سے پیدا ہوئی ہیں، ورنہ معتقدِ آخرت کو اپنی نجات کی مزورفکر رہتی ہے، اور یہاں اُنثیٰ بمعنے دختر کے ہیں، کمافی قولہ تعالیٰ وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى، اور جب ملائکہ کو خدا کے ساتھ شریک ٹھیرانے کے کفر ہونے کی تصریح فرمادی تو بتوں کے شریک ٹھیرانے کا کفر ہونا بدرجۂ اولیٰ ثابت ہو گیا اس لئے صرف اسی پر اکتفار کیا گیا، آگے اس کا بیان ہے کہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی لڑکیاں قرار دینے کا عقیدہ باطل ہے) حالانکہ ان کے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں صرف بے اصل خیالات پر چل رہے ہیں، اور یقیناً بے اصل خیالات امرِ حق (کے اثبات) میں ذرا بھی مفید نہیں ہوتے۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت اور آپ کی وحی کے محفوظ ہونے کے دلائل کا تفصیلی ذکر تھا، ان آیات میں اس کے بالمقابل مشرکینِ عرب کے اس فعل کی مذمت ہے کہ انھوں نے بغیر کسی دلیل کے مختلف بتوں کو اپنا معبود و کارساز بنا رکھا ہے، اور فرشتوں کو خدا تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے ہیں، اور بعض روایات میں ہے کہ ان بتوں کو بھی وہ خدا تعالیٰ کی بیٹیاں کہا کرتے تھے۔

مشرکینِ عرب کے بُت جن کی وہ پرستش کرتے تھے بے شمار ہیں، مگر ان میں سے تین زیادہ مشہور ہیں، اور اُن کی عبادت پر عرب کے بڑے بڑے قبائل لگے ہوئے تھے، لاتؔ، عُزّیٰ، مناتؔ، لاتؔ قبیلۂ ثقیف (اہلِ طائف) کا بُت تھا، عزّیٰ قریش کا اور مناتؔ بنی ہلال کا، ان بتوں کے مقامات پر مشرکین نے بڑے بڑے شاندار مکانات بنا رکھے تھے، جن کو کعبہ کی حیثیت دیتے تھے، فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو منہدم کرا دیا (قرطبی ملخصاً)

قِسْمَةٌ ضِيْزٰى، ضنو سے مشتق ہے، جس کے معنی ظلم کرنے اور حق تلفی کرنے کے ہیں، اسی لئے ابن عباسؓ نے قِسْمَةٌ ضِيْزٰى کے معنی ظالمانہ تقسیم کے کئے ہیں۔

ظن کے مختلف اقسام اور ان کے احکام

اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا، لفظ ظن عربی زبان میں مختلف معانی کے لئے بولا جاتا ہے، ایک معنی یہ بھی ہیں کہ بے بنیاد خیالات کو ظن کہا جاتا ہے، آیت میں یہی مراد ہے، اور یہی مشرکین مکہ کی بُت پرستی کا سبب تھا، اسی کے ازالہ کے لئے یہ فرمایا گیا ہے، دوسرے معنی ظن کے وہ ہیں جو یقین کے بالمقابل آتے ہیں، یقین کہا جاتا ہے اس علمِ قطعی مطابق للواقع کو جس میں کسی شک و شبہ کی راہ نہ ہو، جیسے قرآن کریم یا احادیث متواترہ سے حاصل شدہ علم، اس کے مقابل ظن اس علم کو کہا جاتا ہے جو بے بنیاد خیالات تو نہیں دلیل کی بنیاد پر قائم ہے، مگر یہ دلیل اس درجہ قطعی نہیں جس میں کوئی دوسرا

احتمال ہی نہ رہے، جیسے عام روایاتِ حدیث سے ثابت ہونے والے احکام، اسی لئے قسم اول کے مسائل کو قطعیات اور یقینیات کہا جاتا ہے، اور دوسری قسم کو ظنیات، اور یہ ظن شریعت میں معتبر ہے، قرآن و حدیث میں اس کے معتبر ہونے کے شواہد موجود ہیں، اور تمام امت کے نزدیک واجب العمل ہے، آیت مذکورہ میں ظن کو جو ناقابلِ اعتبار قرار دیا ہے اس سے مراد ظن بمعنی بے بنیاد و بے دلیل خیالات ہیں، اس لئے کوئی اشکال نہیں۔

فَأَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۭ ﴿۲۹﴾

سو تو دھیان نہ کر اس پر جو منہ موڑے ہماری یاد سے اور کچھ نہ چاہے مگر دنیا کا جینا،

ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ۭ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهٖ

بس یہیں تک پہنچی اُن کی سمجھ، تحقیق تیرا رب ہی خوب جانے اس کو جو بہکا اس کی راہ سے،

وَهُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى ﴿۳۰﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۙ لِيَجْزِيَ

اور وہی خوب جانے اس کو جو راہ پر آیا، اور اللہ کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں تاکہ وہ بدلہ دے

الَّذِينَ أَسَاءُوا بِمَا عَمِلُوا وَيَجْزِيَ الَّذِينَ أَحْسَنُوا بِالْحُسْنَى ۚ ﴿۳۱﴾

برائی والوں کو اُن کے کئے کا اور بدلہ دے بھلائی والوں کو بھلائی سے،

الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبٰٓئِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ إِلَّا اللَّمَمَ ۭ إِنَّ رَبَّكَ

جو کہ بچتے ہیں بڑے گناہوں سے اور بےحیائی کے کاموں سے مگر کچھ آلودگی، بیشک تیرے رب

وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۭ هُوَ أَعْلَمُ بِكُمْ إِذْ أَنْشَأَكُمْ مِّنَ الْأَرْضِ وَإِذْ

کی بخشش میں بڑی سمائی ہے، وہ تم کو خوب جانتا ہے جب بنا نکالا تم کو زمین سے اور جب تم

أَنْتُمْ أَجِنَّةٌ فِي بُطُونِ أُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوا أَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴿۳۲﴾ ع

بچے تھے ماں کے پیٹ میں سو مت بیان کرو اپنی خوبیاں، وہ خوب جانتا ہے اس کو جو بچ کر چلا

خلاصۂ تفسیر

(جب إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ اور جَاءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى سے مشرکین عرب کا معاند ہونا معلوم ہو گیا کہ باوجود نزولِ قرآن اور ہدایت کے یہ اپنے گمان اور ہوٰی پر چلتے ہیں، اور معاند سے قبولِ حق کی امید نہیں ہوتی) تو آپ ایسے شخص سے اپنا خیال ہٹا لیجئے جو ہماری نصیحت کا خیال نہ کرے، اور بجز

دنیوی زندگی کے اس کو کوئی (اخروی مطلب) مقصود نہ ہو (جس کی وجہ عدم ایمان بالآخرۃ ہے جو لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ سے اوپر مفہوم ہوا ہے اور) ان لوگوں کے فہم کی رسائی کی حد بس یہی (دنیوی زندگی) ہے (جب اُن کی بدفہمی اور بے فکری کی نوبت یہاں تک پہنچی ہے تو اُن کی فکر نہ کیجئے، اُن کا معاملہ اللہ کے حوالے کیجئے بس) تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون اس کے رستہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہی اس کو بھی خوب جانتا ہے جو راہِ راست پر ہے (اس سے تو اس کا علم ثابت ہوا) اور (اس سے قدرت ثابت ہو کہ) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اللہ ہی کے اختیار میں ہے، (جب وہ علم اور قدرت دونوں میں کامل ہے اور اس کے قانون اور احکام پر عمل کرنے کے اعتبار سے لوگوں کی دو قسمیں ہیں گمراہ اور ہدایت پر عمل کرنے والے تو) انجام کار یہ ہے کہ بُرا کام کرنے والوں کو اُن کے (بُرے) کام کے عوض میں (خاص طور کی) جزاء دے گا اور نیک کام کرنے والوں کو ان کے نیک کاموں کے عوض میں (خاص طور کی) جزاء دے گا (اس کا مقتضایہ ہے کہ اسی کے حوالہ کیجئے آگے ان لوگوں کا بیان ہے جو نیکوکار محسنین ہیں) وہ لوگ ایسے ہیں کہ کبیرہ گناہوں سے اور (ان میں) بے حیائی کی باتوں سے (بالخصوص زیادہ) بچتے ہیں مگر ہلکے ہلکے گناہ (کبھی کبھار ہو جائیں تو جس نکوکاری کا یہاں ذکر ہے اس میں اُن سے خلل نہیں آتا، مطلب استثنار کا یہ ہے کہ اَلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا یعنی محسنین جن کی اس آیت میں مدح کی گئی ہے اور ان کے محبوب عنداللہ ہونے کا اظہار کیا گیا ہے اس کا مصداق بننے کے لئے کبیرہ گناہوں سے بچنا تو شرط ہے، لیکن صغائر کا کبھی کبھی صدور اس محبوبیت کے منافی نہیں، البتہ صغیرہ گناہوں میں بھی یہ شرط ہے کہ اُن کی عادت نہ ڈال لے اور ان پر اصرار نہ کرے، کبھی اتفاقی طور پر ہو جائے، ورنہ اصرار اور عادت سے صغیرہ گناہ بھی کبیرہ ہو جاتا ہے، اور استثنار کا یہ مطلب نہیں کہ صغائر کی اجازت ہے اور کبائر سے اجتناب کی شرط کا یہ مطلب ہو کہ محسنین کو ان کے نیک عمل کی اچھی جزاء ملنا کبائر سے اجتناب پر موقوف ہے، کیونکہ مرتکبِ کبائر بھی جو حسنہ کرے گا اس کی جزاء پا دے گا، لقولہ تعالیٰ فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ، پس یہ شرط جزاء دینے کے اعتبار سے نہیں بلکہ اس کو محسن اور محبوب عنداللہ کا لقب دینے کے اعتبار سے ہے، جس پر عنوان اَحْسَنُوْا دلالت کرتا ہی خوب سمجھ لو، اور اوپر جو بدکاروں کو سزا دینے کا بیان آیا اس سے گناہگاروں کو نا امید کرنے کا وہم ہو سکتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا کہ ایمان و توبہ سے ہمت ہار دیں اور محسنین کو جزائے حسنہ دینے کے وعدہ سے ان کے عجب وغرور میں مبتلا ہونے کا ایہام اور خطرہ تھا، آگے ان دونوں ایہاموں کو رَد کیا گیا ہے) بلاشبہ آپ کے رب کی مغفرت بڑی وسیع ہے (گناہگاروں کو تدارکِ گناہ سے ہمت نہ ہارنی چاہئے، وہ اگر چاہے تو بجز کفر و شرک کے اور سیئات کو محض فضل سے معاف کر دیتا ہے تو تدارک سے کیوں معاف نہ کرے گا، اور اسی طرح محسنین کو عُجب اور فخر نہ کرنا چاہئے، کیونکہ حسنات میں بعض اوقات ایسے مخفی نقائص مل جاتے ہیں، جس کے سبب وہ قابلِ قبول نہیں رہتے اور عامل کو اس طرف التفات نہ ہونے سے اُن کی اطلاع بھی نہیں ہوتی، اور حق تعالیٰ کو تو علم ہوتا ہے جب وہ حسنہ مقبول نہیں تو ان کا کرنے والا محسن اور محبوب نہیں،

پھر عجب وغرور کیسا، اور یہ بات کہ تمہاری کسی حالت کی خود تم کو اطلاع نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کو اطلاع ہو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے بلکہ ابتدا ہی سے اس کا وقوع ہو رہا ہے، چنانچہ) وہ تم کو (اور تمہارے احوال کو اُس وقت سے) خوب جانتا ہے، جب تم کو (یعنی تمہارے جد امجد آدم علیہ السلام کو) زمین (کی خاک) سے پیدا کیا تھا (جن کے ضمن میں بواسطہ تم بھی مٹی سے مخلوق ہوئے) اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے (اور ان دونوں حالتوں میں تم کو خود اپنا کوئی علم نہ تھا اور ہم کو علم تھا، پس اسی طرح اب بھی تمہارا خود اپنے سے ناواقف ہونا اور ہمارا عالم وواقف ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں، جب یہ بات ہے) تو تم اپنے کو مقدس مت سمجھا کرو (کیونکہ) تقویٰ والوں کو وہی خوب جانتا ہے (کہ فلاں متقی ہے فلاں نہیں، گو صورۃً افعال تقویٰ کے دونوں سے صادر ہوتے ہوں)۔

معارف و مسائل

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ، یعنی آپ ایسے لوگوں سے اپنا خیال ہٹا لیجئے جو ہماری یاد سے رُخ پھیر لیں، اور دنیوی زندگی کے سوا ان کا کوئی مقصد نہ ہو، یہی اُن کا انتہائی علم و ہنر ہے۔

ضروری تنبیہ قرآن کریم نے یہ اُن کفار کا حال بیان کیا ہے جو آخرت و قیامت کے منکر ہیں، افسوس ہے کہ انگریزوں کی تعلیم اور دنیا کی ہوا و ہوس نے آجکل ہم مسلمانوں کا یہی حال بنا دیا ہے کہ ہمارے سارے علوم و فنون اور علمی ترقی کی ساری کوششیں صرف معاشیات کے گرد گھومنے لگیں، معادیات (معاملاتِ آخرت) کا بھول کر بھی دھیان نہیں آتا۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیتے ہیں، اور آپ کی شفاعت کی امید لگائے ہوئے ہیں، مگر حالت یہ ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی حالت والوں سے رُخ پھیر لینے کی ہدایت کرتا ہے، نعوذ باللہ منہ

اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ، اس آیت میں ہدایت ربانی کی پیروی کرنے والے محسنین (نیک لوگوں) کا ذکر مقام مدح میں فرما کر ان کی پہچان یہ بتلائی گئی ہے کہ وہ کبیرہ گناہوں سے عموماً اور فحش و بے حیائی کے کاموں سے بالخصوص دور رہتے ہیں، اس میں ایک استثناء بلفظ لَمَمَ فرمایا گیا ہے (جس کی تشریح آگے آتی ہے) اور حاصل استثناء کا وہی ہے جو اوپر خلاصہ تفسیر میں لکھا گیا کہ ان لوگوں کو جو مُحسن یعنی نیکوکار کا خطاب دیا گیا ہے، لَمَمَ میں ابتلاء ان کو اس خطاب سے محروم نہیں کرتا۔

لَمَمَ کی تفسیر میں صحابہ و تابعین سے دو قول منقول ہیں، ایک یہ کہ اس سے مراد صغیرہ گناہ ہیں جن کو سورۂ نساء کی آیت میں سیئات سے تعبیر فرمایا ہے، اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ، یہ قول حضرت ابن عباسؓ و ابو ہریرہؓ سے ابن کثیر نے نقل کیا ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ گناہ ہے جو انسان سے اتفاقی طور پر کبھی سرزد ہوگیا، پھر اس سے توبہ کرلی، اور توبہ کے بعد اس کے پاس نہیں گیا، یہ قول

بھی ابن کثیرؒ نے بروایت ابن جریر اوّل حضرت مجاہدؒ سے نقل کیا ہے، اور پھر ابن جریر ہی کی دوسری روایات میں یہ قول بواسطہ عطاءؒ حضرت ابن عباسؓ سے اور بروایت حضرت حسن بصری حضرت ابوہریرہؓ بھی نقل کیا ہے، اس کا بھی حاصل یہ ہے کہ کسی نیک آدمی سے کبھی اتفاقاً گناہ کبیرہ بھی سرزد ہوگیا اور اس نے توبہ کرلی تو یہ شخص بھی صالحین اور متقین کی فہرست سے خارج نہیں ہوگا، سورۂ آلِ عمران کی ایک آیت میں یہی مضمون بالکل واضح اور صریح آیا ہے، وہ یہ ہے کہ متقین کی صفات بیان کرنے کے ذیل میں فرمایا وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَنْ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ (یعنی وہ لوگ بھی متقین ہی میں داخل ہیں جن سے کوئی فحش کبیرہ گناہ سرزد ہوگیا یا وہ گناہ کرکے اپنی جان پر ظلم کر بیٹھے تو فوراً ان کو اللہ کی یاد آئی اور اپنے گناہوں سے مغفرت مانگی اور اللہ کے سوا گناہوں کو معاف بھی کون کرسکتا ہے، اور جو کچھ گناہ ہوگیا تھا اس پر جمے نہیں رہے) اور یہ بھی جمہور علماء کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ جس صغیرہ گناہ پر اصرار کیا جائے اور اس کی عادت ڈال لی جائے وہ بھی کبیرہ ہو جاتا ہے، اس لئے خلاصۂ تفسیر مذکور میں لَمَم کی تفسیر اُن صغیرہ گناہوں سے کی گئی ہے جن پر اصرار نہ کیا گیا ہو،

صغیرہ اور کبیرہ گناہ کی تعریف | یہ مضمون پوری تفصیل کے ساتھ سورۂ نساء کی آیت إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ کی تفسیر میں معارف القرآن جلد دوم، ص ۳۸۱ سے ۳۸۶ تک لکھ دیا گیا ہے، وہاں ملاحظہ فرما لیا جائے۔

هُوَ أَعْلَمُ بِكُمْ إِذْ أَنْشَأَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَإِذْ أَنْتُمْ أَجِنَّةٌ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ، اَجِنّہ جَنِین کی جمع ہے، بچہ جب تک ماں کے پیٹ میں ہے اس کو جنین کہا جاتا ہے، اس آیت میں حق تعالیٰ نے انسان کو اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ وہ خود اپنی جان کا بھی اتنا علم نہیں رکھتا، جتنا اس کے خالق سبحانہ کو ہے، کیونکہ ماں کے پیٹ میں جو تخلیق کے مختلف دور اس پر گذرے ہیں اس وقت وہ کوئی علم و شعور ہی نہ رکھتا تھا، مگر اس کا بنانے والا خوب جانتا تھا جس کی حکیمانہ تخلیق اس کو بنا رہی تھی، اس میں انسان کو عجز و کم علمی پر متنبہ کرکے یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ جو بھی کوئی اچھا اور نیک کام کرتا ہے وہ اس کا ذاتی کمال نہیں، خدا تعالیٰ کا بخشا ہوا انعام ہی ہے کہ کام کرنے کے لئے اعضاء و جوارح اُس نے بنائے، اُن میں حرکت کی قوت اس نے بخشی، پھر دل میں نیک کام کرنے کا داعیہ اور پھر اس پر عزم و عمل اسی کی توفیق سے ہوا، تو کسی بڑے سے بڑے نیک صالح اور متقی و پرہیزگار انسان کو بھی یہ حق نہیں پہونچتا کہ اپنے عمل پر فخر کرے، اور اس عمل کو اپنا کمال قرار دے کر غرور میں مبتلا ہو جائے، اس کے علاوہ سب چیزوں کا مدار خاتمہ اور انجام پر ہے، ابھی اس کا حال معلوم نہیں کہ خاتمہ کس حال پر ہوتا ہے تو فخر و غرور کرنا کس بات پر، اس ہدایت کو اگلی آیت میں اس طرح بیان فرمایا:-

فَلَا تُزَكُّوا أَنْفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ، یعنی تم اپنے نفس کی پاکی کا دعویٰ نہ کرو، کیونکہ اس کو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کون کیسا ہے اور کس درجہ کا ہے، کیونکہ مدار فضیلت تقویٰ پر ہے، ظاہری اعمال پر نہیں، اور تقویٰ بھی وہ معتبر ہے جو موت تک قائم رہے۔

حضرت زینب بنت ابی سلمہؓ کا نام اُن کے والدین نے بَرّہ رکھا تھا جس کے معنی ہیں نیکوکار، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت مذکورہ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ تلاوت فرما کر اس نام سے منع کیا کیونکہ اس میں اپنے نیک ہونے کا دعویٰ ہے، اور نام بدل کر زینب رکھ دیا، (رواہ مسلم فی صحیحہ، ابن کثیر)

امام احمدؒ نے عبدالرحمٰن بن ابی بکرہؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک دوسرے آدمی کی مدح و تعریف کی، آپ نے منع فرمایا اور فرمایا کہ تمہیں کسی کی مدح وثناء کرنا ہی ہو تو ان الفاظ سے کرو کہ میرے علم میں یہ شخص نیک متقی ہے، وَلَآ اُزَكِّيْ عَلَى اللّٰهِ اَحَدًا یعنی میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ کے نزدیک بھی وہ ایسا ہی پاک صاف ہے جیسا میں سمجھ رہا ہوں۔

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى ﴿۳۳﴾ وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى ﴿۳۴﴾ اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ

بھلا تو نے دیکھا اس کو جس نے مُنہ پھیر لیا، اور لایا تھوڑا سا اور سخت نکلا، کیا اس کے پاس خبر ہے غیب کی

فَهُوَ يَرٰى ﴿۳۵﴾ اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى ﴿۳۶﴾ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ

سو وہ دیکھتا ہے، کیا اس کو خبر نہیں پہنچی اس کی جو ہے ورقوں میں موسیٰ کے، اور ابراہیم کے جس نے کہ اپنا قول پورا

وَفّٰٓى ﴿۳۷﴾ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴿۳۸﴾ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا

اُتارا، کہ اُٹھاتا نہیں کوئی اٹھانے والا بوجھ کسی دوسرے کا، اور یہ کہ آدمی کو وہی ملتا ہے جو اُس نے

سَعٰى ﴿۳۹﴾ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ﴿۴۰﴾ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ﴿۴۱﴾

کمایا، اور یہ کہ اُس کی کمائی اس کو دکھلانی ضرور ہے، پھر اس کو بدلہ ملنا ہے پورا بدلہ،

وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ﴿۴۲﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى ﴿۴۳﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ

اور یہ کہ تیرے رب تک سب کو پہنچنا ہے، اور یہ کہ وہی ہے ہنساتا اور رُلاتا، اور یہ کہ وہی ہے

اَمَاتَ وَاَحْيَا ﴿۴۴﴾ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۴۵﴾ مِنْ

مارتا اور جلاتا، اور یہ کہ اس نے بنایا جوڑا نر اور مادہ، ایک بوند

نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ﴿۴۶﴾ وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى ﴿۴۷﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَ

سے جب ٹپکائی جائے، اور یہ کہ اس کے ذمہ ہے دوسری دفعہ اٹھانا، اور یہ کہ اس نے دولت دی اور

اَقْنٰى ﴿۴۸﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ﴿۴۹﴾ وَاَنَّهٗٓ اَهْلَكَ عَادَا اِۨلْاُوْلٰى ﴿۵۰﴾

خزانہ، اور یہ کہ وہی ہے رب شعریٰ کا، اور یہ کہ اس نے غارت کیا عاد پہلے کو،

وَثَمُوْدَا۟ فَمَآ اَبْقٰى ﴿۵۱﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَ

اور ثمود کو پھر کسی کو باقی نہ چھوڑا، اور نوح کی قوم کو پہلے ان سے وہ تو تھے اور بھی ظالم اور

اَطْغٰى ﴿۵۲﴾ وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى ﴿۵۳﴾ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ﴿۵۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ

شریر، اور اُلٹی بستی کو پٹک دیا، پھر آپڑا اس پر جو کچھ کہ آپڑا، اب تو کیا کیا نعمتیں اپنے رب

تَتَمَارٰى ﴿۵۵﴾ هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى ﴿۵۶﴾ اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ﴿۵۷﴾

کی جھٹلائے گا، یہ ایک ڈر سنانے والا ہے پہلے ڈر سنانے والوں میں کا، آ پہنچی آنے والی،

لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ﴿۵۸﴾ اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ﴿۵۹﴾

کوئی نہیں اس کو اللہ کے سوائے کھول کر دکھانے والا، کیا تم کو اس بات سے تعجب ہوتا ہے،

وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ ﴿۶۱﴾ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ﴿۶۲﴾

اور ہنستے ہو اور روتے نہیں، اور تم کھلاڑیاں کرتے ہو، سو سجدہ کرو اللہ کے آگے اور بندگی

شانِ نزول درمنثور میں بروایت ابن جریر یہ نقل کیا ہے کہ کوئی شخص اسلام لے آیا تھا، اس کے کسی ساتھی نے اس کو ملامت کی کہ تو نے اپنے باپ دادا کے دین کو کیوں چھوڑ دیا؟ اس نے کہا کہ میں اللہ کے عذاب سے ڈرتا ہوں وہ بولا کہ تو مجھے کچھ دیدے تو میں آخرت کا تیرا عذاب اپنے سر پر رکھ لوں گا، تو عذاب سے بچ جائے گا، چنانچہ اس نے کچھ دیدیا، اس نے اور مانگا تو کچھ کشاکشی کے بعد کچھ اور بھی دیدیا، اور بقیہ کی دستاویز مع گواہوں کے لکھ دی، روح المعانی میں اس شخص کا نام ولید بن مغیرہ لکھا ہے، جس کا اسلام کی طرف میلان ہوگیا تھا، اس کے دوست نے ملامت کی، اور عذاب کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔

خلاصۂ تفسیر

(آپ نے نیکوں کی صفات تو سن لیں) تو بھلا آپ نے ایسے شخص کو بھی دیکھا جس نے (دینِ حق سے) روگردانی کی (یعنی اسلام سے ہٹ گیا) اور تھوڑا مال دیا اور (پھر) بند کر دیا (یعنی جس شخص سے مال دینے کا وعدہ اپنے مطلب کے واسطے کیا تھا، وہ بھی پورا نہ دیا، اور اسی سے مفہوم ہوا کہ ایسا شخص دوسروں کی نفع رسانی کے لئے کیا خرچ کرے گا جب اپنے ہی مطلب کے لئے پورا خرچ نہ کر سکا، جس کا حاصل اس کا بخیل ہونا ہے) کیا اس شخص کے پاس (کسی صحیح ذریعہ سے) علمِ غیب ہے کہ اس کو دیکھ رہا ہے (جس کے ذریعہ سے معلوم ہوگیا کہ فلاں شخص میری طرف سے میرے گناہوں کا عذاب اپنے سر لے کر مجھے عذاب سے بچا دے گا)

کیا اس کو اس مضمون کی خبر نہیں پہونچی جو موسیٰ (علیہ السلام) کے صحیفوں میں ہے (اور حسب روایت درمنثور در تفسیر سورۂ اعلیٰ موسیٰ علیہ السلام کے یہ دس صحیفے علاوہ توریت کے ہیں) اور نیز ابراہیم (علیہ السلام) کے (صحیفوں میں ہے وسیأتی فی سورۃ الاعلیٰ) جنھوں نے احکام کی پوری بجا آوری کی (اور وہ مضمون) یہ (ہے) کہ کوئی شخص کسی کا گناہ اپنے اوپر (ایسے طور سے) نہیں لے سکتا (کہ گناہ کرنے والا بَری ہو جاوے، پھر یہ شخص کیسے سمجھ گیا کہ میرا سارا گناہ یہ شخص اپنے سر رکھ لے گا) اور یہ (مضمون ہے) کہ انسان کو (ایمان کے بارے میں) صرف اپنی ہی کمائی ملے گی (یعنی کسی دوسرے کا ایمان اس کے کام نہ آوے گا، پس اگر اس ملامت کرنے والے شخص کے پاس ایمان ہوتا تب بھی اس شخص کے کام نہ آتا، چہ جائیکہ وہاں بھی ایمان ندارد ہے) اور یہ (مضمون ہے) کہ انسان کی سعی بہت جلد دیکھی جاوے گی پھر اس کو پورا بدلہ دیا جاوے گا (باوجود اس کے یہ شخص اپنی فلاح کی سعی سے کیسے غافل ہو گیا) اور یہ (مضمون ہے) کہ (سب کو) آپ کے پروردگار ہی کے پاس پہنچنا ہے (پھر وہ شخص کیسے نڈر ہو گیا) اور یہ (مضمون ہے) کہ وہی ہنساتا اور رُلاتا ہے اور یہ کہ وہی مارتا ہے اور جِلاتا ہے اور یہ کہ وہی دونوں قسم یعنی نر اور مادہ کو نطفہ سے بناتا ہے جب (وہ رحم میں) ڈالا جاتا ہے (یعنی مالک تمام تصرفات کا خدا ہی ہے، دوسرا نہیں، پھر وہ شخص کیسے سمجھ گیا کہ قیامت کے روز یہ تصرف کہ مجھ کو عذاب سے بچالے کسی دوسرے کے قبضہ میں ہو جاوے گا) اور یہ (مضمون ہے) کہ دوبارہ پیدا کرنا (حسب وعدہ) اس کے ذمہ ہے (یعنی ایسا ضروری ہونے والا ہے جیسے کسی کے ذمّہ ہو تو اس شخص کے نڈر ہونے کی وجہ یہ بھی نہ ہونا چاہئے کہ قیامت نہ آوے گی) اور یہ (مضمون ہے) کہ وہی غنی کرتا ہے (یعنی سرمایہ دیتا ہے) اور سرمایہ (دے کر محفوظ اور) باقی رکھتا ہے اور یہ کہ وہی مالک ہے ستارۂ شِعریٰ کا بھی (جس کی عبادت جاہلیت میں بعض لوگ کرتے تھے، یعنی ان تصرّفات و اشیاء کا مالک بھی وہی ہے جیسے پہلے تصرفات کا مالک وہی ہے اور اوپر کے تصرّفات خود انسان کے وجود میں ہیں اور بعد کے تصرّفات متعلقات انسان میں ہیں، چنانچہ مال اور ستارہ دونوں خارج ہیں اور شاید ان دو کے ذکر میں اشارہ ہو کہ جس کو تم اپنا مددگار سمجھتے ہو اس کے رب بھی ہم ہی ہیں، پھر دوسرے کو قیامت میں اس شخص کے گمان کے موافق کیا تصرّف پہونچ سکتا ہے) اور یہ (مضمون ہے) کہ اس نے قدیم قومِ عاد کو (اس کے کفر کی وجہ سے) ہلاک کیا اور ثمود کو بھی کہ (ان میں سے) کسی کو باقی نہ چھوڑا اور ان سے پہلے قوم نوح (علیہ السلام) کو (ہلاک کیا) بیشک وہ سب سے بڑھ کر ظالم اور شریر تھے (کہ ساڑھے نوسو برس کی دعوت میں بھی راہ پر نہ آئے) اور (قوم لوط علیہ السلام کی) اُلٹی ہوئی بستیوں کو بھی پھینک مارا تھا، پھر اُن بستیوں کو گھیر لیا جس چیز نے کہ گھیر لیا (یعنی اوپر سے پتھر برسنا شروع ہوئے، پس یہ شخص اگر ان قصّوں میں غور کرتا تو عذابِ کفر سے ڈرتا، اور بے فکر نہ ہوتا، آگے ان سب مضامین پر تفریع فرماتے ہیں کہ اے انسان جب ایسے ایسے مضامین سے تجھ کو آگاہ کیا جاتا ہے جو بوجہ ہدایت ہونے کے ہر مضمون بجائے خود ایک نعمتِ ربّانی ہے) سو تو اپنے رب کی کون کونسی نعمت میں شک

رو انکار) کرتا رہے گا (اور ان مضامین کی تصدیق کر کے منتفع نہ ہوگا) یہ (پیغمبر) بھی پہلے پیغمبروں کی طرح ایک پیغمبر ہیں (ان کو مان لو کیونکہ) وہ جلدی آنے والی چیز قریب آپہونچی ہے (مراد قیامت ہے اور جب وہ آوے گی تو) کوئی غیر اللہ اس کا ہٹانے والا نہیں (پس کسی کے بھروسہ بے فکری کی گنجائش ہی نہیں) سو کیا (ایسی خوف کی باتیں سُن کر بھی) تم لوگ اس کلام (الٰہی) سے تعجب کرتے اور (استہزاءً) ہنستے ہو اور (خوفِ عذاب سے) روتے نہیں ہو اور تم (اطاعت سے) تکبر کرتے ہو سو (اس کبر و غفلت سے باز آؤ اور حسبِ تعلیم ان پیغمبر کے) اللہ کی اطاعت کرو اور (اس کی بلا شرکت) عبادت کرو (تاکہ تم کو نجات ہو)

معارف و مسائل

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى، تَوَلّٰى کے لفظی معنی مُنھ پھیر لینے کے ہیں، مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے مُنھ پھیرے،

اَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى، اَكْدٰى، كُدْيَة سے مشتق ہے، کُدیہ اس سخت پتھر کو کہا جاتا ہے جو کوئی کنواں یا بنیاد کھودتے ہوئے زمین میں نکل آوے، اور کھدائی کے لئے رکاوٹ بن جاوے، اس لئے اَکدٰی کے معنی یہ ہوئے کہ پہلے کچھ دیا پھر دینے سے رُک گیا، آیت کے شانِ نزول میں جو ایک واقعہ اوپر بیان ہو چکا ہے اس کے مطابق تو معنی ظاہر ہیں، اور اس سے قطع نظر کی جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ وہ شخص جس نے اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کیا پھر چھوڑ دیا، یا شروع میں کچھ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرف مائل ہوا، کچھ کرنے لگا پھر چھوڑ بیٹھا، اس لفظ کی یہ تفسیر حضرت مجاہدؒ، سعید بن جبیرؓ، عکرمہؓ، قتادہؒ وغیرہ سے منقول ہے (ابن کثیر)

اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى، شانِ نزول میں جو قصہ بیان ہوا ہے اس کے مطابق تو آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے اسلام کو اس لئے چھوڑ دیا کہ اس کے کسی ساتھی نے اس سے کہہ دیا تھا کہ آخرت کا تیرا عذاب میں اپنے سر لے کر تجھ کو بچا دوں گا، اس احمق نے اس کا یقین کیسے کر لیا، کیا اس کو علمِ غیب حاصل ہے؟ جس سے وہ دیکھ رہا ہے کہ بے شک کفر کی صورت میں وہ جس عذاب کا مستحق ہوگا وہ عذاب یہ ساتھی اپنے سر لے لے گا اور مجھے بچا دے گا، جو ظاہر ہے کہ سراسر دھوکہ ہے نہ اس کو علمِ غیب ہے نہ کوئی دوسرا آدمی کسی کا عذابِ آخرت اپنے سر لے کر اس کو بچا سکتا ہے، اور اگر اس قصہ سے قطع نظر کی جائے تو معنی آیت کے یہ ہونگے کہ وہ شخص جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتا کرتا رُک گیا ہے اور خرچ کرنا چھوڑ دیا ہے تو اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اس کو یہ خیال ہوا ہوگا کہ موجودہ مال خرچ کر دوں گا تو پھر کہاں سے آئے گا، اس خیال کی تردید میں فرمایا کہ کیا اس کو غیب کا علم ہے جس کے ذریعہ گویا وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ یہ مال ختم ہو جائے گا اور اس کے بجائے اور مال اس کو نہ مل سکے گا، یہ غلط ہے، کیونکہ نہ اس کو غیب کا علم ہے اور نہ یہ بات صحیح ہے، کیونکہ قرآن کریم میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے (وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ) یعنی تم جو کچھ خرچ کرتے ہو

اللہ تعالیٰ اس کا بدل تمہیں دیدیتے ہیں اور وہ سب سے بہتر رزق دینے والے ہیں) انسان غور کرے تو قرآن کا یہ ارشاد صرف مال اور پیسہ کے معاملہ میں نہیں، بلکہ ہر قوت و توانائی جو وہ دنیا میں خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے بدن میں اس کا بدل مَایَتحلّل پیدا کرتے رہتے ہیں، ورنہ انسان کے بدن کا ایک ایک عضو اگر فولاد کا بھی بنا ہوتا تو ساٹھ ستر سال کام لینے سے کبھی کا گھس گھسا کر برابر ہو جاتا، جس طرح اللہ تعالیٰ انسان کے تمام اعضاء میں جو کچھ محنت سے تحلیل ہو جاتا ہے خود کار مشین کی طرح اس کا بدل اندر سے پیدا کر دیتے ہیں، اسی طرح مال کا بھی معاملہ یہی ہے کہ انسان خرچ کرتا رہتا ہے اس کا بدل آتا رہتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلالؓ کو فرمایا: اَنْفِقْ یَا بِلَالُ وَلَا تَخْشَ مِنْ ذِی الْعَرْشِ اِقْلَالًا "یعنی بلال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہو اور عرش والے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا خطرہ نہ رکھو کہ وہ تمہیں مفلس کر دے گا" (ابن کثیر)

اَمْ لَمْ یُنَبَّاْ بِمَا فِیْ صُحُفِ مُوْسٰی وَاِبْرٰهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰیٓ، اس آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک خاص صفت وَفّٰی بیان فرمائی گئی، وفاء کے معنی کسی وعدے یا معاہدے کو پورا کردینے کے آتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خاص صفت ایفائے عہد کی کچھ تفصیل

مراد یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے جو اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں گے اور اس کا پیغام مخلوق کو پہونچا دیں گے، انھوں نے اس معاہدہ کو ہر حیثیت سے پورا کر دکھایا، جس میں ان کو بہت سخت آزمائشوں سے بھی گذرنا پڑا، وَفّٰی کی یہی تفسیر ابن جریر، ابن کثیر وغیرہ نے اختیار کی ہے۔

بعض روایاتِ حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاص خاص اعمال کو لفظ وَفّٰی کا سبب بتایا گیا ہے وہ اس کے منافی نہیں، کیونکہ اصل وفاءِ عہد عام ہے، تمام احکامِ الٰہیہ کی تعمیل و اطاعت جس میں اپنے اعمال بھی داخل ہیں، اور فرائضِ رسالت و نبوت کے ذریعہ عام خلق اللہ کی اصلاح بھی، انھیں اعمال میں یہ عمل بھی ہیں جن کا ذکر ان روایاتِ حدیث میں ہے۔

مثلاً ابن ابی حاتم نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی (وَاِبْرٰهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰیٓ) اور پھر ان سے فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ وَفّٰی کا مطلب کیا ہے؟ ابوامامہ نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں، تو آپؐ نے فرمایا کہ مراد یہ ہے کہ:

وَفّٰی عَمَلَ یَوْمِہٖ بِاَرْبَعِ رَکَعَاتٍ فِیْ اَوَّلِ النَّهَارِ (ابن کثیر)

"یعنی انھوں نے اپنے دن کے اعمال کی تکمیل اس طرح کر دی کہ شروع دن میں چار رکعت (نماز اشراق کی) پڑھ لیں"

(ابن کثیر)

اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو ترمذی نے حضرت ابوذرؓ سے روایت کی ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

اِبْنَ اٰدَمَ ارْکَعْ لِیْ اَرْبَعَ رَکَعَاتٍ مِّنْ اَوَّلِ النَّهَارِ اَکْفِكَ اٰخِرَهٗ (ابن کثیر)

"یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے آدم کے بیٹے! تو شروع دن میں میرے لئے چار رکعتیں پڑھ لیا کر تو میں آخر دن تک تیرے سب کاموں کی کفالت کروں گا"

(ابن کثیر)

اور ابن ابی حاتم ہی نے ایک روایت حضرت معاذ بن انسؓ سے یہ نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہیں بتلاؤں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اَلَّذِیْ وَفّٰی کا خطاب کیوں دیا، پھر فرمایا کہ وجہ یہ ہے کہ وہ روزانہ صبح شام ہونے کے وقت یہ پڑھا کرتے تھے (فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِیًّا وَّحِیْنَ تُظْهِرُوْنَ) ابن کثیر

صحفِ موسیٰ وابراہیم علیہما السلام کی خاص ہدایات و تعلیمات، انبیائے سابقین میں سے جب کسی کا قول یا کوئی تعلیم قرآن میں ذکر کی جاتی ہو تو اس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ اس اُمت کے لئے بھی وہ واجب العمل ہے، جب تک اس کے خلاف کوئی نصِ شرعی نہ ہو، آگے اٹھارہ آیتوں میں اُن خاص تعلیمات کا ذکر ہے جو حضرت موسیٰ و ابراہیم علیہما السلام کے صحیفوں میں تھیں، ان میں عملی احکام جن کا تعلق سابقہ آیات کے ساتھ ہے وہ صرف دو ہیں، باقی تعلیمات عبرت و نصیحت اور حق تعالیٰ کی آیاتِ قدرت سے متعلق ہیں، وہ دو یہ ہیں:-

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی اور وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی، وِزْر کے معنی دراصل بوجھ کے ہیں اور پہلی آیت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی بوجھ اُٹھانے والا اپنے سوا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائیگا بوجھ سے مراد گناہ کا بوجھ اور اس کا عذاب ہے، مطلب یہ ہے کہ قیامت کے روز ایک شخص کا عذاب دوسرے پر نہیں ڈالا جائے گا، نہ کسی کو اس کا اختیار ہوگا کہ وہ دوسرے کا عذاب اپنے سر لے لے، قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں اس کا بیان اس طرح آیا ہے (وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰی حِمْلِهَا لَا یُحْمَلْ مِنْهُ شَیْءٌ) یعنی اگر کوئی گناہوں کے بوجھ سے لدا ہوا شخص لوگوں سے درخواست کرے گا کہ میرا کچھ بوجھ تم اٹھالو تو کسی کی مجال نہیں ہوگی کہ اس کے بوجھ کا کوئی حصہ اُٹھا سکے۔

ایک کے گناہ میں دوسرا نہیں پکڑا جائے گا اس آیت میں اُس شخص کے خیال کی بھی تردید ہوگئی جس کا ذکر شانِ نزول میں آیا ہے کہ وہ مسلمان ہوگیا تھا یا ہونے والا تھا، اس کے ساتھی نے ملامت کی، اور اس کی ضمانت لی کہ قیامت میں تجھ پر کوئی عذاب ہوا تو وہ میں اپنے سر پر لے کر تجھے بچا دوں گا، اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایسے معاملہ کا اللہ کے یہاں کوئی امکان نہیں کہ کسی کے گناہ میں کسی دوسرے کو پکڑ لیا جائے۔

اور ایک حدیث میں یہ آیا ہے کہ جس میت پر اس کے گھر والے ناجائز نوحہ و پکار کرتے ہیں تو ان کے اس فعل سے میت کو عذاب ہوتا ہے (کما ورد فی الصحیحین عن ابن عمرؓ) تو یہ اس شخص کے بارے میں ہے جو خود بھی میت پر نوحہ خوانی، گریہ وزاری کا عادی ہو، یا جس نے اپنے وارثوں کو اس کی وصیت کی ہو کہ میرے بعد

نوحہ وبکار کا انتظام کیا جائے (مظہری) اس صورت میں اس پر عذاب خود اس کے اپنے عمل کا ہوا، دوسروں کے عمل کا نہیں۔

دوسرا حکم ہے (وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى) اس کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح کوئی دوسرے کا عذاب اپنے سر نہیں لے سکتا، اسی طرح کسی کو یہ بھی حق نہیں کہ کسی دوسرے کے عمل کے بدلے خود عمل کرلے اور وہ اس عمل سے سبکدوش ہوجائے، مثلاً ایک شخص دوسرے کی طرف سے نماز فرض ادا کردے یا دوسرے کی طرف سے فرض روزہ رکھ لے اور وہ دوسرا اپنے فرض نماز روزے سے سبکدوش ہوجائے، یا یہ کہ ایک شخص دوسرے کی طرف سے ایمان قبول کرلے اور اس سے اس کو مؤمن قرار دیا جائے۔

آیت مذکورہ کی اس تفسیر پر کوئی فقہی اشکال اور شبہ عائد نہیں ہوتا، کیونکہ زیادہ سے زیادہ شبہ حج اور زکوٰۃ کے مسئلہ میں یہ ہوسکتا ہے کہ ضرورت کے وقت شرعاً ایک شخص دوسرے کی طرف سے حج بدل کرسکتا ہے یا دوسرے کی زکوٰۃ اس کی اجازت سے ادا کرسکتا ہے، مگر غور کیا جائے تو یہ اشکال اس لئے صحیح نہیں کہ کسی کو اپنی جگہ حج بدل کے لئے بھیج دینا اور اس کے مصارف خود ادا کرنا، یا کسی شخص کو اپنی طرف سے زکوٰۃ ادا کردینے کے لئے مامور کردینا بھی درحقیقت اسی شخص کے اپنے عمل اور سعی کا جزء ہے، اس لئے لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى کے منافی نہیں۔

ایصالِ ثواب کا مسئلہ جبکہ اوپر یہ معلوم ہوچکا کہ آیتِ مذکورہ کا مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کے فرائض ایمان و نماز و روزہ کو ادا کرکے دوسرے کو سبکدوش نہیں کرسکتا، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایک شخص کے نفلی عمل کا کوئی فائدہ اور ثواب دوسرے شخص کو نہ پہونچ سکے، ایک شخص کی دعاء اور صدقہ کا ثواب دوسرے شخص کو پہونچنا نصوصِ شرعیہ سے ثابت اور تمام اُمت کے نزدیک اجماعی مسئلہ ہے۔ (ابن کثیر)

صرف اس مسئلہ میں امام شافعیؒ کا اختلاف ہے کہ تلاوتِ قرآن کا ثواب کسی دوسرے کو بخشا اور پہنچایا جاسکتا ہے یا نہیں، امام شافعیؒ اس کا انکار کرتے ہیں اور آیتِ مذکورہ کا مفہوم عام لے کر اس سے استدلال فرماتے ہیں، جمہور ائمہ اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک جس طرح دعاء اور صدقہ کا ثواب دوسرے کو پہونچایا جاسکتا ہے اسی طرح تلاوتِ قرآن اور ہر نفلی عبادت کا ثواب دوسرے شخص کو بخشا جاسکتا ہے اور وہ اس کو ملے گا، قرطبی نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ احادیث کثیرہ اس پر شاہد ہیں کہ مؤمن کو دوسرے شخص کی طرف سے عمل صالح کا ثواب پہونچتا ہے، تفسیر مظہری میں اس جگہ ان احادیث کو جمع کردیا ہے جن سے ایصالِ ثواب کا فائدہ دوسرے کو پہونچنا ثابت ہوتا ہے۔

اوپر صحفِ موسیٰ و ابراہیم علیہما السلام کے حوالے سے جو دو مسئلے بیان کئے گئے ہیں، ایک یہ کہ ایک شخص کے گناہ کا عذاب کسی دوسرے کو نہیں پہونچے گا، اور ایک کے گناہ میں دوسرا کوئی نہ پکڑا جائیگا، دوسرا یہ کہ ہر شخص پر جن اعمال کی شرعی ذمہ داری ہے اس سے سبکدوشی خود اسی کے اپنے عمل سے ہوگی، دوسرے کا عمل اس کو سبکدوش نہ کرے گا۔

یہ دونوں حکم اگرچہ دوسرے انبیاء کی شریعتوں میں بھی تھے مگر حضرت موسیٰ و ابراہیم علیہما السلام کی خصوصیت شاید اس بناء پر کی گئی کہ اُن کے زمانہ میں یہ جاہلانہ رسم جاری ہوگئی تھی کہ باپ کے بدلے میں بیٹے کو اور بیٹے کے بدلے میں باپ کو یا بھائی بہن وغیرہ کو قتل کردیا جاتا تھا، ان دونوں بزرگوں کی شریعتوں نے اس رسم جاہلیت کو مٹایا تھا۔

وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى، یعنی صرف ہر شخص کی ظاہری سعی کافی نہیں، اللہ تعالیٰ کے دربار میں سعی کی اصل حقیقت بھی دیکھی جائے گی کہ وہ اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لئے کی ہے یا دوسری اغراضِ دنیویہ اس میں شامل ہیں، جیسا کہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، یعنی صرف صورتِ عمل کافی نہیں، عمل میں نیت خالص اللہ تعالیٰ کی رضا اور تعمیل حکم کی ہونا ضروری ہے۔

وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى، مراد یہ ہے کہ آخر کار سب کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، اور اعمال کا حساب دینا ہے۔

بعض حضرات مفسرین نے اس جملہ کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ انسانی غور و فکر کا سلسلہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر پہونچ کر ختم ہوجاتا ہے، اس کی ذات وصفات کی حقیقت کسی غور و فکر سے حاصل کی جاسکتی ہے اور نہ اس میں غور و فکر کی اجازت، جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور و فکر کرو اس کی ذات میں غور و فکر نہ کرو بلکہ اس کو علمِ الٰہی کے سپرد کردو وہ تمہارے بس کا نہیں۔

وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى، یعنی نوع انسان میں خوشی اور غم اور اس کے نتیجہ میں ہنسنے اور رونے کا سلسلہ ہر شخص دیکھتا ہے، اور ان دونوں چیزوں کو اُن کے ظاہری طور پر پیش آنے والے اسباب کی طرف منسوب کرکے معاملہ ختم کردیتا ہے، یہاں غور و فکر کی جگہ ہے، گہری نظر سے جو دیکھے گا کہ کسی کی خوشی یا غم اور ہنسنا یا رونا خود اس کے یا کسی دوسرے کے قبضہ میں نہیں، یہ دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، وہ اسباب کو پیدا کرتا ہے وہی اسباب میں تاثیر دیتا ہے وہ جب چاہتا ہے تو رونے والوں کو ایک لمحہ میں ہنسا دیتا ہے، اور ہنسنے والوں کو ایک منٹ میں رُلا دیتا ہے، ولنعم ما قیل ؎

بگوش گُل چہ سخن گفتۂ کہ خنداں ست ٭ بعندلیب چہ فرمودۂ کہ نالاں ست

وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى، غنا کے معنی مالداری کے معروف ہیں، اغناء کے معنی دوسرے کو مالدار بنادینا، اور اَقْنٰى، قنیہ سے مشتق ہے جس کے معنی محفوظ اور ریزرو سرمایہ کے ہیں، مراد آیت کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی لوگوں کو مالدار اور غنی بناتا ہے وہی جس کو چاہے اتنا سرمایہ دیتا ہے کہ اس کو محفوظ رکھ سکے،

وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى، شِعْرٰى بکسر شین، ایک ستارے کا نام ہے جو جوزاء کے پیچھے ہے، عرب کی بعض اقوام اس ستارے کی پرستش کرتی تھیں، اس لئے خصوصیت سے اس کا نام لے کر بتلایا کہ اس ستارے کا مالک اور پروردگار بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے، اگرچہ وہ سارے ہی ستاروں، آسمانوں، زمینوں کا خالق و مالک اور

پروردگار ہے۔

وَاَنَّہٗٓ اَھْلَکَ عَادَا۟ لْاُوْلٰی وَثَمُوْدَاۡ فَمَآ اَبْقٰی، قوم عاد دنیا کی قوی اور سخت ترین قوم ہے، ان کے دو طبقے، یکے بعد دیگرے اُولیٰ اور اُخریٰ کے نام سے موسوم ہیں، ان کی طرف حضرت ہود علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا گیا، نافرمانی پر ہوا کے طوفان کا عذاب آیا، پوری قوم ہلاک ہوئی، قومِ نوح علیہ السلام کے بعد عذاب سے ہلاک ہونے والی یہ پہلی قوم ہے (مظہری) اور ثمود بھی انہی کی نظیر دوسری شاخ ہے، جن کی طرف حضرت صالح علیہ السلام کو بھیجا گیا، ان کی نافرمانی کرنے والوں پر سخت آواز کا عذاب آیا جس سے اُن کے کلیجے پھٹ کر ہلاک ہوگئے۔

وَالْمُؤْتَفِکَۃَ اَھْوٰی، مؤتفکہ کے لفظی معنے مُؤتَلِفَہ کے ہیں، یہ چند بستیاں اور شہر متصل تھے حضرت لوط علیہ السلام ان کی طرف مبعوث ہوئے، نافرمانی اور بے حیائی کے اعمال کی سزا میں ان کی بستیاں جبرئیل امین نے اُلٹ دیں۔

فَغَشّٰہَا مَا غَشّٰی، یعنی ڈھانپ لیا اُن بستیوں کو جس چیز نے ڈھانپ لیا، مراد وہ پتھراؤ ہے جو بستیاں اُلٹنے کے بعد اُن پر کیا گیا، یہاں تک صحفِ موسیٰ و ابراہیم علیہما السلام کے حوالہ سے جو تعلیمات بیان کرنی تھیں وہ ختم ہوگئیں۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکَ تَتَمَارٰی، تماری کے معنی جھگڑا اور مخالفت کرنا ہے، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ خطاب ہر انسان کو ہے، کہ سابقہ آیات اور صحفِ موسیٰ و ابراہیم علیہما السلام میں آئی ہوئی آیاتِ ربانی میں کوئی ذرا بھی غور و فکر کرے تو اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی وحی اور تعلیمات کے حق ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی، اور اقوامِ سابقہ کی ہلاکت و عذاب کے واقعات سُنکر مخالفت سے باز آجانے کا اچھا موقع ملتا ہے جو حق تعالیٰ کی ایک نعمت ہے، اس کے باوجود تم اللہ تعالیٰ کی کس کس نعمت میں جھگڑا اور خلاف کرتے رہوگے۔

ھٰذَا نَذِیْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰی، ہٰذا کا اشارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا قرآن کی طرف ہے کہ یہ بھی پچھلے رسولوں اور پچھلی کتابوں کی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نذیر بنا کر بھیجے گئے ہیں جو صراطِ مستقیم اور دین و دنیا کی فلاح پر مشتمل ہدایات لے کر آئے ہیں اور اس کی مخالفت کرنے والوں کو اللہ کے عذاب سے ڈراتے ہیں۔

اَزِفَتِ الْاٰزِفَۃُ ۚ لَیْسَ لَھَا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ کَاشِفَۃٌ، اَزِفَ بمعنے قَرُبَ آتا ہے، معنی یہ ہیں کہ قریب آنے والی چیز قریب آپہونچی، جس کو خدا تعالیٰ کے سوا کوئی ہٹانے والا نہیں، مراد اس سے قیامت ہے اس کا قریب آپہونچنا پوری دنیا کی عمر کے اعتبار سے ہے کہ اُمتِ محمدیہ اس کے بالکل آخر میں قیامت کے قریب ہے۔

اَفَمِنْ ھٰذَا الْحَدِیْثِ تَعْجَبُوْنَ وَتَضْحَکُوْنَ وَلَا تَبْکُوْنَ، ہٰذا الحدیث سے مراد قرآن کریم ہے معنی آیت کے یہ ہیں کہ قرآن کریم جیسا کلام الٰہی جو خود ایک معجزہ ہے تمہارے سامنے آچکا کیا اس پر بھی تم

تعجب کرتے ہو اور بطور استہزار کے ہنستے ہو، اور اپنی معصیت یا عمل میں کوتاہی پر روتے نہیں۔

وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ، سمود کے لغوی معنی غفلت و بے فکری کے ہیں، سامدون بمعنی غافلون ہے، اور ایک معنی سمود کے گانے بجانے کے بھی آتے ہیں وہ بھی اس جگہ مراد ہوسکتے ہیں (کما فسرہ بہ بعض الائمہ)

فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا، یعنی پچھلی آیات جو غور کرنے والے انسان کو عبرت و موعظت کا سبق دیتی ہیں اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ تم سب اللہ کے سامنے خشوع و تواضع کے ساتھ جھکو اور سجدہ کرو اور صرف اسی کی عبادت کرو۔

صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہو کہ سورۂ نجم کی اس آیت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا اور آپؐ کے ساتھ سب مسلمانوں اور مشرکوں نے اور تمام جن وانس نے سجدہ کیا، اور بخاری و مسلم ہی کی دوسری حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ نجم کی تلاوت فرمائی، اور اس میں سجدۂ تلاوت ادا کیا، اور آپؐ کے ساتھ سب حاضرینِ مجلس (مؤمنین و مشرکین) نے سجدہ کیا بجز ایک قریشی بوڑھے کے جس نے زمین سے ایک مٹھی خاک اٹھا کر پیشانی سے لگالی، اور کہا کہ مجھے یہی کافی ہی، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ پھر میں نے اُس شخص کو حالتِ کفر میں مقتول پڑا ہوا دیکھا ہے، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں مسلمانوں کو تو سجدہ کرنا تھا ہی، جو مشرکین اُس وقت حاضر تھے اللہ تعالیٰ نے اُن پر بھی کچھ ایسی حالت غالب کردی کہ سب سجدہ کرنے پر مجبور ہو گئے، گو اُس وقت اُن کا سجدہ بوجہ کفر کے کچھ ثواب نہ رکھتا تھا، مگر وہ بھی اپنا ایک اثر یہ چھوڑ گیا کہ بعد میں ان سب کو اسلام و ایمان کی توفیق ہوگئی، صرف ایک آدمی کفر پر مرا جس نے سجدہ سے گریز کیا تھا۔

اور صحیحین کی ایک حدیث میں جو حضرت زید بن ثابت کی روایت سے ہے یہ مذکور ہو کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سورۂ نجم پوری پڑھی، مگر آپؐ نے سجدہ نہیں کیا، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سجدہ واجب یا لازم نہیں، کیونکہ اس میں یہ احتمال ہے کہ آپؐ اس وقت با وضو نہ ہوں، یا کوئی دوسرا عذر سجدہ کرنے سے مانع ہو، ایسی حالت میں فوری سجدہ کرنا ضروری نہیں، بعد میں بھی ہوسکتا ہے، واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم

تمّت

سُوْرَةُ النَّجْمِ بِعَوْنِهٖ وَحَمْدِهٖ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى
لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ لِغُرَّةِ الرَّبِيْعِ الثَّانِي ۱۳۹۱ھ
فِيْ اسْبُوْعٍ وَاحِدٍ وَيَتْلُوْهُ تَفْسِيْرُ سُوْرَةِ الْقَمَرِ
اِنْشَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَهُوَ وَلِيُّ التَّوْفِيْقِ

سُوْرَةُ الْقَمَرِ

سُوْرَةُ الْقَمَرِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ خَمْسٌ وَّخَمْسُوْنَ اٰيَةً وَّثَلٰثُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ قمر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی پچپن آیتیں ہیں اور تین رکوع ،

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے ،

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ﴿۱﴾ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَ

پاس آ لگی قیامت اور پھٹ گیا چاند ، اور اگر وہ دیکھیں کوئی نشانی تو ٹلا جائیں اور

يَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ﴿۲﴾ وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ﴿۳﴾

کہیں یہ جادو ہے پہلے سے چلا آتا ، اور جھٹلایا اور چلے اپنی خوشی پر اور ہر کام ٹھہرا رکھا ہے وقت پر ،

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ﴿۴﴾ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ

اور پہنچ چکے ہیں ان کے پاس احوال جن میں ڈانٹ ہو سکتی ہے ، پوری عقل کی بات ہے پھر ان میں کام نہیں کرتے

النُّذُرُ ﴿۵﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ ۘ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ ﴿۶﴾ خُشَّعًا

وقف لازم

ڈر سنانے والے ، سو تو ہٹ آ ان کی طرف سے جس دن پکارے پکارنیوالا ایک ناگوار چیز کی طرف ، آنکھیں

اَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ﴿۷﴾

جھکائے نکل پڑیں قبروں سے جیسے ٹڈی پھیلی ہوئی ،

مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ ۭ يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ﴿۸﴾

دوڑتے جائیں اس پکارنیوالے کے پاس کہتے جائیں منکر یہ دن مشکل آیا ،

خُلاصۂ تفسیر

(ان کفار کے لئے زاجر یعنی غلطی پر متنبہ کرنے والا امر تو اعلیٰ درجہ کا متحقق ہے، چنانچہ) قیامت نزدیک آپہونچی (جس میں تکذیب پر بڑی مصیبت آوے گی) اور (اس اخبار قرب ساعت کا مصداق بھی واقع ہوگیا چنانچہ) چاند شق ہوگیا (اور اس سے قربِ قیامت کی تصدیق اس طرح ہوتی ہے کہ شقِ قمر معجزہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جس سے آپؐ کی نبوت ثابت ہوتی ہے اور نبی کا ہر قول صادق ہے، اس لئے ضروری ہے کہ قیامت کے قریب آنے کی خبر جو آپؐ نے دی ہے وہ بھی صادق ہے اس سے تحقق زاجر کا متعین ہوگیا) اور (اس کا مقتضا یہ تھا کہ یہ لوگ اس سے منزجر اور متاثر ہوتے لیکن ان کی یہ حالت ہے کہ) اگر کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو ٹال دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ جادو ہے جو ابھی ختم ہوا جاتا ہے (یہ کنایہ ہو اس کے باطل ہونے سے کہ باطل کا اثر دیر تک قائم نہیں رہا کرتا، جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ، مطلب یہ کہ قربِ قیامت سے نصیحت حاصل کرنا تو نبوت محمدیہ کے اعتقاد پر موقوف ہے، یہ لوگ خود اس کی دلیل ہی کو نظر تامل سے نہیں دیکھتے اور اس کو باطل سمجھتے ہیں تو پھر اس سے اُن پر کیا اثر ہوتا) اور (اس اعراض اور بطلانِ دعوٰی معجزہ میں خود) ان لوگوں نے (باطل پر مصر ہوکر حق کو) جھٹلایا اور (اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کی (یعنی ان کا اعراض کسی دلیل صحیح کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ سبب اس اعراض کا ہوائے نفسانی کا اتباع اور از روئے عناد تکذیبِ حق ہے) اور (یہ جو معجزات کو جادو کہتے ہیں جس کا اثر جلد زائل ہوجایا کرتا ہے سو قاعدہ ہے کہ) ہر بات کو (بعد چندے اپنی اصلی حالت پر آکر) قرار آجاتا ہے (یعنی حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا، اسباب و آثار سے عام طور پر متعین ہوجاتا ہے، مطلب یہ کہ گو واقع میں تو فی الحال بھی حق متعین اور واضح ہے، مگر کم فہموں کی سمجھ میں اگر اب نہیں آتا تو بعد چندے تو اُن کو بھی ظاہر ہوسکتا ہے، بشرطیکہ غور سے کام لیں تو چند روز کے بعد تم کو معلوم ہوجاوے گا کہ یہ سحر فانی ہے یا حق باقی ہے) اور (اس زاجر مذکور کے علاوہ) ان لوگوں کے پاس (تو امم ماضیہ کی بھی) خبریں اتنی پہونچ چکی ہیں کہ ان میں (کافی) عبرت یعنی اعلیٰ درجہ کی دانشمندی (حاصل ہوسکتی) ہے سو (ان کی یہ کیفیت ہے کہ) خوف دلانے والی چیزیں ان کو کچھ فائدہ ہی نہیں دیتیں (اور جب یہ حال ہے) تو آپؐ ان کی طرف سے کچھ خیال نہ کیجئے (جب وہ وقت قیامت اور عذاب کا جس سے اُن کو ڈرایا جاتا ہے آجاوے گا تو خود معلوم ہوجاوے گا آگے اس روز کا بیان ہے، یعنی) جس روز ایک بُلانے والا فرشتہ (ان کو) ایک ناگوار چیز کی طرف بلاوے گا ان کی آنکھیں (مارے ذلت اور ہیبت کے) جھکی ہوئی ہوں گی (اور) قبروں سے اس طرح نکل رہے ہوں گے جیسے ٹڈی پھیل جاتی ہے، (اور پھر نکل کر) بُلانے والے کی طرف (یعنی موقفِ حساب کی طرف جہاں جمع ہونے کے لئے بلانے والے نے پکارا ہے) دوڑے چلے جارہے ہوں گے (اور وہاں کی سختیاں دیکھکر) کافر کہتے ہوں گے کہ یہ دن بڑا سخت ہے۔

۱۵

معارف ومسائل

پچھلی سورت (النجم) اَزِفَتِ الْاٰزِفَۃُ الخ پر ختم ہوئی ہے جس میں قیامت کے قریب آجانے کا ذکر ہے اس سورت کو شروع اسی مضمون سے کیا گیا ہے اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃُ، آگے قربِ قیامت کی ایک دلیل معجزہ انشقاقِ قمر کا ذکر فرمایا گیا ہے، کیونکہ علاماتِ قیامت جن کی بڑی تفصیل ہے ان میں سے ایک بڑی علامت تو خود حضرت خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ونبوت ہی جیساکہ حدیث میں آپ کا ارشاد ہے کہ میرا آنا اور قیامت اس طرح ملے ہوئے ہیں جیسے ہاتھ کی دو انگلیاں، اور بھی چند روایاتِ حدیث میں آپ کا قیامت کے قریب ہونا بیان فرمایا گیا ہے، اسی طرح ایک بڑی علامت قیامت کی یہ بھی ہے کہ آپ کے معجزہ کے طور پر چاند کے دو ٹکڑے ہوکر الگ الگ ہوجاویں گے پھر باہم جُڑ جاویں گے، نیز معجزۂ شق القمر اس حیثیت سے بھی قیامت کی علامت ہے کہ جس طرح اُس وقت چاند کے دو ٹکڑے اللہ کی قدرت سے ہوگئے قیامت میں سارے ہی سیاروں اور ستاروں کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجانا کوئی امر مستبعد نہیں۔

معجزہ شق القمر

کفارِ مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی نبوت ورسالت کے لئے کوئی نشانی معجزہ کی طلب کی، حق تعالیٰ نے آپ کی حقانیت کے ثبوت کے لئے یہ معجزہ شق القمر ظاہر فرمایا، اس معجزہ کا ثبوت قرآن کریم کی اس آیت میں بھی موجود ہے وَانْشَقَّ الْقَمَرُ، اور احادیث صحیحہ جو صحابہ کرام کی ایک جماعت کی روایت سے آئی ہیں جن میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عمرؓ، جُبیر بن مُطعمؓ، ابن عباسؓ، انس بن مالکؓ وغیرہ شامل ہیں، اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ خود اپنا اس وقت میں موجود ہونا اور معجزہ کا مشاہدہ کرنا بھی بیان فرماتے ہیں، امام طحاویؒ اور ابن کثیرؒ نے واقعۂ شق القمر کی روایات کو متواتر قرار دیا ہے، اس لئے اس معجزۂ نبوی کا وقوع قطعی دلائل سے ثابت ہے۔

واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ کے مقام مِنیٰ میں تشریف رکھتے تھے، مشرکینِ مکہ نے آپ سے نبوت کی نشانی طلب کی، یہ واقعہ ایک چاندنی رات کا ہے، حق تعالیٰ نے یہ کھلا ہوا معجزہ دکھلادیا کہ چاند کے دو ٹکڑے ہوکر ایک مشرق کی طرف دوسرا مغرب کی طرف چلا گیا، اور دونوں ٹکڑوں کے درمیان میں پہاڑ حائل نظر آنے لگا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب حاضرین سے فرمایا کہ دیکھو اور شہادت دو، جب سب لوگوں نے صاف طور پر یہ معجزہ دیکھ لیا تو یہ دونوں ٹکڑے پھر آپس میں مل گئے، اس کھلے ہوئے معجزہ کا انکار تو کسی آنکھوں والے سے ممکن نہ ہوسکتا تھا، مگر مشرکین کہنے لگے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سارے جہان پر جادو نہیں کرسکتے، اطرافِ ملک سے آنے والے لوگوں کا انتظار کرو وہ کیا کہتے ہیں، بیہقی اور ابوداؤد طیالسی کی روایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ہے کہ بعد میں تمام اطراف سے آنے والے مسافروں سے ان لوگوں نے تحقیق کی تو سب نے ایسا ہی چاند کے دو ٹکڑے دیکھنے کا اعتراف کیا۔

بعض روایات میں ہے کہ یہ معجزۂ شق القمر مکہ مکرمہ میں دو مرتبہ پیش آیا مگر روایاتِ صحیحہ سے ایک ہی مرتبہ کا ثبوت ملتا ہے (بیان القرآن) اس معاملہ سے متعلق چند روایاتِ حدیث یہ ہیں (جو تفسیر ابن کثیر سے لی گئی ہیں)

(۱) صحیح بخاری میں حضرت انس بن مالکؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ

اِنَّ اَھْلَ مَکَّۃَ سَاَلُوْا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ یُّرِیَھُمْ اٰیَۃً فَاَرَاھُمُ الْقَمَرَ شِقَّیْنِ حَتّٰی رَاَوْا حِرَاءَ بَیْنَھُمَا (بخاری ومسلم)

"یعنی اہل مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اپنی نبوّت کے لئے کوئی نشانی (معجزہ) دکھلائیں، تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو چاند کے دو ٹکڑے کرکے دکھلا دیا، یہاں تک کہ انھوں نے جبلِ حراء کو دونوں ٹکڑوں کے درمیان دیکھا"

(۲) صحیح بخاری ومسلم اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے:

اِنْشَقَّ الْقَمَرُ عَلٰی عَھْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ شِقَّتَیْنِ حَتّٰی نَظَرُوْا اِلَیْہِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اشْھَدُوْا

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں چاند شق ہوا اور دو ٹکڑے ہوگئے جس کو سب نے صاف طور سے دیکھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا کہ دیکھو اور شہادت دو"

اور ابن جریر نے بھی اپنی سند سے اس حدیث کو نقل کیا ہے، اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ کُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِمِنًی فَانْشَقَّ الْقَمَرُ فَاَخَذَتْ فِرْقَۃٌ خَلْفَ الْجَبَلِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اشْھَدُوْا اشْھَدُوْا (عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ہم مِنٰی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، اچانک چاند کے دو ٹکڑے ہوگئے، اور ایک ٹکڑا پہاڑ کے پیچھے چلا گیا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گواہی دو، گواہی دو"

(۳) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہی کی روایت سے ابوداؤد طیالسی نے اور بیہقی نے یہ بھی نقل کیا ہے:

اِنْشَقَّ الْقَمَرُ بِمَکَّۃَ حَتّٰی صَارَ فِرْقَتَیْنِ فَقَالَ کُفَّارُ قُرَیْشٍ اَھْلُ مَکَّۃَ ھٰذَا سِحْرٌ سَحَرَکُمْ بِہٖ ابْنُ اَبِیْ کَبْشَۃَ اُنْظُرُوا السُّفَّارَ فَاِنْ کَانُوْا رَاَوْا مَا رَاَیْتُمْ فَقَدْ صَدَقَ وَاِنْ کَانُوْا لَمْ یَرَوْا مِثْلَ مَا رَاَیْتُمْ فَھُوَ سِحْرٌ سَحَرَکُمْ بِہٖ فَسُئِلَ السُّفَّارُ قَالَ وَقَدِمُوْا مِنْ کُلِّ جِھَۃٍ فَقَالُوْا رَاَیْنَا،

"مکہ مکرمہ (کے قیام کے زمانہ) میں چاند شق ہوکر دو ٹکڑے ہوگیا، کفار قریش کہنے لگے کہ یہ جادو ہے ابن ابی کبشہ (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے تم پر جادو کر دیا ہے، اس لئے تم انتظار کرو، باہر سے آنے والے مسافروں کا، اگر انھوں نے بھی یہ دو ٹکڑے چاند کے دیکھے ہیں تو انھوں نے سچ کہا ہے اور اگر باہر کے لوگوں نے ایسا نہیں دیکھا تو پھر یہ بیشک جادو ہی ہوگا، پھر باہر سے

آنے والے مسافروں سے تحقیق کی جو ہر طرف سے آئے تھے، سب نے اعتراف کیا کہ ہم نے بھی یہ دو ٹکڑے دیکھے ہیں"

شق القمر کے واقعہ پر کچھ شبہات اور جواب

اس پر ایک شبہ تو یونانی فلسفہ کے اصول کی بنا پر کیا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ آسمان اور سیارات میں خرق والتیام (یعنی شق ہونا اور جڑنا) ممکن نہیں، مگر یہ محض ان کا دعویٰ ہے اس پر جتنے دلائل پیش کئے گئے ہیں وہ سب لچر اور بے بنیاد ہیں، اُن کا لغو و باطل ہونا متکلمین اسلام نے بہت واضح کر دیا ہے، اور آج تک کسی عقلی دلیل سے شق قمر کا محال اور ناممکن ہونا ثابت نہیں ہو سکا، ہاں ناواقف عوام ہر مستبعد چیز کو ناممکن کہنے لگتے ہیں، مگر یہ ظاہر ہے کہ معجزہ تو نام ہی اس فعل کا ہے جو عام عادت کے خلاف اور عام لوگوں کی قدرت سے خارج حیرت انگیز و مستبعد ہو، ورنہ معمولی کام جو ہر وقت ہو سکے اُسے کون معجزہ کہے گا؟

دوسرا عامیانہ شبہ یہ کیا جاتا ہے کہ اگر ایسا عظیم الشان واقعہ پیش آیا ہوتا تو پوری دنیا کی تاریخوں میں اس کا ذکر ہوتا، مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ واقعہ مکہ معظمہ میں رات کے وقت پیش آیا ہے، اُس وقت بہت سے ممالک میں تو دن ہوگا وہاں اس واقعہ کے نمایاں اور ظاہر ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا، اور بعض ممالک میں نصف شب اور آخر شب میں ہوگا، جس وقت عام دنیا سوتی ہے، اور جاگنے والے بھی تو ہر وقت چاند کو نہیں تکتے رہتے، زمین پر پھیلی ہوئی چاندنی میں اس کے دو ٹکڑے ہونے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، جس کی وجہ سے کسی کو اس طرف توجہ ہوتی، پھر یہ تھوڑی دیر کا قصہ تھا، روزمرہ دیکھا جاتا ہے کہ کسی ملک میں چاند گہن ہوتا ہے، اور آجکل تو پہلے سے اس کے اعلانات بھی ہو جاتے ہیں، اس کے باوجود ہزاروں لاکھوں آدمی اس سے بالکل بے خبر رہتے ہیں، ان کو کچھ پتہ نہیں چلتا، تو کیا اس کی یہ دلیل بنائی جا سکتی ہے کہ چاند گہن ہوا ہی نہیں، اس لئے دنیا کی عام تاریخوں میں مذکور نہ ہونے سے اس واقعہ کی تکذیب نہیں ہو سکتی۔

اس کے علاوہ ہندوستان کی مشہور و مستند "تاریخ فرشتہ" میں اس کا ذکر بھی موجود ہے، کہ ہندوستان میں مہاراجہ مالیبار نے یہ واقعہ بچشم خود دیکھا، اور اپنے روزنامچہ میں لکھوایا، اور یہی واقعہ ان کے مسلمان ہونے کا سبب بنا، اور اوپر ابوداؤد طیالسی اور بیہقی کی روایات سے بھی یہ ثابت ہو چکا ہے کہ خود مشرکین مکہ نے بھی باہر کے لوگوں سے اس کی تحقیق کی تھی اور مختلف اطراف کے آنے والوں نے یہ واقعہ دیکھنے کی تصدیق کی تھی، واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم

وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ، مستمر کے مشہور معنی جو فارسی اُردو میں بھی معروف ہیں، وہ دیر تک اور دائم رہنے کے ہیں، مگر عربی زبان میں یہ لفظ مَرّ اور اِسْتَمَرَّ کبھی گذر جانے اور ختم ہو جانے کے معنی میں بھی آتا ہے، ائمہ تفسیر میں سے مجاہدؒ اور قتادہؒ نے اس جگہ یہی معنی بیان کئے ہیں، اس پر مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ یہ جادو کا اثر ہے جو دیر تک نہیں چلا کرتا خود ہی گذر جائے گا اور ختم ہو جائیگا

اور ایک معنی مستمر کے قوی و شدید کے بھی آتے ہیں، ابو العالیہ اور ضحاک نے اس آیت میں مستمر کی یہی تفسیر کی ہے اور مراد یہ ہوگی کہ یہ بڑا قوی جادو ہے۔

اہل مکہ جب اس مشاہدہ کی تکذیب نہ کر سکے تو اس کو جادو یا سخت جادو کہہ کر اپنے دلوں کو تسلی دینے لگے،

وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ، استقرار کے لغوی معنی قرار پکڑنے کے ہیں، مفہوم آیت کا یہ ہے کہ ہر کام اور ہر چیز اپنی غایت پر پہونچ کر آخر کار صاف ہوجاتی ہے، کسی جعل سازی سے جو پردہ حقیقت پر ڈالا جاتا ہے وہ انجام کار کھل کر رہتا ہے، اور حق کا حق اور باطل کا باطل ہونا واضح ہوجاتا ہے،

مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ، مہطعین کے لفظی معنی سر اٹھانے کے ہیں، معنی آیت کے یہ ہیں کہ بلانیوالے کی آواز کی سمت میں دیکھتے ہوئے محشر کی طرف دوڑیں گے، اور اس سے پہلی آیت میں جو خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ آیا ہے جس کے معنی ہیں نگاہ اور سر جھکانے کے، ان دونوں میں تطبیق یہ ہے کہ محشر کے مواقف مختلف ہوں گے، کسی موقف میں ایسا بھی ہوگا کہ سب کے سر جھکے ہوئے ہوں گے۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا وَقَالُوْا مَجْنُوْنٌ وَّازْدُجِرَ ﴿۹﴾

جھٹلا چکی ہے اُن سے پہلے نوح کی قوم پھر جھوٹا کہا ہمارے بندہ کو اور بولے دیوانہ ہے اور جھڑک لیا اس کو

فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ﴿۱۰﴾ فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ﴿۱۱﴾

پھر پکارا اپنے رب کو کہ میں عاجز ہوگیا ہوں تو بدلہ لے، پھر ہم نے کھول دیئے دہانے آسمان کے پانی ٹوٹ کر برسنے والے سے

وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ﴿۱۲﴾ وَحَمَلْنٰهُ

اور بہا دیئے زمین سے چشمے پھر مل گیا سب پانی ایک کام پر جو ٹھیر چکا تھا، اور ہم نے اس کو سوار کر دیا

عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ﴿۱۳﴾ تَجْرِىْ بِاَعْيُنِنَا ۚ جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ﴿۱۴﴾

ایک تختوں اور کیلوں والی پر، بہتی تھی ہماری آنکھوں کے سامنے بدلہ لینے کو اس کی طرف سے جس کی قدر نہ جانی تھی،

وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۵﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِىْ وَنُذُرِ ﴿۱۶﴾

اور اس کو ہم نے رہنے دیا نشانی کیلئے پھر کوئی ہے سوچنے والا، پھر کیسا تھا میرا عذاب اور میرا کھڑ کھڑانا،

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۷﴾

اور ہم نے آسان کر دیا قرآن سمجھنے کو پھر ہے کوئی سوچنے والا،

خلاصۂ تفسیر

ان لوگوں سے پہلے قوم نوح نے تکذیب کی یعنی ہمارے بندہ (خاص نوح علیہ السلام) کی تکذیب کی اور

کہا کہ یہ مجنون ہیں اور (محض اس قول بیہودہ ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ان سے ایک بیہودہ فعل بھی سرزد ہوا یعنی) نوح (علیہ السلام) کو (ان کی طرف سے) دھمکی (بھی) دی گئی (جس کا ذکر سورۃ شعراء میں ہے لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ) تو نوح (علیہ السلام) نے اپنے رب سے دعا کی کہ میں (محض) درماندہ ہوں، (ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا) سو آپ (ان سے) انتقام لے لیجئے (یعنی اُن کو ہلاک کر دیجئے، کقولہ تعالیٰ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا)، پس ہم نے کثرت سے برسنے والے پانی سے آسمان کے دروازے کھول دیئے، اور زمین سے چشمے جاری کر دئے پھر (آسمان اور زمین کا) پانی اس کام کے (پورا ہونے کے) لئے مل گیا جو (علمِ الٰہی میں) تجویز ہو چکا تھا (مراد اس کام سے ہلاکت ہے کفار کی، یعنی دونوں پانی مل کر طوفان بڑھا، جس میں سب غرق ہو گئے) اور ہم نے نوح (علیہ السلام) کو (طوفان سے محفوظ رکھنے کے لئے) تختوں اور میخوں والی کشتی پر جو کہ ہماری نگرانی میں (پانی کی سطح پر) رواں تھی (مع مؤمنین کے) سوار کیا یہ سب کچھ اس شخص کا بدلہ لینے کے لئے کیا جس کی بے قدری کی گئی تھی (مراد نوح علیہ السلام ہیں اور چونکہ رسول اور اللہ تعالیٰ کے حقوق میں تلازم ہے، اس میں کفر باللہ بھی آ گیا، پس یہ شبہ نہ رہا کہ یہ غرق کفر باللہ کے سبب نہ ہوا تھا) اور ہم نے اس واقعہ کو عبرت کے واسطے (حکایات اور تذکروں میں) رہنے دیا، سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے (مقصود اس سے ترغیب ہے تذکّر کی) پھر (دیکھو) میرا عذاب اور میرا ڈرانا کیسا ہوا (یعنی جس چیز سے ڈرانا واقع ہوا تھا وہ کیسا پورا ہو کر رہا، تو اس ڈرانے کا حاصل بھی عذاب ہی ہو گیا، غرض عذاب الٰہی کے دو عنوان ہو گئے، ایک خود عذاب اور دوسرا وعدہ الٰہی کا پورا ہونا) اور ہم نے قرآن کو (جو کہ مشتمل ہے ایسے قصصِ مذکورہ پر) نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا (سب کے لئے عموماً بوجہ واضح ہونے بیان کے اور عرب کے لئے خصوصاً بوجہ عربی زبان کے) سو کیا (اس قرآن میں ایسے مضامینِ نصیحت کے دیکھ کر) کوئی نصیحت حاصل کرنیوالا ہے (یعنی کفار مکّہ کو بالخصوص ان قصص سے ڈر جانا چاہئے)۔

معارف و مسائل

مَجْنُوْنٌ وَّازْدُجِرَ، وَازْدُجِرَ کے لفظی معنی ہیں ڈانٹ دیا گیا (اس کا عطف لفظ قَالُوْا پر ہے اس لئے) مراد یہ ہے کہ ان لوگوں نے حضرت نوح علیہ السلام کو مجنون بھی کہا اور پھر ان کو ڈانٹ دھمکا کر تبلیغ رسالت سے روکنا بھی چاہا، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ہے کہ ان لوگوں نے نوح علیہ السلام کو یہ دھمکی دی کہ اگر آپ اپنی تبلیغ و دعوت سے باز نہ آئے تو ہم آپ کو پتھراؤ کر کے مار دیں گے۔

عبد بن حُمیدؒ نے مجاہدؒ سے نقل کیا ہے کہ نوح علیہ السلام کی قوم کے بعض لوگ جب حضرت نوحؑ کو کہیں پاتے تو بعض اوقات ان کا گلا گھونٹ دیتے تھے یہاں تک کہ وہ بیہوش ہو جاتے، پھر جب افاقہ ہوتا تو اللہ سے یہ دعا کرتے تھے کہ "یا اللہ میری قوم کو معاف کر دے" وہ حقیقت سے ناواقف ہیں، ساڑھے نو سو

سال قوم کی ایسی ایذاؤں کا جواب دعاؤں سے دے کر گذارنے کے بعد آخر میں عاجز ہو کر بد دُعا کی، جس کا ذکر اگلی آیت میں ہے، جس کے نتیجہ میں یہ پوری قوم غرق کی گئی۔

فَالْتَقَى الْمَاءُ عَلَىٰ أَمْرٍ قَدْ قُدِرَ، یعنی زمین سے اُبلنے والا پانی اور آسمان سے برسنے والا پانی دونوں اس انداز پر مل گئے جس سے اللہ تعالیٰ کا مقدر کیا ہوا فیصلہ کہ پوری قوم غرق ہو جائے نافذ ہو گیا کہ پہاڑوں کی چوٹیوں تک بھی کسی کو پناہ نہ ملی۔

ذَاتِ أَلْوَاحٍ وَدُسُرٍ، الواح لوح کی جمع ہے بمعنی تختی، اور دُسُر، دسار کی جمع ہے، جس کے معنی میخ اور مسمار کے بھی آتے ہیں، اور اس ڈورے یا تار کو بھی کہا جاتا ہے جس سے کشتی کے تختے جوڑے جاتے ہیں۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ، لِلذِّکر، ذکر کے معنی یاد کرنے اور حفظ کرنے کے بھی آتے ہیں اور کسی کلام سے نصیحت و عبرت حاصل کرنے کے بھی، یہ دونوں معنی یہاں مراد ہو سکتے ہیں، کہ حق تعالیٰ نے قرآن کریم کو حفظ کرنے کے لئے آسان کر دیا، یہ بات اس سے پہلے کسی کتاب کو حاصل نہیں ہوئی کہ پوری کتاب تورات یا انجیل یا زبور لوگوں کو بر زبان یاد ہو، اور یہ حق تعالیٰ ہی کی تیسیر اور آسانی کا اثر ہے کہ مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے بچے پورے قرآن کو ایسا حفظ کر لیتے ہیں کہ ایک زیر زبر کا فرق نہیں آتا، چودہ سَو برس سے ہر زمانہ ہر طبقے ہر خطے میں ہزاروں لاکھوں حافظوں کے سینوں میں یہ اللہ کی کتاب محفوظ ہے۔

اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ قرآن کریم نے اپنے مضامینِ عبرت و نصیحت کو ایسا آسان کر کے بیان کیا ہے کہ جس طرح بڑے سے بڑا عالم و ماہر فلسفی اور حکیم اس سے فائدہ اٹھاتا ہے، اسی طرح ہر عامی جاہل جس کو علوم سے کوئی مناسبت نہ ہو وہ بھی عبرت و نصیحت کے مضامین قرآنی کو سمجھ کر اس سے متاثر ہوتا ہے۔

حفظ کرنے اور نصیحت حاصل کرنے کیلئے قرآن کو آسان کیا گیا ہو نہ کہ اجتہاد اور استنباط احکام کیلئے

اس آیت میں یَسَّرْنَا کے ساتھ لِلذِّکر کی قید لگا کر یہ بھی بتلا دیا گیا ہے کہ قرآن کو حفظ کرنے اور اس کے مضامین سے عبرت و نصیحت حاصل کرنے کی حد تک اس کو آسان کر دیا گیا ہے، جس سے ہر عالم و جاہل، چھوٹا اور بڑا یکساں فائدہ اٹھا سکتا ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن کریم سے مسائل اور احکام کا استنباط بھی ایسا ہی آسان ہو، وہ اپنی جگہ ایک مستقل اور مشکل فن ہے جس میں عمریں صرف کرنے والے علماء راسخین کو ہی حصہ ملتا ہے ہر ایک کا وہ میدان نہیں۔

اس سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہو گئی جو قرآن کریم کے اس جملے کا سہارا لے کر قرآن کی مکمل تعلیم اس کے اصول و قواعد سے حاصل کئے بغیر مجتہد بننا اور اپنی رائے سے احکام و مسائل کا استخراج کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کھلی گمراہی کا راستہ ہے۔

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ﴿۱۸﴾ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا

جھٹلایا عاد نے پھر کیسا ہوا میرا عذاب اور میرا کھڑکھڑانا، ہم نے بھیجی اُن پر ہوا تند ایک

فِي يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ﴿۱۹﴾ تَنزِعُ النَّاسَ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنقَعِرٍ ﴿۲۰﴾ فَكَيْفَ

نحوست کے دن جو چلے گئے، اکھاڑ مارا لوگوں کو گویا وہ جڑیں ہیں کھجور کی اُکھڑی پڑی، پھر کیسا رہا

كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ﴿۲۱﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ﴿۲۲﴾ ع ۲۲/۸

میرا عذاب اور میرا کھڑکھڑانا، اور ہم نے آسان کر دیا قرآن سمجھنے کو پھر ہے کوئی سوچنے والا،

كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِالنُّذُرِ ﴿۲۳﴾ فَقَالُوا أَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهُ إِنَّا إِذًا

جھٹلایا ثمود نے ڈر سنانے والوں کو، پھر کہنے لگے کیا ایک آدمی ہم میں کا اکیلا ہم اس کے کہے پر چلیں گے تو تو ہم

لَّفِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ ﴿۲۴﴾ أَأُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِن بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ

غلطی میں پڑے اور سودا میں، کیا اُتری اسی پر نصیحت ہم سب میں سے کوئی نہیں یہ جھوٹا ہے،

أَشِرٌ ﴿۲۵﴾ سَيَعْلَمُونَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْأَشِرُ ﴿۲۶﴾ إِنَّا مُرْسِلُو النَّاقَةِ

بڑائی مارتا ہے، اب جان لیں گے کل کو کون ہے جھوٹا بڑائی مارنے والا، ہم بھیجتے ہیں اونٹنی ان کے

فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ﴿۲۷﴾ وَنَبِّئْهُمْ أَنَّ الْمَاءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ

جانچنے کے واسطے سو انتظار کر ان کا اور سہتا رہ، اور سنا دے اُن کو کہ پانی کا بانٹا ہے ان میں

كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ﴿۲۸﴾ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَىٰ فَعَقَرَ ﴿۲۹﴾ فَكَيْفَ كَانَ

ہر باری پر پہنچنا چاہیے، پھر پکارا انھوں نے اپنے رفیق کو پھر ہاتھ چلایا اور کاٹ ڈالا، پھر کیسا ہوا

عَذَابِي وَنُذُرِ ﴿۳۰﴾ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَاحِدَةً فَكَانُوا كَهَشِيمِ

میرا عذاب اور میرا کھڑکھڑانا، ہم نے بھیجی اُن پر ایک چنگھاڑ پھر رہ گئے جیسے روندی ہوئی باڑ

الْمُحْتَظِرِ ﴿۳۱﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ﴿۳۲﴾ كَذَّبَتْ

کانٹوں کی، اور ہم نے آسان کر دیا قرآن سمجھنے کو پھر ہے کوئی سوچنے والا، جھٹلایا لوط

قَوْمُ لُوطٍ بِالنُّذُرِ ﴿۳۳﴾ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا إِلَّا آلَ لُوطٍ نَّجَّيْنَاهُم

کی قوم نے ڈر سنانے والوں کو، ہم نے بھیجی اُن پر آندھی پتھر برسانے والی سوائے لوط کے گھر کے انکو ہم نے بچا دیا

بِسَحَرٍ ﴿۳۴﴾ نِّعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ ﴿۳۵﴾ وَلَقَدْ

پچھلی رات سے ، فضل سے اپنی طرف کے ہم یوں بدلہ دیتے ہیں اس کو جو حق مانے ، اور وہ ڈرا چکا تھا

اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ﴿۳۶﴾ وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ

ان کو ہماری پکڑ سے پھر لگے مکرانے ڈرانے کو ، اور اس سے لینے لگے اس کے مہمانوں کو پس

فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۳۷﴾ وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً

ہم نے مٹا دیں اُن کی آنکھیں اب چکھو میرا عذاب اور میرا ڈرانا ، اور پڑا ان پر صبح کو سویرے

عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ ﴿۳۸﴾ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۳۹﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ

عذاب جو ٹھہر چکا تھا ، اب چکھو میرا عذاب اور میرا ڈرانا ، اور ہم نے آسان کر دیا قرآن

لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۴۰﴾ ع وَلَقَدْ جَاۗءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ﴿۴۱﴾

سمجھنے کو پھر ہے کوئی سوچنے والا ، اور پہنچے فرعون والوں کے پاس ڈرانے والے ،

ع ۲ ۱۸ ۹

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿۴۲﴾

جھٹلایا انھوں نے ہماری نشانیوں کو سب کو پھر پکڑا ہم نے ان کو پکڑنا زبردست کا قابو میں لے کر ،

خلاصۂ تفسیر

عادنے (بھی اپنے پیغمبر کی) تکذیب کی سو (اس کا قصہ سنو کہ) میرا عذاب اور ڈرانا کیسا ہوا ، (اور وہ قصہ یہ ہے کہ) ہم نے اُن پر ایک سخت ہوا بھیجی ایک مسلسل نحوست کے دن میں (یعنی وہ زمانہ اُن کے حق میں ہمیشہ کے لئے اس لئے منحوس رہا کہ اس روز جو عذاب آیا وہ عذاب برزخ سے متصل ہوگیا، پھر عذاب آخرت اس سے متصل ہوگیا، جو اُن سے کبھی منقطع نہ ہوگا اور) وہ ہوا لوگوں کو اس طرح (ان کی جگہ سے) اکھاڑ اکھاڑ کر پھینکتی تھی کہ گویا وہ اُکھڑی ہوئی کھجوروں کے تنے ہیں (اس تشبیہ میں علاوہ اُن کے پھینکے جانے کے اشارہ ان کے طول قامت کی طرف بھی ہے) سو (دیکھو) میرا عذاب اور ڈرانا کیسا (ہولناک) ہوا اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے، ثمود نے (بھی) پیغمبروں کی تکذیب کی (کیونکہ ایک پیغمبر کی تکذیب مستلزم ہے سب پیغمبروں کی تکذیب کو) اور کہنے لگے کیا ہم ایسے شخص کا اتباع کریں گے جو ہماری جنس کا آدمی ہے، اور (حشم وخدم سے) اکیلا ہی (یعنی یا تو فرشتہ ہوتا تو ہم دین میں اتباع کرتے، یا صاحب خدم وحشم ہوتا تو دنیوی امور میں اتباع کرتے

جبکہ بشر ہی اور وہ بھی اکیلا، نہ تو اتباع فی الدنیا کو کوئی امر مقتضی ہے نہ اتباع فی الدین کو اور اگر ہم اس حالت میں اتباع کریں) تو اس صورت میں ہم بڑی غلطی اور (بلکہ) جنون میں پڑجاویں کیا ہم سب میں سے (منتخب ہو کر) اسی (شخص) پر وحی نازل ہوئی ہے (ہرگز ایسا نہیں) بلکہ یہ بڑا جھوٹا اور شیخی باز ہے (شیخی یعنی تکبر کے مارے ایسی باتیں بڑائی کی کرتا ہے، کہ لوگ مجھ کو سردار قرار دے لیں، حق تعالیٰ نے صالح علیہ السلام سے فرمایا کہ تم ان کے بکنے پر رنج مت کرو) اُن کو عنقریب (مرتے ہی) معلوم ہو جائے گا کہ جھوٹا شیخی باز کون تھا (یعنی یہی لوگ تھے کہ انکار نبوت میں کاذب تھے، اور اتباع نبی سے بوجہ شیخی کے عار کرتے تھے، اور یہ لوگ جو اونٹنی کا معجزہ طلب کرتے تھے تو) ہم (ان کی درخواست کے موافق پتھر میں سے) اونٹنی کو نکالنے والے ہیں، اُن کی آزمائش (ایمان) کے لئے سو ان (کی حرکتوں) کو دیکھتے بھالتے رہنا اور صبر سے بیٹھے رہنا اور ان لوگوں کو (جب اونٹنی پیدا ہو تو) یہ بتلا دینا کہ پانی (کنوئیں کا) بانٹ دیا گیا ہے، (یعنی تمہارے مواشی اور اونٹنی کی باری مقرر ہو گئی ہے) ہر ایک باری پر باری والا حاضر ہوا کرے (یعنی اونٹنی اپنی باری میں پانی پیوے اور مواشی اپنی باری میں، چنانچہ اونٹنی پیدا ہوئی اور صالح علیہ السلام نے اسی طرح فرما دیا) سو (اس باری سے وہ لوگ تنگ آگئے اور) انھوں نے (اس کے قتل کرنے کی غرض سے) اپنے رفیق (قُدار) کو بلایا سو اس نے (اونٹنی پر) وار کیا اور (اس کو) مار ڈالا سو (دیکھو) میرا عذاب اور ڈرانا کیسا ہوا (جس کا بیان آگے آتا ہے وہ یہ کہ) ہم نے ان پر ایک ہی نعرہ (فرشتہ کا) مسلط کیا سو وہ (اس سے) ایسے ہو گئے جیسے کانٹوں کی باڑ لگانے والے (کی باڑ) کا چورا (یعنی کھیت یا مواشی وغیرہ کی حفاظت کے لئے جیسے کانٹوں وغیرہ کی باڑ لگا دیتے ہیں اور چند روز بعد سب چورا چورا ہو جاتا ہے اسی طرح وہ ہلاک و تباہ ہو گئے، عرب کے لوگ اس مشبّہ بہ کو یعنی کھیت کے گرد کی باڑ کو شب و روز دیکھتے تھے تو وہ اس تشبیہ کو خوب سمجھتے تھے) اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے قوم لوط نے (بھی) پیغمبروں کی تکذیب کی (کیونکہ ایک نبی کی تکذیب مستلزم ہے سب کی تکذیب کو) ہم نے اُن پر پتھروں کا مینھ برسایا بجز متعلّقین لوط (علیہ السلام) کے (یعنی بجز مؤمنین کے) کہ ان کو اخیر شب میں (بستی سے باہر کر کے عذاب سے) بچا لیا اپنی جانب سے فضل کر کے جو شکر کرتا ہے (یعنی ایمان لاتا ہے) ہم اس کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں (کہ قہر سے بچا لیتے ہیں) اور (قبل عذاب آنے کے) لوط (علیہ السلام) نے اُن کو ہماری دار و گیر سے ڈرایا تھا، سو انھوں نے اس ڈرانے میں جھگڑے پیدا کئے (یعنی یقین نہ لائے) اور (جب لوط علیہ السلام کے پاس ہمارے فرشتے بشکل مہمان آئے اور ان لوگوں کو حسین لڑکوں کا آنا معلوم ہوا تو یہاں آ کر) ان لوگوں نے لوط (علیہ السلام) سے ان کے مہمانوں کو بُری نیت سے لینا چاہا (جس سے لوط علیہ السلام اوّل گھبرائے مگر وہ فرشتے تھے) سو ہم نے (ان فرشتوں کو حکم دے کر) ان کی آنکھیں چوپٹ کر دیں (یعنی جبرئیل علیہ السلام نے اپنے پر اُن کی آنکھوں پر پھیر دیئے جس سے اندھے بھٹ ہو گئے، کذا فی الدرّ عن قتادۃ اور بزبان قال یا حال اُن سے کہا گیا کہ) لو میرے عذاب اور ڈرانے

کا مزہ چکھو (پہلے تو یہ واقعہ طمس یعنی اندھے کرنے کا پیش آیا) اور (پھر) صبح سویرے ہی ان پر دائمی عذاب آپہونچا (اور ارشاد ہوا) کہ لو میرے ڈرانے اور عذاب کا مزہ چکھو (یہی جملہ پہلے اندھے ہونے کے عذاب پر کہا گیا تھا یہاں ہلاکت کے عذاب پر ہے، اس لئے کوئی تکرار نہیں) اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے اور (فرعون اور) فرعون والوں کے پاس بھی ڈرانے کی بہت سی چیزیں پہونچیں (مراد موسیٰ علیہ السلام کے ارشادات اور معجزات ہیں کہ ارشادات سے تشریعی طور پر اور معجزات سے تکوینی طور پر ان کو ڈرایا گیا مگر) ان لوگوں نے ہماری تمام (ان) نشانیوں (کو جو اُن کے پاس آئی تھیں وہ آیات تسعہ (نو آیتیں) مشہور ہیں) جھٹلایا (یعنی اُن کے مدلول و مقتضا توحیدِ الٰہی اور نبوّت موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا، ورنہ واقعات کے وقوع کی تکذیب تو ہو نہیں سکتی) سو ہم نے ان کو زبردست صاحبِ قدرت کا پکڑنا پکڑا (یعنی جب ہم نے ان کو قہر اور غلبہ سے پکڑا تو اس پکڑ کو کوئی دفع نہیں کر سکا، پس عزیز مقتدر سے مراد اللہ تعالیٰ ہے)۔

معارف و مسائل

بعض لغات کی تشریح سُعُرٍ، یہ لفظ آیاتِ مذکورہ میں دو جگہ آیا ہے، اوّل قومِ ثمود کے ذکر میں ان کا اپنا قول ہے اس میں سُعُر کا لفظ جنون کے معنی میں آیا ہے، دوسری جگہ یہی لفظ آگے آنے والی آیات میں حق تعالیٰ کی طرف سے عذابِ مجرمین کے ذکر میں آیا ہے، فِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ، یہاں سُعُر کے معنی جہنّم کی آگ کے ہیں، حسبِ تصریح اہلِ لغت لفظ سُعُر ان دونوں معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔

رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ۔ مراودت کے معنی کسی کو اپنی نفسانی شہوت پورا کرنے کے لئے بہلانا پھسلانا ہے، مراد یہ ہے کہ قومِ لوط علیہ السلام چونکہ اپنی خباثت سے لڑکوں کے ساتھ بدفعلی کے خوگر تھے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کے امتحان ہی کے لئے فرشتوں کو حسین اَمرَد لڑکوں کی صورت میں بھیجا تھا، یہ شیاطین ان کو اپنی خواہش کا نشانہ بنانے کے لئے لوط علیہ السلام کے مکان پر چڑھ آئے، لوط علیہ السلام نے دروازہ بند کر لیا تو یہ دروازہ توڑ کر یا اوپر سے چھلانگ کر اندر آنے لگے، حضرت لوط علیہ السلام پریشان ہوئے تو اس وقت فرشتوں نے اپنا راز ظاہر کیا کہ آپ کچھ فکر نہ کریں، یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، ہم اللہ کے فرشتے اُن کو عذاب دینے ہی کے لئے آئے ہیں۔

سورۂ قمر کو قربِ قیامت کے ذکر سے شروع کیا گیا، تاکہ کفار و مشرکین جو دنیا کی ہوا و ہوس میں مبتلا اور آخرت سے غافل ہیں وہ ہوش میں آئیں، پہلے قیامت کے عذاب کا بیان کیا گیا، اس کے بعد دنیا میں بھی ان کے انجامِ بد کو بتلانے کے لئے پانچ مشہور عالم اقوام کے حالات اور انبیاء علیہم السلام کی مخالفت پر ان کے انجامِ بد اور دنیا میں بھی طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا ہونا بیان کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے قومِ نوح علیہ السلام کا ذکر کیا گیا، کیونکہ یہی سب سے پہلی دنیا کی قوم ہے جو عذابِ الٰہی

میں پکڑی گئی، یہ قصہ سابقہ آیات میں آچکا ہے، مذکور الصدر آیات میں چار اقوام کا ذکر ہے، عاد، ثمود، قوم لوط، قوم فرعون، ان کے واقعات اور مفصل قصے قرآن کریم کے متعدد مقامات میں بیان ہوئے ہیں، یہاں ان کا اجمالی ذکر ہے۔

یہ پانچوں اقوام دنیا کی قوی ترین اور قابو یافتہ قومیں تھیں، جن کو کسی طاقت سے رام کرنا کسی کے لئے آسان نہ تھا، آیات مذکورہ میں ان پر اللہ کا عذاب آنا دکھلایا گیا، اور ہر ایک قوم کے انجام پر قرآن کریم نے ایک جملہ ارشاد فرمایا (فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ) یعنی اتنی بڑی قوی اور بھاری تعداد والی قوم پر جب اللہ کا عذاب آیا تو دیکھو کہ وہ کس طرح اس عذاب کے سامنے مکھیوں، مچھروں کی طرح مارے گئے، اور اس کے ساتھ ہی مؤمنین وکفار کی عام نصیحت کے لئے اس جملے کو بار بار دُہرایا گیا، وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ یعنی اللہ کے اس عذاب عظیم سے بچنے کا راستہ قرآن ہے، اور قرآن کو نصیحت وعبرت حاصل کرنے کی حد تک ہم نے بہت آسان کر دیا ہے، بڑا بدنصیب اور محروم ہے جو اس سے فائدہ نہ اٹھائے، آگے آنے والی آیات میں زمانہ نبوت کے موجودین کو خطاب کر کے یہ بتلایا گیا ہے کہ اس زمانے کے منکرین وکفار دولت وثروت، تعداد، طاقت وقوت میں عاد وثمود اور قوم فرعون وغیرہ سے کچھ زیادہ نہیں ہیں، پھر یہ کیسے بے فکر بیٹھے ہیں۔

اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ ﴿٤٣﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ

اب تم میں جو منکر ہیں کیا یہ بہتر ہیں ان سب سے یا تمھارے لئے فارغ خطی لکھدی گئی ورقوں میں، کیا کہتے ہیں

نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ﴿٤٤﴾ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴿٤٥﴾ بَلِ السَّاعَةُ

ہم سب کا مجمع ہی بدلہ لینے والا، اب شکست کھائے گا یہ مجمع اور بھاگیں گے پیٹھ پھیر کر، بلکہ قیامت ہے

مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ ﴿٤٦﴾ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ﴿٤٧﴾

ان کے وعدہ کا وقت اور وہ گھڑی بڑی آفت ہے اور بہت کڑوی، جو لوگ گنہگار ہیں غلطی میں پڑے ہیں اور سودا میں،

وقف لازم

يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ۭ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ﴿٤٨﴾ اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ

جس دن گھسیٹے جائیں گے آگ میں اوندھے منہ، چکھو مزہ آگ کا، ہم نے ہر چیز بنائی

خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ﴿٤٩﴾ وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۢ بِالْبَصَرِ ﴿٥٠﴾ وَلَقَدْ

پہلے ٹھیرا کر، اور ہمارا کام تو یہی ایک دم کی بات ہے جیسے لپک نگاہ کی، اور ہم

اَهْلَكْنَآ اَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿٥١﴾ وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ ﴿٥٢﴾

برباد کر چکے ہیں تمھارے ساتھ والوں کو، پھر ہے کوئی سوچنے والا، اور جو چیز انھوں نے کی ہے لکھی گئی ورقوں میں

وَكُلُّ صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ مُّسْتَطَرٌ ﴿۵۳﴾ إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَهَرٍ ﴿۵۴﴾ فِي مَقْعَدِ

اور ہر چھوٹا اور بڑا لکھا جا چکا ، جو لوگ ڈرنیوالے ہیں باغوں میں ہیں اور نہروں میں ، بیٹھے سچی بیٹھک

صِدْقٍ عِندَ مَلِيكٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿۵۵﴾

میں نزدیک بادشاہ کے جس کا سب پر قبضہ ہے

خلاصۂ تفسیر

یہ کفار کے قصے اور کفر کی وجہ سے ان پر عذاب ہونے کے واقعات تو تم نے سُن لئے اب جبکہ تم بھی اسی جرم کفر کے مرتکب ہو تو تمہارے عذاب سے بچنے کی کوئی وجہ نہیں) کیا تم میں جو کافر ہیں ان میں ان (مذکورہ پچھلے) لوگوں سے کچھ فضیلت ہے (جس کی وجہ سے تم باوجود ارتکاب جرم کے سزایاب نہ ہو) یا تمہارے لئے (آسمانی) کتابوں میں کوئی معافی (نامہ لکھ دیا) ہے (گو کوئی خاص فضیلت نہ ہو) یا (ان میں کوئی ایسی قوت ہے جو اُن کو عذاب سے بچالے جیسا) یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری ایسی جماعت ہے جو غالب ہی رہیں گے (اور جب کہ ان کے مغلوب ہونے کے دلائل واضحہ موجود ہیں اور خود بھی اپنی مغلوبیت کا اُن کو یقین ہے تو پھر ایسی بات کہنا اس کو مستلزم ہے کہ ان میں کوئی ایسی قوت ہے جو عذاب کو روک سکتی ہے، یہ تین احتمال ہیں عذاب سے بچنے کے بتاؤ کہ ان میں سے کونسی صورت واقع میں ہے، پہلے دو احتمالوں کا بطلان تو ظاہر و باہر ہے، رہا تیسرا احتمال سو اسباب عادیہ کے اعتبار سے گو فی نفسہٖ ممکن ہے مگر بدلالتِ دلائل وقوع اس کا نہ ہوگا، بلکہ اس کے عکس کا وقوع ہوگا، جس سے اُن کا کذب ظاہر ہو جاوے گا اور وہ عکس کا وقوع اس طرح ہوگا کہ) عنقریب (ان کی) یہ جماعت شکست کھاوے گی اور پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے (اور یہ پیشینگوئی بدر و احزاب وغیرہ میں واقع ہوئی، اور یہی نہیں کہ اس دنیوی عذاب پر بس ہو کر رہ جاوے گا) بلکہ (عذاب اکبر) قیامت (میں ہوگا کہ) ان کا (اصل) وعدہ (وہی) ہے اور قیامت (کو کوئی ہلکی چیز نہ سمجھو بلکہ وہ) بڑی سخت اور ناگوار چیز ہے (اور یہ موعود اَدْهیٰ وَ اَمَرّ ضرور واقع ہونے والا ہے اور اس کے وقوع کے انکار میں) یہ مجرمین (یعنی کفار) بڑی غلطی اور بے عقلی میں (پڑے) ہیں (اور وہ غلطی ان کو عنقریب جب علم الیقین مبدل بہ عین الیقین ہوگا ظاہر ہو جاوے گی، اور وہ اس طرح ہوگا کہ) جس روز یہ لوگ اپنے مونہوں کے بل جہنم میں گھسیٹے جاویں گے تو ان سے کہا جاوے گا کہ دوزخ (کی آگ) کے لگنے کا مزہ چکھو (اور اگر ان کو اس سے شبہ ہو کہ قیامت ابھی کیوں نہیں واقع ہوتی تو وجہ اس کی یہ ہے کہ) ہم نے ہر چیز کو (باعتبار زمان وغیرہ کے ایک خاص) انداز سے پیدا کیا ہے (جو ہمارے علم میں ہے، یعنی زمانہ وغیرہ اس کا اپنے علم میں معیّن و مقدر کیا ہے، اسی طرح قیامت کے وقوع کے لئے بھی ایک وقت معیّن ہے، پس اس کا عدم وقوع فی الحال بوجہ اس کے وقت نہ آنے کے ہے، یہ دھوکہ نہ کھانا چاہئے کہ قیامت کا وقوع ہی نہ ہوگا) اور (جب اس کا وقت آجائے گا تو اس وقت

ہمارا حکم (اس وقوع کے متعلق) بس ایسا یکبارگی ہو جائیگا جیسے آنکھ کا جھپکانا (غرض وقوع کی نفی تو باطل ٹھیری) اور (اگر تم کو یہ شبہ ہو کہ ہمارا طریقہ اللہ کے نزدیک ناپسند اور مبغوض نہیں ہے تو اگر قیامت کا وقوع بھی ہو تب بھی ہم کو کوئی فکر نہیں، تو اس باب میں سُن رکھو کہ) ہم تمہارے ہم طریقہ لوگوں کو (اپنے عذاب سے) ہلاک کرچکے ہیں (جو دلیل ہے اس طریقہ کی مبغوض ہونے کی اور وہی تمہارا طریقہ ہے اس لئے مبغوض ہے، اور یہ دلیل نہایت واضح ہے) سو کیا (اس دلیل سے) کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے اور (یہ بھی نہیں ہے کہ اُن کے اعمال علمِ الٰہی سے غائب رہ جاویں، جس کی وجہ سے اللہ کے نزدیک ان کے طریقہ کے مبغوض ہونے کے باوجود سزا سے بچ جانے کا احتمال ہو بلکہ) جو کچھ بھی یہ لوگ کرتے ہیں سب (حق تعالیٰ کو معلوم ہے) اعمالناموں میں (بھی مندرج) ہے اور (یہ نہیں کہ کچھ لکھ لیا گیا ہو کچھ رہ گیا ہو بلکہ) ہر چھوٹی اور بڑی بات (اس میں) لکھی ہوئی ہے (پس وقوعِ عذاب میں کوئی شبہ نہ رہا یہ تو کفار کا حال ہوا اور جو) پرہیزگار لوگ (ہیں وہ بہشت کے) باغوں میں اور نہروں میں ہوں گے، ایک عمدہ مقام میں قدرت والے بادشاہ کے پاس (یعنی جنّت کے ساتھ قربِ حق تعالیٰ بھی ہوگا)۔

معارف و مسائل

بعض لُغات کی تشریح

زُبُرٌ زبور کی جمع ہے، لغت میں ہر لکھی ہوئی کتاب کو زبور کہتے ہیں، اور اس خاص کتاب کا نام بھی زبور ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔

اَدْهٰی وَ اَمَرّ، اَدْهٰی کے معنی زیادہ ہیبت ناک اور اَمَرّ مُرٌّ سے ماخوذ ہے، جس کے اصلی معنی کڑوے کے ہیں، اور ہر سخت اور تکلیف دہ چیز کو بھی مُرّ اور اَمَرّ کہہ دیا جاتا ہے، فِیْ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ، ضلال کے معنی معروف ہیں گمراہی، اور سُعُر کے معنی اس جگہ جہنم کی آگ کے ہیں، اَشْیَاعَکُمْ، اشیاع شیعہ کی جمع ہے، جس کے معنی تبع اور پیروکار کے ہیں، مراد وہ لوگ ہیں جو عمل میں اُن کے متبع یا مثل ہیں، مَقْعَدِ صِدْقٍ، مقعد کے معنی مجلس اور مقام کے ہیں، اور صدق بمعنی حق ہے، مراد یہ ہے کہ یہ مجلس حق ہوگی جس میں کوئی لغو و بیہودہ بات نہ ہوگی۔

اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ، قَدر کے لغوی معنی اندازہ کرنے اور کسی چیز کو حکمت و مصلحت کے مطابق اندازے سے بنانے کے ہیں، اس آیت میں یہ لغوی معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں کہ حق تعالیٰ جل شانہ نے عالم کی تمام مخلوقات کو اور اس کی ہر نوع و صنف کو ایک حکیمانہ اندازہ سے بڑا چھوٹا اور مختلف ہیئت و صورت میں بنایا ہے، پھر ہر نوع و صنف کے ہر فرد کی تخلیق میں بھی حکیمانہ انداز بڑی حکمت کے ساتھ رکھا ہے، انگلیاں سب یکساں نہیں بنائیں طول میں فرق رکھا، ہاتھوں پاؤں کے طول و عرض اور اُن کے کھلنے بند ہونے سمٹنے اور پھیلنے کے لئے اسپرنگ لگائے، ایک ایک عضو کے ایک ایک جُزء کو دیکھو تو قدرت و حکمتِ خداوندی کے عجیب و غریب دروازے کھلتے نظر آنے لگیں۔

اور اصطلاح شرع میں لفظ قَدَر بمعنی تقدیرِ الٰہی بھی استعمال ہوتا ہے، اور اکثر ائمہ تفسیر نے بعض

روایاتِ حدیث کی بنا پر اس آیت میں قدر سے تقدیر الٰہی مراد لی ہے۔

مسند احمد، مسلم، ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ مشرکینِ قریش ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ تقدیر کے متعلق مخاصمت کرنے لگے، تو اس پر یہ آیتِ قرآن نازل ہوئی، اس معنی کے اعتبار سے مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ ہم نے تمام عالم کی ایک ایک چیز کو اپنی تقدیر ازلی کے مطابق بنایا ہے، یعنی ازل میں پیدا ہونے والی چیز اور اس کی مقدار زمانہ ومکان اور اس کے بڑھنے گھٹنے کا پیمانہ عالم کے پیدا ہونے سے پہلے ہی لکھدیا گیا تھا جو کچھ عالم میں پیدا ہوتا ہے وہ اسی تقدیر ازلی کے مطابق ہوتا ہے۔

تقدیر کا یہ مسئلہ اسلام کا قطعی عقیدہ ہے اس کا منکر کافر، اور جو فرقے بتاویل انکار کرتے ہیں وہ فاسق ہیں امام احمد، ابوداؤد، طبرانی نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر امت میں کچھ لوگ مجوسی ہوتے ہیں، اس اُمّتِ محمدیہ کے مجوسی وہ لوگ ہیں جو تقدیر کا انکار کرتے ہیں، ایسے لوگ بیمار پڑیں تو ان کی بیمار پرسی کو نہ جاؤ اور مرجائیں تو اُن کے کفن دفن میں شریک نہ ہو، (از روح المعانی)
واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم

تمّت

بِعَوْنِ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ وَبِحَمْدِهٖ سُوْرَةُ الْقَمَرِ
يَوْمَ الثُّلَاثَاءِ لِسِتَّةٍ مِنَ الرَّبِيْعِ الثَّانِيْ ۱۳۹۱ھ
وَيَتْلُوْهَا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى سُوْرَةُ الرَّحْمٰنِ؛

سُورَةُ الرَّحْمٰنِ

سُوْرَةُ الرَّحْمٰنِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ ثَمَانٌ وَّسَبْعُوْنَ اٰيَةً وَّثَلٰثُ رُكُوْعَاتٍ

سورۃ رحمٰن مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی اٹھتر آیتیں ہیں اور تین رکوع،

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے،

اَلرَّحْمٰنُ ﴿۱﴾ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ﴿۲﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ﴿۳﴾ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴿۴﴾

رحمٰن نے، سکھلایا قرآن، بنایا آدمی، پھر سکھلایا اس کو بات کرنا،

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ﴿۵﴾ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ﴿۶﴾ وَالسَّمَآءَ

سورج اور چاند کے لئے ایک حساب ہے، اور جھاڑ اور درخت مشغول ہیں سجدہ میں، اور آسمان کو

رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ﴿۷﴾ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ﴿۸﴾ وَاَقِيْمُوا

اونچا کیا اور رکھی ترازو، کہ زیادتی نہ کرو ترازو میں، اور سیدھی ترازو

الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ﴿۹﴾ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا

تولو انصاف سے اور مت گھٹاؤ تول کو، اور زمین کو بچھایا واسطے

لِلْاَنَامِ ﴿۱۰﴾ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ﴿۱۱﴾ وَالْحَبُّ

خلق کے، اس میں میوہ ہے اور کھجوریں جن کے میوہ پر غلاف، اور اس میں اناج ہے

ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ﴿۱۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۳﴾ خَلَقَ

جس کے ساتھ بھس ہے اور پھول خوشبودار، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے تم دونوں، بنایا

الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿١٤﴾ وَخَلَقَ الْجَانَّ مِن مَّارِجٍ مِّن
آدمی کو کھنکھناتی مٹی سے جیسے ٹھیکرا ، اور بنایا جن کو آگ کی لپٹ

نَّارٍ ﴿١٥﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿١٦﴾ رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ
سے ، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے تم دونوں، مالک دو مشرقوں کا اور مالک

الْمَغْرِبَيْنِ ﴿١٧﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿١٨﴾ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ﴿١٩﴾
دو مغربوں کا ، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے ، چلائے دو دریا مل کر چلنے والے ،

بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ ﴿٢٠﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٢١﴾ يَخْرُجُ مِنْهُمَا
ان دونوں میں ہر ایک پردہ جو ایک دوسری پر زیادتی نہ کرے، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے، نکلتا ہے ان دونوں سے

اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴿٢٢﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٢٣﴾ وَلَهُ الْجَوَارِ
موتی اور مونگا ، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے ، اور اسی کے ہیں جہاز

الْمُنشَآتُ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ ﴿٢٤﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٢٥﴾
اونچے کھڑے دریا میں جیسے پہاڑ ، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے ،

النصف ع ۲۵

ربط سورت اور جملہ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا کے تکرار کی حکمت

اس سے پہلی سورت القمر میں زیادہ تر مضامین سرکش قوموں پر عذابِ الٰہی آنے کے متعلق تھے اسی لئے ہر ایک عذاب کے بعد لوگوں کو متنبّہ کرنے کے لئے ایک خاص جملہ بار بار استعمال فرمایا ہے، یعنی فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ، اور اس کے متصل ایمان و اطاعت کی ترغیب کے لئے دوسرا جملہ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ بار بار لایا گیا ہے۔

سورۃ الرحمٰن میں اس کے مقابل بیشتر مضامین حق تعالیٰ کی دنیوی اور اُخروی نعمتوں کے بیان میں ہیں اسی لئے جب کسی خاص نعمت کا ذکر فرمایا تو ایک جملہ لوگوں کو متنبّہ کرنے اور شکرِ نعمت کی ترغیب دینے کے لئے فرمایا فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ، اور پوری سورت میں یہ جملہ اکتیس ۳۱ مرتبہ لایا گیا ہے، جو بظاہر تکرار معلوم ہوتا ہے، اور کسی لفظ یا جملے کا تکرار بھی تاکید کا فائدہ دیتا ہے، اس لئے وہ بھی فصاحت و بلاغت کے خلاف نہیں خصوصاً قرآن کریم کی ان دونوں سورتوں میں جس جملے کا تکرار ہوا ہے وہ تو صورت کے اعتبار سے تکرار ہے، حقیقت کے اعتبار سے ہر ایک جملہ ایک نئے مضمون سے متعلق ہونے کی وجہ سے مکرر محض نہیں ہے، کیونکہ سورۃ قمر میں ہر نئے عذاب کے بعد اس کے متعلق (فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي) آیا ہے، اسی طرح سورۃ رحمٰن میں ہر نئی نعمت کے بیان کے بعد (فَبِأَيِّ آلَاءِ) کا تکرار کیا گیا ہے جو ایک نئے مضمون کے متعلق ہونے کے سبب تکرار محض نہیں، علامہ سیوطیؒ

نے اس قسم کے تکرار کا نام تردید بتلایا ہے، وہ فصحاء و بلغاء عرب کے کلام میں مستحسن اور شیریں سمجھا گیا ہے، نثر اور نظم دونوں میں استعمال ہوتا ہے، اور صرف عربی نہیں، فارسی، اردو وغیرہ زبانوں کے مسلّم شعراء کے کلام میں بھی اس کی نظائر پائی جاتی ہیں، یہ موقع ان کو جمع کرنے کا نہیں، تفسیر روح المعانی وغیرہ میں اس جگہ متعدد نظائر بھی نقل کی ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

رحمٰن (کی بے شمار نعمتیں ہیں ان میں سے ایک روحانی نعمت یہ ہے کہ اسی) نے (اپنے بندوں کو احکام) قرآن کی تعلیم دی (یعنی قرآن نازل کیا کہ اس کے بندے اس کے اوپر ایمان لائیں، اور اس کا علم حاصل کر کے اس پر عمل کریں تاکہ دائمی عیش و راحت کا سامان حاصل ہو اور اس کی ایک نعمت جسمانی ہے وہ یہ کہ) اسی نے انسان کو پیدا کیا (پھر) اس کو گویائی سکھلائی (جس پر ہزاروں منافع مرتب ہوتے ہیں منجملہ ان کے قرآن کا دوسرے کی زبان سے پہونچنا اور دوسروں کو پہونچانا ہے، اور ایک نعمت جسمانی آفاقی یہ ہے کہ اس کے حکم سے) سورج اور چاند حساب کے ساتھ (چلتے) ہیں، اور بے تنہ کے درخت اور تنہ دار درخت دونوں (اللہ کے) مطیع ہیں (سورج چاند کا چلنا تو اس لئے نعمت ہے کہ اس پر لیل و نہار سردی گرمی، ماہ و سال کا حساب مرتب ہوتا ہے اور ان کے منافع ظاہر ہیں اور درختوں کا سجدہ اس لئے نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں انسان کے لئے بیشمار منافع کی تخلیق فرمائی ہے) اور (ایک نعمت یہ ہے کہ) اسی نے آسمان کو اونچا کیا (جس سے علاوہ دوسرے منافع متعلقہ بالسماء کے بڑی منفعت یہ ہے کہ اس کو دیکھ کر انسان اس کے بنانے والے کی عظمتِ شان پر استدلال کرے، کما قال تعالیٰ یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ الخ) اور (ایک نعمت یہ ہے کہ) اسی نے (دنیا میں) ترازو رکھ دی تاکہ تم تولنے میں کمی بیشی نہ کرو اور (جب یہ ایسی بڑی منفعت کے لئے موضوع ہے کہ یہ آلہ ہے حقوق کے لین دین کو پورا کرنے کا، جس سے ہزاروں مفاسد ظاہری و باطنی دُور ہو جاتے ہیں، تو تم اس نعمت کا خصوصیت کے ساتھ شکر کرو، اور اس شکر یہ میں سے یہ بھی ہے کہ) انصاف (اور حق رسانی) کے ساتھ وزن کو ٹھیک رکھو اور تول کو گھٹاؤ مت اور (ایک نعمت یہ ہے کہ) اسی نے خلقت کے (فائدہ کے) واسطے زمین کو (اس کی جگہ) رکھ دیا کہ اس میں میوے ہیں اور کھجور کے درخت ہیں جن (کے پھل) پر غلاف (چڑھا) ہوتا ہے اور (اس میں) غلہ ہے جس میں بھوسہ (بھی) ہوتا ہے اور (اس میں) اور غذا کی چیز (بھی) ہے (جیسے بہت سی ترکاریاں وغیرہ) سو اے جن و انس (باوجود نعمتوں کی اس کثرت و عظمت کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (یعنی منکر ہونا بڑی ہٹ دھرمی اور بدیہیات بلکہ محسوسات کا انکار ہے، اور ایک نعمت یہ ہے کہ) اسی نے انسان (کی اصل اوّل یعنی آدم علیہ السلام) کو ایسی مٹی سے جو ٹھیکرے کی طرح (کھن کھن) بجتی تھی پیدا کیا (جس کا اجمالاً چند آیت میں اوپر ذکر آیا ہے) اور جنّات (کی اصل اوّل) کو خالص آگ سے (جس میں دُھواں نہ تھا) پیدا کیا، (اور پھر دونوں نوع میں توالد و تناسل کے ذریعہ سے نسل چلی، شرح اس کی سورۃ حجر کے رکوع دوم میں آچکی ہے)

سوائے جن وانس (باوجود نعمتوں کی اس کثرت وعظمت کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (مراد اس کی اوپر گذری ہے اور) وہ دونوں مشرق اور دونوں مغرب کا مالک (حقیقی) ہے (مراد اس سے سورج اور چاند کے طلوع وغروب کا افق ہے اس میں بھی وجہ نعمت ظاہر ہے کہ لیل ونہار کے افتتاح واختتام کے ساتھ بہت سے اغراض متعلق ہیں) سوائے جن وانس (باوجود نعمتوں کی اس کثرت وعظمت کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (اور ایک نعمت یہ ہے کہ) اسی نے دو دریاؤں کو (صورۃً) ملایا کہ (ظاہر میں) باہم ملے ہوئے ہیں (اور حقیقۃً) ان دونوں کے درمیان میں ایک حجاب (قدرتی) ہے کہ (اس کی وجہ سے) دونوں (اپنے اپنے موقع سے) بڑھ نہیں سکتے (جس کی شرح سورۃ فرقان کے ختم سے ڈیڑھ رکوع قبل گذری ہے اور آبِ شور وآب شیریں کے منافع بھی ظاہر ہیں، اور دونوں کے ملنے میں نعمتِ استدلال بھی ہے) سوائے جن وانس (باوجود اس کثرت وعظمتِ نِعَم کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (اور بحرین کے متعلق ایک یہ نعمت ہے کہ) ان دونوں سے موتی اور مونگا برآمد ہوتا ہے (موتی مونگے کے منافع اور وجوہِ نعمت ہونا ظاہر ہے) سوائے جن وانس (باوجود نعمتوں کی اس کثرت وعظمت کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے اور (ایک نعمت یہ ہے کہ) اسی کے (اختیار اور ملک میں) ہیں جہاز جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح اونچے کھڑے (نظر آتے) ہیں (ان کی منفعت بھی ظاہر بلکہ اظہر ہے) سوائے جنّ وانس (باوجود نعمتوں کی اس کثرت وعظمت کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے،

معارف ومسائل

سورۃ رحمٰن کے مکی یا مدنی ہونے میں اختلاف ہے، امام قرطبیؒ نے چند روایاتِ حدیث کی وجہ سے مکی ہونے کو ترجیح دی ہے، ترمذی میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کے سامنے سورۃ رحمٰن پوری تلاوت فرمائی، یہ لوگ سنکر خاموش رہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے لیلۃ الجن میں جنات کے سامنے یہ سورت تلاوت کی تو اثر قبول کرنے کے اعتبار سے وہ تم سے بہتر رہے، کیونکہ جب میں قرآن کے اس جملے پر پہونچتا تھا (فَبِاَیِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ) تو جنات سب کے سب بول اٹھتے تھے (لَا بِشَیْءٍ مِّنْ نِعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ) "یعنی اے ہمارے پروردگار! ہم آپ کی کسی بھی نعمت کی تکذیب وناشکری نہ کریں گے، آپ ہی کے لئے حمد ہے" اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ سورت مکی ہے، کیونکہ لیلۃ الجن وہ رات جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنات کو تبلیغ وتعلیم فرمائی مکہ مکرمہ میں ہوئی ہے۔

اسی طرح کی اور بھی چند روایات قرطبی نے نقل کی ہیں جن سے اس سورت کا مکی ہونا معلوم ہوتا ہے اس سورت کو لفظ رحمٰن سے شروع کیا گیا اس میں ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ کفار مکہ اللہ تعالیٰ کے

ناموں میں سے رحمٰن سے واقف نہ تھے، اسی لئے کہتے تھے وَمَا الرَّحْمٰنُ کہ رحمٰن کیا چیز ہے، ان لوگوں کو واقف کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے یہاں رحمٰن کا انتخاب کیا گیا۔

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ آگے جو کام رحمٰن کا ذکر کیا گیا ہے، یعنی تعلیم قرآن، اس میں یہ بھی بتلا دیا گیا کہ اس تعلیم قرآن کا مقتضی اور سبب داعی صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، ورنہ اس کے ذمہ کوئی کام واجب وضروری نہیں، جس کا اس سے سوال کیا جاسکے، اور نہ وہ کسی کا محتاج ہے۔

آگے پوری سورت میں حق تعالیٰ کی دنیوی اور دینی نعمتوں کا ذکر مسلسل ہوا ہے، عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں جو سب سے بڑی نعمت ہے اس کے ذکر سے ابتداء کی گئی، اور سب سے بڑی نعمت قرآن ہے کیونکہ قرآن کریم انسان کے معاش اور معاد، دین اور دنیا دونوں کی خیرات و برکات کا جامع ہے، جنھوں نے قرآن کو لیا اور اس کا حق ادا کیا، جیسے صحابہ کرام حق تعالیٰ نے ان کو آخرت کے درجات اور نعمتوں سے تو سرفراز فرمایا ہی ہے دنیا میں بھی وہ درجہ اور مقام عطا فرمایا جو بڑے بڑے بادشاہوں کو بھی حاصل نہیں۔

قاعدے کے مطابق لفظ عَلَّمَ کے دو مفعول ہوتے ہیں، ایک وہ علم جو سکھایا جائے، دوسرے وہ شخص جس کو سکھایا جائے، یہاں آیت میں وہ چیز تو بتلا دی گئی جو سکھائی گئی ہے، یعنی قرآن، دوسرا مفعول یعنی قرآن جس کو سکھایا گیا اس کا ذکر نہیں کیا، بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ بلا واسطہ حق تعالیٰ نے جن کو تعلیم دی، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہی مراد ہیں، پھر آپؐ کے واسطے سے ساری مخلوقات اس میں داخل ہے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تنزیلِ قرآن کا مقصد ساری ہی خلق خدا کو راہِ ہدایت دکھانا اور سب ہی کو اخلاق و اعمالِ صالحہ کا سکھانا ہے، اس لئے کسی خاص مفعول کی تخصیص نہیں کی گئی، دوسرا مفعول ذکر نہ کرنے سے اشارہ اسی عموم کی طرف ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ، انسان کی تخلیق خود حق تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت ہے، اور ترتیب طبعی کے اعتبار سے وہی سب سے مقدم ہے، یہاں تک کہ تعلیمِ قرآن جس کو پہلے ذکر کیا گیا ہے وہ بھی ظاہر ہے کہ تخلیق کے بعد ہی ہوسکتی ہے، مگر قرآن حکیم نے نعمتِ تعلیم قرآن کو مقدم اور تخلیقِ انسان کو مؤخر کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ تخلیقِ انسان کا اصل مقصد ہی تعلیمِ قرآن اور اس کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنا ہے، جیسا کہ دوسری آیت میں ارشاد ہے، وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ یعنی میں نے جن و انس کو صرف اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کیا کریں، اور ظاہر ہے کہ عبادت بغیر تعلیمِ الٰہی کے نہیں ہوسکتی، اسی کا ذریعہ قرآن ہے، اس لئے اس حیثیت میں تعلیمِ قرآن تخلیقِ انسان سے مقدم ہوگئی۔

تخلیقِ انسان کے بعد جو نعمتیں انسان کو عطا ہوئیں وہ بے شمار ہیں، ان میں خاص طور پر تعلیم بیان کو یہاں ذکر فرمانے کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ جن نعمتوں کا تعلق انسان کے نشو و نما اور وجود و بقاء سے ہے

مثلاً کھانا پینا، سردی گرمی سے بچنے کے سامان، رہنے بسنے کا انتظام وغیرہ ان نعمتوں میں تو ہر جاندار انسان اور حیوان شریک ہیں، وہ نعمتیں جو انسان کے ساتھ مخصوص ہیں اُن میں سے پہلے تو تعلیم قرآن کا ذکر فرمایا اس کے بعد تعلیم بیان کا، کیونکہ تعلیم قرآن کا افادہ واستفادہ بیان پر موقوف ہے۔

اور بیان میں زبانی بیان بھی داخل ہے، تحریر وخط اور افہام وتفہیم کے جتنے ذرائع حق تعالیٰ نے پیدا فرمائے ہیں وہ بیان کے مفہوم میں شامل ہیں، اور پھر مختلف خطوں، مختلف قوموں کی مختلف زبانیں اور اُن کے محاورات سب اسی تعلیم بیان کے اجزاء ہیں جو عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا کی عملی تفسیر ہے، فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ، انسان کے لئے حق تعالیٰ نے جو نعمتیں زمین و آسمان میں پیدا فرمائی ہیں اس آیت میں علویات میں سے شمس و قمر کا ذکر خصوصیت سے شاید اس لئے کیا ہے کہ عالم دنیا کا سارا نظام ان دونوں سیاروں کی حرکات اور ان کی شعاعوں سے وابستہ ہے، اور لفظ حُسْبَان بضم الحاء بعض حضرات نے فرمایا کہ حساب کے معنے میں مصدر ہے، جیسے غفران، سُبحان، قرآن، اور بعض نے فرمایا کہ حساب کی جمع ہے، اور مراد آیت کی یہ ہے کہ شمس و قمر کی حرکات جن پر انسانی زندگی کے تمام کاروبار موقوف ہیں، رات دن کا اختلاف، موسموں کی تبدیلی، سال اور مہینوں کی تعیین، ان کی تمام حرکات اور دوروں کا نظام محکم ایک خاص حساب اور اندازے کے مطابق چل رہا ہے، اور اگر حُسْبَان کو حساب کی جمع قرار دیا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ ان میں سے ہر ایک کے دَورہ کا الگ الگ حساب ہے، مختلف قسم کے حسابوں پر یہ نظام شمسی اور قمری چل رہا ہے، اور حساب بھی ایسا محکم و مضبوط کہ لاکھوں سال سے اس میں ایک منٹ، ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آیا۔

یہ زمانہ سائنس کی معراج کا زمانہ کہا جاتا ہے اور اس کی حیرت انگیز نئی نئی ایجادوں نے عقلاء کو حیران کر رکھا ہے، لیکن انسانی مصنوعات اور ربّانی تخلیقات کا کھلا ہوا فرق ہر دیکھنے والا دیکھتا ہے کہ انسانی مصنوعات میں بگاڑ اور سنوار کا سلسلہ ایک لازمی امر ہے، مشین کوئی کتنی ہی مضبوط و مستحکم ہو کچھ عرصہ کے بعد اس کو مرمت کی اور کم از کم گریس وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے، اور اس وقت تک کے لئے وہ مشین معطل رہتی ہے، حق تعالیٰ کی جاری کی ہوئی یہ عظیم الشان مخلوقات نہ کبھی مرمت کی محتاج ہے نہ کبھی ان کی رفتار میں کوئی فرق آتا ہے۔

وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ، نجم اس درخت کو کہا جاتا ہے جس کی بیل پھیلتی ہے تنا نہیں ہوتا، اور شجر تنہ دار درخت کو کہتے ہیں، یعنی ہر قسم کے درخت خواہ بیل والے ہوں یا تنے اور شاخوں والے سب کے سب اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ کرتے ہیں، سجدہ کرنا چونکہ انتہائی تعظیم اور اطاعت کی علامت ہے، اس سے مراد یہاں یہ ہے کہ ہر ایک درخت، پودے اور بیل اور اس کے پتوں اور پھلوں اور پھولوں کو حق تعالیٰ نے جن خاص خاص کاموں اور انسان کے فوائد کے لئے بنایا ہے، اور گویا ہر ایک کی ایک ڈیوٹی مقرر کر دی ہے، کہ وہ فلاں کام کیا کرے، ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی ڈیوٹی پر لگا ہوا ہے اور حکم ربانی کے تابع، اس میں رکھے

ہوئے فوائد اور خواص سے لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے، اسی تکوینی اور جبری اطاعتِ حق کو اس آیت میں سجدہ سے تعبیر کیا گیا ہے (روح، مظہری)

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ، رفع اور وضع دو متقابل لفظ ہیں، رفع کے معنی اونچا اور بلند کرنے کے ہیں، اور وضع کے معنی نیچے رکھنے اور پست کرنے کے آتے ہیں، اس آیت میں اوّل آسمان کو بلند کرنے اور رفعت دینے کا ذکر ہے، جس میں ظاہری بلندی بھی داخل ہے، اور معنوی یعنی درجہ اور رتبہ کی بلندی بھی کہ آسمان کا درجہ زمین کی نسبت بالا و برتر ہے، آسمان کا مقابل زمین سمجھی جاتی ہے، اور پورے قرآن میں اسی تقابل کیساتھ آسمان و زمین کا ذکر کیا گیا ہے اس آیت میں رفعِ سماء کا ذکر کرنیکے بعد وضعِ میزان کا ذکر کیا گیا ہے جو آسمان کے تقابل میں نہیں آتا، غور کرنیسے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی درحقیقت آسمان کے تقابل میں زمین کو لایا گیا ہے جیسا کہ تین آیتوں کے بعد (وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ) آیا ہے، تو دراصل تقابل رفعِ سماء اور وضعِ ارض ہی کا ہے، مگر ان دونوں کے درمیان ایک تیسری چیز یعنی وضعِ میزان کا ذکر کسی خاص حکمت سے کیا گیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکمت اس میں یہ ہے کہ وضعِ میزان اور پھر اس کے بعد میزان کے صحیح صحیح استعمال کا حکم جو بعد کی تین آیتوں میں آیا ہے اُن سب کا خلاصہ عدل و انصاف کا قائم کرنا، اور کسی کی حق تلفی اور ظلم و جور سے بچانا ہے، یہاں رفعِ سماء اور وضعِ ارض کے درمیان آیات میزان کے ذکر میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ آسمان و زمین کی تخلیق کی اصلی غایت و مقصود بھی عالم میں عدل و انصاف کا قیام ہے، اور زمین میں امن و امان بھی عدل و انصاف ہی کے ساتھ قائم رہ سکتا ہے، ورنہ فساد ہی فساد ہوگا، واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم،

لفظ میزان کی تفسیر اس آیت میں حضرت قتادہؒ، مجاہدؒ، سدی وغیرہ نے عدل سے کی ہے، کیونکہ میزان کا اصل مقصد عدل ہی ہے، اور بعض حضرات مفسرین نے یہاں میزان کو اپنے معروف معنی میں لیا ہے، اور حاصل اس کا بھی وہی ہے کہ حقوق میں عدل و انصاف سے کام لیا جائے، اور میزان کے معنی میں ہر وہ آلہ داخل ہے جس سے کسی چیز کی مقدار معین کی جائے، خواہ وہ دو پلے والی تراز و ہو یا کوئی جدید آلۂ پیمائش،

اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ، پہلی آیت میں جو میزان پیدا کرنے کا ذکر تھا اس جملے میں اس کے مقصد کو واضح کیا گیا ہے، تَطْغَوْا، طغیان سے مشتق ہے، جس کے معنی بے انصافی اور ظلم کے ہیں، مراد یہ ہے کہ میزان کو اللہ تعالیٰ نے اس لئے بنایا کہ تم وزن میں کمی بیشی کر کے ظلم و جور میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔

وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ، قسط کے لفظی معنی انصاف کے ہیں، مراد ظاہر ہے کہ وزن کو ٹھیک ٹھیک قائم کرو انصاف کے ساتھ۔

وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ، خسر کے معنی وزن میں کمی کرنے کے ہیں، جو بات پہلے جملے اَقِيْمُوا الْوَزْنَ میں مثبت انداز سے بیان کی گئی ہے، یہ اُسی کا منفی پہلو ہے کہ وزن میں کم تولنا حرام ہے۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ، اَنَام بالفتح بروزن سَحَاب، ہر جاندار کو کہا جاتا ہے جو زمین

پر رہتا چلتا ہے، (قاموس) بیضاوی نے ہر ذی روح اس کا ترجمہ کیا ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ اس آیت میں انام سے مراد انسان اور جنّات ہیں، کیونکہ کُل ذی روح ارواح میں سے یہی دونوں احکامِ شرعیہ کے مکلّف اور مامور ہیں، اور اس سورت میں بار بار انہی دونوں کو خطاب بھی کیا گیا ہے، جیساکہ فَبِاَیِّ اٰلَاۗءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ میں یہی دونوں جن و انس مخاطب ہیں۔

فِیۡهَا فَاکِهَةٌ، فاکہ ہر ایسے میوے اور پھل کو کہا جاتا ہے جو عادةً غذا کے بعد تفریحًا کھایا جاتا ہے۔

وَالنَّخۡلُ ذَاتُ الۡاَکۡمَامِ، اکمام، کِم بالکسر کی جمع ہے جس کے معنی اس غلاف کے ہیں جو کھجور وغیرہ کے پھلوں پر ابتدا میں چڑھا ہوتا ہے۔

وَالۡحَبُّ ذُو الۡعَصۡفِ، لفظ حبّ بفتح حاء وتشدید باء، دانے یعنی غلّے کو کہا جاتا ہے، جیسے گندم، چنا، چاول، ماش، مسور وغیرہ اور عَصۡف اُس بھوسے کو کہتے ہیں جس کے اندر پیک کیا ہوا دانہ بقدرتِ خداوندی وحکمتِ بالغہ پیدا کیا جاتا ہے، عصف یعنی بھوسے کے غلاف میں پیک ہو کر خراب ہواؤں اور مکھی مچھر وغیرہ سے پاک وصاف رہتا ہے، دانے کی پیدائش کے ساتھ ذُو الۡعَصۡفِ کا لفظ بڑھا کر غافل انسان کو اس طرف بھی متوجہ کیا گیا ہے کہ یہ روٹی، دال، وغیرہ جو وہ دن میں کئی کئی مرتبہ کھاتا ہے اس کا ایک ایک دانہ مالک وخالق نے کیسی کیسی صنعتِ عجیبہ کے ساتھ مٹی اور پانی سے پیدا کیا، اور پھر کس طرح اس کو حشرات الارض سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک ایک دانہ پر غلاف چڑھایا، جب وہ تمہارا لقمہ تر بنا، اس کے ساتھ شاید عَصۡف کو ذکر کرنے سے ایک دوسری نعمت کی طرف بھی اشارہ ہو کہ یہ عصف (بھوسہ) تمہارے مواشی کی غذا بنتا ہے، جن کا تم دودھ پیتے ہو، اور سواری و باربرداری کی خدمت اُن سے لیتے ہو۔

وَالرَّیۡحَانُ، ریحان کے مشہور معنی خوشبو کے ہیں، اور ابن زید نے یہی معنی آیت میں مراد لئے ہیں کہ اس نے زمین سے پیدا ہونے والے درختوں سے طرح طرح کی خوشبوئیں اور خوشبودار پھول پیدا فرمائے، اور کبھی لفظ ریحان بمعنی مغز اور رزق بھی استعمال کیا جاتا ہے، خَرَجۡتُ اَطۡلُبُ رَیۡحَانَ اللّٰهِ، ”یعنی میں نکلا اللہ کا رزق تلاش کرنے کے لئے“، حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت میں ریحان کی تفسیر رزق ہی سے کی ہے۔

فَبِاَیِّ اٰلَاۗءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ، لفظ آلاء جمع ہے نعمتوں کے معنے میں، اور مخاطب اس کا انسان اور جنّ ہیں، جس کا قرینہ سورۂ رحمٰن کی متعدد آیتوں میں جنّات کا ذکر ہے۔

خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ صَلۡصَالٍ کَالۡفَخَّارِ، انسان سے مراد اس جگہ باتفاق آدم علیہ السلام ہیں، جن کی تخلیق مٹی سے کی گئی ہے، صَلۡصَالٌ پانی میں ملی ہوئی مٹی جبکہ وہ خشک ہوجائے، اور فَخَّار وہ پانی میں ملائی ہوئی مٹی جس کو آگ پر پکالیا جائے۔

وَخَلَقَ الۡجَآنَّ مِنۡ مَّارِجٍ مِّنۡ نَّارٍ، جانّ، بتشدید نون، جنسِ جنّات کو کہا جاتا ہے، اور مارج آگ سے اُٹھنے والا شعلہ ہے، جنّات کی تخلیق کا بڑا عنصر آگ کا شعلہ ہے، جیساکہ انسان کی تخلیق میں بڑا جزء مٹی ہے۔

رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ، سردی اور گرمی میں آفتاب کا مطلع بدلتا ہے، اس لئے سردی کے زمانے میں مشرق یعنی آفتاب کے نکلنے کی جگہ اور ہوتی ہے اور گرمی کے زمانے میں دوسری، انہی دونوں جگہوں کو آیت میں مشرقین سے تعبیر فرمایا ہے، اسی طرح اس کے بالمقابل مغربین فرمایا، کہ سردی میں غروب آفتاب کی جگہ اور ہوتی ہے اور گرمی میں دوسری۔

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ، مرج کے لغوی معنی آزاد و بے قید چھوڑ دینے کے ہیں، اور بحرین سے دو دریا.... شیریں اور نمکین مراد ہیں، زمین پر حق تعالیٰ نے دونوں قسم کے دریا پیدا فرمائے ہیں، اور بعض جگہ یہ دونوں مل جاتے ہیں، جس کی نظائر دنیا کے ہر خطے میں پائی جاتی ہیں، مگر جہاں دو دریا شیریں اور نمکین مل کر بہتے ہیں وہاں کافی دور تک دونوں کا پانی الگ الگ ممتاز رہتا ہے، ایک طرف میٹھا دوسری طرف کھارا، اور بعض جگہ یہ صورت اوپر نیچے بھی ہوتی ہے، جہاں دریائے شور کسی شیریں دریا کے اوپر چڑھ آتا ہے وہاں بھی نیچے کا پانی اپنی جگہ شیریں ہوتا ہے، اور اوپر کا نمکین اور کھاری، پانی باوجود رقیق اور لطیف ہونے کے ایک مسافت تک ایک دوسرے میں خلط ملط نہیں ہوتا، الگ الگ اپنے ذائقہ کے ساتھ چلتا ہے، اسی قدرت حق تعالیٰ کے بیان کے لئے فرمایا مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ، یعنی دونوں دریا ملتے ہیں، مگر ان کے درمیان قدرتِ خداوندی کا ایک پردہ حائل رہتا ہے جو دور تک آپس میں ان کو ملنے نہیں دیتا،

يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ، لؤلؤ کے معنی موتی اور مرجان کے معنی مونگا، یہ بھی قیمتی جواہرات سے ہے، اس میں درخت کے مشابہ شاخیں ہوتی ہیں، یہ دونوں چیزیں دریا سے نکلتی ہیں مگر معروف یہ ہے کہ موتی اور جواہرات دریائے شور سے نکلتے ہیں، شیریں دریا سے نہیں، اس آیت میں دونوں سے نکلنا بیان فرمایا ہے، اس کی توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ موتی دونوں ہی دریاؤں میں پیدا ہوتے مگر شیریں دریا سب جاری ہوتے ہیں اُن سے موتی کا نکالنا آسان نہیں، شیریں دریا سب جا کر دریائے شور میں گر جاتے ہیں، وہیں سے موتی نکالے جاتے ہیں، اس لئے موتیوں کا منبع دریائے شور کو کہا جاتا ہے۔

وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ، جواری، جاریہ کی جمع ہے، اس کے ایک معنی کشتی کے بھی آتے ہیں وہی یہاں مراد ہیں، مُنْشَئٰت، نَشَاءَ سے مشتق ہے جس کے معنی اُبھرنے اور بلند ہونے کے ہیں، مراد کشتیوں کے بادبان ہیں جو جھنڈوں کی طرح اونچے اور بلند بنائے جاتے ہیں، اس میں کشتی کی صنعت اور اس کے پانی کے اوپر چلنے کی حکمت کا بیان ہے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿۲۶﴾ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿۲۷﴾

جو کوئی ہے زمین پر فنا ہونیوالا ہے، اور باقی رہیگا منہ تیرے رب کا بزرگی اور عظمت والا،

فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۲۸ يَسْـَٔــلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ كُلَّ

پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے ، اس سے مانگتے ہیں جو کوئی ہیں آسمانوں میں اور زمین میں ہر

يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ۝۲۹ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۳۰ سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ

روز اس کو ایک دھندا ہے ، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے ، ہم جلد فارغ ہونے والے ہیں تمھاری

الثَّقَلٰنِ ۝۳۱ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۳۲ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ

طرف اے دو بھاری قافلو ، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے ، اے گروہ جنوں کے اور انسانوں کے اگر

اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ۭ

تم سے ہو سکے کہ نکل بھاگو آسمانوں اور زمین کے کناروں سے تو نکل بھاگو ،

لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۝۳۳ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۳۴ يُرْسَلُ

نہیں نکل سکنے کے بدون سند کے ، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے ، چھوڑے جائیں

عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ڏ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ۝۳۵ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا

تم پر شعلے آگ کے صاف اور دھواں ملے ہوئے پھر تم بدلہ نہیں لے سکتے ، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی

تُكَذِّبٰنِ ۝۳۶ فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَاۗءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۝۳۷ۚ فَبِاَيِّ

جھٹلاؤ گے ، پھر جب پھٹ جائے آسمان تو ہو جائے گلابی جیسے نری ، پھر کیا کیا

اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۳۸ فَيَوْمَىِٕذٍ لَّا يُسْـَٔــلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَاۗنٌّ ۝۳۹ۚ

نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے ، پھر اس دن پوچھ نہیں اس کے گناہ کی کسی آدمی سے اور نہ جن سے ،

فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۴۰ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ

پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے ، پہچانے پڑیں گے گنہگار اپنے چہرے سے پھر پکڑا جائے گا

بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ ۝۴۱ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۴۲ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ

پیشانی کے بال سے اور پاؤں سے ، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے ، یہ دوزخ ہے جس کو جھوٹ

يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۝۴۳ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ۝۴۴ۚ فَبِاَيِّ

بتاتے تھے گنہگار ، پھریں گے بیچ اس کے اور کھولتے پانی کے ، پھر کیا کیا

وقف لازم

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۴۵﴾

نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے ،

ع ۱۲

خلاصہ تفسیر

(جتنی نعمتیں تم لوگوں نے سُنی ہیں تم کو توحید و طاعت سے اُن کا شکر ادا کرنا چاہیے، اور کفر و معصیت سے ناشکری نہ کرنا چاہیے، کیونکہ اس عالم کے فنا کے بعد ایک دوسرا عالم آنے والا ہے، جہاں ایمان و کفر پر جزاء و سزا واقع ہوگی، جس کا بیان آیات آئندہ کے ضمن میں ہے، پس ارشاد ہے کہ) جتنے (جن و انس) روئے زمین پر موجود ہیں سب فنا ہو جائیں گے، اور (صرف) آپ کے پروردگار کی ذات جو کہ عظمت (والی) اور (باوجود عظمت کے) احسان والی ہے باقی رہ جاوے گی (چونکہ مقصود تنبیہ کرنا ثقلین یعنی جن و انس کو ہے، اور وہ سب زمین پر ہیں، اس لئے فنا میں اہلِ ارض کا ذکر کیا گیا، اس تخصیص ذکری سے دوسری چیزوں کی فنا کی نفی لازم نہیں آتی، اور اس جگہ اللہ تعالیٰ کی دو صفتیں عظمت و احسان اس لئے ذکر کی گئیں کہ ایک صفت ذاتی دوسری اضافی ہے، حاصل اس کا یہ ہے کہ اکثر اہل عظمت دوسروں کے حال پر توجہ نہیں کیا کرتے، مگر حق تعالیٰ باوجود اس عظمت کے وہ اپنے بندوں پر رحمت و فضل فرماتے ہیں، اور چونکہ یہ فناءِ عالم اور اس کے بعد جزاء و سزا کی خبر دینا انسان کو دولتِ ایمان بخشتا ہے، اس لئے یہ مجموعہ بھی ایک بڑی نعمت ہی، اس لئے فرمایا) سواے جن و انس (باوجود اس کثرت و عظمتِ نِعَم کے) تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کی منکر ہو جاؤ گے (آگے ایک خاص طور پر اس کی عظمت و اکرام کے متعلق مضمون ہی یعنی وہ ایسا باعظمت ہی کہ) اسی سے (اپنی اپنی حاجتیں) سب آسمان و زمین والے مانگتے ہیں (زمین والوں کی حاجتیں تو ظاہر ہیں اور آسمان والے گو کھانے پینے کے محتاج نہ ہوں، لیکن رحمت و عنایت کے تو سب محتاج ہیں، آگے اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان کو ایک دوسرے عنوان سے بیان کیا گیا ہے) وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں رہتا ہے (یہ مطلب نہیں کہ صدورِ افعال اس کے لوازمِ ذات سے ہے، ورنہ قدیم ہونا حادث کا لازم آئے گا، بلکہ مطلب یہ ہی کہ جتنے تصرفات عالم میں واقع ہو رہے ہیں وہ اسی کے تصرّفات ہیں، جن میں اس کے انعامات و احسانات بھی داخل ہیں، جیسے ایجاد و ابقاء جو رحمتِ عامّہ ہے، اور اعطاءِ رزق و اولاد جو سب دنیوی رحمتیں ہیں، اور ہدایت و اعطاءِ علم و توفیق عمل جو دینی رحمتیں ہیں پس باوجود عظمت کے ایسا اکرام و احسان فرمانا یہ بھی ایک نعمتِ عظیمہ ہی) سواے جن و انس (باوجود اس کثرت و عظمت نِعَم کے) تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (یہ مضمون جلال و اکرام کا بقاءِ خالق کے متعلق فرما کر آگے پھر فناءِ خلق کے متعلق ارشاد ہے کہ تم لوگ یہ نہ سمجھنا کہ پھر وہ فنا مستمر رہے گی اور عذاب و ثواب نہ ہوگا، بلکہ ہم تم کو دوبارہ زندہ کریں گے اور جزا و سزا دیں گے اسی کو اس طرح فرماتے ہیں کہ) اے جن و انس ہم عنقریب تمھارے (حساب و کتاب کے) لئے خالی ہوئے جاتے

ہیں (یعنی حساب وکتاب لینے والے ہیں، مجازاً ومبالغۃً اس کو خالی ہونے سے تعبیر فرمادیا، اور مبالغہ اس طرح ہے کہ انسان جب سب کاموں سے خالی ہو کر کسی طرف متوجہ ہوتا ہے تو پوری توجہ سمجھی جاتی ہے، انسانی فہم کے مطابق یہ عنوان اختیار کیا گیا، ورنہ حق تعالیٰ کی اصل شان یہ ہے کہ اس کو ایک مشغولیت کسی دوسری مشغولیت سے مانع نہیں ہوتی، اور اس کی جس طرف جس وقت توجہ ہوتی ہے تام اور کامل ہی ہوتی ہے، وہاں ناقص توجہ کا احتمال ہی نہیں، اور مثل سابق آگے ارشاد ہے کہ یہ حساب کتاب کی خبر دینا بھی ایک نعمتِ عظمیٰ ہے) سوائے جن وانس (باوجود اس کثرت وعظمتِ نِعَم کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہوجاؤ گے (آگے تاکید وقوعِ حساب کے لئے یہ بتلاتے ہیں کہ اس وقت یہ بھی احتمال نہیں کہ کوئی کہیں بچ کر نکل جائے چنانچہ ارشاد ہے کہ) اے گروہ جن اور انسانوں کے اگر تم کو یہ قدرت ہے کہ آسمان اور زمین کی حدود سے کہیں باہر نکل جاؤ تو (ہم بھی دیکھیں) نکلو (مگر) بدون زور کے نہیں نکل سکتے (اور زور ہے نہیں، پس نکلنے کا وقوع بھی ممکن نہیں اور یہی حالت بعینہٖ قیامت میں ہوگی بلکہ وہاں تو یہاں سے بھی زیادہ عجز ہوگا، غرض بھاگ نکلنے کا احتمال نہ رہا اور یہ بات بتلا دینا بھی موجب ہدایت ونعمتِ عظمیٰ ہے) سوائے جنّ وانس (باوجود اس کثرت وعظمتِ نِعَم کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہوجاؤ گے (آگے بوقتِ عذاب انسان کے عجز کا ذکر فرماتے ہیں، جیسا اوپر حساب کے وقت اس کے عاجز ہونے کا ذکر تھا، یعنی اے جنّ وانس کے مجرمو) تم دونوں پر (قیامت کے روز) آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑا جائے گا پھر تم (اس کو) ہٹا نہ سکو گے (یہ شعلہ اور دھواں غالباً وہ ہے جس کا ذکر سورۃ والمرسلٰت میں ہے اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ الیٰ قولہ اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ فالظل ھو دخان والشرر ھو الشُّواظ، واللہ اعلم، اور اس کا بتلانا بھی بوجہ ذریعہ ہدایت ہونے کے ایک نعمتِ عظمیٰ ہے) سوائے جنّ وانس (باوجود اس کثرت وعظمتِ نِعَم کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہوجاؤ گے غرض (جب ہمارا حساب لینا اور تمہارا احساب وعقاب کے وقت عاجز ہونا معلوم ہوگیا تو اس سے قیامت کے روز حساب وعقاب کا وقوع ثابت ہوگیا، جس کا بیان یہ ہے کہ) جب (قیامت آوے گی جس میں) آسمان پھٹ جاوے گا اور ایسا سُرخ ہوجاوے گا جیسے سُرخ نری (یعنی چمڑا، شاید یہ رنگ اس لئے ہو کہ علامت غضب کی ہے، کہ غضب میں چہرہ سُرخ ہوجاتا ہے، اور یہ آسمان کا پھٹنا وہ ہے جو شروع پارہ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ میں آیا ہے، فی قولہ تعالیٰ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ الخ

اور یہ خبر دینا بھی نعمت ہے) سوائے جنّ وانس (باوجود اس کثرت وعظمت نِعَم کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہوجاؤ گے (یہ تو حساب کا وقوع اور اس کا وقت بتلایا گیا آگے کیفیت حساب وطریق فیصلہ ارشاد فرماتے ہیں یعنی جس روز یہ واقعات ارسال شواظ ونحاس وانشقاق سماء وغیرہ ہوں گے) تو اس روز (اللہ تعالیٰ کے معلوم کرنے کے لئے) کسی انسان اور جن سے اس کے جرم کے متعلق نہ پوچھا جائے گا (کیونکہ اللہ تعالیٰ کو سب معلوم ہے یعنی حساب اس غرض سے نہ ہوگا بلکہ خود ان کو معلوم کرانے اور جتلانے کے لئے سوال اور حساب ہوگا لقولہ تعالیٰ فوربک لنسئلنھم اجمعین

اور یہ خبر دینا بھی ایک نعمت ہے) سوائے جنّ وانس (باوجود اس کثرت وعظمت نِعَم کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہوجاؤ گے (یہ تو حساب کی کیفیت ہوئی کہ بطور تحقیق نہ ہوگا بلکہ بطور توبیخ ہوگا، آگے یہ بتلاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو تو تعیین جرائم ومجرمین کی معلوم ہے، اس لئے تحقیق کی ضرورت نہ ہوگی

لیکن فرشتوں کو مجرمین کی تعیین کیسے ہوگی، پس ارشاد فرماتے ہیں کہ) مجرم لوگ اپنے حلیہ سے (کہ چہرہ کی سیاہی اور آنکھوں کا نیلگوں ہونا ہے، کقولہ تعالیٰ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ، وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِیْنَ یَوْمَئِذٍ زُرْقًا) پہچانے جاویں گے سو (ان کے) سر کے بال اور پاؤں پکڑ لئے جاویں گے (اور ان کو گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جاوے گا، یعنی کسی کا سر کسی کی ٹانگ حسب اعمال یا کبھی سر کبھی ٹانگ بغرض اجتماع انواع عذاب و نکال اور یہ خبر دینا بھی ایک نعمت ہے) سواے جن و انس (باوجود اس کثرت و عظمتِ نعم کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (آگے مزید عذاب بتلاتے ہیں) یہ ہے وہ جہنم جس کو مجرم لوگ (یعنی تم) جھٹلاتے تھے وہ لوگ دوزخ کے اور گرم کھولتے ہوئے پانی کے درمیان چکر لگاتے ہوں گے (یعنی کبھی آگ کا عذاب ہوگا کبھی کھولتے ہوئے پانی کا جس کی تحقیق سورۂ مؤمن رکوع ہشتم میں گذر چکی ہے اور یہ خبر دینا بھی نعمت ہے) سواے جن و انس (باوجود اس کثرت و عظمتِ نعم کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔

معارف و مسائل

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ، عَلَيْهَا کی ضمیر ارض کی طرف راجع ہے، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے (وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ) اس کے علاوہ زمین اُن عام اشیاء میں سے ہے جس کی طرف ضمیر راجع کرنے کے لئے پہلے مرجع کا ذکر لازم نہیں ہے، معنی اس کے یہ ہوئے کہ جو جنات اور انسان زمین پر ہیں سب فنا ہونے والے ہیں، اس میں جن و انس کے ذکر کی تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ اس سورت میں مخاطب یہی دونوں ہیں، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آسمان اور آسمان والی مخلوقات فانی نہیں ہیں کیونکہ دوسری آیت میں حق تعالیٰ نے عام لفظوں میں پوری مخلوقات کا فانی ہونا بھی واضح فرما دیا ہے كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ۔

وَجْهُ رَبِّكَ، وَجْهُ سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک ذات حق سبحانہ و تعالیٰ ہے، اور رَبِّكَ میں ضمیر خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہے، یہ حضرت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص اعزاز و اکرام ہے کہ آپ کو خاص مقامِ مدح میں کہیں تو عَبْدُهٗ کا خطاب ہوا ہے، اور کہیں رب الارباب نے اپنی ذات کی نسبت حضورؐ کی طرف کر کے رَبِّكَ سے خطاب فرمایا ہے۔

مشہور تفسیر کے مطابق معنی آیت کے یہ ہوگئے کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے جن میں جن و انس بھی داخل ہیں سب کے سب فانی ہیں، باقی رہنے والی ایک ہی ذات حق جل و علا شانہ کی ہے۔

فانی ہونے سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ سب چیزیں اس وقت بھی اپنی ذات میں فانی ہیں، ان میں دوام و بقاء کی صلاحیت نہیں، اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ قیامت کے روز یہ سب چیزیں فنا ہو جائیں گی۔

اور بعض حضرات مفسرین نے وَجْهُ رَبِّكَ کی تفسیر جہت اور سمت سے کی ہے، اس صورت میں معنی آیت کے یہ ہو جائیں گے کہ کُل موجودات میں بقاء صرف اس چیز کو ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب میں ہے، اس میں

اس کی ذات وصفات بھی داخل ہیں، اور مخلوقات کے اعمال واحوال میں جس چیز کا تعلق حق تعالیٰ کے ساتھ ہے وہ بھی شامل ہے، جس کا حاصل یہ ہوگا کہ انسان اور جن اور فرشتے جو کام اللہ کے لئے کرتے ہیں وہ کام بھی باقی ہی وہ فنا نہیں ہوگا، (کذا فی المظہری والقرطبی والرّوح) اور اس مفہوم کی تائید قرآن مجید کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے مَا عِنۡدَكُمۡ يَنۡفَدُ وَمَا عِنۡدَ اللّٰهِ بَاقٍ "یعنی جو کچھ تمہارے پاس ہے مال و دولت ہو یا قوت وطاقت یا راحت وکلفت یا کسی کی محبت وعداوت یہ سب چیزیں فنا ہونیوالی ہیں، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے" اللہ کے پاس انسان کے اعمال واحوال میں سے وہ چیز ہے جس کا تعلق حق تعالیٰ سے ہے کہ اس کو فنا نہیں واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

ذُو الۡجَلٰلِ وَالۡاِكۡرَامِ، یعنی وہ رب صاحب عظمت وجلال بھی ہے اور صاحب اکرام بھی، صاحب اکرام ہونے کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ درحقیقت ہر اکرام واعزاز کا مستحق تنہا وہی ہے، اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ خود صاحب عظمت وجلال ہونے کے باوجود عام دنیا کے بادشاہوں اور عظمت والوں کی طرح نہیں کہ ان کو دوسروں کی اور غریبوں کی طرف التفات وتوجہ نہ ہو، بلکہ وہ عظمت وجلال کے ساتھ اپنی مخلوقات کا بھی اکرام کرتا ہے، کہ ان کو عطاء وجود کے بعد طرح طرح کی بے شمار نعمتوں سے نوازتا ہے، اور ان کی درخواستیں اور دعائیں سنتا ہے، اگلی آیت اسی دوسرے معنی کی شہادت دیتی ہے، اور یہ لفظ ذُو الۡجَلٰلِ وَالۡاِكۡرَامِ حق تعالیٰ کی اُن خاص صفات میں سے ہے کہ ان کو ذکر کر کے انسان جو دعاء مانگتا ہے قبول ہوتی ہے، ترمذی، نسائی اور مسند احمد میں ربیعہ ابن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَلِظُّوۡا بِيَا ذَا الۡجَلَالِ وَالۡاِكۡرَامِ، اَلِظُّوۡا، الظاظ سے مشتق ہے، جس کے معنی لازم پکڑنے کے ہیں، مراد حدیث کی یہ ہے کہ اپنی دعاؤں میں یَاذَالۡجَلَالِ وَالۡاِكۡرَامِ کو یاد رکھو اور اسکے ساتھ دعاء کیا کرو کیونکہ وہ اقرب الی القبول ہے (مظہری)

يَسۡـَٔلُهٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ كُلَّ يَوۡمٍ هُوَ فِیۡ شَاۡنٍ، "یعنی زمین وآسمان کی ساری مخلوقات حق تعالیٰ کی محتاج ہیں، اور اسی سے اپنی حاجات مانگتی ہیں، زمین والے اپنے مناسب حاجات رزق اور صحت وعافیت اور آرام وراحت پھر آخرت کی مغفرت ورحمت اور جنت مانگتے ہیں، آسمان والے اگرچہ کھاتے پیتے نہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت وعنایت کے ہر وقت محتاج ہیں، وہ بھی رحمت و مغفرت وغیرہ اپنی حاجات کے طلبگار رہتے ہیں" آگے كُلَّ يَوۡمٍ اسی يَسۡـَٔلُ کا ظرف ہے، یعنی انکے یہ سوالات اور درخواستیں حق تعالیٰ سے ہر روز رہتی ہیں اور یوم اور روز سے مراد بھی عرفی دن نہیں، بلکہ مطلقاً وقت مراد ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ساری مخلوقات مختلف خطوں، مختلف زبانوں میں اس سے اپنی اپنی حاجات ہر وقت مانگتی رہتی ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ پوری مخلوقاتِ ارضی وسمائی اور ان کے ایک ایک فرد کی بے شمار حاجتیں اور وہ بھی ہر گھڑی ہر آن سوائے اس عظمت و جلال والے

قادرِ مطلق کے کون سُن سکتا ہے اور کون ان کو پورا کر سکتا ہے، اسی لئے کُلَّ یَوْمٍ کے ساتھ یہ بھی فرمایا ھُوَ فِیْ شَاْنٍ یعنی ہر وقت ہر لحظہ حق تعالیٰ کی ایک خاص شان ہوتی ہے وہ کسی کو زندہ کرتا ہے، کسی کو موت دیتا ہے، کسی کو عزت دیتا ہے کسی کو ذلت دیتا ہے، کسی تندرست کو بیمار اور کسی بیمار کو تندرست کرتا ہے، کسی مصیبت زدہ کو مصیبت سے نجات دیتا ہے کسی غم زدہ رونے والے کو ہنسا دیتا ہے، کسی سائل کو اس کی مانگی ہوئی چیز عطا کر دیتا ہے، کسی کا گناہ معاف کر کے جنّت میں داخل ہونے کا مستحق بنا دیتا ہے، کسی قوم کو بلند و صاحب اقتدار بنا دیتا ہے کسی قوم کو پست و ذلیل کر دیتا ہے، غرض ہر آن ہر لمحہ حق تعالیٰ جل شانہٗ کی ایک خاص شان ہوتی ہے۔

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ، ثقلان، ثقل کا تثنیہ ہے جس کے معنی وزن اور بوجھ کے ہیں، ثقلان دو بوجھ، مراد اس سے انسان اور جنّات ہیں، لفظ ثقل عربی زبان میں ہر ایسی چیز کے لئے بولا جاتا ہے جس کا وزن اور قدر و قیمت معروف ہو، اسی لئے حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، اِنِّیْ تَارِكٌ فِیْكُمُ الثَّقَلَیْنِ الخ یعنی میں اپنے بعد دو وزن دار قابلِ قدر چیزیں چھوڑتا ہوں جو تمہاری ہدایت و اصلاح کا کام دیتی رہیں گی، ان دونوں چیزوں کا بیان بعض روایات میں كِتَابُ اللّٰهِ وَعِتْرَتِیْ آیا ہے، بعض میں كِتَابُ اللّٰهِ وَسُنَّتِیْ اور حاصل دونوں کا ایک ہی ہے، کیونکہ عترت سے مراد اپنی اولاد ہے جس میں نسبی اور روحانی دونوں قسم کی اولاد شامل ہے، اس لئے مراد سب صحابہ کرام ہوئے، اور معنی حدیث کے یہ ہوئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دو چیزیں مسلمانوں کی ہدایت و اصلاح کا ذریعہ ہوں گی، ایک اللہ کی کتاب دوسرے آپ کے صحابہ کرام اور معاملات و احکام میں ان کا تعامل، اور جس روایت میں عترت کی جگہ سنّت آیا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات جو صحابہ کرام کے واسطے سے مسلمانوں کو پہونچی ہیں۔

بہرحال اس حدیث میں ثقلین سے مراد دو وزن دار قابلِ قدر چیزیں ہیں، آیت مذکورہ میں جن و انس کی دونوں نوعوں کو ثقلین اسی مفہوم کے اعتبار سے کہا گیا ہے کہ زمین پر بسنے رہنے والی سب ذی روح چیزوں میں جن و انس سب سے زیادہ وزن دار اور قابلِ قدر ہیں، اور سَنَفْرُغُ، فراغ سے مشتق ہے، جس کے معنی کسی شغل سے فارغ اور خالی ہونے کے ہیں، فراغ کا مقابل لغت میں شغل ہے، اور لفظ فراغ دو چیزوں کی خبر دیتا ہے اوّل یہ کہ کسی شغل میں مشغول تھا، دوسرے یہ کہ اب اس شغل کو ختم کر کے فارغ ہو گیا، یہ دونوں باتیں مخلوقات میں تو معروف و مشہور ہیں، انسان کبھی ایک شغل میں لگا ہوا ہوتا ہے پھر اس سے فارغ ہو جاتا ہے، مگر حق تعالیٰ جلّ شانہٗ ان دونوں سے بری ہیں، نہ اُن کو ایک شغل دوسرے شغل سے مانع ہوتا ہے نہ وہ کبھی اس طرح فارغ ہوتے ہیں، جس طرح انسان فارغ ہوا کرتا ہے۔

اس لئے آیتِ مذکورہ میں سَنَفْرُغُ کا لفظ ایک تشبیہ و استعارہ کے طور پر لایا گیا ہے جو عام انسانوں میں رائج ہے کہ کسی کام کی اہمیت بتلانے کے لئے کہا جاتا ہے، کہ ہم اس کام کے لئے فارغ ہو گئے یعنی اب پوری توجہ اسی کام پر ہے، اور جو آدمی کسی کام پر اپنی پوری توجہ خرچ کرتا ہے اس کے لئے محاورہ میں

کہا جاتا ہے کہ اس کو تو اس کے سوا کوئی کام نہیں۔

اس سے پہلی آیت میں جو یہ مذکور تھا کہ آسمان و زمین کی ساری مخلوقات اور ان کا ایک ایک فرد حق تعالیٰ سے اپنی حاجات مانگتا رہتا ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر وقت ہر حال میں اُن کی درخواست پورا کرنے کے لحاظ سے ایک خاص شان میں ہوتے ہیں، آیت سَنَفْرُغُ لَكُمْ الخ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ قیامت کے روز درخواستوں اور ان کے قبول اور اُن پر عمل کا سب سلسلہ بند ہو جائے گا اُس وقت کام صرف ایک رہ جائیگا اور شیُون مختلفہ میں سے صرف ایک شان ہوگی، یعنی حساب وکتاب اور عدل وانصاف کے ساتھ فیصلہ (روح)

يَمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ فَانْفُذُوا ۚ لَا تَنْفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطٰنٍ، پچھلی آیت میں جنّ وانس کو بلفظ ثقلین مخاطب کرکے بتلایا گیا تھا کہ قیامت کے روز ایک ہی کام ہوگا کہ سب جنّ وانس کے اعمال کا جائزہ لیا جائے گا، اور اس کے ذرّہ ذرّہ پر جزاء وسزا ہوگی، اس آیت میں یہ بتلانا منظور ہو کہ روزِ جزاء کی حاضری اور حسابِ اعمال سے کوئی شخص راہِ فرار اختیار نہیں کرسکتا، کسی کی مجال نہیں جو موت سے یا روزِ قیامت کے حساب سے کہیں بھاگ کر بچ نکلے، اس آیت میں ثقلان کے بجائے يَمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ کے صریح نام ذکر فرمائے اور جن کو انس پر مقدّم کیا، شاید اس میں اشارہ اس طرف ہو کہ آسمان و زمین کے اقطار سے پار نکل جانا بڑی قوّت وقدرت چاہتا ہے، جنّات کو حق تعالیٰ نے ایسے امور کی قوّت انسان سے زیادہ بخشی ہے، اس لئے جنّ کے ذکر کو مقدّم کیا گیا، مطلب آیت کا یہ ہے کہ اے جنّات اور انسانو! اگر تمہیں یہ گمان ہو کہ ہم کہیں بھاگ جائیں گے، اور اس طرح ملک الموت کے تصرّف سے بچ جائیں یا میدانِ حشر سے بھاگ کر نکل جائیں گے اور حساب کتاب سے بچ جائیں گے، تو لو اپنی قوّت آزما دیکھو، اگر تمہیں اس پر قدرت ہے کہ آسمان و زمین کے دائروں سے باہر نکل جاؤ تو نکل کر دکھلاؤ، یہ کوئی آسان کام نہیں، اس کے لئے تو بہت بڑی قوت وقدرت درکار ہے، جو جنّ وانس کی دونوں قوموں کو حاصل نہیں، اس کا حاصل ان کا اقطار سماء وارض سے باہر نکلنے کا امکان و احتمال بتلانا نہیں، بلکہ بطور فرضِ محال ان کا عاجز ہونا دکھلانا ہے۔

آیت میں مراد اگر موت سے فرار ہے تو یہی دنیا اس کا مصداق ہے، کہ کسی کے امکان میں نہیں کہ زمین سے آسمانوں تک کی حدود کو پھلانگ کر باہر نکل جائے، اور موت سے بچ جائے، ان حدود کو پار کرنے کا ذکر بھی انسانی خیال کے مطابق کیا گیا ہے، ورنہ بالفرض کوئی آسمانوں کی حدود سے باہر نکل جائے تو اللہ تعالیٰ کے احاطۂ قدرت سے بھی باہر نہیں، اور اگر مراد محشر کے حساب وکتاب اور جواب دہی سے فرار کا ناممکن ہونا بتلانا ہے، تو اس کی عملی صورت قرآن کریم کی دوسری آیات اور روایاتِ حدیث میں یہ ہے کہ قیامت کے روز آسمان شق ہو کر سب فرشتے زمین کے کناروں پر آجائیں گے، اور ہر طرف سے محاصرہ ہوگا، جنّ وانس قیامت کی ہولناک چیزوں کو دیکھ کر مختلف سمتوں میں بھاگیں گے، ہر سمت میں

فرشتوں کا محاصرہ دیکھ کر پھر اپنی جگہ لوٹ آئیں گے (روح)

فضائی سفر جو آجکل مصنوعی سیاروں اور راکٹوں سے ہو رہے ہیں ان کا اس آیت سے کوئی جوڑ نہیں: اس زمانہ میں جو زمین کی کشش سے باہر نکلنے اور خلا میں سیارات پر پہونچنے کے تجربات ہو رہے ہیں وہ سب ظاہر ہے کہ آسمان کے حدود سے باہر نہیں، بلکہ سطح آسمان سے بہت نیچے ہو رہے ہیں، اقطار السمٰوات سے باہر نکل جانے کا اس سے کوئی تعلق نہیں، یہ تو اقطار السمٰوات کے قریب بھی نہیں پہونچ سکتے باہر نکلنا تو کجا، اس لئے اس آیت کے مفہوم سے ان خلائی سفروں اور سیارات پر پہونچنے کے واقعات کا کوئی تعلق نہیں، بعض سادہ لوح لوگ اس آیت ہی کو خلائی سفروں کے امکان وجواز کے لئے پیش کرنے لگے، جو معانی قرآن سے بالکل ناواقفیت کی دلیل ہے۔

يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ، حضرت ابن عباسؓ اور دوسرے ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ شُوَاظ بضم شین آگ کے اُس شعلے کو کہا جاتا ہے جس میں دُھواں نہ ہو، اور نُحاس اس دھوئیں کو کہا جاتا ہے جس میں آگ کی روشنی نہ ہو، اس آیت میں بھی جن وانس کو خطاب کر کے ان پر آگ کے شعلے اور دھواں چھوڑنے کا بیان ہے، اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حساب کتاب کے بعد جو مجرمین کو جہنم میں ڈالا جائے گا اس میں یہ دو طرح کے عذاب ہوں گے، کہیں آگ ہی آگ اور شعلہ ہی شعلہ دھوئیں کا نام نہیں، اور کہیں دُھواں ہی دُھواں جس میں آگ کی کوئی روشنی نہیں، اور بعض مفسرین نے اس آیت کو پچھلی آیت کا تکملہ قرار دے کر یہ معنی کئے ہیں کہ اے جن وانس آسمانوں کے حدود سے نکل جانا تمہارے بس کی بات نہیں، اگر تم ایسا ارادہ کر بھی لو تو جس طرف بھاگ کر جاؤ گے آگ کے شعلے اور دھوئیں تمہیں گھیر لیں گے (ابن کثیر)

فَلَا تَنْتَصِرٰنِ، انتصار سے مشتق ہے، جس کے معنی کسی کی مدد کر کے مصیبت سے نکالنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عذاب الٰہی سے بچنے کے لئے تم سب جن وانس میں سے کوئی کسی کی مدد نہ کر سکے گا کہ اس کے ذریعہ عذاب سے چھوٹ جائے۔

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ، یعنی اس دن کسی انسان یا جنّ سے اُس کا گناہ نہ پوچھا جائے گا، اس کا ایک مفہوم تو وہ ہے جو خلاصہ تفسیر میں لیا گیا ہے کہ ان لوگوں سے قیامت میں یہ نہ پوچھا جائے گا کہ تم نے فلاں جرم کیا ہے یا نہیں، وہ تو فرشتوں کے لکھے ہوئے اعمالناموں میں محفوظ اور اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں اس سے پہلے سے موجود ہے، بلکہ سوال یہ ہوگا کہ فلاں جرم تم نے کیوں کیا، یہ تفسیر ابن عباسؓ کی ہے، اور مجاہدؒ نے فرمایا کہ فرشتے جو مجرمین کے عذاب پر مامور ہیں اُن کو مجرمین سے پوچھنے کی ضرورت نہ ہوگی کہ تم نے یہ جرم کیا ہے یا نہیں، بلکہ ہر جرم کی ایک خاص نشانی مجرمین کے چہروں سے ظاہر ہوگی، فرشتے وہ نشانی دیکھ کر ان کو جہنم میں دھکیل دیں گے، اگلی آیت میں یہی مضمون آیا ہے (يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ) ان دونوں تفسیروں کا حاصل یہ ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جبکہ محشر میں حساب کتاب کے بعد مجرمین کے جہنم میں ڈالنے کا فیصلہ ہو چکے گا، تو اب ان سے اُن کے گناہوں کے بارے میں

کوئی گفتگو نہ ہوگی وہ علامت سے پہچان کر جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے۔

اور حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ یہ اُس وقت کا حال ہے جب ایک مرتبہ ان سے اُن کے جرائم کی پرسش ہو چکے گی، اور وہ انکار کر دیں گے، قسمیں اٹھالیں گے، تو ان کے مونہوں اور زبانوں پر مُہر کر دی جائے گی، ہاتھوں پاؤں کی گواہی لی جائے گی، یہ تینوں تفسیریں ابن کثیر نے نقل کی ہیں، تینوں متقارب ہیں کوئی اختلاف نہیں۔

یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمٰهُمْ فَیُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِیْ وَالْاَقْدَامِ، سِیْمَا، کے معنی علامت کے ہیں، حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ اس روز مجرمین جن کو جہنم میں ڈالنے کا فیصلہ ہوگا اُن کی علامت یہ ہوگی کہ چہرے سیاہ اور آنکھیں نیلگوں ہوں گی، رنج و غم سے چہرے فق ہوں گے، فرشتے اسی علامت کے ذریعہ اُن کو پکڑیں گے

نَوَاصِیْ، نَاصِیَۃ کی جمع ہے۔ پیشانی کے بالوں کو کہا جاتا ہے، نَوَاصِیْ اور اَقْدَام سے پکڑنے کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ کسی کو سر کے بال پکڑ کر گھسیٹا جائے گا، کسی کو ٹانگیں پکڑ کر یا کبھی اس طرح کبھی اُس طرح، گھسیٹا جائے گا، اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ پیشانی کے بالوں اور ٹانگوں کو ایک جگہ جکڑ دیا جائے گا (کذا قالہ الضحاک، روح) واللہ اعلم

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴿۴۶﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۷﴾ ذَوَاتَآ

اور جو کوئی ڈرا کھڑے ہونے سے اپنے رب کے آگے اس کیلئے ہیں دو باغ، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے، جن میں

اَفْنَانٍ ﴿۴۸﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۹﴾ فِیْهِمَا عَیْنٰنِ تَجْرِیٰنِ ﴿۵۰﴾ فَبِاَیِّ

بہت سی شاخیں، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے، ان دونوں میں دو چشمے بہتے ہیں، پھر کیا کیا

اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۱﴾ فِیْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ﴿۵۲﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ

نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے، ان دونوں میں ہر میوہ قسم قسم کا ہوگا، پھر کیا کیا نعمتیں

رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۳﴾ مُتَّكِـِٕیْنَ عَلٰى فُرُشٍۭ بَطَآىِٕنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ؕ

اپنے رب کی جھٹلاؤ گے، تکیہ لگائے بیٹھے بچھونوں پر جن کے استر تافتے کے،

وَجَنَا الْجَنَّتَیْنِ دَانٍ ﴿۵۴﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۵﴾ فِیْهِنَّ

اور میوہ ان باغوں کا جھک رہا، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے، اُن میں

قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ۙ لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴿۵۶﴾ فَبِاَیِّ

عورتیں ہیں نیچی نگاہ والیاں نہیں قربت کی ان سے کسی آدمی نے ان سے پہلے اور نہ کسی جن نے، پھر کیا کیا

الَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۷﴾ كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ ﴿۵۸﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ

نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے، وہ کیسی جیسے کہ لعل اور مونگا، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے

رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۹﴾ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴿۶۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ

رب کی جھٹلاؤ گے، اور کیا بدلہ ہے نیکی کا مگر نیکی، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے

رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۱﴾ وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ﴿۶۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۳﴾

رب کی جھٹلاؤ گے، اور ان دو کے سوائے اور دو باغ ہیں، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے،

مُدْهَآمَّتٰنِ ﴿۶۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۵﴾ فِيْهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ﴿۶۶﴾

گہرے سبز جیسے سیاہ، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے، ان میں دو چشمے ہیں اُبلتے ہوئے،

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۷﴾ فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ﴿۶۸﴾ فَبِاَيِّ

پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے، ان میں میوے ہیں اور کھجوریں اور انار، پھر کیا کیا

اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۹﴾ فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ﴿۷۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا

نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے، اُن سب باغوں میں اچھی عورتیں ہیں خوبصورت، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی

تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۱﴾ حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ ﴿۷۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۳﴾

جھٹلاؤ گے، حوریں ہیں رُکی رہنے والیاں خیموں میں، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے،

لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴿۷۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۵﴾

نہیں ہاتھ لگایا اُن کو کسی آدمی نے ان سے پہلے اور نہ کسی جن نے، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے،

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ﴿۷۶﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا

تکیہ لگائے بیٹھے سبز مسندوں پر اور قیمتی بچھونے نفیس پر، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی

تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۷﴾ تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿۷۸﴾

جھٹلاؤ گے، بڑی برکت ہے نام کو تیرے رب کے جو بڑائی والا اور عظمت والا ہے،

خلاصۂ تفسیر

(ان آیتوں میں دو باغوں کا ذکر وَلِمَنْ خَافَ سے شروع ہوا ہے اور دو باغوں کا ذکر وَمِنْ دُوْنِهِمَا

سے پہلے دو باغ خواص مقربین کے ہیں اور پچھلے دو باغ عامہ مؤمنین کے لئے، دلائل اس تعیین و تقسیم کے آگے لکھ دیئے جاویں گے، یہاں صرف تفسیر لکھی جاتی ہے، پچھلی آیات میں مجرمین کی سزاؤں کا ذکر تھا، یہاں سے مؤمنین صالحین کی جزاء کا ذکر شروع ہوتا ہے) اور (اہلِ جنّت کا حال یہ ہے کہ ان میں دو قسم ہیں، خواص اور عوام پس) جو شخص (خواص میں سے ہو اور) اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے (ہر وقت) ڈرتا رہتا ہو (اور ڈر کر شہوات و معاصی سے مجتنب رہتا ہو، اور یہ شان خواص ہی کی ہے، کیونکہ عوام پر تو گاہ گاہ خوف طاری ہو جاتا ہے، اور کبھی ان سے معاصی بھی سرزد ہو جاتے ہیں گو توبہ کرلیں، غرض جو شخص ایسا متقی ہو) اس کے لئے (جنّت میں) دو باغ ہوں گے (یعنی ہر متقی کے لئے دو باغ اور غالباً اس تعدد میں حکمت ان کے تکرّم اور تنعّم کا اظہار ہوگا جس طرح دنیا میں اہلِ تنعّم کے پاس اکثر چیزیں منقولات وغیر منقولات میں سے متعدد ہوتی ہیں) سو اے جنّ و انس (باوجود اس کثرت و عظمتِ نِعَم کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (اور وہ) دونوں باغ کثیر شاخوں والے ہوں گے (اس میں سایہ کی گنجائی اور ثمرات کی کثرت کی طرف اشارہ ہے) سو اے جنّ و انس (باوجود اس کثرت و عظمتِ نِعَم کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (اور) ان دونوں باغوں میں دو چشمے ہوں گے کہ (دور تک) بہتے چلے جاویں گے سو اے جنّ و انس (باوجود اس کثرت و عظمتِ نِعَم کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (اور) ان دو باغوں میں ہر میوہ کی دو قسمیں ہوں گی (کہ اس میں زیادہ تلذّذ ہے، کبھی ایک قسم کا مزہ لے لیا کبھی دوسری قسم کا) سو اے جنّ و انس (باوجود اس کثرت و عظمتِ نِعَم کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (اور) وہ لوگ تکیہ لگائے ایسے فرشوں پر بیٹھے ہوں گے جن کے استر دبیز ریشم کے ہوں گے (اور قاعدہ ہے کہ اوپر کا کپڑا بہ نسبت استر کے زیادہ نفیس ہوتا ہے، پس جب استر استبرق ہوگا تو اوپر کا کیسا کچھ ہوگا) اور ان دونوں باغوں کا پھل بہت نزدیک ہوگا (کہ کھڑے، بیٹھے، لیٹے ہر طرح بلا مشقت ہاتھ آسکتا ہے) سو اے جن و انس (باوجود اس کثرت و عظمت نِعَم کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (اور) ان (باغوں کے مکانات اور محلات) میں نیچی نگاہ والیاں (یعنی حوریں) ہوں گی کہ ان (جنتی) لوگوں سے پہلے ان پر نہ تو کسی آدمی نے تصرف کیا ہوگا اور نہ کسی جنّ نے (یعنی بالکل محفوظ وغیر مستعمل ہوں گی) سو اے جن و انس (باوجود اس کثرت و عظمتِ نِعَم کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (اور رنگت اس قدر صاف و شفاف ہوگی کہ) گویا وہ یاقوت اور مرجان ہیں (اور ممکن ہو کہ تشبیہ سرخی میں بھی ہو اور تعدد مشبہ بہ کا غالباً اہتمام کیلئے ہے) سو اے جنّ و انس (باوجود اس کثرت و عظمتِ نِعَم کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (آگے مضمونِ مذکور کی تقریر و تاکید ہو کہ) بھلا غایت اطاعت کا بدلہ بجز غایت عنایت کے کچھ اور بھی ہو سکتا ہے، (انھوں نے غایت اطاعت کی، اس لئے صلہ میں غایت عنایت کے مورد ہوئے) سو اے جنّ و انس (باوجود اس کثرت و عظمتِ نِعَم کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (یہ تو خواص کے باغوں

کی صفت مذکور ہوئی) اور (آگے عامۂ مؤمنین کے باغوں کا ذکر ہے یعنی) ان (مذکورہ) دونوں باغوں سے کم درجہ میں دو باغ اور ہیں (جو عامۂ مؤمنین کے لئے ہیں اور ہر ایک کو دو دو ملیں گے) سوائے جن وانس (باوجود اس کثرت وعظمتِ نعم کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (اور آگے ان باغوں کی صفت ہے کہ) وہ دونوں باغ گہرے سبز ہوں گے سوائے جنّ وانس (باوجود اس کثرت وعظمتِ نعم کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے، ان دونوں باغوں میں دو چشمے ہوں گے کہ جوش مارتے ہوں گے سوائے جن وانس (باوجود اس کثرت وعظمتِ نعم کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (جوش مارنا بوجہ اس کے کہ چشمہ کے لوازم میں سے ہے اوپر کے چشموں میں بھی یہ صفت مشترک ہے اور وہاں تَجْرِيٰنِ بھی ہے، اور یہاں نہیں پس یہ قرینہ ہے اس کا کہ یہ چشمے صفت جریان میں پہلے دو چشموں سے کم ہیں، اور یہ باغ ان باغوں سے کم ہیں اور) ان دونوں باغوں میں میوے اور کھجوریں اور انار ہوں گے سوائے جن وانس (باوجود اس کثرت وعظمتِ نعم کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (یہاں مطلق فاکہہ اور اور پھر تفصیل میں نخل و رُمّان پر اکتفا فرمانا اور وہاں لفظ کُلّ سے ہر قسم کے فواکہ کی تصریح اور پھر لفظ زَوجان سے ان کے متعدد ہونے کا ذکر جس سے فواکہ کی کثرت معلوم ہوتی ہے، یہ سب قرائن اس کے ہیں کہ جَنَّتَیْن اَوَّلِیین اِن اُخْرَیَیْن سے افضل واعلیٰ ہیں اور) ان (باغوں کے مکانات) میں خوب سیرت خوب صورت عورتیں ہوں گی (یعنی حوریں) سوائے جنّ وانس (باوجود اس کثرت وعظمتِ نعم کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے، وہ عورتیں گوری رنگت والی ہوں گی (اور) خیموں میں محفوظ ہوں گی سوائے جن وانس (باوجود اس کثرت وعظمتِ نعم کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (اور) ان (جنتی) لوگوں سے پہلے اُن پر نہ تو کسی آدمی نے تصرف کیا ہوگا اور نہ کسی جن نے (یعنی غیر مستعمل ہوں گی) سوائے جنّ وانس (باوجود اس کثرت وعظمتِ نعم کے) تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (وہاں یاقوت ومرجان سے تشبیہ دینا جو کہ مفید مبالغہ ہے اور یہاں صرف حِسَانٌ پر اکتفاء فرمانا نیز قرینہ ہے کہ پہلے دو باغ دوسرے دو باغوں سے افضل ہیں، اور یہاں کے سب صفات وہاں صراحۃً یا اشارۃً مذکور ہیں مثلاً خوش سیرت ہونا، قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ سے مفہوم ہوتا ہے، حُور ہونا قرینۂ مقام سے معلوم ہوتا ہے مَقْصُوْرٰات سے زیادہ عصمت وعفت پر لفظ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ دلالت کرتا ہے، کہ جو ایسی ہوں گی وہ ضرور ہی گھر میں رہیں گی اور) وہ لوگ سبز مشجّر اور عجیب خوب صورت کپڑوں (کے فرشوں) پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے، سوائے جنّ وانس (باوجود اس کثرت وعظمتِ نعم کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (اس میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دو باغوں کے فرش بہ نسبت پہلے دو باغوں کے کم درجہ کے ہوں گے، کیونکہ وہاں تصریح ہے ریشمی ہونے کی، پھر دوہرے ہونے کی، اور یہاں نہیں ہے آگے خاتمہ میں حق تعالیٰ کی ثناء وصفت ہے جس میں ان تمام مضامین کی جو سورۂ رحمٰن میں مفصل بیان

ہوئے ہیں تائید و تاکید ہے کہ بڑا بابرکت نام ہے آپ کے رب کا جو عظمت والا اور احسان والا ہے (نام سے مراد صفات ہیں جو کہ ذات کے غیر نہیں، پس حاصل جملہ کا ثنا ہوئی کمالِ ذات و صفات کے ساتھ، اور شاید لفظ اسم بڑھانے سے مقصود مبالغہ ہو کہ مسمّیٰ تو کیسا کامل اور بابرکت ہوگا اس کا تو اسم بھی مبارک اور کامل ہے۔

معارف و مسائل

جس طرح سابقہ آیات میں مجرمین کی سخت سزاؤں کا ذکر تھا ان آیات میں ان کے بالمقابل مؤمنین صالحین کی عمدہ جزاؤں اور نعمتوں کا بیان ہے جن میں اہل جنت کے پہلے دو باغوں کا ذکر اور ان میں جو نعمتیں ہیں ان کا بیان ہے، اس کے بعد دوسرے دو باغوں کا اور ان میں مہیا کی ہوئی نعمتوں کا ذکر ہے۔

پہلے دو باغ جن حضرات کے لئے مخصوص ہیں اُن کو تو متعین کر کے بتلا دیا ہے (وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ) یعنی ان دو باغوں کے مستحق وہ لوگ ہیں جو ہر وقت ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے سامنے قیامت کے روز کی پیشی اور حساب کتاب سے ڈرتے رہتے ہیں، جس کے نتیجہ میں وہ کسی گناہ کے پاس نہیں جاتے، ظاہر ہے کہ ایسے لوگ سابقین اور مقربین خاص ہی ہو سکتے ہیں۔

دوسرے دو باغوں کے مستحق کون ہوں گے اس کی تصریح آیاتِ مذکورہ میں نہیں کی گئی، مگر یہ بتلا دیا گیا ہے کہ یہ دونوں باغ پہلے دو باغوں کی نسبت کم درجہ کے ہوں گے (وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ) یعنی پہلے دو باغوں سے کمتر اور دو باغ ہیں، اس سے بقرینۂ مقام معلوم ہو گیا کہ ان دو باغوں کے مستحق عام مؤمنین ہوں گے جو مقربین خاص سے درجہ میں کم ہیں۔

پہلے اور دوسرے دو باغوں کی تفسیر میں حضرات مفسرین نے اور بھی توجیہات بیان فرمائی ہیں، یہاں جو تفسیر اختیار کی گئی ہے کہ پہلے دو باغ سابقین اوّلین اور مقربین خاص کے لئے ہیں، اور دوسرے دو باغ عامۂ مؤمنین کے لئے، اور یہ کہ یہ دوسرے دو باغ پہلے دو باغوں سے درجہ میں کم ہیں، روایاتِ حدیث سے یہی تفسیر راجح معلوم ہوتی ہے جیسا کہ بیان القرآن میں بحوالۂ دُرِّ منثور یہ حدیث مرفوع نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت لِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ اور مِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ کی تفسیر میں فرمایا جَنَّتَانِ مِنْ ذَهَبٍ لِلْمُقَرَّبِيْنَ وَجَنَّتَانِ مِنْ وَرِقٍ لِاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ یعنی دو باغ سونے کے بنے ہوئے ہیں مقربین کے لئے اور دو باغ چاندی کے اصحاب الیمین یعنی عام مؤمنین صالحین کے لئے، نیز درِّ منثور میں حضرت براء بن عازبؓ سے موقوفاً یہ روایت کیا ہے اَلْعَيْنَانِ الَّتِيْ تَجْرِيَانِ خَيْرٌ مِّنَ النَّضَّاخَتَيْنِ، یعنی پہلے دو باغوں کے دو چشمے جن کے بارے میں تَجْرِيٰنِ فرمایا ہے وہ بہتر ہیں دوسرے دو باغوں کے چشموں سے جن کے متعلق نَضَّاخَتٰنِ فرمایا ہے، کیونکہ نَضَّاخَتٰنِ کے معنی ہیں اُبلنے والے دو چشمے، تو یہ صفت ہر چشمہ میں ہوتی ہے لیکن جن کو تَجْرِيٰنِ کے عنوان سے بیان کیا ہے، ان میں اُبلنے کے علاوہ دور تک سطح زمین

پر جاری رہنے کی صفت مزید ہے۔

یہ اجمالی بیان تھا ان چار جنتوں کا جو اہلِ جنت کو ملیں گے، اب الفاظ آیات کے ساتھ ان کے معانی کو دیکھو

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ، مقامِ رب سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک قیامت کے روز حق تعالیٰ کے سامنے حساب کے لئے پیشی ہے، اور اس سے خوف کے معنی یہ ہیں کہ جلوت و خلوت میں اور ظاہر و باطن کے تمام احوال میں اس کو یہ مراقبہ دائمی رہتا ہو کہ مجھے ایک روز حق تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا اور اعمال کا حساب دینا ہے اور ظاہر ہے جس کو ایسا مراقبہ ہمیشہ رہتا ہو وہ گناہ کے پاس نہیں جائے گا۔

اور قرطبی وغیرہ بعض حضرات مفسرین نے مقامِ رب کی یہ تفسیر بھی کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ہر قول و فعل اور خفیہ و علانیہ عمل پر نگراں اور قائم ہے، ہماری ہر حرکت اس کے سامنے ہے، حاصل اس کا بھی وہی ہوگا کہ حق تعالیٰ کا یہ مراقبہ اس کو گناہوں سے بچادے گا۔

ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ، یہ پہلے دو باغوں کی صفت ہے کہ بہت شاخوں والے ہوں گے، جس کا یہ اثر لازمی ہے کہ ان کا سایہ بھی گھنا ہوگا اور پھل بھی زیادہ ہوگا، دوسرے دو باغ جن کا ذکر آگے آتا ہے اُن میں یہ صفت مذکور نہیں، جس سے اس معاملہ میں ان کی کمی کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔

فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ، پہلے دو باغوں کی صفت میں مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ کے الفاظ سے تمام انواع فواکہ کا ہونا بیان فرمایا ہے، اس کے بالمقابل دوسرے باغوں میں مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ کے بجائے صرف فَاكِهَةٌ کے الفاظ ہیں، اور زَوْجَانِ کے معنی یہ ہیں کہ ہر میوے کی دو دو قسمیں ہوں گی، یہ دو قسمیں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خشک و تر کی ہوں، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک تو عام معروف و مشہور...... اور مزے کی ہو اور دوسری غیر معمولی انداز کی (مظہری)

لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ، لفظ طَمْث کئی معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے، حیض کے خون کو طَمْث کہتے ہیں، اور حائضہ عورت کو طَامِث کہا جاتا ہے، اور کنواری لڑکی سے مباشرت کو بھی طَمْث کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس جگہ یہی معنی مراد ہیں، اور اس میں جو اس کی نفی کی گئی ہے کہ جن اہلِ جنت کے لئے یہ حوریں مقرر ہیں، ان سے پہلے ان کو کسی انسان یا جن نے مَس نہیں کیا ہوگا، اس کا مفہوم وہ بھی ہوسکتا ہے جو خلاصۂ تفسیر میں بیان ہوا ہے کہ جو حوریں انسانوں کے لئے مقرر ہیں ان کو کسی انسان نے اور جو مؤمنین جنات کے لئے مقرر ہیں اُن کو کسی جن نے ان سے پہلے مَس نہیں کیا ہوگا، اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ جیسے دنیا میں انسانی عورتوں پر کبھی جنات بھی مسلط ہو جاتے ہیں وہاں اس کا بھی کوئی امکان نہیں ہوگا۔

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ، مقربینِ خاص کے دو باغوں کی کچھ تفصیل ذکر کرنے کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ احسانِ عمل کا بدلہ احسانِ جزاء ہی ہوسکتا ہے اس کے سوا کوئی احتمال نہیں، ان حضرات نے احسانِ عمل یعنی ہمیشہ نیک عمل کرنے کی پابندی کی تو حق تعالیٰ کی طرف سے ان کو عمدہ جزاء ہی کا بدلہ

دیا جانا چاہیئے تھا جو اُن کو دیا گیا۔

مُدْهَآمَّتٰنِ، گہری سبزی کی وجہ سے جو سیاہی جھلکنے لگتی ہے اس کو ادہام کہا جاتا ہے، مراد یہی ہے کہ ان دونوں باغوں کی سرسبزی ان کے سیاہی مائل ہونے کا سبب ہوگی، یہ صفت اگرچہ پہلے دو باغوں میں ذکر نہیں کی گئی ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُن میں یہ صفت نہ ہو، بلکہ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ جو وہاں کی صفت تبلائی ہے، اس میں مُدْہَامَّتَان کی صفت بھی شامل ہے۔

فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ، خیرات سے مراد سیرت و کردار کی خوبی اور حِسان سے مراد شکل و صورت کی خوبی ہے، اور یہ امر بھی دونوں باغوں کی حوروں میں مشترک ہوگا جس کی طرف اشارہ سابقہ آیات میں موجود ہے۔

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ، قاموس میں ہے کہ رَفْرَف سبز رنگ کا ریشمی کپڑا ہی جس کے فرش اور تکیے اور دوسرا زینت کا سامان بنایا جاتا ہے، اور صحاح میں ہے کہ اس پر نقش و نگار درختوں اور پھولوں کے ہوتے ہیں، جس کو اردو میں مشجّر کہا جاتا ہے، عَبْقَرِی ہر عمدہ خوب صورت کپڑے کو کہا جاتا ہے، حِسَان سے اسی کا وصف خوب صورتی بیان کیا گیا ہے۔

تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِى الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ، سورۂ رحمٰن میں بیشتر حق تعالیٰ کی نعمتوں اور انسان پر احسانات کا ذکر ہے، اس کے خاتمہ پر خلاصہ کے طور پر یہ جملہ ارشاد ہوا کہ اُس ذات پاک کا تو کہنا کیا ہے اس کا نام بھی بڑا بابرکت ہے، اس کے نام ہی سے یہ ساری نعمتیں قائم ہیں، واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم

تَمَّتْ

سُوْرَةُ الرَّحْمٰنِ بِحَمْدِ اللّٰهِ وَعَوْنِهٖ

لِلْحَادِيْ عَشَرَ مِنَ الرَّبِيْعِ الثَّانِيْ،

سنہ ۱۳۹۱ھ يَوْمَ السَّبْتِ

سُوْرَةُ الْوَاقِعَةِ

سُوْرَةُ الْوَاقِعَةِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سِتٌّ وَّتِسْعُوْنَ اٰيَةً وَّثَلٰثُ رُكُوْعَاتٍ

سورۃ واقعہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چھیانوے آیتیں ہیں اور تین رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے ،

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿۱﴾ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ﴿۲﴾ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ﴿۳﴾

جب ہو پڑے ہو پڑنے والی ، نہیں ہے اس کے ہو پڑنے میں کچھ جھوٹ ، پست کرنیوالی ہو بلند کرنیوالی

وقف لازم

اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ﴿۴﴾ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ﴿۵﴾ فَكَانَتْ هَبَآءً

جب لرزے زمین کپکپا کر ، اور ریزہ ریزہ ہوں پہاڑ ٹوٹ پھوٹ کر ، پھر ہو جائیں غبار

مُّنْۢبَثًّا ﴿۶﴾ وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ﴿۷﴾ فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ۬ مَآ اَصْحٰبُ

اُڑتا ہوا ، اور تم ہو جاؤ تین قسم پر ، پھر داہنے والے ، کیا خوب ہیں

الْمَيْمَنَةِ ﴿۸﴾ وَاَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۙ۬ مَآ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ﴿۹﴾ وَالسّٰبِقُوْنَ

داہنے والے ، اور بائیں والے کیا بُرے ہیں بائیں والے ، اور اگاڑی والے

السّٰبِقُوْنَ ﴿۱۰﴾ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۱۱﴾ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۱۲﴾ ثُلَّةٌ مِّنَ

تو اگاڑی والے ، وہ لوگ ہیں مقرّب ، باغوں میں نعمت کے ، انبوہ ہے

الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۴﴾ عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ ﴿۱۵﴾

پہلوں میں سے ، اور تھوڑے ہیں پچھلوں میں سے ، بیٹھے ہیں جڑاؤ تختوں پر ،

مُّتَّكِـِٔيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ ﴿۱۶﴾ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ﴿۱۷﴾

تکیہ لگائے ان پر ایک دوسرے کے سامنے ، لئے پھرتے ہیں ان کے پاس لڑکے سدا رہنے والے ،

بِاَكْوَابٍ وَّاَبَارِيْقَ ۙ وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ﴿۱۸﴾ لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا

آبخورے اور کوزے اور پیالہ نتھری شراب کا ، جس سے نہ سر دُکھے اور نہ

يُنْزِفُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۲۱﴾

بکواس لگے ، اور میوہ جونسا پسند کریں ، اور گوشت اڑتے جانوروں کا جس قسم کو جی چاہے ،

وَحُوْرٌ عِيْنٌ ﴿۲۲﴾ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ﴿۲۳﴾ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۴﴾

اور عورتیں گوری بڑی آنکھوں والیاں ، جیسے موتی کے دانے اپنے غلاف کے اندر ، بدلہ ان کاموں کا جو کرتے تھے ،

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ﴿۲۵﴾ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿۲۶﴾ وَاَصْحٰبُ

نہیں سنیں گے وہاں بکواس اور نہ گناہ کی بات ، مگر ایک بولنا سلام سلام ، اور داہنے

الْيَمِيْنِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ﴿۲۷﴾ فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ﴿۲۸﴾ وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ﴿۲۹﴾

والے کیا کہنے داہنے والوں کے ، رہتے ہیں بیری کے درختوں میں جن میں کانٹا نہیں اور کیلے تہہ پر تہہ ،

وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ﴿۳۰﴾ وَّمَآءٍ مَّسْكُوْبٍ ﴿۳۱﴾ وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ﴿۳۲﴾ لَّا مَقْطُوْعَةٍ

اور سایہ لمبا ، اور پانی بہتا ہوا ، اور میوہ بہت ، نہ اُس میں سے ٹوٹا

وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ ﴿۳۳﴾ وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ﴿۳۴﴾ اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ﴿۳۵﴾

اور نہ روکا ہوا ، اور بچھونے اونچے ، ہم نے اٹھایا ان عورتوں کو ایک اچھے اُٹھان پر

فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ﴿۳۶﴾ عُرُبًا اَتْرَابًا ﴿۳۷﴾ لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿۳۸﴾ ثُلَّةٌ مِّنَ

ع ۳۸ ۱۴

پھر کیا اُن کو کنواریاں ، پیار دلانے والیاں ہم عمر ، واسطے داہنے والوں کے ، انبوہ ہے پہلوں

الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۰﴾ وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۙ مَآ

میں سے ، اور انبوہ ہے پچھلوں میں سے ، اور بائیں والے کیسے

اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ﴿۴۱﴾ فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ ﴿۴۲﴾ وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ﴿۴۳﴾

بائیں والے ، تیز بھاپ میں اور جلتے پانی میں ، اور سایہ میں دھویں کے ،

لَا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيمٍ ﴿۴۴﴾ إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَٰلِكَ مُتْرَفِينَ ﴿۴۵﴾ وَكَانُوا

نہ ٹھنڈا اور نہ عزت کا ، وہ لوگ تھے اس سے پہلے خوش حال ، اور ضد

يُصِرُّونَ عَلَى الْحِنثِ الْعَظِيمِ ﴿۴۶﴾ وَكَانُوا يَقُولُونَ أَئِذَا مِتْنَا

کرتے تھے اس بڑے گناہ پر ، اور کہا کرتے تھے کیا جب ہم مر گئے

وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ ﴿۴۷﴾ أَوَآبَاؤُنَا الْأَوَّلُونَ ﴿۴۸﴾

اور ہو چکے مٹی اور ہڈیاں کیا ہم پھر اٹھائے جائیں گے ، اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی ،

قُلْ إِنَّ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ ﴿۴۹﴾ لَمَجْمُوعُونَ إِلَىٰ مِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ ﴿۵۰﴾

تو کہہ دے کہ اگلے اور پچھلے ، سب اکٹھے ہونیوالے ہیں ، ایک دن مقرر کے وقت پر ،

ثُمَّ إِنَّكُمْ أَيُّهَا الضَّالُّونَ الْمُكَذِّبُونَ ﴿۵۱﴾ لَآكِلُونَ مِن شَجَرٍ مِّن زَقُّومٍ ﴿۵۲﴾

پھر تم جو ہو اے بہکے ہوئے جھٹلانے والو ، البتہ کھاؤ گے ایک درخت سینڈھ کے سے ،

فَمَالِئُونَ مِنْهَا الْبُطُونَ ﴿۵۳﴾ فَشَارِبُونَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيمِ ﴿۵۴﴾

پھر بھرو گے اس سے پیٹ ، پھر پیو گے اس پر ایک جلتا پانی ،

فَشَارِبُونَ شُرْبَ الْهِيمِ ﴿۵۵﴾ هَٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّينِ ﴿۵۶﴾

پھر پیو گے جیسے پئیں اونٹ تونسے ہوئے ، یہ مہمانی ہے اُن کی انصاف کے دن ،

خلاصۂ تفسیر

جب قیامت آوے گی جس کے واقع ہونے میں کوئی خلاف نہیں (بلکہ اس کا واقع ہونا بالکل صحیح اور حق ہے) تو وہ (بعض کو) پست کر دے گی (اور بعض کو) بلند کر دے گی (یعنی کفار کی ذلت کا اور مؤمنین کی رفعت کا اس روز ظہور ہوگا) جبکہ زمین کو سخت زلزلہ آوے گا، اور پہاڑ بالکل ریزہ ریزہ ہو جاویں گے پھر وہ پراگندہ غبار (کی طرح) ہو جاویں گے اور تم (سب آدمی جو اس وقت موجود ہو یا پہلے گذر چکے ہیں یا آئندہ آنے والے ہیں) تین قسم ہو جاؤ گے (جن کی تفصیل آگے آتی ہے، خواص مؤمنین اور عوام مؤمنین اور کفار کہ سورۂ رحمٰن میں بھی یہی تین قسمیں مذکور ہیں اور آئندہ آیات میں خواص کو مقربین اور سابقین کہا ہے اور عوام مؤمنین کو اصحاب الیمین اور کفار کو اصحاب الشمال اور ان آیات اِذَا وَقَعَتِ سے ثُلَّةٌ تک میں بعض واقعات نفخۂ اولیٰ یعنی پہلے صور

کے وقت کے بیان فرمائے ہیں جیسے رُجَّتْ، جیسا شروع سورۃ حج میں آیا ہے اور بُسَّتْ، اور بعض واقعات نفخہ ثانیہ یعنی دوسرے صور کے وقت کے جیسے خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ اور كُنْتُمْ اَزْوَاجًا اور بعض مشترک جیسے اِذَا وَقَعَتْ اور لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا، چونکہ نفخہ اولیٰ سے نفخہ ثانیہ تک کا تمام وقت ایک وقت کے حکم میں ہے اس لئے ہر جزء وقت کو ہر واقعہ کا وقت کہا جا سکتا ہے، آگے ان تینوں قسموں میں تقسیم بیان کرنے کے بعد تینوں کے احکام الگ الگ ذکر کئے ہیں، اول اجمالاً پھر تفصیلاً کہ تین قسمیں جو مذکور ہیں) سو (ان میں ایک قسم یعنی) جو داہنے والے ہیں وہ داہنے والے کیسے اچھے ہیں (مراد اس سے جن کے نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں دیئے جائیں گے، اور گو یہ مفہوم مقربین میں بھی مشترک ہے، لیکن اسی صفت پر اکتفار کرنے سے اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ ان میں اصحاب الیمین سے زائد کوئی اور صفت قرب خاص کی نہیں پائی جاتی، اس طرح مراد اس سے عوام مؤمنین ہو گئے، اور اس میں اجمالاً ان کی حالت کا اچھا ہونا بتلا دیا، آگے فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ الخ سے اس اجمال کی تفصیل کی گئی ہے) اور (دوسری قسم یعنی) جو بائیں والے ہیں وہ بائیں والے کیسے بُرے ہیں (مراد اس سے جن کے نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں دیئے جاویں گے یعنی کفار اور اس میں اجمالاً ان کی حالت کا بُرا ہونا بتلا دیا آگے فِيْ سَمُوْمٍ الخ سے اس اجمال کی تفصیل کی گئی ہے) اور (تیسری قسم یعنی) جو اعلیٰ درجہ کے ہیں وہ تو اعلیٰ درجہ کے ہی ہیں .... (اور وہ (خدا تعالیٰ کے ساتھ) خاص قرب رکھنے والے ہیں، (اس میں تمام اعلیٰ درجہ کے بندے داخل ہیں، انبیاء اور اولیاء، وصدیقین اور کامل متقی اور اس میں اجمالاً اُن کی حالت کا عالی ہونا بتلا دیا، آگے فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ الخ سے اس اجمال کی تفصیل کی جاتی ہے یعنی) یہ (مقرب) لوگ آرام کے باغوں میں ہوں گے (جس کی مزید تفصیل عَلٰى سُرُرٍ سے آتی ہے اور درمیان میں ان مقربین خاص میں بہت سی جماعتوں کا شامل ہونا بتلاتے ہیں کہ ان (مقربین) کا ایک بڑا گروہ تو اگلے لوگوں میں سے ہوگا اور تھوڑے پچھلے لوگوں میں سے ہوں گے (اگلوں سے مراد متقدمین ہیں آدم علیہ السلام سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قبل تک اور پچھلوں سے مراد حضورؐ کے وقت سے لے کر قیامت تک، کذا فی الدر عن جابر مرفوعاً، اور متقدمین میں کثرت سابقین اور متاخرین میں قلت سابقین کی وجہ یہ ہے کہ خواص ہر زمانہ میں کم ہوتے ہیں، اور متقدمین یعنی آدم علیہ السلام سے زمانہ خاتم الانبیاءؐ تک کا زمانہ بہت طویل ہے، بہ نسبت امتِ محمدیہ کے جو قربِ قیامت میں پیدا ہوئی ہے، تو باقتضاءِ عادتِ زمانہ اس طویل زمانہ کے خواص بہ نسبت امتِ محمدیہ کے مختصر زمانے کے خواص کے زیادہ ہونگے کیونکہ اس طویل زمانہ میں لاکھ دو لاکھ تو انبیاء ہی ہیں، اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کوئی اور نبی نہیں، اس لئے خواص مقربین کا بڑا گروہ متقدمین کا ہوگا، اور متاخرین یعنی امتِ محمدیہ میں اس سے کم ہوگا، آگے مقربینِ خواص کے لئے جو نعمتیں مقرر ہیں ان کی تفصیل یہ ہے کہ) وہ (مقرب) لوگ سونے کے تاروں سے بُنے ہوئے تختوں پر تکیہ لگائے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے، (در منثور میں حضرت ابن عباسؓ سے لفظ موضونہ کی یہی تفسیر نقل کی ہے اور) ان کے پاس ایسے لڑکے ہوں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے، یہ

چیزیں لے کر آمد و رفت کیا کریں گے آبخورے اور آفتابے اور ایسا جامِ شراب جو بہتی ہوئی شراب سے بھرا جاوے گا، (اس کی تحقیق سورۂ صافات میں گذر چکی ہے) نہ اس سے ان کو دردِ سر ہوگا اور نہ اس سے عقل میں فتور آئے گا (یہ بھی سورۂ صافات میں گذر چکا ہے) اور میوے جن کو وہ پسند کریں اور پرندوں کا گوشت جو اُن کو مرغوب ہو اور ان کے لئے گوری گوری بڑی بڑی آنکھوں والی عورتیں ہوں گی (مراد حوریں ہیں جن کی رنگت ایسی صاف شفاف ہوگی) جیسے (حفاظت سے) پوشیدہ رکھا ہوا موتی، یہ ان کے اعمال کے صلہ میں ملے گا (اور) وہاں نہ بک بک سنیں گے اور نہ وہ کوئی اور بیہودہ بات (سنیں گے، یعنی شراب پی کر یا ویسے بھی ایسی چیزیں نہ پائی جاویں گے جن سے عیش مکدر ہوتی ہے) بس (ہر طرف سے) سلام ہی سلام کی آواز آوے گی (کقولہ تعالیٰ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ وقولہ تعالیٰ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ جو کہ دلیل اکرام و اعزاز کی ہے، غرض روحانی و جسمانی ہر طرح کی لذت و مسرت اعلیٰ درجہ کی ہوگی، یہ جزاء سابقین کا بیان کیا گیا) اور (آگے اصحاب الیمین کی جزاء کی تفصیل ہے یعنی) جو داہنے والے ہیں وہ داہنے والے کیسے اچھے ہیں (اس اجمال کا اعادہ تفصیل کے قبل اس لئے کیا گیا کہ اُس اجمال کو فصل ہوگیا تھا آگے ان کے اچھے ہونے کا بیان ہے کہ) وہ ان باغوں میں ہوں گے جہاں بے خار بیریاں ہوں گی اور تہہ بتہ کیلے ہوں گے، اور لمبا لمبا سایہ ہوگا، اور چلتا ہوا پانی ہوگا اور کثرت سے میوے ہوں گے جو نہ ختم ہوں گے (جیسے دنیا کے میوے کہ فصل تمام ہونے سے تمام ہوجاتے ہیں) اور ان کی روک ٹوک ہوگی (جیسے دنیا میں باغ والے اس کی روک تھام کرتے ہیں) اور اونچے اونچے فرش (کیونکہ جن درجوں میں وہ بچھے ہیں وہ درجے بلند) ہوں گے (اور چونکہ مقام خوش عیشی کا ہے اور خوش عیشی بدون عورتوں کے کامل نہیں ہوتی، اس طور پر ان اسباب عیش کے ذکر ہی سے عورتوں کا ہونا معلوم ہوگیا، لہذا آگے بہشتی عورتوں کی طرف اَنْشَاْنٰهُنَّ کی ضمیر راجع کر کے ان کا ذکر فرمایا جاتا ہے کہ) ہم نے (وہاں کی) اُن عورتوں کو (جن میں جنت کی حوریں بھی شامل ہیں اور دنیا کی عورتیں بھی، جیساکہ روح المعانی میں ترمذی کے حوالہ سے یہ حدیث مرفوع نقل کی ہے کہ اس آیت میں جن عورتوں کی تخلیق جدید کا ذکر ہے اُن سے مراد وہ عورتیں ہیں جو دنیا میں بوڑھی یا بدشکل تھیں اُن کے متعلق فرمایا کہ ہم نے ان عورتوں کو) خاص طور پر بنایا ہے (جن کی تفصیل آگے ہے) یعنی ہم نے ان کو ایسا بنایا کہ وہ کنواریاں ہیں (یعنی بعد مقاربت کے پھر کنواری ہوجاویں گی، جیساکہ درمنثور میں حضرت ابو سعید خدری کی مرفوع حدیث سے ثابت ہے اور) محبوبہ ہیں (یعنی حرکات و شمائل و ناز و انداز و حسن و جمال سب چیزیں اُن کی دلکش ہیں اور اہل جنت کی) ہم عمر ہیں (اس کی تحقیق سورۂ صٓ میں گذر چکی ہے) یہ سب چیزیں داہنے والوں کے لئے ہیں (آگے یہ بتلاتے ہیں کہ داہنے والے بھی مختلف قسم کے لوگ ہوں گے یعنی) ان (اصحاب الیمین) کا ایک بڑا گروہ اگلے لوگوں میں سے ہوگا اور ایک بڑا گروہ پچھلے لوگوں میں سے ہوگا (بلکہ متاخرین میں اصحاب الیمین بہ نسبت متقدمین کے تعداد میں زیادہ ہوں گے، چنانچہ احادیث میں تصریح ہے کہ اس امت کے مؤمنین کا مجموعہ پچھلی تمام اُمتوں کے مؤمنین کے

مجموعہ سے زیادہ ہوگا، اور اس کی یہی صورت ہوسکتی ہے کہ اصحاب الیمین اس امت میں زیادہ ہوں کیونکہ خواص مقربین کی اکثریت تو متقدمین میں خود آیت بالا سے ثابت ہوچکی ہے، اور جب اصحاب الیمین مرتبہ میں مقربین سے کم ہیں تو ان کی جزا بھی کم ہوگی سو اس کی توجیہ یہ ہے کہ مقربین کی جزا میں وہ سامانِ عیش زیادہ مذکور ہے جو اہلِ شہر کو زیادہ مرغوب ہے، اور اصحاب الیمین کی جزا میں وہ سامانِ عیش زیادہ مذکور ہے جو دیہات و قصبات والوں کو مرغوب ہے، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان دونوں میں ایسا تفاوت ہوگا جیسا اہل شہر و اہل قریہ میں ہوا کرتا ہے، کذا فی الروح) اور (آگے کفار کا اور ان کے عقاب و عذاب کا ذکر ہے، یعنی) جو بائیں والے ہیں وہ بائیں والے کیسے بُرے ہیں (اور اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ) وہ لوگ آگ میں ہوں گے اور کھولتے ہوئے پانی میں اور سیاہ دھوئیں کے سایہ میں جو نہ ٹھنڈا ہوگا اور نہ فرحت بخش ہوگا (یعنی سایہ سے ایک جسمانی نفع ہوتا ہے راحت بُرودت اور ایک رُوحانی نفع ہوتا ہے لذت و فرحت، وہاں دونوں نہ ہوں گے یہ وہی دھواں ہے جس کا ذکر اوپر سورۂ رحمٰن میں بلفظ نحاس آیا ہے، آگے اس عذاب کی وجہ ارشاد ہے کہ) وہ لوگ اس کے قبل (یعنی دنیا میں) بڑی خوش حالی میں رہتے تھے اور (اس خوش حالی کے غرہ میں) بڑے بھاری گناہ (یعنی شرک و کفر) پر اصرار کیا کرتے تھے (مطلب یہ کہ ایمان نہیں لائے تھے) اور (آگے ان کے کفر کا بیان ہے جس کو زیادہ دخل ہے طلبِ حق نہ ہونے میں یعنی وہ) یوں کہا کرتے تھے کہ جب ہم مرگئے اور (مٹی اور ہڈیاں (ہو کر) رہ گئے تو کیا (اس کے بعد) ہم دوبارہ زندہ کئے جاویں گے اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی (زندہ ہوں گے، چونکہ منکرینِ قیامت میں بعض کفار پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی تھے اس لئے اس کے متعلق ارشاد ہے کہ) آپ کہہ دیجئے کہ سب اگلے اور پچھلے جمع کئے جاویں گے ایک معین تاریخ کے وقت پر پھر (جمع ہونے کے بعد) تم کو اے گمراہو جھٹلانے والو! درخت زقوم سے کھانا ہوگا پھر اس سے پیٹ بھرنا ہوگا، پھر اس پر کھولتا ہوا پانی پینا ہوگا پھر پینا بھی پیاسے اونٹوں کا سا (غرض) ان لوگوں کی قیامت کے روز یہ مہمانی ہوگی۔

معارف و مسائل

سورۂ واقعہ کی خصوصی فضیلت مرضِ وفات میں عبداللہ بن مسعودؓ کی سبق آموز ہدایات

ابن کثیر نے بحوالہ ابن عساکر ابوظبیہ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مرض وفات میں حضرت عثمان غنیؓ عیادت کے لئے تشریف لے گئے، حضرت عثمانؓ نے پوچھا مَا تَشْتَكِيْ (تمہیں کیا تکلیف ہے) تو فرمایا، ذُنُوْبِيْ (یعنی اپنے گناہوں کی تکلیف ہے) پھر پوچھا مَا تَشْتَهِيْ (یعنی آپ کیا چاہتے ہیں) تو فرمایا، رَحْمَةَ رَبِّيْ (یعنی اپنے رب کی رحمت چاہتا ہوں، پھر حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ میں آپ کے لئے کسی طبیب (معالج) کو بلاتا ہوں تو فرمایا اَلطَّبِيْبُ اَمْرَضَنِيْ (یعنی مجھے طبیب ہی نے بیمار کیا ہے) پھر حضرت عثمانؓ

نے فرمایا کہ میں آپ کے لئے بیت المال سے کوئی عطیہ بھیجدوں تو فرمایا لَا حَاجَةَ لِي فِيهَا، (مجھے اس کی کوئی حاجت نہیں) حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ عطیہ لے لیجئے وہ آپ کے بعد آپ کی لڑکیوں کے کام آئے گا تو فرمایا کہ کیا آپ کو میری لڑکیوں کے بارے میں یہ فکر ہے کہ وہ فقر و فاقہ میں مبتلا ہو جائیں گی، مگر مجھے یہ فکر اس لئے نہیں کہ میں نے اپنی لڑکیوں کو تاکید کر رکھی ہے کہ ہر رات سورۃ واقعہ پڑھا کریں، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے:

مَنْ قَرَأَ سُورَةَ الْوَاقِعَةِ كُلَّ لَيْلَةٍ لَمْ تُصِبْهُ فَاقَةٌ أَبَدًا (ابن کثیر)	جو شخص ہر رات میں سورۃ واقعہ پڑھا کرے وہ کبھی فاقہ میں مبتلا نہیں ہوگا۔

ابن کثیر نے یہ روایت بسند ابن عساکر نقل کرنے کے بعد اس کی تائید دوسری سندوں اور دوسری کتابوں سے بھی پیش کی ہے۔

إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ، ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ واقعہ قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے، کیونکہ اس کے وقوع میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں،

لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ، کاذبہ مصدر ہے جیسے عَافِيَةٌ اور عَاقِبَةٌ اور معنی یہ ہیں کہ اس کے وقوع میں کوئی کذب نہیں ہو سکتا، بعض حضرات نے کاذبہ کو بمعنی تکذیب قرار دیا ہے، معنی ظاہر ہیں کہ اس کی تکذیب نہیں ہو سکتی۔

خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ، یعنی واقعہ قیامت بہت سی بلند رتبہ قوموں اور افراد کو پست و ذلیل کر دے گا اور بہت سی پست و حقیر قوموں اور افراد کو سربلند کر دے گا، حضرت ابن عباسؓ سے اس جملہ کی یہی تفسیر منقول ہے، اور مقصد اس کا ہولناک ہونا اور اس میں عجیب قسم کے انقلابات پیش آنے کا بیان ہے، جیسا کہ سلطنتوں اور حکومتوں کے انقلاب کے وقت مشاہدہ ہوا کرتا ہے، کہ اوپر والے نیچے اور نیچے والے اوپر ہو جاتے ہیں، فقیر مالدار ہو جاتے ہیں مالدار فقیر ہو جاتے ہیں (روح)

میدانِ حشر میں حاضرین کی تین قسمیں

وَكُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلٰثَةً، ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ قیامت کے روز تمام لوگ تین گروہوں میں تقسیم ہو جاویں گے، ایک قوم عرش کے داہنی جانب ہوگی، یہ وہ ہوں گے جو آدم علیہ السلام کی داہنی جانب سے پیدا ہوئے، اور ان کے اعمالنامے ان کے داہنے ہاتھوں میں دیئے جائیں گے، اور ان کو عرش کی داہنی جانب میں جمع کر دیا جائے گا، یہ سب لوگ جنتی ہیں۔

دوسری قوم عرش کے بائیں جانب میں جمع ہوگی، جو آدم علیہ السلام کے بائیں جانب سے پیدا ہوئی اور جن کے اعمالنامے ان کے بائیں ہاتھوں میں دیئے گئے، ان سب کو بائیں جانب میں جمع کر دیا جائے گا، اور یہ سب لوگ جہنمی ہیں، (نعوذ باللہ من صنیعہم)

اور تیسری قسم طائفہ سابقین کا ہوگا جو رب عرش کے سامنے خصوصی امتیاز اور قرب کے مقام میں

ہوگا، جن میں انبیاء و رسل، صدیقین، شہداء اور اولیاء اللہ شامل ہوں گے، ان کی تعداد بہ نسبت اصحاب الیمین کے کم ہوگی۔

آخر سورۃ میں ان تینوں کا ذکر پھر اس سلسلے میں آئے گا کہ انسانوں کی موت کے وقت سے ہی آثار اس کے محسوس ہوجائیں گے کہ یہ ان تینوں گروہوں میں سے کس گروہ میں شامل ہونے والا ہے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ، امام احمدؒ نے حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے سوال کیا کہ تم جانتے ہو کہ قیامت کے روز ظل اللہ کی طرف سبقت کرنے والے کون لوگ ہوں گے، صحابہ کرام نے عرض کیا اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ، آپ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں کہ جب اُن کو حق کی طرف دعوت دی جائے تو اس کو قبول کریں اور جب اُن سے حق مانگا جائے تو ادا کردیں، اور لوگوں کے معاملات میں وہ فیصلہ کریں جو اپنے حق میں کرتے ہیں۔

مجاہدؒ نے فرمایا کہ سابقین سے مراد انبیاء ہیں، ابن سیرینؒ نے فرمایا کہ جن لوگوں نے دونوں قبلوں یعنی بیت المقدس اور بیت اللہ کی طرف نماز پڑھی ہے وہ سابقین ہیں، اور حضرت حسنؒ و قتادہؒ نے فرمایا کہ ہر اُمت میں سابقین ہوں گے، بعض مفسرین نے فرمایا کہ مسجد کی طرف سب سے پہلے جانے والے سابقین ہوں گے۔

ابن کثیرؒ نے ان تمام اقوال کو نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ سب اقوال اپنی اپنی جگہ صحیح و درست ہیں، ان میں کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ سابقین وہی لوگ ہوں گے جنھوں نے دنیا میں نیک کاموں کی طرف مسابقت کی ہوگی تو جو آدمی اس دنیا میں اعمالِ صالحہ کے اندر دوسروں سے آگے بڑھا رہا وہ آخرت میں بھی سابقین میں سے ہوگا، کیونکہ آخرت کی جزاء عمل کے مناسب دی جائے گی۔

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ، لفظ ثُلّہ بضم ثاء جماعت کو کہتے ہیں، اور زمخشری نے کہا کہ بڑی جماعت کو ثُلّہ کہا جاتا ہے۔ (روح)

اوّلین و آخرین سے کیا مراد ہے یہاں اوّلین و آخرین کی تقسیم کا دو جگہ ذکر آیا ہے، اوّل سابقین مقربین کے سلسلہ میں، دوسرا اصحاب الیمین یعنی عامۂ مؤمنین کے سلسلے میں، پہلی جگہ یعنی سابقین میں تو یہ فرق کیا گیا ہے کہ یہ سابقین مقربین اوّلین میں سے ثُلّہ یعنی بڑی جماعت ہوگی، اور آخرین میں سے کم ہوں گے، جیسا کہ آیت مذکورہ میں ہے، اور دوسری جگہ اصحاب الیمین کے بیان میں اوّلین و آخرین دونوں میں لفظ ثُلّہ وارد ہوا ہے، جس کے معنی یہ ہوتے کہ اصحاب یمین اوّلین میں سے بڑی جماعت ہوگی، اسی طرح آخرین میں سے بھی بڑی جماعت ہوگی، (ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ)

اب قابلِ غور یہ امر ہے کہ اوّلین سے مراد کون ہیں اور آخرین سے کون، اس میں حضرات مفسرین کے دو قول ہیں، ایک یہ کہ آدم علیہ السلام سے لے کر قرب زمانہ خاتم الانبیاء تک کی تمام مخلوقات اوّلین میں داخل ہیں، اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر قیامت تک آنے والی مخلوق آخرین میں داخل ہے

یہ تفسیر مجاہدؒ اور حسن بصریؒ سے ابن ابی حاتم نے سند کے ساتھ نقل کی ہے، اور ابن جریرؒ نے بھی اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے، بیان القرآن کے خلاصۂ تفسیر میں بھی اسی کو اختیار کیا گیا ہے، جو اوپر بیان ہو چکا ہے، اور اس کی دلیل میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے، یہ حدیث ابن عساکر نے اپنی سند کے ساتھ اس طرح نقل کی ہے کہ جب پہلی آیت جو سابقین مقربین کے سلسلے میں آئی ہے نازل ہوئی ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ، تو حضرت عمر بن خطابؓ نے تعجب کے ساتھ عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ کیا پچھلی اُمتوں میں سابقین زیادہ ہوں گے، اور ہم میں کم ہوں گے؟ اس کے بعد سال بھر تک اگلی آیت نازل نہیں ہوئی، جب ایک سال کے بعد یہ آیت نازل ہوئی ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

اِسْمَعْ يَا عُمَرُ مَا قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ اَلَا وَاِنَّ مِنْ اٰدَمَ اِلَيَّ ثُلَّةٌ وَّاُمَّتِيْ ثُلَّةٌ الحدیث (ابن کثیر)	"اے عمر! سنو! جو اللہ نے نازل فرمایا کہ اوّلین میں سے بھی ثلّہ یعنی بڑی جماعت ہو گی اور آخرین میں سے بھی ثلّہ یعنی بڑی جماعت ہو گی، اور یاد رکھو آدم علیہ السلام سے مجھ تک ایک ثلّہ ہے اور میری امت دوسرا ثلّہ،

اور اس مضمون کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو امام احمدؒ اور ابن ابی حاتمؒ نے حضرت ابوہریرہؓ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جب آیت ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ نازل ہوئی تو صحابۂ کرام پر شاق ہوا کہ ہم بہ نسبت اُمم سابقہ کے کم رہیں گے، اس وقت دوسری آیت نازل ہوئی، ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ، اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے امید ہے کہ تم یعنی امتِ محمدیہ جنت میں ساری مخلوق کے مقابلہ میں چوتھائی، تہائی، بلکہ نصف اہلِ جنت ہوں گے، اور باقی نصف میں بھی کچھ تمہارا حصہ ہوگا، (ابن کثیر) جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مجموعی طور پر اہلِ جنت میں اکثریت اُمتِ محمدیہ کی ہو جائے گی، مگر ان دونوں حدیثوں سے استدلال میں ایک اشکال یہ ہے کہ قلیلٌ من الآخرین تو سابقین مقربین کے متعلق آیا ہے اور دوسری آیت میں جو ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ آیا ہے وہ سابقین مقربین کے متعلق نہیں بلکہ اصحاب الیمین کے متعلق ہے۔

اس کا جواب روح المعانی میں یہ دیا ہے کہ صحابۂ کرام اور حضرت عمرؓ کو جو پہلی آیت سے رنج و غم ہوا، اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ انھوں نے یہ خیال کیا ہوگا کہ جو نسبت سابقین میں ہے، وہی شاید اصحاب الیمین اور عام اہلِ جنت میں ہوگی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کل اہلِ جنت میں ہماری تعداد بہت کم رہے گی، جب اصحاب الیمین کی تشریح میں اوّلین و آخرین دونوں میں لفظ ثُلَّةٌ نازل ہوا تو اس شبہ کا ازالہ ہو گیا کہ مجموعی اعتبار سے اہلِ جنت میں اُمتِ محمدیہ کی اکثریت رہیگی، اگرچہ سابقین اوّلین میں ان کی تعداد مجموعہ اُمم سابقہ کے مقابلہ میں کم رہی خصوصاً اس وجہ سے کہ مجموعہ اُمم سابقہ میں ایک بھاری تعداد انبیاء علیہم السلام کی ہے، اُن کے مقابلہ میں امتِ محمدیہ

کے لوگ کم رہیں تو کوئی غم کی چیز نہیں۔

لیکن ابن کثیرؒ، ابوحیان، قرطبی، روح المعانی، مظہری وغیرہ نے سب تفسیروں میں دوسری تفسیر کو ترجیح دی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ اوّلین و آخرین دونوں طبقے اسی امت کے مراد ہیں، اوّلین اس امت کے قرونِ اُولیٰ یعنی صحابہ و تابعین وغیرہ ہیں، جن کو حدیث میں خیر القرون فرمایا ہے اور آخرین قرونِ اُولیٰ کے بعد والے حضرات ہیں۔

ابن کثیرؒ نے حضرت جابرؓ کی مرفوع حدیث جو پہلی تفسیر کی تائید میں اوپر لکھی گئی ہے، اس کی سند کے متعلق کہا ہے وَلٰکِنْ فِیْ اِسْنَادِہٖ نَظَرٌ، دوسری تفسیر کے لئے استدلال میں، وہ آیاتِ قرآنی پیش کی ہیں جن میں امتِ محمدیہؐ کا خیرالامم ہونا مذکور ہے، جیسے کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ وغیرہ اور فرمایا کہ یہ بات بہت مستبعد ہے کہ سابقین مقربین کی تعداد خیرالامم میں دوسری اُمتوں کی نسبت سے کم ہو، اس لئے راجح یہ ہے کہ ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ سے مراد اسی اُمت کے قرونِ اُولیٰ ہیں، اور قَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ، سے مراد بعد کے لوگ ہیں کہ ان میں سابقین مقربین کی تعداد کم ہوگی۔

اس قول کی تائید میں ابن کثیرؒ نے حضرت حسن بصریؒ کا قول بروایت ابن ابی حاتم یہ پیش کیا ہے کہ حضرت حسنؒ نے یہ آیت اَلسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ تلاوت کر کے فرمایا کہ سابقین تو ہم سے پہلے گذر چکے، لیکن یا اللہ ہمیں اصحاب الیمین میں داخل فرما دیجئے، اور حضرت حسنؒ سے دوسری روایت میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ کی تفسیر میں فرمایا ثُلَّۃٌ مِّمَّنْ مَّضٰی مِنْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ، یعنی اوّلین سے مراد اسی امت کے سابقین ہیں۔

اسی طرح محمد بن سیرینؒ نے فرمایا کہ ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ وَقَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ کے متعلق علماء یہ کہتے اور توقع کرتے تھے کہ یہ اوّلین و آخرین سب اسی اُمت میں سے ہوں (ابن کثیرؒ)

اور رُوح المعانی میں اس دوسری تفسیر کی تائید میں ایک حدیث مرفوع بسند حسن حضرت ابوبکرہؓ کی روایت سے یہ نقل کی ہے:۔

اَخْرَجَ مُسَدَّدٌ فِیْ مُسْنَدِہٖ وَابْنُ الْمُنْذِرِ وَالطَّبْرَانِیُّ وَابْنُ مَرْدُوَیہِ بِسَنَدٍ حَسَنٍ عَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ قَوْلِہٖ سُبْحَانَہٗ ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ وَثُلَّۃٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ قَالَ ھُمَا جَمِیْعًا مِّنْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ

"مسدد نے اپنی مسند میں اور ابن المنذر، طبرانی اور ابن مردویہ نے سند حسن کے ساتھ حضرت ابوبکرہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ وَثُلَّۃٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ کی تفسیر میں فرمایا کہ یہ دونوں جماعتیں اسی امتِ محمدیہ میں سے ہوں گی"۔

اور حضرت ابن عباسؓ سے بھی سند ضعیف کے ساتھ حدیث مرفوع بہت سے حضرات محدثین نے

نقل کی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں ھُمَا جَمِیْعًا مِّنْ اُمَّتِیْ، یعنی یہ دونوں اوّلین و آخرین میری ہی امت میں سے ہوں گے۔

اس تفسیر کے مطابق شروع آیت میں کُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَۃً کا مخاطب اُمتِ محمدیہ ہی ہوگی، اور یہ تینوں قسمیں امتِ محمدیہ ہی کی ہوں گی (روح المعانی)

تفسیر مظہری میں پہلی تفسیر کو اس لئے بہت بعید قرار دیا ہے کہ آیات قرآن کی واضح دلالت اس پر ہے کہ اُمتِ محمدیہ تمام اُمم سابقہ سے افضل ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ کسی اُمّت کی فضیلت اس کے اندر اعلیٰ طبقہ کی زیادہ تعداد ہی سے ہوتی ہے، اس لئے یہ بات بعید ہے کہ افضل الامم کے اندر سابقین مقربین کی تعداد کم ہو، آیات قرآن کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ اور لِتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا سے امتِ محمدیہ کی افضلیت سب اُمتوں پر ثابت ہے، اور ترمذی، ابن ماجہ و دارمی نے حضرت بہز بن حکیمؓ سے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

اَنْتُمْ تُتِمُّوْنَ سَبْعِیْنَ اُمَّۃً اَنْتُمْ اٰخِرُھَا وَاَکْرَمُھَا عَلَی اللّٰہِ تَعَالٰی	"تم ستر سابقہ امتوں کا تتمہ ہوگے جن میں تم سب آخر میں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ اکرم و افضل ہوگے"

اور امام بخاریؒ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم اس پر راضی ہو کہ اہلِ جنّت کے چوتھائی تم لوگ ہو جاؤ گے، ہم نے عرض کیا کہ بے شک ہم اس پر راضی ہیں تو آپؐ نے فرمایا:

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ اِنِّیْ لَاَرْجُوْ اَنْ تَکُوْنُوْا نِصْفَ اَھْلِ الْجَنَّۃِ (از مظہری)	"قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے مجھے یہ امید ہے کہ تم (یعنی امتِ محمدیہ) اہل جنّت کے نصف ہوگے"

اور ترمذی، حاکم و بیہقی نے حضرت بریدہؓ سے روایت کیا ہے، اور ترمذی نے اس کی سند کو حسن اور حاکم نے صحیح کہا ہے، الفاظ حدیث کے یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اَھْلُ الْجَنَّۃِ مِائَۃٌ وَّعِشْرُوْنَ صَفًّا ثَمَانُوْنَ مِنْھَا مِنْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ وَاَرْبَعُوْنَ مِنْ سَائِرِ الْاُمَمِ (مظہری)	"اہل جنّت کل ایک سو بیس صفوں میں ہونگے جن میں سے اسّی صفیں اس اُمّت کی ہوں گی باقی چالیس صفوں میں ساری امتیں شریک ہوں گی"

مذکور الصدر روایات میں اس اُمّت کے اہلِ جنّت کی نسبت دوسری امتوں کے اہلِ جنّت سے

کہیں چوتھائی کہیں نصف اور اس آخری روایت میں دو تہائی مذکور ہے، اس میں کوئی تعارض اس لئے نہیں کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اندازہ بیان کیا گیا ہے اس اندازہ میں مختلف اوقات میں زیادتی ہوتی رہی واللہ اعلم

عَلٰی سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ، موضونۃ کے متعلق حضرت ابن عباسؓ سے ابن جریر، ابن ابی حاتم اور بیہقی وغیرہ نے یہ نقل کیا ہے کہ وہ کپڑا جس پر سونے کے تاروں سے کام بنایا گیا ہو۔

وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ سے مراد یہ ہے کہ یہ لڑکے ہمیشہ اسی حالت میں لڑکے ہی رہیں گے، ان میں کوئی تغیر عمر وغیرہ کا نہ ہوگا، اُن جنت کے غلمان کے متعلق راجح تحقیق یہ ہے کہ حوروں کی طرح یہ بھی جنت ہی میں پیدا ہوئے ہوں گے، اور یہ سب اہل جنت کے خادم ہوں گے، روایاتِ حدیث سے ثابت ہے کہ ایک ایک جنتی کے پاس ہزاروں خادم ہوں گے (مظہری)

بِاَكْوَابٍ وَّ اَبَارِيْقَ وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ، اکواب، کوب کی جمع ہے، پانی وغیرہ پینے کے ایسے برتن کو کہتے ہیں، جیسے ہمارے عرف میں گلاس ہوتے ہیں، اور اباریق ابریق کی جمع ہے، ٹونٹی دار لوٹے کو کہتے ہیں، کاس خاص شراب کے پیالے کو کہا جاتا ہے، مَعِیْن سے مراد یہ ہے کہ یہ شراب ایک چشمۂ جاریہ سے لائی گئی ہوگی۔

لَا يُصَدَّعُوْنَ، صُدَاع سے مشتق ہے جس کے معنی دردِ سر کے ہیں، دنیا میں شراب زیادہ پینے سے سر میں درد اور چکر جیسے ہوتے ہیں، جنت کی یہ شراب اس سے پاک ہوگی۔

لَا يُنْزِفُوْنَ، نزف کے اصلی معنی کنویں کا تمام پانی سینچ لینے کے ہیں، یہاں مراد عقل سے خالی ہو جانا ہے۔

وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ، یعنی پرندوں کا گوشت جیسی ان کی خواہش ہو، حدیث میں ہے کہ اہل جنت جس وقت کسی پرندے کے گوشت کی طرف رغبت کریں گے تو اس کا گوشت جس طرح کھانے کی رغبت دل میں آوے گی کہ کباب ہو یا دوسری طرح کا پکا ہوا، اسی طرح کا فوراً تیار ہو کر اس کے سامنے آجائے گا (مظہری)

وَاَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ مَآ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ، اصحاب یمین، دراصل مومنین متقین اور اولیاء اللہ میں گناہگار مسلمان بھی اُن کے ساتھ مل جائیں گے، بعض تو محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے بعض کسی نبی ولی کی شفاعت سے مغفرت اور معافی ہو جانے کے بعد اور بعض کو عذاب ہوگا، مگر اپنے گناہ کا عذاب بھگتنے کے بعد یہ بھی گناہ سے پاک صاف ہو کر اصحاب الیمین کے گروہ میں شامل ہو جائیں گے، کیونکہ گناہگار مومن کے لئے جہنم کی آگ درحقیقت عذاب نہیں بلکہ کھوٹ سے پاک صاف کرنے کی ایک تدبیر ہے۔ (مظہری)

فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ وَّمَآءٍ مَّسْکُوْبٍ، جنت کی نعمتیں بیشمار اور بے مثال و بے قیاس ہیں، ان میں سے جو نعمتیں قرآن کریم ذکر کرتا ہے وہ مخاطبین کے اندازِ فکر اور اُن کی محبوب و پسندیدہ چیزوں کا ذکر کرتا ہے، عرب کے لوگ جن تفریحات اور جن پھلوں کے خوگر تھے، یہاں ان میں سے چند کا ذکر کیا گیا ہے، فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ، سدر بیری کے درخت کو کہتے ہیں، مخضود وہ بیری جس کے کانٹے قطع کر دیئے گئے ہوں، اور پھل کے بوجھ سے شاخ جھکی ہوئی ہو اور یہ جنت کے بیر دنیا کے بیروں کی طرح نہیں ہوں گے، بلکہ یہ بیر مٹکوں کے برابر بڑے اور ذائقہ میں بھی دنیا کے بیر سے اس کی کوئی نسبت نہیں، (کذا فی الحدیث) طَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ، طلح، کیلے کا درخت ... منضود جس کے پھل تہہ بر تہہ ہوں، جیسے کیلے کے خوشوں میں ہوتے ہیں، ظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ، دراز سایہ، صحیحین کی حدیث میں ہے کہ جنت کے بعض درختوں کا سایہ اتنا دراز ہوگا کہ گھوڑے سوار آدمی اس کو سو سال میں بھی قطع نہ کر سکے گا، وَمَآءٍ مَّسْکُوْبٍ جاری پانی جو سطح زمین پر بہتا ہو۔

وَّفَاکِھَۃٍ کَثِیْرَۃٍ، کثیرۃ کے معنی میں یہ بھی داخل ہیں کہ پھلوں کی تعداد بہت ہوگی اور یہ بھی کہ ان کے اقسام و اجناس بے شمار ہوں گے، لَّا مَقْطُوْعَۃٍ وَّلَا مَمْنُوْعَۃٍ، مقطوعہ سے مراد جو فصل ختم ہونے پر ختم ہو جاویں جیسے دنیا کے عام پھلوں کا یہی حال ہے کوئی گرمی میں ہوتا ہے، موسم ختم ہونے پر ختم ہو جاتا ہے، کوئی سردی یا برسات میں ہوتا ہے، اور موسم کے ختم پر اس کا نام و نشان نہیں رہتا، جنت کا ہر پھل دائمی ہر وقت ہر موسم میں موجود رہے گا، ممنوعہ سے مراد بھی یہ ہے کہ دنیا میں جس طرح درختوں پر لگے ہوئے پھلوں کے نگراں اُن کو توڑنے سے منع کرتے ہیں جنت کے پھل اس سے بھی آزاد ہوں گے، اُن کو توڑنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔

وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَۃٍ، فُرُش، فراش کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں بستر یا فرش، فرش کی بلندی اول تو اس لئے ہے کہ یہ مقام خود ہی بلند ہے، دوسرے خود یہ فرش زمین پر نہیں بلکہ تختوں اور چارپائیوں کے اوپر ہوں گے، تیسرے خود فرش بھی دبیز ہوگا، اور بعض مفسرین نے اس جگہ فراش سے مراد عورت کو قرار دیا ہے، کیونکہ عورت کو بھی لفظ فراش سے تعبیر کیا جاتا ہے، حدیث میں ہے اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ، اس میں فراش سے بیوی مراد ہے، اور اگلی آیتوں میں جو جنتی عورتوں کی صفات مذکور ہیں وہ بھی اس معنی کا قرینہ ہیں (مظہری) اس صورت میں لفظ مرفوعہ رفعت ... درجہ کے اعتبار سے ہوگا بمعنی بلند پایہ۔

اِنَّآ اَنْشَاْنٰھُنَّ اِنْشَآءً، انشاء کے معنی پیدا کرنے کے ہیں، ھُنَّ کی ضمیر جنت کی عورتوں کی طرف راجع ہے، اگرچہ سابقہ قریبی آیات میں اُن کا ذکر نہیں ہے، مگر ذرا فاصلہ سے سابقون کے بیان میں ان کا ذکر آچکا ہے، اس لئے ضمیر ان کی طرف راجع ہو سکتی ہے، اور اگر آیتِ مذکورہ میں فراش سے مراد جنت کی عورتیں ہیں، تو ضمیر ان کی طرف ہونا ظاہر ہے، نیز فرش و بستر وغیرہ عیش کی چیزوں کے ذکر

میں خود ایک دلالت عورت کی طرف پائی جاتی ہے، اس لئے بھی ضمیر اس طرف راجع ہو سکتی ہے۔
معنی آیت کے یہ ہیں کہ ہم نے جنّت کی عورتوں کی پیدائش و تخلیق ایک خاص انداز سے کی ہے یہ خاص انداز حورانِ جنت کے لئے تو اس طرح ہے کہ وہ جنّت ہی میں بغیر ولادت کے پیدا کی گئی ہیں ....
اور دنیا کی عورتیں جو جنّت میں جائیں گی ان کی خاص تخلیق سے مطلب یہ ہوگا کہ جو دنیا میں بدشکل، سیاہ رنگ یا بوڑھی تھی اب اس کو حسین شکل و صورت میں جوان رعنا کر دیا جائے گا، جیسا کہ ترمذی اور بیہقی میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ) کی تفسیر میں فرمایا کہ جو عورتیں دنیا میں بوڑھی چُندھی، سفید بال، بدشکل تھیں انھیں یہ نئی تخلیق حسین نوجوان بنا دے گی، اور بیہقی نے حضرت صدیقہ عائشہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے میرے پاس ایک بُوڑھیا بیٹھی ہوئی تھی، آپؐ نے دریافت فرمایا یہ کون ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میری رشتہ کی ایک خالہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور مزاح کے فرمایا لَا تَدْخُلُ الْجَنَّةَ عَجُوْزٌ۔ یعنی جنّت میں کوئی بڑھیا نہ جائے گی، یہ بیچاری سخت غمگین ہوئی، بعض روایات میں ہے کہ رونے لگی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تسلّی دی، اور اپنی بات کی حقیقت یہ بیان فرمائی کہ جس وقت یہ جنّت میں جائے گی تو بوڑھی نہ ہوگی بلکہ جوان ہو کر داخل ہوگی، اور یہی آیت تلاوت فرمائی (مظہری)

اَبْكَارًا، بِكْر، بکسر الباء کی جمع ہے، کنواری لڑکی کو کہا جاتا ہے، مراد یہ ہے کہ جنّت کی عورتوں کی تخلیق اس شان کی ہوگی کہ وہ ہر صحبت و مباشرت کے بعد پھر کنواری جیسی ہو جاویں گی۔

عُرُبًا، بضم عین و راء، عروبہ کی جمع ہے، اُس عورت کو کہتے ہیں جو اپنے شوہر کی عاشق اور اس کی من پسند محبوبہ ہو۔

اَتْرَابًا، ترب بکسر تاء کی جمع ہے، جس کے معنی ہمعمر کے ہیں، جو مٹی میں ساتھ کھیلا ہو، جنّت میں مرد و عورت سب ہمعمر کر دیئے جاویں گے، بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ سب کی عمر تینتیس ۳۳ سال ہوگی (مظہری)

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ، ثُلّة کے معنی بڑی جماعت اور اوّلین و آخرین کی تفسیر میں حضرات مفسّرین کے دو قول اوپر سابقون کے بیان میں مذکور ہو چکے ہیں، اگر اوّلین سے مراد حضرت آدم علیہ السلام سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک کے حضرات اور آخرین سے آپؐ کی اُمّت تا قیامت ہے، جیسا کہ بعض مفسّرین نے فرمایا تو اس آیت کا حاصل یہ ہوگا کہ اصحاب الیمین یعنی مؤمنین متقین کی تعداد پچھلی اُمّتوں کے مجموعہ میں ایک بڑی جماعت ہوگی، اور تنہا اُمّتِ محمدیہ میں ایک بڑی جماعت ہوگی، اس صورت میں اوّل تو اُمّتِ محمدیہ کی فضیلت کے لئے یہ بھی کچھ کم نہیں کہ پچھلے لاکھوں انبیاء علیہم السّلام کی اُمّتوں کی برابر یہ اُمّت ہو جائے جس کا زمانہ بہت مختصر

ہے، اس کے علاوہ لفظ ثُلّہ میں اس کی بھی گنجائش ہے کہ یہ ثُلّہ آخرین تعداد اولین سے بڑھ جائے گا۔

اور اگر دوسری تفسیر مراد لی جائے کہ اولین و آخرین دونوں اسی امت کے مراد ہیں، جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ سے بغوی نے اور حضرت ابوبکرہؓ سے مسدد، طبرانی و ابن مردویہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ "ھُمَا مِنْ اُمَّتِی" یعنی یہ اولین و آخرین میری امت ہی کے دو طبقے ہیں، اس معنی کے لحاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ سابقین اولین صحابہ و تابعین وغیرہ جیسے حضرات سے بھی یہ امت آخر تک بالکل محروم نہ ہوگی اگرچہ آخری دور میں ایسے لوگ کم ہوں گے، اور مومنین متقین و اولیاء اللہ تو اس پوری امت کے اول و آخر میں بھاری تعداد میں رہیں گے، اور امتِ محمدیہ کا کوئی دور کوئی طبقہ اصحاب الیمین سے خالی نہ رہیگا اس کی شہادت اس حدیث سے بھی ملتی ہے جو صحیح بخاری و مسلم میں حضرت معاویہؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ حق پر قائم رہے گی اور ہزاروں مخالفوں کے نرغے میں بھی وہ اپنا رشد و ہدایت کا کام کرتی رہے گی، اس کو کسی کی مخالفت نقصان نہ پہونچا سکے گی، یہاں تک کہ قیامت قائم ہونے تک یہ جماعت اپنے کام میں لگی رہے گی۔

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ﴿۵۷﴾ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ﴿۵۸﴾ ءَاَنْتُمْ

ہم نے تم کو بنایا پھر کیوں نہیں سچ مانتے، بھلا دیکھو تو جو پانی تم ٹپکاتے ہو، اب تم اس کو

تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿۵۹﴾ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا

بناتے ہو یا ہم ہیں بنانے والے، ہم ٹھہرا چکے تم میں مرنا اور ہم

نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۶۰﴾ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا

عاجز نہیں اس بات سے کہ بدلے میں لے آئیں تمہاری طرح کے لوگ اور اٹھا کھڑا کریں تم کو وہاں

تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾

جہاں تم نہیں جانتے، اور تم جان چکے ہو پہلا اٹھان پھر کیوں نہیں یاد کرتے،

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ﴿۶۳﴾ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ﴿۶۴﴾

بھلا دیکھو تو جو تم بوتے ہو، کیا تم اس کو کرتے ہو کھیتی یا ہم ہیں کھیتی کر دینے والے

لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ﴿۶۵﴾ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ﴿۶۶﴾

اگر ہم چاہیں تو کر ڈالیں اس کو روندا ہوا گھاس پھر تم سارے دن رہو باتیں بناتے، ہم تو قرض دار رہ گئے،

بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۶۷﴾ اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ﴿۶۸﴾ ءَاَنْتُمْ

بلکہ ہم بے نصیب ہو گئے، بھلا دیکھو تو پانی کو جو تم پیتے ہو، کیا تم نے

اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴿۶۹﴾ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ

اتارا اس کو بادل سے یا ہم ہیں اتارنے والے، اگر ہم چاہیں کر دیں اس کو

اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۰﴾ اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ﴿۷۱﴾ ءَاَنْتُمْ

کھارا پھر کیوں نہیں احسان مانتے، بھلا دیکھو تو آگ جس کو تم سلگاتے ہو، کیا تم نے

اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ﴿۷۲﴾ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً

پیدا کیا اس کا درخت یا ہم ہیں پیدا کرنے والے، ہم نے ہی تو بنایا وہ درخت یاد دلانے

وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ﴿۷۳﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾

کو اور برتنے کو جنگل والوں کے، سو بول پاکی اپنے رب کے نام کی جو سب سے بڑا

الربع ۲ ع ۳۶ ۱۵

خلاصۂ تفسیر

ہم نے تم کو (اوّل بار) پیدا کیا ہے (جس کو تم بھی تسلیم کرتے ہو) تو پھر تم (باعتبار اس کے نعمت ہونے کے توحید کی اور باعتبار اس کے دلیل قدرت علی الاعادہ ہونے کے قیامت کی) تصدیق کیوں نہیں کرتے، (آگے اس تخلیق کی پھر اس کے اسباب بقاء کی تفصیل وتذکیر ہے یعنی) اچھا پھر یہ بتلاؤ تم جو (عورتوں کے رحم میں) منی پہونچاتے ہو اس کو تم آدمی بناتے ہو یا ہم بنانے والے ہیں (اور ظاہر ہے کہ ہم ہی بناتے ہیں اور) ہم ہی نے تمہارے درمیان میں موت کو (معین وقت پر) ٹھیرا رکھا ہے (مطلب یہ کہ بنانا اور اس بنائے ہوئے کو ایک وقت خاص تک باقی رکھنا یہ سب ہمارا ہی کام ہے، آگے یہ بتلاتے ہیں کہ جیسا انسان کی ذات کا پیدا کرنا اور باقی رکھنا ہمارا فعل ہے، اسی طرح تمہاری موجودہ صورت کو باقی رکھنا بھی ہمارا ہی فعل ہے) اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری جگہ تم جیسے اور (آدمی) پیدا کر دیں اور تم کو ایسی صورت بنا دیں جن کو تم جانتے بھی نہیں، (یعنی مثلاً آدمی سے جانور کی صورت میں مسخ کر دیں جس کا گمان بھی نہیں) اور (آگے تنبیہ ہے اس کی دلیل پر یعنی) تم کو اوّل پیدائش کا علم حاصل ہے (کہ وہ ہماری قدرت سے ہے) پھر تم کیوں نہیں سمجھتے (کہ سمجھ کر اس نعمت کا شکر ادا کرو اور توحید کا اقرار کرو اور قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے پر بھی استدلال کرو، آگے ایک دوسری تنبیہ ہے یعنی) اچھا پھر یہ بتلاؤ تم جو کچھ (تخم وغیرہ) بوتے ہو اس کو تم اُگاتے ہو یا ہم اُگانے والے ہیں (یعنی زمین میں بیج ڈالنے میں تو تم کو کچھ دخل ہے بھی، لیکن اس کو زمین سے نکالنا یہ کس کا فعل ہے، آگے یہ

بتلاتے ہیں کہ زمین سے درخت اُگانا جیسا ہمارا کام ہے آگے اس درخت سے تمھارا فائدہ اٹھانا بھی ہماری قدرت و حکمت پر موقوف ہے، جیسا اوپر بھی فرمایا تھا یعنی) اگر ہم چاہیں تو اس (پیداوار) کو چُورا چُورا کر دیں، (یعنی دانہ کچھ نہ پڑے، پتی خشک ہو کر ریزہ ریزہ ہو جاوے) پھر تم متعجب ہو کر رہ جاؤ کہ (اب کے تو) ہم پر تاوان ہی پڑ گیا (یعنی سرمایہ میں نقصان آگیا، اور نقصان کیا) بلکہ بالکل ہی محروم رہ گئے (یعنی سارا ہی سرمایہ گیا گذرا، آگے تیسری تنبیہ ہے یعنی) اچھا پھر یہ بتلاؤ کہ جس پانی کو تم پیتے ہو اس کو بادل سے تم برسانے ہو یا ہم برسانے والے ہیں (پھر اس پانی کو پینے کے قابل بنانا ہماری دوسری نعمت ہے کہ) اگر ہم چاہیں اس کو کڑوا کر ڈالیں، تو تم شکر کیوں نہیں کرتے (اور بڑا شکر عقیدۂ توحید و ترکِ کفر ہے، آگے چوتھی تنبیہ ہے یعنی) اچھا پھر یہ بتلاؤ جس آگ کو تم سلگاتے ہو اس کے درخت کو (جس میں سے یہ آگ جھڑتی ہے جس کا بیان آخر سورۂ یٰسٓ میں آچکا ہے، اور اسی طرح جن ذرائع سے یہ آگ پیدا ہوتی ہے اُن ذرائع کو) تم نے پیدا کیا ہے یا ہم پیدا کرنے والے ہیں ہم نے اس کو (آتشِ دوزخ کی یا اپنی قدرت عجیبہ کی) یاد دہانی کی چیز اور مسافروں کے لئے فائدہ کی چیز بنایا ہے، (یاد دہانی ایک دینی فائدہ ہے، اور دوسرا دنیوی فائدہ آگ سے کھانا پکانے کا ہے اور تخصیص مسافر کی حصر کے لئے نہیں بلکہ سفر میں آگ کمیاب ہونے کے سبب ایک شے عجیب ہوتی ہے، اور مَتَاعًا میں اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ آگ سے فائدہ اٹھانا بھی ہماری قدرت سے ہے) سو (جس کی ایسی قدرت ہے) اپنے (اُس) عظیم الشان پروردگار کے نام کی تسبیح (و تحمید) کیجئے، (کہ کمال ذات و صفات مقتضی استحقاقِ حمد و ثنا ہیں، اور نام کی تسبیح وغیرہ کی تحقیق آیۃ آخر سورۂ رحمٰن میں گذر چکی ہے)۔

معارف و مسائل

شروع سورت سے یہاں تک محشر میں انسانوں کی تین قسمیں اور تینوں قسموں کے احکام اور جزاء و سزا کا بیان تھا، مذکور الصدر آیات میں اُن گمراہ لوگوں کو تنبیہ ہے جو سرے سے قیامت قائم ہونے اور دوبارہ زندہ ہونے ہی کے قائل نہیں، یا اللہ تعالیٰ کی عبادت میں دوسروں کو شریک ٹھیراتے ہیں، انسان کی اُس غفلت اور جہالت کا پردہ چاک کرنا ہے جس نے اس کو بھول میں ڈال رکھا ہے، توضیح اس کی یہ ہے کہ اس عالمِ کائنات میں جو کچھ موجود ہے یا وجود میں آرہا ہے یا آئندہ آنے والا ہے اس کی تخلیق پھر اس کو باقی رکھنا اور پھر اس کو انسان کے مختلف کاموں میں لگا دینا یہ سب درحقیقت حق تعالیٰ جل شانہ کی قدرت و حکمت کے کرشمے ہیں، اگر اسباب کے پردے درمیان میں نہ ہوں اور انسان ان سب چیزوں کی تخلیق بلاواسطہ اسباب کے مشاہدہ کرلے تو ایمان لانے پر مجبور ہو جائے، مگر حق تعالیٰ نے دنیا کو دار الامتحان بنایا ہے، اس لئے یہاں جو کچھ وجود و ظہور میں آتا ہے وہ اسباب کے پردوں میں آتا ہے۔

اور حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ اور حکمتِ بالغہ سے ان اسباب اور مسبّبات میں ایک ایسا رابطہ

مستحکم قائم فرما دیا ہے کہ جہاں کہیں سبب موجود ہو جاتا ہے تو مسبّب ساتھ ساتھ وجود میں آجاتا ہے، جس کو دیکھنے والا لازم و ملزوم سمجھتا ہے، اور ظاہر بین نظریں اسی سلسلۂ اسباب میں اُلجھ کر رہ جاتی ہیں، اور تخلیقِ کائنات کو انہی اسباب کی طرف منسوب کرنے لگتی ہیں، اصل قدرت اور حقیقی قوتِ فاعلہ جو ان اسباب و مسبّبات کو گردش دینے والی ہے اس کی طرف التفات نہیں رہتا۔

آیات مذکورہ میں حق تعالیٰ نے اوّل خود انسان کی تخلیق کی حقیقت کو واضح فرمایا، پھر انسانی ضروریات کی تخلیق کی حقیقت سے پردہ اٹھایا، خود انسان کو مخاطب کر کے سوالات کئے، ان سوالات کے ذریعہ اصل جواب کی طرف رہنمائی فرمائی، کیونکہ سوالات میں اُن اسباب کی کمزوری اور ان کا علّتِ تخلیق نہ ہونا واضح فرما دیا۔

آیاتِ مذکورہ میں پہلی آیت نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ ایک دعویٰ ہے، اور اگلی آیات اس کے دلائل ہیں، سب سے پہلے خود انسان کی تخلیق پر ایک سوال کیا گیا، کیونکہ غافل انسان چونکہ روزمرہ اس کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے کہ مرد و عورت کے اختلاط سے حمل قرار پاتا ہے اور پھر وہ رحمِ مادر میں بڑھتا اور تیار ہوتا رہتا ہے، اور نو مہینے کے بعد ایک مکمل انسان کی صورت میں پیدا ہو جاتا ہے، اس روزمرّہ کے مشاہدہ سے غفلت شعار انسان کی نظر بس یہیں تک رہ جاتی ہے کہ مرد و عورت کے باہمی اختلاط ہی کو تخلیقِ انسانی کی علّتِ حقیقی سمجھنے لگتا ہے، اس لئے سوال یہ کیا گیا اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ، یعنی اے انسان! ذرا غور تو کر کہ بچے کی پیدائش میں تیرا دخل اس کے سوا کیا ہے کہ تو نے ایک قطرۂ منی ایک خاص محل میں پہونچا دیا، اس کے بعد کیا تجھے کچھ خبر ہے کہ اس نطفہ پر کیا کیا دور گذرے، کیا کیا تغیرات آئے، کس کس طرح اس میں ہڈیاں اور گوشت پوست پیدا ہوئے، اور کس کس طرح اس عالمِ اصغر کے وجود میں کیسی کیسی نازک نازک مشینیں غذا حاصل کرنے، خون بنانے اور رُوحِ حیوانی پیدا کرنے کی پھر دیکھنے، بولنے، سننے، چکھنے اور سوچنے سمجھنے کی قوت اس کے وجود میں نصب فرمائیں کہ ایک انسان کا وجود ایک متحرک فیکٹری بن گیا، نہ باپ کو خبر ہے نہ ماں کو جس کے پیٹ میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے، آخر اگر عقل دنیا میں کوئی چیز ہے تو وہ یہ کیوں نہیں سمجھتی کہ عجیب و غریب حکمتوں پر مشتمل انسانی وجود کیا خود بخود بغیر کسی کے بنائے بن گیا؟ اور اگر کوئی بنانے والا ہے تو وہ کون ہے؟ ماں باپ کو تو خبر بھی نہیں کہ کیا بنا کس طرح بنا؟ ان کو تو وضعِ حمل تک یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ حمل لڑکا ہے یا لڑکی، پھر آخر وہ کونسی قدرت ہے جس نے پیٹ کی پھر رحم کی پھر بچے کے اوپر لپٹی ہوئی جھلی کی تین اندھیریوں میں یہ حسین و جمیل، سمیع و بصیر، سوچنے سمجھنے والا وجود تیار کر دیا، یہاں جو تبارک اللہ احسن الخالقین بول اٹھنے پر مجبور نہ ہو جائے وہ عقل کا اندھا ہی ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد کی آیات میں یہ بھی بتلا دیا کہ اے انسانو! تم پیدا ہو جانے اور چلتا پھرتا فعّال آدمی بن جانے کے بعد بھی اپنے وجود و بقاء اور تمام کاروبار میں ہمارے ہی محتاج ہو۔ ہم نے تمہاری موت کا بھی

ابھی سے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے، اور اس وقت مقرر سے پہلے پہلے جو عمر تمھیں ملی اس میں تم اپنے آپ کو خود مختار پاتے ہو، یہ بھی تمھارا مغالطہ ہی ہے، ہمیں اس پر بھی قدرت ہے کہ ابھی ابھی تمہیں فنا کر کے تمھاری جگہ کوئی دوسری قوم پیدا کر دیں، اور یہ بھی قدرت ہو کہ تمھیں فنا کرنے کے بجائے کسی دوسری صورت حیوانی یا جماداتی میں تمھیں تبدیل کر دیں، یہ مضمون ان آیات کا ہے نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِيْنَ، عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ موت کے مقدر اور وقت معیّن پر آنے میں اس طرف بھی اشارہ ہو کہ تم اپنی بقاء میں آزاد و خود مختار نہیں، بلکہ تمھاری بقاء ایک معیّن وقت تک ہی، تمہیں حق تعالیٰ نے ایک خاص قوت و قدرت اور عقل و حکمت کا حامل بنایا ہے، اس سے کام لے کر تم بہت کچھ کر سکتے ہو، مَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ کا حاصل یہ ہے کہ ہمارے ارادے پر سبقت کرنے والا اور ہماری مشیت پر غالب آنے والا کوئی نہیں، ہم اس وقت بھی جو چاہیں کر سکتے ہیں، کہ اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ، یعنی تمھاری جگہ تمھارے مثل کوئی اور قوم لے آئیں، وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ، اور تمھاری وہ شکل بنا دیں جس کو تم جانتے بھی نہیں، اس کی یہ شکل بھی ہو سکتی ہے کہ مر کر مٹی ہو جاؤ، یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کسی جانور کی شکل میں تبدیل ہو جاؤ، جیسے پچھلی امتوں پر صورتیں مسخ ہو کر بندر اور خنزیر بن جانے کا عذاب آچکا ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمھیں پتھر دل اور جمادات کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے۔

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ، تخلیق انسانی کے معاملے میں انسان کی غفلت اور اسباب طبعیہ کے پردہ میں اُلجھ کر اصل خالق و مالک سے بے خبر ہونے کا پردہ چاک کرنے کے بعد اس کی غذا جو اس کی زندگی کا مدار ہے اس کی حقیقت اسی انداز سے ظاہر فرمائی کہ سوال کیا کہ تم جو کچھ زمین میں بیج بوتے ہو ذرا غور تو کرو کہ اس بیج میں سے درخت پیدا کرتے میں تمھارے عمل کا کیا اور کتنا دخل ہے، غور کرو گے تو جواب اس کے سوا نہ ملے گا کہ کاشتکار کا دخل اس میں اس سے زیادہ نہیں کہ اُس نے زمین کو ہل چلا کر پھر کھاد ڈال کر نرم کر دیا، کہ جو ضعیف کونپل اس دانہ سے پیدا ہو کر اوپر آنا چاہے اس کی راہ میں زمین کی سختی رُکاوٹ نہ بنے بیج بونے والے انسان کی ساری کوشش اسی ایک نقطہ کے گرد دائر ہے، اور جب درخت نمودار ہو جائے تو اس کی حفاظت پر یہ کوشش لگ جاتی ہے، لیکن ایک دانہ کے اندر سے درخت نکال لانا نہ اس کے بس کا ہے، نہ یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں نے یہ درخت بنایا ہے، تو پھر وہی سوال آتا ہے کہ منوں مٹی کے ڈھیر میں پڑے ہوئے دانے کے اندر سے یہ خوب صورت اور ہزاروں فوائد پر مشتمل درخت کس نے بنایا؟ تو جواب اس کے سوا کیا ہے کہ وہی مالک و خالقِ کائنات کی قدرتِ کاملہ اور صنعتِ عجیبہ اس کی بنانے والی ہے۔

اس کے بعد اسی طرح پانی جس کو پی کر انسان زندہ رہتا ہے، آگ جس پر اپنا کھانا پکاتا ہے اور اپنی صنعتوں کو اس سے چلاتا ہے ان سب کی تخلیق پر ایسے ہی سوال و جواب کا ذکر فرمایا، اور آخر میں سب کا

خلاصہ یہ بیان فرمایا۔

نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ، مُقْوِیْن، اقواء سے مشتق ہے اور وہ قواء بمعنی صحراء سے مشتق ہے، مُقوِی کے معنے ہوئے صحراء میں اُترنے والا، مراد اس سے مسافر ہے جو جنگل میں کہیں ٹھہر کر اپنے کھانے کے انتظام میں لگا ہو، اور مراد آیت کی یہ ہے کہ یہ سب تخلیقات ہماری ہی قدرت وحکمت کا نتیجہ ہیں۔

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ، اس کا لازمی اور عقلی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ انسان حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور توحید پر ایمان لائے اور اپنے رب عظیم کے نام کی تسبیح پڑھا کرے، کہ یہی اس کی نعمتوں کا شکر ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴿۷۵﴾ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ﴿۷۶﴾

سو میں قسم کھاتا ہوں تاروں کے ڈوبنے کی، اور یہ قسم ہے اگر سمجھو تو بڑی قسم،

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۷﴾ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿۷۸﴾ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿۷۹﴾

بیشک یہ قرآن ہے عزت والا، لکھا ہوا ہے ایک پوشیدہ کتاب میں، اس کو وہی چھوتے ہیں جو پاک بنائے گئے ہیں

تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ﴿۸۱﴾

اتارا ہوا ہے پروردگار عالم کی طرف سے، اب کیا اس بات میں تم سستی کرتے ہو،

وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ

اور اپنا حصہ تم یہی لیتے ہو کہ اس کو جھٹلاتے ہو، پھر کیوں نہیں جس وقت جان پہنچے

الْحُلْقُوْمَ ﴿۸۳﴾ وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ

حلق کو، اور تم اس وقت دیکھ رہے ہو، اور ہم اس کے پاس ہیں

مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ﴿۸۶﴾

تم سے زیادہ پر تم نہیں دیکھتے، پھر کیوں نہیں اگر تم نہیں ہو کسی کے حکم میں

تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۸۷﴾ فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۸۸﴾

تو کیوں نہیں پھیر لیتے اس رُوح کو اگر ہو تم سچے، سو جو اگر وہ (مردہ) ہوا مقرب لوگوں میں،

فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ ۥ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ﴿۸۹﴾ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ

تو راحت ہے اور روزی ہے اور باغ نعمت کا، اور جو اگر وہ ہوا داہنے والوں

الْيَمِيْنِ ﴿٩٠﴾ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿٩١﴾ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ

ہیں ، تو سلامتی پہنچے تجھ کو داہنے والوں سے ، اور جو اگر وہ ہوا جھٹلانے

الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿٩٢﴾ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿٩٣﴾ وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ﴿٩٤﴾

والوں بہکنے والوں میں سے تو مہمانی ہے جلتا پانی ، اور ڈالنا آگ میں ،

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿٩٥﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿٩٦﴾

بیشک یہ بات یہی ہے لائق یقین کے ، سو بول پاکی اپنے رب کے نام سے جو سب سے بڑا

خلاصۂ تفسیر

(اور دلائل عقلیہ سے بعث یعنی مرکر زندہ ہونے کا امکان ثابت ہونے کے بعد قرآن سے جو اس کا وقوع ثابت ہے اور تم اس قرآن کو نہیں مانتے) سو میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے چھپنے کی اور اگر تم غور کرو تو یہ ایک بڑی قسم ہے (اور قسم اس بات کی کھاتا ہوں) کہ یہ (قرآن جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا ہے بوجہ منزل من اللہ ہونے کے) ایک مکرم قرآن ہے جو ایک محفوظ کتاب (یعنی لوح محفوظ) میں (پہلے سے) درج ہے (اور وہ لوح محفوظ ایسی ہے) کہ بجز اس کو پاک فرشتوں کے (کہ گناہوں سے بالکلیہ پاک ہیں، کوئی (شیطان وغیرہ) ہاتھ نہیں لگانے پاتا (اس کے مضامین پر مطلع ہونا تو دور کی بات ہے، پس وہاں سے یہاں خاص طور پر آنا فرشتے ہی کے ذریعہ سے ہے، اور یہی نبوت ہے، اور شیاطین اس کو لا ہی نہیں سکتے، کہ احتمالِ کہانت وغیرہ سے نبوت میں شبہ ہو، کقولہ تعالیٰ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ، وقولہ تعالیٰ وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ، اس سے ثابت ہوا کہ) یہ رب العالمین کی طرف سے بھیجا ہوا ہے، (جو کہ اشارۂ کریم کا مدلول تھا، یہاں ستاروں کے چھپنے کی قسم اپنے مفہوم و مقصد کے اعتبار سے ایسی ہے جیسے شروع سورۂ والنجم میں ہے جس کا دہاں بیان ہو چکا ہے جس میں ستاروں کا باعتبار غروب کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موصوف بالنبوۃ اور منار الہدیٰ ہونے کا نظیر ہونا بھی بیان ہوا ہے جو کہ مقصود مقام ہے، اور قسمیں جتنی قرآن میں ہیں بوجہ دلالت علی المطلوب کے سب ہی عظیم ہیں، لیکن کہیں کہیں مطلوب کے خاص اہتمام اور اس پر زیادہ متنبہ کرنے کے لئے عظیم ہونے کی تصریح بھی فرمادی ہے، جیسا کہ اس جگہ اور سورۂ والفجر میں، حاصل مقام کا اجمالاً وہ ہے جو تفصیلاً اخیر رکوع میں سورۂ شعراء کے ارشاد ہوا ہے) سو (جب اس کا منزل من اللہ ہونا ثابت ہے تو) کیا تم لوگ اس کلام کو سرسری بات سمجھتے ہو (یعنی اس کو واجب التصدیق نہیں جانتے) اور (اس مداہنت سے بڑھ کر یہ کہ) تکذیب کو اپنی غذا بنا رہے ہو

(اور اس لئے توحید و وقوعِ قیامت کا بھی انکار کرتے ہو) سو (اگر یہ انکار حق ہے تو) جس وقت (مرنے کے قریب کسی شخص کی) رُوح حلق تک آ پہنچتی ہے اور تم اُس وقت (بیٹھے حسرت آلودہ نگاہ سے) تکا کرتے ہو اور ہم (اس وقت) اُس (مرنے والے) شخص کے تم سے بھی زیادہ نزدیک ہوتے ہیں (یعنی تم سے بھی زیادہ اس شخص کے حال سے واقف ہوتے ہیں، کیونکہ تم صرف ظاہری حالت دیکھتے ہو اور ہم اس کی باطنی حالت پر بھی مطلع ہوتے ہیں) لیکن (ہمارے اس قربِ علمی کو بوجہ اپنے جہل و کفر کے) تم سمجھتے نہیں ہو تو (فی الواقع) اگر تمہارا حساب کتاب ہونے والا نہیں ہے (جیسا تمہارا خیال ہے) تو تم اس روح کو (بدن کی طرف) پھر کیوں نہیں لوٹا لاتے ہو (جس کی اس وقت تم کو تمنا بھی ہوا کرتی ہے) اگر (اس انکارِ قیامت وحساب میں) تم سچے ہو (مطلب یہ کہ قرآن صادق ہے اور وقوع بعث کا ناطق ہے، پس مقتضی وقوع محقق ہوا اور مانع کوئی امر نہیں پس وقوع ثابت ہوگیا اور اس پر بھی تمہارا انکار اور نفی کئے چلا جانا بدلالتِ حال اس کو مستلزم ہے کہ گویا تم روح کو اپنے بس میں سمجھتے ہو کہ گو قیامت میں خدا دوبارہ رُوح ڈالنا چاہے جیسا کہ مقتضٰی قرآن کا ہے مگر ہم نہ ڈالنے دیں گے اور بعث نہ ہونے دیں گے، جب ہی تو ایسے زور سے نفی کرتے ہو، ورنہ جو اپنے کو عاجز جانے وہ دلائل وقوع کے بعد ایسے زور کی بات کیوں کہے، سو اگر تم اپنے بس میں سمجھتے ہو تو ذرا اپنا زور اسی وقت دکھلا دو جبکہ کسی قریب الموت انسان کے بقاءِ حیات کے متمنی بھی ہوتے ہو، اور دیکھ دیکھ کر رحم بھی آتا ہے دل گیر بھی ہوتے ہو اور وہ زور دکھلانا یہ کہ اس روح کو نکلنے نہ دو بدن میں لوٹا دو، جب اس پر بس نہیں کہ رُوح کو بدن سے نکلنے نہ دو تو اس کو دوبارہ پیدا کرنے سے روکنے پر کیسے تمہارا بس چلے گا، پس ایسے لاطائل دعوے کیوں کرتے ہو، اور چونکہ مقام ہے نفیِ قدرت کا، اور نفیِ علم مستلزم ہے نفیِ تعلقِ قدرت کو، اس لئے نَحۡنُ اَقۡرَبُ جملہ معترضہ میں اُن کے علمِ تام کی نفی فرما دی، اور چونکہ یہ دلیل کافی ان کے لئے شافی نہ ہوئی، اس لئے لَا تُبۡصِرُوۡنَ میں توبیخ بھی فرما دی، اور چونکہ اس تقریر سے اثباتِ قدرت بھی ہوا اس لئے بعث کے ساتھ یہ توحید کی بھی دلیل ہے، آگے کیفیت مجازاۃ کی ارشاد ہے، یعنی یہ تو ثابت ہو چکا کہ قیامت اپنے وقت پر ضرور آوے گی) پھر (جب قیامت واقع ہوگی تو) جو شخص مقربین میں سے ہوگا (جن کا ذکر اوپر آیا ہے وَالسّٰبِقُوۡنَ الخ) اس کے لئے تو راحت ہے اور (فراغت کی) غذائیں ہیں، اور آرام کی جنت ہے اور جو شخص داہنے والوں میں سے ہوگا (جن کا ذکر اوپر آیا ہے وَ اَصۡحٰبُ الۡیَمِیۡنِ الخ) تو اس سے کہا جاوے گا کہ تیرے لئے (ہر آفت اور خطرہ سے) امن وامان ہے کہ تو داہنے والوں میں سے ہے، (اور یہ کہنا خواہ ابتداءً ہو اگر فضل یا توبہ کے سبب اوّل ہی مغفرت ہو جاوے یا انتہاءً ہو اگر بعد سزا کے مغفرت ہو اور یہاں رَوۡحٌ وَّ رَیۡحَانٌ کا ذکر نہ فرمانا نفی کے لئے نہیں بلکہ اشارہ اس طرف ہو کہ یہ سابقین سے ان امور میں کم ہوگا) اور جو شخص جھٹلانے والوں (اور) گمراہوں میں سے ہوگا تو کھولتے ہوئے پانی سے اس کی دعوت ہوگی اور دوزخ میں داخل ہونا ہوگا، بیشک یہ (جو کچھ مذکور ہوا) تحقیقی یقینی بات ہے سو (جس کے یہ تصرفات ہیں) اپنے (اس) عظیم الشان پروردگار کے نام کی تسبیح (وتحمید) کیجئے (و قدم سآنفاً)۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں عقلی دلائل سے قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے کا ثبوت حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اس دنیاوی تخلیق کے ذریعہ دیا گیا تھا، آگے نقلی دلیل اسی پر حق تعالیٰ کی طرف سے قسم کے ساتھ دی گئی ہے،

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ، لفظ لَا قسم کے شروع میں ایک عام محاورہ ہے، جیسے لَا وَاللّٰہ، اور جاہلیت کی قسموں میں لَا وَاَبِیْکَ مشہور ہے، بعض حضرات نے اس حرف لَا کو زائد قرار دیا ہے، اور بعض نے اس کی توجیہ یہ کی کہ اس موقع میں حرف لَا مخاطب کے گمان کی نفی کے لئے ہوتا ہے، یعنی لَیْسَ کَمَا تَقُوْلُ، یعنی جیسا تم کہتے اور سمجھتے ہو وہ بات نہیں، بلکہ حقیقت وہ ہے جو آگے قسم کھا کر بتلائی جاتی ہے۔

مَوَاقِع، موقع کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں ستاروں کے غروب ہونے کی جگہ یا وقت، اس آیت میں ستاروں کی قسم کو غروب کے وقت کے ساتھ مقید کیا گیا ہے، جیسے سورۂ نجم میں بھی وَالنَّجْمِ اِذَا ھَوٰی میں بھی وقت غروب کی قید ہے، اس قید کی حکمت یہ ہے کہ غروب کے وقت ہر ستارے کے عمل کا اس افق سے انقطاع نظر آتا ہے اور اس کے آثار کی فنا کا مشاہدہ ہوتا ہے، جس سے ان کا حادث اور قدرت الٰہیہ کا محتاج ہونا ثابت ہوتا ہے۔

اِنَّہٗ لَقُرْاٰنٌ کَرِیْمٌ ؀ فِیْ کِتٰبٍ مَّکْنُوْنٍ ؀ لَّا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ؀ سابقہ آیات میں مواقع النجوم کی قسم کھا کر جو مضمون جواب قسم کا بیان کرنا ہے، وہ ان آیات میں مذکور ہے، جس کا حاصل قرآن کریم کا مکرم و محفوظ ہونا اور مشرکین کے اس خیال کی تردید ہے کہ یہ کسی انسان کا بنایا ہوا یا معاذ اللہ شیطان کا القاء کیا ہوا کلام ہے۔

کِتٰبٍ مَّکْنُوْنٍ کے لفظی معنی چھپی ہوئی مستور کتاب، مراد اس سے لوح محفوظ ہے، لَّا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ، یہاں دو مسئلے غور طلب اور ائمۂ تفسیر میں مختلف فیہ ہیں، اول یہ کہ نحوی ترکیب کے اعتبار سے اس جملے میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ جس کتاب کی ایک صفت مکنون آئی یہ جملہ اسی کتاب کی دوسری صفت ہے، اور ضمیر لَا یَمَسُّہٗ کی اسی کتاب کی طرف راجع ہے، اس صورت میں معنی آیت کے یہ ہوتے ہیں کتاب مکنون یعنی لوح محفوظ کو سوائے پاک لوگوں کے اور کوئی نہیں چھو سکتا، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس صورت میں مُطَهَّرُوْن کی مراد صرف فرشتے ہی ہو سکتے ہیں، جن کی رسائی لوح محفوظ تک ہو سکے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس صورت میں لفظ مَسّ اپنے حقیقی معنی ہاتھ سے چھونے کے مفہوم میں نہیں لیا جا سکتا، بلکہ مس کرنے اور چھونے کے مجازی اور لازمی معنی مراد لینے ہوں گے، یعنی لوح محفوظ میں لکھے ہوئے مضامین پر مطلع ہونا، کیونکہ لوح محفوظ کو ہاتھ سے چھونا کسی مخلوق فرشتے وغیرہ کا کام نہیں (قرطبی) بیان القرآن کے مذکور الصدر خلاصہ تفسیر میں یہی ترکیب اور مفہوم اختیار کر کے تفسیر کی گئی ہے۔

دوسرا احتمال اس جملے کی ترکیب نحوی میں یہ ہے کہ اس کو قرآن کی صفت بنایا جائے جو اوپر اِنَّہٗ لَقُرْاٰنٌ

کَرِیْمٌ میں مذکور ہی، اس صورت میں لَایَمَسُّہٗ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہوگی، اور اس سے مراد وہ صحیفہ ہوگا جس میں قرآن لکھا ہوا ہو، اور لفظ مَسَّ اپنے حقیقی معنی ہاتھ سے چھونے کے مفہوم میں رہے گا، مجاز کی ضرورت نہ ہوگی، اسی لئے قرطبی وغیرہ مفسرین نے اس کو ترجیح دی ہے، اور امام مالکؒ نے فرمایا کہ آیت لَایَمَسُّہٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ کی تفسیر میں جو کچھ میں نے سُنا ہے اُن سب میں بہتر قول ہے کہ اس کا وہی مفہوم ہے جو سورۂ عبس کی آیت کا ہے یعنی فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍۭ بِاَيْدِیْ سَفَرَةٍ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ (قرطبی و روح المعانی) اور اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ جملہ کتاب مکنون کی صفت نہیں بلکہ قرآن کی صفت ہے، اور قرآن سے مراد وہ صحیفے ہیں جو وحی لانیوالے فرشتوں کے ہاتھ میں دیئے جاتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ غور طلب اور مختلف فیہ اس آیت میں یہ ہے کہ مُطَهَّرُوْن سے کون مراد ہیں، صحابہ و تابعین اور مفسرین کی ایک بڑی جماعت کے نزدیک مُطَهَّرُوْن سے مراد فرشتے ہیں جو معاصی اور رذائل سے پاک و معصوم ہیں، یہ قول حضرت انسؓ اور سعید بن جبیرؒ سے منقول ہے (قرطبی) حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی قول ہے (ابن کثیر) امام مالکؒ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے (قرطبی)

اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ قرآن سے مراد وہ مصحف ہے جو ہمارے ہاتھوں میں ہے، اور مُطَهَّرُوْن سے مراد وہ لوگ ہیں جو نجاست ظاہری اور معنوی یعنی حدثِ اصغر و اکبر سے پاک ہوں، حدث اصغر کے معنی بے وضو ہونے کے ہیں، اس کا ازالہ وضو کرنے سے ہوجاتا ہے، اور حدث اکبر جنابت اور حیض و نفاس کو کہا جاتا ہے جس سے پاکی کے لئے غسل ضروری ہے، یہ تفسیر حضرت عطاءؒ، طاؤسؒ، سالمؒ اور حضرت محمد باقر رحمہم اللہ سے منقول ہے (روح) اس صورت میں جملہ لَایَمَسُّہٗ اگرچہ جملہ خبریہ ہے مگر اس خبر کو بحکم انشاء یعنی نہی و ممانعت کے معنی میں قرار دیا جائے گا، اور مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ مصحفِ قرآن کو چھونا بغیر طہارت کے جائز نہیں، اور طہارت کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ ظاہری نجاست سے بھی اس کا ہاتھ پاک ہو، اور بے وضو بھی نہ ہو، اور حدث اکبر یعنی جنابت بھی نہ ہو، قرطبی نے اسی تفسیر کو اظہر فرمایا ہے، تفسیر مظہری میں اسی کی ترجیح پر زور دیا ہے۔

حضرت فاروق اعظمؓ کے اسلام لانے کے واقعہ میں جو مذکور ہے کہ انھوں نے اپنی بہن کو قرآن پڑھتے ہوئے پایا تو اوراقِ قرآن کو دیکھنا چاہا، ان کی بہن نے یہی آیت پڑھ کر اوراقِ قرآن اُن کے ہاتھ میں دینے سے انکار کیا، کہ اس کو پاک لوگوں کے سوا کوئی نہیں چھو سکتا، فاروق اعظمؓ نے مجبور ہو کر غسل کیا، پھر یہ اوراق پڑھے، اس واقعہ سے بھی اسی آخری تفسیر کی ترجیح ہوتی ہے، اور روایاتِ حدیث جن میں غیر طاہر کو قرآن کے چھونے سے منع کیا گیا ہے، ان روایات کو بھی بعض حضرات نے اس آخری تفسیر کی ترجیح کے لئے پیش کیا ہے۔

مگر چونکہ اس مسئلے میں حضرت ابن عباسؓ اور حضرت انسؓ وغیرہ کا اختلاف ہے جو اوپر آچکا ہے، اس لئے بہت سے حضرات نے بے وضو قرآن کو ہاتھ لگانے کی ممانعت کے مسئلے میں آیت مذکورہ سے استدلال چھوڑ کر

صرف روایاتِ حدیث کو پیش کیا ہے (روح المعانی) وہ احادیث یہ ہیں :۔

امام مالکؒ نے مؤطا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ مکتوب گرامی نقل کیا ہے جو آپؐ نے حضرت عمرو بن حزمؓ کو لکھا تھا، جس میں ایک جملہ یہ بھی ہے لَا یَمَسَّ الْقُرْاٰنَ اِلَّا طَاهِرٌ (ابن کثیر) یعنی قرآن کو وہ شخص نہ چھوئے جو طاہر نہ ہو۔

اور روح المعانی میں یہ روایت مسند عبدالرزاق، ابن ابی داؤد اور ابن المنذر سے بھی نقل کی ہے اور طبرانی و ابن مردویہ نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا یَمَسَّ الْقُرْاٰنَ اِلَّا طَاهِرٌ (روح المعانی) یعنی قرآن کو ہاتھ نہ لگائے بجز اس شخص کے جو پاک ہو۔

مسئلہ : روایاتِ مذکورہ کی بناء پر جمہور امت اور ائمہ اربعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ قرآن کریم کو ہاتھ لگانے کے لئے طہارت شرط ہے اس کے خلاف گناہ ہے، ظاہری نجاست سے ہاتھ کا پاک ہونا، باوضو ہونا حالتِ جنابت میں نہ ہونا سب اس میں داخل ہے، حضرت علی مرتضیٰؓ، ابن مسعودؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، سعید ابن زیدؓ، عطاء اور زہری، نخعیؒ، حکمؒ، حمادؒ، امام مالکؒ، شافعیؒ، ابوحنیفہؒ سب کا یہی مسلک ہے، اوپر جو اختلافِ اقوال نقل کیا گیا ہے وہ صرف اس بات میں ہے کہ یہ مسئلہ جو احادیثِ مذکورہ سے ثابت اور جمہور امت کے نزدیک مسلّم ہے، کیا یہ بات قرآن کی آیتِ مذکورہ سے بھی ثابت ہے یا نہیں، بعض حضرات نے اس آیت کا مفہوم اور احادیث مذکورہ کا مفہوم ایک قرار دیا، اور اس آیت اور احادیثِ مذکورہ کے مجموعہ سے اس مسئلہ کو ثابت کیا، دوسرے حضرات نے آیت کو استدلال میں پیش کرنے سے بوجہ اختلافِ صحابہ احتیاط کی، لیکن احادیثِ مذکورہ کی بناء پر مسلک سب نے یہی اختیار کیا کہ بے وضو و بے طہارت قرآن کو ہاتھ لگانا جائز نہیں، اس لئے خلاف مسئلے میں نہیں، بلکہ اس کی دلیل میں ہوا ہے۔

مسئلہ : قرآن مجید کا غلاف جو جلد کے ساتھ سلا ہوا ہو وہ بھی بحکم قرآن ہے، اس کو بھی بغیر وضو و بغیر طہارت کے ہاتھ لگانا باتفاق ائمہ اربعہ ناجائز ہے، البتہ قرآن مجید کا جزدان جو علیحدہ کپڑے کا ہوتا ہے اگر اس میں قرآن بند ہے تو اس جزدان کے ساتھ قرآن کریم کو ہاتھ لگانا بلا وضو ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے، مگر امام مالکؒ و شافعیؒ کے نزدیک یہ بھی ناجائز ہے (مظہری)

مسئلہ : جو کپڑا آدمی نے پہنا ہوا ہے اس کی آستین یا دامن سے قرآن مجید کو بلا وضو چھونا بھی جائز نہیں، البتہ علیحدہ رومال یا چادر سے چھوا جاسکتا ہے (مظہری)

مسئلہ : علماء نے فرمایا کہ اسی آیت سے بدرجۂ اولیٰ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جنابت یا حیض و نفاس کی حالت میں قرآن کی تلاوت بھی جائز نہیں، جب تک غسل نہ کرے، کیونکہ مصحف میں لکھے ہوئے حروف و نقوش کی جب یہ تعظیم واجب ہے تو اصل حروف جو زبان سے ادا ہوتے ہیں ان کی تعظیم اس سے زیادہ اہم اور واجب ہونا چاہئے، اس کو مقتضیٰ تو یہ تھا کہ بے وضو آدمی کو بھی تلاوتِ قرآن جائز نہ ہو، مگر حضرت

ابن عباسؓ کی حدیث جو بخاری و مسلم میں ہے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی حدیث جو مسند احمد میں ہے اس سے بغیر وضو کے تلاوتِ قرآن فرمانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، اس لئے فقہاء نے بلاوضو تلاوت کی اجازت دی ہے (تفسیر مظہری)

اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ، مُدْهِنُوْنَ، اِدْهَان سے مشتق ہے، جس کے لغوی معنی تیل کی مالش کرنے کے ہیں اور تیل مالش سے اعضاء نرم ہوجاتے ہیں اس لئے نرم کرنے اور ناجائز مواقع میں نرمی برتنے کے معنی اور نفاق کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا، آیت مذکورہ میں یہ لفظ آیاتِ الٰہیہ کی تصدیق میں نفاق یا تکذیب کے معنی میں استعمال ہے،

فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ۝ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ۝ فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

سابقہ آیات میں پہلے عقلی دلائل سے پھر حق تعالیٰ کی طرف سے ستاروں کی قسم کھا کر اور ان کے مقہور و مغلوب ہونے کی کیفیت کی طرف اشارہ کرکے دو باتیں ثابت کی گئی ہیں، اوّل یہ کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اس میں کسی شیطان وجن وغیرہ کا کوئی تصرف نہیں ہوسکتا، جو کچھ اس میں ہے وہ حق ہے، دوسرا مسئلہ جو قرآن کے مسائل میں خاص اہمیت رکھتا ہے، وہ قیامت کا آنا اور سب مُردوں کا زندہ ہوکر رب العزت کے سامنے حساب کے لئے پیش ہونا ہے، اور اس کے آخر میں کفار ومشرکین کا ان سب دلائل واضحہ کے خلاف قرآن کی حقانیت اور قیامت میں مُردوں کے زندہ ہونے سے انکار کا ذکر کیا گیا تھا۔

قیامت اور مرنے کے بعد زندہ ہونے سے انکار گویا ان کی طرف سے اس کا دعویٰ ہے کہ ان کی جان اور رُوح خود ان کے قبضہ میں ہے اور ان کی اپنی زندگی میں ان کو بھی کچھ دخل ہے، ان کے اس خیالِ باطل کی تردید کے لئے آیاتِ مذکورہ میں ایک قریب الموت انسان کی مثال دے کر بتلایا کہ جب اس کی روح حلق میں پہنچتی ہے اور تم یعنی مرنے والے کے عزیز و قریب، دوست و احباب سب اس کے حال کو دیکھ رہے ہوتے ہیں، اور بتقاضائے محبت وتعلق یہ بھی چاہتے ہیں کہ اس کی روح نہ نکلے، یہ زندہ رہے، مگر اس وقت سب کو اپنی بیچارگی اور عاجزی کا احساس واقرار ہوتا ہے، کہ کوئی اس مرنے والے کی جان نہیں بچاسکتا اس پر حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اس وقت اپنے علم وقدرت کے لحاظ سے ہم تمہاری نسبت اُس مرنے والے سے زیادہ قریب ہوتے ہیں، قریب ہونے سے مراد اس کے اندرونی اور ظاہری حالات سے واقفیت اور اس پر پوری قدرت ہے، اور فرمایا کہ مگر تم ہمارے اس قرب کو اور مرنے والے کے زیر تصرّف ہونے کو آنکھوں سے نہیں دیکھتے، خلاصہ یہ ہے کہ تم سب مل کر اس کی زندگی اور روح کی حفاظت چاہتے ہو مگر تمہاری بات نہیں چلتی، ہم اپنے علم و قدرت کے اعتبار سے اس کے زیادہ قریب ہیں، وہ ہمارے زیر تصرف اور مشیت وحکم کے تابع ہے، جس لمحہ میں اس کی روح نکالنا ہم طے کرچکے ہیں، اس کو کوئی روک نہیں سکتا، اس مثال کو سامنے کرکے ارشاد

ہوتا ہے کہ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ مرنے کے بعد تمہیں زندہ نہیں کیا جا سکتا، اور تم اتنے قوی اور بہادر ہو کہ خدا تعالیٰ کی گرفت سے باہر ہو تو ذرا اپنی قوت و قدرت کا امتحان یہیں کر دیکھو کہ اس مرنے والے کی روح کو نکلنے سے بچا لو، یا نکلنے کے بعد اس میں لوٹا دو، اور جب تم سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا تو پھر اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کی گرفت سے باہر سمجھنا اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے سے انکار کرنا کس قدر بے عقلی کی علامت ہے۔

فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ، سابقہ آیات میں مختلف دلائل اور مختلف عنوانات سے یہ واضح کر دیا گیا کہ دنیا کی موجودہ زندگی کا ایک روز ختم ہو جانا اور مرنے کے وقت سب عزیزوں، دوستوں، طبیبوں کا عاجز ہو جانا روز مشاہدہ میں آتا ہے اسی طرح اس کو بھی یقینی سمجھو کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر اپنے اعمال کا حساب بھی دینا ہے، اور حساب کے بعد جزاء و سزاء بھی یقینی ہے، اور جزاء و سزاء میں کل مخلوق کا تین گروہوں میں تقسیم ہو جانا اور ہر ایک کی جزاء الگ الگ ہونا جو شروع سورت میں بیان ہو چکا ہے، اس کا اجمال پھر یہاں ذکر کر دیا گیا کہ مرنے کے بعد اگر یہ شخص مقربین یعنی سابقین کے گروہ میں سے ہے تو راحت ہی راحت آرام ہی آرام ہے، اور اگر سابقین مقربین میں نہیں مگر اصحاب الیمین یعنی عام مؤمنین صالحین میں سے ہے تو بھی جنت کی نعمتوں سے سرفراز ہوگا، اور اگر تیسرے گروہ یعنی اصحاب شمال کفار و مشرکین میں سے ہوا تو جہنم کی آگ اور کھولتے ہوئے پانی سے اس کو سابقہ پڑے گا، آخر میں فرمایا:۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ، یعنی یہ جزاء و سزاء جس کا ذکر اوپر ہوا ہے حق اور بالکل یقینی امر ہے، اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں،

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ۝ ختم سورۃ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ آپ اپنے رب کے نام کی تسبیح پڑھتے رہئے، یعنی اس کی پاکی تمام اُن چیزوں سے جو اس کے لائق شان ہیں بیان کرتے رہئے، اس میں نماز کی تسبیحات بھی داخل ہیں اور خارج نماز کی تسبیحات بھی، اور خود نماز کو بھی بعض اوقات تسبیح سے تعبیر کر دیا جاتا ہے تو یہ حکم نماز کے اہتمام کا بھی ہو گیا، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

تمّت

سُوْرَةُ الْوَاقِعَةِ بِحَمْدِ اللّٰهِ وَعَوْنِهٖ
لیلۃ الثلاثاء لعشرین من ربیع الثانی
سنۃ ۱۳۹۱ھ ویتلوہ ان شاء اللہ تعالیٰ سورۃ الحدید

سُورَةُ الْحَدِيد

سُوْرَةُ الْحَدِيْدِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ تِسْعٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً وَّاَرْبَعُ رُكُوْعَاتٍ
سورۃ حدید مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی اُنتیس آیتیں ہیں اور چار رکوع،

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے،

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ① لَهٗ
اللہ کی پاکی بولتا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور وہی ہے زبردست حکمتوں والا، اسی کے لئے

مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ②
ہے راج آسمانوں کا اور زمین کا، جلاتا ہے اور مارتا ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے،

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ③
وہی ہے سب سے پہلا اور سب سے پچھلا اور باہر اور اندر اور وہ سب کچھ جانتا ہے،

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى
وہی ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین چھ دن میں پھر قائم ہوا

عَلَى الْعَرْشِ ۚ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ
تخت پر جانتا ہے جو اندر جاتا ہے زمین کے اور جو اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ اُترتا ہے

مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ۭ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا
آسمان سے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں تم ہو، اور اللہ جو تم

تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۴﴾ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ

کرتے ہو اس کو دیکھتا ہے، اسی کے لئے ہے راج آسمانوں کا اور زمین کا اور اللہ ہی تک پہنچتے ہیں

الْاُمُوْرُ ﴿۵﴾ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ؕ وَهُوَ

سب کام، داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور اس کو

عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۶﴾

خبر ہے جیوں کی بات کی،

خلاصۂ تفسیر

اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں سب جو کچھ آسمانوں اور زمین میں (مخلوقات) ہیں (زبان قال سے یا زبانِ حال سے) اور وہ زبردست (اور) حکمت والا ہے اسی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی وہی حیات دیتا ہے اور (وہی) موت دیتا ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے وہی (سب مخلوق سے) پہلے ہے اور وہی (سب کے فنا ذاتی یا صفاتی سے) پیچھے (بھی رہے گا، یعنی اس پر نہ پہلے کبھی عدم طاری ہوا اور نہ آئندہ کسی درجہ میں اس پر عدم طاری ہونے کا امکان ہے، اس لئے سب سے آخر میں وہی ہے) اور وہی (مطلق وجود کے اعتبار سے ازروئے دلائل نہایت) ظاہر ہے اور وہی (کنہِ ذات کے اعتبار سے نہایت) مخفی ہے (یعنی کوئی اس کی ذات کا ادراک نہیں کر سکتا) اور (گو وہ خود تو ایسا ہے کہ مخلوق کو ایک حیثیت سے معلوم ہے اور ایک حیثیت سے غیر معلوم لیکن مخلوق سب من کل الوجوہ اس کو معلوم ہے اور) وہ ہر چیز کا خوب جاننے والا ہے (اور) وہ ایسا (قادر) ہے کہ اس نے آسمان اور زمین کو چھ روز (کی مقدار زمانہ) میں پیدا کیا پھر عرش پر (جو کہ مشابہ ہے تختِ سلطنت کے اس طرح) قائم (اور جلوہ فرما) ہوا (جو اس کی شان کے لائق ہے اور) وہ سب کچھ جانتا ہے جو چیز زمین کے اندر داخل ہوتی ہے (مثلاً بارش) اور جو چیز اس میں سے نکلتی ہے (مثلاً نباتات) اور جو چیز آسمان سے اترتی ہے اور جو چیز اس میں چڑھتی ہے (مثلاً ملائکہ کہ نزول و عروج کرتے ہیں اور مثلاً احکام جن کا نزول ہوتا ہے اور اعمالِ عباد جن کا صعود ہوتا ہے) اور (جس طرح ان چیزوں کا اس کو علم ہے اسی طرح تمہارے تمام احوال کا بھی اس کو علم ہے چنانچہ) وہ (علم و اطلاع کے اعتبار سے) تمہارے ساتھ رہتا ہے خواہ تم لوگ کہیں بھی ہو (یعنی تم کسی جگہ اس سے مخفی نہیں رہ سکتے) اور وہ تمہارے سب اعمال کو بھی دیکھتا ہے اسی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی اور اللہ ہی کی طرف سب امور (جوہریہ و عرضیہ) لوٹ جاویں گے (یعنی قیامت میں پیش ہو جاویں گے، اسی میں توحید کے ساتھ ضمناً قیامت کا بھی اثبات ہو گیا) وہی رات (کے اجزاء) کو دن میں داخل کرتا ہے (جس سے دن بڑا ہو جاتا ہے) اور وہی دن (کے

اجزاء) کو رات میں داخل کرتا ہے (جس سے رات بڑی ہو جاتی ہے) اور (اس قدرت کے ساتھ اس کا علم ایسا ہے کہ) وہ دل کی باتوں (تک) کو جانتا ہے۔

معارف و مسائل

سورۂ حدید کی بعض خصوصیات پانچ سورتوں کو حدیث میں مُسَبِّحَات سے تعبیر کیا گیا ہے، جن کے شروع میں سَبَّحَ یا یُسَبِّحُ آیا ہے، ان میں سے پہلی یہ سورت حدید ہے، دوسری حشر، تیسری صف، چوتھی جمعہ، پانچویں تغابن، ابوداؤد، ترمذی، نسائی میں حضرت عرباض بن ساریہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو سونے سے پہلے یہ مسبّحات پڑھا کرتے تھے، اور آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ان میں ایک آیت ایسی ہے جو ہزار آیتوں سے افضل ہے، ابن کثیرؒ نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ وہ افضل آیت سورۂ حدید کی یہ آیت ہے:
(هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ)۔

ان پانچ سورتوں میں سے تین یعنی حدید، حشر، صف میں تو لفظ سَبَّحَ بصیغہ ماضی آیا ہے، اور آخری دو یعنی جمعہ اور تغابن میں یُسَبِّحُ بصیغۂ مضارع، اس میں اشارہ اس طرف ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور ذکر ہر زمانے ہر وقت ماضی و مستقبل اور حال میں جاری رہنا چاہئے (مظہری)

وساوسِ شیطانیہ کا علاج حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اگر کبھی تمہارے دل میں اللہ تعالیٰ اور دین حق کے معاملے میں شیطان کوئی وسوسہ ڈالے تو یہ آیت آہستہ سے پڑھ لیا کرو: هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (ابن کثیر)

اس آیت کی تفسیر اور اوّلُ و آخرُ، ظاہرُ و باطنُ کے معنی میں حضرات مفسرین کے اقوال دس سے زیادہ منقول ہیں، جن میں کوئی تعارض نہیں، سبھی کی گنجائش ہے، لفظ اوّل کے معنی تو تقریباً متعین ہیں، یعنی وجود کے اعتبار سے تمام موجودات و کائنات سے مقدم اور پہلا ہے، کیونکہ ساری موجودات اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں اس لئے وہ سب سے اوّل ہے، اور آخر کے معنی بعض حضرات نے یہ کئے ہیں کہ تمام موجودات کے فناء ہونے کے بعد بھی وہ باقی رہے گا، جیسا کہ آیت (كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ) میں اس کی تصریح ہے، اور فناء سے مراد عام ہے خواہ فناء و عدم کا وقوع ہو جائے، جیسا قیامت کے روز عام مخلوقات فناء ہو جاوے گی، یا فناء کا وقوع نہ ہو، مگر اس کی فناء و عدم ممکن ہو اور وہ اپنی ذات میں عدم کے خطرہ سے خالی نہ ہو، اس کو موجود ہونے کے وقت بھی فانی کہہ سکتے ہیں، اس کی مثال جنت و دوزخ اور ان میں داخل ہونے والے اچھے برے انسان ہیں کہ اُن کا وجود فنا نہیں ہوگا مگر باوجود وقوعاً فنا نہ ہونے کے امکان و احتمالِ فناء سے پھر بھی خالی نہیں، صرف حق تعالیٰ کی ذات ہے جس پر کسی حیثیت اور کسی مفہوم سے نہ پہلے کبھی عدم طاری ہوا اور نہ آئندہ کبھی اس کا امکان ہے، اس لئے اس کو سب سے آخر کہہ سکتے ہیں۔

اور امام غزالیؒ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ کو آخر باعتبار معرفت کے کہا گیا ہے کہ سب سے آخر معرفت اس کی ہے انسان علم و معرفت میں ترقی کرتا رہتا ہے، مگر یہ سب درجات جو اس کو حاصل ہوتے راستہ کی مختلف منزلیں ہیں اس کی انتہا اور آخری حد حق تعالیٰ کی معرفت ہے (از روح المعانی)

اور ظاہرؔ سے مراد وہ ذات جو اپنے ظہور میں ساری چیزوں سے فائق اور برتر ہو، اور ظہور چونکہ وجود کی فرع ہے، تو جب حق تعالیٰ کا وجود سب موجودات پر فائق اور مقدم ہے اس کا ظہور بھی سب پر فائق ہے کہ اس سے زیادہ اس عالم میں کوئی چیز ظاہر نہیں کہ اس کی حکمت و قدرت کے مظاہر دنیا کے ہر ہر ذرّہ میں نمایاں ہیں'

اور باطنؔ اپنی ذات کی کُنہ اور حقیقت کے اعتبار سے ہے، کہ اس کی حقیقت تک کسی عقل و خیال کی رسائی نہیں ہو سکتی ؎

اے برتر از قیاس و گمان و خیال و وہم — وز ہر چہ دیدہ ایم و شنیدیم و خواندہ ایم
اے بروں از جملہ قال و قیلِ من — خاک بر فرقِ من و تمثیلِ من

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ، یعنی اللہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں بھی ہو،، اس معیّت کی حقیقت اور کیفیت کسی مخلوق کے احاطۂ علم میں نہیں آسکتی، مگر اس کا وجود یقینی ہے، اس کے بغیر انسان کا نہ وجود قائم رہ سکتا ہے نہ کوئی کام اس سے ہو سکتا ہے، اس کی مشیّت و قدرت ہی سے سب کچھ ہوتا ہے، جو ہر حال اور ہر جگہ میں انسان کے ساتھ ہے، واللہ اعلم

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ۭ فَالَّذِيْنَ

یقین لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور خرچ کرو اس میں سے جو تمہارے ہاتھ میں دیا ہے اپنا نائب کر کر، سو جو

اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۷ وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ

لوگ تم میں یقین لائے ہیں اور خرچ کرتے ہیں ان کو بڑا ثواب ہے ، اور تم کو کیا ہوا کہ یقین نہیں لاتے اللہ پر

وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ

اور رسول بلاتا ہے تم کو کہ یقین لاؤ اپنے رب پر اور لے چکا ہے تم سے عہد پکّا اگر ہو تم

مُّؤْمِنِيْنَ ۸ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰي عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ

ماننے والے ، وہی ہے جو اُتارتا ہے اپنے بندے پر آیتیں صاف کہ نکال لائے تم کو

الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۹ وَمَا لَكُمْ اَلَّا

اندھیروں سے اُجالے میں اور اللہ تم پر نرمی کرنیوالا ہے مہربان ، اور تم کو کیا ہوا ہے کہ خرچ

تُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا یَسْتَوِیْ

نہیں کرتے اللہ کی راہ میں اور اللہ ہی کو بچ رہتی ہر شئے آسمانوں اور زمین میں برابر نہیں

مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ

تم میں جس نے کہ خرچ کیا فتح (مکہ) سے پہلے اور لڑائی کی، ان لوگوں کا درجہ بڑا ہے ان سے

الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی ؕ وَاللّٰهُ بِمَا

جو کہ خرچ کریں اس کے بعد اور لڑائی کریں اور سب سے وعدہ کیا ہے اللہ نے خوبی کا اور اللہ کو

تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ﴿۱۰﴾ ع مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ

خبر ہے جو کچھ تم کرتے ہو، کون ہے ایسا کہ قرض دے اللہ کو اچھی طرح پھر وہ اس کو دونا کردے

لَهٗ وَلَهٗۤ اَجْرٌ كَرِیْمٌ ﴿۱۱﴾

اس کے واسطے اور اس کو ملے ثواب عزت کا

ع ۱ ۱۰ ۱۷

خلاصۂ تفسیر

تم لوگ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور (ایمان لاکر) جس مال میں تم کو اس نے دوسروں کا قائم مقام بنایا ہے اس میں سے (اس کی راہ میں) خرچ کرو (اس عنوان ستخلات میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ مال تم سے پہلے اور کسی کے پاس تھا اور اسی طرح تمہارے بعد کسی اور کے ہاتھ میں چلا جاوے گا، بس جب یہ سدا رہنے والی چیز نہیں تو اس کو اس طرح جوڑ جوڑ کر رکھنا کہ ضروری مصرف میں بھی خرچ نہ کیا جاوے حماقت کے سوا کیا ہے) سو (اس حکم کے موافق) جو لوگ تم میں سے ایمان لے آویں اور (ایمان لاکر اللہ کی راہ میں) خرچ کریں اُن کو بڑا ثواب ہوگا، اور (جو لوگ ایمان نہ لاویں ان سے ہم پوچھتے ہیں کہ) تمہارے لئے اس کا کون سبب ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے (اسی میں ایمان بالرسُل بھی آگیا) حالانکہ (دواعی تو یہ ایمان لانے کے موجود ہیں وہ یہ کہ) رسول (صلی اللہ علیہ وسلم جن کی رسالت دلائل سے ثابت ہے) تم کو اس بات کی طرف بُلا رہے ہیں کہ تم اپنے رب پر (اسی کی دی ہوئی تعلیم کے مطابق) ایمان لاؤ (ایک داعی تو یہ ہوا) اور (دوسرا داعی یہ کہ) خود خدا نے تم سے (ایمان لانے کا میثاق اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ میں) عہد لیا تھا (جس کا اجمالی اثر تمہاری فطرت میں بھی موجود ہے، اور اللہ کے رسول جو معجزات اور دلائل لیکر آئے انھوں نے بھی اس کی یاد دہانی کی سو) اگر تم کو ایمان لانا ہو (تو یہ دواعی کافی ہیں ورنہ پھر ایمان لانے کے لئے کس داعی کا انتظار ہے، کقولہ تعالیٰ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰیٰتِهٖ یُؤْمِنُوْنَ، آگے اس مضمون وَالرَّسُوْلُ الخ

کی اور شرح ہے کہ) وہ ایسا (رحیم) ہے کہ اپنے بندۂ (خاص محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر صاف صاف آیتیں بھیجتا ہے (جو حسنِ عبارت اور اعجاز خاص کی وجہ سے مقصود پر واضح دلالت کرتی ہے) تاکہ وہ (بندۂ خاص) تم کو (کفر و جہل کی) تاریکیوں سے (ایمان اور علم حقائق کی) روشنی کی طرف لاوے (کقولہ تعالیٰ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ) اور بے شک اللہ تمہارے حال پر بڑا شفیق مہربان ہے (کہ اس نے ایسا اندھیروں سے نکالنے والا تمہاری طرف بھیجا) اور (اس مضمون میں تو ایمان نہ لانے پر سوال تھا، اب اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے پر سوال ہے کہ ہم پوچھتے ہیں کہ) تمہارے لئے اس کا کون سبب ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے حالانکہ (اس کا بھی ایک قوی داعی ہے وہ یہ کہ) سب آسمان و زمین اخیر میں اللہ ہی کا رہ جاوے گا (جب سب مالک مرجاویں گے اور وہی رہ جاوے گا پس جب سب مال ایک روز چھوڑنا ہے تو خوشی سے کیوں نہ دیا جاوے کہ ثواب بھی ہو، اور آسمان کا ذکر کرنا باوجودیکہ کوئی مخلوق اس کی مالک نہیں شاید اس نکتہ کے لئے ہو کہ جیسے آسمان بلاشرکت اس کی ملک ہے اسی طرح زمین بھی حقیقت کے اعتبار سے تو فی الحال بھی اسکی ملک ہے اور آخر کار ظاہری طور پر بھی اسی کی ملک رہ جاوے گی، یہ مضمون لفظ مستخلفین کی شرح کے طور پر ہو گیا آگے خرچ کرنے والوں کے درجات کا تفاضل بتلاتے ہیں کہ گو خرچ کرنا بوجہ مامور بہ ہونے کے ہر ایک کے لئے جو ایمان لاکر خرچ کرے موجبِ اجر ہے، لیکن پھر بھی تفاوت ہے وہ یہ کہ) جو لوگ فتح مکہ سے پہلے (فی سبیل اللہ) خرچ کر چکے اور (فی سبیل اللہ) لڑ چکے (اور جو کہ بعد فتح مکہ کے لڑے اور خرچ کیا دونوں برابر نہیں (بلکہ) وہ لوگ درجہ میں ان لوگوں سے بڑے ہیں جنھوں نے (فتح مکہ کے) بعد میں خرچ کیا اور لڑے اور (یوں) اللہ تعالیٰ نے بھلائی (یعنی ثواب) کا وعدہ سب سے کر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے (اس لئے ثواب دونوں وقت کے عمل پر دیں گے، اس لئے جن لوگوں کو موقع فتح مکہ کے قبل خرچ کا نہیں ملا ہم ان کو بھی ترغیباً کہتے ہیں کہ) کوئی شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح (یعنی خلوص کے ساتھ) قرض کے طور پر دے پھر خدا تعالیٰ اس (دیئے ہوئے ثواب) کو اس شخص کے لئے بڑھاتا چلا جاوے اور (مضاعفت کے ساتھ) اس کے لئے اجر پسندیدہ (تجویز کیا گیا) ہے (مضاعفت سے تو مقدار بڑھا دینے کو بیان کیا گیا اور لفظ کریم سے اس جزاء کی کیفیت بہتر ہونے کی طرف اشارہ ہے)۔

معارف و مسائل

وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ، اس سے میثاقِ ازل بھی مراد ہو سکتا ہے، جب کہ حق تعالیٰ نے مخلوقات کے پیدا ہونے سے پہلے ہی وجود میں آنے والی تمام ارواح کو جمع کر کے ان سے ربوبیت یعنی اللہ تعالیٰ کے رب العالمین ہونے کا اقرار اور عہد لیا تھا جس کا ذکر قرآن میں (اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى) کے الفاظ سے آیا ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میثاق سے وہ عہد و میثاق مراد ہو جو پچھلے انبیاء اور ان کی امتوں سے

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور ان کی مدد کرنے کے متعلق لیا گیا ہے، جس کا ذکر قرآن کریم کی اس آیت میں ہے (ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝)

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ، یعنی اگر تم مؤمن ہو، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کلام اُن کفار سے ہو رہا ہے جن کے مؤمن نہ ہونے پر تنبیہ اس سے پہلے آ چکی ہے، وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ، پھر ان کو یہ کہنا کیسے درست ہوگا کہ "اگر تم مؤمن ہو"

جواب یہ ہے کہ کفار و مشرکین بھی اللہ تعالیٰ پر تو ایمان کے مدعی تھے، بتوں کے بارے میں یہ کہتے تھے کہ ہم ان کی پرستش اس لئے کرتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہماری سفارش کریں گے مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى، تو مطلب آیت کا یہ ہوا کہ تم جو اللہ پر ایمان رکھنے کے مدعی ہو اگر تمہارا یہ دعویٰ سچا ہے تو پھر ایمان باللہ کی صحیح اور معتبر صورت اختیار کرو جو اس کے بغیر نہیں ہوسکتی کہ اللہ پر ایمان لانے کے ساتھ اس کے رسول پر بھی ایمان لاؤ۔

وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، میراث اصل میں اُس ملکیت کو کہا جاتا ہے جو پچھلے مالک کے انتقال کے بعد اس کے بعد زندہ رہنے والے وارثوں کو ملا کرتی ہے، اور یہ ملک جبری ہوتی ہے مرنے والا چاہے یا نہ چاہے، جو وارث ہوتا ہے ملکیت اس کی طرف منتقل ہو جاتی ہے، یہاں حق تعالیٰ کی ملکیتِ آسمان و زمین کو میراث کے لفظ سے تعبیر کرنے میں یہ حکمت ہے کہ تم چاہو یا نہ چاہو جس جس چیز کے مالک آج تم سمجھے جاتے ہو وہ سب بالآخر حق تعالیٰ کی ملکیتِ خاصہ میں منتقل ہو جائے گی، مراد یہ ہے کہ اگرچہ حقیقی مالکِ تمام اشیاءِ عالم کا پہلے بھی حق تعالیٰ ہی تھا مگر اس نے اپنے فضل سے کچھ اشیاء کی ملکیت تمہارے نام کردی تھی، اور اب وہ ظاہری ملکیت بھی تمہاری باقی نہیں رہے گی، بلکہ حقیقۃً اور ظاہراً ہر طرح اللہ تعالیٰ ہی کی مِلک ہو جائے گی، اس لئے اس وقت جبکہ تمہیں ظاہری ملکیت حاصل ہے اگر تم اللہ کے نام پر خرچ کردو گے تو اس کا بدل تمہیں آخرت میں مل جائے گا، اس طرح گویا اللہ کی راہ میں خرچ کی ہوئی چیز کی ملکیت تمہارے لئے دائمی ہو جائے گی۔

ترمذی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک روز ہم نے ایک بکری ذبح کی جس کا اکثر حصہ تقسیم کردیا، صرف ایک دست گھر کے لئے رکھ لیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے دریافت کیا کہ اس بکری کے گوشت میں سے تقسیم کے بعد کیا باقی رہا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ایک دست رہ گیا ہے، تو آپ نے فرمایا کہ یہ ساری بکری باقی رہی صرف یہ دست باقی نہیں رہا، جس کو تم باقی سمجھ رہی ہو، کیونکہ ساری بکری اللہ کی راہ میں خرچ کردی گئی، وہ اللہ کے یہاں تمہارے لئے باقی رہے گی اور یہ دست جو اپنے

کھانے کے لئے رکھا ہے، اس کا آخرت میں کوئی معاوضہ نہیں اس لئے یہ یہیں فنا ہو جائے گا، (مظہری)

گذشتہ آیات میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی تاکید بیان فرمانے کے بعد اگلی آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جو کچھ جس وقت بھی خرچ کیا جائے ثواب تو ہر ایک پر ہر ایک حال میں ملے گا، لیکن ثواب کے درجات میں ایمان و اخلاص اور مسابقت کے اعتبار سے فرق ہوگا، اس کے لئے فرمایا:

لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ، یعنی مسلمانوں میں فی سبیل اللہ مال خرچ کرنے والے دو قسم کے لوگ ہیں، ایک وہ جو فتح مکہ سے پہلے ایمان لے آئے، اور مومن ہو کر اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا، دوسرے وہ جو فتح مکہ کے بعد جہاد میں شریک ہوئے اور فی سبیل اللہ خرچ میں بھی، یہ دونوں قسمیں اللہ کے نزدیک برابر نہیں، بلکہ درجاتِ ثواب کے اعتبار سے ان میں تفاضل ہے، فتح مکہ سے پہلے ایمان لانے والے اور جہاد کرنے والے اور خرچ کرنے والے درجۂ ثواب کے اعتبار سے بڑھے ہوئے ہیں، دوسری قسم سے یعنی جن لوگوں نے فتح مکہ کے بعد اسلامی خدمات میں شرکت کی،

فتح مکہ کو صحابۂ کرامؓ کے درجات متعین کرنے کے لئے حد فاصل قرار دینے کی حکمت

آیاتِ مذکورہ میں حق تعالیٰ نے صحابۂ کرامؓ کے ۲ دو طبقے قرار دیئے ہیں، ایک وہ جنھوں نے فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہو کر اسلامی خدمات میں حصہ لیا، دوسرے وہ لوگ جنھوں نے فتح مکہ کے بعد یہ کام کیا ہے، پہلے لوگوں کا مقام بہ نسبت دوسرے لوگوں کے اللہ تعالیٰ کے نزدیک بلند ہونے کا اعلان اس آیت میں فرمایا گیا ہے۔

فتح مکہ میں ان دونوں طبقوں میں حدِ فاصل قرار دینے کی ایک بڑی حکمت تو یہ ہے کہ فتح مکہ مکرمہ سے پہلے پہلے سیاسی حالات اور اسبابِ ظاہرہ کے اعتبار سے مسلمانوں کی بقاء و فناء اور اسلام کے آگے بڑھنے پھیلنے یا بہت سی تحریکات کی طرح مُردہ ہو جانے کے احتمالات ظاہر بیں نظروں میں یکساں انداز سے گردش کرتے رہتے تھے، دنیا کے ہوشیار لوگ کسی ایسی جماعت یا تحریک میں شرکت نہیں کیا کرتے جس کے شکست کھا جانے یا ختم ہو جانے کا خطرہ سامنے ہو، انجام کا انتظار کرتے رہتے ہیں، جب کامیابی کے امکانات روشن ہو جائیں تو شریک ہو جاتے ہیں، اور بعض لوگ اگرچہ اس کو حق و صحیح سمجھتے ہوں لیکن مخالفین کی ایذاؤں کے خوف اور اپنے ضعف کے سبب شرکت کرنے کی ہمت نہیں کرتے، لیکن باعزم و ہمت لوگ جو کسی نظریہ اور عقیدہ کو صحیح اور حق سمجھ کر قبول کرتے ہیں وہ فتح و شکست اور جماعت کی قلت و کثرت پر نظر کئے بغیر اس کے قبول کی طرف دوڑتے ہیں،

فتح مکہ سے پہلے جو لوگ ایمان لائے ان کے سامنے مسلمانوں کی قلت اور ضعف اور اس کی وجہ سے مشرکین کی ایذاؤں کا سلسلہ تھا خصوصاً ابتداءِ اسلام کے وقت کہ اسلام و ایمان کا اظہار کرنا اپنی جان کی بازی لگانے اور اپنے گھر بار کو ہلاکت کے لئے پیش کر دینے کے مرادف تھا، یہ ظاہر ہے

کہ ان حالات میں جنھوں نے اسلام قبول کرکے اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈالا اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت اور دین کی خدمت میں اپنے جان و مال کو لگایا ان کی قوتِ ایمان اور اخلاصِ عمل کو دوسرے لوگ نہیں پہونچ سکتے۔

رفتہ رفتہ حالات بدلتے گئے مسلمانوں کو قوت حاصل ہوتی گئی، یہاں تک کہ مکہ مکرمہ فتح ہو کر پورے عرب پر اسلام کی حکومت قائم ہوگئی، اس وقت جیسا کہ قرآن کریم میں مذکور ہے یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا، یعنی لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج ہو کر داخل ہوں گے اس کا ظہور ہوا کیونکہ بہت سے لوگ اسلام کی حقانیت پر تو یقین رکھتے تھے، مگر اپنے ضعف اور مخالفینِ اسلام کی قوت وشوکت اور ان کی ایذاؤں کے خوف سے اسلام وایمان کا اظہار کرتے ہوئے جھجکتے تھے، اب انکی راہ سے یہ رکاوٹ دور ہوگئی، تو فوج در فوج ہو کر اسلام میں داخل ہوگئے، قرآن کریم کی اس آیت نے ان کا بھی اکرام واحترام کیا ہے، اور ان کے لئے بھی مغفرت ورحمت کا وعدہ دیا ہے، لیکن یہ بتلادیا کہ ان کا درجہ اور مقام ان لوگوں کے برابر نہیں ہوسکتا جنھوں نے اپنی ہمت واولوالعزمی اور قوتِ ایمان کے سبب مخالفتوں اور ایذاؤں کے خوف وخطر سے بالاتر ہو کر اسلام کا اعلان کیا، اور آڑے وقت میں اسلام کے کام آئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عزم وہمت اور قوتِ ایمان کے درجات متعین کرنے کے لئے فتح مکہ سے پہلے اور بعد کے حالات ایک حد فاصل کی حیثیت رکھتے ہیں، اسی لئے آیتِ مذکورہ میں فرمایا کہ یہ دونوں طبقے برابر نہیں ہوسکتے۔

تمام صحابہ کرام کے لئے مغفرت ورحمت کی بشارت اور صحابہ کا باقی امت سے امتیاز

آیاتِ مذکورہ میں اگرچہ صحابہ کرام میں باہمی درجات کا تفاضل ذکر کیا گیا ہے لیکن آخر میں فرمایا وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى، یعنی باوجود باہمی فرق مراتب کے اللہ تعالیٰ نے حُسنیٰ یعنی جنت ومغفرت کا وعدہ سب ہی کے لئے کرلیا ہے' یہ وعدہ صحابہ کرام کے ان دونوں طبقوں کے لئے ہے جنھوں نے فتح مکہ سے پہلے یا بعد میں اللہ کی راہ میں خرچ کیا، اور مخالفینِ اسلام کا مقابلہ کیا، اس میں تقریباً صحابہ کرام کی پوری جماعت شامل ہوجاتی ہے، کیونکہ ایسے افراد تو شاذ ونادر ہی ہوسکتے ہیں جنھوں نے مسلمان ہوجانے کے باوجود اللہ کے لئے کچھ خرچ بھی نہ کیا ہو اور مخالفینِ اسلام کے مقابلہ ومقاتلہ میں بھی شریک نہ ہوئے ہوں، اس لئے قرآن کریم کا یہ اعلانِ مغفرت ورحمت پوری جماعت صحابہ کرام کے لئے عام اور شامل ہے۔

ابن حزمؒ نے فرمایا کہ اس کے ساتھ قرآن کی دوسری آیت سورۃ انبیاء کو ملاؤ جس میں فرمایا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۝ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ

فِيمَا اشْتَهَتْ أَنفُسُهُمْ خَٰلِدُونَ ۝ یعنی جن لوگوں کے لئے ہم نے حسنیٰ کو مقرر کردیا ہے وہ جہنم سے ایسے دور رہیں گے کہ اس کی تکلیف دہ آوازیں بھی اُن کے کانوں تک نہ پہونچیں گی، اور اپنی دلخواہ نعمتوں میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے"،

آیات زیر بحث میں كُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ مذکور ہے اور اس آیت میں جن کے لئے حسنیٰ کا وعدہ ہوا ان کے لئے جہنم کی آگ سے بہت دور رہنے کا اعلان ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ قرآن کریم نے اس کی ضمانت دیدی کہ حضرات صحابہ سابقین و آخرین میں سے کسی سے بھی اگر عمر بھر میں کوئی گناہ سرزد ہو بھی گیا تو وہ اس پر قائم نہ رہے گا توبہ کرلے گا یا پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و نصرت اور دین کی خدمات عظیمہ اور ان کی بے شمار حسنات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرمادے گا، اور ان کی موت اس سے پہلے نہ ہوگی کہ ان کا گناہ معاف ہوکر وہ صاف و بیباق ہوجائیں، یا دنیا کے مصائب و آفات اور زیادہ سے زیادہ برزخ میں کوئی تکلیف ان کے سیئات کا کفارہ ہوجائے۔

اور جن احادیث میں بعض صحابۂ کرام پر مرنے کے بعد عذاب کا ذکر آیا ہے وہ عذاب آخرت و عذاب جہنم کا نہیں برزخی یعنی قبر کا عذاب ہے، یہ کوئی بعید نہیں ہے کہ صحابۂ کرام میں سے اگر کسی سے کوئی گناہ سرزد ہوا اور اتفاقاً توبہ کرکے اس سے پاک ہوجانے کا بھی موقع نہیں ہوا تو ان کو برزخی عذاب کے ذریعہ پاک کردیا جائے گا، تاکہ آخرت کا عذاب اُن پر نہ رہے۔

صحابۂ کرام رضؓ کا مقام قرآن و حدیث سے پہچانا جاتا ہے تاریخی روایات سے نہیں

خلاصہ یہ ہے کہ حضرات صحابۂ کرام عام اُمّت کی طرح نہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُمّت کے درمیان اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ایک واسطہ ہیں، اُن کے بغیر اُمّت کو قرآن پہونچنے کا کوئی راستہ ہے اور نہ معانی قرآن اور تعلیمات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا، اس لئے اسلام میں اُن کا ایک خاص مقام ہے اُن کے مقامات کتبِ تاریخ کی رطب و یابس روایات سے نہیں پہچانے جاتے، بلکہ قرآن و سنت کے ذریعہ پہچانے جاتے ہیں۔

ان میں سے اگر کسی سے کوئی لغزش اور غلطی بھی ہوتی ہے تو اکثر وہ اجتہادی خطا ہوتی ہے جس پر کوئی گناہ نہیں، بلکہ حسب تصریح احادیث صحیحہ ایک اجر ہی ملتا ہے، اور اگر.... فی الواقع کوئی گناہ ہی ہوگیا تو اوّل وہ اُن کے عمر بھر کے اعمالِ حسنہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی نصرت و خدمت کے مقابلہ میں صفر کی حیثیت رکھتا ہے، پھر اُن میں خشیت اور خوفِ خدا کا یہ عالم تھا کہ معمولی سے گناہ سے بھی لرز جاتے اور فوراً توبہ کرتے، اور اپنے نفس پر اس کی سزا جاری کرنے کے لئے کوشش کرتے تھے، کوئی اپنے آپ کو مسجد کے ستون سے باندھ دیتا، اور جب تک توبہ قبول ہوجانے کا یقین نہ ہوجائے بندھا کھڑا رہتا تھا، اور پھر ان میں سے ہر ایک کی حسنات اتنی ہیں کہ وہ خود گناہوں کا کفارہ

ہو جاتی ہیں، اُن سب پر مزید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی خطاؤں کی مغفرت کا عام اعلان اس آیت میں اور دوسری آیات میں فرما دیا، اور صرف مغفرت ہی نہیں بلکہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ فرما کر اپنی رضا کی بھی سند دیدی، اس لئے اُن کے آپس میں جو اختلافات اور مشاجرات پیش آئے اُن کی وجہ سے اُن میں سے کسی کو بُرا کہنا یا اُس پر طعن و تشنیع کرنا قطعاً حرام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق موجب لعنت اور اپنے ایمان کو خطرہ میں ڈالنا ہے۔ نعوذ باللہ منہ

آجکل تاریخ کی جھوٹی سچی، قوی ضعیف روایات کی بناء پر جو بعض لوگوں نے بعض حضرات صحابہ کو موردِ طعن و الزام بنایا ہے، اول تو اس کی بنیاد جو تاریخی روایات پر ہے وہ بنیاد ہی متزلزل ہے، اور اگر کسی درجہ میں اُن روایات کو قابلِ التفات مان بھی لیا جائے تو قرآن و حدیث کے کھلے ہوئے ارشادات کے خلاف اُن کی کوئی حیثیت نہیں رہتی، وہ سب مغفور ہیں۔

صحابہ کرام کے بارے میں پوری امت کا اجماعی عقیدہ

یہ ہے کہ تمام صحابہ کرام کی تعظیم و تکریم، ان سے محبت رکھنا، ان کی مدح و ثناء کرنا واجب ہے، اور ان کے آپس میں جو اختلافات اور مشاجرات پیش آئے اُن کے معاملے میں سکوت کرنا، کسی کو موردِ الزام نہ بنانا لازم ہے، عقائدِ اسلامیہ کی تمام کتابوں میں اس اجماعی عقیدہ کی تصریحات موجود ہیں، امام احمدؒ کا رسالہ جو بروایت اصطخری معروف ہے اس کے بعض الفاظ یہ ہیں:-

لَا يَجُوْزُ لِاَحَدٍ اَنْ يَّذْكُرَ شَيْئًا مِّنْ مَّسَاوِيْهِمْ وَلَا يَطْعَنُ عَلٰى اَحَدٍ مِّنْهُمْ بِعَيْبٍ وَلَا نَقْصٍ فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ وَجَبَ تَاْدِيْبُهٗ، (شرح العقيدة الواسطية معروف به الدرة المضية، ص ۳۸۹)

"کسی کے لئے جائز نہیں کہ صحابہ کرام کی کسی برائی کا ذکر کرے، یا اُن میں سے کسی پر طعن کرے یا کوئی عیب یا نقصان ان کی طرف منسوب کرے اور جو ایسا کرے اس کو سزا دینا واجب ہے"۔

اور ابن تیمیہؒ نے الصارم المسلول میں صحابہ کرام کے متعلق فضائل و خصوصیات کی بہت سی آیات اور روایاتِ حدیث لکھنے کے بعد لکھا ہے:-

وَهٰذَا مِمَّا لَا نَعْلَمُ فِيْهِ خِلَافًا بَيْنَ اَهْلِ الْفِقْهِ وَالْعِلْمِ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالتَّابِعِيْنَ لَهُمْ بِاِحْسَانٍ وَسَائِرِ اَهْلِ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ فَاِنَّهُمْ مُجْمِعُوْنَ عَلٰى اَنَّ الْوَاجِبَ الثَّنَاءُ

جہاں تک ہمارے علم میں ہے ہم اس معاملہ میں علماء، فقہاء، صحابہ و تابعین اور تمام اہل السنۃ والجماعۃ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں پاتے کیونکہ سب کا اس پر اجماع ہے کہ امت پر واجب یہ ہے کہ سب صحابہ کرام کی مدح و ثناء کرے اور ان کے لئے استغفار کرے

عَلَيْهِمْ وَالْاِسْتِغْفَارُ لَهُمْ وَالتَّرَحُّمُ عَلَيْهِمْ وَالتَّرَضِّيْ عَنْهُمْ وَاعْتِقَادُ مَحَبَّتِهِمْ وَمُوَالَاتِهِمْ وَعُقُوْبَةُ مَنْ اَسَاءَ فِيْهِمُ الْقَوْلَ

اور ان کو اللہ کی رحمت و رضا کے ساتھ ذکر کرے، اُن کی محبت اور دوستی پر ایمان رکھے، اور جو اُن کے معاملہ میں بے ادبی کرے اس کو سزا دے "

اور ابن تیمیہؒ نے شرح عقیدہ واسطیہ میں تمام اُمتِ محمدیہ اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ بیان کرتے ہوئے مشاجراتِ صحابہ کے متعلق لکھا ہے :-

وَيُمْسِكُوْنَ عَمَّا شَجَرَ بَيْنَ الصَّحَابَةِ وَيَقُوْلُوْنَ هٰذِهِ الْاٰثَارُ الْمَرْوِيَّةُ فِيْ مَسَاوِيْهِمْ مِنْهَا مَا هُوَ كَذِبٌ وَّمِنْهَا مَا زِيْدَ فِيْهَا وَنُقِصَ وَغُيِّرَ وَجْهُهٗ وَالصَّحِيْحُ مِنْهُ هُمْ فِيْهِ مَعْذُوْرُوْنَ اِمَّا مُجْتَهِدُوْنَ مُصِيْبُوْنَ وَاِمَّا مُجْتَهِدُوْنَ مُخْطِئُوْنَ، وَهُمْ مَعَ ذٰلِكَ لَا يَعْتَقِدُوْنَ اَنَّ كُلَّ وَاحِدٍ مِّنَ الصَّحَابَةِ مَعْصُوْمٌ مِّنْ كَبَائِرِ الْاِثْمِ وَصَغَائِرِهٖ بَلْ يَجُوْزُ عَلَيْهِمُ الذُّنُوْبُ فِي الْجُمْلَةِ وَلَهُمْ مِّنَ الْفَضَائِلِ وَالسَّوَابِقِ مَا يُوْجِبُ مَغْفِرَةَ مَا يَصْدُرُ مِنْهُمْ حَتّٰى اِنَّهُمْ يُغْفَرُ لَهُمْ مِّنَ السَّيِّئَاتِ مَا لَا يُغْفَرُ لِمَنْ بَعْدَهُمْ

"اہل السنۃ والجماعۃ سکوت اختیار کرتے ہیں اُن اختلافی معاملات سے جو صحابہ کرام کے درمیان پیش آئے اور کہتے ہیں کہ جو روایات اُن میں سے کسی پر عیب لگانیوالی ہیں اُن کی حقیقت یہ ہے کہ بعض تو بالکل جھوٹ ہیں، اور بعض میں کمی بیشی کرکے ان کی اصل حقیقت بگاڑ دی گئی ہے، اور جو کچھ صحیح ہے وہ اس میں معذور ہیں کیونکہ (انھوں نے جو کچھ کیا اللہ کے لئے کیا اجتہاد سے کیا) اس اجتہاد میں یا وہ صحیح بات پر تھے (تو دوہرے ثواب کے مستحق تھے) یا خطا پر تھے (تو معذور اور ایک ثواب کے مستحق تھے) ان تمام باتوں کے ساتھ وہ اس کے معتقد نہیں کہ ہر صحابی چھوٹے بڑے گناہوں سے معصوم ہو بلکہ ان سے گناہ کا صدور ممکن ہے، مگر ان کے فضائل اور اسلام کی عظیم الشان خدمات ایسی ہیں جو اُن سب کی مغفرت کی مقتضی ہیں یہاں تک کہ ان کی مغفرت و معافی اتنی وسیع ہوگی جو امّت میں دوسروں کے لئے نہ ہوگی "

مقامِ صحابہ اور اُن کے درجات و فضائل پر مفصّل بحث سورۂ فتح کی آیات (وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ الخ) کے تحت گذر چکی ہے، اور احقر نے اس بحث پر ایک مفصّل رسالہ (مقامِ صحابہ) کے نام سے لکھ دیا ہے جو جداگانہ شائع ہو چکا ہے جس میں عدالتِ صحابہ، مشاجراتِ صحابہ اور ان کے بارے میں تاریخی روایات کی حیثیت اور درجہ کی مکمل تحقیق ہے اس کو دیکھ لیا جائے۔

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُورُهُم بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَ

جس دن تو دیکھے ایمان والے مردوں کو اور ایمان والی عورتوں کو دوڑتی ہوئی چلتی ہے انکی روشنی انکے آگے اور

بِأَيْمَانِهِم بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِينَ

ان کے داہنے خوش خبری ہے تم کو آج کے دن باغ ہیں کہ نیچے بہتی ہیں جن کے نہریں سدا رہو

فِيهَا ۚ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿۱۲﴾ يَوْمَ يَقُولُ الْمُنٰفِقُونَ وَالْمُنٰفِقٰتُ

ان میں، یہ جو ہے یہی ہے بڑی مراد ملنی، جس دن کہیں گے دغاباز مرد اور عورتیں

لِلَّذِينَ اٰمَنُوا انظُرُونَا نَقْتَبِسْ مِن نُّورِكُمْ ۚ قِيلَ ارْجِعُوا وَرَاءَكُمْ

ایمان والوں کو راہ دیکھو ہماری ہم بھی روشنی لے لیں تمہارے نور سے کوئی کہے گا لوٹ جاؤ پیچھے،

فَالْتَمِسُوا نُورًا ۖ فَضُرِبَ بَيْنَهُم بِسُورٍ لَّهُ بَابٌ ۖ بَاطِنُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ

پھر ڈھونڈھ لو روشنی پھر کھڑی کردی جائے ان کے بیچ میں ایک دیوار جس میں ہوگا دروازہ اسکے اندر رحمت ہوگی

وَظَاهِرُهُ مِن قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿۱۳﴾ يُنَادُونَهُمْ أَلَمْ نَكُن مَّعَكُمْ ۖ قَالُوا

اور باہر کی طرف عذاب، یہ اُن کو پکاریں گے کیا ہم نہ تھے تمھارے ساتھ کہیں گے

بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنتُمْ أَنفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ

کیوں نہیں لیکن تم نے بچلا دیا اپنے آپ کو اور راہ دیکھتے رہے اور دھوکے میں پڑے اور بہک گئے

الْأَمَانِيُّ حَتّٰى جَاءَ أَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُم بِاللّٰهِ الْغَرُورُ ﴿۱۴﴾ فَالْيَوْمَ لَا

اپنے خیالوں پر یہاں تک کہ آپہنچا حکم اللہ کا اور تم کو بہکا دیا اللہ کے نام سے اس دغاباز نے، سو آج تم سے

يُؤْخَذُ مِنكُمْ فِدْيَةٌ وَلَا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ مَأْوٰىكُمُ النَّارُ ۖ هِيَ

قبول نہ ہوگا فدیہ دینا اور نہ منکروں سے تم سب کا گھر دوزخ ہے وہی ہے

مَوْلٰىكُمْ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿۱۵﴾ أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ اٰمَنُوا أَن تَخْشَعَ

رفیق تمھاری اور بری جگہ جا پہنچے، کیا وقت نہیں آیا ایمان والوں کو کہ گڑگڑائیں ان کے

قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ

دل اللہ کی یاد سے اور جو اُترا ہے سچا دین اور نہ ہوں اُن جیسے جن کو

أُوتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَكَثِيْرٌ

کتاب ملی تھی اس سے پہلے پھر دراز گذری اُن پر مدت پھر سخت ہو گئے ان کے دل اور بہت

مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۱۶﴾ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ قَدْ بَيَّنَّا

اُن میں نافرمان ہیں ، جان رکھو کہ اللہ زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے مرجانے کے بعد ہم نے کھولکر

لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ

سنا دیئے تم کو پتے اگر تم کو سمجھ ہے ، تحقیق جو لوگ خیرات کرنے والے ہیں مرد اور عورتیں

وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۸﴾ وَالَّذِيْنَ

اور قرض دیتے ہیں اللہ کو اچھی طرح اُن کو ملتا ہے دونا اور ان کو ثواب ہے عزت کا ، اور جو لوگ

اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ڰ وَالشُّهَدَاۗءُ عِنْدَ

یقین لائے اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر وہی ہیں سچے ایمان والے اور لوگوں کا احوال بتلانے والے

رَبِّهِمْ ۭ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ

اپنے رب کے پاس ان کے واسطے ہے اُن کا ثواب اور انکی روشنی ، اور جو لوگ منکر ہوئے اور جھٹلایا ہماری باتوں

اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۹﴾

کو وہ ہیں دوزخ کے لوگ ،

خلاصۂ تفسیر

(وہ دن بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جس دن آپ مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو دیکھیں گے کہ ان کا نور اُن کے آگے اور اُن کے داہنی طرف دوڑتا ہوگا (یہ نور پل صراط پر سے گذرنے کے لئے ان کے ہمراہ ہوگا، اور ایک روایت میں ہے کہ بائیں طرف بھی ہوگا، کذافی الدرالمنثور، تو تخصیص داہنی طرف کی شاید اس لئے ہو کہ اس طرف نور زیادہ قوی ہو، اور نکتہ اس تخصیص میں شاید یہ ہو کہ یہ علامت ہو ان کے نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں دیئے جانے کا، اور سامنے نور ہونا تو ایسے موقع پر عادتِ عامّہ ہے) اور ان سے کہا جاویگا کہ آج تم کو بشارت ہے ایسے باغوں کی جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، (اور) یہ بڑی کامیابی ہے (ظاہر یہ ہے کہ یہ بات بھی اسی وقت کہی جاوے گی، اور اس وقت بطور خبر دینے کے کہی جارہی ہے، اور بُشْرٰىكُمُ کہنے والے غالباً فرشتے ہیں، لقولہ تعالیٰ تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ اَلَّا

تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا الخ یا حق تعالیٰ خود اس خطاب سے مشرف فرما دیں اور یہ وہ دن ہوگا)
جس روز منافق مرد اور منافق عورتیں مسلمانوں سے (پل صراط پر) کہیں گے کہ (ذرا) ہمارا انتظار کرلو کہ ہم بھی تمہارے
نور سے کچھ روشنی حاصل کرلیں (یہ اس وقت ہوگا جبکہ مسلمان اپنے اعمال وایمان کی برکت سے بہت آگے بڑھ جاوینگے
اور منافقین جو کہ پل صراط پر مسلمانوں کے ساتھ چڑھائے جاویں گے پیچھے اندھیرے میں رہ جاویں گے، خواہ اُن کے
پاس پہلے ہی سے نور نہ ہو، یا جیساکہ دُرِ منثور کی ایک روایت میں ہے کہ ان کے پاس بھی قدرے نور ہو اور پھر وہ
گُل ہو جاوے، اور حکمت عطاءِ نور میں یہ ہو کہ دنیا میں ظاہری اعمال کے اعتبار سے وہ مسلمانوں کے ساتھ رہا کرتے
تھے مگر باعتبار اعتقاد کے دل سے جُدا تھے، اس لئے اُن کو اوّلاً اُن اعمالِ ظاہری کی وجہ سے نور مل جاوے مگر پھر دل
میں ایمان وتصدیق نہ ہونے کے سبب وہ نور مفقود ہو جاوے، ونیز ان کے خداع اور دھوکہ کی جزا بھی یہی ہو
کہ اوّل ان کو نور مل گیا پھر خلافِ گمان مفقود ہوگیا، غرض وہ مسلمانوں سے ٹھہرنے کو کہیں گے) اُن کو جواب دیا جاویگا
(یہ جواب دینے والے خواہ فرشتے ہوں یا مؤمنین ہوں) کہ تم اپنے پیچھے لوٹ جاؤ پھر (وہاں سے) روشنی تلاش کرو
(حسبِ روایت درمنثور اس پیچھے سے مراد وہ جگہ ہے جہاں ظلمتِ شدیدہ کے بعد پل صراط پر چڑھنے کے وقت نور
تقسیم ہوا تھا، یعنی نور تقسیم ہونے کی جگہ وہ ہے وہاں جاکر لو، چنانچہ وہ اُدھر جاویں گے جب وہاں بھی کچھ نہ ملے گا،
پھر ادھر ہی آویں گے) پھر (مسلمانوں کے پاس نہ پہونچ سکیں گے بلکہ) اُن (فریقین) کے درمیان میں ایک دیوار
قائم کردی جاوے گی جس میں ایک دروازہ (بھی) ہوگا (جس کی کیفیت یہ ہے کہ) اس کے اندرونی جانب
میں رحمت ہوگی اور بیرونی جانب کی طرف عذاب ہوگا (حسبِ روایت درمنثور یہ دیوار اعراف ہے، اور اندرونی جانب
سے مؤمنین کی طرف والی جانب اور بیرونی جانب سے مراد کافروں کی طرف والی جانب اور رحمت سے مراد جنّت
اور عذاب سے مراد دوزخ ہے، اور شاید یہ دروازہ بات چیت کے لئے ہو، یا اسی دروازہ میں سے جنّت کا راستہ ہو
اور زیادہ تحقیق اعراف کی سورۃ اعراف کے رکوع پنجم میں گذری ہے، غرض جب اُن میں اور مسلمانوں میں
دیوار حائل ہو جاوے گی اور یہ خود تاریکی میں رہ جاویں گے تو اس وقت) یہ (منافق) ان (مسلمانوں) کو پکاریں گے
کہ کیا (دنیا میں) ہم تمہارے ساتھ نہ تھے (یعنی اعمال وطاعات میں تمہارے شریک رہا کرتے تھے، تو آج بھی رفاقت
کرنا چاہئے) وہ (مسلمان) کہیں گے کہ (ہاں) تھے تو سہی لیکن (ایسا ہونا کس کام کا کیونکہ محض ظاہر میں ساتھ
تھے اور باطنی حالت تمہاری یہ تھی کہ) تم نے اپنے کو گمراہی میں پھنسا رکھا تھا اور (وہ گمراہی یہ تھی کہ تم پیغمبر
اور مسلمانوں سے عداوت رکھتے تھے، اور اُن پر حوادث واقع ہونے کے) تم منتظر (اور متمنّی) رہا کرتے تھے
اور (اسلام کے حق ہونے میں) تم شک رکھتے تھے اور تم کو تمہاری بیہودہ تمنّاؤں نے دھوکہ میں ڈال
رکھا تھا، یہاں تک کہ تم پر خدا کا حکم آپہنچا (مراد بیہودہ تمنّاؤں سے یہ ہے کہ اسلام مٹ جاوے گا اور یہ کہ ہمارا
مذہب حق ہے اور موجب نجات ہے، اور مراد حکم خدا سے موت ہے، یعنی عمر بھر اُن ہی کفریات پر مصر رہے
توبہ بھی نہ کی) اور تم کو دھوکہ دینے والے (یعنی شیطان) نے اللہ کے ساتھ دھوکہ میں ڈال رکھا تھا،

رد ہ یہ کہ اللہ تعالیٰ ہم پر مواخذہ نہ کرے گا، حاصل مجموعہ کا یہ ہے کہ ان کفریات کی وجہ سے تمھاری معیت ظاہریہ نجات کے لئے کافی نہیں) غرض آج نہ تم سے کوئی معاوضہ لیا جاوے گا اور نہ کافروں سے (یعنی اوّل تو معاوضہ دینے کے واسطے تمھارے پاس کوئی چیز ہے نہیں، لیکن بالفرض اگر ہوتی بھی تب بھی مقبول نہ ہوتی، کیونکہ یہ دارالجزاء ہے دارالعمل نہیں اور) تم سب کا ٹھکانا دوزخ ہے وہی تمھاری (ہمیشہ کے لئے) رفیق ہے اور وہ (واقعی) بُرا ٹھکانا ہے (یہ قول فَالْيَوْمَ الخ یا تو مؤمنین کا ہو یا حق تعالیٰ کا، اس تمام تر بیان سے ثابت ہوگیا کہ جس ایمان میں طاعاتِ ضروریہ کی کمی ہو وہ گو کالعدم نہیں، لیکن کامل بھی نہیں، اس لئے اگلی آیات میں اس کی تکمیل کے لئے بصورت عتاب کے مسلمانوں کو حکم فرماتے ہیں کہ) کیا ایمان والوں (میں سے جو لوگ طاعاتِ ضروریہ میں کمی کرتے ہیں جیسے گناہگار مسلمانوں کی حالت ہوتی ہے تو کیا ان) کے لئے (اب بھی) اس بات کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل خدا کی نصیحت کے اور جو دینِ حق (منجانب اللہ) نازل ہوا ہے (کہ وہی نصیحتِ خداوندی ہے) اس کے سامنے جھک جاویں (یعنی دل سے عزم پابندی طاعاتِ ضروریہ وترکِ معاصی کا کرلیں اور اس کو خشوع بمعنی سکون اس لئے کہا کہ دل کا حالتِ مطلوبہ پر رہنا سکون ہے اور معصیت کی طرف جانا مشابہ حرکت کے ہے) اور (خشوع بالمعنی المذکور میں دیر کرنے سے جس کا حاصل توبہ میں دیر کرنا ہے وہ) ان لوگوں کی طرح نہ ہوجائیں جن کو ان کے قبل کتاب (آسمانی) ملی تھی (یعنی یہود ونصاریٰ کہ انھوں نے بھی برخلاف مقتضائے اپنی کتابوں کے شہوات ومعاصی میں انہماک شروع کیا) پھر (اسی حالت میں) اُن پر ایک زمانۂ دراز گذر گیا (اور توبہ نہ کی) پھر (اس توبہ نہ کرنے سے) ان کے دل (خوب ہی) سخت ہوگئے (کہ ندامت وملامت اضطراری بھی نہ ہوتی تھی) اور (اس کی نوبت یہاں تک پہونچی کہ اسی قساوت کی بدولت) بہت سے آدمی اُن میں کے (آج) کافر ہیں (کیونکہ معصیت پر اصرار اور اس کو اچھا سمجھنا اور نبی برحق کی عداوت اکثر سببِ کفر بن جاتا ہے، مطلب یہ کہ مسلمان کو جلدی توبہ کرلینا چاہئے، کیونکہ بعض اوقات پھر توبہ کی توفیق نہیں رہتی، اور بعض اوقات کفر تک نوبت پہونچ جاتی ہے، آگے فرماتے ہیں کہ اگر تم لوگوں کے دلوں میں معاصی سے کوئی خرابی کم وبیش پیدا ہوگئی ہو تو اس کو اس وہم کی بناء پر توبہ سے مانع نہ سمجھو کہ اب توبہ سے کیا اصلاح ہوگی بلکہ) یہ بات جان لو کہ اللہ تعالیٰ (کی ایسی شان ہے کہ وہ) زمین کو اس کے خشک ہوئے پیچھے زندہ کر دیتا ہے (بس اسی طرح توبہ کرنے پر اپنی رحمت سے قلبِ مردہ کو زندہ اور درست کر دیتا ہے، پس مایوس نہ ہونا چاہئے کیونکہ) ہم نے تم سے (اس کے) نظائر بیان کر دیئے ہیں تاکہ تم سمجھو (نمونہ سے مراد جیسا مدارک میں ہے احیاءِ ارض ہے اور شاید جمع لانا بوجہ تکرار وقوع کے ہو، آگے فضیلت انفاق مذکورہ بالا کی ارشاد ہے یعنی) بلاشبہ صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور یہ (صدقہ دینے والے) اللہ کو خلوص کے ساتھ قرض دے رہے ہیں وہ صدقہ (باعتبار ثواب کے) ان کے لئے بڑھا دیا جائے گا اور (مضاعفہ کے ساتھ) اُن کے لئے اجر پسندیدہ (تجویز کیا گیا) ہے (تفسیر اس کی ابھی گذر چکی ہے) اور (آگے فضیلت ایمان مذکورۂ بالا

کی ارشاد ہے کہ) جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر (پورا) ایمان رکھتے ہیں (یعنی جن میں ایمان اور تصدیق اور پابندیِ طاعت مکمل درجہ میں ہو) ایسے ہی لوگ اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں (جس کا بیان سورۂ نساء کے رکوع نہم میں آچکا ہے، یعنی یہ مراتب کمال ایمان کامل ہی کی بدولت نصیب ہوتے ہیں، اور شہید کا حاصل باذل نفس فی اللہ ہے، یعنی جو اپنی جان کو اللہ کی راہ میں پیش کردے گو قتل نہ ہو، کیونکہ وہ اختیار سے خارج ہے) اُن کے لئے (جنت میں) ان کا اجر (خاص) اور (صراط پر) اُن کا نور (خاص) ہوگا اور (آگے کفار کا ذکر فرماتے ہیں کہ) جو لوگ کافر ہوئے اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا یہی لوگ دوزخی ہیں۔

معارف و مسائل

یَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ ، یعنی وہ دن یاد رکھنے کے قابل ہے جس دن آپ مؤمن مرد اور مومن عورتوں کو دیکھیں گے کہ ان کا نور ان کے آگے آگے اور داہنی طرف ہوگا الخ

اس دن سے مراد قیامت کا دن ہے، اور یہ نور عطا ہونے کا معاملہ پل صراط پر چلنے سے کچھ پہلے پیش آئے گا، اس کی تفصیل ایک حدیث میں ہے جو حضرت ابو امامہ باہلی سے مروی ہے، ابن کثیر نے اس کو بحوالہ ابن ابی حاتم نقل کیا ہے، حدیث طویل ہے جس میں ابو امامہ رضؓ کا دمشق میں ایک جنازہ میں شریک ہونا اور فارغ ہونے کے بعد لوگوں کو موت اور آخرت کی یاد دلانے کے لئے موت اور قبر پھر حشر کے کچھ حالات بیان فرمانا مذکور ہے، اس کے چند جملوں کا ترجمہ یہ ہے کہ:۔

"پھر تم قبروں سے میدانِ حشر کی طرف منتقل کئے جاؤ گے، جس میں مختلف مراحل اور مواقف ہوں گے، ایک مرحلہ ایسا آئے گا کہ بحکم خداوندی کچھ چہرے سفید اور روشن کر دیئے جاویں گے اور کچھ چہرے کالے سیاہ کر دیئے جاویں گے، پھر ایک مرحلہ ایسا آوے گا کہ میدانِ حشر میں جمع ہونے والے سب لوگوں پر جن میں مؤمن و کافر سب ہوں گے، ایک شدید ظلمت اور اندھیری طاری ہو جائے گی، کسی کو کچھ نظر نہ آئے گا، اس کے بعد نور تقسیم کیا جائے گا ہر مؤمن کو نور عطا کیا جائے گا (ابن ابی حاتم ہی کی دوسری روایت میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے کہ مؤمن میں یہ نور بقدر اُن کے اعمال کے تقسیم ہوگا، کسی کا نور مثل پہاڑ کے کسی کا کھجور کے درخت کے مثل، کسی کا قامتِ انسانی کے برابر ہوگا، سب سے کم نور اس شخص کا ہوگا جس کے صرف انگوٹھے میں نور ہوگا اور وہ بھی کبھی روشن ہو جائے گا کبھی بجھ جائے گا، ابن کثیر)

پھر حضرت ابو امامہ باہلیؓ نے فرمایا کہ منافقین اور کفار کو کوئی نور نہ دیا جائے گا، اور فرمایا کہ اسی واقعہ کو قرآن کریم نے ایک مثال کے عنوان سے اس آیت میں بیان فرمایا ہے:

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِىْ بَحْرٍ لُّجِّىٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ اِذَاۤ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ) اور فرمایا کہ مؤمنین کو جو نور عطا ہوگا (اس کا حال دنیا کے نور کی طرح نہیں ہوگا کہ جہاں کہیں نور ہو اس کے پاس والے بھی اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں) بلکہ جس طرح کوئی اندھا آدمی دوسرے بصیر آدمی کے نورِ بصر سے نہیں دیکھ سکتا اسی طرح مؤمنین کے اس نور سے کوئی کافر یا فاسق فائدہ نہیں اٹھا سکے گا (ابن کثیر)

(سورۃ نور: ۴۰)

حضرت ابوامامہ باہلیؓ کی اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس موقف میں ظلمتِ شدیدہ کے بعد حق تعالیٰ کی طرف سے مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں میں نور تقسیم ہوگا اسی وقت سے کافر اور منافق اس نور سے محروم رہیں گے، اُن کو کسی قسم کا نور ملے ہی گا نہیں۔

مگر طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ سے ایک مرفوع روایت یہ نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"پُل صراط کے پاس اللہ تعالیٰ ہر مؤمن کو نور عطا فرماویں گے اور ہر منافق کو بھی مگر جس وقت یہ پُل صراط پر پہونچ جائیں گے تو منافقین کا نور سلب کرلیا جائے گا" (ابن کثیر)

اس سے معلوم ہوا کہ منافقین کو بھی ابتداء میں نور دیا جائے گا، مگر پُل صراط پر پہونچ کر یہ نور سلب ہو جاوے گا، بہرحال خواہ ابتداء ہی سے اُن کو نور نہ ملا ہو یا مل کر بجھ گیا ہو، اس وقت وہ مؤمنین سے درخواست کریں گے کہ ذرا ٹھیرو ہم بھی تمہارے نور سے کچھ فائدہ اٹھالیں کیونکہ ہم دنیا میں بھی نماز، زکوٰۃ، حج، جہاد سب چیزوں میں تمہارے شریک رہا کرتے تھے، تو ان کو اس درخواست کا جواب نامنظوری کی شکل میں دیا جائے گا، جس کا بیان آگے آتا ہے، اور منافقین کے مناسبِ حال تو یہی ہے کہ پہلے ان کو بھی مسلمانوں کی طرح نور ملے پھر اس کو سلب کرلیا جائے جس طرح وہ دنیا میں خدا و رسول کو دھوکا دینے کی ہی کوشش میں لگے رہے تھے، ان کے ساتھ قیامت میں معاملہ بھی ایسا ہی کیا جائے گا جیسے کسی کو دھوکہ دینے کے لئے کچھ روشنی دکھلا کر بجھا دی جائے، جیسا کہ اُن کے بارے میں قرآن کریم کا یہ ارشاد ہے يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ، یعنی منافقین اللہ کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ ان کو دھوکہ دینے والا ہے،، امام بغویؒ نے فرمایا کہ اس دھوکہ سے یہی مراد ہے کہ پہلے نور دیدیا جائے گا مگر عین اُس وقت جب نور کی ضرورت ہوگی سلب کرلیا جائے گا، اور یہی وہ وقت ہوگا جبکہ مؤمنین کو بھی یہ اندیشہ لگ جائے گا کہ کہیں ہمارا نور بھی سلب نہ ہو جائے، اس لئے وہ اللہ تعالیٰ سے دُعاء کریں گے کہ ہمارے نور کو آخر تک پورا کر دیجئے، جس کا ذکر اس آیت میں ہے يَوْمَ لَا يُخْزِى اللّٰهُ النَّبِىَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا، الآية (مظہری)

مسلم، احمد اور دارقطنی میں حضرت جابر بن عبداللہؓ کی مرفوع حدیث میں بھی آیا ہے کہ شروع میں مؤمن ومنافق دونوں کو نور دیا جائے گا پھر پل صراط پر پہونچ کر منافقین کا نور سلب ہو جائے گا۔

اور تفسیر مظہری میں ان دونوں روایتوں کی تطبیق اس طرح بیان کی ہے کہ اصل منافقین جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے اُن کو تو شروع ہی سے کفار کی طرح کوئی نور نہ ملے گا، مگر وہ منافقین جو اس اُمت میں بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوں گے، جن کو منافقین کا نام تو اس لئے نہیں دیا جاسکے گا کہ وحی کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکا اور کسی کے بارے میں بغیر وحی قطعی کے یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا کہ وہ دل سے مؤمن نہیں، صرف زبان کا اقرار ہے، اس لئے اُمت میں کسی کو یہ حق نہیں کہ کسی کو منافق کہے، لیکن اللہ تعالیٰ تو جانتا ہے کہ کس کے دل میں ایمان ہے کس کے دل میں نہیں تو ان میں سے جو لوگ اللہ تعالیٰ کے علم میں منافق ہیں گو ظاہر میں ان کی منافقت نہیں کھلی ان کے ساتھ یہ معاملہ ہوگا کہ شروع میں اُن کو بھی نور دیدیا جائے گا بعد میں سلب کر لیا جائے۔

اس قسم کے منافقین اُمت کے وہ لوگ ہیں جو قرآن وحدیث میں تحریف کر کے ان کے معانی کو بگاڑتے اور اپنے مطلب کے موافق بناتے ہیں۔ نعوذ باللہ منہ

میدانِ حشر میں نور اور ظلمت کے اسباب اس جگہ تفسیر مظہری میں قرآن وحدیث سے محشر کی ظلمت و نور کے اسباب بھی بیان کر دیئے ہیں جو علمی تحقیقات سے زیادہ اہم ہیں وہ نقل کرتا ہوں (لعل اللہ تعالیٰ یرزقنا نوراً)

(۱) ابوداؤد و ترمذی نے حضرت بریدہؓ اور ابن ماجہ نے حضرت انسؓ سے یہ مرفوع حدیث روایت کی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "خوش خبری سُنا دو ان لوگوں کو جو اندھیری راتوں میں مسجد کی طرف جاتے ہیں قیامت کے روز مکمل نور کی"، اور اسی مضمون کی روایات حضرت سہل بن سعدؓ، زید بن حارثہ، ابن عباسؓ ابن عمر، حارثہ ابن وہب، ابوامامہ، ابوالدرداء، ابوسعید، ابوموسیٰ، ابوہریرہؓ، عائشہ صدیقہ وغیرہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بھی منقول ہیں (مظہری)

(۲) مسند احمد اور طبرانی میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(مَنْ حَافَظَ عَلَى الصَّلَوَاتِ كَانَتْ لَهُ نُوْرًا وَّبُرْهَانًا وَّنَجَاةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ وَمَنْ لَّمْ يُحَافِظْ عَلَيْهَا لَمْ يَكُنْ لَّهُ نُوْرًا وَّلَا بُرْهَانًا وَّلَا نَجَاةً وَّكَانَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَعَ قَارُوْنَ وَهَامَانَ وَفِرْعَوْنَ) جو شخص پانچوں نمازوں کی محافظت کرے گا (یعنی ان کے اوقات اور آداب کو پابندی کے ساتھ بجالائے گا) اس کے لئے یہ نماز قیامت کے روز نور اور بُرہان اور نجات بن جائے گی، اور جو اس پر محافظت نہ کرے گا نہ اُس کے لئے نور ہوگا نہ بُرہان اور نہ نجات اور وہ قارون اور ہامان اور فرعون کے ساتھ ہوگا،

اور طبرانی نے حضرت ابوسعیدؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو سورۂ کہف پڑھے گا قیامت کے روز اس کے لئے اتنا نور ہوگا جو اس کی جگہ سے مکہ مکرمہ تک پھیلے گا، اور ایک

روایت میں ہے کہ جو شخص جمعہ کے روز سورۃ کہف پڑھے گا قیامت کے روز اس کے قدموں سے آسمان کی بلندی تک نور چمکے گا۔

(۴) امام احمدؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص قرآن کی ایک آیت بھی تلاوت کرے گا وہ آیت اس کے لئے قیامت کے روز نور ہوگی۔

(۵) دیلمی نے حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ مجھ پر درود بھیجنا پل صراط پر نور کا سبب بنے گا۔

(۶) طبرانی نے حضرت عبادہ بن صامتؓ سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے احکام بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ حج و عمرہ کے احرام سے فارغ ہونے کے لئے جو سر منڈایا جاتا ہے تو اس میں جو بال زمین پر گرتا ہے وہ قیامت کے روز نور ہوگا۔

(۷) مسند بزار میں حضرت ابن مسعودؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ منیٰ میں جمرات کی رمی کرنا قیامت کے روز نور ہوگا۔

(۸) طبرانی نے بسند جید حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جس شخص کے بال حالتِ اسلام میں سفید ہو جاویں وہ اس کے لئے قیامت کے دن نور ہوگا۔

(۹) بزار نے بسند جید حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جو شخص اللہ کی راہ میں جہاد میں ایک تیر بھی پھینکے گا اس کے لئے قیامت میں نور ہوگا۔

(۱۰) بیہقی نے شعب الایمان میں بسند منقطع حضرت ابن عمرؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ بازار میں اللہ کا ذکر کرنے والے کو اس کے ہر بال کے مقابلے میں قیامت کے روز ایک نور ملے گا۔

(۱۱) طبرانی نے حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ جو شخص کسی مسلمان کی مصیبت و تکلیف کو دور کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے پل صراط پر نور کے دو شعبے بنا دیگا جس سے ایک جہان روشن ہو جائیگا جس کی تعداد اللہ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔

(۱۲) بخاری و مسلم نے حضرت ابن عمرؓ سے اور مسلم نے حضرت جابرؓ سے اور حاکم نے حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عمرؓ سے اور طبرانی نے ابن زیاد سے روایت کیا ہے کہ ان سب نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (اِيَّاكُمْ وَالظُّلْمَ فَاِنَّهٗ هُوَ الظُّلُمٰتُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ) یعنی تم ظلم سے بہت بچو، کیونکہ ظلم ہی قیامت کے روز ظلمات اور اندھیری ہوگی۔

نعوذ باللہ من الظلمات ونسالہ النور التام یوم القیامۃ

يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ

یعنی اس روز جب منافق مرد اور منافق عورتیں مؤمنین سے کہیں گے کہ ذرا ہمارا انتظار کرو ہم بھی تمہارے نور سے فائدہ اٹھالیں۔

قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا، اُن سے کہا جائے گا کہ پیچھے لوٹو جہاں یہ نور تقسیم ہوا تھا وہیں نور تلاش کرو، یہ بات یا تو مؤمنین اُن کے جواب میں کہیں گے یا فرشتے جواب دیں گے (کما روی عن ابن عباس وقتادۃ قولین)

فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۭ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ یعنی مؤمنین یا فرشتوں کا جواب سُن کر منافقین اُسی جگہ کی طرف لوٹیں گے جہاں نور تقسیم ہوا تھا، وہاں کچھ نہ پاویں گے تو پھر اُس طرف آویں گے، اُس وقت یہ مؤمنین تک پہونچنے نہ پاویں گے بلکہ ان کے اور مؤمنین کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس کے پرلی طرف جہاں مؤمنین ہوں گے رحمت ہوگی اور اس طرف جہاں منافقین ہوں گے عذاب ہوگا۔

رُوح المعانی میں ابن زیدؒ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ دیوار اعراف ہوگی جو مؤمنین و کفار کے درمیان حائل کر دی جائے گی، اور بعض دوسرے مفسرین نے دیوار اعراف کے علاوہ کوئی دوسری دیوار قرار دی ہے اور اس دیوار میں جو دروازہ رکھا جائے گا یا تو اس لئے کہ اس کے راستہ سے مؤمنین و کفار میں باہم گفتگو ہو سکے، یا مؤمنین کو اسی دروازے سے گذارنے کے بعد بند کر دیا جائے گا۔

فائدہ:۔ اس نور کے معاملے میں کفار کا کہیں ذکر نہیں آیا، کیوں کہ ان میں نور کا کوئی احتمال ہی نہ تھا، منافقین کے نور کے بارے میں دو روایتیں آئیں کہ اوّل ہی سے ان کو نور نہ ملے گا، یا ملنے کے بعد پُل صراط پر جانے کے وقت بجھا دیا جائے گا، اور ان کے اور مؤمنین کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی، اس مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پُل صراط کے ذریعہ جہنّم کو پار کرنا یہ صرف مؤمنین کے لئے ہوگا کفار و مشرکین پُل صراط پر نہیں چڑھیں گے، وہ جہنّم کے دروازوں کے راستے جہنّم میں ڈال دیئے جاویں گے، اور مؤمنین پُل صراط کے راستے سے گذریں گے، پھر گنا ہگار مؤمن جن کے لئے ان کے اعمال کی سزا چند روز جہنّم میں رہنا ہے، وہ اس پُل سے گر کر جہنّم میں پہونچیں گے، باقی مؤمنین صحیح سالم گذر کر جنّت میں داخل ہوں گے، (وصرح بہ الشاہ عبدالقادر الدہلویؒ ویؤیدہ ما فی الدر ہٰہنا واللہ اعلم)

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ، یعنی کیا اب بھی وقت نہیں آیا ایمان والوں کے لئے کہ ان کے قلوب اللہ کے ذکر کے لئے جھک جائیں اور نرم ہو جائیں، اور اس قرآن کے لئے جو اُن پر نازل کیا گیا۔

خشوعِ قلب سے مراد دل کا نرم ہونا اور وعظ و نصیحت کو قبول کرنا اور اس کی اطاعت کرنا ہے (ابن کثیر) قرآن کے لئے خشوع یہ ہے کہ اس کے احکام اوامر و نواہی کی مکمل اطاعت کے لئے تیار ہو جائے، اور اس پر عمل کرنے میں کسی سُستی اور کمزوری کو راہ نہ دے (روح المعانی)

یہ عتاب و تنبیہ مؤمنین کو ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

بعض مؤمنین کے قلوب میں عمل کے اعتبار سے کچھ سستی معلوم کی اس پر یہ آیت نازل ہوئی (ابن کثیر) امام اعمش رح نے فرمایا کہ مدینہ طیبہ پہونچنے کے بعد صحابہ کرام کو کچھ معاشی سہولتیں اور آرام ملا تو بعض حضرات میں عمل کی جد و جہد جو اُن کی عادت تھی اس میں کچھ کمی اور سستی پائی گئی اس پر یہ آیت نازل ہوئی (روح المعانی)

حضرت ابن عباس رضؓ کی مذکورہ روایت میں یہ بھی ہے کہ یہ آیتِ عتاب نزول قرآن سے تیرہ سال بعد نازل ہوئی (رواہ عنہ ابن ابی حاتم) اور صحیح مسلم میں حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ ہمارے اسلام لانے کے چار سال بعد اس آیت کے ذریعہ ہم پر عتاب و تنبیہ نازل کی گئی۔ واللہ اعلم

بہرحال حاصل اس عتاب و تنبیہ کا مؤمنین کو مکمل خشوع اور عمل صالح کے لئے مستعد رہنے کی تعلیم ہے، اور خشوعِ قلب ہی پر تمام اعمال کا مدار ہے۔

حضرت شداد بن اوس رضؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے پہلے جو چیز لوگوں سے اُٹھالی جائے گی وہ خشوع ہے (ابن کثیر)

کیا ہر مؤمن صدیق و شہید ہے؟ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَاۗءُ

اس آیت سے معلوم ہوا کہ صدیق و شہید ہر مؤمن کو کہا جا سکتا ہے، اور حضرت قتادہ رح اور عمرو بن میمون نے اس آیت کی بناء پر فرمایا کہ ہر وہ شخص جو اللہ اور اس کے رسول ص پر ایمان لائے وہ صدیق و شہید ہے،

ابن جریر نے حضرت براء بن عازب رضؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مُؤْمِنُوْا اُمَّتِیْ شُهَدَاۗءُ یعنی میری اُمت کے سب مؤمن شہید ہیں، اور اس کی دلیل میں آپ نے آیتِ مذکورہ تلاوت فرمائی۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک روز اُن کے پاس کچھ حضرات صحابہ جمع تھے، انھوں نے فرمایا كُلُّكُمْ صِدِّيْقٌ وَشَهِيْدٌ یعنی تم میں سے ہر ایک صدیق بھی ہے شہید بھی، لوگوں نے تعجب سے کہا کہ ابوہریرہ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟..... تو حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ میری بات کا یقین نہیں آتا تو قرآن کی یہ آیت پڑھ لو:- وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَاۗءُ،

لیکن قرآن کریم کی ایک دوسری آیت سے بظاہر یہ مستفاد ہوتا ہے کہ صدیق و شہید ہر مؤمن نہیں، بلکہ مؤمنین میں سے ایک اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کو صدیق و شہید کہا جاتا ہے، آیت یہ ہے:- فَاُولٰۗىِٕكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَالصّٰلِحِيْنَ، کیونکہ اس آیت میں انبیاء کے ساتھ عام مؤمنین میں تین طبقے خصوصیت سے ذکر کئے گئے ہیں، صدیقین، شہداء اور صالحین، اور ظاہر اس سے یہ ہے کہ ان تینوں کے مفہوم اور مصداق میں فرق ہے، ورنہ تینوں کو الگ الگ کہنے کی ضرورت نہ ہوتی، اسی لئے بعض حضرات نے فرمایا کہ صدیقین و شہداء تو دراصل مؤمنین

کے مخصوص اعلیٰ طبقات کے لوگ ہیں، جو بڑی صفات عالیہ کے حامل ہیں، یہاں سب مؤمنین کو صدیق و شہید فرمانے کا حاصل یہ ہے کہ ہر مومن بھی ایک حیثیت سے صدیقین و شہداء کے حکم میں ہے، اور اُن کے زمرہ میں لاحق سمجھا جائے گا۔

اور رُوح المعانی میں ہے کہ مناسب یہ ہے کہ اس آیت میں اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مراد وہ مؤمن لئے جاویں جو ایمان کامل رکھتے ہیں اور طاعات کے پابند ہیں، ورنہ وہ مؤمن جو شہوات اور غفلت میں منہمک ہو اس کو صدیق و شہید نہیں کہا جا سکتا۔

اس کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَللَّعَّانُوْنَ لَا یَکُوْنُوْنَ شُھَدَآءَ، یعنی لوگوں پر لعنت کرنے والے شہداء میں شامل نہ ہوں گے، اور حضرت فاروق اعظم رضؓ نے ایک مرتبہ لوگوں سے فرمایا کہ "تمہیں کیا ہو گیا کہ تم دیکھتے ہو کہ کوئی آدمی لوگوں کی عزت و آبرو کو مجروح کرتا ہے اور تم اس کو نہ روکتے ہو، نہ کوئی برا مانتے ہو، ان حضرات نے عرض کیا کہ ہم اس کی بدزبانی سے ڈرتے ہیں کہ ہم کچھ بولیں گے تو وہ ہماری بھی عزت و آبرو پر حملہ کرے گا، حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا اگر یہ بات ہے تو تم لوگ شہداء نہیں ہو سکتے"، ابن اثیر نے یہ روایت نقل کر کے اس کا مطلب یہ بتلایا کہ ایسی مداہنت کرنے والے اُن شہداء میں شامل نہیں ہوں گے جو قیامت کے روز انبیاء سابقین کی اُمتوں کے مقابلہ میں شہادت دیں گے، (روح المعانی)

تفسیر مظہری میں ہے کہ اس آیت میں اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مراد صرف وہ حضرات ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں ایمان لائے اور آپؐ کی صحبت سے مشرف ہوئے۔

اور آیت میں لفظ ھُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ جو کلمہ حصر ہے یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ صدیقیت صحابہ کرام میں منحصر ہے، حضرت مجدد الف ثانیؒ نے فرمایا کہ صحابہ کرام سب کے سب کمالاتِ نبوت کے حامل تھے، جس شخص نے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایمان کے ساتھ دیکھ لیا، وہ کمالات نبوت میں مستغرق ہو گیا۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ

جان رکھو کہ دنیا کی زندگانی یہی ہے کھیل اور تماشہ اور بناؤ اور بڑائیاں کرنی آپس میں

وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ

اور بہتائیت ڈھونڈھنی مال کی اور اولاد کی جیسے حالت ایک مینھ کی جو خوش لگا کسانوں کو

نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ۭ وَفِي الْاٰخِرَةِ

اس کا سبزہ پھر زور پر آتا ہے پھر تو دیکھے زرد ہو گیا پھر ہو جاتا ہے روندا ہوا گھاس اور آخرت میں

عَذَابٌ شَدِيدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ

سخت عذاب ہے اور معافی بھی ہے اللہ سے اور رضامندی اور دنیا کی زندگانی تو یہی

اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝۲۰ سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا

ہے مال دغا کا ، دوڑو اپنے رب کی معافی کی طرف کو اور بہشت کو جس کا پھیلاؤ ہے

كَعَرْضِ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۭ ذٰلِكَ

جیسے پھیلاؤ آسمان اور زمین کا تیار رکھی ہے واسطے اُن کے جو یقین لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر یہ

فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۲۱

فضل اللہ کا ہے دے اس کو جس کو چاہے اور اللہ کا فضل بڑا ہے ،

خُلاصۂ تفسیر

تم خوب جان لو کہ (آخرت کے مقابلہ میں) دنیوی حیات (ہرگز قابل اشتغال چیز نہیں کیونکہ) محض لہو ولعب اور (ایک ظاہری) زینت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا (قوت وجمال اور دنیوی ہنر و کمال میں) اور اموال اور اولاد میں ایک کا دوسرے سے اپنے کو زیادہ بتلانا ہے (یعنی مقاصد دنیا کے یہ ہیں کہ بچپن میں لہو ولعب کا غلبہ رہتا ہے اور جوانی میں زینت و تفاخر کا اور بڑھاپے میں مال و دولت آل و اولاد کو گنوانا اور یہ سب مقاصد فانی اور خواب وخیال محض ہیں جس کی مثال ایسی ہے) جیسے مینھ (برستا) ہے کہ اس کی پیداوار (کھیتی) کاشتکاروں کو اچھی معلوم ہوتی ہے پھر وہ (کھیتی) خشک ہو جاتی ہے سو اس کو تو زرد دیکھتا ہے پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے (اسی طرح دنیا چند روزہ بہار ہے پھر زوال و اضمحلال، یہ تو دنیا کی حالت ہوئی) اور آخرت (کی کیفیت یہ ہے کہ اس) میں (دو چیزیں ہیں ایک تو کفار کے لئے) عذاب شدید ہے اور (دوسری اہل ایمان کے لئے) خدا کی طرف سے مغفرت اور رضامندی ہے (اور یہ دونوں باقی ہیں، پس آخرت تو باقی ہے) اور دنیوی زندگانی محض (فانی ہے، جیسے فرض کرو کہ ایک) دھوکہ کا اسباب ہے (و مر تفسیرہ فی آل عمران قریبًا من الاخیر، پس جب متاع دنیا فانی اور دولت آخرت باقی ہے جو ایمان کی بدولت نصیب ہوتی ہے تو تم کو چاہئے کہ) تم اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف دوڑو اور (نیز) ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین کی وسعت کی برابر ہے (یعنی اس سے کم کی نفی ہے، زیادہ کی نفی نہیں، اور) وہ اُن لوگوں کے واسطے تیار کی گئی ہے جو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں (اور) یہ (مغفرت و رضوان) اللہ کا فضل ہے وہ اپنا فضل جس کو چاہیں عنایت کریں اور اللہ بڑے فضل والا ہے،

(اس میں اشارہ ہے کہ اپنے اعمال پر کوئی مغرور نہ ہو، اور اپنے اعمال پر استحقاقِ جنت کا مدعی نہ ہو، یہ محض فضل ہے جس کا مدار ہماری مشیت پر ہے، مگر ہم نے اپنی رحمت سے ان عملوں کے کرنے والوں کے ساتھ مشیت متعلق کرلی، اگر ہم چاہتے تو مشیت نہ کرتے کہ اَلْقُدْرَۃُ تَتَعَلَّقُ بِالضِّدَّیْنِ)

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں اہلِ جنت کے اور اہلِ جہنم کے حال کا بیان تھا، جو آخرت میں پیش آئے گا اور دائمی ہوگا، اور آخرت کی نعمتوں سے محروم اور عذاب میں گرفتار ہونے کا بڑا سبب انسان کیلئے دنیا کی فانی لذتیں اور ان میں منہمک ہو کر آخرت سے غفلت ہونا ہے، اس لئے ان آیات میں دنیاءِ فانی کا ناقابلِ اعتماد ہونا بیان کیا گیا ہے۔

پہلے ابتداءِ عمر سے آخر تک جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے، اور جس میں دنیا دار منہمک و مشغول اور اس پر خوش رہتے ہیں اُس کا بیان ترتیب کے ساتھ یہ ہے کہ دنیا کی زندگی کا خلاصہ بہ ترتیب چند چیزیں اور چند حالات ہیں، پہلے لعب پھر لہو پھر زینت پھر تفاخر، پھر مال و اولاد کی کثرت پر ناز و فخر۔

لعب وہ کھیل ہے جس میں فائدہ مطلق پیشِ نظر نہ ہو، جیسے بہت چھوٹے بچوں کی حرکتیں، اور لہو وہ کھیل ہے جس کا اصل مقصد تو تفریح اور دل بہلانا اور وقت گذاری کا مشغلہ ہوتا ہے، ضمنی طور پر کوئی ورزش یا دوسرا فائدہ بھی اس میں حاصل ہو جاتا ہے جیسے بڑے بچوں کے کھیل، گیند، شناوری یا نشانہ بازی وغیرہ، حدیث میں نشانہ بازی اور تیرنے کی مشق کو اچھا کھیل فرمایا ہے، زینت بدن اور لباس وغیرہ کی معروف ہے، ہر انسان اس دور سے گذرتا ہے کہ عمر کا بالکل ابتدائی حصہ تو خالص کھیل یعنی لعب میں گذرتا ہے، اس کے بعد لہو شروع ہوتا ہے، اس کے بعد اس کو اپنے تن بدن اور لباس کی زینت کی فکر ہونے لگتی ہے اس کے بعد ہمعصروں ہم عمروں سے آگے بڑھنے اور ان پر فخر جتلانے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔

اور انسان پر جتنے دَور اس ترتیب سے آتے ہیں غور کرو تو ہر دَور میں وہ اپنے اسی حال پر قانع اور اسی کو سب سے بہتر جانتا ہے، جب ایک دَور سے دوسرے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے تو سابقہ دَور کی کمزوری اور لغویت سامنے آجاتی ہے، بچے ابتدائی دَور میں جن کھیلوں کو اپنا سرمایۂ زندگی اور سب سے بڑی دولت جانتے ہیں، کوئی اُن سے چھین لے تو ان کو ایسا ہی صدمہ ہوتا ہے جیسا کہ کسی بڑے آدمی کا مال و اسباب اور کوٹھی بنگلہ چھین لیا جائے، لیکن اس دَور سے آگے بڑھنے کے بعد اس کو حقیقت معلوم ہو جاتی ہے کہ جن چیزوں کو ہم نے اُس وقت مقصودِ زندگی بنایا ہوا تھا وہ کچھ نہ تھیں، سب خرافات تھیں، بچپن میں لعب، پھر لہو میں مشغولیت رہی جوانی میں زینت اور تفاخر کا مشغلہ ایک مقصد بنا رہا، بڑھاپا آیا، اب مشغلہ تکاثر فی الاموال والاولاد کا ہو گیا، کہ اپنے مال و دولت کے اعداد و شمار اور اولاد

ونسل کی زیادتی پر خوش ہوتا رہے ان کو گنتا گناتا رہے، مگر جیسے جوانی کے زمانے میں بچپن کی حرکتیں لغو معلوم ہونے لگی تھیں بڑھاپے میں پہونچ کر جوانی کی حرکتیں لغو و ناقابلِ التفات نظر آنے لگیں، اب بڑے میاں کی آخری منزل بڑھاپا ہے، اس میں مال کی بہتات، اولاد کی کثرت و قوت اور ان کے جاہ و منصب پر فخر سرمایہ زندگی اور مقصود اعظم بنا ہوا ہے، قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ حال بھی گذر جانے والا ہے اور فانی ہے، اگلا دور برزخ پھر قیامت کا ہے اس کی فکر کرو کہ وہی اصل ہے، قرآن کریم نے اس ترتیب کے ساتھ ان سب مشاغل و مقاصد دنیویہ کا زوال پذیر، ناقص، ناقابلِ اعتماد ہونا بیان فرمادیا، اور آگے اس کو ایک کھیتی کی مثال سے واضح فرمایا:-

كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا، غیث کے معنی بارش کے ہیں، اور لفظ کفار جو مؤمنین کے مقابلہ میں آتا ہو اگر یہ معنی تو معروف و مشہور ہی ہیں، اس کے ایک دوسرے لغوی معنی کاشتکار کے بھی آتے ہیں، اس آیت میں بعض حضرات نے یہی معنی مراد لئے ہیں، اور مطلب آیت کا یہ قرار دیا ہے کہ جس طرح بارش سے کھیتی اور طرح طرح کی نباتات اُگتی ہیں، اور جب وہ ہری بھری ہوتی ہیں تو کاشتکار ان سے خوش ہوتا ہے، اور بعض دوسرے حضرات مفسرین نے لفظ کفار کو اس جگہ بھی معروف معنی میں لیا ہے کہ کافر لوگ اس سے خوش ہوتے ہیں اس پر جو یہ اشکال ہے کہ کھیتی ہری بھری دیکھ کر خوش ہونا تو کافر کے ساتھ مخصوص نہیں، مسلمان بھی اس سے خوش ہوتا ہے، اس کا جواب حضرات مفسرین نے یہ دیا ہے کہ مؤمن کی خوشی اور کافر کی خوشی میں بڑا فرق ہے، مؤمن خوش ہوتا ہے تو اس کی فکر کا رُخ حق تعالیٰ کی طرف پھر جاتا ہے، وہ یقین کرتا ہے کہ یہ سب کچھ اس کی قدرت و حکمت اور رحمت کا نتیجہ ہے، وہ اس چیز کو زندگی کا مقصود نہیں بناتا، پھر اس خوشی کے ساتھ اس کو آخرت کی فکر بھی ہر وقت لگی رہتی ہے، اس لئے جو مؤمن ایمان کے تقاضہ کو پورا کرتا ہے دنیا کی بڑی سے بڑی دولت سے بھی وہ ایسا خوش اور مگن اور مست نہیں ہوتا جیسا کافر ہوتا ہے، اس لئے یہاں خوشی کا اظہار کفار کی طرف منسوب ہے۔

آگے اس مثال کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ کھیتی اور دوسری نباتات پھول پھلواریاں جب ہری بھری ہوتی ہیں تو سب دیکھنے والے خصوصاً کفار بڑے خوش اور مگن نظر آتے ہیں، مگر آخر کار پھر وہ خشک ہونا شروع ہوتی ہے، پہلے زرد پیلی پڑجاتی ہے پھر بالکل خشک ہو کر چُورا چورا ہو جاتی ہے، یہی مثال انسان کی ہے کہ شروع میں تر و تازہ حسین خوب صورت ہوتا ہے، بچپن سے جوانی تک کے مراحل اسی حال میں طے کرتا ہے، مگر آخر کار بڑھاپا آجاتا ہے جو آہستہ آہستہ بدن کی تازگی اور حُسن و جمال سب ختم کر دیتا ہے، اور بالآخر مر کر مٹی ہو جاتا ہے، دنیا کی بے ثباتی اور زوال پذیر ہونے کا بیان فرمانے کے بعد پھر اصل مقصود آخرت کی فکر کی طرف توجہ دلانے کے لئے آخرت کے حال کا ذکر فرمایا۔

وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ، یعنی آخرت میں انسان ان دو حالوں میں سے کسی ایک میں ضرور پہونچے گا، ایک حال کفار کا ہے اُن کے لئے عذاب شدید ہے، دوسرا

حال مؤمنین کا ہے ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت اور رحمت ہے۔

یہاں عذاب کا ذکر پہلے کیا گیا کیونکہ دنیا میں مست و مغرور ہونا جو پہلی آیات میں مذکور ہے اس کا نتیجہ بھی عذاب شدید ہے، اور عذاب شدید کے مقابلہ میں دو چیزیں ارشاد فرمائیں، مغفرت اور رضوان، جس میں اشارہ ہے کہ گناہوں اور خطاؤں کی معافی ایک نعمت ہے جس کے نتیجہ میں آدمی عذاب سے بچ جاتا ہے مگر یہاں صرف اتنا ہی نہیں بلکہ عذاب سے بچ کر پھر جنّت کی دائمی نعمتوں سے بھی سرفراز ہوتا ہے، جس کا سبب رضوان یعنی حق تعالیٰ کی خوشنودی ہے۔

اس کے بعد دنیا کی حقیقت کو ان مختصر الفاظ میں بیان فرمایا وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ یعنی ان سب باتوں کو دیکھنے سمجھنے کے بعد ایک عاقل و بصیر انسان کے لئے اس کے سوا کوئی نتیجہ دنیا کے بارے میں نہیں رہ سکتا، کہ وہ ایک دھوکہ کا سرمایہ ہے اصلی سرمایہ نہیں جو آڑے وقت میں کام آسکے، پھر آخرت کے عذاب و ثواب اور دنیا کی بے ثباتی بیان فرمانے کا لازمی اثر یہ ہونا چاہئے کہ انسان دنیا کی لذتوں میں منہمک نہ ہو آخرت کی نعمتوں کی فکر زیادہ کرے اس کا بیان اگلی آیات میں اس طرح آیا:۔

سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ، یعنی مسابقت کرو اپنے رب کی مغفرت اور اس جنّت کی طرف جس کا عرض آسمان و زمین کے عرض کی برابر ہے۔

مسابقت کرنے سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ عمر اور صحت و قدرت کا کچھ بھروسہ نہیں، نیک اعمال میں سستی اور ٹال مٹول نہ کرو ایسا نہ ہو کہ پھر کوئی بیماری یا عذر آکر تمہیں اس کام کے قابل نہ چھوڑے، یا موت ہی آجائے تو حاصل مسابقت کا یہ ہے کہ عجز و ضعف اور موت سے مسابقت کرو کہ ان کے آنے سے پہلے پہلے ایسے اعمال کا ذخیرہ کرلو جو جنّت تک پہونچانے کا ذریعہ بن سکیں۔

اور مسابقت کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ نیک اعمال میں دوسروں سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو، جیسا کہ حضرت علیؓ نے اپنی نصائح میں فرمایا کہ: تم مسجد میں سب سے پہلے جانے والے اور سب سے آخر میں نکلنے والے بنو، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ جہاد کی صفوف میں سے پہلی صف میں رہنے کے لئے بڑھو، حضرت انسؓ نے فرمایا کہ جماعتِ نماز میں پہلی تکبیر میں حاضر رہنے کی کوشش کرو (روح)

جنّت کی تعریف میں فرمایا کہ اس کا عرض آسمان و زمین کے برابر ہوگا، سورۂ آلِ عمران میں بھی اسی مضمون کی آیت پہلے آچکی ہے، اس میں لفظ سمٰوٰت جمع کے ساتھ آیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ آسمان سے مراد ساتوں آسمان ہیں اور معنی یہ ہیں کہ ساتوں آسمانوں اور زمین کی وسعت کو ایک جگہ جمع کرلو تو وہ جنّت کا عرض ہو، یعنی چوڑائی، اور یہ ظاہر ہے کہ طول ہر چیز کا اس کے عرض سے زائد ہوتا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ جنّت کی وسعت ساتوں آسمانوں اور زمین کی وسعت سے بڑھی ہوئی ہے، اور لفظ عرض کبھی مطلق وسعت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اس میں طول کا مقابلہ مقصود نہیں ہوتا، دونوں صورتوں میں جنّت کی

عظیم الشان وسعت کا بیان ہو گیا،

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ، اس سے پہلی آیت میں جنّت اور اس کی نعمتوں کے لئے مسابقت اور کوشش کا حکم تھا، اس سے کسی کو یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ جنّت اور اس کی لازوال نعمتیں ہمارے عمل کا ثمرہ اور ہمارا عمل اس کے لئے کافی ہے، اس آیت میں حق تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ تمہارے اعمال حصولِ جنت کے لئے علّت کافیہ نہیں ہیں، جن پر عطاءِ جنّت کا مرتب ہونا لازمی ہی ہو، انسان کے عمر بھر کے اعمال تو ان نعمتوں کا بدلہ بھی نہیں ہو سکتے جو دنیا میں اس کو مل چکی ہیں، ہمارے یہ اعمال جنّت کی لازوال نعمتوں کی قیمت نہیں بن سکتے، جنّت میں جو بھی داخل ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان ہی سے داخل ہوگا، جیسے صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی مرفوع حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں کسی کو صرف اس کا عمل نجات نہیں دلا سکتا، صحابہؓ نے عرض کیا کہ کیا آپ بھی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں میں بھی اپنے عمل سے جنّت حاصل نہیں کر سکتا بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل و رحمت ہو جاوے (مظہری)

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ

کوئی آفت نہیں پڑتی ملک میں اور نہ تمہاری جانوں میں جو لکھی نہ ہو ایک کتاب میں پہلے اس سے کہ

قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۲۲﴾ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ

پیدا کریں ہم اس کو دنیا میں، بیشک یہ اللہ پر آسان ہے، تاکہ تم غم نہ کھایا کرو اس پر جو ہاتھ نہ آیا اور

وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُــوْرِۨ ﴿۲۳﴾ الَّذِيْنَ

نہ شیخی کیا کرو اس پر جو تم کو اس نے دیا، اور اللہ کو خوش نہیں آتا کوئی اترانیوالا بڑائی مارنیوالا، وہ جو کہ

يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۴﴾

آپ نہ دیں اور سکھلائیں لوگوں کو بھی نہ دینا، اور جو کوئی منہ موڑے تو اللہ آپ ہی ہے بے پروا سب خوبیوں کے ساتھ موصوف

خلاصۂ تفسیر

کوئی مصیبت نہ دنیا میں آتی ہے اور نہ خاص تمہاری جانوں میں مگر وہ (سب) ایک کتاب میں (یعنی لوح محفوظ میں) لکھی ہیں قبل اس کے کہ ہم ان جانوں کو پیدا کریں (یعنی تمام مصیبتیں خارجی ہوں یا داخلی، وہ سب مقدر ہیں اور) یہ اللہ کے نزدیک آسان کام ہے (کہ واقع ہونے سے پہلے لکھ دیا، کیونکہ اس کو علم غیب

حاصل ہے اور ہم نے یہ بات اس واسطے بتلادی ہی تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے (تندرستی یا اولاد یا مال) تم اس پر (اتنا) رنج نہ کرو (جو حق تعالیٰ کی مرضی کے طلب کرنے اور آخرت کے امور میں مشغول ہونے میں رکاوٹ ہو جاوے اور طبعی تکلیف کا مضائقہ نہیں) اور تاکہ جو چیز تمکو عطا فرمائی ہی (اسکی نسبت بھی یہی سمجھ کر خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت و فضل سے عطا فرمانا تجویز کردیا تھا اور اسی نے ہمکو دی ہی) اس پر اتراؤ نہیں (کیونکہ اتراوے تو وہ جس کا استحقاق ذاتی ہو اور جب دوسری کی مشیت و حکم سے ایک چیز ملی ہی اسپر اترانے کا کیا حق ہی) اور (آگے اس اترانے پر وعید ہے کہ) اللہ تعالیٰ کسی اترانیوالے شیخی باز کو پسند نہیں کرتا (اختیال کا لفظ اکثر اندرونی فضائل پر اترانے کے لئے اور فخر اکثر خارجی اشیاء، مال و مرتبہ وغیرہ پر اترانے کے لئے مستعمل ہوتا ہے، آگے بخل کی مذمت ہے کہ) جو ایسے ہیں کہ (دنیا کی محبت کی وجہ سے) خود بھی (خدا کے نزدیک پسندیدہ حقوق میں صرف کرنے سے) بخل کرتے ہیں (گو اپنی خواہشات و گناہوں میں کتنا ہی اسراف کریں) اور (اس گناہ کے مرتکب بھی ہوتے ہیں کہ) دوسرے لوگوں کو بھی بخل کی تعلیم کرتے ہیں (اَلَّذِیْنَ الخ سے جو ترکیب میں بدل ہے یہ مقصود نہیں کہ وعید ان افعال کے مجموعہ کے ساتھ متعلق ہے، کیونکہ ظاہر ہے کہ ہر بُری خصلت پر وعید ہے، بلکہ اشارہ اس طرف ہی کہ دنیا کی محبت ایسی ہے جس سے اکثر بُری صفات جمع ہو ہی جاتی ہیں، اختیال اور افتخار بھی اور بخل بھی وغیر ذالک) اور (یہی دنیا کی محبت کبھی حق سے رُوگردانی کرنے تک پہنچا دیتی ہی، جس کے حق میں یہ وعید ہی کہ) جو شخص (دین حق سے جس کی ایک فرع انفاق فی سبیل اللہ بھی ہے) اعراض کرے گا تو اللہ تعالیٰ (کا کوئی نقصان نہیں، کیونکہ وہ سب کی عبادت اور اموال سے) بے نیاز ہیں (اور اپنی ذات و صفات میں کامل اور) سزاوارِ حمد ہیں۔

معارف و مسائل

دنیا کی دو چیزیں انسان کو اللہ کی یاد اور آخرت کی فکر سے غافل کرنے والی ہیں، ایک راحت و عیش جس میں مبتلا ہو کر انسان اللہ کو بھلا بیٹھتا ہے اس سے بچنے کی ہدایت سابقہ آیات میں آچکی ہی دوسری چیز مصیبت و غم ہے، اس میں مبتلا ہو کر بھی بعض اوقات انسان مایوس اور خدا تعالیٰ کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے، آیاتِ مذکورہ میں اس کا بیان ہے۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا یعنی جو کوئی مصیبت تم کو زمین میں یا اپنی جانوں میں پہونچتی ہے وہ سب ہم نے کتاب یعنی لوحِ محفوظ میں مخلوقات کو پیدا کرنے سے بھی پہلے لکھ دیا تھا، زمین کی مصیبت سے مراد قحط، زلزلہ، کھیت اور باغ میں نقصان، تجارت میں گھاٹا، مال و دولت کا ضائع ہو جانا، دوست احباب کی موت سب داخل ہیں، اور اپنی جانوں کی مصیبت میں ہر طرح کے امراض اور زخم اور چوٹ وغیرہ شامل ہیں۔

لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ، مطلب اس آیت کا یہ ہی کہ دنیا

میں جو کچھ مصیبت یا راحت، خوشی یا غم انسان کو پیش آتا ہے وہ سب حق تعالیٰ نے لوحِ محفوظ میں انسان کے پیدا ہونے سے پہلے ہی لکھ رکھا ہے، اس کی اطلاع تمہیں اس لئے دی گئی تاکہ تم دنیا کے اچھے برے حالات پر زیادہ دھیان نہ دو، نہ یہاں کی تکلیف و مصیبت یا نقصان و فقدان کچھ زیادہ حسرت و افسوس کرنے کی چیز ہے اور نہ یہاں کی راحت و عیش یا مال و متاع اتنا زیادہ خوش اور مست ہونے کی چیز ہے جس میں مشغول ہو کر اللہ کی یاد اور آخرت سے غافل ہو جاؤ۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ ہر انسان طبعی طور پر بعض چیزوں سے خوش ہوتا ہے بعض سے غمگین، لیکن ہونا یہ چاہئے کہ جس کو کوئی مصیبت پیش آوے وہ اس پر صبر کر کے آخرت کا اجر و ثواب کمائے، اور جو کوئی راحت و خوشی پیش آئے وہ اس پر شکر گذار ہو کر اجر و ثواب حاصل کرے (رواہ الحاکم وصححہ از روح)

اگلی آیت میں راحت و آرام یا مال و دولت پر اترانے والے اور فخر کرنے والوں کی مذمت بیان فرمائی، وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ، یعنی اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا اترانے والے، فخر کرنے والے کو، اور یہ ظاہر ہے جس کو پسند نہیں کرتا اس سے بغض و نفرت رکھتا ہے، مطلب یہ ہے کہ دنیا کی نعمتوں پر اترانے اور فخر کرنے والے اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہیں، مگر عنوانِ تعبیر میں پسند نہ کرنا ذکر کر کے شاید اس طرف اشارہ ہے کہ عقلمند عاقبت اندیش انسان کا فرض یہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنے ہر کام میں اس کی فکر کرے کہ وہ اللہ کے نزدیک پسند ہے یا نہیں، اس لئے یہاں ناپسند ہونے کا ذکر فرمایا گیا۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ

ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دیکر اور اُتاری اُن کے ساتھ کتاب اور ترازو

لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْہِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّ

تاکہ لوگ سیدھے رہیں انصاف پر اور ہم نے اُتارا لوہا اس میں سخت لڑائی ہے اور لوگوں

مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ وَرُسُلَہٗ بِالْغَیْبِ ۭ اِنَّ

کے کام چلتے ہیں اور تاکہ معلوم کرے اللہ کون مدد کرتا ہے اس کی اور اس کے رسولوں کی بن دیکھے بیشک

اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ﴿۲۵﴾ ع

اللہ زور آور ہے زبردست

۳ ع ۱۹

خلاصۂ تفسیر

ہم نے (اسی اصلاحِ آخرت کے لئے) اپنے پیغمبروں کو کھلے کھلے احکام دے کر بھیجا اور ہم نے انکے

ساتھ کتاب کو اور (اس کتاب میں بالخصوص) انصاف کرنے (کے حکم) کو (جس کا تعلق حقوق العباد سے ہے) نازل کیا تاکہ لوگ (حقوق اللہ اور حقوق العباد میں) اعتدال پر قائم رہیں (اس میں ساری شریعت آگئی جو معتدل یعنی بین الافراط والتفریط ہے) اور ہم نے لوہے کو پیدا کیا جس میں شدید ہیبت ہے، (تاکہ اس کے ذریعہ سے عالم کا انتظام رہے کہ ڈر سے بہت سی بے انتظامیاں بند ہو جاتی ہیں) اور (اس کے علاوہ) لوگوں کے اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں (چنانچہ اکثر آلات لوہے سے بنتے ہیں) اور (اس لئے لوہا پیدا کیا) تاکہ اللہ تعالیٰ (ظاہری طور پر) جان لے کہ بے (اس کے خدا کو) دیکھے اس کی اور اس کے رسولوں کی (یعنی دین کی) کون مدد کرتا ہے (کیونکہ جہاد میں بھی کام آتا ہے تو یہ بھی اُخروی نفع ہوا اور جہاد کا حکم اس لئے نہیں کہ اللہ اس کا محتاج ہے، کیونکہ) اللہ تعالیٰ (خود) قوی زبردست ہے (بلکہ تمہارے ثواب کے لئے ہے)۔

معارف و مسائل

آسمانی کتابوں اور انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے کا اصل مقصد لوگوں کو عدل و انصاف پر قائم کرنا ہے،

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ الآیۃ، لفظ بَیِّنٰت کے لغوی معنی واضح اور کھلی ہوئی چیزوں کے ہیں اس سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ واضح احکام ہوں، جیسا کہ خلاصہ تفسیر میں یہی ترجمہ لیا گیا ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے معجزات اور نبوت و رسالت پر واضح دلائل مراد ہوں (کما فسرہ بہ ابن کثیر وابن حیان) اور بَیِّنٰت کے بعد اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتٰبَ میں کتاب نازل کرنے کا علیحدہ ذکر بظاہر اسی تفسیر کا مؤید ہے، کہ بَیِّنٰت سے مراد معجزات و دلائل ہوں اور احکام کی تفصیل کے لئے کتاب نازل کرنے کا ذکر فرمایا گیا

کتاب کے ساتھ ایک دوسری چیز مِیْزَان نازل کرنے کا بھی ذکر ہے، مِیْزَانْ اصل میں اس آلہ کو کہا جاتا ہے، جس سے کسی چیز کا وزن کیا جائے، جس کی عام صورت ترازو ہے، اور مروجہ ترازو کے علاوہ مختلف چیزوں کے وزن تولنے کے لئے جو دوسرے مختلف قسم کے آلات ایجاد ہوتے رہتے ہیں، وہ بھی میزان کے مفہوم میں داخل ہیں، جیسے آجکل روشنی، ہوا وغیرہ کے ناپنے والے آلات ہیں۔

اس آیت میں کتاب کی طرح میزان کے لئے بھی نازل کرنے کا ذکر فرمایا ہے، کتاب کا آسمان سے نازل ہونا اور فرشتوں کے ذریعہ پیغمبر تک پہونچنا تو معلوم و معروف ہے، میزان کے نازل کرنے کا کیا مطلب ہے اس کے متعلق تفسیر روح المعانی مظہری وغیرہ میں ہے کہ انزالِ میزان سے مراد اُن احکام کا نزول ہے، جو ترازو کے استعمال کرنے اور انصاف کرنے کے متعلق نازل ہوئے، اور قرطبی نے فرمایا کہ در اصل انزال تو کتاب ہی کا ہوا ہے، ترازو کے وضع کرنے اور ایجاد کرنے کو اس کے ساتھ لگا دیا گیا ہے،

جیسا کہ عرب کے کلام میں اس کی نظائر موجود ہیں تو گویا مفہوم کلام کا یہ ہے کہ اَنْزَلْنَا الْکِتٰبَ وَ وَضَعْنَا الْمِیْزَانَ یعنی ہم نے اُتاری کتاب اور ایجاد کی ترازو، اس کی تائید سورۂ رحمٰن کی آیت (وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِیْزَانَ) سے بھی ہوتی ہے کہ اس میں میزان کے ساتھ لفظ وضع استعمال فرمایا ہے۔

اور بعض روایات میں ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام پر حقیقی معنی میں آسمان سے ترازو نازل کی گئی تھی اور حکم دیا گیا تھا کہ اس سے وزن کر کے حقوق پورے کرنا چاہئیں واللہ اعلم

کتاب اور میزان کے بعد ایک تیسری چیز کے نازل کرنے کا ذکر ہے، یعنی حدید (لوہا) اس کے نازل کرنے کا مطلب بھی اس کو پیدا کرنا ہے، جیسا کہ قرآن کریم کی ایک آیت میں چوپایہ جانوروں کے متعلق بھی لفظ انزال استعمال فرمایا ہے، حالانکہ وہ کہیں آسمان سے نازل نہیں ہوتے، زمین پر پیدا ہوتے ہیں، آیت یہ ہے وَاَنْزَلَ لَکُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ، یہاں باتفاق اَنْزَلْنَا سے مراد خَلَقْنَا ہے، یعنی تخلیق کو انزال کے لفظ سے تعبیر کر دیا ہے، جس میں اشارہ اس طرف پایا جاتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے وہ سب اس اعتبار سے منزّل من السماء ہے کہ اس کے پیدا ہونے سے بھی بہت پہلے وہ لوح محفوظ میں لکھا ہوا تھا۔ (روح)

حدید یعنی لوہے کو نازل کرنے کی دو حکمتیں آیت میں بیان فرمائی ہیں، اوّل یہ کہ مخالفین پر اس کا رعب پڑتا ہے، اور سرکشوں کو اس کے ذریعہ احکامِ الٰہیہ اور عدل و انصاف کے احکام کا پابند بنایا جاسکتا ہے، دوسرے یہ کہ اس میں لوگوں کے لئے بہت منافع حق تعالیٰ نے رکھے ہیں، کہ جس قدر صنعتیں اور ایجادات و مصنوعات دنیا میں ہوئی یا آئندہ ہو رہی ہیں اُن سب میں لوہے کی ضرورت ہے، لوہے کے بغیر کوئی صنعت نہیں چل سکتی۔

فائدہ:۔ یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اس آیت میں اصل مقصد پیغمبروں اور کتابوں کے بھیجنے اور میزانِ عدل ایجاد کرنے اور اس کے استعمال کرنے کا یہ بیان کیا ہے، کہ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ، یعنی لوگ انصاف پر قائم ہو جائیں، اس کے بعد ایک تیسری چیز یعنی لوہے کے نازل کرنے یعنی ایجاد کرنے کا بھی ذکر فرمایا گیا ہے، یہ بھی درحقیقت اُسی عدل و انصاف کی تکمیل کیلئے ہے جو پیغمبر اور کتاب کے نازل کرنے سے مقصود ہے، کیونکہ انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں عدل و انصاف قائم کرنے کے واضح دلائل دیتے ہیں، اور نہ کرنے کی صورت میں عذابِ آخرت سے ڈراتے ہیں، میزان ان حدود کو بتلاتی ہے جن سے انصاف کیا جاتا ہے، مگر سرکش معاند جو نہ کسی دلیل سے مانتا ہے نہ ترازو کی تقسیم کے مطابق عمل کرنے کو تیار ہے، اگر اس کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ دنیا میں عدل و انصاف قائم نہ ہونے دے گا، اس کو پابند کرنا لوہے اور تلوار کا کام ہے جو حکومت و

سیاست کرنے والے آخر میں بدرجۂ مجبوری استعمال کرتے ہیں۔

فائدۂ ثانیہ: یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ قرآن کریم نے دنیا میں عدل و انصاف کرنے کے لئے دو چیزوں کو تو اصل قرار دیا، ایک کتاب، دوسرے میزان، کتاب سے حقوق کی ادائیگی اور اس میں کمی بیشی کی ممانعت کے احکام معلوم ہوتے ہیں، اور میزان سے وہ حصے متعین ہوتے ہیں جو دوسروں کے حقوق ہیں، انہی دونوں چیزوں کے نازل کرنے کا مقصد لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ قرار دیا ہے، حدید کا ذکر اس کے بعد آخر میں فرمایا جس میں اشارہ ہے کہ اقامتِ عدل و انصاف کیلئے لوہے کا استعمال بدرجۂ مجبوری ہے، وہ اصل ذریعہ اقامتِ عدل و انصاف کا نہیں ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ خلقِ خدا کی اصل اصلاح اور ان کا عدل و انصاف پر قائم کرنا درحقیقت ذہنوں کی تربیت اور تعلیم سے ہوتا ہے، حکومت کا زور زبردستی دراصل اس کام کے لئے نہیں، بلکہ راستہ سے رکاوٹ دور کرنے کے لئے بدرجۂ مجبوری ہے، اصل چیز ذہنوں کی تربیت اور تعلیم و تلقین ہے۔

وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ، یہاں وَلِيَعْلَمَ حرف عطف کے ساتھ آیا ہے، روح المعانی میں ہے کہ یہ عطف ایک محذوف جملہ پر ہے، یعنی لِيَنْفَعَهُمْ اور مطلب آیت کا یہ ہو کہ ہم نے لوہا اس لئے پیدا کیا کہ مخالفوں پر اس کا رعب پڑے، اور اس لئے کہ لوگ اس سے صنعت و حرفت میں فائدہ اٹھائیں، اور اس لئے کہ قانونی اور ظاہری طور پر اللہ تعالیٰ یہ جان لیں کہ کون لوگ لوہے کے آلاتِ حرب کے ذریعہ اللہ اور اس کے رسولوں کے مددگار بنتے ہیں، اور دین کے لئے جہاد کرتے ہیں، قانونی اور ظاہری طور پر اس لئے کہا گیا ہے کہ ذاتی طور پر تو حق تعالیٰ کو سب کچھ پہلے ہی سے معلوم ہے، مگر انسان جب عمل کر لیتا ہے تو وہ نامۂ اعمال میں لکھا جاتا ہے، قانونی ظہور اس کا اسی سے ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَ

اور ہم نے بھیجا نوح کو اور ابراہیم کو اور ٹھہرا دی دونوں کی اولاد میں پیغمبری اور

الْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۶﴾ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى

کتاب پھر کوئی ان میں راہ پر ہے اور بہت ان میں نافرمان ہیں، پھر پیچھے بھیجے اُن کے

اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ

قدموں پر اپنے رسول اور پیچھے بھیجا ہم نے عیسٰی مریم کے بیٹے کو اور اس کو ہم نے دی انجیل

وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَرَهْبَانِيَّةَ

اور رکھ دی اس کے ساتھ چلنے والوں کے دل میں نرمی اور مہربانی اور ایک ترک کرنا دنیا کا

ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا

جو انھوں نے نئی بات نکالی تھی ہم نے نہیں لکھا تھا یہ اُن پر مگر کیا چاہنے کو اللہ کی رضامندی پھر نہ نباہا اس کو

حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ

جیسا چاہئے تھا نباہنا، پھر دیا ہم نے ان لوگوں کو جو ایمان دار تھے اُن کا بدلہ، اور بہت اُن میں

فٰسِقُوْنَ ﴿۲۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ

نافرمان ہیں، اے ایمان والو ڈرتے رہو اللہ سے اور یقین لاؤ اس کے رسول پر دے گا تم کو

كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ

دو حصے اپنی رحمت سے اور رکھ دے گا تم میں روشنی جس کو لئے پھرو اور تم کو معاف کرے گا

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۸﴾ لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ

اور اللہ معاف کرنیوالا ہے مہربان، تاکہ نہ جانیں کتاب والے کہ پا نہیں سکتے کوئی

عَلٰي شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ

چیز اللہ کے فضل میں سے اور یہ کہ بزرگی اللہ کے ہاتھ ہے دیتا ہے جس کو چاہے،

وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۹﴾ ع

اور اللہ کا فضل بڑا ہے۔

ع ۲۰

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے (مخلوق کی اسی اصلاحِ آخرت کے لئے) نوح (علیہ السلام) اور ابراہیم (علیہ السلام) کو پیغمبر بنا کر بھیجا اور ہم نے ان کی اولاد میں پیغمبری اور کتاب جاری رکھی (یعنی اُن کی اولاد میں بھی بعضے پیغمبر اور ان میں سے بعضے صاحبِ کتاب بنائے) سو (جن جن لوگوں کے پاس یہ پیغمبر آئے) اُن لوگوں میں بعضے تو ہدایت یافتہ ہوئے اور بہت سے ان میں نافرمان تھے (اور یہ مذکور پیغمبر تو صاحب شریعتِ مستقلہ تھے، ان میں بعضے صاحبِ کتاب بھی تھے جیسے موسیٰ علیہ السلام، جو حضرت نوح علیہ السلام اور ابراہیمؑ دونوں کی اولاد میں تھے، اور بعض اگرچہ صاحبِ کتاب نہیں تھے جیسے ہود اور صالح علیہما السلام کہ ان کا صاحبِ کتاب ہونا منقول نہیں مگر شریعت ان کی مستقل تھی، بہرحال بہت سے نبی تو صاحبِ شریعتِ مستقلہ بھیجے) پھر اُن کے بعد اور رسولوں کو (جو کہ صاحبِ شریعتِ مستقلہ نہ تھے) یکے بعد دیگرے

بھیجتے رہے (جیسے موسیٰ علیہ السلام کے بعد تورات کے احکام کی تعمیل کرانے کے لئے بہت سے پیغمبر آئے) اور ان کے بعد (پھر ایک صاحبِ شریعتِ مستقلہ کو یعنی) عیسیٰ بن مریم کو بھیجا اور ہم نے ان کو انجیل دی اور (ان کی اُمّت میں دو قسم کے لوگ ہوئے ایک ان کا اتباع کرنے والے یعنی اُن پر ایمان لانے والے اور دوسرے انکار کرنے والے) اور جن لوگوں نے ان کا اتباع کیا تھا (یعنی قسمِ اوّل) ہم نے انکے دلوں میں شفقت اور ترحّم (ایک دوسرے کے ساتھ جو کہ اخلاقِ حمیدہ میں سے ہے) پیدا کر دیا (کقولہ تعالیٰ فی الصحابۃ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ، اور شاید بوجہ اس کے کہ ان کی شریعت میں جہاد نہ تھا، اس کے مقابل کی صفت اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ ذکر نہیں فرمائی، غرض غالب اُن پر شفقت و رحمت تھی) اور (ہماری طرف سے تو ان لوگوں کو صرف احکام میں اتباع کرنے کا حکم ہوا تھا، لیکن ان متّبعین میں بعضے وہ ہوئے کہ) انھوں نے رہبانیت کو خود ایجاد کر لیا (رہبانیت کا حاصل نکاح اور جائز لذّتوں اور اختلاط کا چھوڑنا ہے، اور اس کے ایجاد کا سبب یہ ہوا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جب لوگوں نے احکامِ الٰہیہ کو چھوڑنا شروع کیا تو بعضے اہلِ حق بھی تھے جو اظہارِ حق کرتے رہتے تھے، یہ بات خواہشِ نفسانی والوں کو مشکل معلوم ہوئی اور انھوں نے اپنے بادشاہوں سے درخواست کی کہ ان لوگوں کو مجبور کیا جاوے کہ ہمارے ہم مشرب بن کر رہیں جب اُن کو مجبور کیا گیا تو انھوں نے درخواست کی کہ ہم کو اجازت دی جاوے کہ ہم ان لوگوں سے کوئی تعلق وغرض نہ رکھیں اور آزادانہ زندگی بسر کریں خواہ گوشہ میں بیٹھ کر یا سفر و سیاحت میں عمر گذار کر، چنانچہ اسی پر وہ چھوڑ دیئے گئے (کذا فی الدر المنثور) اس مقام پر یہی ذکر ہے کہ انھوں نے رہبانیت کو ایجاد کر لیا) ہم نے ان پر اس کو واجب نہ کیا تھا لیکن انھوں نے حق تعالیٰ کی رضا کے واسطے (اپنے دین کو محفوظ رکھنے کے لئے) اس کو اختیار کر لیا تھا سو (پھر اُن راہبوں میں زیادہ وہ ہوئے کہ) انھوں نے اس (رہبانیت) کی پوری رعایت نہ کی (یعنی جس غرض سے اس کو اختیار کیا تھا اور وہ غرض اللہ کی رضاء جوئی تھی اس کا اہتمام نہیں کیا یعنی اصل احکام کی بجا آوری نہ کی، گو صورۃً رہبان اور احکام کی بجا آوری کا اظہار کرتے رہے، اس طرح رہبانوں میں دو قسم کے لوگ ہوگئے، احکام کی رعایت کرنے والے، اور رعایت نہ کرنے والے، اور ان میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر تھے اُن کے حق میں رعایتِ احکام کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاویں، اس لئے عہدِ مبارک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں احکام کی رعایت واہتمام کرنے والے وہ لوگ ہوئے جو آپ پر ایمان لائے، اور جنھوں نے آپ پر ایمان سے گریز کیا وہ احکام کی رعایت نہ کرنے والوں میں شامل ہوئے) سو ان میں سے جو (حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر) ایمان لائے ہم نے ان کو ان کا اجر (وعدہ کیا ہوا) دیا (مگر ایسے کم تھے) اور زیادہ اُن میں نافرمان ہیں (کہ آپ پر ایمان نہیں لائے اور چونکہ اکثریت نافرمانوں کی تھی اس لئے سب ہی کی طرف رعایت نہ کرنا منسوب کر دیا گیا کہ فَمَا رَعَوْهَا فرمایا، معلوم ہوا کہ یہ نفیِ رعایت اکثر کے

اعتبار سے ہے اور قلیل جو ایمان لائے تھے ان کا بیان آخر آیت میں فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ میں بیان فرمایا۔

یہاں تک عیسائیوں میں سے ایمان لانے والوں اور نہ لانے والوں کی دو قسموں کا ذکر تھا، آگے ایمان والوں کا حکم ہے کہ) اے (عیسیٰ علیہ السلام پر) ایمان رکھنے والو تم اللہ سے ڈرو اور (اس ڈر کے مقتضیٰ پر عمل کرو یعنی) اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لاؤ اللہ تعالیٰ تم کو اپنی رحمت سے (ثواب کے) دو حصے دے گا (جیسے سورۂ قصص میں اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ الآیۃ ہے) اور تم کو ایسا نور عنایت کرے گا کہ تم اس کو لئے ہوئے چلتے پھرتے ہوگے (یعنی ایسا ایمان دے گا جو ہر وقت ساتھی رہے گا یہاں سے پل صراط تک) اور تم کو بخش دے گا (کیونکہ اسلام سے زمانہ کفر کے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں) اور اللہ غفور رحیم ہے (اور یہ دولتیں تم کو اس لئے عنایت کریگا) تاکہ (جس وقت ان عطایا کا ظہور ہو یعنی قیامت کے روز اس وقت) اہل کتاب کو (یعنی جو ایمان نہیں لائے ان کو) یہ بات معلوم ہو جاوے کہ ان لوگوں کو اللہ کے فضل کے کسی جزو پر بھی (بغیر ایمان لائے) دسترس نہیں اور یہ (بھی معلوم ہو جاوے) کہ فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہے دیدے (چنانچہ اسکی مشیت اس کے فضل کے ساتھ مسلمانوں سے متعلق ہوئی تو انہی کو عنایت فرما دیا) اور اللہ بڑے فضل والا ہے (مطلب یہ کہ ان کا غرور اور زعم ٹوٹ جاوے کہ وہ حالتِ موجودہ میں بھی اپنے کو فضل کا مورد اور مغفرت کا محل سمجھتے ہیں)۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں اس عالم کی ہدایت اور اس میں قسط یعنی عدل و انصاف قائم کرنے کے لئے انبیاء و رسول اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کرنے کا عمومی ذکر تھا، مذکور الصدر آیات میں ان میں سے خاص خاص انبیاء و رسل کا ذکر ہے، پہلے حضرت نوح علیہ السلام کا کہ وہ آدم ثانی ہیں، اور بعد طوفانِ نوح کے دنیا میں باقی رہنے والی سب مخلوق ان کی نسل سے ہے، دوسرے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جو ابو الانبیاء اور قدوۃ الخلائق ہیں ان دونوں کے ذکر کے ساتھ یہ اعلان فرما دیا کہ آئندہ جتنے انبیاء اور آسمانی کتابیں دنیا میں آئیں گی وہ سب انہی دونوں کی ذریت میں ہوں گی، یعنی حضرت نوح علیہ السلام کی وہ شاخ اس فضیلت کے لئے مخصوص کر دی گئی جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں، یہی وجہ ہے کہ بعد میں جتنے انبیاء مبعوث ہوئے اور جتنی کتابیں نازل ہوئیں وہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ہیں۔

ان کے خصوصی ذکر کے بعد پورے سلسلۂ انبیاء کو ایک مختصر جملے میں بیان فرمایا ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى

آثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا) آخر میں خصوصیت کے ساتھ آخر انبیاء بنی اسرائیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کر کے حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت کا ذکر فرمایا گیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والے اُن کے حواریین کی خاص صفت یہ بتلائی گئی (وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً) یعنی جن لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا انجیل کا اتباع کیا ہم نے اُن کے دلوں میں رأفت اور رحمت پیدا کر دی، یعنی یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے پر مہربان و رحیم ہیں، یا پوری خلق خدا کے ساتھ ان کو شفقت و رحمت کا تعلق ہے، رأفت و رحمت کے دونوں لفظ ایک دوسرے کے ہم معنی اور مرادف سمجھے جاتے ہیں، یہاں مقابلہ کی وجہ سے بعض حضرات نے فرمایا کہ رأفت شدتِ رحمت کو کہا جاتا ہے گویا عام رحمت سے اس میں زیادہ مبالغہ ہے، اور بعض نے فرمایا کہ کسی شخص پر رحمت و شفقت کے دو تقاضے عادۃً ہوتے ہیں، ایک یہ کہ وہ اگر کسی تکلیف و مصیبت میں مبتلا ہے تو اس کی تکلیف کو دُور کر دیا جائے اس کو رأفت کہا جاتا ہے، دوسرے یہ کہ اس کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ دیدی جائے، یہ رحمت ہے، غرض رأفت کا تعلق دفعِ مضرّت کے ساتھ ہے، اور رحمت کا جلبِ منفعت کے ساتھ، اور چونکہ دفعِ مضرت ہر اعتبار سے مقدم سمجھی جاتی ہے، اس لئے عموماً جب یہ دونوں لفظ یکجا بولے جاتے ہیں تو رأفت کو رحمت پر مقدم بولا جاتا ہے۔

یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصحاب جن کو حواریین کہا جاتا ہے اُن کی خصوصی صفت رأفت و رحمت بیان فرمائی گئی ہے، جیساکہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کی چند صفات سورۂ فتح میں بیان فرمائی ہیں، جن میں ایک صفت رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ بھی ہے، مگر وہاں اس صفت سے پہلے صحابہ کرام کی خاص صفت أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ بھی بیان فرمائی ہے، وجہ فرق کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی شریعت میں کفار سے جہاد و قتال کے احکام نہ تھے، اس لئے کفار کے مقابلہ میں شدت ظاہر کرنے کا وہاں کوئی محل نہ تھا واللہ اعلم

رہبانیت کا مفہوم اور ضروری تشریح

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا، رہبانیت، رہبان کی طرف منسوب ہے، راہب اور رہبان کے معنی ہیں ڈرنے والا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جب بنی اسرائیل میں فسق و فجور عام ہو گیا، خصوصاً ملوک اور رؤسا نے احکام انجیل سے کھلی بغاوت شروع کر دی، ان میں جو کچھ علماء و صلحاء تھے انھوں نے اس بدعملی سے روکا تو انکو قتل کر دیا گیا، جو کچھ بچ رہے انھوں نے دیکھا کہ اب منع کرنے اور مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں، اگر ہم ان لوگوں میں مل جل کر رہے تو ہمارا دین بھی برباد ہوگا، اس لئے ان لوگوں نے اپنے اوپر یہ بات لازم کر لی کہ اب دنیا کی سب جائز لذتیں اور آرام بھی چھوڑ دیں، نکاح نہ کریں، کھانے پینے کے سامان جمع کرنے کی فکر نہ کریں، رہنے سہنے کے لئے مکان اور گھر کا اہتمام نہ کریں، لوگوں سے دور کسی جنگل پہاڑ میں بسر کریں، یا پھر خانہ بدوشوں کی طرح زندگی سیاحت

میں گذار دیں، تاکہ دین کے احکام پر آزادی سے پورا پورا عمل کرسکیں، ان کا یہ عمل چونکہ خدا کے خوف سے تھا، اس لئے ایسے لوگوں کو راہب یا رہبان کہا جانے لگا، ان کی طرف نسبت کرکے ان کے طریقہ کو رہبانیت سے تعبیر کرنے لگے۔

ان کا یہ طریقہ چونکہ حالات سے مجبور ہو کر اپنے دین کی حفاظت کے لئے تھا اس لئے اصالۃً کوئی مذموم چیز نہ تھی، البتہ ایک چیز کو اللہ کے لئے اپنے اوپر لازم کرلینے کے بعد اس میں کوتاہی اور خلاف ورزی بڑا گناہ ہے، جیسے نذر اور منّت کا حکم ہے، کہ وہ اصل سے تو کسی پر لازم و واجب نہیں ہوتی، خود کوئی شخص اپنے اوپر کسی چیز کو نذر کرکے حرام یا واجب کرلیتا ہے تو پھر شرعاً اس کی پابندی واجب اور خلاف ورزی گناہ ہو جاتی ہے، مگر ان میں سے بعض لوگوں نے رہبانیت کا نام رکھ کر دنیا طلبی اور عیش و عشرت کا ذریعہ بنا لیا، کیونکہ عام آدمی ایسے لوگوں کے معتقد ہوئے، تحفے تحائف اور نذرانے آنے لگے، لوگوں کا ان کی طرف رجوع ہوا تو فواحش کی نوبت آنے لگی۔

قرآن کریم نے آیتِ مذکورہ میں ان کی اسی بات پر نکیر فرمائی، کہ خود ہی تو اپنے اوپر ترکِ لذّات کو لازم کیا تھا، جو منجانب اللہ اُن پر لازم نہ کیا گیا تھا، اور جب لازم کرلیا تو پھر اس کی پابندی ان کو کرنا چاہیے تھی، لیکن اسکی خلاف ورزی کی۔

ان لوگوں کا یہ طریقہ اصل سے مذموم نہ تھا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث اس پر شاہد ہے ابن کثیرؒ نے بروایت ابن ابی حاتم و ابن جریر ایک طویل حدیث نقل کی ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنی اسرائیل بہتّر فرقوں میں تقسیم ہوگئے تھے، جن میں سے صرف تین فرقوں کو عذاب سے نجات ملی، جنھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ظالم و جابر بادشاہوں اور دولت و قوت والے فاسق و فاجر لوگوں کو ان کے فسق و فجور سے روکا، اُن کے مقابلہ میں حق کا کلمہ بلند کیا، اور دین عیسیٰ علیہ السلام کی طرف دعوت دی، اُن میں سے پہلے فرقہ نے قوت کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا، مگر ان کے مقابلہ میں مغلوب ہو کر قتل کردیئے گئے، تو پھر ان کی جگہ ایک دوسری جماعت کھڑی ہوئی، جن کو مقابلہ کی اتنی بھی قوت و طاقت نہیں تھی، مگر کلمۂ حق پہونچانے کے لئے اپنی جانوں کی پروا کئے بغیر ان کو حق کی طرف بلایا، ان سب کو بھی قتل کردیا گیا، بعض کو آروں سے چیرا گیا، بعض کو زندہ آگ میں جلایا گیا، مگر انھوں نے اللہ کی رضا کے لئے ان سب مصائب پر صبر کیا، یہ بھی نجات پاگئے، پھر ایک تیسری جماعت ان کی جگہ کھڑی ہوئی، جن میں نہ مقابلہ کی قوت تھی نہ اُن کے ساتھ رہ کر خود اپنے دین پر عمل کرنے کی صورت بنتی تھی، اس لئے ان لوگوں نے جنگلوں اور پہاڑوں کا راستہ لیا، اور راہب بن گئے، یہی وہ لوگ ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر کیا ہے، وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل میں سے اصل رہبانیت اختیار کرنے والے جنھوں نے رہبانیت کے لوازم کی رعایت کی اور مصائب پر صبر کیا وہ بھی نجات یافتہ لوگوں میں سے ہیں۔

آیت مذکورہ کی اس تفسیر کا حاصل یہ ہوا کہ جس طرح کی رہبانیت ابتداءً اختیار کرنے والوں نے اختیار کی تھی وہ اپنی ذات سے مذموم اور بُری چیز نہ تھی، البتہ وہ کوئی حکم شرعی بھی نہیں تھا، ان لوگوں نے اپنی مرضی وخوشی سے اس کو اپنے اوپر لازم کرلیا تھا، بُرائی اور مذمت کا پہلو یہاں سے شروع ہوا کہ اس التزام کے بعد بعض لوگوں نے اس کو نبھایا نہیں، اور چونکہ تعداد ایسے ہی لوگوں کی زیادہ ہوگئی تھی، اس لئے لِلْاَکْثَرِ حُکْمُ الْکُلِّ، یعنی اکثریت کے عمل کو کُل کی طرف منسوب کردینا عرف عام ہے، اس قاعدہ کے موافق قرآن نے عام بنی اسرائیل کی طرف یہ منسوب کیا کہ انھوں نے جس رہبانیت کو اپنے اوپر لازم کرلیا تھا اس کو نبھاہا نہیں، اور اس کی شرائط کی رعایت نہیں کی، اسی کو فرمایا (فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس رہبانیت کے متعلق جو قرآن نے فرمایا اِبْتَدَعُوْهَا یعنی اس کو انھوں نے ایجاد کرلیا، اس میں لفظ ابتداع جو بدعت سے مشتق ہے وہ اس جگہ اپنے لغوی معنی یعنی اختراع و ایجاد کے لئے بولا گیا ہے، شریعت کی اصطلاحی بدعت مراد نہیں ہے جس کے بارے میں حدیث میں ارشاد ہے کُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ "یعنی ہر بدعت گمراہی ہے"۔

قرآن کریم کے نسق و نظم میں غور کریں تو یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے سب سے پہلے تو اس جملے پر نظر ڈالیے وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً وَرَهْبَانِيَّةَ، جس میں حق تعالیٰ نے اپنی نعمت کے اظہار کے سلسلے میں فرمایا کہ ہم نے ان کے دلوں میں رأفت، رحمت، رہبانیت پیدا کردی، نسق کلام بتلاتا ہے کہ جس طرح رأفت و رحمت مذموم نہیں اسی طرح ان کی اختیار کردہ رہبانیت بھی اپنی ذات سے کوئی مذموم چیز نہ تھی ورنہ مقام امتنان میں رأفت و رحمت کے ساتھ رہبانیت کا ذکر کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی، اسی لئے جن حضرات نے مطلقاً رہبانیت کو مذموم و ممنوع قرار دیا ان کو اس جگہ رہبانیت کے عطف میں غیر ضروری تاویل کرنا پڑی، کہ اس کو رأفت و رحمت پر عطف نہیں مانا بلکہ ایک مستقل جملہ یہاں محذوف قرار دیا یعنی اِبْتَدَعُوْا (کما فعلہ القرطبیؒ) لیکن مذکورہ تفسیر پر اس تاویل کی کوئی ضرورت نہیں رہتی، آگے بھی قرآن کریم نے ان کے اس ابتداع پر کوئی نکیر اور رد نہیں فرمایا، بلکہ نکیر اس پر کی گئی کہ انھوں نے اس اختیار کردہ رہبانیت کو نبھاہا نہیں، اس کے حقوق و شرائط کی رعایت نہیں کی، یہ بھی جب ہی ہوسکتا ہے کہ ابتداع کو لغوی معنی میں لیا جائے، شرعی اور اصطلاحی معنی ہوتے تو قرآن خود اس پر بھی نکیر کرتا، کیونکہ بدعت اصطلاحی خود ایک گمراہی ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی مذکورہ حدیث سے اور بھی یہ بات واضح ہوگئی کہ ترہّب اختیار کرنے والی جماعت کو نجات یافتہ جماعتوں میں شمار فرمایا، اگر یہ بدعتِ اصطلاحی کے مجرم ہوتے تو

نجات یافتہ میں شمار نہ ہوتے بلکہ گمراہوں میں شمار کئے جاتے۔

کیا رہبانیت مطلقاً مذموم و ناجائز ہے، یا اس میں کچھ تفصیل ہے؟ صحیح بات یہ ہے کہ لفظ رہبانیت کا عام اطلاق ترکِ لذات و ترک مباحات کے لئے ہوتا ہے، اس کے چند درجے ہیں، ایک یہ کہ کسی مباح و حلال چیز کو اعتقاداً یا عملاً حرام قرار دے، یہ تو دین کی تحریف و تغییر ہے، اس معنی کے اعتبار سے رہبانیت قطعاً حرام ہے، اور آیتِ قرآن (یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ) اور اس کی امثال میں اسی کی ممانعت و حرمت کا بیان ہے، اس آیت کا عنوان لَا تُحَرِّمُوْا خود یہ بتلا رہا ہے کہ اس کی ممانعت اس لئے ہے کہ یہ اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو اعتقاداً یا عملاً حرام قرار دے رہا ہے جو احکامِ الٰہیہ میں تبدیل و تحریف کے مرادف ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ مباح کے کرنے کو اعتقاداً یا عملاً حرام قرار نہیں دیتا، مگر کسی دنیوی یا دینی ضرورت کی وجہ سے اس کو چھوڑنے کی پابندی کرتا ہے، دنیوی ضرورت جیسے کسی بیماری کے خطرہ سے کسی مباح چیز سے پرہیز کرے، اور دینی ضرورت یہ کہ یہ محسوس کرے کہ میں نے اس مباح کو اختیار کیا تو انجام کار میں کسی گناہ میں مبتلا ہو جاؤں گا، جیسے جھوٹ، غیبت وغیرہ سے بچنے کے لئے کوئی آدمی لوگوں سے اختلاط ہی چھوڑ دے، یا کسی نفسانی رذیلہ کے علاج کے لئے چند روز بعض مباحات کو ترک کر دے اور اس ترک کی پابندی بطور علاج و دوا کے اس وقت تک کرے، جب تک یہ رذیلہ دُور نہ ہو جائے، جیسے صوفیائے کرام مبتدی کو کم کھانے کم سونے، کم اختلاط کی تاکید کرتے ہیں کہ یہ ایک مجاہدہ ہوتا ہے نفس کو اعتدال پر لانے کا جب نفس پر قابو ہو جاتا ہے، کہ ناجائز تک پہونچنے کا خطرہ نہ رہے تو یہ پرہیز چھوڑ دیا جاتا ہے، یہ درحقیقت رہبانیت نہیں، تقویٰ ہے جو مطلوب فی الدین اور اسلافِ کرام صحابہ و تابعین اور ائمہ دین سے ثابت ہے۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ کسی مباح کو حرام تو قرار نہیں دیتا مگر اس کا استعمال جس طرح سنت سے ثابت ہے اس طرح کے استعمال کو بھی چھوڑنا ثواب اور افضل جان کر اس سے پرہیز کرتا ہے، یہ ایک قسم کا غلو ہے، جس سے احادیث کثیرہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے، اور جس حدیث میں لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ آیا ہے، یعنی اسلام میں رہبانیت نہیں،، اس سے مراد ایسا ہی ترکِ مباحات ہے کہ ان کے ترک کو افضل و ثواب سمجھے، بنی اسرائیل میں جو رہبانیت اوّل شروع ہوئی وہ اگر حفاظتِ دین کی ضرورت سے تھی تو دوسری قسم یعنی تقویٰ میں داخل ہے، لیکن اہلِ کتاب میں غلو فی الدین کی آفت بہت تھی، وہ اس غلو میں پہلے درجہ میں تحریم حلال تک پہونچے تو حرام کے مرتکب ہوئے اور تیسرے درجہ تک رہے تو بھی ایک مذموم فعل کے مجرم بنے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ

اس آیت میں یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مراد اہل کتاب ہیں جو عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے، قرآن کریم کی عام عادت یہ ہے کہ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کا لفظ صرف مسلمانوں کے لئے بولا جاتا ہے، یہود و نصاریٰ کیلئے اہل کتاب کا لفظ آتا ہے، کیونکہ صرف حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام پر ان کا ایمان کافی اور معتبر نہیں جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائیں، اس لئے وہ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کہلانے کے مستحق نہیں، مگر یہاں اس عام عادت کے خلاف یہ لفظ نصاریٰ کے لئے بولا گیا، شاید اس میں حکمت یہ ہو کہ آگے ان کو حکم کیا گیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام پر صحیح ایمان لانے کا تقاضا یہ ہو کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لاؤ، اور جب وہ ایسا کرلیں تو اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے خطاب کے مستحق ہوگئے۔

آگے اس تکمیل ایمان پر ان سے یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ ان کو دوہرا اجر و ثواب ملے گا، ایک پہلے نبی حضرت موسیٰ یا عیسیٰ علیہما السلام پر ایمان لانے اور ان کی شریعت پر عمل کرنے کا اور دوسرا خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا اور آپؐ کی شریعت پر عمل کرنے کا، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ اگرچہ یہود و نصاریٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانے کے وقت تک کافر تھے اور کافر کی کوئی عبادت مقبول نہیں ہوتی، اس کا مقتضا یہ تھا کہ پچھلی شریعت پر جو عمل کیا وہ سب اکارت ہوگیا، مگر اس آیت نے یہ بتلادیا کہ اہل کتاب کا فر جب مسلمان ہوجائے تو زمانہ کفر کے کئے ہوئے نیک اعمال بھی پھر اس کے بحال کر دیئے جاتے ہیں، اس لئے دوہرا اجر ہوجاتا ہے۔

لِئَلَّا یَعْلَمَ اَھْلُ الْکِتٰبِ، اس میں لَا زائدہ ہے، معنی لِیَعْلَمَ اَھْلُ الْکِتٰبِ کے ہیں، اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ مذکور الصدر احکام اس لئے بیان کئے گئے تا کہ اہل کتاب سمجھ لیں کہ وہ اپنی موجودہ حالت میں ...... کہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر تو ایمان ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نہیں، اس حالت میں وہ اللہ کے کسی فضل کے مستحق نہیں جب تک حضرت خاتم الانبیاءؐ پر ایمان نہ لے آئیں، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

تمت سورۃ الحدید

بحمد اللہ تعالیٰ و عونہ للسادس والعشرین من الربیع الثانی
یوم الاثنین بعد العشاء، و یتلوہ انشاء اللہ سورۃ المجادلۃ !!!

سُورَةُ المُجَادَلَةِ

سُورَةُ المُجَادَلَةِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ اثْنَتَانِ وَعِشْرُونَ اٰيَةً وَّثَلٰثُ رُكُوعَاتٍ

سورۃ مجادلہ مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی بائیس آیتیں ہیں اور تین رکوع،

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے،

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْ إِلَى

سُن لی اللہ نے بات اس عورت کی جو جھگڑتی تھی تجھ سے اپنے خاوند کے حق میں اور جھینکتی تھی

اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۚ إِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ ① اَلَّذِيْنَ

اللہ کے آگے، اور اللہ سنتا تھا سوال و جواب تم دونوں کا بیشک اللہ سنتا ہے دیکھتا ہے، جو لوگ

يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآئِهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ۚ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ

ماں کہہ بیٹھیں تم میں سے اپنی عورتوں کو وہ نہیں ہو جاتیں ان کی مائیں، اُن کی مائیں تو وہی ہیں

اِلَّا الّٰٓـئِيْ وَلَدْنَهُمْ ۚ وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ۚ وَاِنَّ

جنھوں نے اُن کو جنا، اور وہ بولتے ہیں ایک ناپسند بات اور جھوٹی، اور اللہ

اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ② وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ

معاف کرنیوالا بخشنے والا ہے، اور جو لوگ ماں کہہ بیٹھیں اپنی عورتوں کو پھر کرنا

يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ۚ ذٰلِكُمْ

چاہیں وہی کام جس کو کہا ہے تو آزاد کرنا چاہیے ایک بردہ پہلے اس سے کہ آپس میں ہاتھ لگائیں اس سے

تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ③ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ

تم کو نصیحت ہوگی اور اللہ خبر رکھتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو، پھر جو کوئی نہ پائے تو روزے ہیں

شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَاۗسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ

دو مہینے کے لگاتار پہلے اس سے کہ آپس میں چھوئیں، پھر جو کوئی یہ نہ کرسکے تو کھانا دینا ہے

سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ۭ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ

ساٹھ محتاجوں کا، یہ (حکم) اس واسطے کہ تابعدار رہو جاؤ اللہ کے اور اس کے رسول کے اور یہ حدیں باندھی ہیں اللہ کی،

وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ④ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَاۗدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ

اور منکروں کیواسطے عذاب ہے دردناک، جو لوگ کہ مخالفت کرتے ہیں اللہ کی اور اس کے رسول کی وہ

كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۭ وَ

خوار ہوئے ہیں جیسے کہ خوار ہوئے وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے، اور ہم نے اتاری ہیں آیتیں بہت صاف، اور

لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ⑤ ۚ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا

منکروں کے واسطے عذاب ہے ذلت کا، جس دن کہ اٹھائے گا اللہ ان سب کو پھر جتلائے گا انکو

عَمِلُوْا ۭ اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ⑥ ع

ان کے کئے کام، اللہ نے وہ سب گن رکھے ہیں اور وہ بھول گئے اور اللہ کے سامنے ہے ہر چیز

سببِ نزول

اس سورت کی ابتدائی آیات کے نزول کا سبب ایک خاص واقعہ ہے کہ حضرت اوس بن الصامتؓ نے ایک مرتبہ اپنی بیوی خولہ کو یہ کہہ دیا کہ اَنْتِ عَلَيَّ كَظَهْرِ اُمِّيْ "تو میرے حق میں ایسی ہے جیسے میری ماں کی پشت یعنی حرام ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے زمانہ جاہلیت میں یہ لفظ ابدی اور دائمی حرمت کے لئے بولے جاتے تھے، جو طلاق مغلظہ سے بھی زیادہ سخت ہے، حضرت خولہؓ یہ واقعہ پیش آنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس کا حکم شرعی معلوم کرنے کے لئے حاضر ہوئیں، اس وقت تک اس خاص مسئلے کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی وحی نازل نہ ہوئی تھی، اس لئے آپؐ نے قول مشہور کے موافق ان سے فرمادیا مَا اَرَاكِ اِلَّا قَدْ حَرُمْتِ عَلَيْهِ یعنی میری رائے میں تو تم اپنے شوہر پر حرام ہوگئیں، وہ یہ سنکر واویلا کرنے لگیں کہ میری جوانی سب اس شوہر کی خدمت میں ختم ہوگئی، اب بڑھاپے میں انھوں نے مجھ سے یہ معاملہ کیا، میں کہاں جاؤں؟ میرا اور میرے بچوں کا گذارہ کیسے ہوگا؟ اور ایک روایت میں ہے کہ خولہ نے یہ عرض کیا کہ مَا ذَكَرَ طَلَاقًا، یعنی میرے شوہر نے طلاق کا

تو نام بھی نہیں لیا تو پھر طلاق کیسے ہوگئی، اور ایک روایت میں ہے کہ خولہؓ نے اللہ تعالیٰ سے فریاد کی اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَشْکُوْ اِلَیْکَ، اور ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے خولہؓ سے یہ فرمایا مَآ اُمِرْتُ فِیْ شَانِکِ بِشَیْءٍ حَتَّی الْاٰنَ، یعنی ابھی تک تمہارے مسئلے کے متعلق مجھ پر کوئی حکم نازل نہیں ہوا (ان سب روایات میں کوئی تضاد و تعارض نہیں، سبھی اقوال صحیح ہو سکتے ہیں) اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں، کذا فی الدر المنثور و ابن کثیر) اس لئے اس سورت کی ابتدائی آیات میں اس خاص مسئلے کا جس کا نام ظہار ہے حکم شرعی بیان فرمایا گیا، جس میں حق تعالیٰ نے حضرت خولہؓ کی فریاد سُنی اور ان کے لئے آسانی فرمادی، ان کی وجہ سے حق تعالیٰ نے قرآن میں یہ مستقل احکام نازل فرمادیئے، اسی لئے حضرات صحابہ ان کا بڑا احترام کرتے تھے، ایک روز فاروق اعظمؓ ایک مجمع کے ساتھ چلے جا رہے تھے، یہ عورت خولہؓ سامنے آکر کھڑی ہوگئیں، کچھ کہنا چاہتی تھیں حضرت عمرؓ نے راستہ میں ٹھہر کر اُن کی بات سُنی، بعض لوگوں نے کہا کہ آپ نے اس بڑھیا کی خاطر اتنے بڑے مجمع کو روکے رکھا، تو آپ نے فرمایا کہ خبر ہے یہ کون ہے؟ یہ وہ عورت ہے جس کی بات اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کے اوپر سُنی، میں کون تھا کہ ان کی بات کو ٹال دیتا، واللہ اگر یہ خود ہی رخصت نہ ہو جاتی تو میں رات تک ان کے ساتھ یہیں کھڑا رہتا (ابن کثیر)

خلاصۂ تفسیر

بے شک اللہ تعالیٰ نے اس عورت کی بات سُن لی جو آپؐ سے اپنے شوہر کے معاملے میں جھگڑتی تھی (مثلاً یہ کہتی تھی مَا ذَکَرَ طَلَاقًا، یعنی اُس نے طلاق کا صیغہ تو ذکر نہیں کیا پھر حرمت کیسے ہوگئی) اور (اپنے رنج و غم کی) اللہ تعالیٰ سے شکایت کرتی تھی (مثلاً یہ کہا تھا اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَشْکُوْ اِلَیْکَ) اور اللہ تعالیٰ تم دونوں کی گفتگو سُن رہا تھا (اور) اللہ تعالیٰ (تو) سب کچھ سننے والا سب کچھ دیکھنے والا ہے (تو اس کی بات کو کیسے نہ سنتا، اور قَدْ سَمِعَ اللّٰہُ سے خدا تعالیٰ کا مقصود لینے لئے سمع ثابت کرنا نہیں، بلکہ عورت کی تکلیف کو ختم کرنا اور اس کی عاجزی کو قبول کرنا ہے) تم میں جو لوگ اپنی بیبیوں سے ظہار کرتے ہیں (مثلاً یوں کہدیتے ہیں اَنْتِ عَلَیَّ کَظَھْرِ اُمِّیْ) وہ (بیبیاں) ان کی مائیں نہیں ہیں، اُن کی مائیں تو بس وہی ہیں جنھوں نے اُن کو جنا ہے (اس لئے یہ الفاظ کہنے سے یہ عورتیں ان کی مائیں نہیں ہوگئیں تاکہ ہمیشہ کی حرمت مثل ماں کے ثابت ہو جاوے، اور کوئی دوسرا سبب بھی دائمی حرمت کا کسی دلیل سے متحقق نہیں، مثلاً تحریم نسب، رضاع یا مصاہرۃ وغیرہ، پس دائمی حرمت کی نفی ہوگئی) اور وہ لوگ (جو کہ بیبیوں کو ماں کہتے ہیں) بلاشبہ ایک نامعقول اور جھوٹ بات کہتے ہیں (اس لئے گناہ ضرور ہوگا) اور (اگر اس گناہ کا تدارک کر دیا جاوے تو وہ گناہ معاف بھی ہو جاوے گا کیونکہ) یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کردینے والے بخش دینے والے ہیں اور (آگے اس تدارک کا بعض صورتوں کے اعتبار

سے بیان ہے کہ) جو لوگ اپنی بیبیوں سے ظہار کرتے ہیں، پھر اپنی کہی ہوئی بات (کے مقتضا) کی (جو تحریم زوجہ ہے) تلافی کرنا چاہتے ہیں (یعنی بیبیوں سے نفع حاصل کرنا چاہتے ہیں) تو اُن کے ذمہ ایک غلام یا لونڈی کا آزاد کرنا ہے قبل اس کے کہ دونوں (میاں بی بی) باہم اختلاط کریں (صحبت سے یا اسباب صحبت سے) اس (کفارہ کا حکم کرنے) سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے (کفارہ سے علاوہ تکفیر سیئات کے یہ بھی نفع ہے کہ اس سے آئندہ کو تمہیں تنبیہ ہو جاوے گی) اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے (کہ کفارہ کے متعلق پوری بجا آوری احکام کی کرتے ہو یا نہیں، پس کفارہ میں دو حکمتیں ہو گئیں، ایک گناہ کی معافی جس کی طرف اشارہ ہے لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ میں، دوسری زجر و تنبیہ جس کا تُوْعَظُوْنَ میں بیان ہے، اور یہ دوسری حکمت بھی کفارہ کی تینوں قسموں میں ہے، لیکن غلام یا لونڈی آزاد کرنا چونکہ کفارہ کے اقسام میں ذکراً مقدم ہے اس لئے اس کو اس کے ساتھ ذکر کر دیا گیا) پھر جس کو (غلام، لونڈی) میسر نہ ہو تو اس کے ذمہ پے بہ پے (یعنی لگاتار) دو مہینے کے روزے ہیں قبل اس کے کہ دونوں (میاں بی بی) باہم اختلاط کریں پھر جس سے یہ بھی نہ ہو سکیں تو اس کے ذمہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے، (آگے اس حکم کا مثل دیگر احکام کے واجب التصدیق ہونا اس لئے بیان فرماتے ہیں کہ اس حکم کا مقصد قدیم رسم اور جاہلیت کے حکم کو توڑنا ہے، اس لئے اہتمام مناسب ہوا پس ارشاد ہوا کہ) یہ حکم اس لئے (بیان کیا گیا) ہے تاکہ (اس حکم سے متعلق مصلحتوں کے حاصل کرنے کے علاوہ) اللہ اور رسول پر ایمان (بھی) لے آؤ (یعنی ان احکام میں اُن کی تصدیق بھی کرو کہ ایمان سے متعلق مصالح بھی حاصل ہوں) اور (آگے مزید تاکید کے لئے ارشاد ہے کہ) یہ اللہ کی حدیں (باندھی ہوئی) ہیں (یعنی خداوندی ضابطے ہیں) اور کافروں کے لئے (جو کہ ان احکام کی تصدیق نہیں کرتے بالخصوص) سخت دردناک عذاب ہوگا (اور مطلق عذاب عمل میں خلل ڈالنے والے کو بھی ہو سکتا ہے، اور کچھ اسی حکم کی تخصیص نہیں بلکہ) جو لوگ اللہ اور رسول کی مخالفت کرتے ہیں (خواہ کسی حکم میں کریں جیسے کفار مکہ) وہ (دنیا میں بھی) ایسے ذلیل ہوں گے جیسے ان سے پہلے لوگ ذلیل ہوئے (چنانچہ کئی غزوات میں اُس کا وقوع ہوا) اور (سزا کیسے نہ ہو کیونکہ ہم نے کھلے کھلے احکام (جن کی صحت اعجاز آیات سے ثابت ہے) نازل کئے ہیں (تو ان کا انکار لامحالہ موجب سزا ہوگا اور یہ سزا تو دنیا میں ہوگی) اور کافروں کو (آخرت میں بھی) ذلت کا عذاب ہوگا (اور آگے اس عذاب کا وقت بتلاتے ہیں کہ یہ اس روز ہوگا) جس روز ان سب کو اللہ تعالیٰ دوبارہ زندہ کرے گا پھر اُن سب کا کیا ہوا ان کو بتلا دیگا (کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے وہ محفوظ کر رکھا ہے اور یہ لوگ اس کو بھول گئے ہیں (خواہ حقیقۃً یا باعتبار بے فکری و بے التفاتی کے) اور اللہ ہر چیز پر مطلع ہے (خواہ ان کے اعمال ہوں یا اور کچھ)۔

معارف و مسائل

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ الآیۃ، ان آیات کا سببِ نزول جو اوپر بیان ہو چکا ہے اس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ یہ عورت جس کا ذکر اس آیت میں ہے وہ حضرت اوس ابن الصامتؓ کی بیوی خولہ بنت ثعلبہؓ ہیں، جن کے شوہر نے ان سے ظہار کر لیا تھا، اور یہ اس کی شکایت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔

حق تعالیٰ نے اس کو یہ عزت بخشی کہ اس کے جواب میں قرآن کی یہ آیات نازل ہوئیں اور ان میں صرف ظہار کا حکم شرعی اور اس کی تکلیف دور کرنے کا انتظام ہی نہیں فرمایا، بلکہ اس کی دلداری کے لئے شروع کلام میں فرما دیا کہ ہم اس عورت کی باتیں سن رہے تھے، جو اپنے شوہر کے معاملہ میں آپ سے مجادلہ کر رہی تھی، مجادلہ سے مراد وہ جھگڑا جس سے مراد ایک مرتبہ جواب دیدینے کے باوجود اپنی تکلیف کو بار بار بیان کر کے آپ کو متوجہ کرنا ہے، اور بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اُن کو یہ جواب دیا کہ تمھارے معاملہ میں مجھ پر کوئی حکم اللہ کا نازل نہیں ہوا تو اس پر غم زدہ کی زبان سے یہ نکلا کہ یوں تو آپ پر ہر چیز کے حکم نازل ہوتے رہتے ہیں میرے بارے میں کیا ہوا کہ وحی بھی رُک گئی؟ (قرطبی) اور اللہ تعالیٰ سے فریاد شروع کی وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ اس پر حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

حضرت صدیقہ عائشہؓ فرماتی ہیں پاک ہے وہ ذات جس کا سماع تمام آوازوں کو محیط ہے، ہر ایک کی آواز سنتا ہے میں اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھی، جب خولہ بنت ثعلبہؓ اپنے شوہر کی شکایت بیان کر رہی تھیں، مگر اتنے قریب ہونے کے باوجود ان کی بعض باتیں نہ سُن سکی تھی، مگر حق تعالیٰ نے اُن سب کو سُنا اور فرمایا قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ (بخاری، ابن کثیر)

اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ، يُظَاهِرُوْنَ، ظہار بکسر ظاء سے مشتق ہے جو بیوی کو اپنے اوپر حرام کر لینے کی ایک خاص صورت کے لئے بولا جاتا ہے اور زمانۂ اسلام سے پہلے رائج و معروف ہے، وہ صورت یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو یہ کہہ دے اَنْتِ عَلَیَّ کَظَھْرِ اُمِّیْ، یعنی تو مجھ پر ایسی حرام ہے جیسے میری ماں کی پشت، اس موقع پر پشت کا ذکر شاید بطور کنایہ کے ہے، کہ اصل مراد تو بطن تھا ذکر پشت کا کر دیا (کما ذکرہ القرطبی)

ظہار کی تعریف اور حکم شرعی

اصطلاح شرع میں ظہار کی تعریف یہ ہے کہ اپنی بیوی کو اپنی محرماتِ اَبدیہ، ماں بہن بیٹی وغیرہ کے کسی ایسے عضو سے تشبیہ دینا جس کو دیکھنا اس کے لئے جائز نہیں، ماں کی پشت بھی اس کی ایک مثال ہے، زمانۂ جاہلیت میں یہ لفظ دائمی حرمت کے لئے بولا جاتا تھا، اور طلاق کے لفظ سے بھی زیادہ شدید سمجھا جاتا تھا، کیونکہ طلاق کے بعد تو رجعت یا نکاح جدید ہو کر

پھر بیوی بن سکتی ہے مگر ظہار کی صورت میں رسم جاہلیت کے مطابق اُن کے آپس میں میاں بیوی ہو کر رہنے کی قطعی کوئی صورت نہ تھی۔

آیات مذکورہ کے ذریعہ شریعتِ اسلامیہ نے اس رسم کی اصلاح دو طرح فرمائی، اوّل تو خود اس رسم ظہار کو ناجائز و گناہ قرار دیا، کہ جس کو بیوی سے علیحدگی اختیار کرنا ہے اس کا طریقہ طلاق ہے اس کو اختیار کرے، ظہار کو اس کام کے لئے استعمال نہ کرے کیونکہ یہ ایک لغو اور جھوٹا کلام ہے کہ بیوی کو ماں کہہ دیا، قرآن کریم نے فرمایا مَا هُنَّ أُمَّهَاتِهِمْ إِنْ أُمَّهَاتُهُمْ إِلَّا اللَّائِي وَلَدْنَهُمْ، یعنی اُن کے اس بیہودہ کلام کی وجہ سے بیوی ماں نہیں بن جاتی، ماں تو وہی ہے جس کے بطن سے پیدا ہوا ہے، پھر فرمایا وَإِنَّهُمْ لَيَقُولُونَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُورًا، یعنی اُن کا یہ قول جھوٹ بھی ہے کہ خلاف واقع بیوی کو ماں کہہ رہا ہے اور منکر یعنی گناہ بھی ہے۔

دوسری اصلاح یہ فرمائی کہ اگر کوئی ناواقف جاہل یا احکامِ دین سے غافل آدمی ایسا کر ہی بیٹھے تو اس لفظ سے حرمتِ ابدی شریعتِ اسلام میں نہیں ہوتی، لیکن اس کو کھلی چھٹی بھی نہیں دیجاتی کہ ایسا لفظ کہنے کے بعد پھر بیوی سے پہلے کی طرح اختلاط و انتفاع کرتا رہے، بلکہ اس پر ایک جرمانہ کفارہ کا لگایا گیا، کہ اگر پھر یہ اپنی بیوی سے رجوع ہونا چاہتا ہے اور سابق کی طرح بیوی سے انتفاع چاہتا ہے تو کفارہ ادا کرکے اپنے اس گناہ کی تلافی کرے، بغیر کفارہ ادا کئے بیوی حلال نہ ہوگی، اگلی آیت میں وَالَّذِينَ يُظٰهِرُونَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا کا یہی مطلب ہے، يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا میں حرف لام کو عَنْ کے معنی میں لیا گیا، یعنی رجوع کرتے ہیں وہ اپنے قول سے اور حضرت ابن عباسؓ سے يَعُودُونَ کی تفسیر بلفظ يَنْدَمُونَ بھی منقول ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قول کہنے کے بعد وہ اپنے قول پر نادم ہو جائیں اور پھر بیوی سے اختلاط کرنا چاہیں (مظہری)

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کفارہ کا وجوب بیوی کے ساتھ اختلاطِ حلال ہونے کی غرض سے ہے اس کے بغیر حلال نہیں، خود ظہار اس کفارہ کی علت نہیں، بلکہ ظہار کرنا ایک گناہ ہے جس کا کفارہ توبہ و استغفار ہے، جس کی طرف آیت کے آخر میں وَإِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُورٌ سے اشارہ کر دیا گیا ہے، اس لئے اگر کوئی شخص ظہار کر بیٹھے اور اب بیوی سے اختلاط نہیں رکھنا چاہتا تو کوئی کفارہ لازم نہیں، البتہ بیوی کی حق تلفی ناجائز ہے، اگر وہ مطالبہ کرے تو کفارہ ادا کرکے اختلاط کرنا یا پھر طلاق دے کر آزاد کرنا واجب ہے، اگر یہ شخص خود نہ کرے تو بیوی حاکم اسلام کی طرف مراجعت کرکے شوہر کو اس پر مجبور کرسکتی ہے، یہ سب مسائل کتبِ فقہ میں مفصّل لکھے گئے ہیں۔

فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ الآیۃ، یعنی کفارہ ظہار کا یہ ہو کہ ایک غلام یا لونڈی آزاد کرے، اگر اس پر قدرت نہ ہو تو دو مہینے کے لگاتار مسلسل روزے رکھے، اور کسی بیماری یا ضعف کے

سبب اتنے روز دن پر بھی قدرت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے، یعنی دو وقت پیٹ بھرا ئی کھانا ساٹھ مسکینوں کو کھلاوے، اور کھانا کھلانے کے قائم مقام یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو فی کس ایک فطرہ کی مقدار گندم یا اس کی قیمت دیدے، فطرہ کی مقدار ہمارے موجودہ وزن کے اعتبار سے پونے دو سیر گندم ہے اس کی قیمت بھی دی جا سکتی ہے۔

ظہار سے متعلقہ احکام اور اس کے کفارہ کے مفصل مسائل کتب فقہ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ حضرت خولہ بنت ثعلبہؓ کی واویلا اور فریاد پر جب آیات مذکورہ اور کفارۂ ظہار کے احکام نازل ہوئے اور شوہر سے دائمی مفارقت و حرمت سے بچنے کا راستہ نکل آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے شوہر کو بلایا، دیکھا کہ ضعیف البصر بوڑھا آدمی ہے، آپؐ نے اس کو نازل شدہ آیات اور کفارہ کا حکم سنایا کہ ایک غلام یا لونڈی آزاد کردہ، اس نے کہا کہ یہ میری قدرت میں نہیں کہ غلام خرید کر آزاد کروں آپ نے فرمایا کہ پھر دو مہینے کے مسلسل روزے رکھو، اس نے کہا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ کو رسولِ برحق بنایا، میری حالت یہ ہے کہ اگر دن میں دو تین مرتبہ کھانا نہ کھاؤں تو میری نگاہ بالکل ہی جاتی رہتی ہے، آپؐ نے فرمایا کہ پھر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ، اس نے عرض کیا کہ یہ بھی میری قدرت میں نہیں بجز اس کے کہ آپ ہی کچھ مدد کریں، آپؐ نے اس کو کچھ غلّہ عطا فرمایا، پھر کچھ دوسرے لوگوں نے جمع کر دیا اس طرح ساٹھ مسکینوں کو فطرے کی مقدار دے کر کفارہ ادا ہو گیا (ابن کثیر)

ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

اس آیت میں لِتُؤْمِنُوْا فرمایا اور مراد ایمان سے شرائع و احکام پر عمل کرنا ہے، اور پھر فرمایا کہ یہ کفارہ وغیرہ کے احکام اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں، ان سے تجاوز کرنا حرام ہے، اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اسلام نے نکاح، طلاق، ظہار اور دوسرے سب معاملات میں جاہلیت کی رسوم کو مٹا کر ان کی جگہ معتدل اور صحیح طریقوں کی تعلیم دی ہے، تم اس پر قائم رہو اور جو لوگ ان حدود شرعیہ کے منکر اور کافر ہیں ان کو دردناک سزا ملے گی، اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَاۗدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ سابقہ آیت میں حدود اللہ اور شریعتِ اسلام کے احکام کی پابندی کی تاکید کی تھی، اس میں ان لوگوں پر وعید ہے جو حدود اللہ کے مخالف اور منکر ہیں، اس وعید میں اُن کے لئے دنیا میں بھی انجام کار ذلت و خواری اور ان کے کفریہ عزائم کی ناکامی کا بیان ہے اور آخرت میں عذاب الیم کا۔

اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ میں اس پر تنبیہ ہے کہ غافل انسان دنیا میں گناہ اور فسق و فجور کے کام کرتا رہتا ہے جو اس کو یاد بھی نہیں رہتے اور بھولنے کا سبب دراصل یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کام کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اس لئے ذہن میں بھی نہیں رہتا، وہ سب اللہ تعالیٰ کے پاس لکھے ہوئے ہیں، یہ تو کر کے بھول گئے، مگر اللہ تعالیٰ کو سب یاد ہیں سب پر محاسبہ اور عذاب ہوگا۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۖ مَا يَكُونُ مِنْ

تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ کو معلوم ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں، کہیں نہیں ہوتا

نَجْوٰى ثَلٰثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا

مشورہ تین کا جہاں وہ نہیں ہوتا ان میں چوتھا اور نہ پانچ کا جہاں وہ نہیں ہوتا ان میں چھٹا اور نہ

أَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَا أَكْثَرَ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوا ۖ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ

اس سے کم اور نہ زیادہ جہاں وہ نہیں ہوتا ان کے ساتھ جہاں کہیں ہوں، پھر جتلا دے گا ان کو

بِمَا عَمِلُوا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٧﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى

جو کچھ انھوں نے کیا قیامت کے دن، بیشک اللہ کو معلوم ہے ہر چیز ، تو نے نہ دیکھا اُن

الَّذِينَ نُهُوا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَيَتَنٰجَوْنَ

لوگوں کو جن کو منع ہوئی کانا پھوسی پھر بھی وہی کرتے ہیں جو منع ہو چکا ہے اور کانئیں باتیں کرتے ہیں

بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُولِ ۖ وَإِذَا جَاءُوكَ حَيَّوْكَ

گناہ کی اور زیادتی کی اور رسول کی نافرمانی کی اور جب آئیں تیرے پاس تجھ کو وہ دعا دیں

بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللَّهُ ۙ وَيَقُولُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللَّهُ

جو دعا نہیں دی تجھ کو اللہ نے اور کہتے ہیں اپنے دل میں کیوں نہیں عذاب کرتا ہم کو اللہ اس پر

بِمَا نَقُولُ ۚ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿٨﴾ يٰأَيُّهَا

جو ہم کہتے ہیں کافی ہے ان کو دوزخ داخل ہوں گے اس میں سو بُری جگہ پہنچے ، اے ایمان

الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَنٰجَيْتُمْ فَلَا تَتَنٰجَوْا بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَ

والو جب تم بات کرو کان میں تو مت کرو بات گناہ کی اور زیادتی کی اور

مَعْصِيَتِ الرَّسُولِ وَتَنٰجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي

رسول کی نافرمانی کی اور بات کرو احسان کی اور پرہیزگاری کی اور ڈرتے رہو اللہ سے جس

إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٩﴾ إِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِينَ

کے پاس تم کو جمع ہونا ہے ، یہ جو ہے کانا پھوسی سو شیطان کا کام ہے تاکہ دلگیر کرے

اٰمَنُوْا وَلَيْسَ بِضَاۗرِّهِمْ شَيْــــًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ
ایمان والوں کو اور وہ اُن کا کچھ نہ بگاڑے گا بدون اللہ کے حکم کے اور اللہ پر چاہئے کہ

الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي
بھروسہ کریں ایمان والے، اے ایمان والو جب کوئی تم کو کہے کہ کھل کر بیٹھو مجلسوں

الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا
میں تو کھل جاؤ اللہ کشادگی دے تم کو، اور جب کوئی کہے کہ اُٹھ کھڑے ہو تو اُٹھ کھڑے ہو

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ۭ
اللہ بلند کرے گا اُن کے لئے جو کہ ایمان رکھتے ہیں تم میں سے اور علم اُن کے درجے،

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۱۱ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ
اور اللہ کو خبر ہے جو کچھ تم کرتے ہو، اے ایمان والو جب تم کان میں بات کہنا چاہو

الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ
رسول سے تو آگے بھیجو اپنی بات کہنے سے پہلے خیرات، یہ بہتر ہے تمہارے

لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ۭ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۲ ءَاَشْفَقْتُمْ
حق میں اور بہت ستھرا، پھر اگر نہ پاؤ تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے، کیا تم ڈر گئے

اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ۭ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ
کہ آگے بھیجا کرو کان کی بات سے پہلے خیراتیں سو جب تم نے نہ کیا اور اللہ نے

اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ
معاف کر دیا تم کو تو اب تم قائم رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ اور حکم پر چلو اللہ اور اسکے رسول کے

وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۳ع
اور اللہ کو خبر ہے جو کچھ تم کرتے ہو،

٢٨٧/٢

شانِ نزول اسباب نزول ان آیات کے چند واقعات ہیں، اوّل یہود اور مسلمانوں میں صلح تھی، لیکن یہود جب کسی مسلمان کو دیکھتے تو اس کے خیالات پریشان کرنے کے لئے آپس میں سرگوشی

کرنے لگتے، وہ مسلمان سمجھتا کہ میرے خلاف کوئی سازش کر رہے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کو اس سے منع فرمایا مگر وہ باز نہ آئے، اس پر آیت اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى الخ نازل ہوئی۔

دوم : اسی طرح منافقین بھی باہم سرگوشی کیا کرتے اس پر آیت اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا الخ اور آیہ اِنَّمَا النَّجْوٰى الخ نازل ہوئی، سوم : یہود آپ کے حضور میں آتے تو براہِ شرارت بجائے اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ کہنے کے اَلسَّامُ عَلَيْكُمْ کہتے، سام بمعنی موت کے ہیں، چہارم منافقین بھی اسی طرح کہتے ان دونوں واقعوں پر وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ الخ نازل ہوا، اور ابن کثیر نے امام احمد کی روایت سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ یہود اس طرح سلام کر کے خفیہ کہتے لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ یعنی اگر ہم نے یہ گناہ کیا ہے تو ہم پر عذاب کیوں نہیں آتا، پنجم ایک بار آپ صُفّہ مسجد میں تشریف رکھتے تھے اور مجلس میں مجمع زیادہ تھا، چند صحابہ جو غزوۂ بدر کے شرکاء میں سے تھے آئے تو ان کو کہیں جگہ نہ ملی، اور نہ اہلِ مجلس نے ایسا کیا کہ مل مل کر بیٹھ جاتے جس سے جگہ کھل جاتی، آپ نے جب دیکھا تو بعضے آدمیوں کو مجلس سے اُٹھنے کے لئے فرما دیا، منافقین نے طعن کیا کہ یہ کونسی انصاف کی بات ہے، اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے جو اپنے بھائی کے لئے جگہ کھول دے، سو لوگوں نے جگہ کھول دی، اس پر آیت يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا الخ نازل ہوئی، رواہ ابن کثیر عن ابی حاتم، مجموعہ اجزاءِ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اول آپ نے جگہ کھولنے کے لئے فرمایا ہوگا، بعضوں نے تو جگہ کھول دی، جو کافی نہ ہوئی ہوگی، اور بعضوں نے جگہ نہیں کھولی، آپ نے تادیباً جیسے مدارس کے طلبہ میں ہوتا ہے اُن کو اُٹھ جانے کے لئے فرمایا جو کہ منافقین کو ناگوار ہوا۔

ششم بعض اغنیاء حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر بڑی دیر تک آپ سے سرگوشی کیا کرتے اور فقراء کو استفادہ کا وقت کم ملتا، آپ کو ان لوگوں کا دیر تک بیٹھنا اور دیر تک سرگوشی کرنا ناگوار گذرتا اس پر آیت اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ الخ نازل ہوئی، فتح البیان میں زید بن اسلم سے بلا سند نقل کیا ہے کہ یہود و منافقین بلاضرورت آپ سے سرگوشیاں کرتے، مسلمانوں کو اس خیال سے کہ شاید کسی نقصان دہ بات کی سرگوشی ہو ناگوار گذرتا، اس پر اُن کو منع کیا گیا، جس کا ذکر آیت نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى میں ہے، مگر جب وہ باز نہ آئے تو یہ حکم نازل ہوا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ الخ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ باطل اس سرگوشی سے رُک گئے، کیونکہ حُبِّ مال کی وجہ سے صدقہ اُن کو گوارا نہ تھا۔

ہفتم، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ دینے کا حکم ہوا تو بہت سے آدمی ضروری بات کرنے سے بھی رُک گئے، اس پر آیت ءَاَشْفَقْتُمْ نازل ہوئی، حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ صدقہ دینے کے حکم میں پہلے سے بھی فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا میں ناداروں کو رخصت دیدی گئی تھی، لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ نہ تو بالکل نادار ہوتے ہیں اور نہ پورے صاحبِ ثروت ہوتے ہیں گو صاحبِ نصاب ہوں، غالباً ایسے لوگوں کو تنگی پیش آئی ہوگی کہ کم وسعتی

کی وجہ سے تو خرچ کرنا شاق ہوا اور اپنی ناداری میں بھی شبہ ہوا، اس لئے نہ صدقہ دے سکے اور نہ اپنے کو محلِ رخصت سمجھا، اور سرگوشی کرنا کوئی عبادت نہ تھی کہ اس کا چھوڑنا ملامت کا سبب ہو سکے، اس لئے اس سے رُک گئے، (الروایات کلھا فی الدر المنثور) ان اسباب نزول سے فہم تفسیر میں اعانت وسہولت ہو گی (از بیان القرآن)

خُلاصۂ تفسیر

کیا آپ نے اس پر نظر نہیں فرمائی (مطلب اوروں کو سُنانا ہے جو ممنوع کی ہوئی سرگوشی سے باز نہ آتے تھے) کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے (اور اسی میں ان کی تناجی یعنی سرگوشی بھی داخل ہے پس) کوئی سرگوشی تین آدمیوں کی ایسی نہیں ہوتی جس میں چوتھا وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) نہ ہو اور نہ پانچ کی (سرگوشی) ہوتی ہے جس میں چھٹا وہ نہ ہو اور نہ اس (عدد) سے کم (میں ہوتی ہے جیسے دو یا چار آدمیوں میں) اور نہ اس سے زیادہ (میں ہوتی ہے، جیسے چھ سات یا زیادہ آدمیوں میں) مگر وہ (ہر حالت میں) اُن لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے، (خواہ) وہ لوگ کہیں بھی ہوں، پھر ان (سب) کو قیامت کے روز اُن کے کئے ہوئے کام بتلا دے گا، بے شک اللہ تعالیٰ کو ہر بات کی پوری خبر ہے (اس آیت کا مضمون بعنوان کلی اگلے مضامین جزئیہ کی تمہید ہے یعنی یہ ایذاء مسلمین کے لئے باطل سرگوشی کرنے والے خدا سے ڈرتے نہیں کہ خدا کو سب خبر ہے اور ان کو سزا دے گا، آگے وہ جزئی مضامین ہیں، یعنی) کیا آپ نے ان لوگوں پر نظر نہیں فرمائی جن کو سرگوشی سے منع کر دیا گیا تھا (مگر) پھر (بھی) وہ وہی کام کرتے ہیں جس سے اُن کو منع کر دیا گیا تھا اور گناہ اور ظلم اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشیاں کرتے ہیں (یعنی ایسی سرگوشی کرتے ہیں جس میں بوجہ منہی عنہ ہونے کے خود بھی گناہ ہے اور مسلمانوں کو غمگین کرنے کی وجہ سے عدوان یعنی ظلم بھی ہے، اور بوجہ اس کے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم منع فرما چکے تھے رسول کی نافرمانی بھی ہے جیسا واقعہ اوّل اور دوم میں بیان ہوا) اور وہ لوگ (ایسے ہیں کہ) جب آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ کو ایسے لفظ سے سلام کرتے ہیں جس سے اللہ نے آپ کو سلام نہیں فرمایا (یعنی اللہ تعالیٰ کے الفاظ تو یہ ہیں سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ، سَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى، صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا، اور وہ کہتے ہیں اَلسَّامُ عَلَيْكَ) اور اپنے جی میں (یا اپنے آپس میں) کہتے ہیں کہ (اگر یہ پیغمبر ہیں تو) اللہ تعالیٰ ہم کو ہمارے اس کہنے پر (جس میں سراسر آپ کی بے ادبی ہے) سزا (فوراً) کیوں نہیں دیتا (جیسا واقعہ سوم و چہارم میں گذرا، آگے ان کے اس فعل کی وعید اور اس قول کا جواب ہے کہ جلدی عذاب بعض حکمتوں کے سبب نہ آنے سے مطلقاً عذاب نہ دینا لازم نہیں آتا) اُن (کی سزا)

کے لئے جہنم کافی ہے اس میں یہ لوگ (ضرور) داخل ہوں گے سو وہ بُرا ٹھکانا ہے (آگے ایمان والوں کو خطاب ہے جس سے منافقین کے ساتھ مشابہت کرنے سے ان کو بھی ممانعت کی گئی ہے اور منافقین کو بھی سُنانا منظور ہے کہ تم تو مدعی ایمان کے ہو تو مقتضائے ایمان پر عمل کرو پس ارشاد ہے کہ) اے ایمان والو جب تم (کسی ضرورت سے) سرگوشی کرو تو گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشیاں مت کرو (تفسیر ان الفاظ کی ابھی گذری ہے) اور نفع رسانی اور پرہیزگاری کی باتوں کی سرگوشیاں کرو (بِرّ عُدْوَان کا مقابل ہے، اس سے مراد وہ نفع ہے جو دوسروں تک پہنچے، اور تقویٰ، اثم اور معصیت الرسول یعنی رسول کی نافرمانی کا مقابل ہے) اور اللہ سے ڈرو جس کے پاس تم سب جمع کئے جاؤ گے، ایسی سرگوشی محض شیطان کی طرف سے (یعنی اس کے بہکانے سے) ہے تاکہ مسلمانوں کو رنج میں ڈالے (جیسا واقعہ اوّل میں بیان ہوا) اور (آگے اُن مسلمانوں کی تسلّی ہے کہ رنجیدہ نہ ہوا کریں، کیونکہ) وہ (شیطان) بدون خدا کے ارادہ کے ان (مسلمانوں) کو کچھ ضرر نہیں پہونچا سکتا (مطلب یہ کہ اگر بالفرض وہ شیطان کے بہکانے سے تمہارے خلاف ہی کوئی تدبیر کر رہے ہیں تب بھی وہ ضرر بغیر مشیت ازلیہ کے تم کو نہیں پہونچ سکتا پھر کیوں فکر میں پڑتے ہو) اور مسلمانوں کو (ہر امر میں) اللہ ہی پر توکل کرنا چاہئے (آگے واقعہ پنجم کے متعلق حکم ہے، یعنی مجلس میں کچھ لوگ بعد میں آجائیں تو اُن کے لئے جگہ کھولنے کا حکم ہے کہ) اے ایمان والو! جب تم سے کہا جاوے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمادیں یا اولی الامر یا واجب الاطاعت لوگوں میں سے کوئی کہے) کہ مجلس میں جگہ کھول دو (جس میں آنے والے کو بھی جگہ مل جاوے) تو تم جگہ کھول دیا کرو (اور آنے والے کو جگہ دیدیا کرو) اللہ تعالیٰ تم کو (جنت میں) کھلی جگہ دے گا اور (جب (کسی ضرورت سے) یہ کہا جاوے کہ (مجلس سے) اُٹھ کھڑے ہو تو اُٹھ کھڑے ہوا کرو (خواہ اُٹھنے کے لئے اس غرض سے کہا جاوے کہ آنے والے کے لئے جگہ کھل جاوے اور خواہ اس وجہ سے کہا جاوے کہ صدر مجلس کو اُس وقت کسی مصلحت، مشورۂ خاص یا کسی ضرورت آرام یا عبادت وغیرہ سے تنہائی کی ضرورت ہو جو بغیر تنہائی کے مطلقاً حاصل نہ ہوسکیں یا کامل نہ ہوسکیں، بس صدر مجلس کے کھڑے ہونے کے حکم سے اُٹھ جانا چاہئے، اور یہ حکم غیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی عام ہے، کذا فی الروح، پس صاحب مجلس کو ضرورت کے وقت اس کی اجازت ہے کہ کسی شخص کو اُٹھ جانے کے لئے کہہ دے، البتہ آنے والے کو نہ چاہئے کہ کسی کو اُٹھا کر اس کی جگہ بیٹھ جاوے، جیسا کہ حدیث میں ہے، (رواہ الشیخان)، غرض حکم یہ دیا گیا کہ صدر مجلس کے کہنے سے اُٹھ جایا کرو) اللہ تعالیٰ (اس حکم کی اطاعت سے) تم میں ایمان والوں کے اور (ایمان والوں میں) اُن لوگوں کے (اور زیادہ) جن کو علم (دین) عطا ہوا ہے (اخروی) درجے بلند کردے گا (یعنی اس حکم کو بجالانے والوں کی تین قسمیں ہیں، ایک کفار جو کسی مصلحتِ دنیویہ سے مان لیں جیسے منافقین وہ تو لفظ مِنْكُمْ کی بناء پر اس وعدہ سے خارج ہیں

دوسرے اہلِ ایمان جو صاحبِ علم نہ ہوں ان کے لئے محض رفع درجات ہے، تیسرے وہ اہلِ ایمان جو اہلِ علم بھی ہوں، چونکہ بوجہ علم و معرفت ان کے عمل کا منشاء زیادہ خشیت و زیادہ خلوص ہے، جس سے عمل کا ثواب بڑھ جاتا ہے ان کے لئے مزید رفع درجات ہیں) اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے (کہ کس کا عمل ایمان کے ساتھ ہے اور کس کا بغیر ایمان کے، پھر اس میں کس کے عمل میں کم خلوص ہے اور کس کے عمل میں زیادہ خلوص ہے، اس لئے ہر ایک کی جزاء و ثمرہ میں تفاوت رکھا، آگے واقعۂ ششم کے متعلق حکم ہے جو واقعہ اول و دوم سے مربوط ہے یعنی) اے ایمان والو جب تم رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سرگوشی (کرنے کا ارادہ) کیا کرو تو اپنی اس سرگوشی سے پہلے کچھ خیرات (مساکین کو) دیدیا کرو (جس کی مقدار آیت میں منصوص نہیں، اور روایاتِ حدیث میں مختلف مقداریں آئی ہیں، ظاہراً مقدار غیر معیّن معلوم ہوتی ہے، لیکن معتدبہ ہونا ضروری ہے) یہ تمہارے لئے (ثواب حاصل کرنے کے واسطے) بہتر ہے اور (گناہوں سے) پاک ہونے کا اچھا ذریعہ ہے (کیونکہ طاعت سے گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے، یہ مصلحت مالدار مؤمنین کے اعتبار سے ہے، اور فقراء مؤمنین کے اعتبار سے یہ ہے کہ ان کو نفع مالی پہنچے گا، جیسے لفظ صدقہ سے معلوم ہوتا ہے، کیونکہ صدقہ کے مصارف فقراء ہی ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتبار سے یہ ہے کہ اس میں آپؐ کی شان کی بلندی ہے، اور منافقین کی سرگوشی سے آپ کو جو تکلیف ہوتی تھی اس سے نجات اور آرام ہے، کیونکہ ان کو ضرورت تو تناجی یعنی سرگوشی کی تھی نہیں، اور بے ضرورت محض اس لئے مال خرچ کرنا ان کو ازحد شاق تھا، اور غالباً اس صدقہ میں حکم یہ ہوگا کہ سب کے سامنے صدقہ کریں تاکہ نہ کرنے والا دھوکہ نہ دے سکے، آگے فرماتے ہیں کہ یہ حکم تو مقدور کی حالت میں ہے) پھر اگر تم کو (صدقہ دینے کا) مقدور نہ ہو (اور ضرورت پڑے سرگوشی کی) تو اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے (اس صورت میں اس نے تم کو معاف کر دیا ہے، اس سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم صدقہ کا واجب تھا، مگر ناداری کی صورت مستثنیٰ تھی، آگے واقعۂ ہفتم کے متعلق جو کہ واقعۂ ششم سے مربوط ہے ارشاد ہے کہ) کیا تم (یعنی تم میں کے بعض جن کا بیان واقعہ ہفتم کے ذیل میں ہوا ہے) اپنی سرگوشی کے قبل خیرات دینے سے ڈر گئے سو (خیر) جب تم (اس کو) نہ کر سکے اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے حال پر عنایت فرمائی (کہ بالکل اس کو منسوخ کر کے معاف فرما دیا جس کی حکمت ظاہر ہے کہ جس مصلحت کے واسطے یہ حکم واجب ہوا تھا وہ مصلحت حاصل ہو گئی کیونکہ مصلحت سدِّ باب بھی جو بعد نسخ بھی باقی رہی کہ لوگ احتیاط کرنے لگے، غرض ارشاد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو منسوخ فرما دیا) تو تم (دوسری عبادت کے پابند رہو یعنی) نماز کے پابند رہو اور زکوٰۃ دیا کرو اور اللہ و رسولؐ کا کہنا مانا کرو (مطلب یہ ہے کہ اس کے نسخ کے بعد تمہارے قرب و قبولِ نجات کے لئے احکام باقیہ پر استقامت و ہمیشگی ہی کافی ہے) اور اللہ کو تمہارے سب اعمال کی (اور ان کی حالت ظاہری و باطنی کی) پوری خبر ہے

معارف و مسائل

آیات مذکورہ اگرچہ خاص واقعات کی بناء پر نازل ہوئی ہیں جن کا ذکر اوپر شانِ نزول میں آچکا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ سبب نزول کچھ بھی ہو ہدایاتِ قرآنی عام ہوتی ہیں، ان میں عقائد و عبادات اور معاملات و معاشرت کے متعلق تمام احکام ہوتے ہیں، ان آیات میں بھی باہمی سرگوشی اور مشورے کے متعلق چند ایسی ہی ہدایات ہیں۔

خفیہ مشوروں کے متعلق ایک ہدایت

خفیہ مشورہ عموماً مخصوص رازدار دوستوں میں ہوتا ہے، جن پر یہ اطمینان کیا جاتا ہے کہ اِس راز کو کسی پر ظاہر نہ کریں گے، اس لئے ایسے موقع پر ایسے منصوبے بھی بنائے جاتے جن میں کسی پر ظلم کرنا ہے، کسی کو قتل کرنا ہے، کسی کی املاک پر قبضہ کرلینا ہے، وغیر ذٰلک، حق تعالیٰ نے ان آیات میں ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا علم ساری کائنات پر حاوی ہے تم کہیں کیسا ہی چھپ کر مشورہ کرو اللہ تعالیٰ اپنے علم اور سمع و بصر کے اعتبار سے تمھارے پاس موجود ہوتا ہے، اور تمھاری ہر بات کو دیکھتا سنتا اور جانتا ہے، اگر اس میں کوئی گناہ کروگے تو سزا سے نہ بچوگے، اس میں بتلانا تو یہ ہے کہ تم کتنے ہی کم یا زیادہ آدمی مشورہ اور سرگوشی میں شریک ہو حق تعالیٰ ان میں موجود ہوتا ہے، مثال کے طور پر دو عدد بتلادیئے گئے، تین اور پانچ، یعنی اگر تم تین آدمی مشورہ کر رہے ہو تو سمجھو کہ چوتھا اللہ تعالیٰ وہاں موجود ہے، اور پانچ آدمی مشورہ کر رہے ہو تو سمجھو کہ چھٹا حق تعالیٰ موجود ہے، تین اور پانچ کے عدد کی تخصیص میں شاید اس طرف اشارہ ہو کہ جماعت کے لئے اللہ کے نزدیک طاق عدد پسندیدہ ہے (مَا يَكُونُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ الآیہ) کا یہی حاصل ہے۔

سرگوشی اور مشورے کے متعلق ایک ہدایت،

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى، واقعۂ شانِ نزول میں بتلایا گیا ہے کہ جس زمانے میں یہود سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدۂ صلح ہوگیا تھا اس وقت وہ کھل کر تو مسلمانوں کے خلاف کوئی کام نہ کرسکتے تھے، مگر اسلام اور مسلمانوں سے دل میں بھرا ہوا بغض نکالنے کا ایک یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ جب صحابہ کرام میں سے کسی کو اپنے قریب آتے دیکھتے تو باہم سرگوشی اور خفیہ مشورہ کی شکل بنالیتے، اور آنے والے مسلمانوں کی طرف کچھ اشارے کرتے جس سے ان کو یہ خیال پیدا ہوتا کہ ہمارے خلاف کوئی سازش کر رہے ہیں اور اس سے پریشانی اور رنج ہوتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو ایسی سرگوشی سے منع فرمایا، نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى میں اسی ممانعت کا بیان ہے۔

اس ممانعت سے یہ حکم مسلمانوں کے لئے بھی نکل آیا کہ وہ بھی آپس میں کوئی سرگوشی اور مشورہ اس طرح نہ کریں جس سے دوسرے کسی مسلمان کو ایذاء پہونچے۔

بخاری و مسلم وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا: اِذَا کُنْتُمْ ثَلٰثَۃً فَلَا یَتَنَاجٰی رَجُلَانِ دُوْنَ الْاٰخَرِ حَتّٰی یَخْتَلِطُوْا بِالنَّاسِ فَاِنَّ ذٰلِکَ یُحْزِنُہٗ، یعنی جس جگہ تم تین آدمی جمع ہو تو دو آدمی تیسرے کو چھوڑ کر باہم سرگوشی اور خفیہ باتیں نہ کیا کرو جب تک دوسرے آدمی نہ آجائیں، کیونکہ اس سے اس کی دلشکنی ہوگی" (غیریت اور اجنبیت کا احساس ہوگا اور ممکن ہے کہ ایسے شبہات پیدا ہو جائیں کہ شاید یہ دونوں کوئی بات میرے خلاف کر رہے ہیں جو مجھ سے چھپاتے ہیں) (از مظہری)

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَیْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِیَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰی، سابقہ آیات میں کفار کو ناجائز سرگوشی پر تنبیہ کی گئی تھی، اس آیت میں مسلمانوں کو ہدایت ہے، کہ اپنی سرگوشیوں اور مشوروں میں اس کا دھیان رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارے سب حالات اور گفتگو کا علم ہے اور اس استحضار کے ساتھ یہ کوشش کریں کہ اُن کے مشورے اور سرگوشی میں کوئی بات فی نفسہٖ گناہ کی یا دوسروں پر ظلم کرنے کی یا کسی خلافِ شرع کام کی نہ ہو، بلکہ جب بھی آپس میں مشورہ کرو نیک کاموں کے لئے کرو۔

کفار کی شرارت پر بھی نرمی اور شریفانہ مدافعت کی ہدایت

سابقہ آیات کے ضمن میں یہودیوں اور منافقوں کی ایک شرارت یہ بھی ذکر کی گئی ہے کہ وہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو بجائے اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کے اَلسَّامُ عَلَیْکُمْ کہتے تھے، سام کے معنی موت کے ہیں، اور لفظوں میں زیادہ فرق نہ ہونے کے سبب مسلمانوں کو اس طرف التفات نہ ہوتا تھا، ایک روز ایسا ہی ہوا، صدیقہ عائشہؓ بھی سن رہی تھیں جب انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اَلسَّامُ عَلَیْکُمْ کہا تو صدیقہ عائشہؓ نے جواب دیا اَلسَّامُ عَلَیْکُمْ وَلَعَنَکُمُ اللّٰہُ وَغَضِبَ عَلَیْکُمْ یعنی ہلاکت تم پر ہو اور خدا کی لعنت و غضب" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیقہؓ کو ایسا کہنے سے روکا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فحش کلام کو پسند نہیں فرماتے، آپ کو سختی و درشتی سے بچنا اور نرمی اختیار کرنا چاہئے، صدیقہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ کیا آپ نے نہیں سنا کہ ان لوگوں نے آپ کو کیا کہا ہے، آپؐ نے فرمایا کہ ہاں سن بھی لیا اور اس کا معتدل بدلہ بھی لے لیا، کہ میں نے جواب میں کہہ دیا عَلَیْکُمْ یعنی ہلاکت تم پر ہو" اور یہ ظاہر ہے کہ ان کی دعاء قبول ہوگی نہیں، میری دعاء قبول ہوگی، اس لئے اُن کی شرارت کا بدلہ ہوگیا (رواہ البخاری از مظہری)

بعض آدابِ مجلس

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِیْلَ لَکُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا الاٰیۃ، یہ حکم عام مجالس کا ہے جہاں مسلمانوں کا اجتماع ہو کہ جب مجلس میں کچھ لوگ بعد میں آجائیں تو مسلمان اُن کیلئے جگہ دینے کی کوشش کریں اور سمٹ کر بیٹھ جائیں، ایسا کرنے پر اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ اُن کیلئے اللہ تعالیٰ وسعت پیدا فرما دیں گے، یہ وسعت آخرت میں تو ظاہر ہی ہے، کچھ بعید نہیں کہ دنیوی معیشت میں بھی یہ وسعت حاصل ہو۔

اس آیت میں دوسرا حکم آداب مجلس کے متعلق یہ ہے کہ اِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا " یعنی جب (تم میں سے کسی سے) کہا جائے کہ مجلس سے اُٹھ جاؤ تو اُسے اُٹھ جانا چاہئے "۔ اس آیت میں لفظ قِيْلَ مجہول استعمال فرمایا ہے اس کا ذکر نہیں کہ یہ کہنے والا کون ہو، مگر احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خود آنے والے شخص کو اپنے لئے جگہ کرنے کے واسطے کسی کو اس کی جگہ سے اُٹھانا جائز نہیں۔

صحیحین اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا يُقِيْمُ الرَّجُلُ الرَّجُلَ مِنْ مَّجْلِسِهٖ فَيَجْلِسُ فِيْهِ وَلٰكِنْ تَفَسَّحُوْا وَتَوَسَّعُوْا، یعنی کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو اس کی جگہ سے اُٹھا کر اس کی جگہ نہ بیٹھے، بلکہ مجلس میں کشادگی پیدا کر کے آنے والے کو جگہ دیدیا کرو (ابن کثیر)

اس سے معلوم ہوا کہ کسی کو اس کی جگہ سے اُٹھ جانے کے لئے کہنا آنے والے شخص کے لئے تو جائز نہیں اس لئے ظاہر یہ ہے کہ اس کا کہنے والا امیر مجلس یا مجلس کا انتظام کرنے والے افراد ہو سکتے ہیں، تو مطلب آیت کا یہ ہوا کہ اگر میر مجلس یا اس کی طرف سے مقرر کردہ منتظمین کسی کو اس کی جگہ سے اُٹھ جانے کیلئے کہیں تو ادب مجلس یہ ہے کہ اُن سے مزاحمت نہ کرے، اپنی جگہ سے اُٹھ جائے، کیونکہ بعض اوقات خود صاحبِ مجلس کسی ضرورت سے خلوت اختیار کرنا چاہتا ہے، یا کچھ مخصوص لوگوں سے کوئی راز کی بات کرنا چاہتا ہے، یا بعد میں آنے والے حضرات کے لئے اس کے سوا کوئی انتظام نہیں پاتا کہ بعض بے تکلّف لوگوں کو مجلس سے اُٹھا دے جن کے متعلق معلوم ہو کہ ان کا کوئی نقصان مجلس سے اُٹھنے میں نہیں ہوگا، یہ دوسرے وقت میں استفادہ کر سکیں گے۔

البتہ صاحبِ مجلس یا منتظمینِ مجلس کے لئے یہ لازم ہے کہ طریقہ ایسا اختیار کریں کہ اُٹھنے والا اپنی خفّت محسوس نہ کرے، اس کو ایذا نہ پہونچے۔

اور جس واقعہ میں یہ آیت نازل ہوئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صُفّہ مسجد میں تشریف رکھتے تھے، یہ جگہ حاضرین سے پُر ہو چکی تھی، بعد میں بعض اکابرِ صحابہ جو شرکاء بدر ہونے کے سبب قابلِ احترام زیادہ تھے وہ پہونچے، اور جگہ نہ ہونے کے سبب کھڑے رہے، اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے تو عام حکم یہ دیا کہ ذرا کھسک کر مجلس میں کشادگی پیدا کرو اور اُن کو جگہ دیدو، اور بعض حضرات صحابہ کو اُٹھ جانے کے لئے بھی فرمایا، جن کو مجلس سے اٹھایا ان میں یہ بھی احتمال ہے کہ وہ ہر وقت کے حاضر باش لوگ ہوں جن کے اس وقت کی مجلس سے اُٹھ جانے میں کوئی بڑا نقصان نہیں تھا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپؐ نے جب مجلس میں وسعت کرنے اور سمٹ کر بیٹھنے کا حکم دیا تو کچھ لوگوں نے اس پر عمل نہیں کیا، اُن کو تادیباً مجلس سے اُٹھ جانے کا حکم دیا ہو۔

بہر حال اس آیت اور احادیث واردہ سے آداب مجلس کے متعلق ایک تو یہ بات معلوم ہوئی

کہ اہلِ مجلس کو چاہئے کہ بعد میں آنے والوں کو جگہ دینے کی کوشش کریں، اور دوسری بات آنے والوں کے لئے یہ ثابت ہوئی کہ وہ کسی کو اس کی جگہ سے نہ اُٹھائیں، تیسری بات صاحبِ مجلس کے لئے یہ ثابت ہوئی کہ وہ ضرورت سمجھے تو بعض لوگوں کو مجلس سے اُٹھا دینے کی بھی اس کو گنجائش ہے، اور بعض دوسری روایاتِ حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آنے والوں کے لئے ادب یہ ہے کہ پہلے سے بیٹھے ہوئے لوگوں میں گھسنے کے بجائے کسی کنارے پر بیٹھ جائے جیسا کہ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں تین آنے والے شخصوں کا ذکر ہے ان میں ایک وہ بھی ہے جو مجلس میں جگہ نہ پانے کی وجہ سے ایک گوشہ میں بیٹھ گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پھر تعریف وثناء فرمائی۔

مسئلہ: مجلس کے آداب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دو شخصوں کے درمیان بغیر ان کی اجازت کے داخل نہ ہو، کہ بعض اوقات دونوں کے یک جا بیٹھنے میں اُن کی کوئی خاص مصلحت ہوتی ہے، حضرت اُسامہ بن زید لیثیؓ کی روایت ابوداؤد و ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لَا یَحِلُّ لِرَجُلٍ اَنْ یُّفَرِّقَ بَیْنَ اِثْنَیْنِ اِلَّا بِاِذْنِھِمَا " یعنی کسی شخص کے لئے حلال نہیں کہ دو شخص جو ملے بیٹھے ہیں ان کے درمیان تفریق پیدا کرے جب تک کہ ان سے ہی اجازت نہ ملے (ابن کثیر)

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ الاٰیۃ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم و اصلاحِ خلق کے کام میں تو شب و روز مشغول رہتے ہی تھے، مجالسِ عامّہ میں سب حاضرینِ مجلس آپ کے ارشادات سے فائدہ اٹھاتے تھے، اس سلسلے میں ایک صورت یہ بھی تھی کہ بعض لوگ آپ سے علیحدگی میں خفیہ بات کرنا چاہتے اور آپ وقت دیدیتے تھے، یہ ظاہر ہے کہ ایک ایک شخص کو الگ وقت دینا بڑا وقت بھی چاہتا ہے اور محنت بھی، اس میں کچھ منافقین کی شرارت بھی شامل ہوگئی کہ مخلص مسلمانوں کو ایذاء پہونچانے کے لئے آپؐ سے علیحدگی اور سرگوشی کا وقت مانگتے اور اس میں مجلس کو طویل کر دیتے تھے، بعض ناواقف مسلمان بھی بات لمبی کر کے مجلس طویل کر دیتے تھے، حق تعالیٰ نے آپؐ سے یہ بوجھ ہلکا کرنے کے لئے ابتداءً یہ حکم نازل فرمایا کہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے علیحدگی میں خفیہ بات کرنا چاہے وہ پہلے کچھ صدقہ کردے، اس صدقہ کی کوئی مقدار قرآن میں منقول نہیں، مگر جب یہ آیت نازل ہوئی تو سب سے پہلے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے اس پر عمل فرمایا، اور ایک دینار صدقہ کر کے آپؐ سے علیحدگی میں بات کرنے کا وقت لیا۔

اس آیت پر صرف حضرت علیؓ نے عمل کیا تھا پھر منسوخ ہوگئی اور کسی کو عمل کی نوبت نہیں آئی،

اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اس حکم سے چونکہ بہت سے صحابہ کرام کو تنگی پیش آئی اس لئے بہت جلد ہی منسوخ کر دیا گیا، حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن میں ایک آیت ایسی ہے جس پر میرے سوا کسی نے عمل نہیں کیا، نہ مجھ سے پہلے کسی نے عمل کیا، اور نہ میرے بعد کوئی کرے گا، پہلے نہ کرنا

تو ظاہر ہے بعد میں نہ کرنا اس لئے کہ منسوخ ہوگئی وہ آیت یہی تقدیم صدقہ کی ہو (ابن کثیر)

یہ حکم اگرچہ منسوخ ہوگیا مگر جس مصلحت کے لئے جاری کیا گیا تھا وہ اس طرح حاصل ہوگئی کہ مسلمان تو اپنی دلی محبت کے تقاضہ سے ایسی مجلس طویل کرنے سے بچ گئے اور منافقین اس لئے کہ عام مسلمانوں کے طرز کے خلاف ہم نے ایسا کیا تو ہم پہچان لئے جاویں گے اور نفاق کھل جاوے گا، واللہ اعلم

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ مَا هُمْ مِّنْكُمْ

کیا تو نے نہ دیکھا اُن لوگوں کو جو دوست ہوئے ہیں اس قوم کے جن پر غصہ ہوا ہے اللہ نہ وہ تم میں ہیں

وَلَا مِنْهُمْ ۙ وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿١٤﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ

اور نہ اُن میں ہیں، اور قسمیں کھاتے ہیں جھوٹ بات پر اور ان کو خبر ہے، تیار رکھا ہے اللہ نے اُن کیلئے

عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ اِنَّهُمْ سَاۗءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٥﴾ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ

سخت عذاب بیشک وہ بُرے کام ہیں جو وہ کرتے ہیں، بنا رکھا ہے اپنی قسموں کو

جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿١٦﴾ لَنْ تُغْنِيَ

ڈھال پھر روکتے ہیں اللہ کی راہ سے تو ان کو ذلت کا عذاب ہے، کام نہ آئیں گے

عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَـيْـــًٔا ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ

ان کو اُن کے مال اور نہ اُن کی اولاد اللہ کے ہاتھ سے کچھ بھی، وہ لوگ ہیں دوزخ

النَّارِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿١٧﴾ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ

کے وہ اسی میں پڑے رہیں گے، جس دن جمع کرے گا اللہ ان سب کو پھر قسمیں کھائیں گے اُس کے

كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰي شَيْءٍ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ

آگے جیسے کھاتے ہیں تمہارے آگے، اور خیال رکھتے ہیں کہ وہ کچھ بھلی راہ پر ہیں، سنتا ہے وہی ہیں اصل

الْكٰذِبُوْنَ ﴿١٨﴾ اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰـىهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ۭ

جھوٹے، قابو کرلیا ہے اُن پر شیطان نے پھر بھلا دی اُن کو اللہ کی یاد،

اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿١٩﴾

وہ لوگ ہیں گروہ شیطان کا، سنتا ہے جو گروہ ہے شیطان کا وہی خراب ہوتے ہیں،

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحَآدُّوۡنَ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗۤ اُولٰٓئِکَ فِی الۡاَذَلِّیۡنَ ﴿۲۰﴾

جو لوگ خلاف کرتے ہیں اللہ کا اور اس کے رسول کا وہ لوگ ہیں سب بے قدر لوگوں میں ،

کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیۡزٌ ﴿۲۱﴾ لَا تَجِدُ

اللہ لکھ چکا کہ میں غالب ہوں گا اور میرے رسول بیشک اللہ زورآور ہے زبردست ، تو نہ پائے گا کسی

قَوۡمًا یُّؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ یُوَآدُّوۡنَ مَنۡ حَآدَّ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ

قوم کو جو یقین رکھتے ہوں اللہ پر اور پچھلے دن پر کہ دوستی کریں ایسوں سے جو مخالف ہوئے اللہ کے اور اس کے

وَ لَوۡ کَانُوۡۤا اٰبَآءَہُمۡ اَوۡ اَبۡنَآءَہُمۡ اَوۡ اِخۡوَانَہُمۡ اَوۡ عَشِیۡرَتَہُمۡ ؕ اُولٰٓئِکَ

رسول کے خواہ وہ اپنے باپ ہوں یا اپنے بیٹے یا اپنے بھائی یا اپنے گھرانے کے ، اُن کے دلوں میں

کَتَبَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمُ الۡاِیۡمَانَ وَ اَیَّدَہُمۡ بِرُوۡحٍ مِّنۡہُ ؕ وَ یُدۡخِلُہُمۡ

اللہ نے لکھ دیا ہے ایمان اور اُن کی مدد کی ہے اپنے غیب کے فیض سے اور داخل کریگا اُن کو

جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ

باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں ہمیشہ رہیں اُن میں اللہ ان سے راضی اور

وَ رَضُوۡا عَنۡہُ ؕ اُولٰٓئِکَ حِزۡبُ اللّٰہِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ حِزۡبَ اللّٰہِ ہُمُ

وہ اس سے راضی وہ لوگ ہیں گروہ اللہ کا سنتا ہے جو گروہ ہے اللہ کا وہی

الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۲۲﴾ ع

مراد کو پہونچے ،

خُلاصۂ تفسیر

کیا آپ نے ان لوگوں پر نظر نہیں فرمائی جو ایسے لوگوں سے دوستی کرتے ہیں جن پر اللہ نے غضب کیا ہے (پہلے لوگوں سے مراد منافقین ہیں اور دوسرے لوگوں سے مراد یہود و جمیع کفار مجاہرین، اور منافقین چونکہ یہودی تھے اس لئے اُن کی دوستی یہود سے اور اسی طرح اور کفار سے بھی مشہور او رمعلوم ہے) یہ (منافق) لوگ نہ تو (پورے پورے) تم میں ہیں اور نہ (پورے پورے) ان ہی میں (بلکہ ظاہر میں تو تم سے ملے ہوئے ہیں، اور باطناً وعقیدۃً کفار کے ساتھ ہیں) اور جھوٹی بات پر قسمیں کھا جاتے ہیں (وہ جھوٹی بات یہی ہے کہ ہم

۳ع۹۴

مسلمانوں میں شامل ہیں کقولہ تعالیٰ وَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ) اور وہ (خود بھی) جانتے ہیں (کہ ہم جھوٹے ہیں، آگے اُن کے لئے وعید ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے سخت عذاب مہیّا کر رکھا ہے (کیونکہ) بیشک وہ بُرے بُرے کام کیا کرتے تھے (چنانچہ کفر و نفاق سے بدتر کونسا کام ہوگا؟ اور انہی بُرے کاموں میں سے ایک بُرا کام یہ ہے کہ) انھوں نے اپنی (ان جھوٹی) قسموں کو (اپنے بچاؤ کے لئے) ڈھال بنا رکھا ہے (تاکہ مسلمان ہم کو مسلمان سمجھ کر ہماری جان و مال سے تعرّض نہ کریں) پھر (اوروں کو بھی) خدا کی راہ (یعنی دین) سے روکتے رہتے ہیں (یعنی بہکاتے رہتے ہیں) سو (اس وجہ سے) اُن کے لئے ذلّت کا عذاب ہونے والا ہے (یعنی وہ عذاب جیسا شدید ہوگا ایسا ہی ذلیل کرنے والا بھی ہوگا، اور جب وہ عذاب ہونے لگے گا تو) اُن کے اموال اور اولاد اللہ (کے عذاب) سے اُن کو ذرا نہ بچا سکیں گے (اور) یہ لوگ دوزخی ہیں (اس میں تعیین فرما دی اُس عذاب شدید و مہین کی کہ وہ دوزخ ہے اور) وہ لوگ اس (دوزخ) میں ہمیشہ رہنے والے ہیں (آگے وقت عذاب کا بتلاتے ہیں کہ وہ عذاب اُس روز ہوگا) جس روز اللہ تعالیٰ ان سب کو (مع دیگر مخلوقات کے) دوبارہ زندہ کرے گا سو یہ اس کے روبرو بھی (جھوٹی) قسمیں کھا جاویں گے جس طرح تمہارے سامنے قسمیں کھا جاتے ہیں (جیسا مشرکین کی جھوٹی قسم قیامت کے دن اس آیت میں مذکور ہے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ) اور یوں خیال کریں گے کہ ہم کسی اچھی حالت میں ہیں (کہ اس جھوٹی قسم کی بدولت بچ جاویں گے) خوب سُن لو یہ لوگ بڑے ہی جھوٹے ہیں (کہ خدا کے سامنے بھی جھوٹ بولنے سے نہ چُوکے اور ان کی جو حرکات اوپر مذکور ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ) اُن پر شیطان نے پورا تسلّط کرلیا ہے (کہ اس کے کہنے پر عمل کر رہے ہیں) سو اُس نے اُن کو خدا کی یاد بُھلا دی (یعنی اس کے احکام کو چھوڑ بیٹھے واقعی) یہ لوگ شیطان کا گروہ ہے، خوب سُن لو کہ شیطان کا گروہ ضرور برباد ہونے والا ہے (آخرت میں تو ضرور اور گاہے دنیا میں بھی، اور ان کی یہ حالت کیوں نہ ہو کہ یہ اللہ اور رسولؐ کے مخالف ہیں، اور قاعدہ کلیہ ہے کہ) جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں یہ لوگ (اللہ کے نزدیک) سخت ذلیل لوگوں میں ہیں (جب اللہ کے نزدیک ذلیل ہیں تو آثار مذکورہ کا ترتّب کیا مستبعد ہے، اور جس طرح خدا تعالیٰ نے ان کے لئے ذلّت تجویز فرما رکھی ہے اسی طرح مطیعین کے لئے عزت، کیونکہ وہ لوگ اللہ اور رسولوں کے متبع ہیں اور) اللہ تعالیٰ نے یہ بات (اپنے حکم ازلی میں) لکھ دی ہے کہ میں اور میرے پیغمبر غالب رہیں گے (جو کہ حقیقت ہی عزت کی، مقصود یہاں غلبہ بیان کرنا ہے انبیاء کا، اپنا ذکر تشریف انبیاء کے لئے فرما دیا ہے، جب رُسل ذی عزت ہیں تو ان کے متبعین بھی، اور یہ معنی غلبہ کے سورۂ مائدہ کی آیت اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ اور سورۂ مؤمن کی آیت لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا الخ کے ذیل میں گذر چکے ہیں، بیشک اللہ تعالیٰ قوّت والا غلبہ والا ہے (اس لئے وہ جس کو چاہے غالب کردے، آگے دوستی کفار میں منافقین کے حال کے خلاف اہل ایمان کا حال بیان فرماتے ہیں کہ) جو لوگ اللہ پر اور قیامت کے دن پر (پورا پورا) ایمان رکھتے

ہیں آپ اُن کو نہ دیکھیں گے کہ وہ ایسے شخصوں سے دوستی رکھیں جو اللہ اور رسول کے برخلاف ہیں گو وہ انکے باپ یا بیٹے یا بھائی یا کنبہ ہی کیوں نہ ہوں ان لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور ان (کے قلوب) کو اپنے فیض سے قوت دی ہے (فیض سے مراد نور ہے، یعنی مقتضائے ہدایت پر ظاہراً عمل و باطناً سکون قلب وَهُوَ الْمَذْكُورُ فِي قَوْلِهِ تَعَالَى فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّن رَّبِّهِ، چونکہ یہ نور سبب ہو زیادت حیات معنویہ کا اس لئے اس کو رُوح سے تعبیر فرمایا، یہ دولت تو ان کو دنیا میں ملی، کقولہ تعالیٰ أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ) اور (آخرت میں اُن کو یہ نعمت ملے گی کہ) اُن کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوگا اور وہ اللہ سے راضی ہونگے یہ لوگ اللہ کا گروہ ہے خوب سُن لو کہ اللہ ہی کا گروہ فلاح پانے والا ہے (کقولہ تعالیٰ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ، بعد قولہ أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ)

معارف ومسائل

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِم، ان آیات میں حق تعالیٰ نے ان لوگوں کی بدحالی اور انجام کار عذاب شدید کا ذکر فرمایا ہے جو اللہ کے دشمنوں کافروں سے دوستی رکھیں، کفار خواہ مشرکین ہوں یا یہود و نصاریٰ یا دوسرے اقسام کے کفار کسی مسلمان کے لئے دلی دوستی کسی سے جائز نہیں، اور وہ عقلاً ہو بھی نہیں سکتی، کیونکہ مؤمن کا اصل سرمایہ اللہ تعالیٰ کی محبت ہے، کفار اللہ تعالیٰ کے مخالف اور دشمن ہیں، اور جس شخص کے دل میں کسی شخص کی سچی محبت اور دوستی ہو اس سے یہ ممکن ہی نہیں ہو سکتا کہ وہ اس کے دشمن سے بھی محبت اور دوستی رکھے، اسی لئے قرآن کریم کی بہت سی آیات میں موالاتِ کفار کی شدید حرمت و ممانعت کے احکام آئے ہیں، اور جو مسلمان کسی کافر سے دلی دوستی رکھے تو اس کو کفار ہی کے زمرہ میں شامل سمجھے جانے کی وعید آئی ہے، لیکن یہ سب احکام دلی اور قلبی دوستی کے متعلق ہیں۔

کفار کے ساتھ حُسنِ سلوک، ہمدردی، خیر خواہی، اُن پر احسان، حُسنِ اخلاق سے پیش آنا یا تجارتی اور اقتصادی معاملات اُن سے کرنا، دوستی کے مفہوم میں داخل نہیں، یہ سب امور کفار کے ساتھ بھی جائز ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کا کھلا ہوا تعامل اس پر شاہد ہے، البتہ ان سب چیزوں میں اس کی رعایت ضروری ہے کہ ان کے ساتھ ایسے معاملات رکھنا اپنے دین کے لئے مضر نہ ہو اپنے ایمان اور عمل میں سستی پیدا نہ کرے اور دوسرے مسلمانوں کے لئے بھی مضر نہ ہو۔

اس مسئلہ میں موالات اور مواسات اور معاملات کے فرق کی پوری تفصیل سورۂ آلِ عمران آیت لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ کے تحت معارف القرآن جلد دوم صفحہ ۴۵ تا ۴۹ میں

گذر چکی ہے وہاں مطالعہ کر لیا جائے۔

وَيَحْلِفُونَ عَلَى الْكَذِبِ، بعض روایات میں ہو کہ یہ آیت عبداللہ ابن اُبَیّ اور عبداللہ بن نبتل منافق کے بارے میں نازل ہوئی، جس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے ساتھ تشریف رکھتے تھے تو فرمایا کہ اب تمھارے پاس ایک ایسا شخص آنے والا ہے جس کا قلب قلبِ جبار ہے اور جو شیطان کی آنکھوں سے دیکھتا ہے، اس کے بعد ہی عبداللہ بن نبتل منافق داخل ہوا جو نیلگوں چشم، گندم گوں، پست قد، خفیف اللحیہ تھا، آپؐ نے اس سے فرمایا کہ تم اور تمھارے ساتھی مجھے کیوں گالیاں دیتے ہو؟ اس نے حلف کر کے کہا کہ میں نے ایسا نہیں کیا، پھر اپنے ساتھیوں کو بھی بُلا لیا انھوں نے بھی یہ جھوٹا حلف کر لیا، حق تعالیٰ نے اس آیت میں اُن کے جھوٹ کی خبر دیدی (قرطبی)

مسلمان کی دلی دوستی کسی کافر سے نہیں ہو سکتی

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ، الاٰیۃ، پہلی آیات میں کفار و مشرکین سے دوستی کرنے والوں پر غضبِ الٰہی اور عذاب شدید کا ذکر تھا، اس آیت میں مؤمنین مخلصین کا حال اُن کے مقابل بیان فرمایا کہ وہ کسی ایسے شخص سے دوستی اور دلی تعلق نہیں رکھتے جو اللہ کا مخالف یعنی کافر ہے، اگرچہ وہ ان کا باپ یا اولاد یا بھائی یا اور قریبی عزیز ہی کیوں نہ ہو۔

صحابہ کرام سبھی کا حال یہ تھا، اس جگہ مفسرین نے بہت سے صحابہ کرام کے واقعات ایسے بیان کئے ہیں جن میں باپ بیٹے، بھائی وغیرہ سے جب کوئی بات اسلام یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سُنی تو سارے تعلقات کو بھلا کر ان کو سزا دی بعض کو قتل کیا۔

عبداللہ بن اُبَیّ منافق کے بیٹے عبداللہؓ کے سامنے اس کے منافق باپ نے حضورؐ کی شان میں گستاخانہ کلمہ بولا تو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی کہ میں اپنے باپ کو قتل کر دوں، آپؐ نے منع فرما دیا، حضرت ابوبکرؓ کے سامنے اُن کے باپ ابو قحافہ نے حضورؐ کی شان میں کچھ کلمۂ گستاخانہ کہہ دیا تو ارحم اُمّتؐ صدیق اکبرؓ کو اتنا غصہ آیا کہ زور سے طمانچہ رسید کیا جس سے ابو قحافہ گر پڑے، آپؐ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ آئندہ ایسا نہ کرنا، حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح کے والد جراح غزوۂ اُحد میں کفّار کے ساتھ مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے آئے تو میدانِ جہاد میں وہ بار بار حضرت ابو عبیدہؓ کے سامنے آتے وہ ان کے درپے تھے، یہ سامنے سے ٹل جاتے، جب انھوں نے مسلسل یہ صورت اختیار کی تو ابو عبیدہؓ نے اُن کو قتل کر دیا، یہ اور ان کے امثال بہت سے واقعات صحابہ کرام کے پیش آئے، ان پر آیات مذکورہ نازل ہوئیں (قرطبی)

مسئلہ: بہت سے حضرات فقہاء نے یہی حکم فساق و فجار اور دین سے عملاً منحرف مسلمانوں کا قرار دیا ہے کہ اُن کے ساتھ دلی دوستی کسی مسلمان کی نہیں ہو سکتی، کام کاج کی ضرورتوں میں اشتراک

یا مصاحبت بقدر ضرورت الگ چیز ہے، دل میں دوستی کسی فاسق و فاجر کی اسی وقت ہوگی جبکہ فسق و فجور کے جراثیم خود اس کے اندر موجود ہوں گے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں فرمایا کرتے تھے اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْ لِفَاجِرٍ عَلَیَّ یَدًا، یعنی یا اللہ مجھ پر کسی فاجر آدمی کا احسان نہ آنے دیجئے، کیونکہ شریف النفس انسان اپنے محسن کی محبت پر طبعاً مجبور ہوتا ہے اس لئے فساق و فجار کا احسان قبول کرنا جو ذریعہ ان کی محبت کا بنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی پناہ مانگی (قرطبی)

وَاَیَّدَھُمْ بِرُوْحٍ مِّنْہُ، یہاں رُوح کی تفسیر بعض حضرات نے نور سے کی ہے جو منجانب اللہ مؤمن کو ملتا ہے اور وہی اس کے عمل صالح کا اور قلب کے سکون و اطمینان کا ذریعہ ہوتا ہے، اور یہ سکون و اطمینان ہی بڑی قوت ہے، اور بعض حضرات نے رُوح کی تفسیر قرآن اور دلائل قرآن سے کی ہے وہی مؤمن کی اصل طاقت و قوت ہے، (قرطبی) واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

تمت

سُوْرَۃُ الْمُجَادَلَۃِ بِحَمْدِہٖ وَعَوْنِہٖ لِغُرَّۃِ
جُمَادَی الْاُوْلٰی ۱۳۹۱ھ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ
وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ وَیَتْلُوْہُ اِنْشَاءَ اللہُ تَعَالٰی
تَفْسِیْرُ سُوْرَۃِ الْحَشْرِ

سُورَةُ الْحَشْرِ

سُوْرَةُ الْحَشْرِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ اَرْبَعٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً وَّثَلٰثُ رُكُوْعَاتٍ

سورۃ حشر مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی چوبیس آیتیں ہیں اور تین رکوع،

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے،

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ

اللہ کی پاکی بیان کرتا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور وہی ہے زبردست

الْحَكِيْمُ ① هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ

حکمت والا، وہی ہے جس نے نکال دیا ان کو جو منکر ہیں کتاب والوں میں

مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۭ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا

ان کے گھروں سے پہلے ہی اجتماع پر لشکر کے، تم نہ اٹکل کرتے تھے کہ نکلیں گے وہ اور وہ خیال

اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ

رکھتے تھے کہ ان کو بچا لیں گے ان کے قلعے اللہ کے ہاتھ سے پھر پہنچا اُن پر اللہ جہاں سے ان کو

لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۤ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ

خیال نہ تھا، اور ڈال دی اُن کے دلوں میں دھاک اُجاڑنے لگے اپنے گھر

بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۤ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ②

اپنے ہاتھوں اور مسلمانوں کے ہاتھوں، سو عبرت پکڑو اے آنکھ والو،

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ۭ وَلَهُمْ فِي

اور اگر نہ ہوتی یہ بات کہ لکھدیا تھا اللہ نے اُن پر جلا وطن ہونا تو اُن کو عذاب دیتا دنیا میں اور آخرت

الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ③ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاۗقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَ

میں اُن کے لئے ہے آگ کا عذاب ، یہ اس لئے کہ وہ مخالف ہوئے اللہ سے اور اس کے رسول سے اور

مَنْ يُّشَاۗقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ④ مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ

جو کوئی مخالف ہو اللہ سے تو اللہ کا عذاب سخت ہے ، جو کاٹ ڈالا تم نے کھجور کا

لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَاۗىِٕمَةً عَلٰٓي اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ⑤

درخت یا رہنے دیا کھڑا اپنی جڑ پر سو اللہ کے حکم سے اور تاکہ رُسوا کرے نافرمانوں کو

ربط سورت اور شانِ نزول

پچھلی سورت میں یہود کی دوستی جو منافقین نے اختیار کر رکھی تھی اس کی مذمت کا بیان تھا، اس سورت میں یہود پر دنیا میں جلا وطنی کی سزا اور آخرت کا عذاب مذکور ہے اور قصۂ اُن یہود کا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو یہود سے معاہدہ صلح کا ہو چکا تھا، اور ان یہودیوں کے مختلف قبائل میں ایک قبیلہ بنو نضیر کا تھا وہ بھی معاہدۂ صلح میں داخل تھا، اور یہ لوگ مدینہ طیبہ سے دو میل پر رہتے تھے، ایک مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا کہ عمرو بن اُمیہ ضمری کے ہاتھ سے دو قتل ہو گئے تھے جن کا خون بہا سب کو مل کر ادا کرنا تھا، آپ نے اپنے مسلمانوں سے اس کے لئے چندہ حاصل کیا، پھر یہ ارادہ ہوا کہ یہود بھی از روئے صلحنامہ مسلمانوں کے ساتھ ہیں خونبہا کی رقم میں ان کو بھی شریک کیا جاوے، اس کام کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبیلۂ بنو نضیر کے پاس تشریف لے گئے، انھوں نے یہ سازش کی کہ آپ کو قتل کر دینے کا موقع ہمارے ہاتھ آگیا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک جگہ بٹھلا دیا، اور کہا کہ ہم خونبہا کی رقم جمع کرنے کا انتظام کرتے ہیں، اور خفیہ مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ جس دیوار کے نیچے آپ تشریف فرما ہیں کوئی شخص اوپر چڑھ کر کوئی بڑا بھاری پتھر آپ کے اوپر چھوڑ دے کہ آپ کا کام تمام ہو جاوے، آپ کو فوراً بذریعہ وحی اُن کی یہ سازش معلوم ہو گئی، آپ وہاں سے اُٹھ کر واپس تشریف لائے اور ان سے کہلا بھیجا کہ تم نے عہد شکنی کر کے صلح توڑ دی اس لئے اب تمھیں دس روز کی مہلت دی جاتی ہے اس میں تم جہاں چاہو چلے جاؤ، اس مدت کے بعد جو شخص یہاں نظر آوے گا اس کی گردن ماردی جاوے گی، انھوں نے چلے جانے کا ارادہ کیا تو عبداللہ ابن اُبی منافق نے ان کو روکا، کہ کہیں نہ جاؤ، میرے پاس دو ہزار آدمیوں کی جمعیت ہے جو اپنی جان دیدیں گے، تم پر آنچ نہ آنے دیں گے، اور رُوح المعانی میں ابن اسحٰق کی روایت سے اس میں عبداللہ

کے ساتھ ودیعہ بن مالک اور سُوَید اور راعش کا شریک ہونا بھی لکھا ہے، یہ لوگ اُن کے کہنے میں آگئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلا بھیجا کہ ہم کہیں نہیں جائیں گے، آپؐ سے جو کچھ ہو سکے کر لیجئے، آپؐ صحابہ کرام رضؓ کے ساتھ اس قبیلہ پر حملہ آور ہوئے، اور یہ لوگ قلعہ بند ہو گئے، اور منافقین مُنہ چھپا کر بیٹھ گئے، آپؐ نے ان کا محاصرہ کر لیا، اور ان کے درخت جلوا دیئے، کچھ کٹوا دیئے، آخر تنگ آکر انھوں نے جلاوطن ہونا منظور کر لیا، آپؐ نے اس حال میں بھی ان کے ساتھ یہ رعایت کی کہ حکم دیدیا کہ جتنا سامان تم ساتھ لے جا سکتے ہو لیجاؤ، بجز ہتھیار کے وہ ضبط کر لئے جاویں گے، یہ لوگ نکل کر کچھ شام میں چلے گئے، کچھ خیبر میں، اور حرص دنیا کی وجہ سے اپنے گھروں کی کڑیاں، تختے، کواڑ تک اکھاڑ کر لے گئے، اور یہ قصہ غزوۂ اُحد کے بعد ربیع الاوّل ۴ھ میں پیش آیا، پھر حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں ان کو دوسرے یہود کیساتھ ملک شام کی طرف نکال دیا، یہ دونوں جلاوطنی حشرِ اوّل اور حشرِ ثانی کہلاتی ہیں، کذا فی زاد المعاد۔

خلاصۂ تفسیر

اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں سب جو کچھ آسمانوں اور زمین میں (مخلوقات) ہیں اور وہ زبردست (اور) حکمت والا ہے (چنانچہ اس کی عُلوِّشان اور قدرت اور حکمت کا ایک اثر یہ ہے کہ) وہی ہے جس نے (ان) کفار اہلِ کتاب (یعنی بنی نضیر) کو اُن کے گھروں سے پہلی ہی بار اکٹھا کر کے نکال دیا، (یعنی بقولِ زہری اس کے قبل اُن پر یہ مصیبت واقع نہ ہوئی تھی، یہ مصیبت اُن پر پہلی بار ہی آئی ہے جو اُن کی حرکاتِ شنیعہ کا ثمرہ ہے اور اس میں ایک لطیف اشارہ ہے ایک پیشین گوئی کی طرف کہ اُن کے لئے پھر بھی ایسا اتفاق ہوگا، چنانچہ دوبارہ حضرت عمرؓ نے تمام یہود کو جزیرۂ عرب سے نکال دیا، کذا فی الخازن اور اشارہ کو لطیف اس لئے کہا گیا کہ لفظ اوّل ہمیشہ مقتضی نہیں ہوتا کہ اس کا کوئی ثانی بھی ہو، چنانچہ بولتے ہیں فلاں عورت کے پہلی ہی بار بچہ پیدا ہوا ہے، ان کا گھروں سے نکال دینا مسلمانوں کی طاقت اور غلبہ کا اثر تھا، آگے اس کی تقریر ہے کہ اے مسلمانوں ان کا سامان وشوکت دیکھ کر) تمھارا گمان بھی نہ تھا کہ وہ (کبھی اپنے گھروں سے) نکلیں گے اور (خود) انھوں نے یہ گمان کر رکھا تھا کہ ان کے قلعے ان کو اللہ (کے انتقام) سے بچالیں گے (یعنی اپنے قلعوں کے استحکام پر ایسے مطمئن تھے کہ اُن کے دل میں انتقامِ غیبی کا خطرہ بھی نہ آتا تھا، پس اُن کی حالت مشابہ اس شخص کے تھی جس کا یہ گمان ہو کہ ان کے قلعے اللہ کی گرفت سے بچالیں گے، اور اگر خاص قبیلہ بنو نضیر کے قلعے متعدد نہ ہوں تو حُصُونُہُم جمع کی ضمیر مطلقِ یہود کی طرف ہوگی، اور اِنَّہُم کی ضمیر بھی، اور صرف ظَنُّوْٓا کی ضمیر بنی نضیر کی طرف ہو جاوے گی، یعنی بنی نضیر کا یہ خیال تھا کہ سب یہود کو ان کے قلعے حوادث سے بچالیں گے، ان سب یہود میں یہ بھی آگئے، کہ اپنے قلعہ کو اپنا محافظ سمجھتے تھے) سو اُن پر خدا (کا عقاب) ایسی جگہ سے پہنچا کہ ان کو خیال (اور گمان) بھی نہ تھا،

(مراد اس جگہ سے یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں نکالے گئے جن کی بے سروسامانی پر نظر کرکے اس کا احتمال بھی نہ تھا کہ یہ بے سامان ان باسامانوں پر غالب آجائیں گے) اور اُن کے دلوں میں (اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا) رعب ڈال دیا کہ (اس رُعب کی وجہ سے نکلنے کا قصد کیا اور اس وقت یہ حالت تھی کہ) اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں سے بھی اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے بھی اُجاڑ رہے تھے (یعنی خود بھی کڑی تختہ لے جانے کے واسطے اپنے مکانوں کو منہدم کرتے تھے اور مسلمان بھی اُن کے قلب کو صدمہ پہونچانے کے واسطے منہدم کرتے تھے، اور مسلمانوں کے منہدم کرنے کو بھی ان کی طرف منسوب اس لئے کیا کہ سبب اس انہدام کا وہ ہی لوگ تھے، کیونکہ انھوں نے عہد شکنی کی اور وہ فعل یہود کا ہے پس اسناد سبب کی طرف ہوگئی، اور مسلمانوں کا ہاتھ بمنزلہ آلہ کے ہوگیا) سوا اے دانش مندو (اس حالت کو دیکھ کر) عبرت حاصل کرو (کہ انجام خدا اور رسولؐ کی مخالفت کا بعض اوقات دنیا میں بھی نہایت بُرا ہوتا ہے) اور اگر اللہ تعالیٰ اُن کی قسمت میں جلاوطن ہونا نہ لکھ چکتا تو اُن کو دنیا ہی میں (قتل کی) سزا دیتا (جس طرح اُن کے بعد بنی قریظہ کے ساتھ معاملہ کیا گیا) اور (گو دنیا میں عذابِ قتل سے بچ گئے لیکن) ان کے لئے آخرت میں دوزخ کا عذاب (تیار) ہے (اور) یہ (سزائے جلاوطنی دنیا میں اور سزائے نار آخرت میں) اس سبب سے ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کی اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو شخص اللہ کی مخالفت کرتا ہے (اور وہی مخالفت رسول کی بھی ہے) تو اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے (یہ مخالفت دو طرح کی ہوئی، ایک نقضِ عہد سے جس سے کہ سزائے جلاوطنی ہوئی اور دوسرے عدم ایمان سے جو سبب عذابِ آخرت کا ہے، آگے یہود کے ایک طعن کا جواب ہے جو درختوں کے کاٹنے اور جلانے کے باب میں کیا تھا کہ ایسا کرنا تو فساد ہے اور فساد مذموم ہے، کذا فی الدر، و نیز بعض مسلمانوں نے باوجود اجازت کے یہ سمجھ کر کہ ترک جائز ہے اور آخر میں یہ درخت مسلمانوں ہی کے ہوجائیں گے تو ان کا رہنا ہی بہتر ہے، نہیں کاٹے، اور بعض نے یہ سمجھ کر کہ یہود کا دل دُکھے گا کاٹ دیئے، کذا فی الدر، جواب کے ساتھ ان دونوں فعل کی بھی تصویب ہے پس ارشاد ہے کہ) جو کھجوروں کے درخت تم نے کاٹ ڈالے (اسی طرح جو جلا دیئے) یا ان کو ان کی جڑوں پر (بحالہا) کھڑا رہنے دیا سو (دونوں باتیں) خدا ہی کے حکم (اور رضا) کے موافق ہیں اور تاکہ کافروں کو ذلیل کرے (یعنی دونوں فعل میں مصلحت ہے، چنانچہ ترک میں بھی مسلمانوں کی ایک کامیابی اور کفار کو غیظ میں ڈالنا ہے کہ یہ مسلمان اس کو برتیں گے، اور قطع کرنے اور جلا دینے میں بھی مسلمانوں کی دوسری کامیابی یعنی ظہور آثار غلبہ اور کفار کو غیظ میں ڈالنا ہے کہ مسلمان ہماری چیزوں میں کیسے تصرفات کر رہے ہیں، پس دونوں امر جائز ہیں، اور حکمت پر مبنی ہونے کے سبب ان میں کوئی قباحت نہیں۔

معارف ومسائل

سورۂ حشر کی خصوصیات اور قبیلۂ بنو نضیر کی تاریخ، سورۂ حشر پوری یہود کے قبیلۂ بنو نضیر کے متعلق نازل ہوئی ہے (قالہ ابن اسحٰق) اور حضرت ابن عباسؓ اس سورت کا نام ہی سورۂ بنی نضیر کہا کرتے تھے (ابن کثیر) بنو نضیر یہود کا ایک قبیلہ ہے جو حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں ہے، ان کے آباء و اجداد تورات کے عالم تھے، جس میں حضرت خاتم الانبیاء علیہ السلام کی خبر اور آپؐ کا حلیہ اور علامات مذکور تھے، اور یہ کہ آپ کی ہجرت یثرب (مدینہ) کی طرف ہوگی، یہ خاندان اس طمع میں کہ خاتم الانبیاءؐ کے ساتھ رہیں شام سے مدینہ طیبہ منتقل ہوا تھا، ان کے موجودہ لوگوں میں بھی کچھ تورات کے عالم تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے کے بعد علامات دیکھ کر پہچان بھی لیا تھا کہ یہی خاتم الانبیاءؐ ہیں، لیکن ان کا خیال تھا کہ وہ آخری نبی ہارون علیہ السلام کی اولاد میں ان کے خاندان میں ہوں گے، اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسرائیل کے بجائے بنی اسمٰعیل میں مبعوث ہوئے تو اس حسد نے ان لوگوں کو ایمان لانے سے روک دیا، مگر دل میں ان کے اکثر لوگ آپؐ کے آخر الانبیاء ہونے کو جانتے پہچانتے تھے، اور غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی حیرت انگیز فتح اور مشرکین کی شکست دیکھ کر ان کا یہ یقین کچھ اور بڑھا بھی تھا، اس کا اقرار ان کی زبانوں سے سُنا بھی گیا، مگر اس ظاہری فتح و شکست کو حق و باطل کے پہچاننے کا معیار بنا لینا ہی ایک بودی اور کمزور بنیاد تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ غزوۂ اُحد میں جب ابتداءً مسلمانوں کو شکست ہوئی، کچھ حضرات صحابہ شہید ہوئے تو ان کا یقین متزلزل ہوگیا، اور اس کے بعد سے انھوں نے مشرکین مکہ کے ساتھ سازباز شروع کردی۔

اس سے پہلے یہ واقعہ ہو چکا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ پہونچ کر حکیمانہ سیاست کے مقتضیٰ پر سب سے پہلا کام یہ کیا تھا کہ مدینہ طیبہ میں اور شہر کے آس پاس کچھ یہود کے قبائل آباد تھے، ان سے معاہدۂ صلح اس پر کر لیا تھا کہ یہ لوگ نہ مسلمانوں کے خلاف جنگ کریں گے اور نہ کسی جنگ کرنے والے کی امداد کریں گے، اگر ان پر کوئی حملہ آور ہوا تو مسلمان ان کی امداد کریں گے، صلحنامہ میں اور بھی بہت سی دفعات تھیں جن کی تفصیل سیرت ابن ہشام وغیرہ میں مذکور ہے، اسی طرح یہود کے تمام قبائل کی جن میں بنو نضیر بھی داخل تھے، مدینہ طیبہ سے دو میل کے فاصلہ پر ان کی بستی اور مضبوط قلعے اور باغات تھے۔

غزوۂ اُحد تک تو یہ لوگ بظاہر اس صلحنامہ کے پابند نظر آئے، مگر اُحد کے بعد انھوں نے غدّاری کی اور خفیہ خیانت شروع کردی، اس غدر و خیانت کی ابتداء اس سے ہوئی کہ بنو نضیر کا ایک سردار کعب بن اشرف غزوۂ اُحد کے بعد اپنے یہودیوں کے چالیس آدمیوں کے ایک قافلہ کے ساتھ

مکہ معظمہ پہونچا اور یہاں کے کفار قریش جو غزوۂ بدر کی شکست کا بدلہ لینے کی نیت سے غزوۂ اُحد میں گئے تھے، اور اس میں بالآخر شکست کھاکر واپس ہو چکے تھے اُن سے ملاقات کی، اور ان دونوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے کا ایک معاہدہ ہونا قرار پایا، جس کی تکمیل اس طرح کی گئی کہ کعب بن اشرف اپنے چالیس یہودیوں کے ساتھ اور ان کے بالمقابل ابو سفیان اپنے چالیس قریشیوں کے ساتھ حرم بیت اللہ میں داخل ہوئے، اور بیت اللہ کا پردہ پکڑ کر یہ معاہدہ کیا کہ ہم ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کریں گے۔

کعب بن اشرف اس معاہدہ کے بعد مدینہ طیبہ واپس آیا تو جبرئیل امین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سارا واقعہ اور معاہدہ کی تفصیل بتلادی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کعب بن اشرف کے قتل کا حکم جاری فرمادیا، چنانچہ محمد بن مسلمہ صحابی رضؓ نے اس کو قتل کر دیا۔

اس کے بعد بنو نضیر کی مختلف خیانتیں اور سازشیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوتی رہیں، جن میں ایک وہ واقعہ ہے جو اوپر شانِ نزول کے عنوان سے لکھا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش کی، اور اگر فوری طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بذریعہ وحی اس سازش پر مطلع نہ ہوتے تو یہ لوگ اپنی سازشِ قتل میں کامیاب ہوجاتے، کیونکہ جس مکان کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انھوں نے بٹھایا تھا اس کی چھت پر چڑھ کر ایک بڑا بھاری پتھر آپؐ کے سرِ مبارک پر چھوڑ دینے کا منصوبہ تقریباً مکمل ہو چکا تھا، جو شخص اس منصوبہ کو عملی صورت دینے والا تھا اس کا نام عمر بن جحاش تھا، حق تعالیٰ جل شانہٗ نے آپؐ کی حفاظت فرمائی اور یہ منصوبہ فیل ہوگیا۔

ایک عبرت یہ بھی عجیب معاملہ ہے کہ بعد کے واقعہ میں سارے ہی بنو نضیر جلاوطن ہو کر مدینہ سے نکل گئے، مگر ان میں سے صرف دو آدمی مسلمان ہو کر محفوظ و مامون رہے، ان دو میں ایک یہی عمر بن جحاش تھے دوسرے اُن کے چچا یامین بن عمرو بن کعب تھے (ابن کثیر)

عمرو بن اُمیہ ضمری کا واقعہ شانِ نزول کے واقعہ میں جو یہ ذکر آیا ہے کہ عمرو بن اُمیہ ضمری کے ہاتھ سے دو قتل ہوگئے تھے ان کا خوں بہا جمع کرنے کی کوشش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے، اسی خونبہا کے سلسلے میں بنو نضیر کا چندہ حاصل کرنے کے لئے آپؐ ان کی بستی میں تشریف لے گئے تھے، اس کا واقعہ ابن کثیر نے یہ بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف کفار کی سازشیں اور مظالم کی داستان تو بہت طویل ہے، ان میں سے ایک واقعہ بئر معونہ کا تاریخ اسلام میں معروف و مشہور ہے، کہ بعض منافقین و کفار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی بستی میں تبلیغ اسلام کے لئے صحابہ کرام کی ایک جماعت بھیجنے کی درخواست کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ستر صحابہ کرام اُن کے ساتھ کئے، بعد میں حقیقت یہ کھلی کہ ان لوگوں نے یہ محض سازش کی تھی، ان سب کو گھیر کر قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور وہ اس

میں کامیاب ہوگئے، ان میں سے صرف عمرو بن امیہ ضمری کسی طرح نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب ہوگئے، جو بزرگ ابھی کفار کی یہ غداری اور خیانت اور اپنے انہتر بھائیوں کا بیدردی سے قتل دیکھ کر آرہے تھے اُن کا جذبہ کفار کے مقابلہ میں کیا ہوگا ہر شخص خود اندازہ کرسکتا ہے، اتفاق یہ ہوا کہ مدینہ طیبہ واپس آنے کے وقت راستہ میں ان کو دو کافروں سے سابقہ پڑا، انھوں نے دونوں کو قتل کردیا، بعد میں معلوم ہوا کہ دونوں آدمی قبیلۂ بنی عامر کے تھے جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدۂ صلح تھا۔

مسلمانوں کے معاہدات آجکل کے سیاسی لوگوں کے معاہدات تو ہوتے نہیں کہ پہلے ہی خلاف ورزی اور عہد شکنی کی راہیں تلاش کرلی جاتی ہیں، یہاں تو جو کچھ زبان یا قلم سے نکلتا تھا دین و مذہب اور خدا تعالیٰ کے حکم کی حیثیت رکھتا تھا، اور اس کی پابندی لازمی تھی، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس غلطی کا علم ہوا تو آپؐ نے اصولِ شرعیہ کے مطابق ان دونوں مقتولوں کی دیت (خونبہا) ادا کرنے کا فیصلہ فرمایا اور اس کے لئے مسلمانوں سے چندہ کیا، اس میں بنو نضیر کے پاس بھی چندہ کے سلسلے میں جانا ہوا (ابن کثیر)

بنو نضیر کو جلاوطن کرنے کے وقت اسلام اور مسلمانوں کی رواداری موجودہ اہلِ سیاست کے لئے سبق آموز معاملہ

آج کے بڑے بڑے حکمران اور بڑی حکومتیں جو انسانی حقوق کے تحفظ پر بڑے بڑے لیکچر دیتے ہیں اور اس کے لئے ادارے قائم کرتے ہیں اور دنیا میں تحفظِ حقوقِ انسانیت کے چودھری کہلاتے ہیں ذرا اس واقعہ پر نظر ڈالیں کہ بنو نضیر کی مسلسل سازشیں، خیانتیں، قتلِ رسول ص کے منصوبے جو آپ کے سامنے آتے رہے اگر آجکل کے کسی حکمران اور کسی سربراہ مملکت کے سامنے آئے ہوتے تو ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچئے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کرتا، آجکل تو زندہ لوگوں پر پیٹرول چھڑک کر میدان صاف کردینا کسی بڑے اقتدار و حکومت کا بھی محتاج نہیں، کچھ غنڈے شریر جمع ہوجاتے ہیں اور یہ سب کچھ کر ڈالتے ہیں، شاہانہ غیظ و غضب کے کرشمے کچھ اس سے آگے ہی ہوتے ہیں۔

مگر یہ حکومت خدا کی اور اس کے رسولؐ کی ہے جب خیانتیں اور غداریاں انتہا کو پہونچ گئیں تو اس وقت بھی ان کے قتلِ عام کا ارادہ نہیں فرمایا، اُن کے مال و اسباب چھین لینے کا کوئی تصور نہیں تھا، بلکہ (۱) اپنا سب سامان لے کر صرف شہر خالی کردینے کا فیصلہ کیا (۲) اور اس کے لئے بھی دس روز کی مہلت دی کہ آسانی سے اپنا سامان ساتھ لے کر اطمینان سے کسی دوسرے مقام پر منتقل ہوجائیں جب اس کی بھی خلاف ورزی کی تو قومی اقدام کی ضرورت پیش آئی، (۳) اس لئے کچھ درخت تو جلائے گئے، کچھ کاٹے گئے کہ اُن پر اثر پڑے، مگر قلعہ کو آگ لگا دینے کا یا اُن کے قتلِ عام کا حکم اس وقت بھی نہیں دیا گیا۔

(۴) پھر جب مجبور ہو کر ان لوگوں نے شہر خالی کردینا منظور کرلیا تو اس فوجی اقدام کے باوجود ان کو یہ اختیار دیا گیا کہ ایک اونٹ پر جس قدر سامان ایک آدمی لے جاسکتا ہے لے جائے، اُسی کا

نتیجہ تھا کہ انھوں نے اپنے مکانوں کی کڑیاں، تختے، دروازے، کواڑ تک اتار کر لادلئے۔

(۵) اس ساز و سامان کے ساتھ منتقل ہونے والوں کو کسی مسلمان نے ترچھی نظر سے نہیں دیکھا، امن و عافیت اور پورے اطمینان کے ساتھ سامان لیکر رخصت ہوئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ معاملات اس وقت کے ہیں جبکہ آپ کو اپنے دشمن سے انتقام پورا پورا لے لینے کی مکمل قدرت وطاقت حاصل تھی، ان غدار، خائن، سازشی دشمنوں کے ساتھ اُس وقت آپ کا یہ معاملہ اسی کی نظیر ہے جو فتح مکہ کے بعد اپنے قدیمی دشمنوں کے ساتھ آپ نے فرمایا۔

لِاَوَّلِ الْحَشْرِ، بنو نضیر کی اس جلاوطنی کو قرآن کریم نے اول حشر فرمایا، حشر کے معنی اُٹھ جانے کھڑے ہوجانے کے ہیں، اول حشر کہنے کی ایک وجہ خلاصۂ تفسیر میں بیان ہوچکی ہے کہ یہ لوگ زمانہ قدیم میں ایک جگہ آباد تھے، نقلِ مکانی اور جلاوطنی کا یہ واقعہ اُن کو پہلی بار پیش آیا، اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اسلام کا اصل حکم آگے یہ آنے والا تھا کہ جزیرۃ العرب کو غیر مسلموں سے خالی کرایا جائے، تاکہ وہ اسلام کا ایک مستحکم قلعہ بن سکے، اس کے نتیجہ میں ایک دوسرا حشر آئندہ بشکل جلاوطنی ہونے والا تھا، جو عملاً حضرت فاروق اعظمؓ کے عہدِ خلافت میں ہوا کہ ان میں سے جو لوگ منتقل ہوکر خیبر میں آباد ہوگئے تھے انکو جزیرۃ العرب سے باہر چلے جانے کا حکم دیا گیا، اس لحاظ سے بنو نضیر کی یہ جلاوطنی پہلا حشر اور دوسری جلاوطنی بعہد عمری دوسرا حشر ہوا۔

فَاَتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا، اس کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ آ گیا ان کے پاس اللہ تعالیٰ اس انداز سے کہ ان کو اس کا گمان بھی نہ تھا، اللہ کے آنے سے مراد اس کے حکم اور حکم بردار فرشتوں کا آنا ہے۔

يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ، اُن کا اپنے مکانات کا اپنے ہاتھوں خراب کرنا تو اس طرح ہوا کہ اپنے دروازے، کواڑ ساتھ لے جانے کے لئے اکھاڑے، اور مسلمانوں کے ہاتھوں اس طرح کہ جب یہ قلعہ بند تھے تو قلعہ سے باہر مسلمانوں نے اُن پر اثر ڈالنے کے لئے درختوں اور مکانوں کو ویران کیا۔

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ، لفظ لِیْنَہ کھجور کے ہر درخت یا عجوہ کے علاوہ باقی درختوں کے لئے بولا جاتا ہے، بنو نضیر کے باغات کھجور کے تھے، جب قلعہ بند ہوگئے تو بعض صحابۂ کرام نے ان لوگوں کو غیظ دلانے اور اُن پر رعب ڈالنے کے لئے اُن کی کھجوروں کے چند درختوں کو کاٹ کر یا جلا کر ختم کر دیا، اور بعض دوسرے صحابۂ کرام نے خیال کیا کہ انشاء اللہ فتح ہماری ہوگی، اور یہ درخت اور باغات مسلمانوں کے ہاتھ آئیں گے تو کیوں ان کو ضائع کیا جائے وہ ان کے کاٹنے جلانے سے باز رہے، یہ ایک رائے کا اختلاف تھا، بعد

میں جب آپس میں گفتگو ہوئی تو جن حضرات نے کچھ درخت کاٹے یا جلائے تھے اُن کو یہ فکر ہوئی کہ شاید ہم گناہگار ہوگئے کہ جو مال مسلمانوں کو ملنے والا تھا اُس کو نقصان پہونچایا، اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی، جس نے دونوں فریق کے عمل کو جائز و درست فرمایا، اور دونوں کو باذن اللہ میں داخل کر کے حکم الٰہی کی تعمیل قرار دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم درحقیقت اللہ ہی کا حکم ہوتا ہی، منکرین حدیث کیلئے تنبیہ

اس آیت میں ان درختوں کے کاٹنے جلانے یا اُن کو باقی چھوڑنے کے دونوں مختلف عملوں کو باذن اللہ فرمایا ہے، حالانکہ قرآن کی کسی آیت میں دونوں میں سے کوئی بھی حکم مذکور نہیں، ظاہر تو یہ ہو کہ دونوں حضرات نے جو عمل کیا، وہ اپنے اجتہاد سے کیا، زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لی ہو مگر قرآن نے اس اجازت کو جو کہ ایک حدیث تھی اذن اللہ قرار دے کر واضح کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ کی طرف سے تشریع احکام کا اختیار دیا گیا ہی، اور جو حکم آپ جاری فرمادیں وہ اللہ تعالیٰ ہی کے حکم میں داخل ہی، اس کی تعمیل قرآنی آیات کی تعمیل کی طرح فرض ہے۔

اجتہادی اختلاف کی دونوں جانبوں میں کسی کو گناہ نہیں کہہ سکتے،

دوسرا اہم اصول اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ جو لوگ اجتہادِ شرعی کی صلاحیت رکھتے ہیں، اگر ان کا اجتہاد کسی مسئلے میں مختلف ہوجائے، ایک فریق جائز قرار دے اور دوسرا ناجائز، تو عنداللہ یہ دونوں حکم درست اور جائز ہوتے ہیں، ان میں سے کسی کو گناہ و معصیت نہیں کہہ سکتے، اور اسی لئے اس پر نہی عن المنکر کا قانون جاری نہیں ہوتا، کیونکہ ان میں سے کوئی جانب بھی منکر شرعی نہیں، اور وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ میں درختوں کے کاٹنے یا جلانے والوں کے عمل کی توجیہ بیان کی گئی ہے کہ وہ بھی فساد میں داخل نہیں بلکہ کفار کو ذلیل کرنے کے قصد سے موجبِ ثواب ہے۔

مسئلہ: بحالتِ جنگ کفار کے گھروں کو منہدم کرنا یا جلانا اسی طرح درختوں، کھیتوں کو برباد کرنا جائز ہے یا نہیں اس میں ائمہ فقہاء کے مختلف اقوال ہیں، امام اعظم ابوحنیفہ رح سے بحالتِ جنگ ان سب کاموں کا جائز ہونا منقول ہے، مگر شیخ ابن ہمام رح نے فرمایا کہ یہ جواز اس وقت میں ہے جبکہ اس کے بغیر کفار پر غلبہ پانا مشکل ہو، یا اس صورت میں جبکہ مسلمانوں کی فتح کا گمان غالب نہ ہو، تو یہ سب کام اس لئے جائز ہیں کہ ان سے کفار کی طاقت و شوکت کو توڑنا مقصود ہے، یا عدم فتح کی صورت میں اُن کے مال کو ضائع کرنا بھی ان کی قوت کو کمزور کردینے کے لئے اس میں داخل ہی (مظہری)

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّ

اور جو مال کہ لوٹا دیا اللہ نے اپنے رسول پر ان سے سو تم نے نہیں دوڑائے اس پر گھوڑے اور

لَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ

نہ اونٹ ولیکن اللہ غلبہ دیتا ہے اپنے رسولوں کو جس پر چاہے اور اللہ سب کچھ

شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۶﴾ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَ

کر سکتا ہے ، جو مال لوٹایا اللہ نے اپنے رسول پر بستیوں والوں سے سو اللہ کے واسطے

لِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ

اور رسول کے اور قرابت والے کے اور یتیموں کے اور محتاجوں کے اور مسافر کے ،

كَیْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ؕ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ

تاکہ نہ آئے لینے دینے میں دولت مندوں کے تم میں سے اور جو دے تم کو رسول

فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

سو لے لو اور جس سے منع کرے سو چھوڑ دو ، اور ڈرتے رہو اللہ سے بیشک اللہ کا

شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۷﴾ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ

عذاب سخت ہے ، واسطے ان مفلسوں وطن چھوڑنے والوں کے جو نکالے ہوئے آئے

دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ

ہیں اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے ڈھونڈتے آئے ہیں اللہ کا فضل اور اسکی رضامندی اور مدد

اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۸﴾ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ

کرنے کو اللہ کی اور اس کے رسول کی ، وہ لوگ وہی ہیں سچے ، اور جو لوگ جگہ پکڑ رہے ہیں اس گھر میں

وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِیْ

اور ایمان میں ان سے پہلے سے وہ محبت کرتے ہیں اس سے جو وطن چھوڑ کر آئے انکے پاس اور نہیں پاتے اپنے

صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ

دل میں تنگی اس چیز سے جو ان (مہاجرین) کو دی جائے اور مقدم رکھتے ہیں ان کو اپنی جان سے اور

كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۟ؕ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ

اگرچہ ہو اپنے اوپر فاقہ ، اور جو بچایا گیا اپنے جی کے لالچ سے تو وہی لوگ ہیں

وقف لازم

الْمُفْلِحُوْنَ ⑨ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا

مراد پانے والے ، اور واسطے ان لوگوں کے جو آئے ان کے بعد کہتے ہوئے اے رب بخش ہم کو

وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا

اور ہمارے بھائیوں کو جو ہم سے پہلے داخل ہوئے ایمان میں اور نہ رکھ ہمارے دلوں میں بیر

لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ⑩

ایمان والوں کا اے رب تو ہی ہے نرمی والا مہربان ،

خلاصۂ تفسیر

(اوپر جو بیان ہوا وہ تو بنی نضیر کی جانوں کے ساتھ معاملہ تھا) اور (ان کے اموال کے ساتھ جو معاملہ ہوا اس کا بیان یہ ہے کہ) جو کچھ اللہ نے اپنے رسول کو ان سے دلوا دیا سو (اس میں تم کو کوئی مشقت نہیں پڑی، چنانچہ) تم نے اس پر (یعنی اس کے حاصل کرنے پر) نہ گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ (مطلب یہ کہ نہ سفر کی مشقت ہوئی، کیونکہ مدینہ سے دو میل پر ہے، اور نہ قتال کی اور برائے نام جو مقابلہ کیا گیا وہ غیر معتد بہ تھا کذا فی الروح، اس لئے اس مال میں تمہارا استحقاق تقسیم و تملیک کا نہیں، جس طرح مالِ غنیمت میں ہوتا ہے) لیکن اللہ تعالیٰ (کی عادت ہے کہ) اپنے رسولوں کو (اپنے دشمنوں میں سے) جس پر چاہے (خاص طور پر) مسلط فرما دیتا ہے (یعنی محض رعب سے مغلوب کر دیتا ہے، جس میں کسی کو کچھ مشقت اٹھانی نہیں پڑتی، چنانچہ اُن رسولوں میں سے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اموال بنی نضیر پر اسی طرح مسلط فرما دیا، اس لئے اس میں تمہارا کوئی حق نہیں ہے بلکہ اس میں مالکانہ تصرّف کرنے کا مکمل اختیار آپ کو ہی ہے) اور اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے (پس وہ جس طرح چاہے دشمنوں کو مغلوب کر دے اور جس طرح چاہے اپنے رسول کو اختیار اور تصرّف دے، اور جیسا اموالِ بنی نضیر کا یہ حکم ہے اسی طرح) جو کچھ اللہ تعالیٰ (اسی طور پر) اپنے رسول کو دوسری بستیوں کے (کافر) لوگوں سے دلوا دے (جیسا باغِ فدک اور ایک جزو خیبر کا اسی طرح ہاتھ آیا) سو (اس میں بھی تمہارا کوئی استحقاق ملکیت کا نہیں بلکہ) وہ (بھی) اللہ کا حق ہے (یعنی وہ جس طرح چاہے اس میں حکم دے جیسا کہ اور سب چیزوں میں اس کا اسی طرح کا حق ہے اور تخصیص حصر کے لئے نہیں) اور رسول کا (حق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس مال میں مالکانہ تصرفات اپنی صوابدید سے کرنے کا اختیار دیدیا ہے) اور (آپ کے) قرابت داروں کا (حق ہے) اور یتیموں کا (حق ہے) اور غریبوں کا (حق ہے) اور مسافروں کا (حق ہے یعنی یہ سب حسب صوابدید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، اس مال کے مصرف ہیں، اور ان میں بھی انحصار نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

جس کو اپنی رائے سے دینا چاہیں وہ بھی اس میں شامل ہے، اور مذکورہ اقسام کا خاص طور پر ذکر شاید اس لئے کیا گیا کہ اُن کے بارے میں یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ جب شرکاءِ جہاد کا اس مال میں استحقاق نہیں تو یہ اقسام جو شریکِ جہاد بھی نہیں ان کا بھی حق نہیں ہوگا، مگر آیت میں اُن کا ذکر خاص اوصاف یتیم، غریب، مسافر وغیرہ کے ساتھ کر کے اشارہ کر دیا کہ یہ لوگ اپنے ان اوصاف کی وجہ سے اس مال کے مصرف باختیارِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہو سکتے ہیں، جہاد کی شرکت سے اس کا تعلق نہیں، پھر ان اوصاف میں ایک وصف ذوی القربیٰ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رشتہ داروں کا بھی ہے، ان کو اس مال میں سے اس لئے دیا جاتا تھا کہ یہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مددگار تھے، ہر مشکل کے وقت کام آتے تھے، یہ حصّہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد منقطع ہو گیا، جیسا کہ سورۃ انفال میں اس کا بیان آچکا ہے، اور یہ حکم مذکور اس لئے مقرر کر دیا) تاکہ وہ (مال فَیٔ) تمہارے مالداروں کے قبضہ میں نہ آجائے (جیسا جاہلیت میں سب غنائم و محاصلِ جنگ اصحابِ اقتدار کھا جاتے تھے، اور فقراء بالکل محروم رہ جاتے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے رسول ؐ کی رائے پر رکھا اور مصارف بھی بتلا دیئے کہ آپ باوجود مالک ہونے کے پھر بھی اہلِ حاجت و مواقع مصلحت عامّہ میں صرف فرما دیں گے) اور (جب یہ معلوم ہو گیا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے پر ہونے میں حکمت ہے تو) رسول تم کو جو کچھ دیدیا کریں وہ لیلیا کرو اور جس چیز (کے لینے) سے تم کو روک دیں تم رُک جایا کرو (اور بعمومِ الفاظ یہی حکم ہے تمام افعال و احکام میں بھی) اور اللہ سے ڈرو بیشک اللہ تعالیٰ (مخالفت کرنے پر) سخت سزا دینے والا ہے (اور یوں تو فَیٔ میں مطلقاً سب مساکین کا حق ہے لیکن) ان حاجت مند مہاجرین کا (بالخصوص) حق ہے جو اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے (جبراً وظلماً) جدا کر دیئے گئے (یعنی کفار نے ان کو اس قدر تنگ کیا کہ گھر بار چھوڑ کر ہجرت پر مجبور ہوئے اور اس ہجرت سے) وہ اللہ تعالیٰ کے فضل (یعنی جنّت) اور رضامندی کے طالب ہیں (کسی دنیوی غرض سے ہجرت نہیں کی) اور وہ (لوگ) اللہ اور اس کے رسول (کے دین) کی مدد کرتے ہیں (اور) یہی لوگ (ایمان کے) سچّے ہیں اور (نیز) (ان لوگوں کا بھی حق ہے) جو دار الاسلام (یعنی مدینہ) میں اور ایمان میں ان (مہاجرین) کے (آنے کے) قبل سے قرار پکڑے ہوئے ہیں (مراد اس سے انصاری حضرات ہیں، اور مدینہ میں اُن کا پہلے قرار پکڑنا تو ظاہر ہے کہ وہ یہیں کے باشندے تھے، اور ایمان میں پہلے قرار پکڑنے کا یہ مطلب نہیں کہ سب انصار کا ایمان سب مہاجرین سے مقدم ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ مہاجرین کے مدینہ میں آنے سے پہلے ہی یہ حضرات مشرّف باسلام ہو چکے تھے، خواہ اصل ایمان ان کا بعض مہاجرین کے ایمان سے مؤخر ہی ہو) جو اُن کے پاس ہجرت کر کے آتا ہے اس سے یہ لوگ محبت کرتے ہیں اور مہاجرین کو (مالِ غنیمت وغیرہ میں سے) جو کچھ ملتا ہے اس سے یہ (انصار بوجہ محبّت کے) اپنے دلوں میں کوئی رشک نہیں پاتے اور (بلکہ اس سے بھی بڑھ کر محبت کرتے ہیں کہ

الطعام وغیرہ میں ان کو) اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگرچہ ان پر فاقہ ہی ہو (یعنی خود لبسا اوقات فاقہ سے بیٹھ رہتے ہیں اور مہاجرین کو کھلا دیتے ہیں) اور (واقعی) جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جاوے (جیسے یہ لوگ ہیں کہ حرص اور اس کے مقتضا پر عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ نے ان کو پاک رکھا ہے) ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اور ان لوگوں کا (بھی اس مال فئی میں حق ہے) جو (دارالاسلام میں یا ہجرت میں یا دنیا میں) ان (مہاجرین وانصار مذکورین) کے بعد آئے (یا آویں گے) جو دعاء کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو (بھی) جو ہم سے پہلے ایمان لاچکے ہیں (خواہ نفس ایمان یا ایمان کامل کہ موقوف ہجرت پر تھا) اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کی طرف سے کینہ نہ ہونے دیجئے (یہ دعاء متقدمین کے علاوہ معاصرین کو بھی شامل ہے) اے ہمارے رب آپ بڑے شفیق رحیم ہیں۔

معارف ومسائل

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ الآیہ، لفظ اَفَاء، فئی سے مشتق ہے جس کے معنی لوٹنے کے ہیں، اسی لئے دوپہر کے بعد جو چیزوں کا سایہ مشرق کی طرف لوٹتا ہے اس کو بھی فئی کہا جاتا ہے، اموالِ غنیمت جو کفار سے حاصل ہوتے ہیں اُن سب کی اصل حقیقت یہ ہے کہ اُن کے باغی ہوجانے کی وجہ سے ان کے اموال بحقِ سرکار ضبط ہوجاتے ہیں اور ان کی ملکیت سے نکل کر پھر مالکِ حقیقی حق تعالیٰ کی طرف لوٹ جاتے ہیں، اس لئے اُن کے حاصل ہونے کو اَفَاء کے لفظ سے تعبیر کیا گیا، اس کا تقاضا یہ تھا کہ کفار سے حاصل ہونے والے تمام قسم کے اموال کو فئی ہی کہا جاتا، مگر جو مال جہاد و قتال کے ذریعہ حاصل ہوا اس میں انسانی عمل اور جد وجہد کو بھی ایک قسم کا دخل ہے، اس لئے اس کو تو لفظ غنیمت سے تعبیر فرمایا گیا، وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ، لیکن جس کے حصول میں جہاد وقتال کی بھی کوئی ضرورت نہ پڑی اس کو لفظ فئی سے تعبیر فرمایا گیا، اس آیت کا حاصل یہ ہوا کہ جو مال بغیر جہاد و قتال کے حاصل ہوا ہے وہ مجاہدین و غانمین میں مالِ غنیمت کے قانون کے مطابق تقسیم نہیں ہوگا، بلکہ اس میں کلی اختیار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہوگا جس کو جتنا چاہیں عطا فرمادیں یا اپنے لئے رکھیں، البتہ یہ پابندی لگادی گئی کہ چند اقسام مستحقین کی متعین کردی گئیں کہ اس مال کی تقسیم انھیں اقسام میں دائر رہنی چاہئے، اس کا بیان اگلی آیت میں اس طرح فرمایا مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی، اس میں اہلِ قریٰ سے مراد بنونضیر اور ان جیسے دوسرے قبائل بنو قریظہ وغیرہ ہیں جن کے اموال بغیر قتال کے حاصل ہوئے، آگے مصارف و مستحقین کی پانچ قسمیں بتلائی گئیں ہیں جن کا بیان آگے آتا ہے۔

آیاتِ مذکورہ میں فئی کے احکام، اس کے مستحقین اور ان میں تقسیم کا طریقہ کار بیان فرمایا ہے

سورۂ انفال کے شروع میں مال غنیمت اور فیئ کا فرق واضح طور پر بیان ہو چکا ہے، کہ غنیمت اس مال کو کہا جاتا ہے جو کفار سے جہاد و قتال کے نتیجہ میں مسلمانوں کے ہاتھ آتا ہے، اور فیئ وہ مال ہے جو بغیر جہاد و قتال کے ان سے حاصل ہو، خواہ اس طرح کہ وہ اپنا مال چھوڑ کر بھاگ گئے، یا رضامندی سے بصورتِ جزیہ و خراج یا تجارتی ڈیوٹی وغیرہ کے ذریعہ اُن سے حاصل ہوتا ہے۔

اس کی کچھ تفصیل شروع سورۂ انفال میں معارف القرآن جلد چہارم صفحہ ۱۷۴ میں اور مزید تفصیل اسی سورۂ انفال کی آیت ۴۱ کے تحت معارف القرآن جلد چہارم صفحہ ۲۳۶ میں لکھی جا چکی ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ سورۂ انفال کی آیت ۴۱ میں جو الفاظ خمسِ غنیمت کے متعلق آئے ہیں تقریباً وہی الفاظ یہاں مالِ فیئ کے بارے میں ہیں، سورۂ انفال میں ہے:۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ،

ان دونوں آیتوں میں مال کے حقداروں میں چھ نام ذکر کئے گئے، اللہ، رسول، ذوی القربیٰ، یتیم، مسکین، مسافر، یہ ظاہر ہے کہ اللہ جل شانہٗ تو دنیا و آخرت اور تمام مخلوقات کا مالک حقیقی ہے، اس کا نام مبارک تو حصوں کے بیان میں محض تبرکاً اس فائدہ کے لئے ہے کہ اس سے اس مال کی شرافت و فضیلت اور حلال وطیب ہونے کی طرف اشارہ ہو جائے، حسن بصری، قتادہ، عطاء، ابراہیم، شعبی اور عام مفسرین کا یہی قول ہے (مظہری)

اللہ جل شانہٗ کا نام ذکر کرنے سے اس مال کی فضیلت و شرافت کی طرف اشارہ کس طرح ہوا اس کا تفصیلی بیان سورۂ انفال کی تفسیر میں ہو چکا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے لئے مال صدقہ جو مسلمانوں سے حاصل ہوتا ہے، وہ بھی حلال نہیں فرمایا، مالِ غنیمت اور فیئ جو کافروں سے حاصل ہوا اس پر یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کیسے حلال ہوا؟ اس شبہ کا ازالہ اللہ جل شانہٗ کا نام اس جگہ ذکر کر کے اس طرح کیا گیا کہ درحقیقت ہر چیز کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، اس نے اپنے فضل سے ایک خاص قانون کے تحت انسانوں کو حقِ ملکیت دیا ہے، لیکن جو انسان باغی ہو جائیں ان کو صحیح راستہ پر لانے کے لئے اوّل تو انبیاء علیہم السلام اور آسمانی ہدایات بھیجی گئیں جو اُن سے بھی متاثر نہیں ہوئے ان کو یہ حق دیا گیا کہ کم از کم اسلامی قانون کی اطاعت قبول کرلیں اور مقررہ جزیہ و خراج اپنے مال میں سے حکومت کو ادا کیا کریں، جن لوگوں نے اس سے بھی بغاوت کی ان کے مقابلہ میں جہاد و قتال کا حکم ہو گیا جس کا حاصل یہ ہے کہ اُن کی جان اور مال قابلِ احترام نہیں، ان کے اموال بحقِ حکومتِ الٰہیہ ضبط ہو گئے، اور بذریعہ جہاد و قتال جو مال اُن سے حاصل ہوا وہ کسی انسان کی ذاتی ملکیت نہیں رہا، بلکہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی ملک میں واپس ہو گیا، اور لفظ فیئ میں اس مفہوم کی طرف اشارہ بھی ہے، کہ اس کے اصلی معنی لوٹنے ہی کے ہیں، اس مال کو فیئ اس لئے کہا گیا کہ یہ اصل مالکِ حقیقی اللہ تعالیٰ کی ملکیت کی طرف لوٹ گیا

اب اس میں کسی انسانی ملکیت کا کوئی دخل نہیں، اس کے بعد جن مستحقین کو اس میں کوئی حصہ دیا جائے گا یہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگا، اس لئے ایسا ہی حلال طیب ہوگا جیسے پانی اور خود اُگنے والی گھاس جو براہِ راست حق تعالیٰ کا عطیہ انسان کے لئے ہے اور حلال طیب ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نام اس جگہ ذکر کرنے سے اشارہ اس طرف ہے کہ یہ سارا مال دراصل اللہ کا ہے، اس کی طرف سے مستحقین کو دیا جاتا ہے، یہ کسی کا صدقہ و خیرات نہیں۔

اب مستحقین اور مصارف کُل پانچ رہ گئے، رسولؐ، ذوی القربیٰ، یتیمؔ، مسکینؔ، مسافرؔ، یہی پانچ مصارف مالِ غنیمت کے خمس کے ہیں، جس کا بیان سورۂ انفال میں آیا ہے، اور یہی مصارف مال فئے کے ہیں اور دونوں کا حکم یہ ہے کہ یہ سب اموال درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفاء کے مکمل اختیار میں ہوتے ہیں وہ چاہیں تو ان سب اموال کو عام مسلمانوں کے مفاد کے لئے روک لیں، اور بیت المال میں جمع کر دیں، کسی کو کچھ نہ دیں اور چاہیں تقسیم کر دیں، البتہ تقسیم کئے جاویں تو ان پانچ اقسام میں دائر رہیں (قرطبی)

خلفائے راشدینؓ اور دوسرے صحابہ کرام کے تعامل سے ثابت ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تو مالِ فئ آپؐ کے اختیار میں تھا، آپؐ کی صواب دید کے مطابق صرف کیا جاتا تھا، آپ کے بعد آپؐ کے خلفاء کے اختیار اور صواب دید پر رہا۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حصہ اس مال میں رکھا گیا تھا وہ آپؐ کی وفات کے بعد ختم ہوگیا ذوی القربیٰ کو اس مال میں سے دینے کی دو وجہ تھیں، ایک نصرتِ رسولؐ، یعنی اسلامی کاموں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرنا، اس لحاظ سے اغنیاء ذوی القربیٰ کو بھی اس میں سے حصہ دیا جاتا تھا۔

دوسرے یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذوی القربےٰ پر مال صدقہ حرام کر دیا گیا ہے، تو ان کے فقراء و مساکین کو صدقہ کے بدلہ میں مالِ فئ سے حصہ دیا جاتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد نصرت و امداد کا سلسلہ ختم ہوگیا، تو یہ وجہ باقی نہ رہی، اس لئے اغنیاءِ ذوی القربیٰ کا حصہ بھی حصۂ رسولؐ کی طرح ختم ہوگیا، البتہ فقراءِ ذوی القربیٰ کا حصہ بحیثیت فقر و احتیاج کے اس مال میں باقی رہا، اور وہ اس مال میں دوسرے فقراء و مساکین کے مقابلہ میں مقدم رکھے جاویں گے (کذا فی الہدایہ) اس کی پوری تفصیل سورۂ انفال میں آچکی ہے۔

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَاۗءِ مِنْكُمْ، دُوْلَة، بضمِ دال اُس مال کو کہا جاتا ہے جس کا آپس میں لین دین کیا جائے (قرطبی) (معنی آیت کے یہ ہیں کہ مال فئے کے مستحقین اس لئے متعین کر دیئے) "تاکہ یہ مال تمہارے مالداروں اور تونگروں میں گردش کرنے والی دولت نہ بن جائے" اس میں اشارہ اس رسم جاہلیت کو مٹانے کی طرف ہے جس میں اس طرح کے تمام اموال پر رئیس خود قابض و مالک ہو جاتا تھا،

غریبوں، مسکینوں کے حق کا اس میں کوئی حصہ نہ رہتا تھا۔

اکتنازِ دولت پر اسلامی قوانین کی ضرب کاری، حق تعالیٰ رب العالمین ہے، اس کی مخلوق ہونے کی حیثیت سے انسانی ضروریات میں تمام انسانوں کا یکساں حق ہے، اس میں مؤمن و کافر کا بھی فرق نہیں کیا گیا، خاندانی اور طبقاتی امیر و غریب کا کیا امتیاز ہوتا، اللہ تعالیٰ نے دنیا میں تقسیم دولت کا بہت بڑا حصہ جو انسان کی فطری اور اصلی ضروریات پر مشتمل ہے اس کی تقسیم خود اپنے دستِ قدرت میں رکھ کر اس طرح فرمائی ہے کہ اس سے ہر طبقہ ہر خطہ ہر کمزور و قوی یکساں فائدہ اٹھا سکے، ایسی اشیاء کو اللہ جلّ شانہ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے عام انسانی دستبرد اور قبضہ و تسلّط سے مافوق بنا دیا ہے کہ کسی کی مجال نہیں کہ اس پر ذاتی قبضہ جما سکے، ہوا، فضاء، آفتاب، ماہتاب اور سیّاروں کی روشنی، فضاء میں پیدا ہونے والے بادل ان کی بارش، یہ چیزیں ایسی ہیں کہ اُن کے بغیر انسان تھوڑی دیر بھی زندہ نہیں رہ سکتا، ان سب کو قدرت حق سبحانہ و تعالیٰ نے ایسا وقفِ عام بنا دیا کہ کوئی بڑی سے بڑی حکومت وطاقت اس پر قبضہ نہیں جما سکتی، یہ چیزیں اللہ کی مخلوق کو ہر جگہ یکساں ملتی ہیں۔

اشیاء ضرورت کی دوسری قسط زمین سے نکلنے والا پانی اور کھانے کی چیزیں ہیں، یہ اگرچہ اتنی عام نہیں مگر اسلامی قانون میں پہاڑوں اور غیر آباد جنگلوں اور قدرتی چشموں کو وقف عام چھوڑ کر ایک خاص قانون کے تحت خاص خاص انسانوں کو زمین کے بعض حصّوں پر جائز حقِ ملکیت بھی دیا جاتا ہے اور ناجائز قبضہ و تسلّط جمانے والے بھی زمین پر قبضہ جما لیتے ہیں، لیکن قدرتی طور پر زمین کے فوائد کوئی بڑا سرمایہ دار بھی بغیر غریبوں، کسانوں، مزدوروں کو ساتھ لئے حاصل نہیں کر سکتا، اس لئے ایک گونہ قبضہ کے باوجود وہ اس میں دوسرے کمزور غریبوں کو حصّہ دینے پر مجبور ہے۔

تیسری قسط سونا چاندی، روپیہ پیسہ ہے، جو اصلی اور فطری ضروریات میں داخل نہیں، مگر حق تعالیٰ نے اس کو تمام ضروریات کی تحصیل کا ذریعہ بنا دیا ہے، اور یہ معادن سے نکالنے کے بعد خاص قانون کے تحت نکالنے والوں کی ملکیت ہو جاتا ہے، اور اُن سے اُن کی ملکیت مختلف طریقوں پر دوسروں کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہے، اور اگر اس کی گردش پورے انسانوں میں خاطر خواہ ہوتی رہے تو کوئی انسان بھوکا ننگا نہیں رہ سکتا، مگر ہوتا یہ ہے کہ مال سے صرف خود ہی فائدہ اٹھائے، دوسروں تک اس کا فائدہ نہ پہونچے، اس بخل و حرص نے دنیا میں اکتنازِ دولت اور سرمایہ پرستی کے پُرانے اور نئے بہت سے طریقے ایجاد کرائے، جن کے ذریعہ اس دولت کی گردش صرف سرمایہ داروں اور بڑے لوگوں کے ہاتھوں تک محدود ہو کر رہ گئی، عام غریب مساکین محروم کر دیئے گئے، جس کے ردِّ عمل نے دنیا میں کمیونزم اور سوشلزم جیسے نامعقول طریقے ایجاد کئے۔

اسلامی قانون نے ایک طرف تو شخصی ملکیت کا اتنا احترام کیا کہ ایک شخص کے مال کو اس کی جان

کی برابر ادر جان کو بیت اللہ کی حرمت کے برابر قرار دیا اس پر کسی کے ناجائز تصرف کو شدت سے روکا، دوسری طرف جو ہاتھ ناجائز طور پر اس کی طرف بڑھا وہ ہاتھ کاٹ دیا گیا، تیسری طرف ایسے تمام دروازے بند کر دیئے کہ قدرتی وسائل سے حاصل ہونے والی چیزوں پر کوئی خاص شخص یا جماعت قبضہ کر کے بیٹھ جائے اور عوام کو محروم کر دے۔

کسب واکتساب کے مروجہ طریقوں میں سود، سٹہ، جوا ایسی چیزیں ہیں کہ ان کے ذریعہ دولت سمٹ کر چند افراد و اشخاص میں دائر ہو کر رہ جاتی ہے، ان سب کو سخت حرام قرار دے کر تمام معاملات تجارت اور کرایہ داری وغیرہ میں اُن کی جڑ کاٹ دی، اور جو دولت کسی شخص کے پاس جائز طریقوں سے جمع ہوتی اس میں بھی غریبوں فقیروں کے حقوق، زکوٰۃ، عشر، صدقۃ الفطر، کفارات وغیرہ مقررہ فرائض کی صورت میں اور اس سے زائد رضاکارانہ صورت میں قائم فرما دیئے، اور ان سب اخراجات کے بعد بھی جو کچھ انسان کے مرنے کے وقت تک باقی رہ گیا اس کو ایک خاص حکیمانہ اصول کے مطابق تقسیم کر دیا کہ اس کا حق دار اسی مرنے والے کے رشتہ داروں کو اقرب فالاقرب کے اصول پر بنا دیا اس کو عام فقراء میں تقسیم کرنے کا قانون اس لئے نہ بنایا کہ ایسا ہوتا تو مرنے والا اپنے مرنے سے پہلے ہی اس کو جا و بے جا خرچ کر کے فارغ ہونے کی خواہش طبعی طور پر رکھتا، اپنے ہی خویش و عزیز کو ملتا دیکھ کر یہ داعیہ اس کے دل میں پرورش نہ پائے گا۔

یہ طریقہ تو کسب و اکتساب کے عام مروجہ طریقوں میں اکتناز دولت سے بچانے کا اختیار کیا، دوسرا طریقہ دولت حاصل ہونے کا جنگ و جہاد ہے، اس سے حاصل ہونے والے اموال میں وہ تقسیم شرعی جاری فرمادی جس کا ذکر کچھ سورۂ انفال میں گذرا ہے، اور کچھ اس سورت میں بیان ہوا ہے، کیسے بے بصیرت ہیں وہ لوگ جو اسلام کے اس منصفانہ، عادلانہ اور حکیمانہ نظام کو چھوڑ کر نئے نئے ازموں کو اختیار کر کے امن عالم کو برباد کرتے ہیں۔

مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ الآیۃ، یہ آیت اگرچہ مال فئے کی تقسیم کے سلسلے میں آئی ہے، اور اس سلسلے کے مناسب اس کا مفہوم یہ ہے کہ مال فئے میں اگرچہ اللہ تعالیٰ نے مستحقین کے طبقات بیان کر دیئے ہیں مگر ان میں کس کو اور کتنا دیں اس کی تعیین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صواب دید پر رکھی ہے، اس لئے مسلمانوں کو اس آیت میں ہدایت دی گئی کہ جس کو جتنا آپ عطا فرما دیں اس کو راضی ہو کر لے لیں اور جو نہ دیں اس کی فکر میں نہ پڑیں، آگے اس کو اِتَّقُوا اللّٰهَ کے حکم سے مؤکد کر دیا، کہ اگر اس معاملے میں کچھ غلط حیلے بہانے بنا کر زائد وصول کر بھی لیا تو اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے وہ اس کی سزا دے گا۔

حکم رسول مثل حکم قرآن کے واجب التعمیل ہے،

لیکن الفاظ آیت عام ہیں، صرف اموال کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ احکام بھی اس میں داخل ہیں، اس لئے عام انداز میں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو کوئی حکم یا مال یا اور کوئی چیز آپ کسی کو عطا فرما دیں وہ اس کو لے لینا چاہئے، اور اس کے مطابق عمل کے لئے تیار ہو جانا چاہئے اور جس چیز سے روک دیں اس سے رُکنا چاہئے۔

بہت سے صحابۂ کرام نے اسی عام مفہوم کو اختیار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر حکم کو اس آیت کی بنا پر قرآن ہی کا حکم اور واجب التعمیل قرار دیا ہے، قرطبی نے فرمایا کہ اس آیت میں آتٰی کے بالمقابل نہٰی کا لفظ آیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آتٰی کے معنی یہاں اَمَرَ کے ہیں جو نہٰی کا صحیح مقابل ہے، (اھ) اور قرآن کریم نے نہٰی کے مقابل میں اَمَرَ کے لفظ کو چھوڑ کر اٰتٰی کا لفظ استعمال شاید اس لئے فرمایا تاکہ جس مضمون کے سیاق میں یہ آیت آئی ہے یعنی مال فئے کی تقسیم اس پر بھی آیت کا مضمون شامل رہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک شخص کو احرام کی حالت میں سلے ہوئے کپڑے پہنے دیکھا تو حکم دیا کہ یہ کپڑے اُتار دو، اس شخص نے کہا کہ آپ اس کے متعلق مجھے قرآن کی کوئی آیت بتا سکتے ہیں؟ جس میں سلے ہوئے کپڑوں کی ممانعت ہو، حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا ہاں وہ آیت میں بتاتا ہوں، پھر یہی آیت مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ پڑھ کر سُنادی، امام شافعیؒ نے ایک مرتبہ لوگوں سے کہا کہ میں تمہارے ہر سوال کا جواب قرآن سے دے سکتا ہوں، پوچھو جو کچھ پوچھنا ہے، ایک شخص نے عرض کیا کہ ایک مُحرِم نے زنبور (تتیا) مار ڈالا تو اس کا کیا حکم ہے؟ امام شافعیؒ نے یہی آیت مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ تلاوت کر کے حدیث سے اس کا حکم بیان فرما دیا (قرطبی)

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ، ان چند آیات میں آخر رکوع تک فقراء مہاجرین وانصار اور ان کے بعد آنے والی عام اُمّت کے افراد کا بیان ہے، ترکیب نحوی کے اعتبار سے لِلْفُقَرَآءِ کو لِذِي الْقُرْبٰى کا بدل قرار دیا گیا جو اس سے پہلی آیت میں مذکور ہے (مظہری) اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ پچھلی آیت میں جو عام یتیموں، مساکین اور مسافرین کو ان کے فقر و احتیاج کی بناء پر مال فئی کے مستحقین میں شمار کیا گیا ہے، ان آیات میں اس کی مزید تشریح اس طرح کی گئی ہے کہ اگرچہ حقدار اس مال میں تمام ہی فقراء و مساکین ہیں لیکن پھر اُن میں یہ حضرات اور سب لوگوں سے مقدم ہیں جن کی دینی خدمات اور ذاتی اوصاف و کمالاتِ دینیہ معروف ہیں۔

اموالِ صدقات میں صلحاء اور دینی خدمات انجام دینے والے حاجتمندوں کو مقدم کیا جائے

اس سے معلوم ہوا کہ اموال صدقات خصوصاً مالِ فئے اگرچہ عام فقراء مسلمین کی حاجت رفع کرنے کے لئے ہیں، لیکن ان میں بھی نیک، صالح، دیندار خصوصاً دینی خدمات انجام دینے والے طلباء، علماء، اوروں سے مقدم رکھے جاویں، اسی لئے اسلامی حکومتوں میں تعلیم و تبلیغ اور اصلاح خلق میں مشغول علماء اور مفتیوں، قاضیوں کو ان کے گذارہ کے اخراجات مال فئے ہی سے دینے کا رواج تھا، کیونکہ ان آیات میں صحابۂ کرام میں بھی اوّل دو درجے قائم کئے گئے، ایک مہاجرین جنھوں نے سب سے پہلے اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے بڑی قربانیاں پیش کیں، اور اسلام کے لئے بڑے مصائب جھیلے، بالآخر مال و جائیداد، وطن اور تمام خویش و اقرباء کو خیر باد کہہ کر مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی، دوسرے انصارِ مدینہ ہیں، جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھ آنے والے مہاجرین حضرات کو بلا کر دنیا کو اپنا مخالف بنایا اور ان حضرات کی ایسی میزبانی کی کہ جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی، ان دونوں طبقوں کے بعد تیسرا درجہ اُن مسلمانوں کا قرار دیا جو حضرات صحابہ کے بعد

مشرف باسلام ہوئے اور ان کے نقش قدم پر چلے جس میں قیامت تک آنے والے مسلمان سب شریک ہیں، آگے ان تینوں طبقات کے کچھ فضائل وکمالات اور دینی خدمات کا بیان ہے۔

فضائل مہاجرین

اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝

اس میں مہاجرین کا پہلا وصف یہ بیان فرمایا کہ ان کو اُن کے وطن اور مال وجائداد سے نکال دیا گیا، یعنی کفار مکہ نے صرف اس جرم میں کہ یہ لوگ مسلمان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حامی و مددگار ہوگئے تھے ان پر طرح طرح کے مظالم کئے یہاں تک کہ وہ اپنا وطن اور مال وجائداد چھوڑ کر ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے، بعض لوگ بھوک سے مجبور رہو کر پیٹ کو پتھر باندھ لیتے تھے، اور بعض لوگ سردی کا سامان نہ ہونے کے سبب زمین میں گڑھا کھود کر اس میں سردی سے بچتے تھے (مظہری، قرطبی)

ایک اہم مسئلہ، مسلمانوں کے اموال پر کفار کے قبضہ کا حکم

اس آیت میں حضرات مہاجرین کو فقراء فرمایا ہے، اور فقیر وہ شخص ہوتا ہے جس کی ملک میں کچھ نہ ہو یا کم از کم بقدر نصاب کوئی چیز نہ ہو، حالانکہ حضرات مہاجرین میں سے اکثر مکہ مکرمہ میں اصحاب اموال وجائداد تھے، اگر ہجرت کے بعد بھی وہ اموال ان کی ملکیت ہوتے تو اُن کو فقراء کہنا درست نہ ہوتا، قرآن کریم نے اُن کو فقراء فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ ہجرت کے بعد انکی جائداد اور مال جو مکہ میں چھوڑ آئے اور کفار نے اُن پر قبضہ کر لیا وہ اُن کی ملک سے نکل گئے۔

اسی لئے امام اعظم ابوحنیفہؒ و امام مالکؒ نے فرمایا کہ اگر مسلمان کسی جگہ ہجرت کر کے چلے آویں اور ان کے مال وجائداد پر کفار قابض ہو جائیں، یا خدانخواستہ کسی دارالاسلام پر وہ غالب آکر مسلمانوں کے اموال وجائداد چھین لیں تو یہ اموال وجائداد کفار کے مکمل قبضہ مالکانہ کے بعد انہی کی ملک ہو جاتے ہیں، اُن کے تصرفات بیع وشراء ان اموال المسلمین میں نافذ ہوتے ہیں، روایات حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، تفسیر مظہری میں اس جگہ وہ سب روایات نقل کی ہیں۔

دوسری صفت مہاجرین کی اس آیت میں یہ ذکر فرمائی ہے يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا، یعنی اُن کے اسلام میں داخل ہونے اور پھر ہجرت کر کے مال و وطن کو چھوڑنے کی کوئی دنیاوی غرض نہ تھی، بلکہ صرف اللہ کا فضل و رضا مطلوب تھی جس سے ان کا کمال اخلاص معلوم ہوا، لفظ فضل عموماً دنیوی نعمت کے لئے اور رضوان آخرت کی نعمت کے لئے بولا جاتا ہے، اس لئے مفہوم یہ ہوا کہ ان حضرات نے اپنے تمام سابقہ اسباب عیش مکان، جائداد وغیرہ کو تو چھوڑ دیا، اب دنیاوی ضروریات بھی اور آخرت کی نعمتیں بھی صرف اسلام کے سایہ میں مطلوب تھیں اور دنیا کی ضروریات زندگی بھی اللہ و رسولؐ کی رضا کے تحت حاصل کرنا مقصود تھا۔

تیسرا وصف حضرات مہاجرین کا یہ بیان فرمایا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ، یعنی یہ سب کام

انھوں نے اس لئے اختیار کئے کہ اللہ اور اس کے رسول کی مدد کریں، اللہ کی مدد سے مراد اس کے دین کی مدد ہے جس میں انھوں نے حیرت انگیز قربانیاں پیش کیں۔

چوتھا وصف ان کا اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ، یعنی یہی لوگ قول و عمل کے سچے ہیں، کلمۂ اسلام پڑھ کر جو عہد اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے باندھا تھا اس میں بالکل پورے اُترے، اس آیت نے تمام صحابہ مہاجرین کے صادق ہونے کا عام اعلان کر دیا، جو شخص ان میں سے کسی کو جھوٹا قرار دے وہ مسلمان نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ اس آیت کا منکر ہے، معاذ اللہ، روافض جو ان حضرات کو منافق کہتے ہیں یہ اس آیت کی کھلی تکذیب ہے، ان حضرات مہاجرین کا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک یہ مقام تھا کہ اپنی دعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے ان فقراء مہاجرین کا وسیلہ دے کر دعاء فرماتے تھے (کما رواہ البغوی، مظہری)

فضائلِ انصار وَالَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِھِمْ الاٰیۃ، تَبَوَّءَ کے معنی ٹھکانے بنانے کے ہیں اور دار سے مراد دار ہجرت یا دار ایمان یعنی مدینہ طیبہ ہے،

مدینہ طیبہ کی ایک خاص فضیلت اسی لئے حضرت امام مالکؒ ایک حیثیت سے مدینہ طیبہ کو باقی دنیا کے سب شہروں سے افضل قرار دیتے تھے، فرماتے تھے کہ دنیا کے تمام شہر اور ملک جہاں جہاں اسلام پہنچا اور پھیلا ہے سب جہاد کے ذریعہ فتح ہوئے ہیں یہاں تک کہ مکہ مکرمہ بھی، بجز مدینہ طیبہ کے یہ صرف ایمان سے فتح ہوا ہے (قرطبی)

اس آیت میں تَبَوَّءُ کے تحت میں دار کے ساتھ ایمان کا بھی ذکر فرمایا ہے، حالانکہ ٹھکانا پکڑنے کا تعلق کسی مقام اور جگہ سے ہوتا ہے، ایمان کوئی ایسی چیز نہیں جس میں ٹھکانا پکڑا جائے، اس لئے بعض حضرات نے فرمایا کہ یہاں ایک لفظ محذوف ہے، یعنی اَخْلَصُوْا یا تَمَکَّنُوْا، مطلب یہ ہوگا کہ یہی وہ حضرات ہیں جنھوں نے دار الہجرت میں ٹھکانا بنایا اور ایمان میں مخلص اور مضبوط ہوئے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں استعارہ کے طور پر ایمان کو ایک محفوظ مکان سے تشبیہ دے کر اس میں پناہ گزین ہو جانے کو بیان فرمایا ہو، اور لفظ مِنْ قَبْلِھِمْ یعنی مہاجرین سے پہلے کا مطلب یہ ہے کہ ان انصار مدینہ کی ایک فضیلت یہ ہے کہ جو شہر اللہ کے نزدیک دار الہجرت اور دار الایمان بننے والا تھا، اس میں ان لوگوں کا قیام و قرار مہاجرین سے پہلے ہو چکا تھا، اور مہاجرین کے یہاں منتقل ہونے سے پہلے ہی یہ حضرات ایمان قبول کر کے اس میں پختہ ہو چکے تھے۔

دوسری صفت حضرات انصار کی اس آیت میں یہ بیان کی گئی ہے یُحِبُّوْنَ مَنْ ھَاجَرَ اِلَیْھِمْ، یعنی یہ حضرات ان لوگوں سے محبت رکھتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے شہر میں چلے آئے ہیں، جو عام دنیا کے انسانوں کے مزاج کے خلاف ہے، ایسے اُجڑے ہوئے خستہ حال لوگوں کو اپنی بستی میں جگہ دینا کون پسند کرتا ہے، ہر جگہ ملکی اور غیر ملکی کے سوالات کھڑے ہوتے ہیں، مگر ان حضرات انصار نے

صرف یہی نہیں کیا کہ ان کو اپنی بستی میں جگہ دی، بلکہ اپنے مکانوں میں آباد کیا اور اپنے اموال میں حصہ دار بنایا، اور اس طرح عزت و احترام کے ساتھ ان کا استقبال کیا کہ ایک ایک مہاجر کو اپنے پاس جگہ دینے کے لئے کئی کئی انصاری حضرات نے درخواست کی یہاں تک کہ قرعہ اندازی کرنا پڑی، قرعہ کے ذریعہ جو مہاجر جس انصاری کے حصہ میں آیا اس کو سپرد کیا گیا (مظہری)

تیسرا وصف حضرات انصار کا یہ بیان فرمایا وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا اس جملے کا تعلق اُس خاص واقعہ سے ہے جو بنو نضیر کے جلاوطن ہونے اور اُن کے باغات و مکانات پر مسلمانوں کا قبضہ ہونے کے وقت پیش آیا۔

اموال بنو نضیر کی تقسیم کا واقعہ

صورت یہ تھی کہ جب اس آیت میں اموالِ فئے کی تقسیم مہاجرین و انصار وغیرہ میں کرنے کا اختیار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدیا گیا، یہ وہ وقت تھا کہ مہاجرین کے پاس نہ اپنا کوئی مکان تھا نہ جائداد، وہ حضرات انصار کے مکانوں میں رہتے اور انہی کی جائدادوں میں محنت مزدوری کر کے گذارہ کرتے تھے، جب بنو نضیر اور بنو قینقاع کے اموال بطور فئے کے مسلمانوں کو حاصل ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار مدینہ کے سردار ثابت بن قیس بن شماس رضؓ کو بلا کر فرمایا کہ اپنی قوم انصار کو میرے پاس بلا دو، انھوں نے پوچھا یا رسول اللہ انصار کے اپنے قبیلہ خزرج کو یا سب انصار کو؟ آپ نے فرمایا سب ہی کو بلانا ہے، یہ حضرات سب جمع ہو گئے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ دیا، جس میں حمد و صلوٰۃ کے بعد انصارِ مدینہ کی اس بات پر مدح و ثناء فرمائی کہ انھوں نے جو سلوک اپنے مہاجر بھائیوں کے ساتھ کیا وہ بڑے عزم و ہمت کا کام تھا، اس کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بنو نضیر کے اموال آپ لوگوں کو دیدیئے ہیں، اگر آپ چاہیں تو میں ان اموال کو مہاجرین و انصار سب میں تقسیم کر دوں اور مہاجرین بدستور سابق آپ کے مکانوں میں رہائش پذیر رہیں، اور آپ چاہیں تو ایسا کیا جائے کہ یہ بے گھر دبے زر لوگ ہیں، یہ اموال صرف ان میں تقسیم کر دیئے جائیں، اور یہ لوگ آپ کے گھروں کو چھوڑ کر الگ اپنے اپنے گھر بسالیں۔

یہ سُن کر انصار مدینہ کے دو بڑے سردار حضرت سعد بن عبادہؓ اور سعد بن معاذؓ کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ہماری رائے یہ ہے کہ یہ سب اموال بھی صرف مہاجر بھائیوں میں تقسیم فرما دیجئے اور وہ پھر بھی ہمارے مکانوں میں بدستور مقیم رہیں، اُن کی بات سُنکر تمام حاضرین انصار بول اٹھے کہ ہم اس فیصلے پر راضی اور خوش ہیں، اُس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انصار اور ابناءِ انصار کو دُعا دی، اور ان اموال کو صرف مہاجرین میں تقسیم فرما دیا، انصار میں سے صرف دو حضرات کو جو بہت حاجتمند تھے اس میں سے حصہ عطاء فرمایا، یعنی سہل بن حنیفؓ اور ابو دجانہؓ، اور سعد بن معاذؓ کو ایک تلوار عطا فرمائی جو ابن ابی الحقیق کی ایک ممتاز تلوار تھی (مظہری بحوالہ سبیل الرشاد محمد بن یوسف الصالحی)

آیت مذکورہ میں جو یہ ارشاد فرمایا لَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا، اس میں حاجت سے مراد ہر ضرورت کی چیز ہے، اور مِّمَّآ اُوْتُوْا کی ضمیر مہاجرین کی طرف راجع ہے، معنی آیت کے یہ ہیں کہ اس تقسیم میں جو کچھ مہاجرین کو دیدیا گیا، انصارِ مدینہ نے خوشی سے اس کو اس طرح قبول کیا کہ گویا ان کو ان چیزوں کی کوئی حاجت ہی نہیں، اُن کو دینے سے بُرا ماننا یا شکایت کرنا اس کا تو دور دور کوئی امکان ہی نہ تھا، اس کے بالمقابل جب بحرین فتح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ یہ پورا مال صرف انصار میں تقسیم کر دیا جائے مگر انصار نے اس کو قبول نہ کیا، بلکہ عرض کیا ہم اُس وقت تک نہ لیں گے جب تک ہمارے مہاجر بھائیوں کو بھی اس میں سے حصّہ نہ دیا جائے (رواہ البخاری عن انس بن مالکؓ، از ابن کثیر)

چوتھا وصف، انصارِ مدینہ رضی اللہ عنہم کا اس آیت میں یہ ذکر فرمایا ہے:- وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔ خصاصہ کے معنی فقر و فاقہ کے ہیں، اور ایثار کے معنی دوسروں کی خواہش اور حاجت کو اپنی خواہش و حاجت پر مقدّم رکھنے کے ہیں، معنی آیت کے یہ ہیں کہ حضرات انصار اپنے اوپر دوسروں کو یعنی مہاجرین کو ترجیح دیتے تھے کہ اپنی حاجت و ضرورت کو پورا کرنے سے پہلے ان کی حاجت کو پورا کرتے تھے، اگرچہ یہ خود حاجتمند اور فقر و فاقہ میں ہوں۔

حضرات صحابہ خصوصًا انصارؓ کے ایثار کے چند واقعات

اگرچہ تفسیر آیات کے لئے بیانِ واقعات کی ضرورت نہیں، مگر یہ واقعات ہر انسان کو اعلیٰ انسانیت کا سبق دینے والے اور زندگی میں انقلاب لانے والے ہیں، اس لئے حضرات مفسّرین نے اس موقع پر ان کو تفصیل سے لکھا ہے، خصوصًا قرطبیؒ نے اسی سے چند واقعات نقل کئے جاتے ہیں۔

ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک انصاری کے گھر رات کو کوئی مہمان آگیا، اُن کے پاس صرف اتنا کھانا تھا کہ یہ خود اور اُن کے بچے کھا سکیں، انھوں نے اپنی بیوی سے فرمایا کہ بچّوں کو تو کسی طرح سُلا دو اور گھر کا چراغ گُل کر دو، پھر مہمان کے سامنے کھانا رکھ کر برابر بیٹھ جاؤ، کہ مہمان سمجھے کہ ہم بھی کھا رہے ہیں، مگر ہم نہ کھائیں، تاکہ مہمان بافراغت کھانا کھا سکے، اس پر یہ آیتِ مذکورہ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ نازل ہوئی (وقال الترمذی ھٰذا حسن صحیح)

اور ترمذی ہی میں حضرت ابوہریرہؓ سے ایک دوسرا واقعہ یہ منقول ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں بھوک سے پریشان ہوں، آپؐ نے ازواجِ مطہرات میں سے ایک کے پاس اطلاع بھیجی تو ان کا جواب آیا کہ ہمارے پاس تو اس وقت بجز پانی کے کچھ نہیں، دوسری کے پاس پیغام بھیجا وہاں سے بھی یہی جواب آیا، پھر تیسری چوتھی یہاں تک کہ تمام اُمّہات المومنین کے پاس بھیجا اور سب کا ایک ہی جواب آیا کہ پانی کے سوا ہمارے پاس کچھ نہیں، اب آپ نے حاضرینِ مجلس سے خطاب فرمایا کہ کون ہے جو آج رات اس شخص کی مہمانی کرے؟ ایک انصاری نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں کرونگا، انکو ساتھ لیگئے اور جاکر گھر میں پوچھا کہ کھانے کو کچھ ہے؟ تو بیوی نے بتلایا کہ صرف اتنا ہے

کہ ہمارے بچے کھالیں، انصاری بزرگ نے بچوں کو سُلا دینے کے لئے فرمایا اور فرمایا کہ مہمان کے سامنے کھانا رکھنے اور خود ساتھ بیٹھ جانے کے بعد اُٹھ کر چراغ گُل کر دینا کہ ہمارے نہ کھانے کا مہمان کو احساس نہ ہو، مہمان نے کھانا کھالیا، جب یہ صبح کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے اس معاملہ کو جو تم نے گذشتہ رات اپنے مہمان کے ساتھ کیا بہت پسند فرمایا۔

اور مہدوی نے ایک ایسا ہی واقعہ ایک انصاری بزرگ کا حضرت ثابت بن قیسؓ کے ساتھ رات کو چراغ گُل کر کے کھانا کھلانے کا ذکر کیا ہے، اور تمام واقعات کے ساتھ روایت میں یہ بھی ہے کہ آیت مذکورہ اس واقعہ میں نازل ہوئی ہے۔

اور قشیری نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ صحابۂ کرام میں سے ایک بزرگ کو کسی شخص نے ایک بکری کا سَر بطور ہدیہ پیش کیا، اس بزرگ نے خیال کیا کہ ہمارا فلاں بھائی اور اس کے اہل و عیال ہم سے زیادہ ضرورتمند ہیں، یہ سر ان کے پاس بھیج دیا، اس دوسرے بزرگ کے پاس پہونچا تو اسی طرح انھوں نے تیسرے کے پاس اور تیسرے نے چوتھے کے پاس بھیج دیا، یہاں تک کہ سات گھروں میں پھرنے کے بعد پھر پہلے بزرگ کے پاس واپس آگیا، اس واقعہ پر آیاتِ مذکورہ نازل ہوئیں، یہی واقعہ ثعلبیؒ نے حضرت انسؓ سے بھی روایت کیا ہے۔

مؤطا امام مالکؒ میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک مسکین نے اُن سے سوال کیا، ان کے گھر میں صرف ایک روٹی تھی اور ان کا اس روز روزہ تھا، آپ نے اپنی خادمہ سے فرمایا کہ یہ روٹی اس کو دیدو، خادمہ نے کہا کہ اگر یہ دیدی گئی تو شام کو آپ کے افطار کرنے کے لئے کوئی چیز نہ رہے گی، حضرت صدیقہؓ نے فرمایا کہ پھر بھی دیدو، یہ خادمہ کہتی ہیں کہ جب شام ہوئی تو ایک ایسے شخص نے جس کی طرف سے ہدیہ دینے کی کوئی رسم نہ تھی ایک سالم بکری بھُنی ہوئی اور اس کے اوپر آٹے میدے کا خول چڑھا ہوا پختہ، جو عرب میں سب سے بہترین کھانا سمجھا جاتا ہے، اُن کے پاس بطور ہدیہ بھیجدیا، حضرت صدیقہؓ نے خادمہ کو بلایا کہ آؤ یہ کھاؤ یہ تمھاری اُس روٹی سے بہتر ہے۔

اور نسائی نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ وہ بیمار تھے، اور انگور کو جی چاہا ان کے لئے ایک درہم میں ایک خوشہ انگور کا خرید کر لایا گیا، اتفاق سے ایک مسکین آگیا اور سوال کیا، آپ نے فرمایا کہ یہ خوشہ اس کو دیدو، حاضرین میں سے ایک شخص خفیہ طور پر اس کے پیچھے گیا اور خوشہ اس مسکین سے خرید کر پھر ابن عمرؓ کو پیش کر دیا، مگر یہ سائل پھر آیا اور سوال کیا تو حضرت ابن عمرؓ نے پھر اس کو دیدیا، پھر کوئی صاحب خفیہ طور پر گئے اور اس مسکین کو ایک درہم دے کر خوشہ خرید لائے، اور حضرت ابن عمرؓ کی خدمت میں پیش کر دیا، وہ سائل پھر آنا چاہتا تھا لوگوں نے منع کر دیا، اور حضرت ابن عمرؓ کو اطلاع ہوتی کہ یہ وہی خوشہ ہے جو انھوں نے صدقہ میں دیدیا تھا، تو ہرگز نہ کھاتے، مگر ان کو یہ

خیال ہوا کہ لانے والا بازار سے لایا ہے اس لئے استعمال فرمالیا۔

اور ابن مبارک نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت فاروق اعظمؓ نے چار سو دینار ایک تھیلی میں بھر کر تھیلی غلام کے سپرد کی کہ ابو عبیدہ بن جراحؓ کے پاس لیجاؤ کہ ہدیہ ہی قبول کر کے اپنی ضرورت میں صرف کریں، اور غلام کو ہدایت کردی کہ ہدیہ دینے کے بعد کچھ دیر گھر میں ٹھیر جانا اور یہ دیکھنا کہ ابو عبیدہ اس رقم کو کیا کرتے ہیں، غلام نے حسب ہدایت یہ تھیلی حضرت ابو عبیدہؓ کی خدمت میں پیش کردی اور ذرا ٹھیر گیا، ابو عبیدہؓ نے تھیلی لے کر کہا کہ اللہ تعالیٰ اُن کو یعنی عمر بن خطابؓ کو اس کا صلہ دے اور اُن پر رحمت فرمائے، اور اُسی وقت اپنی کنیز کو کہا کہ لو یہ سات فلاں شخص کو پانچ فلاں کو دے آؤ، یہاں تک کہ پورے چار سو دینار اسی وقت تقسیم کر دیئے۔

غلام نے واپس آ کر واقعہ بیان کر دیا، حضرت عمر بن خطابؓ نے اُسی طرح چار سو دینار کی ایک دوسری تھیلی تیار کی ہوئی غلام کو دے کر ہدایت کی کہ معاذ بن جبلؓ کو دے آؤ، اور وہاں بھی دیکھو وہ کیا کرتے ہیں، یہ غلام لے گیا، انھوں نے تھیلی لے کر حضرت عمرؓ کے حق میں دعاء دی رَحِمَہُ اللّٰہُ وَ وَصَلَہٗ، یعنی اللہ اُن پر رحمت فرمائے اور اُن کو صلہ دے"، اور یہ بھی تھیلی لے کر فوراً تقسیم کرنے کے لئے بیٹھ گئے، اور اس کے بہت سے حصّے کر کے مختلف گھروں میں بھیجتے رہے، حضرت معاذؓ کی بیوی یہ سب ماجرا دیکھ رہی تھیں، آخر میں بولیں کہ ہم بھی تو بخدا مسکین ہی ہیں، ہمیں بھی کچھ ملنا چاہئے، اس وقت تھیلی میں صرف دو دینار رہ گئے تھے وہ انکو دیدیئے، غلام یہ دیکھنے کے بعد لوٹا اور حضرت عمرؓ سے بیان کیا، تو آپ نے فرمایا کہ یہ سب بھائی بھائی ہیں سب کا مزاج ایک ہی ہے۔

اور حذیفہ عدویؓ فرماتے ہیں کہ میں جنگ یرموک میں اپنے چچازاد بھائی کی تلاش شہداء کی لاشوں میں کرنے کے لئے نکلا، اور کچھ پانی ساتھ لیا، کہ اگر ان میں کچھ جان ہوئی تو پانی پلادوں گا، ان کے پاس پہنچا تو کچھ رمق زندگی کی باقی تھی، میں نے کہا کہ کیا آپ کو پانی پلادوں، اشارہ سے کہا کہ ہاں، مگر فوراً ہی قریب سے ایک دوسرے شہید کی آواز آہ آہ کی آئی تو میرے بھائی نے کہا کہ یہ پانی اُن کو دیدو، ان کے پاس پہونچا اور پانی دینا چاہا تو تیسرے آدمی کی آواز ان کے کان میں آئی، اس نے بھی اس تیسرے کو دینے کے لئے کہہ دیا، اسی طرح یکے بعد دیگرے سات شہیدوں کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا، جب ساتویں شہید کے پاس پہنچا تو وہ دم توڑ چکے تھے، یہاں سے اپنے بھائی کے پاس پہنچا تو وہ بھی ختم ہو چکے تھے۔

یہ چند واقعات ہیں جن میں کچھ انصار کے کچھ مہاجرین کے ہیں، اکثر کے بارے میں کہا گیا ہو کہ آیت ایثار اس واقعہ میں نازل ہوئی، مگر ان میں کوئی تضاد و اختلاف نہیں، کیونکہ جس طرح کے واقعہ میں ایک آیت نازل ہو چکی ہے اگر اسی طرح کا کوئی دوسرا واقعہ پیش آجائے تو یہ کہدیا جاتا ہے کہ اس میں یہ آیت نازل ہوئی اور حقیقت یہ ہے کہ یہ سبھی واقعات نزولِ آیت کا سبب یا مصداق ہیں۔

ایک شبہ کا جواب

حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے واقعاتِ ایثار جو اوپر بیان ہوئے ہیں اُن پر ایک شبہ روایاتِ حدیث سے یہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا پورا مال صدقہ کر ڈالنے سے منع فرمایا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک بیضہ کے برابر سونے کا ٹکڑا بغرض صدقہ پیش کیا، تو آپؐ نے اس کو اسی کی طرف پھینک کر ارشاد فرمایا کہ تم میں سے بعض لوگ اپنا سارا مال صدقہ کرنے کو لے آتے ہیں پھر محتاج ہو کر لوگوں سے بھیک مانگتے ہیں۔

جواب اس شبہ کا انہی روایات سے یہ نکلتا ہے کہ لوگوں کے حالات مختلف ہوتے ہیں، ہر حال کا حکم الگ ہی، پورا مال صدقہ کر ڈالنے کی ممانعت اُن لوگوں کے لئے ہے جو بعد میں فقر و فاقہ پر صبر نہ کر سکیں، اپنے صدقہ کئے ہوئے پر پچھتائیں، یا پھر لوگوں سے بھیک مانگنے پر مجبور ہو جائیں، اور وہ لوگ جنکے عزم و ہمت اور ثبات و استقلال کا یہ حال ہو کہ سب کچھ خرچ کر ڈالنے کے بعد فقر و فاقہ پر انھیں کوئی پریشانی نہ ہو، بلکہ ہمت کے ساتھ اس پر صبر کر سکتے ہوں اُن کے لئے سارا مال اللہ کی راہ میں خرچ کر ڈالنا جائز ہے، جیسا کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے ایک جہاد میں چندہ میں اپنا سارا مال پیش کر دیا تھا، اسی کے نظائر یہ واقعات ہیں جو اس جگہ مذکور ہیں، ایسے حضرات نے اپنے اہل و عیال کو بھی اسی صبر و استقلال کا خوگر بنا رکھا تھا، اس لئے اس میں ان کی بھی کوئی حق تلفی نہ تھی، اگر مال خود اہل و عیال کے قبضہ میں ہوتا تو وہ بھی ایسا ہی کرتے، (قرطبی باضافہ اشیاء)

حضرات مہاجرین کی طرف سے ایثارِ انصار کی مکافات

دنیا میں کوئی اجتماعی کام یک طرفہ رواداری و ایثار سے قائم نہیں رہتا جبتک دونوں طرف سے اسی طرح کا معاملہ نہ ہو، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسا اس کی ترغیب دی کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کو ہدیہ دے کر باہمی محبت بڑھایا کریں، اسی طرح جن کو ہدیہ دیا گیا ہے ان کو یہ بھی تعلیم دی کہ تم بھی ہدیہ دینے والے کے احسان کی مکافات کرو، اگر مالی وسعت اللہ تعالیٰ عطا فرمادے تو مال سے ورنہ دُعا ہی سے اس کی مکافات کرو، بے حسی کے ساتھ کسی کے احسانات کا بار سر پر لیتے رہنا شرافت اور خُلق کے خلاف ہے۔

حضرات مہاجرین کے معاملہ میں حضرات انصار نے بڑے ایثار سے کام لیا، اپنے مکانوں، دکانوں کاروبار، زمین اور زراعت میں ان کو شریک کر لیا، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ان مہاجرین کو وسعت عطا فرمائی تو انھوں نے بھی حضرات انصار کے احسانات کی مکافات میں کمی نہیں کی۔

قرطبی نے بحوالۂ صحیحین حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کیا ہے کہ جب مہاجرین مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ آئے تو ان کے ہاتھ میں کچھ نہ تھا، اور انصار مدینہ زمین جائداد والے تھے، انصار نے ان حضرات کو ہر چیز نصفا نصف تقسیم کر دی، اپنے باغات کے آدھے پھل سالانہ اُن کو دینے لگے، اور حضرت انسؓ کی والدہ اُم سلیمؓ نے اپنے چند درخت کھجور کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدیئے تھے، جو آنحضرتؐ

صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسامہ بن زید کی والدہ اُم ایمن کو عطا فرما دیئے۔

امام زہری کہتے ہیں کہ مجھے حضرت انس بن مالکؓ نے خبر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب خیبر کے جہاد سے کامیابی کے ساتھ فارغ ہو کر مدینہ طیبہ واپس آئے (اس غزوہ میں مسلمانوں کو اموالِ غنیمت کافی مقدار میں ہاتھ آئے) تو سب مہاجرین نے حضرات انصار کے سب عطایا کا حساب کر کے ان کو واپس کر دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری والدہ کے درخت اُمّ ایمنؓ سے لے کر ان کو واپس کر دیئے، اور اس کی جگہ اُم ایمنؓ کو اپنے باغ میں سے درخت عطا فرمائے۔

وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ حضرات انصار کے ایثار اور اللہ کی راہ میں سب کچھ قربان کر دینے کا ذکر کرنے کے بعد عام ضابطہ ارشاد فرمایا کہ جو لوگ اپنے نفس کے بخل سے بچ گئے تو اللہ کے نزدیک وہ ہی فلاح و کامیابی پانے والے ہیں، لفظ شُحّ اور بخل تقریباً ہم معنی ہیں، لفظ شُحّ میں کچھ مبالغہ ہے کہ بہت شدید بخل کو کہا جاتا ہے، بخل و شُحّ اگر حقوق واجبہ میں کیا جائے خواہ وہ اللہ کے حقوق ہوں، جیسے زکوٰۃ، صدقۃ الفطر، عشر، قربانی وغیرہ کہ ان کی ادائیگی میں بوجہ بخل کے کوتاہی کرے، یا انسانوں کے حقوقِ واجبہ ہوں جیسے اہل و عیال کا نفقہ یا اپنے حاجتمند والدین اور عزیزوں کا نفقۂ واجبہ جو بخل ان حقوق واجبہ کی ادائیگی سے مانع ہو وہ قطعاً حرام ہے، اور جو امورِ مستحبہ اور فضائلِ انفاق سے مانع ہو وہ مکروہ و مذموم ہے، اور جو محض رسمی چیزوں میں خرچ سے مانع ہو وہ شرعاً بخل نہیں۔

بخل و شُحّ اور دوسروں پر حسد ایسی مذموم خصلتیں ہیں کہ قرآن و حدیث میں ان کی بڑی مذمت آئی ہے، اور جو اُن سے بچ جائے اس کے لئے بڑی بشارت ہے حضرات انصار کی جو صفات اوپر بیان ہوئی ہیں اُن میں اُن کا بخل و حسد سے بری ہونا واضح ہے۔

کینہ اور حسد سے پاک ہونا جنتی ہونے کی علامت ہے

ابن کثیر نے بحوالہ امام احمد حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے:۔

"ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے آپؐ نے فرمایا کہ ابھی تمھارے سامنے ایک شخص آنے والا ہے جو اہلِ جنت میں سے ہے، چنانچہ ایک صاحب انصار میں سے آئے، جن کی ڈاڑھی سے تازہ وضو کے قطرات ٹپک رہے تھے، اور بائیں ہاتھ میں اپنے نعلین لئے ہوئے تھے، دوسرے دن بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا اور یہی شخص اسی حالت کے ساتھ سامنے آیا، تیسرے روز پھر یہی واقعہ پیش آیا اور یہی شخص اپنی مذکورہ حالت میں داخل ہوا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجلس سے اُٹھ گئے تو حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ اس شخص کے پیچھے لگے (تاکہ اس کے اہلِ جنت ہونے کا راز معلوم کریں) اور ان سے کہا کہ میں نے کسی جھگڑے میں قسم کھالی ہے کہ میں تین روز تک اپنے گھر نہ جاؤں گا، اگر آپ مناسب سمجھیں تو تین روز مجھے اپنے یہاں رہنے کی جگہ دیدیں، انھوں نے منظور فرمالیا،

عبداللہ بن عمروؓ نے یہ تین راتیں اُن کے ساتھ گذاریں، تو دیکھا کہ رات کو تہجد کے لئے نہیں اُٹھتے البتہ جب سونے کے لئے بستر پر جاتے تو کچھ اللہ کا ذکر کرتے تھے پھر صبح کی نماز کے لئے اُٹھ جاتے تھے، البتہ اس پورے عرصہ میں میں نے ان کی زبان سے بجز کلمۂ خیر کے کوئی کلمہ نہیں سُنا جب تین راتیں گذر گئیں اور قریب تھا کہ میرے دل میں ان کے عمل کی حقارت آجائے تو میں نے اُن پر اپنا راز کھول دیا، کہ ہمارے گھر کوئی جھگڑا نہیں تھا، لیکن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین روز تک یہ سنتا رہا کہ تمہارے پاس ایک ایسا شخص آنے والا ہے جو اہلِ جنت میں سے ہے اور اس کے بعد تینوں دن آپ ہی آئے، اس لئے میں نے چاہا کہ میں آپ کے ساتھ رہ کر دیکھوں کہ آپ کا وہ کیا عمل ہے جس کے سبب یہ فضیلت آپ کو حاصل ہوئی، مگر عجیب بات ہے کہ میں نے آپ کو کوئی بڑا عمل کرتے نہیں دیکھا، تو وہ کیا چیز ہے جس نے آپ کو اس درجہ پر پہنچایا، انھوں نے کہا میرے پاس تو بجز اس کے کوئی عمل نہیں جو آپ نے دیکھا ہے، میں یہ سُنکر واپس آنے لگا تو مجھے بُلا کر کہا کہ ہاں ایک بات ہے کہ "میں اپنے دل میں کسی مسلمان کی طرف سے کینہ اور بُرائی نہیں پاتا، اور کسی پر حسد نہیں کرتا جس کو اللہ نے کوئی خیر کی چیز عطا فرمائی ہو" عبداللہ بن عمرو نے کہا کہ بس یہی وہ صفت ہے جس نے آپ کو یہ بلند مقام عطا کیا ہے،"

ابن کثیر نے اس کو نقل کرکے فرمایا کہ اس کو نسائی نے بھی عمل الیوم واللیلہ میں نقل کیا ہے اور اس کی اسناد صحیح علی شرط الشیخین ہے۔"

مہاجرین وانصار کے بعد عام اُمت کے مسلمان

وَالَّذِيْنَ جَاۗءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ الآیۃ، اس آیت کے مفہوم میں صحابۂ کرام مہاجرین وانصار کے بعد پیدا ہونے والے قیامت تک کے مسلمان شامل ہیں، اور اس آیت نے ان سب کو مال فئی میں حقدار قرار دیا ہے، یہی سبب تھا کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے دنیا کے بڑے ممالک عراق، شام، مصر وغیرہ فتح کئے، تو اُن کی زمینوں کو غانمین میں تقسیم نہیں فرمایا بلکہ ان کو اگلی آنے والی نسلوں کے لئے وقفِ عام رکھا، کہ ان کی آمدنی اسلامی بیت المال میں آتی رہے اور اس سے قیامت تک آنے والے مسلمان فائدہ اٹھا سکیں، بعض صحابۂ کرام نے جو اُن سے مفتوحہ زمینوں کی تقسیم کا سوال کیا تو انھوں نے اسی آیت کا حوالہ دے کر فرمایا، کہ اگر میرے سامنے آئندہ آنے والی نسلوں کا معاملہ نہ ہوتا تو میں جو ملک فتح کرتا اس کی سب زمینوں کو بھی غانمین میں تقسیم کر دیتا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی زمینوں کو تقسیم فرما دیا تھا، اگر یہ ساری زمینیں موجود مسلمانوں میں تقسیم ہو گئیں تو آنے والے مسلمانوں کے لئے کیا باقی رہے گا (رواہ مالک، قرطبی)

اُمّت کے حق پر ہونے کی پہچان صحابۂ کرام کی محبت وعظمت ہے

اس مقام میں حق تعالیٰ نے پوری اُمّتِ محمدیہ کے تین طبقے کئے، مہاجرین، انصار اور باقی تمام اُمّت، مہاجرین وانصار کے خاص اوصاف اور

فضائل بھی اس جگہ ذکر فرمائے، مگر باقی اُمت کے فضائل و کمالات اور اوصاف میں سے صرف ایک چیز یہ بتلائی کہ وہ صحابہ کرام کی سبقتِ ایمانی اور ایمان کے ہم تک پہونچانے کا ذریعہ ہونے کو پہچانیں اور سب کے لئے دُعائے مغفرت کریں اور اپنے لئے یہ دعا کریں کہ ہمارے دلوں میں کسی مسلمان سے کینہ و نفرت نہ رہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کے بعد والے جتنے مسلمان ہیں اُن کا ایمان و اسلام قبول ہونے اور نجات پانے کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ صحابہ کرام کی عظمت و محبت اپنے دلوں میں رکھتے ہوں اور اُن کے لئے دعا کرتے ہوں، جس میں یہ شرط نہیں پائی جاتی وہ مسلمان کہلانے کے قابل نہیں، اسی لئے حضرت مصعب بن سعدؒ نے فرمایا کہ امت کے تمام مسلمان تین درجوں میں ہیں، جن میں سے دو درجے تو گذر چکے یعنی مہاجرین و انصار، اب صرف ایک درجہ باقی رہ گیا، یعنی وہ جو صحابہ کرام سے محبت رکھے، اُن کی عظمت پہچانے، اب اگر تمھیں امت میں کوئی جگہ حاصل کرنی ہے تو اسی تیسرے درجہ میں داخل ہو جاؤ۔

حضرت حسینؓ سے کسی نے حضرت عثمان غنیؓ کے بارے میں سوال کیا (جبکہ ان کی شہادت کا واقعہ پیش آچکا تھا) تو انھوں نے سوال کرنے والے سے پوچھا کہ تم مہاجرین میں سے ہو؟ اس نے انکار کیا، پھر پوچھا کہ انصار میں سے ہو؟ اس نے اس کا بھی انکار کیا تو فرمایا بس اب تیسری آیت اَلَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ کی رہ گئی، اگر تم عثمان غنیؓ کی شان میں شک و شبہ پیدا کرنا چاہتے ہو تو اس درجہ سے بھی نکل جاؤ گے۔

قرطبی نے فرمایا کہ یہ آیت اس کی دلیل ہے کہ صحابہ کرام کی محبت ہم پر واجب ہے، حضرت امام مالکؒ نے فرمایا کہ جو شخص کسی صحابی کو بُرا کہے یا اس کے متعلق بُرائی کا اعتقاد رکھے اس کا مسلمانوں کے مالِ فئے میں کوئی حصہ نہیں، پھر اسی آیت سے استدلال فرمایا، اور چونکہ مالِ فئ میں حصہ ہر مسلمان کا ہے تو جس کا اس میں حصہ نہ رہا اس کا اسلام و ایمان ہی مشکوک ہوگیا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سب مسلمانوں کو اصحابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے استغفار اور دعا کرنے کا حکم دیا، حالانکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ ان کے آپس میں جنگ و جدال کے فتنے بھی پیدا ہوں گے، (اس لئے کسی مسلمان کو مشاجراتِ صحابہ کی وجہ سے ان میں سے کسی سے بدگمان ہونا جائز نہیں)۔

حضرت صدیقہ عائشہؓ نے فرمایا کہ میں نے تمھارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ یہ اُمت اُس وقت تک ہلاک نہیں ہوگی جب تک اس کے پچھلے لوگ اگلوں پر لعنت و ملامت نہ کریں گے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ جب تم کسی کو دیکھو کہ کسی صحابی کو بُرا کہتا ہے تو اس سے کہو کہ جو تم میں سے زیادہ بُرا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت، یہ ظاہر ہے کہ زیادہ بُرے صحابہ تو ہو نہیں سکتے یہی ہوگا جو اُن کی بُرائی کر رہا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرام میں سے کسی کو بُرا کہنا سبب لعنت ہے۔

اور عوام بن حوشبؒ نے فرمایا کہ میں نے اس اُمت کے پہلے لوگوں کو اس بات پر مستقیم اور مضبوط پایا ہو کہ وہ لوگوں کو یہ تلقین کرتے تھے کہ صحابۂ کرام کے فضائل اور محاسن بیان کیا کرو تاکہ لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت پیدا ہو، اور وہ مشاجرات اور اختلافات جو اُن کے درمیان پیش آئے ہیں اُن کا ذکر نہ کیا کرو جس سے ان کی جرأت بڑھے (اور وہ بے ادب ہو جاویں) (یہ سب روایات تفسیر قرطبی سے لی گئی ہیں)۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نَافَقُوا يَقُولُونَ لِإِخْوَانِهِمُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ

کیا تو نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو دغاباز ہیں کہتے ہیں اپنے بھائیوں کو جو کہ کافر ہیں

أَهْلِ الْكِتَابِ لَئِنْ أُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيعُ فِيكُمْ أَحَدًا

اہل کتاب میں سے اگر تم کو کوئی نکال دیگا تو ہم بھی نکلیں گے تمہارے ساتھ اور کہا نہ مانیں گے کسی کا تمہارے معاملہ

أَبَدًا لا وَإِنْ قُوتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ط وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿١١﴾

میں کبھی اور اگر تم سے لڑائی ہوئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے، اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں،

لَئِنْ أُخْرِجُوا لَا يَخْرُجُونَ مَعَهُمْ ج وَلَئِنْ قُوتِلُوا لَا يَنْصُرُونَهُمْ ج

اگر وہ نکالے جائیں یہ نہ نکلیں گے اُن کے ساتھ، اور اگر ان سے لڑائی ہوئی یہ نہ مدد کریں گے ان کی،

وَلَئِنْ نَصَرُوهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْأَدْبَارَ قف ثُمَّ لَا يُنْصَرُونَ ﴿١٢﴾ لَأَنْتُمْ

اور اگر مدد کریں گے تو بھاگیں گے پیٹھ پھیر کر، پھر کہیں مدد نہ پائیں گے، البتہ تمہارا

أَشَدُّ رَهْبَةً فِي صُدُورِهِمْ مِنَ اللَّهِ ط ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ﴿١٣﴾

ڈر زیادہ ہے اُن کے دلوں میں اللہ کے ڈر سے یہ اس لئے کہ وہ لوگ سمجھ نہیں رکھتے،

لَا يُقَاتِلُونَكُمْ جَمِيعًا إِلَّا فِي قُرًى مُحَصَّنَةٍ أَوْ مِنْ وَرَاءِ جُدُرٍ ط

لڑ نہ سکیں گے تم سے سب مل کر مگر بستیوں کے کوٹ میں یا دیواروں کی اوٹ میں

بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ ط تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّىٰ ط ذَٰلِكَ

ان کی لڑائی آپس میں سخت ہے، تو سمجھے وہ اکٹھے ہیں اور اُن کے دل جُدا جُدا ہو رہے ہیں، یہ

بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْقِلُونَ ﴿١٤﴾ كَمَثَلِ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيبًا ذَاقُوا

اس لئے کہ وہ لوگ عقل نہیں رکھتے، جیسے قصہ ان لوگوں کا جو ہو چکے ہیں اُن سے پہلے قریب ہی چکھی انھوں نے

وَبَالَ اَمْرِهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿١٥﴾ كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ
سزا اپنے کام کی اور ان کے لئے عذاب دردناک ہے، جیسے قصہ شیطان کا جب کہے
لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ
انسان کو تو منکر ہو پھر جب وہ منکر ہوگیا کہے میں الگ ہوں تجھ سے میں ڈرتا ہوں اللہ سے
رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٦﴾ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ
جو رب سارے جہان کا، پھر انجام دونوں کا یہی کہ وہ دونوں ہیں آگ میں ہمیشہ رہیں اسی
فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٧﴾
میں اور یہی ہے سزا گنہگاروں کی،

ع ۷/۵ ۲

خلاصۂ تفسیر

کیا آپ نے ان منافقین (یعنی عبداللہ بن ابی وغیرہ) کی حالت نہیں دیکھی کہ اپنے (ہم مذہب) بھائیوں سے کہ کفار اہل کتاب ہیں (یعنی بنی نضیر سے) کہتے ہیں (یعنی کہتے تھے، کیونکہ یہ سورت واقعۂ جلاوطنی بنی نضیر کے بعد نازل ہوئی ہے، کما فی الروح مستدلاً بالحدیث والسیر) کہ واللہ (ہم ہر حال میں تمہارے ساتھ ہیں، پس) اگر تم (اپنے وطن سے جبراً) نکالے گئے تو ہم (بھی) تمہارے ساتھ (اپنے وطن سے) نکل جاویں گے اور تمہارے معاملہ میں ہم کبھی کسی کا کہنا نہ مانیں گے (یعنی ہم کو خواہ کوئی کیسا ہی سمجھاوے کہ خروج و قتال میں جو آئندہ مذکور ہے تمہارا ساتھ نہ دیں لیکن ہم نہ مانیں گے، پس جملہ لَا نُطِيْعُ سیاق و سباق دونوں کے متعلق ہے) اور اگر تم سے کسی کی لڑائی ہوئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے اور اللہ گواہ ہے کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں (یہ تو ان کے کاذب ہونے کا اجمالاً بیان ہوا آگے تفصیلاً فرماتے ہیں کہ) واللہ اگر اہل کتاب نکالے گئے تو یہ (منافقین) اُن کے ساتھ نہیں نکلیں گے اور اگر ان سے لڑائی ہوئی تو یہ اُن کی مدد نہ کریں گے اور اگر (بفرض محال) ان کی مدد بھی کی (اور لڑائی میں شریک ہوئے) تو پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے پھر (ان کے بھاگ جانے کے بعد) ان (اہل کتاب) کی کوئی مدد نہ ہوگی (یعنی جو ناصر تھے وہ تو بھاگ گئے اور دوسرا بھی کوئی ناصر نہ ہوگا، پس لامحالہ مغلوب و مقہور ہوں گے، غرض منافقین کی جو غرض ہے کہ اپنے ان بھائیوں پر کوئی آفت نہ آنے دیں، اس میں ہر طرح ناکامی رہے گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جب آخر میں بنی نضیر نکالے گئے تو منافقین ان کے ساتھ نکلے نہیں اور جب اوّل میں ان کا محاصرہ کیا گیا جس میں احتمال قتال کا تھا تو اس میں انھوں نے نصرت نہیں کی، اور بعد وقوعِ واقعہ کے اس طرح فرمانا لَئِنْ اُخْرِجُوْا الخ جو آئندہ واقع ہونے پر

دلالت کرتا ہے یا تو واقعہ ماضیہ کو مستحضر و موجود فرض کرنے پر مبنی ہے تاکہ اُن کا خلف وعد اور ان کا مخذول ہونا خوب پیش نظر ہو جاوے اور یا آئندہ جو احتمالِ موہوم تھا ساتھ دینے کا اس کی نفی کر دی، آگے اس ساتھ نہ دینے کا سبب فرماتے ہیں کہ) بیشک تم لوگوں کا خوف ان (منافقین) کے دلوں میں اللہ سے بھی زیادہ ہے (یعنی دعوئی ایمان جو یہ اپنا ڈرنا اللہ تعالیٰ سے بیان کرتے ہیں وہ تو خلاف واقع ہے ورنہ کفر کو کیوں نہ چھوڑ دیتے، اور تمہارا واقعی خوف ہی، پس اس خوف کی وجہ سے یہ لوگ ان بنی نضیر کا ساتھ نہیں دے سکتے اور) یہ (ان کا تم سے ڈرنا اور خدا سے نہ ڈرنا) اس سبب سے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ (بوجہ کفر کے خدا تعالیٰ کی عظمت کو) سمجھتے نہیں، (اور یہ یہود عام ہیں بنی نضیر و غیر بنی نضیر سے اور منافقین الگ الگ تو تمہارے مقابلہ کا کیا حوصلہ کرتے) یہ لوگ (تو) سب مل کر بھی تم سے نہ لڑیں گے مگر حفاظت والی بستیوں میں یا دیوار (قلعہ و شہر پناہ) کی آڑ میں (حفاظت سے مراد عام ہے، خندق سے ہو یا قلعہ وغیرہ سے اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کبھی ایسا واقعہ پیش آیا ہو کہ منافقین نے مسلمانوں کا مقابلہ کسی قلعہ اور محفوظ مقام سے کیا ہو، کیونکہ مقصود یہ ہے کہ اگر کبھی یہود یا منافقین اکیلے اکیلے یا جمع ہو کر تمہارے مقابلہ میں آئے بھی تو ان کا مقابلہ محفوظ قلعوں میں یا شہر پناہ کی دیوار کے پیچھے سے ہوگا، چنانچہ یہود بنی قریظہ و اہلِ خیبر اسی طرح مقابلہ میں پیش آئے اور منافقین نہ اُن کے ساتھ ہوئے اور نہ اُن کا کبھی اتنا حوصلہ ہوا کہ کھُل کر مسلمانوں کے مقابلہ پر آئیں، اس میں مسلمانوں کی تشجیع یعنی ہمّت افزائی بھی ہے کہ ان سے اندیشہ نہ رکھیں، اور ان کے بعض قبائل جیسے اوس و خزرج کے واقعات جنگ دیکھ کر یہ اندیشہ نہ کیا جاوے کہ شاید اسی طرح اہلِ اسلام کے مقابلہ میں کسی وقت یہ بھی آسکیں، بات یہ ہو کہ) ان کی لڑائی آپس (ہی) میں بڑی تیز ہے (مگر مسلمانوں کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں ہیں اور اسی طرح یہ احتمال نہ کیا جاوے کہ گو بمقابلہ اہلِ اسلام کے تنہا یہ ضعیف ہوں مگر بہت سے ضعفاء مل کر قوی ہو جاتے ہیں شاید اس طرح یہ سب جمع ہو کر مسلمانوں کا مقابلہ کر سکیں، یہ احتمال اس لئے قابلِ التفات نہیں کہ) اے مخاطب تو ان کو (ظاہر میں) متفق خیال کرتا ہے، حالانکہ ان کے قلوب غیر متفق ہیں (یعنی گو عداوت اہلِ حق ان سب میں ایک وجہ اشتراک کی ہے، مگر خود بھی تو ان میں اختلافِ عقائد کی وجہ سے افتراق اور عداوت ہے جیسا سورۂ مائدہ میں گذر چکا ہے وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ الخ اور ان کے باہم مجتمع ہونے کے احتمال کی نفی بھی زیادۃ تاکید و تقویت مقصود کے لئے ہے ورنہ حق تعالیٰ کی مشیّت ان کی مغلوبی و مقہوری کے ساتھ ہو چکی ہے، تو اگر اتفاق ہو بھی جاتا تو کیا کام آتا، آگے اس نااتفاقی کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ) یہ (تشتّتِ قلوب) اس وجہ سے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو (دین کی) عقل نہیں رکھتے، (اس لئے ہر ایک اپنے اپنے خیال کا تابع ہے، اور جب نظریات اور اغراض مختلف ہوں تو اس کے لئے اختلافِ قلوب لازم ہے، اور اس پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ بے دینوں میں بسا اوقات اتفاق دیکھا جاتا ہے، بات یہ ہے کہ یہاں مقصود قاعدہ کلیہ بیان کرنا نہیں، بلکہ اُن میں جو نااتفاقی تھی اس کا سبب بیان

کرنا مقصود ہے کہ اُن کے لئے یہی امر سبب ہوگیا تھا، چنانچہ ظاہر ہے آگے بالخصوص بنی نضیر اور ان منافقین کی جنھوں نے وعدۂ نصرت کرکے دھوکہ میں ڈالا، اور عین وقت پر دغا دی ان کی حالت کا بیان ہے کہ انکے مجموعہ کی ۲ دو مثالیں ہیں، ایک مثال خاص بنی نضیر کی اور دوسری منافقین کی، بنی نضیر کی مثال تو) ان لوگوں کی سی مثال ہے جو ان سے کچھ ہی پہلے ہوئے ہیں جو (دنیا میں بھی) اپنے کردار کا مزہ چکھ چکے ہیں، اور (آخرت میں بھی) اُن کے لئے دردناک عذاب (ہونے والا) ہے (مراد ان سے یہود بنی قینقاع ہیں، جن کا قصہ یہ ہوا کہ واقعۂ بدر کے بعد انھوں نے آپؐ سے ۲ھ ہجری میں عہد شکنی کرکے جنگ کی، پھر مغلوب و مقہور ہوئے، اور قلعہ سے آپؐ کے فیصلہ پر باہر نکلے، اور سب کی مشکیں باندھی گئیں، پھر عبداللہ بن اُبَیّ کے اصرار و الحاح کی وجہ سے ان کی اس شرط پر جان بخشی کی گئی کہ مدینہ سے چلے جائیں، چنانچہ وہ اَذْرُعات شام کو نکل گئے اور اُن کے اموال مالِ غنیمت کی طرح تقسیم کئے گئے، کذا فی زاد المعاد، اور ان منافقین کی مثال) شیطان کی سی مثال ہے کہ (اول تو) انسان سے کہتا ہے کہ تو کافر ہوجا پھر جب وہ کافر ہوجاتا ہے (اور کفر کے وبال میں گرفتار ہوتا ہے خواہ دنیا میں خواہ آخرت میں) تو (اس وقت صاف جواب دیتا ہے اور) کہہ دیتا ہے کہ میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں میں تو اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں (دنیا میں ایسی تبرّی کا قصہ تو سورۂ انفال آیت وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ الخ میں گذر چکا ہے اور آخرت میں تبرّی مُضِلّین کی ضالّین سے آیات متعددہ میں مذکور ہے) سو آخری انجام دونوں کا یہ ہوا کہ دونوں دوزخ میں گئے جہاں ہمیشہ رہیں گے، (ایک ضلال کی وجہ سے دوسرا اضلال کی وجہ سے) اور ظالموں کی یہی سزا ہے (پس جس طرح اس شیطان نے اس انسان کو اوّل بہکایا پھر وقت پر ساتھ نہ دیا اور دونوں خسران میں پڑے، اسی طرح ان منافقین نے اوّل بنی نضیر کو بُری رائے دی، کہ تم نکلو نہیں، پھر عین وقت پر اُن کو دھوکہ دیا، اور دونوں بلا میں پھنسے، بنی نضیر تو جلاوطنی کی مصیبت میں اور منافقین ناکامیابی کی ذلت میں مبتلا ہوئے۔

معارف و مسائل

كَمَثَلِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا الخ یہ بنو نضیر کی مثال کا بیان ہے اور اَلَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ کی تفسیر میں حضرت مجاہدؒ نے فرمایا کہ کفار اہل بدر مراد ہیں اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا بنو قینقاع (قبیلۂ یہود) مراد ہیں، اور دونوں کا انجام بد اور مقتول و مغلوب اور ذلیل و خوار ہونا اس وقت واضح ہوچکا تھا، کیونکہ بنو نضیر کی جلاوطنی کا واقعہ غزوۂ بدر و اُحد کے بعد واقع ہوا ہے، اور بنو قینقاع کا واقعہ بھی بدر کے بعد پیش آچکا تھا، بدر میں مشرکین عرب کے ستر سردار مارے گئے، اور باقی بڑی ذلت و خواری کے ساتھ واپس ہوئے، اور بقول ابن عباسؓ یہ مراد ہیں تو مطلب آیت کا واضح ہے کہ ان کے بارے میں جو آیت میں فرمایا: ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ، یعنی انھوں نے اپنے کرتوت کا بدلہ چکھ لیا،

یہ آخرت سے پہلے دنیا ہی میں آنکھوں کے سامنے آگیا، اسی طرح اگر اَلَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِہِمْ سے مراد یہود ہی کا قبیلہ بنو قینقاع ہو تو ان کا واقعہ بھی ایسا ہی عبرتناک ہے۔

بنو قینقاع کی جلا وطنی واقعہ یہ تھا کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے تو مدینہ کے آس پاس جتنے قبائل یہود کے تھے سب کے ساتھ ایک معاہدہ صلح کا ہوگیا تھا، جس کی شرائط میں یہ داخل تھا کہ ان میں سے کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے کسی مخالف کی امداد نہ کرے گا، ان معاہدہ کرنے والوں میں قبیلۂ بنو قینقاع بھی شامل تھا، مگر اس نے چند مہینوں کے بعد ہی غدر و عہد شکنی شروع کردی اور غزوۂ بدر کے موقع پر مشرکین کے ساتھ خفیہ سازش و امداد کے کچھ واقعات سامنے آئے، اُس وقت یہ آیتِ قرآن نازل ہوئی (وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِیَانَۃً فَانْۢبِذْ اِلَیْہِمْ عَلٰی سَوَآءٍ) ”یعنی اگر (معاہدہ اور صلح کے بعد) کسی قوم کی خیانت کا خطرہ لاحق ہو تو آپ ان کا معاہدۂ صلح ختم کرسکتے ہیں“۔ بنو قینقاع اس معاہدہ کو اپنی غداری سے خود توڑ چکے تھے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خلاف جہاد کا اعلان فرمایا اور عَلَمِ جہاد حضرت حمزہؓ کو عطا فرمایا اور مدینہ طیبہ کے شہر پر حضرت ابولبابہؓ کو اپنا خلیفہ مقرر کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی تشریف لے گئے، یہ لوگ مسلمانوں کا لشکر دیکھ کر اپنے قلعہ میں بند ہوگئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قلعہ کا محاصرہ کرلیا، پندرہ روز تک تو یہ لوگ محصور ہو کر صبر کرتے رہے، بالآخر اللہ نے ان کے دلوں میں رُعب ڈال دیا، اور یہ سمجھ گئے کہ مقابلہ سے کام نہ چلے گا اور قلعہ کا دروازہ کھول دیا، اور کہا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر راضی ہیں جو آپ ہمارے بارے میں نافذ کریں۔

آپؐ کا فیصلہ ان کے مردوں کے قتل کا ہونے والا تھا، کہ عبداللہ بن اُبَی منافق نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بے حد اصرار و الحاح کیا کہ اُن کی جان بخشی کردی جائے، بالآخر آپؐ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ یہ لوگ بستی خالی کر کے جلا وطن ہوجائیں، اور ان کے اموال مسلمانوں کا مالِ غنیمت ہونگے، اس قرار داد کے مطابق یہ لوگ مدینہ چھوڑ کر ملکِ شام کے علاقہ اَذْرُعَات میں چلے گئے، اور اُن کے اموال کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت کے قانون کے مطابق اس طرح تقسیم فرمایا کہ ایک خمس بیت المال کا رکھ کر باقی چار خمس غانمین میں تقسیم کردیئے۔

غزوۂ بدر کے بعد یہ پہلا خمس تھا جو بیت المال میں داخل ہوا، یہ واقعہ بروز شنبہ ۱۵ شوال ۲ھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے بیس ماہ بعد پیش آیا۔

کَمَثَلِ الشَّیْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اکْفُرْ، الآیۃ یہ دوسری مثال اُن منافقین کی ہے جنھوں نے بنو نضیر کو جلا وطنی کا حکم نہ ماننے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ پر جنگ کرنے کے لئے اُبھارا اور اُن کی مدد کرنے کا وعدہ کیا، مگر جب مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کیا تو کوئی منافق امداد کو نہ پہونچا، ان کی مثال قرآن کریم نے شیطان کے ایک واقعہ سے دی ہے کہ شیطان نے انسان کو کفر پر آمادہ کیا اور

اور اس سے طرح طرح کے وعدے کئے، مگر جب وہ کفر میں مبتلا ہو گیا تو سب سے مکر گیا۔

شیطان کے ایسے واقعات خدا جانے کتنے ہوئے ہوں گے، اُن میں سے ایک واقعہ تو خود قرآن کریم میں منصوص ہے جس کا بیان سورۂ انفال کی ان آیات میں آیا ہے وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ فَلَمَّا تَرَاۗءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰي عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّنْكُمْ الآیۃ، یہ واقعہ غزوۂ بدر کا ہے، جس میں شیطان نے بطور وسوسہ کے یا بشکل انسانی سامنے آکر مشرکین مکہ کو مسلمانوں کے مقابلہ پر اُبھارا اور اپنی مدد کا یقین دلایا، مگر جب مسلمانوں سے مقابلہ ہوا تو مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا، اس واقعہ کی پوری تشریح معارف القرآن جلد چہارم صفحہ ۲۵۶ سے صفحہ ۲۵۸ تک تفصیل کے ساتھ آ چکی ہے۔

اگر آیت مذکورہ میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے تو یہ ارشاد کہ شیطان انسان سے کفر کرنے کو کہتا ہے، اور جب وہ کر لیتا ہے تو اس سے بری ہو کر الگ ہو جاتا ہے، اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس واقعہ میں بظاہر شیطان نے ان کو کفر کرنے کے لئے نہیں کہا، کافر تو وہ پہلے ہی سے تھے، شیطان نے تو ان کو مقابلہ پر جمع کرنے کے لئے کہا تھا، جواب ظاہر ہے کہ کفر پر جمے رہنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ پر قتال کرنے کو کہنا بھی اسی حکم میں ہے کہ ان کو کفر کرنے کے لئے کہا جائے۔

اور تفسیر مظہری و قرطبی و ابن کثیر وغیرہ میں اس جگہ شیطان کی اس مثال کے واقعات بنی اسرائیل کے متعدد راہبوں اور عبادت گذاروں کو شیطان کے بہکا کر کفر تک پہونچا دینے کے متعلق نقل کئے ہیں:

مثلاً بنی اسرائیل کا ایک راہب عبادت گذار جو اپنے صومعہ میں ہمیشہ عبادت میں مشغول رہتا، اور روزے اس طرح رکھتا تھا کہ دس دن میں صرف ایک مرتبہ افطار کرتا تھا، ستّر سال اس کے اسی حال میں گذرے، شیطان لعین اس کے پیچھے پڑا، اور اپنے سب سے زیادہ مکّار، ہوشیار شیطان کو اس کے پاس بصورت راہب عبادت گذار بنا کر بھیجا جس نے اس کے پاس جا کر اس راہب سے بھی زیادہ عبادت گذاری کا ثبوت دیا، یہاں تک کہ راہب کو اس پر اعتماد ہو گیا۔

بالآخر یہ مصنوعی راہب شیطان اس بات میں کامیاب ہو گیا کہ اس راہب کو کچھ دعائیں ایسی سکھلائیں جس سے بیماروں کو شفا ہو جائے، پھر اس نے بہت سے لوگوں کو اپنے اثر سے بیمار کر کے ان کو خود ہی اس راہب کا پتہ دیا، جب یہ راہب اُن پر دُعا پڑھتا تو یہ شیطان اپنا اثر اس سے ہٹا دیتا، وہ شفایاب ہو جاتا تھا، اور عرصۂ دراز تک یہ سلسلہ جاری رکھنے کے بعد اس نے ایک اسرائیلی سردار کی حسین لڑکی پر اپنا یہ عمل کیا اور اس کو بھی راہب کے پاس جانے کا مشورہ دیا، یہاں تک کہ اس کو راہب کے صومعہ تک پہونچانے میں کامیاب ہو گیا اور رفتہ رفتہ اس کو اس لڑکی کے ساتھ زنا میں مبتلا کرنے میں کامیاب ہوا، جس کے نتیجہ میں اس کو حمل ہو گیا، تو رُسوائی سے بچنے کے لئے اس کو قتل کرنے کا مشورہ دیا، قتل کرنے کے بعد شیطان ہی نے سب کو

واقعہ قتل وغیرہ بتلا کر راہب کے خلاف کھڑا کر دیا یہاں تک کہ لوگوں نے اس کا صومعہ ڈھا دیا اور اس کو قتل کر کے سولی دینے کا فیصلہ کیا، اس وقت شیطان اس کے پاس پھر پہونچا کہ اب تو تیری جان بچنے کی کوئی صورت نہیں، ہاں اگر تو مجھے سجدہ کرے تو میں تجھے بچا سکتا ہوں، راہب سب کچھ گناہ پہلے کر چکا تھا، کفر کا راستہ ہموار ہو چکا تھا اس نے سجدہ بھی کر لیا، اس وقت شیطان نے صاف کہہ دیا کہ تو میرے قبضہ میں نہ آتا تھا، میں نے یہ سب مکر تیرے مبتلائے کفر کرنے کے لئے کئے تھے، اب میں تیری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

یہ واقعہ تفسیر قرطبی اور مظہری میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ

اے ایمان والو ڈرتے رہو اللہ سے اور چاہئے کہ دیکھ لے ہر ایک جی کیا بھیجا ہے کل کے واسطے اور ڈرتے رہو اللہ سے

إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿١٨﴾ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ

بیشک اللہ کو خبر ہے جو تم کرتے ہو، اور مت ہو اُن جیسے جنھوں نے بھلا دیا اللہ کو پھر اللہ نے بھلا دیئے

أَنْفُسَهُمْ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿١٩﴾ لَا يَسْتَوِي أَصْحَابُ النَّارِ

ان کو اُن کے جی وہ لوگ وہی ہیں نافرمان، برابر نہیں دوزخ والے اور

وَأَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۚ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴿٢٠﴾ لَوْ أَنْزَلْنَا

بہشت والے، بہشت والے جو ہیں وہی ہیں مراد پانے والے، اگر ہم اُتارتے

هَٰذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُتَصَدِّعًا مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ ۚ

یہ قرآن ایک پہاڑ پر تو تُو دیکھ لیتا کہ وہ دب جاتا پھٹ جاتا اللہ کے ڈر سے،

وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿٢١﴾ هُوَ اللَّهُ الَّذِي

اور یہ مثالیں ہم سُناتے ہیں لوگوں کو تاکہ وہ غور کریں، وہ اللہ ہے جس کے سوائے

لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۖ هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ ﴿٢٢﴾

بندگی نہیں کسی کی، جانتا ہے جو پوشیدہ ہے اور جو ظاہر ہے، وہ ہے بڑا مہربان رحم والا،

هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ

وہ اللہ ہے جس کے سوائے بندگی نہیں کسی کی، وہ بادشاہ ہے پاک ذات سب عیبوں سے سالم امان دینے والا

الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۲۳﴾

پناہ میں لینے والا زبردست دباؤ والا صاحب عظمت پاک ہے اللہ اُن کے شریک بتلانے سے،

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۭ يُسَبِّحُ لَهٗ

وہ اللہ ہے بنانیوالا نکال کھڑا کرنیوالا صورت کھینچنے والا اسی کے ہیں سب نام خاصے پاکی بول رہا ہے اس کی

مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۴﴾ ع

جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور وہی ہے زبردست حکمتوں والا،

۳ع/۷

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو (تم نے نافرمانوں کا انجام سُن لیا سو تم) اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر ہر شخص دیکھ بھال لے کہ کل (قیامت) کے واسطے اُس نے کیا (ذخیرہ) بھیجا ہے (یعنی اعمالِ صالحہ میں کوشش کرو جو کہ ذخیرہ آخرت ہیں) اور (جس طرح تحصیلِ طاعات و اعمالِ صالحہ میں تقویٰ کا حکم ہے، اسی طرح سیئات و معاصی سے بچنے کے بارے میں تم کو حکم ہے کہ) اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تعالیٰ کو تمھارے اعمال کی سب خبر ہے (پس معاصی کے ارتکاب سے اندیشہ عقوبت ہے، پس پہلا اِتَّقُوا اللّٰہَ طاعات کے متعلق ہے جس کا قرینہ قَدَّمَتْ لِغَدٍ ہے، اور دوسرا معاصی کے متعلق ہے، جس کا قرینہ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ہے) اور (آگے ان احکام کی مزید تاکید کے لئے ارشاد ہے کہ) تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جنھوں نے اللہ (کے احکام) سے بے پروائی کی (یعنی عمل بالاحکام کو ترک کر دیا، اس طرح کہ اوامر کے خلاف کیا اور نواہی کا ارتکاب کیا) سو اللہ اس کا یہ ہوا کہ) اللہ تعالیٰ نے خود اُن کی جان سے ان کو بے پرواہ بنا دیا (یعنی اُن کی ایسی عقل ماری گئی کہ خود اپنے نفع حقیقی کو نہ سمجھا اور نہ حاصل کیا) یہی لوگ نافرمان ہیں (اور نافرمانی کی سزا بھگتیں گے اور اوپر جن دو قسم کے لوگوں کا ذکر ہوا، یعنی ایک وہ جو اہلِ تقویٰ ہوئے اور دوسرے وہ جو تارکِ احکام ہوئے ان میں ایک اہلِ جنّت ہیں دوسرے اہلِ نار اور) اہلِ نار اور اہلِ جنّت باہم برابر نہیں (بلکہ) جو اہلِ جنّت ہیں وہ لوگ کامیاب ہیں (اور اہلِ نار ناکام ہیں جیسا اوپر اُولٰۗئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ سے معلوم ہوا پس تم کو اصحابُ الجنۃ میں سے ہونا چاہئے، اہلِ نار میں سے نہ ہونا چاہئے اور یہ چند نصائح جس قرآن کے ذریعہ سے تم کو سنائے جاتے ہیں وہ ایسا ہے کہ) اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے (اور اس میں سمجھنے کا مادہ رکھدیتے اور شہوات کا مادّہ نہ رکھتے) تو (اے مخاطب) تو اس کو دیکھتا کہ خدا کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا (یعنی قرآن فی نفسہ ایسا مؤثر اور قوی الاثر ہے، مگر انسان میں بوجہ غلبہ شہوات کے قابلیت فاسد ہوگئی جس کے سبب تاثر نہیں ہوتا، پس اُن کو چاہئے کہ تحصیل طاعات اور ترک معاصی سے اپنی شہوت

کو مغلوب کرے تاکہ مواعظ قرآنیہ سے اس کو تاثر ہو اور احکام پر استقامت و استدامت اور ذکر و فکر نصیب ہو جس کا اوپر حکم ہوا ہے) اور ان مضامین عجیبہ کو ہم لوگوں کے (نفع کے) لئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سوچیں (اور منتفع ہوں، اسی لئے یہ مضمون لَوْ اَنْزَلْنَا الخ یہاں بیان کیا گیا، آگے حق تعالیٰ کے صفاتِ کمال بیان کئے جاتے ہیں جس سے حق تعالیٰ کی عظمت قلب پر نقش ہو کر احکام بجالانے میں مددگار ثابت ہو، پس ارشاد ہے کہ) وہ ایسا معبود ہے کہ اس کے سوا کوئی اور معبود (بننے کے لائق) نہیں وہ جاننے والا ہے پوشیدہ چیزوں کا اور ظاہر چیزوں کا وہی بڑا مہربان رحم والا ہے (اور چونکہ توحید نہایت مہتم بالشان چیز ہے، اس لئے اس کی تاکید کے لئے مکرر فرمایا کہ) وہ ایسا معبود ہے کہ اس کے سوا کوئی اور معبود (بننے کے لائق) نہیں وہ بادشاہ ہے (سب عیبوں سے) پاک ہے، سالم ہے (یعنی نہ ماضی میں اُس میں کوئی عیب ہوا جو حاصل ہے قدوسی کا اور نہ آئندہ اس کا احتمال ہے جو حاصل ہے سلامؐ کا (کذا فی الکبیر) اپنے بندوں کو خوف کی چیزوں سے) امن دینے والا ہے (اپنے بندوں کی خوف کی چیزوں سے) نگہبانی کرنے والا ہے (یعنی آفت بھی نہیں آنے دیتا اور آئی ہوئی کو بھی دور کر دیتا ہے) زبردست ہے خرابی کا درست کر دینے والا ہے، بڑی عظمت والا ہے، اللہ تعالیٰ (جس کی یہ شان ہے کہ) لوگوں کے شرک سے پاک ہے وہ معبود (برحق) ہے پیدا کرنے والا ہے، ٹھیک ٹھیک بنانے والا ہے (یعنی ہر چیز کو حکمت کے موافق بناتا ہے) صورت (شکل) بنانے والا ہے، اس کے اچھے اچھے نام ہیں (جو اچھی اچھی صفتوں پر دلالت کرتے ہیں) سب چیزیں اس کی تسبیح (و تقدیس) کرتی ہیں (حالاً یا قالاً) جو آسمانوں میں اور زمین میں ہیں اور وہی زبردست حکمت والا ہے (پس ایسے باعظمت کے احکام کی بجا آوری ضرور اور نہایت ضرور ہے)۔

معارف و مسائل

سورۂ حشر میں شروع سے کفار اہل کتاب اور مشرکین و منافقین کے حالات و معاملات اور اُن پر دنیا و آخرت کے وبال کا بیان فرمانے کے بعد اب آخر سورت تک مؤمنین کو متنبہ کرنا اور اعمالِ صالحہ کی پابندی کرنے کی ہدایت ہے۔

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں ایک بلیغ انداز سے آخرت کی فکر اور اس کے لئے تیاری کا حکم ہے جس میں پہلے فرمایا:- يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ یعنی اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور تم میں سے ہر نفس کو اس پر غور کرنا چاہئے کہ اس نے آخرت کے لئے کیا سامان بھیجا ہے۔

یہاں چند باتیں غور طلب ہیں:- اوّل:- یہ کہ اس آیت میں قیامت کو لفظ غد سے تعبیر کیا جس کے معنی ہیں آنے والی کل، اس میں تین چیزوں کی طرف اشارہ ہے، اوّل پوری دنیا کا بمقابلہ آخرت نہایت

قلیل و مختصر ہونا ہے کہ ساری دنیا آخرت کے مقابلہ میں ایک دن کی مثل ہے، اور حساب کے اعتبار سے تو یہ نسبت ہونا بھی مشکل ہے، کیونکہ آخرت دائمی ہے جس کی کوئی انتہا اور انقطاع نہیں، انسانی دنیا کی عمر تو چند ہزار سال ہی بتلائی جاتی ہے، اگر زمین و آسمان کی تخلیق سے حساب لگائیں تو چند لاکھ سال ہو جائیں گے، مگر پھر ایک محدود و مدت ہے، غیر محدود اور غیر متناہی سے اس کو کوئی بھی نسبت نہیں ہوتی۔

بعض روایاتِ حدیث میں ہے اَلدُّنْیَا یَوْمٌ وَّلَنَا فِیْہِ صَوْمٌ "ساری دنیا ایک دن ہے اور اس دن میں ہمارا روزہ ہے"، اور غور کرو تو تخلیقِ انسانی سے شروع کرو یا تخلیقِ زمین و آسمان سے یہ دونوں چیزیں ایک فردِ انسانی کے لئے قابلِ اہتمام نہیں، بلکہ ہر فرد کی دنیا تو اس کی عمر کے ایام و سال ہیں، اور وہ آخرت کے مقابلہ میں کتنی حقیر مدت ہے، اس کا ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے۔

دوسرا اشارہ اس میں قیامت کے یقینی ہونے کی طرف ہے، جیسے آج کے بعد کل کا آنا امر یقینی ہے کسی کو اس میں شبہ نہیں ہوتا، اسی طرح دنیا کے بعد قیامت و آخرت کا آنا یقینی ہے۔

تیسرا اشارہ اس طرف ہے کہ قیامت بہت قریب ہے، جیسے آج کے بعد کل کچھ دُور نہیں، بہت قریب سمجھی جاتی ہے، اسی طرح دنیا کے بعد قیامت بھی قریب ہے۔

اور قیامت ایک تو پورے عالم کی ہے جب زمین و آسمان سب فنا ہو جائیں گے، وہ بھی اگرچہ ہزاروں لاکھوں سال کے بعد ہو مگر بمقابلہ مدتِ آخرت کے بالکل قریب ہی ہے، دوسری قیامت ہر انسان کی اپنی ہے جو اس کی موت کے وقت آجاتی ہے، جیسا کہ کہا گیا ہے مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِیَامَتُہٗ، یعنی جو شخص مر گیا اس کی قیامت تو ابھی قائم ہو گئی"، کیونکہ قبر ہی سے عالمِ آخرت کے آثار شروع ہو جاتے ہیں اور عذاب و ثواب کے نمونے سامنے آجاتے ہیں، کیونکہ عالمِ قبر جس کو عالمِ برزخ بھی کہا جاتا ہے اس کی مثال دنیا کی انتظار گاہ (ویٹنگ روم) کی سی ہے جو فرسٹ کلاس سے لے کر تھرڈ کلاس تک کے لوگوں کے لئے مختلف قسم کے ہوتے ہیں، اور مجرموں کا ویٹنگ روم حوالات یا جیل خانہ ہوتا ہے، اسی انتظار گاہ ہی سے ہر شخص اپنا درجہ اور حیثیت متعین کر سکتا ہے، اس لئے مرنے کے ساتھ ہی ہر انسان کی اپنی قیامت آجاتی ہے، اور انسان کا مرنا اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا معمہ بنایا ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا فلسفی اور سائنسداں اس کا یقینی وقت مقرر نہیں کر سکتا، بلکہ ہر وقت ہر آن انسان اس خطرہ سے باہر نہیں ہوتا، کہ شاید اگلا گھنٹہ زندگی کی حالت میں نہ آئے، خصوصاً اس برق رفتار زمانہ میں تو ہارٹ فیل ہونے کے واقعات نے اس کو روزمرہ کی بات بنا دیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں قیامت کو لفظ غد سے تعبیر کر کے بے فکرے انسان کو متنبہ کر دیا کہ قیامت کو کچھ دُور نہ سمجھو وہ آنے والی کل کی طرح قریب ہے، اور ممکن یہ بھی ہے کہ کل سے پہلے ہی آجائے۔

دوسری غور طلب بات اس آیت میں یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس میں انسان کو اس پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی کہ قیامت جس کا آنا یقینی بھی ہے اور قریب بھی اس کے لئے تم نے کیا سامان بھیجا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ انسان کا اصل وطن اور مقام آخرت ہے، دنیا میں اس کا مقام ایک مسافر کی طرح ہے، وطن کے دائمی قیام و قرار کے لئے یہیں سے کچھ سامان بھیجنا ضروری ہے، اور انسان کے اس سفر کا اصل مقصد ہی یہ ہے کہ یہاں رہ کر کچھ کمائے اور جمع کرے پھر اس کو اپنے وطنِ آخرت کی طرف بھیجدے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہاں سے دنیا کا سامان، مال و دولت کوئی وہاں ساتھ نہیں لے جاسکتا تو بھیجنے کی ایک ہی صورت ہے کہ ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف مال منتقل کرنے کا جو طریقہ دنیا میں رائج ہے کہ یہاں کی حکومت کے بنک میں جمع کر کے دوسرے ملک کی کرنسی حاصل کرلے جو وہاں چلتی ہے، یہی صورت آخرت کے معاملہ میں ہے کہ جو کچھ یہاں اللہ کی راہ میں اور اللہ کے احکام کی تعمیل میں خرچ کیا جاتا ہے وہ آسمانی حکومت کے بنک (اسٹیٹ بنک) میں جمع ہوجاتا ہے، وہاں کی کرنسی ثواب کی صورت میں اس کے لئے لکھ دی جاتی ہے، اور وہاں پہونچ کر بغیر کسی دعوے اور مطالبہ کے اس کے حوالہ کر دی جاتی ہے۔

اور لفظ مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ عام ہے نیک اعمال اور بد اعمال دونوں کے لئے جس نے نیک اعمال آگے بھیجے ہیں اس کو ثواب کی صورت میں آخرت کے نقود (کرنسی) مل جائے گی، اور جس نے بُرے اعمال آگے بھیجے ہیں وہاں اس پر فرد جرم عائد ہوگی، اس کے بعد لفظ اِتَّقُوا اللّٰہَ کا اعادہ کیا گیا، یہ تاکید کے لئے بھی ہوسکتا ہے، اور وہ مراد بھی ہوسکتی ہے جو اوپر خلاصہ تفسیر میں بیان ہوئی ہے کہ پہلے اِتَّقُوا اللّٰہَ سے واجبات و فرائض کی ادائیگی کا اہتمام سکھایا گیا ہے، اور دوسرے اِتَّقُوا اللّٰہَ سے گناہوں سے بچنے کا اہتمام بتلایا گیا ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے اِتَّقُوا اللّٰہَ سے اعمال و احکامِ خداوندی کی تعمیل کر کے آخرت کے لئے کچھ سامان بھیجنے کا حکم ہو، اور دوسرے اِتَّقُوا اللّٰہَ سے اس طرف ہدایت ہو کہ دیکھو جو سامان وہاں بھیجتے ہو اس کو دیکھ لو کہ وہ کوئی کھوٹا خراب سامان نہ ہو جو وہاں کام نہ آئے، کھوٹا سامان وہاں کے لئے وہ ہے کہ جس کی صورت تو عمل صالح کی ہو مگر اس میں اخلاص اللہ کی رضا کے لئے نہ ہو بلکہ نام و نمود یا اور کوئی غرض نفسانی شامل ہو، یا وہ عمل جو صورت میں تو عبادت ہے مگر دین میں اس کا کوئی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے بدعت و گمراہی ہے، تو اس دوسرے اِتَّقُوا اللّٰہَ کا خلاصہ یہ ہوا کہ آخرت کے لئے محض سامان کی صورت بنا دینا کافی نہیں، دیکھ کر بھیجو کہ کھوٹا سامان نہ ہو جو وہاں نہ لیا جائے۔

فَاَنْسٰھُمْ اَنْفُسَھُمْ، یعنی ان لوگوں نے اللہ کو بھول اور نسیان میں کیا ڈالا درحقیقت خود اپنے آپ کو اس بھول میں ڈال دیا کہ اپنے نفع نقصان کی خبر نہ رہی۔

لَوْ اَنْزَلْنَا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ، یہ ایک تمثیل ہے کہ اگر قرآن پہاڑوں جیسی سخت اور

ثقیل چیز پر اُتارا گیا ہوتا اور جس طرح انسان کو فہم و شعور دیا گیا ہے اُن کو بھی دیدیا جاتا تو پہاڑ بھی اس قرآن کی عظمت کے سامنے جھک جاتے بلکہ ریزہ ریزہ ہو جاتے، مگر انسان اپنی خواہش پرستی اور خود غرضی میں مبتلا ہو کر اپنے فطری شعور کو کھو بیٹھا، وہ قرآن سے متاثر نہیں ہوتا، گویا یہ ایک فرضی مثال ہے کہ پہاڑوں میں شعور ہوتا اور بعض حضرات نے فرمایا کہ پہاڑوں اور درختوں اور دنیا کی تمام چیزوں میں شعور و ادراک ہونا عقل و نقل سے ثابت ہے، اس لئے یہ کوئی فرضی مثال نہیں حقیقت ہے (مظہری) واللہ اعلم

انسان کو آخرت کی فکر اور قرآن کی عظمت بتلانے کے بعد آخر میں حق تعالیٰ کی چند صفاتِ کمال کا ذکر کر کے سورت کو ختم کیا گیا۔

عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّہَادَۃِ، یعنی اللہ تعالیٰ ہر چھپی اور کھلی چیز اور غائب و حاضر کا پوری طرح جاننے والا ہے، اَلْقُدُّوْسُ، بضم قاف وہ ذات جو ہر عیب سے پاک اور ہر ایسی چیز سے بری ہو جو اس کے شایانِ شان نہیں، اَلْمُؤْمِنُ، یہ لفظ جب انسان کے لئے بولا جاتا ہے تو اس کے معنی ایمان لانیوالے اور اللہ و رسول کے کلام کی تصدیق کرنے والے کے آتے ہیں، اور جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے بولا جاتا ہے تو اس کے معنی امن دینے والے کے ہوتے ہیں، (کما قالہ ابن عباسؓ) یعنی وہ اللہ و رسولؐ پر ایمان لانے والوں کو ہر طرح کے عذاب و مصیبت سے امن اور سلامتی دینے والا ہے۔

اَلْمُہَیْمِنُ، اس کے معنی ہیں نگرانی کرنے والا (کذا قال ابن عباس و مجاہد و قتادہؒ) قاموس میں ہے کہ ہَیْمَنَ یُہَیْمِنُ کے معنی دیکھ بھال اور نگرانی کرنے کے آتے ہیں (مظہری)

اَلْعَزِیْزُ بمعنی قوی، اَلْجَبَّارُ، صاحب جبروت و عظمت، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لفظ جبر سے مشتق ہو، جس کے معنی ٹوٹی ہڈی وغیرہ کو جوڑنے کے آتے ہیں، اسی لئے جبیرہ اُس پٹی کو کہا جاتا ہے جو ٹوٹی ہوئی ہڈی کو جوڑنے کے بعد اس پر باندھی جاتی ہے، تو معنی اس لفظ کے یہ ہوں گے کہ وہ ہر ٹوٹی ہوئی شکستہ و ناکارہ چیز کی اصلاح کر کے درست کر دینے والا ہے (مظہری)

اَلْمُتَکَبِّرُ تکبر سے اور وہ کبریاء سے مشتق ہے، جس کے معنی بڑائی کے ہیں اور ہر بڑائی.... درحقیقت اللہ جل شانہٗ کے لئے مخصوص ہے، جو کسی چیز میں کسی کا محتاج نہیں، اور جو محتاج ہو وہ بڑا نہیں ہو سکتا، اس لئے اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کے لئے یہ لفظ عیب اور گناہ ہے، کیوں کہ حقیقت میں بڑائی حاصل نہ ہونے کے باوجود بڑائی کا دعویٰ جھوٹا ہے اور وہ ذات جو حقیقت میں سب سے بڑی اور بے نیاز ہے اس کی خاص صفت میں شرکت کا دعویٰ ہے، اس لئے متکبر کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے صفتِ کمال ہے اور غیر اللہ کے لئے جھوٹا دعویٰ۔

اَلْمُصَوِّرُ کے معنی صورت بنانے والا، مراد یہ ہے کہ تمام مخلوقات کو حق تعالیٰ نے خاص خاص شکل و صورت عطا فرمائی ہے جس کی وجہ سے وہ دوسری چیزوں سے ممتاز ہوتی اور پہچانی جاتی ہے

دنیا کی عام مخلوقات آسمانی اور زمینی خاص خاص صورتوں ہی سے پہچانی جاتی ہیں، پھر ان میں انواع و اصناف کی تقسیم اور ہر نوع و صنف کی جداگانہ ممتاز شکل و صورت اور ایک ہی نوعِ انسانی میں مرد و عورت کی شکل و صورت کا امتیاز پھر سب مردوں سب عورتوں کی شکلوں میں باہم ایسے امتیازات کہ اربوں کھربوں انسان دنیا میں پیدا ہوئے ایک کی صورت بالکلیہ دوسرے سے نہیں ملتی کہ بالکل امتیاز نہ ہوسکے، یہ کمالِ قدرت صرف ایک ہی ذات حق جل شانہٗ کا ہے جس میں اس کا کوئی شریک نہیں، جس طرح غیر اللہ کے لئے تکبر جائز نہیں کہ کبریا، صرف اللہ جل شانہٗ کی صفت ہے، اسی طرح تصویر سازی غیر اللہ کے لئے جائز نہیں کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفت میں شرکت کا عملی دعویٰ ہے۔

لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ "یعنی اللہ تعالیٰ کے اچھے اچھے نام ہیں، قرآن کریم میں ان کی تعداد متعین نہیں فرمائی، صحیح احادیث میں ننانوے تعداد بتلائی ہے، ترمذی کی ایک حدیث میں یہ سب یک جا ندکور ہیں، اور بہت سے علماء نے اسماء حسنیٰ پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، احقر کا بھی ایک مختصر رسالہ اسماء حسنیٰ کے نام سے مناجات مقبول کے شروع میں طبع ہوا ہے۔

يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ، یہ تسبیح زبانِ حال سے ہونا تو ظاہر ہی ہے کہ ساری مخلوقات اور ان کے اندر رکھی ہوئی عجیب و غریب صنعتیں اور صورتیں زبانِ حال سے اپنے بنانے والے کی حمد و ثنا میں مشغول ہیں، اور ہوسکتا ہے کہ حقیقی تسبیح مراد ہو کیونکہ تحقیق یہی ہے کہ تمام اشیاء کو عالم میں اپنی اپنی حیثیت کا عقل و شعور ہے، اور عقل و شعور کا سب سے پہلا مقتضیٰ اپنے بنانے والے کو پہچاننا اور اس کا شکر گذار ہونا ہے، اس لئے ہر چیز حقیقۃً تسبیح کرتی ہو تو اس میں کوئی بُعد نہیں، اگرچہ ہم ان کی تسبیح کو کانوں سے نہ سُن سکیں اسی لئے قرآن کریم نے ایک جگہ فرمایا ہے وَلَٰكِن لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ، یعنی تم اُن کی تسبیح کو سنتے سمجھتے نہیں۔

سورۂ حشر کی آخری آیات کے فوائد و برکات

ترمذی میں حضرت معقل بن یسارؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو صبح کے وقت تین مرتبہ أَعُوذُ بِاللَّهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، اور اس کے بعد ایک مرتبہ سورۂ حشر کی آخری تین آیتیں هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ، سے آخر سورت تک پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ ستر ہزار فرشتے مقرر فرما دیتے ہیں جو شام تک اس کے لئے رحمت کی دُعاء کرتے رہتے ہیں، اگر اس دن میں وہ مرگیا تو شہادت کی موت حاصل ہوگی، اور جس نے شام کو یہی کلمات تین مرتبہ پڑھ لئے تو یہی درجہ اس کو حاصل ہوگا (مظہری)

تمت

بِعَوْنِ اللّٰهِ تَعَالٰی سُبْحَانَهٗ وَحَمْدِهٖ سُوْرَةُ الْحَشْرِ

لِعَاشِرِ جُمَادَی الْاُوْلٰی سَنَہ ۱۳۹۱ھ ضحا یوم الاحد وَیَتْلُوْهَا اِنْشَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰی سُوْرَةُ الْمُمْتَحِنَةِ

سُوْرَةُ الْمُمْتَحِنَةِ

سُوْرَةُ الْمُمْتَحِنَةِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثَ عَشْرَةَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۃ ممتحنہ مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی تیرہ آیتیں اور دو رکوع ہیں ،

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے ،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ

اے ایمان والو نہ پکڑو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست تم اُن کو

تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ

پیغام بھیجتے ہو دوستی سے اور وہ منکر ہوئے ہیں اس سے جو تمہارے پاس آیا سچا دین ،

يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ۭ اِنْ كُنْتُمْ

نکالتے ہیں رسول کو اور تم کو اس بات پر کہ تم مانتے ہو اللہ کو جو رب ہے تمہارا ، اگر تم نکلے ہو

خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ ۤ ۖ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ

لڑنے کو میری راہ میں اور طلب کرنے کو میری رضامندی تم انکو چھپا کر بھیجتے ہو دوستی کے

بِالْمَوَدَّةِ ڰ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ ۭ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ

پیغام ، اور مجھ کو خوب معلوم ہے جو چھپایا تم نے اور جو ظاہر کیا تم نے اور جو کوئی کرے تم

مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ① اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ

میں یہ کام تو وہ بھول گیا سیدھی راہ ، اگر تم اُن کے ہاتھ آجاؤ ہو جائیں تمہارے

أَعۡدَآءً وَيَبۡسُطُوٓاْ إِلَيۡكُمۡ أَيۡدِيَهُمۡ وَأَلۡسِنَتَهُم بِٱلسُّوٓءِ وَوَدُّواْ لَوۡ

دشمن اور چلائیں تم پر اپنے ہاتھ اور اپنی زبانیں برائی کے ساتھ اور چاہیں کہ کسی

تَكۡفُرُونَ ۝٢ لَن تَنفَعَكُمۡ أَرۡحَامُكُمۡ وَلَآ أَوۡلَٰدُكُمۡۚ يَوۡمَ ٱلۡقِيَٰمَةِ

طرح تم بھی منکر ہو جاؤ، ہرگز کام نہ آئیں گے تمہارے کنبے والے اور نہ تمہاری اولاد قیامت کے دن

يَفۡصِلُ بَيۡنَكُمۡۚ وَٱللَّهُ بِمَا تَعۡمَلُونَ بَصِيرٞ ۝٣ قَدۡ كَانَتۡ لَكُمۡ

وہ فیصلہ کریگا تم میں اور اللہ جو تم کرتے ہو دیکھتا ہے، تم کو چال چلنی چاہئے

أُسۡوَةٌ حَسَنَةٞ فِيٓ إِبۡرَٰهِيمَ وَٱلَّذِينَ مَعَهُۥٓ إِذۡ قَالُواْ لِقَوۡمِهِمۡ إِنَّا

اچھی ابراہیم کی اور جو اس کے ساتھ تھے، جب انھوں نے کہا اپنی قوم کو ہم

بُرَءَٰٓؤُاْ مِنكُمۡ وَمِمَّا تَعۡبُدُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ كَفَرۡنَا بِكُمۡ وَبَدَا

الگ ہیں تم سے اور ان سے کہ جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوائے ہم منکر ہوئے تم سے اور کھل

بَيۡنَنَا وَبَيۡنَكُمُ ٱلۡعَدَٰوَةُ وَٱلۡبَغۡضَآءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤۡمِنُواْ بِٱللَّهِ

پڑی ہم میں اور تم میں دشمنی اور بیر ہمیشہ کو یہاں تک کہ تم یقین لاؤ اللہ

وَحۡدَهُۥٓ إِلَّا قَوۡلَ إِبۡرَٰهِيمَ لِأَبِيهِ لَأَسۡتَغۡفِرَنَّ لَكَ وَمَآ أَمۡلِكُ

اکیلے پر مگر ایک کہنا ابراہیم کا اپنے باپ کو کہ میں مانگوں گا معافی تیرے لئے اور مالک نہیں میں

لَكَ مِنَ ٱللَّهِ مِن شَيۡءٖۖ رَّبَّنَا عَلَيۡكَ تَوَكَّلۡنَا وَإِلَيۡكَ أَنَبۡنَا وَ

تیرے نفع کا اللہ کے ہاتھ سے کسی چیز کا، اے رب ہمارے ہم نے تجھ پر بھروسہ کیا اور تیری طرف رجوع ہوئے

إِلَيۡكَ ٱلۡمَصِيرُ ۝٤ رَبَّنَا لَا تَجۡعَلۡنَا فِتۡنَةٗ لِّلَّذِينَ كَفَرُواْ وَٱغۡفِرۡ

اور تیری طرف ہی سب کو پھر آنا، اے رب ہمارے مت جانچ ہم پر کافروں کو اور ہم کو معاف کر

لَنَا رَبَّنَآۖ إِنَّكَ أَنتَ ٱلۡعَزِيزُ ٱلۡحَكِيمُ ۝٥ لَقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِيهِمۡ

اے رب ہمارے تو ہی ہے زبردست حکمت والا، البتہ تم کو بھلی چال چلنی چاہئے

أُسۡوَةٌ حَسَنَةٞ لِّمَن كَانَ يَرۡجُواْ ٱللَّهَ وَٱلۡيَوۡمَ ٱلۡأٓخِرَۚ وَمَن يَتَوَلَّ

ان کی جو کوئی امید رکھتا ہو اللہ کی اور پچھلے دن کی، اور جو کوئی منہ پھیرے

مع عندالمتاخرین ۱۲ السماع الوقف علی القیمۃ ۷

فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ﴿٦﴾

تو اللہ وہی ہے بے پرواہ سب تعریفوں والا

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو تم میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ کہ ان سے دوستی کا اظہار کرنے لگو (یعنی گو دل سے دوستی نہ ہو مگر ایسا دوستانہ برتاؤ بھی مت کرو) حالانکہ تمہارے پاس جو دین حق آچکا ہے وہ اس کے منکر ہیں (جس سے اُن کا دشمنِ خدا تعالیٰ ہونا معلوم ہوا جو آیت میں بلفظ عَدُوِّیْ بیان کیا گیا) رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اور تم کو اس بناء پر کہ تم اپنے پروردگار اللہ پر ایمان لے آئے شہر بدر کر چکے ہیں (یہ بیان ہے عَدُوَّكُمْ کا، یعنی وہ صرف اللہ کے دشمن نہیں تمہارے بھی دشمن ہیں، غرض ایسے لوگوں سے دوستی مت کرو) اگر تم میرے راستہ میں جہاد کرنے کی غرض سے اور میری رضامندی ڈھونڈنے کی غرض سے (اپنے گھروں سے) نکلے ہو (کفار کی دوستی جس کا حاصل کفار کی رضامندی کی فکر ہے، اور یہ حق تعالیٰ کی رضا جوئی اور اس کے مناسب اعمال کے منافی ہے) تم اُن سے چپکے چپکے دوستی کی باتیں کرتے ہو (یعنی اوّل تو دوستی ہی بُری چیز ہے، پھر خفیہ پیغام بھیجنا جو خصوصی ربط و تعلق کی علامت ہے یہ اور زیادہ بُرا ہے) حالانکہ مجھ کو سب چیزوں کا خوب علم ہے تم جو کچھ چھپا کر کرتے ہو اور جو ظاہر کر کے کرتے ہو (یعنی مثل دوسرے موانع مذکورہ کے یہ امر بھی ان کی دوستی سے مانع ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کی خبر ہے) اور (آگے اس پر وعید ہے کہ) جو شخص تم میں سے ایسا کرے گا وہ راہِ راست سے بہک گیا، (اور انجام گمراہوں کا معلوم ہی ہے آگے اُن کی دشمنی کا بیان ہے کہ وہ تمہارے ایسے سخت دشمن ہیں کہ) اگر ان کو تم پر دسترس ہو جاوے تو (فوراً) اظہارِ عداوت کرنے لگیں اور (وہ اظہارِ عداوت یہ کہ) تم پر بُرائی (اور ضرر رسانی) کے ساتھ دست درازی اور زبان درازی کرنے لگیں (یہ تو دنیوی نقصان ہے) اور (دینی اضرار یہ کہ) وہ اس بات کے متمنی ہیں کہ تم کافر (ہی) ہو جاؤ (پس ایسے لوگ کب قابلِ دوستی ہیں اور اگر تم کو دوستی کے بارے میں اپنے اہل وعیال کا خیال ہو تو خوب سمجھ لو کہ) تمہارے رشتہ دار اور اولاد قیامت کے دن تمہارے (کچھ) کام نہ آویں گے خدا (ہی) تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا اور اللہ تمہارے سب اعمال کو خوب دیکھتا ہے (پس ہر عمل کا فیصلہ ٹھیک کرے گا، پس اگر تمہارے اعمال موجبِ سزا ہوں گے تو اس سزا سے اولاد و ارحام بچا نہ سکیں گے، پھر اُن کی رعایت میں خدا کے حکم کے خلاف کرنا بہت مذموم امر ہے، اور اس سے اموال کا قابلِ رعایت نہ ہونا اور زیادہ ظاہر ہے، آگے حکم مذکور پر تحریض کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ ارشاد ہے کہ) تمہارے لئے

ابراہیم (علیہ السلام) میں اور ان لوگوں میں جو کہ (ایمان واطاعت میں) ان کے شریک حال تھے ایک عمدہ نمونہ ہے
(یعنی اس بارہ میں کفار سے ایسا برتاؤ رکھنا چاہئے، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے متبعین نے کیا)
جبکہ ان سب نے (اوقات مختلفہ میں) اپنی قوم (کے لوگوں) سے کہہ دیا کہ ہم تم سے اور جن کو تم اللہ کے سوا
معبود سمجھتے ہو اُن سے بیزار ہیں (اوقات مختلفہ اس لئے کہا گیا کہ ابراہیم علیہ السلام نے جس وقت اول
یہ بات اپنی قوم سے کہی تھی اس وقت وہ بالکل تنہا تھے، پھر جو جو آپ کے ساتھ ہوتے گئے کفار سے قطع تعلق
قولاً وفعلاً کرتے گئے آگے اس بیزاری کا بیان ہے کہ) ہم تمہارے (یعنی کفار اور ان کے معبودین کے) منکر
ہیں (یعنی تمہارے عقائد اور معبودات کی عبادت کے منکر ہیں، یہ تو تبرّی باعتبار عقیدہ کے ہوئی) اور (تبرّی
باعتبار معاملہ اور برتاؤ کے یہ ہو کہ) ہم میں اور تم میں ہمیشہ کے لئے عداوت اور بغض (زیادہ) ظاہر ہو گیا (کیونکہ
بناء عداوت کی اختلافِ عقائد ہے، اور اب اس کا زیادہ اعلان ہو گیا تو عداوت کا بھی زیادہ اظہار ہو گیا،
عداوت اور بُغض متقارب ہیں اور دونوں کا جمع کرنا تاکید کے لئے ہے اور یہ عداوت ہم کو تم سے ہمیشہ رہے گی)
جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ (غرض ابراہیم علیہ السلام اور ان کے متبعین نے کفار سے صاف قطع
تعلق کر دیا) لیکن ابراہیم (علیہ السلام) کی اتنی بات تو اپنے باپ سے ہوئی تھی (جس سے بظاہر ان کے
ساتھ محبت ودوستی کا احتمال تھا) کہ میں تمہارے لئے استغفار ضرور کروں گا اور تمہارے لئے (استغفار سے زیادہ)
مجھ کو خدا کے آگے کسی بات کا اختیار نہیں (کہ دعاء کو قبول کرا لوں یا باوجود ایمان نہ لانے کے تم کو
عذاب سے بچا لوں، مطلب یہ ہے کہ اتنی بات تو ابراہیم علیہ السلام نے کہی تھی جس کا مطلب تم میں سے
بعض لوگ مطلق استغفار سمجھ گئے حالانکہ یہاں استغفار کے دوسرے معنی ہیں، یعنی اُن کے لئے یہ دعاء کرنا
کہ وہ ایمان لا کر مغفرت کے مستحق بن جائیں جس کی سب کو اجازت ہے اور واقع میں وہ قطع تعلق کے خلاف
بھی نہیں، مگر ظاہری صورتِ تعلق اور ظاہری معنی استغفار کے اعتبار سے صورۃً اس کو مستثنیٰ کیا جاتا ہے،
یہ گفتگو تو ابراہیم کی اپنی قوم سے ہوئی، آگے اُن کی دعاء کا مضمون ہے، یعنی کفار سے قطع تعلق کر کے انہوں
نے اس بارے میں حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ) اے ہمارے پروردگار ہم (کفار سے اعلانِ برأت وعداوت
کے معاملے میں) آپ پر توکل کرتے ہیں اور (آپ ہی ہماری تمام مہمات ومشکلات کی کفالت اور دشمنوں کی
ایذاؤں سے حفاظت فرماویں گے، ونیز ایمان لائیں) آپ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور (اعتقاد رکھتے ہیں)
آپ ہی کی طرف (سب کو) لوٹنا ہے (پس اس اعتقاد کی وجہ سے ہم نے جو کچھ کفار سے اعلانِ برأت کیا ہے
محض خلوص سے کیا ہے، اس میں کوئی دنیوی غرض نہیں، اور اس سے مقصود تفاخر بھی نہیں بلکہ عرضِ
حال بغرضِ سوال ہے اور) اے ہمارے پروردگار ہم کو کافروں کا تختۂ مشق نہ بنا، (یعنی ہم پر اس تبرّی
سے یہ کافر ظلم نہ کرنے پاویں) اور اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہ معاف کر دیجئے بے شک آپ زبردست
حکمت والے ہیں (اور ہر طرح کی آپ کو قدرت حاصل ہے) بے شک ان لوگوں میں (یعنی ابراہیم علیہ السلام

اور ان کے متبعین میں) تمہارے لئے یعنی ایسے شخص کے لئے عمدہ نمونہ ہے جو اللہ (کے سامنے جانے) کا اور قیامت کے دن (کے آنے) کا اعتقاد رکھتا ہو (یعنی یہ اعتقاد مقتضی ہے اس بارہ میں اتباع ابراہیمی کو) اور (آگے دوسرے طرز پر وعید ہی جیسے اس سے پہلے وَمَنْ يَّفْعَلْهُ میں وعید آچکی ہے یعنی) جو شخص (اس حکم سے) روگردانی کریگا سو (اسی کا ضرر ہوگا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ (تو) بالکل بے نیاز اور (بوجہ جامع الکمالات ہونے کے) سزاوار حمد ہے۔

معارف و مسائل

اس سورت کا ابتدائی حصہ کفار و مشرکین سے موالات اور دوستانہ تعلقات رکھنے کی حرمت و ممانعت میں آیا ہے اور اس کے نزول کا ایک خاص واقعہ ہے:-

شانِ نزول تفسیر قرطبی میں قشیری اور ثعلبی کے حوالہ سے مذکور ہے کہ غزوۂ بدر کے بعد فتح مکہ سے پہلے مکہ مکرمہ کی ایک مغنیہ عورت جس کا نام سارہ تھا، پہلے مدینہ طیبہ آئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ کیا تم ہجرت کرکے آئی ہو تو کہا کہ نہیں، آپؐ نے پوچھا کہ کیا پھر تم مسلمان ہو کر آئی ہو؟ اس نے اس کا بھی انکار کیا، آپؐ نے فرمایا کہ پھر یہاں کس غرض سے آئی ہو؟ اس نے کہا کہ آپ لوگ مکہ مکرمہ کے اعلیٰ خاندان کے لوگ تھے، آپ ہی میں میرا گذارہ تھا، اب مکہ کے بڑے سردار تو غزوۂ بدر میں مارے گئے اور آپ لوگ یہاں چلے آئے ہیں، میرا گذارہ مشکل ہوگیا، میں سخت حاجت و ضرورت میں مبتلا ہو کر آپ سے مدد لینے کے لئے یہاں آئی ہوں، آپؐ نے فرمایا کہ تم تو مکہ مکرمہ کی پیشہ ور مغنیہ ہو وہ مکہ کے نوجوان کیا ہوئے (جو تجھ پر روپیہ پیسے کی بارش کیا کرتے تھے) اس نے کہا کہ واقعۂ بدر کے بعد (انکی تقریبات اور جشنِ طرب ختم ہو چکے ہیں) اس وقت سے کسی نے مجھے نہیں بلایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی عبدالمطلب کو اس کی امداد کرنے کی ترغیب دی، انھوں نے اس کو نقد اور پوشاک وغیرہ دے کر رخصت کیا۔

اور یہ وہ زمانہ تھا جب صلح حدیبیہ کے معاہدہ کو کفار قریش نے توڑ ڈالا تھا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار مکہ پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کرکے اس کی خفیہ تیاری شروع کر رکھی تھی، اور یہ دعا بھی کی تھی کہ ہمارا راز اہلِ مکہ پر قبل از وقت فاش نہ ہو، ادھر مہاجرین اولین میں ایک صحابی حاطب بن ابی بلتعہؓ تھے جو اصل سے یمن کے باشندے تھے، مکہ مکرمہ میں آکر مقیم ہوگئے تھے وہاں ان کا کوئی کنبہ قبیلہ نہ تھا وہیں مسلمان ہوگئے، پھر ہجرت کرکے مدینہ طیبہ آگئے، ان کے اہل و عیال بھی مکہ ہی میں تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بہت سے صحابہ کرام کی ہجرت کے بعد مشرکین مکہ اُن مسلمانوں کو جو مکہ مکرمہ میں رہ گئے تھے ستاتے اور پریشان کرتے تھے، جن مہاجرین کے خویش و عزیز مکہ میں موجود تھے، ان کو تو

کسی درجہ میں تحفظ حاصل تھا، حاطبؓ کو یہ فکر تھی کہ میرے اہل و عیال کو دشمنوں کی ایذاؤں سے بچانے والا وہاں کوئی نہیں، انھوں نے اپنے اہل و عیال کے تحفظ کا موقع غنیمت جانا کہ اہلِ مکہ پر کچھ احسان کر دیا جائے تو وہ ان کے بچوں پر ظلم نہ کریں گے۔

ان کو اپنی جگہ یہ یقین تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو حق تعالیٰ فتح ہی عطا فرمائیں گے، آپ کو یا اسلام کو یہ راز فاش کر دینے سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، اگر میں نے ان کو کوئی خط لکھ کر اس کی اطلاع کر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ تم لوگوں پر حملہ کرنے کا ہے تو میرے بچوں کی حفاظت ہو جائیگی، یہ غلطی ان سے ہو گئی کہ ایک خفیہ خط اہلِ مکہ کے نام لکھ کر اس جانے والی عورت سارہ کے سپرد کر دیا (قرطبی و مظہری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے بذریعہ وحی اس معاملہ کی اطلاع دیدی اور یہ بھی آپ کو معلوم ہو گیا کہ وہ عورت اس وقت روضۂ خاخ کے مقام تک پہنچ چکی ہے۔

صحیحین بخاری و مسلم میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اور ابو مرثد اور زبیر بن عوام کو حکم دیا کہ گھوڑوں پر سوار ہو کر اُس عورت کا تعاقب کرو وہ تمھیں روضۂ خاخ میں ملے گی، اور اس کے ساتھ حاطب بن ابی بلتعہ کا خط بنام مشرکینِ مکہ ہے اس کو پکڑ کر وہ خط واپس لے لو، حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ ہم نے حسب الحکم تیزی کے ساتھ تعاقب کیا، اور ٹھیک اسی جگہ جہاں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی اس عورت کو اونٹ پر سوار جاتے ہوئے پکڑ لیا، اور ہم نے کہا کہ وہ خط نکالو جو تمھارے پاس ہے، اس نے کہا کہ میرے پاس کوئی کسی کا خط نہیں۔ ہم نے اس کے اونٹ کو بٹھا دیا اس کی تلاشی لی مگر خط ہمیں ہاتھ نہ آیا، لیکن ہم نے دل میں کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر غلط نہیں ہو سکتی، ضرور اس نے خط کو کہیں چھپایا ہے، تو اب ہم نے اس کو کہا کہ یا تو خط نکال دو ورنہ ہم تمھارے کپڑے اُتر وائیں گے۔

جب اُس نے دیکھا کہ اب ان کے ہاتھ سے نجات نہیں تو اپنے ازار میں سے یہ خط نکالا، ہم یہ خط لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے، حضرت عمر بن خطابؓ نے واقعہ سنتے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اس شخص نے اللہ اور اس کے رسولؐ اور سب مسلمانوں سے خیانت کی کہ ہمارا راز کفار کو لکھ دیا، مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کی گردن مار دوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب بن ابی بلتعہ سے پوچھا کہ تمھیں کس چیز نے اس حرکت پر آمادہ کیا؟ حاطب ابن ابی بلتعہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ میرے ایمان میں اب بھی ذرا فرق نہیں ہے، بات یہ ہی کہ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ میں اہلِ مکہ پر کچھ احسان کر دوں تاکہ وہ میرے اہل و عیال کو کچھ نہ کہیں، میرے سوا دوسرے حضرات مہاجرین میں کوئی ایسا نہیں جس کا کنبہ قبیلہ وہاں موجود نہ ہو جو اُن کے اہل و عیال کی حفاظت کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطبؓ کا بیان سُن کر فرمایا کہ اس نے سچ کہا ہے اس کے معاملہ میں خیر کے سوا کچھ نہ کہو، حضرت فاروق اعظمؓ نے (اپنی غیرتِ ایمانی سے) پھر اپنی بات دُہرائی اور اُن کے قتل کی اجازت مانگی، آپؐ نے فرمایا کہ کیا یہ اہلِ بدر (یعنی غزوۂ بدر کے شرکاء) میں سے نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے سب شرکاء غزوۂ بدر کی مغفرت کا اور ان کے لئے وعدۂ جنت کا اعلان فرما دیا ہے، یہ سُن کر حضرت فاروق اعظمؓ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ ہی حقیقت کا علم رکھتے ہیں (یہ بخاری کی روایت کتاب المغازی غزوۂ بدر میں ہے، از ابن کثیر) اور بعض روایات میں حاطبؓ کا یہ قول بھی ہے کہ میں نے یہ کام اسلام اور مسلمانوں کو ضرر پہونچانے کے لئے ہرگز نہیں کیا، کیونکہ میرا یقین تھا کہ آپ کو فتح ہی ہوگی، اہلِ مکہ کو خبر بھی ہوگئی تو آپ کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

اس واقعہ کی بناء پر سورۂ ممتحنہ کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن میں اس واقعہ پر سرزنش اور تنبیہ اور مسلمانوں کو کفار کے ساتھ کسی قسم کے دوستانہ تعلق رکھنے کو حرام قرار دیا گیا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ یعنی اے ایمان والو! میرے دشمن اور اپنے دشمن کو دوست نہ بناؤ کہ تم اُن کو دوستی کے پیغام دو، اس میں اسی واقعۂ مذکورہ کیطرف اشارہ ہو کہ اس طرح کا خط کفار کو لکھنا ان کو دوستی کا پیغام دینا ہے، اور آیت میں لفظ کفار کو چھوڑ کر عَدُوِّيْ اور عَدُوَّكُمْ کا عنوان اختیار کرنے میں اوّل تو اس حکم کی علت اور دلیل کی طرف اشارہ ہوگیا کہ اپنے اور خدا کے دشمنوں سے دوستی کی توقع رکھنا سخت دھوکہ ہو اس سے بچو، دوسرے اس طرف بھی اشارہ ہوگیا کہ کافر جب تک کافر ہے وہ کسی مسلمان کا جب تک کہ وہ مسلمان ہے دوست نہیں ہوسکتا، وہ خدا کا دشمن ہے تو مسلمان جو خدا کی محبت کا دعویدار ہو اس سے اس کی دوستی کیسی ہوسکتی ہے۔

وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ، حق سے مراد قرآن یا اسلام ہے، اس آیت میں ان کا کفر جو اصل سبب ہے عداوت کا اس کا بیان کرنے کے بعد ان کی ظاہری عداوت کو بھی بتلایا کہ انھوں نے تم کو اور تمہارے رسولؐ کو ان کے وطن عزیز سے نکالا اور اس نکالنے کی وجہ کوئی دنیاوی سبب نہ تھا بلکہ صرف تمہارا ایمان اس کا سبب تھا، تو یہ بات کھل گئی کہ جب تک تم مؤمن ہو وہ تمہارے دوست نہیں ہوسکتے، اشارہ اس بات کی طرف ہو کہ جیسا حاطبؓ نے خیال کیا تھا کہ اُن پر کچھ احسان کر دوں گا تو وہ میرے اہل و عیال کی حفاظت کریں گے، یہ خیال غلط ہے، کیونکہ وہ تمہارے دشمن ایمان کی وجہ سے ہیں، جب تک خدانخواستہ تمہارا ایمان سلب نہ ہوجاوے ان سے کسی دوستی و تعلق کی توقع رکھنا دھوکہ ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ، اس میں بھی اشارہ اس طرف ہے کہ اگر تمہاری ہجرت واقعی اللہ کے لئے اور اس کی رضاجوئی کے لئے تھی تو کسی کافر دشمنِ خدا سے اس کی

کیسے توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ تمہاری کوئی رعایت کرے۔

تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ، اس میں یہ بھی بتلا دیا کہ جو لوگ کفار سے خفیہ دوستی رکھیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ ان کی یہ حرکت پوشیدہ رہ جائے گی، اللہ تعالیٰ کو اُن کے چھپے اور کھلے ہر حال اور عمل کی خبر ہے، جیسا کہ واقعۂ مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی خبردار کرکے سازش کو پکڑوا دیا۔

اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّيَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ یعنی ان لوگوں سے یہ امید رکھنا کہ وہ موقع پانے کے باوجود تمہارے ساتھ کوئی رواداری برتیں گے اس کا کوئی امکان نہیں، ان کو جب کبھی تم پر غلبہ حاصل ہوگا تو اُن کے ہاتھ اور زبان تمہاری بُرائی اور خرابی کے سوا کسی چیز کی طرف نہ اٹھیں گے۔

وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ، اس میں اشارہ ہے کہ جب تم اُن سے دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ گے تو ان کی دوستی صرف تمہارے ایمان کی قیمت پر رہو گی، جب تک تم کفر میں مبتلا نہ ہو جاؤ، وہ کبھی تم سے راضی نہ ہوں گے۔

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ" یعنی قیامت کے روز تمہارے رشتے ناتے اور تمہاری اولاد تمہارے کام نہ آئیں گے، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز یہ سب تعلقات ختم کر دیں گے، اولاد ماں باپ سے اور ماں باپ اولاد سے بھاگتے پھریں گے، اس میں حضرت حاطبؓ کے عذر کی تردید ہے کہ جس اولاد کی محبت میں مبتلا ہو کر یہ کام کیا تھا سمجھ لو کہ قیامت کے دن وہ اولاد تمہارے کچھ کام نہ آئے گی، اور اللہ تعالیٰ سے کوئی راز اور خفیہ چیز چھپنے والی نہیں۔

اگلی آیات میں کفار سے ترک موالات کی تائید و تاکید کے لئے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے کہ اُن کا تو سارا خاندان مشرکین کا تھا، انھوں نے سب سے بیزاری اور براءت کا ہی نہیں بلکہ عداوت کا اعلان کر دیا، اور بتلا دیا کہ جب تک تم ایک اللہ پر ایمان نہ لاؤ گے اور اپنے شرک سے باز نہ آؤ گے ہمارے تمہارے درمیان بغض وعداوت کی دیوار حائل رہے گی، قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ (تا) حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ کا یہی مطلب ہے۔

ایک شبہ کا جواب

اوپر کی آیت میں مسلمانوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اُسوۂ حسنہ اور سنت پر چلنے کی تاکید فرمائی گئی ہے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اپنے والد مشرک کے لئے استغفار کرنا ثابت ہے، جس کا ذکر سورۃ توبہ وغیرہ میں آیا ہے تو اتباع سنتِ ابراہیمی کے حکم سے کسی کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ اپنے مشرک والدین یا عزیزوں کے لئے دعاءِ مغفرت کرنا بھی اس میں داخل ہے، یہ جائز ہونا چاہئے، اس لئے اس اسوۂ ابراہیمی کے اتباع سے اس کو مستثنیٰ کرکے فرما دیا کہ اور سب چیزوں میں اسوۂ ابراہیمی کا اتباع لازم ہے، مگر ان کے اس فعل کی اقتدا ء

مسلمانوں کے لئے جائز نہیں کہ مشرک والدین اور عزیزوں کے لئے دعائے مغفرت کرنے لگیں، آیت اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ، کا یہی مطلب ہے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عذر سورۃ توبہ میں آچکا ہے کہ انہوں نے باپ کے لئے استغفار کا وعدہ ممانعت سے پہلے کر لیا تھا، یا اس گمان پر کر لیا تھا کہ اس کے دل میں ایمان آگیا ہے، جب معلوم ہوا کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو اس سے بھی براءت و بیزاری کا اعلان کر دیا، فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ الآیۃ، کا یہی مطلب ہے۔

اور بعض حضرات مفسرین نے اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ کے استثناء کو استثناء منقطع قرار دیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ کے لئے استغفار اس اُسوۂ ابراہیمی کے منافی نہیں کیونکہ انہوں نے اس بناء پر استغفار کر لیا تھا کہ انہوں نے گمان کیا تھا کہ وہ مسلمان ہو گیا، پھر جب حقیقت معلوم ہوگئی تو استغفار چھوڑ دیا اور براءت و بیزاری کا اعلان فرما دیا، اور ایسا کرنا اب بھی جائز ہے، کہ جس شخص کو کسی کافر کے متعلق گمان غالب یہ ہو جائے کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے، اس کے استغفار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں (قرطبی) خلاصۂ تفسیر مذکور میں بھی اسی صورت کو اختیار کر کے تفسیر کی گئی ہے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ۭ

امید ہے کہ کر دے اللہ تم میں اور جو دشمن ہیں تمہارے ان میں دوستی،

وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ

اور اللہ سب کچھ کر سکتا ہے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے، اللہ تم کو منع نہیں کرتا ان لوگوں سے

لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ

جو لڑے نہیں تم سے دین پر اور نکالا نہیں تم کو تمہارے گھروں سے کہ ان سے کرو بھلائی اور

وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ

انصاف کا سلوک بیشک اللہ چاہتا ہے انصاف والوں کو، اللہ تو منع کرتا ہے تم کو ان سے

الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓي

جو لڑے تم سے دین پر اور نکالا تم کو تمہارے گھروں سے اور شریک ہوئے تمہارے

اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

نکالنے میں کہ ان سے کرو دوستی اور جو کوئی اُن سے دوستی کرے سو وہ لوگ وہی ہیں گنہگار،

خلاصۂ تفسیر

(اور چونکہ ان کی عداوت سن کر مسلمانوں کو فکر ہوسکتی تھی کچھ قطع قرابات سے طبعًا رنج ہوسکتا تھا، اس لئے بطور بشارت کے آگے پیشنگوئی فرماتے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ سے امید ہے (یعنی ادھر سے وعدہ ہے) کہ تم میں اور ان لوگوں میں جن سے تمہاری عداوت ہے دوستی کردے (گو بعض ہی سے سہی، یعنی ان کو مسلمان کردے جس سے عداوت مبدّل بہ صداقت ہوجاوے) اور (اس کو کچھ بعید نہ سمجھو کیونکہ) اللہ کو بڑی قدرت ہے (چنانچہ فتح مکہ کے روز بہت آدمی خوشی سے مسلمان ہوگئے، مطلب یہ کہ اوّل تو اگر قطع تعلق ہمیشہ کے لئے ہوتا تب بھی بوجہ مامور بہ ہونے کے واجب العمل تھا، پھر خاص کر جبکہ تھوڑی ہی مدت کے لئے کرنا پڑی اور پھر مشارکت فی الایمان سے دوستی اور تعلق بدستور عود کر آوے تو کوئی فکر کی بات نہیں) اور (ابتک جو کسی سے اس حکم کے خلاف خطا ہوگئی ہو جس سے اب وہ تائب ہوچکا ہے تو) اللہ تعالیٰ (اس کے لئے) غفور رحیم ہے (اور یہاں تک تو دوستانہ تعلقات کی نسبت حکم فرمایا تھا کہ ان کا قطع واجب ہے آگے محسنانہ تعلقات کے حکم کی تفصیل فرماتے ہیں وہ یہ کہ) اللہ تعالیٰ تم کو اُن لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا (مراد وہ کافر ہیں جو ذمی یا مصالح ہوں، یعنی محسنانہ برتاؤ ان سے جائز ہے، باقی رہا عدل و انصاف کا منصفانہ برتاؤ تو اس میں ذمی یا مصالح کی شرط نہیں بلکہ وہ تو ہر کافر بلکہ جانور کے ساتھ بھی واجب ہے، اس آیت میں عدل وانصاف سے مراد محسنانہ برتاؤ کرنا ہے، اس لئے مصالحین کے ساتھ مخصوص کیا گیا) اللہ تعالیٰ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں (البتہ) صرف ان لوگوں کے ساتھ دوستی (یعنی برّ واحسان) کرنے سے اللہ تعالیٰ تم کو منع کرتا ہے جو تم سے دین کے بارے میں لڑے ہوں (خواہ بالفعل یا بالعزم) اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ہو اور (اگر نکالا نہ بھی ہو لیکن) تمہارے نکالنے میں (نکالنے والوں کی) مدد کی ہو (یعنی اُن کے ساتھ شریک ہوں خواہ ان کے عمل میں شرکت کی ہو یا عزم و ارادہ اس کا رکھتے ہوں اس میں وہ سب کافر آگئے جن سے مسلمانوں کا کوئی معاہدہ صلح کا یا عقد ذمّہ نہیں تھا، ان کے ساتھ برّ واحسان کا معاملہ جائز نہیں بلکہ ان سے جنگ اور مقابلہ مطلوب ہے) اور جو شخص ایسوں سے دوستی (کا برتاؤ یعنی برّ واحسان کا برتاؤ) کرے گا سو وہ لوگ گنہگار ہوں گے۔

معارف ومسائل

سابقہ آیات میں کفار سے دوستانہ تعلق رکھنے کی سخت ممانعت وحرمت کا بیان آیا ہے اگرچہ وہ کفار رشتہ وقرابت میں کتنے ہی قریب ہوں، صحابۂ کرام اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے احکام کے

معاملہ میں نہ ذاتی خواہش کی پرواہ کرتے تھے نہ کسی خویش وعزیز کی، اس پر عمل کیا گیا، جس کے نتیجہ میں گھر گھر یہ صورت پیش آئی کہ باپ مسلمان بیٹا کافر یا اس کے برعکس ہے تو دوستانہ تعلق قطع کر دیا گیا، ظاہر ہے انسانی فطرت اور طبیعت پر یہ عمل آسان نہ تھا، اس لئے آیاتِ مذکورہ میں حق تعالیٰ نے ان کی اس مشکل کو عنقریب آسان کر دینے کی خبر سُنادی۔

بعض روایات حدیث میں ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ جب اللہ کی رضا جوئی کے لئے اپنی کسی محبوب چیز کو چھوڑتا ہے تو بعض اوقات اللہ تعالیٰ اسی چیز کو حلال کر کے اس تک پہونچا دیتے ہیں، اور بعض اوقات اس سے بہتر چیز عطا فرما دیتے ہیں

ان آیات میں حق تعالیٰ نے اس طرف اشارہ فرما دیا کہ آج جو لوگ کفر پر ہیں اور اس کی وجہ سے وہ تمہارے دشمن تم ان کے دشمن ہو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عداوت کو دوستی سے مبدل فرما دے، مطلب یہ ہے کہ اُن کو ایمان کی توفیق عطا فرما کر تمہارے تعلقات باہمی کو پھر از سر نو ہموار کر دے، اس پیشینگوئی کا ظہور فتح مکہ کے وقت اس طرح ہوا کہ بجز اُن کفار کے جو قتل کئے گئے اور سب مسلمان ہوگئے (مظہری) قرآن کریم میں اس کا بیان يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ..... میں کیا گیا ہے، کہ یہ لوگ فوج فوج بڑی تعدادوں میں اللہ کے دینِ اسلام میں داخل ہو جائیں گے، اور ایسا ہی ہوا۔

صحیح بخاری میں حضرت اسماء بنتِ ابی بکر صدیق رضؓ سے روایت ہے کہ اُن کی والدہ بحالتِ کفر مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ پہونچیں (مسند احمد کی روایت میں ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جبکہ غزوۂ حُدیبیہ کے بعد قریش مکہ سے معاہدۂ صلح ہو گیا تھا اور ان کی والدہ کا نام قُتَیْلَہ ہے، یہ اپنی بیٹی اسماءؓ کے لئے کچھ تحفے ہدیے لے کر مدینہ پہونچیں تو حضرت اسماءؓ نے ان کے تحفے قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور اپنے گھر میں آنے کی بھی اجازت اس وقت تک نہ دی جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت نہ کر لیا) غرض حضرت اسماءؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میری والدہ مجھ سے ملنے کے لئے آئی ہیں اور وہ کافر ہیں میں ان کے ساتھ کیا سلوک کروں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی والدہ کی صلہ رحمی کرو یعنی ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں، لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ۔

بعض روایات میں ہے کہ حضرت اسماء کی والدہ قُتَیْلَہ کو صدیق اکبرؓ نے زمانۂ جاہلیت میں طلاق دیدی تھی، حضرت اسماءؓ اس کے بطن سے تھیں اور ان کی بہن ام المومنین حضرت عائشہؓ صدیق اکبرؓ کی دوسری بیوی اُمّ رومان کے بطن سے تھیں، یہ مسلمان ہوگئی تھیں۔ (ابن کثیر و مظہری)

اس آیت میں ایسے کفار جنھوں نے مسلمانوں سے مقاتلہ نہیں کیا، اور ان کے گھروں سے نکالنے میں بھی کوئی حصہ نہیں لیا ان کے ساتھ احسان کے معاملہ اور اچھے سلوک اور عدل و انصاف کرنے کی

ہدایت دی گئی ہے، عدل وانصاف تو ہر کافر کے ساتھ ضروری ہے، جس میں کافر ذمی اور مصالح اور کافر حربی ودشمن سب برابر ہیں، بلکہ اسلام میں تو عدل وانصاف جانوروں کے ساتھ بھی واجب ہے کہ ان کی طاقت سے زیادہ بار اُن پر نہ ڈالے اور اُن کے چارے اور آرام کی نگہداشت رکھے، اس آیت میں اصل مقصود برّ واحسان کرنے کی ہدایت ہے۔

مسئلہ: اس آیت سے ثابت ہوا کہ نفلی صدقات ذمی اور مصالح کافر کو بھی دیئے جاسکتے ہیں صرف کافر حربی کو دینا ممنوع ہے۔

اِنَّمَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ قٰتَلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ (الیٰ) اَنْ تَوَلَّوْھُمْ، اس آیت میں اُن کفار کا بیان ہے جو مسلمانوں کے مقابلہ میں جنگ وقتال کر رہے ہوں، اور مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکالنے میں کوئی حصہ لے رہے ہوں، اُن کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اُن کے ساتھ موالات اور دوستی سے منع فرماتا ہے، اس میں برّ واحسان کا معاملہ کرنے کی ممانعت نہیں، بلکہ صرف قلبی دوستی اور دوستانہ تعلقات کی ممانعت ہے، اور یہ ممانعت کچھ ان میں برسرِ پیکار دشمنوں کے ساتھ نہیں بلکہ اہل ذمہ اور اہل صلح کافروں کے ساتھ بھی قلبی موالات اور دوستی جائز نہیں، اس سے تفسیر مظہری میں یہ مسئلہ نکالا ہے کہ حربی یعنی برسرِ جنگ کفار کے ساتھ عدل وانصاف تو اسلام میں ضروری ہے ہی، اور ممانعت صرف موالات یعنی دوستی کی کی گئی، برّ واحسان کی ممانعت نہیں کی گئی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محسنانہ سلوک برسرِ پیکار دشمنوں کے ساتھ بھی جائز ہے، البتہ دوسری نصوص کی بنا پر یہ شرط ہے کہ ان کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنے سے مسلمانوں کو کسی نقصان وضرر کا خطرہ نہ ہو، جہاں یہ خطرہ ہو وہاں برّ واحسان اُن پر جائز نہیں، ہاں عدل وانصاف ہر حال میں ہر شخص کیلئے ضروری اور واجب ہے واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا جَآءَکُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُھٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْھُنَّ ؕ

اے ایمان والو جب آئیں تمہارے پاس ایمان والی عورتیں وطن چھوڑ کر تو ان کو جانچ لو

اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِھِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْھُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْھُنَّ

اللہ خوب جانتا ہے ان کے ایمان کو پھر اگر جانو کہ وہ ایمان پر ہیں تو مت پھیرو اُن کو

اِلَی الْکُفَّارِ ؕ لَا ھُنَّ حِلٌّ لَّھُمْ وَلَا ھُمْ یَحِلُّوْنَ لَھُنَّ ؕ وَاٰتُوْھُمْ

کافروں کی طرف نہ یہ عورتیں حلال ہیں اُن (کافروں) کو اور نہ وہ (کافر) حلال ہیں ان عورتوں کو، اور دیدو اُن (کافروں)

مَّاۤ اَنْفَقُوْا ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ اَنْ تَنْکِحُوْھُنَّ اِذَاۤ اٰتَیْتُمُوْھُنَّ

کو جو اُن کا خرچ ہوا ہو اور گناہ نہیں تم کو کہ نکاح کر لو ان عورتوں سے جب اُن کو دو

أُجُورَهُنَّ ۚ وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَاسْأَلُوا مَا أَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْأَلُوا مَا أَنْفَقُوا ۚ ذَٰلِكُمْ

انکے مہر، اور نہ رکھو اپنے قبضہ میں ناموس کافر عورتوں کے اور تم مانگ لو جو تم نے خرچ کیا اور وہ (کافر) مانگ لیں جو انھوں نے خرچ کیا، یہ

حُكْمُ اللَّهِ ۖ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿١٠﴾ وَإِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ

اللہ کا فیصلہ ہے تم میں فیصلہ کرتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے ؛ اور اگر جاتی رہیں تمھارے ہاتھ سے

مِنْ أَزْوَاجِكُمْ إِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَآتُوا الَّذِينَ ذَهَبَتْ أَزْوَاجُهُمْ

کچھ عورتیں کافروں کی طرف پھر تم ہاتھ مارو تو دیدو اُن کو جن کی عورتیں جاتی رہی ہیں جتنا

مِثْلَ مَا أَنْفَقُوا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي أَنْتُمْ بِهِ مُؤْمِنُونَ ﴿١١﴾ يَا أَيُّهَا

انھوں نے خرچ کیا تھا، اور ڈرتے رہو اللہ سے جس پر تم کو یقین ہے ، اے نبی

النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ أَنْ لَا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا

جب آئیں تیرے پاس مسلمان عورتیں بیعت کرنے کو اس بات پر کہ شریک نہ ٹھیرائیں اللہ کا کسی کو

وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ

اور چوری نہ کریں اور بدکاری نہ کریں اور اپنی اولاد کو نہ مار ڈالیں، اور طوفان نہ لائیں

يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ

باندھ کر اپنے ہاتھوں اور پاؤں میں اور تیری نافرمانی نہ کریں کسی بھلے کام میں

فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٢﴾ يَا أَيُّهَا

تو تُو ان کو بیعت کرلے اور معافی مانگ اُن کے واسطے اللہ سے بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے ، اے

الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَئِسُوا مِنَ

ایمان والو مت دوستی کرو اُن لوگوں سے کہ غصہ ہوا ہے اللہ اُن پر وہ آس توڑ چکے ہیں پچھلے

الْآخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ أَصْحَابِ الْقُبُورِ ﴿١٣﴾

گھر سے جیسے آس توڑی منکروں نے قبر والوں سے ؛ ؛ ؛

ع ۲ ۷ ۸ النصف

خلاصۂ تفسیر

سببِ نزول کا واقعہ (یہ آیتیں بھی ایک خاص موقع کے متعلق ہیں اور وہ موقع صلح حدیبیہ کا ہے،

جس کا بیان آغاز سورۃ فتح میں ہوا ہے، منجملہ ان شرطوں کے جو صلح نامہ میں لکھی گئی تھیں ایک شرط یہ بھی تھی کہ جو شخص مسلمانوں میں سے کافروں کی طرف چلا جاوے وہ واپس نہ دیا جاوے، اور جو شخص کافروں میں سے مسلمانوں کی طرف چلا جاوے وہ واپس دیدیا جاوے، چنانچہ بعض مسلمان مرد آئے اور واپس کر دیئے گئے پھر بعضی عورتیں مسلمان ہو کر آئیں، ان کے اقارب نے ان کی واپسی کی درخواست کی، اس پر یہ آیتیں حدیبیہ میں نازل ہوئیں، جس میں عورتوں کے واپس کرنے کی ممانعت کی گئی، پس عموم مضمون صلح نامہ کا اس سے مخصوص اور منسوخ ہو گیا، اور ایسی عورتوں کے باب میں کچھ خاص احکام مقرر کئے گئے، اور اُن کے ساتھ کچھ احکام ایسی عورتوں کے باب میں مقرر ہوئے جو پہلے مسلمانوں کے نکاح میں تھیں مگر اسلام نہ لائیں اور مکہ ہی میں رہ گئیں اور چونکہ مدار ان احکام کا ان عورتوں کا مسلمان ہونا ہے، اس لئے طریق امتحان بھی بتلایا گیا، پس بخطاب عام ارشاد فرماتے ہیں کہ) اے ایمان والو جب تمہارے پاس مسلمان عورتیں (دار الحرب سے) ہجرت کر کے آویں، (خواہ مدینہ میں کہ دار الاسلام ہے خواہ حدیبیہ میں کہ معسکر اسلام حکم دار الاسلام میں ہے کذا فی کتاب الحدود من الہدایۃ) تو تم ان (کے مسلمان ہونے) کا امتحان کر لیا کرو (جس کا طریقہ آگے خطاب خاص یٰاَیُّہَا النَّبِیُّ میں آتا ہے اور اس امتحان میں ظاہری امتحان پر اکتفاء کیا کرو کیونکہ) اُن کے (حقیقی) ایمان کو (تو) اللہ ہی خوب جانتا ہے (تم کو تحقیق ہو ہی نہیں سکتا) پس اگر ان کو (اس امتحان کی رُو سے) مسلمان سمجھو تو ان کو کفار کی طرف واپس مت کرو (کیونکہ) نہ تو وہ عورتیں ان کافروں کے لئے حلال ہیں اور نہ وہ کافر اُن عورتوں کے لئے حلال ہیں (کیونکہ مسلمان عورت کا نکاح کافر مرد سے مطلقاً نہیں رہتا) اور (اس صورت میں) ان کافروں نے جو کچھ (مہر کے بابت ان عورتوں پر) خرچ کیا ہو وہ ان کو ادا کر دو اور تم کو ان عورتوں سے نکاح کرنے میں کچھ گناہ نہ ہوگا جبکہ تم اُن کے مہر ان کو دیدو اور (اے مسلمانو) تم کافر عورتوں کے تعلقات کو باقی مت رکھو (یعنی جو تمہاری بیبیاں دار الحرب میں کفر کی حالت میں رہ گئیں اُن کا نکاح تم سے زائل ہو گیا، اُن کے تعلقات کا کوئی اثر باقی مت سمجھو) اور (اس صورت میں) جو کچھ تم نے (اُن عورتوں کے مہر میں) خرچ کیا ہو (ان کافروں سے) مانگ لو اور (اسی طرح) جو کچھ ان کافروں نے (مہر کے بابت) خرچ کیا ہو وہ (تم سے) مانگ لیں (جیسا اوپر ارشاد ہوا ہے وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا، شاید یہ تکریر مُعَنْوَنْ باختلاف عنوان اس لئے ہو کہ تمہارے ذمہ جو دوسروں کا حق ہو اس کو زیادہ مؤکد سمجھو) یہ (جو کچھ کہا گیا) اللہ کا حکم ہے (اس کا اتباع کرو) وہ تمہارے درمیان (ایسا ہی مناسب) فیصلہ کرتا ہے اور اللہ بڑا علم اور حکمت والا ہے (علم و حکمت کے مناسب احکام مقرر فرماتا ہے) اور اگر تمہاری بیبیوں میں سے کوئی بی بی کافروں میں رہ جانے سے (بالکل ہی) تمہارے ہاتھ نہ آئے (یعنی وہ نہ ملے اور نہ اس کا بدلِ مہر ملے اور) پھر (کافروں کو مہر دینے کی) تمہاری نوبت آوے (یعنی تمہارے ذمہ کسی کافر کا حقِ مہر واجب الادا ہو) تو (تم وہ مہر اُن کافروں کو نہ دو، بلکہ جن (مسلمانوں) کی بیبیاں ہاتھ سے نکل گئیں (جن کا ابھی ذکر ہوا فاتکم میں) جتنا (مہر) انھوں نے

(ان بیبیوں پر) خرچ کیا تھا اس کے برابر (اس رقم واجب الاداء میں سے) تم ان کو دیدو اور اللہ سے کہ جس پر تم ایمان رکھتے ہو ڈرتے رہو (اور احکام واجبہ میں خلل مت ڈالو، آگے خطاب خاص میں طریق امتحان ایمان کا فرماتے ہیں کہ) اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) جب مسلمان عورتیں آپ کے پاس (اس غرض سے) آویں کہ آپ سے ان باتوں پر بیعت کریں کہ اللہ کے ساتھ کسی شے کو شریک نہ کریں گی اور نہ چوری کرینگی اور نہ بدکاری کریں گی اور نہ اپنے بچوں کو قتل کریں گی اور نہ کوئی بہتان کی اولاد لاویں گی جس کو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان (نطفۂ شوہر سے جنی ہوئی اولاد ہونے کا دعویٰ کرکے) بنا لیویں (جیسا جاہلیت میں بعض عورتوں کا دستور تھا کہ کسی غیر کا بچہ اٹھالائیں اور کہہ دیا کہ میرے خاوند کا ہے، اور یا کسی سے بدکاری کی اور اس نطفۂ حرام کو اپنے خاوند کا بتلا دیا کہ اس میں علاوہ گناہ زنا کے اپنے شوہر کے ساتھ غیر کے بچے کا الحاق بھی ہے، جس پر حدیث میں بھی وعید آئی ہے، رواہ ابوداؤد والنسائی) اور مشروع باتوں میں وہ آپ کے خلاف نہ کریں گی (اس میں سب احکام شرعیہ آگئے، پس وہ عورتیں اگر ان شرطوں کو قبول کرلیں جن کا اعتقاد شرط ایمان ہے اور التزام عمل شرط کمالِ ایمان ہے) تو آپ ان کو بیعت کرلیا کیجئے اور ان کے لئے اللہ سے (پچھلے گناہوں کی) مغفرت طلب کیا کیجئے، بیشک اللہ غفور رحیم ہے (مطلب یہ کہ جب ان احکام کے حق اور واجب العمل سمجھنے کا اظہار کریں تو ان کو مسلمان سمجھئے، اور ہر چند کہ خود اسلام ہی سے پچھلے گناہوں کی مغفرت ہوجاتی ہے، مگر یہاں استغفار کا حکم یا تو مکمل طور پر آثارِ مغفرت حاصل کرنے کے لئے ہے، اور یا حاصل اس کا دعا ہے، قبولِ ایمان کی جس پر مغفرت مرتب ہوتی ہے) اے ایمان والو! ان لوگوں سے (بھی) دوستی مت کرو جن پر اللہ تعالیٰ نے غضب فرمایا ہے (مراد اس سے یہود ہیں، لقولہ تعالیٰ فی المائدۃ، مَنۡ لَّعَنَہُ اللّٰہُ وَغَضِبَ عَلَیۡہِ الآیۃ) کہ وہ آخرت کے (خیر و ثواب) سے ایسے ناامید ہوگئے ہیں جیسا کفار جو قبروں میں (مدفون) ہیں (خیر و ثوابِ آخرت سے) ناامید ہیں (جو کافر مرجاتا ہے بوجہ اس کے کہ اس کو معاینہ آخرت کا ہوجاتا ہے، حقیقتِ امر پر یقین کے ساتھ مطلع ہوجاتا ہے کہ اب میری بخشش ہرگز نہ ہوگی، چونکہ حسبِ آیت یَعۡرِفُوۡنَہٗ کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَہُمۡ آپ کی نبوت کو اور اسی طرح مخالفِ نبی کے کافر اور غیر ناجی ہونے کو خوب جانتے ہیں، گو عار و حسد کی وجہ سے اتباع نہ کرتے تھے، اس لئے ان کو دل سے یقین تھا کہ ہم ناجی نہیں ہیں، گو شیخی کے مارے ظاہراً اس کے خلاف کرتے ہوں، پس حاصل یہ ہوا کہ جن کی گمراہی ایسی مسلّم ہے کہ وہ خود بھی دل سے اس کو تسلیم کرتے ہیں ایسے گمراہوں سے تعلق رکھنا کیا ضرور، اور یہ نہ سمجھا جاوے کہ جو گمراہ اشد درجہ کا نہ ہو اس سے دوستی جائز ہے، جوازِ دوستی سے تو مطلق کفر مانع ہے، مگر اس صفت سے وہ عدمِ جواز اور شدید ہوجاوے گا، اور شاید تخصیص یہود کی اس جگہ اس لئے ہو کہ مدینہ میں یہود زیادہ تھے اور دوسرے وہ لوگ شریر و مفسد بھی بہت تھے)۔

معارف و مسائل

معاہدۂ صلح حدیبیہ کی بعض شرائط کی تحقیق، سورۃ فتح میں حُدَیبیہ کا واقعہ تفصیل سے آچکا ہے، جس میں بالآخر قریش مکہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک معاہدۂ صلح دس سال کے لئے لکھا گیا اس معاہدہ کی بعض شرائط ایسی تھیں جن میں دب کر صلح کرنے اور مسلمانوں کی بظاہر مغلوبیت محسوس ہوتی تھی، اسی لئے صحابۂ کرام میں اس پر غم و غصہ کا اظہار ہوا، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باشاراتِ ربانی یہ محسوس فرما رہے تھے کہ اس وقت کی چندروزہ مغلوبیت بالآخر ہمیشہ کے لئے فتح مبین کا پیش خیمہ بننے والی ہے، اس لئے قبول فرمالیا، اور پھر سب صحابۂ کرام بھی مطمئن ہوگئے۔

اس صلح نامہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر مکہ مکرمہ سے کوئی آدمی مدینہ جائے گا تو آپؐ اس کو واپس کردیں گے، اگرچہ وہ مسلمان ہی ہو، اور اگر مدینہ طیبہ سے کوئی مکہ مکرمہ چلا جائے گا تو قریش مکہ اس کو واپس نہ کریں گے، اس معاہدہ کے الفاظ عام تھے جس میں بظاہر مرد و عورت دونوں داخل تھے، یعنی کوئی مسلمان مرد یا عورت جو بھی مکہ مکرمہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جائے اس کو آپؐ واپس کریں گے۔

جس وقت یہ معاہدہ مکمل ہوچکا اور ابھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقامِ حدیبیہ میں تشریف فرما تھے کئی ایسے واقعات پیش آئے جو مسلمانوں کے لئے بہت صبر آزما تھے، جن میں ایک واقعہ ابوجندلؓ کا ہے، جن کو قریش مکہ نے قید میں ڈالا ہوا تھا، وہ کسی طرح ان کی قید سے چھوٹ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہونچ گئے، صحابۂ کرام میں اُن کو دیکھ کر سخت تشویش پھیلی کہ معاہدہ کی رُو سے اُن کو واپس کیا جانا چاہئے، اور ہم اپنے مظلوم بھائی کو پھر ظالموں کے ہاتھ میں دیدیں' یہ کیسے ہوگا؟

مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معاہدہ تحریر فرماچکے تھے اور اصولِ شریعت کی حفاظت اور اُن پر پختگی کو ایک فرد کی وجہ سے نہیں چھوڑ سکتے تھے، اور اس کے ساتھ آپؐ کی چشمِ بصیرت عنقریب ان سب مظلوموں کی فاتحانہ نجات کا بھی گویا مشاہدہ کر رہی تھی، طبعی رنج و تکلیف تو ابوجندل کی واپسی میں آپؐ کو بھی یقیناً ہوگی، مگر آپؐ نے معاہدہ کی پابندی کی بناء پر اُن کو سمجھا بجھا کر رخصت کردیا۔

اسی کے ساتھ ایک دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ سعیدہ بنت الحارث الاسلمیہؓ جو مسلمان تھیں مگر صیفی بن انصب کے نکاح میں تھیں جو کافر تھا، بعض روایات میں اس کا نام مسافر المخزومی بتلایا گیا ہے (اس وقت تک مسلمانوں اور کفار میں رشتہ مناکحت طرفین سے حرام نہیں ہوا تھا) یہ مسلمان عورت مکہ سے بھاگ کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوگئیں، ساتھ ہی ان کا شوہر حاضر ہوا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا کہ میری عورت مجھے واپس کی جائے، کیونکہ آپؐ نے یہ شرط قبول کرلی ہے اور ابھی تک اس معاہدہ کی مہر بھی خشک نہیں ہوئی۔

اس واقعہ پر یہ آیات مذکورہ نازل ہوئیں جن میں دراصل مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان عقدِ مناکحت کو حرام قرار دیا گیا ہے، اور اس کے نتیجہ میں یہ بھی کہ جو عورت مسلمان خواہ اس کا مسلمان ہونا پہلے سے معلوم ہو جیسے سعیدہ مذکورہ تھیں، یا بوقت ہجرت اس کا مسلمان ہونا صحیح طور سے ثابت ہو جائے، وہ اگر ہجرت کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہونچ جائے اس کو کفار کے قبضہ میں واپس نہ دیا جائے، کیونکہ وہ اپنی کافر شوہر کے لئے حلال نہیں رہی (تفسیر قرطبی میں یہ واقعہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے نقل کیا ہے)

غرض ان آیات کے نزول نے یہ واضح کر دیا کہ صلحنامہ کی یہ شرط کہ جو بھی مسلمان آپ کے پاس پہنچے آپ واپس کریں گے اپنے لفظی عموم کے ساتھ جس میں مرد و عورت دونوں داخل ہیں صحیح نہیں، یہ شرط صرف مردوں کے حق میں قبول کی جا سکتی ہے، عورتوں کے معاملہ میں یہ شرط قابلِ قبول نہیں، ان کے بارے میں صرف اتنا کیا جا سکتا ہے کہ جو عورت مسلمان ہو کر ہجرت کرے اس کے کافر شوہر نے جو کچھ اس پر مہر کی صورت میں خرچ کیا ہے وہ خرچ اس کو واپس کیا جائے گا، ان آیات کی بناء پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شرط کے مفہوم کو واضح فرمادیا، اور اس کے مطابق سعیدہ مذکورہ کو واپس نہیں کیا۔

بعض روایات میں ہے کہ ام کلثوم بنتِ عقبہ ابن ابی معیط مکہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہونچ گئیں، ان کے خاندان کے لوگوں نے واپسی کا مطالبہ عموم شرط کی وجہ سے کیا اس پر یہ آیات نازل ہوئیں اور بعض روایات میں ہے کہ ام کلثوم عمرو بن عاص کے نکاح میں تھیں جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، یہ اور انکے ساتھ ان کے دو بھائی مکہ سے بھاگ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہونچ گئے اور ساتھ ہی عمرو بن عاص شوہر اُم کلثوم وغیرہ نے آکر ان کی واپسی کا مطالبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، آپؐ نے شرط کے مطابق ان کے دونوں بھائی عمارہ اور ولید کو تو واپس کر دیا، مگر اُم کلثومؓ کو واپس نہیں فرمایا، اور ارشاد فرمایا کہ یہ شرط مردوں کے لئے تھی عورتیں اس میں شامل نہیں، اس پر یہ آیات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کے لئے نازل ہوئیں۔

اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہونچنے والی دوسری عورتوں کے بھی کچھ واقعات روایات میں مذکور ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ ان میں کوئی تضاد نہیں، ہو سکتا ہے کہ یہ متعدد واقعات سب ہی پیش آئے ہوں۔

شرط مذکور سے عورتوں کا استثنا نقضِ عہد نہیں بلکہ ایک شرط کی وضاحت بقبول فریقین ہے:

مذکور الصدر روایت قرطبی سے تو معلوم ہوا کہ معاہدہ کی شرط کے الفاظ اگرچہ عام تھے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک وہ عورتوں کے لئے عام اور شامل نہیں تھے، اس لئے آپؐ نے اس کی وضاحت وہیں حدیبیہ کے مقام پر فرمادی اور اسی کی تصدیق پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

اور بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے تو اس شرط کو عموم کے ساتھ قبول فرمالیا تھا

جس میں عورتیں بھی شامل تھیں، ان آیات کے نزول نے اس کے عموم کو منسوخ قرار دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش مکہ پر اسی وقت یہ واضح کر دیا کہ عورتیں اس شرط میں داخل نہ ہونگی، چنانچہ عورتوں کو آپ نے واپس نہیں فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ یہ صورت نہ نقضِ عہد کی تھی جس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی امکان ہی نہ تھا، اور نہ یہ نبذ عہد کی صورت تھی یعنی معاہدہ کو ختم کر دینے کی، بلکہ ایک شرط کی وضاحت کا معاملہ تھا، خواہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد پہلے ہی سے یہ ہو یا نزولِ آیت کے بعد آپ نے اس عموم کو صرف مردوں تک محدود کرنے کے لئے فرما دیا ہو، بہرحال ہوا یہ ہے کہ اس توضیح کے بعد بھی معاہدہ صلح کو طرفین نے قبول کیا اور اس پر ایک مدت تک طرفین سے عمل ہوتا رہا، اس صلح کے نتیجہ میں راستے مامون ہوئے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملوکِ دنیا کے نام خطوط بھیجے، اور اسی کے نتیجہ میں ابوسفیان کا قافلہ بے فکری کے ساتھ ملکِ شام تک پہنچا، جہاں ہرقل نے ان کو اپنے دربار میں بلا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و واقعات کی تحقیق کی۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس شرطِ صلح کے عام الفاظ میں، عورتوں کا شامل نہ ہونا خواہ پہلے ہی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں تھا یا نزولِ آیت کے بعد آپ نے عورتوں کو اس عموم سے خارج کیا، بہر دو صورت کفار قریش اور مسلمانوں کے درمیان یہ معاہدہ اس وضاحت کے بعد بھی مکمل ہی سمجھا گیا، اور ایک عرصہ تک اس پر عمل ہوتا رہا، اس لئے اس شرط کی وضاحت کو نقضِ عہد یا نبذِ عہد میں داخل نہیں کیا جا سکتا، واللہ اعلم، آگے آیات کا مفہوم ان کے الفاظ کے تحت دیکھئے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَاۗءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ۭ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ، مراد آیت کی یہ ہے کہ عورتوں کو شرطِ صلح سے مستثنیٰ ہونیکی وجہ اُن کا مسلمان اور مومن ہونا ہے مکہ سے مدینہ آنے والی عورتوں میں احتمال اس کا بھی تھا کہ ان میں سے کوئی اسلام و ایمان کی خاطر نہیں، بلکہ اپنے شوہر سے ناراضی کے سبب یا مدینہ کے کسی شخص سے محبت کے سبب یا کسی دوسری دنیوی غرض سے ہجرت کر کے آگئی ہو وہ عنداللہ اس شرط سے مستثنیٰ نہیں، بلکہ اس کو واپس کرنا شرطِ صلح کے تحت ضروری ہے، اس لئے مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ ہجرت کر کے آنے والی عورتوں کے ایمان کا امتحان لو، اس کے ساتھ ہی یہ جملہ فرمایا کہ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ، اس میں اشارہ کر دیا کہ حقیقی اور اصل ایمان کا تعلق تو انسان کے دل سے ہے، جس پر اللہ کے سوا کسی کو اطلاع نہیں، البتہ آدمی کے زبانی اقرار اور قرائن سے ایمان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، بس مسلمان اسی کے مامور و مکلف ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ اُن کے امتحان کا طریقہ یہ تھا کہ مہاجر عورت سے حلف لیا جاتا تھا کہ وہ اپنے شوہر سے بغض و نفرت کی وجہ سے نہیں آئی، اور نہ مدینہ کے کسی آدمی کی محبت کی وجہ سے اور نہ کسی دوسری دنیوی غرض سے بلکہ اس کا آنا خالص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم

کی محبت و رضا جوئی کے لئے ہے، جب وہ یہ حلف کر لیتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو مدینہ میں رہنے کی اجازت دیتے، اور اس کا مہر وغیرہ جو اس نے اپنے کافر شوہر سے وصول کیا تھا وہ اس کے شوہر کو واپس دیدیتے تھے۔ (قرطبی)

اور حضرت صدیقہ عائشہ رضؓ سے ترمذی میں روایت ہے جس کو ترمذی نے حسن صحیح کہا ہے، آپ نے فرمایا کہ اُن کے امتحان کی صورت وہ بیعت تھی جس کا ذکر اگلی آیات میں تفصیل سے آیا ہے اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ الآیۃ، گویا آنے والی مہاجر عورتوں کے امتحان ایمان کا طریقہ ہی یہ تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر اُن چیزوں کا عہد کریں جو اس بیعت کے بیان میں آگے آئی ہیں، اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ ابتدائی طور پر پہلے وہ کلمات اُن سے کہلوائے جاتے ہوں جو بروایت ابن عباسؓ اوپر ذکر کئے گئے ہیں اور اس کی تکمیل اس بیعت سے ہوتی ہو جس کا آگے ذکر ہے۔ واللہ اعلم

فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ، یعنی جب بطرز مذکور ان مہاجرات کے ایمان کا امتحان لے کر تم ان کو مؤمن قرار دیدو تو پھر ان کو کفار کی طرف واپس کرنا جائز نہیں۔

لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ، یعنی نہ یہ عورتیں کافر مردوں پر حلال ہیں اور نہ کافر مرد اُن کے لئے حلال ہو سکتے ہیں کہ ان سے دوبارہ نکاح کر سکیں۔

مسئلہ :- اس آیت نے یہ واضح کر دیا کہ جو عورت کسی کافر کے نکاح میں تھی اور پھر وہ مسلمان ہو گئی تو کافر سے اس کا نکاح خود بخود فسخ ہو گیا، یہ اس کے لئے اور وہ اس کے لئے حرام ہو گئے، اور یہی وجہ عورتوں کو شرطِ صلح میں واپسی سے مستثنیٰ کرنے کی ہے کہ اب وہ اس کے شوہر کافر کیلئے حلال نہیں رہی۔

وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا، یعنی مہاجر مؤمنہ کے کافر شوہر نے اس کے نکاح میں جو مہر وغیرہ اس کو دیا ہے وہ سب اس کے شوہر کو واپس دیا جائے، کیونکہ شرطِ صلح سے مستثنیٰ صرف عورتوں کی واپسی تھی، جو بوجہ اُن کے حرام ہو جانے کے نہیں ہو سکتی، مگر جو مال انھوں نے ان کو دیا ہے وہ حسب شرط واپس کر دینا چاہئے اس مال کی واپسی کا خطاب مہاجر عورتوں کو نہیں کیا گیا کہ تم واپس کرو بلکہ عام مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ واپس کریں، کیونکہ بہت ممکن بلکہ غالب یہ ہے کہ جو مال ان کے شوہر نے اُن کو دیا تھا وہ ختم ہو چکا ہو، اب اُن سے واپس دلانے کی صورت ہی نہیں ہو سکتی، اس لئے یہ فریضہ عام مسلمانوں پر ڈال دیا گیا کہ معاہدۂ صلح کو پورا کرنے کے لئے اس کی طرف سے کافر شوہروں کا مال واپس کر دیں، اگر بیت المال سے دیا جا سکتا ہے تو وہاں سے ورنہ عام مسلمانوں کے چندے سے (من القرطبی)

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ، پچھلی آیت میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ ہجرت کر کے آنے والی مسلمان عورت کا نکاح اس کے کافر شوہر سے فسخ ہو چکا ہے اور یہ اس پر حرام ہو چکی ہے، اس آیت میں اسی حکم کا تکملہ یہ ہے کہ اب مسلمان مرد سے اس کا نکاح ہو سکتا ہے، اگرچہ سابق

شوہر کا فرزند بھی ہے اور اس نے طلاق بھی نہیں دی، مگر شرعی حکم سے نکاح فسخ ہو چکا ہے، اس لئے دوسری مرد سے اس کا نکاح حلال ہو گیا۔

کافر مرد کی بیوی مسلمان ہو جائے تو نکاح فسخ ہو جانا آیتِ مذکورہ سے معلوم ہو چکا، لیکن دوسرے کسی مسلمان مرد سے اس کا نکاح کس وقت جائز ہوگا، اس کے متعلق امام اعظم ابوحنیفہ رح کے نزدیک اصل ضابطہ تو یہ ہے کہ جس کافر مرد کی عورت مسلمان ہو جائے تو حاکم اسلام اس کے شوہر کو بلا کر کہے کہ اگر تم بھی مسلمان ہو جاؤ تو نکاح برقرار رہے گا، ورنہ نکاح فسخ ہو جائے گا، اگر وہ اس پر بھی اسلام لانے سے انکار کرے تو اب ان دونوں میں فرقت کی تکمیل ہو گئی، اس وقت وہ کسی مسلمان مرد سے نکاح کر سکتی ہے، مگر یہ ظاہر ہے کہ حاکم اسلام کا شوہر کو حاضر کرنا وہیں ہو سکتا ہے جہاں حکومت اسلام کی ہو، دارالکفر یا دارالحرب میں ایسا واقعہ پیش آوے تو شوہر سے اسلام کے لئے کہنے اور اس کے انکار کی صورت نہیں ہوگی جس سے دونوں میں تفریق کا فیصلہ کیا جا سکے، اس لئے اس صورت میں زوجین کے درمیان تفریق کی تکمیل اُس وقت ہوگی جب یہ عورت ہجرت کر کے دارالاسلام میں آجائے یا مسلمانوں کے لشکر میں آجائے، دارالاسلام میں آنے کی صورت مذکورہ واقعات میں مدینہ طیبہ پہونچنے کے بعد ہو سکتی ہے، اور لشکرِ اسلام حدیبیہ میں بھی موجود تھا، اس میں پہونچنے سے بھی اس کا تحقق ہو جاتا ہے، جس کو فقہاء کی اصطلاح میں اختلافِ دارین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی جب کافر مرد اور اس کی بیوی مسلمان کے درمیان دارین کا فاصلہ ہو جائے، یعنی ایک دارالکفر میں ہو دوسرا دارالاسلام میں تو یہ تفریق مکمل ہو کر عورت دوسرے سے نکاح کیلئے آزاد ہو جاتی ہے (ہدایہ وغیرہ)

اور اس آیت میں جو اِذَآ اٰتَیۡتُمُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ کو بطور شرط کے فرمایا کہ تم ان سے نکاح کر سکتے ہو۔ بشرطیکہ اُن کے مہر دیدو، یہ درحقیقت نکاح کی شرط نہیں، کیونکہ باتفاقِ امت نکاح کا انعقاد ادائے مہر پر موقوف اور مشروط نہیں ہے، البتہ نکاح پر مہر کی ادائیگی واجب و لازم ضرور ہے، یہاں اس کو بطور شرط کے شاید اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ ابھی ایک مہر تو اس کے کافر شوہر کو واپس کرایا جا چکا ہے، ایسا نہ ہو کہ اب اس سے نکاح کرنے والے مسلمان یہ سمجھ بیٹھیں کہ مہر تو دیا جا چکا، اور جدید مہر کی ضرورت نہیں، اس لئے فرما دیا کہ اس مہر کا تعلق پچھلے نکاح سے تھا، یہ دوسرا نکاح ہوگا تو اس کا جدید مہر لازم ہے۔

وَلَا تُمۡسِكُوۡا بِعِصَمِ الۡكَوَافِرِ، عِصَم، عِصۡمَت کی جمع ہے، جس کے اصلی معنی حفاظت اور استحکام کے ہیں، مراد اس سے وہ عقدِ نکاح وغیرہ ہیں جن کی حفاظت کی جاتی ہے۔

کَوَافِر جمع کافرہ کی ہے، اور مراد اس سے مشرکہ عورت ہے، کیونکہ کافرہ کتابیہ سے نکاح کی اجازت قرآن کریم میں منصوص ہے، مراد آیت کی یہ ہے کہ اب تک جو مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان مناکحت کی اجازت تھی وہ ختم کر دی گئی، اب کسی مسلمان کا نکاح مشرک عورت سے جائز نہیں، اور جو نکاح پہلے ہو چکے ہیں وہ بھی ختم ہو چکے، اب کسی مشرک عورت کو اپنے نکاح میں روکنا حلال نہیں۔

جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو جن صحابہ کرام کے نکاح میں کوئی مشرک عورت تھی اس کو چھوڑ دیا حضرت فاروق اعظمؓ کے نکاح میں دو مشرک عورتیں اُس وقت تک تھیں جو بوقت ہجرت مکہ مکرمہ میں رہ گئی تھیں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ آیت نازل ہونے کے بعد دونوں کو طلاق دیدی (رواہ البغوی لبسند الزہری کذا فی المظہری) اور طلاق سے مراد اس جگہ چھوڑ دینا اور قطع تعلق کر لینا ہے، اصطلاحی طلاق کی یہاں ضرورت ہی نہیں، کیونکہ اس آیت کے ذریعہ نکاح ٹوٹ چکا ہے۔

وَاسْـَٔلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْـَٔلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا، یعنی جب معاملہ یہ ٹھہرا کہ جو عورت مسلمان ہو کر ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آجائے تو وہ واپس مکہ نہ بھیجی جائے گی، البتہ اس کے شوہر نے جو مہر وغیرہ اس کو دیا ہے وہ اس کے شوہر کو واپس دیا جائے گا، اسی طرح اگر کوئی مسلمان عورت خدانخواستہ مرتد ہو کر مکہ معظمہ چلی جائے یا پہلے ہی سے کافر ہو مگر مسلمان شوہر کے قبضہ سے نکل جائے (خلاصۂ تفسیر میں اسی صورت کو شاید اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ ایسا کوئی واقعہ پیش ہی نہیں آیا کہ کوئی مسلمان عورت مرتد ہو کر مکہ چلی گئی ہو، اور پھر وہیں کافر ہو کر رہ گئی ہو، ہاں ایسے واقعات پیش آئے کہ جو پہلے ہی سے کافر تھیں وہ اپنے مسلمان شوہر کے قبضہ سے نکل کر مکہ ہی میں رہیں) کفار مکہ اس کو واپس نہیں کریں گے، مگر اس کے مسلمان شوہر نے جو مہر وغیرہ اس کو دیا ہے اس کی واپسی کفار مکہ کے ذمہ ہوگی، اس لئے ان معاملات کا تصفیہ باہمی حساب فہمی سے کر لیا جائے، طرفین سے جو کچھ مہر وغیرہ میں خرچ کیا گیا ہے وہ دریافت کر کے اس کے مطابق لین دین کر لیا جاوے

اس حکم پر مسلمانوں نے تو بطیب خاطر عمل کیا کہ احکام قرآن کی پابندی اُن کے نزدیک فرض ہے اس لئے جتنی عورتیں ہجرت کر کے آئیں سب کے مہر وغیرہ ان کے کافر شوہروں کو واپس بھیج دیئے، مگر کفار مکہ کا قرآن پر ایمان نہیں تھا، انھوں نے عمل نہ کیا، اس پر اگلی آیت نازل ہوئی، (ذکرہ البغوی عن الزہری مظہری)

وَاِنْ فَاتَكُمْ شَیْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ الآیۃ، عَاقَبْتُمْ، معاقبہ سے مشتق ہے جس کے ایک معنی انتقام اور بدلہ لینے کے بھی ہیں، یہاں یہ معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں (کمارُوِی عن قتادۃ و مجاہد، قرطبی) اس صورت میں مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ مسلمانوں کی کچھ عورتیں اگر کفار کے قبضہ میں آجائیں تو شرط صلح کے ماتحت اُن پر لازم تھا کہ اُن کے مسلمان شوہروں کو ان کا دیا ہوا مہر وغیرہ واپس کریں جیسا کہ مسلمانوں کی طرف سے مہاجرات کے کافر شوہروں کو ان کا مہر واپس کیا گیا، لیکن جب کفار نے ایسا نہ کیا اور مسلمان عورتوں کے مہر ان کو ادا نہ کئے تو ان کے اس عمل کا اگر تم انتقام اور بدلہ لیلو اس طرح کہ کفار مکہ کو جو رقم مہاجرات کے مہر کی ادا کرنا تھی تم بھی وہ اپنے حق کے مطابق روک لو تو اس کا حکم یہ ہے کہ فَاٰتُوا الَّذِیْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا، یعنی تم اس رقم میں سے جو مہاجرات کے مہر کی روک لی گئی ہے، ان مسلمان شوہروں کے خرچ کئے ہوئے مہر وغیرہ ادا کر دو جن کی عورتیں کفار مکہ کے قبضہ میں آگئی ہیں۔

دوسرے معنی عَاقَبْتُمْ، عَقَّبْتُمْ، اَعْقَبْتُمْ کے جنگ میں مال غنیمت حاصل کرنے کے بھی ہیں، اور اس

آیت میں لفظ عَاقَبْتُمْ کی یہ تینوں قراءتیں بھی مختلف قراء سے منقول ہیں، اور حضرت قتادہؒ و مجاہدؒ سے ان تینوں لفظوں کے معنی غنیمت کے بھی منقول ہیں، اس صورت میں معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ جن مسلمان شوہروں کی عورتیں کفار کے قبضہ میں چلی گئیں اور شرطِ صلح کے مطابق کفار نے اُن کے مہر مسلمان شوہروں کو ادا نہیں کیا پھر مسلمانوں کو مالِ غنیمت حاصل ہوا تو ان شوہروں کا حق مالِ غنیمت سے ان کو ادا کر دیا جائے (قرطبی)

کیا مسلمانوں کی کچھ عورتیں مرتد ہو کر مکہ چلی گئی تھیں ؟ اس آیت میں جس معاملے کا حکم بیان کیا گیا ہے اس کا واقعہ بعض حضرات کے نزدیک صرف ایک ہی پیش آیا تھا کہ حضرت عیاض بن غنم قریشی کی بیوی ام الحکم بنتِ ابی سفیان مرتد ہو کر مکہ مکرمہ چلی گئی تھی، اور پھر یہ بھی اسلام کی طرف لوٹ آئی۔

اور حضرت ابن عباسؓ نے کُل چھ عورتوں کا اسلام سے انحراف اور کفار کے ساتھ مل جانا ذکر فرمایا ہے، جن میں سے ایک تو یہی ام الحکم بنت ابی سفیان تھیں اور باقی پانچ عورتیں وہ تھیں جو ہجرت کے وقت ہی مکہ مکرمہ میں رُک گئیں اور پہلے ہی سے کافر تھیں، جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی جس نے مسلم و کافرہ کے نکاح کو توڑ دیا، اس وقت بھی وہ مسلمان ہونے کے لئے تیار نہ ہوئیں، اس کے نتیجہ میں یہ بھی اُن عورتوں میں شمار کی گئیں، جن کا مہر اُن کے مسلمان شوہروں کو کفارِ مکہ کی طرف سے واپس ملنا چاہئے تھا، جب انھوں نے نہیں دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت سے اُن کا یہ حق ادا کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ مدینہ سے مکہ چلے جانے اور مرتد ہونے کا تو صرف ایک ہی کا واقعہ تھا، باقی پانچ عورتیں پہلے ہی سے کفر پر تھیں، اور کفر پر قائم رہنے کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے نکاح سے اس آیت کی بناء پر نکل گئیں، اس لئے اُن کو بھی اس ضمن میں شمار کیا گیا ہے، اور ایک عورت جس کا مُرتد ہو کر مکہ چلے جانا مذکور ہوا ہے یہ بھی بعد میں پھر مسلمان ہو گئیں (قرطبی) اور بغوی نے بروایت ابن عباسؓ نقل کیا ہے کہ باقی پانچ عورتیں جو اس میں شمار کی گئی ہیں وہ بھی بعد میں مسلمان ہو گئیں۔ (مظہری)

عورتوں کی بیعت يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَاۗءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ الآیۃ، اس آیت میں مسلمان عورتوں سے ایک تفصیلی بیعت لینے کا ذکر ہے جس میں ایمان و عقائد کے ساتھ احکامِ شرعیہ کی پابندی کا بھی معاہدہ ہے، سابقہ آیات جن کے سیاق میں یہ آیتِ بیعت آئی ہے وہ اگرچہ اُن مہاجرات کے ایمان کا امتحان کرنے کے سلسلے میں ہے، اور یہ بیعت اُن کے امتحانِ ایمان کی تکمیل ہے، لیکن الفاظ آیت عام ہیں، نومسلم مہاجرات کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ سب مسلمان عورتوں کے لئے عام ہیں، اور واقعہ بھی اسی طرح پیش آیا، کہ بیعت مذکورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرنے والی صرف نومسلم مہاجرات ہی نہیں دوسری قدیم عورتیں بھی شریک تھیں، جیسا کہ صحیح بخاری میں اُمّ عطیہؓ سے اور بسند بغوی امیمہؓ بنتِ رقیہؓ سے منقول ہے، حضرت امیمہؓ سے روایت ہے کہ میں نے چند دوسری عورتوں کی معیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تو آپؐ نے جن احکامِ شرعیہ کی پابندی کا معاہدہ اس بیعت میں لیا

اس کے ساتھ یہ کلمات بھی تلقین فرمائے کہ فِيمَا اسْتَطَعْتُنَّ وَ اَطَقْتُنَّ، یعنی ہم اُن چیزوں کی پابندی کا عہد اسی حد تک کرتے ہیں جہاں تک ہماری استطاعت وطاقت میں ہے، امیمہؓ نے اس کو نقل کر کے فرمایا کہ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت و شفقت ہم پر خود ہماری ذات سے بھی زائد تھی کہ ہم نے تو بلا کسی قید و شرط کے عہد کرنا چاہا تھا آپؐ نے اس شرط کی تلقین فرمادی، تاکہ کسی اضطراری حالت میں خلاف ورزی ہو جائے تو عہد شکنی میں داخل نہ ہو (مظہری)

اور صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اس بیعتِ نسار کے متعلق فرمایا کہ عورتوں کی یہ بیعت صرف گفتگو اور کلام کے ذریعہ ہوئی، مردوں کی بیعت میں جو ہاتھ پر ہاتھ رکھنے کا دستور ہے، عورتوں کی بیعت میں ایسا نہیں کیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک نے کبھی کسی غیر محرم کے ہاتھ کو نہیں چُھوا (مظہری)

اور روایاتِ حدیث سے ثابت ہو کہ یہ بیعتِ نسار صرف اس واقعۂ حدیبیہ کے بعد ہی نہیں بلکہ بار بار ہوتی رہی، یہاں تک کہ فتح مکہ کے روز بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کی بیعت سے فارغ ہونے کے بعد کوہِ صفا پر عورتوں سے بیعت لی، اور پہاڑ کے دامن میں حضرت عمر بن خطابؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کو دُہرا کر نیچے جمع ہونے والی عورتوں کو پہونچا رہے تھے جو اس بیعت میں شریک تھیں۔

اس وقت بیعت ہونے والی عورتوں میں ابوسفیان کی بیوی ہندہ بھی داخل تھیں، جو شروع میں حیار کے سبب اپنے آپ کو چھپانا چاہتی تھیں، پھر بیعت میں کچھ احکام کی تفصیل آئی تو بولنے اور دریافت کرنے پر مجبور ہو گئیں، کئی سوالات کئے، یہ واقعہ تفصیل سے تفسیر مظہری میں مذکور ہے۔

مردوں کی بیعت میں اجمال اور عورتوں کی بیعت میں تفصیل

مردوں سے جو بیعت لی گئی وہ عموماً اسلام اور جہاد پر لی گئی ہے، عملی احکام کی تفصیل اس میں نہیں ہے، بخلاف عورتوں کی بیعت کے کہ اس میں وہ تفصیل ہی جو آگے آرہی ہے، وجہ فرق کی یہ ہے کہ مردوں سے ایمان واطاعت کی بیعت لینے میں یہ سب احکام داخل تھے، اس لئے تفصیل کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، اور عورتیں عموماً عقل وفہم میں مردوں سے کم ہوتی ہیں اس لئے ان کی بیعت میں تفصیل مناسب سمجھی گئی، یہ اس بیعت کی ابتدار ہے جو عورتوں سے شروع ہوئی مگر آگے یہ عورتوں کے ساتھ مخصوص نہیں رہی، مردوں سے بھی انہی چیزوں کی بیعت لینا روایاتِ حدیث میں ثابت ہے، (کما روی عن عبادۃ بن الصامتؓ) (قرطبی) اس کے علاوہ جن احکام کی پابندی کا عہد عورتوں سے لیا گیا عموماً عورتیں ان میں بے راہی اختیار کرنے کی عادی ہوتی ہیں، اس لئے بھی خصوصیت سے ان کی بیعت میں مندرجہ ذیل تفصیل آئی، يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا، الآیۃ اس میں پہلی بات تو وہی ایمان کی اور شرک سے بچنے کی ہے، جو عام مردانہ بیعتوں میں بھی آتی ہے، دوسری بات چوری نہ کرنا ہے، بہت سی

عورتیں اپنے شوہر کے مال میں چوری کرنے کی عادی ہوتی ہیں، اس لئے ذکر کیا گیا، تیسری بات زنا سے پرہیز کرنا ہو جس میں عورتیں بچتہ ہو جاویں تو مردوں کو بھی نجات آسان ہو جاوے، چوتھی بات یہ ہے کہ اپنی بچوں کو قتل نہ کریں۔ زمانۂ جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ دفن کر کے ہلاک کر دینے کا رواج تھا، اس کو روکا گیا، پانچویں بات یہ ہو کہ افترا اور بہتان نہ باندھیں، اس بہتان کی ممانعت کے ساتھ یہ الفاظ بھی ہیں (بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ) یعنی اپنے ہاتھ پاؤں کے درمیان بہتان نہ باندھیں، ان کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ قیامت کے روز انسان کے ہاتھ پاؤں ہی اس کے اعمال پر شہادت دیں گے، مطلب یہ ہوا کہ ایسے گناہ کے ارتکاب کے وقت یہ خیال رہنا چاہئے کہ میں چار گواہوں کے درمیان یہ کام کر رہا ہوں جو میرے خلاف گواہی دیں گے۔

یہاں لفظ بہتان عام ہے اپنے شوہر پر ہو یا کسی دوسرے پر، کیونکہ افترا، و بہتان ہر شخص پر یہاں تک کہ کافر پر بھی حرام ہے، خصوصاً اپنے شوہر پر بہتان اور بھی اشد گناہ ہے، اور شوہر پر بہتان لگانے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ عورت کسی اور شخص کا بچہ لے کر اس کو اپنے شوہر کا بچہ ظاہر کرے اور اس کے نسب میں داخل کر دے، اور یہ بھی کہ معاذ اللہ بدکاری کرے اور حمل رہ جائے جس کے نتیجہ میں یہ بچہ شوہر کے نسب میں داخل سمجھا جائے۔

چھٹی بات ایک عام ضابطہ ہو کہ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ، یعنی وہ کسی نیک کام میں آپ کہ حکم کی خلاف ورزی نہ کریں گی، یہاں "معروف" یعنی نیک کام کی قید لگانا جب کہ یہ یقینی ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی حکم معروف اور نیکی کے سوا ہو ہی نہیں سکتا، یا تو اس لئے ہے کہ عام مسلمان پوری طرح سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں، یہاں تک کہ رسول کی اطاعت بھی اس شرط کے ساتھ مشروط کر دی گئی۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہو کہ یہاں معاملہ عورتوں کا ہے، ان سے عام اطاعت کہ ان کے کسی حکم کے خلاف نہ کریں گی، کسی کے دل میں اس سے شیطان گمراہی کے وسوسے پیدا کر سکتا ہے اس کا راستہ روکنے کے لئے یہ قید لگا دی، واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم

تمت

سورۃ الممتحنۃ بعون اللہ تعالیٰ وحمدہ
لعشرین خلت من جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۹۱ھ
یوم الثلثاء ویتلوہا انشاء اللہ سورۃ الصف

سُوْرَةُ الصَّفِّ

سُوْرَةُ الصَّفِّ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ اَرْبَعَ عَشْرَةَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۃ صف مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی چودہ آیتیں ہیں اور دو رکوع،

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے،

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ

اللہ کی پاکی بولتا ہے جو کچھ ہے آسمانوں اور جو کچھ ہے زمین میں اور وہی ہے زبردست

الْحَكِيْمُ ﴿۱﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲﴾

حکمت والا، اے ایمان والو کیوں کہتے ہو مُنہ سے جو نہیں کرتے،

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ

بڑی بیزاری کی بات ہے اللہ کے یہاں کہ کہو وہ چیز جو نہ کرو اللہ چاہتا ہے اُن

الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ﴿۴﴾

لوگوں کو جو لڑتے ہیں اس کی راہ میں قطار باندھ کر گویا وہ دیواریں سیسہ پلائی ہوئی،

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو اے قوم میری کیوں ستاتے ہو مجھ کو اور تم کو معلوم ہے

اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ۭ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ۭ

کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں تمہارے پاس، پھر جب وہ پھر گئے تو پھیر دیئے اللہ نے اُن کے دل

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ

اور اللہ راہ نہیں دیتا نافرمان لوگوں کو ، اور جب کہا عیسیٰ مریم کے بیٹے نے

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ

اے بنی اسرائیل میں بھیجا ہوا آیا ہوں اللہ کا تمہارے پاس یقین کرنیوالا اس پر جو مجھ سے آگے ہے

مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ

توریت اور خوش خبری سنانے والا ایک رسول کی جو آئے گا میرے بعد اس کا نام ہے احمد

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَمَنْ اَظْلَمُ

پھر جب آیا اُن کے پاس کھلی نشانیاں لیکر کہنے لگے یہ جادو ہے صریح ، اور اس سے زیادہ بے انصاف

مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعٰٓى اِلَى الْاِسْلَامِ ؕ وَاللّٰهُ

کون جو باندھے اللہ پر جھوٹ اور اس کو بُلاتے ہیں مسلمان ہونے کو اور اللہ

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ

راہ نہیں دیتا بے انصاف لوگوں کو ، چاہتے ہیں کہ بجھادیں اللہ کی روشنی اپنے

بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْٓ

مُنہ سے اور اللہ کو پوری کرنی ہے اپنی روشنی اور پڑے بُرا مانیں منکر ، وہی ہے جس نے

اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ

بھیجا اپنا رسول راہ کی سوجھ دے کر اور سچا دین کہ اس کو اوپر کرے سب دینوں سے اور

كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝

پڑے بُرا مانیں شرک کرنے والے

ع ۹

خلاصۂ تفسیر

سب چیزیں اللہ کی پاکی بیان کرتی ہیں (قالاً یا حالاً) جو کچھ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں اور وہی زبردست حکمت والا ہے (پس جو ایسا باعظمت وشان ہو اس کی اطاعت ہر حکم میں ضروری ہے، جن میں سے ایک حکم جہاد کا ہے، جو اس سورت میں مذکور ہے، جس کے نزول کا سبب یہ ہے کہ

ایک بار بعض مسلمانوں نے باہم تذکرہ کیا کہ اگر ہم کو کوئی ایسا عمل معلوم ہو جو حق تعالیٰ کے نزدیک نہایت محبوب ہی تو ہم اس کو عمل میں لاویں اور اس سے قبل جنگِ اُحد میں بعضے جہاد سے بھاگ چکے تھے جس کا قصہ سورۃ آلِ عمران میں ہے، اور نیز وقتِ نزولِ حکم جہاد کے بعض کو وہ حکم گراں گذرا تھا، جس کا قصہ سورۃ نساء میں ہے اس پر یہ ارشاد نازل ہوا) اے ایمان والو ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو، خدا کے نزدیک یہ بات بہت ناراضی کی ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں، اللہ تعالیٰ تو ان لوگوں کو (خاص طور پر) پسند کرتا ہے جو اس کے رستہ میں اس طرح مل کر لڑتے ہیں کہ گویا وہ ایک عمارت ہے جس میں سیسہ پلایا گیا ہے (یعنی جس طرح یہ عمارت مستحکم ناقابلِ شکست ہوتی ہے، اسی طرح وہ مجاہدین دشمن کے مقابلہ سے ہٹتے نہیں، مطلب یہ ہوا کہ تم جو کہتے ہو کہ ہم کو وہ کام معلوم ہوتا.... جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہی تو یہ عمل تو جہاد ہے پھر اس کے نزول کے وقت گرانی کیوں ہوئی تھی اور اُحد میں کیوں بھاگ گئے تھے، باوجود ان تمام امور کے پیشِ نظر ہونے کے نہایت نازیبا بات اور خدا کو ناپسند ہے، ایسے دعوی کی باتیں کرنا جس کا خلاف ہونا معلوم بھی ہو چکا ہے تو اس میں لاف زنی اور غلط دعوٰی پر زجر کیا گیا، وعظ بے عمل اس کے مفہوم سے خارج ہے) اور (آگے کفار کے مستحقِ قتل و قتال ہونے کی علت یعنی ایذاء رسانی، تکذیب، مخالفتِ رسول کا بیان فرمانا مقصود ہی اور اسی کی مناسبت سے موسٰی علیہ السلام و عیسٰی علیہ السلام کا قصہ ذکر فرماتے ہیں پس ارشاد ہے کہ وہ وقت قابلِ ذکر ہے) جبکہ موسٰی (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم مجھ کو کیوں ایذاء پہنچاتے ہو حالانکہ تم کو معلوم ہے کہ میں تمہارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں (وہ ایذائیں مختلف طور پر تھیں جن میں سے بعض بعض قرآن مجید میں بھی خصوص سورۃ بقرہ میں مذکور ہیں اور حاصل ان سب کا سرکشی اور مخالفت ہے) پھر جب (اس فہمائش پر بھی) وہ لوگ ٹیڑھے ہی رہے (اور راہ پر نہ آئے) تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو اور (زیادہ) ٹیڑھا کر دیا (یعنی مادہ مخالفت اور عصیان کا اور زیادہ بڑھ گیا جیسا کہ قاعدہ ہے کہ گناہ پر مداومت کرنے سے اللہ تعالیٰ کی طرف قلب کا میلان اور اس کی اطاعت کا جذبہ کم ہوتا چلا جاتا ہے) اور اللہ تعالیٰ (کا معمول ہے کہ وہ) ایسے نافرمانوں کو ہدایت (کی توفیق) نہیں دیتا (اسی طرح یہ لوگ رسول اللہ کو انواعِ مخالفت سے ایذائیں پہونچاتے ہیں، اس لئے اُن کا ٹیڑھا پن اور فسق زیادہ ہوتا جاتا ہے کہ امید اصلاح کی نہیں رہی، پس ان کا فساد مٹانے کے لئے قتال کا حکم دینا مصلحت ہوا) اور (اسی طرح وہ وقت بھی قابلِ تذکرہ ہے) جبکہ عیسٰی بن مریم (علیہ السلام) نے (ارشاد) فرمایا کہ اے بنی اسرائیل میں تمہارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں کہ مجھ سے پہلے جو توراۃ (آچکی) ہے میں اسکی تصدیق کرنے والا ہوں اور میرے بعد جو ایک رسول آنے والے ہیں جن کا نام (مبارک) احمد ہوگا، میں ان کی بشارت دینے والا ہوں (اور اس بشارت کا عیسٰی علیہ السلام سے منقول ہونا خود اہل کتاب کے بیان سے حدیثوں میں ثابت ہے، چنانچہ خازن میں بروایۃ ابو داؤد نجاشی بادشاہِ حبشہ کا جو کہ نصاریٰ کے عالم

بھی تھے، یہ قول آیا ہے کہ واقعی آپؐ ہی ہیں جن کی بشارت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی، اور خازن ہی میں ترمذی سے عبداللہ بن سلامؓ کا قول جو کہ علماء یہود میں سے تھے آیا ہے کہ توراۃ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت لکھی ہے اور یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام آپؐ کے ساتھ مدفون ہوں گے، اور چونکہ عیسیٰ علیہ السلام توراۃ کے مبلّغ تھے، اس لئے توراۃ میں اس بشارت کا ہونا نیز عیسیٰ علیہ السلام سے منقول کہا جاوے گا، اور مولانا رحمت اللہ صاحب نے اظہار الحق میں خود توراۃ کے موجودہ نسخوں سے متعدد بشارتیں نقل کی ہیں جلد دوم صفحہ ۱۶۴ مطبوعہ قسطنطنیہ، اور ان مضامین کا اناجیل موجودہ میں نہ ہونا اس لئے مضر نہیں کہ حسبِ تحقیق علماء محققین اناجیل کے نسخے محفوظ نہیں رہے، مگر تاہم جو کچھ موجود ہیں ان میں بھی اس قسم کا مضمون موجود ہے، چنانچہ یوحنا کی انجیل مترجمہ عربی مطبوعہ لندن ۱۸۳۱ء و ۱۸۳۳ء کے چودھویں باب میں ہے کہ تمھارے لئے میرا جانا ہی بہتر ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو فارقلیط تمھارے پاس نہ آوے، پس اگر میں جاؤں تو اس کو تمھارے پاس بھیجدوں گا، فارقلیط ترجمہ احمد کا ہے، اہلِ کتاب کی عادت ہے کہ وہ ناموں کا بھی ترجمہ کر دیتے ہیں، عیسیٰ علیہ السلام نے عبرانی میں احمد فرمایا تھا، جب یونانی میں ترجمہ ہوا تو بیرکلوطوس لکھ دیا جس کے معنی ہیں احمد یعنی بہت سراہا گیا، بہت حمد کرنے والا، پھر جب یونانی سے عبرانی میں ترجمہ کیا تو اس کو فارقلیط کر دیا، اور بعض عبرانی نسخوں میں اب تک نام مبارک احمد موجود ہے، دیکھو پادری پارکہرست کی یہ عبارت دیا دحمدہ خل ہکوئیم از حمایت الاسلام مطبوعہ بریلی ۱۸۷۳ء ص ۸۱ ۸۴ ترجمہ اپالوجی گاڈفری ہیتگنس مطبوعہ لندن ۱۸۲۹ء، اور اس فارقلیط کی نسبت اس انجیل یوحنا میں یہ الفاظ ہیں: "وہ تمہیں سب چیزیں سکھاوے گا"، "اِس جہان کا سردار آتا ہے" "وہ آکر دنیا کو گناہ پر اور راستی اور عدالت (کے خلاف) پر سزا دے گا" یہ ہیں وہ الفاظ جو نبی مستقل ہونے پر دال ہیں، اور پوری بحث اس مقام کی تفسیر حقانی میں ہے، اس کا ایک شمّہ نقل کیا گیا ہے، غرض عیسیٰ علیہ السلام نے یہ ارشاد فرمایا) پھر جب (یہ تمام مضامین ارشاد فرما کر اپنی نبوت کے اثبات کے لئے) وہ (عیسیٰ علیہ السلام) ان لوگوں کے پاس کھلی دلیلیں لائے تو وہ لوگ (ان دلائل یعنی معجزات کی نسبت) کہنے لگے کہ یہ صریح جادو ہے، (اور جادو بتا کر نبوت کی تکذیب کی، کما فی المائدۃ وَاِذْ کَفَفْتُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَنْکَ اِذْ جِئْتَھُمْ بِالْبَیِّنٰتِ الخ اسی طرح بعد عیسیٰ علیہ السلام کے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ رسالت میں کفار موجودین نے آپؐ کی تکذیب کی اور مخالفت کی اور یہ ظلم عظیم ہے، پس اس ظلم کا تعدیہ مٹانے کے لئے قتال کا حکم دینا مصلحت ہوا) اور (واقعی) اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے، حالانکہ وہ اسلام کی طرف بُلایا جاتا ہو اور اللہ ایسے ظالم لوگوں کو ہدایت (کی توفیق) نہیں دیا کرتا (اللہ پر جھوٹ باندھنا یہ ہے کہ نبوت کی تکذیب کی، اثبات المنفی اور نفی المثبت یعنی جو چیز اللہ کی طرف سے نہ ہو اس کو اللہ کی طرف منسوب کرنا اور جو اللہ کی طرف سے واقع ہو اس کی نفی کرنا، دونوں افتراء علی اللہ ہیں، اور وَھُوَ یُدْعٰٓی اس لئے بڑھایا کہ اس سے زیادہ تقبیح ہوگئی، یعنی

خود تو متنبہ کرنے سے بھی متنبہ نہ ہوا اور وَاللّٰہُ لَا یَھْدِیْ اس لئے بڑھایا کہ اُن کی حالتِ موجودہ اصلاح سے بعید ہوگئی اس لئے سزائے قتال ہی تجویز کیا جانا مصلحت ہوا، چنانچہ جس کو اب بھی اسلام کی خبر نہ پہونچی ہو اوّل اس کو دعوتِ اسلام کرنا چاہئے جب اس سے انکار کرے جو کہ ظاہراً علامت ناامیدی کی ہے تب جہاد مشروع ہے، آگے ترغیبِ جہاد کیلئے وعدۂ نصرت وغلبۂ حق اور مغلوبیت باطل ارشاد ہے کہ) یہ لوگ یوں چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور (یعنی دین اسلام) کو اپنے مُنہ سے (پھونک مار کر) بجھادیں (یعنی تدبیر عملی کے ساتھ مُنہ سے بھی ردّ واعتراض کی باتیں اس غرض سے کرتے ہیں کہ دینِ حق کو فروغ نہ ہو، اور بعض اوقات قولی شبہات مؤثر ہوجاتے ہیں، یا یہ تمثیل ہے کہ ان کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی مُنہ سے نورِ آلٰہی کو بجھانا چاہتا ہو یعنی ایسے طریقہ سے بجھاوے جس میں کام رہے) حالانکہ اللہ اپنے نور (مذکور) کو کمال تک پہنچا کر رہے گا گو کافر لوگ کیسے ہی ناخوش ہوں (چنانچہ) وہ اللہ ایسا ہے جس نے (اسی اتمامِ نور کے لئے) اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہدایت (کا سامان یعنی قرآن) اور سچا دین (یعنی اسلام) دے کر (دنیا میں) بھیجا ہے تاکہ اس (دین) کو (کہ وہ نور مذکور ہی) تمام (بقیہ) دینوں پر غالب کردے (کہ یہی اتمام ہے) گو مشرک کیسے ہی ناخوش ہوں، (وقد مر تفسیر الاتمام والظہور فی سورۃ البرأۃ فی مثل ہذہ الآیۃ)

معارف ومسائل

شانِ نزول ترمذی نے حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے روایت کیا ہے، اور حاکم نے اس کو روایت کرکے سند کو صحیح قرار دیا ہے، کہ صحابۂ کرام کی ایک جماعت نے آپس میں یہ مذاکرہ کیا کہ اگر ہمیں یہ معلوم ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب عمل کونسا ہے تو ہم اس پر عمل کریں، بغوی نے اس میں یہ بھی نقل کیا ہے کہ ان حضرات میں سے بعض نے کچھ ایسے الفاظ بھی کہے کہ اگر ہمیں اَحبّ الاعمال عنداللہ معلوم ہوجائے تو ہم اپنی جان ومال سب اُس کے لئے قربان کردیں (مظہری)

ابن کثیر نے بحوالہ مسند احمد روایت کیا ہے کہ ان چند حضرات نے آپس میں جمع ہوکر یہ مذاکرہ کیا، اور چاہا کہ کوئی صاحب جاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا سوال کریں مگر کسی کی ہمت نہ ہوئی ابھی یہ لوگ اسی حالت پر تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب لوگوں کو نام بنام اپنے پاس بلایا (جس سے معلوم ہوا کہ آپ کو بذریعہ وحی ان کا اجتماع اور ان کی گفتگو معلوم ہوگئی تھی) جب یہ سب لوگ حاضرِ خدمت ہوگئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری سورۂ صفّ پڑھ کر سُنائی جو اسی وقت آپؐ پر نازل ہوئی تھی۔

اس سورۃ نے یہ بھی بتلادیا کہ اَحبّ الاعمال جس کی تلاش میں یہ حضرات تھے وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے اور ساتھ ہی ان حضرات نے جو ایسے کلمات کہے تھے کہ اگر ہمیں معلوم ہوجائے تو ہم اس پر عمل

کرنے میں ایسی ایسی جانبازی دکھائیں وغیرہ جن میں ایک قسم کا دعویٰ ہے کہ ہم ایسا کر سکتے ہیں، اس پر ان حضرات کو تنبیہ کی گئی کہ کسی مومن کے لئے ایسے دعوے کرنا درست نہیں، اُسے کیا معلوم ہے کہ وقت پر وہ اپنے ارادے کو پورا کر بھی سکے گا یا نہیں، اس کے اسباب کا جمع ہونا اور موانع کا زائل ہونا اس کے اختیار میں نہیں، پھر خود اس کے دست و بازو اور اعضاء و جوارح بلکہ قلبی عزم و ارادہ ان میں سے کوئی چیز بھی بالکلیہ اس کے قبضہ میں نہیں اسی لئے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی قرآن کریم میں یہ تلقین کی گئی ہے کہ جو کام آپ کو آئندہ کل میں کرنا ہو اگر اس کو بیان کرنا ہے تو انشاء اللہ کی قید کے ساتھ بیان کرو کہ اگر اللہ نے چاہا تو میں کل فلاں کام کروں گا (لَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ) صحابہ کرام کی نیت و قصد خواہ دعوے کا نہ ہو مگر صورت دعویٰ کی تھی وہ اللہ کے نزدیک پسند نہیں کہ کوئی شخص کسی کام کے کرنے کا دعویٰ کرے بجز اس کے کہ اس کو اللہ کی مشیت کے حوالہ کرے، اور انشاء اللہ ساتھ کہے، اس تنبیہ کیلئے یہ آیات نازل ہوئیں۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ جو کام تمہیں کرنا نہیں ہے اس کا دعویٰ کیوں کرتے ہو، جس سے ایسے کام کے دعوے کی ممانعت تو واضح ہو ہی گئی، جس کو کرنے کا عزم و ارادہ ہی انسان کے دل میں نہ ہو کیونکہ یہ تو محض ایک جھوٹا دعویٰ ہے نام و نمود وغیرہ کے لئے ہو سکتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ شانِ نزول کے واقعہ میں جن صحابہ نے مذاکرہ کیا وہ ایسے نہ تھے کہ دل میں کچھ کرنے کا ارادہ ہی نہ ہو اور دعویٰ کریں، اس لئے اس کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ اگرچہ دل میں عزم و ارادہ کام کرنے کا ہو پھر بھی اپنے نفس پر بھروسہ کر کے دعویٰ کرنا کہ ہم فلاں کام کریں گے شانِ عبدیت کے خلاف ہے، اوّل تو اس کے کہنے ہی کی کیا ضرورت ہے جب موقع ملے کر گذرنا چاہئے، اور کسی مصلحت سے کہنا بھی پڑے تو اس کو انشاء اللہ کے ساتھ مقید کر دے تو پھر وہ دعویٰ نہیں رہے گا۔

مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ ایسے کام کا دعویٰ کرنا جس کے کرنے کا ارادہ ہی نہ ہو اور اس کو کرنا ہی نہ ہو یہ تو گناہ کبیرہ اور اللہ کی سخت ناراضی کا سبب ہے، کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ کا مصداق یہی ہے، اور جہاں یہ صورت نہ ہو بلکہ ارادہ کرنے کا ہو وہاں بھی اپنی قوت و قدرت پر بھروسہ کر کے دعویٰ کرنا ممنوع و مکروہ ہے۔

دعویٰ اور دعوت میں فرق مذکورہ تفسیر سے یہ معلوم ہو گیا کہ ان آیات کا تعلق دعوے سے ہے کہ جو کام آدمی کو کرنا نہیں ہے اس کا دعویٰ کرنا اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب ہے، رہا معاملہ دعوت و تبلیغ اور وعظ و نصیحت کا کہ جو کام آدمی خود نہیں کرتا اُس کی نصیحت دوسروں کو کرے، اور اس کی طرف دوسرے مسلمانوں کو دعوت دے، وہ اس آیت کے مفہوم میں تو شامل نہیں، اس کے احکام دوسری آیات اور احادیث میں مذکور ہیں، مثلاً قرآن کریم نے فرمایا اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ، یعنی

تم لوگوں کو تو نیک کام کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے آپ کو بھلا دیتے ہو کہ خود اس نیکی پر عمل نہیں کرتے۔
اس آیت نے امر بالمعروف اور وعظ و نصیحت کرنے والوں کو اس بات پر شرمندہ کیا ہے کہ لوگوں کو ایک نیک کام کی دعوت دو اور خود اس پر عمل نہ کرو، اور مقصد یہ ہے کہ جب دوسروں کو نصیحت کرتے ہو تو خود اپنے آپ کو نصیحت کرنا اس سے مقدم ہے جس کام کی طرف لوگوں کو بلاتے ہو خود بھی اس پر عمل کرو۔
لیکن یہ نہیں فرمایا کہ جب خود نہیں کرتے تو دوسروں کو کہنا بھی چھوڑ دو، اس سے معلوم ہوا کہ جس نیک کام کے خود کرنے کی ہمت و توفیق نہیں ہے اس کی طرف دوسروں کو بلانے اور نصیحت کرنے کا سلسلہ نہ چھوڑے، امید ہے کہ اس وعظ و نصیحت کی برکت سے کسی وقت اُس کو بھی عمل کی توفیق ہو جاوے، جیسا کہ بکثرت تجربہ و مشاہدہ میں آیا ہے، البتہ اگر وہ عمل واجب یا سنت مؤکدہ کے درجہ میں ہو تو آیاتِ مذکورہ پر نظر کر کے اپنے نفس میں نادم و شرمندہ ہونے کا سلسلہ جاری رکھنا بھی واجب ہے، اور اگر مستحبات کے متعلق ہے تو یہ سلسلہ ندامت بھی مستحب ہے۔
اگلی آیات میں اُس اصل معاملہ کا ذکر ہے جو اس سورت کے نزول کا سبب بنا، یعنی اس کا بیان کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کونسا عمل زیادہ محبوب ہے، اس کے متعلق ارشاد فرمایا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب وہ صفِ قتال ہے جو اللہ کے دشمنوں کے مقابلہ میں اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے قائم ہو اور مجاہدین کے عزم و ہمت کی وجہ سے ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ہو کہ اُن کے قدموں میں کوئی تزلزل نہ آنے پائے۔
اس کے بعد حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے جہاد فی سبیل اللہ اور اللہ کی راہ میں دشمنوں کی ایذائیں سہنے کا ذکر ہے، اور اس کے بعد پھر مسلمانوں کو جہاد کی تلقین کی گئی، حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے واقعات جن کا ذکر اس جگہ آیا ہے ان میں بھی بہت سے علمی و عملی فوائد اور ہدایات ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ انھوں نے جب بنی اسرائیل کو اپنی نبوت کے ماننے اور اطاعت کرنے کی دعوت دی تو دو چیزوں کو خصوصیت سے ذکر فرمایا ایک یہ کہ وہ کوئی انوکھے رسول نہیں، انوکھی باتیں لے کر نہیں آئے بلکہ وہ باتیں ہیں جو پہلے انبیاء علیہم السلام کہتے آئے ہیں، اور پہلی آسمانی کتابوں میں مذکور ہیں، اور بعد میں بھی جو آخری پیغمبر آنے والے ہیں وہ بھی اسی قسم کی ہدایات لیکر آئیں گے۔
یہاں پہلی کتابوں میں سے تورات کا خصوصیت سے ذکر غالباً اس لئے کیا کہ بنی اسرائیل پر نازل ہونے والی قریبی کتاب وہی تھی، ورنہ تصدیقِ انبیاء تو سب پچھلی کتابوں کو شامل اور عام ہے، نیز اس میں اشارہ اس طرف بھی ہے کہ شریعت عیسوی اگرچہ مستقل شریعت ہے مگر اس کے اکثر احکام شریعت موسوی اور تورات کے احکام ہی کے مطابق ہیں، صرف چند احکام ہیں جو بدلے گئے ہیں، یہ تو پچھلے انبیاء اور کتابوں کی تصدیق کا مضمون تھا، دوسری چیز یہ کہ بعد میں آنے والے رسول کی خوش خبری سُنائی، اس میں بھی

اس طرف اشارہ ہے کہ اُن کی ہدایات بھی اسی کے مطابق ہوں گی، اس لئے اس پر ایمان لانا عین تقاضائے عقل و دیانت ہے۔

ساتھ ہی جس آنے والے رسول کی خوش خبری عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو سُنائی، اس کا نام پتہ بھی انجیل میں بتلا دیا گیا، اس میں بنی اسرائیل کو اس کی ہدایت ہو کہ جب وہ رسول تشریف لائیں، تو تمہارا فرض ہوگا کہ اُن پر ایمان لاؤ، اور ان کی اطاعت کرو، مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ، میں اسی کا بیان ہے، اس میں آنے والے رسولؐ کا نام احمدؐ بتلایا گیا ہے، ہمارے نبی خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کا نام محمدؐ بھی تھا اور احمدؐ بھی اور بھی متعدد نام تھے، مگر انجیل میں آپؐ کا نام احمدؐ بتلانے میں شاید یہ مصلحت ہو کہ محمدؐ نام رکھنے کا عرب میں قدیم سے دستور تھا، اس لئے اس نام کے دوسرے آدمی بھی عرب میں تھے، بخلاف احمدؐ کے، یہ نام عرب میں معروف نہیں تھا، وہ آپؐ کی ذات ہی کے ساتھ مخصوص تھا۔

انجیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت

یہ سب کو معلوم ہے اور خود یہود و نصاریٰ کو بھی اس کا اقرار کرنا پڑا ہے کہ تورات و انجیل میں تحریف ہوئی ہے، اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان دونوں کتابوں میں تحریف اتنی ہوئی ہو کہ اصل کلام کا پہچاننا بھی آسان نہیں رہا، موجودہ تحریف شدہ انجیل کی بنا پر آجکل کے عیسائی قرآن کی اس خبر کو تسلیم نہیں کرتے کہ انجیل میں کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام احمد لیکر خوش خبری دی گئی ہو، اس کا مختصر جواب وہ کافی ہے جو اوپر خلاصۂ تفسیر میں آچکا ہے۔

اور مفصل جواب کے لئے حضرت مولانا رحمۃ اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب اظہار الحق کا مطالعہ کیا جائے جو مذہب عیسائیت کی حقیقت اور انجیل میں تحریفات اور باوجود تحریفات کے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارتیں موجود ہونے کے متعلق بے نظیر کتاب ہے، خود بڑے عیسائیوں کے مقولے چھپے ہوئے ہیں کہ اگر "دنیا میں یہ کتاب شائع ہوتی رہی تو عیسائیت کا کبھی فروغ نہیں ہو سکتا۔

یہ کتاب عربی زبان میں لکھی گئی تھی پھر ترکی، انگریزی میں اس کے ترجمے چھپے، مگر اس کے شواہد موجود ہیں کہ عیسائی مشن نے اس کتاب کو گم کر دینے میں اپنی پوری کوشش صرف کی ہے، اس کا اردو ترجمہ اب تک نہیں ہوا تھا، حال میں اس کا اردو ترجمہ دارالعلوم کراچی کے مدرس مولانا اکبر علی صاحب نے اور تحقیقاتِ جدیدہ مفیدہ موجودہ زمانے کی مطبوعہ انجیلوں سے مولانا محمد تقی صاحب استاذ دارالعلوم نے لکھی ہیں، جو تین جلدوں میں شائع ہو چکی ہے، اس کی تیسری جلد میں صفحہ ۱۸۲ سے صفحہ ۳۶۲ تک انہی بشارتوں کی تفصیل موجودہ انجیلوں کے حوالہ سے اور شبہات کے جوابات مذکور ہیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۱۰﴾

اے ایمان والو میں بتلاؤں تم کو ایسی سوداگری جو بچائے تم کو ایک عذاب دردناک سے،

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ

ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور لڑو اللہ کی راہ میں اپنے مال سے اور اپنی

اَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ

جان سے، یہ بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم سمجھ رکھتے ہو، بخشے گا وہ تمہارے گناہ

وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ

اور داخل کرے گا تم کو باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں اور ستھرے گھروں میں بسنے کے

عَدْنٍ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۲﴾ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ

باغوں کے اندر یہ ہے بڑی مراد ملنی، اور ایک اور چیز دے جس کو تم چاہتے ہو مدد اللہ کی طرف سے اور فتح

قَرِيْبٌ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ

جلدی اور خوشی سنادے ایمان والوں کو، اے ایمان والو! تم ہو جاؤ مددگار اللہ کے

كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ

جیسے کہا عیسیٰ مریم کے بیٹے نے اپنے یاروں کو کون ہے کہ مدد کرے میری اللہ کی راہ میں، بولے یار

نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَكَفَرَتْ

ہم ہیں مددگار اللہ کے پھر ایمان لایا ایک فرقہ بنی اسرائیل سے اور منکر ہوا ایک

طَّاۗىِٕفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ﴿۱۴﴾ ع

فرقہ پھر قوت دی ہم نے اُن کو جو ایمان لائے تھے اُن کے دشمنوں پر پھر ہو رہے غالب،

خلاصۂ تفسیر

(آگے اول جہاد کا ثمرۂ آخرت پھر ثمرۂ دنیویہ کا وعدہ کر کے ترغیب دیتے ہیں) اے ایمان والو کیا میں تم کو ایسی سوداگری بتلاؤں جو تم کو ایک دردناک عذاب سے بچالے (وہ یہ ہے کہ) تم لوگ اللہ پر اور اسکے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مال و جان سے جہاد کرو، یہ تمہارے لئے بہت ہی بہتر ہے اگر تم کچھ سمجھ رکھتے ہو

(جب ایسا کروگے تو) اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کرے گا اور تم کو (جنّت کے) ایسے باغوں میں داخل کریگا کہ جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور عمدہ مکانوں میں (داخل کرے گا) جو ہمیشہ رہنے کے باغوں میں (بنے) ہونگے یہ بڑی کامیابی ہے اور (اس ثمرۂ حقیقیہ اُخرویہ کے علاوہ) ایک اور ثمرہ (دنیویہ) بھی ہے کہ تم اس کو (بھی خاص طور پر) پسند کرتے ہو (یعنی) اللہ کی طرف سے مدد اور جلدی فتح یابی ہے (اس کا خاص طور پر محبوب ہونا اس لئے ہے کہ انسان طبعًا ثمرۂ عاجلہ بھی چاہتا ہے) اور (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (ان تمام امور کی) مؤمنین کو بشارت دیدیجئے (چنانچہ فتح و نصرت کی پیشنگوئی کا ظہور اسلامی فتوحات سے ظاہر ہے،

آگے اصحاب عیسیٰ علیہ السلام کا قصہ یاد دلاکر نصرتِ دین کی ترغیب دیتے ہیں کہ) اے ایمان والو تم اللہ کے (دین کے) مددگار ہو جاؤ (اس طریقہ سے جو تمہارے لئے مشروع ہے یعنی جہاد) جیسا کہ (حواریین اپنی شریعت کے طریقے کے موافق ناصرِ دین ہوئے تھے جبکہ لوگ کثرت سے عیسیٰ علیہ السلام کے دشمن اور مخالف تھے اور جبکہ) عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) نے (ان) حواریین سے فرمایا کہ اللہ کے واسطے میرا کون مددگار ہوتا ہے، وہ حواری بولے ہم اللہ (کے دین) کے مددگار ہیں (چنانچہ ان حواریین نے دین کی یہ مدد کی کہ اس کی اشاعت میں کوشش کی) سو (اس کوشش کے بعد) بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ ایمان لائے اور کچھ لوگ منکر رہے، (پھر ان میں باہم اختلافِ مذہبی سے عداوت اور خانہ جنگیاں ہوئیں یا مذہبی گفتگو ہوتی) سو ہم نے ایمان والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں تائید کی سو وہ غالب ہوگئے (اسی طرح تم دینِ محمدی کے لئے کوشش اور جہاد کرو، اور اگر ابتداء ان خانہ جنگیوں کی کفار کی طرف سے ہو تو اس سے دینِ عیسوی میں جہاد کا ہونا لازم نہیں آتا)

معارف و مسائل

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ

اس آیت میں ایمان اور مجاہدہ بالمال والنفس کو تجارت فرمایا ہے، کیونکہ جس طرح تجارت میں کچھ مال خرچ کرنے اور محنت کرنے کے صلہ میں منافع حاصل ہوتے ہیں ایمان کے ساتھ اللہ کی راہ میں جان و مال خرچ کرنے کے بدلے میں اللہ کی رضا اور آخرت کی دائمی نعمتیں حاصل ہوتی ہیں، جس کا ذکر اگلی آیت میں ہے کہ جس نے یہ تجارت اختیار کی اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف کردے گا، اور جنت میں اس کو پاکیزہ و بہترین مساکن و مکانات عطا فرمادے گا، جن میں ہر طرح کے آرام و عیش کے سامان ہونگے جیسا کہ حدیث میں مساکنِ طیبہ کی تفسیر میں اس کا بیان آیا ہے، آگے آخرت کی نعمتوں کے ساتھ کچھ دنیا کی نعمتوں کا بھی وعدہ فرماتے ہیں:-

وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ لفظ اُخریٰ نعمت کی صفت ہے معنی یہ

یہ ہیں کہ آخرت کی نعمتیں اور جنت کے مکانات تو ملیں گے ہی جیساکہ وعدہ کیا گیا ہے، ایک نعمت نقد دنیا میں بھی ملنے والی ہے وہ ہے اللہ کی مدد اور اس کے ذریعہ فتح قریب یعنی دشمنوں کے ممالک کا فتح ہونا، یہاں قریب اگر بمقابلہ آخرت کے لیا جائے تو بعد میں آنے والی اسلامی فتوحات عرب و عجم کی سب اس میں داخل ہیں اور قریب عرفی مراد لیا جائے تو اس کا پہلا مصداق فتح خیبر ہے، اور اس کے بعد فتح مکہ مکرمہ ہے، اور اس فتح قریب کے متعلق تُحِبُّونَهَا فرمایا یعنی یہ نقد نعمت تمہاری پسندیدہ اور محبوب ہے، کیونکہ انسان فطری طور پر عجلت پسند واقع ہوا ہے، قرآن کریم میں ہے وَكَانَ الْإِنسَانُ عَجُولًا، یعنی ہے انسان جلد باز" اس کا یہ مفہوم نہیں کہ آخرت کی نعمتیں ان کو محبوب نہ تھیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ آخرت کی نعمتوں کی طلب و محبت تو ظاہر ہی ہے، مگر طبعی طور پر کچھ نقد نعمت دنیا میں بھی تمہیں مطلوب و محبوب ہے، وہ بھی عطا کی جائے گی۔

كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّينَ مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ ، حوارین، حواری کی جمع ہے جس کے معنی مخلص دوست کے ہیں جو ہر عیب سے پاک و صاف ہو (روح از ازہری) اسی لئے جو لوگ عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے ان کو حواری کہا جاتا ہے، اور وہ بارہ آدمی تھے جیساکہ سورۃ آل عمران میں گذر چکا ہے۔

اس آیت میں زمانہ عیسیٰ علیہ السلام کے ایک واقعہ کا ذکر کر کے مسلمانوں کو اس کی ترغیب دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی مدد کے لئے تیار ہو جائیں، جیساکہ عیسیٰ علیہ السلام جب دشمنوں سے تنگ آئے تو لوگوں سے کہا مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللهِ، یعنی اللہ کے دین کی اشاعت میں کون میرا مددگار ہوتا ہے، جس پر بارہ آدمیوں نے وفاداری کا عہد کیا اور پھر دین عیسوی کی اشاعت میں خدمات انجام دیں، تو مسلمانوں کو بھی چاہئے کہ اللہ کے دین کے انصار و مددگار بنیں۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس حکم کی تعمیل ایسی کی کہ پچھلی اُمتوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد اور دین کی خاطر سب عرب و عجم سے دشمنی خریدی، ان کی ایذائیں سہیں، اپنی جان و مال اور اولاد کو اس پر قربان کیا، اور بالآخر اللہ تعالیٰ نے اپنی فتح و نصرت سے نوازا، اور سب دشمنوں پر اُن کو غالب فرمایا ان کے ممالک ان کے ہاتھ آئے اور دنیا کی فرمانروائی بھی اُن کو نصیب ہوئی۔

فَآمَنَت طَّائِفَةٌ مِّن بَنِي إِسْرَائِيلَ وَكَفَرَت طَّائِفَةٌ فَأَيَّدْنَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَىٰ عَدُوِّهِمْ فَأَصْبَحُوا ظَاهِرِينَ۔

عیسائیوں کے تین فرقے بغوی نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان میں اٹھا لیا تو عیسائیوں میں تین فرقے ہو گئے، ایک فرقہ نے کہا کہ وہ خود خدا ہی تھے آسمان میں چلے گئے، دوسرے فرقہ نے کہا کہ وہ خدا تو نہیں بلکہ خدا کے بیٹے

تھے اللہ نے ان کو اٹھالیا اور دشمنوں پر فوقیت دیدی، تیسرے فرقہ نے وہ بات کہی جو صحیح اور حق ہے، کہ وہ نہ خدا تھے نہ خدا کے بیٹے بلکہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو دشمنوں سے حفاظت اور رفعتِ درجہ کے لئے اٹھالیا، یہ لوگ صحیح مؤمن تھے، تینوں فرقوں کے ساتھ کچھ عوام لگ گئے اور باہمی نزاع بڑھتے بڑھتے باہم قتال کی نوبت آگئی، اتفاق سے دونوں کافر فرقے مؤمنین پر غالب آگئے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا جنھوں نے اس مؤمن فرقہ کی تائید کی اس طرح انجام کار وہ مؤمن فرقہ بحیثیت حجت و دلیل کے غالب آگیا (مظہری)

اس تفسیر کے مطابق اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا سے ..... مؤمنین اُمّت عیسیٰ علیہ السلام ہی مراد ہوں گے جو حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و حمایت سے مظفر و منصور ہوں گے (مظہری) اور بعض حضرات نے فرمایا کہ رفعِ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد عیسائیوں میں دو فرقے ہوگئے، ایک عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا قرار دے کر مشرک ہوگیا، دوسرا صحیح دین پر قائم رہا جو اُنکو اللہ کا بندہ اور رسول کہنے کا قائل تھا، پھر اُن مشرکین و مؤمنین میں باہم جنگ ہوئی، تو اللہ تعالیٰ نے مؤمنین امتِ عیسیٰ علیہ السلام کو اس اُمّت کے کافروں پر غالب کردیا، مگر مشہور یہ ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مذہب میں جہاد و قتال کا حکم نہیں تھا، اس لئے مؤمنین کا قتال کرنا بعید معلوم ہوتا ہے (روح المعانی) مگر اوپر خلاصۂ تفسیر میں اس کے جواب میں اشارہ کردیا گیا ہے کہ اس کا امکان ہے کہ جنگ کی ابتداء کفار نصاریٰ کی طرف سے ہوئی ہو اور مؤمنین مدافعت پر مجبور ہوگئے ہوں، تو یہ جہاد و قتال کے حکم میں نہیں آتا، واللہ اعلم۔

تمّت

سُوْرَةُ الصَّفِّ بِحَمْدِ اللّٰهِ وَعَوْنِهٖ
لِلْحَادِیْ وَالْعِشْرِیْنَ مِنْ جُمَادَی الْاُوْلٰی
سنہ ۱۳۹۱ھ یَوْمَ الْخَمِیْسِ وَیَتْلُوْهَا اِنْشَآءَ اللّٰهُ
سُوْرَةُ الْجُمُعَةِ۔

سُوْرَةُ الْجُمُعَةِ

سُوْرَةُ الْجُمُعَةِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ اِحْدٰى عَشْرَةَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۃ جمعہ مدینہ میں نازل ہوئی اس کی گیارہ آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے ،

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ

اللہ کی پاکی بولتا ہے جو کچھ کہ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ کہ ہے زمین میں بادشاہ پاک ذات

الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ① هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ

زبردست حکمتوں والا ، وہی ہے جس نے اٹھایا ان پڑھوں میں ایک رسول انہی میں کا

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ

پڑھ کر سناتا ہے ان کو اس کی آیتیں اور ان کو سنوارتا ہے اور سکھلاتا ہے ان کو کتاب اور عقلمندی

وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ② وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا

اور اس سے پہلے وہ پڑے ہوئے تھے صریح بھول میں ، اور (اٹھایا اس رسول کو ایک) دوسرے لوگوں کیواسطے بھی

يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ③ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ

انہی میں سے جو ابھی نہیں ملے انمیں اور وہی ہے زبردست حکمت والا ، یہ بڑائی اللہ کی ہے دیتا ہے جس کو

مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ④ مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ

چاہے اور اللہ کا فضل بڑا ہے ، مثال ان لوگوں کی جن پر لادی توریت

ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا ۭ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ

پھر نہ اٹھائی انھوں نے جیسے مثال گدھے کی کہ پیٹھ پر لے چلتا ہے کتابیں، بُری مثال ہے اُن لوگوں کی جنھوں نے

كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿۵﴾ قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ

جھٹلایا اللہ کی باتوں کو اور اللہ راہ نہیں دیتا بے انصاف لوگوں کو، تو کہہ اے یہودی

هَادُوا إِنْ زَعَمْتُمْ أَنَّكُمْ أَوْلِيَاءُ لِلَّهِ مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ

ہونے والو اگر تم کو دعویٰ ہے کہ تم دوست ہو اللہ کے سب لوگوں کے سوائے تو مناؤ اپنے مرنے کو

إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۶﴾ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ۚ

اگر تم سچے ہو، اور وہ کبھی نہ منائیں گے اپنا مرنا اُن کاموں کی وجہ سے جنکو آگے بھیج چکے ہیں اُنکے ہاتھ

وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿۷﴾ قُلْ إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِي تَفِرُّونَ مِنْهُ فَإِنَّهُ

اور اللہ کو خوب معلوم ہیں سب گنہگار، تو کہہ موت وہ جس سے تم بھاگتے ہو سو وہ تم سے ضرور

مُلَاقِيكُمْ ۖ ثُمَّ تُرَدُّونَ إِلَىٰ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا

ملنے والی ہے پھر تم پھیرے جاؤ گے اس چھپے اور کھلے جاننے والے کے پاس پھر جتلادے گا تم کو

كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۸﴾ ع

جو تم کرتے تھے،

ع ۱۸ ۱۱

خلاصۂ تفسیر

سب چیزیں جو کچھ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں (قالاً یا حالاً) اللہ کی پاکی بیان کرتی ہیں، جو کہ بادشاہ ہے (عیبوں سے) پاک ہے زبردست ہے حکمت والا ہے وہی ہے جس نے (عرب کے) ناخواندہ لوگوں میں انہی (کی قوم) میں سے (یعنی عرب میں سے) ایک پیغمبر بھیجا جو اُن کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو (عقائد باطلہ اور اخلاق ذمیمہ سے) پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور دانشمندی (کی باتیں جن میں سب علوم ضروریہ دینیہ آگئے) سکھلاتے ہیں اور یہ لوگ (آپ کی بعثت کے) پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے (یعنی شرک و کفر میں اور مراد اکثر ہیں کیونکہ جاہلیت میں بھی بعضے مُوحّد تھے، مگر تاہم تکمیل ہدایت کے وہ بھی محتاج تھے) اور (علاوہ ان موجودین کے) دوسروں کے لئے بھی (آپ کو مبعوث فرمایا) جو (اسلام لاکر) اُن میں سے ہونے والے ہیں لیکن ہنوز ان میں شامل نہیں ہوئے (خواہ بوجہ اس کے کہ موجود ہیں مگر

اسلام نہیں لائے یا بوجہ اس کے کہ ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے اس میں تمام اُمت قیامت تک عربی وعجمی سب آگئے اور ان کو مِنْهُمْ اس لئے فرمایا، کیونکہ مسلمان سب رشتۂ اسلام میں منسلک اور متحد ہیں کذا فی الخازن) اور وہ زبردست حکمت والا ہے (کہ اپنی قدرت اور حکمت سے ایسا نبی بھیجا اور پہلی آیت میں فی نفسہٖ ان صفات کا اثبات مقصود تھا پس تکرار نہ رہا اور) یہ (رسول کے ذریعہ سے ضلال سے نکل کر کتاب وحکمت وہدایت کی طرف آنا) خدا کا فضل ہے وہ فضل جس کو چاہتا ہے دیدیتا ہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے، (اگر سب کو بھی عنایت کرے تو وسعت ہے، مگر وہ اپنی حکمت سے جس کو چاہے تخصیص فرماتا ہے، اور جس کو چاہے بے بہرہ رکھتا ہے، جیساکہ اوپر اُمّیّین کے ایمان لانے سے اور آئندہ کی آیت میں علماء یہود کے ایمان نہ لانے سے یہ امر ظاہر ہے، آگے بعض مُکذّبین رسالت کی تقبیح ہے کہ) جن لوگوں کو توراۃ پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا پھر انھوں نے اس پر عمل نہیں کیا اُن کی حالت اُس گدھے کی سی حالت ہے جو بہت سی کتابیں لادے ہوئے ہے (مگر ان کتب کے نفع سے محروم ہے، اسی طرح اصل مقصود اور نفع علم کا عمل ہے، جب یہ نہ ہوا اور صرف تحصیل وحفظِ علم میں تعب ہوا تو بالکل ایسی ہی مثال ہوگئی اور گدھے کی تخصیص اس لئے کہ وہ جانوروں میں بیوقوف مشہور ہے تو اس میں زیادہ تنفیر ہوگئی غرض) ان لوگوں کی بُری حالت ہے، جنھوں نے خدا کی آیتوں کو جھٹلایا (جیسے یہ یہود ہیں) اور اللہ تعالیٰ ایسے ظالموں کو (توفیق) ہدایت (کی نہیں دیا کرتا کیونکہ جان کر عناد کرتے ہیں اور اگر ہدایت ہوگی تو بعد ترکِ عناد کے ہوگی اور توراۃ پر عمل کرنے کے لوازم میں سے ہے ایمان لانا آنحضرتؐ پر جیساکہ اس میں حکم ہے، پس ایمان نہ لانا مستلزم ہی ترکِ عمل بالتوراۃ کو اور اگر یہ لوگ یہ کہیں کہ ہم باوجود اس حالت کے بھی اللہ کے مقبول ہیں تو) آپ (ان سے) کہدیجئے کہ اے یہود یو اگر تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ تم بلا شرکتِ غیرے اللہ کے مقبول (محبوب) ہو تو تم (اس کی تصدیق کے لئے ذرا) موت کی تمنا کر (کے دکھلا) دو اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو اور (ہم تو پہلے ہی یہ کہہ دیتے ہیں کہ) وہ (خاص مدعی) کبھی اس (موت) کی تمنا نہ کریں گے بوجہ (خوفِ سزا) ان اعمال (کفریہ) کے جو اپنے ہاتھوں سمیٹے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو خوب اطلاع ہے ان ظالموں (کے حال) کی (جب تاریخ مقدمہ کی آوے گی، فرد قرار داد جرم سنا کر سزا کا حکم کر دیا جائے گا اور اس وعدۂ سزا کی تاکید کیلئے) آپ (ان سے یہ بھی) کہدیجئے کہ جس موت سے تم بھاگتے ہو (اور اس کی تمنا باوجود دعویٰ ولایت کے اس لئے نہیں کرتے ہو کہ سزا بھگتنا ہوگی) وہ (موت ایک روز) تم کو آپکڑے گی پھر تم پوشیدہ اور ظاہر کے جاننے والے (خدا) کے پاس لے جائے جاؤ گے پھر وہ تم کو تمہارے سب کئے ہوئے کام بتلا دے گا (اور سزا دے گا)۔

معارف ومسائل

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ، قرآن کریم کی جو سورتیں سَبَّحَ یا یُسَبِّحُ سے شروع

ہوتی ہیں اُن کو مسبحات کہا جاتا ہے، اُن سب میں تمام زمین و آسمان اور جو کچھ ان میں ہے سب کیلئے اللہ تعالیٰ کی تسبیح خوانی ثابت کی گئی ہے، یہ تسبیح حالی یعنی بزبان حال تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کا ذرّہ ذرّہ اپنے صانع حکیم کی حکمت و قدرت پر گواہی دیتا ہے یہی اس کی تسبیح ہے، اور صحیح بات یہ ہے کہ ہر چیز اپنے اپنے طرز میں حقیقی تسبیح کرتی ہے، کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ شعور و ادراک اللہ تعالیٰ نے ہر شجر و حجر اور ہر چیز میں اس کے حوصلے کے مطابق رکھا ہے اس عقل و شعور کا لازمی تقاضا تسبیح ہے، مگر ان چیزوں کی تسبیح کو لوگ سنتے نہیں، اسی لئے قرآن کریم میں فرمایا وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ، اکثر سورتوں کے شروع میں سَبَّحَ بصیغہ ماضی آیا ہے، صرف سورۃ جمعہ اور سورۃ تغابن میں بلفظ مضارع یُسَبِّحُ لایا گیا ہے، تغیر عنوان میں ایک بلاغت و لطافت بھی اس کا سبب ہو گئی ہے، وہ یہ ہے کہ صیغہ ماضی قطعیت اور یقین پر دلالت کرتا ہے اس لئے اکثر وہی استعمال فرمایا اور صیغہ مضارع کی دلالت استمرار و دوام پر ہے، دو جگہ اس فائدہ کے لئے صیغہ مضارع استعمال فرمایا۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ، اُمّیین، اُمّی کی جمع ہے، ناخواندہ شخص کو کہا جاتا ہے، عرب کے لوگ اس لقب سے معروف ہیں، کیونکہ ان میں نوشت و خواند کا رواج نہیں تھا بہت کم آدمی لکھے پڑھے ہوتے تھے، اس آیت میں حق تعالیٰ کی عظیم قدرت کے اظہار کے لئے خاص طور پر عربوں کے لئے یہ لقب اختیار فرمایا، اور یہ بھی کہ جو رسول بھیجا گیا وہ بھی انہی میں سے ہے یعنی اُمّی ہے، اس لئے یہ معاملہ بڑا حیرت انگیز ہے کہ قوم ساری اُمّی اور جو رسول بھیجا گیا وہ بھی اُمّی، اور جو فرائض اس رسول کے سپرد کئے گئے جن کا ذکر اگلی آیت میں آ رہا ہے وہ سب علمی تعلیمی اصلاحی ایسے ہیں کہ نہ کوئی اُمّی ان کو سکھا سکتا ہے اور نہ اُمّی قوم اُن کو سیکھنے کے قابل ہے۔

یہ صرف حق تعالیٰ جلّ شانہٗ کی قدرت کاملہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اعجاز ہی ہو سکتا ہے کہ آپؐ نے جب تعلیم و اصلاح کا کام شروع فرمایا تو انہی اُمّیین میں وہ علماء اور حکماء پیدا ہو گئے جن کے علم و حکمت، عقل و دانش اور ہر کام کی عمدہ صلاحیت نے سارے جہان سے اپنا لوہا منوا لیا،

بعثت نبویؐ کے تین مقصد | يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ،

اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تین وصف نعمائے الٰہیہ کے ضمن میں بتلائے گئے ہیں، ایک تلاوتِ آیاتِ قرآن، یعنی قرآن پڑھ کر اُمت کو سنانا، دوسرے اُن کو ظاہری اور باطنی ہر طرح کی گندگی اور نجاست سے پاک کرنا جس میں بدن اور لباس وغیرہ کی ظاہری پاکی بھی داخل ہے، اور عقائد و اعمال اور اخلاق و عادات کی پاکیزگی بھی، تیسرے تعلیم کتاب و حکمت۔

یہ تینوں چیزیں اُمت کے لئے حق تعالیٰ کے انعامات بھی ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد بھی۔

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ، تلاوت کے اصل معنی اتباع و پیروی کے ہیں، اصطلاح میں یہ لفظ کلام اللہ کے پڑھنے کے لئے استعمال ہوتا ہے، اور آیات سے آیاتِ قرآن کریم مراد ہیں، لفظ عَلَيْهِمْ سے یہ بتلایا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک منصب اور مقصدِ بعثت یہ ہے کہ آیاتِ قرآن لوگوں کو پڑھ کر سنادیں۔

آیت مذکورہ میں بعثتِ نبویؐ کا **دوسرا مقصد** يُزَكِّيْهِمْ بتلایا ہے، یہ تزکیہ سے مشتق ہے، جس کے معنی پاک کرنے کے ہیں، بیشتر معنوی اور باطنی پاکی کے لئے بولا جاتا ہے، یعنی کفر و شرک اور بُرے اخلاق و عادات سے پاک ہونا اور کبھی مطلقاً ظاہری اور باطنی پاکی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، یہاں بظاہر یہی عام معنی مراد ہیں۔

تیسرا مقصد يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ، کتاب سے مراد قرآن کریم اور حکمت سے مراد وہ تعلیمات و ہدایات ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قولاً یا عملاً ثابت ہیں، اسی لئے بہت سے حضرات مفسرین نے یہاں حکمت کی تفسیر سنت سے فرمائی ہے۔

ایک سوال و جواب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بظاہر ترتیب کا تقاضا یہ تھا کہ تلاوت کے بعد تعلیم کا ذکر کیا جاتا اس کے بعد تزکیہ کا، کیونکہ ان تینوں وظائف کی ترتیب طبعی یہی ہے کہ پہلے تلاوت یعنی تعلیم الفاظ پھر تعلیم معانی، اور ان دونوں کے نتیجے میں اعمال و اخلاق کی درستی جو تزکیہ کا مفہوم ہے، مگر قرآن کریم میں یہ آیت کئی جگہ آئی ہے، اکثر جگہوں میں ترتیب بدل کر تلاوت اور تعلیم کے درمیان تزکیہ کا ذکر فرمایا ہے۔

روح المعانی میں اس کی یہ کیفیت بتلائی ہے کہ اگر ترتیب طبعی کے مطابق رکھا جاتا تو یہ تینوں چیزیں مل کر ایک ہی چیز ہوتی جیسے معالجات کے نسخوں میں کئی دوائیں مل کر مجموعہ ایک ہی دوا کہلاتی ہے، اور یہاں اسی حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ یہ تینوں چیزیں الگ الگ مستقل نعمتِ خداوندی ہیں اور تینوں کو الگ الگ فرائضِ رسالت قرار دیا گیا ہے، اس ترتیب کے بدلنے سے اس طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔

اس آیت کی مکمل تفسیر و تشریح بہت سے اہم مسائل و فوائد پر مشتمل سورۂ بقرہ میں گذر چکی ہے اس کو دیکھ لیا جائے، معارف القرآن جلد اول صفحہ ۲۷۲ سے ۲۸۴ تک یہ مضامین آئے ہیں۔

وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ، آخرین کے لفظی معنی "دوسرے لوگ"، لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ کے معنی جو ابھی تک اُن لوگوں یعنی اُمّیین کے ساتھ نہیں ملے، مراد ان سے وہ تمام مسلمان ہیں جو قیامت تک اسلام میں داخل ہوتے رہیں گے، کما روی عن ابن زید و مجاہد وغیرہما اس میں اشارہ ہے کہ قیامت تک آنے والے مسلمان سب کے سب مؤمنین اوّلین یعنی صحابہ کرام ہی کے ساتھ ملحق سمجھے جائیں گے، یہ بعد کے مسلمانوں کیلئے بڑی بشارت ہے (روح)

لفظ آخَرِیْنَ کے عطف میں دو قول ہیں، بعض حضرات نے اس کو اُمِّیّٖنَ پر عطف قرار دیا ہے، جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ بھیجا اللہ نے اپنا رسول امیین میں اور ان لوگوں میں جو ابھی اُن سے نہیں ملے، اس پر جو یہ شبہ ہوتا ہے کہ امیین یعنی موجودین میں رسول بھیجنا تو ظاہر ہے، جو لوگ ابھی آئے ہی نہیں ان میں بھیجنے کا کیا مطلب ہوگا، اس کا جواب بیان القرآن میں یہ دیا ہے کہ ان میں بھیجنے سے مراد ان کیلئے بھیجنا ہے، کیونکہ لفظ فِیْ عربی زبان میں، اس معنے کے لئے بھی آتا ہے۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اٰخَرِیْنَ کا عطف یُعَلِّمُهُمْ کی ضمیر منصوب پر ہے، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم دیتے ہیں امیین کو بھی اور اُن لوگوں کو بھی جو ابھی اُن کے ساتھ ملے نہیں۔ (اختارہ فی المظہری)

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ سورۃ جمعہ آپؐ پر نازل ہوئی، (اور آپؐ نے ہمیں سُنائی) جب آپ نے یہ آیت پڑھی وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ، تو ہم نے عرض کیا یا رسول اللہؐ یہ کون لوگ ہیں جن کا ذکر آخَرِیْنَ کے لفظ سے کیا گیا ہے، آپؐ نے اس وقت سکوت فرمایا، مکرر سہ کرر سوال کیا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک حضرت سلمان فارسیؓ پر رکھ دیا (جو اُس وقت مجلس میں موجود تھے) اور فرمایا کہ اگر ایمان ثریّا ستارہ کی بلندی پر بھی ہوگا تو ان کی قوم کے کچھ لوگ وہاں سے بھی ایمان کو لے آئیں گے (مظہری)

اس روایت میں بھی اہلِ فارس کی تخصیص کا کوئی ثبوت نہیں بلکہ اتنا ثابت ہوا کہ یہ بھی آخَرِیْنَ کے مجموعہ میں داخل ہیں، اس حدیث میں اہلِ عجم کی بڑی فضیلت ہے (مظہری)

مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا،

اَسْفَار، سِفر بکسر سین کی جمع ہے، بڑی کتاب کو کہا جاتا ہے، سابقہ آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت و نبوت اُمیین میں ہونا اور آپؐ کی بعثت کے تین مقاصد کا ذکر جن الفاظ میں آیا ہے، پچھلی آسمانی کتاب توراۃ میں بھی آپؐ کا ذکر تقریباً انہی الفاظ و صفات کے ساتھ آیا ہے، جس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہی آپؐ پر ایمان لے آتے، مگر ان کو دنیا کے جاہ و مال نے توراۃ کے احکام سے اندھا کر دیا اور باوجود توراۃ کا علم ہونے کے عمل کے اعتبار سے ایسے ہوگئے جیسے بالکل جاہل ناواقف ہوں، اُن لوگوں کی مذمت مذکورہ آیت میں اس طرح کی گئی کہ یہ لوگ جن پر تورات لاد دی گئی تھی، یعنی اُن کو بے مانگے اللہ کی یہ نعمت دیدی گئی تھی، مگر انھوں نے اس کے اٹھانے کا حق ادا نہ کیا یعنی تورات کے احکام کی پروا نہ کی، ان کی مثال ایسی ہے جیسے گدھے کی پشت پر علوم و فنون کی بڑی بڑی کتابیں لاد دی جاتی ہیں، یہ گدھا اُن کا بوجھ تو

اٹھاتا ہے مگر ان کے مضامین کی نہ اس کو کچھ خبر ہے نہ اُن سے کوئی فائدہ اس کو پہونچتا ہے، یہود کا بھی یہی حال ہی کہ دنیا سازی کے لئے تورات تولئے پھرتے ہیں اور لوگوں میں اس کے ذریعہ جاہ اور اپنا مقام بھی پیدا کرنا چاہتے ہیں مگر اس کی ہدایات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے۔

عالم بے عمل کی مثال حضرات مفسرین نے فرمایا کہ جو مثال یہود کی دی گئی ہے، یہی مثال اُس عالم دین کی ہی جو اپنے علم پر عمل نہ کرے ؎

نہ محقق بود نہ دانش مند — چار پائے بر و کتابے چند

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔ یہود اپنے کفر و شرک اور ساری بداخلاقیوں کے باوجود یہ دعویٰ بھی رکھتے تھے نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ یعنی ہم تو اللہ کی اولاد اور محبوب ہیں، اور اپنے سوا کسی کو جنت کا مستحق نہ کہتے تھے بلکہ یوں کہا کرتے تھے لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا، گویا وہ آخرت کے عذاب سے اپنے آپ کو بالکل محفوظ و مامون سمجھتے اور جنت کی نعمتوں کو اپنی ذاتی جاگیر سمجھتے تھے، اور یہ ظاہر ہی کہ جس شخص کا یہ ایمان ہو کہ آخرت کی نعمتیں دنیا کی نعمتوں سے ہزاروں درجے افضل و بہتر ہیں اور دنیا میں ہر وقت یہ بھی دیکھتا رہتا ہے کہ یہاں کی زندگی رنج و غم اور تکلیفوں سے اور محنتوں سے خالی نہیں اور بیماریاں بھی آتی ہی رہتی ہیں، اور اس کو یہ بھی یقین ہو کہ موت آتے ہی مجھے وہ عظیم اور دائمی نعمتیں ضرور مل ہی جائیں گی، تو اس کا مقتضا یہ ہی کہ اگر اس میں ذرا بھی عقل و فہم ہے تو اس کے دل میں موت کی تمنا پیدا ہو اور وہ دل سے چاہے کہ موت جلد آجائے تاکہ دنیا کی مکدّر اور رنج و غم سے بھری ہوئی زندگی سے نکل کر خالص راحت اور آرام کی دائمی زندگی میں پہونچ جائے۔

اس لئے آیت مذکورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی گئی کہ آپ یہود سے فرمائیں کہ اگر تمھارا یہ دعویٰ کہ ساری مخلوق میں تم ہی اللہ کے محبوب اور لاڈلے ہو اور تمہیں یہ خطرہ بالکل نہیں کہ آخرت میں تمہیں کوئی عذاب ہو سکتا ہے تو پھر عقل کا تقاضا یہ ہے کہ تم موت کی تمنا کرو، اور اس کے مشتاق رہو۔

پھر قرآن نے خود ان کی تکذیب کر دی اور فرمایا وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ یعنی یہ لوگ ہرگز موت کی تمنا نہ کریں گے۔ بوجہ اس کے کہ اُن کے ہاتھوں نے (آخرت کے لئے کفر و شرک اور اعمالِ بد) آگے بھیج رکھے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ آخرت میں ہمارے لئے عذاب جہنم کے سوا کچھ نہیں، اور یہ دعوے اللہ کے مقبول و محبوب ہونے کے بالکل جھوٹ ہیں جن کا جھوٹ ہونا خود اُن پر بھی واضح ہے، مگر دنیا کے کچھ فوائد حاصل کرنے کے لئے ایسے دعوے کرتے ہیں، اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے پر موت کی تمنا ظاہر کر دی تو وہ ضرور قبول ہو جائے گی اور ہم

مرجائیں گے، اس لئے فرمایا کہ وہ ہرگز ایسی تمنّا نہیں کرسکتے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اس وقت ان میں کوئی موت کی تمنا کرتا تو اسی وقت مرجاتا (روح)

موت کی تمنا جائز ہے یا نہیں یہ بحث مفصل سورۃ بقرہ میں گذر چکی ہے، حدیث میں موت کی تمنّا کرنے سے منع فرمایا گیا ہے، اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ کسی شخص کو دنیا میں یہ یقین کرنے کا حق نہیں ہے کہ وہ مرتے ہی جنت میں ضرور جائے گا، اور کسی قسم کے عذاب کا اس کو خطرہ نہیں تو ایسی حالت میں موت کی تمنا کرنا اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بہادری جتانے کا مرادف ہے۔

قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ، یعنی یہود جو اس دعوے کے باوجود موت کی تمنّا سے گریز کرتے ہیں اس کا حاصل موت سے گریز کرنا اور بھاگنا ہے، ان کو آپ فرمادیں کہ جس موت سے تم بھاگتے ہو وہ تو آکر رہے گی، اس وقت نہیں تو پھر بعد چندروز کے، اس لئے موت سے فرار بالکلیہ کسی کے بس ہی میں نہیں۔

اسباب موت سے فرار کے احکام جو چیزیں عادۃً موت کا سبب ہوتی ہیں، اُن سے فرار مقتضائے عقل بھی ہے، مقتضائے شرع بھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جھکی ہوئی دیوار کے نیچے سے گذرے تو تیزی کے ساتھ نکل گئے، اسی طرح کہیں آگ لگ جائے وہاں سے نہ بھاگنا، عقل و شرع دونوں کے خلاف ہے، مگر وہ فرار من الموت جس کی مذمت آیت مذکورہ میں وارد ہوئی ہے اس میں داخل نہیں، جبکہ عقیدہ سالم ہو اور یہ جانتا ہو کہ جس وقت موت آجائے گی تو میرا بھاگنا مجھے بچا نہ سکے گا مگر چونکہ اس کو معلوم نہیں کہ یہ آگ یا زہر یا کوئی دوسری مہلک چیز متعین طور پر میری موت اس میں لکھدی گئی ہے، اس لئے اس سے بھاگنا فرار من الموت جو مذموم ہے اس میں داخل نہیں۔

باقی رہا طاعون یا وبا جس بستی میں آجائے اس سے بھاگنا یہ ایک مستقل مسئلہ ہے جس کی تفصیلات کتب فقہ و حدیث میں مذکور ہیں وہاں دیکھی جاسکتی ہیں، اور تفسیر روح المعانی میں اس آیت کے ذیل میں بھی اُس پر کافی بحث کر کے مسئلہ کو واضح کردیا ہے، یہاں اس کے نقل کی گنجائش نہیں،

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا

اے ایمان والو! جب اذان ہو نماز کی جمعہ کے دن تو دوڑو اللہ

اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَیْعَ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۹﴾

کی یاد کو اور چھوڑ دو خرید و فروخت یہ بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم کو سمجھ ہے

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ

پھر جب تمام ہو چکے نماز تو پھیل پڑو زمین میں اور ڈھونڈو فضل اللہ کا

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿١٠﴾ وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ

اور یاد کرو اللہ کو بہت سا تاکہ تمہارا بھلا ہو، اور جب دیکھیں سودا بکتا یا کچھ

لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا ۚ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ

تماشا متفرق ہو جائیں اس کی طرف اور تجھ کو چھوڑ جائیں کھڑا تو کہہ جو اللہ کے پاس ہے سو بہتر ہے

اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ۚ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِينَ ﴿١١﴾ ع

تماشے سے اور سوداگری سے اور اللہ بہتر ہے روزی دینے والا،

۲ ع (۳) ۱۲

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو جب جمعہ کے روز نماز (جمعہ) کے لئے اذان کہی جایا کرے تو تم اللہ کی یاد (یعنی نماز و خطبہ) کی طرف (فوراً) چل پڑا کرو اور خرید و فروخت (اور اسی طرح دوسرے مشاغل مانعہ عن السعی کما فی رد المحتار) چھوڑ دیا کرو (اور تخصیص بیع کی بوجہ زیادہ اہتمام کے ہے کہ اس کے ترک کو فوتِ نفع سمجھا جاتا ہے) یہ (چل پڑنا مشاغل بیع وغیرہ کو چھوڑ کر) تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے، اگر تم کو کچھ سمجھ ہو (کیونکہ اس کا نفع باقی ہے اور بیع وغیرہ کا نفع فانی) پھر جب نماز (جمعہ کی) پوری ہو چکے (اور اگر ابتداء میں خطبہ مؤخر تھا تو نماز پورا ہونے سے مراد اس کا مع متعلقات کے پورا ہونا ہے، جس کا حاصل نماز اور خطبہ کا پورا ہو چکنا ہے) تو (اس وقت تم کو اجازت ہے کہ) تم زمین پر چلو پھرو اور خدا کی روزی تلاش کرو (یعنی اس وقت دنیا کے کاموں کے لئے چلنے پھرنے کی اجازت ہے) اور (اس میں بھی) اللہ کو بکثرت یاد کرتے رہو (یعنی اشغالِ دنیویہ میں ایسے منہمک مت ہو جاؤ کہ احکام و عبادات ضروریہ سے غافل ہو جاؤ) تاکہ تم کو فلاح ہو اور (بعضے لوگوں کا یہ حال ہے کہ) وہ لوگ جب کسی تجارت یا مشغولی کی چیز کو دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑنے کے لئے بکھر جاتے ہیں اور آپ کو کھڑا ہوا چھوڑ جاتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ جو چیز (از قسم ثواب و قرب) خدا کے پاس ہے وہ ایسے مشغلہ اور تجارت سے بدرجہا بہتر ہے اور (اگر اس سے افزونی رزق کی طمع ہو تو سمجھو کہ) اللہ سب سے اچھا روزی پہنچانے والا ہے (اس کی طاعاتِ ضروریہ میں مشغول رہنے پر رزق مقدر دیتا ہے، پھر کیوں اس کے احکام کو ترک کیا جاوے)۔

معارف و مسائل

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ، یوم الجمعہ، اس دن کو یوم جمعہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ مسلمانوں کے اجتماع کا دن ہے، اور آسمان و زمین اور تمام کائنات کی تخلیق جو حق تعالیٰ نے چھ دن میں فرمائی ہے ان چھ میں سے آخری دن جمعہ ہے، جس میں تخلیق کی تکمیل ہوئی، اسی دن میں آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے، اسی روز میں اُن کو جنّت میں داخل کیا گیا، پھر اسی دن میں اُن کو زمین کی طرف اُتارا گیا، اسی دن میں قیامت قائم ہوگی، اور اسی دن میں ایک گھڑی ایسی آتی ہے کہ اس میں انسان جو بھی دُعاء کرے قبول ہوتی ہے یہ سب باتیں احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں (ابن کثیر)

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے اجتماع اور عید کا ہر ہفتہ میں یہ دن جمعہ کا رکھا تھا، مگر پچھلی اُمتوں کو اس کی توفیق نہ ہوئی، یہود نے یوم السبت (سنیچر کے دن) کو اپنا یوم اجتماع بنا لیا، نصاریٰ نے اتوار کو، اللہ تعالیٰ نے اِس اُمّت کو اس کی توفیق بخشی، کہ انھوں نے یوم جمعہ کا انتخاب کیا، (کمارواہ البخاری و مسلم عن ابی ہریرۃؓ، ابن کثیر) زمانۂ جاہلیت میں اس دن کو "یوم عروبہ" کہا جاتا تھا، سب سے پہلے عرب میں کعب بن لوئی نے اس کا نام جمعہ رکھا، اور قریش اُس دن جمع ہوتے، اور کعب بن لوئی خطبہ دیتے تھے، یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پانسو ساٹھ سال پہلے کا ہے۔

کعب بن لوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد میں سے ہیں، اُن کو حق تعالیٰ نے زمانۂ جاہلیت میں بھی بُت پرستی سے بچایا، اور توحید کی توفیق عطا فرمائی تھی، انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خوش خبری بھی لوگوں کو سُنائی تھی، قریش میں ان کی عظمت کا عالم یہ تھا کہ ان کی وفات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پانسو ساٹھ سال پہلے ہوئی، اسی سے اپنی تاریخ شمار کرنے لگے، عرب کی تاریخ ابتدار میں بناءِ کعبہ سے لی جاتی تھی کعب بن لوئی کی وفات کے بعد اس سے تاریخ جاری ہوگئی، پھر جب واقعۂ فیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے سال میں پیش آیا تو اس واقعہ سے عرب کی تاریخ کا سلسلہ جاری ہوگیا، خلاصہ یہ ہے کہ جمعہ کا اہتمام عرب میں قبل از اسلام بھی کعب بن لوئی کے زمانہ میں ہو چکا تھا، اور اس دن کا نام جمعہ رکھنا بھی انھی کی طرف منسوب ہے (مظہری)

بعض روایات میں ہے کہ انصار مدینہ نے قبل از ہجرت فرضیتِ جمعہ نازل ہونے سے پہلے اپنے اجتہاد سے جمعہ کے روز جمع ہونے اور عبادت کرنے کا اہتمام کر رکھا تھا، (کمارواہ عبدالرزاق باسناد صحیح عن محمد بن سیرین، از مظہری)

نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ ندار صلوٰۃ سے مراد اذان ہے، اور مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ بمعنی فی یوم الجمعہ ہے، فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ، سعی کے معنی دوڑنے کے بھی آتے ہیں اور کسی کام کو اہتمام کے ساتھ کرنے کے بھی، اس جگہ یہی دوسرے معنی مراد ہیں، کیونکہ نماز کے لئے دوڑتے ہوئے آنے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا، اور یہ ارشاد فرمایا ہے کہ جب نماز کے لئے آؤ تو سکینت اور وقار کے ساتھ آؤ، آیت کے معنی یہ ہیں کہ جب جمعہ کے دن جمعہ کی اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو، یعنی نماز و خطبہ کے لئے مسجد کی طرف چلنے کا اہتمام کرو، جیسا دوڑنے والا کسی دوسرے کام کی طرف توجہ نہیں دیتا، اذان کے بعد تم بھی کسی اور کام کی طرف بجز نماز و خطبہ کے توجہ نہ دو (ابن کثیر) ذِكْرِ اللّٰهِ سے مراد نماز جمعہ بھی ہو سکتی ہے اور خطبہ جمعہ جو نماز جمعہ کے شرائط و فرائض میں داخل ہے وہ بھی، اس لئے مجموعہ دونوں کا مراد لیا جائے یہ بہتر ہے (مظہری وغیرہ)

وَذَرُوا الْبَيْعَ، یعنی چھوڑ دو بیع (فروخت کرنے کو) صرف بیع کہنے پر اکتفاء کیا گیا اور مراد بیع و شراء (یعنی خرید و فروخت) دونوں ہیں، وجہ اکتفاء کی یہ ہے کہ ایک کے چھوٹنے سے دوسرا خود بخود چھوٹ جائے گا، جب کوئی فروخت کرنے والا فروخت نہ کرے گا تو خرید والے کے لئے خریدنے کا راستہ ہی نہ رہے گا۔

اس میں اشارہ اس طرف معلوم ہوتا ہے کہ اذان جمعہ کے بعد جو خرید و فروخت کو اس آیت نے حرام کردیا ہے اس پر عمل کرنا تو بیچنے والوں اور خریداروں سب پر فرض ہے، مگر اس کا عملی انتظام اس طرح کیا جائے کہ دکانیں بند کر دی جائیں تو خریداری خود بخود بند ہو جائے گی، اس میں حکمت یہ ہے کہ گاہکوں اور خریداروں کی تو کوئی حد و شمار نہیں ہوتی اُن سب کے روکنے کا انتظام آسان نہیں، فروخت کرنے والے دکاندار متعین اور معدود ہوتے ہیں ان کو فروخت سے روک دیا جائے تو باقی سب خرید سے خود رُک جائیں گے، اس لئے ذَرُوا الْبَيْعَ میں صرف بیع چھوڑ دینے کے حکم پر اکتفاء کیا گیا۔

فائدہ:۔ اذان جمعہ کے بعد سارے ہی مشاغل کا ممنوع کرنا مقصود تھا جن میں زراعت تجارت، مزدوری سبھی داخل ہیں، مگر قرآن کریم نے صرف بیع کا ذکر فرمایا، اس سے اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ جمعہ کی نماز کے مخاطب شہروں اور قصبوں والے ہیں، چھوٹے دیہات اور جنگلوں میں جمعہ نہیں ہوگا، اس لئے شہروں اور قصبوں میں جو مشاغل عام لوگوں کو پیش آتے ہیں ان کی ممانعت فرمائی گئی وہ بیع و شراء کے ہوتے ہیں، بخلاف گاؤں والوں کے کہ ان کے مشاغل کاشت اور زمین سے متعلق ہوتے ہیں، اور باتفاقِ فقہاء اُمّت یہاں بیع سے مراد فقط فروخت کرنا نہیں بلکہ ہر وہ کام جو جمعہ کی طرف جانے کے اہتمام میں مخل ہو وہ سب بیع کے مفہوم میں داخل ہے اس لئے

اذانِ جمعہ کے بعد کھانا پینا، سونا، کسی سے بات کرنا، یہاں تک کہ کتاب کا مطالعہ کرنا وغیرہ سب ممنوع ہیں، صرف جمعہ کی تیاری کے متعلق جو کام ہوں وہ کئے جاسکتے ہیں۔

اذانِ جمعہ شروع میں صرف ایک ہی تھی جو خطبہ کے وقت امام کے سامنے کہی جاتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پھر صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسی طرح رہا، حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے میں جب مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوگئی، اور اطرافِ مدینہ میں پھیل گئے، امام کے سامنے والی خطبہ کی اذان دور تک سنائی نہ دیتی تھی، تو عثمان غنیؓ نے ایک اور اذان مسجد سے باہر اپنے مکان زوراء پر شروع کرادی، جس کی آواز پورے مدینہ میں پہونچنے لگی، صحابہ کرام میں سے کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا، اس لئے یہ اذان اوّل باجماع صحابہ مشروع ہوگئی، اور اذان جمعہ کے وقت بیع وشراء وغیرہ تمام مشاغل حرام ہوجانے کا حکم جو پہلے اذان خطبہ کے بعد ہوتا تھا اب پہلی اذان کے بعد سے شروع ہوگیا، کیونکہ الفاظِ قرآن (نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ) اس پر بھی صادق ہیں، یہ تمام باتیں حدیث وتفسیر اور فقہ کی عام کتابوں میں بلا اختلاف مذکور ہیں۔

اس پر پوری امت کا اجماع واتفاق ہے کہ جمعہ کے روز ظہر کے بجائے نمازِ جمعہ فرض ہے، اور اس پر بھی اجماع واتفاق ہے کہ نمازِ جمعہ عام پانچ نمازوں کی طرح نہیں اس کے لئے کچھ مزید شرائط ہیں، پانچوں نمازیں تنہا بلاجماعت کے بھی پڑھی جاسکتی ہیں، دو آدمی کی بھی جماعت سے اور جمعہ بغیر جماعت کے ادا نہیں ہوتا، اور جماعت کی تعداد میں فقہاء کے اقوال مختلف ہیں، اسی طرح نماز پنجگانہ ہر جگہ دریا، پہاڑ، جنگل میں ادا ہوجاتی ہے، مگر جمعہ جنگل، صحرا میں کسی کے نزدیک ادا نہیں ہوتا، عورتوں، مریضوں، مسافروں پر جمعہ فرض نہیں، وہ جمعہ کی بجائے ظہر کی نماز پڑھیں، جمعہ کس قسم کی بستی والوں پر فرض ہے اس میں ائمہ فقہاء کے اقوال مختلف ہیں، امام شافعیؒ کے نزدیک جس بستی میں چالیس مرد احرار، عاقل، بالغ بستے ہوں اس میں جمعہ ہوسکتا ہے اس سے کم میں نہیں، امام مالکؒ کے نزدیک ایسی بستی کا ہونا ضروری ہے جس کے مکانات متصل ہوں اور اس میں بازار بھی ہو، امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک جمعہ کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ شہر یا قصبہ یا بڑا گاؤں ہو جس میں گلی کوچے اور بازار ہوں اور کوئی قاضی حاکم فیصلۂ معاملات کے لئے ہو، مسئلہ اور اس کے دلائل کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، حضرات علماء نے اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھ کر سب کچھ واضح کردیا ہے۔

خلاصہ یہ ہی کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اور فَاسْعَوْا باتفاق جمہور امت عام مخصوص البعض ہے، علی الاطلاق ہر مسلمان پر جمعہ فرض نہیں، بلکہ کچھ قیود وشرائط سب کے نزدیک ہیں، اختلاف صرف شرائط کی تعیین میں ہی، البتہ جہاں فرض ہو اُن کے لئے اس فرض کی بڑی اہمیت وتاکید ہے

ان لوگوں میں بلا عذر شرعی کوئی جمعہ چھوڑ دے تو احادیث صحیحہ میں اُس پر سخت وعیدیں آئی ہیں، اور نماز جمعہ اس کے شرائط و آداب کے ساتھ ادا کرنے والوں کے مخصوص فضائل و برکات کا وعدہ ہے۔

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ، سابقہ آیات میں اذانِ جمعہ کے بعد بیع و شراء وغیرہ کے تمام دنیوی امور کو ممنوع کر دیا گیا تھا، اس آیت میں اس کی اجازت دیدی گئی کہ نماز جمعہ سے فارغ ہونے کے بعد، تجارتی کاروبار اور اپنا اپنا رزق حاصل کرنے کا اہتمام سب کر سکتے ہیں۔

جمعہ کے بعد تجارت و کسب میں برکت

حضرت عراک بن مالک رضی اللہ عنہ جب نمازِ جمعہ سے فارغ ہو کر باہر آتے تو دروازۂ مسجد پر کھڑے ہو کر یہ دعاء کرتے تھے؛

اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَجَبْتُ دَعْوَتَكَ وَصَلَّيْتُ فَرِيْضَتَكَ وَانْتَشَرْتُ كَمَا أَمَرْتَنِيْ فَارْزُقْنِيْ مِنْ فَضْلِكَ وَأَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (رواہ ابن ابی حاتم، از ابن کثیر)

"یعنی یا اللہ میں نے تیرے حکم کی اطاعت کی اور تیرا فرض ادا کیا اور جیسا کہ تو نے حکم دیا ہے نماز پڑھ کر میں باہر جاتا ہوں تو اپنے فضل سے مجھے رزق عطا فرما اور تو تو سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔"

اور بعض سلفِ صالحین سے منقول ہے کہ جو شخص نمازِ جمعہ کے بعد تجارتی کاروبار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے ستر مرتبہ برکات نازل فرماتے ہیں، (ابن کثیر)

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ، یعنی نمازِ جمعہ سے فارغ ہو کر کسب معاش تجارت وغیرہ میں لگو، مگر کفار کی طرح خدا سے غافل ہو کر نہ لگو، عین خرید و فروخت اور مزدوری کے وقت بھی اللہ کی یاد جاری رکھو۔

وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوْا إِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَائِمًا قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ، اس آیت میں ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے جو جمعہ کا خطبہ چھوڑ کر تجارتی کام کی طرف متوجہ ہو گئے تھے، امام ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خطبۂ جمعہ نمازِ جمعہ کے بعد دیا کرتے تھے جیسا کہ عیدین میں اب بھی یہی معمول ہے، ایک جمعہ کے روز یہ واقعہ پیش آیا کہ نمازِ جمعہ سے فارغ ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے، کہ اچانک ایک تجارتی قافلہ مدینہ طیبہ کے بازار میں پہنچا، اور ڈھول باجہ وغیرہ سے اس کا اعلان ہونے لگا، اس وقت نمازِ جمعہ سے فراغت ہو چکی تھی، خطبہ ہو رہا تھا، بہت سے حضرات صحابہ بازار چلے گئے اور آپ کے ساتھ تھوڑے سے حضرات رہ گئے، جن کی تعداد بارہ بتلائی گئی ہے (یہ روایت ابو داؤد نے مراسیل میں بیان فرمائی ہے)، بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ

پر فرمایا کہ اگر تم سب کے سب چلے جاتے تو مدینہ کی ساری وادی عذاب کی آگ سے بھر جاتی (رواہ ابو یعلی، ابن کثیر)
امام تفسیر مقاتل کا بیان ہے کہ یہ تجارتی قافلہ دحیہ بن خلف کلبی کا تھا، جو ملک شام سے آیا تھا، اور تجار مدینہ میں اس کا قافلہ عموماً تمام ضروریات لے کر آیا کرتا تھا، اور جب مدینہ کے لوگوں کو اس کی آمد کی خبر ملتی تھی تو سب مرد و عورت اس کی طرف دوڑتے تھے، یہ دحیہ بن خلف اس وقت تک مسلمان نہ تھے بعد میں داخل اسلام ہوئے۔

اور حسن بصریؒ اور ابو مالکؒ نے فرمایا کہ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مدینہ میں اشیاء ضرورت کی کمی اور سخت گرانی تھی (تفسیر مظہری) یہ اسباب تھے کہ حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بڑی جماعت تجارتی قافلہ کی آواز پر مسجد سے نکل گئی، اول تو نماز فرض ادا ہو چکی تھی، خطبہ کے متعلق یہ معلوم نہ تھا کہ جمعہ میں وہ بھی فرض کا جزء ہے، دوسرے اشیاء کی گرانی، تیسرے تجارتی قافلہ پر لوگوں کا ٹوٹ پڑنا، جس سے ہر ایک کو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ دیر کروں گا تو اپنی ضروریات نہ پاسکوں گا۔

بہرحال ان اسباب کے تحت صحابہ کرام سے یہ لغزش ہوئی جس پر حدیث مذکور میں وعید کے الفاظ آئے کہ سب کے سب چلے جاتے تو اللہ کا عذاب آجاتا، اسی پر عار دلانے اور تنبیہ کرنے کے لئے آیت مذکورہ نازل ہوئی، اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً، اور اسی کے سبب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ کے معاملے میں اپنا طرز بدل دیا کہ نماز جمعہ سے پہلے خطبہ دینے کا معمول بنا لیا، اور یہی اب سنت ہے (ابن کثیر)

آیت مذکورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ ان لوگوں کو بتلا دیں کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اس تجارت اور ڈھول ڈھماکہ سے بہتر ہے جس میں آخرت کا ثواب تو مراد ہے ہی یہ بھی بعید نہیں کہ نماز و خطبہ کی خاطر تجارت و کسب معاش کو چھوڑنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں بھی خاص برکات نازل ہوں، جیسا کہ اوپر سلف صالحین سے بروایت ابن کثیر نقل کیا گیا ہے :-

تمت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سُوْرَۃُ الْجُمُعَۃِ
یَوْمَ الْخَمِیْسِ ۲۸ جُمَادَی الْاُوْلٰی ۱۳۹۱ھ

سُوْرَةُ الْمُنٰفِقُوْنَ

سُوْرَةُ الْمُنٰفِقُوْنَ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ اِحْدٰى عَشْرَةَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۃ منافقون مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی گیارہ آیتیں ہیں اور دو رکوع۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ

جب آئیں تیرے پاس منافق کہیں ہم قائل ہیں تو رسول ہے اللہ کا، اور اللہ

يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ ①

جانتا ہے کہ تو اس کا رسول ہے، اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں،

اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ

انھوں نے رکھا ہے اپنی قسموں کو ڈھال بنا کر پھر روکتے ہیں اللہ کی راہ سے یہ لوگ بُرے کام

مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ② ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى

ہیں جو کر رہے ہیں، یہ اس لئے کہ وہ ایمان لائے پھر منکر ہوگئے پھر مہر لگ گئی

قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ③ وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ؕ

ان کے دل پر سو وہ اب کچھ نہیں سمجھتے، اور جب تو دیکھے اُن کو تو اچھے لگیں تجھ کو اُن کے ڈیل،

وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ يَحْسَبُوْنَ

اور اگر بات کہیں سنے تو اُن کی بات کیسے ہیں جیسے کہ لکڑی لگادی دیوار سے، جو کوئی چیخیں جائیں

وقف لازم

كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ۚ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ۚ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ ۖ أَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۴﴾

ہم ہی پر بلا آئی وہی ہیں دشمن ان سے بچتا رہ گردن مارے اُن کی اللہ کہاں سے پھرے جاتے ہیں

وَإِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ

اور جب کہئے اُن کو آؤ معاف کرادے تم کو رسول اللہ کا مٹکاتے ہیں اپنے سر،

وَرَأَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۵﴾ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ

اور تو دیکھے کہ وہ روکتے ہیں اور وہ غرور کرتے ہیں، برابر ہے اُن پر تو معافی چاہے

لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۗ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۗ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي

اُن کی یا نہ معافی چاہے، ہرگز نہ معاف کرے گا اُن کو اللہ بیشک اللہ راہ نہیں دیتا

الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۶﴾ هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ

نافرمان لوگوں کو، وہی ہیں جو کہتے ہیں خرچ مت کرو ان پر جو پاس رہتے ہیں

رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ۗ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ

رسول اللہ کے یہاں تک کہ متفرق ہو جائیں، اور اللہ کے ہیں خزانے آسمانوں کے اور زمین کے

وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿۷﴾ يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَا إِلَى الْمَدِيْنَةِ

ولیکن منافق نہیں سمجھتے، کہتے ہیں البتہ اگر ہم پھر گئے مدینہ کو تو

لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ ۚ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ

نکال دیگا جس کا زور ہے وہاں سے کمزور لوگوں کو، اور زور تو اللہ کا ہے اور اس کے رسول کا اور ایمان والوں کا

وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸﴾

لیکن منافق نہیں جانتے،،،

ع ۱ / ۸ / ۱۳

خلاصۂ تفسیر

جب آپ کے پاس یہ منافقین آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم (دل سے) گواہی دیتے ہیں کہ آپ بے شک اللہ کے رسول ہیں، اور یہ تو اللہ کو معلوم ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں (اس میں تو اُن کے قول کی تکذیب نہیں کی جاتی) اور (باوجود اس کے) اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین (اس کہنے میں) جھوٹے ہیں،

(کہ ہم دل سے گواہی دیتے ہیں، کیونکہ وہ گواہی محض زبانی ہے اعتقادِ قلب سے نہیں) ان لوگوں نے اپنی قسموں کو (اپنی جان و مال کو بچانے کے لئے) ڈھال بنا رکھا ہے (کیونکہ اظہارِ کفر کرتے تو ان کی حالت بھی مثل دوسرے کفار کے ہو جاتی کہ جہاد کیا جاتا اور (قتل و غارت ہوتا) پھر (اس لازمی خرابی کے ساتھ متعدی خرابی بھی ہے کہ) یہ لوگ (دوسروں کو بھی) اللہ کی راہ سے روکتے ہیں بے شک ان کے یہ اعمال بہت ہی بُرے ہیں (اور ہمارا) یہ (کہنا کہ ان کے اعمال بہت بُرے ہیں) اس سبب سے ہے کہ یہ لوگ (اول ظاہر میں) ایمان لے آئے پھر (اپنے شیاطین کے پاس جا کر کلمات کفریہ اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ کہہ کر) کافر ہو گئے، (مطلب یہ کہ اُن پر بُرے اعمال کا حکم کرنا اُن کے نفاق کے سبب سے ہے کہ وہ بدترین عمل کفر ہے) سو (اس نفاق کی وجہ سے) اُن کے دلوں پر مُہر کر دی گئی، تو یہ (حق بات کو) نہیں سمجھتے اور (ظاہر میں یہ ایسے چکنے چپڑے ہیں کہ) جب آپ اُن کو دیکھیں (تو شان و شوکت ظاہری کی وجہ سے) اُن کے قد و قامت آپ کو خوشنما معلوم ہوں اور (باتوں میں ایسے ہیں کہ) اگر یہ باتیں کرنے لگیں تو آپ ان کی بات (بغایت فصاحت و شیرینی کی وجہ سے) سُن لیں (لیکن چونکہ اندر خاک بھی نہیں ہے اس لئے قد و قامت ظاہری کے ساتھ باطنی کمالات سے خالی ہونے کے سبب ان کی ایسی مثال ہے کہ) گویا یہ لکڑیاں ہیں جو (دیوار کے) سہارے سے لگائے ہوئی (کھڑی) ہیں (کہ جثہ میں تو لمبی چوڑی موٹی موٹی مگر بے جان محض، اور عام عادت یہ ہے کہ اکثر جو لکڑی فی الحال کام میں نہیں لگتی وہ اس طرح رکھ دی جاتی ہے، ایسی لکڑی بے نفع محض بھی ہے، اسی طرح یہ لوگ ظاہری دیکھنے میں تو شاندار ہیں لیکن اندر سے محض بیکار اور چونکہ بوجہ عدم اخلاص و عدمِ ایمان کے ہر وقت ان کو اندیشہ رہتا ہے کہ کبھی مسلمانوں کو ہمارے حال کی اطلاع کسی قرینہ سے یا بذریعہ وحی کے نہ ہو جاوے اور مثل دیگر کفار کے ہم پر بھی جہاد وغیرہ نہ ہونے لگے اس خیال سے ایسے خائف رہتے ہیں کہ) ہر غُل پکار کو (گو کسی وجہ سے ہو) اپنے ہی اوپر (پڑنے والی) خیال کرنے لگتے ہیں (یعنی جب کوئی شور و غل ہوتا ہے یہی سمجھتے ہیں کہ کہیں ہمارے اوپر بھی افتاد پڑنے والی نہ ہو حقیقت میں) یہی لوگ (تمہارے پورے) دشمن ہیں آپ ان سے ہوشیار رہئے (یعنی اُن کی کسی بات پر اعتماد نہ کیجئے) خدا اُن کو غارت کریں کہاں (دین حق سے) پھرے چلے جاتے ہیں (یعنی روزانہ دور ہی ہوتے جاتے ہیں) اور (ان کے تکبر اور شرارت کی یہ کیفیت ہے کہ) جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس) آؤ تمہارے لئے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) استغفار کر دیں تو وہ اپنا سر پھیر لیتے ہیں اور آپ اُن کو دیکھیں گے کہ وہ (اس خیرخواہی اور استغفارِ رسول سے) تکبر کرتے ہوئے بے رُخی کرتے ہیں (جب اُن کے کفر کی یہ حالت ہے تو اُنکے حق میں دونوں باتیں برابر ہیں خواہ آپ اُن کے لئے استغفار کریں یا اُن کے لئے استغفار نہ کریں اللہ تعالیٰ اُن کو ہرگز نہ بخشے گا (مطلب یہ کہ اگر وہ آپ کے پاس آتے بھی اور آپ ان کی ظاہری حالت کے اعتبار سے استغفار بھی فرماتے تب بھی اُن کو کچھ نفع نہ ہوتا، یہ تو ماضی کے اعتبار سے اُن کی حالت ہوئی، اور

آئندہ کے لئے یہ ہے کہ) بے شک اللہ تعالیٰ ایسے نافرمان لوگوں کو (توفیق) ہدایت (کی) نہیں دیتا یہ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ جو لوگ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس (جمع) ہیں اُن پر کچھ خرچ مت کرو یہاں تک کہ یہ آپ ہی منتشر ہو جاویں گے اور (ان کا یہ کہنا جہل محض ہے کیونکہ) اللہ ہی کے ہیں سب خزانے آسمانوں اور زمین کے و لیکن منافق سمجھتے نہیں ہیں (کہ رزق کا مدار اہلِ شہر کے نفقات کو سمجھتے ہیں اور) یہ (لوگ) یوں کہتے ہیں کہ اگر ہم اب مدینہ میں لوٹ کر جاویں گے تو عزت والا وہاں سے ذلت والے کو باہر نکال دیگا (یعنی ہم اُن مسافر پردیسیوں کو نکال باہر کردیں گے) اور (اس قول میں جو اپنے کو عزت والا اور مسلمانوں کو ذلت والا کہتے ہیں یہ جہل محض ہے، بلکہ) اللہ ہی کی ہے عزت (بالذات) اور اس کے رسول کی (بواسطہ تعلق باللہ کے) اور مسلمانوں کی (بواسطہ تعلق مع اللہ... والرسول کے) ولیکن منافق جانتے نہیں (بلکہ مدار امور فانیہ کو سمجھتے ہیں)۔

معارف و مسائل

سورۃ منافقون کے نزول کا مفصل واقعہ

یہ واقعہ محمد بن اسحٰق کی روایت کے مطابق شعبان ۶ھ میں اور قتادہ و عروہ کی روایت کے مطابق شعبان ۵ھ ہجری میں غزوۂ بنی المصطلق کے موقع پر پیش آیا ہے (مظہری) جو محمد بن اسحٰق اور اکثر علماء مغازی و سیر کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر ملی کہ بنی المصطلق کے رئیس حارث بن ضرار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کی تیاری کر رہے ہیں، یہ حارث بن ضرار جویریہؓ کے والد ہیں جو بعد میں مسلمان ہو کر ازواج مطہراتؓ میں داخل ہوئیں، اور خود حارث بن ضرار بھی بعد میں مسلمان ہو گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ان کی جنگی تیاری کی خبر ملی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ ان کے مقابلہ کے لئے نکلے، اس جہاد کے لئے نکلنے والے مسلمانوں کے ساتھ بہت سے منافق بھی اس طمع میں نکلے کہ ہمیں بھی مالِ غنیمت میں حصہ ملے گا، کیونکہ یہ لوگ باوجود دل میں کافر و منکر ہونے کے یہ یقین رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد آپؐ کے ساتھ ہے اور آپ ہی غالب اور فاتح ہوں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بنی المصطلق کے مقام پر پہونچے تو حارث بن ضرار کے لشکر سے سامنا اس پانی کے چشمہ یا کنوئیں پر ہوا جو مُرَیسیع کے نام سے معروف تھا، اسی لئے اس غزوہ کو غزوۂ مُرَیسیع بھی کہا جاتا ہے، جانبین سے جنگ کی صفیں مرتب ہو کر تیروں کے ساتھ مقابلہ ہوا، جس میں بنی المصطلق کے بہت سے آدمی مارے گئے باقی بھاگنے لگے، حق تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح عطا فرمائی، ان کے کچھ اموالِ غنیمت اور کچھ مرد و عورت قید ہو کر مسلمانوں کے ہاتھ آئے، اس جہاد کا قضیہ

۲۹

تو ختم ہوا۔

وطنی یا نسبی قومیت کی بنیاد پر تعاون سراسر کفر و جاہلیت کا نعرہ ہے

مگر اس کے بعد ابھی مسلمانوں کا لشکر اسی مُرَیسیع کے پانی پر جمع تھا کہ ایک ناگوار واقعہ پیش آگیا کہ ایک مہاجر اور ایک انصاری میں اسی پانی پر باہم جھگڑا ہوگیا اور نوبت باہم قتل و قتال کی آگئی، مہاجر نے اپنی مدد کے لئے مہاجرین کو پکارا اور انصاری نے انصار کو، دونوں کی مدد کے لئے کچھ افراد پہونچ گئے، اور قریب تھا کہ مسلمانوں کے باہم ایک فتنہ کھڑا ہوجائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو فوراً موقع پر تشریف لے گئے، اور سخت ناراضی کے ساتھ فرمایا "مَا بَالُ دَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ" (یعنی یہ جاہلیت کا نعرہ کیسا ہے) کہ وطنی اور نسبی قومیت کو بنیاد بنا کر امداد و دفاع کا معاملہ ہونے لگا، اور فرمایا "دَعُوْهَا فَاِنَّهَا مُنْتِنَةٌ" (اس نعرہ کو چھوڑ دو یہ بدبودار نعرہ ہے) اور فرمایا کہ ہر مسلمان کو اپنے ہر مسلمان بھائی کی مدد کرنا چاہئے خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم مظلوم کی مدد کرنا تو ظاہر ہے کہ اس کو ظلم سے بچائے اور ظالم کی مدد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روکے، کیونکہ اس کی حقیقی مدد یہی ہے، مراد یہ تھی کہ ہر معاملہ میں یہ دیکھنا چاہئے کہ مظلوم کون ہے، ظالم کون، پھر ہر مسلمان کا خواہ وہ مہاجری ہو یا انصاری اور کسی قبیلہ و خاندان کا ہو یہ فرض ہوجاتا ہے کہ مظلوم کو ظلم سے چھڑائے، اور ظالم کا ہاتھ روکے، خواہ وہ اپنا حقیقی بھائی اور باپ ہی کیوں نہ ہو، یہ نسبی اور وطنی قومیت جاہلانہ اور بدبودار نعرہ ہے جس سے گندگی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنتے ہی جھگڑا ختم ہوگیا، اس معاملہ میں زیادتی جہجاہ مہاجری کی ثابت ہوئی، اس کے بالمقابل سنان بن وبرہ جہنی انصاری کو زخم آگیا تھا، حضرت عبادہؓ بن صامتؓ کے سمجھانے سے سنان بن وبرہ نے اپنا حق معاف کردیا، اور جھگڑنے والے ظالم و مظلوم پھر بھائی بھائی بن گئے۔

منافقین کی ایک جماعت جو مالِ غنیمت کی طمع میں مسلمانوں کے ساتھ لگی ہوئی تھی، ان کا سردار عبداللہ بن اُبی تھا جو دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے دشمنی رکھتا تھا، مگر دنیوی فوائد کی خاطر اپنے کو مسلمان کہتا تھا، اس کو جب مہاجرین و انصار کے باہم تصادم کی خبر ملی تو اس نے مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کا موقع غنیمت پایا اور اپنی مجلس میں جس میں منافقین جمع تھے اور مؤمنین میں سے صرف زید بن ارقمؓ موجود تھے .... اس نے انصار کو مہاجرین کے خلاف بھڑکایا اور کہنے لگا کہ تم نے ان کو اپنے وطن میں بلا کر اپنے سروں پر مسلط کیا، اپنے اموال و جائداد ان کو تقسیم کرکے دیدیئے یہ تمہاری روٹیوں پر پلے ہوئے اب تمہارے ہی مقابلہ پر آئے ہیں، اگر تم نے اب بھی اپنے انجام کو نہ سمجھا تو آگے یہ تمہارا جینا مشکل کردیں گے، اس لئے تمہیں چاہئے کہ آئندہ مال سے ان کی مدد نہ کرو تو خود ہی ادھر اُدھر بھاگ جائیں گے، اور اب تمہیں چاہئے کہ جب مدینہ پہونچ جاؤ تو تم میں سے جو عزت والا

ہے وہ ذلیل کو نکال باہر کرے۔

اس کی مراد عزت والے سے خود اپنی جماعت اور انصار تھے، اور ذلیل سے مراد معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین صحابہ تھے، حضرت زید بن ارقمؓ نے جب اس کا یہ کلام سُنا تو فوراً بولے کہ واللہ تو ہی ذلیل و خوار اور مبغوض ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے دی ہوئی عزت اور مسلمانوں کی دلی محبت سے کامیاب ہیں۔

عبداللہ بن اُبَی چونکہ اپنے نفاق پر پردہ ڈالنا چاہتا تھا اسی لئے الفاظ صاف نہ بولے تھے، اس وقت زید بن ارقمؓ کے اظہارِ غضب سے اس کو ہوش آیا کہ میرا کفر ظاہر ہو جائے گا، تو حضرت زیدؓ سے عذر کیا کہ میں نے تو یہ بات ہنسی میں کہدی تھی، میرا مطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کچھ کرنا نہیں تھا۔

حضرت زید بن ارقمؓ اس مجلس سے اُٹھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ابن اُبَیّ کا یہ سارا واقعہ کہہ سُنایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ خبر بہت شاق ہوئی، چہرۂ مبارک پر تغیر کے آثار نظر آنے لگے (زید بن ارقم کم عمر صحابی تھے) آپ نے اُن سے کہا کہ لڑکے تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو؟ زید بن ارقم نے قسم کھا کر کہا کہ نہیں میں نے اپنے کانوں سے اس کے یہ کلمات سُنے ہیں، آپ نے پھر فرمایا کہ تمہیں کچھ شبہ تو نہیں ہو گیا، زید بن ارقم نے پھر وہی جواب دیا، اور پھر ابن اُبَیّ کی یہ بات مسلمانوں کے پورے لشکر میں پھیل گئی، اور آپس میں اس بات کے سوا کوئی بات ہی نہ رہی، ادھر حضرات انصار سب زید بن ارقم کو ملامت کرنے لگے، کہ تم نے قوم کے سردار پر تہمت لگائی، اور قطع رحمی کی، زید ابن ارقم نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ کی قسم پورے قبیلۂ خزرج میں مجھے ابن اُبَی سے زیادہ کوئی محبوب نہیں (مگر جب اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف یہ کلمات کہے تو میں اسے برداشت نہیں کر سکا) اور اگر میرا باپ بھی ایسی بات کہتا تو میں اس کو بھی ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچاتا۔

دوسری طرف حضرت عمر بن خطابؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کی گردن ماردوں، اور بعض روایات میں ہے کہ فاروقِ اعظمؓ نے یہ عرض کیا کہ آپ عباد بن بشر کو حکم دیدیجئے کہ اس کا سر قلم کر کے آپ کے سامنے پیش کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عمر اس کا کیا ہوگا کہ لوگوں میں یہ شہرت دی جائیگی کہ میں اپنے اصحاب کو قتل کر دیتا ہوں، اس لئے آپؐ نے ابن اُبَی کے قتل سے روک دیا، حضرت فاروق اعظمؓ کے اس کلام کی خبر عبداللہ بن اُبَی منافق کے بیٹے کو پہونچی، ان کا نام بھی عبداللہ تھا، اور یہ سچے مسلمان تھے، یہ فوراً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اگر آپ کا ارادہ میرے باپ کو ان کی اس گفتگو کے نتیجہ میں قتل کرنے کا ہے تو آپؐ مجھے حکم دیجئے میں اپنے باپ کا سر کاٹ کر آپؐ کی خدمت میں اس سے پہلے کہ آپ اپنی مجلس سے اٹھیں پیش کر دوں گا، اور عرض کیا کہ پورا قبیلۂ خزرج اس کا گواہ ہے

کہ اُن میں کوئی بھی مجھ سے زیادہ اپنے والدین کی خدمت واطاعت کرنے والا نہیں ہے، مگر اللہ و رسول کے خلاف اُن کی بھی کوئی چیز برداشت نہیں ہوسکتی، اور مجھے خطرہ ہو کہ اگر آپ نے کسی اور کو میرے باپ کے قتل کا حکم دیا اور اس نے قتل کر دیا تو ایسا نہ ہو کہ جب میں اپنے باپ کے قاتل کو چلتا پھرتا دیکھوں تو مجھ پر غیرت نسبی غالب آجائے اور میں اُسے قتل کر بیٹھوں، جو میرے لئے عذاب کا سبب بنے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہ میرا ارادہ اس کے قتل کا ہے نہ میں نے کسی کو اس کا حکم دیا ہے۔

اس واقعہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام عادت کے خلاف بے وقت سفر کرنے کا اعلانِ عام فرما دیا اور خود ناقہ قصوٰی پر سوار ہوگئے، جب عام حضرات صحابہ روانہ ہوگئے تو آپ نے عبداللہ ابن اُبَی کو بلایا اور دریافت کیا کہ کیا تم نے ایسا کہا ہے؟ یہ قسمیں کھا گیا، کہ میں نے ہرگز ایسا نہیں کہا یہ لڑکا (زید بن ارقم) جھوٹا ہے، عبداللہ بن اُبَی کی اپنی قوم میں عزت تھی سب نے یہ قرار دیا کہ شاید زید بن ارقمؓ کو کچھ مغالطہ لگ گیا ہے، ابن اُبَی نے ایسا نہیں کہا۔

بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن اُبَی کی قسم اور عذر کو قبول کر لیا، اور لوگوں میں زید بن ارقمؓ پر غصہ اور اُن کی ملامت اور تیز ہوگئی، اور یہ اُس رُسوائی کے سبب لوگوں سے چھپے رہنے لگے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے لشکر اسلام کے ساتھ پورے دن پھر پوری رات سفر کیا، اور اگلے روز صبح کو بھی برابر سفر کرتے رہے، یہاں تک کہ دھوپ تیز ہونے لگی، اُس وقت آپؐ نے قافلہ کو ایک جگہ ٹھہرایا، پورے ایک دن ایک رات کے مسلسل سفر سے تھکے ہوئے صحابہ کرام جب اس منزل پر اُترے تو فوراً سب محوِ خواب ہوگئے۔

راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عام سفر کرنے کی عادت کے خلاف فوری طور پر بے وقت سفر شروع کرنے اور پھر سفر کو اتنا طویل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ابن اُبَی کے واقعہ کا چرچا جو تمام مسلمانوں میں پھیل گیا تھا مسلمانوں کو سفر کے ایسے شغل میں لگا دے کہ یہ چرچا ختم ہوجائے۔

اس کے بعد پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر شروع کیا، اسی دوران میں جب تک ابن اُبَی کے بارے میں قرآن کی آیات نازل نہ ہوتی تھیں تو عبادہ بن صامتؓ نے اس کو نصیحت کی کہ تُو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنے جرم کا اعتراف کرلے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیرے لئے استغفار فرما دیں گے، تیری نجات ہوجائے گی، ابن اُبَی نے اُن کی نصیحت سنکر اپنا سر اس طرف سے پھیر لیا، حضرت عبادہ نے اسی وقت فرمایا کہ ضرور تیرے اس اعراض کے بارے میں قرآن ... نازل ہوگا۔

ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں تھے اور زید بن ارقمؓ بار بار آپؐ کے قریب آتے تھے کیونکہ ان کو اپنی جگہ یقین تھا کہ اس شخص منافق نے مجھے پوری قوم میں جھوٹا قرار دے کر رسوا کیا ہے ضرور میری تصدیق اور اس شخص کی نکیر میں قرآن نازل ہوگا، اچانک زید بن ارقمؓ نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

پر وہ کیفیت طاری ہوئی جو وحی کے وقت ہوتی تھی کہ سانس پھولنے لگا اور پیشانی مبارک پر پسینہ بہنے لگا اور آپ کی سواری ناقہ بوجھ سے دبنے لگی، تو ان کو امید ہوئی کہ اب کوئی وحی اس بارے میں نازل ہوگی، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ کیفیت رفع ہوئی، میری سواری چونکہ آپ کے قریب تھی آپ نے اپنی سواری ہی پر سے میرا کان پکڑا اور فرمایا: یَا غُلَامُ صَدَّقَ اللّٰهُ حَدِیْثَكَ وَ نَزَلَتْ سُوْرَةُ الْمُنٰفِقِیْنَ فِیْ ابْنِ اُبَیٍّ مِنْ اَوَّلِهَا اِلٰی اٰخِرِهَا یعنی اے لڑکے اللہ نے تیری بات کی تصدیق کردی اور پوری سورۃ منافقون اسی واقعہ ابن اُبی کے متعلق نازل ہوئی۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ سورۃ منافقون دورانِ سفر ہی میں نازل ہوگئی تھی مگر بغوی کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ پہنچ گئے اور زید بن ارقمؓ رسوائی کے خوف سے گھر میں چھپ کر بیٹھ رہے اُس وقت یہ سورت نازل ہوئی، واللہ اعلم۔

ایک روایت میں ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ کے قریب وادی عقیق میں پہنچے تو عبد اللہ بن اُبی منافق کے مؤمن صاحبزادے عبد اللہ آگے بڑھے اور تمام سواریوں میں تلاش کرتے ہوئے اپنے باپ ابن اُبی کی سواری کے قریب پہنچ کر باپ کی اونٹنی کو بٹھا دیا، اور اس کے گھٹنے پر پاؤں رکھ کر باپ سے خطاب کیا کہ خدا کی قسم! تم مدینہ میں داخل نہیں ہوسکو گے جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں داخل ہونے کی اجازت نہ دیں، اور جب تک تم یہ بات واضح نہ کرو کہ تم نے جو بات کہی ہے کہ عزت والا ذلت والے کو نکال دے گا، اس میں عزت والا کون ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا تم؟ عبد اللہ بن عبد اللہ ابن اُبی اپنے باپ کا راستہ روکے ہوئے کھڑے تھے، اور پاس سے گذرنے والے لوگ عبد اللہ کو ملامت کر رہے تھے کہ باپ کے ساتھ ایسا معاملہ کرتا ہے، آخر میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری اُن کے قریب آئی تو معاملہ کے متعلق دریافت کیا، لوگوں نے بتلایا کہ عبد اللہ مؤمن نے اپنے باپ کا راستہ اس لئے روکا ہوا ہے کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو مدینہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیں گے یہ مدینہ میں داخل نہ ہوسکے گا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ابن اُبی منافق بیٹے سے مجبور ہو کر یہ کہہ رہا ہے کہ میں تو بچوں اور عورتوں سے بھی زیادہ ذلیل ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سُنکر صاحبزادے سے کہا کہ اس کا راستہ چھوڑ دو، مدینہ میں جانے دو، تب بیٹے نے راستہ چھوڑا۔

سورۃ منافقون کے نزول کا قصہ تو اتنا ہی تھا جو اوپر لکھا گیا، قصہ کے شروع میں یہ بھی اجمالاً ذکر ہوا ہے کہ غزوہ بنی المصطلق کا اصل ذمہ دار اُم المؤمنین حضرت جویریہؓ کا والد حارث بن ضرار ہوا تھا، بعد میں حضرت جویریہؓ کو اللہ تعالیٰ نے شرفِ اسلام کے ساتھ اُمہات المؤمنین میں داخل ہونے کا شرف عطا فرمایا اور باپ بھی مسلمان ہوگیا۔

اس کا واقعہ مسند احمد، ابوداؤد وغیرہ میں یہ منقول ہے کہ جب بنو المصطلق کو شکست ہوئی تو مالِ غنیمت کے ساتھ اُن کے کچھ قیدی بھی ہاتھ آئے، اسلامی قانون کے مطابق سب قیدی اور مالِ غنیمت مجاہدین میں تقسیم کردیئے گئے، قیدیوں میں حارث بن ضرار کی بیٹی جُوَیْرِیَہ بھی تھیں، یہ حضرت ثابت بن قیس بن شماس کے حصّہ میں آگئیں، انھوں نے جُوَیرِیَہ کو بصورت کتابت آزاد کرنے کا ارادہ فرمایا جسکی صورت یہ ہوتی ہے کہ غلام یا کنیز پر کچھ رقم مقرر کردی جائے اور اس کو محنت مزدوری یا تجارت کی اجازت دیدی جائے وہ مقررہ رقم کما کر مالک کو ادا کردے تو آزاد ہوجائے۔

جُوَیرِیَہ رضؓ پر جو رقم مقرر کی تھی وہ بڑی رقم تھی جس کی ادائیگی ان کے لئے آسان نہ تھی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور درخواست کی کہ میں مسلمان ہوچکی ہوں، شہادت دیتی ہوں کہ اللہ ایک ہے اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں، پھر اپنا واقعہ سُنایا کہ ثابت بن قیس جن کے حصّہ میں میں آئی ہوں انھوں نے مجھے مکاتب بنا دیا ہے، مگر رقم کتابت کی ادائیگی میرے بس میں نہیں، آپ اس میں میری کچھ مدد فرمادیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست قبول فرمالی اور ساتھ ہی اُن کو آزاد کرکے اپنی زوجیت میں لینے کا ارادہ ظاہر فرمایا، جُوَیرِیَہ کے لئے یہ بہت بڑی نعمت تھی وہ کیسے قبول نہ کرتیں، بخوشی خاطر قبول کیا، اور یہ ازواجِ مطہرات میں داخل ہوگئیں، اُمّ المؤمنین حضرت جُوَیرِیہؓ کا بیان ہے کہ غزوہ بنی المصطلق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے سے تین دن پہلے میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ یثرب کی طرف سے چاند چلا اور میری گود میں آکر گر گیا، اس وقت تو میں نے یہ خواب کسی سے ذکر نہ کیا تھا اب اس کی تعبیر آنکھوں سے دیکھ لی۔

یہ سردارِ قوم کی بیٹی تھیں، ان کے ازواجِ مطہرات میں داخل ہونے سے پورے قبیلہ پر بھی اچھے اثرات مرتب ہوئے اور ایک فائدہ اُن تمام عورتوں کو پہونچا جو اُن کے ساتھ گرفتار ہوئی تھیں، اور ان کی رشتہ دار تھیں، کیونکہ ان کا اُمّ المؤمنین ہوجانا معلوم کرنے کے بعد جس جس مسلمان کے پاس اُن کی رشتہ دار کوئی کنیز تھی سب نے اُن کو آزاد کردیا کہ اُن کی عزیز کسی عورت کو کنیز بناکر اپنے پاس رکھنا ادب کے خلاف سمجھا، اس طرح سَو کنیزیں اُن کے ساتھ آزاد ہوگئیں اور پھر اُن کے والد بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزہ دیکھ کر مسلمان ہوگئے۔

واقعۂ مذکورہ میں اہم ہدایات و فوائد

سورۂ منافقون کے نزول کا واقعہ اس کی تفسیر کے سمجھنے میں تو معین ہے ہی، اس کے ضمن میں بہت اہم ہدایات و مسائل، اخلاق، سیاست اور معاشرت کے متعلق آگئے ہیں، اس لئے احقر نے اس واقعہ کی پوری تفصیل یہاں نقل کی ہے، وہ ہدایات یہ ہیں:-

اسلامی سیاست کا سنگِ بنیاد خالص اسلامی برادری قائم کرنا ہے جس میں رنگ و نسل اور زبان اور ملکی و غیر ملکی کے سب امتیازات بالکل ختم کردیئے جاویں۔

غزوہ بنی المصطلق میں پیش آنے والا ایک انصاری اور ایک مہاجر کا جھگڑا اور دونوں طرف سے انصار و مہاجرین کو اپنی اپنی مدد کے لئے پکارنا، یہ وہ جاہلیت کا بُت تھا جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توڑ دیا تھا، اور مسلمان کہیں کا رہنے والا ہو کسی رنگ و زبان اور کسی نسل و قوم کا ہو سب کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا، انصار و مہاجرین میں باقاعدہ پھر مواخات کرا کر ان کی مشترک اسلامی برادری بنا دی تھی، مگر شیطان کا یہ پُرانا جال ہے جس میں لوگوں کو پھنسا کر باہمی جھگڑوں کے وقت قوم و وطن اور زبان و رنگ وغیرہ کو تعاون و تناصر کی بنیاد بنا دیتا ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تعاون و تناصر کا اسلامی معیار حق و انصاف سب کے ذہنوں سے اوجھل ہو جاتا ہے، صرف برادری اور قومیت کی بنیاد پر ایک دوسرے کی مدد کرنے کا اصول بن جاتا ہے، اس طرح وہ مسلمانوں کو مسلمانوں سے بھڑا دیتا ہے، اس واقعہ میں بھی کچھ ایسی ہی صورت بن رہی تھی، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً موقع پر پہونچ کر اس فتنہ کو ختم کردیا اور بتلایا کہ یہ جاہلیت و کفر کا بدبودار نعرہ ہے، اس سے بچو، اور پھر سب کو قرآنی اصول تعاون پر قائم کردیا جس میں ارشاد ہے تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ، یعنی مسلمانوں کے لئے کسی کی مدد کرنے یا مدد حاصل کرنے کا معیار یہ ہونا چاہئے کہ جو شخص عدل و انصاف اور نیکی پر ہے اس کی مدد کرو، اگرچہ وہ نسب و خاندان اور زبان و وطن میں تم سے الگ ہو اور جو شخص کسی گناہ اور ظلم پر ہو اس کی ہرگز مدد نہ کرو اگرچہ وہ تمہارا باپ اور بھائی ہی ہو، یہی وہ معقول اور منصفانہ بنیاد ہے جس کو اسلام نے قائم فرمایا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر قدم پر اس کی خود رعایت فرمائی، اور سب کو اس کے تابع رہنے کی تلقین فرمائی، اور اپنے آخری خطبہ حجۃ الوداع میں اعلان فرمایا کہ جاہلیت کی سب رسمیں میرے قدموں کے نیچے مسَل دی گئی ہیں، اب عربی، عجمی، کالے گورے ملکی غیر ملکی کے امتیازات کے بُت ٹوٹ چکے ہیں، باہمی تعاون و تناصر کی اسلامی بنیاد صرف حق و انصاف ہے، سب کو اس کے تابع چلنا ہے۔

اس واقعہ نے ہمیں یہ بھی سبق دیا ہے کہ دشمنانِ اسلام آج سے نہیں بلکہ ہمیشہ سے مسلمانوں کا شیرازہ منتشر کرنے کے لئے یہی برادری اور وطنی قومیت کا حربہ استعمال کرتے ہیں، جب اور جس وقت موقع ملجاتا ہے اسی سے کام لے کر مسلمانوں میں تفرقہ ڈالتے ہیں۔

افسوس ہے کہ زمانہ دراز سے پھر مسلمان اپنے اس سبق کو بھول گئے، اور اغیار نے مسلمانوں کی اسلامی وحدت کے ٹکڑے کرنے میں پھر وہی شیطانی جال پھیلا دیا، اور دین و اصولِ دین سے غفلت کی بناء پر عام دنیا کے مسلمان اس جال میں پھنس کر باہمی خانہ جنگیوں کے شکار ہو گئے، اور کفر و الحاد کے مقابلہ کے لئے اُن کی متحدہ قوت پاش پاش ہو گئی، صرف عربی و عجمی ہی نہیں عربوں میں مصری، شامی،

حجازی، یمنی ایک دوسرے سے متحد نہ رہی، ہندوستان اور پاکستان میں پنجابی، بنگالی، سندھی، ہندی، پٹھان اور بلوچی باہم آویزش کے شکار ہوگئے، فالی اللہ المشتکی، دشمنانِ اسلام ہماری آویزش سے کھیل رہے ہیں اس کے نتیجہ میں وہ ہر میدان میں ہم پر غالب آتے جاتے ہیں اور ہم ہر جگہ شکست خوردہ غلامانہ ذہنیت میں مبتلا انہی کی پناہ لینے پر مجبور نظر آتے ہیں، کاش! آج بھی مسلمان اپنے قرآنی اصول اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات پر غور کریں، غیروں کے سہارے جینے کے بجائے خود اسلامی برادری کو مضبوط بنالیں، رنگ و نسل اور زبان و وطن کے بتوں کو پھر ایک دفعہ توڑ ڈالیں تو آج بھی خدا تعالیٰ کی نصرت و امداد کا مشاہدہ کھلی آنکھوں ہونے لگے۔

صحابہ کرام کی اسلامی اصول پر بینظیر ثابت قدمی اور مقام بلند

اس واقعہ نے یہ بھی بتلایا کہ اگرچہ وقتی طور پر شیطان نے کچھ لوگوں کو نعرۂ جاہلیت میں مبتلا کر دیا تھا، مگر درحقیقت سب کے دلوں میں ایمان رچا بسا ہوا تھا، ذرا سی تنبیہ پر سب ان خیالات سے تائب ہوگئے، اور اُن کے دلوں پر اللہ اور رسول کی محبت و عظمت کا ایسا غلبہ تھا جس میں کوئی رشتہ ناطہ برادری اور قومیت حائل نہ ہوئی، اس کی شہادت خود اسی واقعہ میں اول زید بن ارقمؓ کے بیان سے واضح ہوئی کہ وہ خود بھی قبیلۂ خزرج کے آدمی ہیں، اور ابن اُبَی اس قبیلہ کا سردار تھا، اور زید بن ارقمؓ بھی اس کی عزت و عظمت کے قائل تھے لیکن جس وقت اس کی زبان سے مؤمنین مہاجرین اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف الفاظ سنے تو برداشت نہ کر سکے، اُسی مجلس میں ابن اُبَی کو مُنہ توڑ جواب دیا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شکایت پیش کر دی، اگر آجکل کی برادری پرستی ہوتی تو اپنی برادری کے سردار کی یہ بات وہ کبھی حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہونچاتے۔

اس واقعہ میں خود ابن اُبَی کے صاحبزادے عبداللہ کے واقعہ نے اس کو کس قدر روشن کر دیا، کہ ان کی محبت و عظمت کا اصل تعلق صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ سے تھا، جب اپنے باپ سے اُن کے خلاف بات سُنی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر خود اپنے باپ کا سر قلم کرنے کی پیشکش کر دی اور اجازت طلب کی، آپؐ نے اس سے روک دیا، تو مدینہ کے قریب پہونچ کر باپ کی سواری کو بٹھا دیا، اور مدینہ جانے کا راستہ روک کر باپ کو مجبور کیا کہ وہ یہ اقرار کرے کہ عزت دار صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں وہ خود ذلیل و خوار ہے، پھر آپؐ کی اجازت ملنے سے پہلے باپ کا راستہ نہیں کھولا، جس کو دیکھ کر بے ساختہ زبان پر آتا ہے ؎

تو نخلِ خوش ثمر کیستی کہ سرو و سمن ؛ ہمہ ز خویش بریدند و با تو پیوستند

اس کے علاوہ بدر و اُحد اور احزاب کی جنگوں نے تو بذریعہ تلوار اس قوم پرستی اور وطن پرستی کے بُت کے ٹکڑے اُڑائے ہیں، جس نے ثابت کر دیا کہ مسلمان کسی قوم و وطن اور کسی رنگ و زبان کا ہو

وہ سب آپس میں بھائی بھائی ہیں، اور جو اللہ و رسول کو نہ مانے وہ اگرچہ حقیقی بھائی اور باپ ہی کیوں نہ ہو وہ دشمن ہے ۔

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد ۔ فدائے یک تن بیگانہ کآشنا باشد

مسلمانوں کے مصالح عامہ کی رعایت اور اُن کو غلط فہمی سے بچانے کا اہتمام

اس واقعہ نے ہمیں ایک سبق یہ دیا کہ جو کام فی نفسہٖ جائز و درست ہو مگر اس کے کرنے سے کوئی یہ خطرہ ہو کہ کسی مسلمان کو خود غلط فہمی پیدا ہو گی، یا دشمنوں کو غلط فہمی پھیلانے کا موقع ملے گا تو یہ کام نہ کیا جائے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رئیس المنافقین ابن اُبی کا نفاق کھل جانے کے بعد بھی فاروقِ اعظمؓ کے اس مشورہ کو قبول نہیں فرمایا کہ اس کو قتل کیا جائے، کیونکہ اس میں خطرہ یہ تھا کہ دشمنوں کو عام لوگوں میں یہ غلط فہمی پھیلانے کا موقع مل جائے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کو بھی قتل کر دیتے ہیں۔

مگر دوسری روایات سے یہ ثابت ہے کہ غلط فہمی کے خطرہ سے ایسے کاموں کو چھوڑا جا سکتا ہے جو مقاصدِ شرعیہ میں سے نہ ہوں گو مستحب اور کارِ ثواب ہوں، کسی مقصدِ شرعی کو ایسے خطرہ سے ترک نہیں کیا جا سکتا بلکہ خطرہ کے ازالہ کی فکر کی جائے گی اور اس کام کو کیا جائے گا۔

سورت کا ترجمہ اور خلاصۂ تفسیر اوپر لکھا جا چکا ہے، اب اس کے خاص خاص جملوں کی مزید توضیح دیکھئے:۔ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ الآیۃ، عبداللہ بن اُبی رئیس المنافقین جس کے معاملہ میں یہ سورت نازل ہوئی ہے جس میں اس کی قسموں کا جھوٹا ہونا واضح کر دیا گیا تو لوگوں نے اس کو از راہِ خیر خواہی یہ کہا کہ تجھے معلوم ہے کہ تیرے بارے میں قرآن میں کیا نازل ہوا ہے، اب بھی وقت نہیں گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جا، (اور اعترافِ جرم کر لے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیرے لئے استغفار فرما دیں گے، اس نے جواب میں کہا کہ تم لوگوں نے مجھے کہا کہ ایمان لے آ میں نے ایمان اختیار کر لیا، پھر تم نے مجھے اپنے مال میں سے زکوٰۃ دینے کو کہا وہ دینے لگا، اب اس کے سوا کیا رہ گیا ہے کہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سجدہ کیا کروں، اس پر آیاتِ مذکورہ نازل ہوئیں، جن میں واضح کر دیا گیا کہ جب اُس کے دل میں ایمان ہی نہیں تو اس کے لئے کسی کا استغفار نافع نہیں ہو سکتا۔

ابن اُبی اس واقعہ کے بعد مدینہ طیبہ پہونچ کر چند روز ہی زندہ رہا، پھر جلد ہی مر گیا (مظہری)

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ، یہ وہی قول ہے جو جہجاہ مہاجر اور سنان انصاری کے جھگڑے کے وقت ابن اُبی نے کہا تھا، جس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیدیا کہ یہ بیوقوف یوں سمجھ رہے ہیں کہ مہاجرین ہماری داد و دہش کے محتاج ہیں ہم ہی اُن کو دیتے ہیں، حالانکہ تمام آسمان و زمین کے خزانے تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں وہ چاہیں تو مہاجرین کو تمہاری کسی امداد کے بغیر سب کچھ دے سکتے ہیں، اس کا ایسا سمجھنا چونکہ بے عقلی اور بیوقوفی کی دلیل ہے اس لئے قرآن حکیم نے اس جگہ

لَا یَفْقَهُوْنَ کا لفظ اختیار فرما کر بتلا دیا کہ ایسا خیال کرنے والا بے عقل و بے سمجھ ہیں۔

یَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ، یہ بھی اسی منافق عبداللہ ابن اُبَیّ کا قول ہے جس میں اگرچہ الفاظ صاف نہیں بولے مگر مطلب ظاہر تھا کہ اس نے اپنے آپ کو اور انصارِ مدینہ کو عزت والا اور اُن کے مقابل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین صحابہ کو معاذ اللہ ذلیل قرار دیا اور انصارِ مدینہ کو اس پر بھڑکانا چاہا کہ ان کمزور اور ذلیل لوگوں کو مدینہ سے نکال باہر کریں، حق تعالیٰ نے اس کے جواب میں اس کی بات کو اسی پر اُلٹ دیا کہ اگر عزت والوں نے ذلت والوں کو نکالا تو اس کا خمیازہ تمہیں کو بھگتنا پڑے گا، کیونکہ عزت تو اللہ اور اللہ کے رسول اور مؤمنین کا حق ہے، مگر تم اپنی جہالت کی بناء پر اس سے بے خبر ہو، یہاں قرآن کریم نے لَا يَعْلَمُوْنَ کا لفظ استعمال فرمایا اور اس سے پہلے لَا يَفْقَهُوْنَ فرمایا تھا، وجہ فرق کی یہ ہے کہ کوئی انسان اپنے آپ کو دوسرے انسان کا رازق سمجھ بیٹھے تو یہ سراسر عقل کے خلاف ہے، اس کا یہ سمجھنا بیوقوفی اور بے عقلی کی علامت ہے، اور عزت و ذلت دنیا میں کبھی کسی کو کبھی کسی کو ملتی رہتی ہے، اس لئے اس میں مغالطہ ہو تو یہ واقعات سے بے خبری اور ناواقفی کی دلیل ہے، اس لئے یہاں لَا يَعْلَمُوْنَ فرمایا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ

اے ایمان والو! غافل نہ کردیں تم کو تمہارے مال اور تمہاری اولاد اللہ کی یاد

اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۹﴾ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا

سے اور جو کوئی یہ کام کرے تو وہی لوگ ہیں ٹوٹے میں ، اور خرچ کرو کچھ ہمارا

رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ

دیا ہوا اس سے پہلے کہ آ پہنچے تم میں کسی کو موت تب کہے اے رب کیوں نہ ڈھیل دی تو نے مجھ کو ایک

اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰﴾ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ

تھوڑی سی مدت کہ میں خیرات کرتا اور ہو جاتا نیک لوگوں میں ، اور ہرگز نہ ڈھیل دیگا اللہ

اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱﴾

کسی جی کو جب آ پہنچا اس کا وعدہ اور اللہ کو خبر ہے جو تم کرتے ہو ،

ع ۲ / ۱۴

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو تم کو تمہارے مال اور اولاد (مراد اس سے مجموعۂ دنیا ہے) اللہ کی یاد (اور اطاعت

سے (مراد اس سے مجموعۂ دین ہے) غافل نہ کرنے پاویں (یعنی دنیا میں ایسے منہمک مت ہو جانا کہ دین میں خلل پڑنے لگے) اور (جو ایسا کرے گا ایسے لوگ ناکام رہنے والے ہیں (کیونکہ نفع دنیوی تو ختم ہو جاوے گا اور آخرت کا ضرر اور خسارہ ممتد یا دائم رہ جاوے گا) اور (منجملہ طاعات کے ایک طاعتِ مالیہ کا حکم کیا جاتا ہے کہ لَا تُلۡهِكُمۡ اَمۡوَالُكُمۡ کے عام مضمون میں سے ایک فرد خاص ہے یعنی) ہم نے جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں سے (حقوقِ واجبہ کو) اس سے پہلے پہلے خرچ کر لو کہ تم میں سے کسی کی موت آ کھڑی ہو پھر وہ (بطور تمنا و حسرت) کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار مجھ کو اور تھوڑے دنوں مہلت کیوں نہ دی کہ میں خیر خیرات دے لیتا اور نیک کام کرنے والوں میں شامل ہو جاتا (اور اس کی یہ تمنا و حسرت اس لئے غیر مفید ہے کہ) اللہ تعالیٰ کسی شخص کو جبکہ اس کی میعاد (عمر کی ختم ہونے پر) آ جاتی ہے ہرگز مہلت نہیں دیتا اور اللہ کو تمہارے سب کاموں کی پوری خبر ہے (ویسی ہی جزاء کے مستحق ہو گے)۔

معارف و مسائل

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُلۡهِكُمۡ اَمۡوَالُكُمۡ۔ اس سورت کے پہلے رکوع میں منافقین کی جھوٹی قسموں اور اُن کی سازشوں کا ذکر تھا، اور سب کا خلاصہ دنیا کی محبت سے مغلوب ہونا تھا، اسی وجہ سے ظاہر میں اسلام کا دعویٰ کرتے تھے کہ مسلمانوں کی زد سے بھی بچیں اور اموالِ غنیمت وغیرہ کا حصہ بھی ملے، اسی وجہ سے اُن کی یہ سازش تھی کہ مہاجرین صحابہ پر خرچ کرنا بند کر دو، اس دوسرے رکوع میں خطاب مؤمنین مخلصین کو ہے، جس میں اُن کو اس سے ڈرایا گیا ہے کہ دنیا کی محبت میں ایسے مدہوش نہ ہو جائیں جیسے منافقین ہو گئے، دنیا کی سب سے بڑی دو چیزیں ہیں جو انسان کو اللہ سے غافل کرتی ہیں، مال اور اولاد، اس لئے ان دونوں کا نام لیا گیا، ورنہ مراد اس سے پوری متاعِ دنیا ہے اور حاصل ارشاد کا یہ ہے کہ مال و اولاد سے محبت ایک درجہ میں مذموم نہیں، ان کے ساتھ ایک درجہ تک اشتغال صرف جائز نہیں بلکہ واجب بھی ہو جاتا ہے، مگر اس کی یہ حدِ فاصل ہر وقت سامنے رہنا چاہئے کہ یہ چیزیں انسان کو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل نہ کر دیں، یہاں ذکر سے مراد بعض مفسرین نے پانچ وقت کی نماز بعض نے حج اور زکوٰۃ، بعض نے قرآن قرار دیا ہے، حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ ذکر سے مراد یہاں تمام طاعات و عبادات ہیں، اور یہی قول سب کا جامع ہے (قرطبی)

خلاصہ یہ ہے کہ اس دنیاوی معیشت کے سامان میں اس قدر مشغول رہنے کی تو اجازت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر یعنی طاعت سے انسان کو غافل نہ کر دے کہ اُن کی محبت میں مبتلا ہو کر فرائض و واجبات کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے لگے یا حرام اور مکروہات میں مبتلا ہو جائے، اور جو ایسا کرے اُن کے بارے میں ہے اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ، یعنی یہی لوگ ہیں خسارہ میں پڑنے والے، کیونکہ انھوں نے آخرت کی عظیم اور

ہمیشہ باقی رہنے والی نعمتوں کے بدلے میں دنیا کی حقیر اور فانی نعمتوں کو اختیار کر لیا اس سے بڑا خسارہ کیا ہوگا۔

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ، اس آیت میں موت کے آجانے سے مراد موت کے آثار کا مشاہدہ ہے، اور مراد یہ ہے کہ موت کے آثار سامنے آنے سے پہلے صحت و قوت کی حالت میں اپنے اموال اللہ کی راہ میں خرچ کر کے آخرت کے درجات حاصل کر لو، ورنہ موت کے بعد یہ مال وغیرہ تمہارے کچھ کام نہ آئے گا، اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ذکر سے مراد تمام طاعات اور احکام شرعی کی پابندی ہے جس میں ضرورت کے مواقع پر مال خرچ کرنا بھی داخل ہے پھر یہاں صرف انفاقِ مال کو جُدا کر کے بیان کرنے کی دو وجہ ہو سکتی ہیں، اوّل یہ کہ اللہ اور اس کے احکام کی تعمیل سے انسان کو غفلت میں ڈالنے والی سب سے بڑی چیز مال ہی ہے، اس لئے جن چیزوں میں مال خرچ کرنا ہوتا ہے، جیسے زکوٰۃ، عشر، حج وغیرہ ان کو مستقلاً بیان کر دیا، دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ موت کے آثار کا مشاہدہ ہونے کے وقت یہ تو نہ کسی کے بس میں ہے نہ کسی کو اس کا تصور ہو سکتا ہے کہ اس وقت قضا شدہ نمازیں ادا کر دوں یا فوت شدہ حج فرض ادا کروں یا رمضان کے فوت شدہ روزے رکھوں مگر مال سامنے ہوتا ہے اور یہ یقین ہو ہی جاتا ہے کہ اب یہ مال میرے ہاتھ سے چلا، تو اس وقت بھی تمنا ہو سکتی ہے کہ جلد سے جلد مال کو خرچ کر کے مالی عبادات کی کوتاہی سے نجات حاصل کر لیں، نیز یہ کہ صدقہ تمام دوسری بلاؤں اور عذاب کے ٹلا دینے میں بھی مؤثر ہے۔

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کونسا صدقہ سب سے زیادہ اجر و ثواب رکھتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسے وقت اللہ کی راہ میں خرچ کرنا جب کہ انسان تندرست ہو اور اپنی آئندہ ضروریات کے پیش نظر یہ خوف بھی ہو کہ مال خرچ کر ڈالا تو کہیں بعد میں خود محتاج نہ ہو جاؤں، اور فرمایا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو اس وقت تک نہ ٹلاؤ جب تک کہ روح تمہارے حلق میں آجائے اور مرنے لگو تو اس وقت کہو کہ اتنا مال فلاں کو دیدو اتنا فلاں کام میں خرچ کر دو۔

فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ، حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ جس شخص کے ذمہ زکوٰۃ واجب تھی اور ادا نہیں کی، یا حج فرض تھا اور ادا نہیں کیا وہ موت سامنے آجانے کے بعد اللہ تعالیٰ سے اس کی تمنا کرے گا کہ میں پھر دنیا کی طرف لوٹ جاؤں، یعنی موت میں اور کچھ مہلت مل جائے، تاکہ میں صدقہ خیرات کر لوں اور فرائض سے سبکدوش ہو جاؤں، وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ، یعنی وہ مرنے کے وقت یہ بھی تمنا کرے گا کہ کچھ مہلت مل جائے تو ایسے اعمال کر لوں جن کی وجہ سے صالحین میں داخل ہو جاؤں یعنی جو فرائض و واجبات چھوٹے ہیں ان کو قضا کر لوں جن محرمات و مکروہات میں مبتلا ہوا ہوں ان سے توبہ و استغفار کر کے بیباق ہو جاؤں، مگر حق تعالیٰ نے اگلی آیت میں بتلا دیا کہ موت کے آجانے کے بعد کسی کو مہلت نہیں دی جاتی یہ تمنائیں لغو و فضول ہیں۔

تمّت

بحمد اللہ تعالیٰ سورۃ المنافقون قبل صلوٰۃ الجمعۃ للثالث عشر

من جمادی الثانیۃ ۱۳۹۱ھ

سُوۡرَۃُ التَّغَابُنِ

سُوۡرَۃُ التَّغَابُنِ مَدَنِیَّۃٌ وَّھِیَ ثَمَانِیْ عَشۡرَۃَ اٰیَۃً وَّفِیۡھَا رُکُوۡعَانِ

سورۃ تغابن مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی اٹھارہ آیتیں ہیں اور دو رکوع ،

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے ،

یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ۚ لَہُ الۡمُلۡکُ وَلَہُ الۡحَمۡدُ ۫

پاکی بول رہا ہے اللہ کی جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں ، اسی کا راج ہے اور اسی کی تعریف ہے

وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ① ھُوَ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ فَمِنۡکُمۡ کَافِرٌ وَّ

اور وہی ہر چیز کر سکتا ہے ، وہی ہے جس نے تم کو بنایا پھر کوئی تم میں منکر ہے اور

مِنۡکُمۡ مُّؤۡمِنٌ ؕ وَاللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ② خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ

کوئی تم میں ایمان دار اور اللہ جو تم کرتے ہو دیکھتا ہے ، بنایا آسمانوں کو اور

الۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ وَصَوَّرَکُمۡ فَاَحۡسَنَ صُوَرَکُمۡ ۚ وَاِلَیۡہِ الۡمَصِیۡرُ ③ یَعۡلَمُ مَا فِی

زمین کو تدبیر سے اور صورت کھینچی تمہاری پھر اچھی بنائی تمہاری صورت اور اسی کی طرف سب کو پھر جانا ہے ، جانتا ہے جو کچھ

السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَیَعۡلَمُ مَا تُسِرُّوۡنَ وَمَا تُعۡلِنُوۡنَ ؕ وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌ

ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو کھول کر کرتے ہو اور اللہ کو معلوم ہے

بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ④ اَلَمۡ یَاۡتِکُمۡ نَبَؤُا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ قَبۡلُ ۫

جیوں کی بات ، کیا پہنچی نہیں تم کو خبر اُن لوگوں کی جو منکر ہو چکے ہیں پہلے

فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۵ ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ

پھر انھوں نے چکھی سزا اپنے کام کی اور اُن کو عذاب دردناک ہے، یہ اس لئے کہ لاتے تھے اُن کے پاس

رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ؗ فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى

اُن کے رسول نشانیاں پھر کہتے کیا آدمی ہم کو راہ سمجھائیں گے پھر منکر ہوئے اور منہ موڑ لیا اور اللہ نے

اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝۶ زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ؕ قُلْ

بے پروائی کی اور اللہ بے پرواہ ہے سب تعریفوں والا، دعویٰ کرتے ہیں منکر کہ ہرگز انکو کوئی نہ اٹھائیگا، تو کہہ کیوں

بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ؕ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝۷

نہیں قسم ہے میرے رب کی تم کو بیشک اُٹھانا ہے پھر تم کو جتلانا ہے جو کچھ تم نے کیا، اور یہ اللہ پر آسان ہے،

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

سو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے اتارا، اور اللہ کو تمہارے سب کام

خَبِيْرٌ ۝۸ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ؕ وَمَنْ

کی خبر ہے، جس دن تم کو اکٹھا کریگا جمع ہونے کے دن وہ دن ہے ہار جیت کا، اور جو کوئی

يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ

یقین لائے اللہ پر اور کرے کام بھلا اتار دیگا اس پر سے اس کی برائیاں اور داخل کریگا اسکو باغوں

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ

میں جن کے نیچے بہتی ہیں ندیاں رہا کریں اُن میں ہمیشہ، یہی ہے بڑی مراد

الْعَظِيْمُ ۝۹ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ

ملنی، اور جو لوگ منکر ہوئے اور جھٹلائیں انھوں نے ہماری آیتیں وہ لوگ ہیں دوزخ والے

النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۱۰

رہا کریں اسی میں، اور بری جگہ جا پہنچے،

الثلٰثۃ ع ۱۰ - ۱۵

خلاصہ تفسیر

سب چیزیں جو کچھ کہ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ کہ زمین میں ہیں اللہ کی پاکی (قالاً یا حالاً) بیان

کرتی ہیں اسی کی سلطنت ہے اور وہی تعریف کے لائق ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے، (یہ تمہید اگلے بیان کی ہے کہ وہ ایسے صفاتِ کمال کے ساتھ متصف ہے تو اس کی اطاعت واجب اور معصیت قبیح ہے) وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا (جو مقتضی اس کا تھا کہ سب ایمان لاتے) سو (باوجود اس کے بھی) تم میں بعضے کافر ہیں اور بعضے مومن ہیں، اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال (ایمانیہ و کفریہ) کو دیکھ رہا ہے (بس ہر ایک کے مناسب جزاء دے گا) اسی نے آسمانوں اور زمین کو ٹھیک طور پر (یعنی پُر حکمت و پُر منفعت) پیدا کیا اور تمہارا نقشہ بنایا سو عمدہ نقشہ بنایا (کیونکہ اعضاء انسانی کے برابر کسی حیوان کے اعضاء میں تناسب نہیں) اور اسکے پاس (سبکو) لوٹنا ہے (اور) وہ سب چیزوں کو جانتا ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور سب چیزوں کو جانتا ہے جو تم پوشیدہ کرتے ہو اور جو علانیہ کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ دلوں تک کی باتوں کو جاننے والا ہے، اور یہ تمام امور مقتضی اس کو ہیں کہ تم اس کی اطاعت کیا کرو (اور علاوہ اُن مقتضیات کے) کیا تم کو ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی (کہ وہ خبر پہونچنا بھی مقتضی وجوبِ اطاعت کو ہے) جنھوں نے (تم سے) پہلے کفر کیا، پھر انھوں نے اپنے (ان) اعمال کا وبال (دنیا میں بھی) چکھا اور (اس کے علاوہ آخرت میں بھی) ان کے لئے عذاب دردناک ہونے والا ہے یہ (وبال عاجل وعذاب آجل) اس سبب سے ہے کہ ان لوگوں کے پاس اُن کے پیغمبر دلائل واضحہ لے کر آئے تو ان لوگوں نے (ان رسولوں کی نسبت) کہا کہ کیا آدمی ہم کو ہدایت کریں گے (یعنی بشر کہیں پیغمبر یا ہادی ہوسکتا ہے) غرض انھوں نے کفر کیا اور اعراض کیا اور خدا نے (بھی ان کی کچھ) پرواہ نہ کی (بلکہ مقہور کردیا) اور اللہ (سب سے) بے نیاز (اور) ستودہ صفات ہے (اس کو نہ کسی معصیت سے ضرر اور نہ کسی کی طاعت سے نفع، خود مطیع وعاصی ہی کا نفع اور ضرر ہے اور) یہ کافر (مضمون عذاب آخرت کا سن کر جیسا کہ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ میں مذکور ہے) یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ہرگز دوبارہ زندہ نہ کئے جاویں گے (جس کے بعد عذاب الیم کا وقوع بتلایا جاتا ہے) آپ کہدیجئے کہ کیوں نہیں، واللہ ضرور دوبارہ زندہ کئے جاؤ گے پھر جو کچھ تم نے کیا ہے تم سب کو جتلا دیا جاوے گا (اور اس پر سزا دی جاوے گی) اور یہ (بعث و جزاء) اللہ کو (بوجہ کمالِ قدرت) بالکل آسان ہے سو (جب یہ مقتضیات ایمان کے مجتمع ہیں تو تم کو چاہئے کہ) تم اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس نور پر (یعنی قرآن پر) جو کہ ہم نے نازل کیا ہے ایمان لاؤ اور اللہ تمہارے سب اعمال کی پوری خبر رکھتا ہے (اور اس دن کو یاد کرو) جس دن کہ تم سب کو اس جمع ہونے کے دن میں جمع کرے گا یہی دن ہے سود و زیاں (کے ظاہر ہونے) کا (یعنی مسلمانوں کا نفع اور کافروں کا نقصان اُس روز عملاً ظاہر ہوجاوے گا) اور (بیان اس کا یہ ہے کہ) جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہوگا اور نیک کام کرتا ہوگا اللہ اس کے گناہ دور کردیگا اور اس کو (جنت کے) ایسے باغوں میں داخل کریگا جن کے نیچے نہریں جاری ہونگی جنمیں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے رہیں گے (اور) یہ بڑی کامیابی ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا ہوگا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہوگا یہ لوگ دوزخی ہیں اس میں ہمیشہ رہیں گے اور وہ بُرا ٹھکانا ہے ؀

معارف و مسائل

خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ، یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو پیدا کیا پھر تم میں بعض کافر ہوگئے بعض مؤمن رہے، اس میں لفظ فَمِنْكُمْ کا حرف فآ جو تعقیب (یعنی ایک چیز کا دوسرے کے بعد ہونے) پر دلالت کرتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اوّل تخلیق و آفرینش میں کوئی کافر نہیں تھا، یہ کافر و مؤمن کی تقسیم بعد میں اس کسب و اختیار کے تابع ہوئی جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو بخشا ہے، اور اسی کسب و اختیار کی وجہ سے اس پر گناہ و ثواب عائد ہوتا ہے، ایک حدیث سے بھی اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ یُهَوِّدَانِهٖ وَیُنَصِّرَانِهٖ الحدیث" یعنی ہر پیدا ہونے والا انسان فطرت سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے (جس کا تقاضا مؤمن ہونا ہے) مگر پھر اس کے ماں باپ اسکو یہودی یا نصرانی وغیرہ بنا دیتے ہیں (قرطبی)

دو قومی نظریہ

قرآن حکیم نے اس جگہ انسان کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے، کافر، مؤمن جس سے معلوم ہوا کہ اولاد آدم علیہ السلام سب ایک برادری ہے، اور دنیا کے پورے انسان اس برادری کے افراد ہیں، اس برادری کو قطع کرنے اور ایک الگ گروہ بنانے والی چیز صرف کفر ہے جو شخص کافر ہوگیا، اس نے انسانی برادری کا رشتہ توڑ دیا، اس طرح پوری دنیا میں انسانوں میں تحزّب اور گروہ بندی صرف ایمان و کفر کی بنا پر ہو سکتی ہے، رنگ اور زبان، نسب و خاندان، وطن اور ملک میں سے کوئی چیز ایسی نہیں جو انسانی برادری کو مختلف گروہوں میں بانٹ دے، ایک باپ کی اولاد اگر مختلف شہروں میں بسنے لگے یا مختلف زبانیں بولنے لگے یا ان کے رنگ میں تفاوت ہو تو وہ الگ الگ گروہ نہیں ہوجاتے، اختلافِ رنگ و زبان اور وطن و ملک کے باوجود یہ سب آپس میں بھائی ہی ہوتے ہیں، کوئی سمجھدار انسان ان کو مختلف گروہ نہیں قرار دے سکتا۔

زمانۂ جاہلیت میں نسب اور قبائل کی تفریق کو قومیت اور گروہ بندی کی بنیاد بنا دیا گیا، اسی طرح ملک و وطن کی بنیاد پر کچھ گروہ بندی ہونے لگی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب بتوں کو توڑا، اور مسلمان خواہ کسی ملک اور کسی خطہ کا ہو کسی رنگ اور خاندان کا ہو، کوئی زبان بولتا ہو، ان سب کو ایک برادری قرار دیا بنصِ قرآن اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (مؤمنین سب کے سب آپس میں بھائی بھائی ہیں) اسی طرح کفار کسی ملک و قوم کے ہوں وہ اسلام کی نظر میں ملّتِ واحدہ ہیں یعنی ایک قوم ہیں۔

قرآن کریم کی مذکورۃ الصدر آیت بھی اس پر شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کُل بنی آدم کو صرف کافر و مؤمن دو گروہوں میں تقسیم فرمایا، اختلاف رنگ و زبان کو قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی نشانی

اور انسان کے لئے بہت سے معاشی فوائد پر مشتمل ہونے کی بناء پر ایک عظیم نعمت تو قرار دیا ہے مگر اس کو بنی آدم میں گروہ بندی کا ذریعہ بنانے کی اجازت نہیں دی۔

اور ایمان و کفر کی بناء پر ۲ دو قوموں کی تقسیم یہ ایک امر اختیاری پر مبنی ہے، کیونکہ ایمان بھی اختیاری امر ہی، اور کفر بھی، اگر کوئی شخص ایک قومیت چھوڑ کر دوسری میں شامل ہونا چاہے، تو بڑی آسانی سے اپنے عقائد بدل کر دوسرے میں شامل ہو سکتا ہے، بخلاف نسب و خاندان، رنگ اور زبان اور ملک و وطن کے کہ کسی انسان کے اختیار میں نہیں کہ اپنا نسب بدل دے یا رنگ بدل دے، زبان اور وطن اگرچہ بدلے جا سکتے ہیں مگر زبان و وطن کی بنیاد پر بننے والی قومیں دوسروں کو عادۃً اپنے اندر جذب کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتیں خواہ اُن کی ہی زبان بولنے لگے اور اُن کے وطن میں آباد ہو جائے۔

یہی وہ اسلامی برادری اور ایمانی اخوت تھی جس نے تھوڑے ہی عرصہ میں مشرق و مغرب، جنوب و شمال، کالے گورے، عرب عجم کے بے شمار افراد کو ایک لڑی میں پرو دیا تھا، جس کی قوت و طاقت کا مقابلہ دنیا کی قومیں نہ کر سکیں، تو انھوں نے پھر اُن بتوں کو زندہ کیا، جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام نے پاش پاش کر دیا تھا، مسلمانوں کی عظیم ترین ملّتِ واحدہ کو ملک و وطن اور زبان اور رنگ اور نسب اور خاندان کے مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر کے ان کو باہم ٹکرا دیا، اس طرح دشمنانِ اسلام کی یلغار کے لئے میدان صاف ہو گیا، جس کا نتیجہ آنکھیں آج دیکھ رہی ہیں، کہ مشرق و مغرب کے مسلمان جو ایک قوم ایک دل تھے اب چھوٹے چھوٹے گروہوں میں منحصر ہو کر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں، اور اُن کے مقابلہ پر کفر کی طاغوتی قوتیں باہمی اختلاف رکھنے کے باوجود مسلمانوں کے مقابلہ میں ملّتِ واحدہ ہی معلوم ہوتی ہیں۔

وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ، (اس نے تمھاری صورت بنائی پھر تمھاری صورتوں کو بہتر بنایا) صورت گری درحقیقت خالقِ کائنات کی مخصوص صفت ہے، اسی لئے اسماءِ الٰہیہ میں اللہ تعالیٰ کا نام مصوّر آیا ہے، اور غور کرو کہ کائنات میں کتنی اجناس مختلفہ ہیں اور ہر جنس میں کتنی انواعِ مختلفہ، ہر نوع میں اصنافِ مختلفہ اور ہر صنف میں لاکھوں کروڑوں افراد مختلفہ پائے جاتے ہیں، ایک کی صورت دوسرے سے نہیں ملتی، ایک نوعِ انسانی میں ملکوں اور خطوں کے اختلاف سے نسلوں اور قوموں کے اختلاف سے شکل و صورت میں کھلے ہوئے امتیازات، پھر ان میں ہر فرد کی شکل و صورت کا دوسرے سب سے ممتاز ہونا ایک ایسی حیرت انگیز صنعت و صورت گری ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے، انسانی چہرہ جو چھ سات مربع انچ سے زیادہ نہیں، اربوں پدموں انسانوں میں ایک ہی طرح کا چہرہ ہونے کے باوجود ایک کی صورت بالکلیہ دوسرے سے نہیں ملتی کہ پہچاننا دشوار ہو جائے، آیت مذکورہ میں ایک نعمت صورت گری ہی اس کا ذکر فرمایا اس کے بعد فرمایا فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ، یعنی شکل انسانی کو ہم نے تمام کائنات و مخلوقات

کی صورتوں سے زیادہ حسین اور بہتر بنایا ہے، کوئی انسان اپنی جماعت میں کتنا ہی بدشکل بدصورت سمجھا جاتا ہو مگر باقی تمام حیوانات وغیرہ کے اشکال کے اعتبار سے وہ بھی حسین ہے، فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ یَّهْدُوْنَنَا، لفظ بشر اگرچہ مفرد ہے مگر معنی میں جمع کے ہے، اس لئے یَهْدُوْنَ جمع کا لفظ اس کے لئے استعمال فرمایا گیا، بشریت کو نبوت و رسالت کے منافی سمجھنا سبھی کفار کا خیال باطل تھا جس پر قرآن میں جابجا رد کیا گیا ہے، افسوس ہے کہ اب مسلمانوں میں بھی بعض لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کے منکر پائے جاتے ہیں، انھیں سوچنا چاہئے کہ وہ کدھر جا رہے ہیں، بشر ہونا نہ نبوت کے منافی ہے نہ رسالت کے بلند مقام کے منافی ہے، اور نہ رسول کے نور ہونے کے منافی ہے، وہ نور بھی ہیں بشر بھی، ان کے نور کو چراغ اور آفتاب و ماہتاب کے نور پر قیاس کرنا غلطی ہے۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا (تو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر، اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا ہے) نور سے مراد اس جگہ قرآن ہے، کیونکہ نور کی حقیقت یہ ہے کہ وہ خود بھی ظاہر اور روشن ہو اور دوسری چیزوں کو بھی ظاہر و روشن کر دے، قرآن کا اپنے اعجاز کی وجہ سے خود روشن اور ظاہر ہونا کھلی بات ہے اور اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے اور ناراض ہونے کے اسباب اور احکام و شرائع اور تمام حقائق عالم آخرت جن کے جاننے کی انسان کو ضرورت ہے وہ روشن ہو جاتے ہیں۔

قیامت کو یوم تغابن کہنے کی وجہ

یَوْمَ یَجْمَعُكُمْ لِیَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ یَوْمُ التَّغَابُنِ جس روز تم کو اللہ تعالیٰ جمع کرے گا جمع کرنے کے دن میں، یہ دن ہوگا تغابن کا یعنی خسارہ کا" یوم الجمع اور یوم التغابن دونوں قیامت کے نام ہیں، یوم الجمع ہونا اس دن کا تو ظاہر ہے کہ تمام مخلوق اولین و آخرین کو اس روز حساب کتاب اور جزاء و سزاء کے لئے جمع کیا جائے گا، اور یوم التغابن اس لئے کہ تغابن غبن سے مشتق ہے جس کے معنی خسارے اور نقصان کے ہیں، مالی نقصان اور خسارہ کو بھی غبن کہا جاتا ہے، اور رائے اور عقل کے نقصان کو بھی، امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں فرمایا کہ مالی خسارے کے لئے یہ لفظ بصیغۂ مجہول غُبِنَ فُلَانٌ فَهُوَ مَغْبُوْنٌ استعمال کیا جاتا ہے، اور عقل و رائے کے نقصان کے لئے باب سَمِعَ سے غَبِنَ استعمال کیا جاتا ہے، لفظ تغابن اصل کے اعتبار سے دو طرفہ کام کے لئے بولا جاتا ہے، کہ ایک آدمی دوسرے کو اور دوسرا اس کو نقصان پہونچائے، یا اس کے نقصان و خسارہ کو ظاہر کرے، یہاں مراد یک طرفہ اظہار غبن ہے، جیسا کہ یک طرفہ استعمال بھی اس لفظ کا معروف و مشہور ہے، قیامت کو یوم تغابن کہنے کی وجہ یہ ہے کہ احادیث صحیحہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے لئے آخرت میں دو گھر پیدا کئے ہیں، ایک جہنم میں دوسرا جنت میں، اہل جنت کو جنت میں داخل کرنے سے پہلے اُن کا وہ مقام بھی دکھلایا جائے گا، جو ایمان اور عمل نہ ہونے کی صورت میں اس کے لئے مقرر تھا تاکہ اس کو دیکھنے کے بعد جنت کے مقام کی اور زیادہ قدر اس کے دل میں پیدا ہو، اور اللہ تعالیٰ کا مزید شکر گذار ہو، اسی طرح اہل جہنم کو جہنم میں داخل کرنے سے

پہلے اُن کا جنت کا وہ مقام دکھلایا جائے گا جو ایمان اور عمل صالح کی صورت میں اُن کے لئے مقرر تھا تاکہ اُن کو اور زیادہ حسرت ہو، ان روایات میں یہ بھی ہے کہ پھر جنت میں جو مقامات اہل جہنم کے تھے وہ بھی اہل جنت کو مل جائیں گے، اور جہنم میں جو مقامات اہل جنت کے تھے وہ بھی اہل جہنم کے حصہ میں آجائیں گے، یہ روایات حدیث صحیحین اور دوسری کتب حدیث میں مختلف الفاظ سے مفصل آئی ہیں، اس وقت جبکہ کفار فجار اور اشقیاء کے جنتی مقامات بھی اہل جنت کے قبضہ میں آئیں گے، تو ان کو اپنے غبن اور خسارے کا احساس ہوگا کہ کیا چھوڑا اور کیا پایا۔

صحیح مسلم اور ترمذی وغیرہ میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے سوال فرمایا کہ تم جانتے ہو مفلس کون شخص ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ جس شخص کے پاس مال متاع نہ ہو، اس کو مفلس سمجھتے ہیں، آپؐ نے فرمایا کہ میری اُمت کا مفلس وہ شخص ہے جو قیامت میں اپنے اعمال صالحہ نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ کا ذخیرہ لے کر آئے گا مگر اس کا حال یہ ہوگا کہ دنیا میں کسی کو گالی دی، کسی پر بہتان باندھا، کسی کو مارا یا قتل کیا، کسی کا مال ناحق لے لیا، تو یہ سب جمع ہوں گے اور اپنے حقوق کا مطالبہ کریں گے، کوئی اس کی نماز لے جائے گا، کوئی روزہ، کوئی زکوٰۃ اور دوسری حسنات، اور جب حسنات ختم ہو جائیں گی تو مظلوموں کے گناہ اس ظالم پر ڈال کر بدلہ چکایا جائے گا، جس کا انجام یہ ہوگا کہ یہ جہنم میں ڈال دیا جائیگا

اور صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے ذمہ کسی کا کوئی حق ہو اس کو چاہئے کہ دنیا ہی میں اس کو ادا یا معاف کرا کر سبکدوش ہو جائے، ورنہ قیامت کے دن درہم و دینار تو ہوں گے نہیں جس کا مطالبہ ہوگا اس کو اس شخص کے اعمال صالحہ دے کر بدلہ چکایا جائے گا، اعمال صالحہ ختم ہو جائیں گے تو بقدر اس کے حق کے مظلوم کا گناہ اس پر ڈال دیا جائے گا (مظہری)

حضرت ابن عباسؓ اور دوسرے ائمہ تفسیر نے قیامت کو یوم التغابن کہنے کی یہی وجہ بیان کی ہے، اور بہت سے ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ اُس دن غبن اور خسارے کا احساس صرف کفار فجار اور اشقیاء ہی کو نہیں بلکہ صالحین مؤمنین کو بھی اس طرح ہوگا کہ کاش ہم عمل اور زیادہ کرتے تاکہ جنت کے مزید درجات حاصل کرتے، اس روز ہر شخص کو اپنی عمر کے اوقات پر حسرت ہوگی، جو فضول ضائع کئے، جیسا کہ حدیث میں ہے:-

مَنْ جَلَسَ مَجْلِسًا لَمْ يَذْكُرِ اللّٰهَ فِيْهِ كَانَ عَلَيْهِ تِرَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ ،

"جو شخص کسی مجلس میں بیٹھا اور پوری مجلس میں اللہ کا ذکر نہ کیا تو یہ مجلس قیامت کے روز اس کے لئے حسرت بنے گی"

قرطبی میں ہے کہ ہر مؤمن بھی اس روز احسان عمل میں اپنی کوتاہی پر اپنے غبن و خسارہ کا احساس کریگا قیامت کا نام یوم تغابن رکھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ سورۂ مریم میں اس کا نام یوم الحسرۃ آیا ہے۔

وَ اَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ، روح المعانی میں اس آیت کی تفسیر یہ لکھی ہے کہ اس روز ظالم اور بدعمل لوگ اپنی تقصیرات پر حسرت کریں گے، اور مومنین صالحین نے بھی جو احسانِ عمل میں کوتاہی کی ہے اس پر ان کو حسرت ہوگی، اس طرح قیامت کے روز سبھی اپنی اپنی کوتاہی پر نادم اور عمل کی کمی پر غبن و خسارہ کا احساس کریں گے، اس لئے اس کو یوم التغابن کہا گیا۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ۭ

نہیں پہنچتی کوئی تکلیف بدون حکم اللہ کے اور جو کوئی یقین لاتا اللہ پر وہ راہ بتلائے اس کے دل کو

وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿11﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ

اور اللہ کو ہر چیز معلوم ہے، اور حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا پھر اگر تم منہ موڑو

فَاِنَّمَا عَلٰي رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿12﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَعَلَي اللّٰهِ

تو ہمارے رسول کا تو یہی کام ہے پہنچا دینا کھول کر، اللہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں اور اللہ پر

فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿13﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ

چاہئے بھروسہ کریں ایمان والے، اے ایمان والو تمہاری بعض جوروئیں اور

اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا

اولاد دشمن ہیں تمہارے سو اُن سے بچتے رہو اور اگر معاف کرو اور درگذر کرو اور بخشو

فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿14﴾ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۭ وَاللّٰهُ

تو اللہ ہے بخشنے والا مہربان، تمہارے مال اور تمہاری اولاد یہی ہیں جانچنے کو اور اللہ

عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿15﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَ

جو ہے اس کے پاس ہے ثواب بڑا، سو ڈرو اللہ سے جہاں تک ہو سکے اور سنو اور مانو اور

اَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ

خرچ کرو اپنے بھلے کو اور جس کو بچا دیا اپنے جی کے لالچ سے سو وہ لوگ وہی

الْمُفْلِحُوْنَ ﴿16﴾ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ

مراد کو پہنچے، اگر قرض دو اللہ کو اچھی طرح پر قرض دینا وہ دونا کر دے تم کو اور تم کو بخشے

وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾

اور اللہ قدردان ہے تحمل والا، جاننے والا پوشیدہ اور ظاہر کا زبردست حکمت والا،

خلاصۂ تفسیر

(جس طرح کفر آخرت کی فلاح سے کلیۃً مانع ہے، اسی طرح اموال و اولاد اور بیوی وغیرہ میں مشغول ہو کر خدا تعالیٰ کے احکام میں کوتاہی کرنا بھی ایک درجہ میں فلاحِ آخرت سے مانع ہو، اس لئے مصیبت میں تو یہ سمجھنا چاہئے کہ) کوئی مصیبت بدون خدا کے حکم کے نہیں آتی (اور یہ سمجھ کر صبر و رضا اختیار کرنا چاہئے) اور جو شخص اللہ پر (پورا) ایمان رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو (صبر و رضا کی) راہ دکھا دیتا ہے اور اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے (کہ کس نے صبر و رضا اختیار کیا اور کس نے نہیں کیا، اور ہر ایک کو حسبِ حکمت جزاء و سزا دیتا ہے) اور (خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ہر امر میں جس میں مصائب بھی داخل ہیں) اللہ کا کہنا مانو اور رسول کا کہنا مانو اور اگر تم (اطاعت سے) اعراض کرو گے تو (یاد رکھو کہ) ہمارے رسول کے ذمہ صرف صاف صاف پہنچا دینا ہے (جس کو وہ باحسن وجوہ کر چکے ہیں، اس لئے ان کا تو کوئی ضرر نہیں تمہارا ہی ضرر ہوگا، اور چونکہ اللہ کو ضرر ہونے کا احتمال ہی نہیں، اس لئے اس کو یہاں بیان نہیں کیا اور تم لوگوں کو اور خصوص اہلِ مصیبت کو یوں سمجھنا چاہئے کہ) اللہ کے سوا کوئی معبود (بننے کے قابل) نہیں اور مسلمانوں کو اللہ ہی پر (مصائب وغیرہ میں) توکل رکھنا چاہئے۔ اے ایمان والو (جیسا مصیبت میں تم کو صبر و رضا کا حکم کیا گیا ہے اسی طرح نعمت کے بارے میں تم کو منہمک نہ ہونے کا حکم کیا جاتا ہے پس نعمت کے بارے میں یوں سمجھنا چاہئے کہ) تمہاری بعض بیبیاں اور اولاد تمہارے (دین کے) دشمن ہیں (جبکہ وہ اپنے نفع دنیوی کے واسطے تم کو ایسی بات کا حکم کریں جو تمہارے لئے مضرِ آخرت ہو) سو تم ان سے (یعنی ایسوں سے) ہوشیار رہو (اور ان کے ایسے امر پر عمل مت کرو) اور اگر (تم کو ایسی فرمائشوں پر غصہ آوے اور تم ان پر تشدد کرنے لگو اور وہ اس وقت معذرت اور توبہ کریں اور) تم (اس وقت اُن کی وہ خطا) معاف کر دو (یعنی سزا نہ دو) اور درگذر کر جاؤ (یعنی زیادہ ملامت نہ کرو) اور بخش دو (یعنی اس کو دل سے اور زبان سے بھلا دو) تو اللہ تعالیٰ (تمہارے گناہوں کا) بخشنے والا، (اور تمہارے حال پر) رحم کرنے والا ہے (اس میں ترغیب ہے عفو کی اور یہ بعض اوقات واجب ہے، جبکہ عقوبت سے احتمال غالب بے باکی کا ہو، اور بعض اوقات مستحب ہے، آگے اولاد کے ساتھ اموال کے متعلق بھی اسی قسم کا مضمون ہے کہ) تمہارے اموال اور اولاد بس تمہارے لئے ایک آزمائش کی چیز ہے (کہ دیکھیں کون ان میں پڑ کر خدا کے احکام کو بھول جاتا ہے اور کون یاد رکھتا ہے) اور (جو شخص ان میں پڑ کر اللہ کو یاد رکھے گا تو) اللہ کے پاس (اس کے لئے) بڑا اجر ہے تو (ان سب باتوں کو سُن کر) جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو اور (اس کے احکام) سنو اور مانو اور (بالخصوص مواقع حکم میں) خرچ (بھی) کیا کرو یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا (غالباً اس کی تخصیص اس لئے ہے کہ یہ نفس پر زیادہ شاق ہے) اور جو

شخص نفسانی حرص سے محفوظ رہا ایسے ہی لوگ (آخرت میں) فلاح پانے والے ہیں (آگے اس کے بہتر اور اور موجب فلاح ہونے کا بیان ہے کہ) اگر تم اللہ کو اچھی طرح (خلوص کے ساتھ) قرض دو گے تو وہ اس کو تمہارے لئے بڑھاتا چلا جائے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا، اور اللہ بڑا قدر دان ہے (کہ عمل صالح کو قبول فرماتا ہے) اور بڑا بردبار ہے (کہ عمل معصیت پر فی الفور مواخذہ نہیں فرماتا اور) پوشیدہ اور ظاہر (اعمال) کا جاننے والا ہے (اور) زبردست ہے (اور) حکمت والا ہے (''تشکرو'' سے ''حکیم'' تک تمام مضامین سورت کے لئے بمنزلہ علت کے ہیں کہ سب مضامین اُن پر مرتب و متفرع ہو سکتے ہیں)

معارف و مسائل

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ''یعنی کسی کو کوئی مصیبت اللہ کے اذن کے بغیر نہیں پہونچتی اور جو شخص اللہ پر ایمان لاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو ہدایت فرما دیتا ہے''، مطلب یہ ہے کہ یہ امر تو اپنی جگہ ایک یقینی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن و مشیت کے بغیر کہیں کوئی ذرہ بھی نہیں ہل سکتا، اللہ کے اذن کے بغیر نہ کوئی کسی کو نقصان و تکلیف پہونچا سکتا ہے نہ نفع اور راحت، مگر جس شخص کا اللہ پر اور اس کی تقدیر پر ایمان نہیں ہوتا مصیبت کے وقت اُس کے لئے قرار و سکون کا کوئی سامان نہیں ہوتا، وہ ازالۂ مصیبت کے لئے ہاتھ پیر مارتا رہتا ہے، بخلاف مؤمن کے جس کا تقدیر الٰہی پر ایمان ہے اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو اس پر مطمئن کر دیتا ہے کہ جو کچھ ہوا اللہ تعالیٰ کے اذن و مشیت سے ہوا، جو کچھ مصیبت مجھے پہونچی وہ پہنچنی ہی تھی اس کو کوئی ٹلا نہیں سکتا، اور جس مصیبت سے نجات ہوئی وہ نجات ہونا ہی تھی، کسی کی مجال نہیں جو اس مصیبت کو مجھ پر ڈال دے، اس ایمان و اعتقاد کے نتیجہ میں اس کو آخرت کے ثواب کا وعدہ بھی سامنے ہوتا ہے جس سے دنیا کی بڑی سے بڑی مصیبت آسان ہو جاتی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ،

''یعنی اے مسلمانو! تمہاری بعض بیبیاں اور اولاد تمہارے دشمن ہیں، اُن کے شر سے بچتے رہو''

ترمذی و حاکم وغیرہ نے بسند صحیح حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت ان مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی جو ہجرتِ مدینہ کے بعد مکہ مکرمہ میں داخل اسلام ہوئے، اور ارادہ کیا کہ ہجرت کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جائیں، مگر ان کے اہل و عیال نے ان کو نہ چھوڑا کہ ہجرت کر کے چلے جائیں۔ (روح)

(اور یہ زمانہ وہ تھا کہ مکہ سے ہجرت کرنا ہر مسلمان پر فرض تھا) قرآن کریم کی آیت مذکورہ میں ایسی بیوی اور اولاد کو انسان کا دشمن قرار دیا، اور ان کے شر سے بچتے رہنے کی تاکید فرمائی، کیونکہ

اس سے بڑا دشمن انسان کا کون ہو سکتا ہے جو اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے عذاب اور جہنم کی آگ میں مبتلا کر دے۔
اور حضرت عطاء بن ابی رباح کی روایت یہ ہے کہ یہ آیت عوف بن مالک اشجعی کے بارے میں نازل ہوئی، جن کا واقعہ یہ تھا کہ یہ مدینہ میں موجود تھے، اور جب کسی غزوہ و جہاد کا موقع آتا تو جہاد کے لئے جانے کا ارادہ کرتے تھے مگر ان کے بیوی بچے فریاد کرنے لگتے کہ ہمیں کس پر چھوڑ کر جاتے ہو، یہ اُن کی فریاد سے متأثر ہو کر رُک جاتے تھے (روح، ابن کثیر)

ان دونوں روایتوں میں کوئی تضاد نہیں، دونوں ہی آیت کا سبب نزول ہو سکتے ہیں، کیونکہ اللہ کا فرض خواہ ہجرت ہو یا جہاد جو بیوی اور اولاد فرض کی ادائیگی میں مانع ہوں وہ اس کی دشمن ہیں،

وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ؁ سابقہ آیت میں جن کے بیوی بچوں کو دشمن قرار دیا ہے اُن کو جب اپنی غلطی پر تنبہ ہوا تو ارادہ کیا کہ آئندہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ سختی اور تشدد کا معاملہ کریں گے، اس پر آیت کے اس حصہ میں یہ ارشاد نازل ہوا کہ اگرچہ ان بیوی بچوں نے تمھارے لئے دشمن کا سا کام کیا کہ تمہیں ادائے فرض سے مانع ہوئے، مگر اس کے باوجود ان کے ساتھ تشدد اور بے رحمی کا معاملہ نہ کرو بلکہ عفو و درگذر اور معافی کا برتاؤ کرو تو یہ تمھارے لئے بہتر ہے، کیونکہ اللہ جل شانہ کی عادت بھی مغفرت و رحمت کی ہے۔

گناہگار بیوی بچوں سے بیزاری اور بغض نہیں چاہئے

مسئلہ: علماء نے اس آیت سے استدلال کیا کہ اہل و عیال سے کوئی کام خلافِ شرع بھی ہو جائے تو اُن سے بیزار ہو جانا اور اُن سے بغض رکھنا یا اُن کے لئے بددعاء کرنا مناسب نہیں (روح)

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۭ، فتنہ کے معنی ابتلاء اور امتحان کے ہیں، مراد آیت کی یہ ہے کہ مال و اولاد کے ذریعہ اللہ تعالیٰ انسان کی آزمائش کرتا ہے کہ اُن کی محبت میں مبتلا ہو کر احکام و فرائض سے غفلت کرتا ہے، یا محبت کو اپنی حد میں رکھ کر اپنے فرائض سے غافل نہیں ہوتا،

مال و اولاد انسان کے لئے بڑا فتنہ ہیں،

حقیقت یہ ہے کہ مال و اولاد کی محبت انسان کے لئے بڑا فتنہ اور آزمائش ہیں، انسان اکثر گناہوں میں خصوصاً حرام کمائی میں اُنہی کی محبت کی وجہ سے مبتلا ہوتا ہے،

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز بعض اشخاص کو لایا جائے گا اُس کو دیکھ کر لوگ کہیں گے:-
اَكَلَ عِيَالُهٗ حَسَنَاتِهٖ "یعنی اُس کی نیکیوں کو اس کے عیال نے کھالیا" (روح) ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد کے بارے میں فرمایا مَبْخَلَةٌ مَّجْبَنَةٌ "یعنی یہ بُخل اور جُبن یعنی نامردی اور کمزوری کے اسباب ہیں" کہ ان کی محبت کی وجہ سے آدمی اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے رُکتا ہے، انہی کی محبت کی وجہ سے جہاد میں شرکت سے رہ جاتا ہے، بعض سلف صالحین کا قول ہے اَلْعِيَالُ سُوْسُ الطَّاعَاتِ "یعنی عیال انسان کی نیکیوں کے لئے گھُن ہے" جیسا گھُن غلّہ کو کھا جاتا ہے یہ اس کی نیکیوں کو

کہا جاتے ہیں"۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ "یعنی تقویٰ اختیار کرو مقدور بھر"، جب آیت اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ نازل ہوئی جس کے معنی یہ ہیں کہ "اللہ سے ایسا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اللہ کا حق ہے"، تو صحابہ کرام رضؓ پر بہت بھاری اور شاق ہوا، کہ اللہ کے حق کے مطابق تقویٰ کس کے بس میں ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس نے بتلا دیا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کی طاقت اور مقدور سے زیادہ تکلیف نہیں دی، تقویٰ بھی اپنی طاقت کے مطابق واجب ہے، مقصد یہ ہے کہ حصولِ تقویٰ میں اپنی پوری توانائی اور کوشش کرلے تو اس سے اللہ کا حق ادا ہو جائے گا (روح ملخصاً)

تَمَّتْ سُوْرَةُ التَّغَابُنِ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ

سورۃ الطلاق

سُوْرَةُ الطَّلَاقِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ اثْنَتَا عَشْرَةَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۂ طلاق مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی بارہ آیتیں اور دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ج

اے نبی جب تم طلاق دو عورتوں کو تو ان کو طلاق دو ان کی عدت پر اور گنتے رہو عدت کو

وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ج لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ

اور ڈرو اللہ سے جو رب ہے تمہارا مت نکالو ان کو ان کے گھروں سے اور وہ بھی نہ نکلیں مگر جو

يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ط وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ط وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ

کریں صریح بے حیائی اور یہ حدیں ہیں باندھی ہوئی اللہ کی اور جو کوئی بڑھے اللہ کی حدوں سے

فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ط لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ﴿۱﴾ فَاِذَا

تو اس نے برا کیا اپنا اس کو خبر نہیں شاید اللہ پیدا کر دے اس طلاق کے بعد نئی صورت پھر جب

بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا

پہنچیں اپنے وعدہ کو تو رکھ لو ان کو دستور کے موافق یا چھوڑ دو ان کو دستور کے موافق اور گواہ کر لو

ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ط ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ

دو معتبر اپنے میں کے اور سیدھی ادا کرو گواہی اللہ کے واسطے یہ بات جو ہے اس سے سمجھ جائیگا جو کوئی یقین رکھتا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ط وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ﴿۲﴾ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ

ہوگا اللہ پر اور پچھلے دن پر اور جو کوئی ڈرتا ہے اللہ سے وہ کر دے اسکا گزارہ اور روزی دے اس کو

حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ط وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ط اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ط

جہاں سے اسکو خیال بھی نہ ہو اور جو کوئی بھروسہ رکھے اللہ پر تو وہ اسکو کافی ہے، تحقیق اللہ پورا کر لیتا ہے اپنا کام

قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ﴿۳﴾ وَالّٰٓـِٔيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ

اللہ نے رکھا ہے ہر چیز کا اندازہ اور جو عورتیں ناامید ہو گئیں حیض سے

نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ ط وَاُولَاتُ

تمہاری عورتوں میں اگر تم کو شبہ رہ گیا تو ان کی عدت ہے تین مہینے اور ایسے ہی جن کو حیض نہیں آیا اور جن کے

الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ط وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ

پیٹ میں بچہ ہے ان کی عدت یہ کہ جن لیں پیٹ کا بچہ اور جو کوئی ڈرتا ہے اللہ سے کر دے وہ اسکے کام میں

أَمْرِهٖ يُسْرًا ﴿٤﴾ ذٰلِكَ أَمْرُ اللّٰهِ أَنْزَلَهٗٓ إِلَيْكُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ

آسانی یہ حکم ہے اللہ کا جو اُتارا تمہاری طرف اور جو کوئی ڈرتا رہے اللہ سے اُتار دے اُس پر سے

سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗٓ أَجْرًا ﴿٥﴾ أَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ

اسکی بُرائیاں اور بڑا دے اُس کو ثواب اُن کو گھر دو رہنے کے واسطے جہاں تم آپ رہو اپنے مقدور کے موافق

وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ۗ وَإِنْ كُنَّ أُولَاتِ حَمْلٍ فَأَنْفِقُوْا

اور ایذا دینا نہ چاہو اُن کو تاکہ تنگ پکڑو اُن کو اور اگر رکھتی ہوں پیٹ میں بچہ تو اُن پر

عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ أُجُوْرَهُنَّ ۚ

خرچ کرو جب تک جنیں پیٹ کا بچہ پھر اگر وہ دودھ پلائیں تمہاری خاطر، تو دو اُن کو اُن کا بدلہ

وَأْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ۚ وَإِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗٓ أُخْرٰى ﴿٦﴾ لِيُنْفِقْ

اور سکھاؤ آپس میں نیکی اور اگر ضد کرو آپس میں تو دودھ پلائے گی اسکی خاطر اور کوئی عورت چاہیئے

ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ۖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ۚ

خرچ کرے وسعت والا اپنی وسعت کیموافق، اور جسکو نپی تلی ملتی ہے اسکی روزی تو خرچ کرے جیساکہ دیا ہے اسکو اللہ نے

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ۚ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ﴿٧﴾ ع ١٧

اللہ کسی پر تکلیف نہیں رکھتا مگر اُسی قدر جو اُس کو دیا اب کر دے گا اللہ سختی کے پیچھے کچھ آسانی

خلاصہ تفسیر اے پیغمبر (آپ لوگوں سے کہدیجئے کہ) جب تم لوگ (ایسی) عورتوں کو طلاق دینے لگو (جن کے ساتھ خلوت ہو چکی ہے کیونکہ عدّت کا حکم ایسی عورتوں سے متعلق ہے جیساکہ دوسری آیت میں ہے ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ) تو ان کو (زمانہ) عدّت (یعنی حیض) سے پہلے (یعنی طہر میں) طلاق دو (اور یہ احادیث صحاح سے ثابت ہے کہ اس طہر میں صحبت نہ ہو جس میں طلاق دینا ہے) اور (طلاق دینے کے بعد) تم عدّت کو یاد رکھو (یعنی مرد و عورت سب یاد رکھیں، لیکن خطاب میں تخصیص صیغہ مذکر کی اشارہ اس طرف ہے کہ عورتوں میں غفلت غالب ہوتی ہے تو مردوں کو بھی اسکا اہتمام رکھنا چاہیئے، کمافی المدارک) اور اللہ سے ڈرتے رہو جو تمہارا رب ہے (یعنی ان ابواب میں جو اسکے احکام ہیں ان کے خلاف نہ کرو۔ مثلاً یہ کہ تین طلاق دفعۃً مت دو اور یہ کہ حالت حیض میں طلاق مت دو جیساکہ احادیث صحیحہ میں آیا ہے، اور یہ کہ عدّت میں) ان عورتوں کو ان کے (رہنے کے) گھروں سے مت نکالو (کیونکہ سُکنیٰ یعنی حق سکونت مطلقہ کا مثل منکوحہ کے واجب ہے) اور نہ وہ عورتیں خود نکلیں (کیونکہ یہ سُکنیٰ محض شوہر کا حق نہیں ہے جو اس کی رضا سے ساقط ہو جاوے بلکہ حق الشرع ہے) مگر ہاں کوئی کھلی بیحیائی کریں تو اور بات ہے (یعنی مثلاً مرتکب بدکاری یا سرقہ کی ہوں تو سزا کے لئے نکالی جاویں یا بقول بعض علماء زبان درازی اور ہمہ وقت کا تکرار رکھتی ہوں تو ان کو نکال دینا جائز ہے) اور یہ سب خدا کے مقرر

کئے ہوئے احکام ہیں اور جو شخص احکام خداوندی سے تجاوز کریگا (مثلاً اس عورت کو گھر سے نکال دیا) اس نے اپنے اوپر ظلم کیا (یعنی گناہگار ہوا آگے طلاق دینے والے کو ترغیب دیتے ہیں کہ طلاق میں طلاق رجعی بہتر ہے پس ارشاد ہے کہ اے طلاق دینے والے) تجھ کو خبر نہیں شاید اللہ تعالیٰ بعد اس (طلاق دینے) کے کوئی نئی بات (تیرے دل میں) پیدا کردے (مثلاً طلاق پر ندامت ہو تو طلاق رجعی میں اسکا تدارک آسانی سے ہو سکے گا) پھر جب وہ (مطلقہ) عورتیں (جبکہ ان کو طلاق رجعی دی ہو بقرینہ فامسکوہن) اپنی عدت گزرنے کے قریب پہنچ جاویں (اور عدت ختم نہیں ہوئی) تو (تم کو دو اختیار ہیں یا تو) ان کو قاعدہ کیموافق (رجعت کر کے) نکاح میں رہنے دو یا قاعدہ کے موافق ان کو رہائی دو (یعنی انقضائے عدت تک رجعت نہ کرو مطلب یہ کہ تیسری بات مت کرو کہ رکھنا بھی مقصود نہ ہو مگر تطویل عدت کے ذریعہ عورت کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے رجعت کرلو) اور (جو کچھ بھی کرو مرافقت یا مفارقت اس پر) آپس میں سے دو معتبر شخصوں کو گواہ کرلو (یہ مستحب ہے کذا فی الہدایہ والنہایہ رجعت میں تو اس لئے کہ بعد انقضائے عدت کبھی عورت اختلاف نہ کرنے لگے اور مفارقت میں اسلئے کہ کبھی اپنا نفس شرارت نہ کرنے لگے کہ جھوٹا دعویٰ کردے کہ میں رجعت کرچکا تھا) اور (اے گواہو اگر گواہی کی حاجت پڑے تو) تم ٹھیک ٹھیک اللہ کے واسطے (بلا ژو و رعایت) گواہی دو۔ اس مضمون سے اس شخص کو نصیحت کیجاتی ہے جو اللہ پر اور یوم قیامت پر یقین رکھتا ہو (مطلب یہ کہ ایماندار ہی نصائح سے منتفع ہوتے ہیں اور یوں تو نصائح سب کے لئے عام ہیں) اور (اوپر جو تقویٰ کا حکم ہے احکام کے بعد اس کی متعدد فضیلتیں ارشاد فرماتے ہیں، اوّل فضیلت یہ کہ) جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے (مضرتوں سے) نجات کی شکل نکال دیتا ہے اور (منافع عطا فرماتا ہے چنانچہ ایک بڑی منفعت ہے رزق، سو) اس کو ایسی جگہ سے رزق پہنچاتا ہے جہاں اسکا گمان بھی نہیں ہوتا، اور (ایک شعبہ اس تقویٰ کا توکل ہے اس کی یہ خاصیت ہے کہ) جو شخص اللہ پر توکل کریگا تو اللہ تعالیٰ اس (کی اصلاح مہمات) کے لئے کافی ہے (یعنی اپنی کفایت کا اثر خاص اصلاح مہمات میں ظاہر فرماتا ہے ورنہ اسکی کفایت تو تمام عالم کے لئے عام ہے اور یہ اصلاح مہمات بھی عام ہے حسّاً ہو یا باطناً ہو کیونکہ) اللہ تعالیٰ اپنا کام (جس طرح چاہتا ہے) پورا کر کے رہتا ہے (اور اسی طرح اصلاح مہمات کا وقت بھی اُسی کے ارادہ پر ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے ہر شئے کا ایک انداز (اپنے علم میں) مقرر کر رکھا ہے (اور اسی کے موافق اس کو واقع کرنا قرین حکمت ہوتا ہے آگے پھر عود ہے احکام کی طرف یعنی اوپر تو عدت کا اجمالاً ذکر تھا) اور (تفصیل اسکی آگے ہے وہ یہ کہ) تمہاری (مطلقہ) بیبیوں میں سے جو عورتیں (بوجہ زیادت عمر کے) حیض آنے سے ناامید ہو چکی ہیں اگر تم کو (ان کی عدت کے تعین میں) شبہ ہو (جیسا کہ واقع میں شبہ ہوا تھا اور پوچھا تھا) تو انکی عدت تین مہینے ہیں اور اسی طرح جن عورتوں کو (اب تک بوجہ کم عمری کے) حیض نہیں آیا (ان کی عدت بھی تین مہینے ہیں) اور حاملہ عورتوں کی عدت ان کے اس حمل کا پیدا ہو جانا ہے (خواہ کامل ہو یا ناقص بشرطیکہ کوئی

عضو بن گیا ہو گو ایک انگلی ہی سہی) اور (چونکہ تقویٰ خود بھی مہتم بالشان ہے اور احکام مذکورہ ہیں جو کہ متعلق بمعاملات دُنیا ہیں عام طبائع میں خیال ہو سکتا ہے کہ ان دُنیوی معاملات کو دین سے کیا تعلق ہم جس طرح چاہیں کرلیں اسلئے آگے پھر تقویٰ کا مضمون ہے یعنی) جو شخص اللہ سے ڈریگا اللہ تعالےٰ اسکے ہر کام میں آسانی کر دیگا (آخرت کی یا دُنیا کی ظاہراً یا باطناً، آگے پھر تاکید امتثالِ احکام کے لئے ارشاد ہے کہ) یہ (جو کچھ مذکور ہوا) اللہ کا حکم ہے جو اس نے تمھارے پاس بھیجا ہے اور جو شخص (ان معاملات میں اور دوسرے امُور میں بھی) اللہ تعالیٰ سے ڈریگا اللہ تعالےٰ اسکے گناہ دُور کر دیگا (جو سب سے بڑی مضرت سے نجات ہے) اور اس کو بڑا اجر دیگا (جو سب سے بڑی منفعت کا حصول ہے، آگے پھر مطلقات کے احکام کا بیان ہے یعنی عدت میں علاوہ عدم تطویلِ عدت اور حقِ سُکنیٰ کے ان کے کچھ اور حقوق بھی ہیں وہ یہ کہ) تم ان (مطلقہ) عورتوں کو اپنی وسعت کے موافق رہنے کا مکان دو جہاں تم رہتے ہو (یعنی عدت میں سُکنیٰ بھی مطلقہ کا واجب ہے البتہ طلاق بائن میں ایک مکان میں خلوت کے ساتھ دونوں کا رہنا جائز نہیں بلکہ پردہ حائل ہونا ضرور ہے) اور ان کو تنگ کرنے کے لئے (سُکنیٰ کے بارے میں) تکلیف مت پہنچاؤ (مثلاً کوئی ایسی بات کرنے لگو جس سے وہ پریشان ہو کر نکل جائیں) اور اگر وہ (مطلقہ) عورتیں حمل والیاں ہوں تو حمل پیدا ہونے تک ان کو (کھانے پینے کا) خرچ دو (بخلاف غیر حمل والیوں کے کہ ان کے نفقہ کی حد تین حیض یا تین ماہ ہیں۔ اور یہ احکام تو عدت کے متعلق تھے) پھر اگر (عدت کے بعد) وہ (مطلقہ) عورتیں (جبکہ پہلے سے بچّہ والیاں ہوں یا بچہ ہی پیدا ہونے سے ان کی عدت ختم ہوئی ہو) تمھارے لئے (بچّہ کو اُجرت پر) دودھ پلا دیں تو تم انکو (مقررہ) اُجرت دو اور (اُجرت کے بارے میں) باہم مناسب طور پر مشورہ کرلیا کرو (یعنی نہ تو عورت اسقدر زیادہ مانگے کہ مرد کو دوسری اَنّا ڈھونڈھنی پڑے اور نہ مرد اسقدر کم دینا چاہے کہ عورت کا کام نہ چل سکے بلکہ حتیٰ الامکان دونوں اسکا خیال رکھیں کہ ماں ہی دودھ پلادے کہ بچہ کی اس میں زیادہ مصلحت ہے) اور اگر تم باہم کشمکش کرو گے تو کوئی دوسری عورت دودھ پلادے گی (مقصود اس خبر سے امر ہے یعنی اور کسی اَنّا کو تلاش کرلیا جاوے نہ ماں کو مجبور کیا جاوے نہ باپ کو اور صورۃ خبر میں یہ نکتہ ہے کہ مرد کو کم اُجرت تجویز کرنے پر عتاب ہے کہ آخر کوئی عورت پلاوے گی اور وہ بھی غالباً بہت کم نہ لے گی پھر یہ کمی ماں ہی کے لئے کیوں تجویز کی جاوے اور عورت کو زیادہ اُجرت مانگنے پر عتاب ہے کہ تو نہ پلادے گی اور کوئی میسّر ہو جاویگی کیا دُنیا میں ایک تو ہی ہے جو اسقدر گراں بنتی ہے آگے بچہ کے نفقہ کے بارے میں ارشاد ہے کہ) وسعت والے کو اپنی وسعت کے موافق (بچّہ پر) خرچ کرنا چاہیئے اور جس کی آمدنی کم ہو تو اس کو چاہیئے کہ اللہ نے اس کو جتنا دیا ہے اسمیں سے خرچ کرے (یعنی امیر آدمی اپنی حیثیت کے موافق خرچ اُٹھادے اور غریب آدمی اپنی حیثیت کے موافق کیونکہ) خدا تعالیٰ کسی شخص کو اس سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا جتنا اس کو دیا ہے (اور تنگدست آدمی خرچ کرنا ہوا اس سے نہ ڈرے کہ خرچ کرنے سے بالکل ہی کچھ نہ رہے گا جیسا بعضے آدمی اس خوف سے اولاد کو قتل کر ڈالتے ہیں

پس ارشاد ہے کہ) خدا تعالیٰ تنگی کے بعد جلدی فراغت بھی دیدیگا (گو بقدر ضرورت و حاجت روائی سہی، وہٰذا کقولہ تعالیٰ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ)

معارف و مسائل

نکاح و طلاق کی شرعی حیثیت اور ان کا حکیمانہ نظام

معارف القرآن جلد اوّل صفحہ ۵ میں سورۂ بقرہ کی تفسیر میں اسی عنوان مذکور کے تحت میں پوری تفصیل لکھی جاچکی ہے اس کو ملاحظہ فرمالیں جسکا خلاصہ یہ ہے کہ نکاح و طلاق کا معاملہ ہر مذہب و ملت میں عام معاملات. بیع و شراء اور اجارہ کی طرح نہیں کہ طرفین کی رضامندی سے جس طرح چاہیں کرلیں بلکہ ہر مذہب و ملت کے لوگ ہمیشہ سے اس پر متفق ہیں کہ ان معاملات کو ایک خاص مذہبی تقدس حاصل ہے اُسی کی ہدایات کے تحت یہ کام سرانجام پانے چاہئیں - اہل کتاب یہود و نصاریٰ تو بہرحال ایک آسمانی دین اور آسمانی کتاب سے نسبت رکھتے ہیں اُن میں سیکڑوں تحریفات کے باوجود اتنی قدر مشترک اب بھی باقی ہے کہ ان معاملات میں کچھ مذہبی حدود و قیود کے پابند ہیں۔ کفار و مشرکین جو کوئی آسمانی کتاب اور مذہب نہیں رکھتے مگر کسی نہ کسی صورت میں خدا تعالیٰ کے قائل ہیں جیسے ہندو، آریہ، سکھ، مجوس، آتش پرست، نجوم پرست لوگ وہ بھی نکاح و طلاق کے معاملات کو عام معاملات. بیع و شراء یا اجارہ کی طرح نہیں سمجھتے اُن کے یہاں بھی کچھ مذہبی رسوم ہیں جن کی پابندی ان معاملات میں لازم سمجھتے ہیں اور انھیں اصول و رسوم پر تمام مذاہب و فرق کے عائلی قوانین چلتے ہیں۔

صرف دہریہ اور لامذہب منکر خدا لوگوں کا ایک فرقہ ہے جو خدا و مذہب ہی سے بیزار ہے وہ ان چیزوں کو بھی اجارہ کی طرح باہمی رضامندی سے طے ہوجانے والا ایک معاملہ قرار دیتے ہیں جسکا مقصد اپنے شہوانی جذبات کی تسکین سے آگے کچھ نہیں۔ افسوس ہے کہ آجکل دُنیا میں یہی نظریہ عام ہوتا جاتا ہے جسنے انسانوں کو جنگل کے جانوروں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے انا للہ والیہ المشتکیٰ۔

شریعتِ اسلام ایک مکمل اور پاکیزہ نظامِ حیات کا نام ہے۔ اسمیں نکاح کو صرف ایک معاملہ اور معاہدہ نہیں بلکہ ایک گونہ عبادت کی حیثیت بخشی ہے جس میں خالقِ کائنات کی طرف سے انسانی فطرت میں رکھے ہوئے شہوانی جذبات کی تسکین کا بہترین اور پاکیزہ سامان بھی ہے اور مرد و عورت کے ازدواجی تعلقات سے جو عمرانی مسائل بقائے نسل اور تربیت اولاد کے متعلق ہیں ان کا بھی معتدلانہ اور حکیمانہ بہترین نظام موجود ہے۔

اور چونکہ معاملہ ازدواج کی درستی پر عام نسلِ انسانی کی درستی موقوف ہے اسلئے قرآن کریم میں ان عائلی مسائل کو تمام دوسرے معاملات سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ قرآن کریم کو بغور پڑھنے والا یہ عجیب مشاہدہ کریگا کہ دُنیا کے عام معاشی مسائل میں سب سے اہم تجارت شرکت اجارہ وغیرہ ہیں۔ قرآن حکیم نے

ان کے تو صرف اصول بتلانے پر اکتفا فرمایا ہے ان کے فروعی مسائل قرآن میں شاذ و نادر ہیں۔ بخلاف نکاح و طلاق کے کہ انمیں صرف اصول بتلانے پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ انکے بیشتر فروع اور جزئیات کو بھی براہ راست حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں نازل فرمایا ہے۔

یہ مسائل قرآن کی اکثر سورتوں میں متفرق اور سورۂ نساء میں کچھ زیادہ تفصیل سے آئے ہیں یہ سورت جو سورۂ طلاق کے نام سے موسوم ہے اسمیں خصوصیت سے طلاق اور عدت وغیرہ کے احکام کا ذکر ہے اسی لئے بعض روایات حدیث میں اسکو سورۂ نساء صغریٰ بھی کہا گیا ہے یعنی چھوٹی سورۂ نساء (قرطبی بحوالہ بخاری)

اسلامی اصول کا رُخ یہ ہے کہ جن مرد و عورت میں اسلامی اصول کے مطابق ازدواجی تعلق قائم ہو وہ پائیدار اور عمر بھر کا رشتہ ہو جس سے ان دونوں کا دُنیا و دین بھی درست ہو اور ان سے پیدا ہونے والی اولاد کے اعمال و اخلاق بھی درست ہوں۔ اسی لئے نکاح کے معاملے میں شروع سے آخر تک ہر قدم پر اسلام کی ہدایات یہ ہیں کہ اس تعلق کو تلخیوں اور رنجشوں سے پاک صاف رکھنے کی اور اگر کبھی پیدا ہو جائے تو انکے ازالہ کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود بعض اوقات طرفین کی زندگی کی فلاح اسی میں منحصر ہو جاتی ہے کہ یہ تعلق ختم کر دیا جائے جن مذاہب میں طلاق کا اصول نہیں ہے انمیں ایسے اوقات میں سخت مشکلات کا سامنا ہوتا ہے اور بعض اوقات انتہائی بُرے نتائج سامنے آتے ہیں اسلئے اسلام نے قوانین نکاح کی طرح طلاق کے بھی اصول و قواعد مقرر فرمائے مگر ساتھ ہی یہ ہدایات بھی دیدیں کہ طلاق اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت مبغوض و مکروہ کام ہے جہاں تک ممکن ہو اس سے پرہیز کرنا چاہیئے، حدیث میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حلال چیزوں میں سب سے زیادہ مبغوض اللہ کے نزدیک طلاق ہے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تزوّجوا ولا تطلقوا فان الطلاق یھتز منہ عرش الرحمٰن، یعنی نکاح کرو اور طلاق نہ دو کیونکہ طلاق سے عرش رحمٰن ہلجاتا ہے اور حضرت ابو موسیٰ رضؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں کو طلاق نہ دو بغیر کسی بدکاری کے کیونکہ اللہ تعالیٰ ان مردوں کو پسند نہیں کرتا جو صرف ذائقہ چکھنے والے ہیں اور اُن عورتوں کو پسند نہیں کرتا جو صرف ذائقہ چکھنے والی ہیں (قرطبی بروایت ثعلبی) اور دارقطنی نے حضرت معاذ بن جبل رضؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے زمین پر جو کچھ پیدا فرمایا ہے اُن سب میں اللہ کے نزدیک محبوب غلاموں کو آزاد کرنا ہے، اور جتنی چیزیں زمین پر پیدا کی ہیں اُن سب میں مبغوض و مکروہ طلاق ہے (از قرطبی)

بہرحال اسلام نے اگرچہ طلاق کی حوصلہ افزائی نہیں کی بلکہ تا بمقدور اُس سے روکا ہے لیکن بعض ضرورت کے مواقع میں اجازت دی تو اُس کے لئے کچھ اُصول و قواعد بنا کر اجازت دی۔ جنکا حاصل یہ ہی کہ اس رشتۂ ازدواج کو ختم ہی کرنا ضروری ہو جائے تو وہ بھی خوبصورتی اور حُسن معاملہ کیساتھ انجام پائے

محض غصّہ نکالنے اور انتقامی جذبات کا کھیل بنانے کی صورت نہ بننے پائے۔ اس سورت میں احکام طلاق کو اس طرح شروع کیا گیا کہ اوّل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ کے عنوان سے خطاب کیا گیا جو امام قرطبی کے بیان کے مطابق ان مواقع میں استعمال ہوتا ہے جہاں حکم تمام اُمّت کیلئے عام ہو اور جس جگہ کوئی حکم رسُول کی ذات سے متعلق ہوتا ہے تو وہاں یٰاَیُّھَا الرَّسُوْلُ سے خطاب کیا جاتا ہے۔

اس جملہ یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ کا تقاضا یہ تھا کہ آگے بھی بصیغہ مفرد احکام کا بیان ہوتا مگر یہاں اسکے خلاف بصیغہ جمع خطاب فرمایا اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ جو اگرچہ بلا واسطہ خطاب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ہے اور بصیغہ جمع خطاب کرنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و تکریم بھی ہے ساتھ ہی اس طرف اشارہ بھی کہ یہ حکم آپکے لئے مخصوص نہیں تمام اُمّت اسمیں شریک ہے۔

اور بعض حضرات نے اس جگہ جملہ محذوف قرار دیکر آیت کی تفسیر یہ کی ہے، یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِلْمُؤْمِنِیْنَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ، یعنی اے نبی آپ مسلمانوں کو تبلادیں کہ جب وہ طلاق دیا کریں تو آگے بیان کئے ہوئے قانون کی پابندی کریں۔ اوپر خلاصہ تفسیر میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔ آگے بعض احکام طلاق کا بیان ہے۔

پہلا حکم فَطَلِّقُوْھُنَّ لِعِدَّتِھِنَّ، عدّت کے لفظی معنے عدد شمار کرنے کے ہیں۔ شرعی اصطلاح میں اُس مدّت کو کہا جاتا ہے جس میں عورت ایک شوہر کے نکاح سے نکلنے کے بعد دوسرے نکاح سے ممنوع ہوتی ہے اس مدّتِ انتظار کو عدّت کہا جاتا ہے۔ اور کسی شوہر کے نکاح سے نکلنے کی صورتیں دو ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ شوہر کا انتقال ہو جائے، اس کی عدّت کو عدّتِ وفات کہا جاتا ہے جو غیر حاملہ کے لئے چار ماہ دس دن مقرر ہے۔ دوسری صورت نکاح سے نکلنے کی طلاق ہے۔ عدّتِ طلاق غیر حاملہ عورت کیلئے امام اعظم ابو حنیفہ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک تین حیض پورے ہیں اور امام شافعی اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک تین طہر عدت طلاق ہے بہر حال اُس کے لئے کچھ ایام یا مہینے مقرر نہیں جتنے مہینوں میں تین حیض یا تین طہر پورے ہو جاویں وہ ہی عدت طلاق ہوگی۔ اور جن عورتوں کو ابھی کم عمری کیوجہ سے حیض نہیں آیا یا زیادہ عمر ہو جانے کے سبب حیض منقطع ہو چکا ہے اُن کا حکم آگے مستقلاً آرہا ہے اور اسی طرح حمل والی عورتوں کا حکم بھی آگے آرہا ہے اسمیں عدتِ وفات اور عدتِ طلاق دونوں یکساں ہیں۔ فَطَلِّقُوْھُنَّ لِعِدَّتِھِنَّ، اور صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو فَطَلِّقُوْھُنَّ لِقُبُلِ عِدَّتِھِنَّ تلاوت فرمایا اور حضرت ابن عمرؓ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرارت میں بھی ایک روایت میں لِقُبُلِ عِدَّتِھِنَّ اور دوسری ایک روایت میں فِیْ قُبُلِ عِدَّتِھِنَّ منقول ہے (روح)

اور صحیحین بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے اپنی عورت کو بحالتِ حیض طلاق دیدی تھی۔ حضرت فاروق اعظم رضؓ نے اسکا ذکر رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ سخت

ناراض ہوئے پھر فرمایا،

لیراجعها ثم یمسکها حتیٰ تطهر ثم تحیض فتطهر فان بدا له فلیطلقها طاهرًا قبل ان یمسّها فتلك العدّة التی امرها الله تعالےٰ ان یطلّق بها النّساء

(بخاری ومسلم از مظہری)

ان کو چاہیئے کہ بحالتِ حیض دی ہوئی طلاق سے رجوع کرلیں پھر اپنی زوجیت میں رکھیں یہاں تک کہ حیض سے طہارت ہو جائے اور پھر اس کے بعد حیض آئے اُس حیض سے طہارت ہو جائے اسوقت اگر طلاق دینا ہی ہے تو اس طہر میں مباشرت وصحبت کئے بغیر طلاق دیدیں۔ یہی وہ عدت ہی جسکا اللہ تعالےٰ نے آیت (مذکورہ) میں حکم دیا ہے۔

اس حدیث سے چند باتیں ثابت ہوئیں۔ اوّل یہ کہ حالتِ حیض میں طلاق دینا حرام ہے دوسرے یہ کہ اگر کسی نے ایسا کرلیا تو اس طلاق سے رجعت کرلینا واجب ہے (بشرطیکہ طلاق قابلِ رجعت ہو جیساکہ ابن عمرؓ کے واقعہ میں تھی) تیسرے یہ کہ جس طہر میں طلاق دینا ہے اسمیں عورت سے مباشرت وصحبت نہ ہو۔ چوتھے یہ کہ آیت قرآن فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ کی یہی تفسیر ہے۔

آیت مذکورہ کی دونوں قراءتوں سے پھر ایک روایت حدیث سے آیت مذکورہ کا یہ مفہوم متعین ہوگیا کہ جب کسی عورت کو طلاق دینا ہو تو عدت شروع ہونے سے قبل طلاق دی جائے۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک چونکہ عدت حیض سے شروع ہوتی ہے تو معنے آیت کے یہ قرار دیئے کہ جس طہر میں طلاق دینے کا ارادہ ہو اسمیں عورت سے مباشرت نہ کرے اور آخر طہر میں حیض شروع ہونے سے پہلے طلاق دیدے۔ اور امام شافعیؒ وغیرہ کے نزدیک چونکہ عدت طہر ہی سے شروع ہوتی اسلئے لِقُبُلِ عِدَّتِهِنَّ کا مفہوم یہ قرار دیا کہ بالکل شروع طہر میں طلاق دیدی جائے اور یہ بحث کہ عدت تین حیض ہیں یا تین طہر اسکا بیان سورۂ بقرہ کی آیت ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔

بہرحال طلاق کے متعلق پہلا حکم اس آیت سے باجماعِ اُمت یہ ثابت ہوا کہ حالتِ حیض میں طلاق دینا بھی حرام ہے اور ایسے طہر میں جس میں عورت کے ساتھ مباشرت وصحبت کرلی ہو اسمیں بھی طلاق دینا حرام ہے اور وجہ حُرمت کی دونوں میں یہ ہے کہ ان دونوں صورتوں میں عورت کی عدت طویل ہو جائے گی جو اُس کے لئے باعثِ تکلیف ہے کیونکہ جس حیض میں طلاق دی یہ حیض تو عدت میں شمار نہیں ہوگا بلکہ حیض کے ایام پورے ہوں اور مذہب ابو حنیفہؒ کے مطابق اسکے بعد کا طہر بھی خالی گزرے پھر جب دوسرا حیض آئے تو اسوقت عدت شروع ہوگی جسمیں بڑی تطویل ہے اور مذہب شافعیؒ کے مطابق بھی کم از کم حیض کے بقیہ ایام جو عدت سے پہلے گزریں گے وہ زیادہ ہو جائیں گے۔ طلاق کا یہ پہلا حکم ہی اس اہم ہدایت پر مشتمل ہے کہ طلاق کوئی غصہ نکالنے یا انتقام کی چیز نہیں بلکہ بدرجہ مجبوری طرفین کی راحت کا انتظام ہے اسلئے طلاق دینے کے وقت ہی سے اسکا خیال رکھنا ضروری ہے کہ عورت کو طول عدت کی بلا وجہ تکلیف نہ پہنچے۔

اور یہ حکم صرف ان عورتوں کے لئے ہیں جن پر عدت گزارنا حیض یا طہر سے لازم ہے اور جن عورتوں پر عدت واجب ہی نہیں مثلاً وہ عورت جس سے خلوت ہی ابھی تک نہیں ہوئی اُس پر سرے سے عدت ہی لازم نہیں اسکو حالتِ حیض میں بھی طلاق دیدی جائے تو جائز ہے اسی طرح وہ عورت جس کو کم عمری یا زیادتی عمر کے سبب حیض نہیں آتا اسلئے اُس کی عدت میں حیض و طہر کا کوئی اعتبار ہی نہیں بلکہ ان کی عدت مہینوں کے حساب سے تین ماہ ہے انکو کسی بھی حالت میں طلاق دیدی جائے یا صحبت و مباشرت کے بعد طلاق دیدی جائے سب جائز ہے جیسا کہ آئندہ آیات میں آرہا ہے (از مظہری مع بعض تشریحات)

دُوسرا حکم وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ہے۔ احصار کے معنے شمار کرنے کے ہیں۔ معنے آیت کے یہ ہیں کہ عدت کے ایام کو اہتمام کے ساتھ یاد رکھنا چاہیئے ایسا نہ ہو کہ بھول میں پڑ کر اختتام عدت سے پہلے ہی ختم سمجھ لے۔ اور یہ ذمہ داری ایام عدت کو محفوظ رکھنے کی مرد و عورت دونوں پر عائد ہے مگر یہاں صیغہ مذکر استعمال کیا گیا کیونکہ عام طور پر جو احکام مرد و عورت میں مشترک ہیں انمیں عموماً خطاب بصیغہ مذکر ہی آتا ہے عورتیں تبعاً اسمیں داخل سمجھی جاتی ہیں اور اس خاص مسئلہ میں وہ حکمت بھی ہوسکتی ہے جو خلاصۂ تفسیر میں لکھی گئی ہے کہ عورتوں میں غفلت کا احتمال زیادہ ہے اسلئے براہِ راست ذمہ داری مردوں پر ڈالدی گئی

تیسرا حکم لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ (نہ نکالو ان کو ان کے گھروں سے) اس میں لفظ بیوتھن میں (مکانات) کو ان عورتوں کے بُیوت فرما کر اس طرف اشارہ کیا کہ جب تک ان کا حقِ سُکنیٰ (سکونت) مرد کے ذمہ ہے اس گھر میں اسکا حق ہے اسمیں سکونت کو بحال رکھنا کوئی احسان نہیں بلکہ ادائی واجب ہے بیوی کے حقوق میں سے ایک حق سُکنیٰ بھی ہے۔ اس آیت نے بتلادیا کہ یہ حق صرف طلاق دیدینے سے ختم نہیں ہوجاتا بلکہ ایام عدت تک عورت کو اسی جگہ رہنے کا استحقاق ہے۔ اور ان کا گھر سے نکال دینا قبل اتمام عدت کے ظلم و حرام ہے اسی طرح خود ان کے لئے باختیار خود ان گھروں سے نکل جانا بھی حرام ہے اگرچہ شوہر بھی اس کی اجازت دیدے کیونکہ ایام عدت اسی مکان میں گزارنا شوہر ہی کا حق نہیں بلکہ حق اللہ بھی ہے جو منجانب اللہ معتدہ پر لازم ہے (ہذا ہو مذہب الحنفیۃ رح)

چوتھا حکم اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ، یعنی معتدہ عورتوں کو اُن کے گھروں سے نکالنا حرام ہے مگر اسمیں سے یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ عورت کسی کھلی بے حیائی میں مبتلا ہوجائے۔ اس کھلی بے حیائی سے کیا مراد ہے اسمیں ائمہ تفسیر کے تین قول منقول ہیں۔

اوّل یہ کہ بے حیائی سے مراد خود یہی گھر سے نکل جانا ہے تو اس صورت میں یہ استثنار صرف صورۃً استثنار ہے جس سے خروج من البیت کی اجازت دینا مقصود نہیں بلکہ اس کی ممانعت کو اور زیادہ مؤکد کرنا ہے اسکی مثال ایسی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ فلاں کام کسی کو نہیں کرنا چاہیئے بجز اس کے کہ وہ آدمیت ہی سے نکل جائے، یا کہ اپنی ماں کو گالی نہ دو بجز اسکے کہ تم ماں کے بالکل ہی نافرمان ہوجاؤ

تو یہ ظاہر ہے کہ پہلی مثال میں اس صورت استثنار سے اس فعل کا جواز بتلانا منظور نہیں اور دوسری مثال میں ماں کی نافرمانی کا جواز ثابت کرنا نہیں بلکہ بلیغ انداز میں اس کی اور بھی زیادہ ممانعت وشناعت کا بیان ہے تو خلاصہ مضمون آیت اس صورت میں یہ ہوا کہ مطلقہ عورتیں اپنے شوہروں کے گھروں سے نہ نکلیں مگر یہ کہ وہ بےحیائی ہی پر اُتر آئیں اور نکل بھاگیں تو اسکا مطلب نکل بھاگنے کا جواز نہیں بلکہ اور زیادہ مذمت اور ممانعت کا اثبات ہے۔ فاحشہ مبیّنہ کی یہ تفسیر حضرت عبداللہ بن عمرؓ، سدّی، ابن السائب نخعی وغیرہ سے منقول ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ رح نے اسی کو اختیار فرمایا ہے (روح المعانی)

دوسرا قول یہ ہے کہ فاحشہ مبیّنہ سے مراد زنا اور بدکاری ہے اس صورت میں استثنار اپنے معنی میں ہے کہ اگر مطلقہ عورت نے زنا کیا اور جرم اُس پر ثابت ہو گیا تو اس کو حد شرعی جاری کرنے کیلئے لامحالہ بیتِ عدت سے نکالا جائیگا۔ یہ تفسیر حضرت قتادہ، حسن بصری، شعبی، زید بن اسلم اور ضحاک و عکرمہ وغیرہ سے منقول ہے امام ابویوسف رح نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ فاحشہ مبیّنہ سے مراد زبان درازی اور لڑائی جھگڑا ہے تو معنے آیت کے یہ ہونگے کہ مطلقہ عورتوں کو انکے گھروں سے نکالنا جائز نہیں بجز اس صورت کے کہ عورت بدزبان جھگڑالو ہو اپنے شوہر اور اسکے متعلقین سے بدزبانی کے ساتھ پیش آئے تو ایسی صورت میں اس کو مکان عدت سے نکالا جاسکتا ہے۔ فاحشہ مبیّنہ کی یہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ سے بروایت متعددہ منقول ہے اور آیت مذکور میں حضرت اُبیّ بن کعب اور عبداللہ بن مسعود کی قرارت اسطرح ہے (الّا ان یفحش) اس لفظ کے ظاہری معنی فحش کلام اور بدزبانی کے ہیں۔ اس قرارت سے بھی آخری تفسیر کی تائید ہوتی ہے (روح) اس صورت میں بھی استثنار اپنی حقیقت پر رہے گا کہ بدزبانی اور جھگڑا کرنے کی صورت میں مطلقہ کو مکان عدت سے نکالا جاسکتا ہے۔

یہاں تک طلاق کے متعلق چار احکام کا بیان آیا ہے اور آگے مزید احکام بیان ہونگے مگر ان کے درمیان میں احکام مذکورہ کی پابندی کی تاکید اور اُس کی مخالفت سے بچنے کے لئے چند وعظ و نصیحت کے جملے بیان ہوتے ہیں یہ قرآن حکیم کا خاص اسلوب ہے کہ ہر حکم کے بعد خدا تعالیٰ کے خوف اور آخرت کی فکر یاد دلا کر اسکی خلاف ورزی کو روکا گیا ہے کہ کیونکہ میاں بیوی کا رشتہ اور باہمی حقوق کی پوری ادائیگی کا انتظام کسی قانون کے ذریعہ نہیں ہوسکتا اس کے لئے خوفِ خدا و آخرت ہی روکنے والی چیز ہے۔

وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۭ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا، حُدُوْدُ اللّٰهِ سے مراد شریعت کے مقرر کردہ قوانین ہیں۔ وَمَنْ يَّتَعَدَّ یعنی جو شخص حدود اللہ میں تعدّی کرے یعنی ان حدود احکام کی خلاف ورزی کرے فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ تو اُس نے اپنی جان پر ظلم کیا، یعنی اللہ کا یا شریعتِ اسلام کا کچھ نہیں بگاڑا اپنا ہی نقصان کیا ہے اور

یہ نقصان عام ہے دینی بھی اور دُنیاوی بھی، دینی نقصان تو اسی خلاف شرع کرنے کا گناہ اور اس کا وبال آخرت ہے اور دنیوی نقصان یہ ہے کہ جو شخص شرعی ہدایات کے بغیر طلاق دے بیٹھتا ہے وہ اکثر تین طلاقوں تک پہنچ جاتا ہے جس کے بعد آپس میں رجوع یا نکاح جدید بھی نہیں ہو سکتا اور آدمی اکثر طلاق دینے کے بعد پچتاتا ہے اور مصیبت جھیلتا ہے خصوصاً جبکہ صاحبِ اولاد بھی ہو، اس لئے یہ مصیبت دُنیا ہی میں اپنی جان پر پڑی اور بہت سے لوگ جو بیوی کو تکلیف دینے اور نقصان پہنچانے کی نیت سے ظالمانہ طلاق دیتے ہیں گو اس کی تکلیف عورت کو بھی کچھ پہنچ جائے لیکن اس کے لئے ظلم پر ظلم اور دوہرا وبال ہو جائے گا ایک اللہ کی مقرر کردہ حدود کو توڑنے کا دوسرے عورت پر ظلم کرنے کا جس کی حقیقت یہ ہے کہ ؎

پنداشت ستمگر جفا بر ما کرد ✣ بر گردن وے بماند و بر ما بگذشت

لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰهَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا، یعنی تم نہیں جانتے شاید اللہ تعالیٰ اس غیظ و غضب کے بعد کوئی دوسری حالت پیدا فرمادیں کہ بیوی سے جو راحتیں ملتی تھیں اور اولاد کی پرورش اور گھر کے انتظام کی سہولتیں تھیں اُن کا خیال کر کے تم پھر اپنی طلاق پر پچھتاؤ اور دوبارہ اس کو نکاح میں رکھنے کا ارادہ کرو تو دوبارہ نکاح میں رہنے کی صورت جبھی ہو سکتی ہے جبکہ تم طلاق کے وقت حدودِ شرعیہ کی رعایت کرو کہ بلا وجہ طلاق کو بائن نہ کرو بلکہ رجعی رہنے دو جس میں رجعت کرنے کا شوہر کو اختیار رہتا ہے رجعت کر لینے سے پہلا نکاح بدستور قائم رہ جاتا ہے اور یہ کہ تین طلاق تک نوبت نہ پہنچا دو جس کے بعد رجعت کا حق نہیں رہتا اور دونوں کی رضامندی کے باوجود آپس میں دوبارہ نکاح بھی شرعاً حلال نہیں ہوتا۔

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ، اَجَلَهُنَّ میں لفظ اجل بمعنے عدت ہے اور بلوغ اَجَل سے مراد عدت کا اختتام کے قریب ہونا ہے۔

طلاق کے متعلق پانچواں حکم اس آیت میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ جب مطلقہ بیوی کی عدت ختم کے قریب پہنچے تو اب نکاح سے نکل جانے کا وقت آگیا اسوقت تک وقتی تاثرات اور غم و غصہ کی کیفیت بھی ختم ہو جانی چاہیئے اسوقت پھر سنجیدگی کے ساتھ غور کر لو کہ نکاح رکھنا بہتر ہے یا اسکا بالکل منقطع کر دینا اگر نکاح میں رکھنے کی رائے ہو جائے تو اس کو روک لو جس کی مسنون صورت اگلی آیت کے اشارہ اور حدیث کے ارشاد کے مطابق یہ ہے کہ زبان سے کہدو کہ میں نے اپنی طلاق سے رجوع کر لیا اور اس پر دو گواہ بھی بنالو۔

اور اگر اب بھی یہی رائے قائم ہو کہ نکاح ختم کرنا ہے تو پھر اسکو خوبصورتی کے ساتھ آزاد کر دو۔ یعنی عدت ختم ہو جانے دو عدت پوری ہوتے ہی وہ آزاد خود مختار ہو جائے گی۔

چھٹا حکم اختتام عدت کے وقت بیوی کو روکنا اور نکاح میں رکھنا طے ہو یا آزاد کر دینا، دونوں میں قرآن کریم نے بمعروف کی قید لگا دی ہے۔ معروف کے لفظی معنے پہچانا ہوا طریقہ اور مراد اس سے یہ ہے کہ جو طریقہ شریعت و سنت سے ثابت اور اسلام اور مسلمانوں میں عام طور پر معروف ہے وہ اختیار کرو وہ یہ ہے کہ اگر نکاح میں رکھنا اور رجعت کرنا طے کرو تو آگے اس کو زبانی یا عملی ایذا رسانی نہ پہنچاؤ اور اس پر احسان نہ جتلاؤ اور اس کی جو عملی یا اخلاقی کمزوری طلاق کا سبب بن رہی تھی آگے خود بھی اس پر صبر کرنے کا عزم کرلو تاکہ پھر وہ تلخی پیدا نہ ہو، اور اگر آزاد کرنا طے ہو تو اسمیں معروف و مسنون طریقہ یہ ہے کہ اس کو ذلیل و خوار کرکے یا برا بھلا کہہ کر گھر سے نہ نکالو بلکہ حسنِ اخلاق کے ساتھ رخصت کرو۔ اور جیسا کہ قرآن کریم کی دوسری آیات سے ثابت ہے چلتے وقت اس کو کوئی جوڑا کپڑے کا دیکر رخصت کرنا کم از کم مستحب ضرور ہے، بعض صورتوں میں واجب بھی ہے جس کی تفصیل کتبِ فقہ میں ہے۔

ساتواں حکم آیتِ مذکورہ میں روکنے یا آزاد کرنے کے دو اختیار دینے سے نیز اس سے پہلی آیت میں لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا سے ضمنی طور پر یہ مستفاد ہوا کہ منشار ربانی یہ ہے کہ طلاق دینے کی مجبوری ہی پیش آجائے تو طلاق ایسی دی جائے جس میں رجعت کرنے کا حق باقی رہے جس کی مسنون صورت یہ ہے کہ صاف لفظوں میں صرف ایک طلاق دیدے اور اس کے ساتھ اظہار غیظ و غضب کے لئے ایسا کوئی لفظ نہ بولے جو رشتۂ نکاح کو بالکلیہ منقطع کر دینے پر دلالت کرتا ہو مثلاً کہدے کہ میرے گھر سے نکل جاؤ۔ یا کہدے تمھیں بہت سخت طلاق دیتا ہوں یا کہدے کہ اب میرا تم سے کوئی تعلق نکاح کا باقی نہیں ایسے الفاظ اگر طلاق صریح کے ساتھ بھی کہدیئے جاویں یا خود یہی الفاظ بہ نیت طلاق کہدیئے جاویں تو اس سے رجعت کا حق باطل ہو جاتا ہے۔ یہ اصطلاحِ شرع میں طلاق بائن ہو جاتی ہے جس سے نکاح فوراً ٹوٹ جاتا ہے اور رجعت کا حق باقی نہیں رہتا۔ اور اس سے زیادہ اشد یہ ہے کہ طلاق کو تین کے عدد تک پہنچا دے کہ اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ شوہر کا صرف حقِ رجعت ہی سلب نہیں ہو جائے گا بلکہ آئندہ اگر مرد و عورت دونوں راضی ہو کر باہم نکاح بھی کرنا چاہیں تو نکاح جدید بھی نہ ہو سکے گا جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت میں ہے فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ

تین طلاق بیک وقت دینا حرام ہے مگر کسی نے ایسا کیا تو تینوں طلاق واقع ہو جائیں گی اسپر امت کا اجماع ہے

آجکل دین سے بے پرواہی اس کے احکام سے غفلت بری طرح عام ہوتی جاتی ہے جاہلوں کا تو کہنا کیا ہے لکھے پڑھے عرائض نویس بھی تین طلاق سے کم کو گویا طلاق ہی نہیں سمجھتے اور رات دن اسکا مشاہدہ ہوتا ہے کہ تین طلاقیں دینے والے بعد میں پچھتاتے ہیں اور اس فکر میں رہتے ہیں کہ کسی طرح بیوی ہاتھ سے نہ جائے۔ حدیث صحیح میں تین طلاق بیک وقت دینے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سخت غضبناک ہونا امام نسائی نے بروایت محمود بن لبید رضؓ نقل کیا ہے اسی لئے بیک وقت

تین طلاق دینا باجماعِ اُمّت حرام وناجائز ہے۔ اور اگر کوئی شخص تین طہر میں الگ الگ تین طلاقوں تک پہنچ جائے تو اسکے ناپسندیدہ ہونے پر بھی اُمّت کا اجماع اور خود قرآن کی آیات کے اشارہ سے ثابت ہے صرف اسمیں اختلاف ہے کہ یہ صورت بھی حرام وناجائز اور طلاق بدعی میں داخل ہے یا ایسا نہیں، امام مالکؒ کے نزدیک حرام ہے امام اعظم ابوحنیفہ وشافعی حرام تو نہیں کہتے یعنی اس صورت کو طلاق بدعی میں شمار نہیں کرتے بلکہ طلاق سنت میں داخل سمجھتے ہیں مگر ناپسندیدہ فعل انکے نزدیک بھی ہے تفصیل اسکی سورۂ بقرہ کی تفسیر معارف القرآن جلد اوّل ص۵۰۲ میں مذکور ہے۔

مگر جس طرح تین طلاق بیک وقت دینے کے حرام ہونے پر پوری اُمّت کا اجماع ہے اسی طرح اسپر بھی اجماع ہے کہ حرام ہونے کے باوجود کوئی شخص ایسا کر گزرے تو تینوں طلاق واقع ہو کر آئندہ آپسمیں نکاح جدید بھی حلال نہیں ہوگا۔ پوری اُمّت میں کچھ اہلِ حدیث اور اہلِ تشیع کے سوا تمام مذاہب اربعہ اسپر متفق ہیں کہ تین طلاق بیک وقت بھی دیدی گئیں تو تینوں واقع ہو جائیں گی کیونکہ کسی فعل کے حرام ہونے سے اُس کے آثار کا وقوع متاثر نہیں ہوا کرتا جیسے کوئی کسی کو بے گناہ قتل کر دے تو یہ فعل حرام ہونے کے باوجود مقتول تو بہرحال مر ہی جائیگا۔ اسی طرح تین طلاق بیک وقت حرام ہونے کے باوجود تینوں کا وقوع لازمی امر ہے۔ اور صرف مذاہب اربعہ کا ہی نہیں بلکہ اسپر صحابۂ کرام کا بھی اجماع حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں منقول ومعروف ہے اسکا بھی مکمل بیان معارف القرآن جلد اوّل ص۵۰۲ تا ص۵۱۴ میں تفصیل کے ساتھ آچکا ہے اس کو دیکھ لیا جاوے۔

وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ یعنی گواہ بنالو اپنے مسلمانوں میں سے دو معتبر آدمیوں کو اور قائم کرو شہادت کو ٹھیک ٹھیک۔

آٹھواں حکم اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ اختتام عدت کے وقت خواہ رجعت کر کے بیوی کو روکنا طے کیا جائے یا عدت پوری کر کے آزاد کرنا طے کیا جائے دونوں صورتوں میں اپنے اس فعل رجعت یا ترک رجعت پر دو معتبر گواہ بنالو۔ یہ حکم اکثر ائمہ کے نزدیک استحبابی ہے رجعت اس پر موقوف نہیں۔ اور گواہ بنانے کی حکمت رجعت کرنے کی صورت میں تو یہ ہے کہ کہیں کل کو عورت رجعت سے انکار کر کے اسکے نکاح سے نکل جانے کا دعوٰے نہ کرنے لگے اور ترک رجعت اور انقطاع نکاح کی صورتیں اسلئے کہ کل کو خود اپنا نفس ہی کہیں شرارت یا بیوی کی محبت سے مغلوب ہو کر یہ دعوٰی نہ کرنے لگے کہ عدت گزرنے سے پہلے رجعت کرلی تھی۔ ان دو گواہوں کے لئے ذَوَیْ عَدْلٍ فرما کر بتلا دیا کہ شرعی اور اصطلاحی معنی میں عَدْل یعنی ثقہ ومعتبر ہونا گواہوں کا ضروری ہے ورنہ ان کی شہادت پر قاضی کوئی فیصلہ نہیں دیگا۔ اور اَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ میں عام مسلمانوں کو خطاب ہے کہ اگر تم کسی ایسے واقعہ رجعت یا انقطاع نکاح کے گواہ ہو اور قاضی کی عدالت میں گواہی دینے کی نوبت آوے تو کسی رو رعایت یا مخالفت وعداوت کی وجہ سے سچّی گواہی دینے میں

ذرا بھی فرق نہ کرو۔

ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ، یعنی اس مذکورہ مضمون سے اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو ایمان رکھتا ہو اللہ پر اور آخری دن یعنی قیامت پر۔ اسمیں آخرت کا خصوصیت سے ذکر اسلئے کیا گیا کہ زوجین کے باہمی حقوق کی ادائیگی بغیر تقویٰ اور فکرِ آخرت کے کسی سے نہیں کرائی جاسکتی۔

جرم و سزا کے قوانین میں قرآن حکیم کا عجیب و غریب حکیمانہ اور مربیانہ اصول دُنیا کی حکومتوں میں قواعد و قوانین کی تدوین اور جرائم کی سزا و تعزیر کا پُرانا دستور ہے ہر قوم و ملک میں قوانین اور تعزیرات کی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآن کریم بھی اللہ کے قانون کی کتاب ہے مگر اسکا طرز تمام دُنیا کی کتب قوانین سے نرالا اور عجیب ہے کہ ہر قانون کے آگے پیچھے خوفِ خدا اور فکرِ آخرت کو سامنے کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ ہر انسان قانون کی پابندی کسی پولیس اور نگراں کے خوف سے نہیں بلکہ اللہ کے خوف سے کرے کوئی دیکھے یا نہ دیکھے، خلوت ہو یا جلوت ہر صورت میں پابندی قانون کو ضروری سمجھے۔ صرف یہی سبب ہے کہ قرآن پر صحیح ایمان رکھنے والوں میں کسی سخت سے سخت قانون کی تنفیذ بھی زیادہ دشوار نہیں ہوتی اس کے لئے اسلامی حکومت کو پولیس اور اس پر اسپیشل پولیس اور اسپر خفیہ پولیس کا جال پھیلانیکی ضرورت نہیں پڑتی۔

قرآن کریم کا یہ مربیانہ اصول تمام ہی قوانین میں عام ہے۔ خصوصیت سے میاں بیوی کے تعلقات اور باہمی حقوق کے قوانین میں اسکا سب سے زیادہ اہتمام کیا گیا ہے کیونکہ یہ تعلقات ہی ایسے ہیں کہ ان میں نہ ہر کام پر کوئی شہادت مہیا ہوسکتی ہے نہ عدالتی تحقیق زوجین کے حقوق باہمی کی کمی کوتاہی کا صحیح اندازہ لگا سکتی ہے ان کا تمامتر مدار خود زوجین ہی کے قلوب اور انکے اعمال و افعال پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نکاح کے خطبۂ مسنونہ میں قرآن کریم کی جو تین آیتیں پڑھنا سُنت سے ثابت ہے یہ تینوں آیتیں تقویٰ کے حکم سے شروع اور اسی پر ختم ہوتی ہیں جن میں یہ اشارہ ہے کہ نکاح کرنے والوں کو ابھی سے یہ سمجھ لینا ہے کہ کوئی دیکھے یا نہ دیکھے مگر حق تعالیٰ ہمارے کھلے اور چھپے سب اعمال سے بلکہ دلوں کے پوشیدہ خیالات تک سے واقف ہے ہم نے آپس کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی برتی، ایک سے دوسرے کو تکلیف پہنچی تو عالم السرائر کے سامنے جوابدہی کرنا ہوگی، اسی طرح سورۂ طلاق میں جبکہ طلاق کے چند احکام بیان فرمائے گئے تو پہلے ہی حکم کے بعد وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ فرما کر تقویٰ کی ہدایت فرمائی پھر چار احکام کا ذکر کرنے کے بعد یہ وعظ و نصیحت کی کہ جو شخص ان کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ کسی اور پر نہیں بلکہ اپنی ذات ہی پر ظلم کرتا ہے اسکا وبال اسی کو تباہ کر دیگا وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ پھر اور چار ضمنی احکام و قوانین ذکر کرنے کے بعد دوبارہ اس ہدایت کو دہرایا گیا ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ، آگے ایک آیت میں تقویٰ کے فضائل اور اس کی دینی و دنیوی برکات کا بیان فرمایا پھر اسی آیت کے آخر میں اللہ پر توکل اور بھروسہ رکھنے کی برکات ارشاد فرمائی گئیں اسکے بعد پھر چند احکام عدت کے بیان فرمائے اور اسکے بعد پھر دو آیتوں

ہیں تقویٰ کے مزید برکات و ثمرات کا بیان آیا اور اسکے بعد پھر کچھ نکاح و طلاق کے متعلقات بیوی کے نفقہ اور اولاد کے دودھ پلانے وغیرہ کے احکام بتلائے گئے۔ طلاق و عدت اور عورتوں کے نفقہ اور دودھ پلانے وغیرہ کے احکام میں بار بار کہیں ذکر آخرت کہیں تقوے کی فضیلت و برکت اور کہیں توکل کے برکات اور کچھ احکام بیان کر کے پھر تقویٰ کے مکرر سکرر فضائل کا بیان بظاہر بے جوڑ معلوم ہوتا ہے مگر قرآن کریم کے اس مربیانہ اصول کی حکمت سمجھ لینے کے بعد اسکا جوڑ اور گہرا ربط بھی واضح ہوگیا۔ اب آیات مذکورہ کی تفسیر و تشریح دیکھئے۔

وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا ۙ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ، یعنی جو شخص اللہ سے ڈریگا تو اللہ تعالیٰ اسکے لئے ہر مشکل و مصیبت سے نجات کا راستہ نکالدیں گے اور اسکو بے گمان رزق عطا فرما دیں گے لفظ تقویٰ کے اصلی اور لغوی معنے بچنے کے ہیں۔ شرعی اصطلاح میں گناہوں سے بچنے کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف اضافت و نسبت ہوتی ہے تو ترجمہ اللہ سے ڈرنے کا کر دیا جاتا ہے اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی نافرمانی اور معصیت سے بچے اور ڈرے۔

اس آیت میں تقویٰ کی دو برکتیں بیان فرمائیں ہیں۔ اول یہ کہ تقویٰ اختیار کرنے والے کیلئے اللہ تعالیٰ بچنے کا راستہ نکالدیتے ہیں۔ کس چیز سے بچنا، اسمیں صحیح بات یہ ہے کہ یہ عام ہے دُنیا کی سب مشکلات و مصائب کے لئے بھی اور آخرت کی سب مشکلات و مصائب کے لئے بھی اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ متقی یعنی گناہوں سے بچنے والے آدمی کے لئے دُنیا و آخرت کی ہر مشکل و مصیبت سے نجات کا راستہ نکالدیتے ہیں، اور دوسری برکت یہ ہے کہ اس کو ایسی جگہ سے رزق عطا فرماتے ہیں جہاں کا اسکو خیال و گمان بھی نہیں ہوتا۔ صحیح بات یہی ہے کہ رزق سے بھی اس جگہ مراد ہر ضرورت کی چیز ہے خواہ دُنیا کی ہو یا آخرت کی، مؤمن متقی کے لئے اللہ تعالیٰ کا وعدہ اس آیت میں یہ ہے کہ اس کی ہر مشکل کو بھی آسان کر دیتا ہے اور اس کی ضروریات کا بھی تکفل کرتا ہے اور ایسے راستوں سے اسکی ضروریات مہیا کر دیتا ہے جسکا اس کو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا (کذا فی الروح)

مناسبتِ مقام کی وجہ سے بعض حضرات مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں یہ فرمایا ہے کہ طلاق دینے والے شوہر اور مطلقہ بیوی دونوں یا ان میں جو بھی تقویٰ اختیار کرنے والا ہوگا اللہ تعالیٰ اسکو طلاق اور انقطاع نکاح کے بعد پیش آنے والی ہر مشکل و تکلیف سے نجات عطا فرمائیں گے اور مرد کو اسکے مناسب بیوی اور عورت کو اسکے مناسب شوہر عطا فرمائیں گے اور ظاہر ہے کہ آیت کا اصل مفہوم جو تمام مشکلات اور ہر قسم رزق کے لئے عام اور شامل ہے اس میں زوجین کی یہ مشکلات و ضروریات بھی شامل ہیں (کذا فی روح المعانی)

آیتِ مذکورہ کا شانِ نزول | حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ سے روایت ہے کہ عوف بن مالک اشجعی رضؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرے لڑکے سالم کو دشمن گرفتار

کر کے لے گئے، اس کی ماں سخت پریشان ہے مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم کو اور لڑکے کی والدہ کو حکم دیتا ہوں کہ تم کثرت کے ساتھ لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھا کرو۔ ان دونوں نے حکم کی تعمیل کی، کثرت سے یہ کلمہ پڑھنے لگے اسکا یہ اثر ہوا کہ جن دشمنوں نے لڑکے کو قید کر رکھا تھا وہ کسی روز ذرا غافل ہوئے لڑکا کسی طرح اُن کی قید سے نکل گیا اور اُن کی کچھ بکریاں ہنکا کر ساتھ لیکر اپنے والد کے پاس پہنچ گیا۔ بعض روایات میں ہے کہ اُن کا ایک اونٹ ان کو مل گیا اس پر سوار ہوئے اور دوسرے اونٹوں کو ساتھ لگایا سب کو لیکر والد کے پاس پہنچ گئے، اُن کے والد یہ خبر لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ یہ سوال بھی کیا کہ یہ اونٹ بکریاں جو میرا لڑکا ساتھ لے آیا ہے یہ ہمارے لئے جائز و حلال ہیں یا نہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ الآیۃ۔

اور بعض روایات میں ہے کہ عوف بن مالک اشجعی اور ان کی بیوی کو جب لڑکے کی مفارقت نے زیادہ بے چین کیا تو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا، اور اسمیں کچھ بُعد نہیں کہ تقوے کا بھی حکم دیا ہو اور بکثرت لاحول ولا قوۃ الخ پڑھنے کا بھی (یہ سب روایات روح المعانی میں ابن مردویہ سے من طریق الکلبی عن ابی صالح عن ابن عباس رضؓ نقل کی گئی ہیں)

اس شانِ نزول سے بھی یہ معلوم ہوا کہ اگرچہ اس مقام پر یہ آیت طلاق سے تعلق رکھنے والے مرد و عورت کے متعلق آئی ہے مگر مفہوم اسکا عام ہے سب کے لئے شامل ہے۔

مسئلہ۔ اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ کوئی مسلمان کفار کی قید میں میں آجائے اور وہ ان کا کچھ مال لیکر واپس آجائے تو یہ مال بحکم مال غنیمت حلال ہے اور مال غنیمت کے عام قاعدہ کے مطابق اس کا پانچواں حصہ بیت المال کو دینا بھی اس کے ذمہ نہیں جیسا کہ واقعہ حدیث میں اس مال میں سے خمس نہیں لیا گیا۔ حضرات فقہاء نے فرمایا کہ کوئی مسلمان چھپ کر بغیر امان و اجازت لئے ہوئے دارالحرب میں چلا جائے اور وہاں سے کفار کا کچھ مال چھین کر یا کسی طرح لے آئے اور دارالاسلام میں پہنچ جائے تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ لیکن جو شخص کفار سے امان اور اجازت لیکر اُن کے ملک میں جائے جیسا آجکل ویزا لینے کا دستور ہے تو اُس کے لئے جائز نہیں کہ ان کا کوئی مال بغیر اُن کی رضامندی کے لے آئے۔ اسی طرح جو شخص قید ہو کر اُن کے ملک میں چلا جائے پھر کفار میں سے کوئی آدمی اس کے پاس کوئی امانت رکھدے تو اس امانت کا لے آنا بھی حلال نہیں، پہلی صورت میں تو اس لئے کہ امان لے کر جانے سے ایک معاہدہ اُن کے درمیان ہوگیا اب بغیر ان کی رضامندی کے اُن کے جان و مال میں کوئی تصرف کرنا عہد شکنی میں داخل ہے اور دوسری صورت میں بھی امانت رکھنے والے سے عملی معاہدہ ہوتا ہے کہ جب وہ مانگے گا امانت اس کو دیدی جائے گی، اب امانت واپس نہ کرنا

بدعہدی اور عہد شکنی ہے جو شرعاً حرام ہے (مظہری)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس ہجرت سے پہلے بہت سے کفار اپنی امانتیں رکھدیتے تھے۔ ہجرت کے وقت آپکے قبضہ میں ایسی کچھ امانتیں تھیں ان کو آپ اپنے ساتھ نہیں لائے بلکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو اسی کام کے لئے اپنے پیچھے چھوڑا کہ وہ جس جس کی امانت ہے اس کو سپرد کر دیں۔

مصائب سے نجات اور مقاصد کے حصول کا مجرب نسخہ

حدیث مذکور میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے عوف بن مالکؓ کو مصیبت سے نجات اور حصولِ مقصد کے لئے یہ تلقین فرمائی کہ کثرت کیساتھ لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھا کریں۔ حضرت مجدد الف ثانی رحؒ نے فرمایا کہ دینی اور دُنیاوی ہر قسم کے مصائب اور مضرتوں سے بچنے اور منافع و مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے اس کلمہ کی کثرت بہت مجرب عمل ہے اور اس کثرت کی مقدار حضرت مجدد رحؒ نے یہ بتلائی ہے کہ روزانہ پانسو مرتبہ یہ کلمہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھا کرے اور سو سو مرتبہ درود شریف اس کے اوّل و آخر میں پڑھ کر اپنے مقصد کے لئے دُعا کیا کرے (تفسیر مظہری) اور امام احمد رحؒ اور حاکم بیہقی، ابونعیم وغیرہ نے حضرت ابوذر رضؓ سے روایت کیا ہے اور حاکم نے اس کی اسناد کو صحیح کہا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک روز اس آیت وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا الآیۃ کی تلاوت بار بار فرماتے رہے یہانتک کہ مجھے نیند آنے لگی پھر فرمایا کہ اے ابوذر اگر سب آدمی صرف اس آیت کو اختیار کرلیں تو سب کے لئے کافی ہے (روح المعانی) کافی ہونے کی مراد ظاہر ہے کہ تمام دینی اور دُنیوی مقاصد میں کامیابی کے لئے کافی ہے۔

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۭ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝

یعنی جو شخص اللہ پر توکل اور بھروسہ کریگا اللہ اس کی مہمات کے لئے کافی ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ اپنے کام کو جس طرح چاہے پورا کر رہتا ہے اُس نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے اسی کے مطابق سب کام ہوتے ہیں۔ ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

لو انکم توکلتم علی اللہ حق توکلہ لرزقکم کما یرزق الطیر تغدو اخماصا وتروح بطانا

اگر تم اللہ پر توکل کرتے جیسا کہ اسکا حق ہے تو بیشک اللہ تعالیٰ تمھیں اس طرح رزق دیتا جیسا پرندے جانوروں کو دیتا ہے کہ صبح کو اپنے گھونسلوں سے بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے ہوئے واپس ہوتے ہیں

اور صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابن عباس رضؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اُمت میں سے ستر ہزار آدمی بے حساب جنت میں داخل ہونگے، اُن کے اوصاف میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ اللہ پر توکل کرنے والے ہونگے (مظہری)

توکل کے معنی یہ نہیں کہ اللہ کے پیدا کئے ہوئے اسباب و آلات کو چھوڑ دے بلکہ مراد یہ ہے کہ اسباب اختیاریہ کو ضرور اختیار کرے مگر بھروسہ اسباب پر کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ پر کرے کہ جبتک اُس کی مشیت و

ارادہ نہ ہوجائے کوئی کام نہیں ہوسکتا۔ مذکورہ آیت میں تقویٰ اور توکل کے فضائل و برکات بیان کرنے کے بعد مزید چند احکام طلاق و عدت کے بیان فرمائے ہیں، وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُہُنَّ ثَلٰثَۃُ اَشْہُرٍ وَّالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُہُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَہُنَّ، اس آیت میں مطلقہ عورتوں کی عدت کی مزید تفصیل ہے جسمیں تین قسم کی عورتوں کی عدت کا عام قاعدہ عدت سے جداگانہ حکم مذکور ہے۔

عدت طلاق کے متعلق نواں حکم عدتِ طلاق عام حالات میں تین حیض پورے ہیں جس کا بیان سورہ بقرہ میں ہوچکا ہے لیکن وہ عورتیں جن کو عمر کی زیادتی یا کسی بیماری وغیرہ کے سبب حیض آنا بند ہوچکا ہو اسی طرح وہ عورتیں جن کو کم عمری کے سبب ابھی تک حیض آنا شروع نہ ہوا ہو ان کی عدت آیتِ مذکورہ میں تین حیض کے بجائے تین مہینے مقرر فرمادی اور حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل قرار دی ہے خواہ وہ کتنے ہی دنوں میں ہو۔

اِنِ ارْتَبْتُمْ، یعنی اگر تمھیں شک ہو، مراد شک سے یہ ہے کہ اصل عدت حیض سے شمار ہوتی ہے اور ان عورتوں کا حیض تو بند ہے تو پھر عدت کی شمار کیسے ہوگی یہ تردد مراد ہے۔

آگے پھر تقویٰ کی فضیلت و برکت کا بیان ہے وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مِنْ اَمْرِہٖ یُسْرًا یعنی جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اسکے کام میں آسانی کردیتا ہے یعنی دُنیا و آخرت کے کام اس کیلئے آسان ہوجاتے ہیں اس کے بعد پھر طلاق و عدت کے احکام مذکورہ کی پابندی کی تاکید ہے ذٰلِکَ اَمْرُ اللّٰہِ اَنْزَلَہٗٓ اِلَیْکُمْ (یہ حکم ہے اللہ کا جو تمھاری طرف نازل کیا گیا ہے اس کے بعد پھر تقویٰ کی ایک اور فضیلت کا بیان ہے وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یُکَفِّرْ عَنْہُ سَیِّاٰتِہٖ وَیُعْظِمْ لَہٗٓ اَجْرًا، یعنی جو شخص اللہ سے ڈریگا تو اللہ تعالےٰ اُس کے گناہوں کا کفارہ کردیں گے اور اسکا اجر بڑھادیں گے۔

تقویٰ کی پانچ برکات آیاتِ مذکورہ میں جو تقویٰ کے فضائل و برکات کا بیان آیا اسکا خلاصہ پانچ چیزیں ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ متقی کے لئے دُنیا و آخرت کے مصائب و مشکلات سے نجات کا راستہ نکالدیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اُس کے لئے رزق کے ایسے دروازے کھولدیتے ہیں جن کی طرف اسکا دھیان بھی نہیں جاتا، تیسرے یہ کہ اُس کے سب کاموں میں آسانی پیدا فرمادیتے ہیں۔ چوتھے یہ کہ اسکے گناہوں کا کفارہ کردیتے ہیں۔ پانچویں یہ کہ اسکا اجر بڑھا دیتے ہیں اور ایک دوسری جگہ تقوے کی یہ برکت بھی بتلائی گئی ہے کہ اس کی وجہ سے اسکو حق و باطل کی پہچان آسان ہوجاتی ہے آیت اِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا کا یہی مطلب ہے۔ آگے پھر مطلقہ عورتوں کی عدت اور ان کے نفقہ کا بیان اور عام عورتوں کے حقوق کی ادائیگی کی تاکید ہے اَسْکِنُوْہُنَّ مِنْ حَیْثُ سَکَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِکُمْ وَلَا تُضَآرُّوْہُنَّ لِتُضَیِّقُوْا عَلَیْہِنَّ اس آیت کا تعلق اُس پہلے حکم سے ہے جو اوپر آچکا ہے کہ مطلقہ عورتوں کو انکے گھروں سے نہ نکالو۔ اس آیت میں اسکا

ایجابی پہلو ذکر کیا گیا کہ اُن کو عدّت پوری ہونے تک اپنی وسعت و قدرت کیمطابق رہنے کا مکان دو جہاں تم خود رہتے ہو اسی مکان کے کسی حصّہ میں رکھو۔ اگر مطلقہ بطلاق رجعی ہے جب تو باہم کسی پردہ کی بھی ضرورت نہیں، ہاں اگر طلاق بائن دی ہے یا تین طلاق دیدی ہیں تو اب رشتۂ نکاح ٹوٹ چکا ہے اسکو سابق شوہر سے پردہ کرنا چاہیئے اس لئے پردہ کیساتھ اسی مکان میں رہنے کا انتظام کیا جائے۔

دسواں حکم مطلقہ عورتوں کو ایّام عدّت میں پریشان نہ کرو | لَا تُضَآرُّوْهُنَّ اسکا مطلب یہ ہے کہ ایّام عدت میں جبکہ مطلقہ عورت تمھارے ساتھ رہے تو طعن تشنیع کرکے یا اس کی ضروریات میں تنگی کرکے اس کو پریشان نہ کرو کہ وہ نکلنے پر مجبور ہو جائے۔

وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ، یعنی اگر مطلقہ عورتیں حمل والیاں ہوں تو اُن پر اسوقت تک خرچ کرتے رہو جب تک کہ ان کا حمل پیدا نہ ہو جائے۔

گیارھواں حکم مطلقات کا نفقہ عدّت | اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ مطلقہ عورتیں اگر حاملہ ہوں تو اُن کا نفقہ اسوقت تک شوہر پر لازم ہے جب تک کہ حمل پیدا ہو ..... اسی لئے مطلقہ حاملہ کے متعلق پوری اُمت کا اجماع ہے کہ اسکا نفقہ اس کی عدّت جو وضع حمل ہے پوری ہونے تک شوہر پر واجب ہے۔ باقی جو مطلقہ حاملہ نہیں اگر اس کو طلاق رجعی دی گئی ہے تو اسکا نفقہ عدّت بھی شوہر پر باجماعِ اُمت واجب ہے باقی وہ مطلقہ جس کو طلاق بائن یا تین طلاق دی گئی ہیں یا جسنے خُلع وغیرہ کے ذریعہ اپنا نکاح فسخ کرایا ہو اسکے متعلق امام شافعیؒ واحمدؒ اور بعض دوسرے ائمہ کا قول یہ ہے کہ اُن کا نفقہ شوہر پر واجب نہیں اور امام اعظم ابوحنیفہ رح کے نزدیک انکا نفقہ بھی شوہر پر لازم ہے اُن کے نزدیک جس طرح حقِ سکنیٰ تمام مطلقات کے لئے واجب ہے اسی طرح نفقہ بھی ہر قسم کی مطلقات کے لئے واجب ہے اور دلیل یہی آیت ہے جس میں عام مطلّقات کے لئے حق سکنیٰ دینے کو لازم کیا گیا ہے یعنی اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ کیونکہ اسی آیت میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ کی قرارت یہ ہے اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ وَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ مِنْ وُّجْدِكُمْ اور ایک قرارت دوسری قرارت کے لئے مفسّر ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آیتِ مذکورہ کی مشہور قرارت جس میں لفظ انفقوا مذکور نہیں اسمیں بھی یہ لفظ محذوف ہے اور اس نے جس طرح تمام مطلقات کا حق سُکنیٰ شوہروں پر لازم کیا ہے اسی طرح حقِ نفقہ بھی ایام عدّت تک واجب کر دیا ہے اور اس کی تائید حضرت فاروق اعظمؓ اور دوسرے متعدد صحابۂ کرام کے اس قول سے ہوتی کہ انھوں نے فاطمہ بنت قیسؓ کی جن کو اُن کے شوہر نے تین طلاق دیدی تھی اُن کی اس روایت کو کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کا نفقہ ان کے شوہر پر لازم نہیں کیا یہ کہہ کر رد فرمایا کہ ہم انکی اس روایت کی بنا پر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو نہیں چھوڑ سکتے جس میں تمام مطلقات کا نفقہ عدّت شوہروں پر واجب کیا گیا ہے (رواہ مسلم)

اس میں کتاب اللہ کے حوالہ سے بظاہر یہی آیت مراد ہے اور فاروق اعظم کے نزدیک مفہوم آیت میں نفقہ بھی داخل ہے اور سنت سے مراد وہ حدیث ہے جو خود عمر بن خطابؓ سے طحاوی، دارقطنی اور طبرانی نے روایت کی ہے عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ آپؐ نے مطلقہ ثلثا کے لئے بھی نفقہ اور سُکنیٰ واجب کیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حمل والی عورتوں کا نفقہ عدت تو صراحۃً اس آیت نے واجب قرار دیا ہے اسی لئے اُس پر اجماع اُمت ہے۔ اسی طرح مطلقہ رجعیہ کا چونکہ ابھی تک نکاح ٹوٹا نہیں ہے اسکا نفقہ بھی باتفاق واجب ہے مطلقہ بائنہ یا ثلثہ وغیرہ کے معاملہ میں فقہار اُمت کا اختلاف ہے امام اعظم رح کے نزدیک اسکا بھی نفقہ واجب ہے، اس کی مکمل تفصیل اسی آیت کی تفسیر میں تفسیر مظہری میں دیکھی جا سکتی ہے۔

فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ، یعنی مطلقہ عورتیں اگر حاملہ ہوں اور پھر حمل سے بچہ پیدا ہوگیا تو اُن کی عدت تو وضع حمل کی وجہ سے پوری ہوگئی اس لئے ان کا نفقہ تو شوہر پر لازم نہیں رہا مگر جو بچہ پیدا ہوا ہے اگر یہ مطلقہ ماں اس کو دودھ پلائے تو دودھ پلائیکا معاوضہ لینا اور دینا جائز ہے۔

بارھواں حکم ، رضاعت یعنی بچہ کو دودھ پلانے کی اُجرت۔ جب تک عورت شوہر کے نکاح میں ہے اُسوقت تک بچوں کو دودھ پلانا خود ماں کے ذمہ بحکم قرآن واجب ہے وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ اور جو کام کسی کے ذمہ خود واجب ہو اُس پر معاوضہ لینا رشوت کے حکم میں ہے جسکا لینا بھی ناجائز ہے اور دینا بھی۔ اور ایام عدت بھی اس معاملے میں بحکم نکاح ہیں کیونکہ عورت کا نفقہ جس طرح بحالت نکاح شوہر پر لازم ہے عدت میں بھی واجب ہے، البتہ جب وضع حمل کے ذریعہ عدت ختم ہوگئی اور عورت آزاد ہوگئی اسکا نفقہ بھی شوہر پر واجب نہیں رہا، اب اگر یہ اس بچے کو دودھ پلائے تو آیتِ مذکورہ نے اسکا معاوضہ لینے اور دینے کو جائز قرار دے دیا۔

تیرھواں حکم وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ۔ ائتمار کے لفظی معنے باہم مشورہ اور ایک دوسرے کی بات قبول کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دودھ پلانے کی اُجرت میں زوجین کو اسکی ہدایت دی گئی ہے کہ باہمی نزاع کی نوبت نہ آنے دیں۔ مطلقہ بیوی عام اُجرت سے زیادہ نہ مانگے، شوہر عام اُجرت کے مطابق دینے سے انکار نہ کرے ایک دوسرے کیساتھ رواداری کا معاملہ کریں۔

چودھواں حکم وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗٓ اُخْرٰى، یعنی اگر دودھ پلانے کا معاملہ باہمی مشورہ سے طے نہ ہو پائے یا مطلقہ عورت اگر اپنے بچہ کو معاوضہ لیکر بھی دودھ پلانے سے انکار کر دے تو اُس کو قضاءً مجبور نہیں کیا جائیگا بلکہ یہ سمجھا جائے گا کہ ماں کی شفقت بچے پر سب سے زیادہ ہونیکے باوجود جب انکار کر رہی ہے تو کوئی واقعی عذر ہوگا لیکن اگر فی الواقع اس کو عذر نہیں محض غصہ و ناراضی کی وجہ سے انکار کرتی ہے تو عنداللہ وہ گنہگار ہوگی مگر قاضی کی عدالت اسکو دودھ پلانے پر مجبور نہیں کریگی۔

اسی طرح اگر شوہر کو دودھ پلانے کی اُجرت دینے کی بوجہ افلاس کے قدرت نہیں اور کوئی دوسری عورت بلا معاوضہ یا اس معاوضہ سے کم پر دودھ پلانے کو تیار ہو جو معاوضہ مطلقہ ماں مانگتی ہے تو شوہر کو مجبور نہیں کیا جائیگا کہ وہ ماں کا مطالبہ منظور کر کے اسی سے دودھ پلوائے بلکہ دونوں صورتوں میں دوسری عورت سے اس کو دودھ پلوایا جاسکتا ہے۔ ہاں اگر دوسری دودھ پلانے والی عورت بھی اُتنا ہی معاوضہ طلب کرے جتنا ماں کر رہی ہے تو شوہر کے لئے باتفاق فقہاء جائز نہیں کہ ماں کو چھوڑ کر دوسری عورت سے اسی معاوضہ پر دودھ پلوائے۔

مسئلہ۔ اگر دوسری عورت سے دودھ پلوانا طے ہوجائے تو یہ ضروری ہے کہ دودھ پلانے والی عورت اس کی ماں کے پاس رکھکر دودھ پلائے۔ ماں سے الگ کر کے دودھ پلوانا جائز نہیں کیونکہ حضانت یعنی تربیت اور اپنی نگرانی میں رکھنا از روئے احادیث صحیحہ ماں کا حق ہے اس سے یہ حق سلب کرنا جائز نہیں (تفسیر مظہری)

پندرھواں حکم، بیوی کے نفقہ کی مقدار میں شوہر کی حالت کا اعتبار ہوگا لِیُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ۖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ۚ یعنی خرچ کرے وسعت والا آدمی اپنی وسعت کے مطابق اور جس شخص پر رزق تنگ ہو وہ اپنی آمدنی کے مطابق خرچ کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیوی کے نفقہ میں بیوی کی حالت کا اعتبار نہیں کیا جائیگا بلکہ شوہر کی حالت کے مطابق نفقہ دینا واجب ہوگا۔ اگر شوہر مالدار ہے تو امیرانہ نفقہ دینا واجب ہے اگرچہ بیوی مالدار نہ ہو بلکہ تنگدست فقیر ہو، اور اگر شوہر غریب ہے تو غریبانہ نفقہ اسکے مقدور کے مطابق واجب ہوگا اگرچہ بیوی مالدار ہو۔ امام اعظم ابو حنیفہ رح کا یہی مذہب ہے۔ بعض دوسرے فقہاء کے اقوال اسکے خلاف بھی ہیں (تفسیر مظہری)

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ۚ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ، یہ اُسی سابقہ جملہ کی مزید تشریح ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اسکی وسعت و قدرت سے زیادہ کی تکلیف نہیں دیتا اسلئے نادار مفلس شوہر پر اسی حیثیت کا نفقہ واجب ہوگا جو حیثیت اس کی اسوقت ہے۔ آگے بیوی کو غریبانہ نفقہ پر قناعت اور اُس پر صبر کی تلقین کے لئے فرمایا سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ، یعنی کسی کو یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ موجودہ حالت میں تنگی ہے تو یہ تنگی ہمیشہ رہے گی بلکہ تنگی اور فراخی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہ تنگی کے بعد فراخی بھی دے سکتا ہے۔

فائدہ اس آیت میں ایسے شوہروں کے لئے اللہ تعالیٰ کیطرف سے فراخی ملنے کی طرف اشارہ ہے جو مقدور بھر نفقات واجبہ پورا کرنے کی کوشش میں رہیں۔ بیوی کو تنگ رکھنے کی عادت نہ ہو۔ (روح المعانی) واللہ اعلم

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا ۙ

اور کتنی بستیاں کہ نکل چکیں حکم سے اپنے رب کے اور اسکے رسولوں کے پھر ہم نے حساب میں پکڑا اُن کو سخت حساب میں

وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ﴿۸﴾ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ

اور آفت ڈالی اُن پر بن دیکھی آفت پھر چکھی اُنھوں نے سزا اپنے کام کی اور آخر کو اُن کے کام

اَمْرِهَا خُسْرًا ﴿٩﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِى

میں ٹوٹا آگیا تیار رکھا ہے اللہ نے واسطے اُن کے سخت عذاب سو ڈرتے رہو اللہ سے اے

الْاَلْبَابِ ۖۛ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۛ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ﴿١٠﴾ ۙ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا

عقل والو جن کو یقین ہے بیشک اللہ نے اُتاری ہے تم پر نصیحت رسُول ہے جو پڑھ کر سُناتا ہے

عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

تم کو اللہ کی آیتیں کھول کر سُنانے والی تاکہ نکالے اُن لوگوں کو جو کہ یقین لائے اور کئے بھلے کام

مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ

اندھیروں سے اُجالے میں اور جو کوئی یقین لائے اللہ پر اور کرے کچھ بھلائی اس کو داخل کرے

جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ قَدْ اَحْسَنَ

باغوں میں نیچے بہتی ہیں جن کے نہریں سدا رہیں اُن میں ہمیشہ البتہ خوب دی

اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ﴿١١﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ۭ

اللہ نے اس کو روزی اللہ وہ ہے جس نے بنائے سات آسمان اور زمین بھی اتنی ہی

يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ڏ

اُترتا ہے اُس کا حکم اُن کے اندر تاکہ تم جانو کہ اللہ ہر چیز کر سکتا ہے

وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿١٢﴾ ع

اور اللہ کے علم میں سمائی ہے ہر چیز کی

خُلاصۂ تفسیر

اور بہت سی بستیاں تھیں جنھوں نے اپنے رب کے حکم (ماننے) سے اور اسکے رسُولوں سے سرتابی کی سو ہم نے اُن (کے اعمال) کا سخت حساب کیا (مطلب یہ کہ ان کے اعمالِ کفریہ میں سے کسی عمل کو معاف نہیں کیا بلکہ سب پر سزا تجویز کی، یہاں حساب سے پُرسش کے طور پر حساب مراد نہیں) اور ہم نے ان کو بڑی بھاری سزا دی (کہ عذاب کے ذریعہ ہلاک کئے گئے) غرض انھوں نے اپنے اعمال کا وبال چکھا اور ان کا انجام کار خسارہ ہی ہوا (یہ تو دُنیا میں ہوا اور آخرت میں) اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے ایک سخت عذاب تیار کر رکھا ہے (اور جب انجام نافرمانی کا یہ ہے) تو اے سمجھدارو جو کہ ایمان لائے ہو تم خدا سے ڈرو (کہ ایمان بھی اس کو مقتضی ہے اور ڈرنا یہ کہ اطاعت کرو، اور اسی اطاعت کا طریقہ تبلانے کے لئے) خدا نے تمھارے پاس ایک نصیحت نامہ بھیجا (اور وہ نصیحت نامہ دیکر) ایک ایسا رسُول (بھیجا) جو تم کو اللہ کے صاف صاف احکام پڑھ پڑھ کر سُناتے ہیں تاکہ ایسے لوگوں کو کہ جو ایمان لاویں اور اچھے عمل کریں (کفر و جہل کی) تاریکیوں سے (ایمان اور علم و عمل کے) نور کی طرف

لے آویں (مطلب یہ کہ جو نصیحت اس رسُول کے ذریعہ سے پہنچے اس پر عمل کرنا بھی اطاعت ہے) اور (آگے اطاعت یعنی ایمان و عمل صالح پر وعدہ ہے کہ) جو شخص اللہ پر ایمان لاویگا اور اچھے عمل کریگا خدا اسکو (جنت کے) ایسے باغوں میں داخل کریگا جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں ان میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے رہیں گے بیشک اللہ نے (ان کو بہت) اچھی روزی دی (آگے اللہ کا واجب الاطاعت ہونا بیان کیا جاتا ہے یعنی) اللہ ایسا ہے جس نے سات آسمان پیدا کیئے اور ان ہی کی طرح زمین بھی (سات پیدا کی جیسا ترمذی وغیرہ کی حدیث میں ہے کہ ایک زمین کے نیچے دوسری زمین ہے اس کے نیچے تیسری زمین اسی طرح سات زمینیں ہیں اور) ان سب (آسمانوں اور زمینوں) میں (اللہ تعالیٰ کے) احکام (تشریعی یا تکوینی یا دونوں) نازل ہوتے رہتے ہیں (اور یہ اس لئے بتلا دیا گیا) تاکہ تم کو معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ہر شئے پر قادر ہے اور اللہ ہر چیز کو (اپنے) احاطۂ علمی میں لئے ہوئے ہے (اس لئے اللہ تعالیٰ کا واجب الاطاعت ہونا ظاہر ہے)

معارف و مسائل

فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ، آیت میں ان قوموں کے حساب و عذاب کا جو ذکر ہے وہ آخرت میں ہونیوالا ہے مگر یہاں اسکو بلفظ ماضی حاسبنا اور عذبنا سے تعبیر کر دینا یا تو اُس کے یقینی ہونے کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ہے کہ گویا یہ کام ہو چکا (کما فی الروح) اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حساب سے مراد اس جگہ سوالات اور پرسش نہو بلکہ اُس کی سزا کی تعیین ہو جیسا کہ خلاصہ تفسیر مذکور میں لیا گیا، اور یہ بھی احتمال ہے کہ حسابِ شدید اگرچہ آخرت میں ہوگا مگر صحائف اعمال میں اس کی کتابت تو ہو چکی ہے اور ہو رہی ہے اسکو حساب کر دینے سے تعبیر کیا گیا اور عذاب سے مراد دُنیا کا عذاب ہو جو بہت سی پہلی قوموں پر نازل ہوا ہے اس صورت میں بعد میں آنیوالا جملہ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا صرف یہ آخرت کے عذاب سے متعلق رہے گا

قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝ رَّسُوْلًا ، اس آیت کی آسان توجیہ یہ ہے کہ یہاں لفظ اَرْسَلَ محذوف مانا جائے تو معنے یہ ہونگے کہ نازل کیا ذکر یعنی قرآن کو اور بھیجا رسُول کو خلاصہ تفسیر میں اسی کو اختیار کر کے تفسیر کی گئی ہے حضرات مفسرین نے دوسری توجیہات بھی لکھی ہیں مثلاً یہ کہ ذکر سے مراد خود رسُول ہوں کہ ذکر اللہ کی کثرت کے سبب اُن کا وجود گویا خود ذکر اللہ بن گیا وغیر ذلک (روح)

سات زمینیں کہاں کہاں کس صورت میں ہیں۔ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ، اس آیت سے اتنی بات تو واضح طور پر ثابت ہے کہ جس طرح آسمان سات ہیں ایسی ہی زمینیں بھی سات ہیں۔ پھر یہ سات زمینیں کہاں کہاں اور کس وضع و صورت میں ہیں، اوپر نیچے طبقات کی صورت میں تہ بر تہ ہیں یا ہر ایک زمین کا مقام الگ الگ ہے اگر اوپر نیچے طبقات ہیں تو کیا جس طرح سات آسمانوں میں ہر دو آسمان کے درمیان بڑا فاصلہ ہے اور ہر آسمان میں الگ الگ فرشتے آباد ہیں اسی طرح

ایک زمین اور دوسری زمین کے درمیان بھی فاصلہ اور ہوا فضا وغیرہ ہیں اور اُس میں کوئی مخلوق آباد ہے یا یہ طبقاتِ زمین ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں۔ قرآن مجید اس سے ساکت ہے اور روایاتِ حدیث جو اس بارے میں آئی ہیں اُنمیں اکثر احادیث میں ائمۂ حدیث کا اختلاف ہے بعض نے ان کو صحیح و ثابت قرار دیا ہے بعض نے موضوع و منگھڑت تک کہدیا ہے اور عقلاً یہ سب صورتیں ممکن ہیں۔ اور ہماری کوئی دینی یا دُنیوی ضرورت اس کی تحقیق پر موقوف نہیں نہ ہم سے قبر میں یا حشر میں اسکا سوال ہوگا کہ ہم ان سات زمینوں کی وضع وصورت اور محل و قوع اور اُس میں بسنے والی مخلوقات کی تحقیق کریں، اس لئے اسلم صورت یہ ہے کہ بس اس پر ایمان لائیں اور یقین کریں کہ زمینیں بھی آسمانوں کی طرح سات ہی ہیں، اور سب کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے پیدا فرمایا ہے۔ اتنی ہی بات قرآن نے بیان کی ہے جس کو قرآن نے بیان کرنا ضروری نہیں سمجھا ہم بھی اُس کی فکر و تحقیق میں کیوں پڑیں۔ حضراتِ سلف صالحین کا ایسی صورتوں میں یہی طرز عمل رہا ہے۔ اُنھوں نے فرمایا ہے ابھموا ما ابھمہ اللہ، یعنی جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے مبہم چھوڑا ہے تم بھی اُسے مبہم رہنے دو جبکہ اسمیں تمھارے لئے کوئی عملی حکم نہیں، اور تمھاری کوئی دینی یا دُنیوی ضرورت اُس سے متعلق نہیں۔ خصوصاً یہ تفسیر عوام کے لئے لکھی گئی ہے ایسے خالص علمی اختلافی مباحث اسمیں نہیں لئے گئے جن کی عوام کو ضرورت نہیں ہے۔

يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ، یعنی اللہ کا حکم ان ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کے درمیان نازل ہوتا رہتا ہے اور حکمِ الٰہی کی دو قسم ہیں۔ ایک تشریعی جو اللہ کے مکلف بندوں کے لئے بذریعہ وحی بواسطہ انبیاء بھیجا جاتا ہے جیسے زمین میں انسان اور جن کے لئے آسمانوں سے فرشتے یہ تشریعی احکام انبیاء تک لیکر آتے ہیں جن میں عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات، معاشرت کے قوانین ہوتے ہیں اُن کی پابندی پر ثواب اور خلاف ورزی پر عذاب ہوتا ہے۔ دوسری قسم حکم کی حکم تکوینی ہے۔ یعنی تقدیرِ الٰہی کی تنفیذ سے متعلق احکام جس میں کائنات کی تخلیق اور اُس کی تدریجی ترقی اور اُس میں کمی بیشی اور موت و حیات داخل ہیں یہ احکام تمام مخلوقاتِ الٰہیہ پر حاوی ہیں۔ اسلئے اگر ہر دو زمینوں کے درمیان فضاء اور فاصلہ اور اسمیں کسی مخلوق کا آباد ہونا ثابت ہوجائے خواہ مخلوق مکلف احکامِ شرعیہ کی نہ ہو تو اُس پر بھی يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ صادق ہے کہ اللہ تعالیٰ کا امر تکوینی اُس پر بھی حاوی ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالےٰ اعلم

تمت سورۃ الطلاق بعون اللہ وحمدہ فی اٰخر یوم من جمادی الثانیۃ سنہ ۱۳۹۱ھ یوم الاحد واللہ الموفق والمعین

سُورَۃُ التَّحرِیم

سُورَۃُ التَّحْرِیْمِ مَدَنِیَّۃٌ وَّھِیَ اثْنَتَا عَشَرَۃَ اٰیَۃً وَّفِیْھَا رُکُوْعَانِ

سورۂ تحریم مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی بارہ آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ؕ

اے نبی تو کیوں حرام کرتا ہے جو حلال کیا اللہ نے تجھ پر چاہتا ہے تو رضامندی اپنی عورتوں کی

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ① قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَیْمَانِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ

اور اللہ بخشنے والا ہے مہربان مقرر کردیا ہے اللہ نے تمہارے لئے کھول ڈالنا تمہاری قسموں کا اور اللہ

مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ② وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ

مالک ہے تمہارا اور وہی ہے سب کچھ جانتا حکمت والا اور جب چھپاکر کہی نبی نے اپنی کسی عورت سے

حَدِیْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَیْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ

ایک بات پھر جب اُس نے خبر کردی اسکی اور اللہ نے جتلادی نبی کو وہ بات تو جتلائی نبی نے اسمیں سے کچھ اور ٹلادی

عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِیَ

کچھ پھر جب وہ جتلائی عورت کو بولی تجھ کو کس نے بتلادی یہ کہا مجھ کو بتایا

الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ ③ اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَ

اُس خبر والے واقف نے اگر تم دونوں توبہ کرتی ہو تو جھک پڑے ہیں دل تمہارے اور

اِنْ تَظٰهَرَا عَلَیْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِیْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ

اگر تم دونوں چڑھائی کروگی اس پر تو اللہ ہے اس کا رفیق اور جبرئیل اور نیک بخت ایمان والے

وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِیْرٌ ④ عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗٓ

اور فرشتے اسکے پیچھے مددگار ہیں اگر نبی چھوڑدے تم سب کو ابھی اسکا رب بدلے میں دیدے

۳۲

اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ

اس کو عورتیں تم سے بہتر حکم بردار یقین رکھنے والیاں نماز میں کھڑی ہونیوالیاں توبہ کرنیوالیاں بندگی بجالانے

سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ﴿۵﴾

والیاں روزہ رکھنے والیاں بیاہیاں اور کنواریاں

خُلاصۂ تفسیر

اے نبی جس چیز کو اللہ نے آپ کے لئے حلال کیا ہے آپ (قسم کھاکر) اس کو (اپنے اوپر) کیوں حرام فرماتے ہیں (پھر وہ بھی) اپنی بیبیوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے (یعنی گو کسی مباح کا ترک کر دینا جائز ہے اور اس ترک کا مؤکد بالقسم کرنا بھی کسی مصلحت سے جائز ہے لیکن تاہم خلافِ اولیٰ ہے خصوصاً جبکہ اسکا داعی بھی ضعیف ہو۔ یعنی بیبیوں کی رضاجوئی ایسے امر میں جسمیں ان کا راضی کرنا ضروری نہ تھا) اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے (کہ گناہ تک کو معاف کر دیتا ہے اور آپ سے تو کوئی گناہ بھی نہیں ہوا اسلئے یہ عتاب نہیں بلکہ شفقۃً و رافۃً آپ سے کہا جاتا ہے کہ آپ نے ایک جائز نفع کو ترک کر کے کیوں تکلیف اُٹھائی اور چونکہ آپ نے قسم کھائی تھی اسلئے عام خطاب سے قسم کا کفارہ دینے کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے لئے تمہاری قسموں کا کھولنا (یعنی قسم توڑنے کے بعد اسکے کفارہ کا طریقہ) مقرر فرما دیا ہے اور اللہ تمہارا کارساز ہے اور وہ بڑا جاننے والا بڑی حکمت والا ہے (اسلئے وہ اپنے علم و حکمت سے تمہاری مصلحتوں اور ضرورتوں کو جان کر تمہاری بہت سی دشواریوں کو آسان کر دینے کے طریقے مقرر فرما دیتا ہے چنانچہ کفارہ کے ذریعہ قسم کی پابندی کی کلفت کا علاج کر دیا) اور (آگے بیبیوں کو سُناتے ہیں کہ وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے) جبکہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی کسی بی بی سے چپکے سے یک بات فرمائی (وہ بات یہی تھی کہ میں پھر شہد نہ پیوں گا مگر کسی سے کہنا نہیں) پھر جب اس بی بی نے وہ بات (دوسری بی بی کو) بتلادی اور پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے (بذریعہ وحی) اس کی خبر کر دی تو پیغمبر نے (اس ظاہر کر دینے والی بی بی کو) تھوڑی سی بات تو جتلادی (کہ تو نے ہماری یہ بات دوسری سے کہدی) اور تھوڑی بات کو ٹال گئے (یعنی آپ کا کرم اس غایت تک ہے کہ اپنے حکم کے خلاف کرنے پر جو بی بی کی شکایت کرنے بیٹھے تو شکایت کے وقت بھی اس کہی ہوئی بات کے پورے اجزاء کا اعادہ نہیں فرمایا کہ تو نے میری یہ بات کہدی اور یہ بھی کہدی بلکہ کچھ اجزاء کا ذکر کیا اور کچھ اجزاء کا نہیں کیا تاکہ جو بی بی مخاطب ہے اسکو گمان ہو کہ ان کو اتنی ہی بات کہنے کی خبر ہوئی ہے زائد کی نہیں ہوئی تو شرمندگی کم ہو وھذا ۱۲ سھل الاقوال فی تفسیر ھذین البعضین) سو جب پیغمبر نے اس بی بی کو وہ بات جتلائی تو وہ کہنے لگی کہ آپ کو اس کی کس نے خبر کر دی، آپ نے فرمایا کہ مجھ کو بڑے جاننے والے بڑے خبر رکھنے والے (یعنی خدا) نے خبر کر دی

(یہ بیبیوں کو شاید اس لئے سُنایا کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا پورے راز پر مطلع ہونا سُنکر آپکے کریمانہ معاملہ سے اپنی کارروائی پر زیادہ شرمندہ ہوں اور توبہ کریں چنانچہ آگے خود بیبیوں کو توبہ وغیرہ کا خطاب ہے کہ) اے (پیغمبر کی) دونوں بیبیو اگر تم اللہ کے سامنے توبہ کرلو تو (بہتر ہے کیونکہ مقتضیٔ توبہ کا موجود ہے وہ یہ کہ) تمھارے دل (اس طرف) مائل ہو رہے ہیں (کہ دوسری بیبیوں سے ہٹا کر آپ کو اپنا ہی بنالیں اور گو یہ امر باعتبار اسکے کہ اصل مقتضی اسکا حُبِّ رسُول ہے قبیح نہیں ہے لیکن چونکہ اسمیں دوسروں کے حقوق کا اتلاف اور دل شکنی لازم آتی ہے اور مستلزم قبیح قبیح ہوتا ہے اس اعتبار سے قبیح و موجب للتوبہ ہی) اور اگر (اسی طرح) پیغمبر کے مقابلے میں تم دونوں کارروائیاں کرتی رہیں تو (یاد رکھو کہ) پیغمبر کا رفیق اللہ ہے اور جبرئیل ہیں اور نیک مسلمان ہیں اور اُن کے علاوہ فرشتے (آپ کے) مددگار ہیں (مطلب یہ کہ تمھاری ان سازشوں سے آپ کا کوئی ضرر نہیں ہے بلکہ تمھارا ہی ضرر ہے کیونکہ جس شخص کے حامی ایسے ہوں اسکے خلاف مزاج کارروائیاں کرنے کا انجام ظاہر ہے کہ بُرا ہی بُرا ہے اور چونکہ بعضے اسباب نزول میں حضرت عائشہ و حفصہ کے علاوہ اور بیبیاں بھی شریک تھیں جیسے حضرت سودہ و صفیہ، اسلئے آگے صیغہ جمع سے خطاب فرماتے ہیں کہ تم یہ وسوسہ دل میں نہ لانا کہ آخر تو مرد کو بیبیوں کی ضرورت ہوتی ہے اور ہم سے بہتر عورتیں کہاں ہیں اس لئے چار و ناچار ہماری سب باتیں سہی جاویں گی سو یہ سمجھ لو کہ) اگر پیغمبر تم عورتوں کو طلاق دیدیں تو ان کا پروردگار بہت جلد تمھارے بدلے ان کو تم سے اچھی بیبیاں دیدیگا جو اسلام والیاں ایمان والیاں فرمانبرداری کرنے والیاں توبہ کرنے والیاں عبادت کرنے والیاں روزہ رکھنے والیاں ہونگی کچھ بیوہ اور کچھ کنواریاں (بعض مصالح سے بیوہ بھی مرغوب ہوتی ہے جیسے تجربہ سلیقہ ہم عمری وغیرہ اس لئے اس کو بھی اوصاف رغبت میں شمار فرمایا)

معارف و مسائل

آیاتِ تحریم کا واقعہ نزول صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت عائشہ رضؓ وغیرہ سے منقول ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا معمول شریف تھا کہ عصر کے بعد کھڑے کھڑے سب بیبیوں کے پاس (خبر گیری کے لئے) تشریف لاتے تھے۔ ایک روز حضرت زینب رضؓ کے پاس معمول سے زیادہ ٹھیرے اور شہد پیا تو مجھ کو رشک آیا اور میں نے حفصہؓ سے مشورہ کیا کہ ہم میں سے جس کے پاس تشریف لاویں وہ یوں کہے کہ آپ نے مغافیر نوش فرمایا ہے۔ مغافیر ایک خاص قسم کا گوند ہے جسمیں کچھ بدبو ہوتی ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے تو شہد پیا ہے۔ ان بی بی نے کہا کہ شاید کوئی مکھی مغافیر کے درخت پر بیٹھی ہو اور اس کا رس چُوسا ہو (اسی وجہ سے شہد میں بھی بدبو آنے لگی) رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بدبو کی چیزوں سے بہت پرہیز فرماتے تھے اسلئے آپ نے قسم کھالی کہ پھر میں شہد نہ پیوں گا اور اس خیال سے کہ حضرت زینب کا جی

بُرا نہ ہو اس کے اخفا کی تاکید فرمائی مگر ان بی بی نے دوسری سے کہدیا۔ اور بعض روایات میں ہے کہ حضرت حفصہ شہد پلانے والی ہیں اور حضرت عائشہ و سودہ و صفیہ صلاح مشورہ کرنے والی اور بعض روایات میں یہ قصہ دوسری طرح بھی آیا ہے۔ ممکن ہے کہ کئی واقعے ہوں اور ان سب کے بعد یہ آیتیں نازل ہوئی ہوں (از بیان القرآن)

خلاصہ ان آیات کا یہ ہے کہ اس واقعہ میں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک حلال چیز یعنی شہد کو بذریعہ قسم اپنے اوپر حرام کرلیا تھا یہ فعل جبکہ کسی ضرورت و مصلحت سے ہو تو جائز ہے گناہ نہیں۔ مگر اس واقعہ میں ضرورت ایسی نہ تھی کہ اسکی وجہ سے آپؐ خود کوئی تکلیف اُٹھاویں اور ایک حلال چیز کو چھوڑ دیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام ازواج مطہرات کو راضی کرنے کیلئے کیا تھا، اور ایسے معاملے میں ان کا راضی کرنا آپکے ذمہ لازم نہ تھا اسلئے اللہ تعالیٰ نے از روئے شفقت و عنایت فرمایا۔

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ ۚ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِکَ ۭ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ

اس آیت میں بھی قرآن کریم کے عام اسلوب کیمطابق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو آپکا نام لیکر خطاب نہیں کیا بلکہ یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ کے لقب سے خطاب فرمایا جو آپ کا خصوصی اعزاز و اکرام ہے اور پھر فرمایا کہ اپنی ازواج کی رضا جوئی کے لئے آپ اپنے اوپر ایک حلال چیز کو کیوں حرام کرتے ہیں۔ یہ کلام اگرچہ از روئے شفقت ہوا مگر صورت جواب طلبی کی تھی جس سے یہ خیال ہو سکتا تھا کہ شاید آپ سے کوئی بڑی غلطی ہو گئی اسلئے ساتھ ہی فرمایا وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ یعنی اگر گناہ ہوتا بھی تو اللہ تعالیٰ مغفرت اور معاف کرنے والے ہیں۔

مسئلہ ۔کسی حلال چیز کو اپنے اوپر حرام کرنے کی تین صورتیں ہیں جنکا مفصل ذکر سورۂ مائدہ کی آیت یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکُمْ، کے تحت معارف القرآن جلد سوم میں آچکا ہے جسکا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی حلال قطعی کو عقیدۃً حرام قرار دے تو یہ کفر اور گناہِ عظیم ہے۔ اور اگر عقیدۃً حرام نہ سمجھے مگر بلا کسی ضرورت و مصلحت کے قسم کھا کر اپنے اوپر حرام کرلے تو یہ گناہ ہے اس قسم کو توڑنا اور کفارہ ادا کرنا اس پر واجب ہے جسکا ذکر آگے آتا ہے۔ اور کوئی ضرورت و مصلحت ہو تو جائز، مگر خلاف اولیٰ ہے اور تیسری صورت یہ ہے کہ نہ عقیدۃً حرام سمجھے نہ قسم کھا کر اپنے اوپر حرام کرے مگر عملاً اس کو ہمیشہ ترک کرنے کا دل میں عزم کرلے یہ عزم اگر اس نیت سے کرے کہ اسکا دائمی ترک باعثِ ثواب ہے تب تو یہ بدعت اور رہبانیت ہے جو شرعاً گناہ اور مذموم ہے اور اگر ترک دائمی کو ثواب سمجھ کر نہیں بلکہ اپنے کسی جسمانی یا روحانی مرض کے علاج کے طور پر کرتا ہے تو بلا کراہت جائز ہے بعض صوفیائے کرام سے جو ترک لذائذ کی حکایتیں منقول ہیں وہ اسی صورت پر محمول ہیں۔

واقعہ مذکورہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قسم کھالی تھی نزولِ آیت کے بعد اس قسم کو توڑا،

اور کفارہ ادا فرمایا جیسا کہ درمنثور کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غلام کفارہ قسم میں آزاد کیا (از بیان القرآن)

قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ، یعنی اللہ تعالیٰ نے ایسی صورتوں میں جہاں قسم کا توڑنا ضروری یا مستحسن ہو تمہاری قسموں سے حلال ہونے یعنی قسم توڑ کر کفارہ ادا کر دینے کا راستہ نکال دیا ہے جسکا ذکر دوسری آیات میں مفصّل ہے۔

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا، یعنی جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کسی بی بی سے ایک راز کی بات کہی۔ وہ راز کی بات صحیح اور اکثر روایات کی رُو سے یہی تھی کہ آپ نے حضرت زینب رضؓ کے پاس جو شہد پیا اور دوسری ازواج کو بھاری معلوم ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو راضی کرنے کے لئے شہد نہ پینے کی قسم کھالی مگر یہ فرمایا کہ اسکی کسی کو خبر نہ ہو تاکہ زینبؓ کو رنج نہ پہنچے مگر اس بی بی نے یہ راز دوسری پر ظاہر کر دیا جسکا ذکر اگلی آیت میں ہے۔ اس راز کی بات کے متعلق دوسری روایات میں اور بھی چند چیزیں منقول ہیں مگر اکثر اور صحیح روایات میں یہی ہے جو لکھا گیا۔

فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ، یعنی جب اس بی بی نے وہ راز کی بات دوسری بی بی سے کہہ ڈالی اور اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر کر دی کہ اس نے آپکا راز فاش کر دیا تو آپ نے اس بی بی سے افشاء راز کا شکوہ تو کیا مگر پوری بات نہیں کھولی یہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا کرم اور حسنِ خلق تھا کہ پوری بات کھولنے سے ان کو زیادہ خجالت اور شرمندگی ہوگی۔ جس بی بی سے راز کی بات کہی گئی تھی وہ کون تھیں اور جس یہ راز ظاہر کیا وہ کون، قرآن کریم نے اسکو بیان نہیں کیا، اکثر روایاتِ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ راز کی بات حضرت حفصہ رضؓ سے کہی گئی تھی انھوں نے حضرت عائشہ رضؓ سے ذکر کر دیا، جیسا کہ صحیح بخاری کی حدیث میں حضرت ابن عباسؓ سے اسکا بیان آگے آئے گا۔

بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ حضرت حفصہ رضؓ کے راز فاش کرنے پر رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کو طلاق دینے کا ارادہ فرمایا مگر اللہ نے جبرئیل امین کو بھیجکر ان کی طلاق سے روک دیا اور فرمایا کہ بہت نماز گزار بکثرت روزے رکھنے والی ہیں اور اُن کا نام جنّت میں آپؐ کی بیبیوں میں لکھا ہوا ہے (مظہری)

اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا، ازواج مطہرات میں سے جن دو کا اجمالی ذکر اوپر آیا ہے کہ اُنھوں نے باہم مشورہ کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شہد پینے پر ایسا طرز اختیار کیا جس سے آپؐ نے شہد پینے سے قسم کھالی اور پھر آپؐ نے اسکے اخفار کے لئے فرمایا تھا وہ اخفار نہیں کیا بلکہ ایک نے دوسری پر بات کھولدی۔ یہ دو کون ہیں انکے متعلق صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ابن عباسؓ کی ایک طویل روایت ہے جس میں انھوں نے فرمایا کہ عرصہ تک میرے دل میں یہ خواہش تھی کہ میں ان دو عورتوں کے متعلق عمر بن خطابؓ سے دریافت کروں جن کے متعلق قرآن میں آیا ہے اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ، یہاں تک ایک موقع آیا کہ عمر بن خطابؓ حج کے لئے نکلے اور میں بھی شریکِ سفر ہوگیا۔ دورانِ سفر میں ایک روز عمر بن خطاب رضؓ قضاءِ حاجت

کے لئے جنگل کیطرف تشریف لے گئے اور واپس آئے تو میں نے وضو کے لئے پانی کا انتظام کر رکھا تھا میں نے آپکے ہاتھوں پر پانی ڈالا۔ اور وضو کراتے ہوئے میں نے سوال کیا کہ یہ دو عورتیں جن کے متعلق قرآن میں اِنْ تَتُوْبَآ آیا ہے کون ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا آپ سے تعجب ہے کہ آپ کو خبر نہیں یہ دونوں عورتیں حفصہ اور عائشہ ہیں۔ اسکے بعد حضرت عمرؓ نے اپنا ایک طویل قصہ اس واقعہ سے متعلق ذکر فرمایا جسمیں اس واقعہ کے پیش آنے سے پہلے کے کچھ حالات بھی بیان فرمائے جن کی پوری تفصیل تفسیر مظہری میں ہے۔ آیت مذکورہ میں ان دونوں ازواج مطہرات کو مستقل خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ اگر تم توبہ کرو جیسا کہ اس واقعہ کا تقاضا ہے کہ تمھارے دل حق سے مائل ہو گئے کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت اور آپکی رضاجوئی ہر مؤمن کا فرض ہے مگر تم دونوں نے باہم مشورہ کر کے ایسی صورت اختیار کی جس سے آپ کو تکلیف پہنچی یہ ایسا گناہ ہے کہ اس سے توبہ کرنا ضروری ہے اور آگے فرمایا۔

وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ الآیۃ، اسمیں یہ تبلادیا کہ اگر تم نے توبہ کر کے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو راضی نہ کیا تو یہ نہ سمجھو کہ آپ کو کوئی نقصان پہنچے گا کیونکہ آپ کا تو اللہ مولیٰ اور کفیل ہے اور جبرئیل امین اور سب نیک مسلمان اور اُن کے بعد سب فرشتے، جس کی رفاقت واعانت پر سب لگے ہوں اس کو کوئی کیا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ نقصان و ضرر جو کچھ ہے تمھارا ہی ہے آگے انھیں کے متعلق فرمایا۔

عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ الآیۃ، اسمیں عورتوں کے اس خیال کا جواب ہے کہ اگر ہمیں طلاق دیدی تو ہم جیسی دوسری عورتیں شاید آپ کو نہ ملیں۔ حاصل ارشاد کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کیا چیز باہر ہے اگر وہ تمھیں طلاق دیدیں تو وہ تم جیسی ہی نہیں بلکہ تم سے بہتر عورتیں عطا فرما دیگا، اس سے یہ لازم نہیں آیا کہ ان سے بہتر عورتیں اسوقت موجود تھیں ہوسکتا ہے کہ اسوقت نہوں اور جب ضرورت پڑے اللہ تعالیٰ دوسری عورتوں کو ان سے بہتر بنا دیں۔ ان آیات میں جیسا کہ خاص ازواج مطہرات کے اعمال واخلاق کی اصلاح اور ان کی تادیب و تربیت کا بیان تھا آگے عام مؤمنین کو اسکا حکم دیا گیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا

اے ایمان والو بچاؤ اپنی جان کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے جسکی چھپٹیاں ہیں

النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ

آدمی اور پتھر اُس پر مقرر ہیں فرشتے تند خو زبردست نافرمانی نہیں کرتے اللہ کی

مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝۶ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا

جو بات فرمائے اُن کو اور وہی کام کرتے ہیں جو اُن کو حکم ہو اے منکر ہونے والو مت

تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ۖ إِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ⑦

بہانے تبلاؤ آج کے دن وہی بدلہ پاؤ گے جو تم کرتے تھے

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو (جب رسُول کی بیبیوں کو بھی عمل صالح اور اطاعت سے چارہ نہیں جیسا کہ اُوپر معلوم ہوا اور رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بھی اس پر مامور ہیں کہ اپنی ازواج کو نصیحت کر کے عمل صالح پر آمادہ کریں تو باقی سب اُمّت پر بھی یہ فریضہ اور زیادہ مؤکد ہوگیا کہ اپنے اہل وعیال کی اصلاح اعمال و اخلاق میں غفلت نہ برتیں اسلئے حکم دیا گیا کہ) تم اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو (دوزخ کی) اُس آگ سے بچاؤ جسکا ایندھن (سوختہ) آدمی اور پتھر ہیں (اپنے کو بچانا خود اطاعت احکام کرنا اور گھر والوں کو بچانا اُن کو احکام الٰہیہ کا سکھانا اور اُن پر عمل کرانے کے لئے زبان سے ہاتھ سے بقدر امکان کوشش کرنا ہے۔ آگے اُس آگ کی دوسری حالت کا بیان ہے کہ) جس پر تندخو (اور) مضبوط (قوی) فرشتے (متعین) ہیں (کہ نہ وہ کسی پر رحم کریں نہ کوئی اُن کا مقابلہ کر کے بچ سکے) جو خدا کی (ذرا) نافرمانی نہیں کرتے کسی بات میں جو اُن کو حکم دیتا ہے اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے اُس کو (فوراً) بجالاتے ہیں (غرض اس دوزخ پر ایسے فرشتے مقرر ہیں جو کافروں کو دوزخ میں داخل کر کے چھوڑیں گے اور اسوقت کافروں سے کہا جائیگا کہ) اے کافرو تم آج عذر (معذرت) مت کرو۔ (کہ بے سود ہے) بس تم کو تو اُسی کی سزا مل رہی ہے جو کچھ تم (دُنیا میں) کیا کرتے تھے۔

معارف و مسائل

قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ الآیۃ، اس آیت میں عام مسلمانوں کو حکم ہے کہ جہنم کی آگ سے اپنے آپ کو بھی بچائیں اور اپنے اہل وعیال کو بھی پھر نار جہنم کی ہولناک شدت کا ذکر فرمایا اور آخر میں یہ بھی فرمایا کہ جو اس جہنم کا مستحق ہوگا وہ کسی زور طاقت جتھہ یا خوشامد یا رشوت کے ذریعہ اُن فرشتوں کی گرفت سے نہیں بچ سکے گا جو جہنم پر مسلّط ہیں جنکا نام زبانیہ ہے۔

لفظ اَهْلِيْكُمْ میں اہل وعیال سب داخل ہیں جنمیں بیوی، اولاد، غلام، باندیاں سب داخل ہیں اور بعید نہیں کہ ہمہ وقتی نوکر چاکر بھی غلام باندیوں کے حکم میں ہوں۔ ایک روایت میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عمر بن خطاب رضؓ نے عرض کیا یا رسُول اللہ اپنے آپ کو جہنم سے بچانے کی فکر تو سمجھ میں آگئی (کہ ہم گناہوں سے بچیں اور احکام الٰہیہ کی پابندی کریں) مگر اہل و عیال کو ہم کس طرح جہنم سے بچائیں، رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسکا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

تم کو جن کاموں سے منع فرمایا ہے اُن کاموں سے ان سب کو منع کرو اور جن کاموں کے کرنیکا تم کو حکم دیا ہے تم اُن کے کرنیکا اہل و عیال کو بھی حکم کرو تو یہ عمل انکو جہنم کی آگ سے بچاسکے گا (روح المعانی)

بیوی اور اولاد کی تعلیم و تربیت ہر مسلمان پر فرض ہے

حضرات فقہاء نے فرمایا کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ ہر شخص پر فرض ہے کہ اپنی بیوی اور اولاد کو فرائضِ شرعیہ اور حلال و حرام کے احکام کی تعلیم دے اور اُس پر عمل کرانے کے لئے کوشش کرے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس شخص پر اپنی رحمت نازل کرے جو کہتا ہے کہ اے میرے بیوی بچو، تمھاری نماز، تمھارا روزہ تمھاری زکوٰۃ، تمھارا مسکین، تمھارا یتیم، تمھارے پڑوسی، اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو اسکے ساتھ جنت میں جمع فرمائیں گے۔ تمھاری نماز، تمھارا روزہ وغیرہ فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کا خیال رکھو اسمیں غفلت نہونے پائے اور مسکینکم یتیمکم وغیرہ فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے جو حقوق تمھارے ذمہ ہیں اُن کو خوشی اور پابندی سے ادا کرو اور بعض بزرگوں نے فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب میں وہ شخص ہوگا جس کے اہل و عیال دین سے جاہل و غافل ہوں (روح)

عام مؤمنین کی نصیحت کے بعد کفار کو خطاب ہے کہ اب تمھارا کیا ہوا تمھارے سامنے آرہا ہے اب کوئی عذر کسی کا قبول نہیں کیا جاسکتا یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْیَوْمَ کا یہی مطلب ہے

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ

اے ایمان والو توبہ کرو اللہ کی طرف صاف دل کی توبہ امید ہے تمھارا رب اُتار دے

یُّکَفِّرَ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ وَیُدْخِلَکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ ۙ یَوْمَ

تم پر سے تمھاری برائیاں اور داخل کرے تم کو باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں جس دن

لَا یُخْزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ ۚ نُوْرُھُمْ یَسْعٰی بَیْنَ

کہ اللہ ذلیل نہ کریگا نبی کو اور اُن لوگوں کو جو یقین لائے ہیں اسکے ساتھ ان کی روشنی دوڑتی ہے اُن کے

اَیْدِیْھِمْ وَبِاَیْمَانِھِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ

آگے اور ان کے داہنے کہتے ہیں اے رب ہمارے پوری کردے ہم کو ہماری روشنی اور معاف کر ہم کو

اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۸﴾ یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ جَاھِدِ الْکُفَّارَ وَ

بیشک تو سب کچھ کرسکتا ہے اے نبی لڑائی کر منکروں سے اور

الْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْھِمْ ؕ وَمَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ﴿۹﴾

دغابازوں سے اور سختی کر ان پر اور ان کا گھر دوزخ ہے اور بری جگہ جا پہنچے

ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ

اللہ نے بتلائی ایک مثل منکروں کے واسطے عورت نوح کی اور عورت لوط کی

كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتَاهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا

گھر میں تھیں دونوں دو نیک بندوں کے ہمارے نیک بندوں میں سے پھر انھوں نے اُن سے چوری کی پھر وہ کام نہ آئے

مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَقِيلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدَّاخِلِينَ ﴿١٠﴾ وَضَرَبَ اللَّهُ

اُن کے اللہ کے ہاتھ سے کچھ بھی اور حکم ہوا کہ چلی جاؤ دوزخ میں جانیوالوں کے ساتھ اور اللہ نے بتلائی

مَثَلًا لِّلَّذِينَ آمَنُوا امْرَأَتَ فِرْعَوْنَ إِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِي عِندَكَ

ایک مثل ایمان والوں کے لئے عورت فرعون کی جب بولی اے رب بنا میرے واسطے اپنے پاس

بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِي مِن فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهِ وَنَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ

ایک گھر بہشت میں اور بچا نکال مجھ کو فرعون سے اور اس کے کام سے اور بچا نکال مجھ کو ظالم

الظَّالِمِينَ ﴿١١﴾ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا

لوگوں سے اور مریم بیٹی عمران کی جس نے روکے رکھا اپنی شہوت کی جگہ کو پھر ہم نے پھونک

فِيهِ مِن رُّوحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهِ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِينَ ﴿١٢﴾

دی اسمیں ایک اپنی طرف سے جان اور سچا جانا اپنے رب کی باتوں کو اور اسکی کتابوں کو اور وہ تھی بندگی کرنے والوں میں

وقف لازم ۔ ع ۲ ۲۰

خلاصۂ تفسیر

(ان آیات میں دوزخ سے بچنے کا طریقہ بتلایا گیا ہے اور وہی اہل و عیال کو بتلا کر جہنم کی آگ سے بچانے کا طریقہ ہے وہ یہ ہے) اے ایمان والو تم اللہ کے سامنے سچی توبہ کرو (یعنی دل میں گناہ پر کامل ندامت ہو اور آئندہ اُسکے نہ کرنے کا پختہ قصد ہو اسمیں تمام احکام دین فرائض واجبات بھی داخل ہو گئے کہ اُن کا چھوڑنا گناہ ہے اور تمام محرمات و مکروہات بھی آ گئے کہ اُن کا کرنا گناہ ہے) اُمید (یعنی وعدہ) ہے کہ تمھارا رب (اس توبہ کی بدولت) تمھارے گناہ معاف کر دیگا اور تم کو (جنت کے) ایسے باغوں میں داخل کریگا جنکے نیچے نہریں جاری ہونگی (اور یہ اُس روز ہوگا) جس دن کہ اللہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اور جو مسلمان (ایمان اور دین کی رو سے) اُن کے ساتھ ہیں اُن کو رسوا نہ کریگا ان کا نور ان کے داہنے اور ان کے سامنے دوڑتا ہوگا (جیسا کہ سورۂ حدید میں گزر چکا ہے اور وہ) یُوں دُعا کرتے ہونگے کہ اے ہمارے رب ہمارے لئے ہمارے اس نور کو اخیر تک رکھئے (یعنی راستہ میں گُل نہ ہو جاوے) اور ہماری مغفرت فرما دیجئے آپ ہر شئے پر قادر ہیں (اور اس دُعا کی وجہ یہ ہوگی کہ قیامت میں ہر مومن کو کچھ نہ کچھ نور عطا ہوگا جسوقت پل صراط کے پاس پہنچکر منافقین کا نور بجھ جاویگا جسکا ذکر سورۂ حدید میں آ چکا ہے اسوقت مومنین یہ دُعا کریں گے کہ منافقین کی طرح کہیں ہمارا نور بھی سلب نہ ہو جائے (کذا فی الدر المنثور عن ابن عباس) اے نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کفار (سے بذریعہ تلوار) اور منافقین سے (بذریعہ زبان و بیان حجت) جہاد کیجئے اور اُن پر سختی کیجئے (دُنیا میں تو یہ اس سزا کے مستحق ہوئے)

اور (آخرت میں) اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بُری جگہ ہے (آگے اس کا بیان ہے کہ آخرت میں ہر شخص کو اپنا ہی ایمان کام آئے گا۔ کافر کو کسی اُس کے خویش و عزیز کا ایمان عذاب سے نہ بچائے گا، اسی طرح مؤمن کے خویش و عزیز کافر ہوں تو مؤمن کو اسکا کوئی نقصان نہیں پہنچے گا) اللہ تعالیٰ کافروں (کی عبرت) کے لئے نوح کی بی بی اور لوط کی بی بی کا حال بیان فرماتا ہے، وہ دونوں ہمارے خاص بندوں میں سے دو نیک بندوں کے نکاح میں تھیں سو اُن عورتوں نے اُن دونوں بندوں کا حق ضائع کیا (یعنی بوجہ اُن کے نبی ہونے کے اُن کا حق یہ بھی تھا کہ اُن پر ایمان لاتیں اور دینی احکام میں اُن کی اطاعت کرتیں جو انھوں نے نہیں کی) تو وہ دونوں نیک بندے اللہ کے مقابلے میں اُن کے ذرا کام نہ آسکے اور ان دونوں عورتوں کو (بوجہ کافر ہو جانے کے) حکم ہو گیا کہ تم دونوں بھی دوسرے جہنم میں داخل ہونے والوں کے ساتھ جہنم میں داخل ہو جاؤ (یہاں تک کافروں کی عبرت کے لئے واقعہ بیان کیا گیا تھا، آگے مسلمانوں کے اطمینان کے لئے فرمایا) اللہ تعالیٰ مسلمانوں (کی تسلّی) کے لئے فرعون کی بی بی (حضرت آسیہ) کا حال بیان کرتا ہے جبکہ اُن بی بی نے دُعا کی کہ اے میرے پروردگار میرے واسطے جنّت میں اپنے قرب میں مکان بنائیے اور مجھ کو فرعون (کے شر) سے اور اسکے عمل (کفر کے ضرر اور اثر) سے محفوظ رکھیے اور مجھ کو تمام ظالم (یعنی کافر) لوگوں (کے ظاہری اور باطنی ضرر) سے محفوظ رکھیے اور (نیز مسلمانوں کی تسلی کے لئے اللہ تعالیٰ) عمران کی بیٹی حضرت مریم کا حال بیان کرتا ہے جنھوں نے اپنے ناموس کو (حرام اور حلال دونوں سے) محفوظ رکھا، سو ہم نے اُن کے چاک گریبان میں (بواسطہ جبرئیل علیہ السّلام) اپنی روح پھونک دی اور انھوں نے اپنے پروردگار کے پیغاموں کی (جو ملائکہ کے ذریعے پہنچے تھے) اور اُس کی کتابوں کی (جن میں توراۃ و انجیل بھی ہیں) تصدیق کی (یہ بیان ہے اُن کے عقائد کا) اور وہ اطاعت والوں میں سے تھیں (یہ بیان ہے اُن کے اعمال کا)

معارف و مسائل

تُوبُوٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا، توبہ کے لفظی معنے لوٹنے اور رجوع ہونے کے ہیں، مراد گناہوں سے لوٹنا ہے۔ اور اصطلاحِ قرآن و سُنت میں توبہ اسکا نام ہے کہ آدمی اپنے پچھلے گناہ پر نادم ہو اور آئندہ اُس کے پاس نہ جانے کا پختہ عزم کرے۔ اور نصوح کو اگر مصدر نصح اور نصیحت سے لیا جائے تو اس کے معنے خالص کرنے کے ہیں، اور مصدر نصاحت سے مشتق قرار دیں تو اس کے معنے کپڑے کو سینے اور جوڑ لگانے کے ہیں۔ پہلے معنے کے اعتبار سے نصوح کے معنی یہ ہونگے کہ وہ ریا اور نمود سے خالص ہو۔ محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور خوفِ عذاب سے گناہ پر نادم ہو کر اسکو چھوڑ دے اور دوسرے معنی کے اعتبار سے نصوح اس مطلب کے لئے ہوگا کہ اعمالِ صالحہ کا لباس جو گناہ کی وجہ سے پھٹ گیا ہے تو یہ اسکے خرق یعنی پھٹن کو جوڑنے والی ہے۔ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ توبہ نصوح یہ ہے کہ آدمی اپنے گزشتہ عمل پر نادم ہو اور پھر اس کی طرف نہ لوٹنے کا پختہ ارادہ اور عزم رکھتا ہو۔ اور کلبی نے فرمایا کہ توبہ نصوح یہ ہے کہ زبان سے

استغفار کرے اور دل میں نادم ہو اور اپنے بدن اور اعضار کو آئندہ اُس گناہ سے روکے۔

اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سوال کیا گیا کہ توبہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا جس میں چھ چیزیں جمع ہوں۔ (۱) اپنے گزشتہ بُرے عمل پر ندامت (۲) جو فرائض و واجبات اللہ تعالیٰ کے چھوٹے ہیں اُن کی قضا (۳) کسی کا مال وغیرہ ظلماً لیا تھا تو اُس کی واپسی (۴) کسی کو ہاتھ یا زبان سے ستایا اور تکلیف پہنچائی تھی تو اُس سے معافی (۵) آئندہ اُس گناہ کے پاس نہ جانے کا پختہ عزم و ارادہ (۶) اور یہ کہ جس طرح اُس نے اپنے نفس کو اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے دیکھا ہے اب وہ اطاعت کرتے ہوئے دیکھ لے (مظہری)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جو شرائط توبہ بیان فرمائی ہیں وہ سبھی کے نزدیک مُسلّم ہیں۔ بعض نے مختصر بعض نے مفصّل بیان کر دیا ہے۔

عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ الآیۃ لفظ عسیٰ کا ترجمہ اُمید ہے اور یہاں مراد اُس سے وعدہ ہے مگر اس وعدہ کو بلفظ اُمید تعبیر کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ توبہ ہو یا انسان کے دوسرے اعمال صالحہ ان میں سے کوئی بھی جنّت و مغفرت کی قیمت نہیں اور نہ اللہ کے ذمّہ از روئے انصاف یہ لازم آتا ہے جو عمل صالح کرے اس کو ضرور جنّت ہی میں داخل کرے کیونکہ اعمالِ صالحہ کا ایک بدلہ تو ہر انسان کو دُنیوی زندگی میں عطا ہونے والی نعمتوں سے مِل چکا ہے۔ اس کے بدلے میں از روئے قانون و قاعدہ جنّت ملنا ضروری نہیں وہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل و انعام ہی پر موقوف ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں کسی کو صرف اسکا عمل نجات نہیں دلا سکتا۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسُول اللہ، کیا آپکو بھی، آپنے فرمایا ہاں مجھے بھی جب تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و رحمت کا معاملہ نہ فرماویں (بخاری و مُسلم) از مظہری

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ الآیۃ آخر سورت میں حق تعالیٰ نے چار عورتوں کی مثالیں بیان فرمائی ہیں، پہلی دو عورتیں دو پیغمبروں کی بیویاں ہیں جنھوں نے دین کے معاملے میں اپنے شوہروں کی مخالفت کی، کفار و مشرکین کی امداد و موافقت خفیہ کرتی رہیں اس کے نتیجہ میں جہنم میں گئیں، اللہ کے مقبول و برگزیدہ پیغمبروں کی زوجیت بھی ان کو عذاب سے نہ بچا سکی، انہیں ایک حضرت نوح علیہ السّلام کی بی بی ہے جن کا نام واغلہ بیان کیا گیا ہے اور دوسری حضرت لُوط علیہ السّلام کی بی بی جس کا نام والہہ کہا گیا ہے (قرطبی) ان کے ناموں میں اور بھی مختلف اقوال ہیں۔ تیسری وہ عورت ہے جو سب سے بڑے کافر خدائی کے مدّعی فرعون کی بیوی تھی مگر موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئی، اُس کو اللہ تعالیٰ نے یہ درجہ دیا کہ دُنیا ہی میں اس کو جنت کا مقام دکھلا دیا، شوہر کی فرعونیت اس کی راہ میں کچھ حائل نہیں ہو سکی چوتھی حضرت مریم ہیں جو کسی کی بی بی نہیں مگر ایمان اور اعمالِ صالحہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ درجہ دیا کہ ان کو نبوّت کے کمالات عطا فرمائے، اگرچہ جمہور اُمت کے نزدیک نبی نہیں۔

ان سب مثالوں سے یہ واضح کر دیا کہ ایک مؤمن کا ایمان اسکے کسی کافر عزیز کے کام نہیں آسکتا اور

ایک کافر کا کفر اُس کے کسی مومن عزیز کو نقصان نہیں پہنچا سکتا، اس لئے انبیاء و اولیاء کی بیویاں اس پر بے فکر نہ ہوں کہ ہمیں ہمارے شوہروں کی وجہ سے نجات ہو ہی جائے گی اور کسی کافر فاجر کی بیوی یہ فکر نہ کرے کہ اسکا کفر میرے لئے کسی مضرّت کا سبب بن جائیگا بلکہ ہر ایک مرد و عورت کو اپنے ایمان و عمل کی فکر خود کرنا چاہئے

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ یہ مثال فرعون کی بیوی حضرت آسیہ بنت مزاحم کی ہے جس وقت موسیٰ علیہ السلام جادوگروں کے مقابلے میں کامیاب ہوئے اور جادوگر مسلمان ہو گئے تو اس بی بی نے اپنے ایمان کا اظہار کر دیا، فرعون نے ان کو سخت سزا دینا تجویز کیا، بعض روایات میں ہے کہ ان کو چومیخہ کر کے سینے پر بھاری پتھر رکھدیا یعنی چاروں ہاتھوں پیروں میں میخیں گاڑ دیں کہ حرکت نہ کر سکیں۔ اس حالت میں انھوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا کی جو اس آیت میں مذکور ہے اور بعض روایات میں ہے کہ یہ تجویز کیا کہ اوپر سے بہت بھاری پتھر اُن کے سر پر ڈالدیا جائے، ابھی ڈالنے نہیں پائے تھے کہ انھوں نے دُعا کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی رُوح قبض کرلی، پتھر جسم بے جان پر گرا۔ اور دُعا میں یہ فرمایا کہ میرے رب جنت میں اپنے پاس گھر بنا دے اللہ تعالیٰ نے دنیا ہی میں انکو جنت کا گھر دکھلا دیا (مظہری)

وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ، کلماتِ رب سے مراد اللہ کے نازل کردہ صحیفے ہیں جو انبیاء پر اُترتے ہیں۔ اور کتب سے مراد معروف آسمانی کتابیں انجیل۔ زبور۔ تورات ہیں وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ قانت کی جمع ہے جس کے معنی عابد کے ہیں جو اپنی عبادت و طاعت پر مداومت کرتا ہے۔ یہ حضرت مریم کی صفت ہے۔ حضرت ابو موسیٰ رضؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مردوں میں سے بہت لوگ کامل و مکمل ہوئے ہیں مگر عورتوں میں سے صرف آسیہ فرعون کی بیوی اور مریم بنت عمران کامل ہوئیں (بخاری و مسلم۔ از مظہری) ظاہر یہ ہے کہ مراد کمالاتِ نبوت ہیں کہ باوجود عورت ہونے کے انکو حاصل ہوئے (مظہری) واللہ اعلم

تمت سورۃ التحریم بعون اللہ و حمدہ فی غرۃ رجب ۱۳۹۱ یوم الثلثاء

سُورَةُ الْمُلْكِ

سُورَةُ الْمُلْكِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۂ ملک مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی تیس ۳۰ آیتیں ہیں اور دو ۲ رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ ۙ ﴿۱﴾ الَّذِيْ خَلَقَ

بڑی برکت ہے اس کی جس کے ہاتھ میں ہے راج اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے جس نے بنایا

الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ۙ ﴿۲﴾

مرنا اور جینا تاکہ تم کو جانچے کون تم میں اچھا کرتا ہے کام اور وہ زبردست ہے بخشنے والا

الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۭ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۭ

جس نے بنائے سات آسمان تہ پر تہ کیا دیکھتا ہے تو رحمٰن کے بنانے میں کچھ فرق

فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ﴿۳﴾ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ

پھر دوبارہ نگاہ کر کہیں نظر آتی ہے تجھ کو دراڑ پھر لوٹا کر نگاہ کر دو دو بار لوٹ آئے گی

اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ﴿۴﴾ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاۗءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ

تیرے پاس تیری نگاہ رد ہو کر تھک کر اور ہم نے رونق دی سب سے ورلے آسمان کو چراغوں سے

وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ ﴿۵﴾ وَ

اور ان سے کر رکھی ہے ہم نے پھینک مار شیطانوں کے واسطے اور رکھا ہے ان کے واسطے عذاب دہکتی آگ کا اور

لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۶﴾ اِذَآ اُلْقُوْا

جو لوگ منکر ہوئے اپنے رب سے ان کے واسطے ہے عذاب دوزخ کا اور بری جگہ جا پہنچے جب اس میں ڈالے

فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّهِيَ تَفُوْرُ ۙ ﴿۷﴾ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ۭ كُلَّمَآ اُلْقِيَ

جائیں گے سنیں گے اس کا دھاڑنا اور وہ اچھل رہی ہوگی ایسا لگتا ہے کہ پھٹ پڑے گی جوش سے جس وقت پڑے اس میں

فِيهَا فَوْجٌ سَأَلَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيرٌ ﴿٨﴾ قَالُوا بَلَىٰ قَدْ جَاءَنَا نَذِيرٌ ۙ

ایک گروہ پوچھیں اُن سے دوزخ کے داروغہ کیا نہ پہنچا تھا تمہارے پاس کوئی ڈر سنانے والا وہ بولیں کیوں نہیں ہمارے پاس پہنچا تھا ڈر سنانے

فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ ۚ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ كَبِيرٍ ﴿٩﴾

پھر ہم نے جھٹلایا اور کہا نہیں اُتاری اللہ نے کوئی چیز تم تو پڑے ہوئے ہو بڑے بہکاوے میں

وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ ﴿١٠﴾ فَاعْتَرَفُوا

اور کہیں گے اگر ہم ہوتے سُنتے یا سمجھتے تو نہ ہوتے دوزخ والوں میں سو قائل ہو گئے

بِذَنْبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِأَصْحَابِ السَّعِيرِ ﴿١١﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ

اپنے گناہ کے اب دفع ہو جائیں دوزخ والے جو لوگ ڈرتے ہیں اپنے رب سے بن دیکھے

لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ﴿١٢﴾ وَأَسِرُّوا قَوْلَكُمْ أَوِ اجْهَرُوا بِهِ ۖ إِنَّهُ عَلِيمٌ

اُن کے لئے معافی ہے اور ثواب بڑا اور تم چھپا کر کہو اپنی بات یا کھول کر وہ خوب جانتا ہے

بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿١٣﴾ أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۖ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ﴿١٤﴾ هُوَ

جیوں کے بھید بھلا وہ نہ جانے جس نے بنایا اور وہی ہے بھید جاننے والا خبردار وہی ہے

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِنْ

جس نے کیا تمہارے آگے زمین کو پست اب چلو پھرو اسکے کندھوں پر اور کھاؤ کچھ اس کی

رِزْقِهِ ۖ وَإِلَيْهِ النُّشُورُ ﴿١٥﴾ أَأَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ أَنْ يَخْسِفَ بِكُمُ

دی ہوئی روزی اور اسی کیطرف جی اُٹھنا ہے کیا تم نڈر ہو گئے اس سے جو آسمان میں ہے اس سے کہ دھنسا دے تم کو

الْأَرْضَ فَإِذَا هِيَ تَمُورُ ﴿١٦﴾ أَمْ أَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ أَنْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ

زمین میں پھر تبھی وہ لرزنے لگے یا نڈر ہو گئے ہو اس سے جو آسمان میں ہے اس بات سے کہ برسا دے تم پر

حَاصِبًا ۖ فَسَتَعْلَمُونَ كَيْفَ نَذِيرِ ﴿١٧﴾ وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ

مینہ پتھروں کا، سو جان لوگے کیسا ہے میرا ڈرانا اور جھٹلا چکے ہیں جو ان سے پہلے تھے

فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴿١٨﴾ أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَافَّاتٍ وَيَقْبِضْنَ ۚ

پھر کیسا ہوا میرا انکار اور کیا نہیں دیکھتے ہو اُڑتے جانوروں کو اپنے اوپر پر کھولے ہوئے اور پر جھپکتے ہوئے

مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمَٰنُ ۚ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ ﴿١٩﴾ أَمَّنْ هَٰذَا الَّذِي

اُن کو کوئی نہیں تھام رہا رحمٰن کے سوائے اس کی نگاہ میں ہے ہر چیز بھلا وہ کون ہے جو

هُوَ جُنْدٌ لَكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِنْ دُونِ الرَّحْمَٰنِ ۚ إِنِ الْكَافِرُونَ إِلَّا فِي غُرُورٍ ﴿٢٠﴾

فوج ہے تمہاری مدد کرے تمہاری رحمٰن کے سوائے منکر پڑے ہیں بڑے بہکائے میں

ع ١

وقف لازم · وقف منزل

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ یَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ۚ بَلْ لَّجُّوْا فِیْ عُتُوٍّ وَّ نُفُوْرٍ ﴿۲۱﴾

بھلا وہ کون ہے جو روزی دے تم کو اگر وہ رکھ چھوڑے اپنی روزی کوئی نہیں پر اڑ رہے ہیں شرارت اور بدکنے پر

اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖۤ اَهْدٰۤى اَمَّنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۲۲﴾

بھلا ایک جو چلے اوندھا اپنے منہ کے بل وہ سیدھی راہ پائے یا وہ شخص جو چلے سیدھا ایک سیدھی راہ پر

قُلْ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَكُمْ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِیْلًا

تو کہہ وہی ہے جس نے تم کو بنا کھڑا کیا اور بنا دیئے تمھارے واسطے کان اور آنکھیں اور دل تم بہت

مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۳﴾ قُلْ هُوَ الَّذِیْ ذَرَاَكُمْ فِی الْاَرْضِ وَ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

تھوڑا حق مانتے ہو تو کہہ وہی ہے جس نے بکھیر دیا تم کو زمین میں اور اسی کی طرف اکٹھے کئے جاؤ گے

وَ یَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۲۵﴾ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ

اور کہتے ہیں کب ہوگا یہ وعدہ اگر تم سچے ہو تو کہہ خبر تو ہے اللہ ہی کے

اللّٰهِ ۪ وَ اِنَّمَاۤ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۲۶﴾ فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِیْٓــٴَـتْ وُجُوْهُ الَّذِیْنَ

پاس اور میرا کام تو یہی ڈر سنا دینا ہے کھول کر پھر جب دیکھیں گے کہ وہ پاس آ لگا تو بگڑ جائیں گے منہ منکروں

كَفَرُوْا وَ قِیْلَ هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ ﴿۲۷﴾ قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِیَ

کے اور کہے گا یہی ہے جس کو تم مانگتے تھے تو کہہ بھلا دیکھو تو اگر ہلاک کردے مجھ کو

اللّٰهُ وَ مَنْ مَّعِیَ اَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ یُّجِیْرُ الْكٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۲۸﴾

اللہ اور میرے ساتھ والوں کو یا ہم پر رحم کرے پھر وہ کون ہے جو بچائے منکروں کو عذاب دردناک سے

قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَ عَلَیْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ

تو کہہ وہی رحمٰن ہے ہم نے اس کو مانا اور اسی پر بھروسہ کیا سو اب تم جان لوگے کون پڑا ہے صریح

مُّبِیْنٍ ﴿۲۹﴾ قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ یَّاْتِیْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِیْنٍ ﴿۳۰﴾ ع

بہکائے میں تو کہہ بھلا دیکھو تو اگر ہو جائے صبح کو پانی تمھارا خشک پھر کون ہے جو لائے تمھارے پاس پانی نتھرا

ع ۲ / ۱۶

خلاصۂ تفسیر

وہ (خدا) بڑا عالیشان ہے جس کے قبضہ میں تمام سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تاکہ تمھاری آزمائش کرے کہ تم میں کون شخص عمل میں زیادہ اچھا ہے (حسنِ عمل میں موت کا تو دخل یہ ہے کہ موت کی فکر سے انسان دُنیا فانی اور قیامت کے اعتقاد سے آخرت کو باقی سمجھ کر وہاں کے ثواب حاصل کرنے اور وہاں کے عذاب سے بچنے کے لئے مستعد ہوسکتا ہے اور حیات کا دخل یہ ہے کہ اگر حیات نہ ہو تو عمل کس وقت کرے، پس حُسنِ عمل کے لئے موت بمنزلہ شرط کے اور حیات بمنزلہ ظرف کے ہے

اور چونکہ موت عدم محض نہیں ہے اس لئے اس پر مخلوقیت کا حکم صحیح ہے) اور وہ زبردست (اور) بخشنے والا ہے (کہ اعمال غیر حسنہ پر عتاب اور اعمال حسنہ پر مغفرت و ثواب مرتب فرماتا ہے) جس نے سات آسمان اُوپر تلے پیدا کئے (جیسے حدیث صحیح میں ہے کہ ایک آسمان سے اوپر بفاصلہ دراز دوسرا آسمان ہے پھر اسی طرح اس سے اُوپر تیسرا و علیٰ ہذا۔ آگے آسمان کا استحکام بیان فرماتے ہیں کہ اے دیکھنے والے) تو خدا کی اس صنعت میں کوئی خلل نہ دیکھے گا سو (اب کی بار) پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لے کہیں تجھ کو کوئی خلل نظر آتا ہے (یعنی بلا تامّل تو بہت بار دیکھا ہوگا اب کی بار تامّل سے نگاہ کر) پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھ (آخر کار) نگاہ ذلیل اور درماندہ ہو کر تیری طرف لَوٹ آدے گی (اور کوئی رخنہ نظر نہ آویگا یعنی وہ جس چیز کو جیسا چاہے بنا سکتا ہے چنانچہ آسمان کو مضبوط بنانا چاہا کہ باوجود زمان دراز گزر جانے کے اب تک اس میں کوئی خلل نہیں آیا۔ وھذا کقولہ تعالیٰ وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوجٍ، اسی طرح کسی شئے کو ضعیف اور جلد متأثر ہونے والی بنا دیا غرض اس کو ہر طرح کی قدرت ہے) اور (ہماری قدرت کی دلیل یہ ہے کہ) ہم نے قریب کے آسمان کو چراغوں (یعنی ستاروں) سے آراستہ کر رکھا ہے اور ہم نے ان (ستاروں) کو شیطانوں کے مارنے کا ذریعہ بھی بنایا ہے (جس کی حقیقت سورۂ حجر میں گزری ہے) اور ہم نے ان (شیاطین) کے لئے (شہاب کی مار کے علاوہ جو کہ دُنیا میں ہوتا ہے آخرت میں بوجہ ان کے کفر کے) دوزخ کا عذاب (بھی) تیار کر رکھا ہے اور جو لوگ اپنے رب (کی توحید) کا انکار کرتے ہیں ان کے لئے دوزخ کا عذاب ہے اور وہ بُری جگہ ہے جب یہ لوگ اسمیں ڈالے جاویں گے تو اسکی ایک بڑی زور کی آواز سُنیں گے اور وہ اس طرح جوش مارتی ہوگی جیسے معلوم ہوتا ہے کہ (ابھی) غصہ کے مارے پھٹ پڑے گی (یا تو اللہ تعالیٰ اسمیں ادراک اور غصہ پیدا کر دیگا کہ مبغوضین حق پر اس کو بھی غیظ آوے گا اور یا مقصود تمثیل ہے یعنی جیسے کوئی غصہ سے جوش میں آتا ہے اسی طرح وہ شدت اشتعال سے جوش میں آوے گی اور) جب اسمیں کوئی گروہ (کافروں کا) ڈالا جاوے گا تو اس کے محافظ ان لوگوں سے پوچھیں گے کہ کیا تمھارے پاس کوئی ڈرانے والا (پیغمبر) نہیں آیا تھا (جس نے تم کو اس عذاب سے ڈرایا ہو جسکا مقتضا یہ تھا کہ اس سے ڈرتے اور بچنے کا سامان کرتے۔ یہ سوال بطور توبیخ ہے یعنی پیغمبر تو آئے تھے اور یہ سوال ہر نئے جانے والے گروہ سے ہوگا کیونکہ دوزخ میں حسب تفاوت مراتب کفر سب فرقے کفار کے یکے بعد دیگرے جاویں گے) وہ کافر (بطور اعتراف کے) کہیں گے کہ واقعی ہمارے پاس ڈرانے والا (پیغمبر) آیا تھا سو (ہماری شامت تھی کہ) ہم نے اس کو جُھٹلا دیا اور کہہ دیا کہ خدا تعالیٰ نے (از قبیل احکام و کتب) کچھ نازل نہیں کیا (اور) تم بڑی غلطی میں پڑے ہو۔ اور (وہ کافر فرشتوں سے یہ بھی) کہیں گے کہ ہم اگر سُنتے یا سمجھتے (یعنی پیغمبروں کے کہنے کو قبول کرتے اور مانتے) تو ہم اہل دوزخ میں (شامل) نہ ہوتے غرض اپنے جُرم کا اقرار کریں گے سو اہل دوزخ پر لعنت ہے۔ بیشک جو لوگ اپنے پروردگار سے بے دیکھے ڈرتے ہیں (اور ایمان و اطاعت اختیار کرتے ہیں) ان کے لئے مغفرت اور اجر عظیم (مقرر) ہے۔ اور تم لوگ خواہ چھپا کر بات کہو یا پُکار کر کہو (اسکو سب خبر ہے کیونکہ)

وہ دِلوں تک کی باتوں سے خوب آگاہ ہے (اور بھلا) کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے اور وہ باریک بین ہے۔ (اور) پورا باخبر ہے (حاصل استدلال کا یہ ہے کہ وہ ہر شئے کا خالق مختار ہے پس تمہارے احوال و اقوال کا بھی خالق ہے اور کسی چیز کی تخلیق بغیر علم کے نہیں ہو سکتی اس لئے اللہ کو ہر چیز کا علم ضروری ہوا اور تخصیص اقوال کی مقصود نہیں بلکہ حکم عام ہے افعال بھی اسمیں داخل ہیں۔ تخصیص ذکری شاید اس بنا پر ہو کہ اقوال کثیر الوقوع ہیں غرض اس کو سب علم ہے وہ ہر ایک کو مناسب جزا دیگا) وہ ایسا (منعم) ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو مسخر کر دیا، (کہ تم اسمیں ہر طرح کے تصرفات کر سکتے ہو) سو تم اس کے رستوں میں چلو (پھرو) اور خدا کی روزی میں سے (جو زمین میں پیدا کی ہے) کھاؤ (پیو) اور (کھا پی کر اس کو یاد رکھنا کہ) اسی کے پاس دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے (پس یہ اس کو مقتضی ہے کہ اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرو جو ایمان وطاعت ہے) کیا تم لوگ اس سے بیخوف ہو گئے ہو جو کہ آسمان میں (بھی اپنا حکم اور تصرف رکھتا) ہے کہ وہ تم کو (مثل قارون کے) زمین میں دھنسا دے پھر وہ زمین تھرتھرا (کر الٹ پلٹ ہو) نے لگے (جس سے تم اور نیچے اُتر جاؤ اور زمین کے اجزا ر تمہارے اُوپر آکر رل جاویں) یا تم لوگ اس سے بیخوف ہو گئے ہو جو کہ آسمان میں (بھی اپنا حکم اور تصرف رکھتا) ہے کہ وہ تم پر (مثل عاد کے) ایک ہوائے تند بھیجدے (جس سے تم ہلاک ہو جاؤ یعنی مقتضا تمہارے کفر کا یہی ہے) سو (اگر کسی مصلحت سے عذاب عاجل تم پر سے ٹل رہا ہے تو کیا ہوا) عنقریب (مرتے ہی) تم کو معلوم ہو جائے گا کہ میرا ڈرانا (عذاب سے) کیسا (واقع اور صحیح) تھا اور (اگر بدون عذاب عاجل کے کفر کا مبغوض ہونا ان کی سمجھ میں نہ آوے تو اسکا نمونہ بھی موجود ہے چنانچہ) ان سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں اُنھوں نے (دینِ حق کو) جھٹلایا تھا سو (دیکھ لو ان پر) میرا عذاب کیسا (واقع) ہوا (جس سے صاف معلوم ہوا کہ کفر مبغوض ہے پس اگر کسی مصلحت سے یہاں عذاب ٹل گیا تو دوسرے عالم میں حسب وعید واقع ہوگا اور اوپر خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ الخ میں وہ دلائل توحید بیان ہوئے جو آسمان کے متعلق ہیں پھر ھُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ الخ میں زمین کے متعلق چیزوں کا بیان ہوا، آگے جو یعنی فضاء آسمانی کے متعلقہ دلائل کا بیان ہے) کیا ان لوگوں نے اپنے اوپر پرندوں کی طرف نظر نہیں کی کہ پَر پھیلائے ہوئے (اُڑتے پھرتے) ہیں اور (کبھی اسی حالت میں) پر سمیٹ لیتے ہیں (اور دونوں حالتوں میں باوجود ثقیل اور وزنی ہونے کے زمین اور آسمان کی درمیانی فضا میں پھرتے رہتے ہیں زمین پر نہیں گر جاتے اور) بجز (خدائے) رحمان کے ان کو کوئی تھامے ہوئے نہیں ہے بیشک وہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے (اور جس طرح چاہے اس میں تصرف کر رہا ہے) ہاں (خدا کے تصرفات تو سُن لئے اب بتلاؤ کہ) رحمٰن کے سوا وہ کون ہے کہ وہ تمہارا لشکر بن کر (آفات سے) تمہاری حفاظت کر سکے (اور) کافر (جو اپنے معبودوں کی نسبت ایسا خیال رکھتے ہیں) تو (وہ) نرے دھوکہ میں ہیں (اور) ہاں (یہ بھی بتلاؤ کہ) وہ کون ہے جو تمکو روزی پہنچاوے اگر اللہ تعالےٰ اپنی روزی بند کرلے (مگر یہ لوگ اس سے بھی متاثر نہیں ہوتے) بلکہ یہ لوگ سرکشی اور نفرت (عن الحق) پر جم رہے ہیں (خلاصہ یہ کہ تمہارے معبودات باطلہ بت وغیرہ نہ کسی مضرت کے

دفع پر قادر ہیں وہو المراد بقولہ تعالیٰ یَنْصُرُکُمْ اور نہ ایصال منافع پر قادر ہیں وہو المراد بقولہ تعالیٰ یَرْزُقُکُمْ، پھر ان کی عبادت محض بے وقوفی ہے، یعنی جس کافر کا حال اوپر سُنا ہے اِنِ الْکٰفِرُوْنَ اِلَّا فِیْ غُرُوْرٍ بَلْ لَّجُّوْا فِیْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ) سو (اس کو سنکر سوچو کہ) کیا جو شخص (بوجہ ناہمواری راہ کے ٹھوکریں کھاتا ہوا اور) منہ کے بل گرتا ہوا چل رہا ہو وہ منزلِ مقصود پر زیادہ پہنچنے والا ہوگا یا وہ شخص (زیادہ منزل مقصود پر پہنچنے والا ہوگا) جو سیدھا ایک ہموار سڑک پر چلا جا رہا ہو (یہی حال ہے مومن و کافر کا کہ مومن کے چلنے کا رستہ بھی دین مستقیم ہے اور وہ چلتا بھی ہے سیدھا ہو کر افراط تفریط سے بچ کر اور کافر کے چلنے کا رستہ بھی زیغ و ضلالت کا ہے۔ اور چلنے میں بھی ہر وقت مہالک و مخاوف میں گرتا جاتا ہے پس ایسی حالت میں کیا منزل پر پہنچے گا اور اوپر دلائل توحید متعلق آفاق کے تھے آگے متعلق انفس کے ارشاد ہیں)۔ آپ (ان سے) کہئے کہ وہی (ایسا قادر منعم) ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور تم کو کان اور آنکھیں اور دل دیئے (مگر) تم لوگ بہت کم شکر کرتے ہو (اور) آپ (یہ بھی) کہئے کہ وہی ہے جس نے تم کو روئے زمین پر پھیلایا اور تم اسی کے پاس (قیامت کے روز) اکٹھے کئے جاؤ گے اور یہ لوگ (جب قیامت کا ذکر سُنتے ہیں کما فی ہٰذہ السورۃ من قولہ اِلَیْہِ النُّشُوْرُ ومن قولہ اِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ تو) کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب ہوگا اگر تم (یعنی پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین مؤمنین) سچے ہو (تو بتلاؤ) آپ (جواب میں) کہہ دیجئے کہ یہ (تعیین کا) علم تو خدا ہی کو ہے اور میں تو محض (علی الاجمال مگر) صاف صاف ڈرانے والا ہوں پھر جب اس (عذاب قیامت) کو پاس آتا ہوا دیکھیں گے (پاس آتا ہوا دیکھنا یہ کہ اعمال کا محاسبہ ہوگا دوزخ میں جانے کا حکم ہوگا جس سے متیقن ہو جائے گا کہ اب عذاب سر پر آگیا غرض جب اس کو پاس آتا ہوا دیکھیں گے) تو (مارے غم کے) کافروں کے منہ بگڑ جاویں گے (کقولہ تعالیٰ وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ عَلَیْہَا غَبَرَۃٌ تَرْہَقُہَا قَتَرَۃٌ) اور (ان سے) کہا جاویگا یہی ہے وہ جس کو تم مانگا کرتے تھے (کہ عذاب لاؤ، عذاب لاؤ۔ اور یہ کفار ان مضامین حقہ توحید و بعث وغیرہ کو سُنکر جو ایسی باتیں کرتے ہیں شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِہٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ - اِنْ کَادَ لَیُضِلُّنَا عَنْ اٰلِہَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَیْہَا، جن کا حاصل انتظار آپ کی ہلاکت کا اور آپ کو نعوذ باللہ منسوب الی الضلال کرنا ہے آگے اسکے جواب کی تعلیم ہے جسمیں عذاب کفار کی تقریر اور دوسرے مضامین سے اس کی تتمیم ہے ارشاد ہوتا ہے کہ) آپ (ان سے) کہئے کہ تم یہ تبلاؤ کہ اگر خدا تعالیٰ مجھ کو اور میرے ساتھ والوں کو (موافق تمھاری تمنا کے) ہلاک کر دے یا (ہماری اُمید اور اپنے وعدہ کے مطابق) ہم پر رحمت فرما دے تو (دونوں حالت میں اپنی خبر لو اور یہ تبلاؤ کہ) کافروں کو عذاب دردناک سے کون بچالے گا (یعنی ہماری تو جو حالت ہوگی دُنیا میں ہوگی اور انجام اس کا ہر حال میں اچھا ہے کقولہ تعالیٰ ہَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَی الْحُسْنَیَیْنِ الخ مگر اپنی کہو کہ تم پر جو مصیبت عظیمہ آنے والی ہے اس کو کون روکے گا اور ہمارے دُنیوی حوادث سے تمھاری وہ مصیبت کیسے ٹل جاوے گی تو اپنی فکر چھوڑ کر ہمارے حوادث کا انتظار ایک فضول حرکت ہے۔ یہ جواب ہے نتربص الخ کا اور)

آپ (ان سے یہ بھی) کہئے کہ وہ بڑا مہربان ہے ہم اس پر (اس کے حکم کے موافق) ایمان لائے اور ہم اس پر توکل کرتے ہیں (پس ایمان کی برکت سے تو وہ ہم کو عذاب آخرت سے محفوظ رکھے گا اور توکل کی برکت سے حوادث دنیویہ کو دفع یا سہل کر دیگا یہ بھی نتربص کا تتمہ جواب ہے) سو (جب تم پر عذاب الیم آنیوالا ہے اور ہم انشاء اللہ تعالیٰ ایمان کی برکت سے اس عذاب سے محفوظ رہنے والے ہیں تو) عنقریب تم کو معلوم ہو جاویگا (جب اپنے آپ کو عذاب میں مبتلا اور ہم کو اس سے محفوظ دیکھو گے) کہ صریح گمراہی میں کون ہے (یعنی تم ہو جیسا کہ ہم کہتے ہیں یا ہم ہیں جیسا کہ تم کہتے ہو یہ جواب ہے اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا الخ کا، آگے تقریر ہے مضمون بالا فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ الخ کی یعنی اوپر جو کہا گیا ہے کہ تم کو عذاب الیم سے کوئی نہیں بچا سکتا، ان کو اگر اپنے آلہہ باطلہ کا گھمنڈ ہو کہ وہ بچالیں گے تو اس زعم کے ابطال و ازالہ کے لئے ان سے) آپ (یہ) کہدیجئے کہ اچھا یہ بتلاؤ کہ اگر تمھارا پانی (جو کنووں میں ہی نیچے کو (اُتر کر) غائب ہی ہو جائے سو وہ کون ہے جو تمھارے پاس سوت کا پانی لے آئے (یعنی کنویں کی سوت کو جاری کر دے اور اعماق ارض سے اُوپر لے آئے اور اگر کسی کو کھود لینے پر ناز ہو تو اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ اس کو اور نیچے غائب کر دے وعلیٰ ہذا، پس جب خدا کے مقابلے میں کسی کو اتنی بھی قدرت نہیں کہ معمولی طبعی واقعات میں تصرف کر سکے تو عذاب آخرت سے بچانے کی کیا قدرت ہوگی)

معارف و مسائل

فضائل سورۂ ملک اس سورت کو حدیث میں واقیہ اور منجیہ بھی فرمایا ہے۔ واقیہ کے معنے بچانے والی اور منجیہ کے معنے نجات دینے والی، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ھی المانعۃ المنجیۃ تنجیہ من عذاب القبر، یعنی یہ سورت عذاب کو روکنے والی اور عذاب سے نجات دینے والی ہے۔ یہ اپنے پڑھنے والے کو عذاب قبر سے بچالے گی (رواہ الترمذی وقال حدیث حسن غریب از قرطبی)

اور حضرت ابن عباس رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ سورۂ ملک ہر مومن کے دل میں ہو (ذکرہ الثعلبی) اور حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کتاب اللہ میں ایک ایسی سورت ہے جس کی آیتیں تو صرف تیس ۳۰ ہیں قیامت کے روز یہ ایک شخص کی سفارش کرے گی یہاں تک کہ اس کو جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دے گی اور وہ سورۂ تبارک ہے (قرطبی۔ از ترمذی)

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، لفظ تَبَارَكَ برکت سے مشتق ہے جس کے لفظی معنے بڑھنے اور زیادہ ہونے کے ہیں یہ لفظ جب اللہ تعالیٰ کی شان میں بولا جاتا ہے تو سب سے بالا و برتر ہونے کے معنی میں آتا ہے جیسے اللہ اکبر، بِيَدِهِ الْمُلْكُ۔ اللہ کے ہاتھ میں ہے ملک اللہ جل شانہٗ کے لئے قرآن کریم میں جا بجا لفظ ید بمعنے ہاتھ استعمال ہوا ہے اللہ تعالیٰ جسم اور اعضاء سے بالا و برتر ہے۔

اسلئے یہ لفظ متشابہات میں سے ہے جس کے حق ہونے پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کی کیفیت و حقیقت کسی کو معلوم نہیں ہو سکتی اُس کے درپے ہونا درست نہیں۔ اور مُلک سے مراد آسمانوں اور زمینوں کی اور دُنیا و آخرت کی حکومت ہے۔ اس آیت میں حق تعالےٰ کے لئے چار صفات کا دعویٰ ہے۔ اوّل اسکا موجود ہونا، دوسرے انتہائی درجے کی صفات کمال کا مالک اور سب سے بالاوبرتر ہونا، تیسرے آسمان و زمین پر اُس کی حکومت ہونا، چوتھے ہر چیز پر اسکا قادر ہونا، اگلی آیات میں اس دعوے کے دلائل ہیں جو اللہ تعالےٰ کی مخلوقات ہی میں غور و فکر کرنے سے واضح ہوتے ہیں اسلئے اگلی آیات میں تمام کائنات و مخلوقات کی مختلف انواع و اصناف سے اللہ تعالیٰ کے وجود اور توحید پر اور اسکے کمال علم و قدرت پر استدلال کیا گیا ہے سب سے پہلے اشرف المخلوقات انسان کے اپنے وجود میں جو دلائل قدرت ہیں اُن کی طرف متوجہ فرمایا، اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ الخ میں اسکا بیان ہے اس کے بعد کئی آیتوں میں آسمانوں کی تخلیق میں غور و فکر سے استدلال فرمایا اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ الآیۃ، اس کے بعد زمین کی تخلیق اور اُس کے فوائد متعلقہ میں غور و فکر کا بیان ھُوَالَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا سے دو آیتوں میں فرمایا، پھر فضائے آسمانی میں رہنے والی مخلوق پرندوں کا ذکر فرمایا اَوَلَمْ یَرَوْا اِلَی الطَّیْرِ الخ غرض اس پوری سورت میں اصل مضمون حق تعالیٰ کے وجود اور اس کے کمال علم و قدرت پر کائنات عالم کے مشاہدہ سے دلائل پیش کرنا ہے۔ ضمناً دوسرے مضامین کفار کی سزار اور مؤمنین کی جزار کے بھی آگئے ہیں۔ خود انسان کے نفس میں جو دلائل اللہ تعالیٰ کے کمال علم و قدرت کے ہیں، اُن کی طرف دو لفظوں سے ہدایت فرمائی۔

موت و حیات کی حقیقت خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ، یعنی پیدا کیا اس نے موت اور حیات کو۔ احوالِ انسانی میں سے یہاں صرف دو چیزیں موت و حیات بیان کی گئیں کیونکہ یہی دونوں انسان کے تمام عمر کے احوال و افعال پر حاوی ہیں۔ حیات کے لئے پیدا کرنے کا لفظ تو اپنی جگہ ظاہر ہے کہ حیات ایک وجودی چیز ہے تخلیق و تکوین کا اُس سے متعلق ہونا ظاہر ہے لیکن موت جو بظاہر ایک عَدَم کا نام ہے اس کے ساتھ تخلیق کا تعلق کس طرح ہوا، اس کے جواب میں ائمہ تفسیر سے متعدد اقوال منقول ہیں، سب سے زیادہ واضح بات یہ ہے کہ موت عدم محض کا نام نہیں بلکہ روح اور بدن کا تعلق منقطع کرکے روح کو ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل کرنے کا نام ہے اور یہ ایک وجودی چیز ہے۔ غرض جس طرح حیات ایک حال ہے جو جسم انسانی پر طاری ہوتا ہے اسی طرح موت بھی ایک ایسا ہی حال ہے اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور بعض دوسرے ائمہ تفسیر سے جو یہ منقول ہے کہ موت و حیات دو مجسّم مخلوق ہیں، موت ایک مینڈھے کی شکل میں اور حیات ایک گھوڑی کی شکل میں ہے۔ اس سے مراد بظاہر اس صحیح حدیث کا بیان ہے جس میں یہ ارشاد ہی کہ جب قیامت میں اہلِ جنّت جنّت میں اور اہل دوزخ دوزخ میں داخل ہو چکیں گے تو موت کو ایک مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا اور پُل صراط کے پاس اُس کو ذبح کرکے اعلان کر دیا جائیگا کہ اب جو جس

حالت میں ہے وہ دائمی اور ابدی ہے اب کسی کو موت نہیں آئے گی، مگر اس حدیث سے یہ لازم نہیں آتا کہ دُنیا میں موت کوئی جسم ہو بلکہ جس طرح دُنیا کے بہت سے احوال و اعمال قیامت میں مجسّم اور متشکل ہو جائیں گے جو بہت سی احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اسی طرح موت جو انسان کو پیش آنے والی ایک حالت ہے وہ بھی قیامت میں مجسّم ہو کر مینڈھے کی شکل میں ذبح کر دی جائے گی (قرطبی)

اور تفسیر مظہری میں فرمایا کہ موت اگرچہ عدمی چیز ہے مگر عدم محض نہیں، بلکہ ایسی چیز کا عدم ہے جس کو وجود میں کسی وقت آنا ہے اور ایسے تمام معدومات کی شکلیں عالم مثال میں قبل از وجود ناسوتی موجود ہوتی ہیں جن کو اعیان ثابتہ کہا جاتا ہے ان اشکال کی وجہ سے ان کو قبل الوجود بھی ایک قسم کا وجود حاصل ہے اور عالمِ مثال کے موجود ہونے پر بہت سی روایات حدیث سے استدلال فرمایا ہے واللہ اعلم

موت و حیات کے درجات مختلفہ | تفسیر مظہری میں ہے کہ حق تعالیٰ جل شانہٗ نے اپنی قدرت اور حکمتِ بالغہ سے مخلوقات و ممکنات کو مختلف اقسام میں تقسیم فرما کر ہر ایک کو حیات کی ایک قسم عطا فرمائی ہے۔ سب سے زیادہ کامل و مکمل حیات انسان کو عطا فرمائی جس میں یہ صلاحیت بھی رکھدی کہ وہ حق تعالیٰ کی ذات و صفات کی معرفت ایک خاص حد تک حاصل کر سکے اور یہ معرفت ہی بنائے تکلیف احکام شرعیہ اور وہ بارِ امانت ہے جس کے اُٹھانے سے آسمان و زمین اور پہاڑ سب ڈر گئے اور انسان نے اپنی اس خداداد صلاحیت کے سبب اُٹھالیا اس حیات کے مقابل وہ موت ہے جسکا ذکر قرآن کریم کی آیت اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ میں ذکر فرمایا ہے کہ کافر کو مُردہ اور مومن کو زندہ قرار دیا گیا کیونکہ کافر نے اپنی اُس معرفت کو ضائع کر دیا جو انسان کی مخصوص حیات تھی، اور بعض اصناف و اقسام مخلوقات میں یہ درجہ حیات کا تو نہیں مگر حس و حرکت موجود ہے اسکے مقابل وہ موت ہے جسکا ذکر قرآن کریم کی آیت كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ میں آیا ہے کہ اس جگہ حیات سے مُراد حس و حرکت اور موت سے مراد اسکا ختم ہو جانا ہے۔ اور بعض اقسام ممکنات میں یہ حس و حرکت بھی نہیں صرف نمو (بڑھنے کی صلاحیت) ہے جیسے عام درختوں اور نباتات میں اس کے بالمقابل وہ موت ہے جسکا ذکر قرآن کی آیت يُحْيِي الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا میں آیا ہے۔ حیات کی یہ تین قسمیں انسان، حیوان، نبات میں منحصر ہیں ان کے علاوہ اور کسی چیز میں یہ اقسام حیات نہیں ہیں اسی لئے حق تعالیٰ نے پتھروں سے بنے ہوئے بتوں کے متعلق فرمایا اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاۗءٍ لیکن اس کے باوجود جمادات میں بھی ایک خاص حیات موجود ہے جو وجود کیساتھ لازم ہے۔ اسی حیات کا اثر ہے جسکا ذکر قرآن کریم میں ہے وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ یعنی کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ کی حمد کی تسبیح نہ پڑھتی ہو۔ اور آیت میں موت کا ذکر مقدم کرنے کی وجہ بھی اس بیان سے واضح ہو گئی کہ اصل کے اعتبار سے موت ہی مقدم ہے ہر چیز وجود میں آئی ہے پہلے موت کے عالم میں تھی بعد میں اس کو حیات عطا ہوئی ہے اسلئے موت کا ذکر مقدم کیا گیا۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آگے جو موت و حیات کی تخلیق کی وجہ انسان کی آزمائش و

ابتلاء کو قرار دیا ہے لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا، یہ آزمائش بہ نسبت حیات کے موت میں زیادہ ہے کیونکہ جس شخص کو اپنی موت کا استحضار ہوگا وہ اچھے اعمال کی پابندی زیادہ سے زیادہ کریگا۔ اور اگرچہ یہ آزمائش حیات میں بھی ہے کہ زندگی کے قدم قدم پر اس کو اپنا عجز اور اللہ تعالیٰ کے قادر مطلق ہونیکا استحضار ہوتا رہتا ہے جو حُسنِ عمل کیطرف داعی ہے لیکن موت کی فکر اصلاح عمل اور حُسنِ عمل میں سب سے زیادہ مؤثر ہے۔

حضرت عمار بن یاسر کی حدیث مرفوع میں ہے کفیٰ بالموت واعظاً وکفیٰ بالیقین غنیً، یعنی موت وعظ کے لئے کافی ہے اور یقین غنی کے لئے (رواہ الطبرانی) مراد یہ ہے کہ اپنے دوستوں عزیزوں کی موت کا مشاہدہ سب سے بڑا واعظ ہے جو اس سے متأثر نہیں ہوتا اسکا دوسری چیزوں سے متاثر ہونا مشکل ہے اور جس کو اللہ نے ایمان یقین کی دولت عطا فرمائی اسکی برابر کوئی غنی و بے نیاز نہیں۔ اور ربیع بن انس نے فرمایا کہ موت انسان کو دُنیا سے بیزار کرنے اور آخرت کی طرف رغبت دینے کے لئے کافی ہے۔

أَحْسَنُ عَمَلًا، یہاں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ انسان کی اس آزمائش میں جو اس کی موت و حیات سے وابستہ ہے حق تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ تم میں سے کس کا عمل اچھا ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ کس کا عمل زیادہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی عمل کی مقدار کا زیادہ ہونا قابلِ توجہ نہیں بلکہ عمل کا اچھا اور صحیح و مقبول ہونا معتبر ہے اسی لئے قیامت میں انسان کے اعمال کو گِنا نہیں جائے گا بلکہ تولا جائیگا، جسمیں بعض ایک ہی عمل کا وزن ہزاروں اعمال سے بڑھ جائے گا۔

حُسنِ عمل کیا ہے حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی یہاں تک کہ أَحْسَنُ عَمَلًا تک پہنچے تو فرمایا کہ (أَحْسَنُ عَمَلًا) وہ شخص ہے جو اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے سب سے زیادہ پرہیز کرنے والا ہو اور اللہ کی اطاعت میں ہر وقت مستعد و تیار رہو (قرطبی)

فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِن فُطُورٍ، اس آیت سے ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا والے آسمان کو آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ نیلگوں فضا جو دکھائی دیتی ہے یہی آسمان ہو بلکہ ہو سکتا ہے آسمان اس سے بہت اوپر ہو اور یہ نیلگوں رنگ ہوا اور فضاء کا ہو جیسا کہ فلاسفہ کہتے ہیں مگر اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ آسمان انسان کو نظر ہی نہ آئے، ہو سکتا ہے کہ یہ نیلگوں فضا شفاف ہونیکے سبب اصل آسمان کو جو اس سے بہت اوپر ہے دیکھنے میں مانع نہ ہو۔ اور اگر کسی دلیل سے یہ ثابت ہو جائے کہ دُنیا میں رہتے ہوئے آسمان کو آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا تو پھر اس آیت میں رویت سے مراد رویت عقلی یعنی غور و فکر ہوگا (بیان القرآن)

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنَاهَا رُجُومًا لِّلشَّيَاطِينِ، مَصَابِيح سے مراد ستارے ہیں اور نیچے کے آسمان کو ستاروں سے مزین کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ستارے آسمان کے اندر یا اس کے اوپر لگے ہوئے ہوں بلکہ یہ تزیین اس صورت میں بھی صادق ہے جبکہ ستارے آسمان سے بہت نیچے خلا میں ہوں جیسا کہ تحقیق جدید سے اسکا مشاہدہ ہو رہا ہے یہ اُس کے منافی نہیں، اور ستاروں کو شیاطین کے

دفع کرنے کے لئے انگارے بنا دینے کا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ ستاروں میں سے کوئی مادہ آتشیں انکی طرف چھوڑ دیا جاتا ہو ستارے اپنی جگہ رہتے ہوں، عوام کی نظر میں چونکہ یہ شعلہ ستارہ کی طرح حرکت کرتا ہوا نظر آتا ہے اسلئے اس کو ستارہ ٹوٹنا اور عربی میں انقضاض الکوکب کہدیتے ہیں (قرطبی)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شیاطین جو آسمانی خبریں چرانے کے لئے چڑھتے ہیں وہ کواکب اور ستاروں سے نیچے ہی دفع کردیئے جاتے ہیں (قرطبی) یہاں تک مختلف مخلوقات میں غور و فکر کے ذریعہ حق تعالیٰ کے کمال علم و قدرت کے دلائل بیان ہوئے آگے منکرین اور کفار کا عذاب اور پھر مومنین اور اطاعت شعار لوگوں کا ثواب بیان ہوا ہے وَلِلَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ سے سات آیتوں تک یہ مضمون چلا ہے۔ آگے پھر وہی علم و قدرت کا بیان ہے۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا، ذلول کے لفظی معنی منقاد و مطیع کے ہیں اس جانور کو ذلول کہا جاتا ہے جو سواری دینے میں شوخی نہ کرے۔ مناکب، منکب کی جمع ہے مونڈھے کو کہتے ہیں۔ کسی بھی جانور کا مونڈھا سواری کی جگہ نہیں ہوتی بلکہ اُس کی کمر یا گردن ہوتی جو جانور سوار ہونے والوں کے لئے اپنے مونڈھے بھی پیش کردے وہ بہت ہی مطیع و منقاد اور مسخر ہو سکتا ہے اسلئے فرمایا کہ زمین کو تمہارے لئے ہم نے ایسا مسخر و مطیع بنا دیا ہے کہ تم اسکے مونڈھوں پر چڑھتے پھرو۔ زمین کو حق تعالیٰ نے ایک ایسا قوام بخشا ہے کہ نہ تو پانی کی طرح سیال اور بہنے والا ہے نہ روئی اور کیچڑ کی طرح دبنے والا، کیونکہ زمین ایسی ہوتی تو اس پر کسی انسان کا رہنا ٹھہرنا ممکن نہ ہوتا اسی طرح زمین کو لوہے پتھر کی طرح سخت بھی نہیں بنایا اگر ایسا ہوتا تو اسمیں درخت اور کھیتی نہ بوئی جاسکتی اسمیں کنویں اور نہریں نہ کھودی جاسکتیں اسکو کھود کر اونچی عمارتوں کی بنیاد نہ رکھی جاسکتی، اس قوام کے ساتھ اس کو ایسا سکون بخشا کہ اُس پر عمارتیں ٹھہر سکیں چلنے پھرنے والوں کو لغزش نہ ہو۔

وَكُلُوا مِنْ رِزْقِهِ وَإِلَيْهِ النُّشُورُ، پہلے زمین کے اطراف میں چلنے پھرنے کی ہدایت فرمائی اسکے بعد فرمایا کہ اللہ کا رزق کھاؤ۔ اسمیں اشارہ ہو سکتا ہے کہ تجارت کے لئے سفر اور مال کی درآمد برآمد اللہ کے رزق کا دروازہ ہے وَإِلَيْهِ النُّشُورُ میں بتلا دیا کہ کھانے پینے رہنے سہنے کے فوائد زمین سے حاصل کرنے کی اجازت ہے مگر موت اور آخرت سے بے فکر نہ رہو کہ انجام کار اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ زمین پر رہتے ہوئے آخرت کی تیاری میں لگے رہو۔ اس میں تو اس بات سے ڈرایا گیا تھا کہ آخر کار قیامت میں اللہ کی طرف لوٹنا ہے، آگے اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ زمین پر رہنے بسنے کے وقت بھی اللہ کا عذاب آسکتا ہے ارشاد فرمایا،

ءَأَمِنتُم مَّن فِي السَّمَاءِ أَن يَخْسِفَ بِكُمُ الْأَرْضَ فَإِذَا هِيَ تَمُورُ، کیا تم اس سے بیخوف ہو کہ آسمان والا تمھیں زمین کے اندر خسف کر کے دھنسا دے اور زمین تمھیں نگل جائے یعنی اگرچہ اللہ نے زمین کو ایسا معتدل قوام دیا ہے کہ آدمی بغیر کھودے ہوئے اسکے اندر نہیں اُتر سکتا، لیکن وہ اس پر بھی قادر ہے کہ اس کو ایسا بنا دے کہ یہی زمین اپنے اوپر رہنے والوں کو نگل جائے، اسکے بعد دُنیا میں بسنے والوں کو ایک اور طرح کے عذاب سے ڈرایا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو تمھارے اوپر یعنی آسمان سے پتھر بھی برسا کر تمھیں ہلاک کیا جاسکتا ہے

اللہ کے منکر اور نافرمان دُنیا میں اس سے بے فکر ہو کر نہ بیٹھیں۔

اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یُّرْسِلَ عَلَیْكُمْ حَاصِبًا ؕ فَسَتَعْلَمُوْنَ كَیْفَ نَذِیْرِ، یعنی کیا تم اس سے بے خوف ہو کہ آسمان والا تم پر آسمان سے پتھر برسادے، اسوقت تمھیں اس ڈرانے کا انجام معلوم ہوگا مگر اس وقت معلوم ہونا بے سود ہوگا، آج جبکہ تم صحیح سالم محفوظ و مامون ہو اس کی فکر کرو۔ اس کے بعد پچھلی ان قوموں کے واقعات کیطرف اشارہ کیا جن پر دُنیا میں عذابِ الٰہی نازل ہوا ہے مطلب یہ ہے کہ ان کے حال سے عبرت حاصل کرو وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَیْفَ كَانَ نَكِیْرِ کا یہی مطلب ہے اسکے بعد پھر اصل مضمون سورت کی طرف رجوع ہے کہ ممکنات و مخلوقات کے حالات سے حق تعالیٰ کی توحید اور علم و قدرت پر استدلال ہے خود انسان کے نفوس، آسمان، ستارے، زمین وغیرہ کے حالات کا بیان پہلے آچکا ہے آگے ان پرندوں کا ذکر ہے جو فضاء آسمانی میں اُڑتے پھرتے ہیں۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اِلَى الطَّیْرِ الآیۃ، یعنی کیا وہ پرندوں کو اپنے سروں پر اُڑتے ہوئے نہیں دیکھتے جو کبھی اپنے بازوں کو پھیلا دیتے ہیں اور کبھی سمیٹ لیتے ہیں۔ ان میں غور کرو کہ یہ وزنی جسم ہیں عام قاعدہ کی رُو سے وزنی جسم جب اوپر چھوڑا جائے تو اُسے زمین پر گر جانا چاہیئے، ہوا ان وزنی جسموں کو عام طور پر نہیں روک سکتی مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے ان پرندے جانوروں کو ایسی وضع پر بنایا ہے کہ وہ ہوا پر ٹھیر سکیں اور ہوا پر اپنے اجسام کا بوجھ ڈالنے اور اسمیں تیرتے ہوئے پھرنے کے لئے حق تعالیٰ نے اس بظاہر بے عقل و شعور جانور کو یہ سلیقہ سکھا دیا ہے کہ وہ اپنے پَروں کو پھیلانے اور سمیٹنے کے ذریعہ ہوا کو مسخر کرلیتا ہے اور ظاہر ہے کہ ہوا میں یہ صلاحیت پیدا کرنا، پرندوں کے پَروں کو اس وضع پر بنانا پھر اُن کو اپنے پروں کے ذریعہ ہوا پر کنٹرول کرنے کا سلیقہ سکھانا یہ سب حق تعالیٰ ہی کی قدرتِ کاملہ سے ہے۔

یہاں تک ممکنات و موجودات کی مختلف اصناف کے حالات میں غور و فکر کے ذریعہ حق تعالیٰ کے وجود اور توحید اور بے نظیر علم و قدرت کے دلائل جمع فرمائے گئے جن میں ذرا بھی غور و فکر کرنیوالے کو حق تعالیٰ پر ایمان لانے کے سوا چارہ نہیں رہتا، آگے ختم سورت تک کفار و فجار منکرین اور بدعمل لوگوں کو عذابِ الٰہی سے ڈرایا گیا ہے۔ پہلے اس پر تنبیہ کی گئی کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی قوم پر عذاب نازل کرنا چاہیں تو دُنیا کی کوئی طاقت اُس کو نہیں روک سکتی، تمھارے لشکر اور سپاہی اُس سے تم کو نہیں بچاسکتے، چنانچہ ارشاد فرمایا،

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ یَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ ؕ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِیْ غُرُوْرٍ ۝

اس کے بعد اس سے ڈرایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا جو رزق تم کو آسمان سے پانی برسنے اور زمین سے نباتات اُگانے کے ذریعہ مِل رہا ہے، یہ کوئی تمھاری ذاتی جاگیر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی عطا و بخشش ہے وہ اسکو روک بھی سکتا ہے اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ یَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ کا یہی مطلب ہے۔ آگے کفار کے حال پر افسوس ہے جو نہ آیاتِ قدرت میں خود غور کرتے ہیں نہ دوسرے بتانے والوں کی بات سُنتے ہیں بَلْ لَّجُّوْا فِیْ عُتُوٍّ

وَّ نُفُوْرٍ، یعنی یہ لوگ برابر اپنی سرکشی اور حق سے دُوری میں بڑھتے ہی جاتے ہیں۔ آگے میدانِ قیامت میں کافر و مؤمن کا جو حال ہونا ہے اسکا ذکر ہے کہ قیامت کے میدان میں کفار اس طرح حاضر کئے جاویں گے کہ پاؤں پر چلنے کے بجائے سر کے بل چلیں گے۔ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ صحابۂ کرام نے سوال کیا کہ کفار چہرے کے بل کیسے چلیں گے، رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس ذات نے اُن کو پیروں پر چلایا ہے کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ اُن کو چہروں اور سَروں کے بَل چلادے۔ اسی کو اس آیت میں بیان فرمایا ہے۔

اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۝ یعنی کیا وہ آدمی جو اَوندھا اپنے چہرہ کے بَل چلے زیادہ ہدایت پانے والا ہے یا وہ جو سیدھا چلنے والا ہے۔ سیدھا چلنے والے سے مراد مومن ہے کہ ہدایت یافتہ وہی ہوسکتا ہے۔ آگے پھر انسانی تخلیق میں حق تعالیٰ کی قدرت و حکمت کے چند مظاہر کا بیان ہے۔

قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ۝ یعنی آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے تمھیں پیدا کیا اور تمھارے کان، آنکھیں اور دل بنائے۔ مگر تم لوگ شکر گزار نہیں ہوتے۔

سمع و بصر اور قلب کی تخصیص اس میں اعضائے انسانی میں سے اُن تین اعضاء کا ذکر ہے جن پر علم و ادراک اور شعور موقوف ہے۔ فلاسفہ نے علم و ادراک کے پانچ ذریعہ بیان کئے ہیں جن کو حواسِ خمسہ کہا جاتا ہے۔ یعنی سُننا، دیکھنا، سونگھنا، چکھنا اور چھونا، سونگھنے کے لئے ناک اور چکھنے کے لئے زبان اور چھُونے کی قوت سارے بدن میں حق تعالیٰ نے رکھی ہے۔ سُننے کے لئے کان اور دیکھنے کے لئے آنکھ بنائی ہے یہاں حق تعالیٰ نے ان پانچوں چیزوں میں سے صرف دو کا ذکر کیا ہے یعنی کان اور آنکھ، وجہ یہ ہے کہ سونگھنے چکھنے اور چھُونے سے بہت کم چیزوں کا علم انسان کو حاصل ہوتا ہے اسکے معلومات کا بڑا مدار سننے اور دیکھنے پر ہے اور ان میں بھی سننے کو مقدم کیا گیا غور کرو تو معلوم ہوگا کہ انسان کو اپنی عمر میں جتنی معلومات ہوئی ہیں۔ اُن میں سُنی ہوئی چیزیں بہ نسبت دیکھی ہوئی چیزوں کے بدرجہا زائد ہوتی ہیں اس لئے اس جگہ حواسِ خمسہ میں سے صرف دو پر اکتفا کیا گیا ہے کہ بیشتر معلومات انسانی انھیں دو راہوں سے حاصل ہوتی ہیں اور تیسری چیز قلب کو بتلایا ہے کہ وہ اصل بنیاد اور مرکز علم کا ہے۔ کانوں سے سُنی ہوئی اور آنکھوں سے دیکھی ہوئی چیزوں کا علم بھی قلب پر موقوف ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات اس پر شاہد ہیں کہ قلب کو مرکز علم قرار دیا ہے بخلاف فلاسفہ کے کہ وہ دماغ کو اسکا مرکز مانتے ہیں۔

اس کے بعد پھر کفار و منکرین کو تنبیہ اور عذاب کی وعید کا بیان ہے۔ آخر سورت میں پھر ایک جملہ میں یہ ارشاد فرمایا کہ زمین پر بسنے والو اور اُس کو کھود کر کنویں بنانے والو اور اس کے پانی سے اپنے پینے پلانے اور نباتات اُگانے کا کام لینے والو اس بات کو نہ بھولو کہ یہ سب چیزیں کوئی تمھاری

ذاتی جاگیر نہیں صرف حق تعالیٰ کا عطیہ ہے کہ اس نے پانی برسایا اور اُس پانی کو برف کی شکل میں بحرِ منجمد بنا کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر لاد دیا کہ سڑنے اور خراب ہونے سے محفوظ رہے پھر اس برف کو آہستہ آہستہ پگھلا کر پہاڑوں کی عروق کے ذریعہ زمین کے اندر اُتار دیا اور بغیر کسی پائپ لائن کے پوری زمین میں اس کا ایسا جال پھیلا دیا کہ جہاں چاہو زمین کھود کر پانی نکال لو مگر یہ پانی جو اس نے زمین کی اوپر ہی کی سطح پر رکھ دیا ہے جس کو چند فٹ یا گز زمین کھود کر نکالا جا سکتا ہے یہ مالک و خالق کا عطیہ ہے اگر وہ چاہے تو اس پانی کو زمین کے نیچے کی سطح پر اُتار دے جہاں تک تمہاری رسائی ممکن نہ ہو۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ، یعنی آپ ان لوگوں کو تبلا دیجئے کہ اس بات پر غور کریں کہ جو پانی کنوؤں کے ذریعہ بآسانی نکال کر پی رہے ہو اگر وہ پانی زمین کی گہرائی میں اُتر جائے تو تمہاری کونسی طاقت ہے جو اس جاری پانی کو حاصل کر سکے۔ حدیث میں ہے کہ جب آدمی یہ آیت تلاوت کرے تو اس کو کہنا چاہیئے اَللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ یعنی اللہ رب العالمین ہی پھر اس کو لا سکتا ہے ہماری کسی کی طاقت نہیں ؏

تمت سورۃ الملک بحمد اللہ فی ثالث رجب سنہ ۱۳۹۱ھ یوم الخمیس

سُورَةُ القَلَم

سُورَةُ الْقَلَمِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اِثْنَتَانِ وَخَمْسُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سُورۂ قلم مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی باون آیتیں ہیں اور اسمیں دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ① مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ② وَاِنَّ لَكَ

قسم ہے قلم کی اور جو کچھ لکھتے ہیں تو نہیں اپنے رب کے فضل سے دیوانہ اور تیرے واسطے

لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ③ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ④ فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ⑤

بدلہ ہے بے انتہا اور تو پیدا ہوا ہے بڑے خلق پر سو اب تو بھی دیکھ لیگا اور وہ بھی دیکھ لیں گے

بِاَيِّيْكُمُ الْمَفْتُوْنُ ⑥ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ

کہ کون ہے تم میں جو بچل رہا ہے بیشک تیرا رب وہی خوب جانے اُس کو جو بہکا اس کی راہ سے اور وہی

اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ⑦ فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ⑧ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ

خوب جانتا ہے راہ پانے والوں کو سو تو کہنا مت مان جھٹلانے والوں کا وہ چاہتے ہیں کسی طرح تو ڈھیلا

فَيُدْهِنُوْنَ ⑨ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ⑩ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ

ہو تو وہ بھی ڈھیلے ہوں اور تو کہا مت مان کسی قسمیں کھانے والے بے قدر کا طعنے دے چغلی کھاتا

بِنَمِيْمٍ ⑪ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ⑫ عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ⑬

پھرے، بھلے کام سے روکے حد سے بڑھے بڑا گنہگار اُجڈ ان سب کے پیچھے بدنام

اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ ⑭ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ

اسواسطے کہ رکھتا ہے مال اور بیٹے جب سُنائے اس کو ہماری باتیں کہے یہ نقلیں ہیں

الْاَوَّلِيْنَ ⑮ سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ ⑯ اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ

پہلوں کی اب داغ دیں گے ہم اس کو سونڈ پر ہم نے اُن کو جانچا ہے جیسے جانچا تھا

اَصۡحٰبَ الۡجَنَّةِ ۚ اِذۡ اَقۡسَمُوۡا لَيَصۡرِمُنَّهَا مُصۡبِحِيۡنَ ﴿۱۷﴾ وَلَا يَسۡتَثۡنُوۡنَ ﴿۱۸﴾

باغ والوں کو جب ان سب نے قسم کھائی کہ اسکا میوہ توڑیں گے صبح ہوتے اور انشاء اللہ نہ کہا

فَطَافَ عَلَيۡهَا طَآئِفٌ مِّنۡ رَّبِّكَ وَهُمۡ نَآئِمُوۡنَ ﴿۱۹﴾ فَاَصۡبَحَتۡ كَالصَّرِيۡمِ ﴿۲۰﴾

پھر پھیرا کر گیا اُس پر کوئی پھیرے والا تیرے رب کی طرف سے اور وہ سوتے ہی رہے پھر صبح تک ہو رہا جیسے ٹوٹ چکا

فَتَنَادَوۡا مُصۡبِحِيۡنَ ﴿۲۱﴾ اَنِ اغۡدُوۡا عَلٰى حَرۡثِكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰرِمِيۡنَ ﴿۲۲﴾

پھر آپس میں بولے صبح ہوتے کہ سویرے چلو اپنے کھیت پر اگر تم کو توڑنا ہے

فَانۡطَلَقُوۡا وَهُمۡ يَتَخَافَتُوۡنَ ﴿۲۳﴾ اَنۡ لَّا يَدۡخُلَنَّهَا الۡيَوۡمَ عَلَيۡكُمۡ مِّسۡكِيۡنٌ ﴿۲۴﴾

پھر چلے اور آپس میں کہتے تھے چپکے چپکے کہ اندر نہ آنے پائے اس میں آج تمھارے پاس کوئی محتاج

وَّغَدَوۡا عَلٰى حَرۡدٍ قٰدِرِيۡنَ ﴿۲۵﴾ فَلَمَّا رَاَوۡهَا قَالُوۡۤا اِنَّا لَضَآلُّوۡنَ ﴿۲۶﴾ بَلۡ

اور سویرے چلے لپکتے ہوئے زور کے ساتھ پھر جب اس کو دیکھا بولے ہم تو راہ بھول آئے نہیں

نَحۡنُ مَحۡرُوۡمُوۡنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ اَوۡسَطُهُمۡ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ لَوۡلَا تُسَبِّحُوۡنَ ﴿۲۸﴾ قَالُوۡا

ہماری تو قسمت پھوٹ گئی بولا بھلا اُن کا میں نے تم کو نہ کہا تھا کہ کیوں نہیں پاکی بولتے اللہ کی بولے

سُبۡحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ ﴿۲۹﴾ فَاَقۡبَلَ بَعۡضُهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ يَّتَلَاوَمُوۡنَ ﴿۳۰﴾ قَالُوۡا

پاک ذات ہے ہمارے رب کی ہم ہی تقصیر وار تھے پھر منہ کر کر ایک دوسرے کی طرف لگے اُلاہنا دینے بولے

يٰوَيۡلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا طٰغِيۡنَ ﴿۳۱﴾ عَسٰى رَبُّنَاۤ اَنۡ يُّبۡدِلَـنَا خَيۡرًا مِّنۡهَاۤ اِنَّاۤ اِلٰى

ہائے خرابی ہماری، ہم ہی تھے حد سے بڑھنے والے شاید ہمارا رب بدل دے ہم کو اس سے بہتر ہم اپنے رب سے

رَبِّنَا رٰغِبُوۡنَ ﴿۳۲﴾ كَذٰلِكَ الۡعَذَابُ ؕ وَلَعَذَابُ الۡاٰخِرَةِ اَكۡبَرُ ۘ لَوۡ كَانُوۡا

آرزو رکھتے ہیں یوں آتی ہے آفت اور آخرت کی آفت تو سب سے بڑی ہے اگر ان کو

يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۳﴾ اِنَّ لِلۡمُتَّقِيۡنَ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ جَنّٰتِ النَّعِيۡمِ ﴿۳۴﴾ اَفَنَجۡعَلُ

سمجھ ہوتی البتہ ڈرنے والوں کو ان کے رب کے پاس باغ ہیں نعمت کے کیا ہم کر دیں گے

الۡمُسۡلِمِيۡنَ كَالۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۳۵﴾ مَا لَـكُمۡ ۟ كَيۡفَ تَحۡكُمُوۡنَ ﴿۳۶﴾ اَمۡ لَـكُمۡ كِتٰبٌ

حکم برداروں کو برابر گناہگاروں کے کیا ہو گیا تم کو کیسے ٹھہراتے ہو بات کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے

فِيۡهِ تَدۡرُسُوۡنَ ﴿۳۷﴾ اِنَّ لَـكُمۡ فِيۡهِ لَمَا تَخَيَّرُوۡنَ ﴿۳۸﴾ اَمۡ لَـكُمۡ اَيۡمَانٌ

جسمیں پڑھ لیتے ہو اُس میں ملتا ہے تم کو جو تم پسند کرلو کیا تم نے ہم سے قسمیں لے لی ہیں

عَلَيۡنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ ۙ اِنَّ لَـكُمۡ لَمَا تَحۡكُمُوۡنَ ﴿۳۹﴾ سَلۡهُمۡ

ٹھیک پہنچنے والی قیامت کے دن تک کہ تم کو ملے گا جو کچھ تم ٹھہراؤ گے پوچھ ان سے

اَيُّهُمۡ بِذٰلِكَ زَعِيۡمٌ ﴿۴۰﴾ اَمۡ لَهُمۡ شُرَكَآءُ ۚ فَلۡيَاۡتُوۡا بِشُرَكَآئِهِمۡ اِنۡ

کونسا ان میں اسکا ذمہ لیتا ہے کیا اُن کے واسطے کوئی شریک ہیں پھر تو چاہیے لے آئیں اپنے اپنے شریکوں کو اگر وہ

كَانُوا صٰدِقِينَ ﴿٤١﴾ يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا

سچے ہیں جس دن کہ کھولی جائے پنڈلی اور وہ بُلائے جائیں سجدہ کرنے کو پھر

يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿٤٢﴾ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۖ وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ

نہ کر سکیں جھکی پڑتی ہوں گی اُن کی آنکھیں چڑھی آتی ہوگی ان پر ذلت اور پہلے اُن کو بُلاتے رہے

اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ ﴿٤٣﴾ فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ۖ

سجدہ کرنے کو اور وہ تھے اچھے خاصے اب چھوڑ دے مجھ کو اور اُن کو جو کہ جھٹلائیں اس بات کو

سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٤٤﴾ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۖ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿٤٥﴾

اب ہم سیڑھی سیڑھی اُتاریں گے اُن کو جہاں سے اُن کو پتہ بھی نہیں اور اُن کو ڈھیل دیئے جاتا ہوں۔ بیشک میرا داؤ پکا ہے

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴿٤٦﴾ اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ

کیا تو مانگتا ہے اُن سے کچھ حق سو اُن پر تاوان کا بوجھ پڑ رہا ہے کیا اُن کے پاس خبر ہے غیب کی سو وہ

يَكْتُبُوْنَ ﴿٤٧﴾ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ اِذْ نَادٰى

لکھ لاتے ہیں اب تو استقلال سے راہ دیکھتا رہ اپنے رب کے حکم کی اور مت ہو جیسا وہ مچھلی والا جب پکارا اس نے

وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ﴿٤٨﴾ لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ

اور وہ غصہ میں بھرا تھا اگر نہ سنبھالتا اس کو احسان تیرے رب کا تو پھینکا گیا ہی تھا چٹیل میدان میں الزام

مَذْمُوْمٌ ﴿٤٩﴾ فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٥٠﴾ وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ

کھا کر پھر نوازا اس کو اسکے رب نے پھر کر دیا اس کو نیکوں میں اور منکر تو لگ ہی رہے ہیں

كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ

کہ پھسلا دیں تجھ کو اپنی نگاہوں سے جب سنتے ہیں قرآن اور کہتے ہیں وہ تو

لَمَجْنُوْنٌ ﴿٥١﴾ وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٥٢﴾

باؤلا ہے اور یہ قرآن تو یہی نصیحت ہے سارے جہان والوں کو

وقف لازم

وقف لازم ع ۲ الربع

خلاصۂ تفسیر

نٓ (اس کے معنے اللہ ہی کو معلوم ہیں) قسم ہے قلم کی (جس سے مقادیر خلق لوح محفوظ پر لکھے گئے) اور (قسم ہے) ان (فرشتوں) کے لکھنے کی (جو کہ کاتب اعمال ہیں۔ حضرت ابن عباس رضؓ نے قلم اور ما یسطرون کی یہی تفسیر فرمائی ہے (درمنثور) آگے جواب قسم ہے) کہ آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہیں (جیسا منکرین نبوت کہتے ہیں (کذا فی الدرعن ابن جریج فی سبب النزول) مطلب یہ کہ آپ نبی برحق ہیں اور یہ قسمیں اس مُدعا کے نہایت مناسب ہیں کیونکہ منجملہ مقادیر کے نزولِ قرآن بھی ہے پس اس آیت میں

اشارہ ہے کہ نبوت آپ کی علم الٰہی میں پہلے ہی سے محقق و مؤکّد ہے پس ثبوت اسکا متیقن ہوا اور اعمال لکھنے والے فرشتے مصدقین و منکرین کے اعمال کو لکھ رہے ہیں پس انکار نبوت پر سزا ہوگی اس سے ڈر کر ایمان لانا واجب ہے) اور بیشک آپ کے لئے (اس تبلیغ احکام پر) ایسا اجر (ملنے والا) ہے جو (کبھی) ختم ہونے والا نہیں (اس میں بھی تقریر ہے نبوت کی جو مستلزم ہے نفی مطاعن کو اور تقریر نبوت کے ساتھ متضمن ہے تسلی کو بھی کہ آپ چند روز برداشت کر لیجئے کہ انجام اسکا اجر عظیم ہے) اور بیشک آپ اخلاق (حسنہ) کے اعلیٰ پیمانے پر ہیں (کہ ہر فعل آپ کا موصوف باعتدال اور قرین رضائے ایزد متعال ہے اور مجنون میں اخلاق کا کمال کہاں ہوتا ہے یہ بھی جواب ہے طعن مذکور کا آگے تسلیہ ہے یعنی یہ جو ایسے مہملات بکتے ہیں) سو (اسکا غم نہ کیجئے کیونکہ) عنقریب آپ بھی دیکھ لیں گے اور یہ لوگ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں کس کو جنون (حقیقی) تھا (یعنی جنون کی حقیقت ہے زوال عقل اور عقل کی غایت ہے ادراک نفع و ضرر اور ضرر معتدبہ وہ ہے جو ابدی ہو، پس قیامت میں ان کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ عاقل اہل حق تھے جنہوں نے اس نفع کو حاصل کیا اور مجنون یہ خود تھے جو اس نفع سے محروم رہ کر ضرر ابدی میں مبتلا ہوئے اور چونکہ) آپ کا پروردگار اس شخص کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ راہ (راست) پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے (اس لئے ہر ایک کو اس کے مناسب جزا و سزا دیگا اور اس جزا و سزا کے مناسب ہونے کو یہ منکرین بھی اسوقت سمجھ لیں گے جب حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ عاقل کون تھا مجنون کون، آگے ذم منکرین کا مضمون ہے کہ جب آپ حق پر ہیں اور یہ لوگ باطل پر ہیں) تو آپ ان تکذیب کرنے والوں کا کہنا نہ مانئے (جیسا کہ اب تک نہیں مانا، اور وہ کہنا وہ ہے جو آگے مفہوم ہوتا ہے یعنی) یہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ آپ (نعوذ باللہ اپنے منصبی کام میں کہ تبلیغ ہے ذرا) ڈھیلے ہو جاویں تو یہ بھی ڈھیلے ہو جائیں (آپ کا ڈھیلا ہونا یہ کہ بت پرستی کی مذمت نہ کریں، اور ان کا ڈھیلا ہونا یہ کہ آپ کی مخالفت نہ کریں۔ سورۂ کافرون کی تفسیر میں ابن عباس رضؓ نے ڈھیلے ہونے کا یہی مطلب بیان فرمایا ہے۔ درمنثور) اور آپ (بالخصوص) کسی ایسے شخص کا کہنا نہ مانیں جو بہت قسمیں کھانے والا ہو (مراد جھوٹی قسم کھانے والا ہے۔ عادۃً اکثر جھوٹے آدمی قسمیں بہت کھایا کرتے ہیں۔ اور جو اپنی حرکات شنیعہ کی وجہ سے عند اللہ و عند الخلق) بے وقعت ہو (دل دکھانے کے لئے) طعنہ دینے والا ہو چغلیاں لگاتا پھرتا ہو، نیک کام سے روکنے والا ہو حد (اعتدال) سے گزرنے والا ہو گناہوں کا (ارتکاب) کرنے والا ہو، سخت مزاج ہو (اور) اس (سب) کے علاوہ بدنام (بھی) ہو (مراد ولد الزنا اور مطلب یہ ہے کہ اور اخلاق و افعال بھی اس کے خبیث ہوں چونکہ غالباً ولد الزنا کے اخلاق و افعال اچھے نہیں ہوتے اس لئے مجازاً اس سے یہ مراد لیا گیا، خلاصہ یہ کہ اول تو مطلقاً مکذبین کا پھر خصوص جبکہ وہ مکذبین ان ذمائم کے ساتھ بھی متصف ہوں جیسا کہ آپ کے مکذبین میں سے بعض بڑے بڑے ایسے ہی تھے اور اس درخواست میں شریک بلکہ اسکے بانی تھے غرض آپ ایسے شخص کا کہنا نہ مانیئے اور وہ بھی محض) اس سبب سے کہ وہ مال اور اولاد والا ہو۔ (یعنی دنیا کی وجاہت رکھتا ہو اور ایسے شخص کی اطاعت سے اس لئے منع کیا جاتا ہے کہ اس شخص کی یہ

عادت ہے کہ) جب ہماری آیتیں اس کے سامنے پڑھ کر سُنائی جاتی ہیں تو وہ کہتا ہے یہ بے سند باتیں ہیں جو اگلوں سے منقول چلی آتی ہیں (مطلب یہ کہ آیات کی تکذیب کرتا ہے خلاصہ یہ کہ اُن کی اطاعت سے منع کرنے کی اصل علّت ان کی تکذیب ہے اور اسی بنا پر اول لَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ فرمایا گیا پھر بطور تخصیص بعد تعمیم کے ان مکذبین میں سے ایسے لوگوں کی اطاعت سے ممانعت کی گئی جو علاوہ تکذیب کے اور بُری عادتیں بھی رکھتے ہوں ایسوں کی اطاعت سے ممانعت مطلق مکذّبین کی اطاعت کی ممانعت سے اور زیادہ اشد ہوگی لیکن اصل عِلّت وہی تکذیب رہے گی آگے ایسے شخص کی سزا کا بیان ہے کہ) ہم عنقریب اس کی ناک پر داغ لگا دیں گے۔ (یعنی قیامت میں اس کے چہرے اور ناک پر اس کے کفر کی وجہ سے کوئی علامت ذلت اور پہچان کی لگا دیں گے جس سے وہ خوب رُسوا ہو۔ حدیث مرفوع میں ایسا ہی وارد ہے کمافی الدر المنثور۔ آگے اہلِ مکہ کو ایک قصہ سُنا کر اُن کو وبال سے ڈرایا گیا ہے) ہم نے (جو ان اہلِ مکہ کو سامان عیش دے رکھا ہے جس پر یہ مغرور ہو رہے ہیں تو ہم نے) ان کی آزمائش کر رکھی ہے (کہ دیکھیں یہ نعمتوں کے شکر میں ایمان لاتے ہیں یا ناشکری و بیقدری کر کے کفر کرتے ہیں) جیسا (ان سے پہلے نعمتیں دے کر) ہم نے باغ والوں کی آزمائش کی تھی (یہ باغ بقول ابن عباس رضؓ ملک حبشہ میں تھا اور بقول سعید بن جبیر رحؒ یمن میں، کذافی الدر المنثور اور یہ قصہ اہلِ مکہ میں مشہور معروف تھا اور جن باغ والوں کا یہ قصہ ہے اُن کے باپ کا اپنے وقت میں معمول تھا کہ ایک بڑا حصّہ اس باغ کے پھل کا مساکین میں صرف کیا کرتا تھا جب وہ مرگیا تو ان لوگوں نے کہا کہ ہمارا باپ احمق تھا کہ اسقدر آمدنی مسکینوں کو دے دیتا تھا اگر یہ سب آوے کسقدر فراغت ہو چنانچہ ان آیتوں میں ان کا بقیہ قصہ مذکور ہے یعنی یہ واقعہ آئندہ اس وقت ہوا) جبکہ ان لوگوں نے (یعنی اکثر یا بعض نے لقولہ تعالیٰ قَالَ اَوْسَطُهُمْ) باہم قسم کھائی کہ اس (باغ) کا پھل ضرور صبح چل کر توڑ لیں گے اور (ایسا وثوق ہوا کہ) انھوں نے انشاء اللہ بھی نہیں کہا سو اس باغ پر آپکے رب کی طرف سے ایک پھرنے والا (عذاب) پھر گیا (اور وہ ایک آگ تھی۔ کذافی الدر عن ابن جریج، خواہ خالص آگ ہو یا ہوا میں ملی ہوئی ہو جیسے لُو) اور وہ سو رہے تھے پھر صبح کو وہ باغ ایسا رہ گیا جیسے کٹا ہوا کھیت (کہ خالی زمین رہ جاتی ہے اور بعض جگہ کاٹ کر جلا بھی دیا جاتا ہے مگر ان کو اس کی کچھ خبر نہیں تھی) سو صبح کے وقت (سو کر جو اُٹھے تو) ایک دوسرے کو پُکارنے لگے کہ اپنے کھیت پر سویرے چلو اگر تم کو پھل توڑنا ہے (کھیت یا تو مجازاً کہدیا ہو یا اسمیں ایسی چیزیں بھی ہوں جو تنہ دار نہیں ہوتیں جیسے انگور وغیرہ یا کہ اس باغ کے متعلق کھیت بھی ہو) پھر وہ لوگ آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے چلے کہ آج تم تک کوئی محتاج نہ آنے پاوے اور (بزعم خود) اپنے کو اس کے نہ دینے پر قادر سمجھ کر چلے (کہ سب پھل گھر لے آدیں گے اور کسی کو نہ دیں گے، کذا فی الدر عن ابن عباسؓ) پھر جب (وہاں پہنچے اور) اس باغ کو (اس حالت میں) دیکھا تو کہنے لگے کہ بیشک ہم رستہ بھول گئے (اور کہیں نکل آئے کیونکہ یہاں تو باغ داغ یہ کچھ بھی نہیں پھر جب موقع و

حدود کو دیکھ کر یقین کیا کہ وہی جگہ ہے تو اس وقت کہنے لگے کہ بھولے نہیں) بلکہ (جگہ تو وہی ہے لیکن) ہماری قسمت ہی پھوٹ گئی (کہ باغ کا یہ حال ہوگیا) ان میں جو (کسی قدر) اچھا آدمی تھا وہ کہنے لگا کہ کیوں میں نے تم کو کہا نہ تھا (کہ ایسی نیت مت کرو، مساکین کے دینے سے برکت ہوتی ہے اسی لئے اس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اچھا کہا مگر عملاً یہ شخص بھی باوجود کراہت قلب کے سب کے ساتھ شریک ہوگیا تھا اسلئے احقر نے لفظ کسی قدر بڑھا دیا لان الاوسط امر اضافی۔ پھر پہلی بات کو یاد دلا کر اس شخص نے کہا کہ اپنی شامتِ اعمال تو بھگت لی مگر) اب (توبہ اور) تسبیح (وتقدیس) کیوں نہیں کرتے (تاکہ وہ گناہ معاف ہو اور اس سے زیادہ وبال نہ آجاوے) سب (توبہ کے طور پر) کہنے لگے کہ ہمارا پروردگار پاک ہے (یہ تنزیہ ہے جو استغفار کی تمہید ہے) بیشک ہم قصوروار ہیں (یہ استغفار ہے) پھر ایک دوسرے کو مخاطب بناکر باہم الزام دینے لگے (جیسا کام بگڑنے کے وقت اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ ہر شخص دوسرے کو رائے فاسدہ کا ذمہ دار بتلایا کرتا ہے پھر سب متفق ہوکر) کہنے لگے کہ بیشک ہم (سب ہی) حد سے نکلنے والے تھے (کسی ایک کی خطا نہ تھی ایک دوسرے پر الزام بیکار ہے سب ملکر توبہ کرلو) شاید (توبہ کی برکت سے) ہمارا پروردگار ہم کو اس سے اچھا باغ بدلے میں دیدے (اب ہم اپنے رب کی طرف رجوع ہوتے ہیں (یعنی توبہ کرتے ہیں اور بدلنا عام ہے خواہ دُنیا میں نعم البدل ملجاوے خواہ آخرت میں اور ظاہر اً معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ مومن تھے مرتکب معصیت ہوئے تھے اور یہ بات کہیں سند کے ساتھ نظر سے نہیں گزری کہ آیا اس باغ کے عوض ان کو دُنیا میں کوئی باغ ملا یا نہیں، البتہ بلا سند روح المعانی میں ابن مسعودؓ کا قول لکھا ہے کہ اس سے اچھا باغ ان کو عطا کیا گیا واللہ اعلم۔ آگے قصہ کی غرض یعنی تحذیر کی تصریح ہے کہ خلاف حکم کرنے پر) اسی طرح عذاب ہوا کرتا ہے (جب ہوا کرتا ہے یعنی اے اہلِ مکہ تم بھی ایسے عذاب کے مستحق ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ کے کیونکہ عذاب مذکور تو محض معصیت پر تھا اور تم تو کفر کرتے ہو) اور آخرت کا عذاب اس (عذابِ دنیوی) سے بھی بڑھ کر ہے کیا خوب ہوتا کہ یہ لوگ (اس بات کو) جان لیتے (تاکہ ایمان لے آتے۔ آگے ان سزاؤں کی تحقیق کے لئے کفار کے خیال باطل کا ابطال فرماتے ہیں کہ وہ کہتے تھے لَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى۔ یعنی) بیشک پرہیزگاروں کے لئے ان کے رب کے نزدیک آسائش کی جنتیں ہیں (یعنی سبب دخولِ جنّت کا تقویٰ ہے اور اس سے کافر عاری ہیں تو اُن کو جنّت کیسے مِل جاوے گی) کیا ہم فرمانبرداروں کو نافرمانبرداروں کے برابر کردیں گے (یعنی اگر کافروں کو نجات ہو تو فرمانبرداروں اور نافرمانوں میں کیا فرق وامتیاز رہ جاوے گا جس سے فرمانبرداروں کی فضیلت ثابت ہو۔ کقولہ تعالیٰ فی صٓ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ الخ) تم کو کیا ہوا تم کیسا فیصلہ کرتے ہو کیا تمہارے پاس کوئی (آسمانی) کتاب ہے جسمیں پڑھتے ہو کہ اسمیں تمہارے لئے وہ چیز (لکھی) ہو جو تم پسند کرتے ہو یعنی اس میں لکھا ہو کہ تم کو آخرت میں حُسنیٰ یعنی نعمت ملے گی) کیا ہمارے ذمہ کچھ قسمیں چڑھی ہوئی ہیں جو تمہارے لئے کھائی گئی ہوں اور وہ قسمیں

قیامت تک باقی رہنے والی ہوں (جن کا یہ مضمون ہو) کہ تم کو وہ چیزیں ملیں گی جو تم فیصلہ کر رہے ہو (یعنی ثواب اور جنت) ان سے پوچھئے ان میں اسکا کون ذمہ دار ہے کیا ان کے ٹھہرائے ہوئے کچھ شریک (خدائی) ہیں (کہ انھوں نے ان کو ثواب دینے کا ذمہ لیا ہے) سو ان کو چاہیئے کہ یہ اپنے ان شریکوں کو پیش کریں اگر یہ سچے ہیں (غرض جب یہ مضمون کسی آسمانی کتاب میں نہیں ویسے بلا کتاب دوسرے طرق وحی سے ہمارا وعدہ نہیں جو مثل قسم کے ہوتا ہے پھر ایسی حالت میں کون شخص ان میں سے یا ان کے شرکار میں سے ذمہ داری کر سکتا ہے ہرگز نہیں، پھر دعویٰ کس بنا پر ہے۔ آگے ان لوگوں کی قیامت کی رُسوائی کا ذکر ہے وہ دن یاد کرنے کے قابل ہے) جس دن کہ ساق کی تجلّی فرمائی جاوے گی اور سجدہ کی طرف لوگوں کو بلایا جاویگا (اسکا قصہ حدیث شیخین میں مرفوعاً اس طرح آیا ہے کہ حق تعالیٰ قیامت کے میدان میں اپنی ساق ظاہر فرماویگا۔ ساق کہتے ہیں پنڈلی کو، اور یہ کوئی خاص صفت ہے جس کو کسی مناسبت سے ساق فرمایا جیسا قرآن میں ہاتھ آیا ہے اور ایسے مفہومات متشابہات کہلاتے ہیں اور اسی حدیث میں ہے کہ اس تجلّی کو دیکھ کر تمام مؤمنین مومنات سجدے میں گر پڑیں گے مگر جو شخص ریا سے سجدہ کرتا تھا اس کی کمر تختہ کی طرح رہ جاویگی سجدہ نہ کر سکے گا۔ اور سجدے کی طرف بُلائے جانے سے یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ وہ دار التکلیف نہیں ہے کیونکہ بُلائے جانے سے مراد امر بالسجود نہیں ہے بلکہ اس تجلّی میں یہ اثر ہوگا کہ سب بالاضطرار سجدہ کرنا چاہیں گے جن میں مومن اس بات پر قادر ہو جائیں گے اور اہلِ ریا و نفاق قادر نہ ہونگے اور کفار کا قادر نہ ہونا اس سے بدرجۂ اولیٰ مفہوم ہوتا ہے جسکا آگے ذکر ہے یعنی کفار بھی سجدہ کرنا چاہیں گے) سو یہ (کافر) لوگ سجدہ نہ کر سکیں گے (اور) انکی آنکھیں (مارے شرمندگی کے) جھکی ہونگی (اور) ان پر ذلت چھائی ہوگی اور (وجہ اس کی یہ ہے کہ) یہ لوگ (دنیا میں) سجدہ کیطرف بُلائے جایا کرتے تھے (اس طرح کہ ایمان لاکر عبادت کریں) اور وہ صحیح سالم تھے (یعنی سجدہ پر قادر بھی تھے چنانچہ ظاہر ہے کہ ایمان و عبادت فعل اختیاری ہے بس دنیا میں امتثال امر نہ کرنے سے آج ان کو یہ رُسوائی و ذلّت ہوئی اور دوسری آیت میں جو نگاہ کا اوپر اُٹھا رہنا آیا ہے وہ اس کے معارض نہیں کیونکہ گاہے غلبہ حیرت سے ایسا ہوگا اور گاہے غلبہ ندامت سے ایسا ہوگا، آگے کفار کے اس خیال کا رد ہے کہ عذاب میں دیر ہونے کو اپنے مقبول ہونے کی دلیل سمجھتے تھے اور اس کے ضمن میں آپ کی تسلّی بھی ہے، یعنی جب انکا مستحق عذاب ہونا اُوپر کی آیتوں سے معلوم ہو چکا) تو مجھ کو اور جو اس کلام کو جھٹلاتے ہیں اُن کو (اس حال موجودہ پر رہنے دیجئے (یعنی عذاب میں دیر ہونے سے رنج نہ کیجئے) ہم ان کو بتدریج (جہنّم کی طرف) لئے جا رہے ہیں، اس طور پر کہ ان کو خبر بھی نہیں اور (دُنیا میں اُن پر عذاب نہ ڈالنے سے) اُن کو مہلت دیتا ہوں بیشک میری تدبیر بڑی مضبوط ہے (آگے ان کے انکار نبوت پر تعجیب ہے) کیا آپ ان سے کچھ معاوضہ مانگتے ہیں کہ وہ اس تاوان سے دبے جاتے ہیں (اس لئے آپ کی اطاعت سے نفرت ہے وہٰذا کقولہ تعالیٰ اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا) یا ان کے پاس غیب (کا علم) ہے کہ یہ (اس کو محفوظ رکھنے کے واسطے) لکھ لیا کرتے ہیں (یعنی کیا ان کو احکام

خداوندی خود کسی طریقے سے معلوم ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ صاحب وحی کے اتباع سے مستغنی ہیں اور ظاہر ہے کہ دونوں امر نہیں ہیں پھر انکارِ نبوت عجیب ہے آگے آپ کا تسلیہ ہے، جب ان کا استحقاق عذاب اور کفر جو موجب استحقاق ہے معلوم ہو گیا اور یہ کہ ان کی مہلت استدراج یعنی ایک قسم کی ڈھیل ہے اور وقت موعود پر عذاب ہوگا) تو آپ اپنے رب کی (اس) تجویز پر صبر سے بیٹھے رہیے اور (تنگدلی میں) مچھلی (کے پیٹ میں جانے) والے (پیغمبر یونس علیہ السلام) کی طرح نہ ہو جیے (کہ وہ عذاب نازل نہ ہونے سے تنگدل ہوئے اور کہیں چلے گئے جس کا قصہ کئی جگہ تھوڑا تھوڑا آچکا ہے مضمون مقصود تشبیہ کا تو ختم ہو چکا، آگے بطور تتمیم قصد کے ارشاد ہے کہ وہ وقت بھی یاد کیجیے) جبکہ یونس (علیہ السلام) نے (اپنے رب سے) دُعا کی اور وہ غم سے گھٹ رہے تھے (یہ غم مجموعہ تھا کئی غموں کا ایک قوم کے ایمان نہ لانے کا۔ ایک عذاب کے ٹل جانے کا۔ ایک بلا اذن صریح حق تعالیٰ کے وہاں سے چلے آنے کا۔ ایک مچھلی کے پیٹ میں محبوس ہونیکا اور وہ دُعا یہ ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ جس سے مقصود معافی اور طلب نجات عن الحبس ہے چنانچہ اس پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا اور مچھلی کے پیٹ سے نجات ہوئی اسی کی نسبت ارشاد ہے کہ) اگر خداوندی احسان ان کی دستگیری نہ کرتا تو وہ (جس میدان میں مچھلی کے پیٹ سے نکال کر ڈال دیئے گئے تھے اس) میدان میں بدحالی کے ساتھ ڈالے جاتے (دستگیری سے مراد قبول توبہ ہے اور بدحالی سے مراد یہ کہ ان کی اجتہادی غلطی پر منجانب اللہ ان کو ملامت ہوئی حاصل اسکا اور آیت سورۂ صافات کا یہ ہے کہ اگر یہ توبہ و استغفار نہ کرتے تب تو شکم ماہی سے نجات ہی نہ ہوتی کما قال فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ الخ

اور اگر توبہ و استغفار کرتے مگر اللہ تعالیٰ قبول نہ فرماتا تو اس توبہ استغفار کی اسقدر دُنیوی برکت تو ہوتی کہ شکم ماہی سے نجات ہو جاتی اور میدان میں جس طرح اب ڈالے گئے اسی طرح ڈالے جاتے لیکن اسوقت وہ ڈالا جانا مذموم ہوتا اور اب کا ڈالا جانا مذموم ہونے کی حالت میں نہیں ہوا کیونکہ قبول توبہ کے بعد خطا پر مذمت و ملامت نہیں ہوا کرتی) پھر ان کے رب نے ان کو (اور زیادہ) برگزیدہ کر لیا اور ان کو (زیادہ رتبہ کے) صالحین میں سے کر دیا (شاید اس تتمیم قصہ سے یہ بھی مقصود ہو کہ اپنے اجتہاد پر عمل کرنا ان کو کیسا مضر ہوا اور توکل کیسا نافع ہوا اسی طرح عذاب کے بارے میں آپ بھی اپنی رائے سے جلدی نہ کیجیے بلکہ اللہ تعالیٰ پر توکل کیجیے کہ انجام بہتر ہوگا) اور (آگے آپ کی شان میں کفار کے مجنون کہنے کا ایک دوسرے انداز میں ابطال ہے شروع سورت میں اور انداز سے اس کو باطل کیا گیا تھا یعنی) یہ کافر جب قرآن سُنتے ہیں تو (شدت عداوت سے) ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ گویا آپ کو اپنی نگاہوں سے پھسلا کر گرا دیں گے (یہ ایک محاورہ ہے جیسے بولتے ہیں کہ فلاں شخص اس طرح دیکھتا ہے جیسے کھا جائے گا کما فی روح المعانی نظر الیّ نظرا یکاد یصرعنی او یکاد یاکلنی، مطلب یہ کہ شدت عداوت سے آپ کو بُری بُری نگاہوں سے دیکھتے ہیں) اور (اسی عداوت سے آپ کی نسبت) کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) یہ مجنون ہیں حالانکہ یہ قرآن (جس کے

ساتھ آپ تکلّم فرماتے ہیں) تمام جہان کے واسطے نصیحت ہے (اور مجنون آدمی کے متعلق ایسی اصلاح عام نہیں ہوسکتی اس میں تو جواب طعن جنون ظاہر ہے اور بیان عداوت سے بھی اس طعن کا ضعیف ہونا ثابت ہوگیا کیونکہ جس قول کا منشا شدّت عداوت ہو وہ قابلِ التفات نہیں)

معارف و مسائل

سُورۂ مُلک میں اللہ تعالیٰ کے وجود اور توحید اور علم و قدرت کے دلائل مشاہدۂ کائنات سے بیان ہوئے ہیں اور کفار و منکرین پر عذابِ شدید کا ذکر ہے۔ سورۂ نون میں کفّار کے اُن مطاعن کا جواب ہے جو وہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر کیا کرتے تھے۔ سب سے پہلا اُن کا طعنہ یہ تھا کہ اللہ کے بھیجے ہوئے کامل العقل کامل العلم جامع الفضائل رسُول کو معاذ اللہ مجنون کہتے تھے، یا اسوجہ سے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر جو وحی فرشتہ کے ذریعہ نازل ہوتی تھی بوقتِ وحی اُس کے آثار آپکے جسم مبارک پر دیکھے جاتے تھے، پھر آپ وحی سے حاصل شدہ آیات پڑھ کر سُناتے تھے یہ معاملہ کفار کے فہم و ادراک سے باہر تھا اسلئے اس کو جنون قرار دیدیا۔ اور یا اسوجہ سے کہ آپ نے اپنی قوم اور پُوری دُنیا کے عقائدِ موجودہ کے خلاف یہ دعویٰ کیا کہ عبادت کے قابل اللہ کے سوا کوئی نہیں، جن خود تراشیدہ بتوں کو وہ خدا سمجھتے تھے، اُن کا بے علم و شعور ناقابل نفع و ضرر ہونا بیان کیا، آپکے اس عقیدہ کا کوئی ساتھی نہ تھا آپ اکیلے یہ دعویٰ لے کر بغیر کسی ظاہری ساز و سامان کے ساری دُنیا کے مقابلہ میں کھڑے ہوگئے۔ ظاہر بیں نظروں میں اسکی کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا ایسے دعوے کو لیکر کھڑا ہونا جنون سمجھا گیا اور بغیر کسی سبب کے بھی بعض طعن برائے طعن ہوسکتا ہے کہ مجنون کہتے ہوں، سورۂ نون کی ابتدائی آیتوں میں اُن کے اس خیالِ باطل کی تردید قسم کے ساتھ مؤکد کر کے بیان فرمائی ہے۔

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝ حرف نون حروف مقطعہ میں سے ہے جو قرآن کریم کی بہت سی سورتوں کے شروع میں لائے گئے ہیں، ان کے معنی اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں، یا اس کے رسُول صلے اللہ علیہ وسلم کو، اُمت کو اُس کی تحقیق میں پڑنے سے روکدیا گیا ہے۔

قلم سے کیا مُراد ہے اور قلم کی فضیلت وَالْقَلَمِ میں واؤ حرفِ قسم ہے اور قلم سے مراد عام قلم بھی ہوسکتا ہے جس میں قلم تقدیر اور فرشتوں اور انسانوں کے سب قلم جن سے کچھ لکھا جاتا ہے سب داخل ہیں (کما ہو قول ابی حاتم البستی) اور خاص قلم تقدیر بھی مراد ہوسکتا ہے (کما ہو قول ابن عباس رضؓ) اور اس قلم تقدیر کے متعلق حضرت عبادہ بن الصّامت رضؓ کی روایت میں ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم پیدا کیا اور اُس کو حکم دیا کہ لکھ، قلم نے عرض کیا، کیا لکھوں تو حکم دیا کہ تقدیر الٰہی کو قلم نے (حکم کے مطابق) ابد تک ہونے والے تمام واقعات اور حالات کو لکھدیا۔ (رواہ الترمذی وقال ہذا حدیث غریب) اور صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ کی حدیث ہے

کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ " اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کی تقدیر کو آسمان و زمین کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے لکھدیا تھا۔

اور حضرت قتادہ رح نے فرمایا کہ قلم اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت ہے جو اُس نے اپنے بندوں کو عطا فرمائی ہے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ایک قلم، قلمِ تقدیر پیدا فرمایا جس نے تمام کائنات و مخلوقات کی تقدیریں لکھدیں۔ پھر دوسرا قلم پیدا فرمایا جس سے زمین پر بسنے والے لکھتے ہیں اور لکھیں گے اس دوسرے قلم کا ذکر سُورۂ اقرار میں آیا ہے عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، واللہ اعلم

آیت میں اگر قلم سے مراد قلم تقدیر لیا جائے جو سب سے پہلی مخلوق ہے تو اُس کی عظمت اور تمام چیزوں پر ایک برتری ظاہر ہے اس لئے اس کی قسم کھانا مناسب ہوا، اور اگر قلم سے مراد عام قلم لیئے جاویں جسمیں قلم تقدیر اور فرشتوں کے اقلام کے علاوہ انسانوں کے قلم بھی داخل ہیں تو اس کی قسم اس لئے کھائی گئی کہ دُنیا میں بڑے بڑے کام سب قلم ہی سے ہوتے ہیں۔ ملکوں کی فتوحات میں تلوار سے زیادہ قلم کا مؤثر ہونا منقول و معروف ہے ابو حاتم بستی نے اسی مضمون کو دوشعروں میں فرمایا ہے۔

اذا اقسم الابطال یوما بسیفهم | وعدّوہ مما یکسب المجد والکرم

جب کہ قسم کھائیں بہادر لوگ کسی دن اپنی تلوار کی | اور اس کو شمار کریں ان چیزوں میں جو انسان کو عزت و شرف بخشتی ہیں

کفیٰ قلم الکتاب عزا و رفعة | مدی الدهر ان اللہ اقسم بالقلم

تو کافی ہے لکھنے والوں کا قلم اُن کی عزت و برتری کے لئے | ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے کیونکہ اللہ نے قسم کھائی ہے قلم کی۔

بہرحال اس آیت میں قلم تقدیر یا عام قلم خلائق کی اور پھر لفظ مَا یَسْطُرُوْنَ میں جو کچھ ان قلموں سے لکھا گیا یا لکھا جائے گا اُس کی قسم کھا کر حق تعالیٰ نے کفار کے اس طعنہ باطلہ کا رد فرمایا کہ آپ مجنون ہیں ارشاد ہوا مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ، یعنی آپ اپنے رب کی نعمت و فضل کی وجہ سے ہرگز مجنون نہیں اسمیں بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بڑھا کر دعویٰ کی دلیل بھی دیدی کہ جس شخص پر اللہ تعالیٰ کی نعمت و رحمت مکمل ہو وہ کیسے مجنون ہو سکتا ہے اُس کو مجنون کہنے والا خود مجنون ہے۔

فائدہ علماء نے فرمایا ہے کہ قرآن کریم میں حق تعالےٰ جس چیز کی قسم کھاتے ہیں وہ مضمون قسم پر ایک شہادت ہوتی ہے یہاں مایسطرون کے لفظ سے دُنیا کی تاریخ میں جو کچھ لکھا گیا اور لکھا جا رہا ہے اس کو بطور شہادت پیش کیا ہے کہ دُنیا کی تاریخ کو دیکھو ، ایسے اعلیٰ اخلاق و اعمال والے کہیں مجنون ہوتے ہیں وہ تو دوسروں کی عقل درست کرنے والے ہوتے ہیں۔ آگے مضمون مذکور کی مزید تائید کے لئے فرمایا،

وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۝ (اور بیشک آپ کے لئے اجرِ عظیم ہے جو کبھی منقطع ہونے والا نہیں) مطلب یہ ہے کہ آپ کے جس کام کو یہ دیوانے جنون کہہ رہے ہیں وہ تو اللہ کے نزدیک سب سے بڑا مقبول عمل ہے اس پر آپ کو اجرِ عظیم ملنے والا ہے اور اجر بھی ایسا جو دائمی ہے کبھی منقطع نہیں ہوگا کہیں کسی مجنون کے عمل پر بھی مجنون کو اجر

ملا کرتا ہے۔ آگے اسی مضمون کی مزید تائید و تاکید اس جملے سے فرما دی۔

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ، اس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ فاضلہ کاملہ میں غور کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے کہ دیوانو ذرا تو دیکھو کہیں مجنونوں دیوانوں کے ایسے اخلاق و اعمال ہوا کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا خُلقِ عظیم | حضرت ابن عباس رضؓ نے فرمایا کہ خلق عظیم سے مراد دین عظیم ہے کہ اللہ کے نزدیک اس دینِ اسلام سے زیادہ کوئی محبوب دین نہیں۔ حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا کہ آپکا خلق خود قرآن ہے یعنی قرآن کریم جن اعلیٰ اعمال و اخلاق کی تعلیم دیتا ہے آپ اُن سب کا عملی نمونہ ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ خلق عظیم سے مراد آدابِ القرآن ہیں یعنی وہ آداب جو قرآن نے سکھائے ہیں۔ حاصل سب کا تقریباً ایک ہی ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود میں حق تعالیٰ نے تمام ہی اخلاق فاضلہ بدرجہ کمال جمع فرما دیئے تھے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بعثت لاتمم مکارم الاخلاق یعنی مجھے اس کام کے لئے بھیجا گیا ہے کہ میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کروں (ابو حیّان)

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دس سال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی اس پوری مدّت میں جو کام میں نے کیا آپ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ ایسا کیوں کیا اور جو کام نہیں کیا اُس پر کبھی یہ نہیں فرمایا کہ یہ کام کیوں نہیں کیا (حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ دس سال کی مدت میں خدمت کرنے والے کے بہت سے کام خلاف طبع ہوئے ہونگے) (بخاری ومسلم)

اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آپکے مکارمِ اخلاق کا یہ حال تھا کہ مدینہ کی کوئی لونڈی باندی بھی آپ کا ہاتھ پکڑ کر جہاں لیجانا چاہے لیجا سکتی تھی (رواہ البخاری)

حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنے ہاتھ سے کسی کو نہیں مارا بجز جہاد فی سبیل اللہ کے کہ اسمیں کفار کو مارنا اور قتل کرنا ثابت ہے ورنہ آپ نے نہ کسی خادم کو نہ کسی عورت کو کبھی مارا، اُن میں سے کسی سے خطا و لغزش بھی ہوئی تو اسکا انتقام نہیں لیا بجز اسکے کہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی ہو تو اُس پر شرعی سزا جاری فرمائی (رواہ مسلم)

حضرت جابر رضؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کبھی کسی چیز کا سوال نہیں کیا گیا جس کے جواب میں آپ نے نہیں فرمایا ہو (بخاری ومسلم)

اور حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نہ فحش گو تھے نہ فحش کے پاس جاتے تھے نہ بازاروں میں شور و شغب کرتے تھے بُرائی کا بدلہ کبھی بُرائی سے نہیں دیتے تھے بلکہ معافی اور درگزر کا معاملہ فرماتے تھے۔ اور حضرت ابوالدرداء رضؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میزان عمل میں خلق حسن کی برابر کسی عمل کا وزن نہیں ہوگا، اور اللہ تعالے گالی گلوچ کرنے والے بدزبان سے بغض رکھتے ہیں (رواہ الترمذی وقال حدیث حسن صحیح)

اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مُسلمان اپنے حُسنِ خلق کی بدولت اُس شخص کا درجہ حاصل کرلیتا ہے جو ہمیشہ رات کو عبادت میں جاگتا اور دن بھر روزہ رکھتا ہو (رواہ ابوداؤد)

اور حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ مجھے یمن کا عامل مقرر کرکے بھیجنے کے وقت) آخری وصیت جو آپ نے مجھے اسوقت فرمائی جبکہ میں اپنا ایک پاؤں رکاب میں رکھ چکا تھا وہ یہ تھی یَامُعَاذُ اَحْسِنْ خُلُقَكَ لِلنَّاسِ (اے معاذ لوگوں سے حُسن خلق کا برتاؤ کرو۔ رواہ مالک) یہ سب روایات حدیث تفسیر مظہری سے نقل کی گئی ہیں۔

فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُونَ ۝ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُونُ (عنقریب آپ بھی دیکھ لیں گے اور یہ کفار بھی دیکھ لیں گے تم میں کون مجنون ہے) مفتون اس جگہ بمعنے مجنون ہے۔ پچھلی آیات میں آپکو مجنون کہنے والوں کے طعنہ کو دلائل سے رد کیا گیا تھا اس آیت نے پیش گوئی کے طور پر یہ بتلایا کہ یہ بات یوں ہی ڈھکی چھپی رہنے والی نہیں ہے قریب آنے والے وقت میں سب آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ معاذاللہ آپ مجنون تھے یا آپ کو مجنون کہنے والے پاگل دیوانے تھے چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں یہ بات کھُل کر دُنیا کے سامنے آگئی اور انھیں مجنون کہنے والوں میں سے ہزاروں حلقہ بگوش اسلام ہو کر آپکے اتباع و محبت کو سرمایہ سعادت سمجھنے لگے۔ اور بہت سے اشقیا جن کو توفیق نہیں ہوئی وہ دنیا میں بھی ذلیل وخوار ہوئے۔

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ، یعنی آپ ان جھٹلانے والوں کی بات نہ مانیں یہ تو یوں چاہتے ہیں کہ آپ کچھ تبلیغ احکام میں نرم پڑ جائیں اور شرک و بُت پرستی سے ان کو روکنا چھوڑ دیں تو یہ بھی نرم پڑ جائیں کہ آپ پر طعن تشنیع اور آپ کی ایذارسانی چھوڑ دیں (قالہ ابن عباسؓ۔ قرطبی)

مسئلہ۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار و فجار کے ساتھ یہ سودا کرلینا کہ ہم تمھیں کچھ نہیں کہتے تم ہمیں کچھ نہ کہو، یہ مداہنت فی الدین اور حرام ہے (مظہری) یعنی بلا کسی اضطرار و مجبوری کے ایسا معاہدہ جائز نہیں۔

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ ۝ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝ عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ۝ (آپ بات نہ مانیں ہر ایسے شخص کی جو بہت قسمیں کھانیوالا ہو ذلیل ہو اور لوگوں پر عیب لگانے والا غیبت کرنے والا ہو چغلخوری کرنے والا ہو، نیک کاموں سے لوگوں کو روکنے والا ظلم وجور میں حد سے بڑھنے والا ہو بکثرت گناہ کرنے والا اور بہت قسمیں کھانے والا کج خلق بخیل ہو اور ان سب صفاتِ رذیلہ کے ساتھ وہ زنیم بھی ہو۔ زنیم کے معنے وہ شخص جسکا نسب کسی باپ سے ثابت نہ ہو۔ جس شخص کے یہ اوصاف بیان کئے گئے ہیں وہ ایسا ہی غیر ثابت النسب تھا۔

پہلی آیت میں عام کفار کی بات نہ ماننے اور دین کے معاملے میں ان کی وجہ سے کوئی مداہنت نہ کرنے کا عام حکم تھا اس آیت میں ایک خاص شریر کافر ولید بن مغیرہ کی صفاتِ رذیلہ بیان کرکے اُس سے اعراض کرنے اور اُس کی بات نہ ماننے کا خصوصی حکم دیا گیا ہے (کما رواہ ابن جریر عن ابن عباسؓ) آگے بھی کئی آیتوں میں اس شخص کی بداخلاقی اور سرکشی کا ذکر فرمانے کے بعد فرمایا سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ یعنی

ہم قیامت کے روز اس کی ناک پر داغ لگا دینگے جس سے اولین و آخرین میں اُس کی رُسوائی ظاہر ہو جائیگی اس کی ناک کو بغرض تقبیح خرطوم سے تعبیر کیا گیا ہے جو ہاتھی یا خنزیر کی ناک کے لئے مخصوص ہے۔

اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ (یعنی ہم نے آزمائش میں ڈالا ان (اہل مکہ) کو جس طرح آزمائش میں ڈالا تھا باغ والوں کو) سابقہ آیات میں کفار اہل مکہ کی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر طعن و تشنیع کا جواب تھا۔ ان آیات میں حق تعالیٰ نے پچھلے زمانے کا ایک قصہ ذکر کر کے اہل مکہ کو تنبیہ فرمائی اور عذاب سے ڈرایا۔ اہل مکہ کو آزمائش میں ڈالنے سے یہ مراد بھی ہو سکتی کہ جس طرح آئندہ آنے والے قصہ میں باغ والوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں سے سرفراز فرمایا انھوں نے ناشکری کی جس کے نتیجہ میں عذاب آگیا اور انکی نعمت سلب ہوگئی، حق تعالیٰ نے اہل مکہ پر اپنا سب سے بڑا انعام تو یہ فرمایا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اُن کے اندر پیدا فرمایا، اس کے علاوہ ان کی تجارتوں میں برکت عطا فرمائی اور اُن کو خوشحال بنا دیا، یہ اُن کی آزمائش ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کے شکر گزار ہوتے ہیں اور اللہ و رسول پر ایمان لاتے ہیں یا اپنے کفر و عناد پر جمے رہتے ہیں۔ دوسری صورت میں ان کو باغ والوں کے قصہ سے عبرت حاصل کرنا چاہیئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کفرانِ نعمت سے ان پر بھی ایسا ہی عذاب آجائے۔ یہ تفسیر اس صورت میں بھی صادق ہے جبکہ ان آیات کو بھی مثل اکثر سورت کے مکی قرار دیا جائے لیکن بہت سے حضرات مفسرین نے ان آیات کو مدنی قرار دیا ہے اور جس آزمائش کا یہاں ذکر ہے اُس سے مراد وہ قحط کا عذاب ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بددُعا سے ان لوگوں پر مسلط ہوا تھا جس میں وہ بھوک سے مرنے لگے اور مُردار جانور اور درختوں کے پتے کھانے پر مجبور ہوگئے تھے۔ یہ واقعہ ہجرت کے بعد کا ہے۔

باغ والوں کا قصہ | یہ باغ بعض سلف جیسے حضرت ابن عباس وغیرہ کے قول پر یمن میں تھا اور حضرت سعید بن جبیرؓ کی ایک روایت یہ ہے کہ صنعاء جو یمن کا مشہور شہر اور دار السلطنت ہے اُس سے چھ میل کے فاصلے پر تھا اور بعض حضرات نے اسکا محل وقوع حبشہ کو بتلایا ہے (ابن کثیر) یہ لوگ اہل کتاب میں سے تھے اور یہ واقعہ رفع عیسیٰ علیہ السلام کے کچھ عرصہ بعد کا ہے (قرطبی)

آیتِ مذکورہ میں ان کو اصحاب الجنۃ یعنی باغ والوں کے نام سے تعبیر کیا ہے مگر مضمون آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس صرف باغ ہی نہیں بلکہ کاشت کی زمینیں بھی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ باغ کے ساتھ ہی مزروعہ زمین بھی ہو مگر باغوں کی شہرت کے سبب باغ والے کہدیا گیا۔ واقعہ ان کا بروایت محمد بن مروان حضرت عبداللہ ابن عباس رضؓ سے اس طرح منقول ہے۔ صنعاء یمن سے دو فرسخ کے فاصلے پر ایک باغ تھا جس کو صروان کہا جاتا تھا۔ یہ باغ ایک صالح اور نیک بندے نے لگایا تھا، اسکا عمل یہ تھا کہ جب کھیتی کاٹتا تو جو درخت درانتی سے باقی رہ جاتے تھے انکو فقراء و مساکین کیلئے چھوڑ دیتا تھا یہ لوگ اس سے غلہ حاصل کر کے اپنا گزارہ کرتے تھے۔

اسی طرح جب کھیتی کو گاہ کر غلہ نکالتا تو جو دانہ بھوسے کیساتھ اُڑ کر الگ ہو جاتا، اُس دانے کو بھی فقرار و مساکین کیلئے چھوڑ دیتا تھا، اسی طرح جب باغ کے درختوں سے پھل توڑتا تو توڑنے کے وقت جو پھل نیچے گر جاتا وہ بھی فقرار کیلئے چھوڑ دیتا تھا (یہی وجہ تھی کہ جب اس کی کھیتی کٹنے یا پھل توڑنے کا وقت آتا تو بہت سے فقرار و مساکین جمع ہو جاتے تھے) اس مرد صالح کا انتقال ہو گیا اس کے تین بیٹے باغ اور زمین کے وارث ہوئے، انھوں نے آپس میں گفتگو کی کہ اب ہمارا عیال بڑھ گیا ہے اور پیداوار اُن کی ضرورت سے کم ہے اس لئے اب ان فقرار کے لئے اتنا غلہ اور پھل چھوڑ دینا ہمارے بس کی بات نہیں۔ اور بعض روایات میں ہے کہ ان لڑکوں نے آزاد نوجوانوں کی طرح یہ کہا کہ ہمارا باپ تو بے وقوف تھا اتنی بڑی مقدار غلہ اور پھل کی لوگوں کو لُٹا دیتا تھا۔ ہمیں یہ طریقہ بند کرنا چاہئے، آگے ان کا قصہ خود قرآن کریم کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔

اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ۝ وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ۝ یعنی انھوں نے آپس میں حلف وقسم کر کے یہ عہد کیا کہ اب کی مرتبہ ہم صبح سویرے ہی جا کر کھیتی کاٹ لیں گے تاکہ مساکین و فقرار کو خبر نہ ہو اور وہ ساتھ نہ لگ لیں، اور اپنے اس منصوبے پر اُن کو اتنا یقین تھا کہ انشاء اللہ کہنے کی بھی توفیق نہ ہوئی جیسا کہ سنت ہے کہ کل جو کام کرنا ہے جب اسکا ذکر کرے تو یوں کہے کہ ہم انشاء اللہ کل یہ کام کریں گے۔

لَا يَسْتَثْنُوْنَ کے معنی استثنار نہ کرنے کے ہیں اور مراد اس استثنار سے انشار اللہ کہنا ہے اور بعض حضرات مفسرین نے استثنار سے مراد یہ لیا ہے کہ ہم پورا پورا غلہ اور پھل لے آویں گے فقرار کا حصہ مستثنیٰ نہ کریں گے (مظہری)

فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ (پھر پھر گیا اس کھیت اور باغ پر ایک پھرنے والا آپکے رب کی طرف سے۔ پھرنے والے سے مراد کوئی بلا، اور آفت ہے جس سے کھیتی اور باغ تباہ ہو جائے۔ بعض روایات میں ہے کہ وہ ایک آگ تھی جس نے سب کھڑی کھیتی کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا وَهُمْ نَآئِمُوْنَ، یعنی یہ واقعہ نزولِ عذاب کا رات کو اسوقت ہوا جبکہ یہ لوگ محوِ خواب تھے فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ، صَرْم کے معنی پھل وغیرہ کاٹنے کے ہیں۔ صریم بمعنے مصروم و مقطوع ہے مطلب یہ ہے کہ آگ نے اس کھیتی کو ایسا بنا دیا کہ جیسے کھیتی کاٹ لینے کے بعد صاف زمین رہ جاتی ہے۔ اور صریم کے معنی رات کے بھی آتے ہیں، اس معنے کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ جیسے رات تاریک سیاہ ہوتی ہے یہ کھیتی بھی خاک سیاہ ہو گئی (مظہری)

فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ، یعنی صبح اندھیرے سے آپس میں ایک دوسرے کو آواز دیکر جگانے لگے کہ اگر کھیتی کاٹنا ہے تو سویرے چلو۔ وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ، یعنی گھر سے نکلنے کے وقت آپس میں آہستہ بات کرتے تھے کہ کسی فقیر و مسکین کو خبر نہ ہو جائے جو ساتھ لگے۔

وَغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ، حَرْد کے معنی منع کرنے اور غیظ و غضب دکھانے کے ہیں مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے خیال میں یہ سمجھ کر چلے کہ ہمیں اس پر قدرت ہے کہ ہم کسی فقیر و مسکین کو کچھ نہ دیں کوئی آ بھی جاوے تو اُس کو دفع کر دیں۔

فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ، مگر جب اس جگہ کھیت باغ کچھ نہ پایا تو اول تو یہ کہنے لگے کہ ہم جگہ کو بھول کر کہیں اور آ گئے، یہاں تو نہ باغ ہے نہ کھیت، مگر پھر قریبی مقامات اور نشانات پر غور کیا تو معلوم ہوا جگہ تو یہی ہے اور کھیت جل کر ختم ہو چکا ہے تو کہنے لگے بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ، یعنی ہم اس نعمت سے محروم کر دیئے گئے

قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ، ان میں سے جو درمیانہ آدمی تھا یعنی باپ کی طرح نیک صالح اللہ کی راہ میں خرچ پر خوش ہونے والا تھا دوسرے بھائیوں کی طرح بخیل سخت دل نہ تھا اس نے کہا کہ کیا میں نے تمھیں پہلے ہی نہیں کہا تھا کہ تم اللہ کے نام کی تسبیح کیوں نہیں کرتے، تسبیح کے لفظی معنی پاکی بیان کرنے کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ فقراء و مساکین سے اپنا مال بچا لینے کی تدبیر کا منشا یہ ہے کہ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تم کو اس کے بجائے اور نہ دیگا حالانکہ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے وہ خرچ کرنے والوں کو اپنے پاس سے اور زیادہ دیتا ہے (مظہری)

قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ، اس بھائی کی بات اسوقت تو کسی نے نہ سُنی مگر اب سب نے اقرار کیا کہ اللہ تعالیٰ پاک ہے ہر نقص و کمی سے اور ہم ظالم ٹھہرے کہ ہم نے فقراء کے حصّہ کو بھی کھا لینا چاہا۔

تنبیہ | یہ درمیانہ آدمی جس نے صحیح بات کہی تھی اگرچہ دوسروں سے بہتر تھا مگر پھر بہر حال اُنھیں کیساتھ ہو لیا اور اُنھیں کی غلط رائے پر عمل کے لئے تیار ہو گیا تھا اس لئے حشر اسکا بھی اُنھیں جیسا ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو آدمی کسی گناہ سے لوگوں کو روکے مگر وہ نہ رکیں، پھر خود بھی اُن کے ساتھ لگا رہے اور گناہ میں شریک رہے تو یہ بھی اُنھیں کے حکم میں ہوتا ہے اس کو چاہیئے کہ وہ نہیں رُکے تو خود اپنے آپ کو اس گناہ سے بچائے

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ، یعنی ان لوگوں نے اپنے جُرم کا تو اعتراف کر لیا، لیکن اب الزام ایک دوسرے پر ڈالنے لگے کہ تو نے ہی اول ایسی غلط رائے دی تھی جس کے نتیجہ میں یہ عذاب آیا۔ حالانکہ یہ جُرم انمیں سے کسی کا تنہا نہیں تھا بلکہ سب یا اکثر اسمیں شریک تھے۔

تنبیہ | آجکل اس معاملے میں ابتلاء عام ہے کہ بہت سی جماعتوں کے مجموعی عمل کی وجہ سے کوئی ناکامی یا مصیبت پیش آ جائے تو اسوقت ایک دوسرا عذاب ان پر یہ ہوتا ہے کہ اس کا الزام ایک دوسرے پر ڈالنے میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔

قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ، یعنی ابتداءً ایک دوسرے پر الزام ڈالنے کے بعد جب غور کیا تو پھر سب نے اقرار کر لیا کہ ہم سب ہی سرکش گناہگار ہیں یہ اعتراف ندامت کے ساتھ اُن کی توبہ کے قائم مقام تھا اسی بناء پر اُن کو اللہ سے یہ اُمید ہوئی کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس باغ سے بہتر باغ عطا فرما دیں گے۔

امام بغوی نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضؓ سے نقل کیا ہے کہ ابن مسعود رضؓ نے فرمایا کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ جب ان سب لوگوں نے سچّے دل سے توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس سے بہتر باغ عطا فرما دیا جس کے انگوروں کے خوشے اتنے بڑے تھے کہ ایک خوشہ ایک خچر پر لادا جاتا تھا (مظہری)

کَذٰلِکَ الْعَذَابُ ، اہل مکہ کے عذاب قحط کا اجمالی اور باغ والوں کے کھیت جل جانیکا تفصیلی ذکر فرمانیکے بعد عام ضابطہ ارشاد فرمایا کہ جب اللہ کا عذاب آتا ہے تو اسی طرح آیا کرتا ہے، اور دُنیا میں عذاب آجانے سے بھی اُن کے آخرت کے عذاب کا کفارہ نہیں ہوتا بلکہ آخرت کا عذاب اسکے علاوہ اور اس سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔

اگلی آیات میں اوّل نیک متقی بندوں کی جزاء کا ذکر ہے اور اس کے بعد مشرکین مکہ کے ایک اور باطل دعوے کا رد ہے وہ یہ کہ کفار مکہ کہا کرتے تھے کہ اوّل تو قیامت آنے والی نہیں اور دوبارہ زندہ ہو کر حساب کتاب کا قصہ سب افسانہ ہے اور اگر بالفرض ایسا ہو بھی گیا تو ہمیں وہاں بھی ایسی ہی نعمتیں اور مال و دولت ملے گا جیسا دُنیا میں ملا ہوا ہے، اسکا جواب کئی آیتوں میں دیا گیا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نیک بندوں اور مجرمین کو برابر کر دیں گے یہ کیسا عجیب و غریب فیصلہ ہے جس پر نہ کوئی سند نہ دلیل نہ کسی آسمانی کتاب سے اسکا ثبوت نہ اللہ کی طرف سے کوئی وعدہ و عہد کہ وہاں بھی تمھیں نعمت دیگا۔

قیامت کی ایک عقلی دلیل ان آیات مذکورہ سے ثابت ہوا کہ قیامت آنا اور حساب کتاب ہونا اور نیک و بد کی جزاء و سزا یہ سب عقلاً ضروری ہے کیونکہ اسکا تو دُنیا میں ہر شخص مشاہدہ کرتا ہے اور کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ دُنیا میں جو عموماً فساق فجار بدکار ظالم چور اور ڈاکو ہیں نفع میں رہتے اور مزے اُڑاتے ہیں، ایک چور اور ڈاکو ایک رات میں بعض اوقات اتنا کما لیتا ہے کہ شریف نیک آدمی عمر بھر میں بھی نہ کما سکے۔ پھر وہ نہ خوفِ خُدا و آخرت کو جانتا ہے نہ کسی شرم و حیا کا پابند ہے اپنے نفس کی خواہشات کو جس طرح چاہے پُورا کرتا ہے۔ اور نیک شریف آدمی اوّل تو خدا سے ڈرتا ہے وہ بھی نہ ہو تو برادری کی شرم و حیا سے مغلوب ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دُنیا کے کارخانے میں تو بدکار بدمعاش کامیاب اور نیک شریف آدمی ناکام نظر آتا ہے اب اگر آگے بھی کوئی ایسا وقت نہ آئے جس میں حق و ناحق کا صحیح انصاف ہو نیک کو اچھا بدلہ ملے بد کو سزا ملے تو پھر اوّل تو کسی بُرائی کو بُرائی اور گناہ کو گناہ کہنا لغو و بے معنے ہو جاتا ہے کہ وہ ایک انسان کو بلا وجہ اسکی خواہشات سے روکنا ہے دوسرے پھر عدل و انصاف کے کوئی معنے باقی نہیں رہتے جو لوگ خدا کے وجود کے قائل ہیں وہ اسکا کیا جواب دیں گے کہ خدا تعالےٰ کا انصاف کہاں گیا۔

رہا یہ شبہ کہ دُنیا میں بسا اوقات مجرم پکڑا جاتا ہے اُس کی رسوائی ہوتی ہے سزا پاتا ہے شریف آدمی کا امتیاز اس سے یہیں واضح ہو جاتا ہے اور عدل و انصاف حکومتوں کے قوانین سے قائم ہو جاتا ہے۔ یہ اس لئے غلط ہے کہ اول تو ہر جگہ اور ہر حال میں حکومت کی نگرانی ہو ہی نہیں سکتی، جہاں ہو جاوے وہاں عدالتی ثبوت ہر جگہ بہم پہنچنا آسان نہیں جس کے ذریعہ مجرم سزا پا سکے اور جہاں ثبوت بھی بہم پہنچ جائے تو زور و زر اور رشوت و سفارش اور دباؤ کے کتنے چور دروازے ہیں جن سے مجرم نکل بھاگتا ہے۔ اور اس زمانے کی حکومتی اور عدالتی جرم و سزا کا جائزہ لیا جائے تو اس وقت تو سزا صرف وہ بے وقوف بے عقل یا بے سہارا آدمی پاتا ہے جو ہوشیاری سے کوئی چور دروازہ نہ نکال سکے اور جس کے پاس نہ رشوت کے لئے پیسے ہوں نہ کوئی بڑا آدمی

اسکا مددگار ہو یا پھر وہ اپنی بے وقوفی سے ان چیزوں کو استعمال نہ کرسکے۔ باقی سب مجرم آزاد پھرتے ہیں۔
قرآن کریم کے اس لفظ نے اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ، اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ عقلاً یہ ہونا ضروری ہے کہ کوئی ایسا وقت آئے جہاں سب کا حساب ہو اور جہاں مجرموں کیلئے کوئی چور دروازہ نہ ہو اور جہاں انصاف ہی انصاف ہو اور نیک بد کا کھل کر امتیاز واضح ہو اور اگر یہ نہیں ہے تو دنیا میں کوئی برا کام برا نہیں اور کوئی جرم جرم نہیں اور پھر خدائی عدل و انصاف کے کوئی معنے نہیں رہتے۔
اور جب قیامت آنا اور اعمال کی جزا و سزا ہونا یقینی ہوگیا تو آگے کچھ احوال قیامت اور مجرمین کی سزا کا ذکر کیا گیا ہے جس میں قیامت کے دن کشف ساق کا اعجاز بیان ہوا ہے اس کی حقیقت خلاصہ تفسیر میں آچکی ہے۔
فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ، یعنی آپ اس قیامت کی بات جھٹلانے والوں کو اور مجھے چھوڑ دیں پھر دیکھیں کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ یہاں چھوڑ دینا ایک محاورہ کے طور پر فرمایا گیا ہے مراد اس سے اللہ پر بھروسہ اور توکل کرنا ہے اور حاصل اس کلام کا یہ ہے کہ کفار کی طرف سے یہ مطالبہ بھی بار بار پیش ہوا کرتا تھا کہ اگر ہم واقعی اللہ کے نزدیک مجرم ہیں اور اللہ تعالیٰ ہمیں عذاب دینے پر قادر ہے تو پھر ہمیں عذاب ابھی کیوں نہیں دے ڈالتا ان کے ایسے دل آزار مطالبوں کی وجہ سے کبھی کبھی خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں بھی یہ خیال پیدا ہوتا ہوگا اور ممکن ہے کسی وقت دعا بھی کی ہو کہ ان لوگوں پر اسی وقت عذاب آجائے تو باقیماندہ لوگوں کی اصلاح کی توقع ہے اس پر یہ فرمایا گیا کہ اپنی حکمت کو ہم ہی خوب جانتے ہیں ایک حد تک ان کو مہلت دیتے ہیں فوراً عذاب نہیں بھیجدیتے اسمیں انکی آزمائش بھی ہوتی ہے اور ایمان لانے کی مہلت بھی۔ آخر میں حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ کا ذکر فرما کر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ نصیحت فرمائی گئی کہ جس طرح یونس علیہ السلام نے لوگوں کے مطالبے سے تنگ آکر عذاب کی دعا کر دی اور عذاب کے آثار سامنے بھی آگئے اور یونس علیہ السلام اس جائے عذاب سے دوسری جگہ منتقل بھی ہوگئے مگر پھر پوری قوم نے الحاح وزاری اور اخلاص کیساتھ توبہ کرلی اللہ تعالیٰ نے ان کو معافی دیدی اور عذاب ہٹالیا تو اب یونس علیہ السلام نے یہ شرمندگی محسوس کی کہ میں ان لوگوں میں جھوٹا قرار پاؤں گا اس بدنامی کے خوف سے اللہ تعالیٰ کے اذن صریح کے بغیر اپنے اجتہاد سے یہ راہ اختیار کرلی کہ اب ان لوگوں میں واپس جائیں، اس پر حق تعالیٰ نے اُن کی تنبیہ کے لئے دریا کے سفر پھر مچھلی کے نگل جانے کا معاملہ فرمایا اور پھر یونس علیہ السلام کے متنبہ ہو کر استغفار و معافی کیطرف متوجہ ہونے پر دوبارہ اُن پر اپنے سابقہ انعامات کے دروازے کھولدیئے۔ یہ واقعہ سورۂ یونس اور دوسری سورتوں میں گزر چکا ہے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ واقعہ یاد دلا کر اسکی نصیحت فرمائی کہ آپ ان لوگوں کے ایسے مطالبہ سے مغلوب نہ ہوں اور ان پر جلدی عذاب نازل کرنے کے خواہشمند نہ ہوں اپنی حکمتوں اور عالم کی مصلحتوں کو ہم ہی جانتے ہیں ہم پر توکل کریں۔

وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ، یہاں حضرت یونس علیہ السلام کو صاحبِ حُوت اسی مناسبت سے کہا گیا کہ وہ کچھ عرصہ مچھلی کے پیٹ میں رہے ۔

وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ الآیۃ لَيُزْلِقُوْنَكَ ازلاق سے مشتق ہے جس کے معنی لغزش دینے اور گرا دینے کے ہیں (راغب) مطلب یہ ہے کہ کفارِ مکہ آپ کو غضبناک اور ترچھی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ کو اپنی جگہ اور مقام سے لغزش دیدیں جبکہ وہ اللہ کا کلام سُنتے ہیں اور کہنے لگتے ہیں کہ یہ تو مجنون ہے وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ، حالانکہ یہ کلام تو تمام جہان والوں کے لئے ذکر و نصیحت اور اُن کی صلاح و فلاح کا ضامن ہے ایسے کلام والا کہیں مجنون کہا جا سکتا ہے ۔ کفار کے جس طعنہ کا اس سورۃ کے شروع میں جواب دیا گیا تھا ختم سورہ پر اُسی کا ایک دوسرے انداز سے جواب دیدیا گیا ۔

اور امام بغوی وغیرہ مفسرین نے ان آیات کا ایک خاص واقعہ نقل کیا ہے کہ انسان کی نظر بد لگ جانا اور اُس سے کسی انسان کو نقصان اور بیماری بلکہ ہلاکت تک پہنچ جانا ، جیسا کہ حقیقت ہے اور احادیث صحیحہ میں اسکا حق ہونا وارد ہے عرب میں بھی معروف و مشہور تھا اور مکہ میں ایک شخص نظر لگانے میں بڑا مشہور تھا اونٹوں جانوروں کو نظر لگا دیتا تو وہ فوراً مرجاتے تھے ۔ کفارِ مکہ کو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عداوت تو تھی ہی اور ہر طرح کی کوشش آپ کو قتل کرنے اور ایذا پہنچانے کی کیا کرتے تھے ان کو یہ سُوجھی کہ اس شخص سے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو نظر لگواؤ ، اور اُس کو بلا لائے اس نے نظر بد لگانے کی اپنی پوری کوشش کرلی مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت فرمائی یہ آیات اسی سلسلے میں نازل ہوئیں اور لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ میں اسی نگاہِ بد لگانے کو بیان فرمایا گیا ہے ۔

فائدہ حضرت حسن بصری رحمہ سے منقول ہے کہ جس شخص کو نظرِ بد کسی انسان کی لگ گئی ہو اُس پر یہ آیات پڑھ کر دم کر دینا اسکے اثر کو زائل کر دیتا ہے یہ آیات وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے آخر سورت تک ہیں (مظہری)

تمت سُورَۃُ الْقَلَمِ بحمد اللہ یوم الاحد لست مضین من رجب سنہ ۱۳۹۱ھ

سورۃ الحاقۃ

سورة الحاقة مكية وهي اثنتان وخمسون آية وفيها ركوعان

سورۂ حاقّہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی باون آیتیں ہیں اور اسمیں دو رکوع

بسم الله الرحمن الرحيم

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

الحاقة ① ما الحاقة ② وما ادراك ما الحاقة ③ كذبت ثمود و

وہ ثابت ہو چکنے والی، کیا ہے وہ ثابت ہو چکنے والی اور تو نے کیا سوچا کیا ہے وہ ثابت ہو چکنے والی جھٹلایا ثمود اور

عاد بالقارعة ④ فاما ثمود فاهلكوا بالطاغية ⑤ واما عاد فاهلكوا

عاد نے اس کوٹ ڈالنے والی کو سو وہ جو ثمود تھے سو غارت کر دیئے گئے اُچھال کر اور وہ جو عاد تھے سو برباد ہوئے

بريح صرصر عاتية ⑥ سخرها عليهم سبع ليال وثمنية ايام حسوما

ٹھنڈی سناٹے کی ہوا سے نکل جائے ہاتھوں سے مقرر کر دیا اس کو اُن پر سات رات اور آٹھ دن تک لگاتار۔

فترى القوم فيها صرعى كانهم اعجاز نخل خاوية ⑦ فهل

پھر تو دیکھے کہ وہ لوگ اسمیں بچھڑ گئے گویا وہ ڈھنڈ ہیں کھجور کے کھوکھلے پھر تو

ترى لهم من باقية ⑧ وجاء فرعون ومن قبله والمؤتفكت

دیکھتا ہے کوئی انہیں کا بچا اور آیا فرعون اور جو اس سے پہلے تھے اور اُلٹ جانیوالی بستیاں

بالخاطئة ⑨ فعصوا رسول ربهم فاخذهم اخذة رابية ⑩ انا

خطائیں کرتے ہوئے پھر حکم نہ مانا اپنے رب کے رسول کا پھر پکڑا اُن کو پکڑنا سخت ہم نے

لما طغا الماء حملنكم في الجارية ⑪ لنجعلها لكم تذكرة وتعيها

جس وقت پانی اُبلا لاد لیا تم کو چلتی کشتی میں تاکہ رکھیں اس کو تمھاری یادگاری کے واسطے اور سینت کر رکھے

اذن واعية ⑫ فاذا نفخ في الصور نفخة واحدة ⑬ وحملت

اسکو کان سینت کر رکھنے والا پھر جب پھونکا جائے صور میں ایک بار پھونکنا اور اُٹھائی جائے

الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً ﴿۱۴﴾ فَيَوْمَئِذٍ وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿۱۵﴾

زمین اور پہاڑ پھر کوٹ دیئے جائیں ایک بار پھر اس دن ہو پڑے وہ ہو پڑنے والی

وَانْشَقَّتِ السَّمَاءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَاهِيَةٌ ﴿۱۶﴾ وَالْمَلَكُ عَلَىٰ أَرْجَائِهَا ۚ وَيَحْمِلُ

اور پھٹ جائے آسمان پھر وہ اس دن بکھر رہا ہے اور فرشتے ہونگے اس کے کناروں پر اور اٹھائیں گے

عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌ ﴿۱۷﴾ يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ لَا تَخْفَىٰ مِنْكُمْ

تخت تیرے رب کا اپنے اوپر اس دن آٹھ شخص اس دن سامنے کئے جاؤ گے چھپی نہ رہے گی تمہاری کوئی

خَافِيَةٌ ﴿۱۸﴾ فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَيَقُولُ هَاؤُمُ اقْرَءُوا

چھپی بات سو جس کو ملا اس کا لکھا داہنے ہاتھ میں وہ کہتا ہے لیجیو پڑھیو میرا

كِتَابِيَهْ ﴿۱۹﴾ إِنِّي ظَنَنْتُ أَنِّي مُلَاقٍ حِسَابِيَهْ ﴿۲۰﴾ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ ﴿۲۱﴾

لکھا میں نے خیال رکھا اس بات کا کہ مجھ کو ملیگا میرا حساب سو وہ ہیں من مانتے گزران میں

فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿۲۲﴾ قُطُوفُهَا دَانِيَةٌ ﴿۲۳﴾ كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ

اونچے باغ میں جس کے میوے جھکے پڑے ہیں کھاؤ اور پیو رچ کر بدلہ اسکا جو آگے

فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ ﴿۲۴﴾ وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِشِمَالِهِ ۙ فَيَقُولُ يَا لَيْتَنِي لَمْ

بھیج چکے ہو تم پہلے دنوں میں اور جس کو ملا اس کا لکھا بائیں ہاتھ میں وہ کہتا ہے کیا اچھا ہوتا جو

أُوتَ كِتَابِيَهْ ﴿۲۵﴾ وَلَمْ أَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ﴿۲۶﴾ يَا لَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ﴿۲۷﴾ مَا

مجھ کو نہ ملتا میرا لکھا اور مجھ کو خبر نہ ہوتی کہ کیا ہے حساب میرا کسی طرح وہی موت ختم کر جاتی کچھ

أَغْنَىٰ عَنِّي مَالِيَهْ ﴿۲۸﴾ هَلَكَ عَنِّي سُلْطَانِيَهْ ﴿۲۹﴾ خُذُوهُ فَغُلُّوهُ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ

کام نہ آیا مجھ کو میرا مال برباد ہوئی مجھ سے حکومت میری اس کو پکڑو پھر طوق ڈالو پھر

الْجَحِيمَ صَلُّوهُ ﴿۳۱﴾ ثُمَّ فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوهُ ﴿۳۲﴾

آگ کے ڈھیر میں اسکو ڈالو پھر ایک زنجیر میں جس کا طول ستر گز ہے اس کو جکڑ دو

إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ ﴿۳۳﴾ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ﴿۳۴﴾

وہ تھا کہ یقین نہ لاتا تھا اللہ پر جو سب سے بڑا اور تاکید نہ کرتا تھا فقیر کے کھانے پر

فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هَاهُنَا حَمِيمٌ ﴿۳۵﴾ وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِينٍ ﴿۳۶﴾ لَا يَأْكُلُهُ

سو کوئی نہیں آج اسکا یہاں دوستدار اور نہ کچھ ملے کھانا مگر زخموں کا دھوون کوئی نہ کھائے اسکو

إِلَّا الْخَاطِئُونَ ﴿۳۷﴾ فَلَا أُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُونَ ﴿۳۸﴾ وَمَا لَا تُبْصِرُونَ ﴿۳۹﴾ إِنَّهُ

ع ۵

مگر وہی گنہگار سو قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جو دیکھتے ہو اور جو چیزیں کہ تم نہیں دیکھتے یہ

لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ﴿۴۰﴾ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۚ قَلِيلًا مَا تُؤْمِنُونَ ﴿۴۱﴾ وَ

کہا ہے ایک پیغام لانے والے سردار کا اور نہیں ہے یہ کہا کسی شاعر کا تم تھوڑا یقین کرتے ہو اور

وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ﴿٤٢﴾ تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٤٣﴾ وَلَوْ
اور نہیں ہے کہا پریوں والے کا تم بہت کم دھیان کرتے ہو یہ اُتارا ہوا ہے جہان کے رب کا اور اگر

تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ﴿٤٤﴾ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ﴿٤٥﴾ ثُمَّ
یہ بنا لاتا ہم پر کوئی بات تو ہم پکڑ لیتے اس کا داہنا ہاتھ پھر

لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ﴿٤٦﴾ فَمَا مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ﴿٤٧﴾ وَإِنَّهُ
کاٹ ڈالتے اس کی گردن پھر تم میں کوئی ایسا نہیں جو اس سے بچالے اور یہ

لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ ﴿٤٨﴾ وَإِنَّا لَنَعْلَمُ أَنَّ مِنكُم مُّكَذِّبِينَ ﴿٤٩﴾ وَإِنَّهُ
نصیحت ہے ڈرنے والوں کو اور ہم کو معلوم ہے کہ تم میں بعضے جھٹلاتے ہیں اور وہ

لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿٥٠﴾ وَإِنَّهُ لَحَقُّ الْيَقِينِ ﴿٥١﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ﴿٥٢﴾ ع ۲ / ۱۵ / ۶
جو ہے پچھتاوا ہے منکروں پر اور وہ جو ہے یقین کرنے کے قابل ہے اب بول پاکی اپنے رب کے نام کی جو ہے سب سے بڑا

خُلاصۂ تفسیر

وہ ہونے والی چیز کیسی کچھ ہے وہ ہونے والی چیز اور آپ کو کچھ خبر ہے کہ کیسی کچھ ہے وہ ہونے والی چیز (مقصود اس سے قیامت کی عظمت اور ہولناک ہونے کا بیان ہے یہ استفہامات تہویل کے لئے ہیں) ثمود اور عاد نے اس کھڑکھڑانے والی چیز (یعنی قیامت) کی تکذیب کی سو ثمود تو ایک زور کی آواز سے ہلاک کر دیئے گئے اور عاد جو تھے سو وہ ایک تیز و تند ہوا سے ہلاک کئے گئے جس کو اللہ تعالیٰ نے ان پر سات رات اور آٹھ دن متواتر مسلّط کر دیا تھا سو (اے مخاطب اگر) تو (اس وقت وہاں موجود ہوتا تو) اس قوم کو اس طرح گرا ہوا دیکھتا کہ گویا وہ گری ہوئی کھجوروں کے تنے (پڑے) ہیں (کیونکہ وہ بہت دراز قد تھے) سو کیا تجھ کو ان میں کا کوئی بچا ہوا نظر آتا ہے (یعنی کوئی نہیں بچا، کقولہ تعالیٰ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُم مِّنْ أَحَدٍ أَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا) اور (اسی طرح) فرعون نے اور اس سے پہلے لوگوں نے (جن میں قوم نوح و عاد و ثمود سب آگئے) اور (قوم لوط کی) ملی ہوئی بستیوں نے بڑے بڑے قصور کئے (یعنی کفر و شرک اس پر ان کے پاس رسول بھیجے گئے) سو انھوں نے اپنے رب کے رسول کا (جو اُن کی طرف بھیجا گیا تھا) کہنا نہ مانا (اور کفر و شرک سے باز نہ آئے جس میں تکذیب قیامت بھی داخل ہے) تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت سخت پکڑا (جن میں سے عاد و ثمود کا قصہ تو ابھی آچکا ہے اور قوم لوط اور قوم فرعون کی عقوبت بہت سی آیتوں میں پہلے آچکی ہے اور قوم نوح کی عقوبت آگے بضمن امتنان مذکور ہے یعنی) ہم نے جبکہ (نوح علیہ السلام کے وقت میں) پانی کو طغیانی ہوئی تم کو (یعنی تمھارے بزرگوں کو جو مومن تھے اور ان کی نجات تمھارے وجود کا سبب ہوئی) کشتی میں سوار کیا (اور باقیوں کو غرق کر دیا) تاکہ ہم اس معاملہ کو تمھارے لئے ایک یادگار (اور عبرت) بنا دیں اور یاد رکھنے والے کان اسکو یاد رکھیں،

(کان کو یاد رکھنے والا مجازاً کہدیا - حاصل یہ کہ اس کو یاد رکھ کر سزا کے اسباب سے بچیں - یہ قصے تو مکذبین قیامت کے ہوئے، آگے قیامت کے ہول وخوف کا بیان ہے یعنی) پھر جب صور میں یکبارگی پھونک ماردی جاوے گی (مراد نفخۂ اولیٰ ہے) اور (اسوقت) زمین اور پہاڑ (اپنی جگہ سے) اُٹھالئے جاویں گے (یعنی اپنی حیز سے ہٹادیئے جاویں گے) پھر دونوں ایک ہی دفعہ میں ریزہ ریزہ کردیئے جاویں گے تو اس روز وہ ہونے والی چیز ہو پڑے گی اور آسمان پھٹ جاوے گا اور وہ (آسمان) اس روز بالکل بودا ہوگا (چنانچہ پھٹ جانا دلیل ضعف ہے یعنی جیسا اسوقت وہ مضبوط ہے اور اسمیں کہیں فطور وشقوق نہیں، اس روز اسمیں یہ بات نہ رہے گی بلکہ ضعف وانشقاق ہوجاویگا) اور فرشتے (جو آسمان میں پھیلے ہوئے ہیں جس وقت وہ پھٹنا شروع ہوگا) اس کے کناروں پر آجاویں گے (اس سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ آسمان بیچ میں سے پھٹ کر چاروں طرف سمٹنا شروع ہوگا اسلئے فرشتے بھی بیچ میں سے کناروں پر آرہیں گے - پھر آیت صَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ الخ کے مطابق ان فرشتوں پر بھی موت مسلط ہوجاوے گی (کذا فی الکبیر احد الوجہین) اور یہ سب واقعات تو نفخۂ اولیٰ کے وقت کے ہیں) اور (آگے نفخۂ ثانیہ کے وقت کے واقعات ہیں کہ) آپ کے پروردگار کے عرش کو اس روز آٹھ فرشتے اُٹھائے ہونگے (حدیث میں ہے کہ اب عرش کو چار فرشتے اُٹھائے ہوئے ہیں قیامت کو آٹھ فرشتے اُٹھاویں گے (کذا فی الدر مرفوعاً)

غرض آٹھ فرشتے عرش کو اُٹھاکر میدانِ قیامت میں لاویں گے اور حساب شروع ہوگا جسکا آگے بیان ہے یعنی) جس روز تم (خدا کے روبرو حساب کے واسطے) پیش کیے جاؤگے (اور) تمھاری کوئی بات (اللہ تعالیٰ سے) پوشیدہ نہ ہوگی پھر (نامۂ اعمال اُڑاکر ہاتھ میں دیئے جاویں گے تو) جس شخص کا نامۂ اعمال اسکے داہنے ہاتھ میں دیا جاویگا وہ تو (خوشی کے مارے آس پاس والوں سے) کہے گا کہ میرا نامۂ اعمال پڑھ لو میرا (تو پہلے ہی سے) اعتقاد تھا کہ مجھ کو میرا حساب پیش آنے والا ہے (یعنی میں قیامت اور حساب کا معتقد تھا، مطلب یہ کہ میں ایمان اور تصدیق رکھتا تھا خدا تعالیٰ نے اس کی برکت سے آج مجھ کو نوازا) غرض وہ شخص پسندیدہ عیش یعنی بہشت بریں میں ہوگا جس کے میوے (اسقدر) جھکے ہونگے (کہ جس حالت میں چاہیں گے لے سکیں گے اور حکم ہوگا کہ) کھاؤ اور پیو مزے کے ساتھ ان اعمال کے صلہ میں جو تمنے باُمید صلہ گزشتہ ایام (یعنی زمانہ قیام دُنیا) میں کیئے ہیں اور جس کا نامۂ اعمال اسکے بائیں ہاتھ میں دیا جاویگا سو وہ (نہایت حسرت سے) کہیگا کیا اچھا ہوتا کہ مجھ کو میرا نامۂ اعمال ہی نہ ملتا اور مجھ کو یہ ہی خبر نہ ہوتی کہ میرا حساب کیا ہے کیا اچھا ہوتا کہ (پہلی) موت ہی خاتمہ کرچکتی (اور دوبارہ زندہ نہ ہوتے جس پر یہ حساب کتاب مرتب ہوا افسوس) میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا، میرا جاہ (بھی) مجھ سے گیا گزرا (یعنی مال وجاہ سب بے سود ٹھیرے ایسے شخص کے لئے فرشتوں کو حکم ہوگا کہ) اس شخص کو پکڑو اور اس کے گلے میں طوق پہنادو پھر دوزخ میں اس کو داخل کرو، پھر ایک ایسی زنجیر میں جس کی پیمائش ستر گز ہے اس کو جکڑدو (اس گز کی مقدار خدا کو معلوم ہے

کیونکہ یہ گز وہاں کا ہوگا ۔ آگے اس عذاب کی وجہ بتلاتے ہیں کہ) یہ شخص خدائے بزرگ پر ایمان نہ رکھتا تھا (یعنی جس طرح ایمان لانا حسب تعلیم انبیاء ضروری تھا وہ ایمان نہ رکھتا تھا) اور (خود تو کسی کو کیا دیتا اوروں کو بھی) غریب آدمی کے کھلانے کی ترغیب نہ دیتا تھا ۔ (حاصل یہ کہ خدا کی عظمت اور مخلوق کی شفقت جو اصل عبادات متعلقہ حقوق اللہ و حقوق العباد ہیں یہ دونوں کا تارک اور منکر تھا اس لئے مستحق عذاب ہوا) سو آج اس شخص کا نہ کوئی دوستدار ہے اور نہ اس کو کوئی کھانے کی چیز نصیب ہے بجز زخموں کے دھوون کے ۔ (یعنی بجز ایک ایسی چیز کے جو کراہت و صورت میں مثل غسلین کے ہوگا جس سے زخم دھوئے گئے ہوں ۔ اور یہ حصر اضافی ہے اور مقصود اس سے نفی ہے مرغوب کھانوں کی ورنہ زقوم کی غذا ہونا خود آیات سے ثابت ہے غرض ان کا طعام غسلین ہوگا) جس کو بجز بڑے گناہگاروں کے کوئی نہ کھاویگا (آگے قرآن کی حقانیت ارشاد فرمائی جاتی ہے جس میں قیامت میں جزاء و سزا ہونے کا بیان ہے اس کی تکذیب موجب تعذیب مذکور ہے) پھر (بعد بیان مضمون مجازاۃ کے) میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی بھی جن کو تم دیکھتے ہو اور ان چیزوں کی بھی جن کو تم نہیں دیکھتے (کیونکہ بعض مخلوقات بالفعل یا بالقوہ آنکھوں سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور بعض مخلوقات بالفعل یا بالقوہ یہ صلاحیت نہیں رکھتیں ، اس قسم کو مقصود سے ایک خاص مناسبت ہے کہ قرآن مجید کا لانیوالا نظر نہ آتا تھا اور جن پر قرآن آتا تھا وہ نظر آتے تھے مراد یہ ہے کہ تمام مخلوق کی قسم ہے) کہ یہ قرآن (اللہ کا) کلام ہے ایک معزز فرشتہ کا لایا ہوا (پس جس پر یہ کلام نازل ہوا وہ ضرور رسول ہے) اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے (جیساکہ کفار آپ کو شاعر کہتے تھے مگر) تم بہت کم ایمان لاتے ہو (یہاں قلت سے مراد عدم ہے) اور یہ نہ کسی کاہن کا کلام ہے (جیسا بعض کفار آپکو کہتے تھے مگر) تم بہت کم سمجھتے ہو (یہاں بھی قلت سے مراد عدم ہے غرض یہ نہ شعر ہے نہ کہانت ہے بلکہ) رب العالمین کی طرف سے بھیجا ہوا (کلام) ہے اور (آگے اس کی حقانیت کی ایک دلیل عقلی ارشاد ہوتی ہے کہ) اگر یہ (پیغمبر) ہمارے ذمہ کچھ (جھوٹی) باتیں لگا دیتے (یعنی جو کلام ہمارا نہ ہوتا اسکو ہمارا کلام کہتے اور جھوٹا دعوٰی نبوت کا کرتے) تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑتے پھر ہم اُن کی رگ دل کاٹ ڈالتے پھر تم میں کوئی ان کا اس سزا سے بچانے والا بھی نہ ہوتا (رگ دل کاٹنے سے آدمی مرجاتا ہے مراد اس سے قتل ہے) اور بلاشبہ یہ قرآن متقیوں کے لئے نصیحت ہے (یعنی فی نفسہ حق ہونا اسکی صفت کمالیہ ذاتیہ ہے اور موجب نصیحت ہونا اسکی صفت کمالیہ اضافیہ ہے) اور (آگے تکذیبین کی وعید ہے کہ) ہمکو معلوم ہے کہ تم میں سے بعض تکذیب کرنے والے بھی ہیں (پس ہم ان کو اس کی سزا دیں گے) اور (اس اعتبار سے) یہ قرآن کافروں کے حق میں موجب حسرت ہے (کیونکہ ان کے لئے بوجہ تکذیب کے سبب عذاب ہوگیا) اور یہ قرآن تحقیقی یقینی بات ہے سو (جس کا یہ کلام ہے) اپنے (اس) عظیم الشان پروردگار کے نام کی تسبیح (و تحمید) کیجئے ۔

۳۵

معارف و مسائل

اس سورت میں قیامت کے ہولناک واقعات اور پھر وہاں کفار و فجار کی سزا اور مؤمنین متقین کا جزار کا ذکر ہے قیامت کے نام قرآنِ کریم میں بہت سے آئے ہیں۔ اس سورت میں قیامت کو حاقّہ کے لفظ سے، پھر قارعہ کے، پھر واقعہ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور یہ سب قیامت کے نام ہیں۔

لفظ حاقّہ کے معنی حق اور ثابت کے بھی آتے ہیں اور دوسری چیزوں کو حق ثابت کرنے والی چیز کو بھی حاقّہ کہتے ہیں۔ قیامت پر یہ لفظ دونوں معنے کے اعتبار سے صادق آتا ہے کیونکہ قیامت خود بھی حق ہے اور اسکا وقوع ثابت اور یقینی ہے اور قیامت مؤمنین کے لئے جنّت اور کفار کے لئے جہنم ثابت اور مقرر کرنے والی بھی ہے۔ یہاں قیامت کے اس نام کے ساتھ سوال کو مکرر کر کے اسکے مافوق القیاس اور حیرت انگیز ہولناک ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

قارعہ کے لفظی معنے کھڑکھڑانے والی چیز کے ہیں۔ قیامت کے لئے یہ لفظ اس لئے بولا گیا کہ وہ سب لوگوں کو مضطرب اور بے چین کرنے والی اور تمام آسمان و زمین کے اجسام کو منتشر کرنے والی ہے۔

طاغیہ طغیان سے مشتق ہے جس کے معنے حد سے نکل جانے کے ہیں۔ مراد ایسی سخت آواز ہے جو تمام دُنیا کی آوازوں کی حد سے باہر ہے اور زیادہ ہے جس کو انسان کا قلب و دماغ برداشت نہ کر سکے۔ قوم ثمود کی نافرمانی جب حد سے بڑھ گئی تو ان پر اللہ کا عذاب اسی سخت آواز کی صورت میں آیا تھا جس میں تمام دُنیا کی بجلیوں کی کڑک اور دُنیا بھر کی سب سخت آوازوں کا مجموعہ تھا جس سے اُنکے دل پھٹ گئے۔

رِيحٍ صَرۡصَرٍ، اس سخت ہوا کو کہا جاتا ہے جو بہت زیادہ سرد بھی ہو۔

سَبۡعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ، بعض روایات میں ہے کہ بدھ کی صبح سے یہ آندھی کا عذاب شروع ہو کر دوسرے بدھ کی شام تک رہا اس طرح دن تو آٹھ ہو گئے اور راتیں سات آئیں۔

حُسُوۡمًا، حاسم کی جمع ہے جس کے معنی قطع کرنے اور استیصال کرنے یعنی بالکل فنا کر دینے والے کے ہیں

مُؤۡتَفِكٰتُ کے معنے باہم مختلط اور ملے جُلے کے ہیں۔ حضرت لوط علیہ السّلام کی بستیوں کو مؤتفکات یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ سب آپس میں ملی ہوئی بستیاں تھیں اور یا اسلئے کہ عذاب آنیکے وقت جب ان کا تختہ اُلٹا گیا تو سب گڈمڈ ہو گئیں۔

فَاِذَا نُفِخَ فِى الصُّوۡرِ نَفۡخَةٌ وَّاحِدَةٌ ، ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی مرفوع حدیث ہے کہ صُور کوئی سینگ (کی شکل کی کوئی چیز) ہے جس میں قیامت کے روز پھونکا جائے گا۔

نَفۡخَةٌ وَّاحِدَةٌ سے مراد یہ ہے کہ یکبارگی اچانک یہ صور کی آواز ہو گی اور ایک آواز مسلسل رہے گی

یہاں تک کہ اس آواز سے سب مرجائیں گے۔ قرآن وسُنت کی نصوص سے قیامت میں صُور کے دو نفخے ہونا ثابت ہیں پہلے نفخہ کو نفخۂ صعق کہا جاتا ہے جس کے متعلق قرآن کریم میں فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ یعنی اس نفخہ سے تمام آسمان والے فرشتے اور زمین پر بسنے والے جن وانس اور تمام جانور بیہوش ہو جائیں گے (پھر اسی بیہوشی میں سب کو موت آجائے گی) دوسرے نفخہ کو نفخۂ بعث کہا جاتا ہے بعث کے معنے اُٹھنے کے ہیں اس نفخہ کے ذریعہ سب مُردے پھر زندہ ہو کر کھڑے ہو جائیں گے جس کا ذکر قرآن کریم کی اس آیت میں ہے ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ، یعنی پھر صور دوبارہ پھُونکا جائے گا جس سے اچانک سب کے سب مُردے زندہ ہو کر کھڑے ہو جاویں گے اور دیکھنے لگیں گے۔

بعض روایات میں جو ان دونوں نفخوں سے پہلے ایک تیسرے نفخہ کا ذکر ہے جس کا نام نفخۂ فزع بتلایا گیا ہے۔ مجموعہ روایات و نصوص میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلا نفخہ ہی ہے اسی کو ابتداء میں نفخۂ فزع کہا گیا ہے اور انتہاء میں وہی نفخہ صعق ہو جائے گا (مظہری)

وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ، یعنی قیامت کے روز عرشِ رحمٰن کو آٹھ فرشتے اُٹھائے ہوئے ہونگے۔ بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ قیامت سے پہلے تو یہ کام چار فرشتوں کے سپرد ہے قیامت کے روز اُن کے ساتھ اور چار بڑھا دیئے جاویں گے۔

رہا یہ معاملہ کہ عرشِ رحمٰن کیا چیز ہے اُس کی حقیقت اور حقیقی شکل و صورت کیا ہے اور فرشتوں کا اُس کو اُٹھانا کس صورت سے ہے یہ سب چیزیں وہ ہیں کہ نہ عقل انسانی اُنکا احاطہ کر سکتی ہے نہ ان مباحث میں ان کو غور و فکر کرنے اور سوالات کرنے کی اجازت ہے۔ سلف صالحین صحابہ و تابعین کا مسلک اس جیسے تمام معاملات میں یہ ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے کہ اس سے جو کچھ اللہ جل شانہ کی مُراد ہے وہ حق ہے اور اُس کی حقیقت و کیفیت نامعلوم ہے۔

يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ، یعنی اُس روز سب اپنے رب کے سامنے پیش ہونگے، کوئی چھپنے والا چھپ نہ سکے گا۔ اللہ تعالیٰ کے علم و بصر سے تو آج بھی کوئی نہیں چھپ سکتا اُس روز کی خصوصیت شاید یہ ہو کہ میدانِ حشر میں تمام زمین ایک سطح مستوی ہو جائے گی نہ کوئی غار رہیگا نہ پہاڑ نہ کوئی تعمیر و مکان نہ کسی درخت وغیرہ کی آڑ، یہی چیزیں ہیں جن کے پیچھے دُنیا میں چھپنے والے چھپا کرتے ہیں وہاں ان میں سے کوئی چیز نہ ہوگی، کسی کو چھپنے کا امکان ہی نہ رہے گا۔

هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ، لفظ هَاؤُم خُذُوْا کے معنے میں ہے جمع کے لئے بولا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس کا نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں آئے گا وہ خوشی کے مارے آس پاس کے لوگوں سے کہنے لگے گا کہ لو یہ میرا اعمال نامہ پڑھو۔

هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ، سُلطان کے لفظی معنے غلبہ و تسلط کے ہیں، اسی لئے حکومت کو سلطنت اور

حاکم کو سُلطان کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دُنیا میں جو مجھے دوسرے لوگوں پر بڑائی اور غلبہ حاصل تھا میں سب میں بڑا مانا جاتا تھا آج وہ بڑائی اور غلبہ بھی کچھ کام نہ آیا اور سلطان بمعنے حجت بھی لیا جا سکتا ہے تو معنے یہ ہونگے کہ افسوس آج میرے ہاتھ میں کوئی حجت و سند نہیں جس کے ذریعہ عذاب سے نجات حاصل ہو سکے۔

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ، یہ حکم فرشتوں کو ہوگا کہ اس مجرم کو پکڑو اور اس کے گلے میں طوق ڈالو لیکن الفاظ آیت میں اسکا ذکر نہیں کہ کون پکڑے اور طوق ڈالے، اسی لئے بعض روایات میں ہے کہ یہ حکم صادر ہوگا تو ہر در و دیوار اور ہر چیز مطیع و فرمانبردار نوکروں کی طرح ہے اس کے پکڑنے کو دوڑے گی۔

ثُمَّ فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ، یعنی پھر اس کو ایک زنجیر میں پرو دو جسکی مقدار ستر گز ہے۔ زنجیر میں پرونے کا وہ مفہوم بھی مجازاً لیا جا سکتا ہے جو خلاصۂ تفسیر میں لکھا گیا ہے کہ زنجیر میں جکڑ دو لیکن اسکے حقیقی معنے یہ ہیں کہ زنجیر انکے بدن کے اندر ڈالکر دوسری طرف نکال لو جیسے موتی یا تسبیح کے دانے پروئے جاتے ہیں بعض روایاتِ حدیث سے اسی حقیقی معنی کی تائید بھی ہوتی ہے (از مظہری)

فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ، حمیم مخلص اور گہرے دوست کو کہا جاتا ہے اور غسلین بکسر غین وہ پانی ہے جس میں جہنمیوں کے زخموں کی پیپ وغیرہ دھوئی جاوے گی۔ مطلب آیات کا یہ ہے کہ آج اسکا کوئی دوست عزیز اس کی حمایت نہ کر سکے گا اور اس کو عذاب سے نہ بچا سکے گا اور اسکے کھانے کے لئے سوائے اُس گندے پانی کے جسمیں اہلِ جہنم کی پیپ اور پس پڑی ہوگی اور کچھ نہ ہوگا۔ اور کچھ نہ ہونے کا مفہوم اوپر خلاصۂ تفسیر میں یہ بتلایا گیا ہے کہ مرغوب کھانوں میں سے کچھ نہ ہوگا۔ غسلین کی طرح کی کوئی اور مکروہ بد ذائقہ چیز کی نفی نہیں ہے اسلئے دوسری آیت میں جو اہلِ جہنم کا زقوم کھانا آیا ہے وہ اس کے منافی نہیں۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ، یعنی قسم ہے اُن تمام چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو یا دیکھ سکتے ہو۔ اور جن کو تم نہ دیکھتے ہو نہ دیکھ سکتے ہو، اسمیں تمام مخلوقات آگئیں۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ نہ دیکھنے کی چیزوں سے مراد حق تعالیٰ کی ذات و صفات ہیں۔ بعض نے فرمایا کہ دیکھنے کی چیزوں سے مراد دُنیا کی چیزیں ہیں اور نہ دیکھنے کی چیزوں سے مراد آخرت کی اشیاء (مظہری) واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا الخ ، تقوّل کے معنی بات گھڑنے کے ہیں۔ اور وَتین قلب سے نکلنے والی وہ رگ ہے جس سے رُوح جسمِ انسانی میں پھیلتی ہے اسکے قطع کر دینے سے موت فوراً واقع ہو جاتی ہے۔

سابقہ آیات میں کفارِ مکہ کے اس بیہودہ خیال کا رد کیا گیا تھا، کوئی آپ کو شاعر اور آپکے کلام کو شعر کہتا تھا، کوئی آپ کو کاہن اور کلام کو کہانت کہتا تھا۔ کاہن وہ شخص ہوتا ہے جو کچھ شیاطین سے خبریں پا کر کچھ نجوم کے اثرات سے معلوم کر کے آنے والے واقعات میں اٹکل پچو باتیں کیا کرتا تھا۔ غرض آپ کو شاعر یا کاہن کہنے والوں کے الزام کا حاصل یہ تھا کہ آپ جو کلام سُناتے ہیں یہ اللہ کیطرف سے نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

خود اپنے خیالات سے یا کاہنوں کی طرح شیاطین سے کچھ کلمات، جمع کر لیتے ہیں اُن کو اللہ تعالیٰ کیطرف منسوب کرتے ہیں۔ مذکورہ آیات میں حق تعالیٰ نے اُن کے اس خیال باطل کو ایک دوسری صورت سے بڑی شدت کے ساتھ اس طرح رد کیا ہے کہ دیوانو، اگر یہ رسُول معاذ اللہ ہماری طرف جھوٹی باتیں منسوب کرتے اور ہم پر افترا پردازی کرتے تو کیا ہم یُوں ہی دیکھتے رہتے اور ان کو ڈھیل دیدیتے کہ خلق خدا کو گمراہ کریں۔ یہ بات کوئی عقل والا باور نہیں کرسکتا اس لئے اس آیت میں بطور فرض محال کے ارشاد فرمایا کہ اگر یہ رسُول کوئی قول بھی اپنی طرف سے گھڑ کر ہماری طرف منسوب کرتے تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ کر ان کی رگ جان کاٹ ڈالتے اور پھر ہماری سزا سے اُن کو کوئی بھی نہ بچا سکتا یہاں یہ شدت کے الفاظ ان جاہلوں کو سُنانے کے لئے فرض محال کے طور پر استعمال فرمائے ہیں۔ داہنا ہاتھ پکڑنے کی تخصیص غالباً اسلئے ہے کہ جب کسی مجرم کو قتل کیا جاتا ہے تو قتل کرنے والا اسکے بالمقابل کھڑا ہوتا ہے قتل کرنے والے کے بائیں ہاتھ کے مقابل مقتول کا داہنا ہاتھ ہوتا ہے اُس کو یہ قتل کرنے والا اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑ کر داہنے ہاتھ سے اس پر حملہ کرتا ہے۔

تنبیہ اس آیت میں ایک خاص واقعہ کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ اگر خدانخواستہ معاذ اللہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے کوئی بات گھڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیتے تو آپکے ساتھ یہ معاملہ کیا جاتا، اس میں کوئی عام ضابطہ بیان نہیں کیا گیا کہ جو شخص بھی نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرے ہمیشہ اسکو ہلاک ہی کر دیا جائیگا، یہی وجہ ہے کہ دُنیا میں بہت سے لوگوں نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا اُن پر کوئی ایسا عذاب نہیں آیا۔

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ، اس سے پہلی آیتوں میں یہ تبلایا گیا تھا کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے کچھ نہیں فرماتے جو کچھ ہے وہ اللہ کا کلام ہے اور وہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لئے تذکرہ اور نصیحت ہے مگر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ان سب قطعی اور یقینی اُمور کو جانتے ہوئے تم میں بہت سے آدمی اس کی تکذیب بھی کرتے رہیں گے جسکا نتیجہ آخرت میں اُن کی حسرت و یاس اور عذاب دائمی ہوگا اور آخر میں فرمایا وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ، یعنی یہ بات بالکل حق اور یقینی ہے اسمیں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں۔ سب کے آخر میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ۔ جس میں اشارہ ہے کہ آپ ان معاند کفار کی باتوں پر دھیان نہ دیں اور ان سے مغموم نہ ہوں بلکہ اپنے رب عظیم کی تسبیح و تقدیس کو اپنا مشغلہ بنالیں کہ یہی ان سب غموں سے نجات کا ذریعہ ہے اور یہ ایسا ہے جیسا دوسری جگہ قرآن کریم میں فرمایا ہے وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ یعنی ہم جانتے ہیں کہ آپ ان کفار کی بیہودہ گفتگو سے دل تنگ ہوتے ہیں اسکا علاج یہ ہے کہ آپ اپنے رب کی حمد میں مشغول ہو جائیں اور سجدہ گزاروں میں شامل ہو جائیں اُن کی باتوں کی طرف التفات نہ کریں۔

ابو داؤد میں حضرت عقبہ ابن عامر جہنی کی روایت ہے کہ جب یہ آیت فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ نازل ہوئی تو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو اپنے رکوع میں رکھو اور جب آیت سَبِّحِ اسْمَ

رَبِّكَ الْأَعْلٰى نازل ہوئی تو فرمایا کہ اس کو اپنے سجدہ میں رکھو۔ اسی لیئے باجماع اُمّت رکوع اور سجدے میں یہ دونوں تسبیحات پڑھی جاتی ہیں۔ جمہور کے نزدیک ان کا پڑھنا اور تین مرتبہ تکرار کرنا سُنّت ہے۔ بعض حضرات نے واجب بھی کہا ہے۔

تمّت سورۃ الحاقّۃ بحمد اللہ تعالیٰ

سُورَۃُ المَعَارِج

سُوْرَةُ الْمَعَارِجِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اَرْبَعٌ وَّاَرْبَعُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۂ معارج مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چوالیس آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ① لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ② مِّنَ اللّٰهِ

مانگا ایک مانگنے والے نے عذاب پڑنے والا منکروں کے واسطے کوئی نہیں اس کو ہٹانے والا آئے اللہ کی طرف سے

ذِى الْمَعَارِجِ ③ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِىْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ

جو چڑھتے درجوں والا ہے چڑھیں گے اس کی طرف فرشتے اور رُوح اس دن میں جس کا لنباؤ

خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ④ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ⑤ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ⑥

پچاس ہزار برس ہے سو تو صبر کر بھلی طرح کا صبر کرنا وہ دیکھتے ہیں اس کو دُور

وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ⑦ يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ⑧ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ

اور ہم دیکھتے ہیں اسکو نزدیک جس دن ہوگا آسمان جیسے تانبا پگھلا ہوا اور ہونگے پہاڑ جیسے اُون

كَالْعِهْنِ ⑨ وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ⑩ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ۭ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ

رنگی ہوئی اور نہ پوچھے گا دوستدار دوستدار کو سب نظر آجائیں گے ان کو چاہے گا گناہگار کسی طرح

يَفْتَدِىْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۭ بِبَنِيْهِ ⑪ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ⑫ وَ

چھڑوائی میں دے کر اُس دن کے عذاب سے اپنے بیٹے کو اور اپنی ساتھ والی کو اور اپنے بھائی کو اور

فَصِيْلَتِهِ الَّتِىْ تُـْٔوِيْهِ ⑬ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ ⑭ كَلَّا ۭ

اپنے گھرانے کو جس میں رہتا تھا اور جتنے زمین پر ہیں سب کو پھر اپنے آپ کو بچالے ہرگز نہیں

إِنَّهَا لَظَىٰ ﴿١٥﴾ نَزَّاعَةً لِّلشَّوَىٰ ﴿١٦﴾ تَدْعُو مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّىٰ ﴿١٧﴾ وَجَمَعَ

وہ تپتی ہوئی آگ ہے کھینچ لینے والی کلیجہ پکارتی ہے اس کو جس نے پیٹھ پھیری اور پھر کر چلا گیا اور جوڑا اور

فَأَوْعَىٰ ﴿١٨﴾ إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ﴿١٩﴾ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ﴿٢٠﴾

سینت کر رکھا بیشک آدمی بنا ہے جی کا کچا جب پہنچے اس کو برائی تو بے صبرا

وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ﴿٢١﴾ إِلَّا الْمُصَلِّينَ ﴿٢٢﴾ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ

اور جب پہنچے اُس کو بھلائی تو بے توفیقا مگر وہ نمازی جو اپنی

صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ﴿٢٣﴾ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ﴿٢٤﴾ لِّلسَّائِلِ

نماز پر قائم ہیں اور جن کے مال میں حصہ مقرر ہے مانگنے والے

وَالْمَحْرُومِ ﴿٢٥﴾ وَالَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ ﴿٢٦﴾ وَالَّذِينَ هُم

اور ہارے ہوئے کا اور جو یقین کرتے ہیں انصاف کے دن پر اور جو لوگ کہ

مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِم مُّشْفِقُونَ ﴿٢٧﴾ إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ ﴿٢٨﴾

اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں بیشک اُن کے رب کے عذاب سے کسی کو نڈر نہ ہونا چاہیئے

وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ﴿٢٩﴾ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ

اور جو اپنی شہوت کی جگہ کو تھامتے ہیں مگر اپنی جوروں سے یا اپنے ہاتھ کے

أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ﴿٣٠﴾ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ

مال سے سو اُن پر نہیں کچھ اُلاہنا پھر جو کوئی ڈھونڈے اس کے سوائے سو وہی ہیں

هُمُ الْعَادُونَ ﴿٣١﴾ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ﴿٣٢﴾

حد سے بڑھنے والے اور جو لوگ کہ اپنی امانتوں اور اپنے قول کو نباہتے ہیں

وَالَّذِينَ هُم بِشَهَادَاتِهِمْ قَائِمُونَ ﴿٣٣﴾ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ

اور جو اپنی گواہیوں پر سیدھے ہیں اور جو اپنی نماز سے

يُحَافِظُونَ ﴿٣٤﴾ أُولَٰئِكَ فِي جَنَّاتٍ مُّكْرَمُونَ ﴿٣٥﴾ فَمَالِ الَّذِينَ كَفَرُوا — ع ۳۵/۷

خبردار ہیں وہی لوگ ہیں باغوں میں عزت سے پھر کیا ہوا ہے منکروں کو

قِبَلَكَ مُهْطِعِينَ ﴿٣٦﴾ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِينَ ﴿٣٧﴾ أَيَطْمَعُ

تیری طرف دوڑتے ہوئے آتے ہیں داہنے سے اور بائیں سے غول کے غول کیا طمع رکھتا ہے

كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَن يُدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيمٍ ﴿٣٨﴾ كَلَّا إِنَّا خَلَقْنَاهُم مِّمَّا

ہر ایک شخص اُن میں کہ داخل ہو جائے نعمت کے باغ میں ہرگز نہیں ہم نے ان کو بنایا ہے جس سے وہ بھی

يَعْلَمُونَ ﴿٣٩﴾ فَلَا أُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ إِنَّا لَقَادِرُونَ ﴿٤٠﴾

جانتے ہیں سو میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی تحقیق ہم کر سکتے ہیں

عَلٰٓی اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۴۱﴾ فَذَرْهُمْ

کہ بدل کر لے آئیں اُن سے بہتر اور ہمارے قابو سے نکل نہ جائیں گے سو چھوڑ دے انکو

يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِیْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۲﴾ يَوْمَ

کہ باتیں بنائیں اور کھیلا کریں یہانتک کہ جا ملیں اپنے اُس دن سے جسکا اُن سے وعدہ ہے جس دن

يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ ﴿۴۳﴾

نکل پڑیں گے قبروں سے دوڑتے ہوئے جیسے کسی نشانی پر دوڑتے جاتے ہیں

خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۭ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِیْ

جھکی ہوں گی اُن کی آنکھیں چڑھی آتی ہوگی اُن پر ذلت یہ ہے وہ دن جس کا

كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۴﴾ ع

اُن سے وعدہ تھا

ع ۲ / ۸

خلاصۂ تفسیر

ایک مانگنے والا (براہ انکار) وہ عذاب مانگتا ہے جو کہ کافروں پر واقع ہونے والا ہے (اور) جسکا کوئی دفع کرنے والا نہیں (اور) جو اللہ کیطرف سے واقع ہوگا جو کہ سیڑھیوں کا (یعنی آسمانوں کا) مالک ہے (جن سیڑھیوں سے) فرشتے اور (اہل ایمان کی) روحیں اس کے پاس چڑھ کر جاتی ہیں (اس کے پاس سے مراد یہ ہے کہ عالم بالا میں جو موقع انکے عروج کا منتہا مقرر کیا گیا ہے وہاں جاتی ہیں اور چونکہ اس عروج کا رستہ آسمان ہیں اس لئے ان کو معارج (یعنی سیڑھیاں) فرمادیا اور وہ عذاب) ایسے دن میں (واقع) ہوگا جس کی مقدار (دُنیا کے) پچاس ہزار سال (کی برابر) ہے (مراد قیامت کا دن ہے جو کچھ حقیقی مقدار سے کچھ اُس کے اشتداد سے کفار کو اسقدر طُول محسوس ہوگا اور چونکہ کفر و سرکشی کے مراتب کے اعتبار سے اس کی شدت اور درازی مختلف ہوگی کسی کے لئے بہت زیادہ، کسی کے لئے کچھ کم، اس لئے ایک آیت میں کالف سنۃ آیا ہے اور کافروں کی تخصیص اسلئے کی کہ حدیث میں ہے کہ مؤمن کو وہ دن اسقدر ہلکا معلوم ہوگا جیسے ایک فرض پڑھنے کا وقت (کذا فی الدر عن ابی سعید مرفوعاً بروایت احمد والبیہقی وغیرھما) سو (جب عذاب کا آنا ثابت ہے تو) آپ (ان کی مخالفت پر) صبر کیجئے اور صبر بھی ایسا جس میں شکایت کا نام نہ ہو (یعنی انکے کفر و خلاف سے ایسے تنگ نہ ہوجئے کہ شکایت حکایت زبان پر آجاوے بلکہ یہ سمجھ کر تحمل کیجئے کہ ان کو سزا ہونے والی ہے اور اس یوم سزا کا جو ان کو انکار ہے سو) یہ لوگ اس دن کو (قیامت پر ایمان نہ ہونے کے سبب اسکے وقوع کو) بعید دیکھ رہے ہیں اور ہم (کو اسکا وقوع یقینی معلوم ہے اس لئے) اس کو (وقوع سے) قریب دیکھ رہے ہیں (اور وہ عذاب اس روز واقع ہوگا) جس دن (کہ) آسمان (رنگ میں) تیل کی تلچھٹ کی طرح

ہو جاویگا (اور ایک آیت میں کَالدِّھَانِ ہے جس کی تفسیر ادیم احمر یعنی سرخ چمڑے سے کی گئی ہے تو جمع دونوں میں یہ ہے کہ سُرخی کی شدّت سے بھی سیاہی کے مشابہ رنگ پیدا ہو جاتا ہے پس احمر اور اسود دونوں کہنا صحیح ہے۔ یا اوّل ایک رنگ ہو پھر دوسرا بدل جاوے کما نقل ابن کثیر فی الرحمٰن عن الحسن تتلوّن الوانا، اور اگر اس کی تفسیر بھی مثل بعض کے دُرْدِیِّ زَیت سے کی جاوے یعنی روغن زیتون کی تلچھٹ، تو دونوں کا مفہوم متحد ہو جاویگا، غرض آسمان سیاہ ہو جاویگا اور پھٹ بھی جاویگا) اور پہاڑ رنگین اون کی طرح (جو کہ دُھنکی ہوتی ہے لقولہ تعالیٰ کَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ) ہو جاویں گے (یعنی اُڑتے پھریں گے اور رنگین سے تشبیہ اسلئے دی گئی کہ پہاڑ بھی مختلف رنگوں کے ہوتے ہیں کما ھو المذکور فی قولہ تعالیٰ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ) اور (اُس روز) کوئی دوست کسی دوست کو نہ پُوچھے گا (کقولہ تعالیٰ لَا يَتَسَاءَلُوْنَ) باوجودیکہ ایک دوسرے کو دکھا بھی دیئے جاویں گے (یعنی ایک دوسرے کو دیکھیں گے مگر کوئی کسی کی ہمدردی نہ کریگا اور سورۂ صافات میں جو باہم سوال کرنیکا ذکر ہے وہ بطور اختلاف کے ہے بطور ہمدردی کے نہیں اسلئے وہ اس آیت کے منافی نہیں، اس روز) مُجرم (یعنی کافر) اس بات کی تمنّا کریگا کہ اس روز کے عذاب سے چھوٹنے کے لئے اپنے بیٹوں کو اور بیوی کو اور بھائی کو اور کنبہ کو جن میں وہ رہتا تھا اور تمام اہلِ زمین کو اپنے فدیہ میں دیدے پھر یہ (فدیہ میں دیدینا) اس کو (عذاب سے) بچالے (یعنی اس روز ایسی نفسا نفسی ہوگی کہ ہر شخص کو اپنی فکر پڑ جاوے گی، اور کل تک جن پر جان دیتا تھا آج ان کو اپنے فائدے کے لئے عذاب کے سپرد کر دینے کو تیار ہوگا اگر اس کے قابو کی بات ہو لیکن) یہ ہرگز نہ ہوگا (یعنی نجات عن العذاب مطلقاً نہ ہوگی بلکہ) وہ آگ ایسی شعلہ زن ہے جو کھال (تک) اُتار دیگی (اور) وہ اس شخص کو (خود) بُلا دیگی، جس نے (دُنیا میں حق سے) پیٹھ پھیری ہوگی اور (طاعت سے) بے رُخی کی ہوگی اور (دوسروں کا حق مار مار کر یا براہِ حرص مال) جمع کیا ہوگا پھر اسکو اُٹھا اُٹھا رکھا ہوگا (مطلب یہ کہ حقوق اللہ و حقوق العباد ضائع کئے ہوں گے، یا اشارہ ہے فسادِ عقائد و فسادِ اخلاق کی طرف اور بُلانا معنے حقیقی پر محمول ہو سکتا ہے خلاصہ یہ کہ ایسے صفات موجب استحقاق نار ہیں اور اس مجرم میں یہ صفات پائے جاتے ہیں پھر نجات عن العذاب کب متصوّر ہے اور جمع فاوعیٰ سے کفار کا مکلّف بالفروع ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ ان رذائل کی وجہ سے کفار کو اصل عذاب نہیں ہوگا بلکہ اشتداد عذاب ہوگا اور نفس عذاب کفر پر ہوگا، بخلاف گناہگار مؤمنین کے کہ ان کو معاصی پر نفس عذاب بھی ہو سکتا ہے واللہ اعلم۔)

(آگے دوسرے رذائل کا ذکر ہے جو عذاب کا سبب ہوتے ہیں ان سے اہلِ ایمان کا استثنار اور پھر استثناء کا نتیجہ بیان ہے یعنی) انسان کم ہمت پیدا ہوا ہے (مراد انسان سے استثنار کو شامل کرنے کے بعد انسان کافر ہے اور پیدا ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اوّل پیدائش کے وقت سے ہی وہ ایسا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اُس کی جبلّت میں ایسا مادّہ رکھا گیا ہے کہ وہ اپنے وقت پر پہنچکر یعنی بلوغ کے بعد ان رذیل صفات

کا عادی ہو جائے گا، پس کم ہمتی سے مراد طبعی کم ہمتی نہیں ہے بلکہ کم ہمتی کے آثار ذمیمہ اختیاریہ مراد ہیں جن کو آگے بیان فرماتے ہیں یعنی) جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو (حدِ جواز سے زیادہ) جزع فزع کرنے لگتا ہے اور جب اس کو فارغ البالی ہوتی ہے تو (حقوق ضروریہ سے) بُخل کرنے لگتا ہے (یہ تتمہ ہو گیا موجبات عذاب کا جو مَنْ اَدْبَرَ سے شروع ہوئے ہیں) مگر وہ نمازی (یعنی مؤمن ان موجباتِ عذاب سے مستثنیٰ ہیں) جو اپنی نماز پر برابر توجہ رکھتے ہیں (یعنی نماز میں ظاہراً یا باطناً دوسری طرف توجہ نہیں کرتے جس کو قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ میں خٰشِعُوْنَ سے تعبیر فرمایا ہے کذا نقل ابن کثیر عن عقبۃ بن عامر بقولہ الدائم الساکن وعنہ فی الدر المنثور اذا صلّوا لم یلتفتوا عن یمین ولا شمال) اور جن کے مالوں میں سوالی اور بے سوالی سب کا حق ہے (اس کے متعلق مضمون سورۂ ذاریات میں گزر چکا) اور جو قیامت کے دن کا اعتقاد رکھتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کے عذاب سے ڈرنے والے ہیں (اور) واقعی ان کے رب کا عذاب بے خوف ہونے کی چیز نہیں (یہ جملہ معترضہ کے طور پر ہے) اور جو اپنی شرمگاہوں کو (حرام سے) محفوظ رکھنے والے ہیں لیکن اپنی بیبیوں سے یا اپنی (شرعی) لونڈیوں سے (حفاظت نہیں کرتے) کیونکہ ان پر (اسمیں) کوئی الزام نہیں ہاں جو اس کے علاوہ (اور جگہ شہوت رانی کا) طلبگار ہو ایسے لوگ حد (شرعی) سے نکلنے والے ہیں اور جو اپنی (سپردگی میں لی ہوئی) امانتوں اور اپنے عہد کا خیال رکھنے والے ہیں۔ اور جو اپنی گواہیوں کو ٹھیک ٹھیک ادا کرتے ہیں (ان میں کمی بیشی نہیں کرتے) اور جو اپنی (فرض) نماز کی پابندی کرتے ہیں (بس) ایسے لوگ بہشتوں میں عزت سے داخل ہونگے (ان آیات کی تفسیر سورۂ مؤمنون میں دیکھ لی جائے آگے کفار کی حالت کا عجیب ہونا اور وقوع قیامت کا مستبعد ہونا بیان فرماتے ہیں یعنی موجبات سعادت و شقاوت تو اوپر بدلالات واضحہ معلوم ہو چکے) تو (معلوم بالدلیل ہونے کے بعد پھر) کافروں کو کیا ہوا کہ (ان مضامین کی تکذیب کے لئے) آپ کی طرف کو داہنے اور بائیں سے جماعتیں بن بن کر دوڑے آرہے ہیں (یعنی چاہئے تھا کہ ان مضامین کی تصدیق کرتے لیکن یہ لوگ متفق ہو ہو کر آپ کے پاس اس غرض سے آتے ہیں کہ ان مضامین کی تکذیب اور ان کے ساتھ استہزار کریں جیسا کہ کفار عرب نبوت کی خبریں سُن سُن کر اسی غرض سے آتے تھے اور اسلام کو باطل سمجھنے کے ساتھ اپنے کو حق پر سمجھتے تھے اور حق ہونیکا ثمرہ جنت میں جانا ہے اس بنا پر وہ اپنے کو مستحق جنت بھی سمجھتے تھے کقولہ تعالیٰ وَلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰی رَبِّیْٓ اِنَّ لِیْ عِنْدَہٗ لَلْحُسْنٰی، اس لئے اس کے متعلق بطور انکار فرماتے ہیں کہ) کیا ان میں ہر شخص اس کی ہوس رکھتا ہے کہ وہ آسائش کی جنت میں داخل کر لیا جاویگا یہ ہرگز نہ ہوگا (کیونکہ موجبات جہنم کے ہوتے ہوئے جنت کیسے ملجاویگی اور یہ لوگ ان مضامین کی تکذیب میں نفس قیامت کی بھی تکذیب کرتے اور اسکو محال سمجھتے تھے آگے اسکے متعلق ارشاد ہے کہ ان کا استبعاد محض بے وقوفی ہے کیونکہ) ہمنے ان کو ایسی چیز سے پیدا کیا ہے جس کی ان کو بھی خبر ہے (پس جب ان کو معلوم ہے کہ نطفہ سے آدمی کو بنایا ہے اور ظاہر ہے کہ نطفہ سے کہ جسمیں کبھی حیات نہیں آئی آدمی بننے تک جتنا بُعد ہے اُتنا بُعد اجزاء میت سے دوسری بار آدمی بننے تک نہیں ہے کیونکہ ان اجزاء میں

ایک بار حیات پہلے آچکی ہے اس کو محال سمجھنا ان کی بے وقوفی ہے) پھر (دوسرے طور پر دفع استبعاد وقوع قیامت کے لئے) میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی (معنے اس کے سورۂ صافات کے شروع میں گزرے ہیں آگے جواب قسم ہے) کہ ہم اس پر قادر ہیں کہ (دنیا ہی میں) ان کی جگہ ان سے بہتر لوگ لے آئیں (یعنی پیدا کر دیں) اور ہم (اس سے) عاجز نہیں ہیں (پس جب نئی مخلوق اور وہ بھی ایسی جس میں صفات کمال زیادہ ہوں جنہیں زیادہ اشیاء پیدا کرنا پڑیں ہم کو پیدا کرنا آسان ہے تو تم کو دوبارہ پیدا کرنا کون مشکل کام ہے۔ پہلا استدلال خود ان منکرین کی حالت کے اعتبار سے ہے اور دوسرا استدلال انکے امثال ونظائر کے امکان مخلوقیت سے۔ اور جب باوجود وضوح حق مع الدلائل کے اپنے انکار وعناد سے باز نہیں آتے) تو آپ ان کو اسی شغل اور تفریح میں رہنے دیجئے، یہانتک کہ ان کو اپنے اس دن سے سابقہ واقع ہو جسکا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے جس دن یہ قبروں سے نکل کر اس طرح دوڑیں گے جیسے کسی پرستش گاہ کی طرف دوڑے جاتے ہیں (اور) ان کی آنکھیں (مارے شرمندگی کے) نیچے کو جھکی ہونگی (اور) ان پر ذلت چھائی ہوگی، یہ ہے ان کا وہ دن جسکا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا (جو کہ اب واقع ہو گیا)

معارف و مسائل

سَاَلَ سَآئِلٌ ، سوال کبھی کسی چیز کی تحقیق کے لئے ہوتا ہے اسکے ساتھ عربی زبان میں صلہ حرف عن کا استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی سوال بمعنے درخواست اور کسی چیز کی طلب کے ہوتا ہے یہاں ایسا ہی ہے اسی لئے اسکے صلہ میں بجائے عَن کے حرف باء آیا۔ بعذاب معنے یہ ہیں کہ ایک مانگنے والے نے عذاب مانگا۔ نسائی میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ یہ مانگنے والا نضر بن حارث تھا جس نے قرآن اور رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی تکذیب میں اس جرأت سے کام لیا کہ کہنے لگا اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ، یعنی یہ دعا کی کہ یا اللہ اگر یہ قرآن ہی حق ہے اور آپ کی طرف سے، تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا کوئی دوسرا عذاب الیم بھیجدے۔ (مظہری) اللہ تعالیٰ نے اسکو غزوۂ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں عذاب دیا (مظہری بروایت ابن ابی حاتم) اس شخص نے اللہ تعالیٰ کا جو عذاب اپنے منہ مانگا تھا آگے اس کی کچھ حقیقت کا بیان ہے کہ یہ عذاب کافروں پر ضرور واقع ہو کر رہے گا (خواہ دنیا میں یا آخرت میں یا دونوں میں) اس عذاب کو دفع کرنا کسی کے بس میں نہیں۔ یہ عذاب اللہ کیطرف سے ہے جو درجات عالیہ والا ہے۔ یہ آخری جملہ پہلے جملے کی دلیل بھی ہے کہ جو عذاب اللہ بالا و برتر کیطرف سے ہو اسکو دفع کرنا اور ٹالنا کسی کے لئے کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔

معارج، معرج کی جمع ہے عروج سے مشتق ہے جس کے معنی اوپر چڑھنے کے ہیں اور معرج و معراج اُس سیڑھی کو کہا جاتا ہے جسمیں نیچے سے اوپر چڑھنے کے لئے بہت سے درجات ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفت اس آیت میں ذی معارج اس معنی سے ہی کہ اللہ تعالیٰ درجات عالیہ والا ہے (کذا قال سعید بن جبیر) اور یہ درجات عالیہ اوپر نیچے سات آسمان ہیں۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ ذی المعارج کے معنے ہیں۔ ذی السموٰات یعنی مالک سمٰوات۔

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ ، یعنی یہ درجات جو تہ بہ تہ اوپر نیچے ہیں ان درجات کے اندر چڑھتے ہیں فرشتے اور رُوح الامین یعنی جبرئیل امین ۔ جبرئیل علیہ السلام بھی اگرچہ فرشتوں کے زمرہ میں شامل ہیں لیکن اُنکے خصوصی اعزاز کے لئے ان کا الگ نام ذکر فرمایا گیا ہے ۔

فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ، یہ جملہ ایک فعل محذوف سے متعلق ہے یعنی یَقَعُ مطلب یہ ہے کہ یہ عذاب جسکا اوپر ذکر آیا ہے کہ کافروں پر ضرور واقع ہو کر رہے گا ۔ اسکا وقوع اُس روز ہو گا جس کی مقدار پچاس ہزار سال کی ہوگی ۔ حضرت ابو سعید خدری رضؓ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اُس دن کے متعلق سوال کیا جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی کہ یہ دن کتنا دراز ہوگا ۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ یہ دن مومن پر اتنا ہلکا ہوگا کہ ایک نماز فرض ادا کرنے کے وقت سے بھی کم ہوگا (رواہ احمد و ابو یعلی و ابن حبان والبیہقی بسند حسن ۔ مظہری)

اور حضرت ابو ہریرہ رضؓ سے یہ حدیث روایت کی گئی ہے ، کہ

یکون علی المؤمنین کمقدار ما بین الظہر والعصر اخرجہ الحاکم والبیہقی مرفوعاً و موقوفاً (مظہری)	یعنی یہ روز مومنین کے لئے اتنا ہوگا جتنا وقت ظہر وعصر کے درمیان ہوتا ہے یہ روایت حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً بھی منقول ہے موقوفاً بھی

ان روایاتِ حدیث سے معلوم ہوا کہ اس دن کا یہ طول کہ پچاس ہزار سال کا ہوگا ایک اضافی امر ہے کفار کے لئے اتنا دراز اور مومنین کے لئے اتنا مختصر ہوگا ۔

روزِ قیامت کی درازی ایکہزار سال یا پچاس ہزار کی تحقیق اس آیت میں روزِ قیامت کی مقدار پچاس ہزار سال بتلائی ہے ۔ اور سورۂ تنزیل السجدہ کی آیت میں ایک ہزار سال آئے ہیں آیت یہ ہے يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ، یعنی تدبیر کرتے ہیں امرِ الٰہی کی آسمان سے زمین تک پھر چڑھتے ہیں اس کی طرف ایک ایسے دن میں جس کی مقدار ایک ہزار سال ہے عام شمار کے اعتبار سے ۔ بظاہر ان دونوں آیتوں کے مضمون میں تعارض اور تضاد ہے اسکا جواب مذکورہ روایات حدیث سے ہوگیا کہ اس دن کا طول مختلف گروہوں کے اعتبار سے مختلف ہوگا، تمام کفار کے لئے پچاس ہزار سال کا اور مومنین صالحین کے لئے ایک نماز کا وقت ان کے درمیان طوائف کفار ہیں ممکن ہے کہ بعض کے لئے صرف ایک ہزار سال کی برابر ہو ۔ اور وقت کا دراز اور مختصر ہونا شدت و بے چینی اور آرام و عیش میں مختلف ہونا مشہور و معروف ہے کہ بے چینی اور شدتِ تکلیف کا ایک گھنٹہ بعض اوقات انسان کو ایک دن بلکہ ایک ہفتہ عشرہ سے زیادہ محسوس ہوتا ہے اور آرام و عیش کا بڑے سے بڑا وقت مختصر معلوم ہوتا ہے ۔

اور آیت تنزیل السجدہ جس میں ایک ہزار سال کا دن بیان کیا گیا ہے اس کی ایک توجیہ تفسیر مظہری میں یہ بیان کی ہے کہ اس آیت میں جس دن کا ذکر ہے وہ دُنیا ہی کے دنوں میں کا ایک دن ہے اسمیں جبرئیل علیہ السلام اور فرشتوں کا آسمان سے زمین پر آنا پھر زمین سے آسمان واپس جانا اتنی بڑی مسافت کو طے کرتا ہے کہ انسان

طے کرتا تو اس کو ایک ہزار سال لگتے، کیونکہ احادیث صحیحہ میں آیا ہے آسمان سے زمین تک پانسو سال کی مسافت ہے تو پانسو سال اوپر سے نیچے آنے کے اور پانسو واپس جانیکے یہ کل ایک ہزار سال انسانی چال کے اعتبار سے ہیں کہ بالفرض انسان اس مسافت کو قطع کرتا تو آنے اور جانیں ایک ہزار سال لگ جاتے۔ اگرچہ فرشتے اس مسافت کو بہت ہی مختصر وقت میں طے کر لیتے ہیں۔ تو سورۂ سجدہ کی آیت میں دُنیا ہی کے دنوں میں سے ایک دن کا بیان ہوا اور سورۂ معارج میں قیامت کے دن کا بیان ہے جو ایامِ دُنیا سے بہت بڑا ہوگا اور اس کی درازی اور کوتاہی مختلف لوگوں پر اپنے اپنے حالات کے اعتبار سے مختلف محسوس ہوگی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۝ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ، یہاں قریب و بعید باعتبار مسافت یا زمانے کے نہیں بلکہ بعید از امکان یا بعید از وقوع مُراد ہے اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ یہ لوگ تو قیامت کے وقوع بلکہ امکان کو بھی بعید سمجھ رہے ہیں اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ اسکا وقوع یقینی ہے۔

وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ۝ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ، حمیم کے معنی گہرے اور مخلص دوست کے ہیں قیامت کی شدت کا بیان ہے کہ اُس روز کوئی دوست کسی دوست کو نہ پُوچھے گا، مدد کرنا تو درکنار، آگے یہ بھی بتلادیا کہ یہ نہ پوچھنا اس لئے نہیں کہ وہ دوست سامنے نہیں ہوگا بلکہ قدرتِ الٰہیہ ان سب کو ایک دوسرے کے سامنے بھی کردے گی، مگر ہر شخص نفسی نفسی کے عالم میں ہوگا کوئی کسی دوسرے کی تکلیف و راحت کیطرف التفات نہ کرسکے گا۔

كَلَّا ۭ اِنَّهَا لَظٰى ۝ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ، انہا کی ضمیر نار کی طرف راجع ہے اور لظیٰ کے معنے خالص شعلہ بغیر آمیزش کے اور شویٰ شواۃ کی جمع ہے جس کے معنی سر کی کھال کے بھی ہیں اور ہاتھوں پاؤں کی کھال کے بھی، یعنی جہنم کی آگ ایک سخت بھڑکنے والا شعلہ ہوگا جو دماغ کی یا ہاتھوں پاؤں کی کھال اُتار دیگا۔

تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ۝ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ، خود بُلائے گی یہ آگ اُس شخص کو جس نے حق سے پیٹھ موڑی اور رُخ پھیرا اور مال جمع کیا پھر اس کو روک کر رکھا۔ مراد جمع کرنے سے وہ ہے کہ خلاف شرع ناجائز طریقوں سے جمع کرے اور روکنے سے مراد یہ ہے کہ مال پر عائد ہونے والے فرائض و واجبات ادا نہ کرے جیسا کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ، ہلوع کے لفظی معنی حریص بے صبر کم ہمت آدمی کے ہیں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ آیت میں ہلوع سے مراد وہ شخص ہے جو مال حرام کی حرص میں مبتلا ہو اور حضرت سعید بن جبیرؒ نے فرمایا کہ اس سے مراد بخیل آدمی ہے اور مقاتل رحنے فرمایا کہ تنگدل بے صبر آدمی مراد ہے اور یہ سب معانی متقارب ہیں۔ ہلوع کے مفہوم میں سب داخل ہیں، اس ہلوع کی تشریح خود قرآن کے الفاظ میں آرہی ہے

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب اس کو پیدا ہی اس حال میں کیا ہے اور یہ عیب اُس کی تخلیق میں رکھے ہیں تو پھر اسکا کیا قصور ہوا وہ مجرم کیوں قرار دیا گیا۔ وجہ یہ ہے کہ مراد اس سے انسانی فطرت اور جبلّت میں رکھی ہوئی استعداد اور مادّہ ہے سو اسمیں حق تعالیٰ نے ہر خیر و صلاح کا مادہ اور استعداد بھی رکھی ہے اور شر و فساد

کی بھی۔ اور اس کو عقل و ہوش بھی عطا فرمایا اور اپنی کتابوں اور رسولوں کے ذریعہ ہر ایک کام کا انجام بھی بتلا دیا تو اپنے اختیار سے مادہ شر و فساد کی پرورش کی اپنے اختیاری اعمال کو اُس رُخ پر ڈال دیا تو وہ مجرم ان اختیاری اعمال کی وجہ سے قرار پایا جو مادہ اُس کی پیدائش میں ودیعت رکھا گیا تھا اسکی وجہ سے اسکو مجرم نہیں قرار دیا گیا جیسا کہ آگے ہلوع کے معنی کی تشریح خود قرآن کریم نے کی ہے انمیں صرف افعال اختیاریہ کا ذکر فرمایا ہے وہ یہ ہیں۔

اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا، یعنی اس انسان کی کم ہمتی اور بے صبری کا یہ عالم ہے کہ جب اس کو کوئی تکلیف و مصیبت پیش آجاتی ہے تو صبر سے کام نہیں لیتا اور جب کوئی راحت و آرام اور مال و دولت ملجاتا ہے تو اس میں بخل کرتا ہے۔ یہاں بے صبری اور جزع سے مراد وہ ہے جو حدود شرع سے باہر ہوں اسی طرح بخل سے مراد فرائض و واجبات کی ادائیگی میں کوتاہی ہے (کما مر) آگے عام انسانوں کی اس خصلت مذکورہ سے مومنین صالحین کو مستثنیٰ کیا گیا ہے اور اُن کے اعمال و اخلاق صالحہ کا ذکر کیا گیا ہے جو اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ سے شروع ہو کر عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ تک بیان کئے گئے ہیں۔ یہاں استثنار بلفظ مصلّین کیا گیا ہے یعنی نمازی اور مُراد اس سے مومنین ہیں اسمیں اشارہ اس طرف ہے کہ نماز مومن کی پہلی اور سب سے بڑی علامت ہے مومنین کہلانے کے مستحق وہی لوگ ہوسکتے ہیں جو نمازی ہیں۔ آگے ان مصلّین کی یہ صفت بتلائی ہے اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ، مراد اس سے یہ ہے کہ وہ نمازی جو پوری نماز میں اپنی نماز کی طرف متوجہ رہیں ادھر اُدھر التفات نہ کریں۔ امام بغوی نے اپنی سند کیساتھ ابوالخیر سے روایت کیا ہے کہ ہم نے حضرت عقبہ بن عامر رضہ نے اس آیت عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ کا مطلب پوچھا کہ کیا اس کی مراد یہ ہے جو ہمیشہ ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں اُنھوں نے فرمایا کہ نہیں یہ مُراد نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ جو اوّل سے آخر نماز تک اپنی نماز کیطرف متوجہ رہے، داہنے بائیں آگے پیچھے التفات نہ کرے اسکا حاصل مفہوم وہی ہوا جو سورہ مومنون میں اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ کا ہے تو اس جملہ میں نماز کے خشوع کا ذکر ہوا اور آگے جو جملہ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ آرہا ہے اُسمیں نماز اور آداب نماز پر مداومت کا ذکر ہے اسلئے مضمون میں تکرار نہ ہوا۔ آگے مومنین صالحین کی جو صفات بیان کی گئی ہیں یہ سب تقریباً وہی ہیں جو سورہ مومنون میں بیان ہوئی ہیں اور اسی سورت میں اُن کے معانی کی پوری تفسیر مکمل لکھی جا چکی ہے اُس کو دیکھ لیا جاوے۔

مقادیر زکوٰۃ منجانب اللہ مقرر ہیں اُن میں کمی بیشی کا کسی کو اختیار نہیں

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ، اس آیت سے معلوم ہوا کہ مقادیر زکوٰۃ اللہ تعالیٰ کیطرف سے متعین اور معلوم ہیں جن کی تفصیل رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے احادیث صحیحہ میں منقول ہے۔ اسلئے مقادیر زکوٰۃ خواہ نصاب زکوٰۃ سے متعلق ہوں یا مقدار واجب سے دونوں اللہ تعالیٰ طرف سے مقرر کردہ طے شدہ ہیں یہ زمانے اور حالات کے بدلنے سے نہیں بدل سکتیں۔

فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ، اس سے پہلی آیت میں نفسانی خواہش اور شہوت کا جائز مصرف منکوحہ بیوی یا شرعی لونڈی بتلایا گیا تھا اس آیت میں ان دو صورتوں کے سوا شہوت رانی کی

ہر صورت کو ممنوع و ناجائز قرار دیا ہے اس میں نکاح کی وہ صورتیں بھی داخل ہیں جو شرعاً حلال نہیں جیسے اُن عورتوں سے نکاح جن سے شرعاً نکاح حرام ہے اسی طرح مُتعہ جو شرعاً نکاح نہیں۔

اپنے ہاتھ سے شہوت پوری کرنا حرام ہے اور اکثر فقہاء رحمہم اللہ نے استمناء بالید یعنی اپنے ہاتھ سے شہوت پوری کر لینے کو بھی اس کے عموم میں داخل قرار دیکر حرام قرار دیا ہے۔ ابن جُریج فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عطاء سے اسکے متعلق پُوچھا تو اُنھوں نے فرمایا مکروہ ہے۔ میں نے سُنا ہے محشر میں کچھ ایسے لوگ آئیں گے جن کے ہاتھ حاملہ ہونگے میرا گمان یہ ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جو اپنے ہاتھ سے شہوت پوری کرتے ہیں۔ اور حضرت سعید بن جبیر رح نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی قوم پر عذاب نازل فرمایا جو اپنے ہاتھوں سے اپنی شرمگاہوں سے کھیلتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَلعون من نکح یدہٗ یعنی جو اپنے ہاتھ سے نکاح کرے وہ ملعون ہے۔ سنداس کی ضعیف ہے (مظہری)

تمام حقوق اللہ اور سب حقوق العباد امانت میں داخل ہیں۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ، اس آیت میں امانات جمع کا صیغہ استعمال فرمایا ہے جیسے دوسری جگہ بھی اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا فرمایا ہے دونوں جگہ بلفظ جمع لانیمیں اسطرف اشارہ ہے کہ امانت صرف وہ مال ہی نہیں جو کسی نے آپکے پاس رکھدیا ہو بلکہ تمام حقوق واجبہ جنکا ادا کرنا آپکے ذمّہ فرض ہے وہ سب امانات ہیں انمیں کوتاہی کرنا خیانت ہے اسمیں تمام حقوق اللہ نماز روزہ حج زکوٰۃ بھی داخل ہیں اور تمام حقوق العباد جو منجانب اللہ کسی پر واجب ہیں یا اسنے خود کسی معاہدے اور معاملے کے ذریعہ اپنے پر لازم کرلئے ہیں وہ سب امانت کی فہرست میں داخل اور اُن کی ادائیگی فرض، اسمیں کوتاہی خیانت ہے۔ (از مظہری ملخصاً)

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ، یہاں بھی لفظ شہادات کو بلفظ جمع لانے میں اسطرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ شہادت کی بہت سی قسمیں ہیں اور ہر قسم شہادت کو قائم رکھنا واجب ہے۔ اسمیں شہادت ایمان توحید و رسالت بھی داخل ہے۔ ہلال رمضان اور حدود شرعیہ کی شہادت بھی اور لوگوں کے باہمی معاملات جو کسی کے سامنے ہوئے ہوں اُن کی شہادت بھی، کہ ان شہادتوں کا چھپانا اور ان میں کمی بیشی کرنا حرام ہے انکو صحیح صحیح قائم کرنا اس آیت کی رو سے فرض ہے (از مظہری) واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

تمّت بحمد اللہ یوم الثلثاء ۸ رجب سنہ ۱۳۹۱ھ

سُورَۃ نُوح

سُورَۃُ نُوحٍ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَمَانٌ وَّعِشْرُونَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۂ نوح مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی اٹھائیس آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

إِنَّا أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ أَنْ أَنذِرْ قَوْمَكَ مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَهُمْ

ہم نے بھیجا نوح کو اُس کی قوم کی طرف کہ ڈرا اپنی قوم کو اس سے پہلے کہ پہنچے اُن پر

عَذَابٌ أَلِيمٌ (۱) قَالَ يَا قَوْمِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ (۲) أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ

عذاب دردناک بولا اے قوم میری میں تم کو ڈر سناتا ہوں کھول کر کہ بندگی کرو اللہ کی

وَاتَّقُوهُ وَأَطِيعُونِ (۳) يَغْفِرْ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ

اور اس سے ڈرو اور میرا کہنا مانو تاکہ بخشے وہ تم کو کچھ گناہ تمھارے اور ڈھیل دے تم کو ایک مقرر وعدہ

مُّسَمًّى ۚ إِنَّ أَجَلَ اللَّهِ إِذَا جَاءَ لَا يُؤَخَّرُ ۖ لَوْ كُنتُمْ تَعْلَمُونَ (۴)

تک وہ جو وعدہ کیا ہے اللہ نے جب آپہنچے گا اُس کو ڈھیل نہ ہوگی اگر تم کو سمجھ ہے

وقف لازم

قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا (۵) فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَائِي

بولا اے رب میں بلاتا رہا اپنی قوم کو رات اور دن پھر میرے بلانے سے اور زیادہ

إِلَّا فِرَارًا (۶) وَإِنِّي كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوا أَصَابِعَهُمْ فِي

بھاگنے لگے اور میں نے جب کبھی اُن کو بلایا تاکہ تو اُن کو بخشے ڈالنے لگے انگلیاں اپنے

آذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَأَصَرُّوا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا (۷) ثُمَّ

کانوں میں اور لپیٹنے لگے اپنے اوپر کپڑے اور ضد کی اور غرور کیا بڑا غرور پھر

إِنِّي دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا (۸) ثُمَّ إِنِّي أَعْلَنتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا (۹)

میں نے اُن کو بلایا برملا پھر میں نے ان کو کھول کر کہا اور چھپ کر کہا چپکے سے

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ﴿١٠﴾ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ

تو میں نے کہا گناہ بخشواؤ اپنے رب سے بیشک وہ ہے بخشنے والا چھوڑ دے گا آسمان کی تم پر

مِدْرَارًا ﴿١١﴾ وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَلْ لَكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَلْ

دھاریں اور بڑھا دیگا تم کو مال اور بیٹوں سے اور بنا دیگا تمھارے واسطے باغ اور بنا دے گا

لَكُمْ أَنْهَارًا ﴿١٢﴾ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا ﴿١٣﴾ وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا ﴿١٤﴾

تمھارے لئے نہریں کیا ہوا ہے تم کو کیوں نہیں امید رکھتے اللہ سے بڑائی کی اور اسی نے بنایا تم کو طرح طرح سے

أَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللَّهُ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ طِبَاقًا ﴿١٥﴾ وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا

کیا تم نے نہیں دیکھا کیسے بنائے اللہ نے سات آسمان تہ پر تہ اور رکھا چاند کو ان میں اُجالا

وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ﴿١٦﴾ وَاللَّهُ أَنْبَتَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا ﴿١٧﴾ ثُمَّ يُعِيدُكُمْ

اور رکھا سورج کو چراغ جلتا ہوا اور اللہ نے اُگایا تم کو زمین سے جما کر پھر مکرر ڈالیگا تم کو

فِيهَا وَيُخْرِجُكُمْ إِخْرَاجًا ﴿١٨﴾ وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ بِسَاطًا ﴿١٩﴾ لِتَسْلُكُوا

اس میں اور نکالے گا تم کو باہر اور اللہ نے بنا دیا تمھارے لئے زمین کو بچھونا تاکہ چلو

مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ﴿٢٠﴾ قَالَ نُوحٌ رَبِّ إِنَّهُمْ عَصَوْنِي وَاتَّبَعُوا مَنْ لَمْ

اسمیں کشادہ رستے کہا نوح نے اے رب میرے انھوں نے میرا کہا نہ مانا اور مانا ایسے کا جس کو

۱ ع ۲۰ ۹

يَزِدْهُ مَالُهُ وَوَلَدُهُ إِلَّا خَسَارًا ﴿٢١﴾ وَمَكَرُوا مَكْرًا كُبَّارًا ﴿٢٢﴾ وَقَالُوا لَا

اسکے مال اور اولاد سے اور زیادہ ہو ٹوٹا اور داؤ کیا ہے بڑا داؤ اور بولے ہرگز

تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَ

نہ چھوڑیو اپنے معبودوں کو اور نہ چھوڑیو وڈ کو اور نہ سواع کو اور نہ یغوث کو اور یعوق اور

نَسْرًا ﴿٢٣﴾ وَقَدْ أَضَلُّوا كَثِيرًا وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا ضَلَالًا ﴿٢٤﴾ مِمَّا

نسر کو اور بہکا دیا بہتوں کو اور تو نہ زیادہ کرنا بے انصافوں کو مگر بھٹکنا کچھ وہ

خَطِيئَاتِهِمْ أُغْرِقُوا فَأُدْخِلُوا نَارًا فَلَمْ يَجِدُوا لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْصَارًا ﴿٢٥﴾

اپنے گناہوں سے ڈبائے گئے پھر ڈالے گئے آگ میں پھر نہ پائے اپنے واسطے انھوں نے اللہ کے سوائے کوئی مددگار

وَقَالَ نُوحٌ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ﴿٢٦﴾ إِنَّكَ

اور کہا نوح نے اے رب نہ چھوڑیو زمین پر منکروں کا ایک گھر بسنے والا مقرر

إِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿٢٧﴾ رَبِّ اغْفِرْ لِي

اگر تو چھوڑ دیگا اُن کو بہکائیں گے تیرے بندوں کو اور جو جنیں گے سو ڈھیٹھ حق کا منکر اے رب معاف کر

وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ

مجھ کو اور میرے ماں باپ کو اور جو آئے میرے گھر میں ایماندار اور سب ایمان والے مردوں کو اور عورتوں کو

وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا ﴿۲۸﴾

اور گنہگاروں پر بڑھتا رکھ یہی برباد ہونا

خلاصۂ تفسیر

ہم نے نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کے پاس (پیغمبر بنا کر) بھیجا تھا کہ تم اپنی قوم کو (وبال کفر سے) ڈراؤ قبل اسکے کہ ان پر دردناک عذاب آوے (یعنی ان سے کہو کہ اگر ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر عذاب الیم آویگا، خواہ دُنیوی یعنی طوفان یا اُخروی یعنی دوزخ غرض) اُنھوں نے (اپنی قوم سے) کہا کہ اے میری قوم میں تمھارے لئے صاف صاف ڈرانے والا ہوں (اور کہتا ہوں) کہ تم اللہ کی عبادت (یعنی توحید اختیار) کرو اور اس سے ڈرو اور میرا کہنا مانو وہ تمھارے گناہ معاف کر دیگا (مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ کی تحقیق سورۂ احقاف میں گزر چکی) اور تم کو وقت مقرر (یعنی وقت موت) تک (بلا عقوبت) مہلت دیگا (یعنی ایمان نہ لانے پر جس عذاب کا مرنے سے پہلے وعدہ کیا جاتا ہے اگر ایمان لے آئے تو وہ عذاب نہ آویگا اور باقی موت کے لئے جو) اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت (ہے) جب (وہ) آجاویگا تو ٹلے گا نہیں۔ (یعنی موت تو آنا ہر حال میں ضروری ہے ایمان میں بھی اور کفر میں بھی لیکن دونوں حالتوں میں اتنا فرق ہے کہ ایک حالت میں علاوہ عذاب آخرت کے دُنیا میں بھی عذاب ہوگا اور ایک حالتیں مثل دُنیا و آخرت دونوں کے عذابوں سے محفوظ رہو گے) کیا خوب ہوتا اگر تم (ان باتوں کو) سمجھتے (جب مدتہائے دراز تک ان نصائح کا کچھ اثر قوم پر نہ ہوا تو) نوح (علیہ السلام) نے (حق تعالیٰ سے) دُعا (اور التجا) کی کہ اے میرے پروردگار میں نے اپنی قوم کو رات کو بھی اور دن کو بھی (دین حق کیطرف) بُلایا، سو میرے بُلانے پر (دین سے) اور زیادہ بھاگتے رہے اور (وہ بھاگنا یہ ہوا کہ) میں نے جب کبھی اُن کو (دین حق کی طرف) بُلایا تاکہ (انکے ایمان کے سبب) آپ اُن کو بخشدیں تو ان لوگوں نے اپنی اُنگلیاں اپنے کانوں میں دے لیں (تاکہ حق بات سُنیں بھی نہیں، اور یہ نفرت کی انتہا ہے) اور (نیز انتہائی بغض سے انھوں نے) اپنے کپڑے (اپنے اوپر) لپیٹ لئے (تاکہ حق بات کہنے والے کو دیکھیں بھی نہیں، اور کہنے والا بھی اُن کو نہ دیکھے) اور (انھوں نے اپنے کفر و انکار پر) اصرار کیا اور (میری اطاعت سے) غایت درجہ کا تکبر کیا (مگر باوجود اس تنفیر و تکبّر کے) پھر (بھی میں ان کو مختلف طریقوں سے نصیحت کرتا رہا چنانچہ) میں نے ان کو (دینِ حق کیطرف) باواز بلند بُلایا (مراد اس سے خطاب و وعظ عام ہے جسمیں عادۃً آواز بلند ہوتی ہے) پھر میں نے ان کو (خطاب خاص کے طور پر) علانیہ بھی سمجھایا اور انکو بالکل خفیہ بھی سمجھایا (یعنی جتنے طریقے نفع کے ہوسکتے تھے سب ہی طرح سمجھایا، غرض اوقات میں بھی عموم کیا گیا، کما قال لَيْلًا وَّنَهَارًا اور کیفیات میں بھی کما قال دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا الخ) اور (اس سمجھانے میں)

میں نے (ان سے یہ) کہا کہ تم اپنے پروردگار سے گناہ بخشواؤ (یعنی ایمان لے آؤ تاکہ گناہ بخشے جائیں) بیشک وہ بخشنے والا ہے (اگر تم ایمان لے آؤ گے تو علاوہ اُخروی نعمت کے) کہ (مغفرت ہے دُنیوی نعمتیں بھی تم کو عطا کریگا، چنانچہ) کثرت سے تم پر بارش بھیجے گا اور تمہارے مال اور اولاد میں ترقی دیگا اور تمہارے لئے باغ لگا دیگا اور تمہارے لئے نہریں بہا دیگا (ان نعمتوں کے ذکر سے شاید یہ فائدہ ہو کہ اکثر طبائع میں نقد اور جلد حاصل ہونے والی چیزوں کی طلب زیادہ ہے - درِ منثور میں قتادہ کا قول ہے کہ وہ لوگ دُنیا کے زیادہ حریص تھے اسلئے یہ فرمایا اور اس پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ بسا اوقات یہ اُمور دنیویہ ایمان و استغفار پر مرتب نہیں ہوتے، بات یہ ہے کہ یا تو یہ وعدہ خاص انہی لوگوں کے لئے ہوگا اور اگر عام ہو تو قاعدہ ہے کہ موعود سے افضل کوئی چیز ملجانا بھی ایفائے وعدہ ہی ہوتا ہے بلکہ وعدہ سے زیادہ، پس ایمان کامل پر روحانی مسرّت و قناعت و رضا بالقضا ضرور عطا ہوتا ہے جو ان اشیاء سے بھی افضل و اکمل ہے بلکہ ساری متاعِ دُنیا اور سب اشیائے مذکورہ کا اصلی مقصد بھی تو دل کا سکون و آرام ہی ہے - آگے نوح علیہ السلام کا تتمہ کلام ہے یعنی میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ) تم کو کیا ہوا کہ تم اللہ تعالیٰ کی عظمت کے معتقد نہیں ہو حالانکہ (مقتضیات اعتقاد عظمت کے موجود ہیں کہ) اس نے تم کو طرح طرح سے بنایا (کہ عناصر اربعہ سے تمہاری غذا، پھر غذا سے نطفہ اور نطفہ کے بعد علقہ و مُضغہ وغیرہ کی مختلف صورتوں سے گزر کر مکمل انسان بنا، یہ دلیل تو خود انسان کی ذات سے متعلق تھی، آگے دلیل آفاقی فرماتے ہیں کہ) کیا تم کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح سات آسمان اوپر تلے پیدا کئے اور ان میں چاند کو نور (کی چیز) بنایا اور سورج کو (مثل) چراغ (روشن کے) بنایا (اور چاند گو سب آسمانوں میں نہیں ہے مگر فیھنّ باعتبار مجموعہ کے فرما دیا، اور اس کے متعلق کچھ سورۂ فرقان میں گزر چکا ہے) اور اللہ تعالیٰ نے تم کو زمین سے ایک خاص طور پر پیدا کیا (یا تو اس طرح کہ حضرت آدم علیہ السلام مٹی سے بنائے گئے اور یا اس طرح کہ انسان نطفہ سے بنا اور نطفہ غذا سے اور غذا عناصر سے بنی اور عناصر میں غالب اجزاء مٹی کے ہیں) پھر تم کو (بعد مرگ) زمین ہی میں لیجاویگا اور (قیامت میں پھر اسی زمین سے) تم کو باہر لے آویگا اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے زمین کو (مثل) فرش (کے) بنایا تاکہ تم اس کے کھُلے رستوں میں چلو (یہ تمام تر وہ کلام ہے جس کی حکایت نوح علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے بطور فریاد کے کی اور یہ سب حکایت عرض کر کے) نوح (علیہ السلام) نے (یہ) کہا کہ اے میرے پروردگار ان لوگوں نے میرا کہنا نہیں مانا اور ایسے شخصوں کی پیروی کی کہ جن کے مال اور اولاد نے ان کو نقصان ہی زیادہ پہنچایا (مراد ان شخصوں سے رؤسا ہیں جن کا عوام اتباع کیا کرتے ہیں اور مال اور اولاد کا ان رؤسا کو نقصان پہنچانا بایں معنے ہے کہ مال و اولاد سرکشی کا سبب بن گئے) اور (انھوں نے جنکا اتباع کیا ہے وہ ایسے ہیں) جنھوں نے (حق کے مٹانے میں) بڑی بڑی تدبیریں کیں اور جنھوں نے (اپنے تابعین سے یہ) کہا کہ تم اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور نہ (بالخصوص) ودّ کو

اور سواع کو اور یغوث کو اور یعوق کو اور نسر کو چھوڑنا (خصوصیت ان کے ذکر کی اس لئے ہے کہ یہ بُت زیادہ مشہور تھے) اور ان (رئیس) لوگوں نے بہتوں کو (بہکا بہکا کر) گمراہ کر دیا (وہ مکر کبّار یہی گمراہ کرنا ہی) اور (چونکہ مجھ کو آپ کے ارشاد لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ سے معلوم ہوگیا کہ یہ اب ایمان نہ لاویں گے اس لئے یہ بھی دُعا کرتا ہوں کہ) ان ظالموں کی گمراہی اور بڑھا دیجئے (تاکہ یہ لوگ مستحقِ ہلاکت ہوجائیں، اس سے معلوم ہوا کہ مقصود دعا کرنا زیادہ ضلال کی نہیں بلکہ استحقاق ہلاکت کی ہے اور تحقیق اس دُعا کی سورۂ یونس میں قصہ موسیٰ علیہ السلام میں گزری ہے۔ غرض انجام ان لوگوں کا یہ ہوا کہ) اپنے ان ہی گناہوں کے سبب وہ غرق کئے گئے پھر (بعد غرق برزخی یا اُخروی) دوزخ میں داخل کئے گئے اور خدا کے سوا ان کو کچھ حمایتی بھی میسر نہ ہوئے اور نوح (علیہ السلام) نے (یہ بھی) کہا کہ اے میرے پروردگا کافروں میں سے زمین پر ایک باشندہ بھی مت چھوڑ (بلکہ سب کو ہلاک کر دے اور عموم ہلاکت و عموم بعثت کی بحث سورۂ صافّات میں گزری ہے آگے اس دعا کی علّت ہے کیونکہ) اگر آپ انکو روئے زمین پر رہنے دیں گے تو (حسب ارشاد لَنْ یُّؤْمِنَ الخ) یہ لوگ آپ کے بندوں کو گمراہ کریں گے اور (آگے بھی) ان کے محض فاجر اور کافر ہی اولاد پیدا ہوگی (اور کافروں کے لئے بد دُعا کرنے کے بعد مؤمنین کے لئے دُعا فرمائی کہ) اے میرے رب مجھ کو اور میرے ماں باپ کو اور جو مؤمن ہونے کی حالت میں میرے گھر میں داخل ہیں ان کو (یعنی اہل و عیال باستثنار زوجہ اور کنعان کے) اور تمام مسلمان مَردوں اور مسلمان عورتوں کو بخش دیجئے اور (چونکہ مقصود مقام میں بد دُعا ہے کافروں کے لئے اور مؤمنین کے لئے دُعا محض مقابلے کی مناسبت سے ہوگئی تھی اسلئے پھر مضمون بد دعا کی طرف عود ہے جس میں وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا ضَلٰلًا کے مقصود کی تفسیر ہے یعنی) ان ظالموں کی ہلاکت اور بڑھا دیجئے (یعنی ان کی نجات کی کوئی صورت نہ رہے ہلاک ہی ہو جاویں، اور یہی مقصود تھا اس دُعا سے کہ ان کی گمراہی بڑھا دی جائے اور ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام کے والدین مؤمن تھے اور اگر اس کے خلاف ثابت ہو جائے تو والدین سے مراد آبار و اُمّہات بعیدہ ہونگے، اول دُعا اپنے نفس کے لئے کی پھر اُصول کے لئے پھر اہل و عیال کے لئے پھر عام تابعین کے لئے)۔

معارف و مسائل

یَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ، حرف مِنْ اکثر تبعیض یعنی جزئیت بتلانے کے لئے آتا ہے اگر یہ معنے لئے جاویں تو مطلب یہ ہے کہ ایمان لانے سے تمھارے وہ گناہ معاف ہو جائیں گے جنکا تعلق حقوق اللہ سے ہے کیونکہ حقوق العباد کی معافی کے لئے ایمان لانے کے بعد بھی یہ شرط ہی کہ جو حقوق ادائیگی کے قابل ہیں ان کو ادا کرے جیسے مالی واجبات، اور جو قابلِ ادائیگی نہیں جیسے زبان یا ہاتھ سے کسی کو ایذار

پہنچائی اُس سے معاف کرائے۔

حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ ایمان لانے سے پچھلے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں اسمیں بھی حقوق العباد کی ادائیگی یا معافی شرط ہے۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ حرف مِنْ اس جگہ زائد ہے اور مراد یہی کہ ایمان لانے سے تمھارے سب گناہ معاف ہو جائینگے، مگر دوسری نصوص کی بنار پر شرط مذکور بہرحال ضروری ہے۔

وَيُؤَخِّرْكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى، اَجَل کے معنے مدت اور مسمّٰی سے مراد متعین کردہ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم ایمان لے آئے تو اللہ تعالیٰ تمھیں اس مدت تک دُنیا میں مہلت دیگا جو تمھارے لئے مقرر اور متعین ہی یعنی مقررہ مدت عمر سے پہلے تمھیں کسی دُنیاوی عذاب میں پکڑ کر ہلاک نہ کریگا۔ اسکا حاصل یہ ہوا کہ اگر ایمان نہ لائے تو یہ بھی ممکن ہے کہ مدتِ مقررہ سے پہلے ہی تمپر عذاب لاکر ہلاک کردے۔ معلوم ہوا کہ عمر کی مدّتِ مقررہ میں بعض اوقات کوئی شرط ہوتی ہے کہ اس نے فلاں کام کرلیا تو اس کی عمر مثلاً اسّی سال ہوگی اور نہ کیا تو ساٹھ سال میں موت مسلّط کردی جائے گی یا منفی کاموں میں اللہ کی ناشکری سے عمر گھٹ جانا اور شکرگزاری سے عمر بڑھ جانا، اسی طرح بعض اعمال مثلاً والدین کی اطاعت و خدمت سے عمر میں ترقی ہونا جو احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اسکا بھی یہی مطلب ہے۔

انسان کی عمر میں کمی زیادتی کی بحث اس کی تشریح تفسیر مظہری میں یہ ہے کہ تقدیر اور قضائے الٰہی کی دو قسمیں ہیں ایک مُبرم یعنی قطعی، دوسری معلّق یعنی جو کسی شرط پر معلق ہو۔ یعنی لوحِ محفوظ میں اس طرح لکھا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے اگر اللہ کی اطاعت کی تو اس کی عمر مثلاً ستّر سال ہوگی اور نہ کی تو پچاس سال میں مار دیا جائیگا اس دوسری قسم تقدیر میں شرط نہ پائے جانے پر تبدیلی ہو سکتی ہے۔ قرآن کریم میں ان دونوں قسم کی قضا و تقدیر کا ذکر اس آیت میں ہے يَمْحُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ یعنی اللہ تعالیٰ لوحِ محفوظ میں محو و اثبات یعنی ترمیم و تبدیل کرتا رہتا ہے اور اللہ کے پاس ہے اصل کتاب، اصل کتاب سے مراد وہ کتاب ہے جسمیں تقدیر مبرم لکھی ہوئی ہے کیونکہ تقدیر معلّق میں جو شرط لکھی گئی ہی اللہ تعالیٰ کو پہلے ہی سے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ شخص یہ شرط پوری کریگا یا نہیں، اس لئے تقدیر مبرم میں قطعی فیصلہ لکھا جاتا ہے۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، لا یردّ القضاء الا الدعاء ولا یزید فی العمر الا البرّ رواہ الترمذی (مظہری) یعنی قضائے الٰہی کو کوئی چیز بجز دُعا کے نہیں روک سکتی اور کسی کی عمر میں زیادتی بجز برّ والدین کے نہیں ہو سکتی۔ برّ کے معنے اُن کے ساتھ اچھا سلوک ہے اور مطلب اس حدیث کا یہی ہے کہ تقدیر معلق میں ان اعمال کیوجہ سے تبدیلی ہو سکتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں جو اَجَلٍ مُّسَمًّى تک مؤخر کرنے کو ان کے ایمان لانے پر موقوف کیا ہے یہ اُن کی عمر کے بارے میں تقدیر معلّق کا بیان ہے جسکا اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو علم

عطا فرما دیا ہوگا اسکے سبب سے اُنھوں نے اپنی قوم کو بتلایا کہ تم ایمان لائے تو جو اصلی عمر تمھارے لئے اللہ نے مقرر فرمائی ہے وہاں تک تمھیں مہلت ملے گی اور کسی عذاب دُنیوی کے ذریعہ ہلاک نہ کئے جاؤ گے اور اگر ایمان نہ لائے تو اس اصلی عمر سے پہلے ہی خدا تعالیٰ کا عذاب تمھیں ہلاک کر دیگا اور آخرت کا عذاب اس صورت میں اسکے علاوہ ہوگا۔ آگے یہ بھی بتلا دیا کہ ایمان لانے پر بھی ہمیشہ کے لئے موت سے نجات نہیں ہوگی بلکہ تقدیر مُبرم میں جو تمھاری عمر لکھی ہوئی ہے اُس پر موت آنا ضروری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے اس عالمِ دُنیا کو دائمی نہیں بنایا یہاں کی ہر چیز کو فنا ہونا تقاضائے حکمت ہے اسمیں ایمان و اطاعت اور کفر و معصیت سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ میں اسکا بیان ہے آگے حضرت نوح علیہ السلام کا اپنی قوم کی اصلاح و ایمان کے لئے مسلسل مختلف قسم کی کوششوں میں لگے رہنے کا اور قوم کی طرف سے اُن کی مخالفت و تکذیب کا بیان تفصیل سے آیا ہے اور آخر میں مایوس ہوکر بد دُعا کرنے اور پوری قوم کے عذابِ غرق میں مبتلا ہونے کا بیان ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو چالیس سال کی عمر میں نبوّت عطا ہوئی اور قرآنی تصریح کیمطابق آپکی عمر پچاس کم ایکہزار سال ہوگی، اس پوری مدت دراز میں نہ کبھی اپنی کوشش کو چھوڑا نہ کبھی مایوس ہوئے قوم کی طرف سے طرح طرح کی ایذائیں دی گئیں سب پر صبر کرتے رہے۔

بروایت ضحاک حضرت ابنِ عباسؓ سے منقول ہے کہ ان کی قوم ان کو اتنا مارتی کہ وہ گر جاتے تو انکو ایک کمبل میں لپیٹ کر مکان میں ڈالدیتے تھے اور یہ سمجھتے تھے یہ مرگئے، مگر پھر جب اگلے روز ان کو ہوش آتا تو اُن کو اللہ کیطرف بلاتے اور تبلیغ کے عمل میں لگ جاتے۔ محمد بن اسحٰق نے عبید بن عمر ولیثی سے روایت کیا ہے کہ ان کو یہ خبر پہنچی ہے کہ نوح علیہ السلام کی قوم ان کا گلا گھونٹ دیتی تھی جس سے وہ بیہوش ہو جاتے اور جب ہوش آتا تو یہ دُعا کرتے تھے ربِّ اغفر لقومی انّھم لا یعلمون۔ اے میرے پروردگار، میری قوم کو معاف کر دے کیونکہ وہ جانتے نہیں۔ اُنکی ایک نسل کے ایمان لانیسے مایوسی ہوئی تو یہ اُمید رکھتے تھے کہ اُنکی اولاد میں کوئی ایمان لے آئیگا وہ نسل بھی گزر جاتی تو تیسری نسل سے یہی توقع لگاکر اپنے فرضِ منصبی میں مشغول رہتے کیونکہ ان نسلوں کی عمریں اتنی طویل نہ تھیں جتنی حضرت نوح علیہ السلام کو بطور معجزہ عطا ہوئی تھی، جب ان کی نسل پر نسل گزرتی رہی اور ہر آنیوالی نسل پچھلی سے زیادہ شریر اور بد تر ثابت ہوئی تو حضرت نوح علیہ السلام نے بارگاہ ربّ العزّت میں اپنا شکوہ پیش فرمایا جسمیں تبلایا کہ میں نے ان کو رات دن اجتماعاً و انفراداً، علانیہ اور خفیہ جو جو طریقہ کسی کو راستہ پر لانیکا ہو سکتا ہے وہ سب اختیار کیا، کبھی اللہ کے عذاب سے ڈرایا، کبھی جنّتوں کی نعمتوں کی ترغیب دلائی اور یہ بھی کہ ایمان اور عمل صالح کی برکت سے تمھیں دُنیا میں بھی فراخی اور خوشحالی نصیب ہوگی۔ کبھی اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی نشانیوں کو پیش کرکے سمجھایا مگر اُنھوں نے ایک نہ سُنی، دوسری طرف حق تعالیٰ نے انکو یہ بھی تبلا دیا کہ آپکی پوری قوم میں جسکو ایمان لانا تھا

لے آیا آگے انہیں کوئی ایمان قبول نہ کریگا اِنَّہٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ کا یہی مطلب ہے
اُسوقت حضرت نوح علیہ السلام کی زبان پر بددُعا کے کلمات آئے جسکا آگے ذکر کیا گیا جس کے نتیجہ میں
پوری قوم غرق و ہلاک ہوگئی بجز مومنین کے جن کو ایک کشتی میں سوار کر لیا گیا تھا قوم کی فہمائش کے سلسلہ
میں نوح علیہ السلام نے ان کو اللہ تعالیٰ سے استغفار کرنے یعنی ایمان لاکر پچھلے گناہوں کی معافی مانگنے کی
دعوت دی اور اسکا دُنیاوی نفع یہ بتلایا کہ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْکُمْ مِّدْرَارًا وَّیُمْدِدْکُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِیْنَ
اس سے اکثر علماء نے استدلال کیا ہے کہ گناہوں سے توبہ و استغفار سے اللہ تعالیٰ بارش حسب موقع برسا دیتے ہیں
قحط نہیں پڑنے دیتے اور مال و اولاد میں استغفار سے برکت ہوتی ہے کہیں کسی حکمتِ الٰہیہ کے تقاضے سے
اسکے خلاف بھی ہوتا ہے مگر عادۃ اللہ عام لوگوں کے ساتھ یہی ہے کہ توبہ استغفار اور ترک معصیت سے دُنیا
کی بلائیں بھی ٹل جاتی ہیں۔ روایاتِ حدیث سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ
طِبَاقًا وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا، اس آیت میں دلائل توحید و قدرت کے سلسلے میں سات آسمانوں
کا طبق بر طبق ہونا اور پھر اُن میں قمر کا نور ہونا ارشاد ہوا ہے جس میں لفظ فِيْهِنَّ سے ظاہراً یہ سمجھا جاتا ہے
کہ چاند آسمانوں کے جرم کے اندر داخل ہے آجکل کی نئی تحقیقات و مشاہدات سے اس کے خلاف یہ مفہوم
ہوتا ہے کہ چاند آسمانوں سے بہت نیچے فضائے آسمانی میں ہے جس کو آجکل خلاء کہا جاتا ہے اس کی مفصّل
تحقیق سورۂ فرقان کی آیت جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔
اس کو دیکھ لیا جائے۔ قوم کے شکوہ کے سلسلہ میں فرمایا وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا، کبار اکبر کا مبالغہ ہے جس کے معنے
بہت بڑے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انھوں نے بہت بڑا مکر کیا وہ یہ تھا کہ خود تو تکذیب کرکے ایذائیں
پہنچاتے ہی تھے بستی کے غنڈوں اور شریروں کو بھی ان کے پیچھے ڈالدیتے تھے۔ اسی شکوہ میں کفار کا یہ قول نقل فرمایا
کہ انھوں نے باہم معاہدہ کیا کہ لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا یعنی اپنے بتوں
کو خصوصاً ان پانچ بڑے بتوں کی عبادت کو نہ چھوڑو یہ پانچ نام ہیں پانچ بُتوں کے۔

امام بغوی نے نقل کیا ہے کہ یہ پانچوں دراصل اللہ کے نیک صالح بندے تھے جو آدم علیہ السلام اور نوحؑ
کے درمیانی زمانے میں گزرے تھے اُن کے بہت سے لوگ معتقد اور متبع تھے ان لوگوں نے ان کی وفات کے
بعد بھی ایک عرصہ دراز تک اُنھیں کے نقشِ قدم پر عبادت اور اللہ کے احکام کی اطاعت جاری رکھی۔
کچھ عرصہ کے بعد شیطان نے ان کو سمجھایا کہ تم اپنے جن بزرگوں کے تابع عبادت کرتے ہو اگر اُن کی تصویریں
بنا کر سامنے رکھا کرو تو تمھاری عبادت بڑی مکمل ہو جائے گی خشوع و خضوع حاصل ہوگا۔ یہ لوگ اس
فریب میں آکے ان کے مجسمے بنا کر عبادت گاہ میں رکھنے اور ان کو دیکھ کر بزرگوں کی یاد تازہ ہو جانسے ایک
خاص کیفیت محسوس کرنے لگے یہانتک کہ اسی حال میں یہ لوگ سب یکے بعد دیگرے مر گئے اور بالکل نئی
نسل نے ان کی جگہ لے لی تو شیطان نے ان کو یہ پڑھایا کہ تمھارے بزرگوں کے خدا اور معبود بھی بُت تھے وہ

اُنھیں کی عبادت کیا کرتے تھے یہاں سے بُت پرستی شروع ہوگئی اور ان پانچ بتوں کی عظمت ان کے دلوں میں چونکہ سب سے زیادہ بیٹھی ہوئی تھی اس لئے باہمی معاہدے میں ان کا نام خاص طور سے لیا گیا۔

وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ، یعنی ان ظالموں کی گمراہی اور بڑھا دیجئے۔ یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ انبیاء علیہم السّلام کا فرض منصبی قوم کو ہدایت کرنیکا ہے۔ نوح علیہ السلام نے اُن کی گمراہی کی بددُعا کیسے کی کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ نوح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اسکی تو خبر دیدی تھی کہ اب انمیں کوئی مسلمان نہیں ہوگا اسلئے ان کا گمراہی اور کفر پر مرنا تو یقینی تھا حضرت نوح علیہ السّلام نے ان کی گمراہی بڑھا دینے کی دُعا اسلئے فرمائی کہ جلد ان کا پیمانہ لبریز ہو جائے اور ہلاک کر دئیے جائیں۔

مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ، یعنی یہ لوگ اپنی خطاؤں کفر و شرک کیوجہ سے پانی میں غرق کئے گئے تو یہ آگ میں داخل ہوگئے۔ یہ متضاد عذاب کہ ڈوبے پانی میں اور نکلے آگ میں، حق تعالیٰ کی قدرت سے کیا بعید ہے اور ظاہر ہے کہ یہاں جہنم کی آگ تو مراد نہیں کیونکہ اسمیں داخلہ تو قیامت کے حساب کتاب کے بعد ہوگا یہ برزخی آگ ہے جسمیں داخل ہونے کی قرآن کریم نے خبر دی ہے۔

عذاب قبر قرآن سے ثابت ہے | اس آیت سے معلوم ہوا کہ عالم برزخ یعنی قبر میں رہنے کے زمانے میں بھی مُردوں پر عذاب ہوگا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ جب قبر میں بدعمل کو عذاب ہوگا تو نیک عمل والوں کو ثواب اور نعمت بھی ملے گی۔ احادیث صحیحہ متواترہ ہیں قبر کے اندر عذاب و ثواب ہونیکا بیان اس کثرت اور وضاحت سے آیا ہے کہ انکار نہیں کیا جاسکتا اسلئے اس پر اُمّت کا اجماع اور اسکا اقرار اہل سنت والجماعت کی علامت ہے

تمّت سورۂ نوح بحمد اللہ لیلۃ الاربعاء ۸ رجب سنہ ۱۳۹۱ھ

سُورَةُ الْجِنّ

سُورَةُ الْجِنِّ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ ثَمَانٌ وَعِشْرُونَ آيَةً وَفِيهَا رُكُوعَانِ

سورۂ جن مکہ میں نازل ہوئی اور اسکی اٹھائیس آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

قُلْ أُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا ①

تو کہہ مجھ کو حکم آیا کہ سُن گئے کتنے لوگ جنوں کے پھر کہنے لگے ہم نے سُنا ہے ایک قرآن عجیب

يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ ۖ وَلَن نُّشْرِكَ بِرَبِّنَا أَحَدًا ② وَأَنَّهُ تَعَالَىٰ جَدُّ

کہ سمجھاتا ہے نیک راہ سو ہم اُس پر یقین لائے اور ہرگز نہ شریک بتلائیں گے ہم اپنے رب کا کسی کو اور یہ کہ اونچی ہے شان ہمارے

رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَلَا وَلَدًا ③ وَأَنَّهُ كَانَ يَقُولُ سَفِيهُنَا عَلَى اللّٰهِ

رب کی نہیں رکھی اُس نے جورو نہ بیٹا اور یہ کہ ہم میں کا بیوقوف اللہ پر بڑھا کر

شَطَطًا ④ وَأَنَّا ظَنَنَّا أَن لَّن تَقُولَ الْإِنسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ⑤ وَأَنَّهُ

باتیں کہا کرتا تھا اور یہ کہ ہم کو خیال تھا کہ ہرگز نہ بولیں گے آدمی اور جنّ اللہ پر جھوٹ اور یہ کہ

كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْإِنسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوهُمْ رَهَقًا ⑥

تھے کتنے مرد آدمیوں میں کے پناہ پکڑتے تھے کتنے مردوں کی جنوں میں کے پھر تو وہ اور زیادہ سر چڑھنے لگے

وَأَنَّهُمْ ظَنُّوا كَمَا ظَنَنتُمْ أَن لَّن يَبْعَثَ اللّٰهُ أَحَدًا ⑦ وَأَنَّا لَمَسْنَا السَّمَاءَ

اور یہ کہ اُن کو بھی خیال تھا جیسا تم کو خیال تھا کہ ہرگز نہ اُٹھائے گا اللہ کسی کو اور یہ کہ ہم نے ٹٹول دیکھا آسمان کو

فَوَجَدْنَاهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيدًا وَشُهُبًا ⑧ وَأَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ

پھر پایا اس کو بھر رہے ہیں اُس میں چوکیدار سخت اور انگارے اور یہ کہ ہم بیٹھا کرتے تھے ٹھکانوں میں

لِلسَّمْعِ ۖ فَمَن يَسْتَمِعِ الْآنَ يَجِدْ لَهُ شِهَابًا رَّصَدًا ⑨ وَأَنَّا لَا نَدْرِي أَشَرٌّ

سُننے کے واسطے پھر جو کوئی اب سُننا چاہے وہ پائے اپنے واسطے ایک انگارا گھات میں اور یہ کہ ہم نہیں جانتے کہ بُرا

أُرِيدَ بِمَن فِي الْأَرْضِ أَمْ أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ⑩ وَأَنَّا مِنَّا الصَّالِحُونَ وَ

ارادہ ٹھہرا ہے زمین کے رہنے والوں پر یا چاہا ہے اُن کے حق میں انکے رب نے راہ پر لانا اور یہ کہ کوئی ہم میں نیک ہیں اور

مِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ۭ كُنَّا طَرَاۗىِٕقَ قِدَدًا ﴿١١﴾ وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِي

کوئی اس کے سوائے ہم تھے کئی راہ پر پھٹے ہوئے اور یہ کہ ہمارے خیال میں آگیا کہ ہم چھپ نہ جائیں گے اللہ سے

الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ﴿١٢﴾ وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰٓى اٰمَنَّا بِهٖ ۭ فَمَنْ

زمین میں اور نہ تھکا دیں گے اس کو بھاگ کر اور یہ کہ جب ہم نے سن لی راہ کی بات تو ہم نے اسکو مان لیا پھر جو کوئی

يُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا ﴿١٣﴾ وَّاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ

یقین لائے گا اپنے رب پر سو وہ نہ ڈریگا نقصان سے اور نہ زبردستی سے اور یہ کہ کچھ ہم میں حکمبردار ہیں اور

مِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ۭ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰۗىِٕكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ﴿١٤﴾ وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ

کچھ ہیں بے انصاف سو جو لوگ حکم میں آگئے سو انھوں نے اٹکل کر لیا نیک راہ کو اور جو بے انصاف ہیں

فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ﴿١٥﴾ وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَي الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ

وہ ہوئے دوزخ کے ایندھن اور یہ حکم آیا کہ اگر لوگ سیدھے رہتے راہ پر تو ہم پلاتے ان کو

مَّاۗءً غَدَقًا ﴿١٦﴾ لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ۭ وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا

پانی بھر کر تاکہ ان کو جانچیں اسمیں اور جو کوئی منہ موڑے اپنے رب کی یاد سے وہ ڈالدیگا اس کو چڑھتے

صَعَدًا ﴿١٧﴾ وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿١٨﴾ وَّاَنَّهٗ

عذاب میں اور یہ کہ مسجدیں اللہ کی یاد کیواسطے ہیں سو مت پکارو اللہ کے ساتھ کسی کو اور یہ کہ

لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ﴿١٩﴾ۧ قُلْ اِنَّمَآ

ع ۱۹

جب کھڑا ہوا اللہ کا بندہ کہ اس کو پکارے لوگوں کا بندھنے لگتا ہے اس پر ٹھٹھ تو کہہ میں تو

اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ﴿٢٠﴾ قُلْ اِنِّىْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ

پکارتا ہوں بس اپنے رب کو اور شریک نہیں کرتا اسکا کسی کو تو کہہ میرے اختیار میں نہیں تمھارا برا اور

لَا رَشَدًا ﴿٢١﴾ قُلْ اِنِّىْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ڏ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ

نہ راہ پر لانا تو کہہ مجھ کو نہ بچائے گا اللہ کے ہاتھ سے کوئی اور نہ پاؤں گا اس کے سوائے

دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿٢٢﴾ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ

کہیں سرک رہنے کو جگہ مگر پہنچانا ہے اللہ کی طرف سے اور اسکے پیغام لانے اور جو کوئی حکم نہ مانے اللہ کا اور

رَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ﴿٢٣﴾ ۭ حَتّٰٓي اِذَا رَاَوْا

اسکے رسول کا سو اسکے لئے آگ ہے دوزخ کی رہا کریں اسمیں ہمیشہ یہاں تک کہ جب دیکھیں گے

مَا يُوْعَدُوْنَ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا ﴿٢٤﴾ قُلْ

جو کچھ ان سے وعدہ ہوا تب جان لیں گے کس کے مددگار کمزور ہیں اور گنتی میں تھوڑے تو کہہ

اِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّيْٓ اَمَدًا ﴿٢٥﴾ عٰلِمُ الْغَيْبِ

میں نہیں جانتا کہ نزدیک ہے جس چیز کا تم سے وعدہ ہوا ہے یا کردے اسکو میرا رب ایک مدت کے بعد جاننے والا بھید کا

فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ

سو نہیں خبر دیتا اپنے بھید کی کسی کو مگر جو پسند کر لیا کسی رسول کو تو وہ چلاتا ہے

مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿۲۷﴾ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ

اُس کے آگے اور پیچھے چوکیدار تاکہ جانے کہ انھوں نے پہنچائے پیغام

رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ﴿۲۸﴾

اپنے رب کے اور قابو میں رکھا ہے جو اُن کے پاس ہے اور گن لی ہے ہر چیز کی گنتی

خلاصۂ تفسیر

شانِ نزول تفسیر آیات سے پہلے چند واقعات جاننے کے قابل ہیں جن کی ضرورت تفسیر میں پیش آوے گی۔ واقعۂ اوّل، رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت سے پہلے شیاطین آسمان تک پہنچ کر فرشتوں کی باتیں سُنتے تھے، آپؐ کی بعثت کے بعد اُن کو شہاب ثاقب کے ذریعہ اِس سُننے سے روک دیا گیا اور اسی حادثہ کی تحقیق کے ضمن میں یہ جنّات آپؐ تک پہنچے جیسا کہ سورۂ احقاف میں گذرا۔ واقعۂ دوم، زمانۂ جاہلیت میں عادت تھی کہ جب کسی جنگل یا وادی میں دَورانِ سفر قیام کی نوبت آتی تو اِس اعتقاد سے کہ جنّات کے سردار ہماری حفاظت کریں گے یہ الفاظ کہا کرتے تھے اعوذ بعزیز ھذا الوادی من شر سفھاء قومہ یعنی میں اِس جنگل کے سردار کی پناہ لیتا ہوں اُس کی قوم کے بیوقوف شریر لوگوں سے۔ واقعۂ سوم، مکۂ مکرمہ میں آپ کی بد دعا سے قحط پڑا تھا اور کئی سال تک رہا۔ واقعۂ چہارم، جب آپؐ نے دعوتِ اسلام شروع کی تو کُفّار مخالفین کا آپؐ کے خلاف ہجوم اور نرغہ ہوا۔ پہلے دو واقعے تفسیر دُر منثور سے اور آخری دو تفسیر ابنِ کثیر سے لئے گئے ہیں۔

آپ (ان لوگوں سے) کہئے کہ میرے پاس اِس بات کی وحی آئی ہے کہ جنّات میں سے ایک جماعت نے قرآن سُنا پھر (اپنی قوم میں واپس جاکر) انہوں نے کہا کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سُنا ہے جو راہِ راست بتلاتا ہے سو ہم تو اس پر ایمان لے آئے (قرآن ہونا تو اُس کے مضمون سے معلوم ہوا اور عجیب ہونا اِس سے کہ مشابہ کلام بشر کے نہیں) اور ہم (اب) اپنے رب کے ساتھ کسی کو ہرگز شریک نہ بنائیں گے (یہ بیان ہے آمنّا بہٖ کا) اور (انہوں نے ان مضامین کا بھی باہم تذکرہ کیا جو ذیل میں آئے ہیں اور وہ مضامین یہ ہیں کہ) ہمارے پروردگار کی بڑی شان ہے اُس نے نہ کسی کو بیوی بنایا اور نہ اَولاد (کیونکہ ایسا ہونا عقلاً محال ہے۔ یہ بیان ہے لن نشرک کا) اور ہم میں جو احمق ہوئے ہیں وہ اللہ کی شان میں حد سے بڑھی ہوئی باتیں کہتے تھے (مُراد اس سے کلماتِ شرک بیوی اور اَولاد کا اثبات وغیرہ ہیں) اور ہمارا (پہلے) یہ خیال تھا کہ انسان اور جنّات کبھی خدا کی شان میں جھوٹ بات نہ کہیں گے (کیونکہ بڑی بے باکی کی

بات ہے اس میں وجہ اپنے مشرک ہونے کی بیان کی کہ چونکہ اکثر جن و اِنس شرک کرتے تھے ہم سمجھے کہ خدا کی شان میں اتنے شخصوں نے جھوٹ پر اتفاق نہ کیا ہوگا۔ بس ہم نے بھی اسی طریقہ کو اختیار کرلیا حالانکہ نہ مطلق لوگوں کا اتفاق کوئی دلیلِ حقانیت ہے اور نہ ہر اتفاق کا اتباع عذر ہے اور یہ شرکِ مذکور تو مشترک تھا) اور (ایک شرک خاص تھا بعضے آدمیوں کے ساتھ جس سے جنات کا کفر اور بڑھ گیا تھا وہ یہ کہ) بہت سے لوگ آدمیوں میں سے ایسے تھے کہ وہ جنات میں سے بعضے لوگوں کی پناہ لیا کرتے تھے، سو اُن آدمیوں نے اُن جنات کی بد دماغی اور بڑھادی (کہ وہ اِس وہم میں مبتلا ہوگئے کہ ہم جنات کے سردار تو پہلے سے تھے اب آدمی بھی ہم کو ایسا بڑا سمجھتے ہیں بس اس سے بد دماغی بڑھی اور کفر و عناد پر اور زیادہ مُصر ہوگئے۔ یہاں تک مضمون متعلق توحید کے تھا) اور (آگے بعثت یعنی قیامت کے متعلق ہے یعنی ان جنات نے باہم یہ بھی تذکرہ کیا کہ) جیسا تم نے خیال کر رکھا تھا ویسا ہی آدمیوں نے بھی خیال کر رکھا تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی کو دوبارہ زندہ نہ کرے گا (مگر یہ مضمون بھی غلط ثابت ہوا اور بعثت کا حق ہونا معلوم ہوا) اور (آگے رسالت کے متعلق مضمون ہے، یعنی ان جنات نے باہم یہ بھی تذکرہ کیا کہ) ہم نے آسمان (کی خبروں) کی (موافق عادتِ سابقہ کے) تلاشی لینا چاہا سو ہم نے اُس کو سخت پہرہ (یعنی محافظ فرشتوں) اور شعلوں سے (کہ جن کے ذریعہ سے حفاظت کی جاتی ہے) بھرا ہوا پایا (یعنی اب پہرہ ہوگیا کہ کوئی جن آسمانی خبر نہ لیجانے پائے اور جو جاوے شہاب ثاقب سے مارا جائے) اور (اس کے قبل) ہم آسمان (کی خبر سُننے) کے موقعوں میں (خبر) سُننے کے لئے جا بیٹھا کرتے تھے (اور یہ مواقع خواہ اجزاء آسمان ہی کے ہوں اور یا اجزاء ہوا یا کسی ملاء یا خلاء کے ہوں جو کہ آسمان کے قریب ہوں اور جنات اپنی لطافت اور عدم ثقل کی وجہ سے اُس پر مستقر ہوسکتے ہوں جیسے بعض پرندے ہوا میں چلتے چلتے ٹھہر جاتے ہیں) سو جو کوئی اب سُننا چاہتا ہے تو اپنے لئے ایک تیار شعلہ پاتا ہے (اور تحقیق مباحث شہاب کی سورۂ حجر کے رکوع دوم میں گذری ہے۔ یہ مضمون رسالت کے متعلق ہے۔ مطلب یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے رسالت دی ہے اور دفع التباس کے لئے باب کہانت بند کردیا ہے اور اس استراق یعنی خبروں کی چوری کا بند ہونا ہی سبب ہوا ان جنات کے پہنچنے کا آپؐ کی خدمت میں، جیسا واقعۂ اوّل میں مذکور ہے) اور (آگے مضامین مذکور کے متممات ہیں کہ) ہم نہیں جانتے کہ (ان جدید پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث فرمانے سے) زمین والوں کو کوئی تکلیف پہنچانا مقصود ہے یا اُن کے رب نے اُن کو ہدایت کرنے کا قصد فرمایا ہے (یعنی مقصود تکوینی ارسالِ رسل کا معلوم نہیں کیونکہ رسول کے اتباع سے رشد و ہدایت ہوتی ہے اور مخالفت سے مضرت و عقوبت اور اتباع اور مخالفت آئندہ کا ہم کو علم نہیں اِس لئے ہم یہ نہیں جانتے کہ ان کے بھیجنے سے قوم کو سزا دینا مقصود ہے یا ہدایت دینا، شاید یہ اس لئے کہا کہ ان کو اپنی قوم کا اندازہ تھا کہ ایمان لانے والے کم ہوں گے اور وہ سزا کے مستحق ہوجائیں گے و نیز نفی علمِ غیب سے تقویت ہے مضمون توحید کی کہ دیکھو بعضے لوگ علمِ غیب کو جنات کی طرف نسبت کرتے ہیں مگر اُن کو اِتنی بھی خبر نہیں) اور ہم میں (پہلے سے بھی) بعضے نیک (ہوتے آئے) ہیں اور بعضے اور طرح کے (ہوتے

آئے) ہیں (غرض) ہم مختلف طریقوں پر تھے (اِسی طرح ان نبی کی خبر سُن کر اب بھی ہم میں دونوں طریقے کے لوگ موجود ہیں) اور (ہمارا طریقہ تو یہ ہے کہ) ہم نے سمجھ لیا ہے کہ ہم زمین (کے کسی حصّہ) میں (جا کر) اللہ تعالیٰ کو ہرا نہیں سکتے اور نہ (اور کہیں) بھاگ کر اُس کو ہرا سکتے ہیں (بھاگنے سے مُراد زمین کے علاوہ آسمان وغیرہ میں بھاگ جانا ہے جو فی الارض کے مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے فہو کقولہٖ تعالیٰ مَآ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ شاید اس سے بھی مقصود انذار ہو کہ اگر کفر کریں گے تو خدا تعالیٰ کے عذاب سے بچ نہیں سکتے اور اپنے پہلے مختلف طریقوں کے بیان کرنے سے شاید یہ مقصود ہو کہ باوجود حق کے واضح ہو جانے کے بعض کا ایمان نہ لانا حق کے حق ہونے میں کوئی شبہ پیدا نہیں کر سکتا کیونکہ یہ تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے) اور ہم نے جب ہدایت کی بات سُن لی تو ہم نے تو اُس کا یقین کر لیا سو (ہماری طرح) جو شخص اپنے رب پر ایمان لے آوے گا تو اُس کو نہ کسی کمی کا اندیشہ ہوگا اور نہ زیادتی کا (کمی یہ کہ اُس کی کوئی نیکی لکھنے سے رہ جائے اور زیادتی یہ کہ کوئی گناہ زیادہ لکھ لیا جاوے شاید مقصود اِس سے ترغیب ہو) اور ہم میں بعضے تو (یہی مضامین انذار و ترغیب کو سمجھ کر) مسلمان (ہو گئے) ہیں اور بعضے ہم میں (بدستورِ سابق) بے راہ ہیں سو جو شخص مسلمان ہو گیا اُنہوں نے تو بھلائی کا راستہ ڈھونڈھ لیا (جس پر ثواب مرتب ہوگا) اور جو بے راہ ہیں وہ دوزخ کے ایندھن ہیں (یہاں تک کلام جنات کا ختم ہو گیا جو معمول ہے قَالُوا کا) اور (آگے اُوۡحِیَ اِلَیَّ کے دوسرے معمولات ہیں یعنی مجھ کو ان مضامین کی بھی وحی ہوئی ہے ایک یہ کہ) اگر یہ (مکّہ والے) لوگ (سیدھے) رستے پر قائم ہو جاتے تو ہم اُن کو فراغت کے پانی سے سیراب کرتے تاکہ اِس میں اُن کا امتحان کریں (کہ نعمت کا شُکر ادا کرتے ہیں یا ناشکری و نافرمانی کرتے ہیں، مطلب یہ کہ اگر اہلِ مکّہ شرک نہ کرتے جس کی مذمّت اور بضمن کلام جنات آچکی ہے تو اُن پر قحط مسلّط نہ ہوتا جیسا واقعۂ ثالثہ میں مذکور ہے مگر انہوں نے بجائے ایمان کے اعراض کیا اِس لئے مُبتلائے قحط ہوئے) اور (عقوبتِ کفر میں کچھ تخصیص اہلِ مکّہ کی نہیں بلکہ) جو شخص اپنے پروردگار کی یاد (یعنی ایمان و اطاعت) سے روگردانی کرے گا اللہ تعالیٰ اُس کو سخت عذاب میں داخل کرے گا اور (ان وحی شدہ مضامین میں سے ایک یہ ہے کہ) جتنے سجدے ہیں وہ سب اللہ کا حق ہے (یعنی یہ جائز نہیں کہ کوئی سجدہ اللہ کو کیا جاوے اور کوئی سجدہ غیر اللہ کو جیسا مشرکین کرتے تھے) سو اللہ کے ساتھ کسی کی عبادت مت کرو (اِس مضمون میں بھی توحید کی تقریر ہے جس کا اوپر ذکر تھا) اور (ان وحی شدہ مضامین میں سے ایک یہ ہے کہ) جب خدا کا خاص بندہ (مُراد رسولُ اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ہیں) خدا کی عبادت کرنے کھڑا ہوتا ہے تو یہ (کافر) لوگ اِس بندہ پر بھیڑ لگانے کو ہو جاتے ہیں (یعنی تعجب و عداوت سے ہر شخص اِس طرح دیکھتا ہے جیسے اب حملہ کرنے کے لئے بھیڑ لگا چاہتی ہے یہ بھی تتمّہ ہے مضمون توحید کا کیونکہ اِس میں مذمّت ہے مشرکین کی کہ توحید سے ان کو عداوت اور نفرت ہے آگے اس تعجب

اور عداوت کے متعلق جواب دینے کے لئے آپ کو ارشاد ہے یعنی) آپ (ان سے) یہ کہہ دیجئے کہ میں تو صرف اپنے پروردگار کی عبادت کرتا ہوں اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا (سو یہ کوئی تعجب اور عداوت کی بات نہیں یہ سب مضمون متعلق توحید تھا آگے رسالت کے متعلق مضمون ہے کہ) آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ میں تمہارے نہ کسی ضرر کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ کسی بھلائی کا (یعنی تم جو ایسی فرمائشیں کرتے ہو کہ اگر آپ رسول ہیں تو ہم پر عذاب نازل کردیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ میرے اختیار میں نہیں اور اِسی طرح جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ایک طرح ہم آپ کو رسول مان لیں کہ آپ مضامینِ توحید و قرآن میں کچھ تغیر و تبدّل کردیں تو اس کے جواب میں) آپ کہہ دیجئے کہ (اگر خدانخواستہ میں ایسا کروں تو) مجھ کو خدا (کے غضب) سے کوئی نہیں بچا سکتا اور نہ میں اُس کے سِوا کوئی پناہ (کی جگہ) پاسکتا ہوں (مطلب یہ کہ نہ خود کوئی میرا بچانے والا ہوگا اور نہ میری تلاش سے مِل سکے گا اور کفار کے ایسے اقوال استعجالِ عذاب و استبدالِ قرآن و دین کے قرآن میں جا بجا مذکور ہیں۔ اور اوپر لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا میں نفیِ اختیارِ نفع و ضرر کی فرمائی آگے اثباتِ منصبِ رسالت کا فرماتے ہیں کہ ضرر و نفع کا مالک ہونا تو لازمۂ نبوّت نہیں وہ تو منفی ہے) لیکن خدا کی طرف سے پہنچانا اور اُس کے پیغاموں کا ادا کرنا یہ میرا کام ہے اور (آگے توحید و رسالت دونوں کے متعلق مضمون ہے کہ) جو لوگ اللہ اور اُس کے رسول کا کہنا نہیں مانتے تو یقیناً اُن لوگوں کے لئے آتشِ دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (مگر کفار اس وقت ان مضامین سے متاثر نہیں ہوتے بلکہ اُلٹا مسلمانوں کو ذلیل و حقیر سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں اَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ خَیْرٌ مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِیًّا اور یہ اِس جہالت سے باز نہ آویں گے) یہاں تک کہ جب اُس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے اُس وقت جانیں گے کہ کس کے مددگار کمزور ہیں اور کس کی جماعت کم ہے (یعنی کافر ہی ایسے ہوں گے جن کے کوئی کام نہ آوے گا پس مُراد جماعت سے جماعتِ مطیعہ ہے ناصرا میں نافع اعلیٰ کی نفی ہوگئی اور عددًا میں نافعِ ادنیٰ کی۔ آگے قیامت کے متعلق کلام ہے کہ یہ لوگ قیامت کا وقت بطور انکار کے دریافت کرتے ہیں تو) آپ (اُن سے) کہہ دیجئے کہ مجھ کو معلوم نہیں کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے آیا وہ نزدیک (آنے والی) ہے یا میرے پروردگار نے اُس کے لئے کوئی مُدّتِ دراز مقرّر کر رکھی ہے (لیکن ہر حال میں وہ آوے گی ضرور رہا علمِ تعیین سو وہ محض غیب ہے اور) غیب کا جاننے والا وہی ہے سو (جس غیب پر کسی کو مطّلع کرنا مصلحت نہیں ہوتا) وہ اپنے (ایسے) غیب پر کسی کو مطّلع نہیں کرتا (اور علمِ تعیینِ قیامت ایسا ہی ہے کہ اِس پر کسی کو مطّلع کرنے میں کوئی مصلحت نہیں کیونکہ وہ علومِ متعلّقہ بالنبوّۃ سے نہیں جنکے حصول کو قُربِ الٰہی میں دخل ہوتا ہے پس ایسے غیب پر کسی کو مطّلع نہیں کرتا) ہاں مگر اپنے کسی برگزیدہ پیغمبر کو (اگر کسی ایسے علم پر مطّلع کرنا چاہتا ہے جو کہ علمِ نبوت سے ہو خواہ مثبتِ نبوّت ہو جیسے پیشین گوئیاں خواہ فروعِ نبوّت سے ہو جیسے علمِ احکام) تو (اِس طرح اِطّلاع دیتا ہے کہ) اُس پیغمبر کے آگے اور پیچھے

(یعنی جمیع جہات میں وحی کے وقت) محافظ فرشتے بھیج دیتا ہے (تاکہ وہاں شیاطین کا گذر نہ ہو جو کہ وحی کو فرشتہ سے سُن کر اور کسی سے جا کہیں یا کسی وسوسہ وغیرہ کا القاء کرسکیں چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایسے پہرہ دار فرشتے چار تھے کما فی روح المعانی اور یہ انتظام اس لئے کیا جاتا ہے) تاکہ (ظاہری طور پر) اللہ تعالیٰ کو معلوم ہو جاوے کہ ان فرشتوں نے اپنے پروردگار کے پیغام (رسول تک بحفاظت) پہنچا دیئے (اور اس میں کسی کا دخل و تصرف نہیں ہوا اور پہنچانے والا تو صرف وحی کا فرشتہ ہے لیکن معیت کی وجہ سے رصد یعنی محافظ فرشتوں کی طرف بھی اسناد فعل کی کردی) اور اللہ تعالیٰ ان (پہرہ داروں) کے تمام احوال کا احاطہ کئے ہوئے ہے (اس لئے پہرہ دار ایسے مقرر کئے گئے ہیں جو اس کام کے پورے پورے اہل ہیں) اور اس کو ہر چیز کی گنتی معلوم ہے (پس وحی کے سب اجزاء ایک ایک کرکے اُس کو معلوم ہیں۔ اور وہ سب کی پوری حفاظت کرتا ہے، حاصل مقام یہ کہ تعیینِ قیامت کا علم علومِ نبوت سے نہیں اس لئے اس کا علم نہ ہونا نبوت کے منافی نہیں البتہ علومِ نبوت عطا کئے جاتے ہیں اور ان میں احتمال خطا کا نہیں ہوتا تو ایسے علوم سے تم مستفید ہو اور زوائد کی تحقیق چھوڑو)

معارف ومسائل

نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ لفظ نفر تین سے دس تک عدد کے لئے بولا جاتا ہے۔ جن جنات کا یہاں ذکر ہے روایت یہ ہے کہ یہ نو حضرات تھے نصیبین کے رہنے والے۔

جنات کی حقیقت جن مخلوقاتِ الٰہیہ میں ایک ایسی مخلوق کا نام ہے جو ذی اجسام بھی ہیں ذی روح بھی اور انسان کی طرح عقل وشعور والے بھی مگر لوگوں کی نظروں سے مخفی ہیں، اسی لئے ان کا نام جن رکھا گیا کہ جن کے لفظی معنے مخفی کے ہیں۔ ان کی تخلیق کا غالب مادہ آگ ہے جیسے انسان کی تخلیق کا غالب مادہ مٹی ہے۔ اس نوع میں بھی انسان کی طرح نر و مادہ یعنی مرد وعورت ہیں اور انسان ہی کی طرح ان میں توالد و تناسل کا سلسلہ بھی ہے۔ اور ظاہر یہ ہے کہ قرآن میں جن کو شیاطین کہا گیا ہے وہ بھی جنات ہی میں سے شریر لوگوں کا نام ہے۔ جنات اور فرشتوں کا وجود قرآن وسنت کی قطعی دلائل سے ثابت ہے جس کا انکار کفر ہے (تفسیر مظہری)

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ سے معلوم ہوا کہ جنات کے جس واقعہ کا یہاں ذکر ہے اُس میں آپ نے قرآن سُننے والے جنات کو دیکھا نہیں تھا اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی آپ کو اطلاع دی۔

سورۂ جن کے نزول کے واقعہ کی تفصیل صحیح بخاری، مسلم اور ترمذی وغیرہ میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ (اس واقعہ میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنات کو قرآن بالقصد سُنایا نہیں بلکہ اُن کو دیکھا بھی نہیں۔ بلکہ واقعہ یہ پیش آیا کہ آپؐ اپنے کچھ صحابہؓ کے ساتھ بازار عکاظ کی طرف جا رہے تھے

اور یہ واقعہ اُس وقت کا ہے جبکہ شیاطین کو آسمان کی خبریں سُننے سے شہاب ثاقب کے ذریعہ روک دیا گیا تھا۔ اور جنّات نے باہم مشورہ کیا کہ یہ حادثہ جو ہم پر آسمانی خبروں سے ممنوع ہو جانے کا پیش آیا ہے یہ کوئی اتّفاقی بات معلوم نہیں ہوتی دُنیا میں کوئی نئی چیز پیش آئی ہے جو اس کا سبب ہوئی اور یہ طے کیا کہ زمین کے مشرق و مغرب اور ہر طرف میں جنّات کے وفود جائیں اور اس کی تحقیق کر کے آویں کہ یہ نئی چیز کیا پیش آئی ہے۔ ان کا جو وفد تہامہ حجاز کی طرف بھیجا گیا تھا وہ مقام نخلہ پر پہنچے تو وہاں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اپنے صحابۂ کرامؓ کے ساتھ صبح کی نماز جماعت سے ادا کر رہے تھے۔

جنّات کے اِس وفد نے جب قرآن سُنا تو قسمیں کھا کر آپس میں کہنے لگے کہ واللہ یہی کلام ہے جو ہمارے اور آسمانی خبروں کے درمیان حائل اور مانع بنا ہے۔ یہ لوگ یہاں سے لوٹے اور جا کر اپنی قوم سے یہ قصّہ بیان کیا جس کا ذکر اِن آیات میں ہے اِنَّا سَمِعۡنَا قُرۡاٰنًا عَجَبًا الآیۃ۔ اللہ تعالیٰ نے اِس سارے واقعہ کی خبر اپنے رسُول صلّی اللہ علیہ وسلّم کو ان آیات میں دیدی۔

ابو طالب کی وفات اور آنحضرتؐ کا سفرِ طائف

اور اکثر مفسّرین نے فرمایا ہے کہ ابو طالب کی وفات کے بعد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم مکۂ مکرمہ میں بے یار و مددگار رہ گئے تو آپؐ نے تنِ تنہا طائف کا سفر کیا کہ وہاں کے قبیلۂ بنی ثقیف سے اپنی قوم کے مظالم کے مقابلہ میں کچھ مدد اور معاونت حاصل کر سکیں محمّد بن اسحٰق کی روایت ہے کہ جب رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم طائف پہنچے تو قبیلۂ ثقیف کے تین بھائیوں کے پاس گئے جو قبیلہ کے سردار اور شریف سمجھے جاتے تھے، یہ تین بھائی عُمَیر کے بیٹے عبد یالیل اور مسعود اور حبیب تھے، ان کے گھر میں ایک عورت قریش کی تھی۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اُن کو اسلام کی دعوت دی اور اپنی قوم کے مظالم کا ذکر کر کے اُن سے معاونت کے لئے فرمایا۔ مگر ان تینوں نے بڑا سخت جواب دیا اور آپؐ سے اور کچھ کلام نہیں کیا۔

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جب دیکھا کہ قبیلہ بنو ثقیف کے یہی تین آدمی ایسے شریف سمجھے جاتے تھے جن سے کسی معقول جواب کی اُمید تھی، ان سے بھی مایوسی ہوگئی تو آپؐ نے اُن سے فرمایا کہ اچھا اگر آپ لوگ میری مدد نہیں کرتے تو کم از کم میرے آنے کو میری قوم پر ظاہر نہ کرنا۔ مقصد یہ تھا کہ اُن کو خبر ملے گی تو اور زیادہ ستاویں گے، مگر ان ظالموں نے یہ بات بھی نہ مانی بلکہ اپنے قبیلہ کے بے وقوف لوگوں اور غلاموں کو آپؐ کے پیچھے لگا دیا کہ آپؐ کو گالیاں دیں اور شور مچائیں۔ اُن کے شور و شغب سے بہت سے اور شریر جمع ہوگئے۔ آپؐ نے اُن کے شر سے بچنے کے لئے ایک باغ میں جو عتبہ اور شیبہ دو بھائیوں کا باغ تھا اُس میں پناہ لی اور یہ دونوں بھی اُس باغ میں موجود تھے۔ اُس وقت یہ شریر لوگ آپؐ کو چھوڑ کر واپس ہوئے۔ اور آپؐ انگوروں کے باغ کے سائے میں بیٹھ گئے۔ یہ دونوں بھائی آپؐ کو دیکھ رہے تھے اور یہ بھی دیکھا تھا کہ ان کی قوم کے بے وقوفوں کے ہاتھوں آپؐ کو

کیا تکلیف اور اذیّت پیش آئی - اِسی درمیان وہ قریشی عورت بھی آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے ملی جو اُن ظالموں کے گھر میں تھی - آپؐ نے اُس سے شکایت کی کہ تمھاری سُسرال کے لوگوں نے ہمارے ساتھ کیا معاملہ کیا -

جب اس باغ میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو کچھ اطمینان حاصل ہوا تو آپؐ نے اللہ جلّ شانہٗ کی بارگاہ میں دُعا مانگنی شروع کی، اس دُعا کے الفاظ بھی عجیب و غریب ہیں، اور کسی موقع پر آپؐ سے ایسے الفاظِ دُعا منقول نہیں، وہ دُعا یہ ہے :-

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَشْکُوْٓا اِلَیْکَ ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَقِلَّۃَ حِیْلَتِیْ وَھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ وَاَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ فَاَنْتَ رَبِّیْٓ اِلٰی مَنْ تَکِلُنِیْٓ اِلٰی بَعِیْدٍ یَّتَجَھَّمُنِیْٓ اَوْ اِلٰی عَدُوٍّ مَّلَّکْتَہٗ اَمْرِیْ اِنْ لَّمْ تَکُنْ سَاخِطًا عَلَیَّ فَلَآ اُبَالِیْ وَلٰکِنَّ عَافِیَتَکَ ھِیَ اَوْسَعُ لِیْ - اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْھِکَ الَّذِیْٓ اَشْرَقَتْ لَہُ الظُّلُمَاتُ وَصَلُحَ عَلَیْہِ اَمْرُ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ مِنْ اَنْ تُنْزِلَ بِیْ غَضَبَکَ لَکَ الْعُتْبٰی حَتّٰی تَرْضٰی وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِکَ

(مظہری باختصار)

یا اللہ میں آپ سے شکایت کرتا ہوں اپنی قوت کے ضعف اور کمی کی اور اپنی تدبیر کی ناکامی کی اور لوگوں کی نظروں میں اپنی خفّت و بے توقیری کی اور آپ توسب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں اور آپ کمزوروں کی پرورش فرمانے والے ہیں آپ ہی میرے رب ہیں، آپ مجھے کس کے سپرد کرتے ہیں کیا ایک غیر آدمی کے جو مجھ پر حملہ کرے یا کسی دشمن کے جس کو آپ نے میرے معاملہ کا مالک بنا دیا ہے (کہ جو چاہے کرے) اگر آپ مجھ پر ناراض نہ ہوں تو مجھے اِن سب چیزوں کی بھی پروا نہیں لیکن آپ کی عافیت میرے لئے زیادہ بہتر ہے (اُس کو طلب کرتا ہوں) میں آپ کی ذاتِ مبارک کے نور کی پناہ لیتا ہوں جس سے تمام اندھیریاں روشن ہو جاتی ہیں اور اسکی بنا پر دنیا و آخرت کے سب کام درست ہو جاتے ہیں۔ اس بات سے کہ مجھ پر اپنا غضب نازل فرمائیں ہمارا کام ہی یہ ہے کہ آپ کو راضی کرنے اور منانے میں لگے رہیں جب تک کہ آپ راضی نہ ہو جائیں اور ہم تو کسی بُرائی سے بچ سکتے نہیں نہ کسی بھلائی کو حاصل کر سکتے ہیں، بجز آپ کی مدد کے -

جب ربیعہ کے دونوں بیٹوں عتبہ اور شیبہ نے یہ حال دیکھا تو اُن کے دل میں رحم آیا اور اپنے ایک نصرانی غلام عدّاس نامی کو بُلا کر کہا کہ انگور کا ایک خوشہ لو اور ایک طبق میں رکھکر اُس شخص کے پاس لیجاؤ اور اُن سے کہو یہ کھائیں - عدّاس نے ایسا ہی کیا اُس نے جاکر انگور کا یہ طبق آپؐ کے سامنے رکھ دیا - آپؐ نے بسم اللہ پڑھ کر اُس کی طرف ہاتھ بڑھایا - عدّاس یہ دیکھ رہا تھا کہنے لگا واللہ یہ کلام یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تو اِس شہر کے لوگ نہیں بولتے - پھر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اُس سے پوچھا

عدّاس تم کہاں کے رہنے والے ہو اور تمہارا کیا مذہب ہے۔ اُس نے کہا میں نصرانی ہوں اور نینوا کا رہنے والا ہوں۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ اچھا تو اللہ کے نیک بندے یونس بن متی علیہ السلام کی بستی کے رہنے والے ہو۔ اُس نے کہا کہ آپ کو یونس بن متی کی کیا خبر۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ وہ میرے بھائی ہیں کیونکہ وہ بھی اللہ کے نبی تھے میں بھی نبی ہوں۔

یہ سُن کر عدّاس آپؐ کے قدموں پر گر پڑا اور آپؐ کے سرِ مبارک اور ہاتھوں پاؤں کو بوسہ دیا۔ عتبہ اور شیبہ یہ ماجرا دیکھ رہے تھے، ایک نے دوسرے سے کہا کہ اُس نے ہمارے غلام کو تو خراب کر دیا۔ جب عدّاس لوٹ کر اُن کے پاس گیا تو انہوں نے کہا کہ عدّاس تجھے کیا ہوا کہ اس شخص کے ہاتھ پاؤں کو بوسہ دینے لگا۔ اُس نے کہا کہ میرے سردارو۔ اِس وقت زمین پر اس سے بہتر کوئی آدمی نہیں۔ اس نے مجھے ایک ایسی بات بتلائی جو نبی کے سوا کوئی نہیں بتلا سکتا۔ اُنھوں نے کہا کمبخت ایسا نہ ہو کہ یہ آدمی تجھے تیرے مذہب سے پھیر دے۔ کیونکہ تیرا دین بہرحال اُس کے دین سے بہتر ہے۔

اس کے بعد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم طائف سے مکّۂ مکرمہ کی طرف لوٹ گئے جبکہ ثقیف کی ہر خیر سے مایوس ہو گئے۔ واپسی میں آپؐ نے مقامِ نخلہ پر قیام فرمایا اور آخر شب میں نمازِ تہجّد پڑھنے لگے۔ تو مُلک یمن نصیبین کے جنّات کا یہ وفد بھی وہاں پہنچا ہوا تھا اُس نے قرآن سُنا اور سُن کر ایمان لے آئے اور اپنی قوم کی طرف واپس جاکر واقعہ بتلایا جس کا ذکر اللہ تعالےٰ نے آیاتِ مذکورہ میں نازل فرمایا۔ (مظہری)

ایک صحابی جن کا واقعہ

ابنِ جوزی نے کتاب الصفوہ میں اپنی سند کے ساتھ حضرت سہل بن عبداللہ سے نقل کیا کہ انھوں نے ایک مقام پر ایک بوڑھے جن کو دیکھا کہ بیت اللہ کی طرف نماز پڑھ رہا ہے اور اُون کا جُبّہ پہنے ہوئے تھا جس پر بڑی رونق معلوم ہوتی تھی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضرت سہل کہتے ہیں کہ میں نے اُن کو سلام کیا اور اُنھوں نے سلام کا جواب دے کر بتلایا کہ تم اِس جُبّہ کی رونق سے تعجّب کر رہے ہو یہ جُبّہ سات سو سال سے میرے بدن پر ہے، اِسی جُبّہ میں مَیں نے حضرت عیسٰی علیہ السّلام سے مُلاقات کی، پھر اِسی جُبّہ میں محمّد مصطفٰے صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زیارت کی اور میں اُن جنّات میں سے ہوں جن کے بارہ میں سورۂ جن نازل ہوئی ہے (مظہری)

اور روایاتِ حدیث میں جو لیلۃ الجنّ کا واقعہ مذکور ہے جس میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ آپؐ کے ساتھ تھے اُس میں آپ کا بالقصد جنّات کو تبلیغ و دعوت کے لئے مکّۂ مکرمہ کے قریب جنگل میں جانا اور قرآن سُنانا منقول ہے وہ بظاہر اِس واقعہ کے بعد کا قصّہ ہے جس کا ذکر سورۂ جن میں آیا ہے۔

اور علّامہ خفاجیؒ نے فرمایا کہ احادیثِ معتبرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ جنّات کے وفود نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں چھ مرتبہ حاضر ہوئے ہیں اِس لئے اِن دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں کہ سورۂ جن

والے واقعہ میں آپؐ کو جنات کے آنے اور قرآن سُننے کی خبر بھی نہ تھی جب تک بذریعہ وحی آپ کو بتلایا نہ گیا اور یہ کہ یہ واقعہ مقام نخلہ کا اور طائف سے واپسی کے وقت کا ہے۔ اور دوسری روایات جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر مکہ کے قریب ہی کے جنگل میں آپؐ بالقصد اسی کام کے لئے تشریف لے گئے کہ جنات کو دعوتِ اسلام دیں اور قرآن سُنائیں یہ اس کے بعد پیش آیا (مظہری)

وَاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا جدّ کے معنٰے شان کے ہیں حق تعالیٰ کے لئے بولا جاتا ہے، تعالیٰ جدّہٗ یعنی بلند و بالا ہے اُس کی شان۔ یہاں جدّہ کی ضمیر راجع کرنے کے بجائے لفظ ربّ مظہر رکھدیا گیا جس میں اس علوشان کی دلیل بھی آگئی کیونکہ جو ذات مخلوق کی پروردگار ہے اُس کا سب مخلوق سے عالی شان ہونا ظاہر ہے۔

اس آیت میں وَاَنَّهٗ کے عطف اور ترکیبِ نحوی میں مفسرین کا کلام طویل ہے عوام کو اسکی حاجت نہیں۔

وَاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ۙ وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا۔ لفظ شطط کے معنٰے قول بعید از عقل اور ظلم و جور کے آتے ہیں، مُراد یہ ہے کہ ایمان لانے والے جنات نے اب تک شرک و کفر میں مُبتلا رہنے کا عُذر یہ بیان کیا کہ ہماری قوم کے بے وقوف لوگ اللہ تعالیٰ کی شان میں بے سروپا باتیں کہا کرتے اور ہمیں یہ گمان نہ تھا کہ کوئی انسان یا جن اللہ کی طرف جھوٹی بات کی نسبت کر سکتا ہے اس لئے اِن بے وقوفوں کی بات میں آکر آج تک ہم کفر و شرک میں مُبتلا تھے اب قرآن سُنا تو حقیقت کُھلی۔

وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا۔ اِس آیت میں مومن جنات نے یہ بیان کیا ہے کہ جاہلیت کے لوگ جب کسی جنگل میں قیام کرتے تو اُس جنگل کے جنات کی پناہ مانگتے تھے اِس سے جنات یہ سمجھ بیٹھے کہ ہم تو انسان سے بھی افضل ہیں کہ انسان بھی ہماری پناہ لیتا ہے۔ اِس بات نے جنات کی گمراہی میں اور اضافہ کر دیا۔

حضرت رافع بن عمیرؓ کا اسلام بسببِ جنات

تفسیر مظہری میں ہے کہ ہواتف الجن میں سند کے ساتھ حضرت سعید بن جُبیرؒ سے یہ نقل کیا ہے کہ رافع بن عُمیر صحابیؓ نے اپنے اسلام قبول کرنے کا ایک واقعہ یہ بتلایا ہے کہ میں ایک رات ایک ریگستان میں سفر کر رہا تھا۔ اچانک مجھ پر نیند کا غلبہ ہوا میں اپنی اُونٹنی سے اُترا اور سو گیا اور سونے سے پہلے میں نے اپنی قوم کی عادت کے مُطابق یہ الفاظ کہہ لئے انّی اعوذ بعظیم ھٰذا الوادی من الجنّ یعنی میں پناہ لیتا ہوں اِس جنگل کے جنات کے سردار کی۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص کے ہاتھ میں ایک ہتھیار ہے اُس کو وہ میری ناقہ کے سینہ پر رکھنا چاہتا ہے، میں گھبرا کر اُٹھا اور دائیں بائیں دیکھا کچھ نہ پایا تو میں نے دل میں کہا کہ یہ شیطانی خیال ہے

خواب اصلی نہیں اور پھر سو گیا اور بالکل غافل ہو گیا۔ تو پھر وہی خواب دیکھا پھر میں اُٹھا اور اپنی ناقہ کے چاروں طرف پھرا کچھ نہ پایا مگر ناقہ کو دیکھا کہ وہ کانپ رہی ہے۔ میں پھر جا کر اپنی جگہ سو گیا، تو پھر وہی خواب دیکھا، میں بیدار ہوا تو دیکھا کہ میری ناقہ تڑپ رہی ہے اور پھر دیکھا ایک نوجوان ہے جس کے ہاتھ میں حربہ ہے یہ وہی شخص تھا جس کو خواب میں ناقہ پر حملہ کرتے دیکھا تھا۔ اور ساتھ ہی یہ دیکھا کہ ایک بوڑھے آدمی نے اُس کا ہاتھ پکڑ رکھا ہے جو ناقہ پر حملہ کرنے سے اُس کو روک رہا ہے۔ اسی عرصہ میں تین گورخر سامنے آگئے تو بوڑھے نے اُس نوجوان سے کہا اِن تینوں میں سے جس کو تو پسند کرے وہ لے لے اور اِس انسان کے ناقہ کو چھوڑ دے۔ وہ جوان ایک گورخر لے کر رخصت ہو گیا۔ پھر اُس بوڑھے نے میری طرف دیکھکر کہا کہ اے بے وقوف جب تو کسی جنگل میں ٹھہرے اور وہاں کے جنّات و شیاطین سے خطرہ ہو تو تُو یہ کہا کر اعوذ باللہ ربِّ محمّد من ہول ھٰذا الوادی۔ یعنی میں پناہ پکڑتا ہوں ربِّ محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اِس جنگل کے خوف اور شر سے اور کسی جن سے پناہ نہ مانگا کر، کیونکہ وہ زمانہ چلا گیا جب انسان جنوں کی پناہ لیتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہیں۔ اُس نے کہا کہ یہ نبی عربیؐ ہیں، نہ شرقی نہ غربی، پیر کے روز یہ مبعوث ہوئے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ یہ کہاں رہتے ہیں، اُس نے بتلایا کہ وہ یثرب میں رہتے ہیں جو کھجوروں کی بستی ہے۔ میں نے صبح ہوتے ہی مدینہ کا راستہ لیا اور سواری کو تیز چلایا یہاں تک کہ مدینۂ طیّبہ پہنچ گیا۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مجھے دیکھا تو میرا سارا واقعہ مجھے سُنا دیا اِس سے پہلے کہ مَیں آپؐ سے کچھ ذکر کروں اور مجھے اسلام کی دعوت دی میں مسلمان ہو گیا۔ سعید بن جُبیرؒ اِس واقعہ کو نقل کر کے فرماتے تھے کہ ہمارے نزدیک اسی معاملہ کے متعلق قرآن میں یہ آیت نازل ہوئی ہے وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ۔

وَاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا۔ لفظ سماء عربی لُغت میں جس طرح آسمان کے لئے بولا جاتا ہے اُسی طرح بادل پر بھی لفظ سماء کا اطلاق عام اور معروف ہے۔ یہاں بظاہر سماء سے مراد یہی بادل ہے۔

جنّات آسمانی خبریں سننے کیلئے صرف بادلوں تک جاتے تھے آسمان تک نہیں

اور جنّات و شیاطین کا آسمانی خبریں سُننے کے لئے آسمان تک جانے کا مطلب یہی ہے کہ بادلوں تک جاتے تھے اور وہاں سے آسمانی خبریں سُنتے تھے۔

اور دلیل اِس کی حضرت صدّیقہ عائشہؓ کی حدیث ہے جو صحیح بخاری میں بالفاظِ ذیل آئی ہے:۔

قالت سمعت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم یقول ان الملائکۃ تنزل فی العنان و ھو السحاب فتذکر الامر الذی قضی فی السماء فتسترق الشیاطین السمع فتسمعہ فتتوجہ الی

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے سُنا ہے کہ فرشتے عنان سماء میں اُترتے ہیں جس کے معنے بادل کے ہیں وہاں وہ اُن فیصلوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آسمان میں جاری فرمائے ہیں۔ یہاں سے شیاطین یہ خبریں

الکھان فیکذبون معھا مائۃ کذبۃ من عند انفسھم (از مظہری) چُراتے ہیں اور سُن کر کاہنوں کے پاس لاتے ہیں اور اس میں اپنی طرف سے سو جھوٹ ملا کر اُن کو بتاتے ہیں۔

اور صحیح بخاری ہی میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے اور مسلم میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے جو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اصل آسمانوں میں پیش آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کوئی حکم آسمان میں جاری فرماتے ہیں تو سب فرشتے بغرضِ اطاعت اپنے پَر مارتے ہیں اور جب کلام ختم ہو جاتا ہے تو باہم تذکرہ کرتے ہیں کہ تمہارے رب نے کیا فرمایا۔ اس تذکرہ کو آسمانی خبریں چُرانے والے شیاطین سُن لیتے ہیں اور کاہنوں کے پاس اُس میں بہت سے جھوٹ شامل کر کے پہنچاتے ہیں۔

یہ مضمون حدیثِ عائشہؓ مذکورہ کے منافی نہیں کیونکہ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ شیاطین آسمانوں میں جا کر یہ خبریں چُرا لاتے ہیں بلکہ یہ ہو سکتا ہے کہ پہلے یہ خبریں درجہ بدرجہ آسمانوں میں فرشتوں کے اندر پھیلتی ہوں، پھر فرشتے عنان سماء یعنی بادل تک آتے اور اس کا تذکرہ کرتے ہوں یہاں سے شیاطین خبروں کی چوری کرتے ہوں جیسا کہ حضرت صدیقہ عائشہؓ کی حدیث میں ہے (کذافی المظہری)

بہرحال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت سے پہلے شیاطین کا آسمانی خبریں سُن کر کاہنوں تک پہنچانے کا سلسلہ بغیر کسی رکاوٹ کے جاری تھا۔ شیاطین بادلوں تک پہنچ کر فرشتوں سے سُن لیا کرتے تھے۔ مگر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کے وقت آپ کی آسمانی وحی کی حفاظت کیلئے اس سلسلہ کو اس طرح بند کر دیا گیا کہ جب کوئی شیطان یہ خبریں سُننے کے لئے اُوپر آتا تو اُس کی طرف شہاب ثاقب کا انگارہ پھینک کر اُس کو دفع کر دیا جاتا ہے۔ یہی وہ نیا حادثہ تھا جس کی شیاطین و جنّات کو فکر ہوئی اور تحقیقِ حال کے لئے دُنیا کی مشرق و مغرب میں وفود بھیجے پھر مقامِ نخلہ میں آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے ایک وفدِ جنّات کا قرآن سُن کر ایمان لانا سورۂ جن میں ذکر فرمایا گیا۔

شہاب ثاقب بعثتِ نبوی سے پہلے بھی تھے مگر ان کے ذریعہ دفعِ شیاطین کا کام آپؐ کے زمانہ سے ہوا

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ شہابِ ثاقب جس کو عرف میں ستارہ ٹوٹنا یا عربی میں انقضاض الکوکب کہتے ہیں۔ یہ تو دُنیا میں قدیم زمانہ سے ہوتا آیا ہے اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عہدِ نبوی کی تخصیص ہے۔ جواب یہ ہے کہ شہاب ثاقب کا وجود تو پہلے سے تھا خواہ اس کی حقیقت وہ ہو جو فلاسفہ بیان کرتے ہیں کہ زمین سے کچھ آتشیں مادّے فضا میں پہنچتے ہیں وہ کسی وقت بھڑک اُٹھتے ہیں۔ یا یہ ہو کہ خود کسی ستارہ اور سیّارہ سے یہ آتشیں مادّہ نکلتا ہو۔ بہرحال اس کا وجود اگرچہ ابتداءِ عالم سے ہے مگر اِس آتشیں مادّہ سے شیاطین کو دفع کرنے کا کام رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت سے شروع ہوا۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جتنے شہاب ثاقب نظر آتے ہیں سب سے ہی یہ کام لیا جاتا ہو۔ اس کی پوری تفصیل سُورۂ حجر کی تفسیر میں گذر چکی ہے۔

أَنَّا لَا نَدْرِیٓ أَشَرٌّ أُرِيدَ بِمَن فِي الْأَرْضِ أَمْ أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا۔ یعنی جنات و شیاطین کو آسمانی خبریں سننے سے روک دیا بطور سزا کے بھی ہوسکتا ہے کہ زمین والوں کو آسمان کی خبریں نہ ملا کریں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لئے یہ ہدایت کا سامان کیا ہو کہ جنات و شیاطین وحی آسمانی میں کوئی خلل نہ ڈال سکیں۔

فَمَن يُؤْمِن بِرَبِّهِ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَلَا رَهَقًا۔ بخس بفتح الباء وسکون الخاء کے معنے حق سے کم دینے اور کم کرنے کے ہیں اور رہق کے معنے ذلت و رسوائی طاری ہونا۔ مراد یہ ہے کہ جو اللہ پر ایمان لاتا ہے نہ اُس کی جزا میں کوئی کمی ہوسکتی ہے اور نہ آخرت میں اُس کو کوئی ذلت و رسوائی پیش آسکتی ہے۔

وَأَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا۔ مساجد جمع مَسْجِد ہے، یہاں اِس کے معروف مشہور معنے بھی لئے جاسکتے ہیں یعنی وہ عبادت گاہیں جو نماز کے لئے وقف کی جاتی ہیں اور مسجد کہلاتی ہیں اِس صورت میں معنے آیت کے یہ ہوں گے کہ جب سب مساجد صرف اللہ کی عبادت کے لئے بنائی گئی ہیں تو تم مسجدوں میں جاکر اللہ کے سوا کسی اور کو مدد کے لئے نہ پکارو جس طرح یہود و نصاریٰ اپنی عبادتگاہوں میں اس شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔ حاصل اِس کا مساجد کو عقائدِ فاسدہ اور اعمالِ باطلہ سے پاک رکھنا ہے۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مساجد مَسْجَد بفتح الجیم کی جمع ہو جو مصدر میمی بمعنے سجدہ آتا ہے تو معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ سب سجدے صرف اللہ کے لئے مخصوص ہیں، اور جو شخص غیر اللہ کو اعانت کیلئے پکارتا ہے گویا وہ اُس کو سجدہ کرتا ہے۔ غیر اللہ کے سجدہ سے اجتناب کرو۔

مسئلہ باجماعِ اُمّت غیر اللہ کے لئے سجدہ حرام ہے اور بعض علماء کے نزدیک کُفر ہے۔

قُلْ إِنْ أَدْرِیٓ أَقَرِيبٌ مَّا تُوعَدُونَ أَمْ يَجْعَلُ لَهُ رَبِّیٓ أَمَدًا۔ عٰلِمُ الْغَيْبِ۔ ان آیتوں میں سے پہلی آیت میں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم فرمایا کہ آپ ان منکرین سے جو آپ کو قیامت کا معین وقت بتلانے پر مجبور کرتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں یہ فرما دیجئے کہ قیامت کا آنا اور وہاں جزاء و سزا ہونا تو یقینی ہے لیکن اُس کے واقع ہونے کی صحیح تاریخ اور وقت کو اللہ تعالیٰ نے کسی کو نہیں بتلایا اِس لئے میں نہیں جانتا کہ وہ روزِ قیامت قریب آچکا ہے یا میرا رب اُس کے لئے کوئی دُور کی مُدت مقرر کردیگا۔ دوسری آیت میں اس کی دلیل ارشاد فرمائی۔ عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ أَحَدًا۔ یعنی قیامت کے وقتِ معین سے میری بے خبری اِس لئے ہے کہ میں عالم الغیب نہیں بلکہ عالم الغیب ہونا صرف اللہ رب العالمین کی خصوصی صفت ہے۔ اِس لئے وہ اپنے غیب پر کسی کو بھی غالب و قادر نہیں بناتا۔ یہاں عالم الغیب میں الغیب کا الف لام استغراقِ جنس کیلئے ہے (کمافی الروح عن الرضی) یعنی عالم ہر فردِ غیب اور جنس غیب کا۔ اور عَلٰى غَيْبِهٖ میں غیب کی اضافت اللہ کی طرف کرنے سے

بھی اسی استغراق اور جامعیت کا اظہار مقصود ہے، یعنی ہر ہر فرد و جنسِ غیب کا علم جو اللہ رب العالمین کا مخصوص وصف ہے اُس پر وہ کسی کو قادر و غالب نہیں کرتا کہ کوئی جس غیب کو چاہے معلوم کرلے۔

مقصود اِس کلام سے علمِ غیب کُلّی کا جس سے جہان کا کوئی ذرّہ مخفی نہ ہو اُس کی غیر اللہ سے نفی اور صرف اللہ تعالیٰ کے لئے اثبات ہے۔ لیکن کسی بے وقوف کو اِس سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کو کسی بھی غیب کی چیز کی خبر نہیں تو پھر وہ رسول کیا ہوئے، کیونکہ رسول کے پاس تو اللہ تعالےٰ ہزاروں غیب کی خبریں بذریعہ وحی بھیجتے ہیں۔ اور جس کے پاس اللہ کی وحی نہ آئے وہ نبی و رسول نہیں کہلا سکتا۔ اِس لئے آگے آیت میں ایک استثنار کا ذکر فرمایا۔

علمِ غیب اور غیبی خبروں میں فرق

اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا۔ حاصل استثنار کا اُس سفیہانہ شبہ کا یہ جواب ہے کہ علمِ غیب کُلّی کی نفی سے ہر غیب کی نفی مطلقًا مراد نہیں، بلکہ منصبِ رسالت کے لئے جس قدر علمِ غیب کی خبروں اور غیب کی چیزوں کا علم کسی رسول کو دینا ضروری ہے وہ اُن کو منجانب اللہ بذریعۂ وحی دیدیا جاتا ہے اور وہ ایسے محفوظ طریقے سے دیا جاتا ہے کہ جب ان پر اللہ کی طرف سے کوئی وحی نازل ہوتی ہے تو اُس کے ہر طرف فرشتوں کا پہرہ ہوتا ہے تاکہ شیاطین اُس میں کوئی مداخلت نہ کرسکیں۔ اس میں اوّل تو لفظِ رسول سے اُس غیب کی نوعیت متعیّن کردیگئی جس کا علم رسول و نبی کو دیا جاتا ہے اور وہ ظاہر ہے علمِ شرائع و احکام بتمامہ اور غیب کی خبریں بقدرِ ضرورتِ وقت۔ اِس کے بعد جو علمِ غیب رسول و نبی کو دیا جاتا ہے اُس کی نوعیت اگلے جُملے سے یوں بھی متعیّن کردی کہ وہ بذریعہ فرشتوں کے بھیجا جاتا ہے اور وحی لانے والے فرشتے کے گرد دوسرے فرشتوں کا پہرہ ہوتا ہے۔ اِس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اِس استثنار سے جس علمِ غیب کا نبی و رسول کے لئے اثبات ہے وہ بعض اور مخصوص علمِ غیب ہے جس کی ضرورت منصبِ رسالت کے لئے درپیش ہو۔

اِس سے معلوم ہوا کہ یہ استثناء اصطلاحی لفظوں میں استثناءِ منقطع ہے، یعنی جس علمِ غیبِ کُلّی کی اصل کلام میں غیر اللہ سے نفی کی گئی تھی مستثنیٰ میں اُس کا اثبات نہیں بلکہ مخصوص علومِ غیبیہ کا اثبات ہے جس کو قرآنِ کریم میں جا بجا اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ۔

بعض ناواقف غیب اور انبار الغیب میں فرق نہیں سمجھتے اِس لئے وہ انبیار اور خصوصًا خاتم الانبیاؐ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے لئے علمِ غیب کُلّی ثابت کرتے ہیں اور آپؐ کو بالکل اللہ تعالیٰ کی طرح عالم الغیب ہر ہر ذرّۂ کائنات کا علم رکھنے والا کہنے لگتے ہیں جو کھُلا ہوا شرک اور رسول کو خدائی کا درجہ دینا ہے، نعوذ باللہ منہ۔ اگر کوئی شخص اپنا خفیہ راز کسی اپنے دوست کو بتلادے جو اور کسی کے علم میں نہ ہو تو اس سے دنیا میں کوئی بھی اس دوست کو عالم الغیب نہیں کہہ سکتا۔ اِسی طرح انبیار علیہم السّلام کو ہزاروں

غیب کی چیزوں کا بذریعہ وحی بتلا دینا اُن کو عالم الغیب نہیں بنا دیتا خوب سمجھ لیا جائے۔

جاہل عوام جو اِن دونوں باتوں میں فرق نہیں کرتے جب اُن کے سامنے کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم عالم الغیب نہیں، وہ اس کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ آپؐ کو معاذ اللہ کسی غیب کی چیز کی خبر نہیں جس کا دنیا میں کوئی قائل نہیں اور نہ ہو سکتا ہے، کیونکہ ایسا ہونے سے تو خود نبوّت و رسالت کی نفی ہو جاتی ہے جس کا کسی مومن سے امکان نہیں۔

آخر سورت میں فرمایا وَاَحْصٰی کُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہی کی ذات خاص ہے جس کے علم میں ہر چیز کے اعداد و شمار ہیں۔ اُس کو پہاڑوں کے اندر جتنے ذرّے ہیں اُن کا بھی عدد معلوم ہے، ساری دنیا کے دریاؤں میں جتنے قطرے ہیں ان کا شمار اُس کے علم میں ہے۔ ہر بارش کے قطروں اور تمام دُنیا کے درختوں کے پتّوں کے اعداد و شمار کا اُسی کو علم ہے۔ اس میں پھر علم غیب کُلّی کا ذاتِ حق سبحانہٗ و تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہونا واضح کر دیا کہ کسی کو مذکورہ استثنار سے غلط فہمی نہ ہو جائے۔

مسئلہ علم غیب کے معنٰے اور اُس کے احکام سُورۂ نمل کی آیت قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ کے تحت میں پوری تحقیق و تفصیل کے ساتھ گذر چکی ہے وہاں دیکھ لیا جائے واللہ سبحانہٗ و تعالیٰ اعلم۔

تمت

بحمد اللہ تعالیٰ سُورۃ الجنّ لیلۃ الجمعۃ

۱۰ رجب ۱۳۹۱ھ

سُوْرَةُ الْمُزَّمِّلِ

سُوْرَةُ الْمُزَّمِّلِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ عِشْرُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۂ مزمل مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی بیس آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝۱ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۲ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝۳

اے کپڑے میں لپٹنے والے کھڑا رہ رات کو مگر کسی رات آدھی رات یا اس میں سے کم کر دے تھوڑا سا

اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝۴ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا

یا زیادہ کر اس پر اور کھول کھول کر پڑھ قرآن کو صاف ہم ڈالنے والے ہیں تجھ پر ایک بات

ثَقِيْلًا ۝۵ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۝۶ اِنَّ لَكَ

وزن دار البتہ اٹھنا رات کو سخت روندتا ہے اور سیدھی نکلتی ہے بات البتہ تجھ کو

فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۝۷ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝۸

دن میں شغل رہتا ہے لمبا اور پڑھے جا نام اپنے رب کا اور چھوٹ کر چلا آ اسکی طرف سب سے الگ ہو کر

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ۝۹ وَاصْبِرْ

مالک مشرق اور مغرب کا اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں، سو پکڑ لے اسکو کام بنانے والا اور سہتا رہ

عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ۝۱۰ وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي

جو کچھ کہتے رہیں اور چھوڑ دے ان کو بھلی طرح کا چھوڑنا اور چھوڑ دے مجھ کو اور جھٹلانے والوں کو جو

النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ۝۱۱ اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا ۝۱۲ وَّطَعَامًا

آرام میں رہتے ہیں اور ڈھیل دے ان کو تھوڑی سی، البتہ ہمارے پاس بیڑیاں ہیں اور آگ کا ڈھیر اور کھانا گلے میں

ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِيْمًا ۝۱۳ يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ

اٹکنے والا اور عذاب دردناک جس دن کہ کانپے گی زمین اور پہاڑ اور ہو جائیں گے

الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ۝۱۴ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۥ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ

پہاڑ ریت کے تودے پھسلتے ہم نے بھیجا تمہاری طرف رسول بتلانے والا تمہاری باتوں کا

كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾ فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا

جیسے بھیجا فرعون کے پاس رسول پھر کہانہ مانا فرعون نے رسول کا پھر پکڑی ہمنے اس کو

وَّبِيْلًا ﴿۱۶﴾ فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا ﴿۱۷﴾ ۨالسَّمَآءُ

وبال کی پکڑ پھر کیونکر بچو گے اگر منکر ہوگئے اُس دن سے جو کر ڈالے لڑکوں کو بوڑھا آسمان

مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ۭ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ﴿۱۸﴾ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ

پھٹ جائیگا اُس دن بیں اس کا وعدہ ہونے والا ہے یہ تو نصیحت ہے پھر جو کوئی چاہے بنا لے

اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۱۹﴾ ع اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَ

اپنے رب کیطرف راہ بیشک تیرا رب جانتا ہے کہ تو اُٹھتا ہے نزدیک دو تہائی رات کے اور

نِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ۭ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ

آدھی رات کے اور تہائی رات کے اور کتنے لوگ تیرے ساتھ کے اور اللہ ماپتا ہے رات کو اور دن کو

عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ۭ عَلِمَ

اُس نے جانا کہ تم اس کو پورا نہ کرسکو گے سو تم پر معافی بھیجدی اب پڑھو جتنا تم کو آسان ہو قرآن سے جانا کہ

اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ

کتنے ہوں گے تم میں بیمار اور کتنے اور لوگ پھریں گے ملک میں ڈھونڈتے

مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ڮ فَاقْرَءُوْا مَا

اللہ کے فضل کو اور کتنے لوگ لڑتے ہوں گے اللہ کی راہ میں سو پڑھ لیا کرو جتنا

تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا

آسان ہو اسمیں سے اور قائم رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ اور قرض دو اللہ کو اچھی طرح پر

حَسَنًا ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا

قرض دینا اور جو کچھ آگے بھیجوگے اپنے واسطے کوئی نیکی اس کو پاؤ گے اللہ کے پاس بہتر

وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ۭ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۰﴾ ع

اور ثواب میں زیادہ اور معافی مانگو اللہ سے بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے

خلاصۂ تفسیر

اے کپڑوں میں لپٹنے والے (وجہ اِس عنوان سے خطاب کرنے کی یہ ہے کہ ابتدائے نبوت میں قریش نے دار الندوہ میں جمع ہو کر آپ کے بارہ میں مشورہ کیا کہ آپ کی حالت کے مناسب کوئی لقب تجویز کرنا چاہیئے کہ اس پر سب متفق رہیں۔ کسی نے کہا کہ کاہن ہیں، اس کو دوسروں نے رد کر دیا۔ کسی نے

مجنوں کہا پھر اس کو بھی سب نے غلط قرار دیا۔ پھر ساحر کہا پھر بعض نے اِس کو بھی رَد کر دیا لیکن پھر یہی کہنے لگے کہ ساحر اِس لئے ہیں کہ دوست کو دوست سے جُدا کر دیتے ہیں۔ آپ کو یہ خبر پہنچکر رنج ہوا اور رنج کی حالت میں لپٹ گئے۔ اکثر سوچ اور رنج میں آدمی اِس طرح کرلیتا ہے اِس لئے آپؐ کو خوش کرنے اور لُطف کا اظہار کرنے کیلئے اِس عنوان سے خطاب فرمایا، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ آپؐ نے حضرت علیؓ کو ابوتراب فرمایا تھا۔ غرض آپؐ کو خطاب ہے کہ اِن باتوں کا رَنج نہ کرو بلکہ حق تعالیٰ کی طرف مداومت کے ساتھ اور زیادہ توجّہ رکھو اِس طرح سے کہ) رات کو (نماز میں) کھڑے رہا کرو مگر تھوڑی سی رات یعنی نصف رات (کہ اس میں آرام کرو) یا اُس نصف سے کسی قدر کم کردو (یعنی نصف سے کم قیام کرو اور نصف سے زیادہ آرام کرو اور اس نصف سے کم کا مصداق ایک ثلث ہے بقرینہ قولہ تعالیٰ فیما بعد وَثُلُثَہٗ) یا نصف سے کچھ بڑھادو (یعنی نصف سے زیادہ قیام کرو اور نصف سے کم آرام کرو اور اس نصف سے زیادہ کا مصداق قریب دوثلث کے ہے بقرینہ قولہ تعالیٰ فیما بعد "اَدْنٰی مِنْ ثُلُثَیِ الَّیْلِ"، غرض قیامِ لیل تو امرِ وجوبی سے فرض ہوا مگر مقدارِ وقتِ قیام میں تین صورتوں میں اختیار ہے نصف شب، دو تہائی شب، ایک تہائی شب) اور (اِس قیامِ لیل میں) قرآن کو خوب صاف صاف پڑھو (کہ ایک ایک حَرف الگ الگ ہو اور یہی حکم غیرِ صلوٰۃ میں بھی ہے اور تخصیص محض مقام کی وجہ سے ہے، آگے قیام اللیل کے حکم کی علّت اور مصلحت کا بیان ہے کہ) ہم تم پر ایک بھاری کلام ڈالنے کو ہیں (مُراد قرآن مجید ہے جو نزول کے وقت بھی آپؐ کی حالت کو متغیّر کردیتا تھا جیسا حدیثوں میں ہے کہ ایک بار آپؐ کی ران زید بن ثابت کی ران پر رکھی تھی، اُس وقت وحی نازل ہوئی تو زید بن ثابت کی ران پھٹنے لگی۔ اور جب آپ نزولِ وحی کے وقت ناقہ پر سوار ہوتے تو ناقہ گردن ڈال دیتی اور حرکت نہ کرسکتی اور شدّت کے جاڑوں میں آپ پسینہ پسینہ ہوجاتے۔ پھر علاوہ اِس کے اس کا محفوظ رکھنا پھر دوسروں تک پہنچانے میں کلفتیں برداشت کرنا اِن اعتبارات سے ثقیل کہا گیا۔ اور مقصد یہ ہے کہ قیامِ لیل کو شاق نہ سمجھنا ہم تو اِس سے بھی بھاری بھاری کام تم سے لینے والے ہیں۔ قیام اللیل کا حکم آپ کو اسی لئے دیا گیا ہے کہ آپ خوگر ہوں ریاضت کے جس سے استعدادِ نفس اکمل و اقویٰ ہو کیونکہ ہم آپ پر قولِ ثقیل نازل کرنے والے ہیں تو اس کے لئے اپنی استعداد کا قوی کرنا ضروری ہے، آگے قیامِ لیل کی دوسری مصلحت ہے کہ) بے شک رات کا اُٹھنا خوب مؤثر ہے (نفس کے کچلنے میں اور (دُعا ہو یا قرأت ہو ظاہرًا و باطنًا) بات خوب ٹھیک نکلتی ہے (ظاہرًا تو اس طرح کہ فرصت کا وقت ہوتا ہے الفاظ دعا و قرأت کے خوب اطمینان سے ادا ہوتے ہیں اور باطنًا اِس طرح کہ جی خوب لگتا ہے اور موافقتِ دل و زبان کا یہی مطلب ہے اور اس کا علّت ہونا ظاہر ہے۔ آگے ایک تیسری علّت ہے جس میں تخصیص شب کی حکمت کا بیان ہے وہ یہ کہ) بے شک تم کو دن میں بہت

کام رہتا ہے (دُنیوی بھی جیسے تدبیر مہماتِ خانہ داری اور دینی بھی جیسے تبلیغ اِس لئے اِن کاموں کے لئے رات تجویز کی گئی) اور (علاوہ قیامِ لیل کے جس کا اُوپر ذکر ہوا دوسرے اوقات میں بھی) اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے (تعلّق قطع) کرکے اُسی کی طرف متوجہ رہو (یعنی ذکر و تبتُّل یہ ہر وقت کا فرض ہے اور تعلّق قطع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خالق کا تعلّق مخلوق کے سب تعلّقات پر غالب رہے، آگے توحید کے ساتھ اس کی تاکید اور تصریح ہے یعنی) وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے اُس کے سوا کوئی قابلِ عبادت نہیں تو اُسی کو اپنے کام سپرد کرنے کیلئے قرار دیئے رہو، اور یہ لوگ جو جو باتیں کرتے ہیں اُن پر صبر کرو اور خوبصورتی کے ساتھ اُن سے الگ ہوجاؤ (الگ ہونا یہ کہ کوئی تعلّق نہ رکھو اور خوبصورتی سے یہ کہ ان کی شکایت و انتقام کی فکر میں مت پڑو) اور (آگے ان کے عذاب کی خبر دے کر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو تسلّی دی گئی ہے) مجھ کو اور ان جھٹلانے والوں کو ناز و نعمت میں رہنے والوں کو (حالتِ موجودہ پر) چھوڑ دو (یعنی رہنے دو ومر تفسیرہٗ فی اٰیۃ فَذَرْنِیْ وَمَنْ یُّکَذِّبُ بِھٰذَا الْحَدِیْثِ) اور ان لوگوں کو تھوڑے دنوں اور مہلت دیدو (یہ کنایہ ہے صبر و انتظار سے یعنی کچھ دن اور صبر کرلیجئے عنقریب ان کو سزا ہونے والی ہے کیونکہ) ہمارے یہاں بیڑیاں ہیں اور دوزخ ہے اور گلے میں پھنس جانے والا کھانا ہے (وھٰذا کقولہ یَتَجَرَّعُہٗ وَلَا یَکَادُ یُسِیْغُہٗ) اور دردناک عذاب ہے (پس ان لوگوں کو اِن چیزوں سے سزا دی جاوے گی اور یہ سزا اُس روز ہوگی) جس روز زمین و پہاڑ ہلنے لگیں اور پہاڑ (ریزہ ریزہ ہوکر) ریگ رواں ہوجائیں گے (پھر اُڑتے پھریں گے آگے مکذّبین مذکورین کو بطور التفات کے خطاب ہے جس میں اثبات رسالت و تحقیق وعید بھی ہے یعنی) بے شک ہم نے تمہارے پاس ایک ایسا رسول بھیجا ہے جو تم پر (قیامت کے روز) گواہی دیں گے (کہ ان لوگوں نے تبلیغ کے بعد کیا برتاؤ کیا) جیسا ہم نے فرعون کے پاس ایک رسول بھیجا تھا، پھر فرعون نے اس رسول کا کہنا نہ مانا تو ہم نے اُس کو سخت پکڑنا پکڑا سو اگر تم (بھی بعثتِ رسول کے بعد نافرمانی اور) کفر کروگے تو (اِسی طرح ایک روز تم کو بھی مصیبت بھگتنا پڑے گی چنانچہ وہ مصیبت کا دن آنے والا ہے سو تم) اُس دن (کی مُصیبت) سے کیسے بچوگے جو (اپنی شدّت اور طول کی وجہ سے) بچّوں کو بوڑھا کردے گا، جس میں آسمان پھٹ جاوے گا بے شک اُس کا وعدہ ضرور ہوکر رہے گا (یہ بھی احتمال نہیں ہے کہ وہ وقت ٹل جاوے) یہ (تمام مضمون) ایک (بلیغ) نصیحت ہے سو جس کا جی چاہے اپنے پروردگار کی طرف رستہ اختیار کرے (یعنی اس تک پہنچنے کے لئے دین کا رستہ قبول کرے، آگے اس قیامِ لیل کی فرضیّت کا نسخ ہے جو شروع سورت میں مذکور تھا یعنی) آپ کے رب کو معلوم ہے کہ آپ اور آپ کے ساتھ والوں میں سے بعضے آدمی (کبھی) دو تہائی رات کے قریب اور (کبھی) آدھی رات اور (کبھی) تہائی رات (نماز میں) کھڑے رہتے ہیں اور رات اور دن

کا پورا اندازہ اللہ ہی کرسکتا ہے اس کو معلوم ہے کہ تم اس (مقدارِ وقت) کو ضبط نہیں کرسکتے (اور اِس وجہ سے تم کو سخت مشقت لاحق ہوتی ہے کیونکہ اندازے سے تخمینہ کرنے میں تو شبہ رہتا ہے کمی کا اور انداز سے زیادہ کرنے میں تمام رات کے قریب صَرف ہوجاتا ہے تاکہ وقت مقدّر یقینًا پورا ہوجاوے اور ان دونوں امر میں مشقت شدید ہے روحانی یا جسمانی) تو (ان وجوہ سے) اس نے تمھارے حال پر عنایت کی (اور اس سے پہلے حکم کو منسوخ فرمادیا) سو (اب) تم لوگ جتنا قرآن آسانی سے پڑھا جاسکے پڑھ لیا کرو (مراد اس قرآن پڑھنے سے تہجد پڑھنا ہے کہ اس میں قرآن پڑھا جاتا ہے اور یہ امر استحباب کے لئے ہے۔ مطلب یہ کہ تہجد کی فرضیت منسوخ ہوگئی اب جسقدر وقت تک آسان ہو بطور استحباب کے اگر چاہو پڑھ لیا کرو اور منسوخ ہونے کی اصل علّت مشقت ہے جس پر عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْہُ کا قرینہ ہے اور اسکے قبل کا مضمون اسکی تمہید ہے، آگے اسی نسخ کی دوسری علّت کا بیان ہے کہ) اس کو (یہ بھی) معلوم ہے کہ بعضے آدمی تم میں بیمار ہونگے اور بعضے تلاشِ معاش کے لئے ملک میں سفر کریں گے اور بعضے اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے (اس لئے بھی اس حکم کو منسوخ کردیا کیونکہ ان حالتوں میں پابندی تہجد اور اس کے اوقات کی مشکل تھی) سو (اس لئے بھی تم کو اجازت ہے کہ اب) تم لوگ جتنا قرآن آسانی سے پڑھا جاسکے پڑھ لیا کرو، اور (گو تہجد منسوخ ہوگیا مگر یہ احکام اب بھی باقی ہیں یعنی یہ کہ) نماز (فرض) کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو (قدمر تفسیرہٗ فی اول المؤمنین) اور اللہ کو اچھی طرح (یعنی اخلاص سے) قرض دو اور جو نیک عمل اپنے لئے آگے (ذخیرہ آخرت کا بناکر) بھیجدوگے اس کو اللہ کے پاس پہنچکر اس سے اچھا اور ثواب میں بڑا پاؤ گے (یعنی دُنیوی اغراض میں خرچ کرنے سے جو عوض اور نفع مرتب ہوتا ہے اس سے بہتر اور اعظم نفقات خیر پر ملیگا) اور اللہ سے گناہ معاف کراتے رہو، بیشک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے (استغفار بھی ان ہی احکام باقیہ میں ہے)

معارف و مسائل

یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ، مُزَّمِّل، کے لفظی معنے اپنے اوپر کپڑے لپیٹنے والا۔ تقریبًا اسی کا ہم معنے لفظ مُدَّثِّر ہے جو اگلی سورت میں آرہا ہے۔ ان دونوں سورتوں میں رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک وقتی حالت اور مخصوص صفت کیساتھ خطاب کیا گیا ہے کیونکہ اسوقت رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدّت خوف و فزع کے سبب سخت سردی محسوس کررہے تھے اس لئے اپنے اوپر کپڑے ڈالنے کے لئے فرمایا یہ کپڑے ڈالدیئے گئے تو آپ اُن میں لپٹ گئے۔ واقعہ اسکا صحیحین بخاری و مسلم میں حضرت جابر رضؓ کی روایت سے یہ ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فترتِ وحی کے زمانے کا ذکر فرمارہے تھے فترت کے لفظی معنی سُست یا بند ہوجانے کے ہیں، واقعہ اسکا یہ پیش آیا تھا کہ سب سے پہلے غار حراء میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جبرئیل امین نازل ہوئے اور سورۂ اقرأ کی ابتدائی آیتیں آپ کو سُنائیں۔ یہ فرشتے کا نزول اور وحی کی شدّت پہلے پہل تھی جسکا اثر طبعی

طور پر ہوا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ کے پاس تشریف لے گئے سخت سردی محسوس کر رہے تھے اس لئے فرمایا زَمِّلُونِي زَمِّلُونِي یعنی ڈھانپو مجھے ڈھانپو۔ اسکا مفصّل اور طویل واقعہ صحیح بخاری کے پہلے ہی باب میں مذکور ہے اس کے بعد کچھ دنوں تک یہ سلسلہ وحی کا بند رہا اس زمانے کو جس میں سلسلہ وحی بند رہا زمانہ فترت الوحی کہا جاتا ہے آپ نے اس زمانہ فترت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک روز میں چل رہا تھا کہ اچانک میں نے آواز سنی تو نظر آسمان کی طرف اُٹھائی دیکھتا کیا ہوں کہ وہ ہی فرشتہ جو غارِ حرا میں میرے پاس آیا تھا آسمان و زمین کے درمیان ایک معلّق کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ مجھے ان کو اس ہیئت میں دیکھ کر پھر وہ ہی رعب و ہیبت کی کیفیت طاری ہوگئی جو پہلی ملاقات کے وقت ہو چکی تھی میں واپس اپنے گھر چلا آیا اور گھر والوں سے کہا کہ مجھے ڈھانپ دو اُس پر یہ آیت نازل ہوئی یَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ، اس حدیث میں آیت یَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ کے نزول کا ذکر ہے ہوسکتا ہے کہ اسی حالت کو بیان کرنے کے لئے یَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ کا خطاب بھی آیا ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لفظ مزّمّل کے لقب کا واقعہ الگ وہ ہو جو خلاصۂ تفسیر میں بیان ہوا ہے، اس عنوان سے خطاب کرنے میں ایک خاص لطف و عنایت کی طرف اشارہ ہے جیسے محبت و شفقت میں کسی کو اُس کی وقتی حالت کے عنوان سے محض تلطّف کے لئے خطاب کیا جاتا ہے (روح المعانی) اس عنوانِ خاص سے خطاب فرما کر آپ کو نمازِ تہجد کا حکم اور اس کی کچھ تفصیل بتلائی ہے۔

نمازِ تہجد کے احکام اور انمیں تبدیلی لفظ مزّمّل اور مدثّر خود اسکا پتہ دیتے ہیں کہ یہ آیات بالکل شروع اسلام اور نزولِ قرآن کے ابتدائی زمانے میں نازل ہوئی ہیں جبکہ اسوقت پانچ نمازیں اُمت پر فرض نہیں ہوئی تھیں کیونکہ پانچ نمازوں کی فرضیت تو شبِ معراج میں ہوئی ہے۔

امام بغویؒ نے حضرت صدیقہ عائشہؓ وغیرہا کی احادیث کی بنا پر یہ فرمایا ہے کہ اس آیت کی رُو سے قیام اللیل یعنی رات کی نماز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور تمام اُمّت پر فرض تھی اور یہ اسوقت کا واقعہ ہے، جب پانچ نمازیں فرض نہیں تھیں۔

اس آیت میں قیام اللیل یعنی تہجد کی نماز کو صرف فرض ہی نہیں کیا گیا بلکہ اسمیں کم از کم ایک چوتھائی رات سے مشغول رہنا بھی فرض قرار دیا گیا ہے کیونکہ ان آیات میں اصل حکم یہ تھا کہ تمام رات باستثنار قلیل نماز میں مشغول رہیں اور استثنار قلیل کا بیان اور تفصیل آگے آتی ہے۔

امام بغویؒ روایاتِ حدیث کی بنار پر فرماتے ہیں کہ اس حکم کی تعمیل میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رات کے اکثر حصّہ کو نمازِ تہجد میں صرف فرماتے تھے یہاں تک کہ اُن کے قدم ورم کر گئے اور یہ حکم خاصا بھاری معلوم ہوا۔ سال بھر کے بعد اسی سورت کا آخری حصّہ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ نازل ہوا جس نے اس طویل قیام کی پابندی منسوخ کر دی اور اختیار دیدیا کہ جتنی دیر کسی کے لئے آسان ہو سکے اتنا وقت خرچ کرنا نمازِ تہجد میں کافی ہے یہ مضمون ابوداؤد و نسائی میں حضرت صدیقہ عائشہ رضہ سے منقول ہے اور حضرت

ابن عباس رضؓ نے فرمایا کہ جب پانچ نمازوں کی فرضیت شبِ معراج میں نازل ہوئی تو نماز تہجد کی فرضیت منسوخ ہوگئی البتہ سنت پھر بھی رہی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ اُس پر مداومت فرمائی اسی طرح اکثر صحابہ کرام بڑی پابندی سے نماز تہجد ادا کرتے تھے (مظہری) اب الفاظ آیت کی تفسیر دیکھئے ارشاد فرمایا، قُمِ الَّیۡلَ اِلَّا قَلِیۡلًا ، الیل پر الف لام داخل ہونے سے اس نے پوری رات کے معنے دیئے تو مطلب آیت کا یہ ہوگیا کہ آپ ساری رات قیام الیل میں مشغول رہیں بجز قلیل کے۔ مگر چونکہ یہ لفظ قلیل مبہم تھا اس لئے آگے اس کی تشریح اس طرح فرمادی نِصۡفَهٗۤ اَوِ انۡقُصۡ مِنۡهُ قَلِیۡلًا اَوۡ زِدۡ عَلَیۡهِ یعنی اب آپ نصف رات قیام فرمائیں یا نصف سے کچھ کم کردیں یا نصف سے کچھ بڑھادیں۔ یہ بیان اِلَّا قَلِیۡلًا کے استثنار کا ہے۔ اس لئے اس پر یہ سوال ہوسکتا ہے کہ نصف تو قلیل نہیں کہلاتا۔ جواب یہ ہے کہ رات کا ابتدائی حصہ تو نماز مغرب پھر عشار وغیرہ میں گزر ہی جاتا ہے اب نصف سے مراد باقیماندہ کا نصف ہوگا وہ مجموعہ رات کے اعتبار سے قلیل ہے اور اس آیت میں چونکہ نصف سے کم کرنے کی بھی اجازت ہے نصف سے زائد کرنے کی بھی، اسلئے مجموعی طور پر اسکا یہ حاصل ہوا کہ کم از کم چوتھائی رات سے کچھ زیادہ قیام الیل میں مشغول رہنا فرض ہوگا۔

ترتیل قرآن کا مطلب وَرَتِّلِ الۡقُرۡاٰنَ تَرۡتِیۡلًا ، ترتیل کے لفظی معنے کلمہ کو سہولت اور استقامت کے ساتھ منہ سے نکالنے کے ہیں (مفردات امام راغب) مطلب آیت کا یہ ہے کہ تلاوتِ قرآن میں جلدی نہ کریں، بلکہ ترتیل وتسہیل کے ساتھ ادا کریں اور ساتھ ہی اسکے معانی میں تدبر و غور کریں (قرطبی) ورتّل کا عطف قم الیل پر ہے اور اسمیں اسکا بیان ہے کہ رات کے قیام میں کیا کرنا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز تہجد اگرچہ قرارت وتسبیح، رکوع وسجود سبھی اجزائے نماز پر مشتمل ہے مگر اسمیں اصل مقصود قرارت قرآنی ہے اسی لئے احادیث صحیحہ اس پر شاہد ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کی نماز بہت طویل ادا فرماتے تھے، یہی عادت صحابہؓ و تابعین میں معروف رہی ہے۔

مسئلہ - اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن کا صرف پڑھنا مطلوب نہیں بلکہ ترتیل مطلوب ہے جس میں ہر ہر کلمہ صاف صاف اور صحیح ادا ہو۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح ترتیل فرماتے تھے حضرت ام سلمہؓ سے بعض لوگوں نے رات کی نماز میں آپ کی تلاوتِ قرآن کی کیفیت دریافت کی تو انھوں نے نقل کرکے تبلایا جس میں ایک ایک حرف واضح تھا (ترمذی۔ ابوداؤد۔ نسائی۔ از مظہری)

مسئلہ - ترتیل میں تحسینِ صوت یعنی بقدر اختیار خوش آوازی سے پڑھنا بھی شامل ہے حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی کی قرارت وتلاوت کو ایسا نہیں سُنتا جیسا اُس نبی کی تلاوت کو سُنتا ہے جو خوش آوازی کیساتھ جہراً تلاوت کرے (مظہری)

حضرت علقمہ رضؓ نے ایک شخص کو حسن صوت کیساتھ تلاوت کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا لقد رتّل القرآن

فداہ ابی و امی، یعنی اس شخص نے قرآن کی ترتیل کی ہے میرے ماں باپ اس پر قربان ہوں (قرطبی)

اور اصل ترتیل وہی ہے کہ حروف والفاظ کی ادائیگی بھی صحیح اور صاف ہو اور پڑھنے والا اسکے معانی پر غور کر کے اُس سے متأثر بھی ہو رہا ہو جیساکہ حسن بصری رح سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک شخص پر ہوا جو قرآن کی ایک آیت پڑھ رہا تھا اور رو رہا تھا۔ آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ حکم سُنا ہے وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا۔ بس یہی ترتیل ہے (جو یہ شخص کر رہا ہے) از قرطبی

اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا، ثقیل کے معنی بھاری کے ہیں اور قول ثقیل سے مراد قرآن ہے کیونکہ اس کے بیان کردہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے حدود کی دائمی پابندی طبعی طور پر بھاری ہے بجز اسکے کہ جس کے لئے اللہ تعالیٰ اس کو آسان بنا دے اور قرآن کو قول ثقیل اسوجہ سے بھی کہا جاسکتا ہے کہ اسکے نزول کے وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک خاص وزن اور شدت محسوس فرماتے تھے جس سے سخت سردی کے زمانے میں بھی آپ کی پیشانی پسینہ پسینہ ہوجاتی تھی اور اگر اسوقت کسی اونٹنی پر سوار ہیں تو وہ اس کے بوجھ سے اپنی گردن ڈالدیتی تھی جیساکہ احادیث صحیحہ اس پر شاہد ہیں (صحیح بخاری وغیرہ)

اس آیت میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ نماز تہجد کا حکم اسلئے دیا گیا کہ انسان مشقت اُٹھانے کا خوگر بنے۔ یہ رات کو نیند کے غلبہ اور نفس کی راحت کے خلاف ایک جہاد ہے اس کے ذریعہ ثقیل بوجھل احکام کی برداشت آسان ہوجائے گی جو قرآن میں نازل ہونے والے ہیں۔

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ لفظ ناشئہ بوزن عافیت مصدر ہے جس کے معنی ہیں رات کی نماز کے لئے کھڑا ہونا۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ سونے کے بعد رات کی نماز کے لئے اُٹھنا ناشئۃ الّیل ہے اس معنی کے لحاظ سے لفظ ناشئۃ اللّیل بمعنے تہجد ہوگیا کیونکہ تہجد کے لفظی معنے بھی رات میں سو کر اُٹھنے کے بعد نماز پڑھنے کے ہیں۔ ابن کیسان نے فرمایا کہ آخر رات کے قیام کو ناشئۃ اللّیل کہا جاتا ہے۔ ابن زید نے فرمایا کہ رات کے جس حصے میں بھی کوئی نماز پڑھی جائے وہ ناشئۃ الّیل میں داخل ہے۔ اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ عشار کی نماز کے بعد ہر نماز ناشئۃ الیل میں داخل ہے۔ ابن ابی مُلیکہ نے فرمایا کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے ناشئۃ الّیل کے معنے پوچھے تو انھوں نے فرمایا الّیل کلّھا ناشئۃ یعنی رات کے ہر حصّہ کی نماز ناشئۃ الّیل میں داخل ہے (مظہری)

ان مجموعۂ اقوال میں کوئی تضاد نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قیام الیل اور ناشئۃ الّیل کا مفہوم اصل میں عام ہے رات کے کسی بھی حصّہ میں جو نماز پڑھی جائے اس پر ان دونوں لفظوں کا اطلاق ہوسکتا ہے خصوصاً جو نماز عشار کے بعد ہو جیساکہ حسن بصری کا قول ہے لیکن جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور جمہور صحابہ و تابعین اور صلحائے اُمّت کا ہمیشہ یہ عمل رہا ہے کہ اس نماز کو سو کر اُٹھنے کے بعد آخر شب میں ادا کرتے تھے اسلئے وہ افضل و اعلیٰ اور موجب برکات زیادہ ہے اور نفس سنّت قیام الّیل اور ناشئۃ الیل کی عشار کی نماز کے

بعد ہر نماز نفل سے ادا ہو جاتی ہے،

هِيَ أَشَدُّ وَطْئًا، وَطْأً میں دو قراءتیں ہیں، مشہور قراءۃ بفتح الواؤ و سکون الطاء، بروزن ضَرْبٌ ہے جس کے معنی روندنے اور کچلنے کے آتے ہیں، اس کے اعتبار سے مطلب یہ ہوگا کہ رات کی نماز نفس کشی اور نفس کو کچلنے میں بہت معین ہے، یعنی نفس کو قابو میں رکھنے اور ناجائز خواہشات پر اڑنے سے روکنے میں نماز تہجد سے بڑی مدد ملتی ہے، خلاصۂ تفسیر مذکور میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے ——— دوسری قراءۃ میں وِطَاءً بکسر الواؤ و بالالف الممدودۃ بروزن کِتَاب ہے، اس صورت میں یہ مواطاۃ بمعنی موافقت کا مصدر ہے، قرآن کریم کی آیت لِيُوَاطِئُوا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ میں اسی موافقت کے معنی ہیں، ائمہ تفسیر میں سے حضرت ابن عباسؓ اور ابن زیدؓ سے اس کے یہی معنی منقول ہیں، ابن زیدؓ نے فرمایا کہ مراد یہ ہے کہ رات کے وقت نماز کے لئے اٹھنا قلب، نگاہ، کان اور زبان سب میں باہمی موافقت پیدا کرنے میں اشد ہے یعنی بہت زیادہ مؤثر ہے،

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ أَشَدُّ وِطَاءً کے معنی یہ ہیں کہ کان اور قلب میں اس وقت زیادہ موافقت ہوتی ہے، کہ رات کا وقت عموماً کاموں سے فراغت اور شور و شغب سے نجات اور سکون کا وقت ہوتا ہے، اس وقت جو الفاظ زبان سے نکلیں گے اپنے کان بھی ان کو سنیں گے اور دل بھی حاضر ہوگا،

وَأَقْوَمُ قِيلًا، اور اقوم کے معنے زیادہ مستقیم و درست اور زیادہ ثابت کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ رات کے وقت میں تلاوتِ قرآن زیادہ درست اور جماؤ اور ثبات کیساتھ ہو سکتی ہے کیونکہ مختلف قسم کی آوازوں اور شور و شغب سے قلب اور ذہن مشوش نہیں ہوتا۔

خلاصہ اس آیت کا بھی حکم قیام اللیل کی حکمت بیان کرنا ہے اس سے پہلی آیت میں جو اس کی حکمت ارشاد فرمائی گئی تھی إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا، یہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ قدسی کے ساتھ خاص تھی کہ قولِ ثقیل یعنی قرآن کے نزول کا تعلق آپ ہی کی ذات سے ہے۔ اس دوسری آیت میں جو حکمت بیان ہوئی وہ سب اُمت کے لئے عام ہے کہ رات کی نماز میں دو وصف ہیں اوّل قلب و زبان میں موافقت دوسرے تلاوتِ قرآن میں بوجہ سکون کے آسانی۔

إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا، لفظ سَبْح کے لفظی معنے جاری ہونے اور گھومنے پھرنے کے ہیں اسی سے پانی میں تیرنے کو بھی سَبْح اور سباحت کہا جاتا ہے کہ پانی میں بغیر کسی رکاوٹ کے گھومنا پھرنا تیراکی کے ساتھ آسان ہے۔ یہاں مراد سَبْح سے دن بھر کے مشاغل ہیں جن میں تعلیم و تبلیغ اور اصلاحِ خلق کے لئے یا اپنی معاشی مصالح کے لئے چلنا پھرنا سب داخل ہیں۔

اس آیت میں قیام اللیل کے حکم کی تیسری حکمت و مصلحت کا بیان ہے یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور پوری اُمت کے لئے عام ہے وہ یہ کہ دن میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسی طرح دوسرے سبھی حضرات کو بہت سے مشاغل چلنے پھرنے کے رہتے ہیں۔ فراغ بالی سے عبادت میں توجہ مشکل ہوتی ہے رات کا وقت اس کام کے لئے رہنا چاہیئے کہ بقدر ضرورت نیند اور آرام بھی ہو جائے اور قیام اللیل کی عبادت بھی۔

فائدہ حضرات فقہاء نے فرمایا کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ علماء و مشائخ جو تعلیم و تربیت اور اصلاحِ خلق کی خدمتوں میں لگے رہتے ہیں اُن کو بھی چاہیئے کہ یہ کام دن ہی تک محدود رہنے چاہئیں، رات کا وقت اللہ تعالیٰ کے حضور حاضری اور عبادت کے لئے فارغ رکھنا بہتر ہے جیسا کہ علمائے سلف کا تعامل اسپر شاہد ہے کوئی وقتی ضرورت دینی، تعلیمی، تبلیغی کبھی اتفاقات کو بھی اسمیں مشغول رکھنے کی داعی ہو تو وہ بقدرِ ضرورت مستثنیٰ ہے۔ اس کی شہادت بھی بہت سے حضرات علماء و فقہاء کے عمل سے ثابت ہے۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا، تبتّل کے لفظی معنے مخلوق سے منقطع ہو کر خالق کی عبادت میں لگ جانے کے ہیں وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ کا عطف قُمِ الَّيْلَ پر ہے جسمیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو قیام اللیل یعنی رات کی نماز کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے ضمن میں دن کی خاص خاص عبادتوں کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کما فی قولہ إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا۔ اس آیت میں ایک ایسی عبادت کا حکم ہے جو رات یا دن کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر وقت اور ہر حال میں جاری رہتی ہے وہ ہے ذکر اللہ، اور مراد ذکر اللہ کے حکم سے اُس پر مداومت ہے کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اسکا تو تصور ہی نہیں ہو سکتا کہ آپ بالکل ذکر نہ کرتے ہوں اس لئے اس حکم کا منشاء دوام ذکر ہی ہو سکتا ہے (مظہری) اور مراد آیت کی یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ ذکر اللہ کو شب و روز ہمہ وقت جاری رکھیں اسمیں نہ کبھی ذہول ہونا چاہیئے نہ سُستی۔ اور یہ مراد اُسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ ذکر اللہ سے مراد عام لیا جائے خواہ زبان سے ہو یا قلب سے یا اعضاء و جوارح کو اللہ تعالیٰ کے احکام میں مشغول رکھنے سے۔ اور ایک حدیث میں جو حضرت صدیقہ عائشہ رضہ کی روایت سے یہ آیا ہے کہ کان یذکر اللہ علی کل حین، یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہر وقت اللہ کا ذکر فرماتے تھے یہ بھی اس عام معنے کی رُو سے صحیح ہو سکتا ہے کیونکہ بیت الخلاء وغیرہ میں آپ کا ذکر لسانی نہ کرنا روایات حدیث سے ثابت ہے مگر ذکر قلبی ہر وقت جاری رہ سکتا ہے اور ذکر قلبی کی دو صورتیں ہیں ایک الفاظ متخیلہ کے ذریعہ ذکر کرنا، دوسرے اللہ تعالیٰ کی صفات و کمالات میں غور و فکر کرنا، کما افادہ شیخی التھانوی قدس سرہ۔

دوسرا حکم اس آیت میں یہ دیا گیا کہ تَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا، یعنی آپ تمام مخلوقات سے قطع نظر کر کے صرف اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی اور اُس کی عبادت میں لگ جائیں اس کے عام مفہوم میں اللہ کی عبادت میں غیر اللہ کو شریک نہ کرنا بلکہ خالص اللہ کے لئے عبادت کرنا بھی داخل ہے اور یہ بھی کہ اپنے تمام اعمال و افعال اور حرکات و سکنات میں نظر اور بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر رہے کسی مخلوق کو نفع و ضرر کا مالک یا حاجت روا اور مشکل کشا نہ سمجھیں۔ حضرت ابن زید رضہ نے فرمایا کہ تبتل کے معنے یہ ہیں کہ تمام دُنیا و مافیہا کو چھوڑیں اور صرف اُس چیز کی طرف متوجہ رہیں جو اللہ کے پاس ہے (مظہری) لیکن جس تبتّل اور مخلوق سے قطع تعلق کا حکم اس آیت میں دیا گیا ہے وہ اس ترک تعلقات اور ترک دُنیا سے بالکل مختلف ہے جس کو قرآن میں رہبانیت کہا ہے اور اسکی مذمت کیطرف اشارہ کیا ہے وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا۔ اور جس کے متعلق حدیث میں ہے لا رھبانیۃ فی الاسلام۔

کیونکہ رہبانیت اصطلاحِ شرع میں اُس ترکِ دُنیا اور ترکِ تعلقات کا نام ہے جس میں تمام لذائذ اور حلال طیب اشیاء کو بہ نیتِ عبادت چھوڑ دیا جائے یعنی یہ اعتقاد ہو کہ ان حلال چیزوں کے چھوڑے بغیر اللہ تعالیٰ کی رضار حاصل نہیں ہوسکتی۔ یا عملاً ترک تعلقات اس طرح کرے کہ لوگوں کے حقوق واجبہ کی رعایت نہ کرے اُن میں خلل آئے اور یہاں جس تبتّل اور ترک تعلق کا حکم ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تعلق پر کسی دوسری مخلوق کا تعلق غالب نہ آجائے خواہ اعتقاداً یا عملاً اور ایسا ترک تعلق دُنیوی تمام معاملات ازدواج و نکاح اور تعلقات رشتہ داری وغیرہ کے منافی نہیں بلکہ ان سب کے ساتھ جمع ہوسکتا ہے جیسا کہ تمام انبیاء علیہم السّلام کی سنّت خصوصاً سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی پوری زندگی اور شمائل اس پر شاہد ہیں۔ یہاں جس مفہوم کو لفظ تبتّل سے تعبیر کیا گیا ہے اسی کا دوسرا عنوان سلف صالحین کی زبان میں اخلاص ہے۔ (مظہری)

فائدہ مہمہ | ذکر اللہ کی کثرت اور تعلقات دُنیا کے ترک کے معاملے میں صوفیائے کرام سلفاً و خلفاً سب سے آگے رہے ہیں۔ اُنھوں نے فرمایا کہ ہم جس مسافت کو طے کرنے اور راستہ قطع کرنے میں دن رات لگے ہوئے ہیں درحقیقت اُس کے دو قدم ہیں۔ پہلا قدم مخلوق سے انقطاع ہے اور دوسرا قدم وصول الی اللہ ہے۔ اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ آیت مذکورہ میں اُنھیں دو قدموں کو دو جملوں میں عطف کر کے بیان فرمایا گیا ہے وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا۔

یہاں ذکر اللہ سے مراد اُس پر ایسی مداومت ہے جس میں کبھی قصور و فتور نہ ہو اور کسی وقت اُس سے ذہول نہ ہو۔ یہی وہ مقام ہے جس کو صوفیائے کرام کی اصطلاح میں وُصول اِلی اللہ کہا جاتا ہے۔ اس طرح پہلے جملے میں آخری قدم کا ذکر فرمایا اور دوسرے جُملے میں پہلے قدم کا۔ یہ ترتیب شاید اس لئے بدل گئی کہ اگرچہ عمل میں تبتّل یعنی قطع تعلقات (بالمعنے المذکور) مقدم ہے اور وصول الی اللہ اُسکے بعد اُس پر مرتب ہوتا ہے مگر چونکہ مقصد سالک کا یہ دوسرا ہی قدم ہے اور یہی درحقیقت مقصود المقاصد ہے اس کی اہمیت و افضلیت بتلانے کے لئے ترتیب طبعی و قوعی کو بدل کر ذکر اللہ کو مقدم بیان فرمایا گیا۔ شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے اِنھیں دو قدموں کو خوب بیان فرمایا ہے ؎

تعلق حجاب است و بے حاصلی ❊ چو پیوندہا بگسلی واصلی

ذکر اسم ذات یعنی اللہ اللہ کا تکرار بھی مامور بہ ذکر و عبادت ہے | اس آیت میں ذکر اللہ کے حکم کو لفظ اسم کیساتھ مقید کر کے وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ فرمایا ہے وَاذْكُرْ رَبَّكَ نہیں فرمایا اسمیں اشارہ اس طرف نکلتا ہے کہ اسم رب یعنی اللہ اللہ کا تکرار بھی مطلوب و مامور بہ ہے (مظہری) بعض علماء نے جو صرف اسم ذات اللہ اللہ کے تکرار کو بدعت کہدیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اسکو بدعت کہنا صحیح نہیں۔ واللہ اعلم

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ، وکیل لغت میں اُس شخص کو کہا جاتا ہے جس کو کوئی کام سپرد کیا جائے۔ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا کا مفہوم یہ ہوا کہ اپنے سب کاروبار

معاملات اور حالات کو اللہ کے سپرد کرو۔ اسی کا نام اصطلاح میں **توکّل** ہے۔ اس سورت میں جو احکام رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دیئے گئے ہیں یہ انمیں پانچواں حکم ہے۔ امام یعقوب کرخی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ شروع سورت سے اس آیت تک مقامات سلوک کی طرف اشارہ ہے یعنی ۱ رات میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے خلوت۔ ۲ قرآن کریم میں اشتغال۔ ۳ ذکر اللہ پر دوام۔ ۴ ماسوی اللہ سے اعراض و ترک تعلق۔ ۵ اللہ تعالیٰ پر توکل۔ توکّل کے آخری حکم سے پہلے اللہ تعالیٰ شانہٗ کی صفت رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ بیان کرکے اسطرف اشارہ کر دیا کہ جو ذات پاک مشرق و مغرب یعنی سارے جہان کی پالنے والی اور ان کی تمام ضروریات ابتدا سے انتہا تک پورا کرنے کی متکفّل ہے۔ توکّل اور بھروسہ کرنے کے قابل صرف وہی ذات ہو سکتی ہے اور اس پر بھروسہ کرنے والا کبھی محروم نہیں رہ سکتا جیساکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ، یعنی جو شخص اللہ پر توکل (بھروسہ) کرتا ہے اللہ اس کے (سب مہمات و مشکلات کیلئے) کافی ہو جاتا ہے۔

توکّل کے معنی شرعی اللہ پر توکّل اور بھروسہ کے یہ معنی نہیں کہ کسبِ معاش اور دفع بلا کے جو اسباب و آلات قدرتِ حق نے آپ کو عطا فرمائے ہیں اُن کو معطّل کر کے اللہ پر بھروسہ کرو، بلکہ حقیقت توکّل کی یہ ہے کہ اپنے مقاصد کے لئے اللہ کی دی ہوئی قوت و توانائی اور جو اسباب میسّر ہیں اُن سب کو پورا استعمال کرو مگر اسبابِ مادّیہ میں غلو اور انہماک زیادہ نہ کرو اعمالِ اختیاریہ کو کرلینے کے بعد نتیجہ کو اللہ کے سُپرد کر کے بے فکر ہو جاؤ۔

توکّل کا یہ مفہوم خود رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ امام بغوی نے شرح السنۃ میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں یہ حدیث روایت کی ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان نفسا لن تموت حتّٰی تستکمل رزقھا الا فاتقوا اللہ واجملوا فی الطلب (مظہری) یعنی روح القدس (جبرئیل امین) نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے کہ کوئی شخص اسوقت تک نہیں مریگا جب تک وہ اپنے مقدر میں لکھا ہوا اللہ کا رزق پُورا پُورا حاصل نہیں کرلیگا، اس لئے تم خدا سے ڈرو اور اپنے مقاصد کی طلب میں اختصار سے کام لو، زیادہ منہمک نہ ہو کہ قلب کی توجہ ساری انھیں مادی اسباب و آلات میں محصور ہو کر رہ جائے۔ اور اللہ تعالیٰ پر توکّل کرو۔ اور ترمذی میں حضرت ابوذر غفاری رض کی روایت ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ترک دُنیا اسکا نام نہیں کہ تم اپنے اوپر اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام کر لو یا جو مال تمھارے پاس ہو اُسے خواہ مخواہ اُڑا دو، بلکہ ترکِ دُنیا اسکا نام ہے کہ تمھارا اعتماد اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں جو چیز ہے اُس پر زیادہ ہو بہ نسبت اُسکے جو تمھارے ہاتھ میں ہے (مظہری)

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا، بقول امام کرخیؒ یہ چھٹا حکم ہے جو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے یعنی لوگوں کی ایذاؤں اور گالیوں پر صبر جمیل۔ یہ مقامات سلوک میں سب سے اعلیٰ مقام ہے کہ دشمنوں کی جفا و ایذا پر صبر کیا جائے، یعنی یہ حضرات جن لوگوں کی خیر خواہی اور ہمدردی میں اپنی ساری قوت و توانائی اور ساری عمر خرچ کرتے ہیں انھیں کی طرف سے اُس کی جزا میں گالیاں، ایذائیں، طرح طرح کے جور و ستم انکے

مقابلے میں آتے ہیں اُن پر صبر جمیل کرنا یعنی انتقام کا ارادہ بھی نہ کرنا یہ وہ اعلیٰ مقام ہے جو اصطلاح صوفیہ میں فنار کامل کے بغیر نصیب نہیں ہوتا۔

وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا، ہجر بفتح الہار کے لفظی معنے کسی چیز کو رنج و ملال و بیزاری کیساتھ چھوڑ نے کے آتے ہیں۔ معنے یہ ہوئے کہ تکذیب کرنے والے کفار جو کچھ آپ کو ایذا کے کلمات کہتے ہیں آپ اسکا انتقام تو اُن سے نہ لیں مگر اُن سے تعلقات بھی نہ رکھیں۔ مگر ترک تعلق کے وقت انسان کی طبعی عادت یہ ہے کہ جس سے تعلق چھوڑا جائے اسکا شکوہ شکایت اور اُس کو بُرا بھلا کہتا ہے اسلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کے ہجر یعنی ترک تعلق کا جو حکم دیا گیا تو ساتھ ہجراً جمیلا کی قید لگادی گئی کہ آپکے منصب عالی اور خُلقِ عظیم کا تقاضا یہ ہے کہ جن کفار سے ترک تعلق کریں زبان بھی اُن کو بُرا کہنے سے محفوظ رکھیں۔

بعض حضرات مفسرین نے فرمایا ہے کہ آیاتِ جہاد و قتال جو بعد میں نازل ہوئیں اُن سے اس آیت کا حکم منسوخ ہوگیا، لیکن غور کیا جائے تو منسوخ کہنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ آیات مذکورہ میں کفار کی ایذاؤں پر صبر اور ہجر کی تلقین ہے یہ زجر اور سزا و قتال کے منافی نہیں، اس آیت کا حکم ہر وقت ہر حال میں ہے اور قتال و جہاد میں جو زجر و سزا ہے اسکا حکم خاص خاص اوقات میں ہے اور اسلامی قتال و جہاد در حقیقت کوئی انتقام یا اپنا غصہ نکالنا نہیں، جو صبر اور ہجر جمیل کے منافی ہو بلکہ خالص حکم خداوندی کی تعمیل ہے جس طرح صبر اور ہجر جمیل عام حالات میں اس کی تعمیل ہے یہاں تک رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کفار کی ایذاؤں پر صبر اور ترکِ انتقام کی تلقین تھی آگے آپ کی تسلّی کے لئے ان کفار پر جو عذاب آخرت میں آنے والا ہے اسکا بیان ہے مقصد یہ ہے ان کی چند روزہ چیرہ دستی اور ظلم و جور سے آپ ملول نہ ہوں ان کو تو اللہ تعالیٰ سخت عذاب میں پکڑنے والا ہے ہاں حکمت ربّانی کے تقاضے سے کچھ مہلت دے رکھی ہے، اسمیں آپ جلدی کی فکر نہ فرما دیں یہی مفہوم ہے بعد کی آیت (ذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا) کا اس میں کفار مکذبین کو اُولی النعمۃ فرمایا ہے۔ نَعمت بفتح النون کے معنے تنعّم یعنی عیش و عشرت اور مال و اولاد کی بہتات کے ہیں اسمیں اشارہ ہے کہ دُنیا کے مال و اولاد اور ناز و نعمت میں مست ہو جانا اُسی شخص سے ہوسکتا ہے جو آخرت کی تکذیب کرنے والا ہو۔ مؤمن کو بھی یہ چیزیں بسا اوقات نصیب ہوتی ہیں مگر وہ ان میں ایسا مست نہیں ہوتا اسلئے دُنیا کے ہر عیش و راحت کے وقت بھی اسکا قلب فکر آخرت سے خالی نہیں ہوتا۔ خالص عیش و عشرت اور بالکل بے فکری اس دُنیا میں کافروں اور آخرت کی تکذیب کرنے والوں ہی کا حصہ ہوسکتا ہے۔

آگے آخرت کے اس سخت ترین عذاب کا ذکر ہے جس میں پہلے اَنکال کا ذکر کیا جس کے معنی قید و بند اور زنجیروں کے ہیں۔ پھر جہنم کی شدید آگ کا ذکر فرمایا۔ پھر اہلِ جہنم کے دردناک کھانے کا ذکر ہے طَعَامًا ذَا غُصَّةٍ، غُصّہ کے لفظی معنے گلے میں لگجانے والے پھندے کے ہیں کہ کوئی لقمہ گلے میں اس طرح پھنس جائے کہ نہ نگلا جاسکے نہ باہر اگلا جاسکے۔ ضریع اور زقوم جو اہلِ جہنم کو کھانے کے لئے دیا جائیگا انکا یہی حال ہوگا

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اسمیں آگ کے کانٹے ہونگے جو گلے میں پھنس جائیں گے (نعوذ باللہ منہ) آخر میں فرمایا وَعَذَابًا اَلِيْمًا، ان معین عذابوں کے ذکر کرنے کے بعد یہ مبہم لفظ لا کر اس طرف اشارہ کیا گیا کہ اور عذاب ان سے بھی زیادہ شدید وسخت ہیں جنکا کوئی انسان تصوّر نہیں کر سکتا۔ (اللھم احفظنا منہا)

سلف صالحین کا خوف آخرت امام احمد۔ ابن ابی داؤد۔ ابن عدی اور بیہقی کی روایت ہے کہ ایک شخص نے قرآن کی یہ آیت سُنی تو خوف سے بیہوش ہوگیا، اور حضرت حسن بصری رح ایک دن روزہ سے تھے افطار کے وقت کھانا سامنے آیا تو اس آیت کا دھیان آگیا، کھانا نہ کھا سکے اٹھوادیا۔ اگلے روز پھر شام کو ایسا ہی ہوا، کھانا اٹھوادیا۔ تیسرے روز پھر ایسا ہی ہوا تو انکے صاحبزادے حضرت ثابت بنانی اور یزید ضبیؒ اور یحییٰ بکار کے پاس گئے اور حال سُنایا، یہ تینوں حضرات آئے اور حضرت حسن کو کھانے کا بہت اصرار کرتے رہے جب مجبور ہو کر کچھ تناول فرمایا (روح المعانی)

آگے کچھ قیامت کے ہولناک واقعات کا بیان فرمایا يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ الآیۃ اس کے بعد کفار مکہ کو فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا قصہ سُنا کر اس سے ڈرایا گیا کہ جس طرح فرعون اپنے رسُول حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی تکذیب کر کے گرفتار عذاب ہوا، تم بھی اس پر جمے رہے تو سمجھ لو کہ تم پر بھی ایسا ہی کوئی عذاب دُنیا میں آسکتا ہے۔ آخر میں فرمایا کہ اگر دُنیا میں کوئی عذاب نہ بھی آیا تو قیامت کے اُس دن کے عذاب سے تمھیں کون بچا سکے گا جس کی ہولناکی اور طول کی وجہ سے بچے بوڑھے ہوجائیں گے۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ روز قیامت کے شدید اور ہولناک ہونیکا بیان ہے کہ اسمیں لوگوں پر ایسا خوف اور ہول طاری ہوگا کہ اگر کوئی بچّہ بھی ہو تو بوڑھا ہو جائے غرض مراد اس سے ایک تمثیل ہے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ مراد حقیقت ہے اور روز قیامت اسقدر طویل ہوگا کہ اُس میں ایک بچہ بھی بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائے گا (قرطبی و روح)

قیام اللیل کی فرضیت منسوخ ہوگئی شروع سورت میں قُمِ اللَّيْلَ سے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمانوں پر قیام اللیل کو فرض قرار دیا گیا تھا اور اس قیام کا طویل ہونا بھی فرض تھا مگر اسکے طول میں اختیار دیا گیا تھا کہ آدھی رات سے کچھ کم یا کچھ زیادہ اور کم سے کم ایک تہائی رات ہونا چاہیئے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپکے ساتھ صحابۂ کرام کی ایک جماعت اس فرض کی ادائیگی میں اکثر عزیمت پر عمل فرماتے اور زیادہ سے زیادہ رات کا وقت اس نماز میں گزارتے تھے جو دو تہائی رات کے قریب ہوتا تھا۔ ہر رات میں یہ عمل پھر دن میں دین کی دعوت و تبلیغ اور ذاتی ضروریات خصوصاً صحابۂ کرام کہ بیشتر محنت مزدوری یا تجارت کرتے تھے، اس طویل و ثقیل نماز کی پابندی سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے پاؤں ورم کر آئے۔ اُن کی یہ مشقت و محنت اللہ تعالیٰ کے سامنے تھی وہ اس سے بخوبی واقف تھے مگر علمِ الٰہی میں پہلے ہی سے متعین تھا کہ اتنی محنت کا فریضہ چند روز

ہی رکھا جائیگا تاکہ آپ اور صحابۂ کرام محنت و ریاضت کے خوگر ہو جائیں جس کی طرف آیاتِ مذکورہ میں بھی اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ آپ سے یہ محنت و مشقت اسلئے لیجارہی ہو کہ آپ کو قولِ ثقیل یعنی قرآن کی خدمت سپرد ہونے والی تھی جو اس مشقت سے بڑی مشقت ہے۔ بہرحال علم ازلی کے مطابق جب یہ حکمت ریاضت و محنت کے خوگر بنانے کی پوری ہوگئی تو یہ فرض قیام اللیل منسوخ کر دیا گیا۔ اور حضرت ابن عباس رضؓ کی روایت کیمطابق یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آیاتِ مذکورہ سے صرف طولِ قیام کی فرضیت منسوخ ہوئی ہو اصل نماز تہجد کا فرض بدستور رہا ہو پھر شبِ معراج میں پانچ نمازوں کی فرضیت کے وقت نماز تہجد کی فرضیت منسوخ ہوئی ہو، واللہ اعلم

اور ظاہر یہ ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام اُمت سے یہ فرض منسوخ کر دیا گیا البتہ اسکا استحباب اور عند اللہ پسندیدہ ہونا پھر بھی باقی رہا اور اسمیں بھی یہ آسانی کر دی گئی کہ وقت کی اور تلاوتِ قرآن کی کوئی تحدید نہیں رکھی گئی، ہر شخص اپنی اپنی طاقت و فرصت کے مطابق جتنے وقت میں ادا کر سکے کرلے اور اسمیں جتنا قرآن پڑھنا آسانی سے ہو سکے پڑھ لے۔

احکامِ شرعیہ کے منسوخ ہونیکی حقیقت دنیا کی حکومتیں یا ادارے جو اپنے قوانین میں ترمیم و تنسیخ کرتے رہتے ہیں اُس کی بیشتر وجہ تو یہ ہوتی ہے کہ تجربے کے بعد کوئی نئی صورت حال سامنے آتی ہے جو پہلے سے معلوم نہ تھی تو اس صورتِ حال کے مطابق پہلے حکم کو منسوخ کر کے دوسرا حکم جاری کر دیا جاتا ہے مگر احکامِ الٰہیہ جسمیں اس کا کوئی تصوّر و احتمال ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علم محیط ازلی اور ابدی سے کوئی چیز باہر نہیں۔ کوئی حکم شرعی جاری ہونیکے بعد لوگوں کے کیا حالات رہیں گے کیا کیا صورتیں پیش آئیں گی حق تعالیٰ کو پہلے ہی سے معلوم ہی لیکن باقتضائے حکمت و مصلحت کوئی حکم کچھ عرصہ کے لئے جاری کیا جاتا ہے پہلے ہی سے اسکا ہمیشہ جاری رکھنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ ایک مدّت اللہ کے علم میں متعین ہوتی ہے کہ اس مدت تک یہ حکم جاری رہیگا مگر اس مدّت کا اظہار مخلوق پر بمصلحت نہیں کیا جاتا، الفاظ کے عموم سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ حکم غیر موقت اور دائمی ہے عند اللہ جو اسکی مدّت مقرر ہے جب وہ مدّت ختم ہو کر حکم واپس لیا جاتا ہے تو مخلوق کی نظر میں وہ حکم کی منسوخی ہوتی ہے اور حقیقت میں وہ بیان مدّت ہوتا ہے یعنی اسوقت مخلوق پر ظاہر کر دیا جاتا ہے کہ ہم نے یہ حکم ہمیشہ کے لئے نہیں بلکہ صرف اسی مدّت کے لئے جاری کیا تھا اب وہ مدت ختم ہوگئی حکم باقی نہیں رہا۔

قرآن کریم میں بہت سی آیات کے منسوخ ہونے پر جو عامیانہ شبہ کیا جاتا ہے اس تقریر سے وہ شبہ رفع ہوگیا، کیا نماز تہجد خاص رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر اس آیت کے بعد بھی فرض رہی بعض ائمہ تفسیر نے اسی کو اختیار کیا ہے انکا استدلال سورۂ بنی اسرائیل کی آیت وَمِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ سے ہے جسمیں نماز تہجد کو خاص آپکے ذمّہ ایک زائد فرض کی حیثیت سے عائد کیا گیا ہے کیونکہ نافلہ کے لغوی معنی زائدہ کے آتے ہیں اور مراد فریضہ زائدہ ہے مگر جمہور علماء کے نزدیک صحیح یہی ہے کہ فرضیت اس نماز کی اُمت اور

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں سے منسوخ ہوگئی البتہ بطور استحباب اس کی ادائیگی سب کے لئے باقی رہی اور آیت مذکورہ میں نَافِلَةً لَّكَ اپنے اصطلاحی معنے میں بحکم نفل ہے پھر اس کی خصوصیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو آیت میں لفظ لَكَ سے مفہوم ہوتی ہے اس کی کیا وجہ ہے یہ پوری تفصیل اور نماز تہجد کی فرضیت منسوخ ہونے کے بعد یہ نماز صرف نفل و مستحب کے درجہ میں رہی یا سنتِ مؤکدہ کے درجہ میں یہ پوری تحقیق سورۂ بنی اسرائیل کی آیتِ مذکورہ کے تحت میں گزر چکی ہے وہاں دیکھ لیا جائے وہاں تہجد کے خاص فضائل اور مسائل کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔

یہ آیت جن کے ذریعہ نماز تہجد کی فرضیت منسوخ ہوئی اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ سے شروع ہو کر فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ تک آئی ہے یہ آیت شروع سورت کی آیات سے ایک سال یا آٹھ ماہ بعد نازل ہوئی ہر سال بھر کے بعد قیام اللیل کی فرضیت منسوخ ہوئی، مسند احمد، مسلم۔ ابو داؤد۔ ابن ماجہ اور نسائی میں حضرت عائشہ رضی سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورت کے شروع میں قیام اللیل کو فرض کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام ایک سال تک اس کی پابندی کرتے رہے سورت کا آخری حصہ اللہ تعالیٰ نے بارہ مہینے تک آسمان میں روک رکھا سال بھر کے بعد آخری حصہ نازل ہوا جس میں قیام اللیل کی فرضیت منسوخ ہو کر تخفیف ہوگئی اور اسکے بعد قیام اللیل صرف نفل و مستحب رہ گیا (از روح المعانی)

پھر ان آیات میں تنسیخ حکم کی علت یہ بتلائی ہے کہ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ یعنی اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ تم اس کا احصاء نہ کر سکو گے۔ احصاء کے لفظی معنے شمار کرنے کے ہیں۔ مطلب آیت کا بعض حضرات مفسرین نے یہ قرار دیا ہے کہ قیام اللیل میں اللہ تعالیٰ نے اگرچہ مقدار وقت کی پوری تعیین نہیں فرمائی بلکہ ایک تہائی رات سے دو تہائی رات تک کے درمیان کا وقت مقرر فرمایا تھا مگر صحابہ کرام جب اس نماز میں مشغول ہوتے تو اشتغالِ نماز کے ساتھ یہ معلوم ہونا دشوار تھا کہ رات آدھی ہوئی یا کم و بیش کیونکہ اوقات معلوم کرنے کے ایسے آلات گھڑیاں وغیرہ اُس زمانے میں موجود نہ تھیں، اور ہوتیں بھی تب بھی شغلِ نماز کے ساتھ بار بار گھڑیوں کو دیکھتے رہنا ان حضرات کے حالات اور انکے خشوع و خضوع کے ساتھ آسان نہ تھا، یہ معنے ہوئے لَنْ تُحْصُوْهُ کے اور بعض حضرات نے یہاں احصاء سے مراد عمل احصار یعنی اس طویل وقت اور نیند کے وقت کی نماز پر مداومت نہ کر سکنا مراد لیا ہے۔ لفظ احصار اس معنے کے لئے بھی مستعمل ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں اسماء اللہ الحسنیٰ کے بارے میں آیا من احصاھا دخل الجنۃ، اس میں لفظ احصاء کا مفہوم بہت سے علماء نے عمل احصار لیا ہے یعنی اسماء الٰہیہ کے مقتضیٰ پر پورا عمل ہونا، جیسا کہ معارف القرآن میں آیت وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا کے تحت میں اس کی تفصیل لکھی گئی (پارہ ۱۳ سورۂ ابراہیم)

فَتَابَ عَلَيْكُمْ، لفظ توبہ کے اصلی معنے رجوع کے ہیں۔ گناہ سے توبہ کو بھی اسی لئے توبہ کہا جاتا ہے

کہ وہ اپنے پچھلے جرم و گناہ سے رجوع ہوتا ہے اس جگہ مراد صرف رجوع ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ حکم قیام اللیل کی فرضیت کا واپس لے لیا، آخر میں فرمایا۔

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ، یعنی نماز تہجد جواب بجائے فرض کے مستحب یا سُنت باقی رہ گئی ہے اسمیں جسقدر قرآن آسانی سے کوئی شخص پڑھ سکے وہ پڑھ لیا کرے کسی خاص مقدار کی تعیین نہیں ہے اس آیت سے بہت سے مسائل فقہیہ نکلتے ہیں جو فقہ کی کتابوں میں مفصّل مذکور ہیں وہاں دیکھا جاسکتا ہے

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا، اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ میں جمہور مفسرین کے نزدیک نماز فرض مراد ہے اور یہ ظاہر ہے کہ نماز فرض پانچ ہیں جو لیلۃ المعراج میں فرض ہوئی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیام اللیل کی فرضیت جو ایک سال تک جاری رہی تھی اسی عرصہ میں لیلۃ الاسرار کا واقعہ پیش آیا جس میں پانچ نمازیں فرض کی گئیں اور اس کے بعد آیات مذکورہ کے ذریعہ نماز تہجد کی فرضیت منسوخ ہوگئی اور آخر سورت میں جو اقامتِ صلوٰۃ کا حکم آیا ہے اس سے مراد پانچ نمازیں فرض ہیں (ابن کثیر۔ قرطبی۔ بحر محیط)

اسی طرح اٰتُوا الزَّكٰوةَ میں زکوٰۃ سے زکوٰۃ فرض مراد ہے مگر مشہور یہ ہے کہ زکوٰۃ بعد ہجرت دوسرے سال میں فرض ہوئی، اور یہ آیت مکی ہے۔ ابتدائے اسلام میں نازل ہوئی ہے اس لئے بعض مفسرین نے خاص اس آیت کو مدنی کہا ہے۔ مگر ابن کثیر فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ تو مکہ مکرمہ ہی میں اوائلِ اسلام ہی میں فرض ہوگئی ہو مگر اس کے نصاب اور مقدار واجب کی تفصیلات مدینہ طیبہ میں، ہجرت کے دوسرے سال میں بیان کی گئی ہوں، اس طرح آیت کے مکی ہونے کی صورت میں بھی اس کو زکوٰۃ فرض پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ روح المعانی میں بھی اسی کو اختیار کیا ہے اور اس کی پوری تحقیق احقر کے رسالہ نظامِ زکوٰۃ میں تفصیل سے آئی ہے۔

وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا، اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کو اس عنوان سے تعبیر کیا ہے، کہ گویا یہ خرچ کرنے والا اللہ کو قرض دے رہا ہے اسمیں اسکے حال پر لطف و کرم کی طرف اشارہ بھی ہے اور اسکا بیان بھی کہ اللہ تعالیٰ غنی الاغنیار ہے اُس کو دیا ہوا قرض کبھی مارا نہیں جاسکتا ضرور وصُول ہوگا، اور چونکہ زکوٰۃ فرض کا حکم اس سے پہلے آچکا ہے اسلئے اَقْرِضُوا اللّٰهَ میں جس خیرات اور فی سبیل اللہ خرچ کرنے کا ذکر ہے اس کو اکثر حضرات نے صدقات نافلہ اور تبرعات پر محمول کیا ہے جیسے اپنے اقارب و اعزار کو کچھ دینا یا مہمان کی مہمانی پر خرچ کرنا یا علمار و صلحار کی خدمت کرنا وغیرہ اور بعض حضرات نے اسکا مفہوم یہ قرار دیا ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی بہت سے مالی واجبات انسان پر عائد ہوتے ہیں۔ جیسے ماں باپ، بیوی، اولاد کا نفقہ واجبہ یا دوسری واجباتِ شرعیہ تو اٰتُوا الزَّكٰوةَ میں ادائے زکوٰۃ کا حکم دینے کے بعد دوسرے واجبات کا ذکر اَقْرِضُوا اللّٰهَ سے کر دیا گیا۔

وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ الاٰية ، مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ کا مطلب یہ ہے کہ جو نیک کام اپنی زندگی میں کر گزرو وہ بہتر ہے اس سے کہ مرتے وقت وصیت کرو اس میں مالی عبادات صدقہ خیرات بھی داخل ہے اور نماز روزہ وغیرہ بھی جو کسی کے ذمہ قضا ہو اپنے ہاتھ سے اپنے سامنے اللہ کی راہ میں خرچ کر کے اُس سے سبکدوشی بہتر ہے بعد میں تو وارثوں کے اختیار میں بات رہتی ہے وہ کریں یا نہ کریں۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے سوال کیا کہ تم میں ایسا کون ہے جو اپنے وارث کے مال سے بہ نسبت اپنے مال کے زیادہ محبت رکھتا ہو صحابہ کرام نے عرض کیا کہ ہم میں کوئی بھی ایسا نہیں جو اپنے وارث کے مال کی محبت خود اپنے مال سے زیادہ رکھے۔ آپؐ نے فرمایا سوچ سمجھ کر بات کرو۔ صحابہ نے عرض کیا کہ ہمیں تو اس کے سوا کوئی دوسری صورت معلوم نہیں، آپؐ نے فرمایا (جب یہ بات ہے تو سمجھ لو کہ) تمھارا مال وہ ہے جو تم نے اپنے ہاتھ سے اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا اور جو رہ گیا وہ تمھارا مال نہیں بلکہ تمھارے وارث کا مال ہے (ذکرہ ابن کثیر باسناد ابی یعلی الموصلی ثم قال ورواہ البخاری من حدیث حفص بن غیاث الخ)

تمّت

سُوْرَةُ الْمُزَّمِّل بحمد اللہ یوم الثلثاء ۲۲ رجب سنہ ۱۳۹۱ھ

سُورَةُ المُدَّثِّر

سُورَةُ المُدَّثِّرِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سِتٌّ وَّخَمْسُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۂ مدثر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چھپن آیتیں ہیں اور اسمیں دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ① قُمْ فَاَنْذِرْ ② وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ③ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ④

اے لحاف میں لپٹنے والے کھڑا ہو پھر ڈر سنا دے اور اپنے رب کی بڑائی بول اور اپنے کپڑے پاک رکھ

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ⑤ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ⑥ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ⑦ فَاِذَا

اور گندگی سے دُور رہ اور ایسا نہ کر کہ احسان کرے اور بدلہ بہت چاہے، اور اپنے رب سے اُمید رکھ پھر جب

نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ ⑧ فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ⑨ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ

بجنے لگے وہ کھوکھری چیز پھر وہ اُس دن مشکل دن ہے منکروں پر نہیں

يَسِيْرٍ ⑩ ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ⑪ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا

آسان چھوڑ دے مجھ کو اور اُس کو جس کو میں نے بنایا اکیلا اور دیا میں نے اس کو مال

مَّمْدُوْدًا ⑫ وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا ⑬ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ⑭ ثُمَّ يَطْمَعُ

پھیلا کر اور بیٹے مجلس میں بیٹھنے والے اور تیاری کر دی اسکے لئے خوب تیاری پھر لالچ رکھتا ہے

اَنْ اَزِيْدَ ⑮ كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ⑯ سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ⑰

کہ اور بھی دوں ہرگز نہیں وہ ہے ہماری آیتوں کا مخالف اب اُس سے چڑھواؤں گا بڑی چڑھائی

اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ⑱ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ⑲ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ⑳

اُس نے فکر کیا اور دل میں ٹھہرالیا، سو مارا جائیو کیسا ٹھہرایا پھر مارا جائیو کیسا ٹھہرایا

ثُمَّ نَظَرَ ㉑ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ㉒ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ㉓ فَقَالَ اِنْ

پھر نگاہ کی پھر تیوری چڑھائی اور منہ تھتھایا پھر پیٹھ پھیری اور غرور کیا۔ پھر بولا اور

هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ﴿۲۴﴾ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿۲۵﴾ سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ﴿۲۶﴾

کچھ نہیں یہ جادو ہے چلا آتا اور کچھ نہیں یہ کہا ہوا ہے آدمی کا اب اُس کو ڈالوں گا آگ میں

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ﴿۲۷﴾ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ﴿۲۸﴾ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ﴿۲۹﴾ عَلَيْهَا

اور تو کیا سمجھا کیسی ہے وہ آگ نہ باقی رکھے اور نہ چھوڑے جلا دینے والی ہے آدمیوں کو اُس پر

تِسْعَةَ عَشَرَ ﴿۳۰﴾ وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً وَّمَا جَعَلْنَا

مقرر ہیں اُنیس فرشتے اور ہم نے جو رکھے ہیں دوزخ پر داروغہ وہ فرشتے ہی ہیں اور اُن کی جو

عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ

گنتی رکھی ہے سو جانچنے کو منکروں کے تاکہ یقین کریں وہ لوگ جن کو ملی ہے کتاب اور

يَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ

بڑھے ایمانداروں کا ایمان اور دھوکا نہ کھائیں جن کو ملی ہے کتاب اور مسلمان

وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا

اور تاکہ کہیں وہ لوگ کہ جن کے دل میں روگ ہے اور منکر کیا غرض تھی اللہ کو اس مثل

مَثَلًا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَا يَعْلَمُ

سے یوں بچلاتا ہے اللہ جس کو چاہے اور راہ دیتا ہے جس کو چاہے اور کوئی نہیں جانتا

جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ۭ وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ﴿۳۱﴾ كَلَّا وَالْقَمَرِ ﴿۳۲﴾ وَالَّيْلِ

ع ۳۱ / ۱۵

تیرے رب کے لشکر کو مگر خود وہی اور وہ تو سمجھانا ہے لوگوں کے واسطے سچ کہتا ہوں اور قسم ہے چاند کی اور رات کی

اِذْ اَدْبَرَ ﴿۳۳﴾ وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ﴿۳۴﴾ اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ ﴿۳۵﴾ نَذِيْرًا

جب پیٹھ پھیرے ، اور صبح کی جب روشن ہووے وہ ایک ہے بڑی چیزوں میں کی ڈرانے والی ہے

لِّلْبَشَرِ ﴿۳۶﴾ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ﴿۳۷﴾ كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا

لوگوں کو جو کوئی چاہے تم میں سے کہ آگے بڑھے یا پیچھے رہے ہر ایک جی اپنے کئے

كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ﴿۳۸﴾ اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ﴿۳۹﴾ فِيْ جَنّٰتٍ ۛ يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۴۰﴾

کاموں میں پھنسا ہوا ہے مگر داہنی طرف والے باغوں میں ہیں مل کر پوچھتے ہیں

عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۱﴾ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ﴿۴۲﴾ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ﴿۴۳﴾

گنہگاروں کا حال تم کا ہے سے جا پڑے دوزخ میں وہ بولے ہم نہ تھے نماز پڑھتے

وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَكُنَّا

اور نہ تھے کھانا کھلاتے محتاج کو اور ہم تھے باتوں میں دھنسنے والوں کے ساتھ اور ہم تھے

نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۴۶﴾ حَتّٰٓى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ﴿۴۷﴾ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ

جھٹلاتے انصاف کے دن کو یہاں تک کہ آپہنچی ہم پر وہ یقینی بات پھر کام نہ آئے گی انکے سفارش

الشّٰفِعِيْنَ ﴿۴۸﴾ فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ﴿۴۹﴾ كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ﴿۵۰﴾

سفارش کرنیوالوں کی پھر کیا ہوا ہے اُن کو کہ نصیحت سے منہ موڑتے ہیں گویا کہ وہ گدھے ہیں بدکنے والے

فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ﴿۵۱﴾ بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا

بھاگے ہیں غل مچانے سے بلکہ چاہتا ہے ہر ایک مرد اُن میں کا کہ ملیں اس کو ورق

مُّنَشَّرَةً ﴿۵۲﴾ كَلَّا ۭ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿۵۳﴾ كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ﴿۵۴﴾ فَمَنْ

کھلے ہوئے ہرگز نہیں پر وہ ڈرتے نہیں آخرت سے کوئی نہیں یہ تو نصیحت ہے پھر جو کوئی

شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۵۵﴾ وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴿۵۶﴾

چاہے اسکو یاد کرے اور وہ یاد جبھی کریں کہ چاہے اللہ، وہی ہے جس سے ڈرنا چاہیئے اور وہی ہے بخشنے کے لائق

خلاصۂ تفسیر

اے کپڑے میں لپٹنے والے اُٹھو (یعنی اپنی جگہ سے اُٹھو یا یہ کہ مستعد ہو جاؤ) پھر (کافروں کو) ڈراؤ (جو کہ مقتضا منصب نبوت کا ہے اور یہاں تبشیر یعنی جنّت کی بشارت کا اسلئے ذکر نہیں فرمایا کہ یہ آیت بالکل ابتدائے نبوّت کی ہے اسوقت باستثنار ایک دو کے کوئی مسلمان نہیں تھا تو انذار ہی انسب تھا) اور اپنے رب کی بڑائیاں کرو (کہ تبلیغ میں سب سے پہلی چیز توحید ہے) اور (آگے بعض ضروری اعمال و عقائد و اخلاق کی تعلیم ہے جس پر خود بھی عامل رہنا چاہیئے کہ تبلیغ کے ساتھ اپنی اصلاح بھی ضروری ہے یعنی ایک تو) اپنے کپڑوں کو پاک رکھئے (یہ اعمال میں سے ہے اور چونکہ بالکل ابتدار میں نماز نہ تھی اس لئے اسکا حکم نہیں ہوا) اور (دوسرے یہ کہ) بتوں سے الگ رہو (جس طرح کہ اب تک الگ ہو۔ یہ عقائد میں سے ہے یعنی بدستور سابق توحید پر دوام رکھو اور باوجودیکہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے شرک میں مبتلا ہونے کا کوئی احتمال نہ تھا پھر بھی یہ حکم اس لئے دیا گیا کہ عقیدۂ توحید کی اہمیت معلوم ہو کہ معصوم کو بھی باوجود احتیاج نہ ہونے کے اس کی تعلیم کی جاتی ہے) اور کسی کو اس غرض سے مت دو کہ (دوسرے وقت) زیادہ معاوضہ چاہو (یہ متعلق اخلاق کے ہے اور گو اوروں کے لئے یہ امر جائز ہے مگر خلافِ اولیٰ ہے جیسا سورۂ روم کی آیت وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا الخ کی تفسیر سے معلوم ہو سکتا ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان چونکہ اعلیٰ وارفع ہے اس لئے آپ پر اس کو بھی حرام کر دیا گیا کما فی الروح والاصح ان النھی للتحریم وانہ من خواصہ علیہ الصلوٰۃ والسلام) اور پھر (انذار و تبلیغ میں جو ایذا پیش آوے اس پر) اپنے رب (کی خوشنودی) کے واسطے صبر کیجئے (یہ خاص اخلاق متعلقہ بالتبلیغ میں سے ہے پس یہ آیتیں جامع ہو گئیں اصلاح اعمال و اخلاق کو اپنے لئے بھی

دوسروں کے لئے بھی) پھر (اس ڈرانے کے بعد جو کوئی ایمان نہ لاوے اس کے لئے یہ وعید ہے کہ) جس وقت صور پھونکا جاویگا سو وہ وقت یعنی وہ دن کافروں پر ایک سخت دن ہوگا جس میں ذرا آسانی نہ ہوگی (آگے بعض خاص کفار کا ذکر ہے یعنی) مجھ کو اور اس شخص کو (اپنے اپنے حال پر) رہنے دو (کہ ہم اس سے نمٹ لیں گے) جس کو میں نے (مال و اولاد سے خالی اور) اکیلا پیدا کیا (جیسا کہ پیدا ہونے کے وقت آدمی کے پاس نہ مال ہوتا ہے اور نہ اولاد، اور مراد اس سے ولید بن مغیرہ ہے جس کا قصہ معارف و مسائل کے تحت آئے گا) اور اس کو کثرت سے مال دیا اور پاس رہنے والے بیٹے (دیئے) اور سب طرح کا سامان اس کے لئے مہیا کر دیا پھر بھی (باوجود اس کے اس مال و اولاد کا شکر بجا نہ لایا کہ ایمان لے آتا بلکہ اس نعمت وافرہ کو براہِ کفران و بیقدری قلیل سمجھ کر) اس بات کی ہوس رکھتا ہے کہ (اس کو) اور زیادہ دوں ہرگز (وہ زیادہ دینے کے قابل) نہیں (کیونکہ) وہ ہماری آیتوں کا مخالف ہے (اور مخالفت کیساتھ عدم قابلیت ظاہر ہے (استدراج کا معاملہ اس سے الگ ہے) اس شخص کی نزول آیت کے روز سے ظاہراً بھی ترقی بند ہوگئی چنانچہ پھر نہ کوئی اولاد ہوئی اور نہ کچھ مال بڑھا۔ اور یہ سزا تو دنیا میں ہے اور آخرت) میں اس کو عنقریب (یعنی مرنے کے بعد) دوزخ کے پہاڑ پر چڑھاؤں گا (حدیث ترمذی میں مرفوعاً ہے کہ صَعُود دوزخ میں ایک پہاڑ ہے ستر برس میں اس کی چوٹی پر پہنچے گا پھر وہاں سے گر پڑیگا پھر اسی طرح ہمیشہ چڑھے گا اور گریگا اور وجہ اس سزا کی وہی عناد ہے جو اوپر مذکور ہوا، اور آگے بھی اس کی کچھ تفصیل ہے وہ یہ کہ) اس شخص نے (اس بارے میں) سوچا (کہ قرآن کی شان میں کیا بات تجویز کروں) پھر (سوچ کر) ایک بات تجویز کی (جسکا بیان آگے آتا ہے) سو اس پر خدا کی مار ہو کیسی بات تجویز کی (اور) پھر (مکرر) اس پر خدا کی مار ہو کیسی بات تجویز کی (یہ تعجب مکرر اس کی سخت مذمت اور قابلِ تعجب بات پر ہے یعنی کیسی بے جوڑ بات تجویز کی جس کا احتمال ہی نہیں ہو سکتا) پھر (حاضرین کے چہروں کو) دیکھا (کہ وہ تجویز کی ہوئی بات ان سے کہوں) پھر منہ بنایا (تاکہ دیکھنے والے سمجھیں کہ اس کو قرآن سے بہت کراہت وانقباض ہے) اور زیادہ منہ بنایا پھر منہ پھیرا اور تکبر ظاہر کیا (جیسا عادت ہے کہ جس چیز کو قابل اعراض سمجھتے ہیں اسکا تذکرہ کرتے ہوئے بھی گردن پھیر لیتے ہیں اور اظہار تنفر کرتے ہیں) پھر بولا کہ بس یہ تو جادو ہے (جو اوروں سے) منقول (ہے) بس یہ تو آدمی کا کلام ہے (یہ بیان ہے اس تجویز مذکور کا، مطلب یہ کہ اللہ کا کلام نہیں بلکہ بشر کا کلام ہے جس کو آپ کسی جادوگر سے نقل کر دیتے ہیں، یا آپ خود مصنف ہیں لیکن یہ مضامین مدعیانِ نبوت سابقین سے منقول ہیں اور اسلوب عبارت نعوذ باللہ آپکے سحر کا اثر ہے۔ آگے اس عناد کی سزا تفصیلاً فرماتے ہیں جیسا اوپر سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا میں اجمالاً فرمایا تھا پس عَنِيْدًا میں جرم کا ذکر اور سَاُرْهِقُهٗ میں سزا کا ذکر اجمالاً اور اِنَّهٗ فَكَّرَ عَنِيْدًا کی تفصیل ہے اور سَاُصْلِيْهِ۔ سَاُرْهِقُهٗ کی تفصیل ہے یعنی) میں اس کو جلدی دوزخ میں داخل کرونگا اور تم کو کچھ خبر ہے کہ دوزخ کیسی چیز ہے (وہ ایسی ہے کہ) نہ تو (داخل ہونے کے بعد داخل ہونے

والے کی کوئی چیز جلانے سے) باقی رہنے دیگی اور نہ (داخل ہونے کے قبل جو کفار اسوقت باہر ہونگے نہ انہیں سے کسی کو بغیر اپنے اندر لئے ہوئے) چھوڑے گی (اور) وہ (جلاکر) بدن کی حیثیت بگاڑ دیگی (اور) اس پر اُنیس[۱۹] فرشتے (جو اسکے خازن ہیں جنمیں ایک کا نام مالک ہے مقرر) ہونگے (جو کافروں کو انواع انواع عذاب دیں گے۔ حاصل یہ کہ فرشتے جن کی قوت معلوم ہے باوجودیکہ انمیں کا ایک بھی تمام اہل جہنم کی تعذیب کے لئے کافی ہے پھر اُنیس فرشتوں کے مقرر ہونے سے ظاہر ہے کہ عذاب کا بہت ہی اہتمام ہوگا اور نکتہ خاص اُنیس کے عدد میں حقیقۃً اللہ ہی کو معلوم ہے لیکن دوسرے حضرات نے جو ذکر کیا ہے ان سب میں اقرب وہ ہے جو اللہ نے اس حقیر کے دل میں القار فرمایا ہے وہ یہ کہ اصل تعذیب کفار کی عقائدِ حقہ کی مخالفت پر ہے اور عقائدِ قطعیہ جو عملیات کے متعلق نہیں حسب تفصیل رسالہ فروع الایمان نو[۹] ہیں۔ ایمان[۱] لانا اللہ تعالیٰ پر، اعتقاد[۲] رکھنا کہ عالم حادث ہے، ایمان[۳] لانا فرشتوں پر، ایمان[۴] لانا اس کی سب کتابوں پر، ایمان[۵] لانا پیغمبروں پر، ایمان[۶] لانا تقدیر پر، ایمان[۷] لانا قیامت کے دن پر، جنت[۸] کا یقین کرنا، دوزخ[۹] کا یقین کرنا، باقی سب عقائد انھیں کے ملحقات و فروع ہیں۔ اور عقائدِ قطعیہ جو عملیات کے متعلق ہیں دس[۱۰] ہیں۔ پانچ ماموراتِ کے متعلق، یعنی ان کے وجوب کا اعتقاد ضروری ہے۔ وہ پانچ مامورات جو شعائرِ اسلام ہیں یہ ہیں تلفظ بالشہادتین، اقامتِ صلوٰۃ، ایتاءِ زکوٰۃ، صومِ رمضان، حج بیت اللہ۔ اور پانچ منہیات کے متعلق یعنی اُن کی تحریم کا اعتقاد واجب ہے اور وہ پانچ منہیات جو کہ آیت امتحان وغیرہ میں مذکور ہیں یہ ہیں۔ سرقہ، زنا، قتل، خصوصاً قتل اولاد، بہتان، عصیان فی المعروف جس میں غیبت وظلم یتیموں کا مال ناجائز طور پر کھانا وغیرہ سب آگیا پس یہ سب عقائد ملا کر اُنیس[۱۹] ہوئے شاید ایک ایک عقیدہ کے مقابلے میں ایک ایک فرشتہ معین ہو اور چونکہ ان سب میں ایک عقیدہ سب سے بڑا ہے یعنی توحید اسلئے ان فرشتوں میں بھی ایک فرشتہ سب سے بڑا مقرر ہوا ہو یعنی مالک واللہ اعلم بأسرارہ) اور (اس آیت کا مضمون سُن کر جو کفار نے تمسخر کیا جس کا بیان معارف کے تحت میں آئے گا اس پر اگلا مضمون نازل ہوا کہ) ہمنے دوزخ کے کارکن (آدمی نہیں بلکہ) صرف فرشتے بنائے ہیں (جن میں سے ایک ایک فرشتہ میں تمام جنّ و انس کی برابر قوت ہے کذا فی الدر مرفوعاً ولفظہ ھکذا الھم مثل قوۃ الثقلین) اور ہمنے جو ان کی تعداد (ذکر و حکایت میں) صرف ایسی رکھی ہے جو کافروں کی گمراہی کا ذریعہ ہو (مراد اس سے اُنیس[۱۹] کا عدد ہے) تو اس لئے (کہ یہ نتائج اس پر مرتب ہوں یعنی) تاکہ اہلِ کتاب (سُننے کیسا تھ) یقین کرلیں اور ایمان والوں کا ایمان اور بڑھ جائے اور اہلِ کتاب اور مومنین شک نہ کریں اور تاکہ جن لوگوں کے دلوں میں (شک کا) مرض ہے وہ اور کافر لوگ کہنے لگیں کہ اس عجیب مضمون سے اللہ تعالیٰ کا کیا مقصود ہے (اہل کتاب کے یقین کی دو توجیہ ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ ان کی کتاب میں بھی یہ عدد لکھا ہو تو فوراً مان لیں گے اور اگر اب ان کی کتابوں میں یہ عدد نہ ہو تو ممکن ہے کہ کتابوں کے ضائع اور محرّف

ہونے سے ضائع ہوگیا ہو اور دوسری توجیہہ یہ ہوسکتی ہے کہ عدد ان کی کتاب میں نہ ہو لیکن وہ فرشتوں کی قوت کے قائل تھے اور بہت سے اُمور توقیفیہ ان کی کتابوں میں موجود تھے تو ان کے پاس کوئی بنٰی انکار کا نہ تھا پس یقین سے مراد عدم انکار وعدم استہزا ہوگا لیکن ظاہر توجیہہ اوّل ہے اور اہلِ ایمان کے ایمان کی زیادت کی بھی دو توجیہہ ہوسکتی ہیں، ایک یہ کہ اہلِ کتاب کے استیقان کو دیکھ کر ان کا ایمان کیفاً قوی ہوجائے کہ آپ باوجود عدم اختلاط اہلِ کتاب کے وحی سابق کے موافق خبر دیتے ہیں ضرور نبی برحق ہیں۔ دوسری توجیہہ یہ کہ جب کوئی مضمون نیا نازل ہوتا تھا اس پر ایمان لاتے تھے پس ایک فرد تصدیق کی اور بڑھی، اس سے بحیثیت کمیت ایمان میں زیادتی ہوئی اور یَرْتَابَ کو تاکید کے لئے بڑھایا کہ اثبات یقین اور نفی شک دونوں کی تصریح ہوجائے۔ اور مرض میں دو احتمال ہیں ایک تو شک کیونکہ ظہورِ حق کے بعد بعضے جاحد اور منکر ہوتے ہیں بعضے متردد ہوتے ہیں تو اہلِ مکہ میں بھی ایسے لوگ ہوں گے دوسرا بمعنے نفاق تو اسمیں پیشین گوئی ہوگی کہ مدینہ میں منافق ہونگے اور ان کا یہ قول ہوگا اور مؤمنین اور اہلِ کتاب کے اثبات ونفی شک کو جُدا جُدا اس لئے فرمایا کہ اہل کتاب کا یقین ونفی شک لُغوی ہے اور مؤمنین کا شرعی، آگے فریقین کے حال پر بطور تفریع کے فرماتے ہیں کہ جس طرح حق تعالیٰ نے ایمان والوں کو اس باب میں خاص ہدایت کی اور کافروں کو اس باب میں خاص گمراہ کیا) اسی طرح اللہ تعالیٰ جسکو چاہتا ہے گمراہ کردیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت کردیتا ہے اور (آگے تتمہ ہے مضمون سابق کا کہ جہنم کے خازن فرشتوں کا عدد اُنیس ایک خاص حکمت کی بنا پر ہے ورنہ) تمہارے رب کے (ان) لشکروں (کی یعنی فرشتوں کی تعداد اس کثرت سے ہے کہ اس) کو بجز رب کے کوئی نہیں جانتا (اگر وہ چاہتے تو بے انتہا فرشتوں کو خازن بنادیتے اور اب بھی گو خازن اُنیس ۱۹ ہیں مگر ان کے اور اعوان وانصار بہت کثرت سے ہیں چنانچہ حدیث مُسلم میں ہے کہ جہنم کو اس حال میں حاضر کیا جائے گا کہ اس کی ستر ہزار باگیں ہونگی اور ہر باگ کو ستر ہزار فرشتے پکڑے ہونگے) اور (جو اصل مقصود ہے جہنم کا حال بیان کرنے سے وہ عدد کی قلت یا کثرت یا تعیین یا انکشافِ حکمت تخصیص یا عدم انکشاف پر موقوف نہیں اور وہ اصل مقصود یہ ہے کہ) دوزخ (کا حال بیان کرنا) صرف آدمیوں کی نصیحت کیلئے ہے (تاکہ وہاں کے عذاب کو سُن کر ڈریں اور ایمان لاویں اور یہ مقصود کسی خاص خصوصیات پر موقوف نہیں پس مقتضا عقل کا بھی یہی ہے کہ اصل مقصود کو محفوظ وملحوظ رکھ کر ان بالائی اُمور کے درپے نہ ہوں آگے جہنم کی عقوبت کا کسی قدر بیان ہے جس میں ذِکریٰ للبشر کے اجمال کی تفصیل ہے پس ارشاد ہے کہ) بالتحقیق قسم ہے چاند کی اور رات کی جب جانے لگے اور صبح کی جب روشن ہوجائے کہ وہ دوزخ بڑی بھاری چیز ہے جو انسان کے لئے بڑا ڈراوا ہے یعنی تم میں جو (خیر کی طرف) آگے بڑھے اس کے لئے بھی یا جو (خیر سے) پیچھے ہٹے اس کے لئے بھی (مطلب یہ کہ جمیع مکلفین کے لئے نذیر ہے اور چونکہ نتائج اس انداز کے قیامت میں ظاہر ہونگے اس لئے قسم ایسی چیزوں کی کھائی گئی جو قیامت کے بہت ہی مناسب ہے،

چنانچہ قمر کا اول بڑھنا پھر گھٹنا نمونہ اس عالم کے نشوونما اور پھر اضمحلال و فنا کا ہے یہاں تک کہ چاند کے محاق یعنی بے نور ہو جانے کی طرح یہ بھی فانی محض ہو جائے گا، اسی طرح اس عالم دنیا کو اس عالم آخرت کے ساتھ اختفار و اکتشاف حقائق میں ایسی نسبت ہے جیسے رات کو دن کے ساتھ۔ پس اس عالم کا ختم ہو جانا مشابہ رات گزر جانے کے ہے اور اس عالم کا ظہور مشابہ اسفار صبح کے ہے۔ آگے دنیا اور اہل دنیا کے بعض احوال کا بیان ہے یعنی) ہر شخص اپنے اعمال (کفریہ) کے بدلہ میں (دوزخ میں) محبوس ہوگا مگر داہنے والے (یعنی مؤمنین جس کی تفصیل سورۂ واقعہ میں گزری ہے اور چونکہ یہاں اصحاب الیمین مقابل اصحاب الشمال کے ہے اسلئے مقربین کو بھی شامل ہے حاصل یہ کہ مؤمنین اس قید سے مستثنیٰ ہیں) کہ وہ بہشتوں میں ہونگے (اور) مجرموں (یعنی کفار) کا حال (خود ان کفار ہی سے) پوچھتے ہوں گے (اور کیفیت باہمی کلام کی باوجود اس بُعد کے جو دوزخ اور جنت میں ہے۔ سورۂ اعراف کی آیات وَنَادَىٰٓ أَصْحَٰبُ ٱلْجَنَّةِ أَصْحَٰبَ ٱلنَّارِ الخ کی تفسیر میں گزری ہے اور یہ سوال زجر و تنبیہ کے لئے ہوگا حاصل یہ کہ مؤمنین کفار سے پوچھیں گے کہ) تم کو دوزخ میں کس بات نے داخل کیا وہ کہیں گے کہ ہم نہ تو نماز پڑھا کرتے تھے اور نہ غریب کو (جس کا حق واجب تھا) کھانا کھلایا کرتے تھے اور (جو لوگ دین حق کے ابطال کے مشغلہ میں رہتے تھے ان) مشغلہ میں رہنے والوں کے ساتھ ہم بھی (اس مشغلہ (ابطال دین) میں رہا کرتے تھے اور قیامت کے دن کو جھٹلایا کرتے تھے یہاں تک کہ (اسی حالت میں) ہم کو موت آگئی (اور ہم ان حرکات سے باز نہ آئے یعنی خاتمہ اسی نافرمانی پر ہوا اس وجہ سے ہم دوزخ میں آئے اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کفار مکلف بالفروع یعنی نماز روزہ احکام شرعیہ کے مامور ہوں کیونکہ جہنم میں دو چیزیں ہونگی ایک عذاب دوسرا شدت عذاب۔ پس ممکن ہے کہ مجموعۂ اعمال مذکورہ سبب ہو مجموعۂ عذاب اور شدت عذاب کا اس طرح کہ کفر و شرک تو سبب ہو تعذیب کا اور ترک صلوٰۃ وغیرہ سبب ہو زیادہ تعذیب کا اور کفار کے غیر مکلف بالفروع ہونے کے معنی یہ کہے جائیں گے کہ ان فروع پر نفس تعذیب نہ ہوگی اور زیادہ تعذیب اس لئے ہو سکتی ہے کہ اصول کے ضمن میں فروع بھی تبعاً آہی جاتے ہیں۔ اس لئے ضمناً مکلف ہونا زیادتی عذاب کا سبب ہو سکتا ہے) سو (حالت مذکورہ میں) انکو سفارش کرنے والوں کی سفارش نفع نہ دیگی (اور اس عدم نفع کا تحقق عدم شفاعت کے تحقق سے ہوگا یعنی کوئی ان کافروں کی شفاعت ہی نہ کر سکے گا لقولہ تعالیٰ فَمَا لَنَا مِن شَٰفِعِينَ، آگے ان کے اعراض پر تفریع ہے کہ جب کفر و اعراض کی بدولت ان کی یہ گت بننے والی ہے) تو ان کو کیا ہوا کہ اس نصیحت (قرانی) سے رو گردانی کرتے ہیں کہ گویا وہ وحشی گدھے ہیں جو شیر سے بھاگے جا رہے ہیں (اس تشبیہ میں کئی امر کی رعایت ہے اول تو گدھا بے وقوفی اور حماقت میں مشہور ہے دوسرے اسکو وحشی فرض کیا جس کو گورخر کہتے ہیں کہ وہ جو چیزیں ڈرنے کی نہیں ہوتیں ان سے بھی بلا وجہ ڈرتا اور بدکتا بھاگتا ہے تیسرے شیر سے اسکا ڈرنا فرض کیا کہ اس صورت میں ان کا بھاگنا

انتہا درجہ ہوگا، اور اس بھاگنے کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ لوگ اس قرآن کو بزعم خود حجیت میں کافی نہیں سمجھتے) بلکہ ان میں ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کو کھلے ہوئے (آسمانی) نوشتے دیئے جائیں (جیسا دُرِّ منثور میں قتادہ سے مروی ہے کہ بعضے کفار نے آپؐ سے کہا کہ اگر آپؐ چاہتے ہیں کہ ہم آپؐ کا اتباع کریں تو خاص ہمارے نام آسمان سے ایسے نوشتے آئیں جن میں آپ کے اتباع کا حکم لکھا ہوا اھ وھٰذا کقولہ تعالیٰ حَتّٰی تُنَزِّلَ عَلَیۡنَا کِتٰبًا نَّقۡرَؤُہٗ اور مُنَشَّرۃ کا بڑھانا توضیح مقصود کے لئے ہے یعنی جیسے معمولی خط ہوتے ہیں کہ کھولے جاتے ہیں اور پڑھے جاتے ہیں ایسے ہی نوشتے ہمارے پاس آنے چاہئیں، آگے اس بیہودہ درخواست کا رد ہے کہ یہ) ہرگز نہیں (ہوسکتا کیونکہ نہ اس کی ضرورت اور نہ ان لوگوں کو اس کی لیاقت بالخصوص اس وجہ سے کہ اس درخواست کا سبب یہ نہیں ہے کہ دل میں ان کے ارادہ ہو کہ اگر ایسا ہوگا تو اتباع کرلیں گے، بلکہ (سبب یہ ہے کہ) یہ لوگ آخرت (کے عذاب) سے نہیں ڈرتے (اس لئے حق کی طلب نہیں ہے اور یہ درخواستیں محض ضد اور ہٹ دھرمی سے ہیں حتّٰی کہ اگر یہ درخواستیں بالفرض پوری بھی ہو جاویں تب بھی یہ لوگ اتباع نہ کریں (لقولہ تعالیٰ وَلَوۡ نَزَّلۡنَا عَلَیۡكَ کِتٰبًا فِیۡ قِرۡطَاسٍ فَلَمَسُوۡہُ بِاَیۡدِیۡهِمۡ لَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِنۡ ھٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ) آگے بطور نتیجہ کے اسکار داور اس پر زجر ہے کہ جب اس درخواست کا بیہودہ ہونا ثابت ہوگیا تو یہ) ہرگز نہیں (ہوسکتا بلکہ) یہ قرآن (ہی) نصیحت (کے لئے کافی) ہے، (دوسرے صحیفوں کی حاجت نہیں) سو (اس حالت میں) جسکا جی چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے (اور جسکا جی چاہے نہ کرے جہنم میں جاوے ہم کو کوئی ضرورت نہیں کہ مطلوبہ قسم کے نوشتے نازل کریں) اور (قرآن کے تذکرہ یعنی ہدایت ہونے میں اس سے شبہ نہ کیا جاوے کہ بعض لوگوں کو اس سے تذکرہ وہدایت نہیں ہوتی، بات یہ ہے کہ قرآن گو فی نفسہٖ تذکرہ ہے لیکن) بدون خدا کے چاہے یہ لوگ نصیحت قبول نہیں کریں گے (اور اس نہ چاہنے میں بعض حکمتیں ہیں لیکن قرآن فی نفسہٖ تذکرہ ضرور ہے پس اس سے تذکرہ حاصل کرو اور خدا کی اطاعت کرو کیونکہ) وہی ہے جس (کے عذاب) سے ڈرنا چاہیئے اور (وہی ہے) جو (بندوں کے گناہ) معاف کرتا ہے (کقولہ تعالیٰ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِیۡعُ الۡعِقَابِ وَاِنَّہٗ لَغَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ)

معارف و مسائل

سُورۂ مُدَّثِّر قرآن کریم کی ان سورتوں میں سے ہے جو نزولِ قرآن کے بالکل ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہیں اسی لئے بعض حضرات نے اس سورت کو سب سے پہلے نازل ہونیوالی سورت بھی کہا ہے۔ اور روایات صحیحہ معروفہ کی رُو سے سب سے پہلے سورۂ اقرأ کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔ پھر کچھ مدت تک نزولِ قرآن کا سلسلہ بند رہا جس کو زمانہ فترت وحی کا کہا جاتا ہے اسی زمانہ فترت کے آخر میں یہ واقعہ پیش آیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں کسی جگہ تشریف لیجا رہے تھے اوپر سے کچھ آواز سُنی تو آپ نے آسمان کی طرف نظر اُٹھائی

دیکھا کہ وہی فرشتہ جو غارِ حرا میں سورہ اقرأ کی آیات لیکر آیا تھا وہی آسمان کے نیچے فضاء میں ایک معلق کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کو اس حال میں دیکھ کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر وہی طبعی رعب و ہیبت کی کیفیت طاری ہو گئی جو غارِ حرا میں نزولِ اقرأ کے وقت ہوئی تھی سخت سردی اور کپکپی کے احساس سے آپ گھر میں واپس تشریف لے گئے اور فرمایا زملونی زملونی یعنی مجھے ڈھانپو مجھے ڈھانپو۔ آپ کپڑوں میں لپٹ کر لیٹ گئے اس پر سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں کما فی حدیث الصحیحین۔ اسی لئے اس سورت میں آپ کو خطاب یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ کے الفاظ سے کیا گیا، یہ لفظ دِثار سے مشتق ہے جو اُن زائد کپڑوں کو کہا جاتا ہے جو آدمی عام لباس کے اوپر کسی سردی وغیرہ کے دفع کرنے کے لئے استعمال کیا کرتا ہے اس لفظ سے خطاب ایک حبیبانہ مشفقانہ خطاب ہے جیسا کہ مزمّل میں بیان ہو چکا ہے۔ لفظ مُزَّمِّل کے معنے بھی اسی کے قریب ہیں۔ رُوح المعانی میں جابر بن زید تابعی سے منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ سورۂ مُدثر، مُزمّل کے بعد نازل ہوئی ہے اور بعض حضرات نے یہ روایت حضرت ابن عباسؓ سے بھی نقل کی ہے مگر صحیحین کی جو روایت اوپر نقل کی گئی ہے اسمیں اس کی تصریح ہے کہ سب سے پہلے سورۂ مدثر نازل ہوئی (اور مراد یہ ہے کہ فترت وحی کے بعد سب سے پہلے یہ سورت نازل ہوئی) اگر مزمّل کا نزول اس سے پہلے ہوا ہوتا تو حضرت جابر ابن عبداللہؓ راوی حدیث اس کو بیان کرتے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ لفظ مُزّمِّل اور مُدّثِّر دونوں تقریباً ہم معنے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک ہی واقعہ میں ان دونوں کا نزول ہوا اور وہ واقعہ وہی جبرئیل امین کو آسمان کے نیچے کرسی پر بیٹھے دیکھنے کا اور آپ کا گھر میں واپس ہو کر کپڑوں میں لپٹ جانا ہو جو اوپر مذکور ہوا ہے۔ اس سے کم از کم اتنا تو ثابت ہو جاتا ہے کہ سورۂ مزمّل اور مدثر کی ابتدائی آیتیں فترتِ وحی کے بعد سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات ہیں ان دونوں میں کون مقدم اور کون مؤخر ہے اسمیں روایتیں مختلف ہو گئیں اور سورۂ اقرأ کی ابتدائی آیات کا ان سب سے پہلے نازل ہونا تمام روایاتِ صحیحہ سے ثابت ہے اور یہ دونوں سورتیں اگرچہ متقارب زمانے میں ایک ہی واقعہ میں نازل ہوئی ہیں مگر فرق دونوں میں یہ ہے کہ سورۂ مزمّل کے شروع میں جو احکام رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دیئے گئے ہیں اُن میں اپنی ذاتی شخصی اصلاح سے متعلق ہیں۔ اور سورۂ مدثر کے شروع میں جو احکام دیئے گئے ہیں انکا تعلق زیادہ تر دعوت و تبلیغ اور اصلاحِ خلق سے ہے۔

سورۂ مدثر میں سب سے پہلا حکم آپ کو یہ دیا گیا ہے کہ قُمْ فَاَنْذِرْ یعنی کھڑے ہو جایئے اسکے معنے حقیقی قیام کے بھی ہو سکتے ہیں کہ آپ جو کپڑوں میں لپٹ کر لیٹ گئے ہیں اسکو چھوڑ کر کھڑے ہو جایئے اور یہ معنی بھی بعید نہیں کہ قیام سے مراد کام کے لئے مستعد اور تیار ہونا ہو اور مطلب یہ ہو کہ اب آپ ہمت کر کے خلقِ خدا کی اصلاح کی خدمت سنبھالیئے۔ فَاَنْذِرْ، انذار سے مشتق ہے جس کے معنے ڈرانے کے ہیں مگر ایسا ڈرانا جو شفقت و محبت پر مبنی ہوتا ہے جیسے باپ اپنے بچے کو سانپ، بچھو اور آگ سے ڈراتا ہے انبیاء کی یہی شان ہوتی ہے اسلئے اُن کا لقب نذیر اور بشیر ہوتا ہے۔ نذیر کے معنے شفقت و ہمدردی کی بناء پر مضر چیزوں سے ڈرانے والا

اور بشیر کے معنی خوش خبری سُنانے والا۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بھی دونوں ہی لقب قرآن کریم میں جا بجا مذکور ہیں مگر اس جگہ صرف انذار کے ذکر پر اکتفا اس لئے کیا گیا کہ اس وقت مؤمن مُسلمان تو گِنے چُنے چند ہی تھے باقی سب منکرین و کفار تھے جو کسی بشارت کے مستحق نہیں بلکہ ڈرانے ہی کے مستحق تھے۔

دُوسرا حُکم یہ دیا گیا کہ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ یعنی صرف اپنے رب کی بڑائی بیان کیجئے قول سے بھی، عمل سے بھی، لفظ ربّ اس جگہ اسلئے اختیار کیا گیا کہ یہ خود علت اس حکم کی ہے کہ جو سارے جہان کا پالنے والا ہے صرف وہی ہر بڑائی اور کبریائی کا مستحق ہے۔ تکبیر کے لفظی معنے اللہ اکبر کہنے کے بھی آتے ہیں جسمیں نماز کی تکبیر تحریمہ اور دوسری تکبیرات بھی داخل ہیں اور خارج نماز بھی اذان اقامت وغیرہ کی تکبیر اسمیں شامل ہے۔ اس حکم کو نماز کی تکبیر تحریمہ کیساتھ مخصوص قرار دینے کا الفاظِ قرآن میں کوئی اشارہ نہیں۔

تیسرا حُکم یہ دیا گیا وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ، ثیاب ثوب کی جمع ہے اس کے اصلی اور حقیقی معنے کپڑے کے ہیں اور مجازی طور پر عمل کو بھی ثوب اور لباس کہا جاتا ہے، قلب اور نفس کو بھی اور خُلُق اور دین کو بھی۔ انسان کے جسم کو بھی لباس سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کے شواہد قرآن اور محاورات عرب میں بکثرت ہیں۔ اس آیت میں حضرات مفسرین سے سبھی معانی منقول ہیں اور ظاہر یہ ہے کہ یہ کوئی تضاد اور اختلاف نہیں۔ بطور عموم مجاز کے اگر ان الفاظ سے سبھی معنے مراد لئے جاویں تو کوئی بُعد نہیں، اور معنے اس حکم کے یہ ہونگے کہ اپنے کپڑوں اور جسم کو ظاہری ناپاکیوں سے پاک رکھئے قلب اور نفس کو باطل عقاید و خیالات سے اور اخلاقِ رذیلہ سے پاک رکھئے۔ پائجامہ یا تہبند کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانے کی ممانعت بھی اس سے مستفاد ہوتی ہے کیونکہ نیچے لٹکے ہوئے کپڑوں کا آلودہ ہوجانا بعید نہیں تو تطہیر ثوب کے حکم میں یہ بھی آگیا کہ کپڑوں کا استعمال اس طرح کرو کہ نجاست سے دُور رہیں۔ اور کپڑوں کے پاک رکھنے میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ مال حرام سے نہ بنائے جائیں کسی ایسی وضع و ہیئت کے نہ بنائے جائیں جو شرعاً ممنوع ہیں اور ظاہر آیت سے یہ ہے کہ یہ تطہیر ثوب کا حکم نماز کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تمام حالات میں عام ہے اسی لئے فقہار نے فرمایا ہے کہ غیر حالت نماز میں بھی بغیر کسی ضرورت کے جسم کو ناپاک رکھنا یا ناپاک کپڑے پہنے رکھنا یا ناپاک جگہ میں بیٹھے رہنا جائز نہیں، ضرورت کے اوقات مستثنیٰ ہیں (از مظہری)

اللہ تعالیٰ طہارت کو پسند فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ۔ اور حدیث میں طہارت کو نصف ایمان قرار دیا ہے اسلئے مسلمان کو ہر حال میں اپنے جسم اور مکان اور لباس کی ظاہری طہارت کا بھی اہتمام رکھنا ضروری ہے اور قلب کی باطنی طہارت کا بھی۔ واللہُ اعلم

چوتھا حکم یہ دیا گیا وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ، رُجز بضم الرا و بکسر ہا دونوں کے ایک ہی معنے ہیں۔ ائمہ تفسیر مجاہد عکرمہ، قتادہ، زہری، ابن زید وغیرہ نے اس جگہ رُجز کے معنے بتوں کے قرار دیئے ہیں اور حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت میں اس سے مراد ہر گناہ اور معصیت منقول ہے۔ معنے آیت کے یہ ہیں کہ بتوں کو یا گناہ و معصیت کو چھوڑئیے۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو پہلے ہی سب کو چھوڑے ہوئے تھے آپ کو اسکا

حکم کرنے کے معنے یہ ہیں کہ آئندہ بھی ان چیزوں سے دُور رہیں اور درحقیقت یہ حکم اُمت کے لئے تعلیم ہے جو غایت تاکید کے لئے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے دیا گیا ہے تاکہ وہ سمجھیں کہ جب پیغمبر معصوم کو بھی اسکا حکم ہے تو ہمیں اسکا کیسا اہتمام کرنا چاہیئے۔

پانچواں حکم وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ، یعنی کسی شخص پر احسان اس نیت سے نہ کیجئے کہ جو کچھ اُس کو دیا ہے اس سے زیادہ وصول ہو جائیگا، اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کو ہدیہ تحفہ اس نیت سے دینا کہ وہ اسکے معاوضہ میں اس سے زیادہ دیگا یہ مذموم و مکروہ ہے۔ قرآن کی دوسری آیت سے اگرچہ اسکا جواز عام لوگوں کے لئے معلوم ہوتا ہے مگر وہ بھی کراہت سے خالی نہیں اور شریفانہ اخلاق کے منافی ہے۔ خصوصاً رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے تو اس کو حرام قرار دیا گیا (قالہ ابن عباسؓ)

چھٹا حکم وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ، صبر کے لفظی معنے اپنے نفس کو روکنے اور قابو میں رکھنے کے ہیں اسلئے صبر کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی پر اپنے نفس کو قائم رکھے اور یہ بھی داخل ہے کہ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے نفس کو روکے اور یہ بھی داخل ہے کہ مصائب اور تکلیف میں اپنے اختیار کی حد تک جزع فزع اور شکایت سے بچے اسلئے یہ حکم ایک جامع حکم ہے جو تقریباً پورے دین کو شامل ہے اس موقع پر اس حکم کی خصوصیت ممکن ہے اسلئے بھی ہو کہ اُوپر کی آیات میں آپ کو حکم دیا گیا ہے کہ عام خلق خدا تعالیٰ کو دین حق کی طرف دعوت دیں کفر و شرک اور معاصی سے روکیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اس کے نتیجہ میں بہت سے لوگ مخالفت و عداوت اور ایذا رسانی پر آمادہ ہو جائیں گے اسلئے داعیٔ حق کو صبر و ضبط کا خوگر ہونا چاہیئے۔ یہ چند احکام رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دینے کے بعد قیامت اور اُس کے ہولناک ہونیکا ذکر ہے۔ ناقور کے معنے صور کے ہیں اور نقر سے مراد صُور میں پھونک مار کر آواز نکالنے کے ہیں۔ اور روز قیامت کا سبھی کفار کے لئے سخت و شدید ہونا بیان فرمانے کے بعد ایک خاص شریر کافر کے حالات اور اسکے عذابِ شدید کا بیان ہے۔

ولید بن مغیرہ کی آمدنی ایک کروڑ گنیاں سالانہ

یہ کافر ولید بن مغیرہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی مال و دولت اور اولاد فراوانی کے ساتھ دی تھی، بقول ابنِ عباسؓ اس کی زمین جائداد باغات مکہ سے طائف تک پھیلے ہوئے تھے، اور بقول ثوری اس کی سالانہ آمدنی ایک کروڑ دینار تھی۔ بعض نے اس سے کم بھی بتلایا ہے اتنا سب کے نزدیک مسلم ہے کہ اسکے کھیت اور باغات کی آمدنی اور پیداوار سال بھر سردی گرمی کی ہر موسم میں مسلسل رہتی تھی قرآن کریم میں اسی کو فرمایا ہے وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَّمْدُودًا۔ اور یہ عرب کا سردار مانا جاتا تھا۔ لوگوں میں اسکا لقب ریحانہ قریش مشہور تھا یہ خود اپنے آپ کو بطور فخر و تکبر کے وحید ابن الوحید، یعنی یکتا کا بیٹا یکتا کہا کرتا تھا کہ نہ قوم میں میری کوئی نظیر ہے نہ میرے باپ مغیرہ کی (قرطبی) مگر اس ظالم نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی اور قرآن کو کلامِ الٰہی یقین کر لینے کے باوجود اُس نے جھوٹی بات

بنائی اور قرآن کو سحر اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو ساحر کہا۔ اسکا واقعہ تفسیر قرطبی میں یہ بیان کیا ہے کہ جب قرآن کی آیت حٰمٓ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ سے اِلَیْہِ الْمَصِیْرُ تک نازل ہوئی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس کی تلاوت کر رہے تھے ولید بن مغیرہ نے یہ قرارت سُنی تو بیساختہ اسکے کلام الٰہی ماننے اور یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ،

واللہ لقد سمعت منہ کلامًا ما ھو من کلام الانس ولا من کلام الجن وان لہ لحلاوۃ و ان علیہ لطلاوۃ وان اعلاہ لمثمر وان اسفلہ لمغدق وانہ لیعلو ولا یعلےٰ علیہ وما یقول ھذا بشر

واللہ میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا کلام سُنا ہے جو نہ کسی انسان کا کلام ہو سکتا ہے نہ کسی جن کا اور اسمیں بڑی حلاوت ہے اور اُس پر خاص رونق ہے اسکا اعلیٰ پھل دینے والا اور اسفل پانی جاری کرنیوالا ہے وہ بلا شبہ سب سے بالا و بلند ہو کر رہے گا اس پر کوئی غالب نہیں ہو سکتا یہ بشر کا کلام نہیں ہے۔

عرب کے سب سے بڑے مالدار سردار کا ایسا کہنا تھا کہ پورے قریش میں اسنے ایک زلزلہ ڈالدیا اور وہ سب اسلام و ایمان کی طرف جھکنے لگے، قریش کے کافر سرداروں کو فکر ہوئی اور جمع ہو کر مشورہ کرنے لگے۔ ابوجہل نے کہا کہ فکر نہ کرو میں ابھی جاتا ہوں اس کو ٹھیک کر دونگا۔

ابوجہل اور ولید بن مغیرہ کا مکالمہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت پر دونوں کا اتفاق

ابوجہل ولید بن مغیرہ کے پاس غمگین صورت بنا کر پہنچا (اور قصداً ایسی بات بنائی جس پر ولید کو غصہ آجاوے) ولید نے اس سے پوچھا کہ کیا بات تم غمگین نظر آتے ہو۔ ابوجہل نے کہا کہ غمگین کیسے نہ ہوں یہ سارے باہم چندہ کرکے تجھے مال دیتے ہیں کہ تو اب بوڑھا ہو گیا ہے تیری مدد کرنا چاہیئے مگر اب ان کو یہ معلوم ہوا کہ تم محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اور ابن ابی قحافہ (ابوبکرؓ) کے پاس اسلئے جاتے ہو کہ تمھیں کچھ کھانے پینے کو ملجاوے اور اُن کی خوشامد میں اُنکے کلام کی تحسین و تعریف کرتے ہو (ظاہر یہ ہے کہ قریش کا چندہ کر کے ولید کو مال دینا بھی جھوٹ تھا جو صرف اسکو غصہ دلانے کے لئے بولا گیا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کھانے کی چیزیں لینا تو جھوٹ تھا ہی) اس پر ولید بن مغیرہ کے غصہ کی انتہا نہ رہی اور اسکے نتیجہ میں اُس پر اپنے تکبر و تعلی کا جنون سوار ہو گیا کہنے لگا کہ میں محمدؐ اور انکے ساتھیوں کے ٹکڑوں کا محتاج ہوں، کیا تم کو میرے مال و دولت کی کثرت معلوم نہیں۔ قسم ہے لات اور عزیٰ کی (دو بتوں کے نام ہیں) میں اسکا ہرگز محتاج نہیں۔ البتہ تم لوگ جو یہ کہتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مجنون ہیں یہ بات ایسی غلط ہے اسکا کوئی یقین نہیں کر سکتا کیا تم میں سے کسی نے اُن کو کوئی مجنونانہ کام کرتے دیکھا ہے؟ ابوجہل نے اقرار کیا کہ لا واللہ یعنی واللہ ہم نے کوئی ایسا کام اُن کا نہیں دیکھا، پھر ولید نے کہا تم لوگ انکو شاعر کہتے ہو کیا تم نے ان کو کبھی شعر کہتے ہوئے سُنا ہے (ایسی غلط بات کہنا اپنے آپ کو رُسوا کرنا ہے) ابوجہل نے اسپر بھی یہی کہا لا واللہ۔ پھر ولید نے کہا کہ تم لوگ ان کو کذاب کہتے ہو تو بتلاؤ کہ تم نے عمر بھر میں کبھی اُن کی کسی بات کو جھوٹا پایا ہے۔ اس پر بھی ابوجہل کو یہی اقرار کرنا پڑا لا واللہ، پھر ولید نے کہا کہ تم لوگ ان کو کاہن کہتے ہو تو کیا تم نے کبھی ان کے ایسے حالات اور کلمات دیکھے سُنے ہیں جو کاہنوں کے ہوا کرتے ہیں۔ ہم کاہنوں کی باتوں

کو اچھی طرح پہچانتے ہیں، اُن کا کلام کہانت نہیں ہو سکتا، اس پر بھی ابو جہل کو یہی اقرار کرنا بڑا لاؤ اللہ اور پورے قریش میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم صادق امین کے لقب سے معروف تھے اب ابوجہل اپنے ان سب بہتانوں سے تو دستبردار ہوگیا، فکر یہ پڑی کہ آخر پھر کیا کہہ کر لوگوں کو اسلام سے روکا جائے اس لئے خود ولید ہی کو خطاب کر کے کہا کہ پھر تم ہی بتلاؤ کہ ان کو کیا کہا جائے، اس پر اسنے پہلے تو اپنے دل میں سوچا پھر ابو جہل کیطرف نظر اُٹھائی پھر منہ بسورا جس سے نفرت کا اظہار ہو اور آخر میں کہنے لگا کہ ان کو یعنی رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مجنون، شاعر، کاہن، کذاب تو کچھ نہیں کہا جا سکتا، ہاں ان کو ساحر کہو تو بات چل جائے گی۔ یہ کمبخت خوب جانتا تھا کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ساحر بھی نہیں اور نہ آپکے کلام کو ساحروں کا کلام کہا جا سکتا ہے مگر اس نے بات بنانے کی یہ صورت تجویز کی کہ آپکے کلام کے آثار بھی ایسے ہوتے ہیں جیسے ساحروں کے کیونکہ جیسے جادوگر اپنے عمل سے میاں بیوی، بھائی بھائی میں تفرقہ اور نفرت ڈالدیتے تھے (معاذاللہ) آپکے کلام کا بھی یہی اثر ہے کہ جو ایمان لے آتا ہے اپنے کافر ماں باپ اور عزیزوں سے متنفر ہو جاتا ہے۔ اس کے اس واقعہ کے آخری اجزاء ہی کو قرآن کریم نے ان آیات میں بیان فرمایا ہے اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۝ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝ ثُمَّ نَظَرَ ۝ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۝ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۝ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۝ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۝ اسمیں قدّر تقدیر سے مشتق ہے جس کے لفظی معنے تجویز کرنے کے ہیں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ اس کمبخت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نبوت و رسالت پر یقین کامل ہو جانے کے باوجود غصہ اور غیرت سے مغلوب ہو کر مخالفت کرنا توطے کر لیا مگر صاف جھوٹ بولنے سے پرہیز کرنا چاہتا تھا کہ اپنی رسوائی نہ ہو اس لئے بہت غور و فکر کر کے یہ تجویز نکالی کہ ان کو ساحر اس بنا پر کہو کہ آپکے کلام اور تلقین سے باپ بیٹے بھائی بھائی میں تفریق ہو جاتی ہے جیسے جادو سے ہوتی ہے اسی تقدیر و تجویز پر حق تعالےٰ نے اس پر مکرر لعنت قرآن میں فرمائی فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝

جھوٹ سے کفار بھی پرہیز کرتے تھے غور کیجئے کہ یہ قریشی سردار اور سبھی کفار فجار اور طرح طرح کے معاصی و فواحش میں گرفتار تھے مگر جھوٹ ایک ایسا عیب ہے کہ یہ کفار بھی اس سے بھاگتے تھے۔ ابوسفیان کا واقعہ قبل از اسلام جو دربار قیصر روم میں پیش آیا، اُس سے بھی یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں اپنی جان اور اولاد تک کو قربان کرنے کے لئے تیار تھے مگر ایسا جھوٹ بولنے کے لئے تیار نہیں تھے جس سے اُن کو دُنیا میں جھوٹا کہا جائے۔ افسوس ہے کہ اس معکوس ترقی کے زمانے میں یہ عیب عیب ہی نہیں رہا بلکہ سب سے بڑا ہنر ہو گیا اور کفار فجار ہی نہیں نیک دیندار مسلمانوں کے دلوں سے بھی اسکی نفرت نکل گئی بے تکان جھوٹ بولنے اور بولوانے کو فخر کے ساتھ بیان کرتے ہیں (نعوذ باللہ منہ)

اولاد کا اپنے پاس موجود ہونا ایک مستقل نعمت ہے ولید بن مغیرہ پر اللہ تعالےٰ نے جو دنیا میں انعامات مبذول فرمائے تھے اُن میں ایک یہ بھی فرمایا ہے کہ بَنِيْنَ شُهُوْدًا یعنی اولاد حاضر و موجود۔ اس سے معلوم ہوا کہ جیسا اولاد کا پیدا ہونا اور اسکا باقی رہنا اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں اسی طرح اولاد کا اپنے پاس حاضر موجود رہنا

بھی ایک بڑا انعام ہے جو والدین کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک اور قلب کے سکون کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اُن کی حاضری سے اپنی خدمت اور کاروبار میں امداد کا فائدہ مزید براں ہے۔ اس معکوس ترقی نے جو یہ زمانہ کر رہا ہے صرف سونے چاندی کے سکّوں بلکہ ان سکّوں کے اقرارناموں (نوٹوں) کا نام عیش و آرام رکھ لیا ہے جس کے لئے والدین بڑے فخر سے اولاد کو دوسرے ملکوں میں پھینکدیتے ہیں اور اس پر خوش ہوتے ہیں کہ اگرچہ سالہا سال بلکہ عمر بھر اولاد کی صورت بھی نہ دیکھیں مگر اُن کی بڑی تنخواہ اور آمدنی کی خبر ان کے کانوں تک پہنچتی رہے اور یہ اُس خبر کے ذریعہ اپنی برادری میں اپنی برتری ثابت کرتے رہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ آرام و راحت کے مفہوم سے بھی بے خبر ہو گئے۔ اور اللہ تعالیٰ کو بھلانے کا یہی نتیجہ ہونا چاہیئے کہ وہ خود اپنے آپ کو یعنی اپنے اصلی آرام و راحت کو بھی بھول جائے جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ

وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ، ائمہ تفسیر میں سے مقاتل نے فرمایا کہ یہ جواب ابوجہل کے کلام کا ہے اسنے جب یہ آیت سُنی کہ جہنم کے خازن اُنیس ۱۹ فرشتے ہیں تو قریشی جوانوں کو خطاب کر کے کہنے لگا کہ محمدؐ کے ساتھی تو فقط اُنیس ۱۹ ہیں اسکی تمھیں کیا فکر ہو سکتی ہے۔ اور بیہقی نے سدّی سے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ تو ایک بیہودہ کافر قریش جس کو ابوالاسلین کہا جاتا تھا بول اُٹھا کہ اے قوم قریش کچھ فکر نہ کرو۔ ان اُنیس کے لئے تو میں اکیلا کافی ہوں میں اپنے داہنے بازو سے دس کو اور بائیں بازو سے نو کو دفع کر کے ان اُنیس کا خاتمہ کر دونگا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ احمقو، اوّل تو فرشتہ ایک بھی سب کے لئے کافی ہے اور اُنیس کا عدد جو یہاں بتلایا گیا ہے یہ اُن فرشتوں کے بڑوں اور ذمّہ داروں کا عدد ہے ان میں سے ہر ایک کے ماتحت خدائی خدمات اور کفار و فجار کو عذاب دینے کے لئے لاتعداد فرشتے مقرر ہیں جن کا عدد اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ آگے قیامت اور احوالِ قیامت کا ذکر ہے اسمیں فرمایا اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ، انّہا کی ضمیر سقر کی طرف راجع ہے جسکا ذکر اُوپر کی آیات میں آیا ہے۔ کُبَر بضم کاف و فتح بار کُبریٰ کی جمع ہے یہ صفت ہے داہیۃ یا مصیبۃ کی، معنے آیت کے یہ ہوئے کہ یہ سقر یعنی جہنّم جس میں ان کو داخل کیا جائے گا بڑی بڑی آفتوں اور مصیبتوں میں سے ایک ہے اس کے علاوہ اور طرح طرح کے عذاب ہیں۔

لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ، یہاں تقدم سے مراد تقدم الی الایمان والطاعۃ اور تاخر سے مراد ایمان وطاعت سے پیچھے ہٹنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہنّم کے عذاب سے ڈرانا جو اوپر کی آیت میں ہے یہ ہر ایک انسان کے لئے عام ہے پھر کوئی یہ ڈرسُن کر ایمان و اطاعت کی طرف پیشقدمی کرتا ہے کوئی بدنصیب اس کے باوجود پیچھے رہ جاتا ہے۔

كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ، رھینۃ بمعنی مرہونہ ہے اور مراد اس سے اسکا محبوس و مقید ہونا ہے جس طرح کوئی شخص قرض کے بدلے میں کوئی چیز رہن رکھدے تو وہ چیز قرض خواہ کے قبضہ میں محبوس رہتی ہے، مالک اُس سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا، اسی طرح قیامت کے

روز ہر ایک نفس اپنے گناہوں کے بدلے میں محبوس اور مقید رہیگا مگر اصحاب الیمین اس حبس اور قید سے مستثنیٰ ہونگے۔

یہاں حبس سے مراد جہنم میں محبوس ہونا بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ خلاصۂ تفسیر مذکور میں لیا گیا ہے تو معنی یہ ہونگے کہ ہر شخص اپنے اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لئے جہنم میں محبوس رہے گا مگر اصحاب الیمین اس سے مستثنیٰ ہونگے۔ اس سیاق سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اصحاب الیمین سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنا قرض ادا کر دیا یعنی اللہ تعالیٰ اور بندوں کے سب حقوق دُنیا میں ادا کر دیئے تھے یا اللہ تعالیٰ اور بندوں نے معاف کر دیئے وہ فرض اور قرض سب ادا کر چکے اُن کے نفوس کے مرہون ہونے کی کوئی وجہ نہیں، یہ تفسیر بظاہر صاف دبے تکلف ہے۔ اور اگر حبس سے مراد حساب کتاب اور جنت دوزخ کے داخلے سے پہلے کسی جگہ محبوس ہونا ہے تو اسکا حاصل یہ ہوگا کہ تمام نفوس اپنے اپنے حساب کے لئے محبوس ہونگے جب تک حساب نہ ہو جائے کوئی کہیں نہ جاسکے گا۔ اس صورت میں اصحاب الیمین جو مستثنیٰ کئے گئے اُن سے مراد یا تو وہ معصومین ہوسکتے ہیں جن کے ذمہ حساب نہیں، جیسے نابالغ بچے کما ہو قول علی کرم اللہ وجہہٗ یا پھر وہ لوگ جن کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ اس اُمت کے بہت سے لوگ حساب سے مستثنیٰ کر دیئے جاویں گے وہ بغیر حساب کے جنت میں داخل ہونگے۔ اور سورۂ واقعہ میں جو حاضرینِ محشر کی تین قسمیں بتلائی ہیں۔ ایک سابقین و مقربین، دوسرے اصحاب الیمین، تیسرے اصحاب الشمال۔ یہاں مقربین کو بھی اصحاب الیمین میں شامل کر کے صرف اصحاب الیمین کے ذکر پر اکتفا کیا گیا لیکن اس معنی کے اعتبار سے تمام اصحاب الیمین کا حساب کے لئے محبوس ہونے سے استثنا کسی نص سے ثابت نہیں یہ معنی پہلی تفسیر یعنی حبس فی جہنم ہی کے ساتھ درست ہوسکتے ہیں۔ واللہ اعلم

فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ، تنفعھم کی ضمیر اُن مجرمین کیطرف راجع ہے جن کا ذکر اس سے پہلی آیت میں آیا ہے کہ اُنھوں نے اپنے چار جرائم کا اعتراف کیا، ایک یہ کہ وہ نماز نہیں پڑھتے تھے دوسرے یہ کہ وہ کسی مسکین غریب کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ مراد یہ ہے کہ غریبوں کی ضروریات پر خرچ نہیں کرتے تھے، تیسرے یہ کہ اہل باطل جو اسلام و ایمان کے خلاف باتیں کرتے یا معاصی و فواحش میں مبتلا ہوتے ہیں یہ بھی انکے ساتھ لگے رہتے تھے اُن سے بیزاری کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ چوتھے یہ کہ قیامت کا انکار کرتے تھے۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ ایسے مجرم جو ان سب گناہوں کے مرتکب ہوں جن میں قیامت کی تکذیب بھی داخل ہے جو عین کفر ہے ایسے مجرموں کے لئے کسی کی شفاعت نافع نہ ہوگی، کیونکہ یہ کفار ہیں کسی کافر کی شفاعت کرنے کی بھی کسی کو اجازت نہیں ہوگی اور اگر کوئی کرے تو قبول نہیں ہوگی خواہ سارے شفاعت کرنیوالے جمع ہو کر شفاعت کا زور لگائیں ہرگز نفع نہیں دیگی اسی کیطرف اشارہ کرنے کے لئے شفاعۃ الشافعین بصیغہ جمع لایا گیا ہے۔

کافر کے لئے کسی کی شفاعت نافع نہیں مومن کے لئے نافع ہوگی

اس آیت سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ کفار کے علاوہ مسلمانوں کے لئے اگرچہ وہ گنہگار ہوں شفاعت نفع دے گی جیسا کہ بہت سی احادیثِ صحیحہ میں انبیاء علیہم السلام

اور اولیاء صلحاء بلکہ عام مؤمنین کا دوسروں کی شفاعت کرنا اور قبول ہونا ثابت ہے۔

فائدہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ آخرت میں اللہ کے فرشتے اور انبیاء اور شہداء و صالحین گناہگاروں کی شفاعت کریں گے اور وہ اُن کی شفاعت سے جہنم سے نکال لئے جاویں گے بجز ان چار قسم کے مجرمین کے جنکا ذکر اوپر آیا ہے یعنی جو نماز و زکوٰۃ کے تارک ہیں اور جو اہلِ باطل کفار کی خلاف اسلام باتوں میں شریک رہتے ہیں اور جو قیامت کا انکار کرتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بے نماز اور تارک زکوٰۃ کے لئے شفاعت قبول نہیں ہوگی۔ مگر دوسری روایات سے صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیت میں جن لوگوں کی شفاعت قبول نہ ہونا مذکور ہے وہ مراد ہیں جو ان چاروں جرائم کے مجرم ہوں جن میں تکذیب قیامت بھی داخل ہے۔ تکذیب کے علاوہ الگ الگ دوسرے جُرم کرنے والے کی یہ سزا ہونا ضروری نہیں مگر بعض روایاتِ حدیث میں خاص خاص گناہوں کے مرتکب کے متعلق بھی یہ آیا ہے کہ وہ شفاعت سے محروم رہے گا جیسے حدیث میں کہ جو شخص شفاعت کے حق ہونے ہی کا منکر ہو یا حوضِ کوثر کے وجود کا منکر ہو اس کا شفاعت اور حوض کوثر میں کوئی حصہ نہیں۔

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ، یہاں تذکرہ سے مراد قرآن حکیم ہے کیونکہ تذکرہ کے لفظی معنی یاد دلانے والی چیز کے ہیں اور قرآن اللہ تعالیٰ کی صفات کمال اور اُس کی رحمت و غضب اور ثواب و عذاب کو یاد دلانے میں بے نظیر ہے اور آخر میں فرمایا كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ یعنی بلاشبہ قرآن تذکرہ ہے جسکو تم نے چھوڑ رکھا ہے قَسْوَرَةٍ کے معنی شیر کے بھی آتے اور تیر انداز شکاری کے بھی اس جگہ صحابہ کرام سے دونوں منقول ہیں۔

هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ، اللہ تعالیٰ کا اہلِ تقویٰ ہونا باین معنی ہے کہ صرف وہی اسکا مستحق ہے کہ اُس سے ڈرا جائے اور اُس کی نافرمانی سے بچا جائے اور اہلِ مغفرت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہی ایسی ذات ہے جو بڑے سے بڑے مجرم گناہگار کو اُس کے سب گناہ جب چاہتے ہیں بخشدیتے ہیں اور کسی کا یہ حوصلہ نہیں ہو سکتا۔

تمت سورۃ المدثر بحمد اللہ یوم الجمعۃ ۲۵ رجب ۱۳۹۱ھ

سُوْرَةُ الْقِيٰمَةِ

سُوْرَةُ الْقِيٰمَةِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اَرْبَعُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۃ قیامت مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چالیس آیتیں اور دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ ① وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ② اَيَحْسَبُ

قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور قسم کھاتا ہوں جی کی کہ جو ملامت کرے برائی پر کیا خیال رکھتا ہے

الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ③ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ

آدمی کہ جمع نہ کریں گے ہم اس کی ہڈیاں کیوں نہیں ہم ٹھیک کر سکتے ہیں اُس کی

بَنَانَهٗ ④ بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ⑤ يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ

پوریاں بلکہ چاہتا ہے آدمی کہ ڈھٹائی کرے اسکے سامنے پوچھتا ہے کب ہوگا دن

الْقِيٰمَةِ ⑥ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۙ ⑦ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۙ ⑧ وَجُمِعَ الشَّمْسُ

قیامت کا پھر جب چُندھیانے لگے آنکھ اور گہ جائے چاند اور اکٹھے ہوں سورج

وَالْقَمَرُ ۙ ⑨ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ⑩ كَلَّا لَا وَزَرَ ⑪

اور چاند کہے گا آدمی اُس دن کہاں چلا جاؤں بھاگ کر کوئی نہیں کہیں نہیں ہے بچاؤ

اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَىِٕذِ ِۨالْمُسْتَقَرُّ ⑫ يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍۢ بِمَا قَدَّمَ

تیرے رب تک ہے اُس دن جا ٹھہرنا جتلا دیں گے انسان کو اُس دن جو اُس نے آگے بھیجا

وَاَخَّرَ ⑬ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۙ ⑭ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ⑮

اور پیچھے چھوڑا بلکہ آدمی اپنے واسطے آپ دلیل ہے اور پڑا لا ڈالے اپنے بہانے

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ⑯ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ⑰

نہ چلا تو اُسکے پڑھنے پر اپنی زبان تاکہ جلدی اسکو سیکھ لے، وہ تو ہمارا ذمہ ہے اسکو جمع رکھنا تیرے سینہ میں اور پڑھنا تیری زبان سے

فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ﴿١٨﴾ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ﴿١٩﴾ كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ
پھر جب ہم پڑھنے لگیں فرشتہ کی زبانی تو ساتھ رہ اُسکے پڑھنے کے، پھر مقرر ہمارا ذمّہ ہے اسکو کھول کر بتلانا، کوئی نہیں پر تم چاہتے ہو

الْعَاجِلَةَ ﴿٢٠﴾ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ ﴿٢١﴾ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿٢٢﴾ إِلَىٰ
جو جلد آئے اور چھوڑتے ہو جو دیر میں آئے کتنے منہ اُس دن تازہ ہیں اپنے

رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿٢٣﴾ وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ﴿٢٤﴾ تَظُنُّ أَن يُفْعَلَ
رب کی طرف دیکھنے والے اور کتنے منہ اُس دن اُداس ہیں خیال کرتے ہیں کہ اُن پر

بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿٢٥﴾ كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿٢٦﴾ وَقِيلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ﴿٢٧﴾
وہ آئے جس سے ٹوٹے کمر ہرگز نہیں جس وقت جان پہنچے ہانس تک اور لوگ کہیں کون ہے جھاڑنے والا

وَظَنَّ أَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿٢٨﴾ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿٢٩﴾ إِلَىٰ رَبِّكَ
اور وہ سمجھا کہ اب آیا وقت جُدائی کا اور لپٹ گئی پنڈلی پر پنڈلی تیرے رب کی طرف ہے

يَوْمَئِذٍ الْمَسَاقُ ﴿٣٠﴾ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلَّىٰ ﴿٣١﴾ وَلَٰكِن كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ﴿٣٢﴾
اُس دن کھنچ کر چلا جانا پھر نہ یقین لایا اور نہ نماز پڑھی پھر جھٹلایا اور منہ موڑا

ع ۳۰/۱۷

ثُمَّ ذَهَبَ إِلَىٰ أَهْلِهِ يَتَمَطَّىٰ ﴿٣٣﴾ أَوْلَىٰ لَكَ فَأَوْلَىٰ ﴿٣٤﴾ ثُمَّ أَوْلَىٰ لَكَ فَأَوْلَىٰ ﴿٣٥﴾
پھر گیا اپنے گھر کو اکڑتا ہوا خرابی تیری خرابی پر خرابی تیری پھر خرابی تیری خرابی پر خرابی تیری

أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى ﴿٣٦﴾ أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنَىٰ ﴿٣٧﴾
کیا خیال رکھتا ہے آدمی کہ چھوٹا رہے گا بے قید بھلا نہ تھا وہ ایک بوند منی کی جو ٹپکی

ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ ﴿٣٨﴾ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ
پھر تھا لہو جما ہوا پھر اُس نے بنایا اور ٹھیک کر اُٹھایا پھر کیا اسمیں جوڑا نر

وَالْأُنثَىٰ ﴿٣٩﴾ أَلَيْسَ ذَٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَن يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ ﴿٤٠﴾
اور مادہ کیا یہ (خدا) زندہ نہیں کر سکتا مُردوں کو

ع ۴۰/۱۸

خلاصۂ تفسیر

میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور قسم کھاتا ہوں ایسے نفس کی جو اپنے اوپر ملامت کرے (یعنی نیکی کرکے یہ کہے کہ میں نے کیا کیا ہے اسمیں اخلاص نہ تھا، اسمیں فلانی خرابی رہ گئی تھی اور گناہ ہو جاوے تو بہت ہی نادم ہو۔ کذافی الدر المنثور عن ابن عباس والحسن۔ پس اس معنی کے اعتبار سے یہ نفس مطمئنہ کو بھی شامل ہے اور جواب قسم محذوف ہے یعنی تم ضرور مبعوث ہوگے، اور ان دونوں قسموں کا مناسب مقام ہونا ظاہر ہے قیامت کا تو اسلئے کہ وہ ظرف ہے حشر ونشر کا اور نفس لوامہ کا اسلئے کہ ایسا نفس قیامت کی عملی تصدیق کرنے والا ہوتا ہے۔ آگے

منکرینِ بعث پر رد ہے یعنی) کیا انسان خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں ہرگز جمع نہ کریں گے (انسان سے مراد کافر
اور ہڈیوں کی تخصیص اسلئے کہ اصل عمادِ بدن یہی ہیں۔ آگے اس انکار کا جواب ہے یعنی) ہم ضرور جمع کریں گے (اور
یہ جمع کرنا ہمکو کچھ دشوار نہیں) کیونکہ ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کی انگلیوں کی پوریوں تک درست کردیں (پوریوں
کی تخصیص ذکری دو وجہ سے ہے ایک یہ کہ یہ اطرافِ بدن ہیں اور تکمیل ہر شئے کے بننے کی اس کے اطراف پر ہوتی ہے۔
چنانچہ ہمارے محاورہ میں بھی ایسے موقع پر بولتے ہیں کہ میرے پور پور میں درد ہے یعنی تمام بدن میں۔ دوسرے یہ کہ
پوریوں میں باوجود چھوٹی ہونے کے صنعت کی رعایت زیادہ ہے اور عادۃً یہ زیادہ دشوار ہے پس جو اس پر قادر
ہوگا وہ آسان پر بدرجۂ اولیٰ قادر ہوگا لیکن بعضا آدمی قدرتِ الٰہیہ میں غور نہیں کرتا اور قیامت کا قائل نہیں ہوتا)
بلکہ (ایسا) بعضا آدمی (قیامت کا منکر ہوکر) یوں چاہتا ہے کہ اپنی آئندہ زندگی میں بھی (بےخوف وخطر
ہوکر) فسق وفجور کرتا رہے (اسلئے بطور انکار کے) پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب آئیگا (یعنی چونکہ اپنی تمام
عمر معاصی وشہوات میں گزارنا طے کرچکا ہے اسلئے اس کو طلبِ حق کی نوبت ہی نہیں آتی کہ قیامت کا ہونا اسکو
ثابت ہو اسلئے انکار پر مصر ہے اور انکاراً پوچھتا ہے کہ کب آئے گی) سو جس وقت (مارے حیرت کے) آنکھیں خیرہ
ہوجاویں گی (اور وجہ اس حیرت کی یہ ہوگی کہ جن اُمور کی تکذیب کرتا تھا وہ دفعتاً نظر آجاوینگے کذا فی الجلالین)
اور چاند بےنور ہوجاوے گا اور (چاند کی کیا تخصیص ہے بلکہ) سورج اور چاند (دونوں) ایک حالت کے ہوجاوینگے
(یعنی دونوں بےنور ہوجاویں گے، جیسا حدیث بخاری میں آیا ہے (تکوران ومعنی کوّرت قال ابن عباس
اظلمت، رواہما فی الدر المنثور سورۃ التکویر) اور چاند کو جُدا بیان کرنا شاید اسلئے ہو کہ عرب کو بوجہ قمری
حساب رکھنے کے اُسکا حال دیکھنے کا زیادہ اہتمام تھا) اس روز انسان کہے گا کہ اب کدھر بھاگوں (ارشاد
ہوتا ہے کہ) ہرگز (بھاگنا ممکن) نہیں (ہوگا کیونکہ) کہیں پناہ کی جگہ نہیں (ہوگی) اس دن صرف آپ ہی کے
رب کے پاس ٹھکانا (جانے کا) ہے (پھر خواہ جنت میں بھیجیں یا دوزخ میں اور رب کے سامنے جانے کے
وقت) اس روز انسان کو اسکا سب اگلا پچھلا کیا ہوا جتلا دیا جائے گا (اور انسان کا اپنے اعمال سے آگاہ
ہونا کچھ اس جتلانے پر موقوف نہوگا) بلکہ انسان خود اپنی حالت پر (بوجہ انکشافِ ضروری کے) خوب مطلع
ہوگا گو (باقتضائے طبیعت اس وقت بھی) اپنے حیلے (حوالے) پیش لاوے (جیسے کفار کہیں گے وَاللّٰہِ رَبِّنَا
مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ، مگر دل میں خود بھی جانیں گے کہ ہم جھوٹے ہیں غرض انسان اپنے سب حال کو خوب جانتا ہوگا
اسلئے جتلانا اعلام کے لئے نہوگا بلکہ تنبیہ واتمامِ حجت وقطعِ جواب کے لئے ہوگا اور) اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم)
يُنَبَّؤُا اور بَلِ الْإِنْسَانُ سے دو مضمون مستفاد ہوئے ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کے عالم اور محیط ہیں۔
دوسرا یہ کہ حق تعالیٰ کی عادت ہے کہ جب حکمت مقتضی ہوتی ہے تو علومِ غائبہ کثیرہ کو ذہن مخلوق میں حاضر کردیتا ہے
گو اُن علوم غائبہ کا حاضر ہوجانا خلافِ عادتِ طبعی ہو جیسا کہ قیامت میں اسکا وقوع ہوگا جب یہ بات ہے
تو آپ نزولِ وحی کے وقت جیسا کہ اب تک آپ کی عادت ہے اسقدر مشقت کہ سُنتے بھی ہیں، پڑھتے بھی ہیں،

دھیان بھی رکھتے ہیں محض اس احتمال سے کیوں برداشت کرتے ہیں کہ شاید کچھ مضمون میرے ذہن سے نکل جائے، کیونکہ جب ہم نے آپ کو نبی بنایا ہے اور آپ سے تبلیغ کا کام لینا ہے تو یہاں مقتضائے حکمت یہی ہوگا کہ وہ مضامین آپ کے ذہن میں حاضر رکھے جائیں اور ہمارا اس پر قادر ہونا تو ظاہر ہی ہے اسلئے آپ یہ مشقت برداشت نہ کیا کیجئے، اور جب وحی نازل ہوا کرے تو) آپ (قبل وحی ختم ہو چکنے کے) قرآن پر اپنی زبان نہ ہلایا کیجئے تاکہ آپ اُس کو جلدی جلدی لیں (کیونکہ) ہمارے ذمہ ہے (آپکے قلب میں) اُس کا جمع کر دینا اور (آپ کی زبان سے) اسکا پڑھوا دینا (جب یہ ہمارے ذمہ ہے) تو جب ہم اُس کو پڑھنے لگا کریں (یعنی ہمارا فرشتہ پڑھنے لگا کرے) تو آپ (اپنے ذہن سے اور فکر سے ہمہ تن) اُس کے تابع ہو جایا کیجئے (یعنی اُدھر ہی متوجہ ہو جایا کیجئے اور اُسکے دوہرانے میں مشغول نہ ہوا کیجئے کقولہ تعالیٰ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ الخ) پھر (آپ کی زبان سے لوگوں کے سامنے) اسکا بیان کرا دینا (بھی) ہمارے ذمہ ہے (یعنی آپ کو یاد کرا دینا اور آپ کی زبان پر جاری کرا دینا پھر تبلیغ کے وقت بھی اُسکا یاد رکھوانا اور لوگوں کے سامنے پڑھوا دینا یہ سب ہمارے ذمہ ہے اور یہ مضمون استطراداً آ گیا تھا۔ آگے پھر عود ہے خطاب منکرین کی طرف یعنی) اے منکرو (انسان کا اعمال متقدمہ و متاخرہ پر مطلع کیا جانا قیامت میں ضرور ہے اور جیسا تم سمجھ رہے ہو کہ قیامت نہ ہوگی) ہرگز ایسا نہیں (اور نہ تمہارے پاس اس نفی کی کوئی دلیل ہے) بلکہ (صرف بات یہ ہے کہ) تم دُنیا سے محبت رکھتے ہو اور (اُس محبت میں منہمک ہو کر) آخرت (سے غافل ہو اور غفلت کے سبب اُس) کو چھوڑ بیٹھے ہو (پس بنائے تمہاری اس نفی کی محض فاسد ہے سو قیامت ضرور ہوگی اور ہر ایک کو اُس کے اعمال پر مطلع کر کے اُن اعمال کے مناسب جزا ملے گی جس کی تفصیل یہ ہے کہ) بہت سے چہرے تو اس روز بارونق ہونگے اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہونگے اور بہت سے چہرے اس روز بد رونق ہونگے (اور وہ لوگ خیال کر رہے ہونگے کہ ان کے ساتھ کمر توڑ دینے والا معاملہ کیا جائے گا (یعنی اس کو عذاب شدید ہوگا۔ آگے دُنیا کی محبت پر زجر ہے کہ تم جو دُنیا کو محبوب اور آخرت کو متروک ہونے کے قابل سمجھ رہے ہو) ہرگز ایسا نہیں (کیونکہ دُنیا سے ایک روز مفارقت ہونیوالی ہے اور بالآخر آخرت میں جانا ہے جسکا بیان یہ ہے کہ) جب جان ہنسلی تک پہنچ جاتی ہے اور (نہایت حسرت سے اسوقت) کہا جاتا ہے (یعنی تیمار دار کہتے ہیں) کہ (ارے) کوئی جھاڑ (پھونک کر) نے والا بھی ہے (مراد مطلق معالج ہے چونکہ عرب میں جھاڑ پھونک کا زیادہ چرچا تھا اسلئے راق سے تعبیر کیا) اور (اسوقت) وہ (مُردہ) یقین کر لیتا ہے کہ یہ مفارقت (دُنیا) کا وقت ہے اور (شدّتِ سکراتِ موت سے) ایک پنڈلی دوسری پنڈلی سے لپٹ لپٹ جاتی ہے (مُراد اس سے ظہور آثار سکراتِ موت ہے کچھ تخصیص ساقین کے لپٹ جانے کی نہیں اسکا ذکر تمثیلاً ہے۔ جب یہ حالتیں پیش آتی ہیں تو اے شخص) اس روز تیرے رب کی طرف جانا ہوتا ہے (پس ایسی حالت میں حبِ عاجلہ و ترکِ آخرت کس درجہ نادانی ہے پھر خدا کے پاس پہنچنے کے بعد اگر وہ کافر ہے) تو (اُس کا بُرا حال ہوگا کیونکہ) اُس نے نہ تو (خدا اور رسُول کی) تصدیق کی تھی اور نہ نماز پڑھی تھی لیکن (خدا اور رسُول کی) تکذیب کی تھی اور (احکام سے) منہ موڑا تھا پھر (اس پر طرّہ

یہ کہ داعیٔ حق سے منہ موڑ کر اس پر افتخار اور) ناز کرتا ہوا اپنے گھر چل دیتا تھا (مطلب یہ کہ اوّل تو کفر و عصیان پھر اس پر ندامت نہیں بلکہ اور الٹا فخر کرتا تھا کہ ہمنے اس طرح حق کو رد کیا اور باطل پر جمے رہے اور پھر اس کے بعد طلب حق نہیں بلکہ اپنے خدم وحشم میں جا کر اور زیادہ مغرور اور غافل ہو جاتا، آگے اس کافر کی بد حالی کا بیان ہے کہ ایسے شخص سے کہا جاویگا کہ) تیری کمبختی پر کمبختی آنے والی ہے پھر (مکرر سُن لے کہ) تیری کمبختی پر کمبختی آنے والی ہے (تکریر مفرد سے مقدار کی زیادتی مستفاد ہوئی اور تکریر مجموع سے کیفیت کی زیادتی، اور چونکہ وقوع جزائے مذکور موقوف ہے دو امر پر، ایک انسان کا مکلّف ہونا دوسرے اس کا مرکر دوبارہ زندہ ہونا جس کے امکان میں اُن کو کلام تھا اسلئے آگے دونوں مضمون ہیں یعنی) کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ یُوں ہی مہمل چھوڑ دیا جاوے گا۔ (نہ اس پر احکام عائد کئے جاویں گے اور نہ اس سے حساب کتاب ہوگا بلکہ مکلّف ہونا بھی یقینی ہے اور اُسپر بازپرس ہونا بھی یقینی، اور یہ جو بعث کو محال سمجھتا ہے یہ بھی اُس کی حماقت ہے) کیا یہ شخص (ابتدا میں محض) ایک قطرۂ منی نہ تھا جو (عورت کے رحم میں) ٹپکایا گیا تھا پھر وہ خون کا لوتھڑا ہو گیا، پھر اللہ تعالیٰ نے (اس کو انسان) بنایا، پھر اعضاء درست کئے پھر اُس (انسان) کی دو قسمیں کر دیں مرد اور عورت (اور یہ فاتفسیر یہ ہے تو) کیا وہ (خدا جس نے ابتدا میں اپنی قدرت سے یہ سب کچھ کیا) اس بات پر قدرت نہیں رکھتا کہ (قیامت میں) مُردوں کو زندہ کردے (حالانکہ دوبارہ پیدا کرنا پہلے پیدا کرنے کی نسبت آسان ہے)

معارف و مسائل

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ یہاں قسم سے پہلے حرف لا زائد ہے۔ جب قسم کسی مخالف کی بات رد کرنے کے لئے کھائی جاتی ہے تو اُس کے شروع میں حرف لا، اُس شخص کے خیال باطل کی نفی کے لئے زائد استعمال ہوتا ہے اور محاورات عرب میں یہ استعمال معروف و مشہور ہے۔ ہماری زبان میں بھی بعض اوقات کسی قابل تاکید مضمون کے بیان سے پہلے کہا جاتا ہے، نہیں آگے اپنا مقصد بیان کیا جاتا ہے۔ اس سورت میں قیامت و آخرت کے منکروں کو تنبیہ اور اُن کے شکوک و شبہات کا جواب ہے۔ سورت کو اوّل قیامت پھر نفسِ لوّامہ کی قسموں سے شروع فرمایا ہے اور جواب قسم بقرینہ مقام محذوف ہے یعنی قیامت ضرور آکر رہے گی۔ قیامت کی قسم تو اُس کی عظمت کے اثبات کے لئے مناسب مقام ہونا ظاہر ہے اسی طرح نفسِ لوّامہ کی قسم میں بھی اسکی عظمت اور مقبولیت عند اللہ کا اظہار ہے۔ نفس کے معنے جان یا رُوح کے معروف ہیں اور لوّامہ لَوْم بفتح اللام سے مشتق ہے جس کے معنے ملامت اور سرزنش کرنے کے ہیں۔ نفس لوّامہ سے مراد وہ نفس ہے جو خود اپنے اعمال کا محاسبہ کرکے اپنے آپ کو ملامت کرتا رہے یعنی جو گناہ سرزد ہوا یا عمل واجب میں کوتاہی ہوئی اُس پر خود اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے کہ تو نے ایسا کیوں کیا اور اعمال خیر اور حسنات کے متعلق بھی اپنے آپ کو اس پر ملامت کرے کہ اس سے زیادہ نیک کام

کر کے اعلیٰ درجات کیوں نہ حاصل کئے۔ غرض مؤمن کامل اپنے ہر عمل خیر و شر اور حسنات و سیئات میں اپنے آپ کو ہمیشہ ملامت ہی کرتا ہے۔ گناہ یا واجب میں کوتاہی پر ملامت تو ظاہر ہے حسنات اور نیک کاموں میں ملامت کی وجہ یہ ہے کہ اے نفس تو یہ نیکی اس سے زیادہ بھی تو کر سکتا تھا اُس زیادتی سے کیوں محروم رہا۔ یہ تفسیر حضرت ابن عباس اور دوسرے ائمۂ تفسیر سے منقول ہے (ابن کثیر وغیرہ) اور اسی مفہوم کی وجہ سے حضرت حسن بصری رحمۃ نے نفس لوّامہ کی تفسیر نفس مؤمنہ سے کی ہے۔ اور فرمایا کہ واللہ مومن تو ہمیشہ ہر حال میں اپنے نفس کو ملامت ہی کرتا ہے۔ سیئات پر تو ظاہر ہی ہے اپنے حسنات اور نیک کاموں میں بھی وہ بمقابلہ شانِ حق سبحانہٗ وتعالیٰ کے کمی اور کوتاہی محسوس کرتا ہے کیونکہ حقِّ عبادت کو پورا ادا کرنا تو کسی کے بس میں نہیں اس لئے ادائے حق میں تقصیر اسکے سامنے رہتی ہے اُس پر ملامت کرتا ہے۔

نفسِ لوّامہ کی تفسیر حضرت ابنِ عباس اور حسن بصری وغیرہ کی اس تفسیر پر نفسِ لوّامہ کی قسم کھانا حق تعالےٰ کی طرف سے ایسے نفوس مؤمنہ کے اکرام و شرف کے اظہار کے لئے ہے جو خود اپنے اعمال کا محاسبہ کر کے کوتاہی پر نادم ہوتے اور اپنے کو ملامت کرتے ہیں۔

نفس لوّامہ اور مطمئنہ اور نفس لوّامہ کی اس تفسیر کے مطابق یہ نفس مطمئنہ کو بھی شامل ہے لوّامہ اور مطمئنہ دونوں نفس متقی کے لقب ہیں۔

نفس امارہ، لوّامہ، مطمئنہ اور حضرات صوفیائے کرام نے اس میں یہ تفصیل کی ہے کہ نفس اپنی جبلّت و فطرت کے اعتبار سے اَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ ہوتا ہے یعنی انسان کو بُرے کاموں کیطرف بُلانے اور اسمیں مبتلا کرنے کا داعی ہوتا ہے مگر ایمان اور عمل صالح اور ریاضت و مجاہدہ سے یہ نفس لوّامہ بنجاتا ہے کہ بُرائی اور کوتاہی پر نادم ہونے لگتا ہے مگر بُرائی سے بالکلیہ انقطاع اسکا نہیں ہوتا۔ آگے عمل صالح میں ترقی اور قرب حق تعالےٰ کے حصول میں کوشش کرتے کرتے جب اسکا یہ حال ہو جائے کہ شریعت اس کی طبیعت بن جائے اور خلاف شرع کام سے طبعی نفرت بھی ہونے لگے تو اُس نفس کا لقب مطمئنہ ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم

آگے منکرین قیامت کے اس عامیانہ شبہ کا جواب ہے کہ مرنے کے بعد جب انسان مٹی ہو گیا اُس کی ہڈیاں بھی ریزہ ریزہ ہو کر منتشر ہو گئیں اُن کو دوبارہ کیسے جمع کر کے زندہ کیا جائے گا۔ جس کے جواب میں فرمایا بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ، جس کا حاصل یہ ہے کہ تمھیں تو اس پر تعجب ہے کہ میّت کے ذرّات منتشرہ اور بوسیدہ ہڈیوں کو جمع کیسے کیا جاویگا اور اُن میں دوبارہ حیات کیسے ڈالی جاوے گی۔ حالانکہ یہ بات پہلے ایک مرتبہ مشاہدہ میں آچکی ہے کہ ہر انسان کا وجود جو دُنیا میں پلتا اور بڑھتا ہے وہ دُنیا بھر کے مختلف ملکوں خطوں کے اجزاء اور ذرّات کا مرکب ہوتا ہے تو جس ذات قادر نے پہلی مرتبہ ساری دُنیا میں بکھرے ہوئے ذرّات کو ایک انسان کے وجود میں جمع کر دیا تھا اب دوبارہ جمع کر لینا اسکے لئے کیوں مشکل ہوگا، اور جس طرح پہلے اس کے ڈھانچے میں رُوح ڈال کر زندہ کیا تھا دوبارہ ایسا کرنے

ہیں کیا حیرت کی بات ہے۔

حشر اجساد میں قدرت حق تعالیٰ کا عجیب و غریب عمل

غور اس پر کرو کہ ایک انسان جس ہیئت و جسامت اور شکل و صورت پر پہلے پیدا کیا گیا تھا قدرتِ حق دوبارہ بھی اس کے وجود میں اُنہی ساری چیزوں کو بغیر کسی ادنیٰ فرق کے جمع کر دے گی حالانکہ یہ اربوں پدموں انسان ابتدائے دُنیا سے قیامت تک پیدا ہوتے اور فنا ہوتے رہے کس کی مجال ہے کہ ان سب کی شکلوں صورتوں اور قد و قامت کی کیفیتوں کو الگ الگ یاد بھی رکھ سکے اُس جیسا دوبارہ بنانا تو بڑا کام ہے مگر حق تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا کہ ہم صرف اسی پر قادر نہیں ہیں کہ میت کے سارے بڑے بڑے اجزاء و اعضاء کو دوبارہ اُسی طرح بنا دیں بلکہ انسانی وجود کی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی ہم ٹھیک اُسی طرح کر دیں گے جس طرح وہ پہلے تھی اس میں بنان یعنی انگلیوں کے پوروں کا خاص ذکر فرمایا کہ وہ سب سے چھوٹے اجزاء ہیں۔ جب ان چھوٹے اجزاء کی دوبارہ ساخت میں فرق نہیں آیا تو بڑے بڑے اعضاء، ہاتھ پاؤں وغیرہ میں تو کیا فرق ہوتا۔

اور اگر غور کیا جائے تو شاید بنان یعنی انگلیوں کے پوروں کی تخصیص میں اس کی طرف بھی اشارہ ہو کہ حق تعالیٰ نے ایک انسان کو دوسرے انسان سے ممتاز کرنے کے لئے اُس کے سارے ہی بدن میں ایسی خصوصیات رکھی ہیں جن سے وہ پہچانا جاتا ہے اور ایک دوسرے سے ممتاز ہوتا ہے خصوصاً انسانی چہرہ جو چند انچ مربع سے زائد نہیں، اسکے اندر قدرت حق نے ایسے امتیازات رکھے ہیں کہ اربوں پدموں انسانوں میں ایک کا چہرہ بالکل دوسرے کے ساتھ ایسا نہیں ملتا کہ امتیاز باقی نہ رہے۔ انسان کی زبان اور حلقوم بالکل ایک ہی طرح ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے ایسی ممتاز ہے کہ بچے بوڑھے عورت مرد کی آوازیں الگ پہچانی جاتی ہیں اور ہر انسان کی آواز الگ الگ پہچانی جاتی ہے، اُس سے بھی زیادہ حیرت انگیز انسان کے انگوٹھے اور انگلیوں کے پوروے ہیں کہ اُن کے اوپر جو نقش و نگار خطوط کے جال کی صورتیں قدرت نے بنائے ہیں وہ کبھی ایک انسان کے دوسرے انسان کے ساتھ نہیں ملتے، صرف آدھ انچ کی جگہ میں ایسے امتیازات کہ اربوں انسانوں میں یہ پوروے مشترک ہونے کے باوجود ایک کے خطوط دوسرے سے نہیں ملتے۔ اور قدیم و جدید ہر زمانے میں نشان انگوٹھہ کو ایک امتیازی چیز قرار دیکر عدالتی فیصلے اُس پر ہوتے ہیں، اور فنی تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ بات صرف انگوٹھے ہی میں نہیں ہر انگلی کے پوروے کے خطوط بھی اسی طرح ممتاز ہوتے ہیں۔

یہ سمجھ لینے کے بعد پوروں کے بیان کی تخصیص خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے اور مطلب یہ ہے کہ تمھیں تو اسی پر تعجب ہے کہ یہ انسان دوبارہ کیسے زندہ ہو گیا ذرا اس سے آگے سوچو اور غور کرو کہ صرف زندہ ہی نہیں ہو گیا بلکہ اپنی سابقہ شکل و صورت اور اسکے ہر امتیازی وصف کیساتھ زندہ ہوا ہے یہانتک کہ انگوٹھے اور انگلیوں کے پوروں کے خطوط پہلی پیدائش میں جس طرح تھے اس نشأتِ ثانیہ میں بھی بالکل وہی ہونگے

فتبارک اللہ احسن الخالقین ۔

لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ، لفظ امام بفتح الہمزہ سامنے اور مستقبل کے معنے میں ہے اسلئے معنے آیت کے یہ ہوئے کہ کافر اور غافل انسان اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے ان مشاہدات میں غور نہیں کرتا کہ ماضی کے انکار پر نادم ہو کر اپنے مستقبل کو درست کرلے بلکہ مستقبل میں بھی وہ یہی چاہتا رہتا ہے کہ اپنے کفر و شرک اور انکار و تکذیب پر جما رہے ۔

فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَ خَسَفَ الْقَمَرُ وَ جُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ، یہ قیامت کے حالات کا بیان ہے برق بفتح الباء و کسر راء کے معنے آنکھ خیرہ ہو گئی کہ دیکھ نہ سکی ۔ قیامت کے روز سب کی نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی ، نگاہ جما کر کسی چیز کو نہ دیکھ سکیں گی ۔ خسف القمر خسوف سے مشتق ہے جس کے معنے روشنی ختم ہو کر تاریکی ہو جانے کے ہیں ۔ معنے یہ ہیں کہ چاند بے نور ہو جائے گا ۔ آگے وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ میں یہ بتلایا کہ صرف چاند ہی بے نور نہیں ہو گا بلکہ آفتاب بھی بے نور ہو جائے گا جس کے متعلق دنیا کے فلاسفہ کا یہ کہنا ہے کہ اصل روشنی آفتاب میں ہے ۔ چاند کی روشنی بھی آفتاب کی شعاعوں سے مستفاد ہے ۔ حق تعالےٰ نے فرمایا کہ قیامت کے روز یہ چاند اور سورج دونوں ایک ہی حال میں جمع کر دیئے جاویں گے کہ دونوں بے نور ہونگے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ چاند سورج کے جمع ہو جانیکا مطلب یہ ہے کہ اس روز چاند اور سورج دونوں ایک ہی مطلع سے طلوع ہونگے جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے واللہ اعلم

يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍۢ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ، یعنی اس روز انسان کو جتلا دیا جائیگا کہ اُسنے کیا آگے بھیجا کیا پیچھے چھوڑا ۔

حضرت عبداللہ بن مسعود اور ابن عباس رض نے فرمایا کہ جو نیک کام اپنی موت سے پہلے کر لیا وہ آگے بھیج دیا ، اور جو نیک یا بد مفید یا مضر کوئی طریقہ کوئی رسم ایسی چھوڑی کہ اسکے بعد لوگ اس پر عمل کریں وہ پیچھے چھوڑا (اسکا ثواب یا عذاب اس کو ملتا رہے گا) اور حضرت قتادہ نے فرمایا کہ مَا قَدَّمَ سے مراد وہ عمل صالح ہے جو اپنی زندگی میں کر گزرا اور مَا اَخَّرَ سے مراد وہ عمل صالح ہے جس کو کر سکتا تھا مگر نہ کیا اور فرصت ضائع کر دی ۔

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ، بصیر اور بصیرۃ کے معنے دیکھنے والے کے بھی آتے ہیں اور بصیرۃ کے معنے حجت کے بھی آتے ہیں جیسے قرآن کریم میں ہے قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ، اسمیں بصائر بصیرۃ کی جمع ہے اور معنے اسکے حجت کے ہیں ، اور معاذیر معذار بمعنے عذر کی جمع ہے ۔ معنے آیت کے یہ ہیں کہ اگرچہ عدالت کے ضابطہ کی رُو سے انسان کے سارے اعمال محشر میں اس کو ایک ایک کر کے بتلائے جاویں گے مگر درحقیقت اس کو اس کی ضرورت نہیں ، کیونکہ وہ اپنے اعمال کو خوب جانتا ہے خود اس کو معلوم ہے کہ اس نے کیا کیا کام کئے ۔ نیز یہ کہ محشر میں تمام اپنے اعمال

نیک وبد کا مشاہدہ بھی اُس کے سامنے ہو جائے گا جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا یعنی جو عمل اُنھوں نے دنیا میں کیا تھا اُس کو محشر میں حاضر موجود پائیں گے اور آنکھوں سے دیکھ لیں گے یہاں جو انسان کو اپنے نفس پر بصیرہ فرمایا اسکا یہی حاصل ہے۔

اور اگر بصیرہ کے معنے حجت کے لئے جاویں تو معنے یہ ہیں کہ انسان خود اپنے نفس پر حجت و دلیل ہوگا وہ انکار بھی کریگا تو اسکے اعضاء اقرار کریں گے مگر انسان اپنے جرائم و تقصیرات کو جاننے کے باوجود عذر تراشی نہ چھوڑیگا اپنے کئے کا عذر بیان کرتا ہی رہے گا یہ معنے ہیں وَلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ کے۔

یہاں تک قیامت کے احوال اور اہوال کا تذکرہ تھا اور آگے بھی یہی آنے والا ہے۔ درمیان میں چار آیتوں کے اندر رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ایک خاص ہدایت دی گئی ہے جو نزولِ وحی کے وقت نازل شدہ آیات کے متعلق ہے وہ یہ کہ جب جبرئیل امین قرآن کریم کی کچھ آیات لیکر نازل ہوتے تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو اُن کے پڑھنے کے وقت ایک تو یہ فکر ہوتی تھی کہ کہیں اس کے سُننے اور پھر اسکے مطابق پڑھنے میں کوئی فرق نہ آجائے۔ دوسری فکر یہ ہوتی تھی کہ کہیں اسکا کوئی حصہ کوئی کلمہ ذہن سے نکل جائے اور بھول جائیں اس لئے آپ جسوقت جبرئیل امین کوئی آیت سُناتے تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ساتھ ساتھ پڑھتے اور زبان کو جلدی جلدی حرکت دینے لگتے تھے کہ بار بار پڑھ کر اس کو یاد کرلیں، آپ کی اس محنت ومشقت کو دُور کرنے کے لئے ان چار آیتوں میں، اللہ تعالیٰ نے قرآن کے صحیح صحیح پڑھوانے پھر یاد کرا دینے اور پھر اس کو مسلمانوں کے سامنے اُسی طرح پیش کرا دینے کی ذمہ داری خود لے لی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرما دیا کہ آپ اس غرض کے لئے زبان کو جلدی جلدی حرکت دینے کی زحمت نہ اُٹھائیں۔ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ کا یہی مطلب ہے پھر فرمایا اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ، یعنی ان تمام آیات کو آپکے قلب میں جمع کر دینا پھر اُس کو اُسی طرح آپ سے پڑھوا دینا یہ سب ہمارے ذمہ ہے اس لئے آپ اس کی فکر چھوڑ دیں اور فرمایا فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ، قرآن اس جگہ بمعنے قرارت ہے معنے یہ ہیں کہ جب ہم یعنی ہماری طرف سے جبرئیل امین قرآن پڑھیں تو آپ ساتھ ساتھ نہ پڑھا کریں بلکہ ہمارے پڑھنے کے بعد پڑھا کریں اور اسوقت خاموش ہوکر سُنا کریں۔ یہاں باتفاق ائمہ اتباع قرآن سے مراد یہ ہے کہ جب جبرئیل امین پڑھیں تو آپ خاموش رہ کر سُنیں۔

امام کے پیچھے مقتدی کے قرارت نہ کرنے کی ایک دلیل

حدیث صحیح میں جو یہ آیا ہے کہ امام کو اقتدار اور اتباع ہی کے لئے بنایا گیا ہے اسلئے مقتدیوں کو اسکا اتباع کرنا چاہیئے جب وہ رکوع کرے تو سب مقتدی رکوع کرلیں جب وہ سجدہ میں جائے تو سب سجدہ میں جائیں۔ صحیح مسلم کی روایت میں اسی کیساتھ یہ بھی ارشاد ہے کہ جب امام قرارت کرے تو تم خاموش رہ کر سنو اذا قرا فانصتوا، یہ بھی اسکا بیان ہے کہ مقصود امام کا اتباع ہے رکوع سجدے میں تو اتباع امام کی صورت یہ ہے کہ اُس کے ساتھ ساتھ وہ

افعال رکوع سجدے کے ادا کیئے جاویں مگر قرارت کا اتباع یہ نہیں کہ ساتھ ساتھ پڑھا جائے بلکہ قرارت کا اتباع یہی ہے کہ جب امام قرارت کرے تو تم خاموش رہ کر سنو۔ یہی استدلال ہے امام اعظم ابوحنیفہ اور بعض دوسرے ائمہ کا اس معاملے میں کہ امام کے پیچھے مقتدی کو قرارت نہیں کرنا چاہیئے۔ واللہ اعلم

آخر میں فرمایا ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ، اسکا مطلب یہ ہے کہ آپ یہ فکر بھی اپنے اوپر نہ رکھیں کہ نازل شدہ آیات کا صحیح مفہوم اور مراد کیا ہے اسکا بتلانا سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے ہم قرآن کے ہر ہر لفظ اور اُس کی مُراد کو آپ پر واضح کر دیں گے۔ ان چار آیتوں میں قرآن اور اُس کی تلاوت وغیرہ کے متعلقہ احکام بیان کرنے کے بعد آگے پھر قیامت کے احوال و اہوال ہی کا بقیہ تذکرہ آتا ہے۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان چار آیتوں کا اگلی پچھلی آیتوں سے ربط اور جوڑ کیا ہے۔ خلاصہ تفسیر مذکور میں اسکا ربط یہ بیان کیا گیا ہے کہ چار آیتوں سے پہلے جو قیامت کے حالات میں اسکا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم اتنا وسیع ہے کہ ایک ایک انسان کو جس کیفیت جس شکل وصورت میں وہ پہلے تھا اُسی میں دوبارہ پیدا فرما دیں گے یہانتک کہ اُس کی انگلیوں کے پوروں کو اور اُن پر بنے ہوئے امتیازی خطوط ونشانات کو بھی بالکل پہلے جیسا بنا دینگے اُس میں سرِ مو فرق نہ ہوگا یہ جبھی ہوسکتا ہے کہ ذات حق تعالےٰ کا علم بھی بے انتہا ہے اور اسکا احصار اور محفوظ رکھنا بھی بے مثال ہے۔ اس کی مناسبت سے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ان چار آیتوں میں یہ تسلی دی گئی کہ آپ تو بھول بھی سکتے ہیں نقل میں غلطی کا بھی امکان ہوسکتا ہے مگر حق تعالیٰ ان سب سے بالا و برتر ہیں ان چیزوں کی ذمہ داری خود حق تعالےٰ نے اپنے ذمہ لے لی ہے اس لئے آپ قرآن کے کلمات کو محفوظ رکھنے یا اُن کے معانی سمجھنے میں غور کرنے کی زحمت چھوڑ دیں، یہ سب کام حق تعالیٰ خود انجام دیں گے۔ آگے پھر قیامت کے حالات کا بیان ہے۔

وُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ، نَاضِرَۃ بمعنے تروتازہ یعنی اُس روز کچھ چہرے ہشاش بشاش تروتازہ ہونگے اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ، یعنی یہ چہرے اپنے رب کو دیکھ رہے ہونگے، اس سے ثابت ہوا کہ آخرت میں اہلِ جنّت کو حق تعالیٰ کا دیدار بچشم سر نصیب ہوگا اس پر اہلِ سنت والجماعت اور سب علماء و فقہاء کا اجماع ہے، صرف معتزلہ اور خوارج منکر ہیں۔ وجہ انکار کی فلسفیانہ شبہات ہیں کہ آنکھ سے دیکھنے کے لئے دیکھنے والے اور جس کو دیکھا جائے اور ان دونوں کے درمیان مسافت کے لئے جو شرائط ہیں خالق و مخلوق کے درمیان اُن کا تحقق نہیں ہوسکتا۔ اہل سُنت والجماعت کا مسلک یہ ہے کہ آخرت میں حق تعالیٰ کی رویت و زیارت ان سب شرائط سے بے نیاز ہوگی نہ کسی جہت اور سمت سے اسکا تعلق ہوگا نہ کسی خاص شکل وصورت اور ہیئت سے۔ روایاتِ حدیث سے یہ مضمون اور بھی زیادہ وضاحت سے ثابت ہے، البتہ اس رویت و زیارت میں اہل جنت کے مختلف درجات ہونگے، بعض کو یہ زیارت ہفتہ وار جمعہ کو حاصل ہوگی بعض کو روزانہ صبح شام اور بعض کے لئے یہ ہر وقت ہر حال میں رہے گی (مظہری)۔

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۙ وَقِيْلَ مَنْ ٚ رَاقٍ ۙ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۙ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۙ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَىِٕذِ نِ الْمَسَاقُ ۔ سابقہ آیات میں قیامت کے حساب کتاب اور اہل جنت و دوزخ کا کچھ حال بیان فرمانے کے بعد اس آیت میں انسان کو متوجہ کیا گیا کہ اپنی موت کو نہ بھولے موت سے پہلے پہلے ایمان اور عمل صالح کی طرف آ جائے تاکہ آخرت میں نجات ملے۔ آیت مذکورہ میں موت کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا کہ غفلت شعار انسان بھول میں رہتا ہے یہاں تک کہ موت سر پر آ کھڑی ہو اور روح ترقوہ یعنی گلے کی ہنسلی میں آ پھنسے اور تیماردار لوگ دوا و علاج سے عاجز ہو کر جھاڑ پھونک کرنے والوں کو تلاش کرنے لگیں اور ایک پاؤں کی پنڈلی دوسری پر لپٹنے لگے تو یہ وقت اللہ کے پاس جانے کا آگیا۔ اب نہ توبہ قبول ہوتی ہے نہ کوئی عمل اسلئے عقلمند پر لازم ہے کہ اس وقت سے پہلے اصلاح کی فکر کرے وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ میں لفظ ساق کے مشہور معنے پاؤں کی پنڈلی کے ہیں اور پنڈلی کے ایک دوسرے پر لپٹنے کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت اضطراب اور بے چینی سے ایک پنڈلی دوسری پر مارتا ہے اور یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ اسوقت اگر ایک پاؤں دوسرے پر رکھا ہوا ہے اور اسکو حرکت دیکر ہٹانا چاہتا ہے تو وہ اسکی قدرت میں نہیں ہوتا (کما قال الشعبی والحسن)

اور حضرت ابن عباس رضؓ نے فرمایا کہ یہاں دو ساقوں سے مراد دو عالم دُنیا و آخرت کے ہیں اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ اسوقت دنیا کا آخری دن اور آخرت کا پہلا دن جمع ہوا ہے اسلئے دوہری مصیبت میں گرفتار ہے دُنیا سے جُدائی کا غم اور آخرت کے معاملے کی فکر۔ واللہ اعلم

اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ، لفظ اَوْلٰى وَيْل کا مقلوب ہے۔ ویل کے معنے ہلاکت اور بربادی ہیں یہاں اُس شخص کے لئے جس نے کفر و تکذیب ہی کو اپنا شعار بنائے رکھا اور دنیا کے مال و دولت میں مست رہا پھر اسی حال پر مر گیا اسکے لئے چار مرتبہ لفظ ہلاکت و بربادی استعمال کیا گیا کہ مرنیکے وقت پھر مرنے کے بعد قبر میں پھر حشر و نشر کے وقت پھر جہنم میں داخلے کے وقت یہ مصیبت و بربادی تیرا حصّہ ہے۔

اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ، یعنی کیا وہ ذات حق جس کے قبضۂ قدرت میں موت و حیات اور سارا جہان ہے کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مُردوں کو دوبارہ زندہ کر دے۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص سورۂ قیامہ کی اس آیت کی تلاوت کرے تو اُس کو یہ کلمات کہنا چاہیئے بلٰی وانا علٰی ذٰلك من الشّٰهدين۔ یعنی بلا شبہ وہ اس پر قادر ہے اور میں بھی ان لوگوں میں داخل ہوں جو اس کی گواہی دیتے ہیں۔ اس حدیث میں یہی الفاظ سورۂ والتین کی آخری آیت اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ پڑھنے کے وقت بھی کہنے کی تعلیم دی گئی ہے اور اسی حدیث میں یہ بھی فرمایا کہ جو شخص سورۂ مرسلٰت کی اس آیت پر پہنچے فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ تو اس کو اٰمنا باللہ کہنا چاہیئے۔

تمت سورۃ القیمۃ بحمد اللہ ۲۷ رجب سنہ ۱۳۹۱ھ

سُوْرَةُ الدَّهْرِ

سُوْرَةُ الدَّهْرِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اِحْدٰى وَّثَلٰثُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۂ دہر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی اکتیس آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ①

کبھی گزرا ہے انسان پر ایک وقت زمانے میں کہ نہ تھا وہ کوئی چیز جو زبان پر آتی

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا

ہم نے بنایا آدمی کو ایک دورنگی بوند سے ہم پلٹتے رہے اُسکو پھر کر دیا اسکو ہم نے سُننے

بَصِيْرًا ② اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ③ اِنَّا

والا دیکھنے والا ہم نے اسکو سجھائی راہ یا حق مانتا ہے اور یا ناشکری کرتا ہے ہم نے

اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَاۡ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا ④ اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ

تیار کر رکھی ہیں منکروں کے واسطے زنجیریں اور طوق اور آگ دہکتی البتہ نیک لوگ پیتے ہیں

مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ⑤ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ

پیالہ جس کی ملونی ہے کافور ایک چشمہ ہے جس سے پیتے ہیں بندے اللہ کے

يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا ⑥ يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ

چلاتے ہیں وہ اُس کی نالیاں پورا کرتے ہیں منت کو اور ڈرتے ہیں اُس دن سے کہ اس کی بُرائی

مُسْتَطِيْرًا ⑦ وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا

پھیل پڑے گی اور کھلاتے ہیں کھانا اُس کی محبت پر محتاج کو اور یتیم کو

وَّاَسِيْرًا ⑧ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ

اور قیدی کو ہم جو تم کو کھلاتے ہیں سو خالص اللہ کی خوشی چاہنے کو نہ تم سے ہم چاہیں بدلہ اور

لَا شُكُورًا ﴿٩﴾ إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا ﴿١٠﴾ فَوَقَاهُمُ

نہ چاہیں شکرگزاری ہم ڈرتے ہیں اپنے رب سے ایک دن اُداسی والے کی سختی سے پھر بچالیا ان کو

اللَّهُ شَرَّ ذَٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقَّاهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورًا ﴿١١﴾ وَجَزَاهُم بِمَا صَبَرُوا

اللہ نے بُرائی سے اُس دن کی اور ملا دی اُن کو تازگی اور خوش وقتی اور بدلہ دیا اُن کو اُن کے صبر پر

جَنَّةً وَحَرِيرًا ﴿١٢﴾ مُّتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ ۖ لَا يَرَوْنَ فِيهَا

باغ اور پوشاک ریشمی تکیہ لگائے بیٹھیں اُس میں تختوں کے اوپر نہیں دیکھتے وہاں

شَمْسًا وَلَا زَمْهَرِيرًا ﴿١٣﴾ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلَالُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا

دھوپ اور نہ ٹھر اور جُھک رہیں اُن پر اسکی چھائیں اور پست کر رکھے ہیں اسکے گچھے

تَذْلِيلًا ﴿١٤﴾ وَيُطَافُ عَلَيْهِم بِآنِيَةٍ مِّن فِضَّةٍ وَأَكْوَابٍ كَانَتْ

لٹکا کر اور لوگ لئے پھرتے ہیں اُن کے پاس برتن چاندی کے اور آبخورے جو ہو رہے ہیں

قَوَارِيرَا ﴿١٥﴾ قَوَارِيرَ مِن فِضَّةٍ قَدَّرُوهَا تَقْدِيرًا ﴿١٦﴾ وَيُسْقَوْنَ

شیشے کے شیشے ہیں چاندی کے ماپ رکھا ہے اُن کا ماپ اور اُن کو وہاں

فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنجَبِيلًا ﴿١٧﴾ عَيْنًا فِيهَا تُسَمَّىٰ سَلْسَبِيلًا ﴿١٨﴾

پلاتے ہیں پیالے جس کی ملونی ہے سونٹھ ایک چشمہ ہے اسمیں اسکا نام کہتے ہیں سلسبیل

وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ

اور پھرتے ہیں انکے پاس لڑکے سدا رہنے والے جب تو اُن کو دیکھے خیال کرے

لُؤْلُؤًا مَّنثُورًا ﴿١٩﴾ وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلْكًا كَبِيرًا ﴿٢٠﴾

کہ موتی ہیں بکھرے ہوئے اور جب تو دیکھے وہاں تو دیکھے نعمت اور سلطنت بڑی

عَالِيَهُمْ ثِيَابُ سُندُسٍ خُضْرٌ وَإِسْتَبْرَقٌ ۖ وَحُلُّوا أَسَاوِرَ مِن

اُوپر کی پوشاک اُن کی کپڑے ہیں باریک ریشم کے سبز اور گاڑھے اور اُن کو پہنائے جائیں گے کنگن

فِضَّةٍ وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا ﴿٢١﴾ إِنَّ هَٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً

چاندی کے اور پلائے اُن کو اُن کا رب شراب جو پاک کرے دل کو یہ ہے تمہارا بدلہ اور

وَكَانَ سَعْيُكُم مَّشْكُورًا ﴿٢٢﴾ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنزِيلًا ﴿٢٣﴾ ع ۲۲ ۱۹

کمائی تمہاری ٹھکانے لگی ہم نے اُتارا تجھ پر قرآن سہج سہج اُتارنا

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا ﴿٢٤﴾ وَاذْكُرِ اسْمَ

سو تو انتظار کر اپنے رب کے حکم کا اور کہنا مت مان اُن میں سے کسی گنہگار یا ناشکر کا اور لیتا رہ نام اپنے

رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿۲۵﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ﴿۲۶﴾

رب کا صبح اور شام اور کسی وقت رات کو سجدہ کر اُس کو اور پاکی بول اسکی بڑی رات تک

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ﴿۲۷﴾

یہ لوگ چاہتے ہیں جلدی ملنے والے کو اور چھوڑ رکھا ہے اپنے پیچھے ایک بھاری دن کو

نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ ۚ وَاِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا ﴿۲۸﴾

ہم نے اُن کو بنایا اور مضبوط کیا اُن کی جوڑ بندی کو اور جب ہم چاہیں بدل لائیں اُن جیسے لوگ بدل کر

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۲۹﴾ وَمَا

یہ تو نصیحت ہے پھر جو کوئی چاہے کر رکھے اپنے رب تک راہ اور تم نہیں

تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۳۰﴾ يُّدْخِلُ

چاہو گے مگر جو چاہے اللہ بیشک اللہ ہے سب کچھ جاننے والا، حکمتوں والا داخل کرلے

مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۳۱﴾

جس کو چاہے اپنی رحمت میں اور جو گنہگار ہیں تیار رہے ان کے واسطے عذاب دردناک

ع ۲ / ۹ / ۲۰

خلاصۂ تفسیر

بیشک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے جس میں وہ کوئی چیز قابل تذکرہ نہ تھا (یعنی انسان نہ تھا بلکہ نطفہ تھا اور اس سے قبل غذا اور اس سے پہلے عناصر کا جز تھا) ہم نے اس کو مخلوط نطفہ سے پیدا کیا (یعنی مرد اور عورت دونوں کے نطفے سے کیونکہ عورت کی منی بھی اندر ہی اندر عورت کے رحم میں گرتی ہے۔ پھر کبھی فم رحم سے خارج ہو کر ضائع ہو جاتی ہے اور کبھی اندر رہ جاتی ہے اور مخلوط کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ اجزاء مختلفہ سے مرکب ہے چنانچہ ترکیب منی کی اجزاء مختلفہ سے ظاہر ہے غرض ہم نے اس کو ایسے نطفہ سے پیدا کیا) اس طور پر کہ ہم اس کو مکلّف بنائیں تو (اسی واسطے) ہم نے اس کو سُنتا دیکھتا (سمجھتا) بنایا (اور چونکہ محاورہ میں سمیع و بصیر استعمالاً مخصوص ہے عاقل کے ساتھ اسلئے عقل دینے کی جو کہ مدار ہے مکلف ہونے کا تصریح نہیں فرمائی گئی مگر مراد وہ بھی ہے۔ مطلب یہ کہ ہم نے ایسی ہیئات و صفات کے ساتھ پیدا کیا کہ اسمیں احکام شرعیہ کا مکلف بننے کی قابلیت ہو، اس کے بعد جب مکلف ہونے کا وقت آگیا تو) ہم نے اس کو (بھلائی بُرائی پر مطلع کر کے) رستہ تبلایا (یعنی احکام کا مخاطب بنایا پھر) یا تو وہ شکر گزار (اور مؤمن) ہو گیا یا ناشکر (اور کافر) ہو گیا (یعنی جس رستہ پر چلنے کو اس کو کہا تھا جو اس پر چلا وہ مؤمن ہو گیا جو بالکل نہ چلا کافر ہو گیا۔ آگے فریقین کی جزاء کا ذکر ہے کہ) ہم نے کافروں کے لئے زنجیریں اور طوق اور آتش سوزاں تیار کر رکھی ہے (اور) جو نیک (لوگ) ہیں وہ ایسے جام شراب سے (شرابیں) پیویں گے

جس میں کافور کی آمیزش ہوگی یعنی ایسے چشمے سے (پیویں گے) جس سے خدا کے خاص بندے پئیں گے اور (جس کو وہ (خاص بندے جہاں چاہیں گے) بہا کر لے جائیں گے (اور یہ بہشتیوں کی ایک کرامت ہوگی کہ نہانے جنت ان کے تابع ہوگی جیساکہ درمنثور میں ابن شوذب سے مروی ہے کہ جنتیوں کے ہاتھ میں سونے کی چھڑیاں ہوں گی وہ چھڑیوں سے جس طرف اشارہ کردیں گے نہریں اُسی طرف چلنے لگیں گی۔ اور یہ کافور دُنیا کا کافور نہیں ہے بلکہ جنت کا کافور ہے جو سپیدی اور خُنکی اور تفریح و تقویتِ دل و دماغ میں اسکا مشارک ہے شراب میں خاص کیفیات حاصل کرنے کے لئے عادت ہے بعض مناسب چیزوں کے ملانے کی پس وہاں اس جام میں کافور ملایا جاویگا اور وہ جام شراب ایسے چشمے سے بھرا جاویگا جس سے مقرب بندے پیویں گے تو ظاہر ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کا ہوگا سو اس سے ابرار کی بشارت میں تقویت ہوگئی اور اگر ابرار و عباد اللہ کا مصداق ایک ہو تو دو جگہ بیان کرنے سے جُدا جُدا مقصود ہے ایک جگہ اس کی آمیزش بتلانا ہے دوسری جگہ اسکا کثیر و مسخّر ہونا کہ اسباب عیش کی کثرت اور تابع طبیعت ہونا لذتِ عیش کو بڑھا دیتا ہے۔ آگے ان ابرار کی صفات مذکور ہیں کہ) وہ لوگ واجبات کو پورا کرتے ہیں اور (ادا بھی کرتے ہیں خلوص سے کیونکہ وہ) ایسے دن سے ڈرتے ہیں جس کی سختی عام ہوگی (یعنی کم و بیش سب پر اس کی سختی کا اثر ہوگا مراد قیامت کا دن ہے الا من شاء اللہ تعالیٰ) اور (وہ لوگ ایسے مخلص ہیں کہ عبادات مالیہ میں بھی جس میں غالباً اخلاص کم ہوتا ہے کمال درجہ کا اخلاص رکھتے ہیں چنانچہ) وہ لوگ (محض) خدا کی محبت سے غریب اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (قیدی اگر مظلوم ہے کہ ظلماً قید کرلیا گیا تب تو اُس کی اعانت کا مستحسن ہونا ظاہر ہے اور اگر ظالم ہے کہ ظلم کی سزا میں قید ہوا ہے تو شدّتِ حاجت کے وقت اسکا اطعام بھی مستحسن ہے اور وہ لوگ کھانا کھلا کر زبان سے یا دل سے یُوں کہتے ہیں کہ) ہم تم کو محض خدا کی رضامندی کیلئے کھانا کھلاتے ہیں نہ ہم تم سے (اسکا عملی) بدلہ چاہیں اور نہ (اسکا قولی) شکریہ (چاہیں اور ہم خدا کی رضامندی کے لئے اسواسطے تم کو کھانا کھلاتے ہیں کہ) ہم اپنے رب کی طرف سے ایک سخت اور تلخ دن کا اندیشہ رکھتے ہیں (تو اُمید رکھتے ہیں کہ ان مخلصانہ اعمال کی بدولت اُس دن کی تلخی اور سختی سے محفوظ رہیں اور اس سے معلوم ہوا کہ خوفِ آخرت سے کوئی کام کرنا اخلاص اور ابتغاءِ مرضاۃ اللہ کے منافی نہیں) سو اللہ تعالیٰ انکو (اس اطاعت و اخلاص کی برکت سے) اس دن کی سختی سے محفوظ رکھے گا اور ان کو تازگی اور خوشی عطا فرمادیگا، (یعنی چہروں پر تازگی اور قلوب میں خوشی دیگا) اور ان کی پختگی (یعنی استقامت فی الدّین) کے بدلہ میں اُن کو جنّت اور ریشمی لباس دیگا اس حالت میں کہ وہ وہاں (جنّت میں) مسہریوں پر (آرام و عزت سے) تکیہ لگائے ہونگے (اور) نہ وہاں تپش (اور گرمی) پاویں گے اور نہ جاڑا (بلکہ فرحت بخش معتدل موسم ہوگا) اور یہ حالت ہوگی کہ (وہاں کے یعنی جنّت کے) درختوں کے سائے اُن (بہشتیوں) پر جھکے ہونگے (یعنی قریب ہونگے اور سایہ اسباب تنعم سے ہے۔ جنت میں آفتاب ماہتاب نہیں ہونگے تو پھر سایہ کا کیا مطلب ہے ہوسکتا ہے کہ

دوسرے اجسام نورانیہ کی روشنی سے سایہ مقصود ہو، اور فائدہ سایہ کا غالباً یہ ہے کہ حالات بدلتے رہیں، ایک حال کتنے بھی آرام و لذت کا ہو آخر کار اُس سے طبیعت اُکتا جاتی ہے) اور اُن کے میوے اُن کے اختیار میں ہونگے (کہ ہر وقت ہر طرح بلا مشقت لے سکیں گے) اور ان کے پاس (کھانے پینے کی چیزیں پہنچانے کے لئے) چاندی کے برتن لائے جاویں گے اور آبخورے جو شیشے کے ہوں گے (اور) وہ شیشے چاندی کے ہوں گے جن کو بھرنے والوں نے مناسب انداز سے بھرا ہوگا (یعنی اسمیں مشروب ایسے انداز سے بھرا ہوگا کہ نہ اسوقت کی خواہش میں کمی رہے اور نہ اس سے بچے کہ دونوں میں بے لطفی ہوتی ہے اور چاندی کے شیشے کے یہ معنی کہ سفیدی تو چاندی جیسی ہوگی اور شفافی شیشہ جیسی اور دُنیا کی چاندی میں آر پار نظر نہیں آتا اور شیشے میں یہاں ایسی سفیدی نہیں ہوتی پس یہ ایک عجیب چیز ہوگی) اور وہاں اُن کو (علاوہ جام شراب مذکورۂ بالا کے جس میں کافور کی آمیزش تھی اور بھی) ایسا جام شراب پلایا جاویگا جس میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی (کہ انتعاش حرارت غریزی اور منہ کا مزہ بدلنے کے لئے شراب میں اس کو بھی ملاتے تھے) یعنی ایسے چشمے سے جو وہاں ہوگا (اُن کو پلایا جاوے گا) جس کا نام (وہاں) سلسبیل (مشہور) ہوگا (مجموعہ مقام بالا اور مقام ہذا سے معلوم ہوتا ہے کہ چشمہ مذکورہ بالا کی شراب میں آمیزش کافور کی ہوگی اور اس چشمۂ مذکورہ مابعد کی شراب میں آمیزش زنجبیل کی ہوگی واللہ اعلم باسرارہ) اور انکے پاس (یہ چیزیں لیکر) ایسے لڑکے آمد و رفت کریں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے (اور وہ اسقدر حسین ہیں کہ) اے مخاطب اگر تو ان کو (چلتے پھرتے) دیکھے تو یوں سمجھے کہ موتی ہیں جو بکھر گئے ہیں (موتی سے تو تشبیہ صفائی اور اشراق میں اور بکھرے ہوئے کا وصف اُن کے چلنے پھرنے کے لحاظ سے جیسے بکھرے موتی منتشر ہو کر کوئی ادھر جا رہا ہے کوئی اُدھر جا رہا ہے اور یہ اعلیٰ درجہ کی تشبیہ ہے) اور (اُن مذکورہ اسباب تنعم میں انحصار نہیں بلکہ وہاں اور بھی ہر سامان اس افراط اور رفعت کیساتھ ہوگا کہ) اے مخاطب اگر تو اس جگہ کو دیکھے تو تجھ کو بڑی نعمت اور بڑی سلطنت دکھلائی دے (اور) اُن جنتیوں پر باریک ریشم کے سبز کپڑے ہونگے اور دبیز ریشم کے کپڑے ہونگے (کیونکہ ہر لباس میں جدا لطف ہے) اور ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جاویں گے (اس سورت میں تین جگہ چاندی کے سامان کا ذکر آیا ہے اور دوسری آیات میں سونے کا مگر دونوں میں تعارض نہیں کیونکہ دونوں طرح کا سامان ہوگا اور حکمت اسکی وہی تفنن اور تغیر طبائع و تنعمات کا ہے اور یہ شبہ کہ مردوں کو زیور معیوب ہے اسلئے مندفع ہے کہ ہر مقام کا مقتضا جدا ہے یہاں عیب ہونا وہاں عیب ہونے کو مستلزم نہیں) اور اُن کا رب (جو اُن کو شراب پینے کو دیگا جس کا اوپر ذکر آیا ہے تو وہ مثل شراب دُنیا کے ناپاک اور مزیل عقل و موجب خمار نہ ہوگی بلکہ اللہ تعالیٰ) ان کو پاکیزہ شراب پینے کو دیگا (جس میں نہ نجاست ہوگی اور نہ کدورت و ہذا کقولہ تعالیٰ لَا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ اور تین جگہ جو سورت میں ذکر شراب کا آیا ہے ہر جگہ غرض جدا ہے جیسا تقریر ترجمہ سے واضح ہے پھر اوّل میں یشربون ہے دوسری جگہ یُسْقَوْنَ جو زیادتِ اکرام و اعزاز پر دلالت کرتا ہے

تیسری جگہ سَقٰهُمْ رَبُّهُمْ میں نہایت ہی تشریف و تکریم ہے پس تکرار کا شائبہ نہ رہا۔ اور ان سب نعمتوں کو دے کر اہلِ جنت سے مسرت روحانی بڑھانے کے لئے کہا جاوے گا کہ) یہ تمہارا صلہ ہے اور تمہاری کوشش (جو دُنیا میں کیا کرتے تھے) مقبول ہوئی (آگے فریقین کی جزا کا ذکر کرنے کے بعد بطور تفریع معنوی کے آپ کو تسلّی دینے کا بیان ہے۔ یعنی ان مخالفین کی سزا آپ نے سُن لی، پس آپ اُن کی مخالفت سے غم نہ کیجئے اور اپنی عبادت اور دعوت و اصلاح کے کام میں لگے رہئے کہ علاوہ طاعت ہونے کے اسمیں قلب کی بھی تو تقویت ہے اور بیان اس طاعت کا یہ ہے کہ) ہم نے آپ پر قرآن تھوڑا تھوڑا کرکے اُتارا ہے (تاکہ تھوڑا تھوڑا لوگوں کو پہنچاتے رہیں اور انکو اس سے فائدہ اُٹھانے میں آسانی ہو جیساکہ سُورۂ اسراء کے آخر میں ہے وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ الخ) سو آپ اپنے پروردگار کے حکم پر (کہ اسمیں تبلیغ بھی داخل ہے) مستقل رہیئے اور اُن میں سے کسی فاسق یا کافر کے کہنے میں نہ آیئے (یعنی یہ جو تبلیغ سے منع کرتے ہیں کما فی الدر المنثور من سورۃ الکافرین، انکی موافقت نہ کیجئے، مقصود اس سے اظہار اہتمام شان ہے ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اُن کی موافقت کرنے کا کوئی احتمال ہی نہیں تھا یہ تو عبادتِ متعدیہ کا امر ہوا) اور (آگے عبادتِ لازمہ کا امر ہے یعنی) اپنے پروردگار کا صبح و شام نام لیا کیجئے اور کسی قدر رات کے حصے میں بھی اس کو سجدہ کیا کیجئے (یعنی نماز فرض پڑھا کیجئے) اور رات کے بڑے حصّے میں اُس کی تسبیح (و تقدیس) کیا کیجئے (مراد اس سے تہجد ہے علاوہ فرائض کے اور آگے تقویتِ تسلّی کے لئے ایک اور مضمون ہے جس میں کفار کی مذمّت بھی ہے یعنی ان لوگوں کی مخالفت کی اصل وجہ آپ کے ساتھ یہ ہے کہ) یہ لوگ دُنیا سے محبت رکھتے ہیں اور اپنے آگے (آنیوالے) ایک بھاری دن کو چھوڑ بیٹھے ہیں (پس حُبِّ دُنیا نے اندھا کر رکھا ہے اسلیئے حق کہنے سے بغض رکھتے ہیں اور یوم ثقیل کا ذکر سُنکر چونکہ احتمال اُن کے انکار کا تھا اسلئے آگے اُس یومِ ثقیل کے استبعاد کو دفع فرماتے ہیں یعنی) ہم ہی نے اُن کو پیدا کیا اور ہم ہی نے اُن کے جوڑ بند مضبوط کئے اور (نیز) جب ہم چاہیں اُن ہی جیسے لوگ ان کی جگہ بدل دیں (اور امرِ اوّل تو مشاہد ہے اور دوسرا امر ادنیٰ تنبیہ سے معلوم ہوسکتا ہے پس دونوں امروں سے قدرتِ الٰہیہ ظاہر ہے پھر مُردوں کو دوبارہ زندہ کرنے ہی میں کون بات زیادہ دشوار ہے کہ اس پر قدرت نہ ہو، آگے اُن تمام مضامین سابقہ پر بطور تفریع کے فرماتے ہیں کہ) یہ (سب جو مذکور ہوا کافی) نصیحت ہے سو جو شخص چاہے اپنے رب کی طرف راستہ اختیار کرلے (وقد مرّ فی المزمّل) اور (قرآن کے تذکرہ ہونے میں اس سے شبہ نہ کیا جاوے کہ بعض کو اس سے ہدایت نہیں ہوتی، بات یہ ہے کہ قرآن فی نفسہٖ تذکرہ اور ہدایت کافی ہے لیکن) بدون خدا کے چاہے تم لوگ کوئی بات چاہ نہیں سکتے (اور بعض لوگوں کے لئے خدا کے نہ چاہنے میں بعضی حکمتیں ہوتی ہیں کیونکہ) خدا تعالیٰ بڑا علم والا اور حکمت والا ہے وہ جس کو چاہے اپنی رحمت میں داخل کرلیتا ہے اور (جسکو چاہے کفر اور ظلم میں مبتلا رکھتا ہے پھر) ظالموں کے لئے اُس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

معارف و مسائل

سورۂ دہر کا نام سورۂ انسان اور سورۃ الابرار بھی ہے (روح) اسمیں تخلیق انسانی کی ابتدا و انتہا اور اعمال پر جزا و سزا قیامت اور جنت دوزخ کے خاص حالات نہایت بلیغ اور مؤثر انداز میں بیان ہوئے ہیں۔

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا، حرف ھل دراصل استفہام کے لئے آتا ہے اور بعض اوقات کسی بدیہی اور کھلی ہوئی چیز کو بصورت استفہام اس لئے تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ اسکا واضح ہونا اور مؤکد ہو جائے کہ جس سے پوچھو گے یہی جواب دیگا، دوسرا احتمال ہی نہیں جیسے کوئی شخص نصف النہار کے وقت کسی سے کہے کہ کیا یہ دن نہیں ہے اس کی صورت تو استفہام کی ہے مگر درحقیقت اُسکے انتہائی واضح ہونیکا بیان ہے۔ اسی لئے ایسے مواقع میں بعض حضرات نے فرمایا کہ اس جگہ حرف ھل بمعنے قد ہے جو تحقیق واقع کے لئے بولا جاتا ہے۔ بہر دو صورت مطلب آیت کا یہ ہے کہ انسان پر ایک زمانہ دراز ایسا گزرا ہے کہ دُنیا میں کہیں اسکا نام و نشان یہانتک کہ ذکر و تذکرہ تک نہ تھا۔ لفظ حِيْنٌ تنوین کے ساتھ ذکر کرنیسے اسوقت اور زمانے کی درازی کیطرف اشارہ ہے اور اس آیت میں یہ زمانہ دراز انسان پر گزرنا بیان فرمایا ہے جس میں اسکا فی الجملہ کسی نہ کسی طرح کا وجود ہونا لازمی ہے عدم محض کے زمانے کو تو انسان پر گزرنا نہیں کہا جا سکتا اس لئے اکثر حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اس زمانہ دراز سے جو انسان پر گزرا وہ زمانہ مراد ہے جو قرار حمل کے بعد سے پیدائش تک کا وقت ہے جو عادۃً نو مہینے ہوتے ہیں کہ اسمیں انسان کی تخلیق پر جتنے دُور گزرتے ہیں نطفہ سے لیکر جسم اور اعضاء اور پھر اُس میں روحِ حیات آنے تک وہ سب شامل ہیں۔ اس پورے زمانے میں اگرچہ اسکا وجود ایک طرح قائم ہو چکا ہے مگر نہ کوئی جانتا ہے کہ لڑکا ہے یا لڑکی نہ کوئی اسکا نام ہے نہ کسی کو اسکی شکل و صورت معلوم ہے اس لئے اسکا کہیں ذکر و تذکرہ تک نہیں ہے۔ اور اگر اس کو وسیع تر معنے دیئے جائیں تو تخلیقِ انسانی کی ابتدا جس طرح نطفہ سے سمجھی گئی ہے وہ نطفہ بھی جس غذا سے پیدا ہوا وہ غذا اور غذا سے پہلے اُس غذا کا مادہ کسی نہ کسی صورت سے دُنیا میں تھا اگر اُس زمانے کو بھی شامل کریں تو یہ زمانہ دراز ہزاروں سال کا ہو سکتا ہے۔ بہرحال حق تعالیٰ نے اس آیت میں انسان کو ایک ایسے امر کی طرف توجہ دلائی کہ اُسمیں ذرا بھی شعور ہو اور کچھ بھی غور کرے تو اُس کو اپنی حقیقت کے انکشاف کے ساتھ اپنے پیدا کرنے والے اور بنانے والے کے وجود اور علم و قدرت پر مکمل ایمان و یقین کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ اگر ایک ستّر برس کا انسان اسکا مراقبہ کرے اور اس پر غور کرے کہ اب سے اکہتّر سال پہلے اسکا کہیں نام و نشان نہیں تھا اور نہ اسکا کسی عنوان سے کوئی ذکر کر سکتا تھا۔ ماں باپ اور دادا دادی کے دل میں بھی اس کے مخصوص وجود کا کوئی خطرہ تک نہ تھا گو مطلق بچّہ کا تصوّر ہو۔ اسوقت کیا چیز اُس کی ایجاد و تخلیق کی داعی ہوئی اور کس محیر العقول قدرت نے دُنیا بھر میں

پھیلے ہوئے ذرّات کو اس کے وجود میں سمو کر اس کو ایک ہوشیار دانا، سمیع و بصیر انسان بنا دیا تو وہ بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور ہوگا ۔

ما نبودیم و تقاضا ما نبود ؛ لطف تو نا گفتہ ما می شنود

اس کے بعد تخلیق انسانی کی ابتدار کا بیان اس طرح فرمایا اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ یعنی ہم نے پیدا کیا انسان کو ایک مخلوط نطفہ سے اَمْشَاج، مَشَج یا مَشِیج کی جمع ہے جس کے معنے مخلوط کے آتے ہیں اور یہاں ظاہر یہ ہے کہ مرد و زن کا مخلوط نطفہ مُراد ہے جیسا کہ اکثر مفسّرین نے فرمایا ہے اور رُوح المعانی میں بعض مفسّرین سے نقل کیا ہے کہ امشاج سے مراد اخلاط اربعہ یعنی خون، بلغم، سودار، صفرار ہیں جن سے نطفہ مرکب ہوتا ہے۔

ہر انسان کی تخلیق میں دُنیا بھر کے اجزار اور ذرّات کی شمولیت

اور اگر غور کیا جائے تو یہ اخلاط اربعہ مذکورہ بھی اقسام غذا سے حاصل ہوتے ہیں اور ہر انسان کی غذا میں غور کیا جائے تو اسمیں دُور دراز ملکوں اور خطّوں کے اجزار آب و ہوا وغیرہ کے ذریعہ شامل ہوتے ہیں اس طرح ایک انسان کے موجودہ جسم کا تجزیہ اور تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایسے اجزار اور ذرّات کا مجموعہ ہے جو دُنیا کے گوشہ گوشہ میں بکھرے ہوئے تھے۔ قدرت کے نظام عجیب نے حیرت انگیز طریقہ پر اُن کو اس کے وجود میں سمویا ہے۔ اگر امشاج کا مطلب یہ لیا جائے تو اس جگہ لفظ امشاج کے ذکر سے منکرین قیامت کے سب سے بڑے شبہ کا ازالہ بھی ہو جائیگا کیونکہ ان خدا ناشناس لوگوں کے نزدیک قیامت قائم ہونے اور مُردوں کے دوبارہ زندہ ہونے میں سب سے بڑا اشکال یہی ہے کہ انسان مر کر مٹی اور پھر ریزہ ریزہ ہو کر دُنیا میں بکھر جاتا ہے ان کو دوبارہ جمع کرنا پھر انمیں رُوح ڈالنا اُن کے نزدیک گویا ناممکن ہے۔

امشاج بمعنے اخلاط کی تفسیر میں اُن کے اس شبہ کا ایک واضح جواب ہے کہ ابتدائی تخلیق انسانی میں بھی تو دُنیا بھر کے اجزار و ذرّات شامل تھے جس کو یہ ابتدائی تخلیق مشکل نہ ہوئی اُس کے لئے اسکا دوبارہ پیدا کرنا کیوں مشکل ہو گیا اور اس تفسیر پر لفظ امشاج کا اس جگہ اضافہ بھی ایک مستقل فائدہ کیلئے ہو سکتا ہے واللہ اعلم۔

نَّبْتَلِيْهِ ابتلار سے مشتق ہے جس کے معنی امتحان اور آزمائش کے ہیں یہ تخلیق انسانی کی غرض و حکمت کا بیان ہے کہ انسان کو اس شان کیساتھ پیدا کرنیکا مقصد اُس کی آزمائش ہے جسکا بیان اگلی آیتوں میں آیا ہے کہ ہم نے انبیأ اور آسمانی کتابوں کے ذریعہ اُس کو راستہ دکھلا دیا کہ یہ راستہ جنّت کی طرف اور دوسرا دوزخ کی طرف جاتا ہے اور اُسے اختیار دیدیا کہ ان میں سے جس کو چاہے اختیار کرے چنانچہ انمیں دو گروہ ہوگئے اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا یعنی ایک گروہ اُن لوگوں کا ہوا جنھوں نے اپنے پیدا کرنے والے اور نعمت دینے والے کو پہچان کر اسکا شکر ادا کیا اور اُس پر ایمان لایا دوسرا گروہ وہ ہوا جس نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی اور کافر رہا۔ اس کے بعد ان دونوں گروہوں کی جزا اور انجام کا ذکر فرمایا کہ کافروں کیلئے زنجیریں اور طوق اور جہنم ہے اور ابرار یعنی ایمان و طاعت کے پابند لوگوں کے لئے بڑی بڑی نعمتیں ہیں سب سے

پہلے پینے کی چیزوں کا ذکر فرمایا کہ اُن کو ایسا جامِ شراب دیا جائیگا جس میں کافور کی آمیزش ہوگی (یَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا) بعض مفسرین نے فرمایا کہ کافور جنت کے ایک چشمہ کا نام ہے اس شراب میں لذت وکیف بڑھانے کے لئے اُس چشمہ کا پانی شامل کیا جائیگا اور کافور کے مشہور معنے لئے جاویں تو یہ ضروری نہیں کہ جنت کا کافور بھی دُنیا کے کافور کی طرح ہو کھانے پینے کے قابل نہ ہو اس کافور کی خصوصیات جُدا ہوں۔

عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ لفظ عَيْنًا ترکیب نحوی میں کافورًا کا بدل بھی ہوسکتا ہے اس صورت میں یہ متعین ہوجاتا ہے کہ آیت مذکورہ میں کافور سے مراد چشمۂ جنت ہے اور عباد اللہ سے مُراد وہی اللہ کے نیک بندے ہیں جن کا ذکر پہلے ابرار کے عنوان سے کیا گیا ہے اور اگر عیناً کو من کاس سے بدل قرار دیں تو یہ کسی دوسرے چشمہ اور پانی کا بیان ہے اور اس صورت میں عباد اللہ سے مراد اہلِ جنت کی کوئی دوسری جماعت ہے جو ابرار سے کم درجہ میں ہیں۔

يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ، یہ بیان اسکا ہے کہ ابرار اور عباد اللہ کو یہ انعامات کس بنار پر ملیں گے۔ معنے یہ ہیں کہ یہ لوگ جس کام کی اللہ کے لئے نذر (منّت) مان لیتے ہیں اُس کو پُورا کرتے ہیں۔ نذر کے لفظی معنے یہ ہیں کہ آپ اپنے اوپر کوئی ایسا کام واجب کرلیں جو شریعت سے آپ کے ذمہ واجب نہیں ہے۔ ایسی نذر کو پورا کرنا شرعاً واجب ہوتا ہے جس کی کچھ تفصیل آگے آتی ہے۔ یہاں اہلِ جنت کی جزائے عظیم اور انعامات کا سبب ایفائے نذر کو قرار دیا ہے۔ اسمیں اشارہ اس کی طرف ہے کہ یہ لوگ جب اپنی طرف واجب کردہ چیزوں کی ادائیگی کا اہتمام کرتے ہیں تو جو فرائض و واجبات انکے اختیار سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کیطرف سے ان پر لازم کیئے گئے ہیں اُنکا اہتمام بدرجہ اولیٰ کرتے ہونگے۔ اس طرح لفظ ایفائے نذر میں درحقیقت تمام واجبات شرعیہ اور فرائض کی ادائیگی شامل ہوگئی اور انعامات جنت کا سبب مکمل اطاعت اور تمام فرائض و واجبات کو ادا کرنا ہوگا۔ بہرحال اس جملے سے ایفائے نذر کی اہمیت اور وجوب ثابت ہوا۔

مسئلہ۔ نذر (منت) کے منعقد ہونے کے لئے چند شرائط ہیں۔ اول یہ کہ جس کام کی نذر مانی جائے وہ جائز و حلال ہو معصیت نہ ہو۔ اگر کسی نے کسی گناہ اور ناجائز کام کی نذر مان لی تو اس پر لازم ہے کہ وہ ناجائز کام نہ کرے اپنی قسم کو توڑ دے اور قسم کا کفارہ ادا کرے، دوسری شرط یہ ہے کہ وہ اللہ کیطرف سے واجب نہ ہو اس لئے اگر کوئی شخص نماز فرض یا وتر واجب کی نذر مان لے تو یہ نذر لغو ہوگی وہ فرض یا واجب پہلے ہی سے اس پر واجب الاداء ہے۔

امام اعظم ابو حنیفہ رح کے نزدیک یہ بھی شرط ہے کہ جس کام کو بذریعہ نذر اپنے اوپر واجب کیا ہے اُس کی جنس سے کوئی عبادت شریعت میں واجب کی گئی ہو جیسے نماز روزہ صدقہ قربانی وغیرہ اور جسکی جنس سے شرعاً کوئی عبادت مقصود نہیں ہے اس کی نذر ماننے سے نذر لازم نہیں ہوتی جیسے کسی مریض کی عیادت یا جنازے کے پیچھے چلنا وغیرہ جو اگرچہ عبادات ہیں مگر عبادت مقصودہ نہیں، نذر و یمین کے

احکام کی تفصیل کتب فقہ میں دیکھی جائے۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا، یعنی اہل جنت کے یہ انعامات اس سبب سے بھی ہیں کہ وہ دُنیا میں مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے تھے عَلٰى حُبِّهٖ میں حرف علیٰ بمعنے مع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ ایسی حالت میں بھی غریبوں کو کھانا کھلاتے جبکہ وہ کھانا خود اپنے لئے بھی ان کو محبوب اور پسند ہے۔ یہی نہیں کہ اپنے سے زائد فالتو کھانا غریبوں کو دیدیں مسکین اور یتیم کو کھانا کھلانے کا عبادت و ثواب ہونا تو ظاہر ہے۔ قیدی سے مراد ظاہر ہے کہ وہ قیدی ہے جس کو اُصول شرعیہ کے مطابق قید میں رکھا گیا ہے خواہ وہ کافر ہو یا مسلمان مجرم۔ مگر بہر حال اسکا کھانا کھلانا حکومتِ اسلامی کی ذمہ داری ہے جو شخص اس کو کھانا کھلاتا ہے وہ گویا حکومت اور بیت المال کی اعانت کرتا ہے اسلئے قیدی چاہے کافر بھی ہو اسکو کھانا کھلانا ثواب ہوگا خصوصاً ابتدائے اسلام میں تو قیدیوں کا کھانا پینا اور انکی حفاظت عام مسلمانوں میں تقسیم کر کے انکے ذمہ کر دیجاتی تھی جیسے غزوۂ بدر کے قیدیوں کیساتھ معاملہ کیا گیا۔

قَوَارِيْرَا۟ مِنْ فِضَّةٍ، دُنیا میں چاندی کا برتن کثیف ہوتا ہے آئینہ کی طرح نہیں ہو سکتا اور جو کانچ سے تیار کیا جاتا ہے وہ چاندی نہیں ہو سکتا ان دونوں میں تضاد ہے مگر یہ جنت کی خصوصیت ہے کہ وہاں کی چاندی آئینہ کیطرح شفاف ہوگی۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جنت میں جتنی چیزیں ملیں گی اُن سب کی نظیر اور شبیہ دُنیا میں بھی ملتی ہیں سوائے ان گلاسوں اور برتنوں کے جن کی ساخت چاندی سے ہے مگر آئینہ کی طرح شفاف ہیں۔

وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا، زنجبیل کے معروف معنے سونٹھ کے ہیں اور عرب لوگ شراب میں اُس کی آمیزش کو پسند کرتے تھے اس لئے اس کو جنت میں بھی اختیار کیا گیا اور بعض حضرات نے فرمایا کہ جنت کی نعمتوں اور دُنیا کی چیزوں میں نام کے اشتراک کے سوا کوئی چیز مشترک نہیں اس لئے وہاں کی زنجبیل کو دُنیا کی زنجبیل پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

وَحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ، اساور، سوار کی جمع ہے کنگن کو کہا جاتا جو ہاتھوں میں پہننے کا زیور ہے اس آیت میں چاندی کے کنگن کا ذکر ہے اور ایک دوسری آیت میں اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ آیا ہے یعنی کنگن سونے کے، ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت چاندی کے کسی وقت سونے کے کنگن استعمال کئے جاویں یا بعض کے کنگن سونے کے ہوں بعض کے چاندی کے۔ مگر ایک سوال اس جگہ بہر حال ہے کہ چاندی کے کنگن ہوں یا سونے کے بہر حال یہ زیور ہیں جو عورتوں کے استعمال کے لئے ہوتے ہیں۔ مَردوں کے لئے ایسے زیور پہننا عیب سمجھا جاتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ کسی چیز کا عورتوں یا مردوں کے لئے مخصوص ہونا اور ان کیلئے مستحسن یا عیب ہونا یہ چیز عرف و عادت کے تابع ہوتی ہے بعض مُلکوں یا قوموں میں ایک چیز بڑی عیب اور بُری سمجھی جاتی ہے دوسری قوموں میں وہ بڑا حُسن سمجھا جاتا ہے۔ دُنیا میں ملوک کسریٰ ہاتھوں میں

کنگن اور سینے اور تاج میں زیورات استعمال کرتے تھے اور یہ اُن کا خاص امتیاز و اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ مُلک کسریٰ فتح ہونے کے بعد جو خزائن کسریٰ مسلمانوں کو ہاتھ آئے اُن میں کسریٰ کے کنگن بھی تھے۔ جب دُنیا کے مختلف مُلکوں اور قوموں کے معمولی جغرافیائی اور قومی تفاوت سے یہ معاملہ مختلف ہو سکتا ہے تو جنت کو دُنیا پر قیاس کرنے کے کوئی معنے نہیں ہو سکتا ہے کہ وہاں زیور مَردوں کے لئے بھی مستحسن سمجھا جائے۔

اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّ كَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ، یعنی اہلِ جنت کو جنت میں پہنچنے کے بعد حق تعالیٰ کیطرف سے خطاب ہوگا کہ جنت کی یہ محیر العقول نعمتیں سب تمھارے اُن اعمال کی جزاء ہے جو تم نے دُنیا میں کئے تھے اور تمھارے عمل اللہ کے نزدیک مقبول ہوگئے۔ یہ کلمات ان کو بطور مبارکباد کے کہے جائیں گے۔ اہلِ عشق و محبت سے پُوچھئے تو جنت کی ساری نعمتیں ایک طرف اور رب العالمین کا یہ فرمانا ایک طرف سب نعمتوں سے بڑھ کر ہے کہ اسمیں حق تعالیٰ ان کو اپنی رضاء کامل کی سند دے رہے ہیں۔ عام اہلِ جنت کے انعامات کا ذکر کرنے کے بعد خاص ان انعامات کا ذکر کیا گیا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر مبذول ہوئے اُن میں سب سے بڑا انعام تنزیل قرآن ہے اس انعامِ عظیم کا ذکر کرنے کے بعد اوّل تو آپ کو اس کی ہدایت کی گئی کہ مخالفین و کفار کی طرف سے جو ضد و انکار اور ان کی ایذاؤں کی تکلیف آپ کو پہنچتی ہے آپ اس پر صبر سے کام لیں۔ دوسرے اللہ کی عبادت کو دن رات کا مشغلہ بنائیں اسی سے کفار کی اذیت کا بھی ازالہ ہوگا۔

آخر میں معاند کفار کے کفر پر جمے رہنے کی وجہ تبلائی گئی کہ یہ جاہل دُنیا کی سطحی سرسری اور فانی لذتوں میں ایسے مست ہوگئے کہ انجام کو یعنی آخرت کو بھلا بیٹھے حالانکہ ہم نے دُنیا میں بھی خود اُن کے وجود میں ایسی چیزیں رکھی تھیں کہ انمیں غور کرتے تو اپنے خالق و مالک کو پہچانتے۔ مثلاً نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ یعنی ہمنے ہی اُن کو پیدا کیا اور انکے وجود کی صنعت میں ایک خاص کمال یہ رکھا کہ اُسکے جوڑ بند مضبوط و مستحکم بنائے۔

انسانی جوڑ بند میں کرشمۂ قدرت اسمیں اشارہ اس بات کیطرف ہے کہ انسان اپنے ایک ایک جوڑ بند پر نظر ڈالے کہ بتقاضائے حکمت و راحت انسانی جوڑ دیکھنے میں نرم و نازک معلوم ہوتے ہیں اور نرم نرم پٹھوں کے ذریعہ ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے ہیں جسکا طبعی تقاضا یہ تھا کہ سال دو سال ہی میں یہ جوڑوں کے بندھن اور اعصاب گھس جاتے اور ٹوٹ جاتے خصوصاً جبکہ دن رات وہ حرکت میں رہتے ہیں موڑے توڑے جاتے ہیں اتنی شبانہ روز حرکت کیساتھ تو لوہے کے اسپرنگ بھی سال دو سال میں گھس کر ٹوٹ جاتے ہیں یہ نرم و نازک پٹھے دیکھو کس طرح اعضاء کے جوڑوں کو باندھے ہوئے ہیں نہ گھستے ہیں نہ ٹوٹتے ہیں۔ انسان اپنے ہاتھ کی انگلیوں کے جوڑوں کو دیکھے اور حساب لگائے کہ عمر بھر میں ان جوڑوں نے کتنی حرکتیں کی ہیں کیسے کیسے زور اور دباؤ ان پر ڈالے گئے ہیں کہ اگر فولاد بھی ہوتا تو گھس گیا ہوتا مگر یہ جوڑ ہیں جو ستر اسّی سال چلنے پر بھی اپنی جگہ قائم ہیں۔ تبارک اللہ احسن الخالقین ؎

تمّت سُورَۃ الدّھر بحمد اللہ تعالیٰ

سُورَةُ الْمُرْسَلٰت

سُورَةُ الْمُرْسَلٰتِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ خَمْسُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سُورَۃ مُرسلات مکہ میں نازل ہوئی اور اسکی پچاس آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ۙ① فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ۙ② وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ۙ③ فَالْفٰرِقٰتِ

قسم ہے چلتی ہواؤں کی دل کو خوش آتی، پھر جھونکا دینے والیوں کی زور سے، پھر اُبھارنے والیوں کی اُٹھا کر، پھر پھاڑنے والیوں کی

فَرْقًا ۙ④ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ۙ⑤ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ۙ⑥ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ؕ⑦

بانٹ کر پھر فرشتوں کی جو اُتار کر لائیں وحی الزام اُتارنے کو یا ڈر سنانے کو مقرر جو تم سے وعدہ ہوا وہ ضرور ہونا ہے

فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۙ⑧ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ۙ⑨ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۙ⑩

پھر جب تارے مٹائے جائیں اور جب آسمان میں جھروکے پڑ جائیں اور جب پہاڑ اُڑا دیئے جائیں

وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ؕ⑪ لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ ؕ⑫ لِيَوْمِ الْفَصْلِ ۚ⑬ وَمَآ

اور جب رسولوں کا وقت مقرر ہو جائے کس دن کیواسطے ان چیزوں میں دیر ہے اس فیصلے کے دن کیواسطے اور تو نے

اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ ؕ⑭ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ⑮ اَلَمْ نُهْلِكِ

کیا بوجھا کیا ہے فیصلے کا دن خرابی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کی کیا ہم نے نہیں مار کھپایا

الْاَوَّلِيْنَ ؕ⑯ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ⑰ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ⑱

پہلوں کو پھر انکے پیچھے بھیجتے ہیں پچھلوں کو ہم ایسا ہی کیا کرتے ہیں گنہگاروں کے ساتھ

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ⑲ اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ⑳ فَجَعَلْنٰهُ

خرابی ہے اسدن جھٹلانے والوں کی کیا ہم نے نہیں بنایا تم کو ایک بے قدر پانی سے پھر رکھا اُس کو

فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۙ㉑ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۙ㉒ فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ㉓

ایک جمے ہوئے ٹھکانے میں ایک وعدہ مقرر تک پھر ہم اسکو پورا کر سکے سو ہم کیا خوب سکت والے ہیں

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۴﴾ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ﴿۲۵﴾ اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا ﴿۲۶﴾

خرابی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کی کیا ہم نے نہیں بنائی زمین سمیٹنے والی زندوں کو اور مُردوں کو

وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ﴿۲۷﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ

اور رکھے ہم نے زمین میں بوجھ کے لئے پہاڑ اونچے اور پلایا ہم نے تم کو پانی میٹھا پیاس بجھانے والا خرابی ہے اُس دن

لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۹﴾ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ

جھٹلانے والوں کی چل کر دیکھو جس چیز کو تم جھٹلاتے تھے چلو ایک چھاؤں میں

ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ﴿۳۰﴾ لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ﴿۳۱﴾ اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ

جس کی تین پھانکیں ہیں نہ گھری چھاؤں اور نہ کچھ کام آئے تپش میں وہ آگ پھینکتی ہے چنگاریاں

كَالْقَصْرِ ﴿۳۲﴾ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ﴿۳۳﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۴﴾ هٰذَا

جیسے محل گویا وہ اونٹ ہیں زرد خرابی ہے اُسدن جھٹلانے والوں کی یہ وہ

يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ

دن ہے کہ نہ بولیں گے اور نہ اُن کو حکم ہو کہ توبہ کریں خرابی ہے اُس دن

لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۷﴾ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ

جھٹلانے والوں کی یہ ہے دن فیصلے کا جمع کیا ہم نے تم کو اور اگلوں کو پھر اگر کچھ داؤ ہے تمہارا

كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ ﴿۳۹﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۰﴾ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ

تو چلا لو مجھ پر خرابی ہے اُسدن جھٹلانے والوں کی البتہ جو ڈرنے والے ہیں

فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۴۱﴾ وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۴۲﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا

وہ سایوں میں ہیں اور نہروں میں اور میوے جس قسم کے وہ چاہیں کھاؤ اور پیو مزے سے

بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَيْلٌ

بدلہ ان کاموں کا جو تم نے کئے تھے ہم یونہی دیتے ہیں بدلہ نیکی والوں کو خرابی ہے

يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۵﴾ كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۴۶﴾

اُس دن جھٹلانے والوں کی کھالو اور برت لو تھوڑے دنوں بیشک تم گنہگار ہو

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ﴿۴۸﴾

خرابی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کی اور جب کہئے ان کو کہ جھک جاؤ نہیں جھکتے

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۰﴾

خرابی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کی اب کس بات پر اس کے بعد یقین لائیں گے

ربع ۱ ۲۱

ع ۲ ۲۲

خلاصۂ تفسیر

قسم ہے اُن ہواؤں کی جو نفع پہنچانے کے لئے بھیجی جاتی ہیں پھر ان ہواؤں کی جو سختی سے چلتی ہیں (جس سے خطرات کا احتمال ہوتا ہے) اور ان ہواؤں کی جو بادلوں کو (اُٹھا کر) پھیلاتی ہیں (جس کے بعد بارش ہونے لگتی ہے) پھر ان ہواؤں کی جو بادلوں کو متفرق کر دیتی ہیں (جیسا بارش کے بعد ہوتا ہے) پھر ان ہواؤں کی جو (دل میں) اللہ کی یاد یعنی توبہ کا یا ڈرانے کا القار کرتی ہیں (یعنی یہ ہوائیں مذکورہ حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر دلالت کی وجہ سے خالق کائنات کی طرف متوجہ ہو جانے کا سبب ہو جاتی ہیں اور وہ توجہ دو طور سے ہوتی ہے ایک خوف سے جبکہ ان ہواؤں سے آثار خوف کے نمایاں ہوں اور دوسرا توبہ و معذرت سے اور یہ خوف و رجا کی دونوں صورتیں ہو سکتا ہے۔ اگر ہوائیں نفع بخش ہوں تب تو خدا کی نعمتوں کو یاد کر کے اسکا شکر اور اپنی تقصیرات سے عذر کرتے ہیں اور اگر وہ ہوائیں خوفناک ہوں تو خدا کے عذاب سے ڈر کر اپنے معاصی سے توبہ کرتے ہیں، آگے جواب قسم ہے) کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ ضرور ہونے والی ہے۔ (مراد قیامت ہے اور یہ سب قسمیں قیامت کے نہایت مناسب ہیں کیونکہ نفخۂ اُولیٰ کے بعد تمام عالم کی فنار کا واقعہ تیز آندھیوں کے مشابہ ہے اور نفخۂ ثانیہ کے بعد کے واقعات مُردوں کا زندہ ہونا وغیرہ مشابہ واقعات ہوائے نافع کے ہیں جس سے بارش اور بارش سے حیات نباتی اُبھرتی ہے۔ آگے اس کے وقوع پر تفریع فرماتے ہیں) سو جب ستارے بے نور ہو جاویں گے اور جب آسمان پھٹ جاویگا اور جب پہاڑ اُڑتے پھریں گے اور جب سب پیغمبر وقت معیّن پر جمع کئے جاویں گے (اسوقت سب کا فیصلہ ہوگا، آگے اس یوم کا ہولناک ہونا مذکور ہے کہ کچھ معلوم ہے) کس دن کے لئے پیغمبروں کا معاملہ ملتوی رکھا گیا ہے (آگے جواب ہے کہ) فیصلہ کے دن کے لئے (ملتوی رکھا گیا ہے، مطلب اس سوال و جواب کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ کفار جو رسُولوں کی تکذیب کرتے آئے ہیں اور اب بھی اس اُمت کے کفار رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کر رہے ہیں اور جب اس تکذیب پر عذابِ آخرت سے ڈرائے جاتے ہیں تو آخرت کی بھی تکذیب کرتے ہیں اور یہ تکذیب فی نفسہٖ مقتضی اس کو ہے کہ رسُولوں کا جو قصّہ کفار سے پیش آرہا ہے اس کا فیصلہ ابھی ہو جاوے اور اس کی تاخیر سے کفار کو مزید انکار و تکذیب کا موقع ملتا ہے اور مسلمانوں کو طبعی طور پر اسکے جلد ہو جانے کی خواہش ہوتی ہے پس اس آیت میں استعجال کا جواب ہے کہ حق تعالیٰ نے بعض حکمتوں سے اس کو مؤخر کر رکھا ہے لیکن واقع ضرور ہوگا) اور (آگے اُس فیصلہ کے دن کا ہولناک ہونا مذکور ہے کہ) آپ کو معلوم ہے کہ وہ فیصلہ کا دن کیسا کچھ ہے (یعنی بہت سخت ہے اور جو لوگ اس امرِ حق یعنی وقوعِ قیامت کو جھٹلا رہے ہیں سمجھ رکھیں کہ) اُس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی (آگے نظائر سابقہ کے ذریعہ موجودہ لوگوں کو ڈرانا ہے) کیا ہم اگلے (کافر) لوگوں کو (عذاب سے)

ہلاک نہیں کر چکے پھر پچھلوں کو بھی (عذاب میں) اُن (پہلوں) ہی کے ساتھ ساتھ کر دیں گے (یعنی آپ کی اُمت کے کفار پر بھی وبالِ ہلاکت نازل کریں گے جیسا بدر وغیرہ غزوات میں ہوا) ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کیا کرتے ہیں (یعنی اُن کے کفر پر سزا دیتے ہیں خواہ دارین میں خواہ دار آخرت میں، اور جو اس امرِ حق یعنی کفر پر مستحقِ عذاب ہونے کے کو جھٹلا رہے ہیں سمجھ رکھیں کہ) اُس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی (آگے وقوع قیامت اور احیاء موتیٰ کو ذہنوں کے قریب کرنے کے لئے فرمایا) کیا ہم نے تم کو ایک بے قدر پانی (یعنی نطفہ) سے نہیں بنایا (یعنی ابتدار میں تم نطفہ تھے) پھر ہمنے اسکو ایک وقت مقرر تک ایک محفوظ جگہ (یعنی عورت کے رحم) میں رکھا، غرض ہم نے (ان سب تصرفات کا) ایک اندازہ ٹھیرایا، سو ہم کیسے اچھے اندازہ ٹھیرانے والے ہیں (اس سے مُردوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر قدرت ثابت ہوئی، پھر جو لوگ اس امر حق یعنی قدرت علی البعث کو جھٹلا رہے ہیں سمجھ رکھیں کہ) اُس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی (آگے اپنی بعضی نعمتیں جن سے ترغیب اطاعت و ایمان ہو ذکر فرماتے ہیں یعنی) کیا ہم نے زمین کو زندوں اور مُردوں کی سمیٹنے والی نہیں بنایا (کہ زندگی اسی پر بسر ہوتی ہے مرنے کے بعد دفن اور غرق ہوجانے اور جلجانے کی صورت میں بالآخر مٹی ہوکر اجزار ارضیہ ہی میں کھپ جاتے ہیں اور اس حالت بعد الموت کا نعمت ہونا اس طرح ہے کہ اگر مُردے خاک نہ ہوجایا کرتے تو زندے پریشان ہوکر مُردہ سے بدتر ہوجاتے کہ اُن کو اپنے بسنے بلکہ چلنے پھرنے کی جگہ نہ ملتی) اور ہم نے اُس (زمین) میں اونچے اونچے پہاڑ بنائے (جن سے بہت سے منافع متعلق ہیں) اور ہم نے تم کو میٹھا پانی پلایا (اس نعمت کو خواہ مستقل کہا جاوے یا زمین ہی کے متعلق کہا جاوے کیونکہ مرکز پانی کا بھی زمین ہی ہے اور ان نعمتوں کا مقتضا وجوب توحید ہے۔ پس جو لوگ اس امر حق یعنی وجوب توحید کو جھٹلا رہے ہیں سمجھ رکھیں کہ) اُس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی (آگے قیامت کی بعض سزاؤں کا بیان ہے یعنی قیامت کے روز کفار سے کہا جائے گا کہ) تم اس عذاب کی طرف چلو جس کو جھٹلایا کرتے تھے (جس میں کی ایک سزا وہ ہے جسکا بیان اس حکم میں ہے کہ) ایک سائبان کی طرف چلو جس کی تین شاخیں ہیں جس میں نہ (ٹھنڈا) سایہ ہے اور نہ وہ گرمی سے بچاتا ہے (مراد اس سائبان سے ایک دُھواں ہے جو جہنم سے نکلے گا اور چونکہ کثرت سے ہوگا اسلئے بلند ہوکر پھٹ کر تین ٹکڑے ہوجاویں گے کما فی الطبری عن قتادۃ اور فراغ حساب تک کفار اسی دُھویں کے احاطہ میں رہیں گے جیسا کہ مقبولین ظلّ عرش میں ہوں گے کذا فی الخازن، آگے اس دُھویں کا اور حال مذکور ہے کہ) وہ انگارے برسا دیگا جیسے بڑے بڑے محل جیسے کالے کالے اونٹ (قاعدہ ہے کہ جب چنگاری آگ سے جھڑتی ہے تو بڑی ہوتی ہے۔ پھر بہت سے چھوٹے ٹکڑے ہوکر زمین پر گرتی ہے پس پہلی تشبیہ ابتدائی حالت کے اعتبار سے ہے اور دوسری تشبیہ انتہائی حالت کے اعتبار سے۔ کذا فی الروح، پھر

جو لوگ اس امرِ حق یعنی اس واقعہ کو جھٹلا رہے ہیں سمجھ رکھیں کہ) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی (آگے اور واقعہ متعلق کفار ہے یعنی) یہ وہ دن ہوگا جس میں وہ لوگ نہ بول سکیں گے اور نہ ان کو اجازت (عذر پیش کرنے کی) ہوگی سو عذر بھی نہ کرسکیں گے (کیونکہ واقع میں کوئی معقول عُذر ہوگا ہی نہیں، اور جو لوگ اس واقعہ حقہ کو بھی جھٹلا رہے ہیں سمجھ رکھیں کہ) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی (آگے بھی اسی یوم کا بیان ہے کہ ان لوگوں سے کہا جاویگا کہ) یہ ہے فیصلہ کا دن (جس کی تم تکذیب کیا کرتے تھے) ہم نے (آج) تم کو اور اگلوں کو (فیصلے کے لئے) جمع کرلیا سو اگر تمھارے پاس (آج کے نتیجے اور فیصلے سے بچنے کی) کوئی تدبیر ہو تو مجھ پر تدبیر چلالو (اور یہ کفار اس واقعہ حقہ کی بھی تکذیب کرتے ہیں سو سمجھ رکھیں کہ) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی (آگے کفار کے مقابلے میں اہلِ ایمان کے ثواب کا بیان ہے یعنی) پرہیزگار لوگ سایوں میں اور چشموں میں اور مرغوب میووں میں ہوں گے (اور ان سے کہا جاوے گا کہ) اپنے اعمال (نیک) کے صلہ میں خوب مزے سے کھاؤ پیو ہم نیک لوگوں کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں (اور یہ کفار نعمائے جنت کی بھی تکذیب کرتے ہیں سو سمجھ رکھیں کہ) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی (آگے پھر توبیخ و تنبیہ ہے کفار کو، یعنی اے کافرو!) تم (دُنیا میں) تھوڑے دن اور کھا لو اور برت لو (عنقریب کمبختی آنے والی ہے کیونکہ) تم بیشک مجرم ہو (اور مجرم کا یہی حال ہونے والا ہے اور جو لوگ سزائے جُرم کو جھٹلاتے ہیں سمجھ رکھیں کہ) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی اور (ان کافروں کی سرکشی اور جُرم کی یہ حالت ہے کہ) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (خدا کی طرف) جُھکو (یعنی ایمان اور عبدیت اختیار کرو) تو نہیں جُھکتے (اس سے زیادہ کیا جرم ہوگا اور یہ لوگ اسکے جرم ہونے کو بھی جھٹلاتے ہیں سو سمجھ رکھیں کہ) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی (اور ان تقریعات و تہدیدات قرآنیہ کا مقتضا یہ تھا کہ سُنتے ہی ڈر کر ایمان لے آتے مگر جب اس پر بھی ان کو اثر نہیں) تو پھر اس (قرآن بلیغ الالفاظ والانذار) کے بعد اور کونسی بات پر ایمان لاویں گے (اسمیں کفار پر توبیخ اور اُن کے ایمان سے آپ کو مایوس کرنا ہے)

معارف و مسائل

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ سے روایت ہے کہ ہم رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیساتھ منیٰ کے ایک غار میں تھے اچانک سورۂ مُرسلات نازل ہوئی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس کو پڑھتے جاتے تھے اور میں آپ کے مبارک منھ سے اس کو سُنتا یاد کرتا جاتا تھا، آپ کا دہن مبارک اس سورۃ کی حلاوت سے رطب (شاداب) ہو رہا تھا اچانک ایک سانپ نے ہم پر حملہ کیا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل کا حکم دیا، ہم اُس کی طرف جھپٹے وہ نِکل بھاگا۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

کہ جس طرح تم اسکے شر سے محفوظ رہے وہ بھی تمھارے شر سے محفوظ ہو گیا (ابن کثیر)

اس سورت میں حق تعالیٰ نے چند چیزوں کی قسمیں کھا کر قیامت کے یقینی طور پر آنے کا ذکر فرمایا ہے، ان چیزوں کا نام قرآن میں بیان نہیں کیا گیا البتہ ان کی اس جگہ پانچ صفتیں بیان فرمائی ہیں۔ مُرسلات، عاصفات ناشرات، فارقات، مُلقیٰت الذکر۔ کسی حدیث مرفوع میں اس کی پوری تعیین نہیں آئی کہ ان صفات کے موصوفات کیا ہیں اس لئے صحابہ و تابعین کی تفسیریں اس معاملے میں مختلف ہو گئیں۔

بعض حضرات نے ان پانچوں صفات کا موصوف فرشتوں کو قرار دیا ہے اور یہ کہ ہو سکتا ہے کہ فرشتوں کی مختلف جماعتیں ان مختلف صفات کی حامل ہوں۔ بعض حضرات نے ان صفات کا موصوف ہواؤں کو قرار دیا ہے وہ بھی مختلف اقسام اور نوعیت کی ہوتی ہیں، اس لئے یہ صفات مختلفہ اُن میں ہو سکتی ہیں۔ بعض حضرات نے ان کا موصوف خود انبیاء و رُسل کو قرار دیا ہے۔ ابن جریر طبری نے اسی لئے اس معاملے میں توقف اور سکوت کو اسلم قرار دیا کہ احتمال دونوں ہیں ہم اپنی طرف سے کسی کو متعین نہیں کرتے۔

اور اسمیں شبہ نہیں کہ جو پانچ صفات اس جگہ ذکر کی گئی ہیں اُن میں سے بعض تو ملائکۃ اللہ پر زیادہ چسپاں اور اُن کے مناسب ہیں ان کو ریاح کی صفت بنائیں تو کھینچ تان اور تاویل کرنا پڑتی ہے، اور بعض صفات ایسی ہیں جو ریاح یعنی ہواؤں پر زیادہ چسپاں اور واضح ہیں اُن کو فرشتوں کی صفت بنائیں تو تاویل کے بغیر نہیں بنتی۔ اسلئے اس مقام میں بہتر فیصلہ ابن کثیرؒ کا معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ شروع کی تین صفات ہواؤں کی صفتیں ہیں ان تین میں ریاح اور ہواؤں کی قسم ہو گئی باقی آخری دو صفتیں یہ فرشتوں کی صفات ہیں تو یہ فرشتوں کی قسم ہو گئی۔

ریاح کی صفت قرار دینے میں آخری دو صفتوں میں جو تاویل کیجاتی ہے وہ آپ خلاصۂ تفسیر میں دیکھ چکے ہیں کیونکہ اُس میں اسی کو اختیار کر کے تفسیر کی گئی ہے۔ اسی طرح جن حضرات نے ان سب صفات کو صفات ملائکہ قرار دیا ہے ان کو پہلی تین صفات یعنی مُرسلات عاصفات ناشرات کو فرشتوں پر چسپاں کرنے کے لئے اسی طرح کی تاویلات سے کام لینا پڑا ہے۔ ابن کثیر کے اختیار کے مطابق معنی ان آیتوں کے یہ ہو گئے کہ قسم ہے ان ہواؤں کی جو بھیجی جاتی ہیں۔ عُرفاً، یہاں عُرفاً کا مفہوم وہ بھی ہو سکتا ہے جو خلاصۂ تفسیر میں اوپر مذکور ہوا یعنی جود وسخا اور نفع رسانی۔ جو ہوائیں بارش لیکر آتی ہیں اُن کی جود وسخا اور نفع رسانی ظاہر ہے۔ اور دوسرے معنے عرفاً کے متتابع یعنی پے در پے کے بھی آتے ہیں۔ یہ معنے لئے جاویں تو مراد وہ ہوائیں ہونگی جو بادل اور بارش کو لئے ہوئے مُسلسل اور متتابع چلتی ہیں۔ اور عاصفات عصف سے مشتق ہے جس کے لُغوی معنی ہوا کے تیز چلنے کے ہیں اس سے مراد وہ آندھیاں اور تیز ہوائیں ہیں جو بعض اوقات دُنیا میں آیا کرتی ہیں۔ اور ناشرات سے مراد وہ ہوائیں ہیں جو بارش ختم ہونے کے بعد بادل کو پھاڑ کر منتشر کر دیتی ہیں۔ اور فارقات، یہ صفت فرشتوں کی ہے جو وحی الٰہی نازل کر کے حق وباطل میں

فرق واضح کر دیتے ہیں اور مُلقیات ذکراً بھی فرشتوں کی صفت ہے اور ذکر سے مراد قرآن یا مطلق وحی ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ قسم ہے اُن فرشتوں کی جو بذریعہ وحی حق و باطل میں فرق اور امتیاز واضح کر دیتے ہیں اور قسم ہے اُن فرشتوں کی جو انبیاء علیہم السلام پر ذکر یعنی وحی اور قرآن کا القاء کرتے ہیں۔ اس طرح کسی صفت میں تاویل اور کھینچ تان کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

رہا یہ سوال کہ اس تفسیر کی بناء پر پہلے ہواؤں کی مختلف اقسام کی قسم کھائی گئی پھر فرشتوں کی، ان دونوں میں ربط اور جوڑ کیا ہے سو کلام الٰہی کی حکمتوں کا احاطہ تو کوئی کر نہیں سکتا، یہ مناسبت بھی ہوسکتی ہے کہ ہواؤں کی دونوں قسمیں بارش والی نفع بخش، اور سخت آندھیاں مضرت رساں یہ سب محسوسات میں سے ہیں ہر شخص اُن کو پہچانتا ہے پہلے غور و فکر کے لئے انسان کے سامنے ان کو لایا گیا، اس کے بعد فرشتوں اور وحی کو پیش کیا گیا جو محسوس نہیں مگر ذرا سے غور و فکر کرنے پر اُن کا یقین ہوسکتا ہے۔

عُذْرًا اَوْ نُذْرًا یہ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا سے متعلق ہے کہ یہ ذکر اور وحی انبیاء علیہم السلام پر اسلئے نازل کی جائے گی کہ وہ اہلِ حق مومنین کے لئے اُن کی کوتاہیوں سے معذرت کا سبب بنے اور اہلِ باطل کفار کے لئے نذیر اور عذاب سے ڈرانے والا ثابت ہو۔

ہواؤں یا فرشتوں یا دونوں کی قسم کھا کر حق تعالیٰ نے فرمایا اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ، یعنی تم سے جس قیامت اور حساب و کتاب جزاء و سزا کا وعدہ بذریعہ انبیاء کیا جا رہا ہے وہ ضرور پورا اور واقع ہو کر رہے گا۔ آگے اس کے واقع ہونے کے وقت کے چند حالات کا ذکر ہے اول یہ کہ سب ستارے بے نور ہو جائیں گے جس کی یہ صورت بھی ہوسکتی ہے کہ یہ سب بالکلیہ فنا ہی ہو جاویں، یا یہ کہ موجود رہیں مگر ان کا نور سلب ہو جائے، اس طرح پوری دُنیا ایک انتہائی سخت اندھیری میں غرق ہو جائے گی۔ دوسرا حال یہ بیان فرمایا کہ آسمان پھٹ جائیں گے۔ تیسرا یہ کہ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اُڑتے پھریں گے۔ چوتھا حال یہ بتلایا گیا وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ، اُقِّتَتْ، توقیت سے مشتق ہے جس کے اصلی معنے تعیین وقت اور تحدید وقت کے ہیں اور بقول زمخشری کبھی اسکے معنے کسی مقررہ وقت پر پہنچ جانے کے بھی آتے ہیں (کما فی الروح) اس جگہ یہی دوسرے معنے مناسب ہیں اور معنے آیت کے یہ ہونگے کہ انبیاء و رسل کے لئے جو میعاد اور وقت مقرر کیا گیا تھا کہ اسمیں اپنی اپنی اُمتوں کے معاملے میں شہادت کے لئے حاضر ہوں وہ اس میعاد کو پہنچ گئے اور اُن کی حاضری کا وقت آگیا۔ اسی لئے خلاصہ تفسیر مذکور میں اسکا ترجمہ انبیاء کے جمع کرنے کے ساتھ کیا گیا۔ آگے قیامت کے دن کے عظیم اور ہولناک ہونے کا بیان ہے کہ وہ فیصلہ کا دن ہے جس میں مکذبین اور کفار کے لئے تباہی بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ کے یہی معنی ہیں۔ وَیل کے معنے ہلاکت و بربادی کے ہیں اور بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ وَیل جہنم کی ایک وادی کا نام ہے جس میں اہلِ جہنم کے زخموں کی پیپ

جمع ہو گی یہ جگہ مکذبین کے رہنے کی قرار دی جاوے گی۔ اس کے بعد موجودہ لوگوں کو پچھلی اُمتوں کے حالات سے عبرت حاصل کرنے کے لئے فرمایا اَلَمۡ نُهۡلِكِ الۡاَوَّلِيۡنَ ۝ ثُمَّ نُتۡبِعُهُمُ الۡاٰخِرِيۡنَ یعنی کیا ہم نے پہلے لوگوں کو اُن کے کفر و عناد کی وجہ سے ہلاک نہیں کر دیا۔ قوم عاد و ثمود اور قوم لوط قوم فرعون وغیرہ کی طرف اشارہ ہے اور ثُمَّ نُتۡبِعُهُمُ الۡاٰخِرِيۡنَ مشہور معروف[1] قرارت کے مطابق بسکونِ عین عطف ہے نُهۡلِكۡ پر جس کے معنی یہ ہیں کیا ہم نے اوّلین کے بعد آخرین کو بھی انکے پیچھے ہلاک نہیں کر دیا، اس لئے آخرین سے مراد بھی پچھلی اُمتوں ہی کے آخرین ہوں گے جن کی ہلاکت نزولِ قرآن سے پہلے واقع ہو چکی ہے اور دوسری ایک قرارت میں نُتۡبِعُهُمۡ بضم عین بھی آیا ہے اس قرارت پر یہ جملہ الگ ہے اور آخرین سے مراد اُمتِ محمدیہ کے کفار ہیں۔ پچھلی اُمتوں کی ہلاکت اور عذاب کی خبر دینے کے بعد موجودہ کفار اہلِ مکہ کو آئندہ ان پر آنے والے عذاب کی خبر دینا مقصود ہے جیسا کہ غزوہ بدر وغیرہ میں مسلمانوں کے ہاتھوں ان پر عذاب ہلاکت نازل ہوا۔

فرق یہ ہے کہ پچھلی اُمتوں پر آسمانی عذاب آتا تھا جس سے پوری بستیاں تباہ ہو جاتی تھیں۔ اُمتِ محمدیہ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے یہ اکرام خاص ہے کہ ان کے کفار پر آسمانی عذاب نہیں آتا بلکہ ان کا عذاب مسلمانوں کی تلوار سے آتا ہے جسمیں ہلاکت عام نہیں ہوتی صرف بڑے بڑے سرکش مجرم ہی مارے جاتے ہیں۔

اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ كِفَاتًا ۝ اَحۡيَآءً وَّاَمۡوَاتًا ، یعنی ہم نے زمین کو کفات بنایا ہے زندہ اور مُردہ انسانوں کے لئے، کفات، کفت سے مشتق ہے جس کے معنے ملانے اور جمع کر لینے کے ہیں کفات وہ چیز جو بہت سی چیزوں کو اپنے اندر جمع کرے۔ زمین کو حق تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ زندہ انسان اسکی پیٹھ پر سوار ہیں اور مُردے سب اسکے پیٹ میں جمع ہیں۔

اِنَّهَا تَرۡمِىۡ بِشَرَرٍ كَالۡقَصۡرِ ۝ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفۡرٌ ، قصر کے معنی بڑا عالیشان محل۔ اور جمالۃ بمعنے جمل اونٹ کو کہا جاتا ہے۔ صُفۡرٌ، اصفر کی جمع ہے جس کے معنے زرد کے ہیں۔ مُراد آیت کی یہ ہے کہ اس جہنم کی آگ سے اتنے بڑے بڑے شرارے اُٹھیں گے جو ایک مستقل محل عالیشان کی برابر ہوں گے پھر وہ متفرق ہو کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہوں گے وہ ٹکڑے زرد اونٹوں کی برابر ہونگے اور بعض حضرات نے اس جگہ صُفر کا ترجمہ سیاہ کیا ہے کیونکہ زرد اونٹ کی زردی سیاہی مائل ہوتی ہے (روح)

هٰذَا يَوۡمُ لَا يَنۡطِقُوۡنَ ۝ وَلَا يُؤۡذَنُ لَهُمۡ فَيَعۡتَذِرُوۡنَ ، یعنی اس دن میں کوئی بول نہ سکے گا اور نہ کسی کو اپنے کئے ہوئے عمل کا عذر پیش کرنے کی اجازت ہو گی، اور دوسری آیات قرآن میں جو

---

[1] اس مقام پر حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ سے تسامح ہوا ہے، کیونکہ مشہور و معروف قرارت سکونِ عین کی نہیں ہے ضمِ عین کی ہے، جیسا کہ کتب قرارت دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، سکونِ عین کی قرارت درحقیقت شاذ ہے ۱۲ محمد عبداللہ

کفار کا بولنا اور عذر پیش کرنا مذکور ہے وہ اس کے منافی نہیں کیونکہ محشر میں مختلف مواقف اور مقامات آئیں گے کسی مقام میں کلام اور عذر پیش کرنا ممنوع ہوگا، کسی میں اجازت ہوگی ۔ (روح)

كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ، یعنی کھاؤ پیو اور آرام اُٹھا لو تھوڑے دن کیونکہ تم مجرم ہو، آخر کار سخت عذاب میں جانا ہے ۔ یہ مکذبین کو خطاب ہے دُنیا میں، انبیاء کے ذریعہ اُن کو کہا گیا ہے کہ یہ تمھارا عیش و آرام چند روزہ ہے پھر عذاب ہی عذاب ہے (کذا فسرہ ابو حیان)

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ، یہاں اکثر مفسرین کے نزدیک رکوع سے مراد اُسکے لُغوی معنی یعنی جُھکنا اور اطاعت کرنا ہے مطلب یہ ہے کہ جب دُنیا میں اُن کو احکامِ الٰہیہ کی اطاعت کے لئے کہا جاتا تھا تو یہ اطاعت نہ کرتے تھے ۔ اور بعض حضرات نے رکوع کے اصطلاحی معنے بھی مراد لئے ہیں اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ جب ان کو نماز کی طرف بلایا جاتا تھا تو یہ نماز نہ پڑھتے تھے ۔ رکوع بول کر پوری نماز مراد لی گئی ہے (روح)

فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ، یعنی جب یہ لوگ قرآن جیسی عجیب و غریب بلیغ اور حکمتوں سے پُر واضح دلائل کی کتاب پر ایمان نہ لائے تو اس کے بعد اب کس بات پر ایمان لائیں گے مراد انکے ایمان سے مایوسی کا اظہار ہے ۔ حدیث میں ہے کہ جب تلاوت کرنے والا اس آیت پر پہنچے تو اسکو کہنا چاہیے اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ، یعنی ہم اللہ پر ایمان لے آئے ۔ نماز سے خارج میں اور نوافل میں یہ الفاظ کہنے چاہئیں مگر فرائض میں اور سُنن میں اس زیادتی سے احتراز کرنا روایاتِ حدیث سے ثابت ہے اس لئے اُس میں نہ کہا جائے ، واللہ اعلم

تمت سورة المرسلت بحمد الله لآخر يوم من رجب ۱۳۹۱ھ وبہ

تم الجزء التاسع والعشرون من القرآن والله الموفق لاتمام الباقی

سُورَةُ النَّبَإِ

سُوْرَةُ النَّبَاِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اَرْبَعُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۂ نبا مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چالیس آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ① عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ② الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ③

کیا بات پوچھتے ہیں لوگ آپس میں پوچھتے ہیں اس بڑی خبر سے جس میں وہ مختلف ہیں

كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ④ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ⑤ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ⑥

ہرگز نہیں اب جان لیں گے پھر بھی ہرگز نہیں اب جان لیں گے کیا ہم نے نہیں بنایا زمین کو بچھونا

وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ⑦ وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ⑧ وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ⑨ وَّ

اور پہاڑوں کو میخیں اور تم کو بنایا ہم نے جوڑے جوڑے اور بنایا نیند کو تمہاری تکان دفع کرنے کے لئے اور

جَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ⑩ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ⑪ وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا

بنایا رات کو اوڑھنا اور بنایا دن کمائی کرنے کو اور چُنی ہم نے تم سے اوپر سات

شِدَادًا ⑫ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ⑬ وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً

چُنائی مضبوط اور بنایا ایک چراغ چمکتا ہوا اور اُتارا نچڑنے والی بدلیوں سے پانی کا

ثَجَّاجًا ⑭ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ⑮ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ⑯ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ

ریلا تاکہ ہم نکالیں اس سے اناج اور سبزہ اور باغ پتوں میں لپٹے ہوئے بیشک دن فیصلہ کا ہے

كَانَ مِيْقَاتًا ⑰ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ⑱ وَّفُتِحَتِ

ایک وقت ٹھہرا ہوا جس دن پھونکی جائے صُور پھر تم چلے آؤ جُٹ کے جُٹ اور کھولا جائے

السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ⑲ وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ⑳ اِنَّ جَهَنَّمَ

آسمان تو ہو جائیں اس میں دروازے اور چلائے جائیں گے پہاڑ تو ہو جائیں گے چمکتا ریتا بیشک دوزخ ہے

كَانَتْ مِرْصَادًا ﴿٢١﴾ لِّلطَّاغِينَ مَآبًا ﴿٢٢﴾ لَّابِثِينَ فِيهَآ أَحْقَابًا ﴿٢٣﴾ لَا يَذُوقُونَ

تاک میں شریروں کا ٹھکانا رہا کریں اس میں قرنوں نہ چکھیں

فِيهَا بَرْدًا وَلَا شَرَابًا ﴿٢٤﴾ إِلَّا حَمِيمًا وَغَسَّاقًا ﴿٢٥﴾ جَزَآءً وِفَاقًا ﴿٢٦﴾ إِنَّهُمْ كَانُوا

وہاں کچھ مزہ ٹھنڈک کا اور نہ پینا ملے کچھ مگر گرم پانی اور بہتی پیپ بدلہ ہے پورا ان کو توقع

لَا يَرْجُونَ حِسَابًا ﴿٢٧﴾ وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كِذَّابًا ﴿٢٨﴾ وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ

نہ تھی حساب کی اور جھٹلاتے تھے ہماری آیتوں کو مکرا کر اور ہر چیز ہم نے گن رکھی ہے

كِتَابًا ﴿٢٩﴾ فَذُوقُوا فَلَن نَّزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا ﴿٣٠﴾ إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا ﴿٣١﴾

لکھ کر اب چکھو کہ ہم نہ بڑھاتے جائیں گے تم پر مگر عذاب بیشک ڈر والوں کو ان کی مراد ملنی ہے

حَدَآئِقَ وَأَعْنَابًا ﴿٣٢﴾ وَكَوَاعِبَ أَتْرَابًا ﴿٣٣﴾ وَكَأْسًا دِهَاقًا ﴿٣٤﴾ لَّا يَسْمَعُونَ

باغ ہیں اور انگور اور نوجوان عورتیں ایک عمر کی سب اور پیالے چھلکتے ہوئے نہ سنیں گے

فِيهَا لَغْوًا وَلَا كِذَّابًا ﴿٣٥﴾ جَزَآءً مِّن رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ﴿٣٦﴾ رَّبِّ

وہاں بک بک اور نہ مکرانا بدلہ ہے تیرے رب کا دیا ہوا حساب سے جو رب ہے

السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمَٰنِ لَا يَمْلِكُونَ مِنْهُ خِطَابًا ﴿٣٧﴾

آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے بڑی رحمت والا قدرت نہیں کہ کوئی اس سے بات کرے

يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَآئِكَةُ صَفًّا لَّا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ

جس دن کھڑی ہو روح اور فرشتے قطار باندھ کر کوئی نہیں بولتا مگر جس کو حکم دیا

الرَّحْمَٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴿٣٨﴾ ذَٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ فَمَن شَآءَ اتَّخَذَ

رحمٰن نے اور بولا بات ٹھیک وہ دن ہے برحق پھر جو کوئی چاہے بنا رکھے

إِلَىٰ رَبِّهِ مَآبًا ﴿٣٩﴾ إِنَّآ أَنذَرْنَاكُمْ عَذَابًا قَرِيبًا يَوْمَ يَنظُرُ الْمَرْءُ

اپنے رب کے پاس ٹھکانا ہم نے خبر سنا دی تم کو ایک آفت نزدیک آنیوالی کی جس دن دیکھ لے گا آدمی

مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ وَيَقُولُ الْكَافِرُ يَا لَيْتَنِي كُنتُ تُرَابًا ﴿٤٠﴾

جو آگے بھیجا اسکے ہاتھوں نے اور کہے گا کافر کسی طرح میں مٹی ہوتا

خلاصۂ تفسیر

یہ (قیامت کا انکار کرنے والے) لوگ کس چیز کا حال دریافت کرتے ہیں اس بڑے واقعہ کا حال دریافت کرتے ہیں جس میں یہ لوگ (اہلِ حق کیساتھ) اختلاف کر رہے ہیں (مراد قیامت ہے اور دریافت کرنے سے مراد بطور انکار کے دریافت کرنا ہے اور مقصود اس سوال و جواب سے اذہان کا ادھر متوجہ کرنا اور تفسیر بعد الابہام سے

اُسکا اہتمام شان ظاہر کرنا ہے، آگے اُن کے اختلاف کا بے وجہ اور باطل ہونا بیان کیا گیا ہے کہ جیسا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ قیامت نہ آوے گی) ہرگز ایسا نہیں (بلکہ قیامت آوے گی اور) ان کو ابھی معلوم ہوا جاتا ہے (یعنی جب دُنیا سے رخصت ہونے کے بعد اُن پر عذاب واقع ہوگا تب حقیقت اور حقیت قیامت کی منکشف ہو جاوے گی اور ہم) پھر (مکرر کہتے ہیں کہ جیسا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ قیامت نہ آوے گی) ہرگز ایسا نہیں (بلکہ آوے گی اور) اُن کو ابھی معلوم ہوا جاتا ہے (اور چونکہ وہ لوگ اِس کو مستبعد یا محال سمجھتے ہیں، آگے اسکے امکان اور وقوع کا بیان ہے کہ اس کو محال سمجھنے سے ہماری قدرت کا انکار لازم آتا ہے اور ہماری قدرت کا انکار نہایت عجیب ہے کیونکہ) کیا ہم نے زمین کو فرش اور پہاڑوں کو (زمین کی) میخیں نہیں بنایا (یعنی مثل میخوں کے بنایا، جیسا کسی چیز میں میخیں لگا دینے سے وہ چیز اپنی جگہ سے نہیں ہلتی اسی طرح زمین کو پہاڑوں سے مستقر کر دیا اس کی تحقیق سورۂ نحل میں گزر چکی ہے اور (اس کے علاوہ ہم نے اور بھی دلائل قدرت ظاہر فرمائے چنانچہ) ہم ہی نے تم کو جوڑا جوڑا (یعنی مرد و عورت) بنایا اور ہم ہی نے تمہاری نیند کو راحت کی چیز بنایا اور ہم ہی نے رات کو پردہ کی چیز بنایا اور ہم ہی نے دن کو معاش کا وقت بنایا اور ہم ہی نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے اور ہم ہی نے (آسمان میں) ایک روشن چراغ بنایا (مراد آفتاب ہے لقولہ تعالیٰ وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا) اور ہم ہی نے پانی بھرے بادلوں سے بہت پانی برسایا تاکہ ہم اس پانی کے ذریعہ سے غلّہ اور سبزی اور گنجان باغ پیدا کریں (اور ان سب سے ہمارا کمالِ قدرت ظاہر ہے پھر قیامت پر ہمارے قادر ہونے کا کیوں انکار کیا جاتا ہے - یہ بیان تھا امکان کا آگے وقوع کا ذکر ہے کہ) بیشک فیصلہ کا دن ایک معین وقت ہے یعنی جس دن صُور پھونکا جاویگا پھر تم لوگ گروہ گروہ ہو کر آؤگے (یعنی ہر اُمّت جُدا جُدا ہوگی، پھر مؤمن جُدا، کافر جُدا، پھر ابرار جُدا، اشرار جدا، سب ایک دوسرے سے ممتاز ہو کر میدانِ قیامت میں حاضر ہونگے) اور آسمان کُھل جاویگا پھر اسمیں دروازے ہی دروازے ہو جاویں گے (یعنی اسقدر بہت سا کُھل جاویگا جیسے بہت سے دروازے ملا کر بہت بڑی جگہ کُھلی ہوتی ہے پس کلام مبنی ہے تشبیہ پر، اب یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ دروازے تو آسمان میں اب بھی ہیں پھر اس دن دروازے ہونے کے کیا معنی، اور یہ کُھلنا نزولِ ملائکہ کے لئے ہوگا جیسے سورۂ فرقان میں تَشَقَّقُ السَّمَآءُ سے تعبیر فرمایا ہے اور اس کی شرح وہاں گزری ہے) اور پہاڑ (اپنی جگہ سے) ہٹادیئے جائیں گے سو وہ ریت کی طرح ہو جاویں گے (کقولہ تعالیٰ کَثِيبًا مَّهِيلًا - اور یہ واقعات نفخۂ ثانیہ کے وقت ہوں گے البتہ تسییر جبال میں یہاں بھی اور جہاں جہاں واقع ہوا ہے دونوں احتمال ہیں یا تو نفخۂ ثانیہ کے بعد کہ اس سے عالم کی سب چیزیں اپنی ہیئت پر عود کر آویں گی، جب حساب کا وقت آویگا پہاڑوں کو زمین کے برابر کر دیا جاویگا تاکہ زمین پر کوئی آڑ پہاڑ نہ رہے سب ایک ہی میدان میں نظر آویں، اور یا یہ نفخۂ اولیٰ کا وقت ہوگا جس سے خود فنا کرنا مقصود بالذات ہوگا، پھر اس تقدیر پر یوم کو ان سب واقعات کا ظرف فرمانا اس بنا پر ہوگا کہ نفخۂ اولیٰ سے نفخۂ ثانیہ تک کا مجموعہ ایک یوم قرار دے لیا گیا واللہ اعلم

آگے اس یوم الفصل میں جو فیصلہ ہوگا اسکا بیان ہے یعنی) بیشک دوزخ ایک گھات کی جگہ ہے (یعنی عذاب کے فرشتے انتظار اور تاک میں ہیں کہ کافر آویں تو اُن کو پکڑتے ہی عذاب دینے لگیں اور وہ) سرکشوں کا ٹھکانا (ہے) جس میں وہ بے انتہا زمانوں (پڑے) رہیں گے (اور) اس میں نہ تو وہ کسی ٹھنڈک (یعنی راحت) کا مزہ چکھیں گے (اس سے زمہریر یعنی سخت سردی کی نفی نہیں ہوئی) اور نہ پینے کی چیز کا (جس سے پیاس بجھے) بجز گرم پانی اور پیپ کے یہ (ان کو) پورا بدلہ ملیگا (اور وہ اعمال جن کا یہ بدلہ ہے یہ ہیں کہ) وہ لوگ حساب (قیامت) کا اندیشہ نہ رکھتے تھے اور وہ ہماری (اُن) آیتوں کو (جن میں حساب و دیگر اُمور حقہ کی خبر تھی) خوب جھٹلاتے تھے اور ہم نے (اُن کے اعمال میں سے) ہر چیز کو (انکے نامۂ اعمال میں) لکھ کر محفوظ کر رکھا ہے سو (ان اعمال پر ان کو مطلع کر کے کہا جاویگا کہ اب اُن اعمال کا) مزہ چکھو کہ ہم تم کو سزا ہی بڑھاتے چلے جائینگے (یہ تو کافروں کا فیصلہ ہوا آگے اہل ایمان کا فیصلہ مذکور ہے کہ) خدا سے ڈرنے والوں کے لئے بیشک کامیابی ہے یعنی (کھانے اور سیر کو) باغ (جن میں طرح طرح کے میوے ہونگے) اور انگور (یہ تخصیص بعد التعمیم اہتمام شان کیلئے ہے) اور (دل بہلانے کو) نوخاستہ ہم عمر عورتیں ہیں اور (پینے کو) لبالب بھرے ہوئے جام شراب (اور) وہاں نہ کوئی بیہودہ بات سُنیں گے اور نہ جھوٹ (کیونکہ یہ باتیں وہاں محض معدوم ہیں) یہ (ان کو اُن کی نیکیوں کا) بدلہ ملے گا جو کہ کافی انعام ہوگا آپ کے رب کی طرف سے جو مالک ہے آسمانوں اور زمین کا اور اُن چیزوں کا جو دونوں کے درمیان میں ہیں (اور جو) رحمان ہے (اور) کسی کو اس کی طرف سے (مستقل) اختیار نہ ہوگا کہ (اُس کے سامنے) عرض معروض کر سکے جس روز تمام ذی ارواح اور فرشتے (خدا کے روبرو) صف بستہ (خشوع و خضوع کے ساتھ) کھڑے ہونگے (اُس روز) کوئی بول نہ سکے گا بجز اسکے جسکو رحمان (بولنے کی) اجازت دیدے اور وہ شخص بات بھی ٹھیک کہے (ٹھیک بات سے مراد وہ بات جس کی اجازت دی گئی ہے یعنی بولنا بھی محدود و مقید ہوگا، یہ نہیں کہ جو چاہے بولنے لگے اور مستقل اختیار سے اور یہی مُراد ہے، آگے اوپر کے تمام مضامین کا خلاصہ ہے کہ) یہ (دن جسکا اوپر ذکر ہوا) یقینی دن ہے سو جسکا جی چاہے (اسکے حالات سُنکر) اپنے رب کے پاس (اپنا) ٹھکانا بنا رکھے (یعنی نیک عمل کرے کہ وہاں نیک ٹھکانا ملے، آگے اتمام حجت ہے کہ لوگو) ہم نے تم کو ایک نزدیک آنے والے عذاب سے ڈرا دیا ہے (جو کہ ایسے دن میں واقع ہونے والا ہے) جس دن ہر شخص ان اعمال کو (اپنے سامنے حاضر) دیکھ لے گا جو اُس نے اپنے ہاتھوں کئے ہوں گے اور کافر (حسرت سے) کہے گا کہ کاش میں مٹی ہو جاتا (تاکہ عذاب سے بچتا، اور یہ اُسوقت کہے گا جب چوپائے جانور مٹی کر دیئے جاویں گے، رواہ فی الدر عن ابی ہریرۃ رضؓ -)

معارف و مسائل

عَمَّ يَتَسَاۗءَلُوْنَ لفظ عَمَّ دو حرفوں سے مرکب عن اور ما حرف ما استفہام کے لئے آتا ہے۔

اس ترکیب میں حرف مَا میں سے الف ساقط کر دیا گیا ہے معنے یہ ہوئے کہ یہ لوگ کس چیز میں باہمی سوال و جواب کر رہے ہیں، پھر خود ہی اسکا جواب دیا گیا عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ الَّذِیْ هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ، لفظ نَباء کے معنے خبر کے ہیں مگر ہر خبر کو نَبار نہیں بلکہ جب کوئی عظیم الشان خبر ہو اُس کو نبار کہا جاتا ہے مراد اس نبا یعنی خبر عظیم الشان سے قیامت ہے اور معنے آیت کے یہ ہیں کہ یہ لوگ اہلِ مکہ اس عظیم الشان خبر یعنی قیامت کے بارے میں بحث اور سوال جواب کر رہے ہیں جس میں انکے آپس میں اختلاف ہو رہا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ جب قرآن کریم نازل ہونا شروع ہوا تو کفارِ مکہ اپنی مجلسوں میں بیٹھ کر اسکے متعلق رائے زنی اور چہ میگوئیاں کیا کرتے تھے۔ قرآن میں قیامت کا ذکر اہمیت کیساتھ آیا ہے اور انکے نزدیک گویا یہ محال چیز تھی اسلئے اسمیں گفتگو بکثرت چلتی تھی، کوئی تصدیق کرتا کوئی انکار، اسلئے اس سورت کے شروع میں انکا یہ حال ذکر کر کے آگے قیامت کا واقع ہونا مذکور ہے اور اُن کے نزدیک جو اسکے واقع ہونیمیں اشکال اور استبعاد تھا اسکا جواب دیا گیا۔ اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہ سوال جواب کوئی واقعی تحقیق کیلئے نہیں تھا بلکہ محض استہزاء و تمسخر کے لئے تھا واللہ اعلم، قرآن کریم نے انکے جواب میں ایک ہی جملہ کو تاکید کے لئے دو مرتبہ فرمایا کَلَّا سَیَعْلَمُوْنَ ثُمَّ کَلَّا سَیَعْلَمُوْنَ، کَلَّا کے معنی ہیں ہرگز نہیں، مراد یہ ہے کہ یہ سوال و جواب اور بحث و تحقیق سے سمجھ میں آنے والی چیز نہیں، وہ تو جب سامنے آوے گی اُس وقت حقیقت معلوم ہوگی۔ یہ ایک ایسی یقینی چیز ہے جسمیں بحث و سوال اور انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ پھر فرمایا کہ اس کی حقیقت خود ان لوگوں پر عنقریب واضح ہو جائے گی یعنی مرنے کے بعد ان کو دوسرے عالم کی چیزوں کا انکشاف ہوگا اور وہاں کے ہولناک مناظر کو آنکھوں سے دیکھ لیں گے اسوقت حقیقت کھل جائے گی۔ اسکے بعد حق تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ اور حکمت و صنعت کے چند مناظر کا ذکر فرمایا ہے جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ سے یہ کوئی بعید نہیں کہ وہ اس سارے عالم کو ایک مرتبہ فنا کر کے دوبارہ پھر ویسا ہی پیدا کر دے، اس میں زمین اور اس کے پہاڑوں کی تخلیق پھر انسان کی تخلیق مرد و عورت کے جوڑے کی صورت میں بیان فرمائی پھر انسان کی راحت اور صحت اور کاروبار کے لئے سازگار حالات پیدا کرنے کا ذکر فرمایا، اسمیں ایک یہ ارشاد ہے جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا، سُبات سبت سے مشتق ہے جس کے معنی مونڈنے اور قطع کرنے کے ہیں، نیند کو حق تعالیٰ نے ایسی چیز بنایا ہے کہ وہ انسان کے تمام ہموم و غموم اور افکار کو قطع کر کے اسکے قلب کو دماغ کو ایسی راحت دیتی ہے کہ دُنیا کی کوئی راحت اسکا بدل نہیں ہو سکتی، اسی لئے سُبات کا ترجمہ بعض حضرات نے راحت سے بھی کیا ہے۔

نیند بہت بڑی نعمت ہے | یہاں حق تعالیٰ نے انسان کو جوڑے جوڑے بنانے کا ذکر فرمانے کے بعد اس کی راحت کے سب سامانوں میں سے خاص طور پر نیند کا ذکر فرمایا ہے۔ غور کیجئے تو یہ ایک ایسی عظیم الشان نعمت ہے کہ انسان کی ساری راحتوں کا مدار یہی ہے اور اس نعمت کو حق تعالیٰ نے پوری مخلوق کے لئے عام ایسا فرما دیا ہے کہ امیر، غریب، عالم، جاہل، بادشاہ اور مزدور سب کو یہ دولت یکساں بیک وقت عطا ہوتی ہے، بلکہ

دُنیا کے حالات کا تجزیہ کریں تو غریبوں اور محنت کشوں کو یہ نعمت جیسی حاصل ہوتی ہے وہ مالداروں اور دُنیا کے بڑوں کو نصیب نہیں ہوتی، اُن کے پاس راحت کے سامان، راحت کا مکان، ہوا اور سردی گرمی کے اعتدال کی جگہ، نرم گدّے تکیئے سب کچھ ہوتے ہیں جو غریبوں کو بہت کم ملتے ہیں مگر نیند کی نعمت ان گدّوں تکیوں یا کوٹھی بنگلوں کی فضا کے تابع نہیں، وہ تو حق تعالیٰ کی ایک نعمت ہے جو براہِ راست اُس کی طرف سے ملتی ہے۔ بعض اوقات مفلس بے سامان کو بغیر کسی بستر تکیئے کے کھُلی زمین پر یہ نعمت فراوانی سے دیدی جاتی ہے اور بعض اوقات ساز و سامان والوں کو نہیں دی جاتی، اُن کو خواب آور گولیاں کھا کر حاصل ہوتی ہے اور بعض اوقات وہ گولیاں بھی کام نہیں کرتیں، پھر غور کرو کہ اس نعمت کو حق تعالیٰ نے جیسا ساری مخلوق انسان اور جانور کے لئے عام فرمایا ہے اور مفت بلا محنت سب کو دیا ہے اس سے بڑی نعمت یہ ہے کہ صرف مفت بلا محنت ہی نہیں بلکہ اپنی رحمتِ کاملہ سے اس نعمت کو جبری بنا دیا ہے کہ انسان بعض اوقات کام کی کثرت سے مجبور ہو کر چاہتا ہے کہ رات بھر جاگتا ہی رہے مگر رحمتِ حق جلّ شانہٗ اس پر جبراً نیند مسلّط کر کے اس کو سُلا دیتی ہے کہ دن بھر کا تکان دُور ہو جائے اور اُس کے قویٰ مزید کام کے لئے تیز ہو جائیں، آگے اسی نیند کی عظیم نعمت کا تکملہ یہ بیان فرمایا کہ وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا، یعنی رات کو ہم نے چھپانے کی چیز بنا دیا، اشارہ اس طرف ہے کہ انسان کو فطرۃً نیند اُس وقت آتی ہے جب روشنی زیادہ نہ ہو، ہر طرف سکون ہو، شور شغب نہ ہو۔ حق تعالےٰ نے رات کو لباس یعنی اوڑھنے اور چھپانے کی چیز فرما کر اشارہ کر دیا کہ قدرت نے محض صرف نیند کی کیفیت ہی عطا نہیں فرمائی بلکہ سارے عالم میں ایسے حالات پیدا کر دیئے جو نیند کے لئے سازگار ہوں - اوّل رات کی تاریکی، دوسرے پورے عالم انسان اور جانور سب پر بیک وقت نیند کا مسلّط ہونا کہ جب سبھی سو جائیں گے تو پورے عالم میں سکون ہوگا ورنہ دوسرے کاموں کی طرح اگر نیند کے اوقات بھی مختلف لوگوں کے مختلف ہوا کرتے تو کسی کو بھی نیند کے وقت سکون میسّر نہ آتا۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا، وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا کہ انسان کی راحت و سکون کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کو غذا وغیرہ کی ضروریات ملیں ورنہ وہ نیند موت ہو جائے گی۔ اگر ہمہ وقت رات ہی رہتی اور آدمی سوتا ہی رہتا تو یہ چیزیں کیسے حاصل ہوتیں، ان کے لئے جدّ و جہد اور محنت اور دوڑ دھوپ کی ضرورت ہے جو روشنی میں ہو سکتی ہیں اس لئے فرمایا کہ تمھاری راحت کو مکمل کرنے کے لئے ہم نے صرف رات اور اسکی تاریکی ہی نہیں بنائی بلکہ ایک روشن دن بھی دیا جس میں تم کاروبار کر کے اپنی معاشی ضروریات حاصل کر سکو، فتبارک اللہ احسن الخالقین، اس کے بعد انسان کی راحت کے اس سامان کا ذکر ہے جو آسمان سے متعلق ہیں اُن میں سب سے بڑی نفع بخش چیز آفتاب کی روشنی ہے اسکا ذکر فرمایا وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا یعنی ہمنے آفتاب کو ایک روشن بھڑکنے والا چراغ بنا دیا، پھر آسمان کے نیچے جو چیزیں انسان کی راحت کے لئے پیدا فرمائیں اُن میں سب سے زیادہ ضرورت کی چیز پانی برسانے والے بادل ہیں انکا ذکر فرمایا

وَّاَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡمُعۡصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا، مُعۡصِرٰت، مُعۡصِرَہ کی جمع ہے جو پانی سے بھرے ہوئے ایسے بادل کو کہا جاتا ہے جو برسنے ہی والا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ بارش بادلوں سے نازل ہوتی ہے اور جن آیات میں آسمان سے نازل ہونے کا ذکر ہے یا تو اُن میں بھی آسمان سے مراد فضائے آسمانی ہو جیسے کہ قرآن میں بکثرت لفظ سمار اس معنی کے لئے آیا ہے اور یا یہ کہا جائے کہ کسی وقت براہِ راست آسمان سے بھی بارش آسکتی ہے اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں، ان تمام صنائع قدرت اور انعاماتِ ربانی کا ذکر فرمانے کے بعد پھر اصل مضمون قیامت کی طرف رجوع ہے۔

اِنَّ یَوۡمَ الۡفَصۡلِ کَانَ مِیۡقَاتًا، یعنی فیصلہ کا دن جس سے مراد قیامت ہے وہ ایک موقت اور متعین حد ہے جس پر یہ دُنیا ختم ہو جائے گی جبکہ صُور پھُونکا جائے گا، اور دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ نفخ صُور دو مرتبہ ہوگا، پہلے نفخہ سے سارا عالم فنا ہو جائے گا، دوسرے نفخہ سے پھر زندہ وقائم ہو جائیگا، اس دوسرے نفخہ کے وقت سارے عالم کے اگلے پچھلے انسان اپنے رب کے سامنے فوج در فوج ہو کر حاضر ہونگے۔ حضرت ابوذر غفاری رضؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ سلم نے فرمایا کہ لوگ قیامت کے روز تین فوجوں میں تقسیم ہوں گے، ایک فوج اُن لوگوں کی ہوگی جو پیٹ بھرے ہوئے لباس پہنے ہوئے سواریوں پر سوار میدانِ حشر میں آئیں گے، دوسری فوج پیادہ لوگوں کی ہوگی جو چل کر میدان میں آئیں گے، تیسری فوج اُن لوگوں کی ہوگی جن کو چہروں کے بل گھسیٹ کر میدانِ حشر میں لایا جائے گا (مظہری بروایت نسائی وحاکم وبیہقی) بعض روایات میں افواج کی تشریح دس قسم کی افواج سے کی گئی ہے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ حاضرینِ محشر کی بیشمار جماعتیں اپنے اپنے اعمال وکردار کے اعتبار سے ہونگی، ان اقوال میں کوئی تضاد نہیں، سب جمع ہو سکتے ہیں۔

وَّسُیِّرَتِ الۡجِبَالُ فَکَانَتۡ سَرَابًا، سُیِّرَتۡ سے مراد یہ ہے کہ پہاڑ جو آج ثبات وقرار میں بطور مثال کے پیش کئے جاتے ہیں یہ سب اپنی اپنی جگہوں کو چھوڑ کر ریزہ ریزہ ہو کر اُڑتے پھرنے لگیں گے، سَراب کے لفظی معنے ذہاب یعنی چلے جانیکے ہیں، جنگل کا وہ ریت جو دُور سے چمکتا ہوا پانی کی صورت میں نظر آتا ہے اسکو بھی سراب اسی بنار پر کہتے ہیں کہ وہ قریب پہنچتے ہی نظر سے جاتا رہتا ہے (کذا فی الصحاح والراغب)

اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتۡ مِرۡصَادًا، مِرۡصَاد، وہ جگہ جہاں بیٹھ کر کسی کی نگرانی یا انتظار کیا جائے، جہنم سے مراد اس جگہ جسر جہنم یعنی پُل صراط ہے۔ یہاں ثواب دینے والے اور عذاب دینے والے دونوں فرشتے انتظار کرتے ہوں گے اہلِ جہنم کو عذاب کے فرشتے پکڑلیں گے اور اہلِ جنت کے ساتھ ثواب کے فرشتے اُن کو اُن کے مقام پر پہنچا دیں گے (مظہری)

حضرت حسن بصری رحؒ نے فرمایا کہ جہنم کے پُل پر نگراں فرشتوں کی چوکی ہوگی جس کے پاس جنت میں جانیکا پروانہ ہوگا، اسکو گزرنے دیا جائیگا جس کے پاس نہ ہوگا اسکو روک لیا جائے گا (قرطبی)

لِلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا، ظاہر یہ ہے کہ لِلطّٰغِيْنَ، مَاٰبًا کے متعلق ہے اور یہ اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ کی دوسری خبر ہے، اس طرح معنے دونوں جملوں کے یہ ہوئے کہ جسر جَهَنَّمَ تو ہر نیک و بد کے لئے انتظار گاہ ہے سبھی کو اس کے اوپر سے گزرنا ہے اور جہنم طاغین کے لئے مستقر اور ٹھکانا ہے۔ طاغین طاغی کی جمع ہے طغیان سے مشتق ہے جس کے معنے ہیں سرکشی اور طاغی اس شخص کو کہا جاتا ہے جو سرکشی اور نافرمانی میں حد سے گزر جائے اور یہ جبھی ہو سکتا ہے جبکہ وہ ایمان کی حد سے نکل جائے اسلئے طاغین سے مراد اس جگہ کفار ہونگے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد وہ بدعقیدہ گمراہ مسلمانوں کے فرقے ہوں جو قرآن و سنت کی حدود سے نکلے ہوئے ہیں اگرچہ صراحۃً کفر اختیار نہیں کیا جیسے روافض، خوارج، معتزلہ وغیرہ (کمافی المظہری)

لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا، لّٰبِثِيْنَ، لابث کی جمع ہے جس کے معنے ٹھہرنے والے اور قیام کرنے والے کے ہیں، اَحْقَابٌ حقبہ کی جمع ہے، زمانہ دراز کو حقبہ کہا جاتا ہے، اس کی مقدار میں اقوال مختلف ہیں۔ ابن جریر نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اس کی مقدار اَسّی سال نقل کی اور ہر سال بارہ مہینے کا اور ہر مہینہ تیس دن کا اور ہر دن ایک ہزار سال کا۔ اس طرح تقریباً دو کروڑ اٹھاسی لاکھ سال کا ایک حُقبہ۔ اور حضرت ابوہریرہؓ، عبداللہ بن عمر، ابن عباس وغیرہ نے مقدار حقبہ اسّی کے بجائے ستر سال قرار دی باقی حساب وہی ہے (ابن کثیر) مگر مسند بزار میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مرفوعاً یہ منقول ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ،

لا یخرج احد کم من النّار حتّٰی یمکث فیہ احقابًا والحقب بضعٌ وثمانون سنۃ کل سنۃ ثلثمائۃ وستون یوما ممّا تعدّون (از مظہری)

تم میں سے جو لوگ گناہوں کی سزا میں جہنم میں ڈالے جائیں گے کوئی اسوقت تک جہنم سے نہ نکلے گا جبتک اسمیں چند احقاب نہ رہے اور حقبہ کچھ اوپر اسّی سال کا، اور ہر سال تین سو ساٹھ دن کا ہے تمہارے موجودہ دنوں کے مطابق۔

اس حدیث میں اگرچہ اس آیت مذکورہ کی تفسیر مذکور نہیں ہے مگر بہر حال لفظ احقاب کے معنی کا بیان ہے چند صحابہ کرام سے جو اسمیں ہر دن ایک ہزار سال کا منقول ہے اگر وہ بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہوا ہے تو روایاتِ حدیث میں تعارض ہوا، اس تعارض کے وقت کسی ایک پر جزم و یقین تو نہیں ہو سکتا مگر اتنی بات دونوں ہی روایتوں میں مشترک ہے کہ حقبہ یا حقب بہت ہی زیادہ طویل زمانے کا نام ہے اسی لئے بیضاوی نے احقاباً کی تفسیر دھور متتابعہ سے کی ہے یعنی پے درپے بہت سے زمانے۔

جہنم کے خلود اور دوام پر اشکال وجواب حقبہ کی مقدار کتنی بھی طویل سے طویل قرار دی جائے بہر حال وہ متناہی اور محدود ہے۔ اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس مدتِ طویلہ کے بعد کفار اہلِ جہنم بھی جہنم سے نکل جاوینگے حالانکہ یہ قرآن مجید کی دوسری واضح نصوص کے خلاف ہے جن میں خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا کے الفاظ آئے ہیں اور اسی لئے اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ نہ جہنم کبھی فنا ہوگی، نہ کفّار کبھی اس سے نکالے جائیں گے۔

سُدّی نے حضرت مُرّہ بن عبداللہ سے نقل کیا ہے کہ کفّار اہلِ جہنم کو اگر یہ خبر دی جائے کہ اُن کا قیام جہنم

میں دُنیا بھر میں جتنی کنکریاں تھیں اُنکی برابر ہوگا تو وہ اس پر بھی خوش ہوں گے کہ بالآخر یہ کنکریاں اربوں کھربوں کی تعداد میں سہی پھر بھی محدود اور متناہی تو ہیں، بہرحال کبھی نہ کبھی اس عذاب سے چھٹکارا ہو جائے گا اور اگر اہلِ جنّت کو یہی خبر دی جائے کہ اُن کا قیام جنّت میں دُنیا بھر کی کنکریوں کے عدد کے مطابق سالوں ہیگا تو وہ غمگین ہونگے کہ کتنی ہی مدّت دراز سہی مگر بہرحال اس مدّت کے بعد جنّت سے نکالدیئے جاوینگے (مظہری)

بہرحال اس آیت میں احقاباً کے لفظ سے جو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ چند احقاب کے بعد کفار اہلِ جہنم بھی جہنم سے نکال لئے جاویں گے، تمام نصوص اور اجماعِ اُمت کیخلاف ہونے کی بنا پر یہ مفہوم معتبر نہیں ہوگا کیونکہ اس آیت میں اس کی تصریح تو ہے نہیں کہ احقاب کے بعد کیا ہوگا صرف اتنا ذکر ہے کہ مدت احقاب ان کو جہنّم میں رہنا پڑیگا، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ احقاب کے بعد جہنّم نہیں رہے گا یا یہ لوگ اُس سے نکال لئے جاویں گے۔ اسی لئے حضرت حسنؓ نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے اہلِ جہنّم کے لئے جہنم کی کوئی میعاد اور مدّت مقرر نہیں فرمائی جس کے بعد اُن کا اس سے نکل جانا سمجھا جائے بلکہ مراد یہ ہے کہ جب ایک حقبہ زمانے کا گزر جائیگا تو دوسرا شروع ہو جائیگا، اسی طرح دوسرے کے بعد تیسرا چوتھا یہاں تک کہ ابدالآباد یہی سلسلہ رہے گا، اور سعید بن جبیرؒ نے قتادہ سے بھی یہی تفسیر روایت کی ہے کہ احقاب سے مراد وہ زمانہ ہے جسکا انقطاع اور انتہا نہیں بلکہ ایک حقب ختم ہوگا تو دوسرا حقب آجائیگا اور یہی سلسلہ ابد تک رہیگا (ابن کثیر و مظہری) اور یہاں ایک دوسرا احتمال اور بھی ہے جس کو ابن کثیر نے یحتمل کے لفظ سے بیان کیا ہے اور قرطبی نے فرمایا کہ یہ بات بھی ممکن ہے اور مظہری نے اسی کو اختیار کیا ہے وہ احتمال یہ ہے کہ اس آیت میں لفظ طاغین سے مراد کفار نہ لئے جاویں بلکہ وہ اہلِ توحید جو عقائدِ باطلہ کے سبب اسلام کے گمراہ فرقوں میں شمار ہوتے ہیں جن کو محدثین کی اصطلاح میں اہلِ اہوار کہا جاتا ہے وہ مراد ہوں تو آیت کا حاصل یہ ہوگا کہ ایسے اہلِ توحید کلمہ گو جو عقائدِ باطلہ رکھنے کے سبب کفر کی حدود تک پہنچے ہوئے تھے مگر صریح کافر نہ تھے وہ مدّت احقاب جہنّم میں رہنے کے بعد بالآخر کلمۂ توحید کی بدولت جہنّم سے نکال لئے جاویں گے۔

مظہری نے اس احتمال کی تائید میں وہ حدیث مرفوع بھی پیش کی جو اوپر حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بحوالہ مسند بزار نقل ہو چکی ہے جس میں آپ نے یہی بیان فرمایا ہے کہ مدّت احقاب گزرنے کے بعد یہ لوگ جہنم سے نکال لئے جاویں گے مگر ابو حیّان نے فرمایا کہ بعد کی آیات اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًاۙ وَّكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا اس احتمال کے منافی ہیں کہ طاغین سے مراد اس جگہ اہلِ توحید اور گمراہ فرقے ہوں کیونکہ ان آخری آیات میں قیامت کے انکار اور تکذیبِ رُسل کی تصریح ہے اسی طرح ابو حیّان نے مقاتل کے اس قول کو بھی فاسد قرار دیا ہے کہ اس آیت کو منسوخ مانا جائے۔

اور ایک جماعتِ مفسّرین نے ایک تیسرا احتمال اس آیت کی تفسیر میں یہ قرار دیا ہے کہ اس آیت کے بعد کا جملہ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًاۙ اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا، یہ احقاباً سے جملہ حالیہ ہو اور معنی آیت

کے یہ ہوں کہ احقاب کے زمانہ دراز تک یہ لوگ نہ ٹھنڈی لذیذ ہوا کا ذائقہ چکھیں گے نہ کسی کھانے اور پینے کی چیز کا بجز حمیم اور غسّاق، پھر احقاب گزرنے کے بعد ہوسکتا ہے کہ یہ حال بدل جائے اور دوسری اقسام کے عذاب ہونے لگیں حمیم وہ کھولتا ہوا گرم پانی ہے کہ جب چہرہ کے قریب آئیگا تو اسکا گوشت جل جائیگا اور جب پیٹ میں ڈالا جائیگا تو اندرونی اعضاء کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور غسّاق وہ خون اور پیپ وغیرہ جو اہلِ جہنّم کے زخموں سے نکلے گی۔

جَزَآءً وِّفَاقًا، یعنی جو سزا ان کو جہنّم میں دیجائے گی وہ اُن کے عقائد باطلہ اور اعمالِ سیئہ کیمطابق ہوگی از روئے عدل وانصاف اسمیں کوئی زیادتی نہ ہوگی فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا، یعنی جس طرح تم دُنیا میں اپنے کفرو انکار میں زیادتی ہی کرتے چلے گئے اور اگر جبراً تمھیں موت نہ آجاتی تو اور بڑھتے ہی رہتے اسی طرح آج اُس کی جزا یہ ہے کہ تمھارا عذاب بڑھتا ہی چلا جائے، یہاں تک کفار و فجّار کی سزا کا بیان تھا آگے اسکے بالمقابل مؤمنین متقین کے ثواب اور نعمائے جنّت کا تذکرہ ہے۔ ان نعمتوں کا ذکر فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا۔

جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا، یعنی اوپر جنّت کی جن نعمتوں کا ذکر آیا ہے یہ جزا ہے مؤمنین کے لئے اور عطاء ہے اُن کے رب کی طرف سے عطائے کثیر۔ یہاں ان نعمتوں کو اوّل جزائے اعمال بتلایا پھر عطائے ربّانی، بظاہر ان دونوں میں تضاد ہے کیونکہ جزا اُس چیز کو کہا جاتا ہے جو کسی چیز کے بدلے میں ہو اور عطاء وہ ہے جو بلا کسی بدلے کے بطور انعام و احسان ہو۔ قرآن کریم نے ان دونوں لفظوں کو یکجا جمع کرکے اس طرف اشارہ کردیا کہ جنّت میں داخل ہونا اور اس کی نعمتیں صرف صورت اور ظاہر کے اعتبار سے تو اہلِ جنّت کے اعمال کی جزاء ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ خالص عطائے ربّانی ہے کیونکہ انسانی اعمال تو ان نعمتوں کا بھی بدلہ نہیں بن سکتے جو اُن کو دُنیا میں دیدی گئی ہیں آخرت کی نعمتوں کا حصول تو صرف حق تعالیٰ کا فضل وانعام اور عطائے محض ہے جیسا کہ حدیث میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کوئی شخص اپنے عمل سے جنّت میں نہیں جاسکتا جبتک حق تعالیٰ کا فضل نہو، صحابہ کرام نے عرض کیا کہ کیا آپ بھی، آپ نے فرمایا کہ ہاں میں بھی اپنے عمل سے جنت میں نہیں جاسکتا، اور لفظ حسابًا کے دو معنے ہوسکتے ہیں، ائمہ تفسیر میں بعض نے پہلے بعض نے دوسرے معنے لئے ہیں پہلے معنی حسابًا عطاءً کافیًا کثیرًا کے ہیں یعنی ایسی عطاء جو اس کی تمام ضرورتوں کے لئے کافی وافی اور کثیر ہو، یہ معنے اس محاورہ سے ماخوذ ہیں اَحْسَبْتُ فُلَانًا ای اَعْطَيْتُهٗ مَا يَكْفِيْهِ حَتّٰى قَالَ حَسْبِیْ یعنی اَحْسَبْتُ کا لفظ اس معنے کے لئے آتا ہے کہ میں نے اس کو اتنا دیا کہ اُس کے لئے بالکل کافی ہوگیا یہانتک کہ بول اُٹھا حَسْبِیْ یعنی بس یہ میرے لئے بہت ہے۔ اور دوسرے معنے حساب کے موازنہ اور مقابلے کے بھی آتے ہیں۔ حضرت مجاہد نے اس جگہ یہی معنی لے کر مطلب آیت کا یہ قرار دیا کہ یہ عطائے ربّانی اہلِ جنت پر اُن کے اعمال کے حساب سے مبذول ہوگی، اس عطاء میں درجات بحساب اخلاص اور احسان عمل کے ہونگے جیسا کہ احادیث صحیحہ میں صحابہ کرام کے اعمال کا درجہ باقی اُمت کے اعمال کے مقابلے میں یہ قرار دیا ہے کہ صحابی اگر اللہ کی راہ میں ایک مُد خرچ کرے جو تقریباً ایک سیر ہوتا ہے، اور غیر صحابی اُحد پہاڑ کی برابر خرچ کرے تو صحابی کا ایک مُد اس پہاڑ سے بڑھا ہوا رہے گا۔ واللہ اعلم

لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ، اس جملہ کا تعلق پہلے جملے جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا سے بھی ہوسکتا ہے تو معنے یہ ہونگے کہ حق تعالیٰ جس کو جو درجہ ثواب کا عطا فرما دیں گے اُس میں کسی کو گفتگو کرنے کی مجال نہ ہوگی کہ فلاں کو زیادہ فلاں کو کم کیوں دیا گیا ، اور اگر اس کو علیحدہ جملہ قرار دیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ محشر میں کسی کو بغیر اجازتِ حق تعالیٰ خطاب کرنے کا اختیار نہ ہوگا اور یہ اجازت بعض مواقف حشر میں ہوگی بعض میں نہ ہوگی ۔

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ، روح سے مراد بعض ائمہ تفسیر کے نزدیک جبریل امین ہیں ، ان کا ذکر عام ملائکہ سے پہلے انکی عظمتِ شان کے اظہار کے لئے ہے ۔ اور بعض روایاتِ مرفوعہ میں ہے کہ رُوح اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم الشان لشکر ہے جو فرشتے نہیں ، اُن کے سر اور ہاتھ پاؤں ہیں ۔ اس تفسیر پر گویا دو صفیں ہوں گی ، ایک صف روح کی دوسری فرشتوں کی ۔

يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ ، ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد روزِ قیامت ہے ، اور محشر میں ہر شخص اپنے اعمال کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا خواہ اس طرح کہ نامۂ اعمال اسکے ہاتھ میں آجائیگا اسکو دیکھے گا ، یا اس طرح کہ اعمال محشر میں مجسّم اور متشکل ہو کر سامنے آجائیں گے جیسا کہ بعض روایاتِ حدیث سے ثابت ہے ۔ اور احتمال یہ بھی ہے کہ اس روز سے مراد موت کا دن ہو اور اپنے اعمال کا دیکھنا قبر و برزخ میں مراد ہو ، کما فی المظہری ۔

وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ قیامت کے روز ساری زمین ایک سطح مستوی ہو جائے گی جسمیں انسان ، جنّات ، زمین پر چلنے والے پالتو جانور اور وحشی جانور سب جمع کردیے جاوینگے اور جانوروں میں سے اگر کسی نے دوسرے پر ظلم دنیا میں کیا تھا تو اس سے اسکا انتقام دلوایا جائیگا یہانتک کہ اگر کسی سینگ والی بکری نے بے سینگ بکری کو مارا تھا تو آج اسکا بھی بدلہ دلوایا جائیگا ، جب اس سے فراغت ہوگی تو سب جانوروں کو حکم ہوگا کہ مٹی ہو جاؤ وہ سب مٹی ہو جائیں گے ، اسوقت کافر لوگ یہ تمنّا کریں گے کہ کاش ہم بھی جانور ہوتے ۔ اور اسوقت مٹی ہو جاتے ، حساب کتاب اور جہنم کی سزا سے بچ جاتے ، نعوذ باللہ منہ ، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

تمّت سورۃ النّبا بحمد اللہ لیلۃ الجمعۃ ۲ شعبان سنہ ۱۳۹۱ھ

سُوْرَةُ النّٰزِعٰت

سُوْرَةُ النّٰزِعٰتِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سِتٌّ وَّاَرْبَعُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۂ نازعات مکہ میں نازل ہوئی اس کی چھیالیس آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۙ﴿۱﴾ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۙ﴿۲﴾ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۙ﴿۳﴾ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا

قسم ہے گھسیٹ لانیوالوں کی غوطہ لگاکر، اور بند چھڑا دینے والوں کی کھولکر اور پیرنے والوں کی تیزی سے پھر آگے بڑھنے والوں کی دوڑ کر

فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۘ﴿۵﴾ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۙ﴿۶﴾ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ؕ﴿۷﴾

پھر کام بنانے والوں کی حکم سے جس دن کانپے کانپنے والی اُس کے پیچھے آئے دوسری

قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ۙ﴿۸﴾ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۘ﴿۹﴾ يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ

کتنے دل اُس دن دھڑکتے ہیں اُن کی آنکھیں جُھک رہی ہیں لوگ کہتے ہیں کیا ہم پھر آئیں گے

فِي الْحَافِرَةِ ؕ﴿۱۰﴾ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ؕ﴿۱۱﴾ قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۘ﴿۱۲﴾

اُلٹے پاؤں کیا جب ہم ہو چکیں ہڈیاں کھوکھری بولے تو تو یہ پھر آنا ہے ٹوٹے کا

فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ﴿۱۳﴾ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ؕ﴿۱۴﴾ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۘ﴿۱۵﴾

سو وہ تو صرف ایک جھڑکی ہے پھر تبھی وہ آرہیں میدان میں کیا پہنچی ہے تجھ کو بات موسیٰ کی

اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۚ﴿۱۶﴾ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ

جب پکارا اُس کو اسکے رب نے پاک میدان میں جسکا نام طویٰ ہے جا فرعون کے پاس اس نے

طَغٰى ۖ﴿۱۷﴾ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰى اَنْ تَزَكّٰى ۙ﴿۱۸﴾ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۚ﴿۱۹﴾

سر اُٹھایا پھر کہہ تیرا جی چاہتا ہے کہ تو سنور جائے اور راہ بتلاؤں تجھ کو تیرے رب کی طرف پھر تجھ کو ڈر ہو

فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ۖ﴿۲۰﴾ فَكَذَّبَ وَعَصٰى ۖ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ۖ﴿۲۲﴾ فَحَشَرَ ۫

پھر دکھلائی اسکو وہ بڑی نشانی پھر جھٹلایا اُسنے اور نہ مانا پھر چلا پیٹھ پھیر کر تلاش کرتا ہوا، پھر سب کو جمع کیا،

وقف لازم ۔ وقف لازم ۔ وقف لازم ۔ وقف لازم

فَنَادَىٰ ﴿۲۳﴾ فَقَالَ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ ﴿۲۴﴾ فَأَخَذَهُ اللَّهُ نَكَالَ الْآخِرَةِ

پھر پکارا تو کہا میں ہوں رب تمھارا سب سے اوپر پھر پکڑا اُس کو اللہ نے سزا میں آخرت کی

وَالْأُولَىٰ ﴿۲۵﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَن يَخْشَىٰ ﴿۲۶﴾ أَأَنتُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ

اور دُنیا کی بیشک اسمیں سوچنے کی جگہ ہے جس کے دل میں ڈر ہے کیا تمھارا بنانا مشکل ہے یا

السَّمَاءُ ۚ بَنَاهَا ﴿۲۷﴾ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوَّاهَا ﴿۲۸﴾ وَأَغْطَشَ لَيْلَهَا وَأَخْرَجَ ضُحَاهَا ﴿۲۹﴾

آسمان کا، اُسنے اسکو بنالیا، اونچا کیا اسکا اُبھار پھر اسکو برابر کیا اور اندھیری کی رات اُس کی اور کھول نکالی اسکی دھوپ

وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذَٰلِكَ دَحَاهَا ﴿۳۰﴾ أَخْرَجَ مِنْهَا مَاءَهَا وَمَرْعَاهَا ﴿۳۱﴾ وَالْجِبَالَ

اور زمین کو اس کے پیچھے صاف بچھا دیا باہر نکالا زمین سے اسکا پانی اور چارا اور پہاڑوں کو

أَرْسَاهَا ﴿۳۲﴾ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ﴿۳۳﴾ فَإِذَا جَاءَتِ الطَّامَّةُ الْكُبْرَىٰ ﴿۳۴﴾

قائم کر دیا کام چلانے کو تمھارے اور تمھارے چوپایوں کے پھر جب آئے وہ بڑا ہنگامہ

يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنسَانُ مَا سَعَىٰ ﴿۳۵﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِمَن يَرَىٰ ﴿۳۶﴾ فَأَمَّا مَن

جسدن کہ یاد کرے گا آدمی جو اُسنے کمایا اور نکال ظاہر کردیں دوزخ کو جو چاہے دیکھے سو جس نے کی ہو

طَغَىٰ ﴿۳۷﴾ وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ﴿۳۸﴾ فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ﴿۳۹﴾ وَأَمَّا مَنْ

شرارت اور بہتر سمجھا ہو دُنیا کا جینا سو دوزخ ہی ہے اُس کا ٹھکانا اور جو کوئی

خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ﴿۴۰﴾ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ﴿۴۱﴾

ڈرا ہو اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے اور روکا ہو اُس نے جی کو خواہش سے سو بہشت ہی ہے اُس کا ٹھکانا

يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا ﴿۴۲﴾ فِيمَ أَنتَ مِن ذِكْرَاهَا ﴿۴۳﴾

تجھ سے پوچھتے ہیں وہ گھڑی کب ہوگا قیام اس کا تجھ کو کیا کام اُس کے ذکر سے

إِلَىٰ رَبِّكَ مُنتَهَاهَا ﴿۴۴﴾ إِنَّمَا أَنتَ مُنذِرُ مَن يَخْشَاهَا ﴿۴۵﴾ كَأَنَّهُمْ يَوْمَ

تیرے رب کی طرف ہے پہنچ اُس کی تُو تو ڈر سُنانے کے واسطے ہے اسکو جو اس سے ڈرتا ہے ایسا لگے گا جس دن

يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحَاهَا ﴿۴۶﴾

دیکھیں گے اسکو کہ نہیں ٹھہرے تھے دُنیا میں مگر ایک شام یا صبح اُس کی

خُلاصۂ تفسیر

قسم ہے اُن فرشتوں کی جو (کافروں کی) جان سختی سے نکالتے ہیں اور جو (مسلمانوں کی رُوح آسانی سے نکالتے ہیں گویا اُن کا) بند کھول دیتے ہیں اور جو (رُوحوں کو لیکر زمین سے آسمان کیطرف اس طرح سُرعت و سہولت سے چلتے ہیں جیسے گویا) تیرتے ہوئے چلتے ہیں پھر (جب روحوں کو لیکر پہنچتے ہیں تو ان ارواح کے باب میں جو

خدا کا حکم ہوتا ہے اسکے امتثال کے لئے) تیزی کیساتھ دوڑتے ہیں پھر (ان ارواح کے متعلق ثواب کا حکم ہو یا عقاب
کا دونوں امروں میں سے) ہر امر کی تدبیر کرتے ہیں (ان سب کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ) قیامت ضرور آوے گی جس روز
ہلا دینے والی چیز ہلا ڈالے گی (مُراد نفخۂ اُولیٰ ہے) جس کے بعد ایک پیچھے آنے والی چیز آجاوے گی (مُراد نفخۂ ثانیہ ہے)
بہت سے دل اُس روز دھڑک رہے ہونگے اُن کی آنکھیں (مارے ندامت کے) جھک رہی ہونگی (مگر یہ لوگ قیامت
کا انکار کر رہے ہیں اور) کہتے ہیں کہ کیا ہم پہلی حالت میں پھر واپس ہونگے (پہلی حالت سے مراد حیات قبل الممات ہے یعنی
کیا بعد الموت پھر حیاتِ ثانیہ ہوگی؟ مقصود استبعاد ہے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے) کیا جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہوجاوینگے
پھر (حیات کی طرف) واپس ہونگے (مقصود استصعاب ہے کہ یہ سخت دشوار ہے) کہنے لگے کہ (اگر ایسا ہوا تو) اس
صورت میں یہ واپسی (ہمارے لئے) بڑے خسارہ کی ہوگی (کیونکہ ہم نے تو اسکے لئے کچھ سامان نہیں کیا، مقصود اس
سے تمسخر تھا اہلِ حق کے اس عقیدہ کے ساتھ، یعنی ان کے عقیدہ پر ہم بڑے خسارہ میں ہوں گے جیسے کوئی شخص
کسی کو خیر خواہی سے ڈرائے کہ اس راہ مت جانا شیر ملے گا اور مخاطب تکذیب کے طور پر کسی سے کہے کہ بھائی اُدھر
مت جانا شیر کھا جاویگا مطلب یہ کہ وہاں شیر ویر کچھ بھی نہیں ہے۔ آگے استبعاد و استصعاب مذکور کا رد ہے
کہ یہ لوگ جو قیامت کو بعید اور مشکل کہتے ہیں) تو (یہ سمجھ رکھیں کہ ہم کو کچھ مشکل نہیں بلکہ) وہ بس ایک ہی سخت
آواز ہوگی جس سے سب لوگ فوراً ہی میدان میں آموجود ہونگے (آگے مکذبین کی تخویف اور تکذیب پر آپ کی تسلّی
کے لئے موسیٰ علیہ السّلام کا قصہ فرعون کیساتھ بیان کیا جاتا ہے، پس فرماتے ہیں کہ) کیا آپ کو موسیٰ (علیہ السلام)
کا قصہ پہنچا ہے جبکہ اُن کو انکے پروردگار نے ایک پاک میدان یعنی طویٰ میں (یہ اسکا نام ہے) پکارا کہ تم
فرعون کے پاس جاؤ اس نے بڑی شرارت اختیار کی ہے سو اُس سے (جاکر) کہو کہ کیا تجھ کو اس بات کی
خواہش ہے کہ تو درست ہو جاوے، اور (تیری درستی کی غرض سے) میں تجھ کو تیرے رب کی طرف
(ذات و صفات کی) رہنمائی کروں تو تو (ذات و صفات کو سُن کر اس سے) ڈرنے لگے (اور اس ڈر سے درستی
ہو جاوے، غرض یہ حکم سُن کر موسیٰ علیہ السلام اُن کے پاس گئے اور جاکر پیغام ادا کیا) پھر (جب اُس نے دلیل
نبوت طلب کی تو) اُس کو بڑی نشانی (نبوت کی) دکھلائی (مراد معجزۂ عصا ہے یا بارادۂ جنس مجموعۂ عصا و ید بیضا ہے)
تو اُس (فرعون) نے (اُن کو) جھٹلایا اور (اُن کا) کہنا نہ مانا پھر (موسیٰ علیہ السلام سے) جدا ہوکر (انکے خلاف)
کوشش کرنے لگا اور (لوگوں کو) جمع کیا پھر (اُن کے سامنے) باآوازِ بلند تقریر کی اور کہا کہ میں تمہارا ربِّ اعلیٰ
ہوں (اعلیٰ قید واقعی کے طور پر کہا پس اصل مقصود انا ربکم ہے اور اعلیٰ صفتِ مادحہ بڑھا دی اور احترازی
نہیں جس سے غیر اعلیٰ دوسرے رب کا ثبوت ہو) سو اللہ تعالےٰ نے اُس کو آخرت کے اور دُنیا کے عذاب میں پکڑا۔
(دُنیوی عذاب تو غرق ہے اور اُخروی عذاب حَرَق یعنی جلنا ہے) بیشک اِس (واقعہ) میں ایسے شخص کے لئے بڑی عبرت ہے
جو (اللہ تعالیٰ سے) ڈرے، (آگے قیامت کو بعید یا مشکل سمجھنے کا عقلی جواب ہے یعنی) بھلا تمہارا (دوسری
بار) پیدا کرنا (فی نفسہ) زیادہ سخت ہے یا آسمان کا (اور فی نفسہ اسلئے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نسبت

سے تو سب مساوی ہیں اور ظاہر ہے کہ آسمان ہی کا پیدا کرنا زیادہ سخت ہے، پھر جب اس کو پیدا کر دیا تو تمہارا پیدا کرنا کیا مشکل ہے، آگے آسمان کے پیدا کرنے کی کیفیت بیان فرماتے ہیں کہ) اللہ نے اسکو بنایا (اسطرح سے کہ) اسکی چھت کو بلند کیا اور اس کو درست بنایا (کہ کہیں اسمیں شقوق و فطور، پھٹا ہوا یا جوڑ پیوند تو نہیں) اور اس کی رات کو تاریک بنایا اور اسکے دن کو ظاہر کیا (رات اور دن کو آسمان کیطرف اسلئے منسوب کیا کہ رات اور دن آفتاب کے طلوع اور غروب سے ہوتے ہیں اور آفتاب آسمان سے متعلق ہے) اور اُسکے بعد زمین کو بچھایا (اور بچھاکر) اس سے اس کا پانی اور چارہ نکالا اور پہاڑوں کو (اُس پر) قائم کر دیا تمہارے اور تمہارے مواشی کے فائدہ پہنچانے کے لئے (اصل استدلال خلقِ سماء سے تھا مگر زمین کا ذکر شاید اسلئے کر دیا کہ اسکے احوال ہر وقت پیشِ نظر ہیں اور گو سماء کے برابر نہ سہی لیکن فی نفسہٖ انسان کی تخلیق سے زمین کی تخلیق بھی اشد ہے پس حاصل استدلال کا یہ ہوا کہ جب ایسی ایسی چیزیں ہمنے بنا دیں تو تمہارا دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے آگے بعث کے بعد جو واقعات مجازاۃ کے متعلق ہونگے اُن کی تفصیل ہے یعنی قیامت کا امکان اور صحتِ وقوع تو ثابت ہو گیا) سو جب وہ بڑا ہنگامہ آویگا یعنی جس دن انسان اپنے کئے کو یاد کریگا اور دیکھنے والوں کے سامنے دوزخ ظاہر کیجاویگی تو (اُس روز یہ حالت ہوگی کہ) جس شخص نے (حق سے) سرکشی کی ہوگی اور (آخرت کا منکر ہو کر اُس پر) دنیوی زندگی کو ترجیح دی ہوگی سو دوزخ اُسکا ٹھکانا ہوگا اور جو شخص (دُنیا میں) اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا (کہ قیامت اور آخرت اور حساب کتاب پر اسکا ایمان مکمل ہو) اور نفس کو (حرام) خواہش سے روکا (یعنی اعتقادِ صحیح کے ساتھ عمل صالح بھی کیا) ہوگا سو جنّت اسکا ٹھکانا ہوگا (اور عمل صالح طریقِ جنّت ہے موقوف علیہ نہیں، چونکہ کفار بقصد انکار قیامت کے اسکا وقت پوچھا کرتے تھے آگے اسکا جواب ہے یعنی) یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اسکا وقوع کب ہوگا (سو) اس کے بیان کرنیسے آپ کا کیا تعلق (کیونکہ بیان کا موقوف علیہ علم ہے اور قیامت کا معین وقت ہم نے کسی کو بتلایا نہیں بلکہ) اُس (کے علم کی تعیین) کا مدار صرف آپ کے رب کی طرف ہے (اور) آپ تو صرف (اخبار اجمالی سے) ایسے شخص کے ڈرانے والے ہیں جو اس سے ڈرتا ہو (اور ڈر کر ایمان لانے والا ہو اور یہ لوگ جو جلدی مچا رہے ہیں تو سمجھ لیں کہ) جس روز یہ اس کو دیکھیں گے تو (اُن کو) ایسا معلوم ہوگا کہ گویا (دُنیا میں) صرف ایک دن کے آخری حصّہ میں یا اسکے اوّل حصّہ میں رہے ہیں (وبس یعنی دُنیا کی مُدّتِ طویلہ قصیر معلوم ہوگی اور سمجھیں گے کہ عذاب بڑی جلدی آگیا جس کی یہ استدعا کرتے ہیں حاصل یہ کہ جلد بازی کیوں کرتے ہو وقوع کے وقت اسکو یہی سمجھوگے کہ بڑی جلد ہو گیا جس دیر کو اب دیر سمجھ رہے ہو یہ دیر معلوم نہ ہوگی)

معارف و مسائل

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ، نازعات، نزع سے مشتق ہے جس کے معنے کسی چیز کو کھینچ کر نکالنے کے آتے ہیں، اور غرقاً اُس کی تاکید ہے کیونکہ غرق اور اغراق کے معنے کسی کام میں پوری قوت شدت خرچ کرنے کے ہیں۔ محاورہ

میں کہا جاتا ہے اغرق النازع فی القوس یعنی کمان کھینچنے والے نے اسکے کھینچنے میں اپنی پوری قوت خرچ کردی اس سورۃ کے شروع میں ملائکہ کی چند صفات اور حالات بیان کرکے انکی قسم کھائی گئی ہے اور جواب قسم بدلالتِ حال حذف کردیا گیا، مراد اس سے قیامت اور حشر و نشر کا یقیناً واقع ہونا ہے۔ فرشتوں کی قسم شاید اس مناسبت سے کھائی گئی ہے کہ اگرچہ فرشتے اسوقت بھی تمام عالم کے نظم ونسق میں دخل رکھتے اور اپنی اپنی خدمت بجالاتے ہیں لیکن قیامت کے روز اسباب مادیہ کے سب رشتے ٹوٹ جائینگے غیر معمولی حالات و واقعات پیش آوینگے، ان واقعات میں فرشتے ہی کام کریں گے۔

فرشتوں کی اس جگہ پانچ صفات وہ بیان کی گئی ہیں جن کا تعلق انسان کی موت اور نزع رُوح سے ہے مقصد تو قیامت کا حق ہونا بیان کرنا ہے، شروع اسکا انسان کی موت سے کیا گیا کہ ہر انسان کی موت خود اسکے لئے ایک جزوی قیامت ہے اور قیامت کے اعتقاد میں اسکا بڑا دخل ہے۔ ان پانچ صفات میں سے پہلی صفت النّٰزِعٰتِ غَرْقًا، یعنی سختی کے ساتھ کھینچکر نکالنے والے، مراد اس سے وہ عذاب کے فرشتے ہیں جو کافر کی رُوح سختی کے ساتھ نکالتے ہیں، مراد اس سختی سے روحانی سختی اور تکلیف ہے یہ ضروری نہیں کہ دیکھنے والوں کو بھی اس سختی کا احساس ہو اسی لئے بسا اوقات یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ کافر کی رُوح بظاہر آسانی سے نکلتی ہے مگر یہ آسانی ہمارے دیکھنے میں ہے جو سختی اُس کی رُوح پر ہو رہی ہے اس کو کون دیکھ سکتا ہے وہ تو اللہ تعالیٰ ہی کی خبر دینے سے معلوم ہوسکتی ہے۔ اس لئے اس جملے میں یہ خبر دیدی گئی ہے کہ کفار کی روح کو کھینچکر سختی سے نکالا جاتا ہے۔

دوسری صفت ہے وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا، ناشطات نشط سے مشتق ہے جس کے معنے بندھن کھولدینے کے ہیں۔ جس چیز میں پانی یا ہوا وغیرہ بھری ہوں اسکا بندھن کھولدینے سے وہ پانی وغیرہ آسانی کیساتھ نکل جاتا ہے اسمیں مؤمن کی روح نکلنے کو اس سے تشبیہ دیکر بتلایا ہے کہ جو فرشتے مؤمن کی قبض روح پر مقرر ہیں وہ آسانی سے اُس کو قبض کرتے ہیں شدت نہیں کرتے، یہاں بھی آسانی سے روحانی مراد ہے جسمانی نہیں اس لئے کسی مسلمان بلکہ مرد صالح کو بوقت موت نزع روح میں دیر لگنے سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اُس پر سختی ہورہی ہے اگرچہ جسمانی طور پر یہ سختی دیکھی جاتی ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ کافر کو نزع روح کے وقت ہی سے برزخ کا عذاب سامنے آجاتا ہے، اسکی روح اس سے گھبراکر بدن میں چھپنا چاہتی ہے، فرشتے کھینچکر نکالتے ہیں، اور مؤمن کی روح کے سامنے عالم برزخ کا ثواب، نعمتیں اور بشارتیں آتی ہیں تو اُس کی رُوح تیزی سے ان کی طرف جانا چاہتی ہے۔

تیسری صفت فرشتوں کی وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ہے سبح کے لغوی معنی تیرنے کے آتے ہیں، مراد اس جگہ تیزی سے چلنا ہے جیسے دریا میں کوئی آڑ پہاڑ نہیں ہوتا، تیرنے والا یا کشتی وغیرہ میں چلنے والا سیدھا اپنی منزل مقصود کی طرف جاتا ہے فرشتوں کی یہ صفت کہ تیز جانے والے ہیں یہ بھی ملائکہ موت سے متعلق ہے کہ انسان کی روح قبض کرنے کے بعد اس کو تیزی سے آسمان کیطرف لیجاتے ہیں۔

چوتھی صفت فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ہے مراد یہ ہے کہ پھر یہ روح جو فرشتوں کے قبضہ میں ہے اس کو اسکے اچھے یا بُرے ٹھکانے پر پہنچانے میں سبقت اور عجلت سے کام لیتے ہیں۔ مؤمن کی روح کو جنّت کی ہواؤں اور

نعمتوں کی جگہ میں کافر کی روح کو دوزخ کی ہواؤں اور عذابوں کی جگہ میں پہنچا دیتے ہیں۔

پانچویں صفت فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ہے۔ امر الٰہی کی تدبیر و تنفیذ کرنے والے یعنی ان ملائکہ موت کا آخری کام یہ ہوگا کہ جس روح کو ثواب اور راحت دینے کا حکم ہوگا اسکے لئے راحت کے سامان جمع کر دیں اور جس کو عذاب اور تکلیف میں ڈالنے کا حکم ہوگا اسکے لئے اسکا انتظام کر دیں۔

قبر میں ثواب و عذاب موت کے وقت فرشتوں کا آنا اور انسان کی روح قبض کر کے آسمان کیطرف لیجانا پھر اسکے اچھے یا بُرے ٹھکانے پر جلدی سے پہنچا دینا اور وہاں ثواب یا عذاب، تکلیف یا راحت کے انتظامات کر دینا ان آیاتِ مذکورہ سے ثابت ہوگیا۔ یہ عذاب و ثواب قبر یعنی برزخ میں ہوگا۔ حشر کا عذاب و ثواب اس کے بعد ہے احادیث صحیحہ میں اسکی بڑی تفصیلات مذکور ہیں۔ حضرت براء بن عازبؓ کی ایک طویل حدیث مشکوٰۃ میں بحوالہ مسند احمد مذکور ہے۔

نفس اور روح کے متعلق حضرت قاضی ثناء اللہ رح کی تحقیق مفید تفسیر مظہری کے حوالہ سے نفس و روح کی حقیقت پر کچھ کلام سورۂ حجر کی آیت ۲۹ کے تحت گزر چکا ہے۔ اسی سلسلے کی مزید تحقیق و توضیح بیہقیٔ وقت حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی قدس سرہٗ نے اس جگہ تحریر فرمائی ہے جس سے بہت سے اشکالات حل ہو جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ حدیث مذکور سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نفس انسانی ایک جسمِ لطیف ہے جو اسکے جسمِ کثیف کے اندر سمایا ہوا ہے اور وہ انھیں مادی عناصر اربعہ سے بنا ہے۔ فلاسفہ اور اطباء اسی کو روح کہتے ہیں مگر درحقیقت رُوح انسانی ایک جوہر مجرد اور لطیفۂ ربانی ہے جو اس طبعی رُوح یعنی نفس کیساتھ ایک خاص تعلق رکھتا ہے اور طبعی رُوح یعنی نفس کی حیات خود اس لطیفہ ربانی پر موقوف ہے گویا اس کو روح الروح کہہ سکتے ہیں کہ جسم کی زندگی نفس سے ہے اور نفس کی زندگی اس روح سے وابستہ ہے اس روح مجرد اور لطیفہ ربانیہ کا تعلق اسی جسمِ لطیف یعنی نفس کیساتھ کیا اور کس طرح کا ہے اس کی حقیقت کا علم انکے پیدا کرنے والے کے سوا کسی کو نہیں، اور یہ جسمِ لطیف جسکا نام نفس ہے اسکو حق تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ایک آئینہ کی مثال بنایا ہے جو آفتاب کے بالمقابل رکھدیا گیا ہو تو آفتاب کی روشنی اسمیں ایسی آجاتی ہے کہ یہ خود آفتاب کی طرح روشنی پھیلاتا ہے نفسِ انسانی اگر تعلیم وحی کیمطابق ریاضت و محنت کرلیتا ہے تو وہ بھی منور ہو جاتا ہے ورنہ وہ جسمِ کثیف کے خراب اثرات میں ملوث ہوتا ہے یہی جسمِ لطیف ہے جس کو فرشتے اوپر لیجاتے ہیں اور پھر اعزاز کے ساتھ نیچے لاتے ہیں جبکہ وہ منور ہو چکا ہو، ورنہ آسمان کے دروازے اسکے لئے نہیں کھُلتے، اوپر ہی سے نیچے پٹخ دیا جاتا ہے۔ یہی جسمِ لطیف ہے جس کے بارمیں حدیث مذکور میں ہے کہ ہمنے اسکو زمین کی مٹی سے پیدا کیا، پھر اسمیں لوٹائیں گے پھر اُسی سے دوبارہ پیدا کریں گے، یہی جسمِ لطیف اعمالِ صالحہ سے منور اور خوشبودار بنجاتا ہے اور کفر و شرک سے بدبُودار ہو جاتا ہے۔ باقی روحِ مجرد اسکا تعلق جسمِ کثیف کے ساتھ بواسطہ جسمِ لطیف یعنی نفس کے ہوتا ہے اُس پر موت طاری نہیں ہوتی، قبر کا عذاب و ثواب بھی اسی جسمِ لطیف یعنی نفس سے وابستہ ہے اور اس نفس کا تعلق قبر سے ہی رہتا ہے اور روح مجرد علیین میں ہوتی ہے

اور روح مجرد اسکے ثواب عذاب سے بالواسطہ متاثر ہوتی ہے، اس طرح روح کا قبر میں ہونا بمعنے نفس کے صحیح ہے اور اسکا عالمِ ارواح یا علیین میں رہنا بمعنے روح مجرد صحیح ہے اس سے ان روایات مختلفہ کی تطبیق بھی ہو جاتی ہے، واللہ اعلم۔ آگے قیامت کے وقوع اور اسمیں پہلے نفخ صور سے سارے عالم کی فنا پھر دوسرے سے سارے عالم کی دوبارہ ایجاد اور اس پر کفار کے شبہ استبعاد کا جواب مذکور ہے اس کے آخر میں فرمایا فَاِذَاھُمْ بِالسَّاھِرَۃِ ساہرہ سطح زمین کو کہا جاتا ہے۔ قیامت میں جو زمین دوبارہ پیدا کی جاوے گی وہ پوری ایک سطح مستوی ہوگی۔ اسمیں آڑ پہاڑ عمارت یا غار نہیں ہوگا، اسی کو ساہرہ کہا گیا ہے، اسکے بعد کفار منکرین قیامت کی ضد اور عناد سے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچتی تھی اسکا ازالہ فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بیان کر کے کیا گیا ہے کہ مخالفین سے ایسی ایذائیں کچھ آپکے لئے مخصوص نہیں، انبیاء سابقین کو بھی بڑی بڑی ایذائیں ان سے پہنچی ہیں، اُنھوں نے صبر کیا، آپ بھی صبر سے کام لیں۔

فَاَخَذَہُ اللّٰہُ نَکَالَ الْاٰخِرَۃِ وَالْاُوْلٰی، نکال ایسے عذاب کو کہا جاتا ہے جس کو دیکھ کر دوسروں کو عبرت ہو اور سب سہم جائیں، نکالِ آخرت فرعون کے لئے آخرت کا عذاب ہے، اور نکال اُولیٰ سے مراد وہ عذاب۔ ہے جو دُنیا میں اس کی پُوری قوم کے غرق دریا ہو جانے سے ان کو پہنچا۔ آگے پھر منکرین حشر و نشر کے اس استبعاد اور شبہ کا ازالہ ہے کہ مرنے اور مٹی ہو جانے کے بعد کیسے دوبارہ زندہ کئے جاویں گے، اسمیں حق تعالیٰ نے آسمان زمین اور انکے اندر پیدا کی ہوئی عظیم مخلوقات کا ذکر کر کے انسان غافل کو اس پر متنبہ کیا ہے کہ جس ذات نے ایسی عظیم الشان مخلوقات کو ابتدائی وجود بغیر کسی مادہ و آلہ کے عطا فرمایا وہ اگر ان کو نیست و نابود کرنے کے بعد دوبارہ وجود عطا فرما دے تو تمھارے تعجب کا کیا مقام ہے۔ آگے پھر روز قیامت کی شدت اور اُس روز ہر شخص کے اعمال کا سامنے آجانا اور اہلِ جنت اور اہلِ جہنم کے دونوں ٹھکانوں کا بیان اور آخر میں اہل جنت اور اہلِ دوزخ کی خاص خاص علامات کا بیان ہے جس سے ایک انسان دُنیا ہی میں یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ ضابطہ سے میرا ٹھکانا جنت میں ہے یا دوزخ میں، ضابطہ اس لئے کہا گیا ہے کہ کسی کی شفاعت یا بلا واسطہ حق تعالیٰ کی رحمت سے کسی جہنمی کو اُس سے آزاد کر کے جنت میں پہنچا دینا جیسا کہ بہت سی آیات و روایاتِ حدیث اس پر دلالت کرتی ہیں وہ ایک استثنائی حکم ہے اور اصل ضابطہ جنت یا دوزخ میں ٹھکانے کا وہی ہے جو ان آیات میں بیان فرمایا ہے۔

پہلے اہلِ جہنم کی خاص علامات بیان کی گئی وہ دو ہیں فَاَمَّا مَنْ طَغٰی وَاٰثَرَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا، اول طغیان یعنی اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول کے احکام کی پابندی کے بجائے سرکشی کرنا، دوسرے دُنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دینا۔ یعنی جب ایسا کوئی کام سامنے آئے کہ اسکے اختیار کرنے سے دنیا میں تو آرام یا لذت ملتی ہے مگر آخرت میں اُس پر عذاب مقرر ہے اسوقت وہ دُنیا کی لذت کو ترجیح دے کر آخرت کی فکر کو نظر انداز کر دے۔ جو شخص دُنیا میں ان دو بلاؤں میں مبتلا ہے اس کے لئے فرما دیا فَاِنَّ الْجَحِیْمَ ھِیَ الْمَاْوٰی، یعنی جہنم ہی اُسکا ٹھکانا ہے، اسکے بعد اہلِ جنت کی اسی طرح دو علامتیں بتلائی ہیں وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی،

اوّل یہ کہ جس شخص کو دُنیا میں اپنے ہر عمل ہر کام کے وقت یہ خوف لگا رہا کہ مجھے ایک روز حق تعالیٰ کے سامنے پیش ہو کر ان اعمال کا حساب دینا ہوگا، دوسرے جس نے اپنے نفس کو قابو میں رکھا، ناجائز خواہشوں سے اسکو روکدیا، جس نے دُنیا میں یہ دو وصف حاصل کرلئے قرآن کریم نے اسکو یہ خوشخبری دیدی فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى یعنی جنت ہی اُس کا ٹھکانا ہے۔

مخالفت نفس کے تین درجے آیت مذکورہ میں جنت کے ٹھکانے کی دو شرطیں بتلائی ہیں اور غور کیا جائے تو وہ نتیجہ کے اعتبار سے ایک ہی ہے، کیونکہ پہلی شرط خدا تعالیٰ کے حضور جوابدہی کا خوف ہے۔ دوسری شرط نفس کو ہویٰ سے روکنا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ خدا کا خوف ہی نفس کو اتباعِ ہویٰ سے روکنے والی چیز ہے۔ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں فرمایا کہ مخالفت ہویٰ کے تین درجے ہیں۔

اوّل درجہ تو یہ ہے کہ آدمی اُن عقائد باطلہ سے بچ جائے جو ظاہر نصوص اور اجماعِ سلف کے خلاف ہوں، اس درجہ میں پہنچکر وہ سُنّی مسلمان کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہے۔

متوسّط درجہ یہ ہے کہ وہ کسی معصیت اور گناہ کا ارادہ کرے پھر اس کو یہ بات یاد آجائے کہ مجھے اللہ کے سامنے حساب دینا ہے اس خیال کی بنا پر گناہ کو ترک کردے۔ اسی متوسط درجہ کا تکملہ یہ ہے کہ آدمی شبہات سے بھی پرہیز کرے اور جس مباح و جائز کام میں مشغول ہونے سے کسی ناجائز کام میں مبتلا ہو جانیکا خطرہ ہو اُس جائز کام کو بھی ترک کردے، جیسا کہ حضرت نعمانؓ بن بشیر کی حدیث میں ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جسنے مشتبہات سے پرہیز کرلیا اُسنے اپنی آبرو اور دین کو بچالیا اور جو شخص مشتبہات میں مبتلا ہوگیا وہ بالآخر محرمات میں مبتلا ہو جائیگا، مراد مشتبہات سے وہ کام ہیں جنمیں جائز و ناجائز ہونیکے دونوں احتمال ہوں، یعنی عمل کرنے والے کو یہ شبہ ہو کہ میرے لئے یہ کام جائز ہے یا ناجائز، مثلاً ایک شخص بیمار ہے وضو کرنے پر قادر تو ہے اور اسکا یقین پورا نہیں کہ میرے لئے وضو کرنا اس حالتمیں مضر ہی ہے تو تیمم کا جواز اور عدم جواز مشتبہ ہوگیا اسی طرح کھڑے ہو کر نماز پڑھ توسکتا ہے مگر مشقت بہت زیادہ ہے اسکی وجہ سے یہ اشتباہ ہوگیا کہ بیٹھ کر نماز میرے لئے درست ہے یا نہیں ایسے مواقع میں مشتبہ چیز کو چھوڑ کر یقینی جواز کو اختیار کرنا تقویٰ ہے اور مخالفت کا متوسط درجہ یہی ہے۔

مکائدِ نفس نفس کی مخالفت ان چیزوں میں جو صریح طور سے گناہ اور سیئات ہیں یہ تو اگر کوئی کوشش کرے تو باختیار خود بھی اسمیں کامیابی ہو جاتی ہے لیکن ایک ہوائے نفس وہ ہے جو عبادات اور اعمال حسنہ میں شامل ہو جاتی ہے، ریار و نمود، خود پسندی، یہ ایسے دقیق گناہ اور شدید ہوائے نفس ہیں جس میں انسان اکثر خود بھی دھوکا کھاتا ہے اپنے عمل کو درست و صحیح سمجھتا رہتا ہے اور یہی وہ ہوائے نفس ہے جسکی مخالفت سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ضروری ہے، مگر اس سے بچنے کا صحیح علاج اور مجرب نسخہ اسکے سوا نہیں کہ انسان کوئی ایسا شیخ کامل تلاش کرے جو کسی ماہر شیخ کی خدمتمیں رہ کر مجاہدات کرکے عیوبِ نفس اور انکے معالجہ سے واقف ہو اپنے آپکو اسکے حوالہ کردے اور اسکے مشورہ پر عمل کرے۔

شیخ امام حضرت یعقوب کرخی رحمہ فرماتے ہیں کہ میں اپنی ابتدائی عمر میں نجّار تھا (لکڑی کا کام کرتا تھا) میں نے اپنے نفس میں سستی اور باطن میں ایک قسم کی ظلمت محسوس کی تو ارادہ کیا کہ چند روز روزے رکھوں تاکہ یہ ظلمت اور سستی دُور ہوجائے، اتفاقاً اسی روزے کی حالت میں ایک روز میں شیخ اجل امام بہاؤ الدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا، شیخ نے مہمانوں کے لئے کھانا منگایا اور مجھے بھی کھانے کا حکم دیا اور فرمایا بہت بُرا بندہ ہے جو اپنی ہوائے نفسانی کا بندہ ہو جو اسکو گمراہ کرے اور فرمایا کہ کھانا کھا لینا اُس روزے سے بہتر ہے جو ہوائے نفسانی کے ساتھ ہو، اسوقت مجھے احساس ہوا کہ میرا نفس عُجب و خود پسندی کا شکار ہو رہا تھا جس کو شیخ نے محسوس کیا اور مجھے ثابت ہوگیا کہ ذکر و شغل اور نفلی عبادات میں کسی شیخ کامل کی اجازت و ہدایت درکار ہے کیونکہ وہ مکائدِ نفس سے واقف ہوتا ہے جس نفلی عمل میں کوئی نفس کا کید ہوگا اسی سے روکدیگا، اس وقت میں نے حضرت شیخ نقشبند قدس سرہٗ سے عرض کیا کہ حضرت اگر ایسا شیخ جس کو اصطلاح میں فانی فی اللہ اور باقی باللہ کہا جاتا ہے کسی کو میسر نہ ہو تو وہ کیا کرے، شیخ نے فرمایا کہ اس کو چاہیئے کہ استغفار کی کثرت کرے اور ہر نماز کے بعد بیس۲۰ مرتبہ استغفار کرنے کی پابندی کرے تاکہ پانچ وقت سو مرتبہ استغفار ہوجائے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بعض اوقات میں اپنے قلب میں کدورت محسوس کرتا ہوں اور میں ہر روز اللہ تعالیٰ سے سو مرتبہ استغفار یعنی طلبِ مغفرت کرتا ہوں۔

تیسرا اعلیٰ درجہ مخالفت ہوائے نفسانی کا یہ ہے کہ کثرتِ ذکر اور مجاہدات و ریاضات کے ذریعہ اپنے نفس کو ایسا مُزکّٰی بنالے کہ اسمیں وہ ہوائے نفسانی باقی ہی نہ رہے جو انسان کو شر کی طرف کھینچتی ہے یہ مقام ولایتِ خاصّہ کا مقام ہے اور اُسی شخص کو حاصل ہوتا ہے جس کو صوفیہ کی اصطلاح میں فانی فی اللہ اور باقی باللہ کہا جاتا ہے، یہی لوگ قرآن کی اس آیت کے مصداق ہیں جو شیطان کو مخاطب کرکے کہی گئی ہے اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ، یعنی میرے خاص بندوں پر تیرا قابو نہیں چل سکے گا، اور یہی مصداق ہیں اُس حدیث کے جس میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِہٖ، یعنی تم میں کوئی شخص اسوقت تک مومن کامل نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی ہوائے نفسانی میری تعلیمات کے تابع نہ ہوجائیں (اللہم ارزقناہ بفضلک و کرمک)

آخر سورت میں کفار کے اس معاندانہ سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کی معین تاریخ اور وقت بتلانے پر اصرار کرتے تھے حاصل جواب یہ ہے کہ اسکو حق تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے صرف اپنی ذات کیلئے مخصوص رکھا ہے اسکی اطلاع کسی فرشتے یا رسُول کو بھی نہیں دیگئی ہے اسلئے یہ مطالبہ لغو ہے۔

تمّت سُورۃ النّٰزعات الحمد للہ ۶ر شعبان ۱۳۹۱ھ دوشنبہ

سُوْرَۃُ عَبَسَ

سُوْرَۃُ عَبَسَ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ اِثْنَتَانِ وَاَرْبَعُوْنَ اٰیَۃً وَّفِیْھَا رُکُوْعٌ وَّاحِدٌ وَّکَذَا الخ

سورۂ عبس مکہ میں نازل ہوئی اور اُس کی بیالیس ۴۲ آیتیں ہیں اور ایک رکوع اور اسی طرح آخر تک

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی ﴿۱﴾ اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی ﴿۲﴾ وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰٓی ﴿۳﴾ اَوْ

تیوری چڑھائی اور منہ موڑا اس بات سے کہ آیا اس کے پاس اندھا اور تجھ کو کیا خبر ہے شاید کہ وہ سنورتا یا

یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَہُ الذِّکْرٰی ﴿۴﴾ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی ﴿۵﴾ فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدّٰی ﴿۶﴾ وَ

سوچتا تو کام آتا اس کے سمجھانا وہ جو پروا نہیں کرتا سو تو اس کی فکر میں ہے اور

مَا عَلَیْکَ اَلَّا یَزَّکّٰی ﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنْ جَآءَکَ یَسْعٰی ﴿۸﴾ وَھُوَ یَخْشٰی ﴿۹﴾ فَاَنْتَ

تجھ پر کچھ الزام نہیں کہ وہ نہیں درست ہوتا اور وہ جو آیا تیرے پاس دوڑتا اور وہ ڈرتا ہے سو تو

عَنْہُ تَلَھّٰی ﴿۱۰﴾ کَلَّآ اِنَّھَا تَذْکِرَۃٌ ﴿۱۱﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَکَرَہٗ ﴿۱۲﴾ فِیْ صُحُفٍ

اس سے تغافل کرتا ہے یوں نہیں یہ تو نصیحت ہے پھر جو کوئی چاہے اس کو پڑھے لکھا ہے عزت کے

مُّکَرَّمَۃٍ ﴿۱۳﴾ مَّرْفُوْعَۃٍ مُّطَھَّرَۃٍ ﴿۱۴﴾ بِاَیْدِیْ سَفَرَۃٍ ﴿۱۵﴾ کِرَامٍ بَرَرَۃٍ ﴿۱۶﴾

ورقوں میں اونچے رکھے ہوئے نہایت ستھرے ہاتھوں میں لکھنے والوں کے جو بڑے درجہ والے نیک کار ہیں

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَکْفَرَہٗ ﴿۱۷﴾ مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَہٗ ﴿۱۸﴾ مِنْ نُّطْفَۃٍ

مارا جائیو آدمی کیسا ناشکر ہے کس چیز سے بنایا اس کو ایک بوند سے

خَلَقَہٗ فَقَدَّرَہٗ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَہٗ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ اَمَاتَہٗ فَاَقْبَرَہٗ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اِذَا

بنایا اس کو پھر اندازہ پر رکھا اسکو پھر راہ آسان کر دی اسکو پھر اسکو مردہ کیا پھر قبر میں رکھوا دیا اسکو پھر جب

شَآءَ اَنْشَرَہٗ ﴿۲۲﴾ کَلَّا لَمَّا یَقْضِ مَآ اَمَرَہٗ ﴿۲۳﴾ فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰی

چاہا اُٹھا نکالا اس کو ہرگز نہیں پورا نہ کیا جو اس کو فرمایا اب دیکھ لے آدمی اپنے

وقف لازم

طَعَامِهٖٓ ﴿۲۴﴾ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ﴿۲۵﴾ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ﴿۲۶﴾ فَاَنْۢبَتْنَا
کھانے کو کہ ہم نے ڈالا پانی اوپر سے گرتا ہوا پھر چیرا زمین کو پھاڑ کر پھر اُگایا

فِيْهَا حَبًّا ﴿۲۷﴾ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ﴿۲۸﴾ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ﴿۲۹﴾ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ﴿۳۰﴾ وَّ
اس میں اناج اور انگور اور ترکاری اور زیتون اور کھجوریں اور گھن کے باغ اور

فَاكِهَةً وَّاَبًّا ﴿۳۱﴾ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿۳۲﴾ فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿۳۳﴾
میوہ اور گھاس کام چلانے کو تمھارے اور تمھارے چوپایوں کے پھر جب آئے وہ کان پھوڑنے والی

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ﴿۳۴﴾ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ﴿۳۵﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ﴿۳۶﴾
جس دن کہ بھاگے مرد اپنے بھائی سے اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے اور اپنی ساتھ والی سے اور اپنے بیٹوں سے

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ﴿۳۷﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿۳۸﴾
ہر مرد کو لا ان میں سے اُس دن ایک فکر لگا ہوا ہے جو اسکے لئے کافی ہے کتنے منہ اُسدن روشن ہیں

ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿۳۹﴾ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿۴۰﴾ تَرْهَقُهَا
ہنستے خوشیاں کرتے اور کتنے منہ اُس دن اُن پر گرد پڑی ہے چڑھی آتی ہے

قَتَرَةٌ ﴿۴۱﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿۴۲﴾
اُن پر سیاہی یہ لوگ وہی ہیں جو منکر ہیں ڈھیٹھ

ع ۱ / ۴۲ / ۵

خلاصۂ تفسیر

شانِ نزول ان آیات کے نزول کا قصّہ یہ ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بعض رؤسائے مشرکین کو سمجھا رہے تھے، بعض روایات میں انہیں سے بعض کے نام بھی آئے ہیں۔ ابوجہل بن ہشام، عتبہ بن ربیعہ، اُبیّ بن خلف، اُمیّہ بن خلف، شَیبہ، کہ اتنے میں حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم نابینا صحابی حاضر ہوئے اور کچھ پوچھا، یہ قطع کلام آپکو ناگوار ہوا اور آپ نے ان کی طرف التفات نہیں کیا، اور ناگواری کیوجہ سے آپ چیں بجبیں ہوئے، جب اس مجلس سے اُٹھ کر گھر جانے لگے تو آثار وحی کے نمودار ہوئے اور یہ آیتیں عَبَسَ وَتَوَلّٰی الخ نازل ہوئیں، اسکے بعد جب وہ آپکے پاس آتے آپ بڑی خاطر کرتے تھے ھٰذہ الروایات کلّھا فی الدر المنثور غرض واقعہ مذکور کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ) پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) چیں بجبیں ہوئے اور متوجہ نہ ہوگئے اس بات سے کہ ان کے پاس اندھا آیا (یہاں تو غائب کے صیغہ سے فرمایا اور یہ متکلم کے انتہائی لطف و کرم اور مخاطب کی تکریم ہے کہ رُو در رُو اس امر کی نسبت نہیں فرمائی) اور (آگے خطاب کا صیغہ بطور التفات کے اسلئے اختیار کیا کہ شبہ اعراض کا نہو، ارشاد ہوتا ہے کہ) آپ کو کیا خبر شاید وہ (نابینا آپ کی تعلیم سے پورے طور پر) سنور جاتا یا (کم سے کم کسی خاص امر میں) نصیحت قبول کرتا سو اس کو نصیحت کرنا (کچھ نہ کچھ) فائدہ پہنچاتا، تو جو

شخص (دین سے) بے پرواہی کرتا ہے آپ اس کی تو فکر میں پڑتے ہیں، حالانکہ آپ پر کوئی الزام نہیں کہ وہ نہ سنورے (اُس کی بے پرواہی ذکر کر کے اسکی طرف زیادہ توجّہ نہ دینے کی ہدایت ہے) اور جو شخص آپکے پاس (دین کے شوق میں) دوڑتا ہوا آتا ہے اور وہ (خدا سے) ڈرتا ہے آپ اس سے بے اعتنائی کرتے ہیں (ان آیات میں آپکی اجتہادی لغزش پر آپ کو مطلع کیا گیا ہے، منشاء اس اجتہاد کا یہ تھا کہ یہ امر تو متیقن اور ثابت ہے کہ اہم کام کو مقدم کرنا چاہیئے، آپ نے کفر کی اشدیت کو موجب اہمیت سمجھا جیسے دو بیمار ہوں ایک کو ہیضہ ہو اور دوسرے کو زکام، تو ہیضہ کے مریض کا علاج مقدم ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ مرض کی شدت اُسوقت موجب اہمیت ہے جب دونوں مریض طالب علاج ہوں، لیکن اگر مرض شدید والا علاج کا طالب ہی نہیں بلکہ مخالف ہو تو پھر مقدم وہ ہوگا جو طالب علاج ہے اگرچہ مرض اسکا خفیف ہو آگے ان مشرکین کیطرف اسقدر توجّہ ضروری نہ ہونے کو ارشاد فرماتے ہیں کہ آپ آئندہ) ہرگز ایسا نہ کیجئے (کیونکہ) قرآن (محض ایک) نصیحت کی چیز ہے (اور آپکے ذمہ صرف اسکی تبلیغ ہے) سو جسکا جی چاہے اس کو قبول کرے (اور جو قبول نہ کرے وہ جانے، آپ کا کوئی ضرر نہیں، پھر آپ اسقدر اہتمام کیوں فرماتے ہیں۔ آگے قرآن کے اوصاف بیان فرماتے ہیں کہ) وہ (قرآن لوح محفوظ کے) ایسے صحیفوں میں (ثبت) ہے جو (عنداللہ) مکرم ہیں (یعنی پسندیدہ و مقبول ہیں، اور) رفیع المکان ہیں (کیونکہ لوح محفوظ تحت العرش ہے کما فی الدر المنثور سورۃ البروج، اور وہ) مقدس ہیں (شیاطین خبیثہ کی وہاں تک رسائی نہیں، کقولہ تعالیٰ لَا یَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ) جو ایسے لکھنے والوں (یعنی فرشتوں) کے ہاتھوں میں (رہتے) ہیں کہ وہ مکرم (اور) نیک ہیں (یہ سب صفات اسکے من جانب اللہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں جیساکہ سورۂ واقعہ کی آیت لَا یَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ میں بیان ہوا ہے اور لوح محفوظ ہر چند کہ شئ واحد ہے مگر اسکے اجزاء کو صُحُف سے تعبیر فرمایا، اور ان فرشتوں کو کاتب اسلئے کہا کہ یہ لوح محفوظ سے بامر الٰہی نقل کرنیوالے ہیں۔ حاصل آیات کا یہ ہوا کہ قرآن من جانب اللہ نصیحت کے لئے ہے، آپ نصیحت کر کے اپنے فرض سے فارغ ہوجاویں گے خواہ کوئی ایمان لاوے یا نہ لاوے بس اس قسم کی تقدیم تاخیر کی کوئی ضرورت نہیں، یہانتک آداب تذکیر و تبلیغ کے ہوئے آگے کفار کے اُس سے فائدہ نہ اُٹھانے پر تشنیع ہے کہ منکر) آدمی پر (جو ایسے تذکرہ سے نصیحت حاصل کرے جیسے ابو جہل وغیرہ جن کو آپ سمجھاتے تھے اور وہ نہیں سمجھے تو ایسے شخص پر) خدا کی مار کہ وہ کیسا ناشکرا ہے (وہ دیکھتا نہیں کہ) اللہ تعالیٰ نے اسکو کیسی (حقیر) چیز سے پیدا کیا (آگے جواب ہے کہ) نطفہ سے (پیدا کیا، آگے اسکی کیفیت مذکور ہے کہ بہت سے انقلابات اور تغیرات کے بعد) اسکی صورت بنائی پھر اس (کے اعضا) کو اندازے سے بنایا (جیساکہ سورۂ القیامہ کی آیت فَخَلَقَ فَسَوّٰی میں گزر چکا ہے) پھر اسکو (نکلنے کا) راستہ آسان کر دیا (چنانچہ ظاہر ہے کہ ایسے تنگ موقع سے اچھے خاصے تنومند بچہ کا صحیح سالم نکل آنا صاف دلیل ہے اللہ کے قادر اور عبد کے مقدور ہونیکی) پھر (بعد عمر ختم ہونیکے) اسکو موت دی پھر اسکو قبر میں لے گیا (خواہ اوّل سے خاک میں رکھدیا جائے یا بعد چندے خاک میں ملجائے) پھر جب اللہ چاہے گا اسکو دوبارہ زندہ کر دیگا (مطلب یہ کہ سب تصرفات دلیل ہیں انسان کے داخل قدرت الٰہیہ ہونیکی اور نعمت

بھی ہیں۔ بعضے حسّی بعضے معنوی جسکا مقتضٰی تھا وجوب طاعت وایمان مگر اس نے) ہرگز (شکر) نہیں (ادا کیا اور اس کو جو حکم کیا تھا اس کو بجا نہیں لایا، سو انسان کو چاہیئے کہ (اپنی تخلیق کے ابتدائی حالات پر نظر کرنے کے بعد اسبابِ بقاء و تعیش پر نظر کرے مثلاً) اپنے کھانے کیطرف نظر کرے (تاکہ وہ باعث ہو حق شناسی اور اطاعت و ایمان کا اور آگے نظر کرنے کا طریقہ بتاتے ہیں وہ یہ) کہ ہم نے عجیب طور پر پانی برسایا، پھر عجیب طور پر زمین کو پھاڑا، پھر ہمنے اس میں غلہ اور انگور اور ترکاری اور زیتون اور کھجور اور گنجان باغ اور میوے اور چارہ پیدا کیا (بعضی چیزیں) تمھارے اور (بعضی چیزیں) تمھارے مواشی کے فائدہ کے لئے (اور یہ سب بھی نعمت اور دلیلِ قدرت ہیں، اور اس مجموعہ میں ہر جزو مقتضی ہے وجوبِ شکر ایمان کو، یہاں تک تشنیع ہوگئی نصیحت قبول نہ کرنے پر، آگے عدمِ تذکّر پر سزا اور تذکّر پر ثواب آخرت مذکور ہے۔ یعنی اب تو یہ لوگ ناشکری اور کفر کرتے ہیں) پھر جسوقت کانوں کا بہرا کردینے والا شور برپا ہوگا (یعنی قیامت اُسوقت ساری ناشکری کا مزا معلوم ہوجائیگا، آگے اس دن کا بیان ہے کہ) جس روز (ایسا) آدمی (جسکا اوپر بیان ہوا) اپنے بھائی سے اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹوں سے بھاگے گا (یعنی کوئی کسی کی ہمدردی نہ کریگا، کقولہ تعالیٰ لَا یَسْئَلُ حَمِیْمٌ حَمِیْمًا وجہ یہ کہ) ان میں ہر شخص کو (اپنا ہی) ایسا مشغلہ ہوگا جو اسکو اور طرف متوجہ نہ ہونے دیگا (یہ تو کفار کا حال ہوگا، آگے مجموعۂ مومنین اور کفار کی تفصیل ہے کہ) بہت سے چہرے اس روز (ایمان کی وجہ سے) روشن (اور مسرت سے) خنداں شاداں ہونگے اور بہت سے چہروں پر اس روز (کفر کی وجہ سے) ظلمت ہوگی (اور اس ظلمت کیساتھ) ان پر (غم کی) کدورت چھائی ہوگی یہی لوگ کافر فاجر ہیں (کافر سے اشارہ ہے فسادِ عقائد کی طرف اور فاجر سے فسادِ اعمال کی طرف)

معارف و مسائل

شانِ نزول میں جو واقعہ حضرت عبداللہ ابن اُمِّ مکتوم نابینا صحابی رضؓ کا نقل کیا گیا ہے اسمیں بغوی نے یہ مزید روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ رضؓ کو نابینا ہونے کے سبب یہ تو معلوم نہیں ہوسکا کہ آپ کسی دوسرے سے گفتگو میں مشغول ہیں، مجلس میں داخل ہو کر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو آواز دینی شروع کی اور بار بار آواز دی (مظہری) اور ابن کثیر کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اُنھوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے ایک آیت قرآن پڑھوانے کا سوال کیا اور اس سوال کے فوری جواب دینے پر اصرار کیا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اسوقت مکہ کے کفار سرداروں کو دین کی تبلیغ کرنے اور سمجھانے میں مصروف تھے۔ یہ سردار عتبہ بن ربیعہ، ابوجہل ابن ہشام اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضؓ تھے جو اسوقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس موقع پر عبداللہ ابن امّ مکتوم رضؓ کا اس طرح خطاب کرنا اور ایک آیت کے الفاظ درست کرسکنے معمولی سوال پر فوری جواب کے لئے اصرار کرنا ناگوار ہوا جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ عبداللہ ابن ام مکتوم رضؓ پکّے مسلمان اور ہر وقت کے حاضر باش

تھے دوسرے اوقات میں بھی سوال کر سکتے تھے، ان کے جواب کے مؤخر کرنے میں کسی دینی نقصان کا خطرہ نہ تھا بخلاف رؤسائے قریش کے کہ نہ یہ لوگ ہر وقت آپکی خدمت میں آتے ہیں اور نہ ہر وقت اُن کو اللہ کا کلمہ پہنچایا جاسکتا ہے، اسوقت یہ لوگ آپ کی بات سُن رہے تھے جس سے انکے ایمان لانیکی توقع کیجا سکتی تھی اور ان کی بات کاٹ دیجاتی تو ایمان ہی سے محرومی انکی ظاہر تھی۔ ان مجموعۂ حالات کیوجہ سے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ابن ام مکتوم رض سے رُخ پھیر کر اپنی ناگواری کا اظہار فرمایا اور جو گفتگو تبلیغ حق کی رؤسائے قریش کے ساتھ جاری تھی اُس کو جاری رکھا، اس پر مجلس سے فارغ ہونے کے وقت سورۂ عبس کی آیاتِ مذکورہ نازل ہوئیں جس میں آپ کے اس طرزِ عمل کو ناپسندیدہ قرار دے کر آپ کو ہدایت کی گئی۔

رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ طرزِ عمل اپنے اجتہاد پر مبنی تھا کہ جو مسلمان آدابِ مجلس کیخلاف طرزِ گفتگو اختیار کرے اسکو کچھ تنبیہ ہونی چاہیئے تاکہ آئندہ وہ آدابِ مجلس کی رعایت کرے اس کے لئے تو آپ نے حضرت ابن اُمّ مکتوم سے رُخ پھیر لیا، اور دوسری بات یہ تھی کہ بظاہر حال کفر و شرک سب سے بڑے گناہ ہیں انکے ازالہ کی فکر مقدم ہونا چاہیئے بمقابلۂ دین کے فروعی احکام کی تعلیم کے جو عبداللہ ابن اُمّ مکتوم چاہتے تھے مگر حق تعالٰے جل شانہٗ نے آپکے اس اجتہاد کو درست قرار نہیں دیا اور اس پر متنبہ فرمایا کہ یہاں قابلِ غور یہ بات تھی کہ ایک شخص جو آپ سے دینی تعلیم کا طالب ہو کر سوال کر رہا ہے اسکے جواب کا فائدہ تو یقینی ہے اور جو آپکا مخالف ہے آپ کی بات سُننا بھی پسند نہیں کرتا اُس سے گفتگو کا فائدہ موہوم ہے، موہوم کو یقینی پر ترجیح نہ ہونا چاہیئے اور عبداللہ ابن اُمّ مکتوم سے جو آدابِ مجلس کیخلاف بات سرزد ہوئی اُن کا عذر قرآن نے لفظ اعمٰی کہکر بتلا دیا کہ وہ نابینا تھے اسلئے اس کو نہ دیکھ سکتے تھے کہ آپؐ اسوقت کس شغل میں ہیں، کن لوگوں سے گفتگو چل رہی ہے اسلئے وہ معذور تھے، مستحقِ اعراض نہیں تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی معذور آدمی سے بیخبری میں کوئی بات آدابِ مجلس کے خلاف ہو جائے تو وہ قابلِ عتاب نہیں ہوتا۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰی، عَبَسَ کے معنے ترشروئی اختیار کرنا یعنی چہرہ سے اظہارِ ناگواری کرنا اور تَوَلّٰی کے معنے رُخ پھیر لینے کے ہیں۔ اس جگہ موقع اسکا تھا کہ یہ الفاظ آپ کو بصیغۂ خطاب کہے جاتے کہ آپ نے ایسا کیا۔ لیکن قرآن کریم نے صیغۂ خطاب کے بجائے صیغۂ غائب اختیار کیا جس میں عتاب کی حالتمیں بھی رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اکرام ملحوظ رکھا گیا اور صیغہ غائب اختیار کر کے یہ ایہام کیا کہ جیسے یہ کام کسی اور نے کیا ہو اشارہ اس طرف ہے کہ یہ کام آپکے شایانِ شان نہیں، اور دوسرے جملے میں خود رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عذر کی طرف اشارہ فرما دیا وَمَا یُدْرِیْکَ (یعنی آپ کو کیا خبر) اس میں بتلا دیا کہ اعراض کی وجہ یہ پیش آئی ہے کہ آپؐ کا دھیان اس طرف نہیں گیا کہ یہ صحابی جو کچھ دریافت کر رہے ہیں اسکا اثر یقینی ہے اور غیروں سے گفتگو کا اثر موہوم۔ اور اس دوسرے جملے میں صیغۂ غائب چھوڑ کر صیغہ خطاب کا اختیار فرمانے میں بھی رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تکریم اور دلجوئی ہے کہ اگر بالکل خطاب کا صیغہ استعمال نہ ہوتا تو یہ شبہ

ہو سکتا تھا کہ اس طرز عمل کی ناپسندیدگی ترکِ خطاب کا سبب بن گئی جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک ناقابلِ برداشت رنج و الم ہوتا، اسلئے جس طرح پہلے جملہ میں خطاب کے بجائے غائب کا صیغہ استعمال کرنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تکریم ہے اسی طرح دوسرے جملے میں خطاب کرنا بھی آپ کی تکریم اور دلجوئی ہے۔

لَعَلَّهٗ یَزَّكّٰۤى اَوْ یَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى، یعنی آپ کو کیا معلوم کہ یہ صحابی جو بات دریافت کر رہے تھے اس کا افادہ متیقن تھا کہ آپ اُن کو تعلیم دیتے تو یہ اُس کے ذریعہ اپنے نفس کا تزکیہ کرلیتے اور کمال حاصل کرلیتے اور یہ بھی نہ ہوتا تو کم از کم اس ذکر اللہ سے وہ ابتدائی نفع اُٹھاتے کہ اس سے انکے دل میں اللہ تعالےٰ کی محبت اور خوف کی ترقی ہوجاتی۔ لفظ ذکریٰ کے معنے کثرتِ ذکر کے ہیں (کذا فی الصحاح)

یہاں قرآن کریم نے دو جملے اختیار فرمائے یَزَّكّٰى اور یَذَّكَّرُ، پہلے کے معنے پاک صاف ہوجانے کے ہیں اور دوسرے کے معنے نصیحت حاصل کرنے اور ذکر سے متأثر ہونے کے ہیں۔ پہلا مقام ابرار و اتقیاء کا ہے۔ جو اپنے نفس کو ظاہری اور باطنی ہر قسم کی گندگیوں سے پاک صاف کرلیں اور دوسرا مقام طریق دین پر چلنے کے ابتدائی حال کا ہے کہ مبتدی کو اللہ کی یاد دلائی جاتی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی عظمت و خوف اسکے دل میں مستحضر ہوجاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو تعلیم دینا نفع سے کسی حال خالی نہیں تھا خواہ نفع کامل ہوجاتا کہ تزکیۂ نفس مکمل حاصل کرلیتے یا ابتدائی نفع حاصل ہوتا کہ اللہ کی یاد اور عظمت و خوف انکے دل میں بڑھ جاتا اور دونوں جملے بحرف تردید یعنی اَوْ کے ساتھ استعمال کئے گئے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک حال ضرور حاصل ہوتا اس میں اصطلاحی مانعۃ الخلو ہے یعنی احتمال یہ بھی ہے کہ دونوں نفع جمع ہوجائیں کہ ابتداءً تذکر ہو اور اسکے بعد تزکیہ، مانعۃ الجمع نہیں کہ دونوں جمع نہ ہوسکیں (مظہری)

تبلیغ و تعلیم کے لئے ایک اہم اُصولِ قرآنی اس موقع میں یہ تو ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو کام بیک وقت آگئے، ایک مسلمان کو تعلیم اور اُس کی تکمیل اور دلجوئی، دوسرے غیر مسلموں کی ہدایت کے لئے اُن کی طرف توجہ۔ قرآن کریم کے اس ارشاد نے یہ واضح کردیا کہ پہلا کام دوسرے کام پر مقدم ہے۔ دوسرے کام کی وجہ سے پہلے کام میں تاخیر کرنا یا کوئی خلل ڈالنا درست نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی تعلیم اور اُن کی اصلاح کی فکر غیر مسلموں کو اسلام میں داخل کرنے کی فکر سے اہم اور مقدم ہے۔

اس میں اُن علماء کے لئے ایک اہم ہدایت ہے جو غیر مسلموں کے شبہات کے ازالے اور ان کو اسلام سے مانوس کرنے کی خاطر بعض ایسے کام کر بیٹھتے ہیں جن سے عام مسلمانوں کے دلوں میں شکوک شبہات یا شکایات پیدا ہوجاتی ہیں اُن کو اس قرآنی ہدایت کے مطابق مسلمانوں کی حفاظت اور اصلاحِ حال کو مقدم رکھنا چاہیئے، اکبر مرحوم نے خوب فرمایا ؎

بے وفا سمجھیں تمھیں اہلِ حرم اس سے بچو ⁂ دَیر والے کج ادا کہدیں یہ بدنامی بھلی

بعد کی آیتوں میں قرآن کریم نے اسی بات کو پوری وضاحت سے بیان فرمایا ہے کہ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى

فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی ، یعنی جو شخص آپ سے اور آپ کے دین سے استغنار اور بے رُخی برت رہا ہے آپ اُس کے تو درپے ہیں کہ کسی طرح یہ مُسلمان ہو جائے حالانکہ یہ آپ کے ذمّہ نہیں، اور اگر وہ مُسلمان نہ ہو تو آپ پر کوئی الزام نہیں، اور جو شخص دوڑتا ہوا طلب علم دین کے لئے آیا اور وہ خدا تعالےٰ سے ڈرنے والا بھی ہے آپ اُسکی طرف توجہ نہیں دیتے۔ اس میں واضح طور پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی گئی کہ مسلمانوں کی تعلیم اور اصلاح و تربیت کرکے اُن کو پکّا مسلمان اور قوی مؤمن بنانا یہ غیر مُسلموں کو اسلام میں داخل کرنے کی فکر سے زیادہ اہم اور مقدّم ہے اس کی فکر زیادہ چاہیئے۔ واللہ اعلم۔ اس کے بعد قرآن مجید کا اللہ کی طرف سے تذکرہ نصیحت ہونا اور اسکا مکرم عالیشان ہونا بیان فرمایا ہے۔

فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ، صحف سے مراد لوحِ محفوظ ہے وہ اگرچہ ایک ہی ہے مگر اسکو بصیغۂ جمع صحف سے تعبیر اس لئے کیا گیا کہ اس میں سب صحائفِ آسمانی لکھے ہوتے ہیں یا اس لئے کہ فرشتے اپنے صحیفے اُس سے نقل کرتے ہیں۔ مرفوعہ سے مراد اُن صحیفوں کا عنداللہ عالیشان ہونا ہے۔ اور مطہّرہ سے مُراد یہ ہے کہ جنابت والے آدمی اور حیض نفاس والی عورت اور بے وضو کے لئے اُن کا چھونا جائز نہیں۔

بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۝ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ، سَفَرَہ بفتحتین سافر کی جمع بھی ہوسکتی ہے جس کے معنی کاتب کے ہیں، اس صورت میں اس سے مراد فرشتے، کرام کاتبین یا انبیار علیہم السلام اور اُن کی وحی کو لکھنے والے حضرات ہوں گے۔ حضرت ابن عباسؓ اور مجاہد سے یہی تفسیر منقول ہے۔

اور لفظ سَفَرَة، سفیر بمعنے قاصد کی جمع بھی ہوسکتی ہے، اس صورت میں اس سے مراد رُسل ملائکہ اور انبیار علیہم السلام اور وحی کی کتابت کرنے والے حضرات صحابہ ہوں گے، اور علمائے اُمت بھی اسمیں داخل ہیں، کیونکہ وہ بھی رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور اُمت کے درمیان سفیر اور قاصد ہیں۔ حدیث میں ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص قرآن پڑھتا ہے اور وہ قرارت میں بھی ماہر ہے تو وہ سَفَرہ کرام ابرار کے ساتھ ہے۔ اور جو شخص ماہر نہیں مگر تکلّف کے ساتھ مشقّت اُٹھا کر قرارت صحیح کرلیتا ہے اُس کے لئے دوہرا اجر ہے (رواہ الشیخان عن عائشہ رض۔ مظہری) اس سے معلوم ہوا کہ غیر ماہر کو دو اجر ملتے ہیں ایک قرارتِ قرآن کا دوسرا مشقت اُٹھانے کا۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ماہر کو بے شمار اجر ملیں گے (مظہری)

سابقہ آیات میں قرآن کریم کا عالیشان واجب الایمان ہونا بیان کرنے کے بعد کافر انسان جو قرآن کے منکر ہیں اُن پر لعنت اور اللہ کی نعمت کی ناشکری پر تنبیہ ہے اور قرآن کا منجانب اللہ ایک نعمتِ عظیم ہونا تو ایک معنوی چیز ہے جس کو اہلِ علم و فہم ہی سمجھ سکتے ہیں، آگے اُن انعاماتِ الٰہیہ کا ذکر ہے جو انسان کی تخلیق سے آخر تک انسان پر مبذول ہوتے رہتے ہیں۔ یہ مادّی اور محسوس چیز ہے جسکو ادنیٰ شعور والا انسان بھی سمجھ سکتا ہے۔ اسی سلسلے میں تخلیقِ انسانی کا ذکر فرمایا مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ۝ مِنْ نُّطْفَةٍ پہلے تو اس میں ایک سوال کیا گیا کہ اے انسان تو غور کر کہ تجھے اللہ نے کس چیز سے پیدا کیا ہے اور چونکہ اسکا

جواب متعین ہے، اس کے سوا کوئی دوسرا جواب ہو ہی نہیں سکتا، اسلئے پھر خود ہی فرمایا مِنْ نُّطْفَةٍ، یعنی انسان کو نطفہ سے پیدا کیا، پھر فرمایا خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ، یعنی یہی نہیں کہ نطفہ سے ایک جاندار کا وجود بنا دیا بلکہ اس کو ایک خاص اندازہ اور بڑی حکمت سے بنایا، اُس کے قد و قامت اور جسامت اور شکل و صورت اور اعضاء کے طول و عرض اور جوڑ بند اور آنکھ ناک کان وغیرہ کی تخلیق میں ایسا اندازہ قائم فرمایا کہ ذرا اسکے خلاف ہو جائے تو انسان کی صورت بگڑ جائے اور کام کاج مصیبت بن جائے۔

اور لفظ قَدَّرَهٗ سے یہاں یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ انسان جس وقت بطنِ مادر میں زیر تخلیق ہوتا ہے اُس وقت اللہ تعالیٰ اس کی چار چیزوں کی مقدار لکھدیتے ہیں، وہ یہ کہ وہ کیا کیا اور کیسے کیسے عمل کریگا، اسکی عمر کتنی ہوگی، اس کو رزق کتنا ملے گا، اور وہ انجام کار سعید و نیک بخت ہوگا یا شقی بدبخت (کما فی حدیث ابن مسعود رضؓ عند الشیخین)

ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ، یعنی حق تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے انسان کی تخلیق بطن مادر کی تین اندھیریوں اور ایسے محفوظ مقام میں فرمائی کہ جس کے پیٹ میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے اسکو بھی اس تخلیق کی تفصیل کی کچھ خبر نہیں، پھر یہ زندہ تمام اعضاء و جوارح سے مکمل انسان جس جگہ میں بنا ہے وہاں سے اس دنیا میں آنیکا راستہ بھی باوجود تنگ ہونیکے حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ ہی نے آسان فرما دیا کہ چار پانچ پونڈ کا وزنی جسم صحیح سالم برآمد ہو جاتا ہے اور ماں کے وجود کو بھی اس سے کوئی خاص نقصان نہیں پہنچتا۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ

ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ، تخلیقِ انسانی کی ابتدا بیان کرنے کے بعد اس کی انتہا موت اور قبر پر ہے اسکا ذکر بسلسلہ انعامات فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی موت درحقیقت کوئی مصیبت نہیں نعمت ہی ہے۔ حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تحفة المؤمن الموت کہ مؤمن کا تحفہ موت ہی اور اسمیں مجموعہ عالم کے اعتبار سے بڑی حکمتیں ہیں، اور فَاَقْبَرَهٗ کے معنی پھر اس کو قبر میں داخل کیا یہ بھی ایک انعام ہے کہ انسان کو حق تعالیٰ نے عام جانوروں کی طرح نہیں رکھا کہ مر گیا تو وہیں زمین پر سڑتا اور پھولتا پھٹتا ہے، بلکہ اُسکا اکرام یہ کیا گیا کہ اُس کو نہلا کر نئے اور پاک صاف کپڑوں میں ملبوس کر کے احترام کے ساتھ قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے۔

مسئلہ - اس آیت سے معلوم ہوا کہ مُردہ انسان کو دفن کرنا واجب ہے۔

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ، اس میں تخلیقِ انسانی کی ابتدا و انتہا اور انمیں حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور انعامات کا ذکر کرنے کے بعد منکر انسان کو تنبیہ کی گئی کہ ان آیاتِ الٰہیہ اور انعامات کا تقاضا تھا کہ انسان ان میں غور کر کے اللہ پر ایمان لاتا اور اسکے احکام کی تعمیل کرتا مگر اس بدنصیب نے ایسا نہیں کیا، آگے پھر اُن انعاماتِ الٰہیہ کا تذکرہ ہے جو تخلیقِ انسانی کی ابتدا و انتہا کے درمیانی زمانے میں انسان پر مبذول ہوتے ہیں کہ انسان کا رزق کس طرح پیدا کیا جاتا ہے کہ آسمان سے پانی برستا ہے، بیج اور دانہ جو زمین میں مدفون ہی یہ بارش

اسمیں ایک حیاتِ نباتی پیدا کرتی ہے جس کے ذریعہ ایک نحیف وضعیف کونپل زمین کو شق کرکے اوپر نکلتی ہے اور پھر اس سے انواع واقسام کے غلے میوے اور باغات وجود میں آتے ہیں۔ ان سب انعاماتِ الٰہیہ پر انسان کو مکرر شکور تنبیہ کے بعد آخر سورت میں پھر قیامت کا ذکر ہے۔

فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ، صاخّہ ایسے شور اور سخت آواز کو کہتے ہیں جس سے انسان کے کان بہرے ہو جائیں مراد اس سے شورِ قیامت یعنی نفخِ صور ہے۔

يَوۡمَ يَفِرُّ الۡمَرۡءُ مِنۡ اَخِيۡهِ ، یہ محشر میں سب کے جمع ہونے کے وقت کا بیان ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے فکر میں اور نفسی نفسی کے عالم میں ہوگا، دنیا میں جو رشتے ناتے ایسے ہیں کہ لوگ ایک دوسرے پر اپنی جان تک قربان کر دیتے ہیں اُس عالم میں ہر شخص اپنی اپنی ایسی فکر میں مبتلا ہوگا کہ کوئی کسی کی خبر نہ لے سکے گا بلکہ سامنے دیکھے گا تو بھی گریز کریگا۔ انسان اپنے بھائی سے ماں باپ سے بیوی اور اولاد سے منہ چھپاتا بھاگتا پھریگا، دُنیا میں تعاون وتناصر اور امداد باہمی بھائیوں میں ہوتی ہے اس سے زیادہ ماں باپ کی امداد واعانت کی فکر ہوتی ہے طبعی طور پر اُن سے بھی زیادہ بیوی اور اولاد سے تعلق ہو جاتا ہے اسمیں ادنیٰ سے اعلیٰ تعلق کیطرف ترتیب سے بیان فرمایا ہے، آگے اس میدانِ حشر میں مؤمنین اور کفار کے انجام کا ذکر کرکے سورت ختم کی گئی ہے۔

تمت سورۂ عبس والحمد للہ لیلۃ الاربعاء ۷ شعبان سنہ ۱۳۹۱ھ

سُوْرَۃُ التَّکْوِیْر

سُوْرَۃُ التَّکْوِیْرِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ تِسْعٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰیَۃً

سورۂ تکویر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی انتیس ۲۹ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ ﴿۱﴾ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْکَدَرَتْ ﴿۲﴾ وَاِذَا الْجِبَالُ سُیِّرَتْ ﴿۳﴾ وَ

جب سورج کی دھوپ تہ ہوجائے اور جب تارے میلے ہوجائیں اور جب پہاڑ چلائے جائیں اور

اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ﴿۴﴾ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ﴿۵﴾ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ﴿۶﴾ وَ

جب بیاتی اونٹنیاں چھٹی پھریں اور جب جنگل کے جانوروں میں رول پڑجائے اور جب دریا جھونکے جائیں اور

اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ﴿۷﴾ وَاِذَا الْمَوْءٗدَۃُ سُئِلَتْ ﴿۸﴾ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ﴿۹﴾

جب جیوں کے جوڑے باندھے جائیں اور جب بیٹی جیتی گاڑدی گئی کو پوچھیں کہ کس گناہ پر وہ ماری گئی

وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ﴿۱۰﴾ وَاِذَا السَّمَآءُ کُشِطَتْ ﴿۱۱﴾ وَاِذَا الْجَحِیْمُ سُعِّرَتْ ﴿۱۲﴾ وَ

اور جب اعمالنامے کھولے جائیں اور جب آسمان کا پوست اُتار لیں اور جب دوزخ دہکائی جائے اور

اِذَا الْجَنَّۃُ اُزْلِفَتْ ﴿۱۳﴾ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ﴿۱۴﴾ فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ﴿۱۵﴾

جب بہشت پاس لائی جائے جان لیگا ہر ایک جی جو لے کر آیا، سو قسم کھاتا ہوں میں پیچھے ہٹ جانیوالوں

الْجَوَارِ الْکُنَّسِ ﴿۱۶﴾ وَالَّیْلِ اِذَا عَسْعَسَ ﴿۱۷﴾ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ﴿۱۸﴾ اِنَّہٗ

سیدھے چلنے والوں دبک جانیوالوں کی، اور رات کی جب پھیل جائے اور صبح کی جب دم بھرے مقرر یہ

لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ ﴿۱۹﴾ ذِیْ قُوَّۃٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ ﴿۲۰﴾ مُّطَاعٍ

کہا ہے ایک بھیجے ہوئے عزت والے کا قوت والا عرش کے مالک کے پاس درجہ پانے والا سب کا مانا ہوا

ثَمَّ اَمِیْنٍ ﴿۲۱﴾ وَمَا صَاحِبُکُمْ بِمَجْنُوْنٍ ﴿۲۲﴾ وَلَقَدْ رَاٰہُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ ﴿۲۳﴾ وَ

وہاں کا معتبر ہے اور یہ تمھارا رفیق کچھ دیوانہ نہیں اور اسنے دیکھا ہے اس فرشتے کو آسمان کے کھلے کنارہ کے پاس اور

مَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ ﴿٢٤﴾ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيمٍ ﴿٢٥﴾ فَأَيْنَ تَذْهَبُونَ ﴿٢٦﴾

یہ غیب کی بات بتانے میں بخیل نہیں اور یہ کہا ہوا نہیں کسی شیطان مردود کا پھر تم کدھر چلے جا رہے ہو

إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِينَ ﴿٢٧﴾ لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَسْتَقِيمَ ﴿٢٨﴾ وَمَا

یہ تو ایک نصیحت ہے جہان بھر کے واسطے جو کوئی چاہے تم میں سے کہ سیدھا چلے اور تم

تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِينَ ﴿٢٩﴾

جبھی چاہو کہ چاہے اللہ سارے جہان کا مالک

ع ۲۹

خُلاصۂ تفسیر

جب آفتاب بے نور ہو جاویگا اور جب ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر پڑیں گے اور جب پہاڑ چلائے جاویں گے اور جب دس مہینے کی گابھن اُونٹنیاں چھٹی پھریں گی، اور جب وحشی جانور (مارے گھبراہٹ کے) سب جمع ہو جاوینگے اور جب دریا بھڑکائے جاویں گے (یہ چھ واقعے تو نفخۂ اولیٰ کے وقت ہونگے جبکہ دُنیا آباد ہوگی اور اس نفخہ سے یہ تغیرات و تبدلات واقع ہونگے اور اُسوقت اُونٹنیاں وغیرہ بھی اپنی اپنی حالت پر ہونگی جنمیں بعضے وضع حمل کے قریب ہونگی جو کہ عرب کے نزدیک سب سے زیادہ قیمتی مال ہے جس کی ہر وقت دیکھ بھال کرتے رہتے ہیں مگر اسوقت ہل چل میں کسی کو کہیں کا ہوش نہ رہیگا اور وحوش بھی مارے گھبراہٹ کے سب گڈمڈ ہو جاوینگے اور دریاؤں میں اوّل طغیانی پیدا ہوگی اور زمین میں شقوق واقع ہو جاویں گے جس سے سب شیریں اور شور دریا ایک ہو جاوینگے جسکا ذکر آئندہ سُورت میں وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ میں فرمایا ہے۔ پھر شدّتِ حرارت سے سب کا پانی آگ ہو جاویگا، شاید اوّل ہوا ہو جاوے پھر ہوا آگ بنجاوے اسکے بعد عالم فنا ہو جاویگا) اور (اگلے چھ واقعات بعد نفخۂ ثانیہ کے ہونگے جنکا بیان یہ ہے کہ) جب ایک ایک قسم کے لوگ اکٹھے کئے جاویں گے (کافر الگ مُسلمان الگ، پھر انمیں ایک ایک طریقہ کے الگ الگ) اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جاویگا کہ وہ کس گناہ پر قتل کیگئی تھی (مقصود اس پُوچھنے سے زندہ درگور کرنیوالے ظالموں کا اظہارِ جرم ہے) اور جب نامۂ اعمال کھولدئیے جاوینگے (تاکہ سب اپنے اپنے عمل دیکھ لیں کقولہ تعالیٰ يَلْقٰهُ مَنْشُوْرًا) اور جب آسمان کھُل جاوے گا (اور اسکے کھلنے سے آسمان کے اُوپر کی چیزیں نظر آنے لگیں گی اور نیز اُسکے کھلنے سے غمام کا نزول ہوگا جسکا ذکر پارۂ ۱۹ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ، آیت وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَاءُ الخ میں آیا ہے) اور جب دوزخ (اور زیادہ) دہکائی جاویگی، اور جب جنت نزدیک کردی جاویگی (کما فی سورۂ قٓ وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، جب یہ سب واقعات نفخۂ اُولیٰ اور ثانیہ کے واقع ہو جاوینگے تو اُسوقت) ہر شخص اُن اعمال کو جان لیگا جو لیکر آیا ہے (اور جب ایسا واقعہ ہائلہ ہونیوالا ہے) تو (میں منکرین کو اسکی حقیقت بتلاتا ہوں اور مصدقین کو اسکے لئے آمادہ کرتا ہوں، اور یہ دونوں امر قرآن کی تصدیق اور اسپر عمل کرنے سے حاصل ہوتے ہیں کہ اسمیں اسکا اثبات اور نجات کا طریق ہے

اِسلئے) میں قسم کھاتا ہوں ان ستاروں کی جو (سیدھے چلتے چلتے) پیچھے کو ہٹنے لگتے ہیں (اور پھر پیچھے ہی کو) چلتے رہتے ہیں (اور کبھی پیچھے چلتے چلتے اپنے مطالع میں) جا چھپتے ہیں (ایسا امر پانچ سیاروں کو پیش آتا ہے کہ کبھی سیدھے چلتے ہیں کبھی پیچھے چلتے ہیں اور اُن کو خمسہ متحیرہ کہتے ہیں۔ زحل، مشتری، عطارد، مریخ، زہرہ) اور قسم ہے رات کی جب وہ جانے لگے، اور قسم ہے صبح کی جب وہ آنے لگے (آگے جواب قسم ہے) کہ یہ قرآن (اللہ کا) کلام ہے ایک معزز فرشتہ (یعنی جبرئیل علیہ السلام) کا لایا ہوا جو قوت والا ہے (کما فی النجم عَلَّمَہٗ شَدِیۡدُ الۡقُوٰی) اور مالکِ عرش کے نزدیک ذی رُتبہ ہے (اور) وہاں (یعنی آسمانوں میں) اسکا کہنا مانا جاتا ہے (یعنی فرشتے اسکا کہنا مانتے ہیں جیسا حدیثِ معراج سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انکے کہنے سے فرشتوں نے آسمانوں کے دروازے کھولدیئے اور) امانتدار ہے (کہ وحی کو صحیح پہنچا دیتا ہے پس وحی لانیوالا تو ایسا ہے) اور (آگے جن پر وحی نازل ہوئی اُن کی نسبت ارشاد ہے کہ) یہ تمہارے ساتھ کے رہنے والے (محمد صلے اللہ علیہ وسلم جنکا حال بخوبی تم کو معلوم ہی) مجنون نہیں ہیں (جیسا منکرینِ نبوت کہتے تھے) اور انہوں نے اس فرشتہ کو (اصلی صورت میں آسمان کے) صاف کنارہ پر دیکھا بھی ہے (صاف کنارہ سے مراد بلند کنارہ ہے کہ صاف نظر آتا ہے کما فی النجم وَہُوَ بِالۡاُفُقِ الۡاَعۡلٰی، اور اسکا مفصل بیان سورۂ نجم میں گزرا ہے) اور یہ پیغمبر مخفی (بتلائی ہوئی وحی کی) باتوں پر بخل کرنیوالے بھی نہیں (جیسا کاہنوں کی عادت تھی کہ رقم لے کر کوئی بات بتلاتے تھے اس سے کہانت کی بھی نفی ہوگئی اور اس کی بھی کہ آپ اپنے کام کا کسی سے معاوضہ لیں) اور یہ قرآن کسی شیطان مردود کی کہی ہوئی بات نہیں ہے (اس سے نفی کہانت کی اور تاکید ہوگئی، حاصل یہ کہ نہ آپ مجنون ہیں نہ کاہن، نہ صاحبِ غرض، اور وحی لانیوالے کو پہچانتے بھی ہیں اور وحی لانیوالا ایسا ایسا ہے پس لا محالہ یہ اللہ کا کلام اور آپ اللہ کے رسُول ہیں، اور یہ قسمیں مطلوب مقام کے نہایت مناسب ہیں چنانچہ ستاروں کا سیدھا چلنا اور لَوٹنا اور چھپ جانا مشابہ ہے فرشتے کے آنے اور واپس جانے اور عالمِ ملکوت میں جا چھپنے کے اور رات کا گزرنا اور صبح کا آنا مشابہ ہے قرآن کے سبب ظلمتِ کفر کے رفع ہو جانے اور نورِ ہدایت کے ظاہر ہو جانے کے، جب یہ بات ثابت ہے) تو تم لوگ (اس بارہ میں) کدھر کو چلے جا رہے ہو (کہ نبوت کے مُنکر ہو رہے ہو) بس یہ تو (بالعموم) دُنیا جہان والوں کے لئے ایک بڑا نصیحت نامہ ہے (اور بالخصوص) ایسے شخص کے لئے جو تم میں سے سیدھا چلنا چاہے (عام لوگوں کے لئے ہدایت اس معنے سے ہے کہ اُن کو سیدھا راستہ بتلایا اور مؤمنین متقین کے لئے اس معنے سے کہ اُن کو منزلِ مقصود پر پہنچا دیا) اور (بعض کے نصیحت قبول نہ کرنے سے اسکے نصیحتنامہ ہونے میں شبہ نہ کیا جاوے کیونکہ) تم بدون خدائے رب العالمین کے چاہے کچھ نہیں چاہ سکتے ہو (یعنی فی نفسہٖ تو نصیحت ہے لیکن تاثیر اس کی موقوف مشیت پر ہے جو بعض لوگوں کے لئے متعلق ہوتی ہے اور بعض کے لئے کسی حکمت سے متعلق نہیں ہوتی)

معارف و مسائل

اِذَا الشَّمۡسُ كُوِّرَتۡ، تکویر سے مشتق ہے اسکے معنے بے نور ہو جانے کے بھی آتے ہیں۔ حسن بصری رح کی یہی تفسیر ہے اور اسکے معنے ڈالدینے پھینک دینے کے بھی آتے ہیں۔ ربیع ابن خیثم نے اسکی یہی تفسیر کی ہے کہ مراد اس سے یہ ہے کہ آفتاب کو سمندر میں ڈالدیا جائیگا جس کی گرمی سے سارا سمندر آگ بن جائیگا، اور ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہو سکتا ہے کہ اول آفتاب کو بے نور کر دیا جائے پھر اس کو سمندر میں ڈالدیا جائے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضہ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شمس و قمر قیامت کے دن دریا میں ڈالدیئے جاوینگے اور مسند بزار میں اس کیساتھ یہ بھی ہے کہ جہنم میں ڈالدیئے جاوینگے ابن ابی حاتم، ابن ابی الدنیا اور ابو الشیخ نے ان آیات کے متعلق یہ نقل کیا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ شمس قمر اور تمام ستارونکو سمندر میں ڈالدیں گے اور پھر اُس پر تیز ہوا چلے گی جس سے سارا سمندر آگ ہو جاویگا، اس طرح یہ کہنا بھی صحیح ہو گیا کہ شمس و قمر کو دریا میں ڈالدیا جائے گا، اور یہ کہنا بھی درست رہا کہ جہنم میں ڈالدیا جائیگا کیونکہ سارا سمندر اسوقت جہنم بن جائے گا۔ (مستفاد من المظہری والقرطبی)

وَإِذَا النُّجُومُ انكَدَرَتۡ، انکدار سے مشتق ہے اسکے معنے سقوط اور گرنے کے ہیں سلف سے یہی تفسیر منقول ہے اور مُراد یہ ہے کہ آسمان کے سب ستارے سمندر میں گر پڑیں گے جیساکہ مذکورہ روایات میں اسکی تفصیل آ چکی ہے

وَإِذَا الۡعِشَارُ عُطِّلَتۡ، یہ عرب کی عادت کیمطابق بطور مثال کے فرمایا ہے کیونکہ اسکے پہلے مخاطب عرب لوگ تھے انکے نزدیک دس مہینے کی گابھن اونٹنی ایک بڑی دولت سمجھی جاتی تھی کہ اُس سے دودھ اور بچے کا انتظار ہوتا تھا اور وہ اُس کی دُم سے لگے پھرتے تھے کسی وقت اُس کو آزاد نہ چھوڑتے تھے۔

وَإِذَا الۡبِحَارُ سُجِّرَتۡ، سجرت، تسجیر سے مشتق ہے جس کے معنے آگ لگانے اور بھڑکانے کے بھی آتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضہ نے اس جگہ یہی معنے لئے ہیں اور اسکے معنے بھر دینے کے بھی آتے ہیں اور گڈمڈ خلط ملط کر دینے کے بھی بعض ائمہ تفسیر نے یہی معنے لئے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ انمیں کوئی اختلاف نہیں۔ پہلے سمندر اور میٹھے دریاؤں کو ایک کر دیا جائیگا درمیان کی رکاوٹیں ختم کر دی جاوینگی جس سے دریائے شور اور شیریں دریاؤں کے پانی خلط ملط بھی ہو جائیں گے اور زیادہ بھی، پھر شمس و قمر اور ستاروں کو اُس میں ڈالدیا جائے گا پھر اس تمام پانی کو آگ بنا دیا جائیگا جو جہنم میں شامل ہو جائیگا (مظہری)

وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتۡ، یعنی جبکہ حاضرینِ محشر کے جوڑے جوڑے اور جتھے بنا دیئے جاویں گے یہ جتھے اور جماعتیں ایمان و عمل کے اعتبار سے ہونگے کہ کافر ایک جگہ مؤمن ایک جگہ، پھر کافر و مؤمن میں بھی اعمال و عادات کا فرق ہوتا ہے، انکے اعتبار سے کفار میں بھی مختلف قسم کے گروہ ہو جائیں گے اور مسلمانوں میں بھی یہ گروہ عقیدے اور عمل میں اشتراک کی بنا پر ہونگے جیساکہ بیہقی نے بروایت حضرت نعمان بن بشیر رضہ

حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت کیا ہے کہ جو لوگ ایک جیسے اعمال کرتے ہونگے وہ ایک جگہ کر دیئے جاوینگے اعمال حسنہ ہوں یا سیئہ، مثلاً اچھے مسلمانوں میں علم دین کی خدمت کرنیوالے علماء ایک جگہ، عبّاد و زہاد ایک جگہ جہاد کرنے والے غازی ایک جگہ، صدقہ خیرات میں خصوصیت رکھنے والے ایک جگہ۔ اسی طرح بداعمال لوگوں میں چور ڈاکو ایک جگہ، زناکار فحاش ایک جگہ، دوسرے خاص خاص گناہوں میں باہم شریک رہنے والے ایک جگہ ہو جائیں گے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر میں ہر شخص اپنی قوم کیساتھ ہوگا (مگر یہ قومیت نسبی یا وطنی نہیں بلکہ عمل و عقیدہ کے اعتبار سے ہوگی) نیک عمل کرنیوالے ایک جگہ بدعمل والے دوسری جگہ ہونگے اور اس پر آیت قرآنی سے استشہاد فرمایا وَکُنۡتُمۡ اَزۡوَاجًا ثَلٰثَۃً یعنی محشر میں لوگوں کے بڑے گروہ تین ہونگے جیسا کہ سورۂ واقعہ کی آیت میں اسکی تفصیل یہ آئی ہے کہ ایک گروہ سابقین اولین کا ہوگا، دوسرا اصحاب الیمین کا، یہ دونوں گروہ نجات پانیوالے ہونگے تیسرا گروہ اصحاب الشمال کا ہوگا جو کفار فجار پر مشتمل ہوگا۔

وَاِذَا الۡمَوۡءٗدَۃُ سُئِلَتۡ، موءودۃ وہ لڑکی جس کو زندہ دفن کر دیا گیا جیسا کہ جاہلیتِ عرب میں یہ رسم تھی کہ لڑکی کو اپنے لئے موجب عار سمجھتے تھے اور زندہ ہی اس کو دفن کر دیتے تھے اسلام نے یہ رسم بد مٹائی، اس آیت میں قیامت و محشر کے حالات کے بیان میں ارشاد ہوا کہ جب اُس لڑکی سے سوال کیا جائیگا جسکو زندہ درگور کرکے مار دیا گیا تھا، ظاہر الفاظ سے یہ ہے کہ یہ سوال خود اس لڑکی سے ہوگا، اُس سے پوچھا جائے گا کہ تجھے کس جُرم میں قتل کیا گیا، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مقصود اس سے سوال کرنیکا یہ ہے کہ یہ اپنی بے گناہی اور مظلوم ہونیکی پوری فریاد بارگاہ رب العزت میں پیش کرے تاکہ اُسکے قاتلوں سے انتقام لیا جائے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ مُراد یہ ہو کہ موءودہ لڑکی کے بارے میں اسکے قاتلوں سے سوال کیا جائے گا کہ اس کو تم نے کس جُرم میں قتل کیا۔

فائدہ مہمہ یہاں بہرحال ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قیامت کا تو نام ہی یوم الحساب یوم الجزاء یوم الدین ہے اسمیں تو ہر شخص سے اسکے سبھی اعمال کا محاسبہ اور سوال ہونگے اس جگہ خصوصی احوال اور اہوالِ قیامت کے سلسلہ میں خاص موءودہ لڑکی کے معاملے میں اور اسکے متعلق سوال ہونے کو اتنی اہمیت اور خصوصیت کیساتھ ذکر کرنیمیں کیا حکمت ہے؟ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وجہ خصوصیت یہ ہے کہ یہ مظلوم لڑکی جس کو خود اسکے ماں باپ نے قتل کیا ہے اسکے خون کا انتقام لینے کے لئے اس کی طرفسے کوئی دعوے کرنے والا تو ہے نہیں خصوصاً جبکہ اسکو خفیہ دفن کر دیا ہو تو کسی کو اس کی خبر بھی نہیں ہوئی کہ شہادت دے سکے محشر کے میدان میں جو عدل و انصاف کی عدالتِ الٰہیہ قائم ہوگی، وہ ایسے مظالم کو بھی سامنے لائیگی جس کے ظلم پر نہ کوئی شہادت ہے نہ کوئی اس مظلوم کا پُرسانِ حال ہے۔ واللہ اعلم

چار ماہ کے بعد اسقاطِ حمل قتل کے حکم میں ہے

مسئلہ۔ بچّوں کو زندہ دفن کر دینا یا قتل کر دینا سخت گناہِ کبیرہ اور ظلم عظیم ہے اور چار ماہ کے بعد کسی حمل کو گرانا بھی اسی حکم میں ہے کیونکہ چوتھے مہینہ میں حمل میں

رُوح پڑجاتی ہے اور وہ زندہ انسان کے حکم میں ہوتا ہے اسی طرح جو شخص کسی حاملہ عورت کے پیٹ پر ضرب لگائے اور اس سے بچہ ساقط ہوجائے تو باجماعِ اُمّت مارنے والے پر اس کی دیت میں غُرّہ یعنی ایک غلام یا اسکی قیمت واجب ہوتی ہے اور اگر بطن سے باہر آنیکے وقت وہ زندہ تھا پھر مرگیا تو پوری دیت بڑے آدمی کے برابر واجب ہوتی ہے اور چار ماہ سے پہلے اسقاط حمل بھی بدون اضطراری حالات کے حرام ہے مگر پہلی صورت کی نسبت کم ہے کیونکہ اسمیں کسی زندہ انسان کا قتل صریح نہیں ہے (مظہری)

مسئلہ - کوئی ایسی صورت اختیار کرنا جس سے حمل قرار نہ پائے جیسے آجکل دُنیا میں ضبط تولید کے نام سے اسکی سیکڑوں صورتیں رائج ہوگئی ہیں اس کو بھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وأدِ خفی فرمایا ہے یعنی خفیہ طور سے بچہ کو زندہ درگور کردینا (کما رواہ مسلم عن حذامۃ بنت وہب) اور بعض دوسری روایات میں جو عزل یعنی ایسی تدبیر کرنا کہ نطفہ رحم میں نہ جائے، اس پر رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سکوت یا عدم ممانعت منقول ہے وہ ضرورت کے مواقع کے ساتھ مخصوص ہے وہ بھی اس طرح کہ ہمیشہ کے لئے قطع نسل کی صورت نہ بنے (مظہری) آجکل ضبطِ تولید کے نام سے جو دوائیں یا معالجات کئے جاتے ہیں اُن میں بعض ایسے بھی ہیں کہ ہمیشہ کے لئے سلسلہ نسل و اولاد کا منقطع ہوجائے اس کی کسی حال اجازت شرعًا نہیں ہے واللہ اعلم

وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ، کشط کے لغوی معنے جانور کی کھال اُتارنے کے ہیں، بظاہر یہ حال قیامت کا نفخۂ اُولیٰ کے وقت کا ہے جو اسی دُنیا میں پیش آئیگا کہ آسمان کی زینت جن ستاروں اور شمس و قمر سے تھی وہ سب بے نور ہوکر دریا میں ڈالدیئے جاویں گے آسمان کی موجودہ ہیئت بدل جاویگی، اس کو کشط کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور بعض حضرات مفسرین نے کشط کے معنے لپیٹنے کے لکھے ہیں اور معنی آیت کے یہ ہوگئے کہ آسمان جو چھت کیطرح سروں پر محیط ہے یہ لپیٹ دیا جائے گا۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ، یعنی جب قیامت کے حالاتِ مذکورہ پیش آدیں گے اُسوقت ہر انسان جان لیگا کہ وہ اپنے ساتھ کیا سامان لایا ہے۔ سامان سے مراد اُسکا نیک یا بد عمل ہے کہ وہ سب اعمال اسکے سامنے آجاویں گے جو دُنیا میں کئے تھے خواہ اس طرح کہ صحائف اعمال میں لکھے ہوئے اسکے ہاتھ میں آجائیں یا اسطرح کہ یہ اعمال کسی خاص شکل و صورت میں اسکے سامنے آویں جیسا کہ بعض روایاتِ حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم - قیامت کے احوال اور ہولناک مناظر اور وہاں محاسبۂ اعمال کا ذکر فرمانے کے بعد حق تعالیٰ نے چند ستاروں کی قسم کھاکر فرمایا کہ یہ قرآن حق ہے اللہ کی طرف سے بڑی حفاظت کیساتھ بھیجا گیا ہے اور جس ذات پر نازل ہوا ہے وہ ذات ایک بڑی ہستی ہے وحی لانے والے فرشتے کو وہ پہلے سے جانتے پہچانتے تھے اسلئے اسکے حق ہونیمیں کسی شک و شبہ کی راہ نہیں۔ جن ستاروں کی قسم یہاں کھائی گئی وہ پانچ ستارے ہیں جن کو علمِ ہیئت فلکیات میں خمسہ متحیرہ کہتے ہیں اور متحیرہ کہنے کیوجہ یہ ہے کہ ان پانچوں ستاروں کی حرکت دُنیا میں اسطرح دیکھی جاتی ہے کہ کبھی مشرق سے مغرب کیطرف چل رہے ہیں کبھی پھر پیچھے کو مغرب سے مشرق کیطرف

چلنے لگتے ہیں اسکی وجہ کیا، اور دو مختلف حرکتوں کا سبب کیا ہے، اسکے بارے میں قدیم فلسفہ یُونان والونکے مختلف اقوال ہیں اور جدید فلسفہ والوں کی تحقیق اُن میں سے بعض کیمطابق ہے بعض کے خلاف اور حقیقت کا علم، پیدا کرنیوالے کے سوا کسی کو نہیں، سب تخمینے اور اندازے ہی ہیں جو غلط بھی ہو سکتے ہیں صحیح بھی، قرآن حکیم نے اُمت کو اس فضول بحث میں نہیں اُلجھایا، جتنی بات اُن کے فائدہ کی تھی وہ بتلا دی کہ وہ رب العزت جلّ شانہ کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کا اسمیں مشاہدہ کریں اور ایمان لائیں۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ذِيْ قُوَّةٍ الخ، ستاروں کی قسم کے بعد فرمایا کہ یہ قرآن قول ہے ایک رسُولِ کریم کا، آگے اس رسُولِ کریم کی صفت ایک تو یہ بیان فرمائی کہ وہ ذی قوت ہے، دوسری یہ کہ ربّ العرش کے پاس وہ مُطاع ہے کہ اسکے احکام عرش والے مانتے ہیں، تیسری یہ کہ وہ اللہ کے نزدیک امین ہے اس سے پیغام لانے اور پہنچانے میں کسی خیانت اور کمی بیشی کا امکان نہیں۔ اس جگہ رسُولِ کریم سے مُراد بظاہر جبریلِ امین ہیں کیونکہ لفظ رسُول کا جیسے انبیاء پر اطلاق ہوتا ہے ایسے ہی فرشتوں کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور آگے جتنی صفات رسُول کی بیان کی گئی ہیں وہ سب جبریلِ امین پر بغیر کسی تکلف و تاویل کے منطبق ہیں، اُنکا ذی قوت ہونا سورۂ نجم میں صراحۃً مذکور ہے عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى، اہلِ عرش و سمٰوات میں اُن کا مُطاع ہونا اور اُن کے احکام کی پیروی کرنا لیلۃ المعراج کی حدیث سے ثابت ہے کہ جب جبرئیلِ امین آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لے کر آسمان پر پہنچے اور آسمانوں کے دروازے کھلوانے کا ارادہ کیا تو دروازوں پر مقرر فرشتوں نے ان کے حکم کی اطاعت کی اور امین ہونا جبرئیل علیہ السلام کا ظاہر ہے۔ اور بعض ائمہ تفسیر نے اس جگہ رسُولِ کریم سے مراد محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا ہے اور صفاتِ مذکورہ کو کسی قدر تکلف سے آپ کی ذات پر منطبق کیا ہے واللہ اعلم۔ آگے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ شان اور کفار کے بیہودہ الزاموں کا جواب ہے وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ، یہ اُن کفار کے بیہودہ اعتراض کا جواب ہے جو معاذ اللہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مجنون کہتے تھے وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ یعنی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل امین کو کھلے اُفق پر دیکھا ہے جیسا کہ سُورۂ نجم میں فرمایا فَاسْتَوٰى وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى، اور مقصود اسکے ذکر کرنے سے یہ ہے کہ وحی لانے والے فرشتے جبرئیلؑ سے رسُول کریم صلے اللہ علیہ وسلم خوب واقف تھے، اُن کو اصلی ہیئت و صورت میں بھی دیکھ چکے تھے اس لئے اس وحی میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، باقی مضمونِ آیات خلاصۂ تفسیر میں واضح ہو چکا ہے۔

تمّت سُورۃ التکویر بحمد اللہ تعالیٰ یوم الاربعاء ۸ شعبان ۱۳۹۱ھ

سُورَۃ الانفطار

سُورَۃُ الْاِنْفِطَارِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ تِسْعَ عَشْرَۃَ اٰیَۃً
سورۂ انفطار مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی اُنیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ﴿۱﴾ وَاِذَا الْکَوَاکِبُ انْتَثَرَتْ ﴿۲﴾ وَاِذَا الْبِحَارُ
جب آسمان چر جائے اور جب تارے جھڑ پڑیں اور جب دریا

فُجِّرَتْ ﴿۳﴾ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ﴿۴﴾ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ﴿۵﴾
اُبل نکلیں اور جب قبریں زیر و زبر کردی جائیں جان لے ہر ایک جی جو کچھ کہ آگے بھیجا اور پیچھے چھوڑا

یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ ﴿۶﴾ الَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ
اے آدمی کس چیز سے بہکا تو اپنے رب کریم پر جس نے تجھ کو بنایا پھر تجھ کو ٹھیک کیا

فَعَدَلَکَ ﴿۷﴾ فِیْٓ اَیِّ صُوْرَۃٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ ﴿۸﴾ کَلَّا بَلْ تُکَذِّبُوْنَ
پھر تجھ کو برابر کیا جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ دیا ہرگز نہیں پر تم جھوٹ جانتے ہو

بِالدِّیْنِ ﴿۹﴾ وَاِنَّ عَلَیْکُمْ لَحٰفِظِیْنَ ﴿۱۰﴾ کِرَامًا کَاتِبِیْنَ ﴿۱۱﴾ یَعْلَمُوْنَ
انصاف کا ہونا اور تم پر نگہبان مقرر ہیں عزت والے عمل لکھنے والے جانتے ہیں جو کچھ

مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۱۲﴾ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ﴿۱۳﴾ وَّاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ ﴿۱۴﴾
تم کرتے ہو بیشک نیک لوگ بہشت میں ہیں اور بیشک گنہگار دوزخ میں ہیں

یَّصْلَوْنَھَا یَوْمَ الدِّیْنِ ﴿۱۵﴾ وَمَا ھُمْ عَنْھَا بِغَآئِبِیْنَ ﴿۱۶﴾ وَمَآ اَدْرٰکَ مَا
ڈالے جائیں گے اسمیں انصاف کے دن اور نہ ہونگے اُس سے جُدا ہونے والے اور تجھ کو کیا خبر ہے کیسا ہے

یَوْمُ الدِّیْنِ ﴿۱۷﴾ ثُمَّ مَآ اَدْرٰکَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ ﴿۱۸﴾ یَوْمَ لَا تَمْلِکُ نَفْسٌ
دن انصاف کا پھر بھی تجھ کو کیا خبر ہے کیسا ہے دن انصاف کا جس دن کہ بھلا نہ کر سکے کوئی جی

لِّنَفۡسٍ شَيۡـًٔا ؕ وَالۡاَمۡرُ يَوۡمَئِذٍ لِّلّٰهِ ﴿۱۹﴾

کسی جی کا کچھ بھی اور حکم اُس دن اللہ ہی کا ہے

ع ۱۹ الربع

خُلاصۂ تفسیر

جب آسمان پھٹ جائیگا اور جب ستارے (ٹوٹ کر) جھڑ پڑیں گے اور جب سب دریا (شور اور شیریں) بہہ پڑیں گے (اور بہہ کر ایک ہو جاویں گے جیسا اوپر کی سُورت میں سُجِّرَت کی تفسیر میں بیان ہوا ہے یہ تینوں واقعات تو نفخۂ اُولیٰ کے ہیں آگے نفخۂ ثانیہ کے بعد کا واقعہ ہے یعنی) اور جب قبریں اُکھاڑ دی جاویں گی (یعنی انمیں کے مُردے نکل کھڑے ہوں گے اسوقت) ہر شخص اپنے اگلے اور پچھلے اعمال کو جان لیگا (اور ان واقعات کا مقتضیٰ یہ تھا کہ انسان خوابِ غفلت سے بیدار ہوتا اسلئے آگے غفلت پر زجر و تنبیہ ہے کہ) اے انسان تجھ کو کس چیز نے تیرے ایسے ربِ کریم کے ساتھ بُھول میں ڈال رکھا ہے جس نے تجھ کو (انسان) بنایا پھر تیرے اعضاء کو درست کیا پھر تجھ کو (مناسب اعتدال پر بنایا (یعنی اعضاء میں تناسب رکھا اور) جس صورت میں چاہا تجھ کو ترکیب دیدیا، ہرگز (مغرور) نہیں (ہونا چاہیئے مگر تم اغترار سے باز نہیں آتے) بلکہ (اس درجہ اغترار میں بڑھ گئے ہو کہ) تم (خود) جزا و سزا (ہی) کو (جس سے یہ غرور اور فریب دفع ہو سکتا تھا) جھٹلاتے ہو اور (یہ جھٹلانا تمہارا خالی نہ جاویگا بلکہ ہماری طرف سے) تم پر (تمھارے سب اعمال کے) یاد رکھنے والے (جو ہمارے نزدیک معزز (اور تمھارے اعمال کے) لکھنے والے (ہیں) مقرر ہیں جو تمھارے سب افعال کو جانتے ہیں (اور لکھتے ہیں پس قیامت میں یہ سب اعمال پیش ہونگے جنمیں تمھاری یہ تکذیب اور کفر بھی ہے اور سب پر مناسب جزا ملیگی جسکی تفصیل آگے ہے کہ) نیک لوگ بیشک آسائش میں ہونگے اور بدکار (یعنی کافر) لوگ بیشک دوزخ میں ہونگے روزِ جزا کو اسمیں داخل ہونگے اور (پھر داخل ہو کر) اس سے باہر نہ ہونگے (بلکہ اسمیں خلود ہوگا) اور آپ کو کچھ خبر ہے کہ روزِ جزا کیسا ہے (اور ہم) پھر (مکرر کہتے ہیں کہ) آپ کو کچھ خبر ہے کہ وہ روزِ جزا کیسا ہے (مقصود اس استفہام سے تہویل ہے، آگے جواب ہے کہ) وہ ایسا دن ہے جس میں کسی شخص کا کسی شخص کے نفع کے لئے کچھ بس نہ چلے گا اور تمامتر حکومت اس روز اللہ ہی کی ہوگی۔

معارف و مسائل

عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ وَاَخَّرَتۡ، یعنی جب قیامت کے وہ حالات پیش آچکیں گے جن کا ذکر شروع سورت میں کیا گیا ہے، آسمان کا پھٹنا، ستاروں کا جھڑ جانا، سب شور و شیریں دریاؤں کا ایک ہو جانا، قبروں سے مُردوں کا اُٹھنا اُسوقت ہر انسان جان لیگا کہ اُسنے کیا آگے بھیجا کیا پیچھے چھوڑا۔ آگے بھیجنے سے مراد اسپر عمل کر لینا ہے اور پیچھے چھوڑنے سے مراد ترکِ عمل ہے تو قیامت کے دن ہر شخص جان لیگا کہ اُسنے نیک بد کیا کیا عمل کر لئے اور نیکی یا بدی میں سے کیا چھوڑ دی تھی اور یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ آگے بھیجے ہوئے اعمال سے مراد وہ

عمل ہوں جو اُسنے خود کیئے، خواہ نیک ہوں یا بد اور پیچھے چھوڑنے سے مراد وہ عمل ہوں جن کو اسنے خود تو نہیں کیا لیکن اسکی رسم دُنیا میں ڈال گئے، اگر وہ نیک کام ہیں تو اُن کا ثواب ان کو ملتا رہے گا اور بُرے ہیں تو اسکی بُرائی اُس کے اعمال نامے میں لکھی جاتی رہے گی جیساکہ حدیث میں ہے کہ جس شخص نے اسلام میں کوئی اچھی سُنت اور طریقہ جاری کرایا اسکا ثواب ہمیشہ اس کو ملتا رہیگا، اور جس نے کوئی بُری رسم اور گناہ کا کام دُنیا میں جاری کر دیا تو جبتک لوگ اس بُرے کام میں مبتلا ہونگے اسکا گناہ اس شخص کے لئے بھی لکھا جاتا رہے گا۔ یہ مضمون پہلے بھی آیت يُنَبَّؤُا الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ کے تحت میں گزر چکا ہے۔

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ، اس سے پہلی آیات میں معاد اور انجام یعنی قیامت کے ہولناک معاملات کا ذکر فرمایا، اور اس آیت میں انسان کے مبدأ یعنی تخلیق کے ابتدائی مراحل کا ذکر فرمایا، اس مجموعہ کا تقاضا یہ تھا کہ انسان کچھ بھی غور و فکر سے کام لیتا تو اللہ اور اسکے رسُول پر ایمان لاتا اور انکے احکام کی سرِ مو خلاف ورزی نہ کرتا مگر انسان غفلت اور بُھول میں پڑ گیا اسپر بطور زجر و تنبیہ کے یہ سوال فرمایا کہ اے انسان تیری ابتدا و انتہا کے یہ حالات سامنے ہونے کے باوجود تجھے کس چیز نے بُھول اور دھوکے میں ڈالا کہ اللہ کی نافرمانی کرنے لگا۔

یہاں بیان مبدأ یعنی تخلیق انسانی کے ابتدائی مراحل کے ذکر میں پہلے فرمایا خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ یعنی اللہ تعالیٰ نے تجھے پیدا کیا، اور صرف پیدا ہی نہیں کر دیا بلکہ تیرے وجود اور تمام اعضاء کو ایک خاص مناسبت کیساتھ درست کر کے بنایا، ہر عضو کو اسکے مناسب جگہ دی، ہر عضو کی جسامت اور طول و عرض کو ایک تناسب سے بنایا کہ ذرا اس سے مختلف ہو جائے تو اعضائے انسانی کے وہ فوائد باقی نہ رہیں جو اسکی موجودہ صورتمیں ہیں، اسکے بعد فرمایا فَعَدَلَكَ، یعنی تیرے وجود کو ایک خاص اعتدال بخشا جو دُنیا کے کسی دوسرے جاندار میں نہیں۔ اعضاء کے تناسب کے اعتبار سے بھی اور مزاج و طبیعت کے اعتبار سے بھی کہ اگرچہ انسان کی تخلیق میں متضاد اور مختلف مواد شامل ہیں۔ خون، بلغم، سوداء، صفراء، کوئی گرم کوئی سرد مگر حکمتِ ربانی نے ان متضاد چیزوں سے ایک معتدل مزاج تیار کر دیا اسکے بعد ایک تیسری خصوصیت بیان فرمائی۔

فِي أَيِّ صُورَةٍ مَا شَاءَ رَكَّبَكَ، یعنی باوجود اسکے کہ تخلیق سب انسانوں کی ایک خاص وضع اور ہیئت اور مزاج پر ہونیکی وجہ سے سب میں اشتراک ہے اسکا نتیجہ بظاہر یہ ہونا چاہئے تھا کہ سب ایک ہی شکل و صورت کے ہوتے باہمی امتیاز دشوار ہو جاتا، مگر حق تعالیٰ جل شانہٗ کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ نے کروڑوں بلکہ اربوں پدموں انسانوں کی شکل و صورت میں ایسے ایسے امتیازات پیدا فرما دیئے جو ایک دوسرے سے مشتبہ نہیں ہوتے صاف اور نمایاں امتیاز رہتا ہے۔

انسان کی ابتدائی تخلیق کے یہ کمالاتِ قدرت بیان فرما کر ارشاد فرمایا مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ کہ اے غافل انسان جس پروردگار نے تیرے وجود میں ایسے ایسے کمالات ودیعت فرمائے اُسکے معاملے میں تو نے کیونکر دھوکہ اور فریب کھایا کہ اُسی کو بُھول بیٹھا اُسکے احکام کی نافرمانی کرنے لگا، تجھے تو خود تیرے جسم کا

جوڑ جوڑ اللہ کی یاد دلانے اور اُس کی اطاعت پر مجبور کرنے کے لئے کافی تھا پھر یہ بھول اور غفلت یہ غرور اور دھوکہ کیسے لگا، اس جگہ رب کی صفت کریم ذکر کر کے اسکے جواب کیطرف بھی اشارہ کر دیا کہ انسان کے بھول اور دھوکہ میں پڑنے کا سبب حق تعالیٰ کا کریم ہونا ہے کہ وہ اپنے لطف و کرم سے انسان کے گناہ پر فوراً سزا نہیں دیتا بلکہ اسکے رزق اور عافیت اور دُنیوی آسائش میں بھی کوئی کمی نہیں کرتا، یہ لُطف و کرم اسکے غرور اور دھوکے کا سبب بن گیا حالانکہ ذرا عقل سے کام لیتا تو یہ لُطف و کرم غرور و غفلت کا سبب بننے کے بجائے اور زیادہ اپنے رب کریم کے احسانات کا ممنون ہو کر اطاعت میں لگجانے کا سبب ہونا چاہئے تھا۔

حضرت حسنؒ بصری نے فرمایا کہ کم من مغرور تحت الستر وھو لا یشعر یعنی کتنے ہی انسان ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے عیبوں اور گناہوں پر پردہ ڈالا ہوا ہے اُن کو رسوا نہیں کیا، وہ اس لُطف و کرم سے اور زیادہ غرور اور دھوکے میں مبتلا ہو گئے۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ وَّاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ، اسکا تعلق اُس جملے سے ہے جو پہلے گزر چکا یعنی عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ کہ قیامت کے روز ہر انسان کو اپنا اپنا عمل سامنے آجائیگا۔ اس جملے میں اس عمل کی سزا و جزاء کا ذکر ہے کہ اطاعت شعار ابرار تو اس روز اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں مسرور ہونگے اور سرکش نافرمان جہنم کی آگ میں۔

وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِیْنَ، یعنی جہنمی لوگ کسی وقت جہنم سے غائب نہ ہو سکیں گے کیونکہ اُن کے لئے خلود اور دائمی عذاب کا حکم ہے لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا، یعنی کوئی شخص باختیار خود کسی دوسرے کو محشر میں کوئی نفع نہ پہنچا سکے گا نہ کسی کی تکلیف کو کم کر سکے گا، اس سے شفاعت کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ شفاعت کسی کی اپنے اختیار سے نہ ہو گی جب تک کہ اللہ تعالیٰ کسی کو کسی کی شفاعت کی اجازت نہ دیں، اسلئے اصل حکم کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے وہ ہی اپنے فضل سے کسی کو شفاعت کی اجازت دیدے اور پھر شفاعت قبول فرمالے تو وہ بھی اُسی کا حکم ہے، واللہ اعلم

تمت سورۃ الانفطار بحمد اللہ لیلۃ الاربعاء ۸ شعبان سنہ ۱۳۹۱ھ

سُورۃ التطفیف

سُورَةُ التَّطْفِيفِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ سِتٌّ وَّثَلٰثُوْنَ اٰيَةً

سُورۃ تطفیف مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چھتیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ﴿۱﴾ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ﴿۲﴾

خرابی ہے گھٹانے والوں کی وہ لوگ کہ جب ماپ کر لیں لوگوں سے تو پورا بھر لیں،

وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ﴿۳﴾ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ

اور جب ماپ کر دیں اُن کو یا تول کر تو گھٹا کر دیں کیا خیال نہیں رکھتے وہ لوگ کہ اُن کو

مَّبْعُوْثُوْنَ ﴿۴﴾ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۵﴾ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶﴾ كَلَّآ

اُٹھنا ہے اس بڑے دن کے واسطے جسدن کھڑے رہیں لوگ راہ دیکھتے جہان کے مالک کی ہرگز نہیں

اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ﴿۷﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ﴿۸﴾ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿۹﴾

بیشک اعمال نامہ گنہگاروں کا سجّین میں ہے اور تجھ کو کیا خبر ہے کیا ہے سجّین ایک دفتر ہے لکھا ہوا

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۰﴾ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۱۱﴾ وَمَا

خرابی ہے اُسدن جھٹلانے والوں کی جو جھوٹے جانتے ہیں انصاف کے دن کو اور اسکو

يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ﴿۱۲﴾ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ

جھٹلاتا ہے وہی جو بڑھ نکلنے والا گنہگار ہے جب سُنائے اسکو ہماری آیتیں کہے نقلیں ہیں

الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾ كَلَّا بَلْ سكتة رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾

پہلوں کی کوئی نہیں پر زنگ پکڑ گیا ہے اُن کے دلوں پر جو وہ کماتے تھے

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ﴿۱۵﴾ ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا

کوئی نہیں وہ اپنے رب سے اُسدن روک دیئے جائیں گے پھر مقرر وہ گرنیوالے ہیں

الْجَحِيمِ ﴿١٦﴾ ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُونَ ﴿١٧﴾ كَلَّآ إِنَّ كِتٰبَ

دوزخ میں پھر کہا جائے گا یہ وہی ہے جس کو تم جھوٹ جانتے تھے ہرگز نہیں بیشک اعمالنامہ

الْأَبْرَارِ لَفِي عِلِّيِّينَ ﴿١٨﴾ وَمَآ أَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّونَ ﴿١٩﴾ كِتٰبٌ مَّرْقُومٌ ﴿٢٠﴾

نیکوں کا علیین میں ہے اور تجھ کو کیا خبر ہے کیا ہے علیین ایک دفتر ہے لکھا ہوا

يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُونَ ﴿٢١﴾ إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ﴿٢٢﴾ عَلَى الْأَرَآئِكِ

اُس کو دیکھتے ہیں نزدیک والے یعنی فرشتے بیشک نیک لوگ ہیں آرام میں تختوں پر بیٹھے

يَنْظُرُونَ ﴿٢٣﴾ تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ ﴿٢٤﴾ يُسْقَوْنَ مِنْ

دیکھتے ہونگے پہچان لے تو اُن کے منہ پر تازگی آرام کی اُن کو پلائی جاتی ہے

رَّحِيقٍ مَّخْتُومٍ ﴿٢٥﴾ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ؕ وَفِي ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ

شراب خالص مہر لگی ہوئی جس کی مہر جمتی ہے مشک پر اور اُس پر چاہیئے کہ ڈھکیں

الْمُتَنَافِسُونَ ﴿٢٦﴾ وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيمٍ ﴿٢٧﴾ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ ﴿٢٨﴾

ڈھکنے والے اور اُس کی ملونی ہے تسنیم سے وہ ایک چشمہ ہے جس سے پیتے ہیں نزدیک والے

إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ اٰمَنُوا يَضْحَكُونَ ﴿٢٩﴾ وَإِذَا مَرُّوا

وہ لوگ جو گنہگار ہیں تھے ایمان والوں سے ہنسا کرتے اور جب ہو کر نکلتے

بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ ﴿٣٠﴾ وَإِذَا انْقَلَبُوٓا إِلٰىٓ أَهْلِهِمُ انْقَلَبُوا فَكِهِينَ ﴿٣١﴾ وَ

انکے پاس کو تو آپسمیں آنکھ مارتے اور جب پھر کر جاتے اپنے گھر پھر جاتے باتیں بناتے اور

إِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوٓا إِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّونَ ﴿٣٢﴾ وَمَآ أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حٰفِظِينَ ﴿٣٣﴾

جب اُن کو دیکھتے کہتے بیشک یہ لوگ بہک رہے ہیں اور اُن کو بھیجا نہیں اُن پر نگہبان بناکر

فَالْيَوْمَ الَّذِينَ اٰمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ﴿٣٤﴾ عَلَى الْأَرَآئِكِ يَنْظُرُونَ ﴿٣٥﴾

سو آج ایمان والے منکروں سے ہنستے ہیں تختوں پر بیٹھے دیکھتے ہیں

هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿٣٦﴾

اب بدلہ پایا ہے منکروں نے جیسا کچھ کہ کرتے تھے

خلاصۂ تفسیر

بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی کہ جب لوگوں سے (اپنا حق) ناپ کرلیں تو پورا لیں اور جب اُن کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا دیں (گو لوگوں سے اپنا حق پورا لینا مذموم نہیں ہے مگر اسکے ذکر کرنے سے مقصود خود اس پر مذمت کرنا نہیں ہے بلکہ کم دینے پر مذمت کی تاکید و تقویت ہے یعنی کم دینا اگرچہ

فی نفسہٖ مذموم ہے لیکن اس کے ساتھ اگر دوسروں کی ذرا رعایت نہ کی جاوے تو اور زیادہ مذموم ہے، بخلاف رعایت کرنے والے کے کہ اگر اس میں عیب ہے تو ایک ہنر بھی ہے اس لئے اوّل شخص کا عیب اشد ہے اور چونکہ اصل مقصود مذمت ہے کم دینے کی اس لئے اس میں ناپ اور تول دونوں کا ذکر کیا تاکہ خوب تصریح ہو جاوے کہ ناپنے میں بھی کم دیتے ہیں اور تولنے میں بھی کم دیتے ہیں اور چونکہ پُورا لینا فی نفسہ مدار مذمت کا نہیں اس لئے وہاں ناپ اور تول دونوں کا ذکر نہیں کیا بلکہ ایک ہی کا ذکر کیا پھر تخصیص ناپ کی شاید اس لئے ہو کہ عرب میں زیادہ دستور کیل کا تھا خصوصاً اگر آیت مدنی ہو جیسا روح المعانی میں بروایت نسائی وابن ماجہ وبیہقی اس کا نزول اہلِ مدینہ کے باب میں لکھا ہے تو اس وقت اس تخصیص کی وجہ زیادہ ظاہر ہے کیونکہ مدینہ میں کیل کا دستور مکّہ سے بھی زیادہ تھا، آگے ایسا کرنے والوں کو ڈرایا گیا ہے کہ) کیا ان لوگوں کو اس کا یقین نہیں ہے کہ وہ ایک بڑے سخت دن میں زندہ کر کے اُٹھائے جاویں گے جس دن تمام آدمی ربّ العالمین کے سامنے کھڑے ہونگے (یعنی اس روز سے ڈرنا چاہیئے اور تطفیف یعنی لوگوں کی حق تلفی سے توبہ کرنا چاہیئے اس بعث وجزا کو سُنکر جو مؤمن تھے وہ ڈر گئے اور جو کافر تھے وہ انکار کرنے لگے، اس لئے آگے انکار پر تنبیہ فرما کر فریقین کی جزا کی تفصیل فرماتے ہیں کہ جیسا کفار لوگ جزاء وسزا کے منکر ہیں) ہرگز (ایسا) نہیں (بلکہ جزاء وسزا ضروری الوقوع ہے جن اعمال پر جزا وسزا ہوگی وہ بھی منضبط اور محفوظ ہیں اور اس مجموعہ کا بیان یہ ہے کہ) بدکار (یعنی کافر) لوگوں کا نامۂ عمل سجّین میں رہے گا (وہ ایک مقام ساتویں زمین میں ہے جو مقام ہے ارواح کفار کا، کذا فی تفسیر ابن کثیر عن کعب وفی الدر المنثور عن ابن عباسؓ ومجاہد وفرقد وقتادۃ وعبداللہ ابن عمرو مرفوعاً، اور کفار کے اعمال کا اس مقام پر رہنا بھی مجاہد وعبداللہ ابن عمرو سے درمنثور میں منقول ہے، آگے ڈرانے کے لئے سوال ہے کہ) اور آپکو کچھ معلوم ہے کہ سجّین میں رکھا ہوا نامۂ عمل کیا چیز ہے وہ ایک نشان کیا ہوا دفتر ہے (نشان سے مراد مہر ہے کما فی الدر المنثور عن کعب الاحبار فیختم ویوضع ای بعد الموت مقصود یہ ہوگا کہ اس میں تغیرّ وتبدل کا کچھ احتمال نہیں پس حاصل اسکا اعمال کا محفوظ ہونا ہے جس سے جزا کا تحقق ہونا ثابت ہوا آگے ان اعمال کی جزاء کا بیان ہے کہ) اس روز (یعنی قیامت کے روز) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی جو کہ روزِ جزاء کو جھٹلاتے ہیں اور اس (یومِ جزاء) کو تو وہی شخص جھٹلاتا ہے جو حد (عبدیت) سے گزرنے والا ہو مجرم ہو (اور) جب اس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاویں تو یُوں کہدیتا ہو کہ یہ بے سند باتیں اگلوں سے منقول چلی آتی ہیں (مطلب یہ بتلانا ہے کہ جو شخص روزِ قیامت کی تکذیب کرتا ہے وہ معتدی، اثیم، مکذب بالقرآن ہے آگے تکذیب روزِ جزاء پر جو صراحۃً مذکور ہے تنبیہ کی گئی ہے کہ یہ لوگ اس کو غلط سمجھ رہے ہیں) ہرگز ایسا نہیں (اور کسی کو یہ شبہ نہو کہ شاید ان کے پاس کوئی دلیل نفی کی ہوگی جس سے یہ استدلال کرتے ہونگے ہرگز نہیں) بلکہ (اصل وجہ تکذیب کی یہ ہے کہ) ان کے دلوں پر ان کے اعمالِ بد کا زنگ بیٹھ گیا ہے (اس سے استعداد قبولِ حق کی فاسد ہو گئی اسلئے براہِ عناد انکار کرنے لگے آگے پھر انکار پر زجر ہے کہ جیسا یہ لوگ سمجھ رہے ہیں) ہرگز ایسا نہیں

(آگے ویل کی کچھ تفصیل ہے کہ وہ خرابی یہ ہے کہ) یہ لوگ اس روز (ایک تو) اپنے رب (کا دیدار دیکھنے) سے روک دیئے جائیں گے پھر (صرف اسی پر اکتفا نہ ہوگا بلکہ) یہ دوزخ میں داخل ہونگے پھر (ان سے) کہا جاویگا کہ یہی ہے جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے (اور چونکہ یہ لوگ یوم دین کی تکذیب میں جس طرح اپنی سزا کو جھٹلاتے تھے اسیطرح مؤمنین کی جزا کو بھی جھٹلاتے تھے، آگے اس پر تنبیہ فرماتے ہیں کہ یہ جو مؤمنین کے اجر و ثواب کے منکر ہیں) ہرگز ایسا نہیں، (بلکہ ان کا اجر و ثواب ضرور ہونے والا ہے جسکا بیان یہ ہے کہ) نیک لوگوں کا نامۂ عمل علّیّین میں رہیگا (وہ ایک مقام ہے ساتویں آسمان میں جو مستقر ہے ارواحِ مؤمنین کا، کذافی تفسیر ابن کثیر عن کعب) اور (آگے تفخیم کے لئے سوال ہے کہ) آپ کو کچھ معلوم ہے کہ علّیّین میں رکھا ہوا نامۂ عمل کیا چیز ہے وہ ایک نشان کیا ہوا دفتر ہے جس کو مقرب فرشتے (شوق سے) دیکھتے ہیں (اور یہ مومن کا بہت بڑا اکرام ہے جیسا کہ رُوح المعانی میں بتخریج عبد بن حمید حضرت کعب سے روایت ہے کہ جب ملائکہ مؤمن کی رُوح کو قبض کر کے لیجاتے ہیں تو ہر آسمان کے مقرّب فرشتے اسکے ساتھ ہوتے جاتے ہیں یہانتک کہ ساتویں آسمان تک پہنچکر اس روح کو رکھ دیتے ہیں، پھر فرشتے عرض کرتے ہیں کہ ہم اسکا نامۂ اعمال دیکھنا چاہتے ہیں چنانچہ وہ نامۂ عمل کھول کر دکھلایا جاتا ہے (مختصراً) آگے انکی جزاء آخرت کا بیان ہے کہ) نیک لوگ بڑی آسائش میں، ہونگے مسہریوں پر (بیٹھے بہشت کے عجائب) دیکھتے ہونگے (اے مخاطب) تو ان کے چہروں میں آسائش کی بشاشت پہچانے گا (اور) ان کو پینے کیلئے شراب خالص سربمہر جس پر مشک کی مہر ہوگی ملے گی اور حرص کرنے والوں کو ایسی چیز کی حرص کرنا چاہیئے (کہ حرص کے لائق یہی ہے خواہ صرف شراب مراد لیجاوے خواہ کُل نعمائے جنت یعنی شوق و رغبت کی چیز یہ نعمتیں ہیں، نہ کہ دُنیا کی ناقص اور فانی لذّتیں اور اُن کی تحصیل کا طریق نیک اعمال ہیں، پس اسمیں کوشش کرنا چاہیئے) اور اس (شراب) کی آمیزش تسنیم (کے پانی سے) ہوگی (عرب عموماً شراب میں پانی ملا کر پیتے تھے تو اس شراب کی آمیزش کے لئے تسنیم کا پانی ہوگا، آگے تسنیم کی شرح ہے) یعنی ایک ایسا چشمہ جس سے مقرب لوگ پانی پئیں گے، (مطلب یہ کہ سابقین یعنی مقربین کو تو خالص پینے کو اسکا پانی ملے گا اور اصحاب الیمین یعنی ابرار کو اس کا پانی دوسری شراب میں ملا کر ملے گا، کذا فی الدر المنثور عن قتادہ و مالک ابن الحارث و ابن عباس و ابن مسعود و حذیفۃ - اور یہ مہر لگنا علامت اکرام کی ہے ورنہ وہاں ایسی حفاظت کی ضرورت نہیں، اور مُشک کی مہر کا مطلب یہ ہے کہ جیسے قاعدہ ہے کہ لاکھ وغیرہ لگا کر اس پر مُہر کرتے ہیں اور ایسی چیز کو طینِ ختام کہتے ہیں وہاں شراب کے برتن کے منہ پر مشک لگا کر اس پر مہر کر دی جاوے گی، یہانتک فریقین کی جزائے اُخروی کا الگ الگ بیان تھا آگے مجموعہ فریقین کا مجموعہ حال دُنیا و آخرت مذکور ہے یعنی) جو لوگ مجرم (یعنی کافر) تھے وہ ایمان والوں سے (دُنیا میں تحقیراً) ہنسا کرتے تھے اور یہ (ایمان والے) جب ان کافروں کے سامنے سے ہو کر گزرتے تھے تو آپس میں آنکھوں سے اشارے کرتے تھے (مطلب یہ کہ انکے ساتھ استہزاء و تحقیر سے پیش آتے تھے) اور جب اپنے گھروں کو جاتے تو (وہاں بھی ان کا تذکرہ کر کے) دل لگیاں (اور تمسخر) کرتے (مطلب یہ کہ غَیبَتْ و حضور ہر حالتیں انکی تحقیر و

استہزار کا مشغلہ رہتا، البتہ حضور میں اشارے چلا کرتے اور غیبت میں صراحۃً تذکرہ کرتے) اور جب انکو دیکھتے تو یوں کہا کرتے کہ یہ لوگ یقیناً غلطی پر ہیں (کیونکہ کفار اسلام کو غلطی پر سمجھتے تھے) حالانکہ یہ (کافر) ان (مسلمانوں) پر نگرانی کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے (یعنی ان کو اپنی فکر کرنا چاہیئے تھا، ان کے پیچھے کیوں پڑ گئے بس ان سے دو غلطیاں ہوئیں اوّل اہل حق کے ساتھ استہزار پھر اپنی اصلاح سے بے فکری) سو آج (قیامت کے دن) ایمان والے کافروں پر ہنستے ہونگے، مسہریوں پر (بیٹھے ان کا حال) دیکھ رہے ہونگے (درمنثور میں قتادہ سے منقول ہے کہ کچھ دریچے جھروکے ایسے ہونگے جن سے اہل جنت اہل نار کو دیکھ سکیں گے، پس ان کا بُرا حال دیکھ کر بطور انتقام کے اُن پر ہنسیں گے آگے تقریر ہے اس سزا کی یعنی) واقعی کافروں کو انکے کئے کا خوب بدلہ ملا۔

معارف و مسائل

سورۂ تطفیف حضرت عبداللہ بن مسعود کے قول پر مکّی سورت ہے عام مصاحفِ قرآن میں اسی بنار پر اسکو مکّی لکھا ہے، اور حضرت ابنِ عباس، قتادہ، مقاتل، ضحاک کے نزدیک مدنی سُورت ہے مگر اسکی صرف آٹھ آیتیں مکی ہیں، امام نسائی نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ جب رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو دیکھا کہ مدینہ کے لوگ جن کے عام معاملات کیل یعنی ناپ کے ذریعہ ہوتے تھے وہ اس معاملہ میں چوری کرنے اور کم ناپنے کے بہت عادی تھے اس پر یہ سورت ویل للمطففین نازل ہوئی۔ حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ یہ پہلی سورت ہے جو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مدینہ طیبہ پہنچتے ہی نازل ہوئی، وجہ یہ تھی کہ اہلِ مدینہ میں یہ رواج اسوقت عام تھا کہ جب خود کسی سے سودا لیتے تو ناپ تول پُورا پُورا لیتے تھے اور جب دوسروں کو بیچتے تو اس میں کمی اور چوری کیا کرتے تھے۔ اس سورت کے نازل ہونے پر یہ لوگ اس رسم بد سے باز آگئے اور ایسے باز آئے کہ آجتک اہل مدینہ ناپ تول پُورا پُورا کرنے میں معروف و مشہور ہیں (رواہ الحاکم والنسائی وابن ماجہ بسند صحیح از مظہری)

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ، مطففین تطفیف سے مشتق ہے جس کے معنے ناپ تول میں کمی کرنے کے ہیں اور ایسا کرنے والے کو مطفف کہا جاتا ہے۔ قرآن حکیم کے اس ارشاد سے ثابت ہوا کہ تطفیف کرنا حرام ہے۔

تطفیف صرف ناپ تول ہی میں نہیں بلکہ حقدار کو اُس کے حق سے کم دینا کسی چیز میں ہو تطفیف میں داخل ہے

قرآن و حدیث میں ناپ تول میں کمی کرنے کو حرام قرار دیا ہے کیونکہ عام طور سے معاملات کا لین دین انہی دو طریقوں سے ہوتا ہے انہی کے ذریعہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ حقدار کا حق ادا ہو گیا یا نہیں، لیکن یہ معلوم ہے کہ مقصود اس سے ہر ایک حقدار کا حق پورا پورا دینا ہے اسمیں کمی کرنا حرام ہے، تو معلوم ہوا کہ یہ صرف ناپ تول کیساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر وہ چیز جس سے کسی کا حق پورا کرنا یا نہ کرنا جانچا جاتا ہے اسکا یہی حکم ہے خواہ ناپ تول سے ہو یا عدد شماری سے یا کسی اور طریقے سے ہر ایک میں حقدار کے حق سے کم دینا بحکم تطفیف حرام ہے۔

مؤطا امام مالک میں ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ نماز کے رکوع سجدے وغیرہ پورے

نہیں کرتا جلدی جلدی نماز ختم کر ڈالتا ہے تو اُس کو فرمایا لَقَدْ طَفَّفْتَ یعنی تو نے اللہ کے حق میں تطفیف کر دی، فاروق اعظم کے اس قول کو نقل کر کے حضرت امام مالکؒ نے فرمایا لکلّ شیءٍ وفاء و تطفیف یعنی پورا حق دینا یا کم کرنا ہر چیز میں ہے یہانتک کہ نماز، وضو، طہارت میں بھی اور اسی طرح دوسرے حقوق اللہ اور عبادات میں کمی کوتاہی کرنے والا تطفیف کرنے کا مجرم ہے اسی طرح حقوق العباد میں جو شخص مقررہ حق سے کم کرتا ہے وہ بھی تطفیف کے حکم میں ہے۔ مزدور ملازم نے جتنے وقت کی خدمت کا معاہدہ کیا ہے اُس میں سے وقت چُرانا اور کم کرنا بھی اس میں داخل ہے۔ وقت کے اندر جس طرح محنت سے کام کرنے کا عرف میں معمول ہے اسمیں سُستی کرنا بھی تطفیف ہے اس میں عام لوگوں میں یہانتک کہ اہلِ علم میں بھی غفلت پائی جاتی ہے، اپنی ملازمت کے فرائض میں کمی کرنے کو کوئی گناہ ہی نہیں سمجھتا اعاذنا اللہ منہ

حدیث حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خمس بخمس یعنی پانچ گناہوں کی سزا پانچ چیزیں ہیں۔ (۱) جو شخص عہد شکنی کرتا ہے اللہ اُس پر اُس کے دشمن کو مسلط اور غالب کر دیتا ہے (۲) جو قوم اللہ کے قانون کو چھوڑ کر دوسرے قوانین پر فیصلے کرتے ہیں ان میں فقر و احتیاج عام ہو جاتا ہے (۳) جس قوم میں بے حیائی اور زنا عام ہو جائے اُس پر اللہ تعالیٰ طاعون (اور دوسرے وبائی امراض) مسلط کر دیتا ہے (۴) اور جو لوگ ناپ تول میں کمی کرنے لگیں اللہ تعالیٰ اُن کو قحط میں مبتلا کر دیتا ہے (۵) جو لوگ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے اللہ تعالیٰ اُن سے بارش کو روک دیتا ہے (ذکرہ القرطبی وقال خرجہ البزار بمعناہ و مالک بن انس ایضاً من حدیث ابن عمرؓ) اور طبرانی نے حضرت ابن عباس رضؓ سے روایت کیا ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس قوم میں مالِ غنیمت کی چوری رائج ہو جائے اللہ تعالیٰ انکے دلوں میں دشمن کا رُعب اور ہیبت ڈالدیتے ہیں۔ اور جس قوم میں ربوا یعنی سود خوری کا رواج ہو جائے اُنمیں موت کی کثرت ہو جاتی ہے اور جو قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ انکا رزق قطع کر دیتے ہیں اور جو لوگ حق کے خلاف فیصلے کرتے ہیں اُن میں قتل و خون عام ہو جاتا ہے اور جو لوگ معاہدات میں غداری کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن پر اُن کے دشمن مسلط کر دیتا ہے (رواہ مالک موقوفاً۔ از مظہری)

فقر و فاقہ اور قحط و قطع رزق کی مختلف صورتیں حدیث میں جن لوگوں کا رزق قطع کر دینے کا ارشاد ہے اُس کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ اُس کو رزق سے بالکل محروم کر دیا جائے اور یہ صورت بھی قطع رزق ہی میں داخل ہے کہ رزق موجود ہوتے ہوئے وہ اُس کو کھا نہ سکے یا استعمال نہ کر سکے جیسے بہت سی بیماریوں میں اسکا مشاہدہ ہوتا ہے اور اس زمانے میں بہت عام ہے۔ اسی طرح قحط کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ اشیاء ضرورت مفقود ہو جائیں، اور یہ بھی ہو سکتی ہے کہ موجود بلکہ کثیر ہونے کے باوجود اُن کی گرانی اتنی بڑھ جائے کہ خریداری مشکل ہو جائے جیسا کہ آجکل اسکا مشاہدہ اکثر چیزوں میں ہو رہا ہے۔ اور حدیث میں فقر مسلط کرنیکا ارشاد ہے اسکے معنے صرف یہی نہیں کہ روپیہ پیسہ اور ضرورت کی اشیاء اسکے پاس نہ رہیں بلکہ فقر کے اصلی معنے محتاجی اور حاجتمندی کے ہیں۔ ہر شخص اپنے کاروبار اور ضروریاتِ زندگی میں دوسروں کا جتنا محتاج ہو وہ اُتنا ہی فقیر ہے۔ اس زمانے کے حالات پر غور کیا جائے تو

انسان اپنے رہن سہن اور نقل و حرکت اور اپنے ارادوں کے پورا کرنے میں ایسے ایسے قوانین میں جکڑا ہوا نظر آتا ہے کہ اُس کے لقمہ اور کلمہ تک پر پابندیاں ہیں، اپنا مال موجود ہوتے ہوئے خریداری میں آزاد نہیں کہ جہاں سے چاہے کچھ خریدے۔ سفر میں آزاد نہیں کہ جب کہیں جانا چاہے چلا جائے، ایسی ایسی پابندیوں میں انسان جکڑا گیا ہے کہ ہر کام کے لئے دفتر گردی اور افسروں سے لیکر چپراسیوں تک کی خوشامد کئے بغیر زندگی گزارنا مشکل ہے یہ سب محتاجی ہی تو ہے جسکا دوسرا نام فقر ہے۔ اس تفصیل سے وہ شبہات رفع ہوگئے جو حدیث کے ارشاد کے متعلق ظاہری حالات کے اعتبار سے ہوسکتے ہیں۔

سجین اور علیین | كَلَّآ إِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ، سجین، بکسر سین و تشدید جیم بروزن سکّین سجن سے مشتق ہے جس کے معنی تنگ جگہ میں قید کرنے کے ہیں۔ قاموس میں ہے کہ سجین کے معنے دائمی قید کے ہیں اور احادیث و آثار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سجین ایک مقام خاص کا نام ہے، اور کفار فجار کی ارواح کا مقام یہی ہے اور اسی مقام میں انکے اعمالنامے رہتے ہیں، جسکا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُن کے اعمالنامے اس جگہ میں محفوظ کر دیئے جاتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس جگہ کوئی ایسی کتاب جامع ہو جسمیں تمام دُنیا کے کفار و فجار کے اعمال لکھدیئے جاتے ہوں۔

یہ مقام کس جگہ ہے اس کے متعلق حضرت براء بن عازب رضؓ کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سجین ساتویں زمین کے نچلے طبقہ میں ہے اور علیین ساتویں آسمان میں زیر عرش ہے (اخرجہ البغوی بسندہ واخرجہ احمد وغیرہ از مظہری) بعض روایاتِ حدیث میں یہ بھی ہے کہ سجین کفار و فجار کی ارواح کا مستقر ہے، اور علیین، مؤمنین متقین کی ارواح کی جگہ ہے۔

جنّت اور دوزخ کا مقام | بیہقی نے دلائل نبوّت میں حضرت عبداللہ بن سلام رضؓ سے روایت کیا ہے کہ جنّت آسمان میں ہے اور جہنّم زمین میں، اور ابنِ جریر نے اپنی تفسیر میں حضرت معاذ بن جبل رضؓ سے روایت کیا ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ قرآن کریم میں جو یہ آیا ہے کہ قیامت کے روز جہنّم کو لایا جائیگا وَجِایْۤءَ یَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ اسکا مطلب کیا ہے، جہنّم کو کہاں سے لایا جائے گا تو آپؐ نے فرمایا کہ جہنّم کو ساتویں زمین سے لایا جائے گا۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنّم ساتویں زمین میں ہے وہیں سے بھڑک کر سارے سمندر اور دریا اُس کی آگ میں شامل ہو جائینگے اور سب کے سامنے آجائے گی۔ جہنّم کے لائے جانیکا یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے۔ اس طرح جن روایات میں یہ آیا ہے کہ سجین جہنّم کے ایک مقام کا نام ہے وہ بھی اس پر منطبق ہوگیا، (مظہری) واللہ اعلم

كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ، مرقوم کے معنے اس جگہ مختوم کے ہیں۔ یعنی مہر لگی ہوئی۔ امام بغوی اور ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ جملہ مقام سجین کی تفسیر نہیں، بلکہ اس سے پہلے جو کِتٰبَ الْفُجَّارِ آیا ہے اسکا بیان ہے، معنے یہ ہیں کہ کفار و فجار کے اعمالنامے مہر لگاکر محفوظ کر دیئے جاویں گے کہ اُنمیں کسی کمی بیشی اور تغیر کا امکان نہ رہے گا اور انکے محفوظ کرنے کی جگہ سجین ہے یہیں کفار کی ارواح کو جمع کردیا جائے گا۔

كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ، ران، رین سے مشتق ہے جس کے معنے زنگ اور میل

کہیں مطلب یہ ہے کہ انکے دِلوں پر انکے گناہوں کا زنگ لگ گیا ہے اور جس طرح زنگ لوہے کو کھا کر مٹی بنا دیتا ہے اسی طرح ان گناہوں کے زنگ نے اُن کے دل کی اس صلاحیت کو ختم کر دیا جس سے بھلے بُرے کی تمیز ہوتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مؤمن بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اُس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگجاتا ہے اگر اُسنے توبہ کر لی اور اُس پر نادم ہو کر آگے اپنے عمل کو درست کر لیا تو یہ سیاہ نقطہ مٹ جاتا ہے اور دل اپنی اصلی حالت پر منوّر ہو جاتا ہے اور اگر اُس نے توبہ نہ کی بلکہ اپنے گناہوں میں زیادتی کرتا چلا گیا تو یہ سیاہی اُس کے سارے قلب پر چھا جاتی ہے اسی کا نام ران ہے جو آیتِ قرآن بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ میں مذکور ہے (رواہ البغوی وکذا اخرج احمد والترمذی وصحہ والنسائی وابن ماجہ وابن حبان والحاکم۔ از مظہری) لفظ کَلَّا جو آیت کے شروع میں ہے اسکو حرف ردع کہتے ہیں جس کے معنے دفع کرنے اور زجر و تنبیہ کرنیکے ہیں۔ پہلی آیتوں میں کفار کی تکذیب کا ذکر تھا کہ وہ آیاتِ قرآن کو کہانیاں کہہ کر جھٹلاتے ہیں، اس آیت میں لفظ کَلَّا سے اس پر زجر و تنبیہ ہے کہ ان جاہلوں نے اپنے گناہوں کے انبار میں مبتلا ہو کر اپنے دِلوں کی اُس نورانیت اور صلاحیت کو ختم کر دیا ہے جس سے حق و باطل پہچانا جاتا ہے اور یہ صلاحیت حق تعالیٰ ہر انسان کی جبلّت اور فطرت میں رکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اُن کی یہ تکذیب کسی دلیل یا عقل و فہم کی بنار پر نہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے قلوب اندھے ہو چکے ہیں اُنھیں بھلا بُرا نظر ہی نہیں آتا۔

اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ، یعنی قیامت کے روز یہ کفار فجار اپنے رب کی زیارت سے محروم پسِ پردہ روکدیئے جاوینگے، یہ انکے اس عمل کی سزا ہوگی کہ اُنھوں نے دنیا میں حق کو نہیں پہچانا تو اب اپنے رب کی زیارت کے قابل نہیں رہے۔ حضرت امام مالکؒ اور شافعیؒ نے فرمایا کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ مؤمنین اور اولیار اللہ کو حق تعالیٰ کی زیارت ہوگی ورنہ پھر کفار کے محجوب رہنے کا کوئی فائدہ ہی نہ ہوتا۔

فائدہ بعض اکابر علمار نے فرمایا کہ یہ آیت اس کی دلیل ہے کہ ہر انسان اپنی فطرت سے حق تعالیٰ کی محبت پر مجبور ہے اسی لئے دُنیا کے عام کفار و مشرکین چاہے کتنے ہی کفر و شرک میں مبتلا ہوں اور اللہ جل شانہ کی ذات و صفات کے متعلق باطل عقیدے رکھتے ہوں مگر اتنی بات سب میں مشترک ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت سب کے دلوں میں ہوتی ہے اور اپنے اپنے عقیدے کے مطابق اُسی کی جستجو اور رضا جوئی کے لئے عبادتیں کرتے ہیں، راستہ غلط ہوتا ہے اس لئے منزلِ مقصود پر نہیں پہنچتے مگر طلب اُسی منزلِ حق کی ہوتی ہے وجہ استدلال کی یہ ہے کہ اگر کفار میں حق تعالیٰ کی زیارت کا شوق نہ ہوتا تو اُن کی سزا میں یہ نہ کہا جاتا کہ وہ زیارت سے محروم رہیں گے کیونکہ جو شخص کسی کی زیارت کا طالب ہی نہیں بلکہ متنفر ہے اُس کے لئے یہ کوئی سزا نہیں کہ اُس کو اس کی زیارت سے محروم کیا جائے۔

اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ، علّیین بعض حضرات کے نزدیک عُلو کی جمع ہے اور مراد اعلیٰ درجہ کا عُلو اور بلندی ہے اور فرار کے نزدیک یہ ایک موضع کا نام ہے وزن جمع پر آیا ہے جمع نہیں، اور لفظ سجّین کی تحقیق میں اُوپر گزر چکا ہے کہ حضرت برار بن عازب رضؓ کی مرفوع روایت سے ثابت ہے کہ علّیین ساتویں آسمان پر زیرِ عرش ایک مقام ہے جسمیں مؤمنین کی ارواح اور صحائفِ اعمال رکھے جاتے ہیں، اور آگے جو كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ مذکور ہے یہ بھی علّیین کی

تفسیر نہیں بلکہ ابرار کے نامۂ اعمال کا بیان ہے جسکا ذکر اوپر اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ میں آیا ہے۔

يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ، یشہد، شہود سے مشتق ہے جس کے معنے حاضر ہونے اور مشاہدہ کرنیکے آتے ہیں۔ بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ مراد آیت کی یہ ہے کہ ابرار و صالحین کی کتاب الاعمال کو مقربین دیکھتے ہونگے اور مراد مقربین سے فرشتے ہیں اور دیکھنے سے مراد اس کی نگرانی اور حفاظت ہے، مطلب یہ ہے کہ ابرار و صالحین کے صحائف اعمال مقرب فرشتوں کی نگرانی میں ہونگے (قرطبی) اور شہود سے مراد حضور کے معنی لئے جائیں تو یشہدہ کی ضمیر کتاب کے بجائے علّیین کیطرف راجع ہوگی اور معنی آیت کے یہ ہونگے کہ مقربین بارگاہ کی ارواح اسی مقام علّیین میں حاضر ہونگی کیونکہ یہ ہی مقام انکی ارواح کا مستقر بنایا گیا ہے جس طرح سجّین کفار کی ارواح کا مستقر ہے اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعودرضؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شہدار کی ارواح اللہ تعالےٰ کے نزدیک سبز پرندوں کے پوٹوں میں ہونگی جو جنت کے باغات اور نہروں کی سیر کرتی ہونگی اور اُن کے رہنے کی جگہ قندیل ہونگے جو عرش کے نیچے معلّق ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ شہدار کی ارواح تحت العرش رہیں گی اور جنت کی سیر کرسکیں گی اور سورۂ یٰسین میں جو حبیب نجّار کے واقعہ میں آیا ہے قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ، اس سے معلوم ہوا کہ حبیب نجّار موت کیساتھ ہی جنّت میں داخل ہوگئے اور بعض روایاتِ حدیث سے بھی ارواح مؤمنین کا جنّت میں ہونا معلوم ہوتا ہے، ان سب کا حاصل ایک ہی ہے کہ مستقرانِ ارواح کا ساتویں آسمان پر تحت العرش ہے اور یہی مقام جنّت کا بھی ہے ان ارواح کو جنت کی سیر کرنیکا اختیار دیا گیا ہے۔ اور یہاں اگرچہ یہ حال صرف مقرّبین کا انکی اعلیٰ خصوصیت اور فضیلت کیوجہ سے بیان کیا گیا ہے مگر درحقیقت یہی مستقر تمام مؤمنین کی ارواح کا بھی ہے جیساکہ حضرت کعب بن مالکؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ،

انما نسمۃ المؤمن طائر یعلق فی شجر الجنۃ حتّٰی ترجع الیٰ جسدہ یوم القیٰمۃ (رواہ مالک والنسائی بسند صحیح)

مومن کی روح ایک پرندہ کی شکل میں جنت کے درختوں میں معلق رہے گی یہاں تک کہ قیامت کے روز وہ اپنے جسم میں پھر لوٹ جائے۔

اور اسی مضمون کی ایک حدیث اُمّ ہانی رضؓ کی روایت سے مسند احمد اور طبرانی میں آئی ہے (مظہری)

مقرِّ ارواح یعنی موت کے بعد انسانی روحوں کا مقام کہاں ہے اس معاملے میں روایاتِ حدیث بظاہر مختلف ہیں، سجّین اور علّیین کی تفسیر میں جو روایات اُوپر مذکور ہوئی اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ارواحِ کفار سجّین میں رہتی ہیں جو ساتویں زمین میں ہے اور ارواحِ مؤمنین علیین میں رہتی ہیں جو ساتویں آسمان پر زیرِ عرش ہے اور مذکور الصدر روایات میں بعض سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ارواحِ کفار جہنّم میں اور ارواحِ مؤمنین جنّت میں رہیں گی۔ اور بعض روایاتِ حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مؤمنین و کفار دونوں کی روحیں اُن کی قبروں میں رہتی ہیں جیساکہ حضرت براء بن عازب کی طویل حدیث میں ہے کہ جب مومن کی رُوح کو آسمان میں فرشتے لیجاتے ہیں تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے اس بندے کا اعمالنامہ علّیین میں لکھدو اور اسکو زمین کیطرف لوٹا دو کیونکہ اس کو میں نے زمین ہی سے پیدا کیا ہے اور مرنے کے بعد

اُسی میں لوٹاؤں گا اور پھر اُسی زمین سے اُن کو دوبارہ زندہ کرکے نکالوں گا، اس حکم پر فرشتے اسکی رُوح کو قبر میں لوٹا دیتے ہیں۔ اسی طرح کافر کی روح کے لئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے اور یہی حکم ہوگا کہ اس کو اس کی قبر میں لوٹا دو۔ امام ابن عبدالبر نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ سب کی ارواح بعد الموت قبر ہی میں رہتی ہیں۔ ان میں پہلی اور دوسری روایات میں جو یہ اختلاف پایا جاتا ہے کہ بعض سے ارواح مؤمنین کا ..... علّیین میں رہنا معلوم ہوتا ہے اور بعض سے جنّت میں رہنا، غور کیا جائے تو یہ کوئی اختلاف نہیں کیونکہ مقام علّیین بھی ساتویں آسمان پر زیر عرش ہے اور جنت کا بھی یہی مقام خود قرآن کریم کی تصریح سے ثابت ہے عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوٰى، اس میں تصریح ہے کہ جنّت سدرۃ المنتہیٰ کے پاس ہے اور سدرہ کا ساتویں آسمان میں ہونا حدیث سے ثابت ہے اسلئے مقامِ ارواح جب علّیین ہوا تو وہ جنّت کے متصل ہے اور ان ارواح کو جنّت کے باغات کی سیر نصیب ہے اسلئے ان کا مقام جنّت بھی کہا جا سکتا ہے۔

اسی طرح کفّار کی ارواح سجّین میں ہیں اور وہ ساتویں زمین میں ہے اور حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ جہنّم بھی ساتویں زمین میں ہے اور اہلِ سجّین کو جہنّم کی تپش اور ایذائیں پہنچتی رہیں گی اسلئے اُنکا مقام جہنّم میں کہدینا بھی صحیح ہے۔ البتہ اور جس روایت میں ارواح کا قبروں میں رہنا معلوم ہوتا ہے بظاہر پچھلی دونوں روایتوں سے بہت مختلف ہے اس کی تطبیق بیہقی زمانہ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رہ نے تفسیر مظہری میں یہ بیان کی ہے کہ یہ بات کچھ بعید نہیں کہ اصل مستقر ارواح کا علّیین اور سجّین ہی ہوں مگر ان ارواح کا ایک خاص رابطہ قبروں کیساتھ بھی قائم ہو۔ اس رابطہ کی حقیقت تو اللہ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا مگر جس طرح آفتاب ماہتاب آسمان میں ہیں اور اُن کی شعاعیں زمین پر پڑکر اسکو روشن بھی کر دیتی ہیں گرم بھی۔ اسی طرح علّیین و سجّین کی ارواح کا کوئی رابطہ معنویہ قبروں سے ہو سکتا ہے اور ان تمام اقوال کی تطبیق میں حضرت قاضی ثناء اللہ رہ کی تحقیق سورۂ نازعات کی تفسیر میں ابھی گزر چکی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ روح کی دو قسمیں ہیں ایک جسمِ لطیف ہے جو انسان کے بدن میں حلول کرتا ہے اور وہ مادّی اور عنصری جسم ہے مگر لطیف ہے نظر نہیں آتا، اسی کو نفس کہا جاتا ہے۔ دوسری روح جوہر مجرد ہے مادی نہیں، اور وہ روح مجردہی روح اوّل کی حیات ہے اسلئے اسکو رُوح الروح کہہ سکتے ہیں، انسان کے جسم سے تعلق تو ان دونوں قسم کی رُوحوں کا ہے مگر پہلی قسمِ جسمِ انسانی کے اندر رہتی ہے اسکے نکلنے ہی کا نام موت ہے۔ دوسری روح کا اس پہلی روح سے تعلق قریب تو ہے مگر اس تعلق کی حقیقت اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ مرنیکے بعد روح اوّل تو آسمانوں میں لیجائی جاتی ہے پھر قبر میں لوٹا دیجاتی ہے اسکا مستقر قبر ہی ہے اسی پر عذاب ثواب ہوتا ہے اور رُوح مجرد علّیین یا سجّین میں رہتی ہے۔ اسطرح اقوال جمع ہوگئے مستقر ارواح کا جنّت یا علّیین میں یا اسکے بالمقابل جہنّم یا سجّین میں ہونا رُوح مجرد کے اعتبار سے ہے اور اسکا مستقر قبر میں ہونا روح کی قسم اوّل یعنی نفس کے اعتبار سے ہے جو جسمِ لطیف ہے اور مرنیکے بعد قبر میں رہتا ہے۔ واللہ اعلم

وَفِي ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ ، تنافس کے معنے ہے چند آدمیوں کا کسی خاص مرغوب و محبوب چیز کے حاصل کرنے کے لئے جھپٹنا دوڑنا تاکہ دوسروں سے پہلے وہ اس کو حاصل کرلیں، یہاں جنّت کی

نعمتوں کا ذکر فرمانے کے بعد حق تعالیٰ نے غفلت شعار انسان کو اس طرف متوجہ کیا ہے کہ آج تم لوگ جن چیزوں کو مرغوب و مطلوب سمجھ کر اُن کے حاصل کرنے میں دوسروں سے آگے بڑھنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہو۔ یہ ناقص اور فانی نعمتیں اس قابل نہیں کہ ان کو مقصود زندگی سمجھ کر اُن کے لئے مسابقت کرو بلکہ ان میں تو اگر قناعت وایثار سے کام لیکر یہ سمجھ لو کہ یہ چند روزہ راحت کا سامان ہاتھ سے نکل ہی گیا تو کچھ بڑے صدمے کی بات نہیں، ایسا خسارہ نہیں جس کی تلافی نہ ہو سکے، البتہ تنافس اور مسابقت کرنے کی چیز یہ جنت کی نعمتیں ہیں جو ہر حیثیت سے مکمل بھی ہیں اور دائمی بھی، اکبر مرحوم نے خوب فرمایا ؎

یہ کہاں کا فسانہ ہے سُود و زیاں، جو گیا سو گیا جو مِلا سو مِلا
کہو ذہن سے فرصتِ عمر ہے کم، جو دِلا تو خُدا ہی کی یاد دِلا

إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ ، ان آیات میں حق تعالیٰ نے اہلِ حق کے ساتھ اہلِ باطل کے طرزِ عمل کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے کہ کفار اہلِ باطل مؤمنین اہلِ حق پر استہزاءً ہنستے اور دل لگی کرتے ہیں اور جب اہلِ حق اُن کے سامنے آتے ہیں تو یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کو آنکھ کے اشارے کرتے ہیں جس سے مقصود بھی ان کی استہزار اور ایذا رسانی ہوتی ہے۔ پھر جب یہ کفار اہلِ باطل اپنے اپنے ٹھکانوں پر لوٹتے ہیں تو مومنین کے ساتھ جو تمسخر اور استہزار کیا ہے اسکا باہم تذکرہ مزے لیکر کرتے ہیں کہ ہمنے خوب ان لوگوں کو ذلیل کیا۔ اور جب یہ کفار مؤمنین کو دیکھتے ہیں تو بظاہر ہمدردی کے لہجہ میں اور درحقیقت تمسخر کیلئے یہ کہتے ہیں کہ یہ بیچارے بڑے سادہ لوح بے وقوف ہیں ان کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے گمراہ کر دیا ہے۔

آجکل کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو اسوقت وہ لوگ جو کچھ نئی تعلیم کی نحوست سے دین و آخرت سے بے فکر ہو چکے ہوتے ہیں خدا اور رسول پر ایمان برائے نام رہ جاتا ہے وہ علماء و صلحاء کیساتھ بعینہٖ اسی طرح کا معاملہ کرتے ہیں، حق تعالیٰ مسلمانوں کو اس عذابِ الیم سے نجات عطا فرماویں۔ مؤمنین صالحین کے لئے اس آیت میں تسلی کا کافی سامان ہے کہ اُن کے ہنسنے کی پروا نہ کریں کسی نے خوب کہا ہے ؎

ہنسنے جانے سے جبتک ہم ڈریں گے ❖ زمانہ ہم پہ ہنستا ہی رہے گا

تمت سورۃ التطفیف والحمد للہ لیلۃ یوم الاثنین ۱۲ شعبان سنہ ۱۳۹۱ھ

سُورَۃ الانشقاق

سُورَۃُ الْاِنْشِقَاقِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ خَمْسٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰیَۃً

سُورَۃ انشقاق مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی پچیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ﴿۱﴾ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ﴿۲﴾ وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ﴿۳﴾

جب آسمان پھٹ جائے اور سن لے حکم اپنے رب کا اور وہ آسمان اسی لائق ہے اور جب زمین پھیلادی جائے

وَاَلْقَتْ مَا فِیْهَا وَتَخَلَّتْ ﴿۴﴾ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ﴿۵﴾ یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ

اور نکال ڈالے جو کچھ اسمیں ہے اور خالی ہو جائے اور سن لے حکم اپنے رب کا اور وہ زمین اسی لائق ہے اے آدمی

اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ ﴿۶﴾ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ

تجھ کو تکلیف اٹھانی ہے اپنے رب تک پہنچنے میں سہہ سہہ کر پھر اس سے ملنا ہے سو جس کو ملا اعمالنامہ اس کا

بِیَمِیْنِهٖ ﴿۷﴾ فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا ﴿۸﴾ وَّیَنْقَلِبُ اِلٰۤی اَهْلِهٖ

داہنے ہاتھ میں تو اس سے حساب لیں گے آسان حساب اور پھر کر آئے گا اپنے لوگوں کے پاس

مَسْرُوْرًا ﴿۹﴾ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ﴿۱۰﴾ فَسَوْفَ یَدْعُوْا

خوش ہو کر اور جس کو ملا اس کا اعمالنامہ پیٹھ کے پیچھے سے سو وہ پکاریگا موت

ثُبُوْرًا ﴿۱۱﴾ وَّیَصْلٰی سَعِیْرًا ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ کَانَ فِیْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ﴿۱۳﴾ اِنَّهٗ

موت اور پڑے گا آگ میں وہ رہا تھا اپنے گھر میں بے غم اس نے

ظَنَّ اَنْ لَّنْ یَّحُوْرَ ﴿۱۴﴾ بَلٰۤی اِنَّ رَبَّهٗ کَانَ بِهٖ بَصِیْرًا ﴿۱۵﴾ فَلَاۤ اُقْسِمُ

خیال کیا تھا کہ پھر کر نہ جائے گا کیوں نہیں اس کا رب اس کو دیکھتا تھا سو قسم کھاتا ہوں

بِالشَّفَقِ ﴿۱۶﴾ وَالَّیْلِ وَمَا وَسَقَ ﴿۱۷﴾ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ﴿۱۸﴾ لَتَرْکَبُنَّ

شام کی سرخی کی اور رات کی اور جو چیزیں اسمیں سمٹ آتی ہیں اور چاند کی جب پورا بھر جائے کہ تم کو چڑھنا ہے

معانقۃ ۱۰

طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿١٩﴾ فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٢٠﴾ وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ

سیڑھی پر سیڑھی — پھر کیا ہوا ہے اُن کو جو یقین نہیں لاتے — اور جب پڑھیے اُن کے پاس قرآن

لَا يَسْجُدُونَ ﴿٢١﴾ بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُكَذِّبُونَ ﴿٢٢﴾ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا

وہ سجدہ نہیں کرتے — اُوپر سے اور یہ کہ منکر جھٹلاتے ہیں — اور اللہ خوب جانتا ہے جو اندر

يُوعُونَ ﴿٢٣﴾ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٢٤﴾ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

بھر رکھتے ہیں سو خوشی سُنا دے اُن کو عذاب دردناک کی — مگر جو لوگ کہ یقین لائے اور کام کئے بھلے

لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ﴿٢٥﴾

اُن کے لئے ثواب ہے بے انتہا

خلاصۂ تفسیر

جب (نفخۂ ثانیہ کے وقت) آسمان پھٹ جاویگا (تاکہ اسمیں سے غمام یعنی بادل کی شکل کی ایک چیز کا نزول ہو جس میں فرشتے ہونگے جسکا ذکر پارۂ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ آیت وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَاءُ الخ میں ہے) اور اپنے رب کا حکم سُن لیگا (اور مان لیگا، یہاں حکم سے مراد حکم تکوینی انشقاق کا ہے اور ماننے سے مراد اس کا وقوع ہے) اور وہ (آسمان بوجہ محکوم قدرت ہونے کے) اسی لائق ہے (کہ جس امر کی مشیت اسکے متعلق ہو اسکا وقوع ضرور ہو جاوے) اور جب زمین کھینچ کر بڑھادی جاوے گی (جس طرح چمڑا یا ربڑ کھینچا جاتا ہے، پس اسوقت کی مقدار سے اُس وقت مقدار زیادہ ہو جاوے گی تاکہ سب اوّلین و آخرین اُس میں سما جاویں جیسا درمنثور میں بسند جید حاکم کی روایت سے مرفوعاً وارد ہے تمدّ الارض یوم القیٰمۃ مدّ الادیم الخ پس آسمان کا یہ انشقاق اور زمین کا امتداد دونوں حسابِ محشر کے مقدمات میں سے ہیں) اور (وہ زمین) اپنے اندر کی چیزوں کو (یعنی مُردوں کو) باہر اُگل دیگی اور (سب مُردوں سے) خالی ہو جاوے گی اور (وہ زمین) اپنے رب کا حکم سُن لیگی اور وہ اسی لائق ہے (اسکی تفسیر بھی مثلِ سابق ہے بس اسوقت انسان اپنے اعمال کو دیکھے گا جیسا آگے ارشاد ہے کہ) اے انسان تو اپنے رب کے پاس پہنچنے تک (یعنی مرنے کے وقت تک) کام میں کوشش کر رہا ہے (یعنی کوئی نیک کام میں لگا ہوا ہے کوئی بُرے کام میں) پھر (قیامت میں) اُس (کام کی جزاء) سے جا ملیگا تو (اس روز) جس شخص کا نامۂ اعمال اسکے داہنے ہاتھ میں ملے گا سو اس سے آسان حساب لیا جاوے گا اور وہ (اس سے فارغ ہو کر) اپنے متعلقین کے پاس خوش خوش آئیگا (آسان حساب کے مراتب مختلف ہیں، ایک یہ کہ اس پر بالکل عذاب مرتب نہو، بعض کے لئے تو یہ ہوگا اور حدیث میں اسی کی تفسیر یہ آئی ہے کہ جس حساب میں مناقشہ (خورده گیری) نہ ہو صرف پیشی ہو جاوے اور یہ اُن کے لئے ہوگا جو بلا کسی عذاب کے نجات پائیں گے۔ دوسرا یہ کہ اُس پر عذاب دائمی نہ ہو اور یہ عام مومنین کیلئے ہوگا۔ اور مطلق عذاب اسکے منافی نہیں) اور جس شخص کا نامۂ اعمال (اسکے بائیں ہاتھ میں) اسکی پیٹھ کے پیچھے سے ملیگا (مراد اس

سے کفار ہیں، اور پشت کیطرف سے ملنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اُس کی مشکیں کسی ہوئی ہوں گی تو بایاں ہاتھ بھی پشت کیطرف ہوگا، دوسری صورت مجاہد کا قول ہے کہ اسکا بایاں ہاتھ پشت کی طرف نکالدیا جاویگا، کذا فی الدرالمنثور) سو وہ موت کو پکاریگا (جیسا مصیبت میں عادت ہے موت کی تمنا کرنے کی) اور جہنم میں داخل ہوگا، یہ شخص (دُنیا میں) اپنے متعلقین (اہل و عیال و حشم و خدم) میں خوش خوش رہا کرتا تھا (یہاں تک کہ فرطِ خوشی میں آخرت کی تکذیب کرنے لگا تھا جیساکہ آگے ارشاد ہے کہ) اُس نے خیال کر رکھا تھا کہ اُسکو (خدا کی طرف) لوٹنا نہیں ہے (آگے رد ہے اس گمان کا کہ لوٹنا) کیوں نہ ہوتا (آگے لوٹنے کے بعد جزا کا اثبات ہے کہ) اسکا رب اسکو خوب دیکھتا تھا (اور اسکے اعمال پر جزا دینے کے ساتھ مشیت متعلق کر چکا تھا اسلئے جزا کا وقوع ضروری تھا) سو (اس بنا پر) میں قسم کھا کر کہتا ہوں شفق کی اور رات کی اور اُن چیزوں کی جن کو رات سمیٹ (کر جمع کر) لیتی ہے (مراد وہ سب جاندار ہیں جو رات کو آرام کرنے کے لئے اپنے اپنے ٹھکانے میں آجاتے ہیں) اور چاند کی جب وہ پُورا ہو جاوے (یعنی بدر بنجاوے، ان سب چیزوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں) کہ تم لوگوں کو ضرور ایک حالت کے بعد دوسری حالت پر پہنچنا ہے (یہ تفصیل ہے يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ تا مُلٰقِيْهِ کی، پس وہاں جنس کو خطاب تھا یہاں جمیع افراد کو خطاب ہے وہاں لقائے عمل کا ذکر مجملاً فرمایا، یہاں اُس چیز کی تفصیل ہے جس سے روزِ محشر ملے گا یا اسکے سامنے آویگی اور وہ حالتیں ایک موت ہے اسکے بعد احوالِ برزخ اسکے بعد احوالِ قیامت پھر خود اُنمیں بھی تعدد و کثرت ہے اور ان قسموں کا مناسبِ مقام ہونا اسطرح ہے کہ رات کے احوال کا مختلف ہونا کہ اول شفق نمودار ہوتی ہے پھر زیادہ رات آتی ہے تو سب سو جاتے ہیں اور پھر ایک رات کا دوسری رات سے نورِ قمر کی زیادت و نقصان میں مختلف ہونا، یہ سب مشابہ ہے اختلافِ احوال بعد الموت کے، ونیز موت سے عالمِ آخرت شروع ہوتا ہے جیسے شفق سے رات شروع ہوتی ہے پھر عالمِ برزخ میں رہنا مشابہ لوگوں کے سو رہنے کے ہے اور چاند کا پورا ہونا بعد مُحاق کے مشابہ ہے حیٰوۃ قیامت کے بعد فنائے عالم کے) سو (باوجود ان مقتضیات خوف و ایمان کے اجتماع کے) ان لوگوں کو کیا ہوا کہ ایمان نہیں لاتے اور (خود تو ایمان اور حق کی کیا طلب کرتے انکی عناد کی یہ حالت ہے کہ) جب انکے روبرو قرآن پڑھا جاتا ہے تو (اسوقت بھی خدا کیطرف) نہیں جھکتے بلکہ (بجائے جھکنے کے) یہ کافر (اور اُلٹی) تکذیب کرتے ہیں اور اللہ کو سب خبر ہے جو کچھ یہ لوگ (اعمالِ بد کا ذخیرہ) جمع کر رہے ہیں سو (ان اعمالِ کفریہ کے سبب) آپ ان کو ایک دردناک عذاب کی خبر دیدیجئے لیکن جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے عمل کئے انکے لئے (آخرت میں) ایسا اجر ہے جو کبھی موقوف ہونیوالا نہیں (عمل صالح کی قید شرط کے طور پر نہیں سبب کے طریق پر ہے)

معارف و مسائل

اس سورت میں قیامت کے احوال اور حساب کتاب اور نیک و بد کی جزاء و سزا کا پھر غافل انسان کو خود اسکی ذات اور گرد و پیش کے حالات میں غور کرنے اور اُن سے ایمان باللہ والقرآن تک پہنچنے کی ہدایت ہے۔ اسمیں پہلے

آسمان کے پھٹنے کا ذکر ہے پھر زمین کا کہ جو کچھ اسکے پیٹ میں ہے خواہ وہ خزائن دفائن ہوں یا انسان کے مُردہ اجسام وہ سب اُگل کر نکالدے گی اور محشر کے لئے ایک نئی زمین تیار ہوگی جس میں نہ کوئی غار، پہاڑ ہوگا نہ تعمیر اور درخت ایک صاف سطح مستوی ہوگی اُس کو کھینچکر بڑھا دیا جائیگا تاکہ تمام اوّلین و آخرین اُس پر جمع ہوسکیں یہ بیان دوسری سُورتوں میں مختلف عنوان سے آیا ہے، یہاں ایک نئی زیادتی یہ ہے کہ آسمان اور زمین دونوں پر جو تصرف حق تعالیٰ کیطرف سے روزِ قیامت ہوگا اسکے متعلق فرمایا وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ، اَذِن کے معنی ہیں سُن لیا اور مراد سُننے سے سُنکر اطاعت کرنا ہے اور حُقَّتْ بصیغۂ مجہول کے معنی یہ ہیں کہ حُقَّ لہا الانقیاد یعنی حق ہے واجب تھا کہ وہ اللہ کے اس حکم کی اطاعت کرے

احکامِ الٰہیہ کی دو قسمیں یہاں آسمان و زمین کی اطاعت اور تعمیلِ حکم کے دو معنے ہوسکتے ہیں کیونکہ احکامِ الٰہیہ دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک تشریعی احکام جنمیں ایک قانون بتلایا جاتا ہے اور اُس کی خلاف ورزی کی سزا بتلا دی جاتی ہے مگر کرنیوالے کو اُسکی کسی جانب پر مجبور محض نہیں کیا جاتا بلکہ اسکو ایک درجہ کا اختیار دیا جاتا ہے وہ اپنے اختیار سے اس قانون کی پابندی کرے یا خلاف ورزی، اور ایسے احکام عموماً اُن مخلوقات پر عائد ہوتے ہیں جو ذوی العقول کہلاتے ہیں جیسے انسان اور جن، یہیں سے ان میں مؤمن و کافر اور مطیع و نافرمان کی دو قسمیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ دوسری قسم احکام کی تکوینی اور تقدیری احکام ہیں ان کی تنفیذ جبری ہوتی ہے کسی کی مجال نہیں کہ سرمو ان کے خلاف کرسکے ان احکام کی تعمیل کل مخلوقات جبراً کرتی ہے ان میں انسان اور جن بھی داخل ہیں، تکوینی احکام میں اُنکے لئے جو کچھ مقدر کر دیا گیا ہے مؤمن ہو یا کافر، متقی ہو یا فاسق، سب کے سب اُسی تقدیری قانون کے تابع چلنے پر مجبور ہیں

ذرہ ذرہ دہر کا پابستۂ تقدیر ہے زندگی کے خواب کی جامی یہی تعبیر ہے

اس جگہ یہ ہوسکتا ہے کہ آسمان و زمین کو حق تعالیٰ خاص شعور و ادراک عطا فرما دیں جو مکلّفین میں ہوتا ہے اور جب ان کو کوئی حکم حق تعالیٰ کی طرف سے ملا، انھوں نے باختیار خود اُس کی تعمیل اور اطاعت کی۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس حکم سے مراد حکم تکوینی لیا جائے جس میں کسی کے ارادہ و اختیار کو دخل ہی نہیں ہوتا اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ کے الفاظ پہلے معنے کے لئے زیادہ اقرب ہیں، دوسرے معنے بھی بطور مجاز کے بن سکتے ہیں۔

وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ، مَدّ کے معنے کھینچنے اور دراز کرنے کے ہیں۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز زمین کو اس طرح کھینچکر پھیلایا جائیگا جیسے چمڑے (یا ربڑ) کو کھینچکر بڑا کر دیا جاتا ہے، مگر اسکے باوجود میدانِ حشر جو اس زمین پر ہوگا اسمیں ابتدارِ دُنیا سے قیامت تک کے تمام انسان جمع ہونگے تو صورت یہ ہوگی کہ ایک آدمی کے حصہ میں صرف اتنی زمین ہوگی جس پر اسکے پاؤں ہیں (رواہ الحاکم بسند جید۔ مظہری)

وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ، یعنی اُگل دیگی زمین ہر اُس چیز کو جو اسکے بطن میں ہے اور بالکل خالی ہو جاویگی زمین کے بطن میں خزائن و دفائن اور معادن بھی ہیں اور ابتدائے دُنیا سے مرنیوالے انسانوں کے اجسام و ذرات بھی زمین ایک زلزلہ کے ساتھ یہ سب چیزیں اپنے بطن سے باہر نکالدے گی۔

يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ، کدح کے معنے کسی کام میں پوری جد و جہد اور اپنی توانائی صرف کرنے

کے ہیں، اور الیٰ ربّک سے مراد الیٰ لقاء ربّک ہے یعنی انسان کی ہر سعی و جدوجہد کی انتہا اسکے رب کیطرف ہونیوالی ہے

رجوع الی اللہ | اس آیت میں حق تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو خطاب فرما کر اسکے غور و فکر کے لئے ایک ایسی راہ دکھائی ہے کہ اسمیں کچھ بھی عقل و شعور ہو تو وہ اپنی جدّوجہد کا رُخ صحیح سمت کیطرف پھیر سکتا ہے جو اسکو دُنیا و دین میں سلامتی اور عافیت کی ضمانت دے۔ پہلی بات تو یہ ارشاد فرمائی کہ انسان نیک ہو یا بد، مؤمن ہو یا کافر اپنی فطرت سے اسکا عادی ہے کہ کچھ نہ کچھ حرکت کرے اور کسی نہ کسی چیز کو اپنا مقصود بنا کر اسکے حاصل کرنے کے لئے جد و جہد اور محنت بر داشت کرے، جسطرح ایک شریف نیک خو انسان اپنے معاش اور ضروریاتِ زندگی کی تحصیل میں فطری اور جائز طریقوں کو اختیار کرتا ہے اور اسمیں اپنی محنت و توانائی صرف کرتا ہے۔ بدکار بدخو انسان بھی اپنے مقاصد کہیں بے محنت بے جد و جہد حاصل نہیں کر سکتا، چور ڈاکو بدمعاش دھوکہ فریب سے لُوٹ کھسوٹ کرنے والوں کو دیکھو کیسی کیسی ذہنی اور جسمانی محنت برداشت کرتے ہیں جب اُن کو اُن کا مقصود حاصل ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ بتلائی کہ عاقل انسان اگر غور کرے تو اسکی تمام حرکات بلکہ سکنات بھی ایک سفر کی منزلیں ہیں جسکو وہ غیر شعوری طور پر قطع کر رہا ہے جسکی انتہا اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری یعنی موت ہے (الیٰ ربّک) میں اسی کا بیان ہے۔ اور یہ انتہا ایسی حقیقت ہے کہ جسکا کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ انسان کی ہر جد و جہد اور محنت موت پر ختم ہونا یقینی ہے تیسری بات یہ بتلائی کہ موت کے بعد اپنے رب کے سامنے حاضری کے وقت اسکی تمام حرکات و اعمال اور ہر جد وجہد کا حساب ہونا از روئے عقل و انصاف ضروری ہے تاکہ نیک و بد کا انجام الگ الگ معلوم ہو سکے ورنہ دُنیا میں تو اسکا کوئی امتیاز نہیں ہوتا، ایک نیک آدمی ایک مہینہ محنت مزدوری کر کے اپنا رزق اور جو ضروریات حاصل کرتا ہے، چور ڈاکو اُس کو ایک رات میں حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر کوئی وقت حساب کا اور جزا و سزا کا نہ آئے تو دونوں برابر ہو گئے جو عقل و انصاف کیخلاف ہے۔ آخر میں فرمایا فَمُلٰقِيْهِ، مُلاقیہ کی ضمیر کدح کیطرف بھی راجع ہو سکتی ہے تو معنی یہ ہونگے کہ جو جد و جہد یہاں انسان کر رہا ہے بالآخر اپنے رب کے پاس پہنچکر اپنی اس کمائی سے ملیگا اور اسکے اچھے یا بُرے نتائج اسکے سامنے آجائیں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مُلاقیہ کی ضمیر رب کیطرف راجع ہو اور معنی یہ ہوں کہ ہر انسان آخرت میں اپنے رب سے ملنے والا اور حساب کے لئے اسکے سامنے پیش ہونیوالا ہے، آگے نیک و بد اور مؤمن و کافر انسانوں کے الگ الگ انجام کا ذکر ہے جس کی ابتدا اعمال نامہ کا داہنے یا بائیں ہاتھ میں آجانا ہے داہنے والوں کو جنّت کی دائمی نعمتوں کی بشارت، اور بائیں والوں کو دوزخ کے عذاب کی اطلاع ملجاتی ہے۔ اس مجموعہ پر اگر انسان غور کرے کہ ضروریاتِ زندگی بلکہ اپنے نفس کی غیر ضروری مرغوبات کو بھی حاصل تو نیک و بد دونوں ہی کر لیتے ہیں اسطرح دُنیا کی زندگی دونوں کی گزر جاتی ہے مگر ان دونوں کے انجام میں زمین و آسمان کا فرق ہے ایک کے نتیجہ میں دائمی غیر منقطع راحت ہی راحت ہے، دوسرے کے نتیجہ میں دائمی مصیبت و عذاب ہے پھر کیوں نہ انسان اس انجام کو آج ہی سوچ سمجھ کر اپنی سعی و عمل کا رُخ اُس طرف پھیر دے جو دُنیا میں بھی اُس کی ضرورتوں کو پورا کر دے اور آخرت کی دائمی نعمت بھی اس کو حاصل رہے۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا وَّيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا

اس میں مؤمنین کا حال بیان فرمایا ہے کہ ان کے نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں دیئے جادیں گے اور ان سے بہت آسان حساب لے کر جنّت کی بشارت دیدی جائے گی اور وہ اپنے گھر والوں کے پاس خوش خوش واپس ہوگا۔

صحیح بخاری کی ایک حدیث میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا من حوسب یوم القیٰمۃ عذّب، یعنی قیامت کے روز جس سے حساب لیا جائے وہ عذاب سے نہ بچے گا۔ اسپر حضرت صدیقہ عائشہؓ نے سوال کیا کہ کیا قرآن میں حق تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں ہے یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس آیت میں جسکو حسابِ یسیر فرمایا وہ درحقیقت مکمل حساب نہیں بلکہ صرف ربّ العزت کے سامنے پیشی ہے اور جس شخص سے اسکے اعمال کا پورا پورا حساب لیا گیا وہ ہرگز عذاب سے نہ بچے گا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مؤمنین کے اعمال بھی ربّ العزّت کے سامنے پیش تو سب ہونگے مگر ان کے ایمان کی برکت سے اُن کے ہر ہر عمل پر مناقشہ نہیں ہوگا، اسی کا نام حسابِ یسیر ہے۔ اور اپنے گھر والوں کیطرف خوش خوش واپس ہونیکے دو معنے ہوسکتے ہیں، یا تو گھر والوں سے مراد جنّت کی حُوریں ہیں جو وہاں اسکے اہل ہوں گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ دُنیا میں جو اسکے اہل و عیال تھے محشر کے میدان میں جب حساب کے بعد کامیابی ہوگی تو دُنیا کی عادت کے مطابق اسکی خوشخبری سُنانے انکے پاس جائے، ائمۂ تفسیر نے دونوں احتمال بیان فرمائے ہیں (قرطبی)

فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا، یعنی جسکا اعمالنامہ اُس کی پشت کیطرف سے اسکے بائیں ہاتھ میں دیا جائیگا وہ وہاں اس کی تمنّا کرے گا کہ کاش وہ پھر مر کر مٹی ہوجائے اور عذاب سے بچ جائے مگر وہاں یہ ناممکن ہوگا بلکہ اسکو جہنّم میں داخل کردیا جائیگا، اس کی ایک وجہ یہاں یہ ارشاد فرمائی کہ وہ دُنیا میں اپنے اہل و عیال میں آخرت سے بے فکر ہو کر مگن اور خوش رہا کرتا تھا، بخلاف مؤمنین کے کہ اُن کو دُنیا کی زندگی میں کبھی بے فکری نہیں ہوتی، ہر عیش و راحت کے وقت بھی آخرت کی فکر ضرور لگی رہتی ہے جیسا کہ قرآنِ کریم نے ان کا حال بیان فرمایا ہے اِنَّا کُنَّا قَبْلُ فِیْٓ اَھْلِنَا مُشْفِقِیْنَ، یعنی ہم تو اپنے اہل و عیال میں رہتے ہوئے بھی آخرت کا خوف رکھتے تھے اس لئے ان دونوں فریق کا انجام انکے مناسب ہوا جو دُنیا میں اپنے اہل و عیال کیساتھ آخرت سے بے فکر ہو کر عیش و عشرت اور خوشی و مسرت میں گزارتے تھے آج انکے حصہ میں یہ عذاب جہنم آئے گا، اور جو لوگ دُنیا میں آخرت کے حساب و عذاب سے ڈرتے رہتے تھے انکو وہاں مسرت و خوشی حاصل ہوگی اور اب وہ اپنے اہل و عیال میں دائمی مسرت کے ساتھ رہیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی راحتوں میں مست و مسرور ہوجانا مؤمن کا کام نہیں، اس کو کسی وقت کسی حال آخرت کے حساب سے بے فکری نہیں ہوتی۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ، اس آیت میں حق تعالیٰ نے چار چیزوں کی قسم کے ساتھ مؤکد کر کے انسان کو پھر اُس چیز کی طرف متوجہ کیا ہے جسکا کچھ ذکر پہلے اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ میں آچکا ہے۔ یہ چاروں چیزیں جن کی قسم کھائی ہے اگر غور کرو تو اُس مضمون کی شاہد ہیں جو جوابِ قسم میں آنیوالا ہے یعنی انسان کو ایک حال پر قرار نہیں اس کے حالات اور درجات ہر وقت بدلتے رہتے ہیں۔ پہلی چیز شفق ہے یعنی وہ سُرخی جو آفتاب غروب ہونے کے

بعد اُفق مغرب میں ہوتی ہے یہ رات کی ابتداء ہے جو انسانی احوال میں ایک بڑے انقلاب کا مقدمہ ہے کہ روشنی جارہی ہے اور تاریکی کا سیلاب آرہا ہے، اسکے بعد خود رات کی قسم ہے جو اس انقلاب کی تکمیل کرتی ہے، اس کے بعد اُن تمام چیزوں کی قسم ہے جن کو رات کی تاریکی اپنے اندر جمع کرلیتی ہے۔ وَسَقَ کے اصل معنے جمع کرلینے کے ہیں، اس کے عام معنے مراد لئے جائیں تو اس میں تمام دُنیا کی کائنات داخل ہیں جو رات کی تاریکی میں چھپ جاتی ہیں اسمیں حیوانات، نباتات، جمادات، پہاڑ اور دریا سبھی شامل ہیں۔ اور جمع کرلینے کی مناسبت سے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ وہ چیزیں جو عادۃً دن کی روشنی میں منتشر پھیلی ہوئی رہتی ہیں۔ رات کے وقت وہ سب سمٹ کر اپنے اپنے ٹھکانوں میں جمع ہوجاتی ہیں، انسان اپنے گھر میں، حیوانات اپنے اپنے گھروں اور گھونسلوں میں جمع ہوجاتے ہیں، کاروبار میں پھیلے ہوئے سامانوں کو سمیٹ کر یکجا کردیا جاتا ہے، یہ ایک عظیم انقلاب خود انسان اور اسکے متعلقات میں ہے۔ چوتھی چیز جس کی قسم کھائی گئی وہ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ہے یہ بھی وَسَقَ سے مشتق ہے جسکے معنے جمع کرلینے کے ہیں قمر کے اتِّساق سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی روشنی کو جمع کرے اور یہ چودھویں رات میں ہوتا ہے جبکہ چاند بالکل مکمل ہوتا ہے۔ اِذَا اتَّسَقَ کا لفظ چاند کے مختلف اطوار اور حالات کیطرف اشارہ ہے کہ پہلے ایک نہایت خفیف نحیف قوس کی شکل میں ہوتا ہے پھر اس کی روشنی روز کچھ ترقی کرتی ہے یہانتک کہ بدر کامل ہوجاتا ہے مسلسل اور پیہم انقلابات احوال پر شہادت دینے والی چار چیزوں کی قسم کھا کر حق تعالیٰ نے فرمایا لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ، جو چیزیں تہ بر تہ ہوتی ہیں اُس کی ایک تہ کو طبق یا طبقہ کہتے ہیں جمع طبقات آتی ہے لَتَرْكَبُنَّ، رکوب بمعنے سوار ہونے سے مشتق ہے معنے یہ ہیں کہ اے بنی نوعِ انسان تم ہمیشہ ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ پر سوار ہوتے اور چڑھتے چلے جاؤ گے۔ یعنی انسان اپنی تخلیق کے ابتدا سے انتہا تک کسی وقت ایک حال پر نہیں رہتا بلکہ اسکے وجود پر تدریجی انقلابات آتے رہتے ہیں۔

انسانی وجود میں بیشمار انقلابات اور دائمی سفر اور اُس کی آخری منزل

نطفہ سے منجمد خون بنا پھر اُس سے ایک مضغہ گوشت بنا پھر اُسمیں ہڈیاں پیدا ہوئیں پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھا اور اعضاء کی تکمیل ہوئی پھر اُس میں رُوح لاکر ڈالی گئی اور وہ ایک زندہ انسان بنا جس کی غذا بطن مادر کے اندر رحم کا گندہ خون تھا، نو مہینے کے بعد اللہ نے اسکے دُنیا میں آنیکا راستہ آسان کردیا اور گندی غذا کی جگہ ماں کا دودھ ملنے لگا۔ دُنیا کی وسیع فضا اور ہوا دیکھی بڑھنے اور پھلنے پھولنے لگا، دو برس کے اندر چلنے پھرنے اور بولنے کی قوت بھی حرکت میں آئی، ماں کا دودھ چھوٹ کر اُس سے زیادہ لذیذ اور طرح طرح کی غذائیں ملیں، کھیل کود اور لہو و لعب اسکے دن رات کا مشغلہ بنا۔ کچھ ہوش و شعور بڑھا تو تعلیم و تربیت کے شکنجے میں کسا گیا، جوان ہوا تو پچھلے سب کام متروک ہوکر جوانی کی خواہشات نے اُن کی جگہ لے لی اور ایک نیا عالم شروع ہوا۔ نکاح شادی، اولاد اور خانہ داری کے مشاغل دن رات کا مشغلہ بن گئے۔ آخر یہ دور بھی ختم ہونے لگا، قویٰ میں اضمحلال اور ضعف پیدا ہوا بیماریاں آئے دن رہنے لگیں، بڑھاپا آگیا اور اس جہان کی آخری منزل یعنی قبر تک پہنچنے کے سامان ہونے لگے۔ یہ سب چیزیں تو سب کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں

کسی کو مجال انکار نہیں مگر حقیقت سے ناآشنا انسان سمجھتا ہے کہ یہ موت اور قبر اس کی آخری منزل ہے آگے کچھ نہیں، اللہ تعالیٰ جو خالقِ کائنات اور علیم و خبیر ہے اُسنے آگے آنیوالے مراحل کو اپنے انبیاء کے ذریعہ غافل انسان تک پہنچایا کہ قبر تیری آخری منزل نہیں بلکہ یہ صرف ایک انتظار گاہ (ویٹنگ روم) ہے اور آگے ایک بڑا جہان آنیوالا ہے اور اسمیں ایک بڑے امتحان کے بعد انسان کی آخری منزل مقرر ہو جائے گی جو یا دائمی راحت و آرام کی ہوگی یا پھر دائمی عذاب و مصیبت کی، اور اس آخری منزل پر ہی انسان اپنے حقیقی مستقر پر پہنچکر انقلابات کے چکر سے نکلیگا، قرآن کریم نے اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى، اور اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى اور كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ میں یہی مضمون بیان فرما کر غفلت شعار انسان کو حقیقت اور اُس کی آخری منزل سے آگاہ اور اس پر متنبہ کیا کہ عمر دُنیا کے تمام حالات اور انقلابات آخری منزل تک جانے کا سفر اور اسکے مراحل ہیں اور انسان چلتے پھرتے سوتے جاگتے کھڑے بیٹھے ہر حال میں اس سفر کی منزلیں طے کر رہا ہے اور بالآخر اپنے رب کے پاس پہنچتا ہے اور عمر بھر کے اعمال کا حساب دیکر آخری منزل میں قرار پاتا ہے جہاں یا راحت ہی راحت اور غیر منقطع آرام ہی آرام ہے یا پھر معاذ اللہ عذاب ہی عذاب اور غیر منقطع مصائب ہیں، تو عقلمند انسان کا کام یہ ہے کہ دُنیا میں اپنے آپ کو ایک مسافر سمجھے اور اپنے وطن اصلی کے لئے سامان تیار کرنے اور بھیجنے کی فکر ہی کو دُنیا کا سب سے بڑا مقصد بنائے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کُنْ فِي الدُّنْيَا كَاَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ، یعنی دُنیا میں اس طرح رہو جیسے کوئی مسافر چند روز کے لئے کہیں ٹھہر گیا ہو یا کسی رہگذر میں چلتے چلتے کچھ دیر آرام کے لئے رُک گیا ہو۔ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ کی تفسیر جو اُوپر بیان کی گئی ہے ابو نعیم نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضہ کی روایت سے خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اسی مضمون کی روایت کی ہے یہ طویل حدیث اسجگہ قرطبی نے بحوالہ ابی نعیم اور ابنِ کثیر نے بحوالہ ابن ابی حاتم مفصل نقل کی ہے۔ ان آیات میں غافل انسان کو اُس کی تخلیق اور عمر دُنیا میں اُس کو پیش آنے والے حالات و انقلابات سامنے کرکے یہ ہدایت دی کہ غافل اب بھی وقت ہے کہ اپنے انجام پر غور اور آخرت کی فکر کر، مگر ان تمام روشن ہدایات کے باوجود بہت سے لوگ اپنی غفلت سے باز نہیں آتے اسلئے آخر میں ارشاد فرمایا فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ، یعنی ان غافل و جاہل انسانوں کو کیا ہو گیا کہ یہ سب کچھ سُننے اور جاننے کے بعد بھی اللہ پر ایمان نہیں لاتے وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ، یعنی جب اُن کے سامنے ان واضح ہدایات سے بھرا ہوا قرآن پڑھا جاتا ہے اُسوقت بھی وہ اللہ کیطرف نہیں جھکتے۔

سجدہ اور سجود کے معنی لُغت میں جُھکنے کے ہیں اور یہ اطاعت شعاری اور فرمانبرداری سے کنایہ کیا جاتا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ اس جگہ سجدہ سے مراد سجدہ اصطلاحی نہیں بلکہ اللہ کے سامنے اطاعت کیساتھ جُھکنا جسکو خشوع و خضوع کہتے ہیں وہ مراد ہے اور وجہ اس کی یہ کُھلی ہوئی ہے کہ اس آیت میں حکم سجدہ کسی خاص آیت کے متعلق نہیں بلکہ پورے قرآن کے متعلق ہے اگر اس سے سجدہ اصطلاحی مُراد لیا جائے تو یہ لازم آئے گا کہ پورے قرآن کی ہر آیت پر سجدہ لازم ہو جو باجماعِ اُمت مراد نہیں ہو سکتا۔ سلف و خلف میں کوئی اسکا قائل نہیں، اب رہا یہ مسئلہ کہ اس آیت کے پڑھنے اور سُننے پر سجدہ واجب ہے یا نہیں تو اگرچہ کسی قدر تاویل کے ساتھ اس آیت سے بھی وجوب سجدہ پر استدلال

ہو سکتا ہے جیسا کہ بعض فقہائے حنفیہ نے کہا ہے کہ یہاں القرآن سے مراد پورا قرآن نہیں، بلکہ الف لام عہد کا ہے اور مُراد اس سے خاص یہی آیت ہے لیکن یہ ایک قسم کی تاویل ہی ہے جو احتمال کے درجہ میں تو صحیح کہی جا سکتی ہے۔ مگر اسکا مُراد قرآن ہونا ظاہر عبارت سے بعید معلوم ہوتا ہے واللہ اعلم، اسلئے صحیح بات یہ ہے کہ اسکا فیصلہ روایاتِ حدیث اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے تعامل سے ہو سکتا ہے مگر روایاتِ حدیث سجدۂ تلاوت کے متعلق مختلف قسم کی آئی ہیں، بعض سے وجوب معلوم ہوتا ہے بعض سے رخصت، اسی لئے ائمۂ مجتہدین کا اس معاملہ میں اختلاف ہے امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس آیت پر بھی سجدہ واجب ہے جیسا کہ مفصّل کی دوسری آیتوں پر واجب ہے۔ امام اعظمؒ کا استدلال اسکے وجوب پر مندرجہ ذیل احادیث سے ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابو رافع رضؓ نے فرمایا کہ میں نے ایک روز عشا کی نماز حضرت ابو ہریرہؓ کے پیچھے پڑھی، اُنھوں نے سورۂ اِذَا السَّمَاۗءُ انْشَقَّتْ کی تلاوت نماز میں کی اور اس آیت پر سجدہ کیا، میں نے ابو ہریرہ رضؓ سے پُوچھا کہ یہ کیسا سجدہ ہے، اُنھوں نے فرمایا کہ میں نے ابو القاسم صلے اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز میں اس آیت پر سجدہ کیا ہے اس لئے میں ہمیشہ اس آیت پر سجدہ کرتا رہوں گا جبتک کہ محشر میں آپؐ سے ملاقات ہو۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ ہم نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اِذَا السَّمَاۗءُ انْشَقَّتْ میں اور اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ میں سجدہ کیا ہے۔ قرطبی نے ابنِ عربی سے نقل کیا ہے کہ صحیح یہی ہے کہ یہ آیت بھی آیاتِ سجدہ میں سے ہے اس کے پڑھنے اور سُننے والے پر سجدہ واجب ہے مگر ابن عربی جن لوگوں میں مقیم تھے اُن میں اس آیت پر سجدہ کرنیکا رواج نہیں تھا وہ کسی ایسے امام کے مقلّد ہونگے جن کے نزدیک سجدہ واجب نہیں تو ابن عربی کہتے ہیں کہ میں نے یہ طریقہ اختیار کر لیا کہ جب کہیں امامت کروں تو سورۂ انشقاق نہیں پڑھتا کیونکہ میرے نزدیک اس پر سجدہ واجب ہے اگر سجدہ نہیں کرتا تو گناہگار ہوتا ہوں اور اگر کرتا ہوں تو پوری جماعت میرے اس فعل کو بُرا سمجھے گی، بلا وجہ اختلاف کیوں ڈالا جائے، واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم۔

تمت سورۃ الانشقاق بحمد اللہ تعالیٰ ۱۶/ شعبان ۱۳۹۱ھ

سُورَۃ البروج

سُورَۃُ الْبُرُوْجِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ اِثْنَتَانِ وَعِشْرُوْنَ اٰیَۃً

سورۂ بروج مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی بائیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ① وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ② وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ③ قُتِلَ

قسم ہے آسمان کی جس میں بُرج ہیں اور اُس دن کی جس کا وعدہ ہے، اور اُس دن کی جو حاضر ہوتا ہے اور اسکی کہ جسکے پاس حاضر ہوتے ہیں، مارے

اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ④ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ⑤ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ⑥ وَّهُمْ

گئے کھائیاں کھودنے والے آگ ہے بہت ایندھن والی جب وہ اس پر بیٹھے اور جو کچھ

عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ⑦ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا

وہ کرتے مسلمانوں کے ساتھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور اُن سے بدلہ نہ لیتے تھے مگر اسی بات کا کہ وہ یقین لائے

بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ⑧ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ عَلٰى

اللہ پر جو زبردست ہے تعریفوں والا جس کا راج ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور اللہ کے

كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ⑨ اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ

سامنے ہے ہر چیز تحقیق جو دین سے بچلائے ایمان والے مردوں کو اور عورتوں کو پھر

لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ⑩ اِنَّ

توبہ نہ کی تو اُن کے لئے عذاب ہے دوزخ کا اور ان کے لئے عذاب ہے آگ لگنے کا بیشک

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

جو لوگ یقین لائے اور کیں انھوں نے بھلائیاں انکے لئے باغ ہیں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں

ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ⑪ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ⑫ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ

یہ ہے بڑی مراد ملنی بیشک تیرے رب کی پکڑ سخت ہے بیشک وہی کرتا ہے پہلی مرتبہ

وَيُعِيدُ ﴿۱۳﴾ وَهُوَ الْغَفُورُ الْوَدُودُ ﴿۱۴﴾ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ ﴿۱۵﴾ فَعَّالٌ

اور دوسری اور وہی ہے بخشنے والا محبت کرنے والا مالک عرش کا بڑی شان والا کر ڈالنے والا

لِّمَا يُرِيدُ ﴿۱۶﴾ هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ ﴿۱۷﴾ فِرْعَوْنَ وَثَمُودَ ﴿۱۸﴾ بَلِ

جو چاہے کیا پہنچی تجھ کو بات ان لشکروں کی فرعون اور ثمود کے کوئی نہیں

الَّذِينَ كَفَرُوا فِي تَكْذِيبٍ ﴿۱۹﴾ وَاللَّهُ مِن وَرَائِهِم مُّحِيطٌ ﴿۲۰﴾ بَلْ

بلکہ منکر جھٹلاتے ہیں اور اللہ نے اُن کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے کوئی نہیں

هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ ﴿۲۱﴾ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ ﴿۲۲﴾

یہ قرآن ہے بڑی شان کا لکھا ہوا لوح محفوظ میں

ع ۱ ۲۲ ۱۰

خُلاصۂ تفسیر

شانِ نزول اس سُورت میں ایک قصہ کا اجمالاً ذکر ہے جو صحیح مُسلم میں مذکور ہے۔ خلاصہ اسکا یہ ہے کہ کوئی کافر بادشاہ تھا اسکے پاس ایک کاہن تھا (کاہن اس کو کہا جاتا ہے جو شیاطین کے ذریعہ یا نجوم کے آثار کے ذریعہ کچھ مستقبل کی غیبی خبریں معلوم کر کے لوگوں کو بتائے) اس کاہن نے بادشاہ سے کہا کہ مجھ کو ایک ہوشیار لڑکا دیا جاوے تو اُس کو اپنا علم سکھا دوں، چنانچہ ایک لڑکا تجویز کیا گیا، اسکے راستے میں ایک راہب یعنی عیسائی پادری رہتا تھا اور اُس زمانے میں دین عیسیٰ علیہ السلام ہی دینِ حق تھا اور یہ راہب اسی پر قائم عبادت گزار تھا وہ لڑکا اسکے پاس آنے جانے لگا اور خفیہ مُسلمان ہوگیا، ایک بار اس لڑکے نے دیکھا کہ کسی شیر نے راستہ روک رکھا ہے اور خلقِ خدا پریشان ہے تو اس نے ایک پتھر ہاتھ میں لیکر دُعا کی کہ اے اللہ اگر راہب کا دین سچا ہے تو یہ جانور میرے پتھر سے مارا جاوے اور اگر کاہن سچا ہے تو نہ مارا جاوے اور یہ کہہ کر وہ پتھر مارا تو شیر کو لگا اور وہ ہلاک ہوگیا، لوگوں میں شور ہوگیا کہ اس لڑکے کو کوئی عجیب علم آتا ہے کسی اندھے نے سُنا آکر درخواست کی میری آنکھیں اچھی ہو جاویں، لڑکے نے کہا بشرطیکہ تو مسلمان ہو جاوے چنانچہ اسنے قبول کیا، لڑکے نے دُعا کی وہ اچھا ہوگیا اور مُسلمان ہو گیا، بادشاہ کو یہ خبریں پہنچیں تو اس راہب کو اور لڑکے کو اور اس نابینا کو گرفتار کر کے بلایا، اس نے راہب اور اعمیٰ کو تو قتل کر دیا اور لڑکے کے لئے حکم دیا کہ پہاڑ کے اوپر لیجا کر گرا دیا جاوے مگر جو لوگ اس کو لے گئے تھے وہ خود گر کر ہلاک ہوگئے اور لڑکا صحیح سالم چلا آیا، پھر بادشاہ نے سمندر میں غرق کرنیکا حکم دیا وہ اس سے بھی بچ گیا اور جو لوگ اس کو لے گئے تھے وہ سب ڈوب گئے پھر خود لڑکے نے بادشاہ سے کہا مجھ کو بسم اللہ کہکر تیر مارو تو میں مر جاؤں گا چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور لڑکا مر گیا، پس اس واقعہ عجیبہ کو دیکھ کر یک لخت عام لوگوں کی زبان سے نعرہ بلند ہوا کہ ہم سب اللہ پر ایمان لاتے ہیں، بادشاہ بڑا پریشان ہوا اور ارکانِ سلطنت کے مشورے سے بڑی بڑی خندقیں آگ سے بھروا کر اشتہار دیا کہ جو شخص اسلام سے نہ پھریگا اسکو آگ میں جلا دینگے

چنانچہ بہت آدمی جلائے گئے، اس صورت میں ان پر غضبِ الٰہی نازل ہونے کا بیان قسم کے ساتھ فرمایا ہے) قسم ہے
بُرجوں والے آسمان کی (مُراد بُرجوں سے بڑے بڑے ستارے ہیں، کذا فی الدر المنثور مرفوعا) اور قسم ہے وعدہ کئے ہوئے
دن کی (یعنی قیامت کے دن کی) اور قسم ہے حاضر ہونیوالے (دن) کی، اور قسم ہے اُس (دن) کی جس میں لوگوں کی حاضری
ہوتی ہے (حدیث ترمذی میں مرفوعاً ہے کہ یوم موعود قیامت کا دن ہے اور شاہد جمعہ کا دن ہے اور مشہود عرفہ کا
دن ہے اور ایک دن کو شاہد اور دوسرے کو مشہود شاید اس لئے فرمایا کہ یوم جمعہ میں تو سب اپنی اپنی جگہ رہتے ہیں تو گویا
وہ دن خود آتا ہے اور یوم عرفہ میں حجاج اپنے اپنے مقامات سے سفر کرکے عرفات میں اس یوم کے قصد سے جمع ہوجاتے
ہیں تو گویا وہ دن مقصود و مشہود اور دوسرے لوگ حاضری کا قصد کرنیوالے ہیں آگے جواب قسم ہے) کہ خندق والے
یعنی بہت سے ایندھن کی آگ والے ملعون ہوئے جس وقت وہ لوگ اُس (آگ) کے آس پاس بیٹھے ہوئے تھے اور
وہ جو کچھ مسلمانوں کیساتھ (ظلم و ستم) کر رہے تھے اس کو دیکھ رہے تھے (انکے ملعون ہونے کی خبر دینے سے تسلّی مؤمنین کی
ظاہر ہے کہ اسی طرح جو کفار اسوقت مسلمانوں پر ظلم کررہے ہیں وہ بھی گرفتارِ لعنت ہونگے جسکا اثر خواہ دُنیا میں بھی مرتب
ہو جیسے غزوہ بدر وغیرہ میں مقتول و مخذول ہوئے یا صرف آخرت میں جیسا عام کفار کے لئے یقینی ہے اور دشمن کے
عذاب کی خبر سے تسلّی ہونا امر طبعی ہے اور ان لوگوں کا بیٹھنا اس ظلم و ستم کے انتظام اور نگرانی کے لئے تھا اور لفظ
شہود میں علاوہ نگرانی کے اشارہ ان لوگوں کی سنگدلی کیطرف بھی ہے کہ دیکھکر بھی ترحم نہ آتا تھا اور اسکو خدا تعالےٰ کی
لعنت میں خاص دخل ہے کہ یہ سنگدلی سبب لعنت ہے) اور ان کافروں نے ان مسلمانوں میں اور کوئی عیب
نہیں پایا تھا بجز اسکے کہ وہ خدا پر ایمان لے آئے تھے جو زبردست (اور) سزاوار حمد ہے ایسا کہ اسی کی ہے سلطنت آسمانوں
اور زمین کی (یعنی ایمان لانے پر یہ معاملہ کیا اور ایمان لانا کوئی خطا نہیں، پس بے خطا اُن پر ظلم کیا اسلئے وہ لوگ ملعون
ہوئے اور آگے ظالموں کے لئے عام وعید اور مظلوموں کے لئے عام وعدہ ہے) کہ اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے (مظلوم
کی مظلومیت سے بھی پس اسکی نصرت کریگا اور ظالم کی ظالمیت سے بھی تو اسکو سزا دیگا خواہ یہاں خواہ وہاں چنانچہ
آگے یہی مضمون ہے کہ) جنھوں نے مسلمان مَردوں اور مسلمان عورتوں کو تکلیف پہنچائی (اور) پھر توبہ نہیں کی تو انکے لئے جہنم کا
عذاب ہے اور (جہنم میں بالخصوص) انکے لئے جلنے کا عذاب ہے (عذاب میں ہر طرح کی تکلیف داخل ہے۔ سانپ، بچھو، طوق
زنجیریں، حمیم، غسّاق وغیرہ اور سب سے بڑھ کر جلنے کا عذاب ہے اسلئے اسکو بالتخصیص فرمایا یہ تو ظالم کے حق میں فرمایا آگے
مؤمنین کے حق میں جنہیں مظلوم بھی آگئے ارشاد ہے کہ) بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کئے انکے لئے (بہشت
کے) باغ ہیں جنکے نیچے نہریں جاری ہونگی اور یہ بڑی کامیابی ہے (اور اوپر دو مضمون تھے کفار کے لئے جہنم ہونا اور مؤمنین
کے لئے جنت ہونا، آگے انکے مناسب اپنے بعض افعال و صفات ان مضمونوں کی تقریر کے لئے ارشاد فرماتے ہیں کہ) آپکے
رب کی دارو گیر بڑی سخت ہے (پس کفار پر سزائے شدید کا واقع ہونا مستبعد نہیں اور نیز) وہی پہلی بار بھی پیدا کرتا ہی
اور دوبارہ (قیامت میں بھی) پیدا کردیگا (پس یہ شبہ بھی نہ رہا کہ گو بطش شدید ہے مگر قیامت ہی واقع نہ ہوگی جو کہ وقت
بطش کا ہے اس سے تقریر ہوگئی وعید کفار کی) اور (آگے تقریر ہے وعدۂ مؤمنین کی کہ) وہی بڑا بخشنے والا (اور) بڑی محبت

کرنے والا اور عرش کا مالک (اور) عظمت والا ہے (پس ایمان والوں کے گناہ معاف کر دیگا اور ان کو اپنا محبوب بنالیگا، اور ذوالعرش اور مجید گو تعذیب و اثابت دونوں کیساتھ متعلق ہو سکتا ہے کہ دونوں فرع ہیں صاحب سلطنت کمالِ صفات کی، لیکن یہاں مقابلے کے قرینے سے ان پر اثابت کا متفرع کرنا مقصود ہے اور آگے دونوں کے اثبات کے لئے ایک صفت ارشاد ہے کہ) وہ جو چاہے سب کچھ کر گزرتا ہے (آگے مؤمنین کی مزید تسلی اور کفار کی مزید تنبیہ کے لئے بعض خاص مغضوبین کا حال بیان فرماتے ہیں کہ) کیا آپ کو ان لشکروں کا قصہ پہنچا ہے یعنی فرعون (اور آلِ فرعون) اور ثمود کا (کہ کس طرح کفر کیا اور کیونکر گرفتار عذاب ہوئے اس سے مؤمنین کو تسلی حاصل کرنا چاہیئے اور کفار کو ڈرنا چاہیئے مگر کفار بالکل عذاب سے نہیں ڈرتے) بلکہ یہ کافر (خود قرآن کی) تکذیب میں (لگے) ہیں (یہ اس کے مضمون تعذیب کو بھی اور دیگر مضامین کو بھی جھٹلاتے ہیں) اور (انجام کار اسکی سزا بھگتیں گے کیونکہ) اللہ ان کو ادھر اُدھر سے گھیرے ہوئے ہے (اسکے قبضۂ قدرت اور عقوبت سے بچ نہیں سکتے، اور ان کا قرآن کو جھٹلانا محض حماقت ہے کیونکہ قرآن ایسی چیز نہیں جو جھٹلانے کے قابل ہو) بلکہ وہ ایک باعظمت قرآن ہے جو لوحِ محفوظ میں (لکھا ہوا) ہے (جسمیں کوئی تغیر و تبدل محتمل نہیں، وہاں سے نہایت حفاظت کے ساتھ صاحبِ وحی کے پاس پہنچایا جاتا ہے کما قال تعالیٰ فی سورۃ الجن، فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا، پس ایسی صورتمیں تکذیب قرآن کی بلاشبہ جہالت و موجب عقوبت ہے)

معارف و مسائل

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ، بُروج، بُرج کی جمع ہے بڑے محل یا قلعہ کو کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُشَيَّدَةٍ، یہاں بُروج سے مراد محلات و قصور ہی ہیں اور اصل مادہ بُرج کے لغوی معنے ظہور کے ہیں۔ تبرج کے معنے بے پردہ کھُلے پھرنے کے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ، اس آیت میں بروج سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک بڑے بڑے ستارے ہیں۔ حضرت ابن عباس، مجاہد، ضحاک حسن بصری، قتادہ، سُدّی سب کا یہی قول ہے اور بعض دوسرے ائمہ تفسیر نے اسجگہ بروج سے مراد قصور یعنی محلات لئے ہیں اور اس سے مراد وہ مکانات ہیں جو آسمان میں پہرہ داروں اور نگراں فرشتوں کے لئے مقرر ہیں۔ اور بعض متاخرین نے برج سے مراد وہ برج بتلائے ہیں جو فلاسفہ کی اصطلاح ہے کہ کل آسمان کو بارہ حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصہ کو ایک برج کہا جاتا ہے اُن کا خیال یہ ہے کہ ثوابت ستارے انہی بُرجوں میں اپنی جگہ مقیم ہیں اور سیارات حرکت فلک کیساتھ متحرک ہوتے ہیں اور ان بُرجوں میں سیارات کا نزول ہوتا ہے، مگر یہ سراسر غلط ہے قرآن کریم سیارات کو آسمانوں میں مرکوز نہیں قرار دیتا بلکہ ہر سیارے کو اپنی ذاتی حرکت سے متحرک قرار دیتا ہی جیسا کہ سورۂ یٰسٓ کی آیت میں ہے وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ، فلک سے مراد اسمیں آسمان نہیں بلکہ سیارے کی مدار ہے جس میں وہ حرکت کرتا ہے (مظہری)

وَالْيَوْمِ الْمَوْعُودِ وَشَاهِدٍ وَمَشْهُودٍ، خلاصۂ تفسیر میں ترمذی کی مرفوع حدیث کے حوالہ سے ان

الفاظ کی تفسیر لکھدی گئی ہے کہ یوم موعود سے مراد روز قیامت اور شاہد سے مراد روز جمعہ اور مشہود سے مراد روز عرفہ ہے اس آیت میں حق تعالیٰ نے چار چیزوں کی قسم کھائی، اوّل بُرجوں والے آسمان کی - پھر قیامت کے روز کی پھر جمعہ اور عرفہ کے دنوں کی - مناسبت ان چیزوں کی قسم کی جواب قسم کیساتھ یہ ہے کہ یہ سب چیزیں حق تعالیٰ جل شانہٗ کی قدرت کاملہ پر اور پھر قیامت کے روز حساب کتاب اور جزا سزا پر دلیل ہیں اور روز جمعہ وعرفہ مؤمنین کے لئے ذخیرۂ آخرت جمع کرنے کے مبارک دن ہیں، آگے جواب قسم میں اُن کفار پر لعنت آئی ہے جنھوں نے مسلمانوں کو انکے ایمان کیوجہ سے آگ میں جلایا اور پھر مؤمنین کے درجاتِ آخرت کا بیان فرمایا،

واقعہ اصحابِ اُخدود کی کچھ تفصیل یہی واقعہ اس سورت کے نزول کا سبب ہے جسکا خلاصہ صحیح مسلم کی حدیث کے حوالہ سے خلاصۂ تفسیر میں بیان ہو چکا ہے - یہ شخص جس کو اس واقعہ میں کاہن کہا گیا بعض روایات میں کاہن کے بجائے ساحر آیا ہے اور یہ بادشاہ جس کا ذکر اس قصّہ میں ہے ملک یمن کا بادشاہ تھا جسکا نام حضرت ابنِ عباسؓ کی روایت میں یوسف ذو نواس تھا، اسکا زمانہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے ستر سال پہلے کا زمانہ تھا، اور یہ لڑکا جس کو کاہن یا ساحر کے پاس اسکا فن سیکھنے کے لئے بادشاہ نے مأمور کیا تھا اسکا نام عبداللہ بن تامر ہے اور راہب عیسائی مذہب کا عابد و زاہد ہے اور اُس زمانے میں چونکہ مذہب عیسٰی علیہ السّلام ہی دینِ حق تھا اسلئے یہ راہب اسوقت کا سچا مسلمان تھا، یہ لڑکا عبداللہ بن تامر جس کو کہانت یا سحر سیکھنے کے لئے بادشاہ نے مأمور کیا تھا اور وہ راستہ میں راہب کے پاس جاتا اور اسکا کلام سنکر متاثر ہوتا اور بالآخر مسلمان ہو گیا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو ایمان بھی ایسا پختہ نصیب فرمایا کہ ایمان کیخاطر کونکی ایذائیں برداشت کرتا تھا، کیونکہ جب جانیکے وقت راستہ میں راہب کے پاس بیٹھتا یہاں کچھ وقت لگتا تو جب ساحر یا کاہن کے پاس دیر سے پہنچتا تو وہ اس کو مارتا تھا اور واپسی کے وقت جب پھر راہب کے پاس بیٹھتا تو گھر واپس جانیمیں دیر ہوتی اس پر گھر والے اس کو مارتے تھے مگر اُسنے کسی کی پروا کئے بغیر راہب کی صحبت و مجالست نہ چھوڑی، اسکی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اس کو وہ کرامات عطا فرمائیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے - اس ظالم بادشاہ نے ایمان لانیوالوں کو عذاب دینے کے لئے خندق کھدوا کر اسکو آگ کے بڑے شعلوں سے لبریز کیا پھر ایمان لانیوالوں میں سے ایک ایک کو حاضر کر کے کہا کہ یا ایمان کو چھوڑ دو یا پھر اس خندق میں گر جانا پڑیگا، اللہ تعالیٰ نے ان مؤمنین کو ایسی استقامت بخشی کہ ان میں سے ایک بھی ایمان چھوڑنے پر راضی نہ ہوا اور آگ میں گر جانا قبول کیا، صرف ایک عورت جس کی گود میں ایک بچہ تھا اسکو آگ میں گرنے سے ذرا جھجک ہوئی تو چھوٹا سا بچہ بولا کہ اماں جان صبر کرو، کیونکہ آپ حق پر ہیں جو لوگ اس طرح دہکتی آگ میں جلا کر اس ظالم نے قتل کئے انکی تعداد بعض روایات میں بارہ ہزار، بعض میں اس سے زیادہ منقول ہے -

اور یہ لڑکا جس کی کرامتوں کا ذکر اوپر آچکا ہے اور یہ کہ اسنے خود بادشاہ کو اپنے قتل کی یہ صورت بتلائی کہ تم میرے ترکش کا تیر لو اور اس پر باسم اللہ ربی کہکر میرے تیر مارو تو میں مر جاؤنگا، اس ترکیب کیساتھ لڑکے

نے تو جان دیدی مگر اس واقعہ کو دیکھ کر بادشاہ کی ساری قوم نے نعرہ لگایا اور اپنے مسلمان ہونیکا اعلان کر دیا، کافر ظالم کو حق تعالیٰ نے دُنیا میں بھی خائب و خاسر بنا دیا۔

محمد بن اسحٰق کی روایت میں ہے کہ یہ لڑکا عبداللہ ابن تامر جس جگہ مدفون تھا اتفاقاً کسی ضرورت سے وہ زمین حضرت فاروق اعظمؓ کے زمانے میں کھودی گئی تو اسمیں عبداللہ بن تامر کی لاش صحیح سالم اس طرح برآمد ہوئی کہ وہ بیٹھے ہوئے تھے اور اُن کا ہاتھ اپنی کُنپٹی پر رکھا ہوا تھا جہاں تیر لگا تھا، کسی دیکھنے والے نے اُن کا ہاتھ اس جگہ سے ہٹایا تو زخم سے خون جاری ہوگیا پھر ویسے ہی رکھدیا تو بند ہوگیا، اُن کے ہاتھ میں ایک انگوٹھی تھی جس پر لکھا ہوا تھا اللہُ ربّی۔ عامل یمن نے اس واقعہ کی اطلاع حضرت فاروقِ اعظمؓ کو دی تو آپ نے جواب میں لکھا کہ اُن کو انکی ہیئت پر انگوٹھی سمیت اُسی طرح چھپا دو جیسے پہلے تھے (ابن کثیر)

فائدہ ابن کثیر نے بحوالہ ابن ابی حاتم نقل کیا ہے کہ آگ کی خندق کا واقعہ دُنیا میں ایک ہی نہیں بہت مختلف ملکوں اور زمانوں میں ہوئے ہیں، پھر ابن ابی حاتم نے ان واقعات میں سے تین کا خصوصیت سے ذکر کیا کہ ایک خندق یمن میں تھی (جسکا واقعہ زمان فترت میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے ستر سال پہلے پیش آیا ہے) دوسری خندق شام میں، تیسری فارس میں تھی۔ مگر قرآن کریم میں جس خندق کا ذکر اس سورت میں ہے وہ خندق نجران ملک یمن کی خندق ہے کیونکہ یہی عرب کے ملک میں تھی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ، یہ اُن ظالموں کی سزا کا بیان ہے جنھوں نے مسلمانوں کو صرف انکے ایمان کی بنا پر آگ کی خندق میں ڈال کر جلایا تھا، اور سزا میں دو باتیں ارشاد فرمائیں فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ، یعنی انکے لئے آخرت میں جہنم کا عذاب ہے، دوسری وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ، یعنی اُن کے لئے جلنے کا عذاب ہے۔ ہوسکتا ہے کہ دوسرا جملہ پہلے ہی جملے کا بیان اور تاکید ہو اور معنے یہ ہوں کہ جہنم میں جاکر اس کو ہمیشہ آگ میں جلتے رہنے کا عذاب ملے گا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ دوسرے جملے میں اُن کی اسی دُنیا میں سزا کا ذکر ہو، جیساکہ بعض روایات میں ہے کہ جن مؤمنین کو ان لوگوں نے آگ کی خندق میں ڈالا تھا اللہ تعالیٰ نے اُن کو تو تکلیف سے اس طرح بچا دیا کہ آگ کے چھونے سے پہلے ہی اُن کی ارواح قبض کرلی گئیں آگ میں مُردہ جسم پڑے، پھر یہ آگ اتنی بھڑک اُٹھی کہ خندق کے حدود سے نکل کر شہر میں پھیل گئی اور ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کے جلنے کا تماشا دیکھ رہے تھے اس آگ نے جلا دیا، صرف بادشاہ یوسف ذونواس بھاگ نکلا اور آگ سے بچنے کیلئے اپنے آپکو دریا میں ڈالدیا اسمیں غرق ہوکر مرا (مظہری)

ان لوگوں کے لئے عذاب جہنم اور عذاب حریق کی خبر کے ساتھ قرآن کریم نے یہ قید بھی لگا دی کہ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا، یعنی یہ عذاب اُن لوگوں پر پڑیگا جو اپنے اس فعل پر نادم ہوکر تائب نہیں ہوئے اس میں ان لوگوں کو توبہ کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ حضرت حسن بصری رح فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس جود و کرم کو دیکھو کہ ان لوگوں نے اللہ کے اولیاء کو زندہ جلا کر اُن کا تماشا دیکھا اور حق تعالیٰ اس پر بھی اُن کو توبہ اور مغفرت کیطرف دعوت دے رہا ہے (ابن کثیر)

تمت سورۃ البروج والحمد للہ ۱۶ شعبان سنہ ۱۳۹۱ھ

سُورَةُ الطَّارِق

سُورَةُ الطَّارِقِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سَبْعَ عَشْرَةَ آيَةً
سورۂ طارق مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی سترہ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ﴿۱﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ﴿۲﴾ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ﴿۳﴾ اِنْ كُلُّ
قسم ہے آسمان کی اور اندھیرے میں آنیوالے کی اور تو نے کیا سمجھا کیا ہے اندھیرے میں آنیوالا وہ تارا چمکتا ہوا کوئی جی

نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ﴿۴﴾ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ﴿۵﴾ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ
نہیں جس پر نہیں ایک نگہبان اب دیکھ لے آدمی کہ کا ہے سے بنا ہے بنا ہے ایک اچھلتے ہوئے

دَافِقٍ ﴿۶﴾ يَّخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ﴿۷﴾ اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ﴿۸﴾
پانی سے جو نکلتا ہے پیٹھ کے بیچ سے اور چھاتی کے بیچ سے بیشک وہ اس کو پھیر لا سکتا ہے

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ﴿۹﴾ فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ﴿۱۰﴾ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ﴿۱۱﴾
جس دن جانچے جائیں بھید تو کچھ نہ ہوگا اسکو زور اور نہ کوئی مدد کرنے والا قسم ہے آسمان چکر مارنے والے کی

وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ﴿۱۳﴾ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ﴿۱۴﴾ اِنَّهُمْ
اور زمین پھوٹ نکلنے والی کی بیشک یہ بات ہے دو ٹوک اور نہیں یہ بات ہنسی کی البتہ وہ

يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ﴿۱۵﴾ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ﴿۱۶﴾ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ﴿۱۷﴾
لگے ہوئے ہیں ایک داؤ کرنے میں اور میں لگا ہوا ہوں ایک داؤ کرنے میں سو ڈھیل دے منکروں کو ڈھیل دے اُن کو تھوڑے دنوں

ع ۱۷ / ۱۱

خلاصۂ تفسیر

قسم ہے آسمان کی اور اُس چیز کی جو رات کو نمودار ہونے والی ہے اور آپ کو کچھ معلوم ہے وہ رات کو نمودار ہونے والی چیز کیا ہے وہ روشن ستارہ ہے (کوئی ستارہ ہو کقولہ تعالیٰ وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى، آگے جواب قسم ہے کہ) کوئی شخص

ایسا نہیں کہ جس پر کوئی اعمال کا یاد رکھنے والا (فرشتہ) مقرر نہو (کقولہ تعالیٰ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ، مطلب یہ کہ ان اعمال پر محاسبہ ہونیوالا ہے اور اس قسم کو مقصود سے مناسبت یہ ہے کہ جیسے آسمان پر ستارے ہر وقت محفوظ ہیں مگر ظہور ان کا خاص شب میں ہوتا ہے۔ اسی طرح اعمال سب نامۂ اعمال میں اسوقت بھی محفوظ ہیں مگر ظہور ان کا خاص قیامت میں ہوگا جب یہ بات ہے) تو انسان کو (قیامت کی فکر چاہیئے اور اگر اسکے استبعاد کا شبہ ہو تو اس کو) دیکھنا چاہیئے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے، وہ ایک اُچھلتے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پُشت اور سینہ (یعنی تمام بدن) کے درمیان سے نکلتا ہے (مراد اس پانی سے منی ہے خواہ صرف مرد کی یا مرد و عورت دونوں کی اور عورت کی منی میں گو اندفاق (اُچھلنا) مرد کی منی کی برابر نہیں ہوتا لیکن کچھ اندفاق ضرور ہوتا ہے اور دوسری تقدیر پر یعنی جبکہ ماء سے مراد مرد و عورت دونوں کا نطفہ ۔۔ ہو تو لفظ ماء کا مفرد لانا اس بناء پر ہے کہ دونوں مادّے مخلوط ہو کر مثل شئ واحد کے ہو جاتے ہیں اور پشت اور سینہ چونکہ بدن کے دو طرفین ہیں اس لئے کنایہ جمیع بدن سے ہوسکتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ نطفہ سے انسان بنا دینا زیادہ عجیب ہے بہ نسبت دوبارہ بنانیکے اور جب عجیب تر امر اُس کی قدرت سے ظاہر ہو رہا ہے تو اس سے ثابت ہوا کہ) وہ اسکے دوبارہ پیدا کرنے پر ضرور قادر ہے (پس وہ استبعاد قیامت کا شبہ دفع ہوگیا اور یہ دوبارہ پیدا کرنا اس روز ہوگا) جس روز سب کی قلعی کُھل جاوے گی (یعنی سب مخفی باتیں عقائد باطلہ و نیاتِ فاسدہ ظاہر ہو جاویں گی، اور دُنیا میں جس طرح موقع پر جُرم سے مُکر جاتے ہیں اس کو چُھپا لیتے ہیں یہ بات وہاں ممکن نہ ہوگی) پھر اس انسان کو نہ تو خود (مدافعت) کی قوت ہوگی اور نہ اس کا کوئی حمایتی ہوگا (کہ عذاب کو اس سے دفع کر دے اور اگر کہا جاوے کہ امکان قیامت کا گو عقلی ہے مگر وقوع نقلی ہے اور دلیل نقلی قرآن ہے اور وہ ہنوز محتاج اثبات ہے تو اس کے متعلق سنو کہ) قسم ہے آسمان کی جس سے پیاپے بارش ہوتی ہے اور زمین کی جو (بیج نکلنے کے وقت) پھٹ جاتی ہے (آگے جواب قسم ہے) کہ یہ قرآن حق و باطل میں ایک فیصلہ کر دینے والا کلام ہے اور وہ کوئی لغو چیز نہیں ہے (اس سے قرآن کا کلامِ حق منجانب اللہ ہونا ثابت ہوگیا مگر باوجود اثباتِ حق کے ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ) یہ لوگ (نفی حق کے لئے) طرح طرح کی تدبیریں کر رہے ہیں اور میں بھی (ان کی ناکامی اور سزا کے لئے) طرح طرح کی تدبیریں کر رہا ہوں (اور ظاہر ہے کہ میری تدبیر غالب آوے گی اور جب میرا تدبیر کرنا سُن لیا) تو آپ ان کافروں (کی مخالفت سے گھبرائیے نہیں اور ان پر جلدی عذاب آنے کی خواہش نہ کیجئے بلکہ ان) کو یُوں ہی رہنے دیجئے (اور زیادہ دن نہیں بلکہ) اُنکو تھوڑے ہی دنوں رہنے دیجئے (پھر میں ان پر عذاب نازل کر دوں گا، خواہ قبل الموت یا بعد الموت، اخیر کی قسم کو اخیر کے مضمون سے یہ مناسبت ہے کہ قرآن آسمان سے آتا ہے اور جس میں قابلیت ہوتی ہے اس کو مالا مال کرتا ہے جیسے بارش آسمان سے آتی ہے اور عمدہ زمین کو فیضیاب کرتی ہے)

معارف و مسائل

اس سورت میں حق تعالیٰ نے آسمان اور ستاروں کی قسم کھا کر یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ہر انسان پر ایک

محافظ نگراں ہے جو اُس کے تمام افعال و اعمال اور حرکات و سکنات کو دیکھتا جانتا ہے اس کا تقاضائے عقلی یہ ہے کہ انسان اپنے انجام پر غور کرے کہ دُنیا میں وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ اللہ کے یہاں محفوظ ہے اور یہ محفوظ رکھنا حساب کے لئے ہے جو قیامت میں ہوگا، اس لئے کسی وقت آخرت اور قیامت کی فکر سے غافل نہ ہو، اس کے بعد اُس شبہ کا جواب ہے جو شیطان لوگوں کے دِلوں میں ڈالتا ہے کہ مر کر مٹی اور ذرہ ذرہ ہو جانے کے بعد پھر سب اجزاء کا جمع ہونا اور اسمیں زندگی پیدا ہونا ایک موہوم خیال بلکہ عوام کی نظر میں محال و ناممکن ہے۔ جواب میں انسان کی ابتدائی تخلیق پر غور کرنے کی ہدایت ہے کہ وہ کس طرح مختلف ذرّات اور مختلف مواد سے ہوتی ہے جیسے ابتدائی تخلیق میں دُنیا بھر کے مختلف ذرّات کو جمع کر کے ایک زندہ سمیع بصیر انسان بنا دیا، اُس کو اس پر بھی قدرت کیوں نہ ہوگی کہ پھر اس کو اسی طرح لوٹا دے، اس کے بعد کچھ حال قیامت کا بیان فرما کر دوسری قسم زمین اور آسمان کی کھا کر غافل انسان کو یہ جتلایا کہ جو کچھ اس کو فکرِ آخرت کی تلقین کی گئی ہے اس کو مذاق و دل لگی نہ سمجھے یہ ایک حقیقت ہے جو سامنے آکر رہے گی۔ آخر میں کفار کے اس شبہ کا جواب دیا گیا کہ کفر و شرک اور معاصی اگر اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں تو پھر دُنیا ہی میں اُن پر عذاب کیوں نہیں آجاتا، اس پر سورت ختم کی گئی ہے۔

پہلی قسم میں آسمان کے ساتھ طارق کی قسم ہے، طارق کے معنے رات کو آنے والے کے ہیں، ستارے چونکہ دن کو چھپے رہتے ہیں اس لئے ستارہ کو طارق فرمایا اور خود قرآن نے اس کی تفسیر کر دی وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ، یعنی تمہیں کیا خبر کہ طارق کیا چیز ہے پھر فرمایا اَلنَّجْمُ الثَّاقِبُ، یعنی ستارہ روشن، نجم کے معنی ستارہ کے ہیں، قرآن نے کوئی ستارہ متعین نہیں کیا، اس لئے ہر ستارہ اسکا مصداق ہو سکتا ہے بعض حضرات مفسرین نے نجم سے خاص ستارہ ثریا یا زحل مُراد لیا ہے اور کلامِ عرب سے لفظ نجم کا اسپر اطلاق ثابت کیا ہے ثاقب کے معنے روشن چمکدار کے ہیں۔

اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ، یہ جواب قسم ہے، اس میں شروع کا حرف اِنْ نافیہ ہے اور حرف لَمَّا بتشدید میم بمعنے الّا ہے جو قبیلہ ہذیل کے لغت میں استثناء کے معنے دیتا ہے اور معنے آیت کے یہ ہیں کہ کوئی نفس ایسا نہیں جس پر حافظ نہ ہو، حافظ کے معنے نگراں کے بھی آتے ہیں جو کسی کے اعمال کو نظر میں رکھے تاکہ انکا حساب لے، اور حافظ بمعنے محافظ بھی آتا ہے جس کے معنے مصائب و آفات سے حفاظت کرنے والے کے ہیں، پہلے معنے کے اعتبار سے حافظ سے مراد فرشتہ کاتبِ اعمال ہے، اور یہاں اگرچہ اس کو بلفظ مفرد بمعنی جنس بیان کیا ہے مگران کا متعدد ہونا دوسری آیت سے ثابت ہے اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ

اور دوسرے معنے کے اعتبار سے وہ فرشتے مراد ہیں جو اللہ تعالےٰ نے ہر انسان کی حفاظت کے لئے مقرر کئے ہیں وہ دن رات تمام آفات و مصائب سے انسان کی حفاظت کرتے ہیں، بجز اس مصیبت و آفت کے جو اللہ تعالےٰ نے اسکے لئے مقدر کر دی ہے جیساکہ ایک دوسری آیت میں اسکا صراحۃً بیان آیا ہے لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ، یعنی انسان کے لئے نوبت بہ نوبت آنیوالے محافظ فرشتے مقرر ہیں

جو اسکے آگے اور پیچھے سے اس کی حفاظت بامر الٰہی کرتے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر مومن پر اللہ تعالیٰ کیطرف سے ایک سو ساٹھ فرشتے اس کی حفاظت کے لئے مقرر ہیں جو انسان کے ہر ہر عضو کی حفاظت کرتے ہیں اُن میں سے سات فرشتے صرف انسان کی آنکھ کی حفاظت کے لئے مقرر ہیں، یہ فرشتے انسان سے ہر بلا و مصیبت جو اسکے لئے مقدر نہیں اس طرح انسان سے دفع کرتے ہیں جیسے شہد کے برتن پر آنے والی مکھیوں کو پنکھے وغیرہ سے دفع کیا جاتا ہے۔ اور اگر انسان پر یہ حفاظتی پہرہ نہ ہو تو شیاطین اُس کو اُچک لیں (قرطبی)

خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ، یعنی انسان پیدا کیا گیا ہے ایک اُچھلنے والے پانی سے جو نکلتا ہے پشت اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے۔ عام طور سے حضرات مفسرین نے اسکا یہ مفہوم قرار دیا ہے کہ نطفہ مرد کی پشت اور عورت کے سینے سے نکلتا ہے مگر اعضائے انسانی کے ماہر اطباء کی تحقیق اور تجربہ یہ ہے کہ نطفہ درحقیقت انسان کے ہر ہر عضو سے نکلتا ہے اور بچے کا ہر عضو اُس جزء نطفہ سے بنتا ہے جو مرد و عورت کے اسی عضو سے نکلا ہے۔ البتہ دماغ کو اس معاملے میں سب سے زیادہ دخل ہے اسی لئے مشاہدہ ہوتا ہے کہ جماع کی کثرت کرنے والے اکثر ضعفِ دماغ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اسی کیساتھ انکی تحقیق یہ بھی ہے کہ نطفہ تمام اعضاء سے منفصل ہو کر نُخاع کے ذریعہ خصیتین میں جمع ہوتا اور پھر وہاں سے نکلتا ہے۔

اگر یہ تحقیق صحیح ہے تو حضرات مفسرین نے جو نطفہ کا خروج مرد کی پشت اور عورت کے سینے کے متعلق قرار دیا ہے اس کی توجیہ بھی کچھ بعید نہیں کیونکہ اس پر اطباء کا اتفاق ہے کہ نطفہ کی تولید میں سب سے بڑا دخل دماغ کو ہے اور دماغ کا خلیفہ و قائم مقام نُخاع ہے جو ریڑھ کی ہڈی کے اندر دماغ سے پشت اور پھر خصیتین تک آیا ہوا ہے، اسی کے کچھ شعبے سینے کی ہڈیوں میں آئے ہوئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ عورت کے نطفہ میں سینے کی ہڈیوں سے آنیوالے نطفہ کا اور مرد کے نطفہ میں پشت سے آنیوالے نطفہ کا دخل زیادہ ہو (ذکرہ البیضاوی)

اور اگر قرآن کریم کے الفاظ پر غور کیا جائے تو اُن میں مرد و عورت کی کوئی تخصیص نہیں، صرف اتنا ہے کہ نطفہ پشت اور سینے کے درمیان سے نکلتا ہے۔ اسکا یہ مطلب بے تکلف ہوسکتا ہے کہ نطفہ مرد و عورت دونوں کے سارے بدن سے نکلتا ہے اور سارے بدن کی تعبیر آگے پیچھے کے اہم اعضاء سے کردی گئی سامنے کے حصہ میں سینہ اور پیچھے کے حصہ میں پشت سب سے اہم اعضاء ہیں۔ ان دونوں کے اندر سے نکلنے کا مطلب یہ لیا جائے کہ سارے بدن سے نکلتا ہے جیسا کہ خلاصۂ تفسیر میں لکھا گیا ہے۔

اِنَّهٗ عَلٰی رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ، رجع کے معنے لوٹا دینے کے ہیں مطلب یہ ہے کہ جس خالق کائنات نے اوّل انسان کو نطفہ سے پیدا کیا ہے وہ اسکو دوبارہ لوٹا دینے یعنی مرنے کے بعد زندہ کردینے پر بدرجہ اولیٰ قادر ہے۔

یَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ، تبلیٰ کے لفظی معنے امتحان لینے اور آزمانے کے ہیں اور سرائر کے معنی ہیں مخفی اُمور مطلب یہ ہے کہ قیامت کے روز انسان کے تمام عقائد و خیالات اور نیت و عزم جو دل میں پوشیدہ تھی دُنیا میں

اُس کو کوئی نہ جانتا تھا اسی طرح وہ اعمال و افعال جو اُس نے چُھپ کر کئے دُنیا میں کسی کو اُن کی خبر نہیں، محشر میں سب کا امتحان لیا جائے گا یعنی سب کو ظاہر کر دیا جائے گا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز انسان کے ہر مخفی راز کو کھولدے گا۔ ہر اچھے برُے عقیدے اور عمل کی علامت انسان کے چہرہ پر یا زینت ہو کر یا ظلمت و سیاہی کی صورت میں ظاہر کر دی جائے گی (قرطبی)

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ، رجع کے معنے اُس بارش کے ہیں جو پے در پے ہو کہ ایک مرتبہ بارش ہو کر ختم ہو جائے اور پھر لوٹے۔

اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ، یعنی قرآن کریم ایک فیصلہ کن قول ہے جو حق و باطل میں فیصلہ کرتا ہے اور اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ قرآن کے متعلق فرمایا کتاب فیه خبر ما قبلکم وحکم ما بعدکم وھو الفصل لیس بالھزل یعنی یہ ایک ایسی کتاب ہے جسمیں تم سے پہلی اُمتوں کے حالات و اخبار ہیں اور تمھارے بعد آنیوالوں کے لئے احکام ہیں وہ فیصلہ کُن قول ہے ہنسی مذاق نہیں۔

تمت سُورۃ الطارق بحمد اللہ تعالیٰ ۱۷ شوال ۱۳۹۱ھ

سُورَۃ الاعلیٰ

سُوْرَۃُ الْاَعْلٰی مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ تِسْعَ عَشْرَۃَ اٰیَۃً

سورۂ اعلیٰ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی اُنیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ① الَّذِىْ خَلَقَ فَسَوّٰى ② وَالَّذِىْ قَدَّرَ فَهَدٰى ③ وَ

پاکی بیان کر اپنے رب کے نام کی جو سب سے اُوپر جس نے بنایا پھر ٹھیک کیا اور جس نے ٹھہرا دیا پھر راہ بتلائی اور

الَّذِىْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ④ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى ⑤ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ⑥

جس نے نکالا چارا پھر کر ڈالا اس کو کوڑا سیاہ البتہ ہم پڑھائیں گے تجھ کو پھر تو نہ بھولیگا

اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ⑦ وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ⑧ فَذَكِّرْ

مگر جو چاہے اللہ وہ جانتا ہے پکارنے کو اور جو چھپا ہوا ہے اور سہج سہج پہنچائیں گے ہم تجھ کو آسانی تک، سو تو سمجھائے

اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ⑨ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ⑩ وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ⑪

اگر فائدہ کرے سمجھانا سمجھ جائے گا جس کو ڈر ہوگا اور یکسو رہے گا اُس سے بڑا بدقسمت

الَّذِىْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ⑫ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ⑬

وہ جو داخل ہوگا بڑی آگ میں پھر نہ مرے گا اُس میں اور نہ جئے گا

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ⑭ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ⑮ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ

بیشک بھلا ہوا اُسکا جو سنورا اور لیا اُسنے نام اپنے رب کا پھر نماز پڑھی کوئی نہیں تم بڑھاتے ہو

الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ⑯ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ⑰ اِنَّ هٰذَا لَفِى الصُّحُفِ

دُنیا کے جینے کو اور پچھلا گھر بہتر ہے اور باقی رہنے والا یہ لکھا ہوا ہے پہلے ورقوں

الْاُوْلٰى ⑱ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ⑲ ع

میں صحیفوں میں ابراہیم کے اور موسیٰ کے

خلاصۂ تفسیر

(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (اور جو مومن آپ کے ساتھ ہیں) اپنے پروردگار عالیشان کے نام کی تسبیح (وتقدیس) کیجئے جس نے (ہر شئ کو) بنایا پھر (اس کو) ٹھیک بنایا (یعنی ہر شئ کو مناسب طور پر بنایا) اور جس نے (جانداروں کے لئے اُن کے مناسب چیزوں کو) تجویز کیا پھر (اُن جانداروں کو اُن چیزوں کی طرف) راہ بتلائی (یعنی اُن کی طبائع میں ان اشیاء کا تقاضا پیدا کر دیا) اور جس نے (سبز خوشنما) چارہ (زمین سے) نکالا پھر اس کو سیاہ کوڑا کر دیا (اوّل عام تصرفات مذکور ہیں، پھر حیوانات کے متعلق پھر نباتات کے متعلق، مطلب یہ ہے کہ طاعات کے ذریعہ آخرت کی تیاری کرنا چاہیئے جہاں اعمال پر جزا و سزا ہونے والی ہے اور اسی طاعت کا طریقہ بتلانے کے لئے ہم نے قرآن نازل کیا ہے اور آپ کو اس کی تبلیغ کے لئے مامور کیا ہے سو اس قرآن کی نسبت ہم وعدہ کرتے ہیں کہ) ہم (جتنا) قرآن (نازل کرتے جاویں گے) آپ کو پڑھا دیا کریں گے (یعنی یاد کرا دیا کریں گے) پھر آپ (اُس میں سے کوئی جزو) نہیں بھولیں گے مگر جسقدر (بھلانا) اللہ کو منظور ہو (کہ نسخ کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کما قال تعالیٰ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا الخ سو وہ البتہ آپکے اور سب کے ذہنوں سے فراموش کر دیا جاویگا، اور یہ یاد رکھانا اور فراموش کر دینا سب قرینِ حکمت ہوگا کیونکہ) وہ ہر ظاہر اور مخفی کو جانتا ہے (اس لئے اُس سے کسی چیز کی مصلحت مخفی نہیں، تو جب کسی چیز کا محفوظ رکھنا مصلحت ہوتا ہے محفوظ رکھتے ہیں، اور جب بھلا دینا مصلحت ہوتا ہے تو بھلا دیتے ہیں) اور (جیسا ہم آپکے لئے قرآن کا یاد ہونا آسان کر دیں گے اسی طرح) ہم اس آسان (شریعت کے ہر حکم پر چلنے) کے لئے آپ کو سہولت دیدیں گے (یعنی سمجھنا بھی آسان ہوگا اور عمل بھی آسان ہوگا اور تبلیغ بھی آسان ہو جاوے گی اور مزاحمتوں کو دفع کر دیں گے، اور شریعت کی صفت یُسْرٰی لانا بطور مدح کے ہے یا اسلئے کہ وہ سبب ہے یُسر کا، اور جب ہم آپکے لئے وحی کے متعلق ہر کام آسان کر دینے کا وعدہ کرتے ہیں) تو آپ (جس طرح خود تسبیح وتقدیس کرتے ہیں اُس طرح دوسروں کو بھی) نصیحت کیا کیجئے اگر نصیحت کرنا مفید ہوتا ہو (مگر جیسا کہ ظاہر اور معلوم ہے کہ نصیحت اپنی ذات میں ہمیشہ مفید ہی ہوتی ہے کما قال تعالیٰ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ حاصل یہ ہوا کہ جب نصیحت نفع کی چیز ہے تو آپ نصیحت کرنیکا اہتمام کریں، مگر باوجود اسکے کہ نصیحت اپنی ذات میں نافع ومفید ہے اس سے یہ نہ سمجھئے کہ وہ سب ہی کے لئے مفید ہوگی اور سب ہی اُس کو مان لیں گے بلکہ) وہی شخص نصیحت مانتا ہے جو (خدا سے) ڈرتا ہے اور جو سخت بدنصیب ہے وہ اُس سے گریز کرتا ہے جو (آخر کار) بڑی آگ میں (یعنی آتشِ دوزخ میں جو دُنیا کی سب آگوں سے بڑی ہے) داخل ہوگا پھر (اس سے بڑھ کر یہ کہ) نہ اسمیں مر ہی جاوے گا اور نہ (آرام کی زندگی) جیئے گا (یعنی جس جگہ نصیحت قبول کرنے کی شرط موجود نہیں ہوتی وہاں اگرچہ اُسکا اثر ظاہر نہ ہو مگر نصیحت فی نفسہٖ نافع ومفید ہی ہے، اور آپ کے ذمہ اُسکے واجب ہونے کے لئے یہی کافی ہے۔ خلاصہ اول سورت سے یہاں تک کا یہ ہوا کہ آپ اپنی بھی تکمیل کیجئے اور دوسروں کو بھی اس کی تبلیغ کیجئے کہ ہم آپ کے معاون ہیں

آگے اس کی تفصیل ہے کہ اللہ سے ڈرنے والے نصیحت سے فائدہ اُٹھاتے ہیں) بامراد ہوا جو شخص (قرآن سُنکر عقائدِ باطلہ اور اخلاقِ رذیلہ سے) پاک ہوگیا اور اپنے رب کا نام لیتا اور نماز پڑھتا رہا (مگر اے منکرو تم قرآن سُنکر اسکو نہیں مانتے اور آخرت کا سامان نہیں کرتے) بلکہ تم دُنیوی زندگی کو مقدم رکھتے ہو حالانکہ آخرت (دُنیا سے) بدرجہا بہتر اور پائیدار ہے (اور یہ مضمون صرف قرآن ہی کا دعویٰ نہیں بلکہ) یہ مضمون اگلے صحیفوں میں بھی ہے، یعنی ابراہیم و موسیٰ (علیہما السلام) کے صحیفوں میں (روح المعانی میں عبدبن حمید کی روایت سے حدیث مرفوع مذکور ہے کہ ابراہیم علیہ السلام پر دس صحیفے نازل ہوئے اور موسیٰ علیہ السلام پر تورات کے نزول سے پہلے دس صحیفے نازل ہوئے)

معارف و مسائل

مسئلہ ۔ علماء نے فرمایا ہے کہ قاری جب سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى کی تلاوت کرے تو مستحب ہے کہ یہ کہے سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى، صحابہ کرام حضرت عبداللہ بن عباسؓ، ابن عمرؓ، ابن زبیرؓ، ابو موسیٰ اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم اجمعین کا یہی معمول تھا کہ جب یہ سورت شروع کرتے تو سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى کہا کرتے تھے (قرطبی) یعنی نماز کے سوا جب تلاوت کریں تو ایسا کہنا مستحب ہے۔

مسئلہ ۔ حضرت عقبہ بن عامر جہنیؓ سے روایت ہے کہ جب سورۃ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى نازل ہوئی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اجعلوھا فی سجودکم یعنی یہ کلمہ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى اپنے سجدہ میں کہا کرو سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى، تسبیح کے معنی پاک رکھنے اور پاکی بیان کرنے کے ہیں سبّح اسم ربک کے معنی یہ ہیں کہ اپنے رب کے نام کو پاک رکھئے ۔ مراد یہ ہے کہ رب کے نام کی تعظیم و تکریم کیجئے اور جب اللہ کا نام لیں تو خشوع خضوع اور ادب کا لحاظ رکھئے، اور ہر ایسی چیز سے اُس کے نام کو پاک رکھئے جو اسکے شایاں نہیں، اسمیں یہ بھی داخل ہے کہ اللہ تعالیٰ کو صرف ان ناموں سے پکاریئے جو خود اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے بیان فرمائے ہیں یا اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو بتلائے ہیں انکے سوا کسی اور نام سے اسکو پکارنا جائز نہیں۔

مسئلہ ۔ اسی طرح اس حکم میں یہ بھی داخل ہے کہ جو نام اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے وہ کسی مخلوق کیلئے استعمال کرنا اس کی تنزیہہ و تقدیس کے خلاف ہے اسلئے جائز نہیں (قرطبی) جیسے رحمٰن، رزّاق، غفّار، قدّوس وغیرہ آجکل اس معاملے میں غفلت بڑھتی جارہی ہے، لوگوں کو ناموں کے اختصار کا شوق ہے، عبدالرحمٰن کو رحمٰن، عبدالرزاق کو رزاق، عبدالغفار کو غفار بے تکلف کہتے رہتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ اسکا کہنے والا اور سُننے والا دونوں گنہگار ہوتے ہیں، اور یہ گناہ بے لذت رات دن بلا وجہ ہوتا رہتا ہے۔ اور بعض حضرات مفسرین نے اس جگہ اسم سے مراد خود مسمّٰی کی ذات مراد لی ہے اور عربی زبان کے اعتبار سے اس کی گنجائش بھی ہے اور قرآن کریم میں بھی اس معنے کے لئے استعمال ہوا ہے، اور حدیث میں جو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کلمہ کو نماز کے سجدے میں پڑھنے کا حکم دیا اُس کی تعمیل میں جو کلمہ اختیار کیا گیا وہ سُبْحَانَ اسم ربک الاعلیٰ نہیں بلکہ سُبْحَانَ

رَبِّیَ الاعلیٰ ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسم اس جگہ مقصود نہیں خود مسمّیٰ مراد ہے (قرطبی) واللہ علم

تخلیقِ کائنات میں لطیف اور دقیق حکمتیں | اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی، یہ سب ربِّ اعلیٰ کی صفات کا ذکر ہے جو تخلیقِ کائنات میں اُس کی حکمتِ بالغہ اور قدرتِ کاملہ کے مشاہدہ سے متعلق ہیں انمیں پہلی صفت خَلَقَ ہے خلق کے معنے محض صنعت گری کے نہیں بلکہ عدم سے بغیر کسی مادّہ سابقہ کے وجود میں لانا ہے اور یہ کام کسی مخلوق کے بس میں نہیں صرف حق تعالیٰ شانہٗ کی قدرتِ کاملہ ہے کہ بغیر کسی سابق مادہ کے جب چاہتے ہیں اور جس چیز کو چاہتے ہیں عدم سے وجود میں لے آتے ہیں۔ دوسری صفت اس تخلیق ہی کیساتھ وابستہ فَسَوّٰی ہے جو تسویہ سے مشتق ہے اور اس کے لفظی معنی برابر کرنے کے ہیں اور مراد برابر کرنے سے یہ ہے کہ ہر چیز کو جو وجود عطا فرمایا اسکی جسامت اور شکل وصورت اور اعضاء واجزاء کی وضع وہیئت میں ایک خاص تناسب ملحوظ رکھ کر یہ وجود بخشا گیا ہے، انسان اور ہر جانور کو اُس کی ضروریات کے مناسب اعضاء دیئے گئے اور اُن اعضاء کی جسامت اور وضع وہیئت اُس کی ضروریات کے مناسب بنائی گئی ہیں، ہاتھ پاؤں اور اُن کی اُنگلیوں کے پوروں میں ایسے جوڑ رکھے اور قدرتی اسپرنگ لگائے کہ وہ ہر طرف موڑے توڑے اور تہ کئے جاسکتے ہیں، اسی طرح دوسرے ایک ایک عضو کو دیکھو یہ حیرت انگیز تناسب خود انسان کو خالقِ کائنات کی حکمت وقدرت پر ایمان لانے کیلئے کافی ہے۔

تیسری چیز اسی سلسلے میں فرمائی قَدَّرَ، تقدیر کے معنے کسی چیز کو خاص اندازے پر بنانے اور باہمی موازنت کے بھی آئے ہیں اور بمعنے قضاء وقدر بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنے ہر چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اور خاص تجویز کے ہیں، اس آیت میں یہی معنے مراد ہیں، اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے دنیا کی چیزوں کو صرف پیدا کر کے اور بنا کر نہیں چھوڑ دیا بلکہ ہر چیز کو کسی خاص کام کے لئے پیدا کیا اور اسکے مناسب اسکو وسائل دیئے اور اُسی کام میں اسکو لگا دیا، غور کیا جائے تو یہ بات کسی خاص جنس یا نوع مخلوق کے لئے مخصوص نہیں، ساری ہی کائنات اور مخلوقات ایسی ہیں کہ اُن کو اللہ تعالیٰ نے خاص خاص کاموں کے لئے بنایا ہے اور اُن کو اُسی کام میں لگا دیا ہے، ہر چیز اپنے رب کی مقرر کردہ ڈیوٹی پر لگی ہوئی ہے۔ آسمان اور اُس کے ستارے، برق وباراں سے لیکر انسان وحیوان اور نباتات وجمادات سب میں اسکا مشاہدہ ہوتا ہے کہ جسکو جس کام پر خالق نے لگا دیا ہی وہ اسپر لگا ہوا ہی ؎ ابروباد ومہ خورشید وفلک در کارند

اور مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے ؎

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند	بامن و تو مُردہ با حق زندہ اند

خصوصاً انسان اور حیوان کے ہر نوع وصنف کو حق تعالےٰ نے جن خاص خاص کاموں کے لئے پیدا فرمایا ہے وہ قدرتی طور پر اسی کام میں لگے ہوئے ہیں، اُن کی رغبت وشوق سب اُسی کام کے گرد گھومتا ہے ؎

ہر یکے را بہر کارے ساختند	میل اورا در دلش انداختند

چوتھی چیز یہ فرمائی فَهَدٰی یعنی خالقِ کائنات نے جس چیز کو جس کام کے لئے پیدا فرمایا اسکو اسکی ہدایت بھی فرمادی کہ وہ کس کس طرح اس کام کو انجام دے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ہدایت تمام کائنات ومخلوقات کو

شامل ہے آسمان اور آسمانی مخلوقات ہوں یا زمین اور اُس کی مخلوقات کیونکہ ایک خاص قسم کی عقل و شعور اللہ تعالیٰ نے اُن کو بھی دیا ہے گو وہ انسان کے عقل و شعور سے کم ہو جیسا کہ قرآن کریم کی دوسری آیت میں ارشاد ہے اَعْطٰى كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا کر کے ایک وجود بخشا پھر اس کو اسکے متعلقہ کام کی ہدایت کردی اسی ہدایتِ عامہ کا اثر ہے کہ آسمان و زمین ستارے اور سیارات پہاڑ اور دریا سب کے سب جس خدمت پر اول خلقت سے مامور کردیئے گئے اُس خدمت کو ٹھیک ٹھیک اسی طرح بغیر کسی کمی کوتاہی یا سُستی کے بجالاتے ہیں خصوصاً انسان اور حیوانات جن کا عقل و شعور ہر وقت مشاہدہ میں آتا ہے ان میں بھی غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہیں سے ہر نوع ہر صنف بلکہ ہر ہر فرد کو حق تعالیٰ نے اپنی اپنی ضروریات زندگی حاصل کرنے اور اپنے مخالف چیزوں کو دفع کرنے کے لئے کیسے کیسے دقیق ہنر سکھائے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے، انسان تو سب سے زیادہ عقل و شعور والا ہے جنگل کے جانوروں، درندوں، پرندوں اور حشرات الارض کو دیکھو کہ ہر ایک کو اپنی ضروریات زندگی حاصل کرنے اور رہنے بسنے اور اپنی انفرادی اور جنسی ضروریات کو پُورا کرنے کے لئے کیسے کیسے ہنر سکھائے ہیں اور یہ سب بلا واسطہ تعلیم خالقِ کائنات کیطرف سے ہے، انھوں نے کسی اسکول کالج میں رہ کر یا کسی اُستاد سے یہ چیزیں نہیں سیکھیں بلکہ یہ سب اسی ہدایتِ عامہ اور تلقینِ ربانی کے ثمرات ہیں جسکا ذکر آیت اَعْطٰى كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى، اور اس سورت کی قَدَّرَ فَهَدٰى میں فرمایا ہے۔

انسان کو سائنسی تعلیم بھی درحقیقت عطائے ربانی ہے

انسان جس کو حق تعالیٰ نے عقل و شعور سب سے زیادہ مکمل عطا فرمایا اور اس کو مخدوم کائنات بنایا ہے تمام زمین اور پہاڑ اور دریا اور اُن میں پیدا ہونے والی اشیا، انسان کی خدمت اور اسکے نفع کے لئے پیدا ہوئی ہیں مگر اُن سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھانا اور مختلف قسم کے منافع حاصل کرنا اور مختلف چیزوں کو جوڑ کر ایک نئی چیز پیدا کرلینا یہ بڑے علم و ہنر کو چاہتا ہے قدرت نے انسان کے اندر فطری طور پر یہ عقل و فہم رکھا ہے کہ پہاڑوں کو کھود کر دریاؤں میں غوطہ لگا کر سیکڑوں معدنی اور دریائی چیزیں حاصل کرلیتا ہے اور پھر لکڑی، لوہے، تانبے، پیتل وغیرہ کو باہم جوڑ کر ان سے نئی نئی چیزیں اپنی ضرورت کی بنالیتا ہے اور یہ علم و ہنر فلاسفہ کی تحقیقات اور کالجوں کی تعلیمات پر موقوف نہیں، ابتدائے دُنیا سے اَن پڑھ جاہل یہ سب کام کرتے آئے ہیں، اور یہی فطری سائنس ہے جو حق تعالیٰ نے انسان کو فطرۃً بخشی ہے آگے فنی اور علمی تحقیقات کے ذریعہ اس میں ترقی کرنے کی استعداد بھی اسی قدرتِ ربانی کا عطیہ ہے۔

یہ سب جانتے ہیں کہ سائنس کسی چیز کو پیدا نہیں کرتی بلکہ قدرت کی پیدا کردہ اشیاء کا استعمال سکھاتی ہے اور اس استعمال کا ادنیٰ درجہ تو حق تعالیٰ نے انسان کو فطرۃً سکھا دیا ہے، آگے اسمیں فنی تحقیقات اور ترقی کا بڑا وسیع میدان رکھا ہے اور انسان کی فطرت میں اسکے سمجھنے کی استعداد و صلاحیت رکھی ہے جس کے مظاہر اس سائنسی دَور میں روز نئے نئے سامنے آرہے ہیں اور معلوم نہیں آگے اس سے بھی زیادہ کیا کیا سامنے آئے گا غور کرو تو یہ سب ایک لفظ قرآن فَهَدٰى کی شرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ان سب کاموں کا راستہ دکھایا، اور

اُس میں اُن کے پُورا کر لینے کی استعداد عطا فرمائی مگر افسوس ہے کہ سائنس میں ترقی کرنے والے اس حقیقت سے اور زیادہ ناآشنا بلکہ اندھے ہوتے جارہے ہیں ۔

وَالَّذِیۡۤ اَخۡرَجَ الۡمَرۡعٰی ۪ۙ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحۡوٰی ، مرعیٰ کے معنی چراگاہ کے ہیں جہاں چوپائے جانور چرتے ہیں اور غثاء اُس کوڑے کرکٹ کو کہتے ہیں جو پانی کے سیلاب میں اُوپر آجاتا ہے ۔ احوٰی ، حوۃ سے مشتق ہے گہری سبزی میں جو ایک قسم کی سیاہی آجاتی ہے اسکو حوّت کہتے ہیں ، اس آیت میں حق تعالیٰ نے نباتات سے متعلق کچھ اپنی قدرت و حکمت کا بیان فرمایا ہے کہ زمین سے سرسبز گھاس نکالی پھر اسکو خشک کرکے سیاہ رنگ کر دیا وہ سرسبزی جاتی رہی ، اسمیں انسان کو اسکے انجام کیطرف بھی اشارہ ہے کہ یہ جسم کی شادابی خوبصورتی اور چستی چالاکی حق تعالیٰ کا عطیہ ہے مگر انجام کار پھر اس سب کو ختم ہونا ہے ۔

سَنُقۡرِئُکَ فَلَا تَنۡسٰۤی ۙ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ، سابقہ آیات میں حق تعالیٰ نے اپنی قدرت و حکمت کے چند مظاہر بیان فرمانیکے بعد رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو انکے فریضہ پیغمبری کیطرف چند ہدایات دی ہیں اور ہدایات سے پہلے آپؐ کے کام کو آسان کر دینے کی خوشخبری سُنائی ہے وہ یہ کہ ابتدا میں جب آپؐ پر قرآن نازل ہوتا اور جبریلِ امین کوئی آیتِ قرآن سُناتے تو آپ کو یہ فکر ہوتی تھی کہ ایسا نہ ہو کہ الفاظ آیت ذہن سے نکل جائیں اسلئے جبریلِ امین کے پڑھنے کے ساتھ ساتھ آپؐ بھی الفاظِ قرآن پڑھتے جاتے تھے ۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے یہ کام یعنی قرآن کا یاد کرا دینا اپنے ذمّہ لے لیا اور آپکو بے فکر کر دیا کہ جبریلِ امین کے چلے جانے کے بعد آیاتِ قرآن کا آپؐ سے صحیح صحیح پڑھوا دینا پھر اُن کو یاد میں محفوظ کرا دینا ہماری ذمہ داری ہے آپ فکر نہ کریں جسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ فَلَا تَنۡسٰۤی ۙ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ یعنی آپ قرآن کی کوئی چیز بھولینگے نہیں بجز اسکے کہ کسی چیز کو اللہ تعالیٰ ہی اپنی حکمت و مصلحت کی بنا پر آپکے ذہن سے بُھلا دینا اور محو کر دینا چاہیں ، مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو بعض آیاتِ قرآن کو منسوخ فرماتے ہیں اسکا ایک طریقہ تو معروف ہے کہ صاف حکم پہلے حکم کیخلاف آگیا ، اور ایک صورت منسوخ کرنے کی یہ بھی ہے کہ اُس آیت ہی کو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمانوں کے ذہنوں سے محو اور فراموش کر دیا جائے جیساکہ نسخ آیات قرآنی کے بیان میں فرمایا ہے مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰیَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا یعنی ہم جو آیت منسوخ کرتے ہیں یا آپکے ذہن سے بُھلا دیتے ہیں الخ اور بعض حضرات نے اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ کے استثنار کا یہ مفہوم قرار دیا ہے کہ یہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی مصلحت اور حکمت کی بنا پر عارضی طور سے کوئی آیت آپکے ذہن سے بُھلا دیں پھر یاد آجائے جیساکہ بعض روایات حدیث میں ہے کہ ایک روز رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کوئی سورت تلاوت فرمائی جس میں ایک آیت پڑھنے سے رہ گئی ، حضرت ابی بن کعبؓ جو کاتب وحی تھے انھوں نے یہ سمجھا کہ شاید یہ آیت منسوخ ہوگئی مگر جب آپؐ سے دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ منسوخ نہیں مجھ سے سہواً ترک ہوگئی (قرطبی) تو حاصل اس استثنار کا یہ ہوگا کہ وقتی اور عارضی طور پر کسی آیت کا بھول جانا اور پھر بدستور یاد آجانا اس وعدے کے منافی نہیں ، واللہ اعلم

وَنُیَسِّرُکَ لِلۡیُسۡرٰی ، لفظی ترجمہ اسکا یہ ہے کہ ہم آپکو طریقہ یُسریٰ کے لئے آسان کر دینگے ، طریقہ یُسریٰ سے مراد شریعت اسلام ہے بظاہر مقتضائے مقام یہ تھا کہ یہ فرمایا جاتا کہ ہم اس طریقہ اور شریعت کو آپکے لئے آسان کر دینگے مگر قرآن کریم نے اسکو چھوڑ کر یہ فرمایا کہ ہم آپ کو اس طریقہ کے لئے آسان کر دینگے حکمت اسمیں یہ بتلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو طبعی

اور مادی طور پر ایسا بنا دیں گے کہ شریعت آپکی طبیعت بنجائے اور آپ شریعت کے سانچہ میں ڈھل جائیں۔

فَذَكِّرْ إِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى، سابقہ آیات میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو آپکے فریضۂ پیغمبری کے ادا کرنے میں حق تعالےٰ کیطرف سے دی ہوئی سہولتوں کا بیان تھا، اس آیت میں آپکو اس فریضہ کی ادائیگی کا حکم ہے اور معنے الفاظ آیت کے یہ ہیں کہ آپ لوگوں کو تبلیغ و نصیحت کیجئے اگر نصیحت نفع دیتی ہو، یہ الفاظ اگرچہ شرط کے آئے ہیں مگر درحقیقت مقصود کوئی شرط نہیں بلکہ اسکا تاکیدی حکم دینا ہے جس کی مثال ہمارے عرف میں یہ ہے کہ کسی شخص کو بطور تنبیہ کے کہا جائے کہ اگر تو آدمی ہے تو فلاں کام کرنا ہوگا یا اگر تو فلاں کا بیٹا ہے تو تجھے ایسا کرنا چاہیئے۔ یہاں مقصود شرط نہیں ہوتی بلکہ اسکا اظہار ہوتا ہے کہ جب تو آدمی زادہ ہے یا جبکہ تو فلاں بزرگ یا شریف آدمی کا بیٹا ہے تو تجھ پر یہ کام لازم ہے مطلب یہ ہے کہ نصیحت و تبلیغ کا نافع و مفید ہونا تو متعین اور متیقن ہے اسلئے اس نافع چیز کو آپ کسی وقت نہ چھوڑیں،

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى، تزکّٰی، زکوٰۃ سے مشتق ہے جس کے اصل معنے پاک کردینے کے ہیں مال کی زکوٰۃ کو بھی اسلئے زکوٰۃ کہتے ہیں کہ وہ باقی مال کو انسان کے لئے پاک کردیتی ہے یہاں لفظ تزکّٰی کا مفہوم عام ہے جسمیں ایمانی اور اخلاقی تزکیۂ طہارت بھی داخل ہے اور مال کی زکوٰۃ دینا بھی ہے۔ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى، یعنی اپنے رب کا نام لیتا اور نماز پڑھتا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ اسمیں ہر قسم کی نماز فرض و نفل شامل ہے، بعض مفسرین نے جو خاص نماز عید سے اسکی تفسیر کی ہے وہ بھی اسمیں داخل ہے۔ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ عام لوگوں میں دُنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کیوجہ یہ ہے کہ دُنیا کی نعمت و راحت تو نقد و حاضر ہے اور آخرت کی نعمت و راحت نظروں سے غائب اور اُدھار ہے حقیقت سے ناآشنا لوگوں نے حاضر کو غائب پر اور نقد کو اُدھار پر ترجیح دیدی جو اُنکے لئے دائمی خسارہ کا سبب بنی، اسی خسارے سے بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابوں اور رسُولوں کے ذریعہ آخرت کی نعمتوں، راحتوں کو ایسا واضح کر دیا کہ گویا وہ حاضر و موجود ہیں اور یہ تبلا دیا کہ جس چیز کو تم نقد سمجھ کر اختیار کرتے ہو یہ متاع کاسد و ناقص اور بہت جلد فنا ہو جانیوالا ہے عقلمند کا کام نہیں کہ ایسی چیز پر اپنا دل ڈالے اور اُس کے لئے اپنی توانائی صرف کرے اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے آگے ارشاد فرمایا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝ دُنیا کو آخرت پر ترجیح دینے والوں کو تنبیہ ہے کہ ذرا عقل سے کام لو، کس چیز کو اختیار کر رہے اور کس کو چھوڑ رہے ہو دُنیا جس پر تم فریفتہ ہو اوّل تو اسکی بڑی سے بڑی راحت و لذت بھی رنج و غم اور کُلفت و مشقت کی آمیزش سے خالی نہیں دوسرے اُسکا کوئی قرار و ثبات نہیں، آج کا بادشاہ کل کا فقیر، آج کا جوان شہ زور کل کا ضعیف و عاجز ہوتا رات دن دیکھتے ہو۔ بخلاف آخرت کے کہ وہ ان دونوں عیبوں سے پاک ہے اُس کی ہر نعمت و راحت خیر ہی خیر ہے اور دُنیا کی نعمت و راحت سے اسکو کوئی نسبت نہیں اور اس سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ ابقٰی ہے یعنی ہمیشہ رہنے والی ہے۔ انسان ذرا غور کرے کہ اگر اُس کو کہا جائے کہ تمھارے سامنے دو مکان ہیں، ایک عالیشان محل اور بنگلہ تمام ساز و سامان سے آراستہ ہے اور دوسرا ایک معمولی کچّا مکان ہے اور یہ سامان بھی اُس میں نہیں تمھیں ہم اختیار دیتے ہیں کہ یا تو یہ بنگلہ لے لو مگر صرف مہینہ دو مہینہ کیلئے اسکے بعد اسے خالی کرنا ہوگا، یا یہ کچّا مکان

لیلو جو تمھاری دائمی ملکیت ہوگی تو عقلمند انسان ان دونوں میں کس کو ترجیح دیگا، اسکا مقتضا تو یہ ہے کہ آخرت کی نعمتیں اگر بالفرض ناقص اور دُنیا سے کم درجہ کی بھی ہوتیں مگر انکے دائمی ہونے کیوجہ سے وہی قابلِ ترجیح تھیں اور جبکہ وہ نعمتیں دُنیا کی نعمتوں کے مقابلے میں خیر اور افضل اور اعلیٰ بھی ہیں اور دائمی بھی تو کوئی احمق بدنصیب ہی انکو چھوڑ کر دُنیا کی نعمت کو ترجیح دے سکتا ہے۔

اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۝ یعنی اس سورت کے سب مضامین یا آخری مضمون یعنی آخرت کا بہ نسبت دُنیا کے خیر اور ابقیٰ ہونا پچھلے صحیفوں میں بھی موجود تھا جسکا بیان آگے یہ فرمایا کہ حضرت ابراہیم اور موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں یہ مضمون تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات سے پہلے کچھ صحیفے بھی دیئے گئے تھے وہ مراد ہیں اور ہو سکتا ہے کہ صحفِ موسیٰؑ سے تورات ہی مراد ہو۔

صحفِ ابراہیمی کے مضامین آجری نے حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت کیا ہے کہ اُنھوں نے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے کیسے اور کیا تھے آپ نے فرمایا کہ اُن صحیفوں میں امثالِ عبرت کا بیان تھا، اُن میں سے ایک مثال میں ظالم بادشاہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اے لوگوں پر مسلط ہو جانے والے مغرور مبتلیٰ، میں نے تجھے حکومت اس لئے نہیں دی تھی کہ تو دُنیا کا مال پر مال جمع کرتا چلا جائے بلکہ میں نے تو تجھے اقتدار اس لئے سونپا تھا کہ تو مظلوم کی بد دُعا مجھ تک نہ پہنچنے دے کیونکہ میرا قانون یہ ہے کہ میں مظلوم کی دُعا کو رد نہیں کرتا اگرچہ وہ کافر کی زبان سے نکلی ہو۔

اور ایک مثال میں عام لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ عقلمند آدمی کا کام یہ ہے کہ اپنے اوقات کے تین حصّے کرے ایک حصہ اپنے رب کی عبادت اور اُس سے مناجات کا ہو، دوسرا حصّہ اپنے اعمال کے محاسبہ کا اور اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت و صنعت میں غور و فکر کا، تیسرا حصّہ اپنی ضروریاتِ معاش حاصل کرنے اور طبعی ضرورتیں پُورا کرنے کا۔

اور فرمایا کہ عقلمند آدمی پر لازم ہے کہ اپنے زمانے کے حالات سے واقف رہے اور اپنے مقصود کام میں لگا رہے اپنی زبان کی حفاظت کرے، اور جو شخص اپنے کلام کو اپنا عمل سمجھ لیگا اسکا کلام بہت کم صرف ضروری کاموں میں رہ جائیگا۔

صحفِ موسیٰ علیہ السلام کے مضامین حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ پھر میں نے عرض کیا کہ صحفِ موسیٰ علیہ السلام میں کیا تھا تو آپؐ نے فرمایا کہ اُن میں سب عبرتیں ہی عبرتیں تھیں جن میں سے چند کلمات یہ ہیں:-

مجھے تعجب ہے اُس شخص پر جس کو مرنے کا یقین ہو پھر وہ کیسے خوش رہتا ہے، اور مجھے تعجب ہے اُس شخص پر جو تقدیر پر ایمان رکھتا ہو وہ کیسے عاجز و درماندہ اور غمگین ہو اور مجھے تعجب ہے اُس شخص پر جو دُنیا اور اسکے انقلابات اور لوگوں کے عروج و نزول کو دیکھتا ہے وہ کیسے دُنیا پر مطمئن ہو بیٹھتا ہے، اور مجھے تعجب ہے اُس شخص پر جس کو آخرت کے حساب پر یقین ہو وہ کیسے عمل کو چھوڑ بیٹھتا ہے، حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے پھر یہ سوال کیا کہ کیا ان صحیفوں میں سے کوئی چیز آپکے پاس آنیوالی وحی میں بھی ہے آپنے فرمایا اے ابوذرؓ یہ آیتیں پڑھو قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝ آخر سورۂ اعلیٰ تک (قرطبی)

تمّت سُورة الاعلیٰ بحمد اللہ تعالیٰ لیلة یوم الاحد ۱۸ شعبان سنہ ۹۱ھ

سُورَةُ الغَاشِيَة

سُورَةُ الغَاشِيَةِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ سِتٌّ وَعِشْرُونَ آيَةً

سورہ غاشیہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چھبیس ۲۶ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

هَلْ أَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ① وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ② عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ③

کچھ پہنچی تجھ کو بات اس چھپا لینے والی کی کتنے منہ اس دن ذلیل ہونیوالے ہیں محنت کرنے والے تھکے ہوئے

تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ④ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ⑤ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا

گریں گے دہکتی ہوئی آگ میں پانی ملے گا ایک چشمے کھولتے ہوئے کا نہیں ان کے پاس کھانا مگر

مِنْ ضَرِيْعٍ ⑥ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ⑦ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ⑧

جھاڑ کانٹوں والا نہ موٹا کرے اور نہ کام آئے بھوک میں کتنے منہ اس دن تروتازہ ہیں

لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ⑨ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ⑩ لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ⑪ فِيْهَا

اپنی کمائی سے راضی اونچے باغ میں نہیں سنتے اسمیں بکواس اسمیں

عَيْنٌ جَارِيَةٌ ⑫ فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ ⑬ وَّأَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ⑭ وَّ

ایک چشمہ ہے بہتا اسمیں تخت ہیں اونچے بچھے ہوئے اور آبخورے سامنے چنے ہوئے اور

نَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ⑮ وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ⑯ أَفَلَا يَنْظُرُوْنَ إِلَى الْإِبِلِ

غالیچے برابر بچھے ہوئے اور مخمل کے نہالچے جگہ جگہ پھیلے ہوئے بھلا کیا نظر نہیں کرتے اونٹوں پر

كَيْفَ خُلِقَتْ ⑰ وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ⑱ وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ

کہ کیسے بنائے ہیں اور آسمان پر کہ کیسا اس کو بلند کیا ہے اور پہاڑوں پر کہ کیسے کھڑے

نُصِبَتْ ⑲ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ⑳ فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ

کر دیئے ہیں اور زمین پر کہ کیسی صاف بچھائی ہے سو، تو سمجھائے جا تیرا کام تو یہی

رکوع ۱۳ (حاشیہ)

مُذَكِّرٌ ﴿٢١﴾ لَسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ﴿٢٢﴾ إِلَّا مَن تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ ﴿٢٣﴾ فَيُعَذِّبُهُ
سمجھانا ہے تو نہیں ان پر داروغہ مگر جس نے منہ موڑا اور منکر ہوگیا تو عذاب کرے گا

اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ﴿٢٤﴾ إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُم ﴿٢٦﴾
اُس پر اللہ وہ بڑا عذاب بیشک ہمارے پاس ہے اُن کو پھر آنا، پھر بیشک ہمارا ذمہ ہے اُن سے حساب لینا

ع ۱۴ -۲۶ النصف

خُلاصۂ تفسیر

آپ کو اس محیطِ عام واقعہ کی کچھ خبر پہنچی ہے (مراد اس واقعہ سے قیامت ہے کہ تمام عالم کو اسکا اثر محیط ہوگا اور مقصود اس استفہام سے تشویق ہے جس سے کلام کے سُننے کا اہتمام پیدا ہو، آگے بصورت جواب اس خبر کی تفصیل ہے یعنی) بہت سے چہرے اُس روز ذلیل اور مصیبت جھیلتے خستہ (اور درماندہ) ہونگے (اور) آتش سوزاں میں داخل ہونگے (اور کھولتے ہوئے چشمے سے پانی پلائے جاویں گے (اور) ان کو بجز ایک خاردار جھاڑ کے اور کوئی کھانا نصیب نہ ہوگا جو نہ (تو کھانے والوں کو) فربہ کریگا اور نہ (اُن کی) بھوک کو دفع کریگا (یعنی نہ اسمیں غذا بننے کی صلاحیت ہے نہ بھوک رفع کرنے کی، اور مصیبت جھیلنے سے مُراد حشر میں پریشان پھرنا اور دوزخ میں سلاسل اور اغلال کو لادنا، دوزخ کے پہاڑوں پر چڑھنا اور اس کے اثر سے خستگی ظاہر ہے۔ اور کھولتا ہوا چشمہ وہی جس کو دوسری آیتوں میں حمیم فرمایا ہے اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اسکا بھی چشمہ ہوگا، اور یہ فرمانا کہ اسکا طعام بجز ضریع کے اور نہ ہوگا اسکا مطلب یہ ہے کہ کوئی لذیذ کھانا نہیں ہوگا، ضریع ہی کی طرح زقوم یا غسلین کا اسکے کھانے میں شامل ہونا اسکے منافی نہیں، اور چہروں سے مراد اصحاب چہرہ ہیں یہ تو دوزخیوں کا حال ہوا، آگے اہلِ جنّت کا حال ہے یعنی) بہت سے چہرے اُس روز بارونق (اور) اپنے نیک کاموں کی بدولت خوش ہونگے (اور) بہشت بریں میں ہونگے جن میں کوئی لغو بات نہ سُنیں گے (اور) اس (بہشت) میں بہتے ہوئے چشمے ہونگے (اور) اس (بہشت) میں اُونچے اُونچے تخت (بچھے) ہیں اور رکھے ہوئے آبخورے (موجود) ہیں (یعنی یہ سامان اسکے سامنے ہی موجود ہوگا تاکہ جب پانی کو جی چاہے دیر نہ لگے) اور برابر لگے ہوئے گدے (تکیے) ہیں اور سب طرف قالین (ہی قالین) پھیلے پڑے ہیں (کہ جہاں چاہیں آرام کرلیں، ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا بھی نہ پڑے یہ تفصیل ہوگئی جزا کی اور ان مضامین کو سُن کر جو بعضے لوگ قیامت کا انکار کرتے ہیں جسمیں یہ سب واقعات ہونگے تو اُن کی غلطی ہے کیونکہ) کیا وہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح (عجیب طور پر) پیدا کیا گیا ہے (کہ ہیئت اور خاصیت دونوں بہ نسبت دوسرے جانوروں کے اسمیں عجیب ہیں) اور آسمان کو (نہیں دیکھتے) کہ کس طرح بلند کیا گیا ہے اور پہاڑوں کو (نہیں دیکھتے) کہ کس طرح کھڑے کیئے گئے اور زمین کو (نہیں دیکھتے) کہ کس طرح بچھائی گئی ہے (یعنی ان چیزوں کو دیکھکر قدرتِ الٰہیہ پر استدلال نہیں کرتے تاکہ اسکا بعث یعنی قیامت پر قادر ہونا سمجھ لیتے اور تخصیص ان چار چیزوں کی اسلئے ہے کہ عرب کے لوگ اکثر جنگلوں میں چلتے پھرتے رہتے تھے اسوقت انکے سامنے اونٹ ہوتے تھے اور اوپر آسمان

اور نیچے زمین اور اطراف میں پہاڑ اسلئے ان علامات میں غور کرنے کیلئے ارشاد فرمایا گیا اور جب یہ لوگ باوجود قیام دلائل کے غور نہیں کرتے تو آپ بھی ان کی فکر میں زیادہ نہ پڑیئے بلکہ صرف) نصیحت کر دیا کیجئے (کیونکہ) آپ تو بس صرف نصیحت کرنیوالے ہیں (اور آپ ان پر مسلط نہیں ہیں (جو زیادہ فکر میں پڑیں) ہاں مگر جو روگردانی اور کفر کریگا تو خدا اس کو (آخرت میں) بڑی سزا دیگا کیونکہ ہمارے ہی پاس اُن کا آنا ہوگا پھر ہمارا ہی کام اُن سے حساب لینا ہے (آپ زیادہ غم میں نہ پڑیئے ۔)

معارف و مسائل

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۙ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۙ قیامت میں دو فریق مؤمن و کافر الگ الگ ہو جائینگے اُنکے چہرے الگ الگ پہچانے جائیں گے ۔ اس آیت میں کافروں کے چہروں کا ایک حال یہ تبلایا ہے کہ وہ خاشعہ ہونگے ، خشوع کے معنے جھکنے اور ذلیل ہونے کے ہیں ۔ نماز میں خشوع کا یہی مطلب ہے کہ اللہ تعالےٰ کے سامنے جھکنے اور ذلت و پستی کے آثار اپنے وجود پر طاری کرے ۔ جن لوگوں نے دُنیا میں اللہ تعالیٰ کے سامنے خشوع و تذلل اختیار نہیں کیا اس کی سزا اُن کو قیامت میں یہ ملے گی کہ وہاں انکے چہروں پر ذلت اور رُسوائی کے آثار نمایاں ہونگے ۔

دوسرا اور تیسرا حال اُن کے چہروں کا یہ بیان فرمایا کہ عاملہ ، ناصبہ ہونگے ، عاملہ کے لفظی معنے عمل اور محنت کرنے والے کے ہیں ۔ محاورات میں عامل اور عاملہ اُس شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو مسلسل عمل اور محنت سے تھکا ماندہ چُور ہو گیا ہو ۔۔ اور ناصبہ نصب سے مشتق ہے اس کے معنے بھی تھکنے اور تعب و مشقت میں پڑجانے کے ہیں ۔ کفار و مجرمین کے یہ دو حال کہ عمل اور محنت سے تھکے درماندہ ہونگے ظاہر یہ ہے کہ یہ حال اُن کی دُنیا کا ہے کیونکہ آخرت میں تو کوئی عمل اور محنت نہیں ، اسی لئے قرطبی وغیرہ مفسرین نے اسکا یہ مفہوم قرار دیا ہے کہ پہلا حال یعنی چہروں پر ذلت و رُسوائی یہ تو آخرت میں ہوگا اور عاملہ ۔ ناصبہ کے دونوں حال ان لوگوں کے دُنیا ہی میں ہوتے ہیں کیونکہ بہت سے کفار فجار مشرکانہ عبادت اور باطل طریقوں میں مجاہدہ و ریاضت دُنیا میں کرتے رہتے ہیں ۔ ہندوؤں کے جوگی ، نصاریٰ کے راہب بہت سے ایسے بھی ہیں جو اخلاص کے ساتھ اللہ تعالےٰ ہی کی رضاجوئی کے لئے دُنیا میں عبادت و ریاضت کرتے ہیں اور اسمیں محنت شاقہ برداشت کرتے ہیں مگر وہ عبادت مشرکانہ اور باطل طریقہ پر ہونیکی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی اجر و ثواب نہیں رکھتی تو ان لوگوں کے چہرے دُنیا میں بھی عاملہ ناصبہ رہے اور آخرت میں ان پر ذلت و رُسوائی کی سیاہی چھائی ہوگی

حضرت حسن بصری رحؒ نے روایت کیا ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضؓ جب ملک شام میں تشریف لے گئے تو ایک نصرانی راہب آپ کے پاس آیا جو بوڑھا تھا اور اپنے مذہب کی عبادت و ریاضت اور مجاہدہ و محنت میں لگا ہوا تھا ۔ محنت سے اسکا چہرہ بگڑا ہوا ، بدن خشک لباس خستہ و بدہیت تھا ، جب فاروق اعظم رضؓ نے اُس کو دیکھا تو آپ رو پڑے لوگوں نے رونے کا سبب پوچھا تو فاروق اعظم رضؓ نے فرمایا کہ مجھے اس

بوڑھے کے حال پر رحم آیا کہ اس بیچارے نے ایک مقصد کے لئے بڑی محنت و جانفشانی کی مگر وہ اس مقصد یعنی رضائے الٰہی کو نہیں پا سکا اور اس پر حضرت عمرؓ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝ (قرطبی)

نَارًا حَامِيَةً ۝ حامیہ کے لفظی معنے گرم کے ہیں اور آگ کا گرم ہونا اُس کا طبعی حال ہے پھر اسکی صفتِ خاصہ بیان کرنا یہ بتلانے کے لئے ہے کہ اس آگ کی گرمی دُنیا کی آگ کی طرح کسی وقت کم یا ختم ہونے والی نہیں بلکہ یہ حامیہ دائماً ہے۔

لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِنْ ضَرِيعٍ ، یعنی اہلِ جہنم کو کھانے کے لئے ضریع کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ ضریع دُنیا میں ایک خاص قسم کی خاردار گھاس ہے جو زمین پر پھیلتی ہے کوئی جانور اُس کے پاس نہیں جاتا بدبودار زہریلی کانٹوں والی ہے (کذا فسرہ عکرمہ و مجاہد - قرطبی)

جہنم میں گھاس درخت کیسے یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ گھاس درخت تو آگ سے جلجانے والی چیزیں ہیں جہنم میں یہ کیسے رہیں گی کیونکہ جس خالق و مالک نے اُن کو دُنیا میں پانی اور ہوا سے پالا ہے اسکو یہ بھی قدرت ہے کہ جہنم میں ان درختوں کی غذا آگ ہی بنا دے وہ اسی سے پھلیں پھُولیں۔

ایک شبہ کا جواب قرآن میں اہلِ جہنم کی غذا کے بارے میں مختلف چیزوں کا ذکر آیا ہے۔ یہاں ضریع اُنکی غذا بتلائی ہے۔ دوسری جگہ زقوم اور تیسری جگہ غسلین، تو اس آیت میں جو حصر کیساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اہلِ جہنم کو کوئی غذا بجز ضریع کے نہ دی جائے گی، یہ حصر بمقابلہ اُس غذا کے ہے جو کھانے کے لائق خوشگوار جزءِ بدن بننے والی ہو اور ضریع بطور مثال کے لایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہلِ جہنم کو کوئی کھانے کے لائق غذا نہیں ملے گی بلکہ ضریع جیسی تکلیف دہ مضر چیزیں دی جائیں گی اسلئے ضریع میں حصر مقصود نہیں بلکہ زقوم اور غسلین بھی ضریع میں شامل ہیں اور قرطبی نے فرمایا کہ ہو سکتا ہے کہ جہنم کے مختلف درکات طبقات میں اُنکی مختلف غذائیں ہوں۔ کہیں ضریع کہیں زقوم کہیں غسلین۔

لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعٍ ، آیتِ سابقہ میں جو اہلِ جہنم کی غذا ضریع بتلائی گئی ہے بعض کفارِ مکہ نے جب یہ آیت سُنی تو کہنے لگے کہ ہمارے اونٹ تو ضریع کھا کر خوب فربہ ہو جاتے ہیں اُن کے جواب میں فرمایا کہ جہنم کے ضریع کو دُنیا کے ضریع پر قیاس نہ کرو۔ وہاں کے ضریع سے نہ فربہی پیدا ہوگی اور نہ بھوک سے نجات ملے گی۔

لَا تَسْمَعُ فِيهَا لَاغِيَةً ، یعنی جنّت میں کوئی ایسا کلام ایسی بات اہلِ جنّت کے کانمیں نہ پڑیگی جو لغو و بیہودہ اور دلخراش ہو۔ اسمیں کلماتِ کفریہ باطلہ بھی آگئے اور گالی گلوچ، افترا و بہتان الزام لگانا اور ایسے سب کلام آگئے جن کو سُنکر انسان کو ایذا پہنچتی ہے۔ دوسری جگہ قرآن کریم نے اسی کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَّلَا تَأْثِيمًا ، یعنی اہلِ جنت جنت میں کوئی لغو بات یا الزام

لگانے کی بات نہ سُنیں گے ۔ اسکے علاوہ بھی کئی جگہ یہ مضمون قرآن کریم میں مذکور ہے ۔

اس سے معلوم ہوا کہ الزام تراشی اور بے تُکی بے ڈھنگی باتیں بڑی ایذا کی چیز ہے اسی لئے قرآن کریم نے اہلِ جنت کے حالات میں اہتمام سے اس کو بیان فرمایا کہ اہلِ جنّت کے کانوں میں کبھی کوئی ایسا کلمہ نہیں پڑیگا جس سے اُن کا دل بُرا اور میلا ہو ۔

بعض آدابِ معاشرت

وَّ اَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ، اکواب، کُوب کی جمع ہے، پانی پینے کے برتن کو کہا جاتا ہے جیسے آبخورے، گلاس وغیرہ اس کی صفت میں لفظ موضوعہ یعنی اپنی مقررہ جگہ پر پانی کے قریب رکھے ہوئے ہونگے ۔ یہ فرما کر آدابِ معاشرت کے ایک اہم باب کی تلقین فرمائی گئی ہے کہ پانی پینے کے برتن پانی کے قریب مقررہ جگہ پر رہنے چاہئیں وہاں سے ادھر اُدھر ہو جائیں اور پانی پینے کے وقت تلاش کرنا پڑے یہ ایذا و تکلیف کی چیز ہے اسلئے ہر شخص کو اسکا اہتمام چاہیئے کہ ایسی استعمالی چیزیں جو سب گھر والوں کے کام میں آتی ہیں جیسے لوٹے، گلاس، تولیہ وغیرہ ان کی جگہ مقرر رہنی چاہیئے اور استعمال کرنے کے بعد اسکو وہیں رکھنا چاہیئے تاکہ دوسروں کو تکلیف نہ پہنچے ۔ یہ اشارہ لفظ موضوعہ سے اس لئے نکلا کہ حق تعالیٰ نے اہلِ جنت کی راحت و آسائش کے لئے اس کے ذکر کا اہتمام فرمایا کہ اُنکے پانی پینے کے برتن پانی کے قریب رکھے ہوئے ملیں گے ۔

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ، الآیۃ ۔ قیامت کے احوال اور اسمیں مومن و کافر کی جزا و سزا کا بیان فرمانے کے بعد ان جاہل معاندین کی ہدایت کی طرف توجہ فرمائی جو اپنی بے وقوفی سے قیامت کا انکار اس بنا پر کرتے ہیں کہ انھیں مرنے اور مٹی ہو جانے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا بہت بعید بلکہ محال نظر آتا ہے اُن کی ہدایت کے لئے حق جلّ شانہٗ نے اپنی قدرت کی چند نشانیوں میں غور کرنے کا ان آیتوں میں ارشاد فرمایا ہے اور اللہ کی قدرت کی نشانیاں تو آسمان و زمین میں بے شمار ہیں، یہاں اُن میں سے ایسی چار چیزوں کا ذکر فرمایا جو عرب کے بادیہ نشین لوگوں کے مناسب حال ہیں کہ وہ اونٹوں پر سوار ہو کر بڑے بڑے سفر طے کرتے ہیں اسوقت اُن کے سب سے زیادہ قریب اونٹ ہوتا ہے اوپر آسمان اور نیچے زمین اور دائیں بائیں اور آگے پیچھے پہاڑوں کا سلسلہ ہوتا ہے اِنھیں چاروں چیزوں میں ان کو غور کرنے کا حکم دیا گیا کہ دوسری آیاتِ قدرت کو بھی چھوڑو انھیں چار چیزوں میں غور کرو تو حق تعالیٰ کی ہر چیز پر قدرتِ کاملہ کا مشاہدہ ہو جائے گا ۔

اور جانوروں میں اونٹ کی کچھ ایسی خصوصیات بھی ہیں جو خاص طور سے غور کرنے والے کیلئے حق تعالیٰ کی حکمت و قدرت کا آئینہ بن سکتی ہیں ۔ اول تو عرب میں سب سے زیادہ بڑا جانور اپنے ڈیل ڈول کے اعتبار سے اونٹ ہی ہے، ہاتھی وہاں ہوتا نہیں دوسرے حق تعالیٰ نے اس عظیم الجثہ جانور کو ایسا بنا دیا ہے کہ عرب کے بدّو اور غریب مفلس آدمی بھی اس اتنے بڑے جانور کے پالنے رکھنے میں کوئی مشکل محسوس نہ کریں کیونکہ

اسکو چھوڑ دیجئے تو یہ اپنا پیٹ خود بھر لیگا اونچے درختوں کے پتے توڑنے کی زحمت بھی آپ کو نہیں کرنا پڑتی یہ خود درختوں کی شاخیں کھا کر گزارہ کرلیتا ہے، ہاتھی اور دوسرے جانوروں کی سی اس کی خوراک نہیں جو بڑی گراں پڑتی ہے۔ عرب کے جنگلوں میں پانی ایک بہت ہی کمیاب چیز ہے، ہر جگہ ہر وقت نہیں ملتا۔ قدرت نے اسکے پیٹ میں ایک ریزروٹنکی ایسی لگا دی ہے کہ سات آٹھ روز کا پانی پی کر یہ اُس ٹنکی میں محفوظ کرلیتا ہے، اور تدریجی رفتار سے وہ اس کی پانی کی ضرورت کو پورا کر دیتا ہے۔ اتنے اونچے جانور پر سوار ہونے کے لئے سیڑھی لگانا پڑتی مگر قدرت نے اسکے پاؤں کو تین تہ میں تقسیم کر دیا یعنی ہر پاؤں میں دو گھٹنے بنا دیئے کہ وہ طے کر کے بیٹھ جاتا ہے تو اُس پر چڑھنا اور اُترنا آسان ہو جاتا ہے۔ محنت کش اتنا ہے کہ سب جانوروں سے زیادہ بوجھ اُٹھا لیتا ہے۔ عرب کے میدانوں میں دن کا سفر دھوپ کی وجہ سے سخت مشکل ہے قدرت نے اس جانور کو رات بھر چلنے کا عادی بنا دیا ہے۔ مسکین طبع ایسا ہے کہ ایک لڑکی بچی اُس کی مُہار پکڑ کر جہاں چاہے لیجائے اس کے علاوہ اور بہت سی خصوصیات ہیں جو انسان کو حق تعالیٰ کی قدرت و حکمت بالغہ کا سبق دیتی ہیں۔ آخر سورت میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تسلّی کے لئے فرمایا کہ آپ کو ہم نے اس پر مسلط نہیں کیا کہ سب کو مؤمن ہی بنا دیں لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ بلکہ آپ کا کام تبلیغ کرنے اور نصیحت کرنے کا ہے وہ کر کے آپ بے فکر ہو جائیں، ان کا حساب کتاب اور جزا و سزا سب ہمارا کام ہے۔

تمت سورۃ الغاشیہ بحمد اللہ لیلۃ یوم الاثنین ۱۹ شعبان ۱۳۹۱ھ

سُوْرَةُ الْفَجْرِ

سُوْرَةُ الْفَجْرِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثُوْنَ اٰيَةً
سورۂ فجر مکہ میں نازل ہوئی اور اسکی تیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالْفَجْرِ ﴿۱﴾ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ﴿۲﴾ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ﴿۳﴾ وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ﴿۴﴾ هَلْ فِيْ
قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی اور جفت اور طاق کی اور اُس رات کی جب رات کو چلے ہے ان

ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ﴿۵﴾ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ﴿۶﴾ اِرَمَ ذَاتِ
چیزوں کی قسم پوری عقلمندوں کے واسطے تونے نہ دیکھا کیسا کیا تیرے رب نے عاد کے ساتھ وہ جو ارم میں تھے

الْعِمَادِ ﴿۷﴾ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ﴿۸﴾ وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا
بڑے ستونوں والے کہ بنی نہیں ویسی سارے شہروں میں اور ثمود کے ساتھ جنھوں نے تراشا

الصَّخْرَ بِالْوَادِ ﴿۹﴾ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ ﴿۱۰﴾ الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي
پتھروں کو وادی میں اور فرعون کے ساتھ وہ میخوں والا یہ سب تھے جنھوں نے سر اُٹھایا

الْبِلَادِ ﴿۱۱﴾ فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ﴿۱۲﴾ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ
ملکوں میں پھر بہت ڈالی ان میں خرابی پھر پھینکا اُن پر تیرے رب نے کوڑا

عَذَابٍ ﴿۱۳﴾ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿۱۴﴾ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ
عذاب کا بیشک تیرا رب لگا ہے گھات میں سو آدمی جو ہے جب جانچے اسکو رب

رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۵ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ﴿۱۵﴾ وَاَمَّآ اِذَا مَا
اسکا پھر اس کو عزت دے اور اسکو نعمت دے تو کہے میرے رب نے مجھ کو عزت دی اور وہ جسوقت اسکو

ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۵ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ﴿۱۶﴾ كَلَّا بَلْ
جانچے پھر کھینچ کرے اُس پر روزی کی تو کہے میرے رب نے مجھے ذلیل کیا کوئی نہیں پر تم

لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ﴿۱۷﴾ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿۱۸﴾ وَ
عزت سے نہیں رکھتے یتیم کو اور تاکید نہیں کرتے آپس میں محتاج کے کھلانے کی اور
تَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ﴿۱۹﴾ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿۲۰﴾ كَلَّآ
کھا جاتے ہو مُردے کا مال سمیٹ کر سارا اور پیار کرتے ہو مال کو جی بھر کر کوئی نہیں
اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿۲۱﴾ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿۲۲﴾
جب پست کر دی جائے زمین کوٹ کوٹ کر اور آئے تیرا رب اور فرشتے آئیں قطار قطار
وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ﴿۲۳﴾
اور لائی جائے اُس دن دوزخ اُس دن سوچے گا آدمی اور کہاں ملے اسکو سوچنا
يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ ﴿۲۴﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ ﴿۲۵﴾
کہے کیا اچھا ہوتا جو میں کچھ آگے بھیجدیتا اپنی زندگی میں پھر اُس دن عذاب نہ دے اس کا سا کوئی
وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ ﴿۲۶﴾ يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِيْٓ
اور نہ باندھ کر رکھے اسکا سا باندھنا کوئی اے وہ جی جس نے چین پکڑ لیا پھر چل
اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿۲۸﴾ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿۲۹﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿۳۰﴾
اپنے رب کیطرف تو اُس سے راضی وہ تجھ سے راضی، پھر شامل ہو میرے بندوں میں اور داخل ہو میری بہشت میں

ع ۱۴ ۱

خلاصۂ تفسیر

قسم ہے (فجر کے وقت) کی اور (ذی الحجہ کی) دس راتوں (یعنی دس تاریخوں) کی (کہ وہ نہایت فضیلت والی ہیں کذا فسر فی الحدیث) اور جفت کی اور طاق کی (جفت سے مراد دسویں تاریخ ذی الحجہ کی اور طاق سے نویں تاریخ، کذا فی الحدیث، اور ایک حدیث میں ہے کہ اس سے نماز مراد ہے کہ کسی کی طاق رکعتیں ہیں کسی کی جفت، اور پہلی حدیث کو روایۃً بھی اصح کہا گیا ہے، کذا فی الروح اور درایۃً بھی وہ ارجح ہے کیونکہ اس سورت میں جن چیزوں کی قسم کھائی گئی وہ سب زمانے اور اوقات کی قسم سے ہیں۔ درمیان میں شفع اور وتر بھی اوقات ہی کی قسم سے ہو تو تناسب واضح رہتا ہے۔ اور یہ تطبیق بھی ہو سکتی ہے کہ شفع و وتر سے مراد ہر وہ جفت اور طاق ہوں جو لائق تعظیم ہیں، اوقات و ایام بھی ہمیں داخل ہیں اور عدد رکعات نماز بھی) اور (قسم ہے) رات کی جب وہ چلنے لگے (یعنی گزرنے لگے، کقولہ تعالیٰ وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ۔ آگے بطور جملہ معترضہ کے تاکید کے لئے اس قسم کا عظیم ہونا بیان فرماتے ہیں کہ) کیا اس (قسم مذکور) میں عقلمند کے واسطے کافی قسم بھی ہے (یہ استفہام تقریر و تاکید کے لئے ہے یعنی ان مذکورہ قسموں میں ہر ہر قسم تاکیدِ کلام کے لئے کافی ہے اور گو سب قسمیں جو قرآن میں مذکور ہیں ایسی ہی ہیں مگر اہتمام کے لئے اسکے کافی ہونے کی تصریح فرما دی، کما مر فی قولہ تعالیٰ

فی سورۃ الواقعہ وَاِنَّہٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ ، اور جواب قسم مقدر ہے کہ منکروں کو ضرور سزا ہوگی کما فی الجلالین جس پر آئندہ کلام قرینہ ہے جس میں منکرین سابقین کی تعذیب کا ذکر ہے یعنی) کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے پروردگار نے قوم عاد یعنی قوم ارم کے ساتھ کیا معاملہ کیا جن کے قد و قامت ستون (وعمود) جیسے (دراز) تھے (اور) جن کی برابر (زور و قوت میں دُنیا بھر کے) شہروں میں کوئی شخص نہیں پیدا کیا گیا (اس قوم کے دو لقب ہیں، عاد اور ارم، کیونکہ عاد بیٹا ہے عاص کا اور وہ ارم کا اور وہ سام بن نوحؑ کا پس کبھی اُن کو باپ کے نام پر عاد کہتے ہیں اور کبھی دادا کے نام پر اِرَم کہتے ہیں اور اس اِرَم کا ایک بیٹا عابر ہے اور عابر کا بیٹا ثمود جس کے نام سے ایک قوم مشہور ہے پس عاد اور ثمود دونوں ارم میں جا ملتے ہیں۔ عاد بواسطہ عاص کے اور ثمود بواسطہ عابر کے اور یہاں اِرَم اس لئے بڑھا دیا کہ اس قوم عاد میں دو طبقے ہیں، ایک متقدمین جن کو عادِ اولیٰ کہتے ہیں دوسرے متاخرین جن کو عادِ اُخریٰ کہتے ہیں، پس ارم بڑھا دینے سے اشارہ ہو گیا کہ عاد اُولیٰ مراد ہے کیونکہ بوجہ قربِ قلت وسائط کے ارم کا اطلاق عاد اُولیٰ پر ہوتا ہے (کذا فی الروح وہذا التحقیق عندی قاض علی ما سبق فی الاعراف والنجم واللہ اعلم) اور (آگے عاد کے بعد دوسری ہلاک ہونے والی اُمتوں کا بیان فرماتے ہیں کہ آپ کو معلوم ہے کہ) قوم ثمود کے ساتھ (کیا معاملہ کیا) جو وادی القریٰ میں (پہاڑ کے) پتھروں کو تراشا کرتے تھے (اور مکانات بنایا کرتے تھے۔ وادی القُریٰ اُنکے شہروں میں سے ایک شہر کا نام ہے جیسا ایک کا نام حجر ہے اور یہ سب حجاز اور شام کے درمیان میں ہیں اور سب میں ثمود رہتے تھے کذا فی بعض التفاسیر) اور میخوں والے فرعون کے ساتھ (درمنثور میں ابن مسعود وسعید بن جبیر و مجاہد و حسن و سدی سے اس کی تفسیر میں منقول ہے کہ وہ جس کو سزا دیتا اسکے چاروں ہاتھ پاؤں چار میخوں سے باندھ کر سزا دیتا ، اور ایک تفسیر اس کی سورۂ صٓ میں گزر چکی ، آگے سب کی صفت مشترکہ فرماتے ہیں کہ) جنھوں نے شہروں میں سر اُٹھا رکھا تھا ، اور ان میں بہت فساد مچا رکھا تھا سو آپکے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا (یعنی عذاب نازل کیا پس عذاب کو کوڑے سے اور اسکے نازل کرنے کو برسانے سے تعبیر فرمایا، آگے اس عذاب کی علت اور موجودین کی عبرت کے لئے ارشاد ہے کہ) بیشک آپ کا رب نافرمانوں کی گھات میں ہے (جن میں سے مذکورین کو تو ہلاک کر دیا اور موجودین کو عذاب کرنے والا ہے) سو (اسکا مقتضا یہ تھا کہ کفار موجودین عبرت پکڑتے اور اعمالِ موجبہ للعذاب سے بچتے لیکن کافر) آدمی (کا یہ حال ہے کہ اعمال موجبہ للعذاب کو اختیار کرتا ہے جن سب کی اصل حبّ دُنیا ہے چنانچہ اس) کو جب اسکا پروردگار آزماتا ہے یعنی اس کو ظاہراً انعام اکرام دیتا ہے (مثل مال و جاہ وغیرہ جس سے مقصود اُس کی شکر گزاری کا دیکھنا ہوتا ہے اور اسی وجہ سے اسکو آزمانے سے تعبیر فرمایا) تو وہ (اسکو اپنا حق لازم سمجھ کر فخر و غرور سے) کہتا ہے کہ میرے رب نے میری قدر بڑھا دی (یعنی میں اسکا مقبول ہوں کہ مجھ کو ایسی ایسی نعمتیں دیں) اور جب اس کو (دوسری طرح) آزماتا ہے یعنی اس کی روزی اس پر تنگ کر دیتا ہے (جس سے مقصود اسکے صبر و رضا کا دیکھنا ہوتا ہے اور اسی وجہ سے اس کو آزمانے سے تعبیر

فرمایا) تو وہ شکایت کرتا ہے) کہتا ہے کہ میرے ربنے میری قدر گھٹا دی (یعنی مجھ کو باوجود استحقاق اکرام کے اپنی نظر سے آجکل گرا رکھا ہے کہ دُنیوی نعمتیں کم ہوگئیں، مطلب یہ کہ کافر دُنیا ہی کو مقصود بالذات سمجھتا ہے کہ اس کی فراخی کو دلیلِ مقبولیت اور اپنے کو اسکا مستحق اور تنگی کو دلیلِ مردودیت اور اپنے کو اسکا غیر مستحق سمجھتا ہے پس اسمیں دو غلطیاں ہیں، ایک دُنیا کو مقصود بالذات سمجھنا جس سے آخرت کا انکار اور اس سے اعراض پیدا ہوتا ہے اور دوسرے دعوائے استحقاق جس سے نعمت پر فخر و غرور اور ناشکری اور مصیبت پر شکوہ اور بے صبری پیدا ہوتی ہے اور یہ سب اعمال سببِ عذاب ہیں، آگے اس پر زجر و تنبیہ ہے کہ) ہرگز ایسا نہیں (یعنی نہ تو دُنیا مقصود بالذات ہے اور نہ اسکا ہونا نہ ہونا دلیلِ مقبولیت یا مخذولیت کی ہے اور نہ کوئی کسی اکرام کا مستحق ہے اور نہ کوئی صبر و شکر کے وجوب سے مستثنٰی ہے آگے بصیغۂ خطاب بطور التفات کے فرماتے ہیں کہ تم لوگو نہیں صرف یہی اعمال سببِ عذاب نہیں) بلکہ (تم میں اور اعمال بھی مذموم و نامرضی عند اللہ و موجبِ عذاب ہیں چنانچہ) تم لوگ یتیم کی (کچھ قدر) (اور خاطر) نہیں کرتے ہو (مطلب یہ کہ یتیم کی اہانت اور اس پر ظلم کرتے ہو کہ اسکا مال کھا جاتے ہو) اور دوسروں کو بھی مسکین کو کھانا دینے کی ترغیب نہیں دیتے (یعنی دوسروں کے حقوقِ واجبہ نہ خود ادا کرتے ہو اور نہ اَوروں کو حقوق واجبہ ادا کرنے کو کہتے ہو اور عملاً اسکے تارک اور اعتقاداً اسکے منکر ہو اور کافر کے لئے ترکِ واجب زیادتی عذاب کا سبب ہوتا ہے اور اعتقاد کا فساد یعنی کفر و شرک اصل عذاب کی بنیاد ہی) اور (تم) میراث کا مال سارا سمیٹ کر کھا جاتے ہو (یعنی دوسروں کا حق بھی کھا جاتے ہو اور میراث بتفصیل موجود گو مکہ مکرمہ میں مشروع نہ تھی مگر نفس میراث شرع ابراہیمی و اسماعیلی سے متوارث چلی آتی تھی چنانچہ جاہلیت میں بچّوں اور لڑکیوں کو میراث کا مستحق نہ سمجھنا اس کی دلیل ہے کہ میراث کا حکم پہلے سے بھی تھا جس کا بیان سورۂ نساء کے پہلے رکوع آیت لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ الخ کے تحت میں گزر چکا ہی) اور (تم لوگ) مال سے بہت ہی محبت رکھتے ہو (اور اعمالِ مذکورہ سب اسی کی فرع ہیں کیونکہ حُبِّ دُنیا سب خطیئات کی اصل ہے۔ غرض یہ سب اعمال قولیہ و فعلیہ و حالیہ موجبِ تعذیب ہیں۔ پس انسان کا یہ حال ہے کہ مضامین عبرت سُن کر بجائے اسکے کہ عبرت پکڑتا ایسے اعمال اختیار کرتا ہے جو اور زیادہ موجبِ عذاب ہیں اسلئے اللہ تعالیٰ ان کو عذاب دینے والا ہے کما قال تعالیٰ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ آگے اُن لوگوں پر زجر و تنبیہ ہے جو ان افعال کو سببِ عذاب نہیں سمجھتے) ہرگز ایسا نہیں (جیسا تم سمجھتے ہو کہ ان اعمال پر عذاب نہ ہوگا، ضرور ہوگا، آگے جزاء و سزا کا وقت بتلاتے ہیں جس میں ان کو عذاب اور اہلِ طاعت کو اجر و ثواب ملیگا پس ارشاد ہے کہ) جسوقت زمین (کے بلند اجزاء پہاڑ وغیرہ) کو توڑ توڑ کر (اور ریزہ ریزہ کرکے زمین کو برابر کر دیا جاویگا (کقولہ تعالیٰ لَا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا، سورہ طٰہٰ) اور آپ کا پروردگار اور جوق جوق فرشتے (میدانِ محشر میں) آویں گے (یہ حساب کے وقت ہوگا اور اللہ تعالیٰ کا آنا متشابہات میں سے ہے جس کی حقیقت کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا) اور اس روز جہنم کو لایا جاویگا (جیسا سورۂ مدثر میں وَمَا يَعْلَمُ

جُنُوْدَ رَبِّكَ کے متعلق بیان ہو چکا ہے) اس روز انسان کو سمجھ آوے گی اور اب سمجھ آنیکا موقع کہاں رہا (یعنی اب سمجھ آنے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے کیونکہ وہ دار الجزا ہے دار العمل نہیں۔ آگے سمجھ آنیکے بعد جو اسکا قول ہوگا اسکا بیان ہے کہ وہ) کہے گا کاش میں اس زندگی (اُخروی) کے لئے کوئی (نیک) عمل آگے بھیج لیتا پس اس روز نہ تو خدا کے عذاب کی برابر کوئی عذاب دینے والا نکلے گا اور نہ اسکے جکڑنے کے برابر کوئی جکڑنے والا نکلے گا (یعنی ایسی سخت سزا اور قید کریگا کہ دنیا میں کبھی کسی نے کسی کو نہ اتنی سخت سزا دی ہوگی نہ ایسی سخت قید کی ہوگی یہ سزا تو اُن لوگوں کی ہوگی جو اعمالِ عذاب کے مرتکب ہوئے، اور جو اللہ کے فرمانبردار تھے اُن کو ارشاد ہوگا کہ) اے اطمینان والی رُوح (یعنی جس کو امرِ حق میں یقین واذعان تھا اور کسی طرح کا شک و انکار نہ تھا اور تعبیر روح سے باعتبار جزءِ اشرف کے ہے) تو اپنے پروردگار (کے جوار رحمت) کی طرف چل اس طرح سے کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش، پھر (ادھر چل کر) تو میرے (خاص) بندوں میں شامل ہو جا (یہ بھی نعمتِ روحانی ہے کہ اُنس کے لئے احباب سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں) اور میری جنت میں داخل ہو جا (لفظ مطمئنہ میں ان لوگوں کے اعمالِ حسنہ کیطرف اشارہ ہوگیا اور اعمال حسنہ کیطرف اشارہ اور اعمال عذاب کی تفصیل بیان فرمانا شاید اس لئے ہے کہ زیادہ مقصود یہاں اہلِ مکہ کو سُنانا ہے اور اسوقت وہاں ایسے اعمال کے مرتکب زیادہ تھے)

معارف و مسائل

اس سورت میں پانچ چیزوں کی قسم کھا کر اُس مضمون کی تاکید کی گئی ہے جو آگے اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ میں بیان ہوا ہے یعنی اس دُنیا میں تم جو کچھ کر رہے ہو اُس پر جزاء و سزا ہونا لازمی اور یقینی ہے تمہارا رب تمہارے سب اعمال کی نگرانی میں ہے خواہ اسی جملے اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ کو جواب قسم کہا جائے یا محذوف قرار دیا جائے۔

وہ پانچ چیزیں جن کی قسم کھائی ہے اُن میں پہلی چیز فجر یعنی صبح صادق کا وقت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مراد ہر روز کی صبح ہو کہ وہ عالم میں ایک انقلاب عظیم لاتی ہے اور حق تعالیٰ شانہٗ کی قدرتِ کاملہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ الفجر کے الف لام کو عہد کا قرار دیکر اس سے کسی خاص دن کی فجر مراد ہو مفسرین صحابہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ حضرت ابن عباسؓ ابن زبیرؓ سے پہلے معنے یعنی عام وقت فجر کسی روز کا ہو منقول ہے اور حضرت ابن عباس رضؓ کی ایک روایت میں اس سے مراد ماہِ محرم کی پہلی تاریخ کی فجر ہے جو اسلامی قمری سال کا آغاز ہے۔ حضرت قتادہ نے بھی یہی تفسیر کی ہے۔

اور بعض حضرات مفسرین نے ذی الحجہ کی دسویں تاریخ یعنی یوم النحر کی صبح اس کی مراد قرار دی ہے۔ مجاہد و عکرمہ کا یہی قول ہے اور حضرت ابن عباس رضؓ سے بھی ایک روایت میں یہ قول منقول ہے وجہ اس یوم النحر کی تخصیص کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر دن کے لئے ایک رات ساتھ لگائی ہے جو اسلامی اصول کے مطابق دن سے پہلے ہوتی ہے صرف یوم النحر ایسا دن ہے کہ اسکے ساتھ کوئی رات نہیں کیونکہ یوم النحر سے

پہلے جو رات ہے وہ یوم النحر کی نہیں بلکہ شرعاً عرفہ ہی کی رات قرار دی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی حج کرنے والا عرفہ کے دن میدان عرفات میں نہ پہنچ سکا رات کو صبح صادق سے پہلے کسی وقت بھی عرفات میں پہنچ گیا تو اسکا وقوف معتبر اور حج صحیح ہو جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ روز عرفہ کی دو راتیں ہیں ایک اس سے پہلے دوسری اسکے بعد اور یوم النحر کی کوئی رات نہیں، اس لحاظ سے صبح یوم النحر تمام ایام دُنیا میں ایک خاص شان رکھتی ہے (قرطبی)

دوسری چیز جس کی قسم ہے وہ لیالِ عشر یعنی دس راتیں، حضرت ابن عباسؓ، قتادہ، مجاہد سُدّی، ضحاک، کلبی، ائمہ تفسیر کے نزدیک ذی الحجہ کی ابتدائی دس راتیں مراد ہیں کیونکہ حدیث میں ان کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عبادت کرنے کے لئے اللہ کے نزدیک سب دنوں میں عشرۂ ذی الحجہ سب سے افضل ہے اسکے ہر دن کا روزہ ایک سال کے روزوں کی برابر اور اسمیں ہر رات کی عبادت شبِ قدر کی برابر ہے (رواہ الترمذی وابن ماجہ بسند ضعیف عن ابی ہریرۃؓ مظہری) اور ابو الزبیر نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ خود رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ کی تفسیر میں فرمایا کہ اس سے مراد عشرۂ ذی الحجہ ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ دس راتیں وہی ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں آئی ہیں وَاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ۔ کیونکہ یہی دس راتیں سال کے ایام میں افضل ہیں۔ امام قرطبی نے فرمایا کہ حضرت جابرؓ کی حدیث مذکور سے افضل ایام ہونا عشرہ ذی الحجہ کا معلوم ہوا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے لئے بھی یہی دس راتیں ذی الحجہ کی مقرر کیگئی تھیں

وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ، شفع کے لغوی معنے جوڑ کے ہیں جس کو اُردو میں جُفت کہتے ہیں اور وَتر کے معنے طاق اور فرد کے ہیں۔ قرآن کریم کے الفاظ میں یہ متعین نہیں کہ اس جفت اور طاق سے کیا مراد ہے اسلئے ائمہ تفسیر کے اقوال اسمیں بے شمار ہیں مگر خود حدیث مرفوع جو ابو الزبیر نے حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے اسکے الفاظ یہ ہیں

(وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ) ھو الصّبح وعشر النحر والوتر یوم عرفۃ والشفع یوم النّحر	رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے والفجر ولیالِ عشر کے متعلق فرمایا کہ فجر سے مراد صبح اور عشر سے مراد عشرہ نحر ہے (اور یہ عشرہ ذی الحجہ کا پہلا ہی عشرہ ہو سکتا ہے جسمیں یوم نحر شامل ہے) اور فرمایا کہ وتر سے مراد روز عرفہ اور شفع سے مراد یوم النحر (دسویں ذی الحجہ) ہے

قرطبی نے اس روایت کو نقل کر کے فرمایا کہ یہ اسناد کے اعتبار سے اصح ہے بہ نسبت دوسری حدیث کے جو حضرت عمران بن حصینؓ کی روایت سے نقل ہوئی ہے جس میں شفع و وتر نماز کا ذکر ہے۔ اسی لئے حضرت ابن عباسؓ، عکرمہؒ، نحاسؒ نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ شفع سے مراد یوم النحر اور وتر سے مراد یوم عرفہ ہے۔ اور بعض ائمہ تفسیر ابن سیرین، مسروق، ابو صالح، قتادہ نے فرمایا کہ شفع سے مراد تمام مخلوقات ہیں

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سب مخلوقات کو جوڑ جوڑ جفت پیدا کیا ہے اور ارشاد فرمایا ہے وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ، یعنی ہم نے ہر چیز کا جوڑا پیدا کیا ہے۔ کفر و ایمان، شقاوت و سعادت، نور و ظلمت، لیل و نہار، سردی گرمی، آسمان و زمین، جن و انس، مرد و عورت، اور ان سب کے بالمقابل وتر وہ صرف اللہ جل شانہٗ کی ذات ہے ھو اللہ الاحد الصمد، وَالَّيْلِ إِذَا يَسْرِ، یسر سریٰ سے مشتق ہے جس کے معنے رات کو چلنے کے ہیں۔ یہاں خود رات کو کہا گیا کہ جب وہ چلنے لگے یعنی ختم ہونے لگے۔ یہ پانچ قسمیں ذکر فرمانے کے بعد حق تعالیٰ نے غفلت شعار انسان کو ایک خاص انداز میں سوچنے سمجھنے کی دعوت دینے کے لئے فرمایا هَلْ فِي ذَٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِي حِجْرٍ، حجر کے لفظی معنے روکنے کے ہیں انسان کی عقل اُس کو برائی اور مضرت رساں چیزوں سے روکنے والی ہے اسلئے حجر بمعنے عقل بھی استعمال ہوتا ہے یہاں یہی معنے مراد ہیں۔ معنے آیت کے یہ ہیں کہ کیا عقل والے آدمی کے لئے یہ قسمیں بھی کافی ہیں یا نہیں۔ یہ صورت تو استفہام کی ہے مگر درحقیقت انسان کو غفلت سے بیدار کرنے کی ایک تدبیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمتِ شان پر اور اسکے قسم کھا کر ایک بات کو بیان کرنے پر اور خود ان چیزوں کی عظمت پر جن کی قسم کھائی گئی ہے ذرا سا غور کرو تو جس چیز کے لئے یہ قسم کھائی گئی اسکا یقینی ہونا ثابت ہو جائے گا اور وہ چیز یہی ہے کہ انسان کے ہر عمل کا آخرت میں حساب ہونا اور اُس پر جزا و سزا ہونا شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ یہ جواب قسم اگرچہ صراحۃً مذکور نہیں مگر سباقِ کلام سے ثابت ہے اور آگے جو کفار پر عذاب آنیکا بیان ہو رہا ہے وہ بھی اسی کا بیان ہے کہ کفر و معصیت کی سزا آخرت میں تو ملنا طے شدہ ہی ہے کبھی کبھی دُنیا میں بھی ایسے لوگوں پر عذاب بھیجدیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں تین قوموں کے عذاب کا ذکر فرمایا۔ اوّل قوم عاد، دوسرے ثمود، تیسرے قوم فرعون۔ عاد و ثمود دو قومیں جنکا سلسلۂ نسب اوپر جاکر اِرَم میں ملجاتا ہے اس طرح لفظ ارم عاد و ثمود دونوں کے لئے بولا جاسکتا ہے۔ یہاں صرف عاد کے ساتھ اِرَم کا ذکر کرنے کی وجہ خلاصہ تفسیر میں عاد و ثمود کے دونوں قوموں کے تحقیقی حالات کے ساتھ گزر چکی ہے۔

إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ، لفظ اِرَم عاد کا عطف بیان یا بدل ہے اور مقصود اس سے قبیلہ عاد کی دو قسموں میں سے ایک کی تعیین ہے یعنی عادِ اولیٰ جو انکے متقدمین ہیں ان کو عاد ارم کے لفظ سے اسلئے تعبیر کیا کہ یہ لوگ اپنے جدِ اعلیٰ اِرَم سے بہ نسبت عادِ اُخریٰ کے قریب تر ہیں۔ ان کو اس جگہ قرآن کریم عاد ارم کے لفظ سے اور سورۂ نجم میں أَهْلَكَ عَادًا الْأُولَىٰ کے عنوان سے تعبیر فرماتا ہے۔ ان کی صفت میں قرآن کریم نے ذَاتِ الْعِمَادِ فرمایا۔ عماد اور عمود ستون کو کہتے ہیں۔ قوم عاد کو ذات العماد اسلئے کہا گیا کہ انکے قد و قامت بڑے طویل تھے اور یہ قوم اپنے ڈیل ڈول اور قوت و طاقت میں سب دوسری قوموں سے ممتاز تھی ان کے اس امتیاز کو خود قرآن کریم نے بڑے واضح الفاظ میں فرمایا لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ، یعنی ایسی طویل القامت قوی قوم دُنیا میں اس سے پہلے پیدا نہیں کی گئی تھی۔ قرآن کریم نے انکے طولِ قامت اور ڈیل ڈول کا دُنیا کی ساری قوموں سے زیادہ ہونا تو واضح فرمادیا مگر ان کی کوئی پیمائش ذکر کرنا ضرورت سے زائد کام تھا اسکو چھوڑ دیا۔ اسرائیلی روایات میں انکے قد و قامت اور قوت کے

متعلق عجیب عجیب اقوال مذکور ہیں حضرت ابن عباسؓ اور مقاتل سے اُن کی قامت کا طول بارہ ہاتھ یعنی چھ گز یا ۱۸ فٹ منقول ہے اور ظاہر یہ ہے کہ اُن کا یہ قول بھی اسرائیلی روایات ہی سے ماخوذ ہے۔ واللہ اعلم

اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اِرَم اُس جنت کا نام ہے جو عاد کے بیٹے شداد نے بنائی تھی اور اُسی کی صفت ذات العماد ہے کہ وہ ایک عظیم الشان عمارت بہت سے عمودوں پر قائم ہونے چاندی اور جواہرات سے تعمیر کی تھی تاکہ لوگ آخرت کی جنت کے بدلے اس نقد جنت کو اختیار کرلیں مگر جب یہ عالیشان محلات تیار ہوگئے اور شداد نے اپنے رؤسائے مملکت کیساتھ اسمیں جانیکا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا یہ سب ہلاک ہوگئے اور وہ محلات بھی مسمار ہوگئے (قرطبی) اس اعتبار سے اس آیت میں قوم عاد کے ایک خاص عذاب کا ذکر ہوا جو ..... شداد بن عاد اور اس کی بنائی ہوئی جنت پر نازل ہوا اور پہلی تفسیر جس کو جمہور مفسرین نے اختیار کیا ہے اسمیں قوم عاد پر جتنے عذاب آئے ہیں ان سب کا بیان ہے۔

وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ، اوتاد، وَتَد کی جمع ہے میخ کو کہتے ہیں۔ فرعون کو ذی الاوتاد کہنے کی مختلف وجوہ حضرات مفسرین نے بیان فرمائی ہیں مشہور جمہور مفسرین کے نزدیک وہی ہے جو خلاصہ تفسیر میں اُوپر آچکی ہے کہ اس لفظ میں اُسکے ظلم و جور اور وحشیانہ سزاؤں کا ذکر ہے وہ جس پر خفا ہوتا اس کے ہاتھ پاؤں چار میخوں میں باندھ کر یا خود انمیں میخیں گاڑ کر اس کو دھوپ میں لٹا دیتا اور اس پر سانپ بچھو چھوڑ دیتا تھا۔ اور بعض مفسرین نے اس کی اپنی بیوی حضرت آسیہ کے متعلق ایک طویل قصہ انکے مومن ہونے اور پھر فرعون کے سامنے اظہار ایمان کرنیکا اور پھر فرعون کی اسی قسم کی سزا کے ذریعہ ہلاک کرنیکا ذکر کیا ہے (مظہری)

فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ، قوم عاد و ثمود اور قوم فرعون کے شر و فساد کا تذکرہ فرماتے ہوئے جو عذاب اُن پر نازل ہوا اُس کو عذاب کا کوڑا برسانے کے عنوان سے تعبیر کیا ہے اسمیں اشارہ اسطرف ہے کہ جس طرح کوڑا مختلف اطراف بدن پر پڑتا ہے ان پر بھی مختلف قسم کے عذاب نازل کئے گئے۔

إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ، مِرصاد اور مَرصَد رصدگاہ اور انتظار گاہ کو کہا جاتا ہے جو کسی مقام بلند پر ہو جہاں بیٹھ کر کوئی شخص دُور دُور تک کے لوگوں کو دیکھ سکے اور انکے افعال و اعمال کی نگرانی کرسکے۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ ہر انسان کے تمام اعمال اور حرکات و سکنات کو دیکھ رہا ہے اور سب کو اُن کی جزا و سزا دینے والا ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ جملہ ہی ان قسموں کا جواب ہے جو وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ میں مذکور ہوئی ہیں۔

دنیا میں رزق کی فراخی اور تنگی اللہ کے نزدیک مقبول یا مردود ہونے کی علامت نہیں

فَأَمَّا الْإِنسَانُ الآیۃ، یہاں انسان سے مراد اصل میں تو کافر انسان ہے جو اللہ تعالیٰ کے متعلق جو چاہے خیال باندھ لے مگر مفہوم عام کے اعتبار سے وہ مسلمان بھی اس خطاب میں شریک ہے جو اس جیسے خیال میں مبتلا ہو اور وہ خیال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو اپنے رزق میں وسعت اور مال و دولت صحت و تندرستی سے نوازے تو شیطان اسکو دو باطل خیالات میں مبتلا کرتا ہے اوّل یہ کہ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ میری ذاتی صلاحیت اور عقل و فہم اور سعی و عمل کا لازمی نتیجہ ہے جو

مجھے ملنا ہی چاہیئے میں اسکا مستحق ہوں دوسرے یہ کہ ان چیزوں کے حاصل ہونے سے یہ قرار دے کہ میں اللہ کے نزدیک بھی مقبول ہوں اگر مردود ہوتا تو وہ مجھے یہ نعمتیں کیوں دیتا۔ اسی طرح جب کسی انسان پر رزق میں تنگی اور فقر و فاقہ آوے تو اسکو اللہ کے نزدیک مردود ہونے کی دلیل سمجھے اور اُس پر اسلئے خفا ہو کہ میں تو مستحق انعام واکرام کا تھا مجھے بے وجہ ذلیل و حقیر کر دیا، ایسے خیالات کفار و مشرکین میں تو ہوتے ہی تھے اور قرآن کریم میں کئی جگہ کفّار کے ان خیالات کا اظہار مذکور بھی ہے افسوس ہے کہ آجکل بہت سے مسلمان بھی اس گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے ان آیات میں ایسے انسانوں کا حال ذکر کر کے فرمایا کَلَّا یعنی تمھارا یہ خیال بالکل باطل بے بنیاد ہے نہ دنیا میں وسعت رزق نیک اور مقبول عنداللہ ہونے کی علامت ہے اور نہ تنگیٔ رزق اور فقر و فاقہ اللہ کے نزدیک مردود یا ذلیل ہونے کی علامت ہے بلکہ اکثر معاملہ برعکس ہوتا ہے۔ فرعون کو دعوائے خدائی کے ساتھ کبھی درد سر بھی نہ ہوا اور بعض پیغمبروں کو دشمنوں نے آرے سے چیر کر دو ٹکڑے کر دیئے اور رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرات مہاجرین میں سے جو فقیر و مفلس تھے وہ اغنیاء مہاجرینؓ سے چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہونگے (رواہ مسلم عن عبد اللہ بن عمرو، مظہری) اور ایک حدیث میں ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جس بندہ سے محبت فرماتے ہیں اسکو دُنیا سے ایسا پرہیز کراتے ہیں جیسے تم لوگ اپنے بیمار کو پانی سے پرہیز کراتے ہو (رواہ احمد والترمذی عن قتادۃ بن النعمان۔ مظہری)

یتیم پر صرف خرچ کرنا کافی نہیں اُس کا احترام بھی ضروری ہے

اس کے بعد کفار کو ان کی چند بُری خصلتوں پر تنبیہ ہے اوّل لَا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ یعنی تم یتیم بچے کا اکرام نہیں کرتے اسمیں اصل بتلانا تو یہ ہے کہ یتیم کے حقوق ادا نہیں کرتے اس پر ضروری خرچ نہیں کرتے لیکن اس کی تعبیر اکرام کے عنوان سے کی گئی جس میں اشارہ ہے کہ عقل وانسانیت کا اور اللہ نے جو مال تمھیں دیا ہے اسکے شکر کا تقاضا تو یہ ہے کہ تم یتیم کو فقط یہی نہیں کہ اسکا حق دو اور اس پر خرچ کرو بلکہ واجب ہے کہ اسکا اکرام بھی کرو اپنے بچّوں کے مقابلے میں اُس کو ذلیل و حقیر نہ جانو۔ یہ بظاہر کفار کے اس قول کا جواب ہے کہ دُنیا کی فراخی کو اکرام اور تنگی کو اہانت سمجھا کرتے تھے اس پر حرف بَلْ کے ساتھ یہ ذکر فرمایا کہ اگر تمھیں کبھی تنگی رزق پیش آتی ہے تو وہ اسوجہ سے کہ تم ایسی بُری عادتوں میں پھنسے ہوئے ہو کہ یتیم جیسے قابل رحم بچّوں کے حقوق بھی ادا نہیں کرتے۔ دوسری بُری خصلت اُن کی یہ بتلائی وَلَا تَحٰٓضُّونَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِينِ یعنی تم خود تو کسی مسکین غریب کو کیا دیتے دوسروں کو بھی اسکی ترغیب نہیں دیتے کہ وہ بھی یہ کام کریں۔ اس عنوان میں بھی ان کفار کی بُری عادت اور مذمّت کے بیان کیساتھ اسطرف اشارہ ہے کہ غرباء و مساکین کا حق جیسے اغنیاء اور مالداروں پر ہے کہ اُن کو اپنے پاس سے دیں اسیطرح جو لوگ خود دینے کی قدرت نہیں رکھتے انکو بھی اتنا تو کرنا چاہیئے کہ دوسروں ہی کو اسکے لئے ترغیب دیں۔

تیسری بُری خصلت یہ بیان فرمائی وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا، لَمّ کے معنے جمع کر لینے ہیں، مطلب یہ ہے کہ تم میراث کا مال حلال و حرام سب کو جمع کر کے کھا جاتے ہو اپنے حصّے کے ساتھ دوسروں کا حصّہ

بھی غصب کر لیتے ہو۔ یہاں خصوصیت سے میراث کے مال کا ذکر کیا گیا حالانکہ ہر ایک مال جسمیں حلال وحرام کو جمع کیا گیا ہو ناجائز ہی ہے۔ وجہ خصوصیت کی شاید یہ ہو کہ میراث کے مال پر زیادہ نظر رکھنا اور اُسکے درپے ہونا بڑی کم ہمتی اور کم حوصلہ ہونے کی دلیل ہے کہ مردارخور جانوروں کی طرح تکتے رہیں کہ کب ہمارا مورث مرے اور کب ہمیں یہ مال تقسیم کرنیکا موقع ہاتھ آئے۔ اولوالعزم اور باہمت لوگ اپنی کمائی پر خوش ہوتے ہیں۔ مُردوں کے مال پر ایسی حریصانہ نظر نہیں ڈالتے۔

چوتھی بُری خصلت یہ بتلائی وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ، جمّ کے معنے کثیر کے ہیں مطلب یہ ہے کہ تم مال کی محبت بہت کرتے ہو، بہت کے لفظ سے اسطرف اشارہ ہوگیا کہ مال کی ایک درجہ میں محبت تو انسان کا فطری تقاضا ہے وہ سبب مذمت نہیں بلکہ اس کی محبت میں حد سے بڑھنا اور انہماک کرنا یہ سبب مذمت ہے۔ کفار کی ان بُری خصلتوں کے بیان کے بعد پھر اصل مضمون کیطرف عود کیا گیا جو شروع سورت میں پانچ قسموں کیساتھ مؤکد کیا گیا ہے یعنی آخرت کی جزاوسزا۔ اس سلسلہ میں اوّل قیامت کے آنیکا ذکر فرمایا۔

اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ، لفظ دکّ کے لفظی معنے کسی چیز کو ضرب مار کر توڑنے کے ہیں مراد قیامت کا زلزلہ ہے جو پہاڑوں کو باہم ٹکرا کر ریزہ ریزہ کر دیگا اور دَكًّا دَكًّا کو مکرر لانیسے اسطرف اشارہ ہے کہ قیامت کا زلزلہ یکے بعد دیگر مسلسل رہے گا۔

وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ، یعنی آئے گا آپ کا رب اور فرشتے صف بصف مراد میدان حشر میں آنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے آنے کی کیا شان ہوگی اس کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، یہ متشابہات میں سے ہے اور فرشتوں کا صف بصف آنا ظاہر ہے وَجِایْٓءَ یَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ ، یعنی لایا جائیگا اس روز جہنم کو۔ جہنم کو لائے جانے کا کیا مطلب ہے اور کس طرح میدانِ حشر میں لائی جائے گی اس کی حقیقت تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے ظاہر یہ ہے کہ جہنم جو اب ساتویں زمین کی تہ میں ہے اُسوقت وہ بھڑک اُٹھے گی اور سمندر سب آگ ہو کر اُس میں شامل ہو جائیں گے اس طرح جہنم عرصہ حشر میں سب کے سامنے آجائے گی۔

يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ، اس جگہ تذکّر سے مراد سمجھ میں آجانا ہے یعنی کافر کو اُس روز سمجھ آئے گی کہ مجھے دُنیا میں کیا کرنا چاہئے تھا اور میں نے کیا کیا مگر اسوقت یہ سمجھ میں آنا بے سود ہوگا کہ عمل اور اصلاحِ حال کا زمانہ گزر چکا آخرت دارالعمل نہیں دارالجزاء ہے آگے اس تذکّر کا بیان ہے کہ وہ تمنّا کریگا کہ کاش میں دُنیا میں کچھ نیک عمل کر لیتا۔ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ ، پھر اس تمنا کا باطل اور غیر مفید ہونا بتلایا کہ اب جبکہ کفر وشرک کی سزا سامنے آگئی اب اس تمنا سے کچھ فائدہ نہیں اب تو عذاب اور پکڑ کا وقت ہے اور اللہ تعالیٰ کی پکڑ کی برابر کوئی پکڑ نہیں ہوسکتی۔ کفار کے عذاب بیان کرنے کے بعد آخر میں مومن کا ثواب اور ان کا جنت میں داخل کیا جانا ذکر فرمایا ہے۔

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ، یہاں مومن کی رُوح کو نفس مطمئنہ کے لقب سے خطاب کیا گیا ہے۔ مطمئنہ

کے لفظی معنے ساکنہ کے ہیں۔ مراد وہ نفس ہے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اسکی اطاعت سے سکون و قرار پاتا ہے اسکے ترک سے بے چینی محسوس کرتا ہے اور یہ وہی نفس ہو سکتا ہے جو ریاضات و مجاہدات کر کے اپنی بُری عادات اور اخلاق رذیلہ کو دُور کر چکا ہو۔ اطاعت حق اور ذکر اللہ اسکا مزاج اور شریعت اسکی طبیعت بن جاتی ہے اس کو خطاب کر کے فرمایا گیا اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ یعنی لوٹ جاؤ اپنے رب کی طرف، لوٹنے کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکا پہلا مقام بھی رب کے پاس تھا اب وہیں واپس جانیکا حکم ہو رہا ہے، اس سے اُس روایت کی تقویت ہوتی ہے جسمیں یہ ہے کہ مومنین کی ارواح انکے اعمالناموں کے ساتھ علیین میں رہیں گی اور علیین ساتویں آسمان پر عرش رحمٰن کے سایہ میں کوئی مقام ہے کل ارواح انسان کا اصلی مستقر وہی ہے وہیں سے روح لاکر انسان کے جسم میں ڈالی جاتی ہے اور پھر موت کے بعد وہیں واپس جاتی ہے

رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً، یعنی یہ نفس اللہ تعالیٰ سے اسکے تکوینی اور تشریعی احکام پر راضی ہے اور اللہ تعالیٰ بھی اس سے راضی ہے کیونکہ بندہ کا اللہ تعالیٰ کے تقدیری احکام پر راضی ہونا ہی اس کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہے، اگر اللہ تعالیٰ اس سے راضی نہوتا تو اسکو رضا بالقضا کی توفیق ہی نہ ہوتی۔ یہ نفس اپنی موت کے وقت موت پر بھی راضی اور خوش ہوتا ہے حضرت عبادہ ابن صامت رضؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے من احب لقاء اللہ احب اللہ لقائہ ومن کرہ لقاء اللہ کرہ اللہ لقائہ، یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے ملنے کو پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اُس سے ملنے کو پسند کرتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اللہ بھی اُس سے ملنے کو ناپسند کرتا ہے یہ حدیث سُن کر حضرت صدیقہ عائشہ رضؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اللہ سے ملنا تو موت ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے، لیکن موت تو ہمیں یا کسی کو بھی پسند نہیں، آپؐ نے فرمایا یہ بات نہیں، حقیقت یہ ہے کہ مومن کو موت کے وقت فرشتوں کے ذریعہ اللہ کی رضا اور جنّت کی بشارت دیجاتی ہے جس کو سُن کر اسکو موت زیادہ محبوب ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کافر کو موت کے وقت عذاب اور سزا سامنے کر دی جاتی ہے اسلئے اسکو اُس وقت موت سے بڑھ کر کوئی چیز بُری اور مکروہ معلوم نہیں ہوتی (رواہ البخاری ومسلم مظہری) خلاصہ یہ ہے کہ موت کی محبت یا کراہت اسوقت کی معتبر نہیں بلکہ نزع روح کے وقت جو مرنے اور اللہ سے ملنے پر راضی ہے اللہ بھی اس سے راضی یہی مفہوم ہے راضیۃ مرضیۃ کا۔

فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ، نفس مطمئنہ کو مخاطب کر کے یہ حکم ہوگا کہ میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنّت میں داخل ہو جا۔ اسمیں پہلے اللہ کے صالح اور مخلص بندوں میں شامل ہونیکا حکم ہے پھر جنت میں داخل ہونیکا، اسمیں اشارہ پایا جاتا ہے کہ جنت میں داخل ہونا اس پر موقوف ہے کہ پہلے اللہ کے صالح مخلص بندوں کے زمرہ میں شامل ہو ان سب کے ساتھ ہی جنّت میں داخلہ ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو دُنیا میں صالحین کی صحبت و معیت اختیار کرتا ہے یہ علامت اس کی ہے کہ یہ بھی انکے ساتھ جنّت میں جائے گا اسی لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنی دُعا میں فرمایا وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ اور حضرت یوسف علیہ السلام نے دُعا میں فرمایا وَاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ، معلوم ہوا کہ صحبت صالحین وہ نعمت کبریٰ ہے

کہ انبیاء علیہم السلام بھی اس کی دعا سے مستغنی نہیں۔

وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ، اسمیں جنت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کر کے میری جنت فرمایا جو بڑا اعزاز واکرام ہے اور اسمیں اشارہ پایا جاتا ہے کہ جنّت میں صرف یہی نہیں کہ ہر طرح کی راحتیں جمع ہیں اور دائمی ہیں بلکہ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا مقام ہے۔

آیاتِ مذکورہ میں مؤمنین کی جزاء ثواب کو اس طرح ذکر کیا گیا کہ اُن کی ارواح کو حق تعالیٰ کیطرف سے بواسطہ ملائکہ اعزاز واکرام کے ساتھ خطاب کیا جائے گا جو ان آیات میں مذکور ہے۔ یہ خطاب کس وقت ہوگا اسمیں بعض ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ قیامت میں حساب کتاب کے بعد یہ خطاب ہوگا اور سباق آیات سے اسکی تائید ہوتی ہے کہ اوپر جو عذاب کفار کا بیان ہوا ہے وہ آخرت میں قیامت کے بعد ہی ہوگا اس سے ظاہر ہے کہ مؤمنین کا یہ خطاب بھی اسی وقت ہو۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ خطاب مؤمنین کو موت کے وقت دنیا ہی میں ہوتا ہے بہت سی صحیح احادیث اس پر شاہد ہیں۔ اسی لئے ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ ظاہر یہ ہے کہ دونوں وقتوں میں یہ خطاب ارواح مؤمنین کو ہوگا موت کے وقت بھی، پھر قیامت میں بھی۔

وہ احادیث جن سے اس خطاب کا بوقت موت ہونا معلوم ہوتا ہے ایک تو وہی حدیثِ عبادہ ابنِ صامتؓ ہے، جو اوپر گزر چکی ہے اور ایک طویل حدیث حضرت ابوہریرہؓ کی مسند احمد، نسائی، ابنِ ماجہ میں ہے جسمیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب مؤمن کی موت کا وقت آتا ہے تو رحمت کے فرشتے سفید ریشمی کپڑا سامنے کرکے اسکی روح کو خطاب کرتے ہیں اخرجی راضیۃ مرضیۃ الیٰ روح اللہ وریحانہ، یعنی اس بدن سے نکلو اس حالت میں کہ تم اللہ سے راضی ہو اور اللہ تم سے راضی، اور یہ نکلنا اللہ تعالیٰ کی رحمت اور جنت کی دائمی راحتوں کیطرف ہوگا۔ الحدیث، اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ میں نے ایک روز یہ آیت يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھی تو صدیق اکبرؓ جو مجلس میں موجود تھے کہنے لگے یا رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) یہ کتنا اچھا خطاب اور اکرام ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ سُن لو فرشتہ موت کے بعد آپ کو یہ خطاب کریگا (ابن کثیر)

چند واقعاتِ عجیبہ حضرت سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابنِ عباس رضؓ کا طائف میں انتقال ہوا، جنازہ تیار ہونے کے بعد ایک عجیب و غریب پرندہ جس کی مثال پہلے کبھی نہ دیکھی گئی تھی آیا اور جنازہ کی نعش میں داخل ہوگیا پھر کسی نے اُس کو نکلتے ہوئے نہیں دیکھا جس وقت نعش قبر میں رکھی جانے لگی تو قبر کے کنارے ایک غیبی آواز نے یہ آیت پڑھی يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ الخ سب نے تلاش کیا کون پڑھ رہا ہے کسی کو معلوم نہ ہوسکا (ابن کثیر)

اور امام حافظ طبرانی نے کتاب العجائب میں اپنی سند سے فتان بن رزین ابی ہاشم سے ان کا اپنا واقعہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ایک مرتبہ ہمیں بلاد رُوم میں قید کرلیا گیا اور وہاں کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا اس کافر بادشاہ نے ہمیں مجبور کیا کہ ہم اسکا دین اختیار کریں، اور جو اس سے انکار کریگا اُس کی گردن ماری جائے گی ہم چند آدمی تھے اُن میں سے تین آدمی جان کے خوف سے مرتد ہوگئے بادشاہ کا دین اختیار کرلیا۔ چوتھا آدمی پیش ہوا اُس نے کفر

کرنے اور اس کے دین کو اختیار کرنے سے انکار کیا، اس کی گردن کاٹ کر سر کو ایک قریبی نہر میں ڈالدیا گیا، اُس وقت تو وہ سر پانی کی تہ میں چلا گیا، اسکے بعد پانی کی سطح پر اُبھرا اور ان لوگوں کی طرف دیکھ کر انکے نام لیکر آواز دی کہ فلانے فلانے اور پھر کہا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ، اس کے بعد پھر پانی میں غوطہ لگا دیا۔ یہ عجیب واقعہ سب حاضرین نے دیکھا اور سُنا، اور وہاں کے نصاریٰ یہ دیکھ کر تقریباً سب مسلمان ہوگئے اور بادشاہ کا تخت ہل گیا، یہ تین آدمی جو مرتد ہوگئے تھے یہ سب پھر مسلمان ہوگئے اور پھر خلیفہ ابو جعفر منصور نے ہم سب کو اُن کی قید سے رہا کرایا (ابن کثیر)

الحمدللہ کہ تفسیر سورۂ والفجر آج ۲۱ر شعبان ۱۳۹۱ھ میں تمام ہوئی، جبکہ اس ناکارہ گنہگار کی عمر کا چھہترواں سال ختم اور ستترواں شروع ہو رہا ہے۔ یوں نصف صدی سے زیادہ حق تعالیٰ کی دی ہوئی مہلت کو غفلتوں گناہوں میں برباد کرنے پر حسرت و افسوس جتنا بھی ہو کم ہی ہے مگر قدم قدم پر حق تعالیٰ شانہ کے انعامات کی بارش اور اپنی کتاب کی اس ناچیز خدمت کو قریب الختم پہنچا دینے کا احسانِ عظیم عفو و کرم ہی کی اُمید دلا رہا ہے۔ یا من لا تضرہ الذنوب ولا تنقصہ المغفرۃ ھب لی ما لا ینقصک واغفرلی ما لا یضرک واجعلنی من الذین یقال لھم یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی

سُورَةُ البَلَد

سُورَةُ البَلَدِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ عِشْرُوْنَ اٰيَةً

سورۂ بلد مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی بیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ﴿۱﴾ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ﴿۲﴾ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ﴿۳﴾

قسم کھاتا ہوں میں اس شہر کی اور تجھ پر قید نہیں رہے گی اس شہر میں اور قسم ہے جنتے کی اور جو اُس نے جنا

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ﴿۴﴾ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ﴿۵﴾

تحقیق ہم نے بنایا آدمی کو محنت میں کیا خیال رکھتا ہے وہ کہ اس پر بس نہ چلے گا کسی کا

يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ﴿۶﴾ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗٓ اَحَدٌ ﴿۷﴾ اَلَمْ

کہتا ہے میں نے خرچ کر ڈالا مال ڈھیروں کیا خیال رکھتا ہے کہ دیکھا نہیں اس کو کسی نے بھلا ہم نے

نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ﴿۸﴾ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ﴿۹﴾ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ﴿۱۰﴾

نہیں دیں اس کو دو آنکھیں اور زبان اور دو ہونٹ اور دکھلا دیں اس کو دو گھاٹیاں

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴿۱۱﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ﴿۱۲﴾ فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿۱۳﴾ اَوْ

سو نہ دھمک سکا گھاٹی پر اور تو کیا سمجھا کیا ہے وہ گھاٹی چھڑانا گردن کا یا

اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ﴿۱۴﴾ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿۱۵﴾ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا

کھلانا بھوک کے دن میں یتیم کو جو قرابت والا ہے یا محتاج کو جو خاک میں

مَتْرَبَةٍ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا

رل رہا ہے پھر ہووے ایمان والوں میں جو تاکید کرتے ہیں آپس میں تحمل کی اور تاکید

بِالْمَرْحَمَةِ ﴿۱۷﴾ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴿۱۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا

کرتے ہیں رحم کھانے کی وہ لوگ ہیں بڑے نصیب والے اور جو منکر ہوئے ہماری آیتوں سے

هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ﴿١٩﴾ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ﴿٢٠﴾

وہ ہیں کمبختی والے انہی کو آگ میں موند دیا ہے

خلاصۂ تفسیر

میں قسم کھاتا ہوں اس شہر (مکہ) کی اور (جواب قسم سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ایک بشارت دی گئی کہ) آپ کو اس شہر میں لڑائی حلال ہونے والی ہے (چنانچہ فتح مکہ کے روز آپکے لئے قتال جائز کر دیا گیا تھا۔ احکام حرم باقی نہیں رہے تھے) اور قسم ہے باپ کی اور اولاد کی (ساری اولاد کے باپ آدم علیہ السلام ہیں پس آدم اور بنی آدم سب کی قسم ہوئی آگے جواب قسم ہے) کہ ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا ہے (چنانچہ عمر بھر کہیں مرض میں کہیں رنج میں کہیں فکر میں اکثر اوقات مبتلا رہتا ہے اور اسکا مقتضا یہ تھا کہ اسمیں عجز و درماندگی پیدا ہوتی اور اپنے کو بستہ حکم تقدیر سمجھ کر مطیع امر و تابع رضا ہوتا لیکن انسان کافر کی یہ حالت ہے کہ بالکل بھول میں پڑا ہے تو) کیا وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کسی کا بس نہ چلے گا (یعنی کیا اللہ کی قدرت سے اپنے کو خارج سمجھتا ہے جو اسقدر بھول میں پڑا ہے اور) کہتا ہے کہ میں نے اتنا وافر مال خرچ کر ڈالا (یعنی ایک تو شیخی بھگارتا ہے پھر عداوت رسول و مخالفت اسلام و معاصی میں خرچ کرنے کو ہنر سمجھتا ہے پھر جھوٹ بھی بولتا ہے کہ اس کو مال کثیر بتلاتا ہے) کیا وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس کو کسی نے دیکھا نہیں (یعنی اللہ تعالیٰ نے تو دیکھا ہے اور وہ جانتا ہے کہ معصیت میں خرچ کیا ہے پس اس پر سزا دیگا نیز مقدار بھی دیکھی ہے کہ اسقدر نہیں ہے جسقدر لوگوں کو یقین دلانا چاہتا ہے یہ حال مطلق کافر کا ہے کہ اس وقت آپ کے مخالفین کے یہی اقوال و احوال تھے، غرض یہ شخص نہ تو محن یعنی تکلیف و رنج سے متاثر ہوا اور نہ منن یعنی انعامات و احسانات سے جسکا آگے بیان ہے کہ) کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں اور زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے اور (پھر) ہم نے اس کو دونوں رستے (خیر و شر) کے بتلا دیئے (تاکہ طریق مضر سے بچے اور نافع پر چلے سو اسکا بھی مقتضا یہ تھا کہ احکام الٰہی کا تابع ہوتا مگر) سو وہ شخص (دین کی) گھاٹی میں سے ہو کر نہ نکلا (دین کے کاموں کو اس لئے گھاٹی کہا کہ نفس پر شاق ہے) اور آپ کو معلوم ہے کہ گھاٹی (سے) کیا (مراد) ہے وہ کسی (کی) گردن کا (غلامی سے) چھڑا دینا ہے یا کھانا کھلانا فاقہ کے دن میں کسی رشتہ دار یتیم کو یا کسی خاک نشین محتاج کو (یعنی ان احکام الٰہیہ کو بجالانا چاہئے تھا) پھر (سب سے بڑھ کر یہ کہ) ان لوگوں میں سے نہ ہوا جو ایمان لائے اور ایک دوسرے کو (ایمان کی) پابندی کی فہمائش کی اور ایک دوسرے کو ترحم (علی الخلق) کی (یعنی ترک ظلم کی) فہمائش کی (ایمان تو سب سے مقدم ہے پھر امر بالثبات علی الایمان اوروں سے افضل ہے، پھر لوگوں کی ایذا سے بچنا بقیہ سے اہم ہے پھر ان اعمال کا رتبہ ہے جو فَكُّ رَقَبَةٍ سے مَتْرَبَةٍ تک مذکور ہیں پس یہ ثُمَّ تفخیم رتبہ کے لئے ہے، مطلب یہ کہ جمیع اصول و فروع میں اطاعت کرنا چاہیئے تھا، آگے اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الخ کی جزا کا بیان ہے یعنی) یہی لوگ داہنے والے ہیں (جن کی تفصیل جزار سورۂ واقعہ میں ہے اور یہاں اسمیں مطلق اہل ایمان خواص و عوام

سب داخل ہیں) اور (آگے اُنکے مقابلین کا بیان ہے کہ) جو لوگ ہماری آیتوں کے منکر ہیں (خود اُصول ہی میں مخالف ہیں فروع کا تو کہنا کیا) وہ لوگ بائیں والے ہیں، ان پر آگ محیط ہوگی جس کو بند کر دیا جاویگا (یعنی دوزخیوں کو دوزخ میں بھر کر آگے سے دروازہ بند کر دیں گے کیونکہ خلود کی وجہ سے نکلنا تو ملے گا ہی نہیں)

معارف و مسائل

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ، حرف لا اس جگہ زائد ہے اور قسموں میں یہ حرف زائد لانا عرب کے محاورہ میں معروف ہے اور زیادہ اصح یہ ہے کہ یہ حرف لَا مخاطب کے باطل خیال کی تردید کے لئے شروع قسم میں لایا جاتا ہے جس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ جو تمنے خیال باندھ رکھا ہے وہ نہیں بلکہ ہم قسم کیساتھ کہتے ہیں کہ حقیقت وہ ہے جو ہم بیان کرتے ہیں۔ اور البلد سے مکہ مکرمہ مُراد ہے جیساکہ سورۂ والتین میں بھی شہر مکہ کی قسم کھائی ہے اور اسکے ساتھ اس کی صفت امین بھی بیان فرمائی۔

وَھٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ، شہر مکہ کی قسم کھانا اس شہر کی بہ نسبت دوسرے شہروں کے شرافت و افضلیت کو بتلانا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عدی رضؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے وقت شہر مکہ کو خطاب کرکے فرمایا کہ (خدا تعالیٰ کی قسم ہے کہ تو ساری زمین میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ بہتر اور محبوب ہے اور اگر مجھے یہاں سے نکلنے پر مجبور نہ کر دیا جاتا تو میں تیری زمین سے نہ نکلتا (رواہ الترمذی و ابن ماجہ۔ مظہری)

وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ لفظ حلّ میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ حلول سے مشتق ہو جس کے معنے کسی شئ کے اندر سمانے اور رہنے اور اُترنے کے آتے ہیں، اس اعتبار سے حلّ کے معنے اُترنے والے اور رہنے والے کے ہونگے۔ اور مراد آیت کی یہ ہوگی کہ شہر مکہ خود بھی محترم اور مقدس ہے خصوصاً جبکہ آپؐ بھی اس شہر میں رہتے ہیں تو مکین کی فضیلت سے بھی مکان کی فضیلت بڑھ جاتی ہے اسلئے شہر کی عظمت و حُرمت آپ کے اس میں مقیم ہونے سے دوہری ہوگئی۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ لفظ حلّ مصدر حلّت سے مشتق ہو جس کے معنی کسی چیز کے حلال ہونے کے ہیں، اس اعتبار سے لفظ حلّ کے دو معنے ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ آپ کو کفار مکہ نے حلال سمجھ رکھا ہے کہ آپ کے قتل کے درپے ہیں حالانکہ وہ خود بھی شہر مکہ میں کسی شکار کو بھی حلال نہیں سمجھتے مگر اُن کا ظلم و سرکشی اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ جس مقدس مقام پر کسی جانور کا قتل بھی جائز نہیں اور خود ان لوگوں کا بھی یہی عقیدہ ہے وہاں اُنھوں نے اللہ کے رسُول کا قتل و خون حلال سمجھ لیا ہے دوسرے معنے حلّ کے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ آپ کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ کے لئے حرم مکہ میں قتالِ کفار حلال ہونے والا ہے جیساکہ فتح مکہ میں ایک روز کے لئے آپ سے احکام حرم اُٹھالئے گئے تھے اور کفار کا قتل حلال کر دیا گیا تھا۔ خلاصہ تفسیر مذکور میں یہی تیسرے معنے لیکر تفسیر کی گئی۔ مظہری میں تینوں احتمال مذکور ہیں اور تینوں معنے کی گنجائش ہے وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ، والد سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں جو سب انسانوں کے باپ ہیں اور مَا وَلَدَ سے اُن کی اولاد مراد ہے جو ابتداء دُنیا سے قیامت تک ہوگی۔ اس طرح اس لفظ میں حضرت آدم اور تمام بنی آدم کی قسم ہوگئی۔ آگے جواب قسم مذکور ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ، کَبَد کے لفظی معنے محنت و مشقت کے ہیں۔ معنے یہ ہیں کہ انسان اپنی فطرت سے ایسا پیدا کیا گیا ہے کہ اوّل عمر سے آخر تک محنتوں اور مشقتوں میں رہتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ابتدائے حمل سے رحم مادر میں محبوس رہا پھر ولادت کے وقت کی محنت و مشقت برداشت کی، پھر ماں کا دودھ پینے پھر اُسکے چھوٹنے کی محنت پھر اپنے معاش اور ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کی مشقت پھر بڑھاپے کی تکلیفیں پھر موت پھر قبر پھر حشر اور اسمیں اللہ تعالیٰ کے سامنے اعمال کی جوابدہی پھر جزا و سزا، یہ سب دَور اُس پر محنتوں ہی کے آتے ہیں، اور یہ محنت و مشقت اگرچہ انسان کے ساتھ مخصوص نہیں سب جانور بھی اس میں شریک ہیں مگر اس حال کو انسان کے لئے بالخصوص اسلئے فرمایا کہ اوّل تو وہ سب جانوروں سے زیادہ شعور و ادراک رکھتا ہے اور محنت کی تکلیف بھی بقدرِ شعور زیادہ ہوتی ہے، دوسرے آخری اور سب سے بڑی محنت محشر میں دوبارہ زندہ ہو کر عمر بھر کے اعمال کا حساب دینا ہے وہ دوسرے جانوروں میں نہیں۔

بعض علماء نے فرمایا کہ کوئی مخلوق اتنی مشقتیں نہیں جھیلتی جتنی انسان برداشت کرتا ہے باوجودیکہ وہ جسم اور جثہ میں اکثر جانوروں کی نسبت ضعیف و کمزور ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ انسان کی دماغی قوت سب سے زیادہ ہے اسی لئے اُس کی تخصیص کی گئی۔ مکہ مکرمہ اور آدم و اولاد آدم علیہ السلام کی قسم کھا کر حق تعالیٰ نے اس حقیقت کو بیان فرمایا کہ انسان کو ہم نے شدت و محنت اور مشقت ہی میں اور اُسی کے لئے پیدا کیا ہے جو اس کی دلیل ہے کہ انسان خود بخود پیدا نہیں ہو گیا یا اسکو کسی دوسرے انسان نے جنم نہیں دیا بلکہ اسکا پیدا کرنے والا ایک قادر مختار ہے جس نے اپنی حکمت سے ہر مخلوق کو خاص خاص مزاج اور خاص اعمال و افعال کی استعداد دیکر پیدا کیا ہے اگر انسان کی تخلیق میں خود انسان کو کچھ دخل ہوتا تو وہ اپنے لئے یہ محنتیں مشقتیں کبھی تجویز نہ کرتا (قرطبی)

دُنیا میں مکمل راحت جس میں کوئی تکلیف نہ ہو کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی اسلئے انسان کو چاہیئے کہ مشقت کیلئے تیار رہے اس قسم اور جواب قسم میں انسان کو اس پر متنبہ کیا گیا ہے کہ تمھاری جو یہ خواہش ہے کہ دنیا میں ہمیشہ راحت ہی راحت ملے کسی تکلیف سے سابقہ نہ پڑے یہ خیال خام ہے جو کبھی حاصل نہیں ہوگا اسلئے ضروری ہے کہ ہر شخص کو دُنیا میں محنت و مشقت اور رنج و مصیبت پیش آئے، اور جب مشقت و کلفت پیش آنا ہی ہے تو عقلمند کا کام یہ ہے کہ یہ محنت و مشقت اُس چیز کیلئے کرے جو اسکو ہمیشہ کام آوے اور دائمی راحت کا سامان بنے اور وہ صرف ایمان اور طاعتِ حق میں منحصر ہے۔ آگے غافل اور آخرت کے منکر انسان کی چند جاہلانہ خصلتوں کا ذکر کر کے فرمایا اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗۤ اَحَدٌ یعنی کیا یہ بیوقوف یہ سمجھتا ہے کہ اُس کے اعمالِ بد کو کسی نے دیکھا نہیں اسکو جاننا چاہیئے کہ اسکا خالق اُس کے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے۔

آنکھ اور زبان کی تخلیق میں چند حکمتیں اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ، نجدین تثنیہ نجد کا ہے جس کے لفظی معنے اس راستہ کے ہیں جو اوپر بلندی کیطرف جاتا ہو مراد اس سے کھلا واضح راستہ ہے اور ان دو راستوں میں ایک خیر و فلاح کا دوسرا شر و ہلاکت کا راستہ ہے۔

سابقہ آیت میں انسان کی اس غفلت و جہالت پر تنبیہ تھی کہ وہ سمجھتا ہے کہ میرے اوپر اللہ تعالیٰ کو بھی

قدرت نہیں، اور یہ کہ اُس کے اعمال وافعال کو کوئی دیکھنے والا نہیں۔ اس آیت میں چند اُن نعمتوں کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے اُس کے وجود میں ایسی عطا فرمائی ہیں کہ خود اُن کی صنعت و حکمت ہی پر غور کرے تو حق تعالیٰ کی بے مثال حکمت و قدرت کا نظارہ انھیں چیزوں میں کرے، انمیں پہلے دو آنکھوں کا ذکر فرمایا کہ آنکھ کے نازک پردے نازک شرایین (رگیں) اُنمیں قدرتی روشنی، پھر آنکھ کی وضع وہیئت کہ یہ نازک ترین عضو ہے اسکی حفاظت کا کیا سامان خود اسکی خلقت میں کیا گیا کہ اسکے اوپر ایسے پردے ڈالدیئے جو خودکار مشین کی طرح جب کوئی مضر چیز سامنے سے آتی دکھائی دے خود بخود بغیر کسی اختیار کے بند ہو جاتے ہیں ان پردوں کے اوپر پلکوں کے بال کھڑے کر دیئے کہ گرد و غبار کو روک لیں، اسکے اوپر بھوؤں کے بال رکھے کہ اُوپر سے آنیوالی چیز براہ راست آنکھ میں نہ پہنچے، اس کو چہرے کے اندر اس طرح فٹ کیا گیا کہ اوپر سخت ہڈی ہے، نیچے رخسارہ کی سخت ہڈی ہے آدمی کہیں چہرے کے بل گر جائے یا اس کے چہرے پر کوئی چیز آپڑے تو اوپر نیچے کی ہڈیاں آنکھ کو بچالیں گی۔

دوسری چیز زبان ہے اس کی عجیب و غریب تخلیق اور دل کی باتوں کی ترجمانی جو اس پُراسرار اور خودکار مشین کے ذریعہ ہوتی ہے اسکے حیرت انگیز طریقۂ کار کو دیکھو کہ دل میں ایک مضمون آیا دماغ نے اُس پر غور کیا اُس کیلئے عنوان اور الفاظ تیار کیئے وہ الفاظ اس زبان کی مشین سے نکلنے لگے یہ اتنا بڑا کام کیسی سُرعت کیساتھ ہو رہا ہے کہ سُننے والے کو یہ احساس بھی نہیں ہو سکتا کہ ان الفاظ کے زبان پر آنے میں اسکے پیچھے کتنی مشینری نے کام کیا ہے تب یہ کلمات زبان پر آئے ہیں۔ زبان کیساتھ شفتین یعنی ہونٹوں کا ذکر اسلئے بھی فرمایا کہ زبان کے کام میں ہونٹ بڑے مددگار ہیں آواز و حروف کی ممتاز شکلیں وہی بناتے ہیں اور شاید اسلئے بھی کہ قدرت نے زبان کو ایسی سریع العمل مشین بنایا ہے کہ آدھے منٹ میں اس سے ایسا کلمہ بھی بولا جا سکتا ہے جو اس کو جہنم سے نکال کر جنت میں پہنچا دے جیسے کلمۂ ایمان یا دُنیا میں دشمن کی نظر میں بھی اس کو محبوب بنا دے جیسے پچھلے قصور کی معافی، اور اسی زبان سے اتنے ہی وقفہ میں ایسا کلمہ بھی بولا جا سکتا ہے جو اس کو جہنم میں پہنچا دے جیسے کلمۂ کفر یا دُنیا میں اسکے بڑے سے بڑے مہربان دوست کو اسکا دشمن بنا دے جیسے گالی گلوچ وغیرہ۔ جس طرح زبان کے منافع بیشمار ہیں اس کی ہلاکت آفرینی بھی اسی انداز کی ہے گویا یہ ایک تلوار ہے جو دشمن پر بھی چل سکتی ہے اور خود اپنا گلا بھی کاٹ سکتی ہے اسلئے حق تعالیٰ جل شانہٗ نے اس تلوار کو دو ہونٹوں کے غلاف میں مستور کر کے عطا فرمایا اور اس جگہ ہونٹوں کا ذکر کرنا اسطرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ جس مالک نے انسان کو زبان دی اُس نے اُس کو روکنے بند کرنے کے لئے ہونٹ بھی دیئے ہیں اسلئے اسکے استعمال میں سوچ سمجھ سے کام لے، بے موقع اسکو ہونٹوں کی میان سے نہ نکالے، تیسری چیز دو راستوں کی ہدایت ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو خیر و شر اور بھلے بُرے کے پہچان کے لئے ایک استعداد اور مادّہ خود اسکے وجود میں رکھ دیا ہے، جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا یعنی نفسِ انسانی کے اندر اللہ تعالیٰ نے فجور اور تقویٰ سے دونوں کے مادّے رکھدیئے ہیں تو اس طرح ایک ابتدائی ہدایت انسان کو خود اسکے ضمیر سے ملتی ہے پھر اس ہدایت کی تائید کے لئے انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں آتی ہیں جو انکو بالکل واضح کر دیتی ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جاہل

اور غافل انسان قدرتِ حق کے منکر ذرا اپنے ہی وجود کی چند نمایاں چیزوں میں غور کرے تو قدرت و حکمتِ حق کے کمال کا مشاہدہ ہو جائیگا۔ آنکھوں سے دیکھو پھر زبان سے اقرار کرو پھر دو راستوں میں سے خیر کے راستے کو اختیار کرو۔

آگے پھر اس کی غفلت شعاری اور بے فکری پر تنبیہ ہے کہ ان روشن دلائل سے اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا اور اسکے ذریعہ قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے اور حساب دینے کا یقین ہو جانا چاہیئے اس یقین کا مقتضایہ تھا کہ یہ خلقِ خدا کو نفع اور راحت پہنچاتا، اُن کی ایذاؤں سے بچتا اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا اور خود اپنی اصلاح کرتا اور دوسرے لوگوں کی اصلاح کی فکر کرتا تاکہ قیامت میں وہ اصحابِ یمین یعنی اہلِ جنت میں شامل ہو جائے مگر اس بدنصیب نے ایسا نہ کیا بلکہ کفر پر قائم رہا جسکا انجام جہنم کی آگ ہے۔ آخر سورت تک یہ مضمون بیان ہوا ہے اسمیں چند نیک اعمال کے اختیار نہ کرنے کو ایک خاص انداز سے بیان فرمایا ہے۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ، عقبہ پہاڑ کی بڑی چٹان کو بھی کہتے ہیں اور دو پہاڑوں کے درمیانی راستہ کو یعنی گھاٹی کو بھی، اور دشمن سے نجات حاصل کرنے میں یہ عقبہ انسان کی مدد کرتا ہے کہ پہاڑ کے اوپر چڑھ کر دشمن سے اپنے کو بچالے یا پھر گھاٹی میں داخل ہو کر یہاں سے نکلجائے۔ اس جگہ طاعات و عبادات کو ایک عقبہ سے تعبیر فرمایا ہے کہ جس طرح عقبہ دشمن سے نجات دلانیکا سبب ہوتا ہے اعمالِ صالحہ آخرت کے عذاب سے نجات کا ذریعہ بنتے ہیں پھر ان اعمالِ صالحہ میں پہلے فَكُّ رَقَبَةٍ فرمایا، یعنی کسی غلام کو آزاد کرنا کہ بہت بڑی عبادت اور ایک انسان کی زندگی کو بنا دینا ہے۔ دوسری چیز اَوْ اِطْعٰمٌ بیان فرمائی کہ بھوکے کو کھانا کھلانا بہت بڑا ثواب ہے اور کھانا کھلانا کسی کو بھی ہو ثواب سے خالی نہیں مگر بعض کو کھلانا بہت بڑا ثواب بن جاتا ہے اس لئے اُس بڑے ثواب کے حاصل کرنے کے لئے فرمایا یَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ، یعنی خصوصاً جب کھانا کسی ایسے یتیم کو کھلایا جائے جس کیساتھ تمھاری قرابت و رشتہ داری بھی ہے تو اسمیں دوہرا ثواب ہوگیا، ایک بھوکے کا پیٹ بھرنا دوسرے رشتہ دار کی صلہ رحمی اور اسکا حق ادا کرنا۔ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ، یعنی بالخصوص ایسے دن میں اس کو کھانا کھلانا جس میں وہ بھوکا ہو اور بھی زیادہ موجبِ ثواب ہے۔ اسی طرح یتیم رشتہ دار نہ ہو تو ایسا مسکین ہو جس کی مسکنت نے اُس کو خاک نشین بنا رکھا ہے مراد بہت زیادہ مفلس و محتاج ہے اور جس پر خرچ کیا جائے وہ جتنا زیادہ محتاج ہوگا اُتنا ہی خرچ کرنے والے کا ثواب بڑھے گا۔

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ اس آیت میں ایمان کے بعد مومن کا یہ فرض بتلایا گیا کہ وہ دوسرے مسلمان ایمان کا تقاضا ہے کہ انسان صرف اپنی نیکی پر اکتفا نہ کرے دوسروں کو بھی نیکی کی ہدایت کرتا رہے بھائیوں کو بھی صبر اور رحمت کی تلقین کرتا ہے۔ صبر سے مُراد نفس کو بُرائیوں سے روکنا اور بھلائیوں پر عمل کرنا ہے۔ اور مرحمت سے مراد دوسروں کے حال پر رحم کھانا، اُن کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھ کر اُن کی ایذا اور اُن پر ظلم سے بچنا، اس میں تقریباً دین کے سارے ہی احکام آگئے۔

تمّت سُورَۃ البلد بحمد اللہ ۲۳ شعبان سنہ ۱۳۹۱ھ

سُوْرَةُ الشَّمْسِ

سُوْرَةُ الشَّمْسِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ خَمْسَ عَشْرَةَ اٰيَةً

سورۂ شمس مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی پندرہ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ① وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ② وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ③ وَالَّيْلِ

قسم سورج کی اور اسکے دھوپ چڑھنے کی، اور چاند کی جب آئے سورج کے پیچھے، اور دن کی جب اُس کو روشن کرے اور رات کی جب

اِذَا يَغْشٰىهَا ④ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰىهَا ⑤ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا ⑥ وَنَفْسٍ

اس کو ڈھانک لیوے اور آسمان کی اور جیسا کہ اُس کو بنایا، اور زمین کی اور جیسا کہ اس کو بچھلایا اور جی کی

وَّمَا سَوّٰىهَا ⑦ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ⑧ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ⑨ وَ

اور جیسا کہ اس کو ٹھیک بنایا، پھر سمجھ دی اسکو ڈھٹائی کی اور بچکر چلنے کی تحقیق مراد کو پہنچا جس نے اُسکو سنوار لیا اور

قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ⑩ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ⑪ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ⑫

نامراد ہوا جس نے اسکو خاک میں ملا چھوڑا جھٹلایا ثمود نے اپنی شرارت سے جب اُٹھ کھڑا ہوا انمیں کا بڑا بدبخت

فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ⑬ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا

پھر کہا اُن کو اللہ کے رسول نے خبردار رہو اللہ کی اونٹنی سے اور اسکی پانی پینے کی باری سے، پھر انھوں نے جھٹلایا اسکو، پھر پاؤں کاٹ ڈالے

فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ⑭ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ⑮

اسکے، پھر اُلٹ مارا اُن پر ان کے رب نے بسبب اُن کے گناہوں کے پھر برابر کر دیا سب کو، اور وہ نہیں ڈرتا پیچھا کرنے سے

ع ۱۵
۱۶

خلاصۂ تفسیر

قسم ہے سورج کی اور اُس کی روشنی کی اور چاند کی جب سورج (کے غروب) سے پیچھے آوے (یعنی طلوع ہو مراد اس سے وسط ماہ کی بعض شبوں کا چاند ہے کہ سورج کے چھپنے کے بعد طلوع ہوتا ہے اور یہ قید شاید اس لئے ہو کہ وہ

وقت کمال نور کا ہوتا ہے جیسا کہ ضحاہا کا اشارہ ہے کمال نورِ آفتاب کیطرف اور یا اسوقت ذو آیۃ قدرت علی سبیل التعاقب والاتصال ظاہر ہوتی ہیں غروب شمس وطلوع قمر) اور (قسم ہے) دن کی جب وہ اس (سورج) کو خوب روشن کردے اور (قسم ہے) رات کی جب وہ اس (سورج) کو (اور اس کے آثار و انوار کو بالکلیہ) چھپالے (یعنی خوب رات ہو جاوے کہ دن کی روشنی کا کچھ اثر نہ رہے اور چاروں چیزیں جن کی قسم کھائی گئی ہے اُن میں جو قیدیں لگائی گئی ہیں وہ اُن کے کمال کے اعتبار سے ہیں، یعنی ہر ایک کی قسم ان کی حالتِ کمال کے اعتبار سے ہے) اور (قسم ہے) آسمان کی اور اس (ذات) کی جس نے اس کو بنایا (مراد اللہ تعالیٰ ہے اسی طرح ماطحاہا اور ماسوّاہا میں بھی اور مخلوق کی قسم کو خالق کی قسم پر مقدم فرمانا اس لئے ہو سکتا ہے کہ اسمیں ذہن کو دلیل سے مدلول کی طرف منتقل کرنا ہے کیونکہ مصنوع دلیل ہے صانع پر، تو اس میں استدلال علی التوحید کی طرف بھی اشارہ ہو گیا) اور (قسم ہے) زمین کی اور اس (ذات) کی جس نے اس کو بچھایا اور (قسم ہے) انسان کی جان کی اور اس (ذات) کی جس نے اس کو (ہر طرح صورت شکل اعضاء سے) درست بنایا پھر اس کی بدکرداری اور پرہیزگاری (دونوں باتوں) کا اس کو القا کیا (یہ اسناد باعتبار تخلیق کے ہے یعنی قلب میں جو نیکی کا رجحان ہوتا ہے یا جو بدی کی طرف میلان ہوتا ہے دونوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، گو القاء اول میں فرشتہ واسطہ ہوتا ہے اور ثانی میں شیطان پھر وہ رجحان و میلان کبھی مرتبۂ عزم تک پہنچ جاتا ہے جو کہ انسان کے قصد و اختیار سے صادر ہوتا ہے اسی قصد و اختیار پر عذاب و ثواب مرتب ہوتا ہے جس کے بعد صدور فعل بتخلیق حق ہوتا ہے اور کبھی عزم تک نہیں پہنچتا وہ معاف ہے آگے مضمون کی تکمیل کے لئے اہل فجور و اہلِ تقویٰ کا مآل بتلاتے ہیں کہ) یقیناً وہ مراد کو پہنچا جسنے اس (جان) کو پاک کر لیا (یعنی نفس کو فجور سے روکا اور تقویٰ اختیار کر لیا) اور نامراد ہوا جس نے اس کو (فجور میں) دبا دیا (اور فجور سے مغلوب کر دیا، اس کے بعد جواب قسم مقدر ہے یعنی اے کفارِ مکہ جب تم اہلِ فجور ہو تو ضرور مبتلائے غضب و ہلاک ہو گے آخرت میں تو یقیناً اور دنیا میں بعض اوقات جیسا کہ قوم ثمود اس فجور کی وجہ سے غضب الٰہی اور عذاب کی مورد بنی جن کا قصہ یہ ہے کہ) قوم ثمود نے اپنی شرارت کے سبب (صالح علیہ السلام کی) تکذیب کی (اور یہ اُس زمانہ کا قصہ ہے) جبکہ اس قوم میں جو سب سے زیادہ بدبخت تھا وہ (اونٹنی کے قتل کرنے کے لئے) اُٹھ کھڑا ہوا (یعنی آمادہ ہو گیا اور اسکے ساتھ اور لوگ بھی شریک تھے) تو ان لوگوں سے اللہ کے پیغمبر (صالح علیہ السلام) نے (جب انکو اس عزمِ قتل کی اطلاع ہوئی کذا فی الخازن) فرمایا کہ اللہ کی (اس) اونٹنی سے اور اسکے پانی پینے سے خبردار رہنا (یعنی اسکو قتل مت کرنا اور نہ اسکا پانی بند کرنا، چونکہ ارادۂ قتل کا اصل سبب بھی پانی کی باری تھی اسلئے اسکی تصریح فرمائی۔ اور اللہ کی اونٹنی اسلئے کہا کہ خدا تعالیٰ نے اسکو معجزہ کے طور پر عجیب طرح سے پیدا کر کے دلیلِ نبوت بنا دیا اور اس کے احترام کو واجب فرمایا) سو اُنھوں نے پیغمبر کو (یعنی دلیلِ نبوت کو جو ناقۃ اللہ کے ذریعہ ظاہر ہوئی) جھٹلایا (کیونکہ وہ اُن کو نبی نہ سمجھتے تھے) پھر اس اونٹنی کو مار ڈالا تو ان کے پروردگار نے انکے گناہ کے سبب ان پر ہلاکت نازل فرمائی پھر اس (ہلاکت) کو تمام قوم کے لئے عام فرمایا اور اللہ تعالیٰ کو اس ہلاکت کے اخیر میں کسی خرابی (نکلنے) کا کسی سے اندیشہ نہیں ہوا (جیسے ملوک دنیا کو بعض اوقات کسی قوم کو سزا دینے کے بعد احتمال ہوتا ہے

کہ اس پر کوئی شورش و ہنگامہ ملکی مرتب نہو) مفصل قصہ ثمود کا اور اونٹنی کا سورہ اعراف میں گزر چکا ہے ۔

معارف و مسائل

اس سورت کے شروع میں سات چیزوں کی قسم آئی ہے اور ساتوں چیزوں کیساتھ اُن کی حالت کمال کے اعتبار سے کچھ اوصاف اور قیود ذکر کئے گئے ہیں ۔ پہلی قسم وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ، یہاں اگرچہ ضحٰہا کو واؤ عطف کے ساتھ ذکر کیا ہے مگر بقرینہ بعد کی اشیاء کے ضحٰی کا ذکر بطور وصف شمس کے ہے یعنی قسم ہے آفتاب کی جبکہ وہ وقت ضحٰی میں ہو ۔ ضحٰی اسوقت کو کہا جاتا ہے جب آفتاب طلوع ہو کر کچھ بلند ہو جائے اور اُس کی روشنی زمین پر پھیل جائے ، اسوقت میں وہ انسان کو قریب نظر آتا ہے اور تمازت زیادہ نہونے کی وجہ سے اُس کو پوری طرح دیکھ بھی سکتے ہیں ۔

دوسری قسم وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ، یعنی چاند کی قسم جبکہ وہ آفتاب کے پیچھے آئے ۔ اسکا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب چاند غروب آفتاب کے بعد طلوع ہو اور یہ مہینہ کے وسط میں ہوتا ہے جبکہ چاند تقریباً مکمل ہوتا ہے اور پیچھے آنے کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح کہ ضحٰی کے وقت میں آفتاب بکمال نظر آتا ہے اسی طرح جبکہ چاند اُس کے پیچھے آئے یعنی کامل ہونے میں آفتاب کے تابع ہو جائے ۔ تیسری قسم وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا ، جَلّٰهَا کی ضمیر زمین یا دُنیا کی طرف بھی راجع ہو سکتی ہے اگرچہ اس سے پہلے زمین اور دُنیا کا ذکر نہیں آیا مگر محاورات عرب میں ایسی چند چیزیں جو عموماً انسانوں کے سامنے رہتی ہیں اُن کی طرف بغیر ذکر ماسبق کے بھی ضمیر راجع کر دینا مشہور و معروف ہے اور قرآن کریم میں بھی اس کی نظائر موجود ہیں ۔ اس اعتبار سے معنے یہ ہوئے کہ قسم ہے دن کی اور دُنیا کی یا زمین کی جس کو دن نے روشن کر دیا ہے اس میں بھی اشارہ اس طرف ہے کہ دن کی قسم اس حالت کے اعتبار سے ہے جبکہ وہ پوری طرح روشن ہو جائے ۔ اور عبارت کے اعتبار سے ظاہر یہ ہے کہ یہ ضمیر آفتاب کی طرف راجع ہو اس صورت میں معنے یہ ہونگے کہ قسم ہے دن کی جبکہ وہ آفتاب کو روشن کر دے ۔ یہ اسناد مجازی ہوگی اور مطلب یہ ہوگا کہ جب دن نکل آنے کے سبب آفتاب روشن نظر آنے لگے ۔

چوتھی قسم وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا ، یعنی قسم ہے رات کی جبکہ وہ آفتاب پر چھا جائے یعنی آفتاب کی روشنی کو مستور کر دے ۔

پانچویں قسم وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا ، اس میں سیاق نظم کے اعتبار سے زیادہ واضح بات یہ ہے کہ مَا بَنٰهَا میں صرف ما کو مصدریہ قرار دیکر معنے یہ لئے جاویں کہ قسم ہے آسمان اور اسکے بنانے کی جیسا قرآن کریم میں ہے بِمَا غَفَرَلِیْ رَبِّیْ ۔ اسی طرح چھٹی قسم وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا میں بمعنے مصدر لیکر ترجمہ یہ ہوا کہ قسم ہے زمین اور اسکے بچھانے پھیلانے کی ، کیونکہ طحو مصدر کے معنے بچھانے پھیلانے کے آتے ہیں ۔ اسمیں آسمان کیساتھ بنانیکا اور زمین کے ساتھ بچھانے پھیلانے کا ذکر بھی اُسی حالت کمال کو بتلانے کے لئے ہے کہ قسم ہے آسمان کی اُس حالت میں جبکہ اُس کی تخلیق و تکوین مکمل ہو گئی ، اور قسم ہے زمین کی جبکہ اسکو پھیلا کر اُس کی تخلیق مکمل کر دی گئی ۔ حضرت قتادہ وغیرہ

سے یہی تفسیر منقول ہے۔ کشاف اور بیضاوی و قرطبی نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور بعض حضرات مفسرین نے اس جگہ حرف ما کو بمعنے مَنْ لیکر اس کی مراد حق تعالیٰ کی ذات لی ہے کہ قسم ہے آسمان کی اور اسکے بنانے والے کی، اسی طرح وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا کا مفہوم یہ بیان کیا گیا کہ قسم ہے زمین اور اُس کے پھیلانے والے کی۔ مگر یہاں جتنی قسمیں اب تک مذکور ہوئیں اور جو آگے آرہی ہیں وہ سب مخلوقات کی قسمیں ہیں، درمیان میں ذاتِ حق کی قسم آجانا نسق اور ترتیب سے بعید معلوم ہوتا ہے اور اس صورت میں جو اوپر لکھی گئی ہے یہ اشکال بھی نہیں لازم آتا کہ مخلوقات کی قسم کو ذاتِ خالق پر مقدم کیوں بیان کیا گیا۔ واللہ اعلم

ساتویں قسم وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا، اسمیں بھی ما کو مصدریہ لیا جائے تو معنے یہ ہیں کہ قسم ہے انسانی جان کی اور اسکے درست و متناسب کرنے کی اور اگر ما کو بمعنے مَنْ لیا جائے تو معنے یہ ہونگے کہ قسم ہے نفس کی اور اسکے برابر درست کرنیوالے کی۔ تسویہ یعنی درست اور برابر کرنے کا مفہوم اس سے پہلی سورتوں میں آچکا ہے۔

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا، الہام کے معنے دل میں ڈالنا۔ فجور کے معنے کھلا گناہ اور تقویٰ کا مفہوم معروف و مشہور ہے۔ یہ جملہ بھی ساتویں قسم وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا کے ساتھ مربوط ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی کو بنایا، پھر اسکے دل میں فجور اور تقویٰ دونوں کا الہام کردیا، مراد یہ ہے کہ نفس انسانی کی تخلیق میں حق تعالےٰ نے گناہ اور طاعت دونوں کے مادے اور استعداد رکھدی ہے پھر انسان کو ایک خاص قسم کا اختیار اور قدرت دیدی کہ وہ اپنے قصد و اختیار سے گناہ کی راہ اختیار کرلے یا طاعت کی، جب وہ اپنے قصد و اختیار سے انمیں سے کوئی راہ اختیار کرتا ہے تو اسی قصد و اختیار پر اسکو ثواب یا عذاب ملتا ہے، اس تفسیر سے وہ شبہ دفع ہوگیا کہ گناہ اور طاعت جب خود انسان کی تخلیق میں رکھدی گئی تو وہ اسکے کرنے پر مجبور ہوا، ایسی صورتیں وہ نہ کسی ثواب کا مستحق ہے نہ عذاب کا، اور یہ تفسیر ایک حدیث مرفوع سے مستفاد ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عمران بن حصینؓ کی روایت سے آئی ہے کہ بعض لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ تقدیر کے متعلق سوال کیا تو آپ نے جواب میں یہ آیت تلاوت فرمائی۔ اس آیت سے مسئلہ تقدیر کے شبہ کا جواب اسی صورت میں ہوسکتا ہے جبکہ الہام فجور و تقویٰ سے مراد یہ لیا جائے کہ دونوں کے مادے اور استعداد دیں حق تعالیٰ نے نفسِ انسانی کے اندر رکھدیئے ہیں مگر اس کو انمیں سے کسی ایک پر مجبور محض نہیں کیا بلکہ اُس کو قدرت و اختیار دیا کہ انمیں سے جس کو جی چاہے اختیار کرسکتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ اور ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب یہ آیت تلاوت فرماتے تو بلند آواز سے یہ دُعا پڑھا کرتے تھے اَللّٰهُمَّ اٰتِ نَفْسِیْ تَقْوٰىهَا اَنْتَ وَلِیُّهَا وَمَوْلَاهَا وَاَنْتَ خَیْرُ مَنْ زَكّٰىهَا یعنی یا اللہ میرے نفس کو تقویٰ کی توفیق عطا فرما، آپ ہی میرے نفس کے ولی اور مربّی ہیں۔

ان سات قسموں کے بعد جواب قسم میں فرمایا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا، یعنی بامراد ہوا وہ شخص جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کرلیا۔ تزکیہ کے اصلی معنے باطنی پاکی کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ جس نے اللہ کی اطاعت کرکے اپنے ظاہر و باطن کو پاک کرلیا۔ اور محروم ہوا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو گناہوں کی دلدل میں دھنسادیا

لفظ دَسّٰی ، دَسٌّ سے مشتق ہے جس کے معنے زمین میں دفن کر دینے کے ہیں کما قال تعالیٰ اَمۡ یَدُسُّہٗ فِی التُّرَابِ
اور بعض مفسرین نے یہاں زَکّٰی اور دَسّٰی دونوں میں ضمیر فاعل اللہ کی طرف راجع کر کے معنے یہ کئے ہیں کہ بامراد ہوا وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے پاک کر دیا، اور نامراد و محروم ہوا وہ جس کو اللہ تعالیٰ نے گناہوں میں دھنسا دیا اس آیت نے کُل انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا، ایک بامُراد دوسرا نامراد، آگے اس دوسری قسم کے لوگوں کا ایک واقعہ بطور مثال کے پیش کر کے اُن کے انجام بد سے ڈرایا گیا ہے کہ ان نامرادوں کو آخرت میں تو سخت سزا ملے ہی گی بعض اوقات دنیا میں بھی اُن کو سزا کی ایک قسط دیدی جاتی ہے جیسے قوم ثمود کو پیش آیا، ان کا واقعہ تفصیل کیساتھ سورۂ اعراف میں آچکا ہے یہاں اس کی طرف اجمالی اشارہ فرما کر انکے عذاب کا بیان فرمایا۔

فَدَمۡدَمَ عَلَیۡہِمۡ رَبُّہُمۡ بِذَنۡۢبِہِمۡ فَسَوّٰىہَا ، دمدمہ کا لفظ ایسے سخت عذاب کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی شخص یا قوم پر بار بار آتا رہے یہانتک کہ ان کو بالکل فنا کر دے۔ اور فَسَوّٰىہَا کا مطلب یہ ہے کہ یہ عذاب پوری قوم پر محیط ہو گیا جس میں مرد و عورت بچہ بوڑھا سب برابر ہو گئے۔ آخر میں فرمایا وَلَا یَخَافُ عُقۡبٰہَا یعنی حق تعالیٰ کا عذاب اور کسی قوم کو تباہ کر دینے کے معاملے کو دُنیا کے معاملات کی طرح نہ سمجھ کہ اسمیں بڑے سے بڑا بادشاہ صاحبِ قوت و شوکت بھی جب کسی قوم کے ساتھ ایسا معاملہ کرتا ہے جس میں پوری قوم کی ہلاکت ہے تو اسکو خود بھی یہ خطرہ رہتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ اُن کے بقایا یا انکے حامی لوگ ہم سے انتقام لیں اور بغاوت کرنے لگیں غرض دُنیا میں دوسروں کو مارنے والا خود بھی کبھی بے خطر نہیں رہتا، جو دوسروں پر حملہ کرتا ہے اسکو اپنے پر حملے کا خطرہ بھی لازماً برداشت کرنا پڑتا ہے بجز حق تعالیٰ جل شانہٗ کے کہ اس کو کسی وقت کسی سے کوئی خطرہ نہیں، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

تمت سورۃ الشمس بحمد اللہ ۲۴ شعبان ۱۳۹۱ھ

سُورَۃُ اللَّیل

سُوْرَۃُ اللَّیْلِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ اِحْدٰی وَعِشْرُوْنَ اٰیَۃً

سورہ لیل مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی اکیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی ① وَالنَّھَارِ اِذَا تَجَلّٰی ② وَمَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَالْاُنْثٰٓی ③

قسم رات کی جب چھا جائے اور دن کی جب روشن ہو اور اُس کی جو اُس نے پیدا کیئے نر اور مادہ

اِنَّ سَعْیَکُمْ لَشَتّٰی ④ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی ⑤ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ⑥

تمھاری کمائی طرح طرح پر ہے سو جس نے دیا اور ڈرتا رہا اور سچ جانا بھلی بات کو

فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْیُسْرٰی ⑦ وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی ⑧ وَکَذَّبَ

تو اسکو ہم سہج سہج پہنچادیں گے آسانی میں، اور جس نے نہ دیا اور بے پروا رہا اور جھوٹ جانا

بِالْحُسْنٰی ⑨ فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْعُسْرٰی ⑩ وَمَا یُغْنِیْ عَنْہُ مَالُہٗٓ اِذَا تَرَدّٰی ⑪

بھلی بات کو، سو اسکو ہم سہج سہج پہنچا دیں گے سختی میں اور کام نہ آئیگا اس کے مال اسکا جب گڑھے میں گرے گا

اِنَّ عَلَیْنَا لَلْھُدٰی ⑫ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَۃَ وَالْاُوْلٰی ⑬ فَاَنْذَرْتُکُمْ نَارًا

ہمارا ذمہ ہے راہ سمجھا دینا اور ہمارے ہاتھ میں ہے آخرت اور دُنیا سو میں نے سُنا دی تم کو خبر ایک

تَلَظّٰی ⑭ لَا یَصْلٰھَآ اِلَّا الْاَشْقَی ⑮ الَّذِیْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی ⑯ وَسَیُجَنَّبُھَا

بھڑکتی ہوئی آگ کی، اُسمیں وہی گریگا جو بڑا بد بخت ہے جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا، اور بچادیں گے اُس سے بڑے

الْاَتْقَی ⑰ الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی ⑱ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَہٗ مِنْ نِّعْمَۃٍ

ڈرنیوالے کو، جو دیتا ہے اپنا مال دل پاک کرنے کو اور نہیں کسی کا اُس پر احسان جس کا

تُجْزٰٓی ⑲ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْہِ رَبِّہِ الْاَعْلٰی ⑳ وَلَسَوْفَ یَرْضٰی ㉑

بدلہ دے مگر واسطے چاہنے مرضی اپنے رب کی جو سب سے برتر ہے اور آگے وہ راضی ہوگا

خلاصۂ تفسیر

قسم ہے رات کی جبکہ وہ (آفتاب کو اور دن کو) چھپالے، اور (قسم ہے) دن کی جبکہ وہ روشن ہو جاوے (اور قسم ہے) اُس (ذات) کی جس نے نر اور مادہ کو پیدا کیا (مراد اللہ تعالیٰ ہے آگے جواب قسم ہے) کہ بیشک تمہاری کوششیں (یعنی اعمال) مختلف ہیں (اور اسی طرح انکے ثمرات بھی مختلف ہیں) سو جس نے (اللہ کی راہ میں مال) دیا اور اللہ سے ڈرا اور اچھی بات (یعنی ملتِ اسلام) کو سچا سمجھا تو ہم اس کو راحت کی چیز کے لئے سامان دیدیں گے (راحت کی چیز سے نیک عمل اور بواسطہ نیک عمل کے جنّت مراد ہے کہ یُسر کا سبب اور محل ہے اسی لئے یُسریٰ کہدیا گیا ورنہ یُسریٰ کے معنی ہیں آسان چیز) اور جس نے حقوق واجبہ سے بُخل کیا اور (بجائے خدا سے ڈرنے کے خدا سے) بے پروائی اختیار کی اور اچھی بات (یعنی ملتِ اسلام کو جھٹلایا تو ہم اس کو تکلیف کی چیز کے لئے سامان دیدیں گے (تکلیف کی چیز سے بدعمل اور بواسطۂ بدعمل کے دوزخ مراد ہے کہ عُسر کا سبب اور محل ہے اسلئے اُس عسر کو عسریٰ کہدیا گیا اور سامان دینے سے مراد دونوں جگہ یہ ہے کہ اچھے یا بُرے کام اُس کے لئے آسان ہو جائیں گے اور بے تکلف سرزد ہونے لگیں گے اور ویسے ہی اسباب جمع ہو جاویں گے پھر نیک اعمال کا سامانِ جنت ہونا اور اعمال بد کا سامانِ دوزخ ہونا ظاہر ہی ہے۔ حدیث میں ہے اما من کان من اھل السعادۃ فییسر لعمل اھل السعادۃ دکذا فی الشقاوۃ) اور (آگے صاحبِ عُسریٰ کا حال مذکور ہے کہ) اس کا مال اسکے کچھ کام نہ آویگا جب وہ برباد ہونے لگے گا (بربادی سے مراد جہنم میں جانا ہے) واقعی ہمارے ذمہ (اپنے وعدہ کے مطابق) راہ کا بتلا دینا ہے (سو وہ ہم نے پوری طور سے بتلا دیا ہے پھر کسی نے ایمان و طاعت کی راہ اختیار کرلی جسکا ذکر مَنْ اَعْطٰی الخ میں ہوا ہے، اور کسی نے کفر و معصیت کی راہ کو اختیار کرلیا جسکا ذکر مَنْ بَخِلَ میں ہوا ہے) اور (جیسی راہ کوئی شخص اختیار کریگا ویسا ہی ثمرہ اس کو دیں گے کیونکہ) ہمارے ہی قبضہ میں ہے آخرت اور دُنیا (یعنی دونوں میں ہماری ہی حکومت ہے اس لئے دُنیا میں ہم نے احکام مقرر کیے اور آخرت میں مخالفت اور موافقت پر سزا و جزا دیں گے جسکا بیان دو جگہ فَسَنُيَسِّرُهٗ میں ہوا ہے۔ آگے بطور تنقیح اور توضیح کے ارشاد ہے کہ میں نے جو تم کو اعمالِ مختلفہ کی مختلف جزائیں بتلادی ہیں) تو میں تمکو ایک بھڑکتی ہوئی آگ سے ڈرا چکا ہوں (جس پر جملہ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى دلالت کرتا ہے تاکہ ایمان و طاعت جن کا ذکر اعطٰی الخ میں ہے اختیار کرکے اس آگ سے بچو، اور کفر و معصیت جن کا ذکر بَخِلَ الخ میں ہے اختیار کرکے دوزخ میں نہ جاؤ، کیونکہ اسمیں جانے اور نہ جانے کے یہی اسباب ہیں چنانچہ آگے اس کی تصریح ہے کہ) اس میں (ہمیشہ کے لئے) وہی بدبخت داخل ہوگا جس نے (دینِ حق کو) جھٹلایا اور اس سے روگردانی کی اور اس سے ایسا شخص دُور رکھا جاویگا جو بڑا پرہیزگار ہے، جو اپنا مال (محض) اس غرض سے دیتا ہے کہ (گناہوں سے) پاک ہو جاوے۔ (یعنی محض رضائے حق اسکا مطلوب ہے) اور بجز اپنے عالیشان پروردگار کی رضا جوئی کے (کہ یہی اس کا

مقصود ہے) اس کے ذمہ کسی کا احسان نہ تھا کہ (اس دینے سے) اسکا بدلہ اُتارنا (مقصود) ہو (اسمیں نہایت ہی مبالغہ ہے اخلاص میں کیونکہ کسی کے احسان کا بدلہ اُتارنا بھی فی نفسہ مستحب اور افضل و موجب ثواب ہے مگر فضیلت میں احسان ابتدائی کی برابر نہیں، پس جب اس شخص کا انفاق فی سبیل اللہ اس سے بھی مبرا ہے تو ریا وغیرہ معاصی کی آمیزش سے بدرجۂ اولیٰ بری ہوگا اور یہ کمال اخلاص ہے) اور (ایسے شخص کے لئے اوپر صرف جہنم سے بچنا مذکور تھا آگے حصول نعمائے آخرت کو فرماتے ہیں کہ) یہ شخص عنقریب خوش ہو جاویگا (یعنی آخرت میں ایسی ایسی نعمتیں ملیں گی جن سے اس کو دائمی خوشی نصیب ہوگی)

معارف و مسائل

اِنَّ سَعْیَکُمْ لَشَتّٰی، یہ ایسا جملہ ہے جیسے سورۂ انشقاق میں مذکور ہوا اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا جس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت سے کسی نہ کسی کام کے لئے سعی و عمل اور جد و جہد کرنیکا خوگر ہے مگر بعض لوگ اپنی جد و جہد اور محنت سے دائمی راحت کا سامان کر لیتے ہیں اور بعض دوسرے اپنی اسی محنت سے دائمی عذاب خرید لیتے ہیں جیسے حدیث میں ہے کہ ہر انسان جب صبح کو اُٹھتا ہے تو وہ اپنے نفس کو تجارت پر لگا دیتا ہے کوئی تو اس تجارت میں کامیاب ہوتا ہے اور اپنے آپ کو عذابِ آخرت سے آزاد کرلیتا ہے اور کوئی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسکی محنت اور سعی و عمل ہی اُس کی ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے مگر عقل کا کام یہ ہے کہ پہلے اپنی سعی و عمل کے انجام کو سوچے، جس عمل کے انجام میں وقتی آرام و لذت ہو مگر دائمی عذاب و رنج کا سبب بنے اُس کے پاس نہ جائے۔

سعی و عمل کے اعتبار سے انسانوں کے دو گروہ آگے قرآن حکیم نے سعی و عمل کے اعتبار سے انسانوں کے دو گروہ تبلائے اور دونوں کے تین تین اوصاف ذکر کئے۔ پہلا گروہ کامیاب لوگوں کا ہے اُن کے تین عمل یہ ہیں فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰی، یعنی جس نے اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا اور اللہ سے ڈر کر زندگی کے ہر شعبہ میں اُس کے احکام کی خلاف ورزی سے بچتا رہا اور جس نے اچھی بات کی تصدیق کی۔ اچھی بات سے مراد کلمۂ ایمان لا الٰہ الا اللہ ہے۔ (کما قالہ ابن عباس والضحاک والسدی) اس کلمہ کی تصدیق سے مراد ایمان لے آنا ہے اور اگرچہ ایمان سب اعمال کی رُوح اور سب سے مقدم ہے اسکو یہاں مؤخر کرنیکی شاید یہ وجہ ہو کہ اس جگہ ذکر سعی و عمل اور جد و جہد کا ہے اور وہ اعمال ہی ہیں۔ ایمان تو ایک قلبی چیز ہے کہ دل میں اللہ تعالیٰ اور اسکے رسُول کی تصدیق کرے پھر زبان سے بھی اسکا اقرار کلمہ شہادت کے ذریعہ کرلے، اور ظاہر ہے کہ ان دونوں چیزوں میں کوئی جسمانی محنت نہیں نہ کوئی اسکو اعمال کی فہرست میں شمار کرتا ہے دوسرے گروہ کے بھی تین عمل کا ذکر فرمایا وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی وَکَذَّبَ بِالْحُسْنٰی، یعنی جس نے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے بخل کیا کہ زکوٰۃ فرض اور صدقات واجبہ بھی ادا کرنے سے گریز کیا اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور اسکی طرف جھکنے اور اطاعت اختیار کرنے کے بجائے اُس سے بے نیازی اور بے رُخی اختیار کی اور اچھی بات یعنی کلمۂ ایمان

کی تکذیب کی، ان دونوں گروہوں میں سے پہلے گروہ کے بارے میں فرمایا فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى، یُسریٰ کے لفظی معنے ہیں آسان اور آرام دہ چیز جسمیں مشقت نہ ہو مراد اس سے جنّت ہے۔ اسی طرح اسکے بالمقابل دوسرے گروہ کے متعلق فرمایا فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى، عُسریٰ کے لفظی معنے مشکل اور تکلیف دہ چیز کے ہیں، مراد اس سے جہنّم ہے۔ اور معنے دونوں جملوں کے یہ ہیں کہ جو لوگ اپنی سعی و محنت پہلے تین کاموں میں لگاتے ہیں یعنی اللہ کی راہ میں خرچ اور اللہ سے ڈرنا اور ایمان کی تصدیق، ان لوگوں کو ہم یُسریٰ یعنی اعمال جنّت کے لئے آسان کر دیتے ہیں اور جو لوگ یہ سعی و عمل دوسرے تین کاموں میں لگاتے ہیں اُن کو ہم عُسریٰ یعنی اعمالِ جہنّم کے لئے آسان کر دیتے ہیں، یہاں بظاہر مقتضائے مقام یہ کہنے کا تھا کہ اُن کے لئے اعمالِ جنّت یا اعمالِ دوزخ آسان کر دیئے جائیں گے کیونکہ آسان یا مشکل ہونا صفت اعمال ہی کی ہوسکتی ہے تو خود ذوات واشخاص آسان ہوتے ہیں نہ مشکل، مگر قرآن کریم نے اس کی تعبیر اسطرح فرمائی کہ خود ان لوگوں کی ذات اور وجود ان اعمال کے لئے آسان کر دیئے جاویں گے اسمیں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ان کی طبیعتوں اور مزاجوں کو ایسا بنا دیا جائیگا کہ پہلے گروہ کیلئے اعمال جنّت اُنکی طبیعت بن جائینگے اُن کے خلاف کرنے میں وہ تکلیف محسوس کرنے لگیں گے، اسی طرح دوسرے گروہ کا مزاج ایسا بنا دیا جاویگا کہ اس کو اعمالِ جہنّم ہی پسند آئیں گے، اُنھیں میں راحت ملے گی اعمالِ جنّت سے نفرت ہوگی۔ ان دونوں گروہوں کے مزاجوں میں یہ کیفیت پیدا کر دینے کو اس سے تعبیر فرمایا کہ یہ خود ان کاموں کے لئے آسان ہوگئے۔ ایک مرفوع حدیث میں اس کی تائید اس طرح آتی ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اعملوا فکلّ میسر لما خلق لہ اما من کان من اھل السّعادۃ فسییسّر لعمل السّعادۃ واما من کان من اھل الشّقاوۃ فییسّر لعمل اھل الشقاوۃ (رواہ البخاری ومسلم عن علی رض) یعنی تم جو عمل کرتے ہو وہ کرتے رہو کیونکہ ہر ایک آدمی کے لئے وہی کام آسان کر دیا گیا ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا، اس لئے جو اہلِ سعادت نیک بخت خوش نصیب ہیں تو اہل سعادت ہی کے اعمال اُن کی طبعی رغبت بنجاتے ہیں اور جو اہلِ شقاوت بدنصیب یعنی اہلِ جہنّم ہیں اُن کے لئے اہلِ شقاوت ہی کے اعمال کرنا مزاج اور طبیعت بنجاتی ہے۔ مگر یہ دونوں چیزیں اپنے خداداد اختیار کو استعمال کرنے کے نتیجہ میں ملتی ہیں اسلئے ان پر عذاب وثواب کا ترتب مستبعد نہیں کہا جا سکتا۔

اسکے بعد بدنصیب گروہ اہلِ جہنّم کو تنبیہ ہے وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى، یعنی جس مال کیخاطر یہ کمبخت حقوقِ واجبہ میں بھی بخل کیا کرتا تھا یہ مال اس پر عذاب آنے کے وقت کچھ کام نہ دیگا۔ تَرَدّٰى کے لفظی معنے گڑھے میں گر جانے اور ہلاک ہونے کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ موت کے بعد قبر میں اور پھر قیامت میں جب وہ جہنّم کے گڑھے میں گرتا ہوگا تو یہ مال اُس کو کچھ نفع نہیں دیگا۔

لَا يَصْلٰىهَاۤ اِلَّا الْاَشْقَى ۝ الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى، یہ نارِ جہنّم کے حال کا بیان ہے کہ اسمیں داخل نہیں ہوگا مگر وہی شخص جو بدنصیب ہے اور جس نے اللہ و رسول کی تکذیب کی اور اُن کی اطاعت سے روگردانی کی اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ و رسُول کی تکذیب کرنیوالا صرف کافر ہی ہو سکتا ہے۔ اس سے بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مومن گناہگار جو تکذیب کا مجرم نہیں جہنّم میں نہیں جائے گا، حالانکہ قرآن و حدیث کی بیشمار نصوص اس سے بھری ہوئی ہیں،

کہ مومن بھی جو گناہ کرتا ہے اگر اُسنے توبہ نہ کرلی یا کسی کی شفاعت سے یا خالص رحمت سے اسکو معاف نہ کردیاگیا تو وہ بھی جہنم میں جائیگا اور اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے تک جہنّم میں رہے گا، البتہ سزا بھگتنے کے بعد جہنّم سے نکال لیا جائے گا اور پھر ببرکت ایمان جنّت میں داخل ہوجائیگا، بظاہر اس آیت کے الفاظ اس کیخلاف ہیں اس لئے ضروری ہے کہ مراد اس آیت کی وہ ہو جو دوسری آیاتِ قرآن اور احادیث صحیحہ کیخلاف نہو، اسکی بہت آسان توجیہ تو وہ ہے جو خلاصہ تفسیر میں لی گئی ہے کہ یہاں دخولِ جہنم سے مراد وہ دخول ہے جو ہمیشہ کے لئے ہو، اور ایسا دخول صرف کافر کے ساتھ مخصوص ہے مومن کسی نہ کسی وقت بالآخر اپنے گناہ کی سزا پوری کرنے کے بعد جہنم سے نکال لیا جائیگا۔ علماء مفسرین نے اسکے سوا دوسری کچھ توجیہات بھی بیان فرمائی ہیں وہ بھی اپنی جگہ درست ہوسکتی ہیں۔ اور تفسیر مظہری میں اس کی ایک توجیہ یہ کی ہے کہ اس آیت میں اشقیٰ اور اتقیٰ سے مراد عام نہیں، بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں موجود تھے، اُن موجودین میں سے کوئی مسلمان باوجود گناہ سرزد ہونے کے بھی ببرکت صحبت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے جہنّم میں نہیں جائے گا۔

صحابہ کرام سب کے سب جہنّم سے محفوظ ہیں | وجہ یہ ہے کہ اول تو ان حضرات میں کسی سے بھی گناہ کا صدور بہت ہی شاذ و نادر ہوا ہے اور بوجہ خوفِ آخرت کے اُن کے حالات سے یہ لازم معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی سے کوئی گناہ ہوا بھی ہے تو اُسنے توبہ کرلی ہوگی۔ پھر اسکے ایک گناہ کے مقابلے میں اُس کے اعمالِ حسنہ اتنے زیادہ ہیں کہ انکی وجہ سے بھی یہ گناہ معاف ہوسکتا ہے جیساکہ قرآن کریم میں ہے اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ، یعنی نیک اعمال بُرے اعمال کا کفارہ بنجاتے ہیں اور خود صحبتِ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ایسا عمل ہے جو تمام اعمالِ حسنہ پر غالب ہے۔ حدیث میں صلحاء اُمت کے بارے میں آیا ہے هم قوم لا يشقى جليسهم ولا يخاب انيسهم (صحیحین) یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن کیساتھ بیٹھنے والا شقی و نامراد نہیں ہوسکتا اور جو اُن سے مانوس ہو وہ محروم نہیں رہ سکتا۔ تو جو شخص سید الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کا جلیس اور انیس ہو وہ کیسے شقی ہوسکتا ہے۔ اسی لئے احادیث صحیحہ میں اس کی تصریحات موجود ہیں کہ صحابہ کرام سب کے سب ہی عذاب جہنّم سے بَری ہیں۔ خود قرآن کریم میں صحابہ کرام کے بارے میں یہ موجود ہے وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى، یعنی انمیں سے ہر ایک کے لئے اللہ نے حُسنیٰ یعنی جنت کا وعدہ فرمایا ہے اور دوسری آیت میں ہے اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ، یعنی جن لوگوں کے لئے ہماری طرف سے حُسنیٰ مقدر ہوچکی ہے وہ نارِ جہنّم سے دُور رہیں گے۔ اور ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ جہنم کی آگ اُس شخص کو نہیں چھوئے گی جس نے مجھے دیکھا ہے (ترمذی عن جابرؓ)

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۝ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ، یہ اہلِ شقاوت کے مقابل اہلِ سعادت تقویٰ شعار حضرات کی جزاء کا بیان ہے کہ جو آدمی اتقیٰ یعنی مکمل اطاعتِ حق کا خوگر ہو اور وہ اپنا مال اللہ کی راہ میں صرف اسلئے خرچ کرتا ہے کہ وہ گناہوں سے پاک ہوجائے ایسا شخص اس جہنّم کی آگ سے دُور رکھا جائے گا۔ الفاظ آیت کے تو عام ہیں جو شخص بھی ایمان کیساتھ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے اُس کے لئے یہ

بشارت ہے لیکن شانِ نزول کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل مراد اس لفظ اتقیٰ سے حضرت صدیق اکبرؓ ہیں ابن ابی حاتم نے حضرت عروہ سے روایت کیا ہے کہ سات مسلمان ایسے تھے جن کو کفارِ مکہ نے اپنا غلام بنایا ہوا تھا جب وہ مسلمان ہوگئے تو ان کو طرح طرح کی ایذائیں دیتے تھے حضرت صدیقِ اکبرؓ نے اپنا بڑا مال خرچ کرکے اُن کو کفار سے خرید کر آزاد کر دیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی (مظہری)

اسی کے مناسب آیت کا آخری جملہ ہے وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ، یعنی جن غلاموں پر حضرت صدیقِ اکبرؓ نے یہ احسانِ عظیم فرمایا کہ زرِ کثیر خرچ کرکے خریدا اور آزاد کر دیا، ان کا کوئی سابقہ احسان بھی انکے ذمہ نہیں تھا جس کے بدلے میں یہ اقدام کرتے بلکہ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ، یعنی انکا مقصد اللہ تعالیٰ عالیشان کی رضاجوئی کے سوا کچھ نہ تھا۔

مستدرک حاکم میں حضرت زبیرؓ سے منقول ہے کہ صدیقِ اکبرؓ کی یہ عادت بھی تھی کہ جس مسلمان کو کفار کے ہاتھ میں قیدی دیکھتے اُس کو خرید کر آزاد کر دیتے تھے اور یہ لوگ عموماً ضعفاء ہوتے تھے، صدیقِ اکبرؓ کے والد حضرت ابو قحافہؓ نے ان سے فرمایا کہ جب تم غلاموں کو آزاد ہی کرتے ہو تو اتنا کام کرلو کہ ایسے غلاموں کو آزاد کیا کرو جو قوی و بہادر ہیں تاکہ وہ کل تمہارے دشمنوں کا مقابلہ اور تمہاری حفاظت کرسکیں۔ حضرت صدیقِ اکبرؓ نے فرمایا کہ میرا مقصد ان آزاد کردہ حضرات سے کوئی فائدہ اُٹھانا نہیں بلکہ میں تو صرف اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لئے ان کو آزاد کرتا ہوں (مظہری)

وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ، یعنی جس شخص نے اپنا مال خرچ کرنے میں صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کو دیکھا اپنا کوئی دُنیوی فائدہ نہیں تکا تو اللہ تعالیٰ بھی آخرت میں اسکو راضی ہی کر دیں گے کہ جنت کی نعماء عجیبہ دائمہ نصیب فرما دیں گے۔ شانِ نزول کے واقعہ سے ان آیات کا صدیقِ اکبر کی شان میں نازل ہونا ثابت ہے اس لئے یہ آخری کلمہ حضرت صدیقِ اکبرؓ کے لئے ایک عظیم خوشخبری اور اعزاز ہے کہ ان کو دُنیا ہی میں اللہ کیطرف سے راضی کر دیئے جانے کی خوشخبری سُنادی۔

تمت سورة الليل بحمد الله ۲۵ شعبان سنہ ۱۳۹۱ھ

سُوْرَةُ الضُّحٰى

سُوْرَةُ الضُّحٰى مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اِحْدٰى عَشْرَةَ اٰيَةً

سورۂ ضحیٰ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی گیارہ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالضُّحٰى ۝۱ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝۲ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۝۳ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ

قسم دھوپ چڑھتے وقت کی اور رات کی جب چھا جائے، نہ رخصت کردیا تجھ کو تیرے رب نے اور نہ بیزار ہوا، اور البتہ پچھلی بہتر ہے

لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝۴ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝۵ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا

تجھ کو پہلی سے اور آگے دیگا تجھ کو تیرا رب پھر تو راضی ہوگا بھلا نہیں پایا تجھ کو یتیم

فَاٰوٰى ۝۶ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝۷ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝۸ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ

پھر جگہ دی اور پایا تجھ کو بھٹکتا پھر راہ سجھائی اور پایا تجھ کو مفلس پھر بے پروا کردیا سو جو یتیم ہو

فَلَا تَقْهَرْ ۝۹ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝۱۰ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝۱۱

اسکو مت دبا اور جو مانگتا ہو اس کو مت جھڑک اور جو احسان ہے تیرے رب کا سو بیان کر

ع ۱۸

خلاصۂ تفسیر

قسم ہے دن کی روشنی کی اور رات کی جب کہ وہ قرار پکڑے (قرار پکڑنے کے دو معنی ہوسکتے ہیں ایک حقیقی یعنی اسکی ظلمت کا کامل ہوجانا کیونکہ رات میں اندھیری رفتہ رفتہ بڑھتی ہے، کچھ رات گزرنے پر مکمل ہوجاتی ہے، دوسرے مجازی یعنی جانداروں کا اسمیں سو جانا اور چلنے پھرنے اور بولنے چالنے کی آوازوں کا ساکن ہوجانا، آگے جواب قسم ہے) کہ آپکے پروردگار نے نہ آپ کو چھوڑا اور نہ آپ سے بیزار ہوا (کیونکہ اوّل تو آپ سے کوئی بات ایسی نہیں ہوئی دوسرے حضرات انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے اس سے محفوظ و معصوم بنایا ہے۔ پس آپ کفار کے خرافات ولغویات سے محزون نہ ہوجیے جو چند روز وحی کی تاخیر کے سبب یہ کہنے لگے کہ آپ کو آپکے خدا نے چھوڑ دیا ہے، آپ برابر نعمت وحی سے

مشرف رہیں گے اور یہ شرف و کرامت تو آپ کے لئے دُنیا میں ہے) اور آخرت آپکے لئے دنیا سے بدرجہا بہتر ہے (پس وہاں آپ کو اس سے زیادہ نعمتیں ملیں گی) اور عنقریب اللہ تعالیٰ آپؐ کو (آخرت میں بکثرت نعمتیں) دے گا سو آپؐ (انکے عطا ہونے سے) خوش ہو جاویں گے (اور جس کی قسم کھائی ہے اُس کو اس بشارت سے مناسبت یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ ظاہر میں اپنی قدرت و حکمت کے مختلف نشان ظاہر کرتا ہے دن کے پیچھے رات کو اور رات کے پیچھے دن کو لاتا ہے یہی کیفیت باطنی حالات کی سمجھو۔ اگر سورج کی دھوپ کے بعد رات کی تاریکی کا آنا اللہ تعالیٰ کی خفگی اور ناراضی کی دلیل نہیں اور نہ اسکا کوئی ثبوت ہے کہ اس کے بعد دن کا اُجالا کبھی نہ ہوگا تو چند روز وحی کے رُکے رہنے سے یہ کیونکر سمجھ لیا جائے کہ آجکل خدا اپنے منتخب کئے ہوئے پیغمبر سے خفا اور ناراض ہو گیا اور ہمیشہ کے لئے وحی کا دروازہ بند کر دیا، ایسا کہنا تو خدا تعالیٰ کے علم محیط اور حکمتِ بالغہ پر اعتراض کرنا ہے گویا اسکو خبر نہ تھی کہ جس کو میں نبی بنا رہا ہوں وہ آئندہ چلکر اسکا اہل ثابت نہ ہوگا نعوذ باللہ منہ۔ آگے بعض نعمتوں سے مضمون مذکور کی تائید ہے یعنی) کیا اللہ تعالیٰ نے آپکو یتیم نہیں پایا پھر (آپکو) ٹھکانا دیا (کہ شکمِ مادر میں ہونے کے وقت ہی آپ کے والد کی وفات ہو گئی اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے دادا سے پرورش کرایا پھر جب آپؐ آٹھ برس کے ہوئے تو ان کی بھی وفات ہو گئی تو آپؐ کے چچا سے پرورش کرایا، ٹھکانا دینے کا مطلب یہی ہے) اور اللہ تعالیٰ نے آپکو (شریعت سے) بے خبر پایا سو (آپؐ کو شریعت کا) رستہ بتلایا (کقولہ تعالیٰ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ الخ اور وحی سے پہلے شریعت کی تفصیل معلوم نہ ہونا کوئی عیب نہیں) اور اللہ تعالیٰ نے آپکو نادار پایا سو مالدار بنا دیا (اس طرح کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مال میں آپنے بطور مضاربت کے تجارت کی، اسمیں نفع ملا، پھر حضرت خدیجہ نے آپؐ سے نکاح کر لیا اور اپنا تمام مال حاضر کر دیا مطلب یہ کہ آپؐ ابتدا سے موردِ انعامات رہے ہیں آئندہ بھی رہیں گے اُن انعامات پر ادائے شکر کا حکم ہے کہ جب ہم نے آپکو یہ نعمتیں دی ہیں) تو آپؐ (اس کے شکر یہ میں) یتیم پر سختی نہ کیجئے اور سائل کو مت جھڑکئے (یہ تو شکر فعلی ہے) اور اپنے رب کے انعامات (مذکورہ) کا تذکرہ کرتے رہا کیجئے۔

معارف و مسائل

شانِ نزول اس سورت کے سببِ نزول کے متعلق بخاری و مسلم میں حضرت جندبؓ بن عبداللہ کی روایت سے آیا ہے اور ترمذی نے حضرت جندبؓ سے یہ روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک انگلی زخمی ہو گئی اُس سے خون جاری ہوا تو آپؐ نے فرمایا، ان انت الا اصبع دمیت ؞ وفی سبیل اللہ ما لقیت، یعنی تو ایک انگلی ہی تو ہے جو خون آلودہ ہو گئی اور جو کچھ تکلیف تجھے پہنچی وہ اللہ کی راہ میں ہے (اسلئے کیا غم ہے) حضرت جندبؓ نے یہ واقعہ ذکر کر کے فرمایا کہ اس واقعہ کے بعد (کچھ روز) جبرئیل امین کوئی وحی لیکر نہیں آئے تو مشرکین مکہ نے یہ طعنہ دینا شروع کیا کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کو اُن کے خدا نے چھوڑ دیا اور ناراض ہو گیا، اس پر یہ سورت ضحیٰ نازل ہوئی حضرت جندبؓ کی روایت جو بخاری میں ہے اسمیں ایک دو رات تہجد کے لئے نہ اُٹھنے کا ذکر ہے، وحی میں تاخیر کا ذکر نہیں اور ترمذی میں تہجد میں ایک دو رات نہ اُٹھنے کا ذکر نہیں صرف وحی میں تاخیر کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ

ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں، ہوسکتا ہے کہ دونوں باتیں پیش آئی ہوں، راوی نے کبھی ایک کو بیان کیا کبھی دوسرے کو، اور یہ عورت جس نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو طعنہ دیا اُمّ جمیل ابولہب کی بیوی تھی جیساکہ دوسری روایات میں ہے اور تاخیر وحی کے واقعات متعدد مرتبہ پیش آئے ہیں ایک شروع نزول قرآن میں پیش آیا جسکو زمانہ فترت وحی کہا جاتا ہے یہ سب سے زیادہ طویل تھا۔ ایک واقعہ تاخیر وحی کا اسوقت پیش آیا جبکہ مشرکین یا یہود نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے روح کی حقیقت کے متعلق سوال فرمایا اور آپ نے بعد میں جواب دینے کا وعدہ فرمالیا، مگر انشاء اللہ نہ کہنے کے سبب کچھ روز تک سلسلہ وحی کا بند رہا اسپر مشرکین نے یہ طعنے دینا شروع کئے کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کا خدا اُن سے ناراض ہوگیا اور اُن کو چھوڑ دیا، اسی طرح کا یہ واقعہ ہے جو سورۂ ضحیٰ کے نزول کا سبب ہوا یہ ضروری نہیں کہ یہ سب واقعات ایک ہی زمانے میں پیش آئے ہوں بلکہ آگے پیچھے بھی ہوسکتے ہیں۔

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى، یہاں آخرت کو اپنے معروف معنی میں اور اسکے بالمقابل اُولیٰ کو دُنیا کے معنے میں لیا جائے تو تفسیر وہ ہے جو خلاصہ تفسیر میں اُوپر آچکی ہے کہ یہ کفار و مشرکین جو طعنے آپ کو دے رہے ہیں یہ دُنیا میں تو دیکھ ہی لیں گے کہ وہ سراسر لغو اور غلط تھے ہم اُس سے آگے آخرت کے انعامات کا بھی آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کو دنیا سے بہت زیادہ انعامات سے نوازا جائیگا اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ اس جگہ آخرت کو اسکے لفظی معنے میں لیا جاوے یعنی پچھلی حالت جیساکہ لفظ اُولیٰ کے لفظی معنے پہلی حالت کے ہیں تو مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ آپ پر اللہ تعالیٰ کے انعامات برابر زیادہ ہی ہوتے چلے جائیں گے کہ ہر پہلی حالت سے پچھلی حالت بہتر اور افضل ہوتی چلی جائے گی، اسمیں علوم و معارف اور قرب الٰہی کے درجات میں ترقی بھی داخل ہے اور دُنیا کے معاشی مسائل اور عزّت و حکومت بھی۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى، یعنی آپ کا رب آپ کو اتنا دیگا کہ آپ راضی ہوجائیں، اس میں حق تعالیٰ نے یہ متعین کرکے نہیں تبلایا کہ کیا دیں گے اسمیں اشارہ عموم کی طرف ہے کہ آپکی ہر مرغوب چیز آپکو اتنی دیں گے کہ آپ راضی ہوجائیں۔ آپ کی مرغوب چیزوں میں دین اسلام کی ترقی، دینِ اسلام کا عام طور پر دُنیا میں پھیلنا پھر اُمت کی ہر ضرورت اور خود آپ کا دشمنوں پر غالب آنا، انکے ملک میں اللہ کا کلمہ بلند کرنا اور دینِ حق پھیلانا سب داخل ہیں۔ حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِذًا لَّا اَرْضٰى وَوَاحِدٌ مِّنْ اُمَّتِىْ فِى النَّارِ یعنی جب یہ بات ہے تو میں اُسوقت تک راضی نہ ہونگا جبتک میری اُمت میں سے ایک آدمی بھی جہنم میں رہے گا (قرطبی) اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ میری اُمت کے بارے میں میری شفاعت قبول فرمائیں گے یہانتک کہ حق تعالیٰ فرمادیں گے رَضِيْتَ يَا مُحَمَّدُ، اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم، اب بھی آپ راضی ہیں، تو میں عرض کرونگا یا رب رَضِيْتُ یعنی اے میرے پروردگار میں راضی ہوں۔ اور صحیح مسلم میں حضرت عمرو بن عاص رضؓ کی روایت ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے وہ آیت تلاوت فرمائی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ہے فَمَنْ تَبِعَنِىْ فَاِنَّهٗ مِنِّىْ وَمَنْ عَصَانِىْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ، پھر دوسری آیت تلاوت فرمائی جسمیں حضرت عیسٰی علیہ السلام

کا قول ہے اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ، پھر آپؐ نے دُعا کے لئے دونوں ہاتھ اُٹھائے اور گریہ وزاری شروع کی اور بار بار فرماتے تھے اَللّٰھُمَّ اُمَّتِیْ اُمَّتِیْ ، حق تعالیٰ نے جبرئیلِ امین کو بھیجا کہ آپ سے دریافت کریں کہ آپؐ کیوں روتے ہیں (اور یہ بھی فرمایا کہ اگرچہ ہمیں سب معلوم ہے) جبرئیلِ امین آئے اور سوال کیا، آپؐ نے فرمایا کہ میں اپنی اُمت کی مغفرت چاہتا ہوں۔ حق تعالیٰ نے جبرئیلِ امین سے فرمایا کہ پھر جاؤ اور کہدو کہ اللہ تعالیٰ آپؐ سے فرماتے ہیں کہ ہم آپؐ کو آپؐ کی اُمت کے بارے میں راضی کر دیں گے اور آپؐ کو رنجیدہ نہ کریں گے۔

اوپر طعنہ کفار کے جواب میں جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر انعاماتِ الٰہیہ کے دُنیا و آخرت میں فائض ہونیکا اجمالی ذکر آیا ہے اسمیں اس کی تھوڑی سی تفصیل تین خاص نعمتوں کے ذکر سے فرمائی گئی ہیں اوّل اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى یعنی ہم نے آپ کو یتیم پایا کہ والد کا انتقال ولادت سے پہلے ہی ہو چکا تھا اور انھوں نے کوئی مال و جائداد بھی چھوڑی تھی جس سے آپؐ کی پرورش ہوسکے، تو ہم نے آپؐ کا ٹھکانہ بنا دیا، یعنی آپکے دادا عبدالمطلب اور اُنکے بعد چچا ابوطالب کے دلوں میں آپکی ایسی محبت ڈالدی کہ صلبی اولاد سے زیادہ آپؐ کی تربیت میں کوشش کرتے تھے۔

دوسری نعمت وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ، لفظ ضَال کے معنے گمراہ کے بھی آتے ہیں اور ناواقف بےخبر کے بھی، یہاں دوسرے ہی معنے مراد ہوسکتے ہیں کہ نبوت سے پہلے آپؐ شریعتِ الٰہیہ کے احکام اور علوم سے بےخبر تھے، آپؐ کو منصبِ نبوّت پر فائز کرکے آپؐ کی رہنمائی فرمائی۔

تیسری نعمت وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ، عائل، عیلہ سے مشتق ہے جس کے معنے فقیر و محتاج ہونے کے ہیں، معنی آیت کے یہ ہوئے کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے نادار اور بے زر پایا تو آپؐ کو غنی و مالدار کر دیا، جس کی ابتدا حضرت خدیجہ کبریٰ رضؓ کے مال میں بطور شرکت مضاربت کے تجارت کرنے سے ہوئی پھر وہ خود آپؐ کے عقدِ نکاح میں آکر اُمّ المومنین ہوئیں تو اُن کا سارا مال ہی آپؐ کی خدمت کے لئے ہوگیا۔

ان تینوں نعمتوں کا ذکر فرمانے کے بعد آپؐ کو تین چیزوں کا حکم دیا گیا، اوّل فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ، قہر کے معنے غلبہ اور جبری تسلّط کے ہیں، مراد یہ ہے کہ آپ کسی یتیم کو ضعیف اور بے وارث سمجھ کر اسکے اموال و حقوق پر اسطرح مسلّط نہوں کہ اسکا حق ضائع ہوجائے اسی لئے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یتیم کے ساتھ شفقت کے معاملے کی تاکید فرمائی اور اسکے ساتھ دل شکنی کا برتاؤ کرنے سے منع فرمایا، ارشاد ہے کہ مسلمانوں کے گھروں میں بہتر گھر وہ ہے جسمیں کوئی یتیم ہو اور اسکے ساتھ احسان و محبت کا سلوک کیا جاتا ہو، اور سب سے بُرا گھر وہ ہے جسمیں کوئی یتیم ہو اور اسکے ساتھ بُرا سلوک کیا جاتا ہو (رواہ البخاری فی الادب المفرد، وابن ماجہ والبغوی، مظہری)

دوسرا حکم اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ، تنہر، نہر سے مشتق ہے جس کے معنے زجر اور جھڑکنے کے ہیں اور سائل کے معنے سوال کرنے والا، اسمیں وہ بھی داخل ہے جو کسی مال کا سوال کرے اور وہ بھی جو علمی تحقیق کا سوال کرے، دونوں کو جھڑکنے ڈانٹنے سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو منع فرمایا گیا، بہتر یہ ہے کہ سائل کو کچھ دیکر رخصت کرے اور نہیں دے سکتا تو نرمی سے عذر کر دے اسی طرح کسی علمی مسئلہ کا سوال کرنے والے کے جواب میں بھی سختی اور بدخوئی

ممنوع ہے نرمی اور شفقت سے جواب دینا چاہیئے بجز اسکے کہ سائل کسی طرح مانے ہی نہیں تو بضرورت زجر بھی جائز ہے۔

تیسرا حکم وَاَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ ، حدّث، تحدیث سے مشتق ہے جس کے معنے بات کرنے کے ہیں، مراد یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا لوگوں کے سامنے ذکر کیا کریں کہ یہ بھی ایک طریقہ شکر گزاری کا ہے یہاں تک کہ آدمی جو کسی آدمی پر احسان کرے اسکا بھی شکر ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے جو شخص لوگوں کے احسان پر اُنکا شکر نہیں کرتا وہ اللہ کا بھی شکر نہیں کریگا (رواہ احمد ورواتہ ثقات، مظہری)

ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ جو شخص تم پر کوئی احسان کرے تو چاہیئے کہ آپ بھی اسکے احسان کا بدلہ دو، اور اگر مالی بدلہ دینے کی استطاعت نہیں تو یہی کرو کہ لوگوں کے سامنے اُس کی تعریف کرو کیونکہ جس نے لوگوں کے مجمع میں اس کی ثناء وتعریف کی تو اُسنے شکر گزاری کا حق ادا کر دیا (رواہ البغوی عن جابر بن عبداللہ رضؓ، مظہری)

مسئلہ ۔ ہر نعمت کا شکر ادا کرنا واجب ہے مالی نعمت کا شکر یہ ہے کہ اس مال میں سے کچھ اللہ کے لئے اخلاص نیت کے ساتھ فرچ کرے اور نعمت بدن کا شکر یہ ہے کہ جسمانی طاقت کو اللہ تعالیٰ کے واجبات ادا کرنے میں صرف کرے اور علم ومعرفت کی نعمت کا شکر یہ ہے کہ دوسروں کو اُس کی تعلیم دے (مظہری)

مسئلہ ۔ سورۂ والضحیٰ سے آخر قرآن تک ہر سورت کیساتھ تکبیر کہنا سنت ہے اور اس تکبیر کے الفاظ شیخ صالح مصری نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکۡبَرُ بتلائے ہیں (مظہری)

ابن کثیر نے ہر سورت کے ختم پر اور بغوی نے ہر سورت کے شروع میں ایک مرتبہ تکبیر کہنے کو سنت کہا ہے (مظہری) دونوں میں سے جو صورت بھی اختیار کرے سنت ادا ہو جائے گی۔ واللہ اعلم

فائدہ سورۂ ضحیٰ سے آخر قرآن کریم تک بیشتر سورتوں میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر حق تعالیٰ کے خاص انعامات اور آپ کے مخصوص فضائل کا ذکر ہے اور چند سورتوں میں قیامت اور اسکے احوال کا۔ قرآن حکیم کا شروع خود قرآن کی عظمت اور ناقابل شک وشبہ ہونے سے کیا گیا اور ختم قرآن اُس ذات کی عظمت وشان پر کیا گیا جس پر قرآن نازل ہوا۔

تمت سورۃ الضحیٰ ۲۸ شعبان ۱۳۹۱ھ

سُوْرَةُ الْاِنْشِرَاحِ

سُوْرَةُ الْاِنْشِرَاحِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَمٰنُ اٰيٰتٍ

سورۂ انشراح مکہ میں نازل ہوئی اور اسکی آٹھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝۱ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝۲ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝۳

کیا ہم نے نہیں کھولدیا تیرا سینہ اور اُتار رکھا ہم نے تجھ پر سے بوجھ تیرا جس نے جھکادی تھی پیٹھ تیری

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝۴ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝۵ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝۶ فَاِذَا

اور بلند کیا ہم نے مذکور تیرا سو البتہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے البتہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے پھر جب

فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝۷ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝۸

تو فارغ ہو تو محنت کر اور اپنے رب کی طرف دل لگا

ع ۸ ۱۹

خلاصۂ تفسیر

کیا ہم نے آپ کی خاطر آپ کا سینہ (علم وحلم سے) کشادہ نہیں کر دیا (یعنی علم بھی وسیع عطا فرمایا اور تبلیغ میں جو مخالفین کی مزاحمت سے ایذاء پیش آتی ہے اس میں تحمل اور حلم بھی دیا، کذا قال الحسن کما فی الدر المنثور) اور ہم نے آپ پر سے آپ کا وہ بوجھ اُتار دیا جس نے آپ کی کمر توڑ رکھی تھی (وِزْر سے مراد وہ مباح اور جائز اُمور ہیں جو کبھی کبھی کسی حکمت و مصلحت کے پیش نظر آپ سے صادر ہو جاتے تھے اور بعد میں ان کا خلافِ حکمت و خلافِ اولیٰ ہونا ثابت ہوتا تھا اور آپ بوجہ علوشان وغایت قرب کے اس سے ایسے مغموم ہوتے تھے جس طرح گناہ سے کوئی مغموم ہوتا ہے، اسمیں بشارت ہے ایسے اُمور پر مواخذہ نہ ہونے کی کذا فی الدر المنثور عن مجاہد وشریح بن عبید الحضرمی پس اس بناء پر یہ بشارت آپ کو دو بار ہوئی، اوّل مکہ میں اس سورت کے ذریعہ، دوسری مدینہ میں سورہ فتح میں اسکی تاکید وتکمیل اور تجدید وتفصیل کے لئے) اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کا آوازہ بلند کیا (یعنی اکثر جگہ شریعت میں

اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ آپ کا نام مبارک مقرون کیا گیا، کذا فی الدر المنثور مرفوعاً قال اللہ تعالیٰ اذا ذکرتُ ذکرتَ معی، یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جہاں میرا ذکر ہوگا آپ کا ذکر بھی میرے ساتھ ہوگا (رواہ ابن جریر وابن ابی حاتم) جیسے خطبہ میں تشہد میں نماز میں اذان میں اقامت میں اور اللہ کے نام کی رفعت اور شہرت ظاہر ہے پس جو اس کے قرین ہوگا رفعت و شہرت میں وہ بھی تابع رہے گا اور چونکہ مکہ میں آپ اور مؤمنین طرح طرح کی تکالیف و شدائد میں گرفتار تھے اسلئے آگے انکے ازالہ کا بطریق تفریع علی السابق کے وعدہ فرماتے ہیں کہ جب ہم نے آپ کو روحانی راحت دی اور روحانی کلفت رفع کر دی جیسا الم نشرح الخ سے معلوم ہوا) سو (اس سے دُنیوی راحت و محنت میں بھی ہمارے فضل و کرم کا اُمیدوار رہنا چاہیئے چنانچہ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ) بیشک موجودہ مشکلات کے ساتھ (یعنی عنقریب ہی جو حکماً ساتھ ہونے کے معنے میں ہے) آسانی (ہونے والی) ہے (اور چونکہ ان مشکلات کے انواع واعداد کثیر تھے اس لئے اس وعدہ کو مکرر تاکید کے لئے فرماتے ہیں کہ) بیشک موجودہ مشکلات کے ساتھ آسانی (ہونیوالی) ہے (چنانچہ وہ مشکلات ایک ایک کر کے سب رفع ہوگئیں جیسا روایات احادیث وسیر و تواریخ اس پر متفق ہیں، آگے ان نعمتوں پر شکر کا حکم ہے کہ جب ہم نے آپ کو ایسی ایسی نعمتیں دی ہیں) تو آپ جب (تبلیغ احکام سے جو دوسروں کی نفع رسانی کی وجہ سے عبادت ہے) فارغ ہو جایا کریں تو (دوسری عبادات متعلقہ بذات خاص میں) محنت کیا کیجئے (مراد کثرت عبادت و ریاضت ہے کہ آپؐ کی شان کے یہی مناسب ہے) اور (جو کچھ مانگنا ہو اس میں) اپنے رب ہی کی طرف توجہ رکھئے (یعنی اُسی سے مانگئے اور اسمیں بھی ایک حیثیت سے بشارت ہے زوالِ عُسر کی کہ خود درخواست کرنے کا حکم گویا درخواست پورا کرنے کا وعدہ ہے)

معارف و مسائل

جیساکہ سُورۂ ضحیٰ کے آخر میں بیان ہو چکا ہے کہ سورۂ ضحیٰ سے آخر قرآن تک بائیس سورتوں میں بیشتر ذکر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر انعامات الٰہیہ اور آپؐ کی عظمتِ شان سے متعلق مضامین ہیں، صرف چند سورتیں احوالِ قیامت یا بعض دوسرے مضامین سے متعلق آئی ہیں۔ سورۂ انشراح میں بھی اُن خاص خاص نعمتوں کا ذکر ہے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر حق تعالیٰ نے مبذول فرمائیں اور اسکے بیان میں اسی عنوان استفہام کو اختیار فرمایا ہے جو سورۂ ضحیٰ میں اَلَمْ یَجِدْكَ الخ میں تھا فرمایا،

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ، شرح کے لفظی معنے کھولنے کے ہیں، اور سینہ کو کھول دینا اسکو علوم و معارف اور اخلاقِ حسنہ کے لئے وسیع کر دینے کے معنے میں استعمال ہوتا ہے جیساکہ ایک دوسری آیت میں ہے فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنْ یَّھْدِیَہٗ یَشْرَحْ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سینۂ مبارک کو حق تعالیٰ نے علوم و معارف اور اخلاقِ کریمہ کے لئے ایسا وسیع بنا دیا تھا کہ آپکے علم و حکمت کو بڑے بڑے عقلاء بھی نہ پا سکے اور اسی شرح صدر کا نتیجہ تھا کہ آپ کو مخلوق کیطرف توجہ کرنا حق تعالےٰ کی طرف توجہ میں مخل نہ ہوتا تھا اور بعض احادیث صحیحہ

میں یہ آیا ہے کہ فرشتوں نے بحکم الٰہی آپؐ کا سینہ مبارک ظاہری طور پر بھی چاک کر کے صاف کیا، بعض حضرات مفسرین نے شرح صدر سے اس جگہ وہی شق صدر کا معجزہ مراد لیا ہے، کما فی ابن کثیر وغیرہ، واللہ اعلم

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِىٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ، وزر کے لفظی معنے بوجھ کے ہیں اور نقض ظہر کے لفظی معنے کمر توڑ دینے یعنی کمر کو جھکا دینے کے ہیں جیسا کوئی بڑا بوجھ انسان پر لاد دیا جائے تو اس کی کمر جھک جاتی ہے، اس آیت میں ارشاد یہ ہے کہ وہ بوجھ جس نے آپؐ کی کمر جھکا دی تھی ہم نے اس کو آپؐ سے ہٹا دیا۔ وہ بوجھ کیا تھا اس کی ایک تفسیر تو وہ ہے جو اوپر خلاصۂ تفسیر میں آچکی ہے کہ اس سے وہ جائز اور مباح کام ہیں جن کو بعض اوقات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قرین حکمت و مصلحت سمجھ کر اختیار کر لیا بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مصلحت کے خلاف یا خلافِ اولیٰ تھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنی علو شان اور تقرب الٰہی میں خاص مقام حاصل ہونے کی بنا پر ایسی چیزوں پر بھی سخت رنج و ملال اور صدمہ ہوتا تھا۔ حق تعالیٰ نے اس آیت میں بشارت سنا کر وہ بوجھ آپؐ سے ہٹا دیا کہ ایسی چیزوں پر آپ سے مواخذہ نہ ہوگا۔

اور بعض حضرات مفسرین نے وِزر (یعنی بوجھ کی مراد اس جگہ یہ لکھی ہے کہ ابتداء نبوت میں وحی کا اثر بھی آپ پر شدید ہوتا تھا اور اُس میں آپ پر جو ذمہ داری ساری دُنیا میں کلمۂ حق پھیلانے اور کفر و شرک کو مٹا کر خلق خدا کو توحید پر جمع کرنے کی ڈالی گئی تھی اور اس سب کام میں حکم یہ تھا کہ فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ، یعنی آپ امر الٰہی کے مطابق استقامت پر رہیں جس میں کسی طرف جھکاؤ نہ ہو، اس کا بارِ عظیم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم محسوس فرماتے تھے اور بعض روایاتِ حدیث میں آیا ہے کہ آپ کی لحیہ مبارک میں کچھ سفید بال آگئے تو آپؐ نے فرمایا کہ اس آیت فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ نے بوڑھا کر دیا۔

یہ وہ بوجھ تھا جس کو آپؐ کے قلب سے ہٹا دینے کی بشارت اس آیت میں دی گئی ہے اور اُس کے ہٹا دینے کی صورت اگلی آیات میں یہ آئی ہے کہ آپ کی ہر مشکل کے بعد آسانی ہونیوالی ہے حق تعالیٰ نے شرح صدر کے ذریعہ آپکا حوصلہ اتنا بلند فرما دیا کہ یہ سب مشکلات آسان نظر آنے لگیں اور وہ بوجھ بوجھ نہ رہا، واللہ اعلم

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا رفع ذکر یہ ہے کہ تمام اسلامی شعائر میں اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ آپ کا نام مبارک لیا جاتا ہے جو ساری دُنیا میں مناروں اور منبروں پر اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے ساتھ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ پکارا جاتا ہے اور دُنیا میں کوئی سمجھدار انسان آپؐ کا نام بغیر تعظیم کے نہیں لیتا اگرچہ وہ مسلمان بھی نہ ہو۔

فائدہ یہاں تین نعمتوں کا ذکر ہے شرحِ صدر، وضعِ وزر، رفعِ ذکر، ان تینوں کو تین جملوں میں ذکر فرمایا ہے اور سب میں فعل اور مفعول کے درمیان ایک حرف لَكَ یا عَنْكَ لایا گیا ہے اسمیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت اور خاص عظمت کیطرف اشارہ ہے کہ یہ سب کام آپ کی خاطر کئے گئے ہیں۔

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ، اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ، عربی زبان کا قاعدہ یہ ہے کہ جس کلمہ کے شروع میں الف لام ہوتا ہے جس کو اصطلاح میں لام تعریف کہتے ہیں۔ اگر اسی کلمہ کو الف لام ہی کیساتھ مکرر لایا جائے تو اس کا مصداق

وہ ہی ہوتا ہے جو پہلے کلمہ کا تھا اور اگر بغیر الف لام تعریف کے مکرر لایا جائے تو دونوں کے مصداق الگ الگ ہوتے ہیں اس آیت میں العسر جب مکرر آیا تو معلوم ہوا کہ اس سے وہ پہلا ہی عُسر مراد ہے کوئی نیا نہیں۔ اور لفظ یُسرًا دونوں جگہ بغیر الف لام کے لایا گیا، اس سے معلوم ہوا کہ یہ دوسرا یُسر پہلے یُسر کے علاوہ ہے تو اس آیت میں اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا کے تکرار سے یہ نتیجہ نکلا کہ ایک ہی عُسر و مشکل کے لئے دو آسانیوں کا وعدہ ہے اور دو سے مراد بھی خاص دو کا عدد نہیں بلکہ متعدد ہونا مراد ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ایک عُسر یعنی تنگی اور مشکل جو آپ کو پیش آئی یا آئے گی اُس کیساتھ بہت سی آسانیاں آپ کو دی جائیں گی۔

حضرت حسن بصریؒ سے مرسلاً روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے بیان کیا گیا کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام کو اس آیت سے بشارت سُنائی اور فرمایا لن یغلب عُسرٌ یُسرَیْنِ یعنی ایک عُسر دو یُسروں پر (ایک مشکل دو آسانیوں پر) غالب نہیں آسکتی۔ چنانچہ تاریخ و سیرت کی سب کتابیں جو اپنوں اور غیروں، مسلم و غیر مسلم نے لکھی ہیں وہ اس پر شاہد ہیں کہ جو کام مشکل سے مشکل بلکہ لوگوں کی نظر میں ناممکن نظر آتے تھے آپ کے لئے وہ سب آسان ہوتے چلے گئے۔ روایتِ مذکورہ سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس آیت میں العُسر کا الف لام عہد کے لئے ہے اور مراد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کا عُسر ہے، یعنی یہ وعدہ کہ ہر مشکل کے ساتھ بہت سی آسانیاں دی جائیں گی، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے لئے ہے جس کو حق تعالیٰ نے ایسا پورا فرمایا کہ دُنیا نے آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اب اگر دُنیا میں کسی شخص کو عُسر کے بعد یُسر نصیب نہ ہو تو وہ اس آیت کے منافی نہیں، البتہ عادۃ اللہ اب بھی یہی ہے کہ جو شخص سختی پر صبر کرے اور سچے دل سے اللہ پر اعتماد رکھے اور ہر طرف سے ٹوٹ کر اُسی سے لو لگائے اور اُسی کے فضل کا اُمیدوار رہے اور کامیابی میں دیر ہونے سے آس نہ توڑ بیٹھے تو ضرور اللہ تعالیٰ اُس کے حق میں آسانی کر دیگا (فوائد عثمانیہ) بعض روایاتِ حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

تعلیم و تبلیغ کرنے والوں کو خلوت میں ذکر اللہ اور توجہ الی اللہ بھی ضروری ہے

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ، یعنی جب آپ ایک محنت یعنی دعوت حق اور تبلیغ احکام سے فارغ ہوں تو (دوسری) محنت کے لئے تیار ہو جائیے وہ یہ کہ نماز اور ذکر اللہ اور دُعاء استغفار میں لگ جائیں۔ اکثر حضرات مفسرین نے اس آیت کی یہی تفسیر کی ہے۔ بعض حضرات نے دوسری تفسیریں بھی لکھی ہیں مگر اقرب وہی ہے جو اوپر لکھی گئی، اسکا حاصل یہ ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ اور خلقِ خدا کو راستہ دکھانا اُن کی اصلاح کی فکر یہ آپ کی سب سے بڑی عبادت تھی مگر یہ عبادت بواسطہ مخلوق ہے کہ ان کی اصلاح پر توجہ دیں اور اسکی تدبیر کریں، آیت کا مقصود یہ ہے کہ صرف اس عبادت بالواسطہ پر آپ قناعت نہ کریں بلکہ جب اس سے فرصت ملے تو بلا واسطہ خلوت میں حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں اُسی سے ہر کام میں کامیابی کی دُعا کریں کہ اصل مقصود جس کے لئے انسان پیدا کیا گیا ہے وہ ذکر اللہ اور عبادت بلا واسطہ ہی ہے اور شاید اسی لئے پہلی قسم یعنی عبادت بالواسطہ سے فراغت کا ذکر فرمایا کہ وہ کام ایک ضرورت کے لئے ہے اُس سے فراغت ہو سکتی ہے اور دوسرا کام

یعنی توجہ الی اللہ ایسی چیز ہے کہ اس سے فراغت مؤمن کو کبھی نہیں ہوسکتی بلکہ اپنی ساری عمر اور توانائی کو اسمیں صرف کرنا ہے۔

فائدہ اس سے معلوم ہوا کہ علماء جو تعلیم و تبلیغ اور اصلاح خلق کا کام کرنے والے ہیں اُن کو اس سے غفلت نہ ہونا چاہیئے کہ اُن کا کچھ وقت خلوت میں توجہ الی اللہ اور ذکر اللہ کے لئے بھی مخصوص ہونا چاہیئے جیسا کہ علماء سلف کی سیرتیں اس پر شاہد ہیں اسکے بغیر تعلیم تبلیغ بھی موثر نہیں ہوتی اُن میں نور و برکت نہیں ہوتی۔

فائدہ لفظ فانصب، نصب سے مشتق ہے جس کے اصلی معنے تعب اور تکان کے ہیں اسمیں اشارہ پایا جاتا ہے کہ عبادت اور ذکر اللہ اس حد تک جاری رکھا جائے کہ کچھ مشقت اور تکان محسوس ہونے لگے، صرف نفس کی راحت و خوشی ہی پر اسکا مدار نہ رہے اور کسی وظیفہ اور معمول کی پابندی خود ایک مشقت اور تعب ہے، خواہ کام مختصر ہی ہو۔

تمت سورۃ الانشراح والحمد للہ

سُوْرَۃُ التِّیْن

سُوْرَۃُ التِّیْنِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ ثَمٰنُ اٰیٰتٍ

سورۂ تین مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی آٹھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ ① وَطُوْرِ سِیْنِیْنَ ② وَھٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ ③ لَقَدْ

قسم انجیر کی اور زیتون کی اور طور سینین کی اور اس شہر امن والے کی ہم نے

خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ④ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ⑤

بنایا آدمی خوب سے انداز ے پر پھر پھینک دیا اُس کو نیچوں سے نیچے

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَھُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ⑥ فَمَا

مگر جو یقین لائے اور عمل کیے اچھے سو اُن کے لئے ثواب ہے بے انتہا پھر تو

یُکَذِّبُکَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ ⑦ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحٰکِمِیْنَ ⑧

اسکے پیچھے کیوں جھٹلائے بدلہ ملنے کو کیا نہیں ہے اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم

ع ۱ / ۲۰

خلاصۂ تفسیر

قسم ہے انجیر (کے درخت) کی اور زیتون (کے درخت) کی اور طور سینین کی اور اس امن والے شہر (یعنی مکہ معظمہ) کی کہ ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سانچہ میں ڈھالا ہے پھر (ان میں جو بوڑھا ہو جاتا ہے) ہم اسکو پستی کی حالت والوں سے بھی پست تر کر دیتے ہیں (یعنی وہ خوبصورتی بدصورتی سے اور قوت ضعف سے بدلجاتی ہے اور بُرے سے بُرا ہو جاتا ہے مقصود اس سے بیان کرنا کمال قبح کا ہے جس سے اُن کے دوبارہ پیدا کرنے پر حق تعالیٰ کی قدرت ہونا واضح ہوتا ہے کقولہ تعالیٰ اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ ضُعْفٍ الخ اور مقصود اس سورت کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت دوبارہ پیدا کرنے اور زندہ کرنے پر ثابت کرنا ہے جیسا کہ فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ کے جملے سے اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے اور اس آیت کے عموم سے چونکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بوڑھے سب کے سب قبیح اور بُرے ہو جاتے ہیں اس ایہام کو دُور کرنے کے لئے آگے آیت میں ایک استثناء بیان کیا جاتا ہے کہ) لیکن جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے تو اُن کے لئے اسقدر ثواب ہے جو کبھی منقطع نہ ہوگا (جسمیں بتلا دیا کہ مومن صالح بوڑھے ضعیف ہو جانے کے باوجود انجام کار کے اعتبار سے اچھے ہی رہتے ہیں بلکہ پہلے سے زیادہ ان کی عزت بڑھ جاتی ہے، آگے خَلَقْنَا اور رَدَدْنَا پر تفریع ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تخلیق و تقلیب احوال پر قادر ہیں) تو (اے انسان) پھر کون چیز تجھ کو قیامت کے بارے میں منکر بنا رہی ہے (یعنی وہ کونسی دلیل ہے جس کی بنا پر تو ان دلائل کے ہوتے ہوئے قیامت کا منکر ہو رہا ہے) کیا اللہ تعالیٰ سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں ہے (تصرفات دنیویہ میں بھی جن میں سے تخلیق انسانی اور پھر بڑھاپے میں اُس میں تغیرات کا ذکر اُوپر آیا ہے اور تصرفات اخرویہ میں بھی جن میں سے قیامت و مجازاۃ بھی ہے)

معارف و مسائل

وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ، اس آیت میں چار چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے جن میں دو درخت ہیں ایک تین یعنی انجیر، دوسرے زیتون اور ایک پہاڑ طور اور ایک شہر یعنی مکہ مکرمہ کی، اس تخصیص کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ یہ دونوں درخت کثیر البرکت کثیر المنافع ہیں جس طرح طور پہاڑ اور شہر مکہ کثیر البرکت ہیں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں تین اور زیتون کے ذکر سے مراد وہ جگہ ہو جہاں یہ درخت کثرت سے پیدا ہوتے ہیں اور وہ ملک شام ہے جو معدن انبیاء علیہم السلام ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اسی ملک میں مقیم تھے انکو ہجرت کرا کر مکہ معظمہ لایا گیا تھا اسطرح ان قسموں میں تمام وہ مقامات مقدسہ شامل ہو گئے جہاں خاص خاص انبیاء علیہم السلام پیدا اور مبعوث ہوئے، ملک شام عام انبیاء علیہم السّلام کا وطن اور مسکن ہے۔ کوہِ طور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حق تعالیٰ کے ساتھ ہمکلام ہونے کی جگہ ہے اور سینین یا سینا، اُس مقام کا نام ہے جہاں یہ پہاڑ واقع ہے اور

بلد امین مکہ مکرمہ خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کا مولد و مسکن ہے ۔

ان چار چیزوں کی قسم کھا کر فرمایا گیا لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ، تقویم کے لفظی معنے کسی چیز کے قوام ، اور بنیاد کو درست کرنے کے ہیں ۔ احسنِ تقویم سے مراد یہ ہے کہ اسکی جبلت و فطرت کو بھی دوسری مخلوقات کے اعتبار سے احسن بنایا گیا اور اُس کی جسمانی ہیئت اور شکل و صورت کو بھی دُنیا کے سب جانداروں سے بہتر اور حسین بنایا گیا ۔

انسان تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ حسین ہے ۔ جسکا حاصل یہ ہے کہ انسان کو حق تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ حسین بنایا ہے ۔ ابن عربی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں کوئی انسان سے احسن نہیں کیونکہ اُس کو اللہ تعالیٰ نے حیات کیساتھ عالم، قادر، متکلم، سمیع، بصیر، مُدبّر اور حکیم بنایا ہے اور یہ سب صفات در اصل خود حق سبحانہٗ و تعالیٰ کی ہیں ۔ چنانچہ بخاری و مسلم کی روایت میں آیا کہ؛ اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السّلام کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا ہے ۔ مراد اس سے یہی ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کا کوئی درجہ اس کو بھی دیا گیا ہے ورنہ حق تعالیٰ ہر شکل و صورت سے بری ہے (قرطبی)

....

....

....

حُسنِ انسانی کا ایک عجیب واقعہ قرطبی نے اس جگہ نقل کیا ہے کہ عیسیٰ بن موسیٰ ہاشمی جو خلیفہ ابو جعفر منصور کے دربار کے مخصوص لوگوں میں سے تھے اور اپنی بیوی سے بہت محبت رکھتے تھے ایک روز چاندنی رات میں بیوی کے ساتھ بیٹھے ہوئے بول اُٹھے انت طالق ثلاثًا ان لم تکونی احسن من القمر یعنی تم پر تین طلاق ہیں، اگر تم چاند سے زیادہ حسین نہ ہو، یہ کہتے ہی بیوی اُٹھ کر پردہ میں چلی گئی کہ آپ نے مجھے طلاق دیدی، بات ہنسی دل لگی کی تھی مگر طلاق کا حکم یہی ہے کہ کسی طرح بھی طلاق کا صریح لفظ بیوی کو کہدیا جائے تو طلاق ہو جاتی ہے خواہ ہنسی دل لگی ہی میں کہا جائے ۔ عیسیٰ بن موسیٰ نے رات بڑی بے چینی اور رنج و غم میں گزاری صبح کو خلیفہ وقت ابو جعفر منصور کے پاس حاضر ہوئے اور اپنا قصہ سُنایا اور اپنی پریشانی کا اظہار کیا منصور نے شہر کے فقہاء اہلِ فتویٰ کو جمع کر کے سوال کیا سب نے ایک ہی جواب دیا کہ طلاق ہو گئی کیونکہ چاند سے زیادہ حسین ہونے کا کسی انسان کے لئے امکان ہی نہیں، مگر ایک عالم جو امام ابو حنیفہؒ کے شاگردوں میں سے تھے خاموش بیٹھے رہے منصور نے پوچھا کہ آپ کیوں خاموش ہیں تب یہ بولے اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھکر سورۃ تین تلاوت کی اور فرمایا کہ امیر المؤمنین اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کا احسنِ تقویم میں ہونا بیان فرما دیا ہے، کوئی شے اس سے زیادہ حسین نہیں ۔ یہ سُن کر سب علماء فقہاء حیرت میں رہ گئے کوئی مخالفت نہیں کی اور منصور نے حکم دے دیا کہ طلاق نہیں ہوئی ۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق میں سب سے زیادہ حسین ہے ظاہر کے اعتبار سے بھی اور باطن کے اعتبار سے بھی، حسن و جمال کے اعتبار سے بھی اور بدنی ساخت کے اعتبار سے بھی، اس کے سر میں کیسے کیسے اعضاء کیسے کیسے عجیب کام کر رہے ہیں کہ ایک مستقل فیکٹری معلوم ہوتی ہے جسمیں بہت سی نازک باریک خود کار مشینیں چل رہی ہیں۔ یہی حال اسکے سینہ اور پیٹ کا ہے اسی طرح اسکے ہاتھ پاؤں کی ترکیب و ہیئت ہزاروں حکمتوں پر مبنی ہے۔ اسی لئے فلاسفہ نے کہا ہے کہ انسان ایک عالم اصغر یعنی پورے عالم کا ایک نمونہ ہے۔ سارے عالم میں جو چیزیں بکھری ہوئی ہیں وہ سب اسکے وجود میں جمع ہیں (قرطبی) صوفیائے کرام نے بھی اس کی تائید کی اور بعض حضرات نے انسان کے سر سے پیر تک کا سراپا لیکر اشیائے عالم کے نمونے اسمیں دکھلائے ہیں۔

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ، پہلے جملے میں ساری مخلوقات اور کائنات سے احسن بنانے کا بیان تھا، اس جملے میں اسکے بالمقابل یہ بتلایا گیا ہے کہ جس طرح وہ اپنی ابتدا اور شباب میں ساری مخلوقات سے زیادہ حسین اور سب سے بہتر تھا آخر میں اس پر یہ حالت بھی آتی ہے کہ وہ بد سے بدتر اور بُرے سے بُرا ہو جاتا ہے ظاہر یہ ہے کہ بدتری اور بُرائی اُس کی ظاہری جسمانی حالت کے اعتبار سے بتلائی گئی ہے کہ شباب ڈھلنے کے بعد شکل و صورت بدلنے لگتی ہے بڑھاپا اسکا روپ بالکل بدل ڈالتا ہے، بدہیئت بدشکل نظر آنے لگتا ہے بیکار اور دوسروں پر بار ہو کر رہ جاتا ہے کسی کے کام نہیں آتا، بخلاف دوسرے جانوروں کے کہ وہ آخر تک اپنے کام میں لگے رہتے ہیں، انسان اُن سے دودھ اور سواری باربرداری کے اور دوسری قسم کے سیکڑوں کام لیتے ہیں، وہ ذبح کر دیئے جائیں یا مر جائیں تو بھی اُن کی کھال، بال، ہڈی، غرض جسم کا ریزہ ریزہ انسانوں کے کام میں آتا ہے بخلاف انسان کے کہ جب وہ بیماری اور بڑھاپے میں عاجز و درماندہ ہو جاتا ہے تو مادی اور دُنیاداری کے اعتبار سے کسی کام کا نہیں رہتا مرنیکے بعد بھی اسکے کسی جزء سے کسی انسان یا جانور کو فائدہ نہیں پہنچتا، خلاصہ یہ ہے کہ اسکے اسفل السافلین میں پہنچ جانے سے مراد اس کی مادی اور جسمانی کیفیت ہے۔ یہ تفسیر حضرت ضحاک وغیرہ ائمۂ تفسیر سے منقول ہے (کمافی القرطبی)

اس تفسیر پر اگلی آیت میں جو مؤمنین صالحین کے استثناء یعنی اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ کا ذکر ہے اسکا یہ مطلب نہیں کہ ان پر بڑھاپے میں کے حالات اور عجز و درماندگی نہیں آتی بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس جسمانی بیکاری اور مادی خرابی کا نقصان ان کو نہیں پہنچتا بلکہ نقصان صرف اُن لوگوں کو پہنچتا ہے جنھوں نے اپنی ساری فکر اور توانائی اسی مادی درستی پر خرچ کی تھی وہ اب ختم ہوگئی اور آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں بخلاف مؤمنین صالحین کے کہ انکا اجر و ثواب کبھی قطع ہونیوالا نہیں۔ اگر دُنیا میں بڑھاپے کی بیماری کمزوری اور عجز سے سابقہ بھی پڑا تو آخرت میں اُنکے لئے درجاتِ عالیہ اور راحت ہی راحت موجود ہے اور بڑھاپے کی بیکاری میں بھی عمل کم ہو جانیکے باوجود انکے نامۂ اعمال میں وہ سب اعمال لکھے جاتے ہیں جو وہ قوت کے زمانے میں کیا کرتا تھا حضرت

انسؓ کی روایت ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ سلم نے فرمایا کہ جب کوئی مسلمان کسی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالےٰ اسکے اعمال لکھنے والے فرشتے کو حکم دیدیتے ہیں کہ جو جو عمل خیر یہ اپنی تندرستی میں کیا کرتا تھا وہ سب اسکے اعمال نامہ میں لکھتے رہو (رواہ البغوی فی شرح السنۃ والبخاری عن ابی موسیٰ مثلہ فی المریض والمسافر) اسکے علاوہ اس مقام پر مؤمنین صالحین کی جزا جنت اور اسکی نعمتوں کو بیان کرنیکے بجائے لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ فرمایا ہے یعنی اُن کا اجر کبھی مقطوع و منقطع ہونیوالا نہیں ۔ اسمیں اشارہ اسطرف بھی ہوسکتا ہے کہ اُن کا یہ صلہ دُنیا کی مادّی زندگی ہی سے شروع ہو جاتا ہے ۔ حق تعالیٰ اپنے مقبول بندوں کے لئے بڑھاپے اور ضعف میں ایسے مخلص رفقار مہیّا فرما دیتے ہیں جو اُن کے آخری لمحہ تک ان سے رُوحانی فوائد اُٹھاتے ہیں اور انکی ہر طرح کی خدمت کرتے ہیں اسی طرح بڑھاپے کا وہ وقت جب انسان مادّی اور جسمانی طور پر معطّل بیکار اور لوگوں پر بار سمجھا جاتا ہے ، اللہ کے یہ بندے اُسوقت بھی بیکار نہیں ہوتے ۔ اور بعض حضرات مفسرین نے اس آیت کی تفسیر یہ فرمائی ہے کہ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ عام انسانوں کے لئے نہیں بلکہ کفّار و فجّار کے لئے ہے ۔ جنھوں نے خداداد احسن تقویم اور انسانی کمالات و شرافت اور عقل کو مادّی لذائذ کے پیچھے برباد کر دیا تو اس ناشکری کی سزا میں اُن کو اسفل السافلین میں پہنچا دیا جائے گا ، اس صورت میں اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کا استثنار اپنے ظاہری مفہوم پر رہتا ہے کہ اسفل سافلین میں پہنچنے سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو ایمان لائے اور عمل صالح کے پابند رہے کیونکہ ان کا اجر ہمیشہ جاری رہے گا (کذا فی المظہری)

فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ، پچھلی آیات میں تخلیق انسانی کے کمال اور اُس پر حق تعالیٰ کے خاص انعام کا پھر بڑھاپے میں حالات کے انقلاب کا ذکر فرما کر اس آیت میں منکرین قیامت کو تنبیہ کی گئی ہے کہ قدرتِ الٰہیہ کے ایسے مناظر اور انقلابات دیکھنے کے بعد بھی کیا گنجائش ہے کہ تم آخرت اور قیامت کی تکذیب کرو ، کیا اللہ تعالیٰ سب حکومت کرنے والوں پر حاکم نہیں ۔

مسئلہ ۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ سلم نے فرمایا کہ جو شخص سورۂ تین پڑھے اور اس آیت پر پہنچے اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ تو اُس کو چاہیئے کہ یہ کلمہ کہے بَلٰى وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ اس لئے حضرات فقہار نے فرمایا کہ یہ کلمہ پڑھنا مستحب ہے ۔

تمّت سُورة التّين والحمد للہ ۳۰ شعبان سنہ ۱۳۹۱ھ

سُورَۃ العَلَق

سُوْرَۃُ العَلَقِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ تِسْعَ عَشَرَۃَ اٰیَۃً

سورۂ علق مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی اُنیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ﴿۱﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ﴿۲﴾ اِقْرَاْ وَ

پڑھ اپنے رب کے نام سے جو سب کا بنانیوالا بنایا آدمی کو جمے ہوئے لہو سے پڑھ اور

رَبُّکَ الْاَکْرَمُ ﴿۳﴾ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ﴿۴﴾ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ﴿۵﴾ کَلَّآ

تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے علم سکھایا قلم سے سکھلایا آدمی کو جو وہ نہ جانتا تھا کوئی نہیں

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰٓی ﴿۶﴾ اَنْ رَّاٰہُ اسْتَغْنٰی ﴿۷﴾ اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰی ﴿۸﴾

آدمی سر چڑھتا ہے اس سے کہ دیکھے اپنے آپ کو بے پروا بیشک تیرے رب کیطرف پھر جانا ہے

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْھٰی ﴿۹﴾ عَبْدًا اِذَا صَلّٰی ﴿۱۰﴾ اَرَءَیْتَ اِنْ کَانَ عَلَی الْھُدٰٓی ﴿۱۱﴾

تو نے دیکھا اُس کو جو منع کرتا ہے ایک بندہ کو جب وہ نماز پڑھے بھلا دیکھ تو اگر ہوتا نیک راہ پر

اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰی ﴿۱۲﴾ اَرَءَیْتَ اِنْ کَذَّبَ وَ تَوَلّٰی ﴿۱۳﴾ اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ

یا سکھاتا ڈر کے کام بھلا دیکھ تو اگر جھٹلایا اور منہ موڑا یہ نہ جانا کہ اللہ

یَرٰی ﴿۱۴﴾ کَلَّا لَئِنْ لَّمْ یَنْتَہِ ۬ لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِیَۃِ ﴿۱۵﴾ نَاصِیَۃٍ کَاذِبَۃٍ خَاطِئَۃٍ ﴿۱۶﴾

دیکھتا ہے کوئی نہیں اگر باز نہ آئے گا ہم گھسیٹیں گے چوٹی پکڑ کر کیسی چوٹی جھوٹی گنہگار

فَلْیَدْعُ نَادِیَہٗ ﴿۱۷﴾ سَنَدْعُ الزَّبَانِیَۃَ ﴿۱۸﴾ کَلَّا ؕ لَا تُطِعْہُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴿۱۹﴾ ع

اب بلا لیوے اپنی مجلس والوں کو، ہم بھی بلاتے ہیں پیادے سیاست کرنے کو، کوئی نہیں مت مان اسکا کہا اور سجدہ کر اور نزدیک ہو

ع ۱۹ / ۲۱ السجدۃ

خُلاصۂ تفسیر

اقرأ سے مالم یعلم تک سب سے پہلی وحی ہے جس کے نزول سے نبوت کی ابتدا ہوئی جسکا قصہ حدیث شیخین

میں یہ ہے کہ عطاءِ نبوت کے قریب زمانے میں آپ کو از خود خلوت پسند ہو گئی، آپ غارِ حرا میں تشریف لیجا کر کئی کئی شب رہتے، ایک روز دفعۃً جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور آپ سے کہا کہ اِقْرَاْ یعنی پڑھئے، آپ نے فرمایا کہ مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ، یعنی میں کچھ پڑھا ہوا نہیں، انھوں نے خوب آپ کو زور سے دبایا پھر چھوڑ دیا اور پھر کہا اِقْرَاْ، آپ نے پھر وہی جواب دیا، اسی طرح تین بار کیا پھر آخر میں دبانے کے بعد چھوڑ کر کہا اِقْرَاْ الیٰ مالم یعلم۔

اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (پر جو) قرآن (نازل ہوا کریگا جس میں اسوقت کی نازل ہونے والی آیتیں بھی داخل ہیں) اپنے رب کا نام لے کر پڑھا کیجئے (یعنی جب پڑھئے تو بسم اللہ الرحمن الرحیم کہہ کر پڑھا کیجئے جیساکہ اس آیت میں اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ الخ میں قرآن کے ساتھ اعوذ باللہ پڑھنے کا حکم ہوا ہے اور ان دونوں امر سے جو اصل مقصود ہے یعنی توکل واستعانت وہ تو واجب ہے اور زبان سے کہہ لینا مسنون ومندوب ہے اور گو اصل مقصود کے اعتبار سے اس آیت کے نزول کے وقت بسم اللہ کا آپکو معلوم ہونا ضروری نہیں لیکن بعض روایات میں اس سورت کے ساتھ بسم اللہ الرحمن الرحیم کا نازل ہونا بھی آیا ہے اخرجہ الواحدی عن عکرمۃ والحسن انھما قالا اول ما نزل بسم اللہ الرحمن الرحیم واوّل سورۃ اقرأ واخرجہ ابن جریر وغیرہ عن ابن عبّاس انہ قال اوّل ما نزل جبریل علیہ السلام علی النبی صلے اللہ علیہ وسلم قال یا محمّد استعذ ثم قل بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کذا فی روح المعانی، اور ان آیتوں میں جو قرأۃ کو اسمِ الٰہی کے ساتھ افتتاح کرنے کا حکم ہوا ہے اس حکم میں خود ان آیتوں کا داخل ہونا ایسا ہے کہ جیسے کوئی شخص دوسرے سے کہے کہ اِسْمَعْ مَا اَقُوْلُ لَکَ یعنی میں جو کچھ تجھ سے کہوں تو اس کو سُن، تو خود اس جملہ کے سُننے کا حکم کرنا بھی اس کو مقصود ہے پس حاصل یہ ہوگا کہ خواہ ان آیتوں کو پڑھو یا جو آیات بعد میں نازل ہوں گی ان کو پڑھو سب کی قرارت اسمِ الٰہی سے ہونا چاہیئے اور آپ کو بعلم ضروری معلوم ہو گیا کہ یہ قرآن اور وحی ہے۔ اور حدیثوں میں جو آپ کا ڈر جانا اور ورقہ ابن نوفل سے بیان کرنا آیا ہے وہ بوجہ شبہ کے نہ تھا بلکہ خوف وہیبت وحی سے اضطراری تھا اور ورقہ سے بیان کرنا مزید اطمینان وزیادت ایقان کے لئے تھا نہ کہ عدم ایقان کے سبب، اور معلم متعلم سے ابجد شروع کرانے کے وقت کہتا ہے کہ ہاں پڑھ، پس اس سے تکلیف مالا یطاق لازم نہیں آتی اور آپ کا عذر فرمانا یا تو اسوجہ سے ہے کہ آپ کو اس جملے کے معنے متعین نہ ہوئے ہوں کہ مجھ سے کیا پڑھوانا چاہتے ہیں اور یہ امر کوئی خلافِ شان نہیں ہے یا باوجود تعیین مراد کے اس سبب سے ہے کہ قرارت کا استعمال اکثر لکھی ہوئی چیز کو پڑھنے کے معنے میں آتا ہے تو آپ نے بوجہ حرف شناس نہ ہونے کے یہ عذر فرمایا ہو اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کا دبانا بظنِ غالب واللہ اعلم بحقیقۃ الحال اسلئے ہوگا کہ آپکے اندر بارِ وحی کے تحمل کی استعداد پیدا کر دیں اور لفظ رب سے اشارہ اسطرف ہے کہ ہم آپ کی مکمل تربیت کریں گے اور نبوت کے درجاتِ اعلیٰ پر پہنچا دینگے آگے رب کی صفت ہے یعنی وہ ایسا رب ہے) جس نے (مخلوقات کو) پیدا کیا (اس وصف کی تخصیص میں یہ نکتہ ہے کہ حق تعالیٰ کی نعمتوں میں اول ظہور اس نعمت کا ہوتا ہے تو تذکیر میں اسکا مقدم ہونا مناسب ہے

اور نیز خلق دلیل ہے خالق پر اور سب سے اہم اور اقدم معرفت خالق ہے آگے بطور تخصیص بعد تعمیم کے ارشاد ہے کہ) جس نے (سب مخلوقات میں سے بالخصوص) انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا (اس تخصیص بعد تعمیم میں اشارہ ہے کہ نعمتِ خلق میں بھی عام مخلوقات سے زیادہ انسان پر انعام ہے کہ اس کو کس درجہ تک ترقی دی کہ صورت کیسی بنائی، عقل و علم سے مشرف بنایا، پس انسان کو زیادہ شکر اور ذکر کرنا چاہئے، اور تخصیص علق کی شاید اسلئے ہے کہ یہ ایک برزخی حالت ہے کہ اسکے قبل نطفہ اور غذا و عنصر ہے اور اسکے بعد مضغہ اور ترکیب عظام و نفخ روح ہے پس گویا وہ جمیع احوال متقدمہ و متاخرہ کے درمیان ہے آگے قرارت کو مقصود اہم قرار دینے کیلئے ارشاد ہے کہ) آپ قرآن پڑھا کیجئے (حاصل یہ کہ پہلے امر یعنی اقرأ باسم ربک سے یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ یہاں اصل مقصود ذکر اسم اللہ ہے بلکہ قرارت خود بھی فی نفسہا مقصود ہے کیونکہ تبلیغ کا ذریعہ یہی قرارت ہے اور تبلیغ ہی اصل کام صاحبِ وحی کا ہے پس اس تکرار میں آپ کی نبوت اور مامور بالتبلیغ ہونے کا اظہار بھی ہوگیا) اور (آگے اُس عذر کو رفع کر دینے کیطرف اشارہ ہے جو آپ نے اوّل جبرئیل علیہ السلام سے پیش کیا تھا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، اس کے لئے ارشاد فرمایا کہ) آپ کا رب بڑا کریم ہے (جو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور وہ ایسا ہے) جس نے (لکھے پڑھوں کو نوشتہ) قلم سے تعلیم دی (اور عموماً و مطلقاً) انسان کو (دوسرے ذرائع سے) ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ نہ جانتا تھا (مطلب یہ کہ اوّل تو تعلیم کچھ کتابت میں منحصر نہیں کیونکہ دوسرے طریقوں سے بھی تعلیم کا مشاہدہ کیا جاتا ہے، ثانیاً اسباب مؤثر بالذات نہیں، مسبب حقیقی اور علم دینے والے ہم ہیں، پس گو آپ لکھنا نہیں جانتے مگر ہم نے جب آپ کو قرارت کا امر کیا ہے تو ہم دوسرے ذریعہ سے آپ کو قرارت اور حفظِ علوم وحی پر قدرت دیدیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا، پس ان آیات میں آپ کی نبوت اور اُس کے مقدمات و متممات کا پورا بیان ہوگیا اور چونکہ صاحبِ نبوت کی مخالفت غایت درجہ کا گناہ اور شنیع امر ہے اس لئے آئندہ آیات میں جن کا نزول آیات اولیٰ سے ایک مدت کے بعد ہوا ہے آپ کے ایک خاص مخالف یعنی ابوجہل کی مذمت عام الفاظ سے ہے جس میں دوسرے مخالفین بھی شامل ہو جاویں، جسکا سببِ نزول یہ ہے کہ ایک بار ابوجہل نے آپکو نماز پڑھتے دیکھا کہنے لگا کہ میں آپ کو اس سے بارہا منع کر چکا ہوں، آپ نے اس کو جھڑک دیا تو کہنے لگا کہ مکہ میں سب سے بڑا مجمع میرے ساتھ ہے اور یہ بھی کہا تھا کہ اگر اب کی بار نماز پڑھتے دیکھوں گا تو نعوذ باللہ آپ کی گردن پر پاؤں رکھدوں گا چنانچہ ایک بار اس قصد سے چلا مگر قریب جا کر رُک گیا اور پیچھے ہٹنے لگا، لوگوں نے وجہ پوچھی کہنے لگا مجھ کو ایک خندق آگ کی حائل معلوم ہوئی اور اسمیں پردار چیزیں نظر آئیں آپ نے فرمایا وہ فرشتے تھے اگر اور آگے آتا تو فرشتے اسکو بوٹی بوٹی کر کے نوچ ڈالتے اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں کذا فی الدر المنثور عن الصحاح وغیرہا من کتب الحدیث ارشاد ہے کہ) سچ مچ بیشک (کافر) آدمی حد (آدمیت) سے نکل جاتا ہے اسوجہ سے کہ اپنے آپ کو (ابنائے جنس سے) مستغنی دیکھتا ہے (کقولہ تعالیٰ ولو بسط اللہ الرزق لعبادہ لبغوا الخ حالانکہ اس استغنا پر سرکشی حماقت ہے کیونکہ کسی کو گو مخلوق سے من وجہ استغنا ہو بھی جاوے لیکن حق تعالیٰ سے

استغنار تو کسی حال میں نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ آخر میں) اے مخاطب (عام) تیرے رب ہی کی طرف سب کا لوٹنا ہوگا (اور اس وقت بھی مثل حالت حیات کے اس کی قدرت کے احاطہ میں گھرا ہوگا اور اس حالت میں جو اسکو طغیان کی سزا ہوگی اس سے بھی کہیں نہ بھاگ سکے گا پس ایسا عاجز ایسے قادر سے کب مستغنی ہو سکتا ہے تو اپنے کو مستغنی سمجھنا اور اس کی بنا پر سرکشی کرنا بڑی بیوقوفی ہے، آگے بصورت استفہام تعجب ہے اس کی سرکشی پر یعنی) اے مخاطب (عام) بھلا اس شخص کا حال تو بتلا جو (ہمارے) ایک (خاص) بندے کو منع کرتا ہے جب وہ (بندہ) نماز پڑھتا ہے (مطلب یہ کہ اس شخص کا حال دیکھ کر تو بتلا کہ اس سے زیادہ عجیب بات بھی کوئی ہے حاصل یہ کہ نماز کو نماز سے روکنا نہایت ہی بُری اور عجیب بات ہے، آگے اسی تعجیب کی تاکید و تقویت کے لئے مکرر فرماتے ہیں کہ) اے مخاطب (عام) بھلا یہ تو بتلا کہ اگر وہ بندہ (جس کو نماز سے روکا گیا ہے) ہدایت پر ہو (کہ جو کمال لازمی ہے) یا وہ (دوسروں کو بھی) تقویٰ کی تعلیم دیتا ہو (جو کمال متعدی یعنی دوسروں کی نفع رسانی ہے اور شاید کلمہ تردید لانے سے اشارہ اس طرف ہو کہ اگر ان میں سے ایک صفت بھی ہوتی تب بھی منع کرنے والے کی مذمت کے لئے کافی تھی چہ جائیکہ دونوں ہوں اور) اے مخاطب (عام) بھلا یہ تو بتلا کہ اگر وہ شخص (منع کرنے والا دین حق کو) جھٹلاتا ہو اور (دین حق سے) روگردانی کرتا ہو (یعنی نہ عقیدہ رکھتا ہو اور نہ عمل، یعنی اول تو یہ دیکھو کہ نماز سے منع کرنا کتنا بُرا ہے پھر بالخصوص یہ دیکھو کہ جب منع کرنے والا ایک گمراہ اور جس کو منع کر رہا ہے وہ ہدایت کا اعلیٰ نمونہ ہے تو یہ کتنی عجیب بات ہے۔ آگے اس منع کرنے پر اس کو وعید ہے یعنی) کیا اس شخص کو یہ خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ (اسکی سرکشی اور اس سے پیدا ہونے والے اعمال کو) دیکھ رہا ہے (اور اس پر سزا دیگا، آگے اس پر زجر ہے یعنی اسکو) ہرگز (ایسا) نہیں (کرنا چاہیئے اور) اگر یہ شخص (اپنی اس حرکت سے) باز نہ آوے گا تو ہم (اس کو) پٹھے پکڑ کر جو کہ دروغ اور خطا میں آلودہ پٹھے ہیں (جہنم کی طرف) گھسیٹیں گے (ناصیہ سر کے اگلے بالوں کو کہا جاتا ہے جن کو اردو میں پٹھے بولتے ہیں اس کی صفت میں کاذبہ خاطئہ مجازاً فرمایا اور اس کو جو اپنے مجمع پر گھمنڈ ہے اور ہمارے پیغمبر کو دھمکاتا ہے) سو یہ اپنی مجلس والوں کو بُلالے (اگر اس نے ایسا کیا تو) ہم بھی دوزخ کے پیادوں کو بُلالیں گے (چونکہ اُس نے نہیں بُلایا اس لئے اللہ نے ان فرشتوں کو بھی نہیں بلایا کما روی الطبری عن قتادہ مرسلاً قال النبی صلے اللہ علیہ وسلم لو فعل ابوجہل لاخذتہ الملٰئکۃ الزبانیۃ عیاناً۔ آگے پھر زیادتِ زجر کے لئے اس کو تنبیہ ہے کہ اسکو) ہرگز (ایسا) نہیں (کرنا چاہیئے مگر) آپ اس نالائق کی ان حرکتوں کی کچھ پرواہ نہ کیجئے اور) اسکا کہنا نہ مانیئے (جیسا اب تک بھی نہیں مانا) اور (بدستور) نماز پڑھتے رہیئے اور (خدا کا) قرب حاصل کرتے رہیئے (اسمیں ایک لطیف وعدہ ہے کہ حق تعالیٰ آپکو ان لوگوں کے ضرر سے محفوظ رکھیگا کیونکہ نماز سے قرب ہوتا ہے اور قرب موجب عظمت ہے الا لحکمۃ خاصۃ، پس ایسے اُمور کی طرف ذرا التفات نہ کیجئے اپنے کام میں لگے رہیئے۔)

معارف و مسائل

وحی نبوت کی ابتدا اور سب سے پہلی وحی | صحیحین اور دوسری معتبر روایات سے ثابت اور جمہور سلف و خلف کا اس پر

اتفاق ہے کہ وحی کی ابتدا سورۂ علق یعنی اقرأ سے ہوئی ہے اور اس سورۃ کی ابتدائی پانچ آیتیں مالم یعلم تک سب سے پہلے نازل ہوئیں۔ بعض حضرات نے سورۂ مدثر کو سب سے پہلی سورت قرار دیا ہے اور بعض نے سورۂ فاتحہ کو۔ امام بغوی نے فرمایا کہ جمہور سلف وخلف کے نزدیک صحیح یہی ہے کہ سب سے پہلے سورۂ اقرأ کی پانچ آیتیں نازل ہوئیں (کذا روی عن ابن عباس والزہری وعمرو بن دینار۔ دُرِ منثور) اور جن حضرات نے سورۂ مدثر کو پہلی سورت فرمایا ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ اقرأ کی پانچ آیتیں نازل ہونے کے بعد نزولِ قرآن میں ایک مدت تک توقف رہا جس کو زمانہ فترت کا کہا جاتا ہے اور وحی کی تاخیر وتوقف سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو سخت رنج وغم پیش آیا اسکے بعد اچانک پھر حضرت جبرئیل امین سامنے آئے اور سورۂ مدثر کی آیتیں نازل ہوئیں اسوقت بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی اور ملاقات جبرئیل سے وہی کیفیت طاری ہوئی جو سورۂ اقرأ کے نزول کے وقت پیش آئی تھی جس کا بیان آگے آرہا ہے اس طرح فترت کے بعد سب سے پہلے سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں اس لحاظ سے اسکو بھی پہلی سورت کہہ سکتے ہیں اور سورۂ فاتحہ کو جن حضرات نے پہلی سورت فرمایا ہے اُس کی بھی ایک وجہ ہے وہ یہ کہ مکمل سورت سب سے پہلے سورۂ فاتحہ ہی نازل ہوئی اس سے پہلے چند سورتوں کی متفرق آیات ہی کا نزول ہوا تھا (مظہری) صحیحین کی ایک طویل حدیث میں نبوت اور وحی کی ابتدا کا واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے کہ اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ سب سے پہلے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر سلسلہ وحی رویائے صالحہ یعنی سچے خوابوں سے شروع ہوا جس کی کیفیت یہ تھی کہ جو کچھ آپ خواب میں دیکھتے بالکل اسکے مطابق واقعہ پیش آتا اور اسمیں کسی تعبیر کی بھی ضرورت نہ تھی، صبح کی روشنی کی طرح واضح طور پر خواب میں دیکھا ہوا واقعہ سامنے آجاتا تھا۔

اس کے بعد رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مخلوق سے یکسوئی اور خلوت میں عبادت کرنیکا داعیہ قوی پیش آیا جس کے لئے آپ نے غارِ حرار کو منتخب فرمایا (یہ غار مکہ مکرمہ کے قبرستان جنۃ المعلیٰ سے کچھ آگے ایک پہاڑ پر ہے جسکو جبل النور کہا جاتا ہے اس کی چوٹی دُور سے نظر آتی ہے) حضرت صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ آپ اس غار میں جاکر راتوں کو رہتے اور عبادت کرتے تھے جب تک اہل وعیال کی خبرگیری کی ضرورت پیش نہ آتی وہیں مقیم رہتے تھے اور اس وقت کے لئے آپ ضروری توشہ لیجاتے تھے اور پھر توشہ ختم ہونے کے بعد حضرت خدیجہ اُمّ المومنین کے پاس تشریف لاتے اور مزید کچھ دنوں کے لئے توشہ لیجاتے یہاں تک کہ آپ اسی غارِ حرار میں تھے کہ اچانک آپ کے پاس حق یعنی وحی پہنچی۔ (غارِ حرار میں خلوت گزینی کی مدت میں علمار کا اختلاف ہے۔ صحیحین کی روایت ہے کہ آپ نے ایک ماہ یعنی پورے ماہ رمضان اسمیں قیام فرمایا۔ ابن اسحٰق نے سیرت میں اور زرقانی نے شرح مواہب میں فرمایا کہ اس سے زیادہ مدت کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں ہے اور یہ عبادت جو آپ غارِ حرار میں نزولِ وحی سے پہلے کرتے تھے اسوقت نماز وغیرہ کی تعلیم تو ہوئی نہ تھی، بعض حضرات نے فرمایا کہ نوح اور ابراہیم اور عیسیٰ علیہم السلام کی شرائع کے مطابق عبادت کرتے تھے مگر نہ کسی روایت سے اسکا ثبوت ہے اور نہ آپ کے اُمّی ہونے کی وجہ سے یہ احتمال صحیح ہے بلکہ ظاہر یہ ہے کہ اسوقت آپ کی عبادت محض مخلوق سے انقطاع

اور اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ خاص اور تفکر کی تھی (مظہری)

حضرت صدیقہ فرماتی ہیں کہ وحی آنے کی صورت یہ ہوئی کہ فرشتہ یعنی جبرئیل امین آپکے پاس آیا، اور آپ سے کہا اِقْرَأْ یعنی پڑھیئے، آپ نے فرمایا مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ یعنی میں پڑھنے والا نہیں ہوں (کیونکہ آپ اُمّی تھے، اور جبرئیل امین کے قول اِقْرَأْ کی مراد آپ پر اسوقت واضح نہ تھی کہ کیا اور کس طرح پڑھوانا چاہتے ہیں کیا کوئی لکھی ہوئی تحریر دیں گے جس کو پڑھنا ہوگا اس لئے اپنے اُمّی ہونے کا عذر کر دیا) حضرت صدیقہ کی روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میرے اس جواب پر جبرئیل امین نے مجھے آغوش میں لیکر اتنا دبایا کہ مجھے اسکی تکلیف محسوس ہونے لگی اس کے بعد مجھے چھوڑ دیا اور پھر وہی بات کہی اقْرَأْ میں نے پھر وہی جواب دیا کہ میں پڑھنے والا نہیں ہوں تو پھر جبرئیل امین نے دوبارہ آغوش میں لیکر اتنا دبایا کہ مجھے اس کی تکلیف محسوس ہونے لگی پھر چھوڑ دیا اور تیسری مرتبہ پھر کہا اقْرَأْ میں نے پھر وہی جواب دیا مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ تو تیسری مرتبہ پھر آغوش میں دبایا پھر چھوڑ کر کہا، اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ○ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ○

قرآن کی یہ (سب سے پہلی پانچ) آیتیں لیکر آپ گھر واپس تشریف لائے آپ کا دل کانپ رہا تھا حضرت خدیجہؓ کے پاس آکر فرمایا زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ مجھے ڈھانپو مجھے ڈھانپو (حضرت خدیجہ نے آپ پر کپڑے ڈالے) یہانتک کہ یہ ہیبت کی کیفیت رفع ہوئی (یہ کیفیت اور کپکپی جبرئیل علیہ السلام کے خوف سے نہیں تھی کیونکہ آپ کی شان اس سے بہت بلند و بالا ہے بلکہ اس وحی کے ذریعہ جو نبوت و رسالت کی ذمہ داری آپ کو سونپی گئی اسکا بارِ گراں محسوس فرمانے اور ایک فرشتہ کو اُس کی اصلی ہیئت میں دیکھنے سے طبعی طور پر یہ ہیبت کی کیفیت پیدا ہوئی)

حضرت صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ افاقہ کے بعد رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ کو غارِ حرار کا پورا واقعہ سُنایا اور فرمایا کہ اس سے مجھ پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ مجھے اپنی جان کا خوف ہوگیا۔ حضرت خدیجہ ام المومنین رضہ نے عرض کیا کہ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا اللہ تعالیٰ آپ کو ہرگز ناکام نہ ہونے دیں گے کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ بوجھ میں دبے ہوئے لوگوں کا بوجھ اُٹھا لیتے ہیں۔ بے روزگار آدمی کو کسب پر لگا دیتے ہیں مہمانوں کی مہمانداری کرتے ہیں اور مصیبت زدوں کی امداد کرتے ہیں (حضرت خدیجہ رضہ لکھی پڑھی خاتون تھیں اُن کو شاید کتبِ سابقہ توریت و انجیل سے یا اسکے علماء سے یہ بات معلوم ہوئی ہوگی کہ جس شخص کے اخلاق و عادات ایسے کریمانہ ہوں وہ محروم و ناکام نہیں ہوا کرتا اسلئے اس طریقے سے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو تسلّی دی)

اس کے بعد حضرت خدیجہ رضہ آپ کو اپنے چچا زاد بھائی ورقہ ابن نوفل کے پاس لے گئیں یہ زمانہ جاہلیت ہی میں بُت پرستی سے تائب ہوکر نصرانی ہوگئے تھے (کیونکہ اسوقت کا دین حق یہی تھا) ورقہ ابن نوفل (لکھے پڑھے آدمی تھے عبرانی زبان بھی جانتے تھے اور عربی تو اُن کی مادری زبان تھی) وہ عبرانی زبان میں بھی لکھتے تھے اور انجیل کو عربی زبان میں لکھتے تھے اور اس وقت وہ بہت بوڑھے تھے، بڑھاپے کی وجہ سے بینائی

جاتی رہی تھی، حضرت خدیجہ رضؓ نے اُن سے کہا کہ میرے چچا زاد بھائی ذرا اپنے بھتیجے کی بات تو سُنو۔ ورقہ ابن نوفل نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے حال دریافت کیا تو آپ نے غارِ حرا میں جو کچھ دیکھا تھا بیان کر دیا۔ ورقہ بن نوفل نے سُنتے ہی کہا کہ یہ وہی ناموس یعنی فرشتہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اُتارا تھا کاش میں آپ کی نبوت کے زمانے میں قوی ہوتا، اور کاش کہ میں اُس وقت زندہ ہوتا جبکہ آپکی قوم آپ کو (وطن سے) نکالے گی۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے (تعجب سے پُوچھا) کیا میری قوم مجھے نکالدیگی، ورقہ نے کہا کہ بلاشبہ نکالے گی کیونکہ جب بھی کوئی آدمی وہ پیغامِ حق اور دینِ حق لیکر آیا ہے جو آپ لائے ہیں تو اُس کی قوم نے اُس کو ستایا ہے اور اگر میں نے وہ زمانہ پایا تو میں آپ کی بھرپور مدد کرونگا مگر ورقہ اسکے چند ہی روز کے بعد انتقال کر گئے اور اس واقعہ کے بعد وحیٔ قرآن کا سلسلہ رُک گیا (بخاری ومسلم) فترتِ وحی کی مدت کے متعلق سہیلی کی روایت یہ ہے کہ ڈھائی سال تک رہی اور بعض روایات میں تین سال کی مدت بیان کی گئی ہے (مظہری)

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ، بِاسْمِ رَبِّكَ میں لفظ اسم بڑھانے سے اسطرف اشارہ ہے کہ قرآن جب بھی پڑھیں اللہ کا نام لیکر یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر شروع کریں جیسا کہ خلاصہ تفسیر میں لکھا گیا ہے، دوسرا اشارہ اسمیں اُس عذر کے جواب کا ہے جو آپ نے پیش کیا تھا کہ میں قاری نہیں، باسمِ ربّک کے لفظ سے اسطرف اشارہ کیا گیا کہ اگرچہ آپ اپنی موجودہ حالت کے اعتبار سے اُمّی ہیں لکھے پڑھے نہیں مگر آپ کے رب کو سب قدرت ہے وہ اُمّی شخص کو اعلیٰ علوم اور خطابت کا سلیقہ اور فصاحت و بلاغت کا وہ درجہ دے سکتا ہے کہ جس کے سامنے بڑے بڑے لکھے پڑھے عاجز ہو جائیں جیسا کہ بعد میں اسکا ظہور ہوا (مظہری) اور اس جگہ اللہ تعالیٰ کے اسمارِ حسنیٰ میں سے لفظ ربّ کو خصوصیت سے اختیار کرنے میں اس مضمون کی مزید تائید و تاکید ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ آپ کا پروردگار ہے ہر طرح کی تربیت کرتا ہے وہ اُمّی ہونے کے باوجود آپ سے پڑھوا بھی سکتا ہے الّذی خلق صفاتِ الٰہیہ میں سے اس جگہ صفتِ تخلیق کو خصوصیت سے ذکر کرنے میں شاید یہ حکمت ہو کہ مخلوقات پر جیسے انعامات و احسانات حق تعالیٰ کے ہیں اُنمیں سب سے پہلا انعام اسکو وجود عطا کرنا ہے جو تخلیق ربّانی کے ذریعہ عطا ہوتا ہے، اور اس جگہ خَلَقَ کا مفعول یعنی جس چیز کو پیدا کیا وہ ذکر نہیں کی گئی اسمیں اشارہ عموم کیطرف ہے کہ ساری ہی کائنات اُس کی مخلوق ہیں۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اَلَّذِیْ خَلَقَ میں پوری کائنات کی تخلیق کا بیان ہوا تھا خَلَقَ الْاِنْسَانَ میں اشرف المخلوقات انسان کی تخلیق کا ذکر فرمایا کہ غور سے دیکھو تو پوری کائنات و مخلوقات کا خلاصہ انسان ہے، جہان میں جو کچھ ہے اُس کی نظائر انسان کے وجود میں موجود ہیں اسی لئے انسان کو عالمِ اصغر کہا جاتا ہے اور انسان کی تخصیص بالذکر کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نبوت و رسالت اور قرآن کے نازل کرنے کا مقصد احکامِ الٰہیہ کی تنفیذ و تعمیل ہے وہ انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ عَلَقَ کے معنے منجمد خون کے ہیں انسان کی تخلیق پر مختلف دَور گزرے اور گزرتے ہیں اُس کی ابتدار مٹی اور عناصر سے ہے پھر نطفہ سے اُس کے بعد عَلَقَہ

یعنی منجمد خون بنتا ہے پھر مُضغہ گوشت پھر ہڈیاں وغیرہ پیدا کیجاتی ہیں۔ علقہ ان تمام اَدوار تخلیق میں ایک درمیانہ حالت ہے اس کو اختیار کر کے اسکے اوّل و آخر کی طرف اشارہ ہوگیا۔

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ، یہاں لفظ اقرأ کو مکرر لایا گیا ہے جس کی ایک وجہ خلاصۂ تفسیر میں آچکی ہے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پہلا اقرأ تو خود آپ کے پڑھنے کے لئے فرمایا تھا، یہ دوسرا تبلیغ و دعوت اور لوگوں کو پڑھانے کے لئے فرمایا اور اگر محض تاکید کے لئے تکرار ہو تو وہ بھی کچھ بعید نہیں۔ اور صفت اکرم میں اسطرف اشارہ ہے کہ تخلیقِ عالم اور تخلیقِ انسان میں اللہ تعالیٰ کی اپنی کوئی غرض اور نفع نہیں بلکہ یہ سب بتقاضائے جود و کرم ہے، کہ بے مانگے کائنات کو وجود کی نعمتِ عظمیٰ عطا فرمائی۔

الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، تخلیقِ انسانی کے بعد اُس کی تعلیم کا بیان ہے کیونکہ تعلیم ہی وہ چیز ہے جو انسان کو دوسرے تمام حیوانات سے ممتاز اور تمام مخلوقات سے اشرف و اعلیٰ بناتی ہے پھر تعلیم کی عام صورتیں دو ہیں ایک زبانی تعلیم دوسرے بذریعہ قلم تحریر و خط سے۔ ابتدائے سورت میں لفظ اقرأ میں اگرچہ زبانی تعلیم ہی کی ابتداء ہے مگر اس آیت میں جہاں تعلیم دینے کا بیان آیا ہے اسمیں قلمی تعلیم کو مقدم کر کے بیان فرمایا ہے۔

تعلیم کا سب سے پہلا اور اہم ذریعہ قلم اور کتابت ہے ایک صحیح حدیث حضرت ابوہریرہ رضؓ کی روایت سے ہے جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لما خلق اللہ الخلق کتب فی کتابہ فھو عندہ فوق العرش، ان رحمتی غلبت غضبی، یعنی اللہ تعالیٰ نے ازل میں جب مخلوق کو پیدا کیا تو اپنی کتاب میں جو عرش پر اللہ تعالیٰ کے پاس ہے یہ کلمہ لکھا کہ "میری رحمت میرے غضب پر غالب رہے گی"

اور حدیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اوّل ما خلق اللہ القلم فقال لہٗ اکتب فکتب ما یکون الی یوم القیٰمۃ فھو عندہ فی الذکر فوق عرشہٖ، یعنی سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا اور اس کو حکم دیا کہ لکھے، اُس نے تمام چیزیں جو قیامت تک ہونے والی تھیں لکھدیں، یہ کتاب اللہ تعالیٰ کے پاس عرش پر ہے (قرطبی)

قلم کی تین قسمیں علماء نے فرمایا ہے کہ عالم میں قلم تین ہیں۔ ایک سب سے پہلا قلم جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور تقدیر کائنات لکھنے کا اُس کو حکم دیا، دوسرے فرشتوں کے قلم جس سے وہ تمام ہونے والے واقعات اور اُن کی مقادیر کو نیز انسانوں کے اعمال کو لکھتے ہیں۔ تیسرے عام انسانوں کے قلم جن سے وہ اپنے کلام لکھتے اور اپنے مقاصد میں کام لیتے ہیں اور کتابت درحقیقت بیان کی ایک قسم ہے اور بیان انسان کی مخصوص صفت ہے (قرطبی) امام تفسیر مجاہد نے ابو عمرو سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات میں چار چیزیں اپنے دستِ قدرت سے خود بنائیں اور اُن کے سوا باقی مخلوقات کے لئے حکم دیا کُنْ یعنی ہو جا وہ موجود ہوگئیں۔ یہ چار چیزیں یہ ہیں۔ قلم، عرش، جنت عدن، آدم علیہ السلام

علمِ کتابت سب سے پہلے دنیا میں کس کو دیا گیا بعض حضرات نے فرمایا کہ سب سے پہلے یہ فنِ کتابت ابوالبشر حضرت آدمؑ

کو سکھایا گیا تھا اور سب سے پہلے انھوں نے لکھنا شروع کیا (کعب احبار) اور بعض حضرات نے فرمایا کہ سب سے پہلے یہ فن حضرت ادریس علیہ السلام کو ملا ہے اور سب سے پہلے کاتب دُنیا میں وہی ہیں (ضحاک) اور بعض حضرات نے فرمایا کہ ہر شخص جو کتابت کرتا ہے وہ تعلیم منجانب اللہ ہی ہے۔

خط و کتابت اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے حضرت قتادہ رحمہ نے فرمایا کہ قلم اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے اگر یہ نہ ہوتا تو نہ کوئی دین قائم رہتا نہ دُنیا کے کاروبار درست ہوتے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ کا بہت بڑا کرم ہے کہ اُس نے اپنے بندوں کو اُن چیزوں کا علم دیا جن کو وہ نہیں جانتے تھے اور اُن کو جہل کی اندھیری سے نورِ علم کیطرف نکالا اور علمِ کتابت کی ترغیب دی کیونکہ اُس میں بیشمار اور بڑے منافع ہیں جن کا اللہ کے سوا کوئی احاطہ نہیں کرسکتا۔ تمام علوم و حِکَم کی تدوین اور اوّلین و آخرین کی تاریخ انکے حالات و مقالات اور اللہ تعالےٰ کی نازل کی ہوئی کتابیں سب قلم ہی کے ذریعہ لکھی گئیں اور رہتی دُنیا تک باقی رہیں گی، اگر قلم نہ ہو تو دُنیا و دین کے سارے ہی کام مختل ہوجائیں۔

علمائے سلف و خلف نے ہمیشہ خط و کتابت کا بہت اہتمام کیا ہے علمائے سلف و خلف نے ہمیشہ تعلیم خط و کتابت کا بڑا اہتمام کیا ہے جس پر اُن کی تصانیف کے عظیم الشان ذخائر آجتک شاہد ہیں۔ افسوس ہے کہ ہمارے اس دَور میں علماء و طلباء نے اس اہم ضرورت کو ایسا نظر انداز کیا ہے کہ سیکڑوں میں دو چار آدمی مشکل سے تحریر کتابت کے جاننے والے نکلتے ہیں فالی اللہ المشتکےٰ۔

رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کتابت کی تعلیم نہ دینے کا راز حق تعالیٰ جلّ شانہٗ نے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو لوگوں کے فکر و قیاس سے بالاتر بنانے کے لئے آپ کی جائے پیدائش سے لیکر آپ کے ذاتی حالات تک سب ایسے بنائے تھے کہ جن میں کوئی انسان اپنی ذاتی کوشش و محنت سے کوئی کمال حاصل نہیں کرسکتا۔ جائے پیدائش کے لئے عرب کا صحرا تجویز ہوا جو متمدن دُنیا اور علم و حکمت کے گہواروں سے بالکل کٹا ہوا تھا اور راستے اور مواصلات اتنے دشوار گزار تھے کہ شام و عراق اور مصر وغیرہ کے متمدن شہروں سے یہاں کے لوگوں کا کوئی جوڑ نہ تھا، اسی لئے عرب سب کے سب ہی اُمیین کہلاتے ہیں، ایسے ملک اور ایسے قبائل میں آپ پیدا ہوئے اور پھر حق تعالےٰ نے ایسے سامان کئے کہ عرب کے لوگوں میں جو خال خال کوئی علم و حکمت اور خط و کتابت سیکھ لیتا تھا، آپ کو اُسکے سیکھنے کا بھی موقع نہ دیا گیا، ان حالات میں پیدا ہونے والے انسان سے علم و حکمت اور اخلاقِ فاضلہ عالیہ کا کس کو تصوّر ہوسکتا ہے۔ اچانک حق تعالیٰ نے خلعتِ نبوّت سے نوازا اور علم و حکمت کا غیر منقطع سلسلہ آپ کی زبان مبارک پر جاری فرمادیا، فصاحت و بلاغت میں عرب کے بڑے بڑے شعراء و بلغاء آپکے سامنے عاجز ہوگئے یہ ایک ایسا کھلا ہوا معجزہ تھا کہ ہر آنکھوں والا اسکو دیکھ کر یہ یقین کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ کے کمالاتِ انسانی سعی و عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے غیبی عطیات ہیں، خط و کتابت کی تعلیم نہ دینے میں بھی یہی حکمت تھی (ماخوذ از قرطبی)

عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ، اس سے پہلی آیت میں تعلیم کے ایک خاص ذریعہ کا ذکر تھا جو عام طور پر تعلیم کے لئے استعمال ہوتا ہے یعنی قلمی تعلیم۔

ذریعۂ علم صرف قلم نہیں بلکہ بیشمار ذرائع ہیں اس آیت میں اس کا ذکر ہے کہ اصل تعلیم دینے والا اللہ تعالیٰ سُبحانہ ہے اور اُس کے لئے ذرائع تعلیم بیشمار ہیں، کچھ قلم ہی کیساتھ مخصوص نہیں اس لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو وہ علم دیا جس سے وہ پہلے ناواقف تھا، اسمیں قلم یا کسی دوسرے ذریعۂ تعلیم کا ذکر نہ فرمانے سے اسطرف اشارہ ہے کہ حق تعالیٰ کی یہ تعلیم انسان کی ابتدار آفرینش سے جاری ہے کہ اوّل اسمیں عقل پیدا کی جو سب سے بڑا ذریعۂ علم ہے، انسان اپنی عقل سے خود بغیر کسی تعلیم کے بہت سی چیزیں سمجھتا ہے پھر اسکے پس و پیش میں اپنی قدرتِ کاملہ کے ایسے مناظر اور دلائلِ قدرت رکھدیئے جن کا مشاہدہ کر کے وہ اپنی عقل سے اپنے پیدا کرنے والے کو پہچان سکے۔ پھر وحی اور الہام کے ذریعہ بہت سی چیزوں کا علم انسان کو عطا فرمایا اور بہت سی ضروری چیزوں کا علم انسان کے ذہن میں خود بخود پیدا فرمادیا جس میں کسی زبان یا قلم کی تعلیم کا دخل نہیں، ایک بے شعور بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کیساتھ ہی اپنی غذا کے مرکز یعنی ماں کی چھاتیوں کو پہچان لیتا ہے پھر چھاتی سے دودھ اُتارنے کے لئے منھ کو دبانا اسکو کس نے سکھایا اور کون سکھا سکتا تھا، پھر اس کو ایک ہنر رونے کا اللہ تعالیٰ نے اوّل ولادت ہی سے سکھا دیا، بچے کا یہ رونا اُس کی تمام ضروریات کو پورا کرنے کا ذریعہ بنتا ہے اُس کو روتا ہوا دیکھ کر ماں باپ اس فکر میں پڑ جاتے ہیں کہ اس کو کیا تکلیف ہے۔ اس کی بھوک پیاس، سردی، گرمی کی سب ضروریات اسی رو دینے سے ہی پوری ہوتی ہیں۔ یہ رونے کی تعلیم اس نومولود کو کون کرسکتا تھا اور کس طرح کرتا۔ یہ سب وہبی علم ہے جو اللہ تعالیٰ ہر جاندار کے خصوصًا انسان کے ذہن میں پیدا فرمادیتا ہے۔ اس ضروری علم کے بعد پھر زبانی تعلیم پھر قلمی تعلیم کے ذریعہ اس کے علوم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور مَا لَمْ يَعْلَمْ یعنی جس کو وہ نہیں جانتا تھا اس کے کہنے کی بظاہر کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ عادۃً تعلیم تو اُسی چیز کی ہوتی ہے جسکو انسان نہیں جانتا اس کے فرمانے میں اشارہ اسطرف ہے کہ اس خداداد علم و ہنر کو انسان اپنا ذاتی کمال نہ سمجھ بیٹھے، مَا لَمْ يَعْلَمْ سے اشارہ فرمادیا کہ انسان پر ایک ایسا وقت بھی آیا ہے جب وہ کچھ نہیں جانتا تھا جیساکہ قرآنِ کریم میں ہے أَخْرَجَكُم مِّن بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا یعنی اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے بطن سے ایسی حالت میں نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے، معلوم ہوا کہ انسان کو جو بھی علم و ہنر ملا ہے وہ اُسکا ذاتی نہیں بلکہ سب خالق و مالک کا عطیہ ہے۔ (مظہری) اور بعض حضرات مفسّرین نے اس آیت میں انسان سے حضرت آدم یا نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مراد قرار دیا ہے کیونکہ آدم علیہ السلام سب سے پہلے انسان ہیں جن کو تعلیم دی گئی وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا، اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم وہ آخری پیغمبر ہیں جن کی تعلیم میں تمام انبیاء سابقین کے علوم اور لوح و قلم کے علوم شامل ہیں کما قال ؎ ومن علومك علم اللوح والقلم

یہاں تک سورۂ اقرأ کی پانچ آیتیں سب سے پہلے نازل ہوئیں، اس کے بعد کی آیتیں کافی عرصہ کے بعد نازل ہوئی ہیں کیونکہ باقی آیتیں آخر سورت تک ابوجہل کے ایک واقعہ کے متعلق ہیں اور ابتدارِ وحی و نبوت میں تو

مکہ میں کوئی بھی آپ کا مخالف نہ تھا سب آپ کو امین کے لقب سے پکارتے تھے اور محبت و تعظیم کرتے تھے، ابوجہل کی مخالفت اور دشمنی خصوصاً نماز پڑھنے سے روکنے کا واقعہ جو آگے آنے والی آیات میں مذکور ہے ظاہر ہے کہ اُسوقت کا ہے جب رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نبوت و دعوت کا اعلان فرمایا اور شبِ معراج میں آپ کو نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا۔

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى، اس آیت کا روئے سخن اگرچہ ایک خاص شخص یعنی ابوجہل کیطرف ہے جس نے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تھی مگر عنوان عام رکھا ہے جسمیں عام انسانوں کی ایک کمزوری بیان کی گئی وہ یہ ہے کہ انسان جب تک دوسروں کا محتاج رہتا ہے تو سیدھا چلتا ہے اور جب اُس کو یہ گمان ہو جائے کہ میں کسی کا محتاج نہیں سب سے بے نیاز ہوں تو اسکے نفس میں طغیان یعنی سرکشی وغیرہ اور دوسروں پر ظلم وجور کے رجحانات پیدا ہو جاتے ہیں، جیساکہ عموماً مالداروں اور اقتدارِ حکومت والوں اور اولاد و احباب یا خدام کی کثرت رکھنے والوں میں اسکا بکثرت مشاہدہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے تموّل اور جماعت جتھے کی طاقت میں مست ہو کر کسی کو نظر میں نہیں لاتے، چونکہ ابوجہل کا بھی یہی حال تھا کہ مکہ مکرمہ کے خوشحال لوگوں میں سے تھا اور اسکے قبیلے بلکہ پورے شہر کے لوگ اسکی تعظیم و تکریم کرتے اور بات مانتے تھے وہ بھی اسی پندار میں مبتلا ہوا یہانتک کہ سیدالانبیاء اور اشرف الخلائق کی شان میں گستاخی کر بیٹھا۔ اگلی آیت میں ایسے سرکشوں کے بُرے انجام پر تنبیہ ہے۔

اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى، رُجعیٰ مثل بُشریٰ کے اسم مصدر ہے۔ معنے یہ ہیں کہ سب کو اپنے رب ہی کیطرف لوٹنا ہے اسکے ظاہر معنے تو یہی ہیں کہ مرنے کے بعد سب کو اللہ کے پاس جانا اور اچھے بُرے اعمال کا حساب دینا ہے اسوقت اس طغیانی اور سرکشی کے انجام بد کو آنکھوں سے دیکھ لیگا اور یہ بھی بعید نہیں کہ اس جملے میں مغرور انسان کے غرور کا علاج بتلایا گیا ہو کہ اے احمق تو اپنے آپ کو سب سے بے نیاز خود مختار سمجھتا ہے اگر غور کریگا تو اپنی ہر حالت بلکہ ہر حرکت و سکون میں تو اپنے آپ کو رب تعالیٰ کا محتاج پائیگا، اگر اُسنے تجھے کسی انسان کا محتاج بظاہر نہیں بنایا تو کم از کم اس کو تو دیکھ کہ اللہ تعالیٰ کا تو ہر چیز میں محتاج ہے اور انسانوں کی محتاجی سے بے نیاز سمجھنا بھی صرف ظاہری مغالطہ ہی ہے ورنہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مدنیّ الطبع بنایا ہے وہ اکیلا اپنی ضروریات میں سے کسی ایک ضرورت کو بھی پُورا نہیں کرسکتا، اپنے ایک لُقمہ کو دیکھے تو پتہ چلے گا کہ ہزاروں انسانوں اور جانوروں کی محنتِ شاقہ اور مدت دراز تک کام میں لگے رہنے کا نتیجہ یہ لُقمۂ تر ہے جو بے فکری کیساتھ نگل رہا ہے اور اتنے ہزاروں انسانوں کو اپنی خدمتمیں لگالینا کسی کے بس کی بات نہیں، یہی حال اسکے لباس اور تمام دوسری ضروریات کا ہے کہ ان کے مہیا کرنے میں ہزاروں لاکھوں انسانوں اور جانوروں کی محنت کا دخل ہے جو تیرے غلام نہیں اگر تو ان سب کو تنخواہیں دیکر بھی چاہتا کہ اپنے اس کام کو پُورا کرے تو ہرگز تیرے بس میں نہ آتا، ان باتوں میں غور و فکر انسان پر یہ راز کھولتا ہے کہ اسکی تمام ضروریات کے مہیّا کرنے کا نظام خود اسکا بنایا ہوا نہیں بلکہ خالقِ کائنات نے اپنی حکمتِ بالغہ سے بنایا اور چلایا ہے کسی دل میں ڈالدیا کہ زمین میں کاشت کا کام کرے، کسی کے دل میں یہ پیدا کر دیا کہ وہ لکڑی تراشنے اور نجاری کا کام کرے، کسی کے دل میں لوہار کے کام کی رغبت ڈالدی، کسی

کو محنت مزدوری کرنے ہی میں راضی کر دیا، کسی کو تجارت و صنعت کی طرف راغب کر کے انسانی ضروریات کے بازار لگا دیئے۔ نہ کوئی حکومت اسکا نظم قانون سے کر سکتی تھی نہ کوئی فرد۔ اسلئے اس غور و فکر کا لازمی نتیجہ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى یعنی انجام کار سب چیزوں کا حق تعالیٰ کی قدرت و حکمت کے تابع ہونا مشاہدہ میں آجاتا ہے۔

اَرَءَيْتَ الَّذِي يَنْهٰى عَبْدًا اِذَا صَلّٰى، اس آیت سے آخر سورۃ تک ایک واقعہ کیطرف اشارہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھنے کا حکم دیا اور آپ نے نماز پڑھنا شروع کی تو ابو جہل نے آپکو نماز پڑھنے سے روکا اور دھمکی دی کہ آئندہ نماز پڑھیں گے اور سجدہ کریں گے تو وہ معاذ اللہ آپ کی گردن کو پاؤں سے کچل دے گا، اسکے جواب اور اُس کو زجر کرنے کے لئے یہ آیات آئی ہیں انمیں فرمایا اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى، یعنی کیا وہ یہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے، یہاں یہ ذکر نہیں فرمایا کہ کس کو دیکھ رہا ہے اسلئے عام اور شامل ہے کہ نماز پڑھنے والی بزرگ ہستی کو بھی دیکھ رہا ہے اور اُس سے روکنے والے بدبخت کو بھی اور یہاں صرف اس جملہ پر اکتفا کیا گیا کہ ہم یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں، آگے دیکھنے کے بعد کیا حشر ہوگا اُس کے ذکر نہ کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ہولناک انجام قابلِ تصور نہیں۔

لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ، سفع مصدر سے مشتق ہے جس کے معنے سختی کے ساتھ کھینچنے کے ہیں اور ناصیہ سر کے اگلے بالوں کو کہا جاتا ہے جو پیشانی کے اوپر ہوتے ہیں جس شخص کے پیشانی کے بال کسی کے ہاتھ میں آجائیں وہ اسکے ہاتھ میں مجبور و مقہور ہو کر رہ جاتا ہے۔

كَلَّا لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ، یہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہے کہ ابو جہل کی بات پر کان نہ دھریں اور سجدہ اور نماز میں مشغول رہیں کہ یہی اللہ تعالیٰ کے قرب کا راستہ ہے۔

سجدے کی حالتمیں قبولیتِ دُعاء ابو داؤد میں حضرت ابوہریرہ رض کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اقرب ما یکون العبد من ربہ وھو ساجد فاکثروا الدعاء، یعنی بندہ اپنے رب سے قریب تر اسوقت ہوتا ہے جبکہ وہ سجدہ میں ہو اسلئے سجدہ میں بہت دُعا کیا کرو۔ اور ایک دوسری صحیح حدیث میں یہ لفظ بھی آئے ہیں فانہ قمن ان یستجاب لکم، یعنی سجدے کی حالت میں دُعا قبول ہونے کے لائق ہے۔

مسئلہ۔ نفل نمازوں کے سجدہ میں دُعا کرنا ثابت ہے، بعض روایاتِ حدیث میں اس دُعا کے خاص الفاظ بھی آئے ہیں وہ الفاظ ماثورہ پڑھے جائیں تو بہتر ہے۔ فرائض میں اسطرح کی دُعائیں ثابت نہیں، کیونکہ فرائض میں اختصار مطلوب ہے۔

مسئلہ۔ اس آیت کو پڑھنے اور سُننے والے پر سجدۂ تلاوت واجب ہے۔ صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابوہریرہ رض رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اس آیت پر سجدۂ تلاوت کرنا ثابت ہے واللہ اعلم

تمت سورۃ العلق ۵ رمضان ۱۳۹۱ھ

سُوْرَةُ القَدْر

سُوْرَةُ القَدْرِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ خَمْسُ اٰيَاتٍ

سورۂ قدر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی پانچ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝١ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝٢ لَيْلَةُ

ہم نے اس کو اُتارا شب قدر میں اور تو نے کیا سمجھا کہ کیا ہے شب قدر شب

الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝٣ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا

قدر بہتر ہے ہزار مہینے سے اُترتے ہیں فرشتے اور رُوح اُس میں

بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝٤ سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝٥

اپنے رب کے حکم سے ہر کام پر امان ہے وہ رات صبح کے نکلنے تک

وقف النبی علیہ السلام

ع ۵ - ۲۲

معانقہ ۱۸

خلاصۂ تفسیر

بیشک ہم نے قرآن کو شبِ قدر میں اُتارا ہے (تحقیق شبِ قدر میں نازل ہونے کی سُورۂ دُخان میں گزری ہے) اور (زیادت تشویق کے لئے فرماتے ہیں کہ) آپ کو کچھ معلوم ہے کہ شبِ قدر کیسی چیز ہے (آگے جواب ہے کہ) شبِ قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے (یعنی ہزار مہینہ تک عبادت کرنے کا جس قدر ثواب ہے اُس سے زیادہ شبِ قدر میں عبادت کرنیکا ثواب ہے، کذا فی الخازن اور وہ رات ایسی ہے کہ) اس رات میں فرشتے اور روح القدس (یعنی جبرئیل علیہ السلام) اپنے پروردگار کے حکم سے ہر امر خیر کو لے کر (زمین کی طرف) اُترتے ہیں (اور وہ شب) سراپا سلام ہے (جیسا حدیث بیہقی میں حضرت انس رضؓ سے مرفوعاً مروی ہے کہ شبِ قدر میں حضرت جبرئیل علیہ السّلام فرشتوں کے ایک گروہ میں آتے ہیں اور جس شخص کو قیام وقعود و ذکر میں مشغول دیکھتے ہیں تو اُس پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں یعنی اُس کے لئے دُعائے رحمت کرتے ہیں اور خازن نے ابن الجوزی سے اس روایت میں مُسَلِّمُوْنَ بھی بڑھایا ہے یعنی سلامتی کی دُعا کرتے ہیں۔ اور یُصَلُّوْنَ کا خلاصہ

بھی یہی ہے کیونکہ رحمت وسلامتی میں تلازم ہے اسی کو قرآن میں سلام فرمایا ہے اور امرِ خیر سے مراد یہی ہے، اور نیز روایات میں اسمیں توبہ کا قبول ہونا ابواب سما کا مفتوح ہونا اور ہر مؤمن پر ملائکہ کا سلام کرنا آیا ہے۔ کذا فی الدر المنثور۔ اور ان اُمور کا بواسطہ ملائکہ کے ہونا اور موجبِ سلامت ہونا ظاہر ہے یا امر سے مُراد وہ اُمور ہوں جن کا عنوان سُورۂ دخان میں امرِ حکیم اور اس شب میں ان کا طے ہونا ذکر فرمایا ہے اور) وہ شبِ قدر (اسی صفت وبرکت کے ساتھ) طلوعِ فجر تک رہتی ہے (یہ نہیں کہ اس شب کے کسی حصّہ خاص میں یہ برکت ہو اور کسی میں نہ ہو)

معارف و مسائل

شانِ نزول ابن ابی حاتم نے مجاہد سے مرسلاً روایت کیا ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل کے ایک مجاہد کا حال ذکر کیا جو ایک ہزار مہینے تک مسلسل مشغولِ جہاد رہا، کبھی ہتھیار نہیں اُتارے مسلمانوں کو یہ سُنکر تعجب ہوا، اس پر سورۂ قدر نازل ہوئی جس میں اس اُمّت کے لئے صرف ایک رات کی عبادت کو اُس مجاہد کی عمر بھر کی عبادت یعنی ایک ہزار مہینے سے بہتر قرار دیا ہے۔ اور ابن جریر نے بروایت مجاہد ایک دوسرا واقعہ یہ ذکر کیا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک عابد کا یہ حال تھا کہ ساری رات عبادت میں مشغول رہتا اور صبح ہوتے ہی جہاد کے لئے نکل کھڑا ہوتا دن بھر جہاد میں مشغول رہتا، ایک ہزار مہینے اُس نے اسی مسلسل عبادت میں گزار دیئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ قدر نازل فرما کر اس اُمّت کی فضیلت سب پر ثابت فرمادی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شبِ قدر اُمّتِ محمدیہ کی خصوصیات میں سے ہے (مظہری)

ابن کثیر نے یہی قول امام مالک کا نقل کیا ہے اور بعض ائمۂ شافعیہ نے اس کو جمہور کا قول لکھا ہے خطابی نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے مگر بعض محدثین نے اسمیں اختلاف کیا ہے (ماخوذ از ابن کثیر)

لیلۃ القدر کے معنے قدر کے ایک معنی عظمت وشرف کے ہیں۔ زہری وغیرہ حضرات علماء نے اس جگہ یہی معنی لئے ہیں اور اس رات کو لیلۃ القدر کہنے کی وجہ اس رات کی عظمت وشرف ہے۔ اور ابوبکر وراق نے فرمایا کہ اس رات کو لیلۃ القدر اسوجہ سے کہا گیا کہ جس آدمی کی اس سے پہلے اپنی بے عملی کے سبب کوئی قدر وقیمت نہ تھی اس رات میں توبہ واستغفار اور عبادت کے ذریعہ وہ صاحبِ قدر وشرف بن جاتا ہے۔

قدر کے دوسرے معنی تقدیر وحکم کے بھی آتے ہیں، اس معنے کے اعتبار سے لیلۃ القدر کہنے کی وجہ یہ ہوگی کہ اس رات میں تمام مخلوقات کے لئے جو کچھ تقدیر ازلی میں لکھا ہے اس کا جو حصّہ اس سال میں رمضان سے اگلے رمضان تک پیش آنیوالا ہے وہ اُن فرشتوں کے حوالہ کر دیا جاتا ہے جو کائنات کی تدبیر اور تنفیذ اُمور کے لئے مامور ہیں، اسمیں ہر انسان کی عمر اور موت اور رزق اور بارش وغیرہ کی مقداریں مقررہ فرشتوں کو لکھوا دی جاتی ہیں یہانتک کہ جس شخص کو اس سال میں حج نصیب ہوگا وہ بھی لکھ دیا جاتا ہے اور یہ فرشتے جن کو یہ اُمور سپرد کئے جاتے ہیں

بقول ابن عباسؓ چار ہیں ۔ اسرافیل ، میکائیل ، عزرائیل ، جبرئیل علیہم السلام (قرطبی)

سورہ دخان کی آیت اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنۡذِرِیۡنَ ۝ فِیۡهَا یُفۡرَقُ كُلُّ اَمۡرٍ حَكِیۡمٍ ۝ اَمۡرًا مِّنۡ عِنۡدِنَا میں یہ مضمون خود صراحت کیساتھ آگیا ہے کہ اس لیلۃ مبارکہ میں تمام اُمور تقدیر کے فیصلے لکھے جاتے ہیں اور اس آیت کی تفسیر میں گزر گیا ہے کہ جمہور مفسرین کے نزدیک لیلۃ مبارکہ سے مراد بھی لیلۃ القدر ہی ہے اور بعض حضرات نے جو لیلۂ مبارکہ سے نصف شعبان کی رات یعنی لیلۃ البرات مُراد لی ہے تو وہ اس کی تطبیق اس طرح کرتے ہیں کہ ابتدائی فیصلے اُمور تقدیر کے اجمالی طور پر شبِ برات میں ہو جاتے ہیں پھر اُن کی تفصیلات لیلۃ القدر میں لکھی جاتی ہیں اس کی تائید حضرت ابن عباسؓ کے ایک قول سے ہوتی ہے جس کو بغوی نے بروایت ابو الضحیٰ نقل کیا ہے اس میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ سال بھر کے تقدیری اُمور کا فیصلہ تو شبِ برات یعنی نصف شعبان کی رات میں کر لیتے ہیں پھر شبِ قدر میں یہ فیصلے متعلقہ فرشتوں کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں (مظہری) اور یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اُمورِ تقدیر کے فیصلے اس رات میں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس سال میں جو اُمورِ تقدیر نافذ ہونا ہیں وہ لوحِ محفوظ سے نقل کر کے فرشتوں کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں اور اصل نوشتۂ تقدیر ازل میں لکھا جا چکا ہے ۔

لیلۃ القدر کی تعیین اتنی بات تو قرآن کریم کی تصریحات سے ثابت ہے کہ شبِ قدر ماہِ رمضان المبارک میں آتی ہے مگر تاریخ کے تعین میں علماء کے مختلف اقوال ہیں جو چالیس تک پہنچتے ہیں مگر تفسیر مظہری میں ہے کہ ان سب اقوال میں صحیح یہ ہے کہ لیلۃ القدر رمضان مبارک کے آخری عشرہ میں ہوتی ہے مگر آخری عشرہ کی کوئی خاص تاریخ متعین نہیں بلکہ ان میں سے کسی بھی رات میں ہوسکتی ہے وہ ہر رمضان میں بدلتی بھی رہتی ہے ۔ اور ان دس میں سے خاص طاق راتیں یعنی ۲۱-۲۳-۲۵-۲۷-۲۹ میں از روئے احادیث صحیحہ زیادہ احتمال ہے ۔ اس قول میں تمام احادیث جو تعیین شبِ قدر کے متعلق آئی ہیں جمع ہو جاتی ہیں جن میں ۲۱-۲۳-۲۵-۲۷-۲۹ راتوں میں شبِ قدر ہونے کا ذکر آیا ہے ۔ اگر شبِ قدر کو ان راتوں میں دائر اور ہر رمضان میں منتقل ہونے والا قرار دیا جائے تو یہ سب روایاتِ حدیث اپنی اپنی جگہ درست اور ثابت ہو جاتی ہیں کسی میں تاویل کی ضرورت نہیں رہتی ، اسی لئے اکثر ائمہ فقہاء نے اس کو عشرۂ اخیرہ میں منتقل ہونے والی رات قرار دیا ہے ۔ ابو قلابہ ، امام مالک ، احمد بن حنبل ، سفیان ثوری ، اسحاق بن راہویہ ابو ثور ، مزنی ، ابن خزیمہ وغیرہ سب نے یہی فرمایا ہے اور ایک روایت میں امام شافعیؒ سے بھی اسکے موافق منقول ہے اور دوسری روایت امام شافعیؒ کی یہ ہے کہ یہ رات منتقل ہونے والی نہیں بلکہ معین ہے (ابن کثیر)

صحیح بخاری میں حضرت صدیقہ عائشہؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تحرّوا لیلۃ القدر فی العشر الاواخر من رمضان ، یعنی شبِ قدر کو رمضان کے آخری عشرہ میں تلاش کرو ۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فاطلبوھا فی الوتر منھا ، یعنی شبِ قدر کو رمضان کے عشرۂ اخیرہ کی طاق راتوں میں طلب کرو (مظہری)

لیلۃ القدر کے بعض فضائل اور اس رات کی مخصوص دُعا اس رات کی سب سے بڑی فضیلت تو وہی ہے جو اس سورت میں

بیان ہوئی ہے کہ اس ایک رات کی عبادت ایک ہزار مہینوں یعنی تراسی ۸۳ سال سے زائد کی عبادت سے بھی بہتر ہے پھر بہتر ہونے کی کوئی حد مقرر نہیں، کتنی بہتر ہے کہ دوگنی چوگنی دس گنی سو گنی وغیرہ سبھی احتمالات ہیں۔

اور صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شب قدر میں عبادت کے لئے کھڑا رہا اسکے تمام پچھلے گناہ معاف ہو گئے۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شبِ قدر میں وہ تمام فرشتے جنکا مقام سدرۃ المنتہٰی پر ہے جبرئیل امین کیساتھ دنیا میں اترتے ہیں اور کوئی مؤمن مرد یا عورت ایسی نہیں جسکو وہ سلام نہ کرتے ہوں بجز اُس آدمی کے جو شراب پیتا یا خنزیر کا گوشت کھاتا ہو اور ایک حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص شب قدر کی خیر و برکت سے محروم رہا وہ بالکل ہی محروم بدنصیب ہے۔ شبِ قدر میں بعض حضرات کو خاص انوار کا مشاہدہ بھی ہوتا ہے مگر نہ یہ سب کو حاصل ہوتا ہے نہ رات کی برکات اور ثواب حاصل ہونے میں ایسے مشاہدات کا کچھ دخل ہے اسلئے اسکی فکر میں نہ پڑنا چاہیئے۔

حضرت صدیقہ عائشہ رضؓ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اگر میں شب قدر کو پاؤں تو کیا دُعا کروں آپ نے فرمایا کہ یہ دُعا کرو اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ یا اللہ آپ بہت معاف کرنے والے ہیں اور معافی کو پسند کرتے ہیں میری خطائیں معاف فرمایئے (قرطبی)

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ، اس آیت میں تصریح ہے کہ قرآن کریم شبِ قدر میں نازل ہوا، اسکا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ پورا قرآن لوحِ محفوظ سے اس رات میں اُتار اگیا پھر جبرئیل امین اس کو تدریجاً تئیس سال کے عرصہ میں حسب ہدایت تھوڑا تھوڑا لاتے رہے اور یہ بھی مُراد ہو سکتی ہے کہ ابتدائے نزول قرآن اس رات میں چند آیتوں سے ہو گیا باقی بعد میں نازل ہوتا رہا۔

تمام آسمانی کتابیں رمضان ہی میں نازل ہوئی ہیں۔

حضرت ابوذر غفاری رضؓ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صحفِ ابراہیم علیہ السلام تیسری تاریخ رمضان میں، اور تورات چھٹی تاریخ میں اور انجیل تیرھویں تاریخ میں اور زبور اٹھارویں تاریخ رمضان میں نازل ہوئی ہیں اور قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر چوبیسویں تاریخ رمضان میں اُترا ہے (مظہری)

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ، روح سے مراد جبرئیل امین ہیں۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب شبِ قدر ہوتی ہے تو جبرئیل امین فرشتوں کی بڑی جماعت کیساتھ زمین پر اُترتے ہیں، اور جتنے اللہ کے بندے مرد و عورت نماز یا ذکر اللہ میں مشغول ہوتے ہیں سب کیلئے رحمت کی دُعا کرتے ہیں (مظہری)

مِنْ كُلِّ اَمْرٍ میں حرف مِنْ بمعنے با ہے جیسے یَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ الآیۃ میں بھی مِنْ بمعنے با استعمال ہوا ہے۔ معنے یہ ہیں کہ فرشتے لیلۃ القدر میں تمام سال کے اندر پیش آنے والے تقدیری واقعات لیکر زمین پر اُترتے ہیں۔ اور بعض حضرات مفسّرین مجاہد وغیرہ نے مِنْ كُلِّ اَمْرٍ کو سلام کے ساتھ متعلق کر کے یہ معنے قرار دیئے ہیں کہ یہ رات سلامتی ہے ہر شر و آفت اور بُری چیز سے (ابن کثیر)

سَلٰمٌ ، عبارت کی اصل ھِیَ سَلٰمٌ ہے۔ لفظ ھی حذف کر دیا گیا، معنے یہ ہیں کہ یہ رات سلام اور سلامتی ہی ہے اور خیر ہی خیر ہے اس میں شر کا نام نہیں (قرطبی) اور بعض حضرات نے تقدیر عبارت سلام ہو قرار دے کر اسکو مِنْ كُلِّ أَمْرٍ کی صفت بنایا اور معنی یہ ہوئے کہ یہ فرشتے ہر ایسا امر لیکر آتے ہیں جو خیر و سلام ہے (مظہری)

ھِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ، یعنی لیلۃ القدر کی یہ برکات رات کے کسی خاص حصہ کی ساتھ مخصوص نہیں، شروع رات سے طلوع فجر تک ایک ہی حکم ہے۔

فائدہ ان آیات میں لیلۃ القدر کو ایک ہزار مہینوں سے بہتر قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ ان ایک ہزار مہینوں کے اندر بھی ہر سال ایک شب قدر آئے گی تو حساب کس طرح بنے گا۔ ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ یہاں ایک ہزار مہینوں سے وہ مراد ہیں جن میں شب قدر شامل نہ ہو اسلئے کوئی اشکال نہیں (کذا ذکرہ ابن کثیر عن مجاہد)

اختلافِ مطالع کے سبب مختلف ملکوں اور شہروں میں شبِ قدر مختلف دنوں میں ہو تو اس میں کوئی اشکال نہیں، کیونکہ ہر جگہ کے اعتبار سے جو رات شب قدر قرار پائے گی اُس جگہ اُسی رات میں شبِ قدر کے برکات حاصل ہونگے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

مسئلہ۔ جس شخص نے شبِ قدر میں عشاء اور صبح کی نماز جماعت سے پڑھ لی اُس نے بھی اس رات کا ثواب پالیا، اور جو شخص جتنا زیادہ کریگا زیادہ ثواب پائیگا۔ صحیح مسلم میں حضرت عثمان غنی رضؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرلی تو آدھی رات کے قیام کا ثواب پالیا، اور جس نے صبح کی نماز بھی جماعت سے ادا کرلی تو پوری رات جاگنے عبادت کرنیکا ثواب حاصل کرلیا ؀

تمّت سورۃ القدر بحمد اللہ ۷ رمضان ۱۳۹۱ھ

سُورَةُ الْبَيِّنَة

سُورَةُ الْبَيِّنَةِ مَدَنِيَّةٌ وَهِيَ ثَمَانُ آيَاتٍ

سورۂ بینہ مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی آٹھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى

نہ تھے وہ لوگ جو منکر ہیں اہل کتاب اور مشرک باز آنے والے یہانتک کہ

تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ① رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ② فِيْهَا كُتُبٌ

پہنچے اُن کے پاس کھلی بات ایک رسول اللہ کا پڑھتا ہوا ورق پاک اُس میں لکھی ہیں

قَيِّمَةٌ ۝٣ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ
کتابیں مضبوط اور وہ جو پھوٹ پڑی اہل کتاب میں سو جبکہ آچکی اُن کے پاس کھلی

الْبَيِّنَةُ ۝٤ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ
بات اور اُن کو حکم یہی ہوا کہ بندگی کریں اللہ کی خالص کرکے اسکے واسطے بندگی ابراہیم کی راہ پر

وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَٰلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ ۝٥ إِنَّ الَّذِينَ
اور قائم رکھیں نماز اور دیں زکوٰۃ اور یہ ہے راہ مضبوط لوگوں کی اور جو

كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أُولَٰئِكَ
منکر ہوئے اہل کتاب اور مشرک ہونگے دوزخ کی آگ میں سدا رہیں اُسمیں وہ لوگ ہیں

هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝٦ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ هُمْ
سب خلق سے بدتر وہ لوگ جو یقین لائے اور کئے بھلے کام وہ لوگ ہیں سب

خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝٧ جَزَاؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ
خلق سے بہتر بدلہ اُن کا اُن کے رب کے یہاں باغ ہیں ہمیشہ رہنے کو نیچے بہتی ہیں

تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ
اُن کے نہریں سدا رہیں اُن میں ہمیشہ اللہ اُن سے راضی اور وہ اُس سے راضی

ذَٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ ۝٨
یہ ملتا ہے اُس کو جو ڈرا اپنے رب سے

خلاصۂ تفسیر

جو لوگ اہل کتاب اور مشرکین میں سے (قبل بعثت نبویہ) کافر تھے وہ (اپنے کفر سے ہرگز) باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ اُن کے پاس واضح دلیل نہ آتی (یعنی) ایک اللہ کا رسول جو (اُن کو) پاک صحیفے پڑھ کر سنادے جن میں درست مضامین لکھے ہوں (مراد قرآن ہے مطلب یہ ہے کہ ان کفار کا کفر ایسا شدید تھا اور ایسے جہل میں مبتلا تھے کہ بدون کسی عظیم رسول کے اُن کی راہ پر آنے کی کوئی توقع نہ تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُن پر اپنی حجت تمام کرنے کے لئے آپ کو قرآن دے کر مبعوث فرمایا) اور (اُن کو چاہیئے تھا کہ اس کو غنیمت سمجھتے اور اس پر ایمان لے آتے مگر) جو لوگ اہل کتاب تھے (اور غیر اہل کتاب تو بدرجۂ اولیٰ) وہ اس واضح دلیل کے آنے ہی کے بعد (دین میں) مختلف ہوگئے (یعنی دین حق سے بھی اختلاف کیا اور باہمی اختلاف جو پہلے سے تھے اُن کو بھی دین حق کا اتباع کرکے دُور نہ کیا اور مشرکین کو بدرجۂ اولیٰ اس لئے کہا کہ اُن کے پاس تو پہلے سے بھی کوئی علم سماوی نہ تھا) حالانکہ

اُن لوگوں کو (کتب سابقہ میں) یہی حکم ہوا تھا کہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ عبادت کو اسی کے لیے خالص رکھیں یکسو ہو کر (ادیانِ باطلہ کی طرح کسی کو اللہ کا شریک نہ بنا دیں) اور نماز کی پابندی رکھیں اور زکوٰۃ دیا کریں، اور یہی طریقہ ہے اُن درست مضامین (مذکورہ) کا (بتلایا ہوا۔ حاصل تقریر کا یہ ہوا کہ اُن اہلِ کتاب کو اُنکی کتابوں میں یہ حکم ہوا تھا کہ قرآن اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں، اور یہی تعلیم تھی قرآن کی جس کو اوپر کُتبِ قیمہ سے تعبیر فرمایا ہے اس لیئے اس قرآن کے نہ ماننے سے خود اپنی کتب کی مخالفت بھی لازم آتی ہے۔ یہ تو الزام اہلِ کتاب کو ہوا اور مشرکین اگرچہ پہلی کتب کو نہیں مانتے مگر ابراہیم علیہ السلام کے طریقے کا حق ہونا یہ بھی تسلیم کرتے تھے اور یہ بات یقینی طور پر ثابت ہے کہ ابراہیم علیہ السلام شرک سے بالکل بری تھے، اور کتبِ قیمہ یعنی قرآن کا اُس طریقے کے ساتھ موافق ہونا بھی ظاہر ہے اس لیئے اُن پر بھی حجت تمام ہوگئی اور مُراد ان متفرقین ومخالفین سے بعض وہ کفار ہیں جو ایمان نہ لائے تھے اور قرینہ مقابلہ سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جن لوگوں نے تفرق اور خلاف نہیں کیا وہ اہلِ ایمان ہیں، آگے بیان عمل کے بعد تصریحاً کفار کی دونوں قسموں یعنی اہلِ کتاب و مشرکین کی اور مؤمنین کی سزا و جزاء کا مضمون ارشاد فرماتے ہیں یعنی) بے شک جو لوگ اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے کافر ہوئے وہ آتشِ دوزخ میں جاویں گے جہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (اور) یہ لوگ بدترین خلائق ہیں (اور) بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیئے وہ لوگ بہترین خلائق ہیں اُن کا صلہ اُن کے پروردگار کے نزدیک ہمیشہ رہنے کی بہشتیں ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (اور) اللہ تعالیٰ اُن سے خوش رہے گا اور وہ اللہ سے خوش رہیں گے (یعنی نہ اُن سے کوئی معصیت ہوگی اور نہ اُن کو کوئی امر مکروہ پیش آوے گا جس سے احتمال عدم رضا کا جانبین سے ہو اور) یہ (جنّت اور رضا) اُس شخص کے لیئے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے (اور اللہ سے ڈرنے ہی پر ایمان وعمل صالح مرتب ہوتا ہے جس کو دخولِ جنّت و حصولِ رضا کا مدار فرمایا ہے)

معارف ومسائل

پہلی آیت میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے دُنیا میں کفر و شرک اور جہالت کے انتہائی عموم اور غلبہ کو ذکر کرکے فرمایا گیا ہے کہ کفر و شرک کی ایسی عالمگیر ظلمت کو دُور کرنے کے لیئے رب العالمین کی حکمت ورحمت کا تقاضا یہ ہوا کہ جیسے اُن کا مرض شدید اور وبار عالمگیر ہے اُس کے علاج کے لیئے بھی کوئی سب سے بڑا ماہر حاذق معالج بھیجنا چاہیئے اس کے بغیر وہ اس مرض سے نجات نہ پا سکیں گے۔ آگے اُس حاذق وماہر حکیم کی صفت بیان کی کہ اس کا وجود ایک بیّنہ یعنی حجّتِ واضحہ ہو شرک و کفر کے ابطال کے لیئے آگے فرمایا کہ مراد اس معالج سے اللہ کا وہ رسُولِ اعظم ہے جو قرآن کی حجّتِ واضحہ لے کر اُن کے پاس آوے۔ اس مجموعہ میں بعثتِ نبوی سے پہلے زمانے کے فسادِ عظیم اور ہر طرف جہالت وظلمت ہونا بھی معلوم ہوا اور رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ شان کا بھی بیان ہوا۔ آگے

قرآن کی چند اہم صفات کا بیان فرمایا ۔

یَتۡلُوۡا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝ فِيۡهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ، یتلو، تلاوت سے مشتق ہے جس کے معنے پڑھنے کے ہیں، مگر ہر پڑھنے کو تلاوت نہیں کہا جاتا بلکہ وہ پڑھنا جو پڑھانے والے کی تلقین کے بالکل مطابق ہو اس کو تلاوت کہتے ہیں اسی لئے عرف میں عموماً لفظ تلاوت صرف قرآن پڑھنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ صحف صحیفہ کی جمع ہے جن کاغذات میں کوئی مضمون تحریر ہو اُن کو صحیفہ کہتے ہیں۔ کُتُب، کتاب کی جمع ہے اس کے ایک معنی تو لکھی ہوئی چیز کے ہیں اس اعتبار سے کتاب اور صحیفہ تقریباً ہم معنی لفظ ہیں، اور کبھی لفظ کتاب بمعنے حکم بھی بولا جاتا ہے جیسا کہ قرآن کی آیت لَوۡلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ میں لفظ کتاب بمعنے حکم ہی مستعمل ہوا ہے۔ اس جگہ بھی یہی دوسرے معنے مراد ہیں کیونکہ معروف معنی میں لیں تو کتب عین صحف ہیں۔ فیہا کہنے کے کوئی معنے نہیں رہتے۔

مُطَهَّرَةً ، یہ صحف کی صفت ہے۔ حضرت ابن عباس رض نے فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ صحیفے جھوٹ اور شک اور نفاق اور گمراہی سے پاک ہیں۔ قَيِّمَةٌ بمعنے مستقیمہ کتب کی صفت ہے معنے یہ ہیں کہ یہ احکام مستقیم منصفانہ و معتدل ہیں اور اس کے معنے مضبوط و مستحکم کے بھی ہو سکتے ہیں تو مطلب یہ ہوگا کہ احکام الٰہیہ جو قرآن میں آئے قیامت تک قائم دائم رہیں گے۔

مطلب آیت کا یہ ہو گیا کہ اس زمانے کے مشرکین اور اہل کتاب کی گمراہی اس درجے میں پہنچی ہوئی تھی کہ اُن کو اپنے عقائد باطلہ سے ہٹنا ممکن نہ تھا جب تک کہ اُن کے پاس اللہ تعالیٰ کی کھلی نشانی اور حجتِ واضحہ نہ آجائے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُن کے واسطے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حجتِ واضحہ بنا کر بھیجا جس کا کام یہ تھا کہ وہ اُن کو پاک صحیفے پڑھ کر سُناتے تھے۔ مراد یہ ہے کہ وحیِ خداوندی کے وہ احکام سُناتے تھے جو بعد میں صحیفوں کے ذریعہ محفوظ کئے گئے کیونکہ ابتدائے تلاوت میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کسی صحیفے سے نہیں بلکہ اپنی یاد سے پڑھ کر سُناتے تھے، اور یہ پاک صحیفے ایسے ہیں جن میں ایسے احکام الٰہیہ ہیں جو عدل و اعتدال کے ساتھ دیئے گئے ہیں اور ہمیشہ قائم رہنے والے ہیں۔

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ الۡبَيِّنَةُ ، تفرّق سے مراد اس جگہ انکار و اختلاف ہے۔ قرآن اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوّت سے جس پر تمام اہل کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور بعثت سے پہلے متفق تھے کیونکہ اُن کی آسمانی کتب تورات و انجیل میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوّت کا اور آپ کی خاص خاص صفات اور آپ پر قرآن نازل ہونے کا واضح ذکر موجود تھا اس لئے کسی یہودی نصرانی کو اس میں اختلاف نہیں تھا کہ آخر زمانے میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لادیں گے۔ آپ پر قرآن نازل ہوگا آپ ہی کا اتباع سب پر لازم ہوگا، جیسا کہ قرآن کریم میں بھی انکے اس اتفاق کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے وَكَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ يَسۡتَفۡتِحُوۡنَ عَلَى الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ، یعنی یہ اہل کتاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے آپ کے آنے کے منتظر تھے اور جب کبھی مشرکین سے ان کا مقابلہ ہوتا تو آنے والے نبی کے واسطے سے اپنی

فتح مانگتے تھے یعنی اللہ سے دُعا کرتے تھے کہ نبی آخر الزماں جو آنے والے ہیں اُن کی برکت سے ہمیں فتح نصیب فرمادے یا یہ کہ یہ مشرکین سے کہا کرتے تھے تم لوگ ہمارے خلاف زور آزمائی کرتے ہو مگر عنقریب ایک ایسے رسُول آنے والے ہیں جو تم سب کو زیر کر دیں گے اور ہم چونکہ اُن کے ساتھ ہونگے تو ہماری فتح ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کی بعثت سے پہلے تو اہل کتاب سب کے سب آپؐ کی نبوّت و رسالت پر متفق تھے مگر جب آپؐ تشریف لے آئے تو منکر ہو گئے۔ اسی مضمون کو قرآن میں ایک جگہ فرمایا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ، یعنی جب ان لوگوں کے پاس وہ رسُول یا دینِ حق یا قرآن آگیا جس کو انھوں نے بھی اپنی آسمانی کتابوں کی پیش گوئی کے مطابق پہچان لیا تو لگے کفر کرنے۔ اور آیت مذکورہ میں اسی مضمون کو اس طرح ذکر فرمایا کہ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ الآیۃ، یعنی یہ عجیب بات ہے کہ آپؐ کے آنے اور دیکھنے سے پہلے تو ان لوگوں کو آپؐ سے کوئی اختلاف نہیں تھا سب آپؐ کی نبوت کے اعتقاد پر جمع تھے مگر جب یہ اللہ کا بیّنۂ واضحہ یعنی رسُول آخر الزماں تشریف لے آئے تو ان میں افتراق پیدا ہو گیا کچھ لوگ تو آپؐ پر ایمان لائے اور بہت سے انکار کرنے لگے۔

یہ معاملہ چونکہ اہل کتاب ہی کے ساتھ مخصوص تھا اس لئے اس آیت میں صرف اہلِ کتاب ہی کا ذکر فرمایا ہے مشرکین کو شامل نہیں کیا بلکہ فرمایا وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ الآیہ، اور پہلا معاملہ مشرکین اور اہلِ کتاب دونوں کو عام اور شامل تھا اس لئے وہاں فرمایا لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ۔

اور خلاصۂ تفسیر مذکور میں معاملہ ثانیہ کو بھی مشرکین اور اہلِ کتاب دونوں میں عام قرار دے کر اُس کے مطابق تقریر کی گئی ہے واللہ اعلم۔

وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ، یہاں لفظ قَیِّمَہ بظاہر کتب کی صفت ہے جس کا ذکر اوپر آیا ہے اور بعض نے اس کو ملّت کی صفت قرار دیا ہے۔ حاصل آیت کا یہ ہے کہ اہلِ کتاب کو اُن کی کتابوں میں یہی حکم دیا گیا تھا کہ اپنی عبادت و اطاعت کو خالص اللہ کے لئے رکھیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، پھر فرمایا کہ یہ کچھ اُن کی ہی خصوصیت نہیں، ہر ملّتِ قیّمہ یا تمام کتبِ قیّمہ جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئیں اُن سب کا دین اور طریقہ یہی ہے اور ظاہر یہ ہے کہ قیّمہ جو کتب کی صفت ہے اس سے مراد بقرینہ سابق احکامِ قرآنیہ لئے جائیں تو مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ اس شریعتِ محمدیہ نے بھی جو احکام اُن کو دیئے وہ بھی بعینہا وہی تھے جو پہلے اُن کی کتابوں نے دیئے تھے اُن سے کچھ مختلف احکام ہوتے تو اُن کو مخالفت کا کچھ بہانا بھی ہوتا اب وہ بھی نہیں۔

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ، اس آیت میں اہلِ جنّت کی سب سے بڑی نعمت کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن سے راضی ہے اب ناراضی کا کوئی خطرہ نہیں۔ حضرت ابُو سعید خُدری رضؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اہلِ جنّت سے خطاب کیلئے فرمائینگے

یا اھل الجنۃ، تو اہل جنت جواب دیں گے لَبَّیْكَ رَبَّنَا وَسَعْدَیْكَ وَالْخَیْرُ كُلُّهٗ فِیْ یَدَیْكَ ، یعنی اے ہمارے رب ہم حاضر ہیں اور اطاعت حکم کے لئے تیار ہیں اور ہر بھلائی آپ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ پھر حق تعالیٰ فرمائیں گے ھَلْ رَضِیْتُمْ یعنی تم لوگ راضی اور خوش ہو وہ جواب دیں گے، اے ہمارے پروردگار، اب بھی راضی نہ ہونے کا کیا احتمال ہے جبکہ آپ نے ہمیں وہ سب کچھ عطا فرما دیا جو کسی مخلوق کو نہیں ملا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ کیا میں تم کو اس سے بھی افضل اور بہتر نعمت دیدوں، پھر فرمائیں گے کہ میں نے اپنی رضا تمہارے اوپر نازل کردی اب کبھی تم سے ناراض نہ ہوں گا (رواہ البخاری ومسلم۔ مظہری)

اس حدیث میں بھی اہل جنت سے پوچھا گیا کہ آپ راضی بھی ہو، اور اس آیت میں خبر دی گئی کہ رَضُوْا عَنْهُ ، یعنی اہل جنت بھی اللہ تعالیٰ سے راضی ہوں گے، یہاں بظاہر یہ سوال ہوتا ہے کہ اللہ سے اور اسکے ہر حکم اور ہر فعل سے راضی ہونا تو فرائض بندگی اور لازمۂ عبدیت ہے اس کے بغیر تو کوئی جنت میں جا ہی نہیں سکتا، پھر یہاں اہل جنت کی رضامندی ذکر کرنے کا کیا مطلب ہے، جواب یہ ہے کہ رضاء کے عام مفہوم کے اعتبار سے تو یہ صحیح ہے کہ رضاء بالقدر واجبات و فرائض عبدیت میں سے ہے لیکن رضاء کا ایک درجہ اور بھی ہے جو اس سے آگے ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی بندے کو اُس کی ہر مراد عطا کردیں اور کوئی تمنا و آرزو باقی نہ چھوڑیں، اس جگہ رضا سے یہی مراد ہے جیسے سورۂ ضحیٰ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے آیا ہے وَلَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ، یعنی عنقریب اللہ تعالیٰ آپ کو دیں گے وہ چیز جس سے آپ راضی ہو جائیں گے، یہاں بھی مراد غایت تمنا کا پورا کردینا ہے اسی لئے اس آیت کے نزول پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر تو میں اُس وقت تک راضی نہ ہوں گا جب تک ایک بھی مومن جہنم میں باقی رہے گا (من المظہری)

ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِیَ رَبَّهٗ ، آخر سورت میں تمام کمالات دینی اور نعمائے اُخروی کا جس پر مدار ہے وہ بتلا دیا یعنی خشیۃ اللہ ، خشیت اُس خوف کو نہیں کہا جاتا جو کسی دشمن یا درندے یا موذی چیز سے طبعاً ہوتا ہے بلکہ خشیت اُس خوف کو کہتے ہیں جو کسی کی انتہائی عظمت و جلال کی وجہ سے پیدا ہو جسکا مقتضا یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر کام ہر حال میں اُس کی رضا جوئی کی فکر کرتا ہے اور ناراضی کے شبہ سے بھی بچتا ہے یہی وہ چیز ہے جو انسان کو عبدِ کامل اور مقبول بنانے والی ہے ۔

تمت سورة البیّنۃ بحمد اللہ تعالیٰ

سُوْرَۃُ الزِّلْزَال

سُوْرَۃُ الزِّلْزَالِ مَدَنِیَّۃٌ وَّھِیَ ثَمَانُ اٰیٰتٍ
سورۂ زلزال مدینہ میں نازل ہوئی اور اسکی آٹھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَھَا ① وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَھَا ② وَ
جب ہلا ڈالے زمین کو اُس کے بھونچال سے اور نکال باہر کرے زمین اپنے اندر سے بوجھ اور

قَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَھَا ③ یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَھَا ④ بِاَنَّ رَبَّکَ
کہے آدمی اس کو کیا ہوگیا اُس دن کہہ ڈالے گی وہ اپنی باتیں اسواسطے کہ تیرے رب نے

اَوْحٰی لَھَا ⑤ یَوْمَئِذٍ یَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ۬ لِّیُرَوْا اَعْمَالَھُمْ ⑥ فَمَنْ
حکم بھیجا اُس کو اُس دن ہو پڑیں گے لوگ طرح طرح پر کہ اُن کو دکھا دیئے جائیں انکے عمل سو جس نے

یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ ⑦ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ ⑧
کی ذرہ بھر بھلائی وہ دیکھ لے گا اُسے اور جس نے کی ذرّہ بھر برائی وہ دیکھ لے گا اُسے

ع ۸
۲۴

خلاصۂ تفسیر

جب زمین اپنی سخت جُنبش سے ہلائی جائے گی اور زمین اپنے بوجھ باہر نکال پھینکے گی (مراد بوجھ سے دفینے اور مُردے ہیں، اور اگرچہ بعض روایات سے پہلے بھی دفینوں کا باہر آجانا معلوم ہوتا ہے لیکن ممکن ہے کہ قیامت سے پہلے جو دفینے باہر آگئے تھے مرورِ ایام سے پھر اُن پر مٹی آگئی ہو اور مستور ہوگئے ہوں اور قیامت کے روز پھر نکلیں اور دفائن کے ظاہر ہوجانے کی شاید یہ حکمت ہو کہ مال کی بہت محبت کرنے والے اپنی آنکھوں اموال کا بیکار ہونا دیکھ لیں) اور (اس حالت کو دیکھ کر کافر) آدمی کہے گا کہ اس کو کیا ہوا (کہ زمین اس طرح ہل رہی ہے اور سب

دفینے باہر آرہے ہیں) اس روز زمین اپنی سب (اچھی بُری) خبریں بیان کرنے لگے گی اس سبب سے کہ آپ کے رب کا اُس کو یہی حکم ہوگا (ترمذی وغیرہ میں اسکی تفسیر میں حدیث مرفوع آئی ہے کہ جس شخص نے روئے زمین پر جیسا عمل کیا ہوگا اچھا یا بُرا زمین سب کہدے گی یہ اُس کی شہادت ہوگی) اُس روز لوگ مختلف جماعتیں ہو کر (موقف حساب سے) واپس ہوں گے (یعنی جو لوگ حساب محشر سے فارغ ہو کر لوٹیں گے تو کچھ جماعتیں جنتی کچھ دوزخی قرار پاکر جنت و دوزخ کی طرف چلی جاویں گی) تاکہ اپنے اعمال (کے ثمرات) کو دیکھ لیں، سو جو شخص (دُنیا میں) ذرہ برابر نیکی کریگا وہ اُس کو دیکھ لیگا اور جو شخص ذرّہ برابر بدی کریگا وہ اُس کو دیکھ لیگا (بشرطیکہ اُس وقت تک وہ خیر و شر باقی رہی ہو، ورنہ اگر کفر کے سبب وہ چیز فنا ہو چکی ہو یا ایمان و توبہ کے ذریعہ بدی معاف ہو چکی ہو تو وہ اس میں داخل نہیں کیونکہ اب نہ وہ باطل شُدہ خیر خیر ہے اور نہ وہ معاف کیا ہوا گناہ اور شر شر ہے اس لئے محشر میں وہ سامنے نہ آویں گی۔)

معارف و مسائل

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا، اس میں اختلاف ہے کہ اس آیت میں جس زلزلہ کا ذکر ہے یہ وہ زلزلہ ہے جو نفخۂ اولی سے پہلے دُنیا میں ہوگا جیساکہ علاماتِ قیامت میں اس زلزلہ کا ذکر آیا ہے یا اس زلزلہ سے مراد نفخۂ ثانیہ کے بعد جب مُردے زندہ ہو کر زمین سے اُٹھیں گے اُس وقت کا زلزلہ ہے۔ روایات اور اقوال مفسرین کے مختلف ہیں اور اس میں بھی کوئی بُعد نہیں کہ زلزلے متعدد ہوں، ایک نفخۂ اوّل سے پہلے، دوسرا نفخۂ ثانیہ کے بعد مُردوں کے زندہ ہونے کے وقت اور اس جگہ یہی دوسرا زلزلہ مراد ہو، اور اس سورت میں جو آگے احوال قیامت حساب کتاب کا ذکر ہے وہ قرینہ اسی کا ہے کہ یہ زلزلہ دوسرا نفخۂ ثانیہ کے بعد کا ہے۔ واللہ اعلم (از مظہری)

وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا، رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس زلزلہ کے متعلق ارشاد فرمایا کہ زمین اپنے جگر کے ٹکڑے سونے کی بڑی چٹانوں کی صورت میں اُگل دے گی اسوقت ایک شخص جس نے مال کے لئے کسی کو قتل کیا تھا وہ دیکھ کر کہے گا کہ یہ وہ چیز ہے جس کے لئے میں نے اتنا بڑا جُرم کیا تھا، جس شخص نے اپنے رشتہ داروں سے مال کی وجہ سے قطع تعلق کیا تھا وہ کہے گا کہ یہ ہے وہ چیز جس کے لئے میں نے یہ حرکت کی تھی۔ چور جس کا ہاتھ چوری کی سزا میں کاٹا گیا تھا اُس کو دیکھ کر کہے گا کہ اسکے لئے میں نے اپنا ہاتھ گنوایا تھا پھر کوئی بھی اس سونے کی طرف التفات نہ کریگا۔ (رواہ مسلم عن ابی ہریرۃ رض)

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ، آیت میں خیر سے مراد وہ خیر ہے جو شرعاً معتبر ہے، یعنی جو ایمان کے ساتھ ہو بغیر ایمان کے اللہ کے نزدیک کوئی نیک عمل نیک نہیں، یعنی آخرت میں ایسے نیک عمل کا جو حالت کفر میں کیا ہے کوئی اعتبار نہیں ہوگا گو دُنیا میں اُس کو اس کا بدلہ دیدیا جائے اسی لئے اس آیت سے اس پر استدلال کیا گیا ہے کہ جس شخص کے دل میں ایک ذرّہ برابر ایمان ہوگا وہ بالآخر جہنم سے نکال لیا جاویگا کیونکہ اس آیت کے وعدہ کے مطابق اسکو اپنی نیکی کا پھل بھی آخرت میں ملنا ضرور ہے اور کوئی بھی نیکی نہ ہو تو خود ایمان بہت بڑی نیکی ہے۔

اسلئے کوئی مؤمن کتنا ہی گناہگار ہو ہمیشہ جہنم میں نہ رہے گا۔ البتہ کافر نے اگر دُنیا میں کچھ نیک عمل بھی کئے تو شرطِ عمل یعنی ایمان کے نہونے کی وجہ سے کالعدم ہیں اس لئے آخرت میں اُس کی کوئی خیر خیر ہی نہیں۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ، مراد اس سے وہ شر ہے جس سے اپنی زندگی میں توبہ نہ کرلی ہو کیونکہ توبہ سے گناہوں کا معاف ہونا قرآن و سُنّت میں یقینی طور پر ثابت ہے۔ البتہ جس گناہ سے توبہ نہ کی ہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا آخرت میں اسکا نتیجہ ضرور سامنے آئے گا۔ اسی لئے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیقہ عائشہؓ کو مخاطب کرکے فرمایا کہ دیکھو ایسے گناہوں سے بچنے کا پورا اہتمام کرو جن کو چھوٹا یا حقیر سمجھا جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس پر بھی مواخذہ ہونا ہے (رواہ النسائی وابن ماجہ عنہا)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ یہ آیت قرآن کی سب سے زیادہ مستحکم اور جامع آیت ہے اور حضرت انسؓ کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو الفاذۃ الجامعہ فرمایا ہے یعنی منفرد یکتا اور جامع۔

اور حضرت انس اور ابن عباسؓ کی حدیث ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سورۂ اِذَا زُلْزِلَتْ کو نصف القرآن اور قل ہو اللہ احد کو ثلث القرآن اور قل یا ایہا الکٰفرون کو رُبع القرآن فرمایا ہے (رواہ الترمذی والبغوی۔ مظہری)

سُوْرَةُ الْعٰدِيٰتِ

سُوْرَةُ الْعٰدِيٰتِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اِحْدٰى عَشْرَةَ اٰيَةً

سورۂ عادیات مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی گیارہ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۝۱ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۝۲ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۝۳ فَاَثَرْنَ بِهٖ

قسم ہے دوڑنے والے گھوڑوں کی ہانپ کر پھر آگ سُلگانے والے جھاڑ کر پھر غارت ڈالنے والے صبح کو پھر اُٹھانیوالے اُسمیں

نَقْعًا ۝۴ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۝۵ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۝۶ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ

گرد پھر گھس جانیوالے اُسوقت فوج میں بیشک آدمی اپنے رب کا ناشکر ہے اور وہ آدمی اس کام کو

لَشَهِيْدٌ ۝۷ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝۸ اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي

سامنے دیکھتا ہے اور آدمی محبت پر مال کی بہت پکا ہے کیا نہیں جانتا وہ وقت کہ کریدا جائے جو کچھ

الْقُبُوْرِ ۝۹ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ۝۱۰ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ ۝۱۱

قبروں میں ہے اور تحقیق ہووے جو کچھ کہ جیوں میں ہے بیشک اُن کے رب کو اُن کی اُس دن سب خبر ہے

ع ۱ ۱۱ ۲۵

خُلاصۂ تفسیر

قسم ہے اُن گھوڑوں کی جو ہانپتے ہوئے دَوڑتے ہیں پھر (پتھر پر) ٹاپ مار کر آگ جھاڑتے ہیں پھر صبح کے وقت تاخت تاراج کرتے ہیں پھر اُس وقت غبار اُڑاتے ہیں پھر اُس وقت (دشمنوں کی) جماعت میں جا گھستے ہیں (مراد اس سے لڑائی کے گھوڑے ہیں۔ جہاد ہو یا غیر جہاد، عرب چونکہ حرب و ضرب اور جنگ کے عادی تھے جس کے لئے گھوڑے پالتے تھے اُن کی مناسبت سے ان جنگی گھوڑوں کی قسم کھائی گئی آگے جواب قسم ہے کہ) بیشک (کافر) آدمی اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے اور اُس کو خود بھی اس کی خبر ہے (کبھی ابتداءً ہی اور کبھی کچھ غور کے بعد اپنی ناشکری کا احساس کرلیتا ہے) اور وہ مال کی محبّت میں بڑا مضبوط ہے (یہی اسکی ناشکری کا سبب ہے، آگے حُبِّ مال اور ناشکری پر وعید ہے یعنی) کیا اُس کو وہ وقت معلوم نہیں جب زندہ کئے جاویں گے جتنے مُردے قبروں میں ہیں اور ظاہر ہو جائیگا جو کچھ دِلوں میں ہے بیشک اُن کا پروردگار اُن کے حال سے اُس روز پورا آگاہ ہے (اور مناسب جزا دیگا۔ حاصل یہ ہے کہ انسان کو اگر اُس وقت کی پُوری خبر ہوتی اور آخرت کا حال مستحضر ہوتا تو اپنی ناشکری اور حُبِّ مال سے باز آجاتا)

معارف و مسائل

سورۂ عادیات حضرت ابن مسعودؓ اور جابرؓ اور حسن بصری، عکرمہ، عطاء رحمہم اللہ کے نزدیک مکّی اور ابن عباسؓ، انسؓ، امام مالک، قتادہ کے نزدیک مدنی سُورت ہے (قرطبی)

اس سورت میں حق تعالیٰ نے جنگی گھوڑوں کے کچھ خاص حالات و صفات کا ذکر فرمایا اور ان کی قسم کھا کر یہ ارشاد فرمایا کہ انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔ یہ بات تو قرآن میں بار بار معلوم ہو چکی ہے کہ حق تعالیٰ اپنی مخلوقات میں سے مختلف چیزوں کی قسم کھا کر خاص واقعات اور احکام بیان فرماتے ہیں یہ حق تعالیٰ کی خصوصیت ہے انسان کے لئے کسی مخلوق کی قسم کھانا جائز نہیں ہے اور قسم کھانے کا مقصد عام قسموں کی طرح اپنی بات کو محقق اور یقینی بتلانا ہے اور یہ بات بھی پہلے آچکی ہے کہ قرآن کریم جس چیز کی قسم کھا کر کوئی مضمون بیان فرماتا ہے تو اس چیز کو اُس مضمون کے ثبوت میں دخل ہوتا ہے اور یہ چیز گویا اُس مضمون کی شہادت دیتی ہے۔ یہاں جنگی گھوڑوں کی سخت خدمات کا ذکر گویا اس کی شہادت میں لایا گیا ہے کہ انسان بڑا ناشکرا ہے۔ تشریح اسکی یہ ہے کہ گھوڑوں کے اور خصوصاً جنگی گھوڑوں کے حالات پر نظر ڈالیئے کہ وہ میدان جنگ میں اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر کیسی کیسی سخت خدمات انسان کے حکم و اشارہ کے تابع انجام دیتے ہیں حالانکہ انسان نے ان گھوڑوں کو پیدا نہیں کیا، انکو جو گھاس دانہ انسان دیتا ہے وہ بھی اس کا پیدا کیا ہوا نہیں، اسکا کام صرف اتنا ہے کہ خدا تعالیٰ کے پیدا کئے رزق کو اُن تک پہنچانے کا ایک واسطہ بنتا ہے اب گھوڑے کو دیکھئے کہ وہ انسان کے اتنے سے احسان کو کیسا پہچانتا اور مانتا ہے کہ اُس کے ادنیٰ اشارہ پر اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دیتا ہے اور سخت سے سخت مشقت برداشت کرتا ہے، اسکے بالمقابل انسان کو دیکھو جس کو ایک حقیر قطرہ سے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور اسکو مختلف کاموں کی قوّت بخشی، عقل و شعور

دیا، اُن کے کھانے پینے کی ہر چیز پیدا فرمائی اور اُس کی تمام ضروریات کو کس قدر آسان کر کے اس تک پہنچا دیا کہ عقل حیران رہ جاتی ہے مگر وہ ان تمام اکمل واعلیٰ احسانات کا بھی شکر گزار نہیں ہوتا اب الفاظ آیت کی تشریح دیکھئے عَادِیَات، عَدْو سے مشتق ہے جسکے معنی دوڑنے کے ہیں۔ ضَبْحًا، ضبح وہ خاص آواز ہے جو گھوڑے کے دوڑنے کے وقت اسکے سینے سے نکلتی ہے جسکا ترجمہ ہانپنا کیا گیا ہے۔ مُوْرِیَاتِ، ایراء سے مشتق ہے جس کے معنی آگ نکالنے کے ہیں جیسے چقماق کو مار کر یا دیاسلائی کو رگڑ کر نکالی جاتی ہے۔ قَدْحًا، قدح کے معنے ٹاپ مارنے کے ہیں پتھریلی زمین پر جب گھوڑا تیزی سے دوڑے خصوصاً جبکہ اُس کے پاؤں میں آہنی نعل بھی ہو تو ٹکراؤ سے آگ کی چنگاریاں نکلتی ہیں۔ مُغِیْرَات، اغارہ سے مشتق ہے جس کے معنے حملہ کرنے اور چھاپہ مارنے کے ہیں۔ صُبْحًا صبح کے وقت کی تخصیص بیان عادت کے طور پر ہے کیونکہ عرب لوگ اظہار شجاعت کے لئے رات کی اندھیری میں چھاپہ مارنا معیوب سمجھتے تھے حملہ صبح ہونے کے بعد کیا کرتے تھے اَثَرْنَ، اثارت سے مشتق ہے غبار اُڑانے کے معنی میں اور نقع غبار کو کہا جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ یہ گھوڑے میدان میں اس تیزی سے دوڑتے ہیں کہ اُن کے سُموں سے غبار اُڑ کر چھا جاتا ہے خصوصاً صبح کے وقت میں غبار اُڑنا زیادہ سُرعت اور تیزی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ یہ وقت عادۃً غبار اُڑنے کا نہیں کسی سخت دوڑ ہی سے اس وقت غبار اُٹھ سکتا ہے۔

فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا، یعنی یہ دشمن کی صفوں میں بے خوف وخطر گھس جاتے ہیں۔ کَنُوْد کے معنی میں حضرت حسن بصری رہ نے فرمایا کہ وہ شخص جو مصائب کو یاد رکھے اور نعمتوں کو بھول جائے اُس کو کنُود کہا جاتا ہے۔ ابوبکر واسطی نے فرمایا جو اللہ کی نعمتوں کو اُس کی معصیتوں میں صرف کرے وہ کنُود ہے۔ اور ترمذی نے فرمایا کہ جو شخص نعمت کو دیکھے اور مُنعم یعنی نعمت دینے والے کو نہ دیکھے وہ کنُود ہے۔ ان سب اقوال کا حاصل نعمت کی ناشکری کرنا ہے اس لئے کنُود کا ترجمہ ناشکر کا کیا گیا ہے۔

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ، خیر کے لفظی معنی ہر بھلائی کے ہیں۔ عرب میں مال کو بھی لفظ خیر سے تعبیر کرتے تھے، گویا مال بھلائی ہی بھلائی اور فائدہ ہی فائدہ ہے حالانکہ درحقیقت بعض مال انسان کو ہزاروں مصیبتوں میں بھی مبتلا کر دیتے ہیں۔ آخرت میں تو ہر مال حرام کا یہی انجام ہے کبھی کبھی دُنیا میں بھی مال انسان کے لئے وبال بن جاتا ہے مگر عرب کے محاورہ کے مطابق اس آیت میں مال کو لفظ خیر سے تعبیر کر دیا ہے جیسا ایک دوسری آیت میں فرمایا اِنْ تَرَكَ خَیْرًا، یہاں بھی خیر سے مراد مال ہے۔

آیتِ مذکورہ میں گھوڑوں کی قسم کھا کر انسان کے متعلق دو باتیں کہی گئیں، ایک یہ کہ وہ ناشکر ہے مصیبتوں تکلیفوں کو یاد رکھتا ہے نعمتوں اور احسانات کو بھول جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ مال کی محبت میں شدید ہے۔ یہ دونوں باتیں شرعاً وعقلاً مذموم ہیں ان میں انسان کو ان مذموم خصلتوں پر متنبہ کرنا مقصود ہے۔ ناشکری کا مذموم ہونا تو بالکل ظاہر ہے۔ مال کی محبت کو جو مذموم قرار دیا حالانکہ وہ انسانی ضروریات کا مدار ہے۔ اور اُس کے کسب و اکتساب کو شریعت نے صرف حلال ہی نہیں بلکہ بقدر ضرورت فرض قرار دیا ہے تو مال کی محبت

کا مذموم ہونا یا تو وصف شدّت کے اعتبار سے ہے کہ مال کی محبت میں ایسا مغلوب ہو جاوے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام سے بھی غافل ہو جائے اور حلال و حرام کی پروانہ رہے، اور یا اسلئے کہ مال کا کسب اکتساب اور بقدرِ ضرورت جمع کرنا تو مذموم نہیں بلکہ فرض ہے مگر محبت اُس کی بھی مذموم ہے کیونکہ محبت کا تعلق دل سے ہے اسکا حاصل یہ ہوگا کہ مال کو بقدر ضرورت حاصل کرنا اور اُس سے کام لینا تو ایک فریضہ اور محمود ہے لیکن دل میں اُس کی محبت ہونا پھر بھی مذموم ہی ہے۔ جیسا انسان پیشاب پاخانے کی ضرورت کو پورا بھی کرتا ہے اُس کا اہتمام بھی کرتا ہے مگر اسکے دل میں محبت نہیں ہوتی۔ بیماری میں دوا بھی پیتا ہے آپریشن بھی کراتا ہے مگر دل میں ان چیزوں کی محبت نہیں ہوتی بلکہ بدرجۂ مجبوری کرتا ہے اسی طرح اللہ کے نزدیک مومن کو ایسا ہونا چاہیئے کہ بقدرِ ضرورت مال کو حاصل بھی کرے اُس کی حفاظت بھی کرے اور مواقع ضرورت میں اُس سے کام بھی لے مگر دل اسکے ساتھ مشغول نہ ہو، جیساکہ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے بلیغ انداز میں فرمایا ہے ؎

آب اندر زیرِ کشتی پُشتی است ❖ آب در کشتی ہلاکِ کشتی است

یعنی پانی جب تک کشتی کے نیچے رہے تو کشتی کا مددگار ہے مگر یہی پانی جب کشتی کے اندر آجائے تو کشتی کو لے ڈوبتا ہے۔ اسی طرح مال جب تک دل کی کشتی کے اردگرد رہے تو مفید ہے جب دل کے اندر گھُس گیا تو ہلاکت ہے۔ آخر سورت میں انسان کی ان دونوں مذموم خصلتوں پر آخرت کی وعید سُنائی گئی۔

اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ الآیۃ، کیا اس غافل انسان کو اس کی خبر نہیں کہ قیامت کے روز جبکہ مُردے قبروں سے زندہ کرکے اُٹھائے جاویں گے اور دِلوں میں چھپی ہوئی باتیں بھی سب کھُل کر سامنے آجاوینگی اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ ربّ العالمین ان سب کے سب حالات سے باخبر ہیں تو اسکے مطابق جزا و سزا دیں گے اسلئے عقلمند کا کام یہ ہے کہ ناشکری سے باز آئے اور مال کی محبت میں ایسا مغلوب نہ ہو کہ اچھے بُرے کی تمیز نہ رہے۔

فائدہ | اس آیت میں یہ دو مذموم خصلتیں مطلق انسان کی بیان کی گئی ہیں حالانکہ انسان میں انبیاء و اولیاء اور بہت سے صلحاء عباد ایسے ہیں، جو ان مذموم خصلتوں سے پاک اور شکرگزار بندے ہوتے ہیں مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرڈالنے کے لئے تیار رہتے ہیں حرام مال سے بچتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ مطلق انسان کیطرف ان مذموم خصلتوں کی نسبت اس لئے کردی گئی کہ اکثر انسان ایسے ہی ہیں اس سے سب کا ایسا ہونا لازم نہیں آتا۔ اسی لئے بعض حضرات نے اس آیت میں انسان سے مراد انسان کافر لیا ہے جیساکہ اوپر خلاصہ تفسیر میں ایسا ہی ہے اسکا حاصل یہ ہوگا کہ یہ دونوں مذموم خصلتیں دراصل کافر کی ہیں کسی مسلمان میں بھی خدانخواستہ پائی جائیں تو اُسے فکر کرنا چاہیئے۔ واللہ اعلم

تمت سورۃ العٰدیٰت بحمد اللہ تعالیٰ

سُورَةُ القَارِعَة

سُورَةُ الْقَارِعَةِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اِحْدٰى عَشْرَةَ اٰيَةً

سورۂ قارعہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی گیارہ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلْقَارِعَةُ ﴿۱﴾ مَا الْقَارِعَةُ ﴿۲﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ﴿۳﴾ يَوْمَ يَكُوْنُ

وہ کھڑکھڑا ڈالنے والی، کیا ہے وہ کھڑکھڑا ڈالنے والی اور تو کیا سمجھا کیا ہے وہ کھڑکھڑا ڈالنے والی جس دن ہوویں

النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ﴿۴﴾ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ﴿۵﴾

لوگ جیسے پتنگے بکھرے ہوئے اور ہوویں پہاڑ جیسے رنگی ہوئی اُون دُھنی ہوئی

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ﴿۶﴾ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ

سو جس کی بھاری ہوئیں تولیں تو وہ رہے گا من مانتے گزران میں اور جس کی ہلکی ہوئیں

مَوَازِيْنُهٗ ﴿۸﴾ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ﴿۹﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ﴿۱۰﴾ نَارٌ حَامِيَةٌ ﴿۱۱﴾

تولیں تو اسکا ٹھکانا گڑھا ہے اور تو کیا سمجھا وہ کیا ہے آگ ہے دہکتی ہوئی

ع ۱ / ۲۶

خلاصۂ تفسیر

وہ کھڑکھڑانے والی، چیز، کیسی ہے وہ کھڑکھڑانے والی چیز اور آپ کو کچھ معلوم ہے کیسی کچھ ہے وہ کھڑکھڑانے والی چیز (مراد قیامت ہے جو دلوں کو گھبراہٹ سے اور کانوں کو سخت آوازوں سے کھڑکھڑائے گی اور یہ اُس روز ہوگا) جس روز آدمی پریشان پروانوں کی طرح ہو جاویں گے (پروانوں سے تشبیہ چند چیزوں کی وجہ سے دی گئی، ایک کثرت سے ہونا کہ سارے اوّلین و آخرین انسان ایک میدان میں جمع ہو جاویں گے، دوسرے کمزور ہونا کہ سب انسان اُس وقت کمزوری میں پروانے جیسے ضعیف و عاجز ہوں گے یہ دونوں وصف تو تمام

اہلِ محشر انسانوں میں عام ہوں گے، تیسرے بیتاب اور بے چین ادھر اُدھر پھرنا جو پروانوں میں مشاہدہ کیا جاتا ہے یہ صورت خاص مومنین میں نہیں ہوگی وہ اپنی قبروں سے مطمئن اُٹھیں گے) اور پہاڑ دُھنکی ہوئی رنگین اُون کی طرح ہو جاویں گے (عہن رنگین اُون کو کہا جاتا ہے، پہاڑوں کے رنگ چونکہ مختلف ہیں وہ سب اُڑتے پھریں گے جن کی مثال اُس اُون کی ہوگی جس میں مختلف رنگ کے بال ملے ہوئے ہوں اُس روز اعمالِ انسانی تولے جائینگے) پھر جس شخص کا پلّہ (ایمان کا) بھاری ہوگا (یعنی جو مومن ہوگا) وہ تو خاطر خواہ آرام میں ہوگا (یعنی نجات پاکر جنت میں جائے گا) اور جس شخص کا پلّہ (ایمان کا) ہلکا ہوگا (یعنی کافر) اس کا ٹھکانا ہاویہ ہوگا اور آپ کو کچھ معلوم ہے کہ وہ (ہاویہ) کیا چیز ہے (وہ) ایک دہکتی ہوئی آگ ہے۔

معارف و مسائل

اس سورت میں اعمال کے وزن ہونے اور اُن کے ہلکے بھاری ہونے پر دوزخ یا جنت ملنے کا ذکر ہے۔ وزنِ اعمال کی پوری تحقیق اور شبہات کا جواب سورۂ اعراف کے شروع میں گزر چکا ہے (معارف جلد سوم ص۵۲۶ تا ص۵۳۲) وہاں دیکھ لیا جائے اُس میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ روایاتِ حدیث اور آیات کی تطبیق سے معلوم ہوتا ہے کہ وزن اعمال غالباً دو مرتبہ ہوگا، ایک مرتبہ کے وزن سے مؤمن اور کافر کا امتیاز کر دیا جائے گا ہر مؤمن کا پلّہ بھاری اور کافر کا ہلکا رہے گا، پھر مؤمنین میں اعمال حسنہ اور سیئہ کا امتیاز کرنے کے لئے دوسرا وزن ہوگا، اس سورت میں بظاہر وہ پہلا وزن مراد ہے جس میں ہر مومن کا پلّہ ایمان کی وجہ سے بھاری رہے گا خواہ اسکا عمل کیسا بھی ہو اور کافر کا پلّہ ایمان نہ ہونے کے سبب ہلکا رہے گا خواہ اُس نے کچھ نیک کام بھی کئے ہوں۔ تفسیر مظہری میں ہے کہ قرآن کریم میں عام طور پر جزا و سزا میں تقابل کفار کا مؤمنین صالحین کیساتھ کیا گیا کہ اصلی مؤمنین کاملین ہی ہیں، باقی رہے وہ مومنین جنھوں نے اعمالِ صالحہ اور سیئہ مخلوط کئے ہیں قرآن میں عام طور پر اُن سے سکوت کیا گیا، اور ان سب آیات میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قیامت میں انسانوں کے اعمال تولے جائیں گے گِنے نہیں جائیں گے، اور عمل کا وزن بقدرِ اخلاص اور مطابقت سُنت کے بڑھتا ہے جس شخص کے عمل میں اخلاص بھی کامل ہو اور سُنت کی مطابقت بھی مکمل ہو اگرچہ اسکے عمل تعداد میں کم ہوں اس کا وزن بہ نسبت اُس شخص کے بڑھ جائیگا جس نے تعداد میں تو نماز روزے، صدقہ خیرات، حج عمرے بہت کئے مگر اخلاص میں کمی رہی یا سنت کی مطابقت میں کمی رہی۔ واللہ اعلم ؂

تمت سورۃ القارعۃ بحمد اللہ تعالیٰ

سُورَةُ التَّكَاثُر

سُورَةُ التَّكَاثُرِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَمَانُ اٰيَاتٍ

سورۂ تکاثر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی آٹھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ① حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ② كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ③

غفلت میں رکھا تم کو بہتایت کی حرص نے یہانتک کہ جا دیکھیں قبریں کوئی نہیں آگے جان لوگے

ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ④ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ⑤ لَتَرَوُنَّ

پھر بھی کوئی نہیں آگے جان لوگے کوئی نہیں اگر جانو تم یقین کر کے بیشک تمکو دیکھنا ہے

الْجَحِيْمَ ⑥ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ⑦ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ⑧

دوزخ پھر دیکھنا ہے اُس کو یقین کی آنکھ سے پھر پوچھیں گے تم سے اُس دن آرام کی حقیقت

ع ۸ ۲۷

خُلاصۂ تفسیر

(دنیوی سامان پر) فخر کرنا تم کو (آخرت سے) غافل کئے رکھتا ہے یہانتک کہ تم قبرستانوں میں پہنچ جاتے ہو (یعنی مرجاتے ہو کذا فی تفسیر ابن کثیر مرفوعًا) ہرگز نہیں (یعنی دنیوی سامان قابل فخر ہے اور نہ آخرت قابل غفلت) تم کو بہت جلد (قبر میں جاتے ہی یعنی مرتے ہی) معلوم ہو جاوے گا پھر (دوبارہ تم کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ) ہرگز (یہ چیزیں قابل فخر اور توجہ کے اور آخرت قابل غفلت وانکار کے) نہیں تم کو بہت جلد (قبر سے نکلتے ہی یعنی حشر میں) معلوم ہو جاویگا (کذا فی فتح البیان مرفوعًا اور سہ بارہ پھر تم کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ) ہرگز (یہ چیزیں قابل فخر و توجہ کے اور آخرت قابل غفلت وانکار کے) نہیں (اور) اگر تم یقینی طور پر جان لیتے (یعنی دلائل صحیحہ میں غور و توجہ سے کام لیتے اور اسکا یقین آجاتا تو کبھی اس سامان پر فخر اور آخرت سے غفلت میں نہ پڑتے) واللہ تم لوگ ضرور دوزخ کو دیکھو گے پھر (مکرر تاکید کے لئے کہا جاتا ہے) واللہ تم لوگ ضرور اُس کو ایسا دیکھنا دیکھو گے جو کہ خود یقین ہے (کیونکہ یہ دیکھنا استدلال اور دلائل کی راہ سے نہیں ہوگا جس سے یقین حاصل ہونے میں کبھی دیر بھی لگتی ہے بلکہ یہ آنکھوں کا مشاہدہ ہوگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اپنی آنکھوں دیکھ لینے کو عین الیقین سے تعبیر فرمایا ہے) پھر (اور بات سنو کہ) اُس روز تم سب سے نعمتوں کی پوچھ ہوگی۔ (کہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا حق ایمان و اطاعت کیساتھ بجا لائے یا نہیں)

معارف و مسائل

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ، تکاثر کثرت سے مشتق ہے معنی ہیں کثرت کیساتھ مال و دولت جمع کرنا۔ حضرت ابن عباسؓ اور حسن بصری نے اس لفظ کی یہی تفسیر کی ہے اور یہ لفظ بمعنے تفاخر بھی استعمال کیا جاتا ہے حضرت قتادہ کی یہی تفسیر ہے اور حضرت ابن عباس رضہ کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے الہاکم التکاثر پڑھ کر فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ مال کو ناجائز طریقوں سے حاصل کیا جائے اور مال پر جو فرائض اللہ کے عائد ہوتے ہیں انہیں خرچ نہ کریں (قرطبی)

حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ، یہاں زیارتِ مقابر سے مراد مرکر قبر میں پہنچنا ہے جیسا کہ حدیث مرفوع میں خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حتّٰی زرتم المقابر کی تفسیر میں فرمایا حتّٰی یأتیکم الموت (ابن کثیر بروایت ابن ابی حاتم) اسلئے مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ تم لوگوں کو مال و دولت کی بہتات یا مال و اولاد اور قبیلہ و نسب پر تفاخر غفلت میں ڈالے رہتی ہے اپنے انجام اور آخرت کے حساب کی کوئی فکر نہیں کرتے یہانتک کہ اسی حال میں تمھیں موت آجاتی ہے اور وہاں عذاب میں پکڑے جاتے ہو۔ یہ خطاب بظاہر عام انسانوں کو ہے جو مال و اولاد کی محبت یا دوسروں پر اپنی برتری اور تفاخر میں ایسے مست رہتے ہیں کہ اپنے انجام کو سوچنے کیطرف توجہ ہی نہیں ہوتی۔ حضرت عبداللہ ابن شخّیر رضہ فرماتے ہیں کہ میں ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا تو آپ الہاکم التکاثر پڑھ رہے تھے اور یہ فرما رہے تھے کہ

یقول ابن اٰدم مالی مالی وھل لك من مالك الا ما اکلت فافنیت او لبست فابلیت او تصدّقت فامضیت وفی روایۃ لمسلم وما سوٰی ذٰلك فذاھب وتارکہ للناس (ابن کثیر و قرطبی بروایت مسلم۔ ترمذی احمد)

آدمی کہتا ہے کہ میرا مال میرا مال حالانکہ اسمیں تیرا حصّہ تو اتنا ہی ہے جس کو تو نے کھا کر فنا کر دیا یا پہنکر بوسیدہ کر دیا یا صدقہ کر کے اپنے آگے بھیجدیا اور اسکے سوا جو کچھ ہے وہ تیرے ہاتھ سے جانے والا ہے تو اُس کو لوگوں کے لئے چھوڑنے والا ہے۔

امام بخاری نے حضرت انس رضہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

لو کان لابن اٰدم وادیًا من ذھب لاحبّ ان یکون لہ وادیان ولن یملاء فاہ الا التراب و یتوب اللہ علٰی من تاب۔

اگر آدم زادے کے لئے ایک وادی (دامن کوہ) سونے سے بھری ہوئی موجود ہو تو (وہ اس پر قناعت نہیں کریگا بلکہ) چاہیگا کہ ایسی دو وادیاں ہو جاویں اور اُس کے منہ کو تو (قبر کی) مٹی کے سوا کوئی چیز بھر نہیں سکتی اور اللہ تعالیٰ تو بہ قبول کرتا ہے اُس شخص کی جو اُس کی طرف رجوع ہو۔

حضرت اُبی بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ ہم حدیث کے الفاظ مذکورہ کو قرآن سمجھا کرتے تھے یہانتک کہ سورۂ الہاکمُ التکاثر نازل ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے الہاکم التکاثر پڑھ کر مذکورہ الفاظ اُس کی تفسیر و تشریح کے طور پر پڑھے تھے اس سے بعض صحابہ کو شبہ ہو گیا کہ یہ بھی قرآن ہی کے الفاظ ہیں بعد میں جب پوری سورۃ الہاکم التکاثر سامنے آئی تو اسمیں یہ الفاظ نہیں تھے اس سے حقیقت واضح ہو گئی کہ یہ الفاظ تفسیر کے تھے۔

لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ، حرف لَوْ جو شرط کے لئے آتا ہے اسکے مقابل کوئی جزا ہونا چاہیئے وہ بقرینہ سیاق اس جگہ حذف کردی گئی ہے یعنی لما الھٰکم التکاثر یعنی اگر تم کو قیامت کے حساب کتاب کا یقین ہوتا

توتم اس تکاثر اور تغافل میں نہ پڑتے ۔

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ، اُوپر خلاصۂ تفسیر سے معلوم ہو چکا ہے کہ عین الیقین سے مراد وہ یقین ہے کہ جو کسی چیز کے مشاہدہ کے بعد حاصل ہوتا ہے اور یہ سب سے اعلیٰ درجہ یقین کا ہے ۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور پر تشریف رکھتے تھے اور اُن کے پیچھے اُن کی قوم نے گوسالہ پرستی شروع کردی تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو وہیں کوہ طور پر خبر کردی تھی کہ تمھاری قوم اس وبال میں مبتلا ہوگئی ہے مگر موسیٰ علیہ السلام پر اس خبر سے اتنا اثر نہیں ہوا جتنا اسوقت ہوا جب واپس پہنچکر اُنھوں نے بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی آنکھوں سے دیکھی اسکا اثر یہ ہوا کہ بے اختیار ہو کر الواحِ تورات ہاتھ سے چھوڑ دیں (رواہ احمد والطبرانی بسند صحیح ۔ مظہری)

ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ، یعنی تم سب سے قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کے متعلق بازپرس ہوگی کہ تمنے اُن کا شکر کیا ادا کیا اور اُن کو گناہوں میں تو خرچ نہیں کیا، انہیں سے بعض نعمتوں کے متعلق تو خود قرآن میں دوسری جگہ وضاحت آگئی جیسا فرمایا اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۤئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا جسمیں انسان کی قوتِ شنوائی، بینائی اور دل سے متعلق وہ لاکھوں نعمتیں آگئیں جن کو انسان ہر لمحہ استعمال کرتا ہے

حدیث ۔ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز بندہ سے جس چیز کا سب سے پہلے سوال ہوگا (وہ تندرستی ہے) اُس کو کہا جائے گا کہ کیا ہم نے تمھیں تندرستی نہیں دی تھی اور کیا ہم نے تمھیں ٹھنڈا پانی نہیں پلایا تھا (الترمذی عن ابی ہریرہ وابن حبان فی صحیحہ ۔ ابن کثیر)

حدیث ۔ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر میں کوئی آدمی اپنی جگہ سے سرک نہ سکے گا جبتک پانچ سوالوں کا جواب اُس سے نہ لیا جائے ۔ ایک یہ کہ اُس نے اپنی عمر کو کن کاموں میں فنا کیا ہے ۔ دوسرے یہ کہ اُس نے اپنے شباب کی قوت کو کن کاموں میں خرچ کیا ہے ۔ تیسرے یہ کہ جو مال اُس نے حاصل کیا وہ کس کس طریقے جائز یا ناجائز سے حاصل کیا ۔ چوتھے یہ کہ اس مال کو کہاں کہاں خرچ کیا، پانچویں یہ کہ جو علم اللہ نے اُس کو دیا تھا اُس پر کتنا عمل کیا ۔ (رواہ البخاری)

اور امام تفسیر مجاہد نے فرمایا کہ قیامت میں یہ سوال دُنیا کی ہر لذّت کے متعلق ہوگا (قرطبی) خواہ اسکا تعلق کھانے پینے سے ہو یا لباس اور مکان سے یا بیوی اور اولاد سے یا حکومت و عزّت سے ۔ قرطبی نے اس کو نقل کرکے فرمایا کہ یہ بالکل درست ہے اس سوال میں کسی خاص نعمت کی تخصیص نہیں ہے ۔

سورۂ تکاثر کی خاص فضیلت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام سے خطاب کرکے فرمایا کہ کیا تم میں کوئی آدمی اس کی قدرت نہیں رکھتا کہ ہر روز قرآن کی ایک ہزار آیتیں پڑھا کرے ۔ صحابۂ کرام نے عرض کیا کہ روزانہ ایک ہزار آیتیں کون پڑھ سکتا ہے ۔ آپ نے فرمایا کہ تم میں کوئی الْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ نہیں پڑھ سکتا مطلب یہ ہے کہ الْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ روزانہ پڑھنا ایک ہزار آیتوں کے پڑھنے کی برابر ہے ۔ (مظہری بحوالہ حاکم و بیہقی عن ابن عمرؓ)

تمّت سورۃ التکاثر بحمد اللہ تعالیٰ

سُورَةُ العَصر

سُوْرَةُ الْعَصْرِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثُ اٰيٰتٍ

سورۂ عصر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی تین آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالْعَصْرِ ① اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ② اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

قسم ہے عصر کی مقرر انسان ٹوٹے میں ہے مگر جو لوگ کہ یقین لائے اور کئے بھلے کام

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۵ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ③

اور آپس میں تاکید کرتے رہے سچے دین کی، اور آپس میں تاکید کرتے رہے تحمل کی

ع ۳ ۲۸

خلاصۂ تفسیر

قسم ہے زمانہ کی (جس میں رنج و خسران واقع ہوتا ہے) کہ انسان (اپنی عمر ضائع کرنے کی وجہ سے) بڑے خسارے میں ہے مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے (جو اپنے نفس کا کمال ہے) اور ایک دوسرے کو حق (پر قائم رہنے) کی فہمائش کرتے رہے اور ایک دوسرے کو (اعمال کی) پابندی کی فہمائش کرتے رہے (جو دوسروں کی تکمیل ہے تو جو لوگ خود بھی یہ کمال حاصل کریں اور دوسروں کی بھی تکمیل کریں یہ لوگ البتہ خسارے میں نہیں بلکہ نفع میں ہیں)

معارف و مسائل

سورۂ عصر کی خاص فضیلت حضرت عبید اللہ ابن حصن فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے دو شخص ایسے تھے کہ جب وہ آپس میں ملتے تھے تو اُس وقت تک جُدا نہ ہوتے جب تک ان میں سے ایک دوسرے کے سامنے سورۂ والعصر نہ پڑھ لے (رواہ الطبرانی) اور امام شافعی رح نے فرمایا کہ اگر لوگ صرف اسی

سُورت میں تدبُّر کرلیتے تو یہی اُن کے لئے کافی تھی (ابن کثیر)

سورۂ عصر قرآن کریم کی بہت مختصر سی سورت ہے لیکن ایسی جامع ہے کہ بقول حضرت امام شافعیؒ اگر لوگ اسی سُورت کو غور و تدبّر کے ساتھ پڑھ لیں تو دین و دُنیا کی دُرستی کے لئے کافی ہو جائے ۔ اس سورت میں حق تعالیٰ نے زمانہ کی قسم کھا کر فرمایا کہ نوعِ انسان بڑے خسارے میں ہے اور اس خسارہ سے مستثنیٰ صرف وہ لوگ ہیں جو چار چیزوں کے پابند ہوں ۔ ایمان، عمل صالح، دوسروں کو حق کی نصیحت و وصیّت اور صبر کی وصیّت ، دین و دُنیا کے خسارے سے بچنے اور نفع عظیم حاصل کرنے کا یہ قرآنی نسخہ چار اجزار سے مرکب ہے جن میں پہلے دو جزء اپنی ذات کی اصلاح کے متعلق ہیں اور دوسرے دو جزء دوسرے مُسلمانوں کی ہدایت و اصلاح سے متعلق ہیں ۔

یہاں پہلی بات یہ غور طلب ہے کہ اس مضمون کے ساتھ زمانے کو کیا مناسبت ہے جس کی قسم کھائی گئی کیونکہ قسم اور جوابِ قسم میں باہم مناسبت ضرور ہوتی ہے ۔ عام حضرات مفسّرین نے فرمایا کہ انسان کے تمام حالات اُسکا نشو و نما، اُس کی حرکات سکنات، اعمال، اخلاق سب زمانے ہی کے اندر ہوتے ہیں ۔ جن اعمال کی ہدایت اس سورت میں دی گئی ہے وہ بھی اسی زمانے کے لیل و نہار میں ہونگے اسکی مناسبت سے زمانہ کی قسم اختیار کی گئی ،

زمانے کو نوعِ انسانی کے خسارے میں کیا دخل ہے | اور توضیح اس کی یہ ہے کہ انسان کی عمر کا زمانہ اس کے سال اور مہینے اور دن رات بلکہ گھنٹے اور منٹ اگر غور کیا جائے تو یہی اسکا سرمایہ ہے جس کے ذریعہ وہ دُنیا و آخرت کے منافع عظیمہ عجیبہ بھی حاصل کرسکتا ہے اور عمر کے اوقات اگر غلط اور بُرے کاموں میں لگا دیئے تو یہی اس کے لئے وبالِ جان بھی بن جاتے ہیں ، بعض علمار نے فرمایا ہے ؎

حَيَاتُكَ اَنْفَاسٌ تُعَدُّ فَكُلَّمَا ❊ مَضٰى نَفَسٌ مِنْهَا انْتَقَصْتَ بِهٖ جُزْءًا

یعنی تیری زندگی چند گنے ہوئے سانسوں کا نام ہے ۔ جب اُن میں سے ایک سانس گزر جاتا ہے تو تیری عمر کا ایک جزء کم ہو جاتا ہے حق تعالیٰ نے ہر انسان کو اُس کی عمر کے اوقاتِ عزیز کا بے بہا سرمایہ دے کر ایک تجارت پر لگایا ہے کہ وہ عقل و شعور سے کام لے اور اس سرمایہ کو خالص نفع بخش کاموں میں لگائے تو اس کے منافع کی کوئی حد نہیں رہتی اور اگر اس کے خلاف کسی مضرت رساں کام میں لگا دیا تو نفع کی تو کیا اُمید ہوتی یہ رأس المال بھی ضائع ہو جاتا ہے اور صرف اتنا ہی نہیں کہ نفع اور رأس المال ہاتھ سے جاتا رہا ۔ بلکہ اُس پر سیکڑوں جرائم کی سزا عائد ہو جاتی ہے اور کسی نے اس سرمایہ کو نہ کسی نفع بخش کام میں لگایا نہ مضرت رساں میں تو کم از کم یہ خسارہ تو لازمی ہی ہے کہ اسکا نفع اور رأس المال دونوں ضائع ہو گئے اور یہ کوئی شاعرانہ تمثیل ہی نہیں بلکہ ایک حدیث مرفوع سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے جس میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ۔

كُلُّ يَغْدُوْ فَبَائِعٌ نَفْسَهٗ فَمُعْتِقُهَا اَوْ مُوْبِقُهَا | یعنی ہر شخص جب صبح اُٹھتا ہے تو اپنی جان کا سرمایہ تجارت پر لگاتا ہے پھر کوئی تو اپنے اس سرمایہ کو خسارہ سے آزاد کرالیتا ہے اور کوئی ہلاک کرڈالتا ہے

خود قرآن کریم نے بھی ایمان و عمل صالح کو انسان کی تجارت کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے هَلْ اَدُلُّكُمْ

عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنْجِیْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ، اور جب زمانہ عمر انسان کا سرمایہ ہوا اور انسان اسکا تاجر تو عام حالات میں اس تاجر کا خسارہ میں ہونا اس لئے واضح ہے کہ اس مسکین کا سرمایہ کوئی منجمد چیز نہیں جس کو کچھ دن بیکار بھی رکھا تو اگلے وقت میں کام آسکے بلکہ یہ سیّال سرمایہ ہے جو ہر منٹ ہر سکنڈ بہ رہا ہے اس کی تجارت کرنے والا بڑا ہوشیار مستعد آدمی چاہیئے جو بہتی ہوئی چیز سے نفع حاصل کرے۔ اسی لئے ایک بزرگ کا قول ہے کہ وہ برف بیچنے والے کی دوکان پر گئے تو فرمایا کہ اس کی تجارت کو دیکھ کر سورۂ والعصر کی تفسیر سمجھ میں آگئی کہ یہ ذرا بھی غفلت سے کام لے تو اسکا سرمایہ پانی بن کر ضائع ہو جائے گا اس لئے اس ارشادِ قرآنی میں زمانے کی قسم کھا کر انسان کو اس پر متوجہ کیا ہے کہ خسارے سے بچنے کے لئے جو چار اجزار سے مرکب نسخہ بتلایا گیا ہے اُس کے استعمال میں ذرا غفلت نہ برتے۔ عمر کے ایک ایک منٹ کی قدر پہچانے اور ان چار کاموں میں اسکو مشغول کردے۔

زمانہ کی قسم کی ایک مناسبت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جس چیز کی قسم کھائی جائے وہ ایک حیثیت سے اس معاملہ کے شاہد کے قائم مقام ہوتی ہے اور زمانہ ایسی چیز ہے کہ اگر اسکی تاریخ اور اُس میں قوموں کے عروج و نزول کے بھلے بُرے واقعات پر نظر کرے گا تو ضرور اس یقین پر پہنچ جائے گا کہ صرف یہ چار کام ہیں جن میں انسان کی فلاح و کامیابی منحصر ہے جس نے ان کو چھوڑا وہ خسارہ میں پڑا دُنیا کی تاریخ اس کی گواہ ہے۔

آگے ان چاروں اجزار کی تشریح یہ ہے کہ ایمان اور عمل صالح جو خود انسان کی ذات سے متعلق ہیں انکا معاملہ واضح ہے کسی تشریح کا محتاج نہیں البتہ آخری دو جز یعنی تَوَاصِیْ بِالْحَقِّ اور تَوَاصِیْ بِالصَّبْرِ یہ قابلِ غور ہیں کہ ان سے کیا مراد ہے۔ لفظ تَوَاصِیْ وصیّت سے مشتق ہے کسی شخص کو تاکید کے ساتھ مؤثر انداز میں نصیحت کرنے اور نیک کام کی ہدایت کرنے کا نام وصیّت ہے اسی وجہ سے مرنے والا جو اپنے بعد کے لئے کچھ ہدایات دیتا ہے اسکو بھی وصیّت کہا جاتا ہے۔

یہ دو جزر در حقیقت اسی وصیّت کے دو باب ہیں۔ ایک حق کی وصیّت دوسرے صبر کی وصیت، اب ان دونوں لفظوں کے معنی میں کئی احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ حق سے مراد عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ کا مجموعہ ہو، اور صَبر کے معنے تمام گناہوں اور بُرے کاموں سے بچنا ہو تو پہلے لفظ کا حاصل امر بالمعروف ہو گیا یعنی نیک کاموں کا حکم کرنا اور دوسرے کا حاصل نہی عن المنکر ہو گیا یعنی بُرے کاموں سے روکنا، اس مجموعہ کا حاصل پھر وہی ایمان اور عمل صالح جس کو خود اختیار کیا ہے اُس کی تاکید و نصیحت دوسروں کو کرنا ہو گیا اور ایک احتمال یہ ہے کہ حق سے مراد اعتقادات حقہ لئے جائیں اور صبر کے مفہوم میں تمام اعمالِ صالحہ کی پابندی بھی ہو اور بُرے کاموں سے بچنا بھی، کیونکہ لفظ صبر کے حقیقی معنے اپنے نفس کو روکنے اور پابند بنانے کے ہیں۔ اس پابندی میں اعمال صالحہ بھی آگئے اور گناہوں سے اجتناب بھی۔

اور حافظ ابن تیمیہ نے اپنے کسی رسالے میں فرمایا کہ انسان کو ایمان اور عمل صالح سے روکنے والی عادۃً دو چیزیں ہوتی ہیں، ایک شبہات یعنی اُس کو ایمان و عمل صالح میں کچھ نظری اور فکری شبہات پیدا ہو جاویں

جن کے سبب عقائد ہی مختل ہوجائیں اور عقائد کے مختل ہونے سے عمل صالح کا خلل پذیر ہونا خود ظاہر ہے۔ دوسرے شہوات یعنی خواہشات نفسانی جو انسان کو بعض اوقات نیک عمل سے روک دیتی ہیں اور بعض اوقات بُرے اعمال میں مبتلا کر دیتی ہیں اگرچہ وہ نظری اور اعتقادی طور پر نیکی پر عمل اور برائی سے بچنے کو ضروری سمجھتا ہو مگر نفسانی خواہشات اُسکے خلاف ہوں اور وہ ان خواہشات سے مغلوب ہو کر سیدھا راستہ چھوڑ بیٹھے، تو آیت مذکور میں وصیت حق سے مراد یہ ہو کہ شبہات کو دُور کرے، اور وصیت صبر سے مراد یہ کہ نفسانی خواہشات کو چھوڑ کر اچھے اعمال اختیار کرنے کی ہدایت کرے اسکا خلاصہ یہ ہے کہ وصیتِ بالحق سے مراد دوسرے مسلمانوں کی علمی اصلاح ہے اور وصیت بالصّبر سے مراد عملی اصلاح۔

نجات کے لئے صرف اپنے عمل کی اصلاح کافی نہیں بلکہ دوسرے مسلمانوں کی فکر بھی ضروری ہے

اس سورت نے مسلمانوں کو ایک بڑی ہدایت یہ دی کہ اُن کا صرف اپنے عمل کو قرآن وسُنّت کے تابع کر لینا جتنا اہم اور ضروری ہے اُتنا ہی اہم یہ ہے کہ دوسرے مسلمانوں کو بھی ایمان اور عمل صالح کی طرف بلانے کی مقدور بھر کوشش کرے ورنہ صرف اپنا عمل نجات کے لئے کافی نہ ہوگا، خصوصاً اپنے اہل وعیال اور احباب و متعلقین کے اعمال سیئہ سے غفلت برتنا اپنی نجات کا راستہ بند کرنا ہے اگرچہ خود وہ کیسے ہی اعمال صالحہ کا پابند ہو، اسی لئے قرآن وحدیث میں ہر مسلمان پر اپنی اپنی مقدرت کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض کیا گیا ہے۔ اس معاملے میں عام مسلمان بلکہ بہت سے خواص تک غفلت میں مبتلا ہیں، خود عمل کرنے کو کافی سمجھ بیٹھے ہیں، اولاد وعیال کچھ بھی کرتے رہیں اسکی فکر نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس آیت کی ہدایت پر عمل کی توفیق نصیب فرماویں۔

سُوْرَةُ الْهُمَزَة

سُوْرَةُ الْهُمَزَةِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ تِسْعُ اٰيٰتٍ

سورۂ ہمزہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی نو آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۝١ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝٢ يَحْسَبُ

خرابی ہے ہر طعنہ دینے والے عیب چننے والے کی جس نے سمیٹا مال اور گن گن کر رکھا خیال کرتا ہے

اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۝٣ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝٤ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا

کہ اسکا مال سدا کو رہے گا اسکے ساتھ کوئی نہیں وہ پھینکا جائیگا اُس روندنے والی میں اور تو کیا سمجھا کون ہے وہ

الْحُطَمَةُ ۝٥ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝٦ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝٧ اِنَّهَا

روندنے والی ایک آگ ہے اللہ کی سلگائی ہوئی وہ جھانک لیتی ہے دِل کو اُن کو

عَلَيْهِم مُّؤْصَدَةٌ ﴿٨﴾ فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ﴿٩﴾

اسمیں موند دیا ہے لنبے لنبے ستونوں میں

خلاصۂ تفسیر

بڑی خرابی ہے ہر ایسے شخص کے لئے جو پس پشت عیب نکالنے والا ہو (اور) رُو در رُو طعنہ دینے والا ہو جو (بہت حرص کی وجہ سے) مال جمع کرتا ہو اور (اس کی محبت اور اس پر فخر کے سبب) اس کو بار بار گنتا ہو (اسکے برتاؤ سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا) وہ خیال کر رہا ہے کہ اسکا مال اسکے پاس سدا رہے گا (یعنی مال کی محبت میں ایسا انہماک رکھتا ہو جیسے وہ اسکا معتقد ہے کہ وہ خود بھی ہمیشہ زندہ رہیگا اور اسکا مال بھی ہمیشہ یوں ہی رہے گا حالانکہ یہ مال اسکے پاس) ہرگز نہیں (رہے گا، آگے اُس ویل یعنی خرابی کی تفصیل ہے کہ) واللہ وہ شخص ایسی آگ میں ڈالا جائیگا جس میں جو کچھ پڑے وہ اُس کو توڑ پھوڑ دے، اور آپ کو کچھ معلوم ہے کہ وہ توڑنے پھوڑنے والی آگ کیسی ہے وہ اللہ کی آگ ہے جو (اللہ کے حکم سے) سُلگائی گئی ہے (آگ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنیمیں اُس آگ کے سخت اور ہولناک ہونیکی طرف اشارہ ہے، اور وہ ایسی ہے) جو (بدن کو لگتے ہی) دلوں تک جا پہنچے گی وہ (آگ) اُن پر بند کردی جاوئیگی (اس طرح سے کہ وہ لوگ آگ کے) بڑے لمبے لمبے ستونوں میں (گھرے ہوئے ہوں گے جیسے کسی کو آگ کے صندوقوں میں بند کردیا جائے)

معارف و مسائل

اس سورت میں تین سخت گناہوں پر عذاب شدید کی وعید اور پھر اُس عذاب کی شدت کا بیان ہے وہ تین گناہ یہ ہیں ہمز، لمز، جمع مال۔ ہمز اور لمز چند معانی کے لئے استعمال ہوتے ہیں، اکثر مفسرین نے جس کو اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہمز کے معنی غیبت یعنی کسی کے پیٹھ پیچھے اُس کے عیوب کا تذکرہ کرنا ہے اور لمز کے معنے آمنا سامنے کسی کو طعنہ دینے اور بُرا کہنے کے ہیں، یہ دونوں ہی چیزیں سخت گناہ ہیں۔ غیبت کی وعیدیں قرآن و حدیث میں زیادہ ہیں جس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس گناہ کے اشتغال میں کوئی رکاوٹ سامنے نہیں ہوتی جو اسمیں مشغول ہو تو بڑھتا چڑھتا ہی چلا جاتا ہے اسلئے گناہ بڑے سے بڑا اور زیادہ سے زیادہ ہوتا جاتا ہے بخلاف آمنا سامنے کہنے کے کہ وہاں دوسرا بھی مدافعت کے لئے تیار ہوتا ہے اسلئے گناہ میں امتداد نہیں ہوتا، اسکے علاوہ کسی کے پیچھے اسکے عیوب کا تذکرہ اس لئے بھی بڑا ظلم ہے کہ اُس کو خبر بھی نہیں کہ مجھ پر کیا الزام لگایا جا رہا ہے کہ اپنی صفائی پیش کرسکے۔

اور ایک حیثیت سے لمز زیادہ شدید ہے، کسی کے روبرو اُس کو بُرا کہنا اُس کی توہین و تذلیل بھی ہے، اور اس کی ایذا بھی اشد ہے اسی اعتبار سے اسکا عذاب بھی اشد ہے۔ حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

شِرَارُ عِبَادِ اللّٰهِ تَعَالٰى اَلْمَشَّاءُوْنَ بِالنَّمِيْمَةِ المفرّقون بَيْنَ الْاَحِبَّةِ اَلْبَاغُوْنَ الْبُرَاءَ العنت

یعنی اللہ کے بندوں میں بدترین وہ لوگ ہیں جو چغلخوری کرتے ہیں اور دوستوں کے درمیان فساد ڈلواتے ہیں، اور بے گناہ لوگوں کے عیب تلاش کرتے رہتے ہیں۔

تیسری خصلت جس پر عذاب کی وعید اس سورت میں آئی ہے وہ مال کی حرص اور محبت ہے اُسی کو آیت میں اس طرح سے تعبیر کیا ہے کہ حرص و محبت مال کیوجہ سے اُس کو بار بار گنتا رہتا ہے۔ چونکہ دوسری آیات و روایات اس پر شاہد ہیں کہ مطلقاً مال کا جمع رکھنا کوئی حرام و گناہ نہیں اسلئے یہاں بھی مراد وہ جمع کرنا ہے جسمیں حقوق واجبہ ادا نہ کئے گئے ہوں یا فخر و تفاخر مقصود ہو یا اُس کی محبت میں منہمک ہو کر دین کی ضروریات سے غفلت ہو۔

تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ، یعنی یہ جہنم کی آگ دلوں تک پہنچ جائے گی۔ یُوں تو ہر آگ کا خاصہ یہی ہے کہ جو چیز اسمیں پڑے اسکے سبھی اجزاء کو جلا دیتی ہے انسان اُس میں ڈالا جائے گا تو اُس کے سارے اعضاء کے ساتھ دل بھی جل جائے گا، یہاں جہنم کی آگ کی یہ خصوصیت اس لئے ذکر کی گئی کہ دُنیا کی آگ جب انسان کے بدن کو لگتی ہے تو اُس کے دل تک پہنچنے سے پہلے ہی موت واقع ہو جاتی ہے بخلاف جہنم کے کہ اُس میں موت تو آتی نہیں تو دل تک آگ کا پہنچنا بحالتِ حیات ہوتا ہے اور دل کے جلنے کی اذیت اپنی زندگی میں انسان محسوس کرتا ہے۔

تمت سورۃ الھمزۃ بحمد اللہ تعالیٰ

سُورَةُ الْفِيلِ

سُورَةُ الْفِيلِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ خَمْسُ آيَاتٍ

سورۂ فیل مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی پانچ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ ﴿١﴾ أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي

کیا تونے نہ دیکھا کیسا کیا تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا نہیں کر دیا اُن کا داؤ

تَضْلِيلٍ ﴿٢﴾ وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ ﴿٣﴾ تَرْمِيهِم بِحِجَارَةٍ

غلط اور بھیجے اُن پر اُڑتے جانور ٹکڑیاں ٹکڑیاں پھینکتے تھے اُن پر پتھریاں

مِّن سِجِّيلٍ ﴿٤﴾ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ ﴿٥﴾

کنکر کی پھر کر ڈالا اُن کو جیسے بھُس کھایا ہوا۔

ع ۵ ۳۰

خلاصۂ تفسیر

کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے رب نے ہاتھی والوں سے کیا معاملہ کیا (اس استفہام و سوال سے مقصود اس واقعہ کی عظمت اور ہولناک ہونے پر تنبیہ کرنا ہے۔ آگے اس معاملہ کا بیان ہے) کیا اُن کی تدبیر کو (جو کعبہ ویران کرنے کے لئے تھی) سرتاپا غلط نہیں کر دیا (یہ استفہام و سوال تقریری ہے یعنی واقعہ کی صحت ثابت کرنے کے لئے)

اور اُن پر غول کے غول پرندے بھیجے جو اُن لوگوں پر کنکر کی پتھریاں پھینکتے تھے سو اللہ تعالیٰ نے اُن کو کھائے ہوئے بھوسہ کی طرح (پامال) کر دیا (حاصل یہ کہ احکام الٰہیہ کی بےحرمتی کرنے والوں کو ایسے عذاب و عقاب سے بےفکر نہ رہنا چاہیئے ہو سکتا ہے کہ دُنیا ہی میں عذاب آجائے جیسے اصحابِ فیل پر آیا ورنہ آخرت کا عذاب تو یقینی ہی ہے)

معارف و مسائل

اس سُورت میں اصحابِ فیل کے واقعہ کا مختصر بیان ہے کہ اُنھوں نے بیت اللہ کو مسمار کرنے کے قصد سے ہاتھیوں کی فوج لیکر مکہ مکرمہ پر چڑھائی کی تھی، حق تعالیٰ نے معمولی پرندوں کے ذریعہ اُن کی فوج کو عذابِ آسمانی نازل فرما کر نیست و نابود کر کے اُن کے عزائم کو خاک میں ملا دیا۔

واقعہ فیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے سال میں ہوا یہ واقعہ اُس سال میں پیش آیا جس سال میں حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مکہ مکرمہ میں ہوئی، بعض روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور یہی مشہور قول ہے (ابن کثیر) حضرات محدثین نے اس واقعہ کو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ایک قسم کا معجزہ قرار دیا ہے مگر چونکہ معجزات کا قانون یہ ہے کہ وہ نبی کے دعوائے نبوت کیساتھ اُن کی تصدیق کے لئے ظاہر کئے جاتے ہیں۔ دعوائے نبوت سے پہلے بلکہ نبی کی ولادت سے بھی پہلے حق تعالیٰ بعض اوقات دُنیا میں ایسے واقعات اور نشانیاں ظاہر فرماتے ہیں جو خرق عادت ہونے میں مثل معجزہ کے ہوتے ہیں۔ اس طرح کی نشانیوں کو محدثین کی اصطلاح میں ارہاص کہا جاتا ہے جو تاسیس و تمہید کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ رہص سنگ بنیاد کو کہتے ہیں (قاموس) انبیاء علیہم السلام کی دُنیا میں تشریف آوری سے یا انکے دعوائے نبوت سے پہلے بھی حق تعالیٰ کچھ ایسی نشانیاں ظاہر فرماتے ہیں جو معجزات کی قسم سے ہوتی ہیں، اور ایسی نشانیاں چونکہ انکی نبوت کے اثبات کا مقدمہ اور اس قسم کی تمہید و تاسیس ہوتی ہیں اس لئے ان کو ارہاص کہا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور ولادت سے پہلے بھی اس قسم کے ارہاصات متعدد قسم کے ہوئے ہیں۔ اصحابِ فیل کو آسمانی عذاب کے ذریعہ بیت اللہ پر حملے سے روک دینا بھی انہی ارہاصات میں سے ہے۔

اصحابِ فیل کا واقعہ امام حدیث و تاریخ ابن کثیر نے اس طرح نقل فرمایا ہے کہ یمن پر ملوک حمیر کا قبضہ تھا یہ لوگ مشرک تھے ان کا آخری بادشاہ ذو نواس ہے جس نے اُس زمانے کے اہلِ حق یعنی نصاریٰ پر شدید مظالم کئے، اسی نے ایک طویل و عریض خندق کھدوا کر اُسکو آگ سے بھرا اور جتنے نصرانی بُت پرستی کے خلاف ایک اللہ کی عبادت کرنیوالے تھے سب کو اس آگ

کی خندق میں ڈال کر جلا دیا جن کی تعداد بیس ہزار کے قریب تھی۔ یہی وہ خندق کا واقعہ ہے جس کا ذکر اصحاب الاخدود کے نام سے سورۂ بروج میں گزرا ہے۔ ان میں دو آدمی کسی طرح اسکی گرفت سے نکل بھاگے اور انھوں نے قیصر ملک شام سے جاکر فریاد کی کہ ذونواس ملک حمیر نے نصاریٰ پر ایسا ظلم کیا ہے آپ انکا انتقام لیں۔ قیصر ملک شام نے بادشاہ حبشہ کو خط لکھا یہ بھی نصرانی تھا اور یمن سے قریب تھا کہ آپ اس ظالم سے ظلم کا انتقام لو، اسنے اپنا عظیم لشکر دو کمانڈر (امیر) ارباط اور ابرہہ کی قیادت میں یمن کے اس بادشاہ کے مقابلے پر بھیجدیا، لشکر اُس کے ملک پر ٹوٹ پڑا اور پورے یمن کو قوم حمیر کے قبضہ سے آزاد کرایا۔ ملک حمیر ذوالنواس بھاگ نکلا اور دریا میں غرق ہوکر مر گیا۔ اس طرح ارباط وابرہہ کے ذریعہ یمن پر بادشاہ حبشہ کا قبضہ ہوگیا، پھر ارباط اور ابرہہ میں باہمی جنگ ہوکر ارباط مقتول ہوگیا ابرہہ غالب آگیا اور یہی بادشاہ حبشہ نجاشی کیطرف سے ملک یمن کا حاکم (گورنر) مقرر ہوگیا، اس نے یمن پر قبضہ کرنے کے بعد ارادہ کیا کہ یمن میں ایک ایسا شاندار کنیسہ بنائے جس کی نظیر دُنیا میں نہ ہو۔ اس سے اسکا مقصد یہ تھا کہ یمن کے عرب لوگ جو حج کرنے کے لئے مکہ مکرمہ جاتے ہیں اور بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں یہ لوگ اس کنیسہ کی عظمت وشوکت سے مرعوب ہوکر کعبہ کے بجائے اسی کنیسہ میں جانے لگیں گے، اس خیال پر اُس نے بہت بڑا عالیشان کنیسہ اتنا اُونچا تعمیر کیا کہ اُس کی بلندی پر نیچے کھڑا ہوا آدمی نظر نہیں ڈال سکتا تھا اور اُسکو سونے چاندی اور جواہرات سے مرصّع کیا اور پوری مملکت میں اعلان کرا دیا کہ اب یمن سے کوئی کعبہ کے حج کے لئے نہ جائے اس کنیسہ میں عبادت کرے۔ عرب میں اگرچہ بُت پرستی غالب آگئی تھی مگر دین ابراہیم اور کعبہ کی عظمت ومحبت انکے دلوں میں پیوست تھی اسلئے عدنان اور قحطان اور قریش کے قبائل میں غم وغصہ کی لہر دَوڑ گئی یہانتک کہ انہیں سے کسی نے رات کے وقت کنیسہ میں داخل ہوکر اسکو گندگی سے آلودہ کردیا اور بعض روایات میں ہے کہ انہیں سے مسافر قبیلہ نے کنیسہ کے قریب اپنی ضروریات کے لئے آگ جلائی اسکی آگ کنیسہ میں لگ گئی اور اس کو سخت نقصان پہنچ گیا۔

ابرہہ کو جب اسکی اطلاع ہوئی اور بتلایا گیا کہ کسی قریشی نے یہ کام کیا ہے تو اُس نے قسم کھائی کہ میں انکے کعبہ کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رہونگا، ابرہہ نے اس کی تیاری شروع کی اور اپنے بادشاہ نجاشی سے اجازت مانگی اسنے اپنا خاص ہاتھی کہ جسکا نام محمود تھا ابرہہ کے لئے بھیجدیا کہ وہ اس پر سوار ہوکر کعبہ پر حملہ کرے بعض روایات میں ہے کہ یہ سب سے بڑا عظیم الشان ہاتھی تھا جس کی نظیر نہیں پائی جاتی تھی اور اُس کے ساتھ آٹھ ہاتھی دوسرے بھی اس لشکر کے لئے بادشاہ حبشہ نے بھیجدیئے تھے۔ ہاتھیوں کی یہ تعداد بھیجنے کا منشاء یہ تھا کہ بیت اللہ کعبہ کے ڈھانے میں ہاتھیوں سے کام لیا جائے۔ تجویز یہ تھی کہ بیت اللہ کے ستونوں میں لوہے کی مضبوط اور طویل زنجیریں باندھ کر ان زنجیروں کو ہاتھیوں کے گلے میں باندھیں اور انکو ہنکا دیں تو سارا بیت اللہ (معاذ اللہ) فوراً ہی زمین پر آگرے گا۔

عرب میں جب اس کے حملے کی خبر پھیلی تو سارا عرب مقابلہ کے لئے تیار ہوگیا۔ یمن کے عربوں میں ایک شخص ذونفر نامی تھا اُسنے عربوں کی قیادت اختیار کی اور عرب لوگ اسکے گرد جمع ہوکر مقابلہ کے لئے تیار ہوگئے اور ابرہہ کے خلاف جنگ کی مگر اللہ تعالیٰ کو تو یہ منظور تھا کہ ابرہہ کی شکست اور اُس کی رُسوائی نمایاں ہوکر دُنیا کے سامنے آئے

اسلئے یہ عرب مقابلے میں کامیاب نہ ہوئے، ابرہہ نے اُن کو شکست دیدی اور ذونفر کو قید کرلیا اور آگے روانہ ہوگیا اس کے بعد جب وہ قبیلہ خثعم کے مقام پر پہنچا تو اس قبیلہ کے سردار نُفَیل بن حبیب نے پورے قبیلہ کیساتھ ابرہہ کا مقابلہ کیا مگر ابرہہ کے لشکر نے اُن کو بھی شکست دیدی اور نفیل بن حبیب کو بھی قید کرلیا اور ارادہ اُن کے قتل کا کیا مگر پھر یہ سمجھ کر اُن کو زندہ رکھا کہ اُن سے ہم راستوں کا پتہ معلوم کرلیں گے، اسکے بعد جب یہ لشکر طائف کے قریب پہنچا تو طائف کے باشندے قبیلہ ثقیف پچھلے قبائل کی جنگ اور ابرہہ کی فتح کے واقعات سُن چکے تھے اُنھوں نے اپنی خیر منانے کا فیصلہ کیا اور یہ کہ طائف میں جو ہم نے ایک عظیم الشان بُت خانہ لَات کے نام سے بنا رکھا ہے یہ اُس کو نہ چھیڑے تو ہم اسکا مقابلہ نہ کریں، انھوں نے ابرہہ سے مِلکر یہ بھی طے کرلیا کہ ہم تمھاری امداد اور رہنمائی کے لئے اپنا ایک سردار ابو رِغال تمھارے ساتھ بھیجدیتے ہیں، ابرہہ اس پر راضی ہوکر ابو رغال کو ساتھ لیکر مکہ مکرمہ کے قریب ایک مقام مُغَمَّس پر پہنچ گیا جہاں قریش مکّہ کے اونٹ چر رہے تھے، ابرہہ کے لشکر نے سب سے پہلے ان پر حملہ کرکے اونٹ گرفتار کرلئے جن میں دو سو اُونٹ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے جدِّ امجد عبدالمطلب رئیسِ قریش کے بھی تھے ابرہہ نے یہاں پہنچکر اپنا ایک سفیر حناطہ حمیری کو شہر مکہ میں بھیجا کہ وہ قریش کے سرداروں کے پاس جاکر اطلاع کردے کہ ہم تم سے جنگ کے لئے نہیں آئے، ہمارا مقصد کعبہ کو ڈھانا ہے اگر تم نے اس میں رکاوٹ نہ ڈالی تو تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ حناطہ جب مکہ مکرمہ میں داخل ہوا تو سب نے اُس کو عبدالمطلب کا پتہ دیا کہ وہ سب سے بڑے سردار قریش کے ہیں، حناطہ نے عبدالمطلب سے گفتگو کی اور ابرہہ کا پیغام پہنچا دیا۔ ابنِ اسحٰق کی روایت کے مطابق عبدالمطلب نے یہ جواب دیا کہ ہم بھی ابرہہ سے جنگ کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے، نہ ہمارے پاس اتنی طاقت ہے کہ اسکا مقابلہ کرسکیں۔ البتہ میں یہ بتائے دیتا ہوں کہ یہ اللہ کا گھر اور اسکے خلیل ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا ہے وہ خود اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہے اللہ سے جنگ کا ارادہ ہے تو جو چاہے کرے پھر دیکھے کہ اللہ تعالیٰ کیا معاملہ کرتے ہیں۔ حناطہ نے عبدالمطلب سے کہا کہ تو پھر آپ میرے ساتھ چلیں میں آپکو ابرہہ سے ملاتا ہوں۔ ابرہہ نے جب عبدالمطلب کو دیکھا کہ بڑے وجیہ آدمی ہیں تو انکو دیکھ کر اپنے تخت سے نیچے اُتر کر بیٹھ گیا اور عبدالمطلب کو اپنی برابر بٹھایا اور اپنے ترجمان سے کہا کہ عبدالمطلب سے پُوچھے کہ وہ کس غرض سے آئے ہیں، عبدالمطلب نے کہا کہ میری ضرورت تو اتنی ہے کہ میرے اونٹ جو آپ کے لشکر نے گرفتار کرلئے ہیں اُن کو چھوڑ دیں۔ ابرہہ نے ترجمان کے ذریعہ عبدالمطلب سے کہا کہ جب میں نے آپ کو اوّل دیکھا تو میرے دل میں آپ کی بڑی وقعت و عزت ہوئی مگر آپ کی گفتگو نے اس کو بالکل ختم کردیا کہ آپ مجھ سے صرف اپنے دو سو اونٹوں کی بات کررہے ہیں اور یہ معلوم ہے کہ میں آپ کا کعبہ جو آپ کا دین ہے اُس کو ڈھانے کے لئے آیا ہوں اسکے متعلق آپ نے کوئی گفتگو نہیں کی۔ عبدالمطلب نے جواب دیا کہ اونٹوں کا مالک تو میں ہوں مجھے اُن کی فکر ہوئی اور بیت اللہ کا میں مالک نہیں بلکہ اسکا مالک ایک عظیم ہستی ہے وہ اپنے گھر کی حفاظت کرنا جانتا ہے۔ ابرہہ نے کہا کہ تمھارا خدا اُس کو میرے ہاتھ سے نہ بچا سکے گا۔ عبدالمطلب نے کہا کہ پھر تمھیں اختیار ہے جو چاہو کرو۔ اور بعض روایات میں ہے کہ عبدالمطلب کیساتھ اور بھی قریش کے چند سردار گئے تھے اور اُنھوں نے

ابرہہ کے سامنے یہ پیش کش کی کہ اگر آپ بیت اللہ پر دست اندازی نہ کریں اور لوٹ جائیں تو ہم پورے تہامہ کی ایک تہائی پیداوار آپ کو بطور خراج ادا کرتے رہیں گے مگر ابرہہ نے اُس کے ماننے سے انکار کر دیا۔ عبدالمطلب کے اونٹ ابرہہ نے واپس کر دیئے وہ اپنے اونٹ لیکر واپس آئے تو بیت اللہ کے دروازے کا حلقہ پکڑ کر دعا میں مشغول ہوئے اور قریش کی ایک بڑی جماعت ساتھ تھی سب نے اللہ تعالیٰ سے دُعائیں کیں کہ ابرہہ کے عظیم لشکر کا مقابلہ ہمارے تو بس میں نہیں، آپ ہی اپنے بیت کی حفاظت کا انتظام فرما دیں، الحاح وزاری کے ساتھ دُعا کرنے کے بعد عبدالمطلب مکہ مکرمہ کے دوسرے لوگوں کو ساتھ لیکر مختلف پہاڑوں پر پھیل گئے انکو یہ یقین تھا کہ اسکے لشکر پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آئے گا، اسی یقین کی بنا پر اُنھوں نے ابرہہ سے خود اپنے اونٹوں کا مطالبہ کیا، بیت اللہ کے متعلق گفتگو کرنا اسلئے پسند نہ کیا کہ خود تو اسکے مقابلے کی طاقت نہ تھی اور دوسری طرف یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اُنکی بے بسی پر رحم فرما کر دشمن کی قوت اور اس کے عزائم کو خاک میں ملا دیں گے۔ صبح ہوئی تو ابرہہ نے بیت اللہ پر چڑھائی کی تیاری کی اور اپنے ہاتھی محمود نامی کو آگے چلنے کے لئے تیار کیا۔ نفیل بن حبیب جن کو راستہ سے ابرہہ نے گرفتار کیا تھا اُس وقت وہ آگے بڑھے اور ہاتھی کا کان پکڑ کر کہنے لگے تو جہاں سے آیا ہے وہیں صحیح سالم لوٹ جا، کیونکہ تو اللہ کے بلد امین (محفوظ شہر) میں ہے یہ کہہ کر اسکا کان چھوڑ دیا، ہاتھی یہ سُنتے ہی بیٹھ گیا، ہاتھی بانوں نے اُس کو اُٹھانا چلانا چاہا لیکن وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا، اس کو بڑے بڑے آہنی تبروں سے مارا گیا، اُس کی بھی پروانہ کی، اُس کی ناک میں آنکڑا لوہے کا ڈالدیا پھر بھی وہ کھڑا نہ ہوا، اس وقت ان لوگوں نے اس کو یمن کی طرف لوٹانا چاہا تو فوراً کھڑا ہو گیا پھر شام کی طرف چلانا چاہا تو چلنے لگا پھر مشرق کی طرف چلایا تو چلنے لگا، ان سب اطراف میں چلانے کے بعد پھر اس کو مکہ مکرمہ کیطرف چلانے لگے تو پھر بیٹھ گیا۔

قدرتِ حق جلّ شانہٗ کا یہ کرشمہ تو یہاں ظاہر ہوا۔ دوسری طرف دریا کی طرف سے کچھ پرندوں کی قطاریں آتی دکھائی دیں جن میں سے ہر ایک کے ساتھ تین کنکریاں چنے یا مسور کی برابر تھیں ایک چونچ میں اور دو پنجوں میں واقدی کی روایت میں ہے کہ پرندے عجیب طرح کے تھے جو اس سے پہلے نہیں دیکھے گئے، جثہ میں کبوتر سے چھوٹے تھے اُن کے پنجے سُرخ تھے، ہر پنجے میں ایک کنکر اور ایک چونچ میں لئے آتے دکھائی دیتے اور فوراً ہی ابرہہ کے لشکر کے اُوپر چھا گئے، یہ کنکریں جو ہر ایک کے ساتھ تھیں اُن کو ابرہہ کے لشکر پر گرایا۔ ایک ایک کنکر نے وہ کام کیا جو ریوالور کی گولی بھی نہیں کر سکتی، کہ جس پر پڑتی اُسکے بدن کو چھیدتی ہوئی زمین میں گھُس جاتی تھی۔ یہ عذاب دیکھ کر ہاتھی سب بھاگ کھڑے ہوئے، صرف ایک ہاتھی رہ گیا تھا جو اس کنکری سے ہلاک ہوا، اور لشکر کے سب آدمی اسی موقع پر ہلاک نہیں ہوئے بلکہ مختلف اطراف میں بھاگے اُن سب کا یہ حال ہوا کہ راستہ میں مر مر کر گر گئے۔ ابرہہ کو چونکہ سخت سزا دینا تھی یہ فوراً ہلاک نہیں ہوا مگر اسکے جسم میں ایسا زہر سرایت کر گیا کہ اسکا ایک ایک جوڑ گل سڑ کر گرنے لگا اسی حال میں اس کو واپس یمن لایا گیا، دارالحکومت صنعاء پہنچکر اسکا سارا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بہ گیا اور مر گیا۔ ابرہہ کے ہاتھی محمود کے ساتھ دو ہاتھی بان یہیں مکہ مکرمہ میں رہ گئے مگر اس طرح کہ دونوں اندھے اور اپاہج ہو گئے

تھے۔ محمد بن اسحٰق نے حضرت عائشہ رضؓ سے روایت کیا ہے کہ اُنھوں نے فرمایا کہ میں نے ان دونوں کو اس حالت میں دیکھا ہے کہ وہ اندھے اور اپاہج تھے اور حضرت صدیقہ عائشہ کی بہن اسماء رضؓ نے فرمایا کہ میں نے دونوں اپاہج اندھوں کو بھیک مانگتے ہوئے دیکھا ہے۔ اصحاب فیل کے اسی واقعہ کے متعلق اس سورت میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا ہے،

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحٰبِ الْفِيْلِ، یہاں الم تر فرمایا جس کے معنے ہیں کیا آپ نے نہیں دیکھا حالانکہ یہ واقعہ آپ کی ولادت باسعادت سے کچھ دن پہلے کا ہے، آپ کے دیکھنے کا یہاں بظاہر کوئی موقع نہیں تھا مگر جو واقعہ یقینی ایسا ہو کہ عام طور پر مشاہدہ کیا گیا ہو اُس کے علم کو بھی لفظ رویت سے تعبیر کر دیا جاتا ہے کہ گویا یہ آنکھوں دیکھا واقعہ ہے، اور ایک حد تک دیکھنا بھی ثابت ہے جیسا کہ اوپر گزرا ہے کہ حضرت صدیقہ عائشہ اور اسماء رضی اللہ عنہا نے ہاتھی بانوں کو اندھا اور اپاہج بھیک مانگتے دیکھا ہے۔

طَيْرًا اَبَابِيْلَ، ابابیل لفظ جمع کا ہے مگر اسکا کوئی مفرد مستعمل نہیں، معنے اس کے پرندوں کے غول کے ہیں کسی خاص جانور کا نام نہیں، اُردو زبان میں جو ایک خاص چڑیا کو ابابیل کہتے ہیں وہ مراد نہیں جیسا کہ اوپر روایت میں گزر چکا ہے۔ یہ پرندے کبوتر سے کسی قدر چھوٹے تھے اور کوئی ایسی جنس تھی جو پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی (کذا قال سعید بن جبیرؒ، قرطبی)

بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ، سجیل بکسر سین سنگ گل کا معرّب کیا ہوا لفظ ہے جس کے معنے ہیں ایسی کنکریں جو ترمٹی کو آگ میں پکانے سے بنتی ہے اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ یہ کنکریں بھی خود کوئی طاقت نہ رکھتی تھیں معمولی گارے اور آگ سے بنی ہوئی تھیں مگر بقدرتِ حق سبحانہٗ اُنھوں نے ریوالور کی گولیوں سے زیادہ کام کیا۔

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ، عصف، بھوسہ کو کہتے ہیں اوّل تو خود بھوسہ ہی منتشر تنکے ہوتے ہیں، پھر جبکہ اُس کو کسی جانور نے چبا بھی لیا ہو تو وہ تنکے بھی اپنے حال پر نہیں رہتے۔ ابرہہ کے لشکر میں جس پر یہ کنکر پڑی ہے اس کا یہی حال ہو گیا ہے۔

اصحاب فیل کے اس عجیب غریب واقعہ نے پورے عرب کے دلوں میں قریش کی عظمت بڑھا دی اور سب ماننے لگے کہ یہ لوگ اللہ والے ہیں ان کی طرف سے خود حق تعالیٰ جلّ شانہٗ نے اُن کے دشمن کو ہلاک کر دیا (قرطبی) اسی عظمت کا یہ اثر تھا کہ قریش مکہ مختلف ملکوں کا سفر بغرض تجارت کرتے تھے اور راستہ میں کوئی اُن کو نقصان نہ پہنچاتا حالانکہ اُس وقت دوسروں کے لئے کوئی سفر ایسے خطرات سے خالی نہیں تھا۔ قریش کے انہی سفروں کا ذکر آگے اگلی سورت سورۂ قریش میں کر کے اُن کو شکر نعمت کی طرف دعوت دی گئی ہے۔

تمّت سُورۃ الفیل بحمد اللہ تعالیٰ

سُورۃ القریش

سُورۃ القریش مکیۃ وھی اربع اٰیات
سورۃ قریش مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چار آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ﴿١﴾ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ﴿٢﴾ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ
اسواسطے کہ مانوس رکھا قریش کو مانوس رکھنا اُن کو سفر سے جاڑے کے اور گرمی کے تو چاہیئے کہ بندگی کریں
هٰذَا الْبَيْتِ ﴿٣﴾ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴿٤﴾
اس گھر کے رب کی جس نے اُن کو کھانا دیا بھوک میں اور امن دیا ڈر میں

ع ۱
۲۱

خلاصۂ تفسیر

چونکہ قریش خوگر ہوگئے ہیں یعنی جاڑے اور گرمی کے سفر کے خوگر ہوگئے ہیں تو (اس نعمت کے شکر میں) انکو چاہیئے کہ اس خانۂ کعبہ کے مالک کی عبادت کریں جس نے اُن کو بھوک میں کھانے کو دیا اور خوف سے اُن کو امن دیا۔

معارف و مسائل

اس پر تو سب مفسرین کا اتفاق ہے کہ معنی اور مضمون کے اعتبار سے یہ سورت سورۂ فیل ہی سے متعلق ہے، اور شاید اسوجہ سے بعض مصاحف میں ان دونوں کو ایک ہی سورت کر کے لکھا گیا تھا، دونوں کے درمیان بسم اللہ نہیں لکھی تھی مگر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے جب اپنے زمانے میں تمام مصاحفِ قرآن کو جمع کر کے ایک نسخہ تیار فرمایا اور تمام صحابہ کرام کا اس پر اجماع ہوا۔ اسی نسخۂ قرآن کو جمہور کے نزدیک امام کہا جاتا ہے اسمیں ان دونوں کو دو الگ الگ سورتیں ہی لکھا ہے، دونوں کے درمیان بسم اللہ لکھی گئی ہے۔

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ، حرف لام ترکیبِ نحوی کے اعتبار سے اسکا مقتضی ہے کہ اسکا تعلق کسی سابق مضمون

کے ساتھ ہوا اسی لئے اس کے متعلق میں متعدد اقوال ہیں، پچھلی سورت کیساتھ معنوی تعلق کی بنا پر بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ یہاں محذوف جملہ اِنَّا اَهْلَكْنَا اَصْحٰبَ الْفِيْلِ ہے یعنی ہم نے اصحاب فیل کو اس لئے ہلاک کیا کہ قریش مکہ سردی گرمی کے دو سفروں کے عادی تھے، ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ رہے سب کے دلوں میں انکی عظمت پیدا ہو جائے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ محذوف جملہ اِعْجَبُوْا ہے یعنی تعجب کرو قریش کے معاملے سے کہ کس طرح سردی گرمی کے سفر آزادانہ بے خطر ہو کر کرتے ہیں، اور بعض نے فرمایا کہ اسکا تعلق اس جملہ سے ہے جو آگے آیت میں آرہا ہے یعنی فَلْيَعْبُدُوْا، مطلب یہ ہوا کہ قریش کو اس نعمت کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہونا اور اس کی عبادت میں لگ جانا چاہئے اس صورت میں فَلْيَعْبُدُوْا کے اوپر حرف فاء اسلئے ہے کہ پہلے جملے میں ایک معنی شرط کے پائے جاتے ہیں۔ بہر حال اس سورت میں ارشاد یہ ہے کہ قریش مکہ چونکہ دو سفروں کے عادی تھے، ایک سردی میں یمن کیطرف دوسرا گرمی میں شام کیطرف اور انہی دو سفروں پر ان کی تجارت اور کاروبار کا مدار تھا اور اسی تجارت کی بنا پر وہ مالدار اور اغنیاء تھے اسلئے اللہ تعالیٰ نے انکے دشمن اصحاب فیل کو عبرتناک سزا دیکر انکی عظمت لوگونکے قلوب میں بڑھا دی، یہ پورے ممالک میں جہاں بھی جائیں لوگ انکی تعظیم تکریم کرتے ہیں۔

قریش کی فضیلت سارے عرب پر اس سورت میں اسکی طرف بھی اشارہ ہے کہ تمام قبائل عرب میں قریش اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مقبول ہیں جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام اولاد اسماعیل علیہ السلام میں سے کنانہ کو اور کنانہ میں سے قریش کو اور قریش میں سے بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم میں سے مجھ کو انتخاب کر لیا ہے (البغوی عن واثلہ بن اسقع) اور ایک حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام آدمی قریش کے تابع ہیں خیر و شر میں (رواہ مسلم عن جابرؓ۔ مظہری) اور پہلی حدیث میں جس خداوندی انتخاب کا ذکر ہے غالباً اُس کی وجہ ان قبائل کے خاص ملکات اور استعدادیں ہیں، کفر و شرک اور جہالت کے زمانہ میں بھی ان کے بعض اخلاق اور ملکات نہایت اعلیٰ تھے انہیں قبولِ حق کی استعداد بہت کامل تھی، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام اور اولیاء اللہ میں بیشتر لوگ قریش ہیں سے ہوئے ہیں (مظہری)

رِحْلَةَ الشِّتَاۗءِ وَالصَّيْفِ، یہ بات معلوم و معروف ہے کہ مکہ مکرمہ ایک ایسے مقام میں آباد ہے جہاں کوئی زراعت نہیں ہوتی وہاں باغات نہیں جن کے پھل مکہ والوں کو مل سکیں، اسی لئے بانی بیت اللہ حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مکہ مکرمہ کے آباد ہونے کے وقت اللہ تعالیٰ سے یہ دعا فرمائی تھی کہ اس شہر کو جائے امن بنا دے اور اہل مکہ کو ثمرات کا رزق عطا فرمائے اُرْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ، اور باہر سے ہر طرح کے پھل یہاں لائے جایا کریں۔ يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ، اسلئے اہل مکہ کے معاش کا مدار اس پر تھا کہ وہ تجارت کے لئے سفر کریں اور اپنی ضروریات وہاں سے لائیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ مکہ والے بڑے افلاس اور تکلیف میں تھے یہانتک کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے جدِ امجد ہاشم نے قریش کو اسکے لئے آمادہ کیا کہ دوسرے ملکوں سے تجارت کا کام کریں۔ ملک شام ٹھنڈا ملک تھا گرمی کے زمانے میں وہاں اور یمن گرم ملک ہے سردی کے زمانے میں اسطرف تجارتی سفر کرتے اور منافع حاصل کرتے تھے اور چونکہ یہ لوگ بیت اللہ کے خادم ہونے کی حیثیت سے تمام عرب میں مقدس و محترم مانے جاتے تھے تو یہ راستہ کے ہر خطرے سے بھی محفوظ رہتے تھے، اور ہاشم چونکہ ان سب کے سردار مانے جاتے تھے اُن کا طریقہ یہ تھا کہ اس

تجارت میں جو منافع حاصل ہوتے اُن کو قریش کے امیر و غریب سب میں تقسیم کر دیتے تھے یہاں تک کہ انکا غریب آدمی بھی مالداروں کی برابر سمجھا جاتا تھا۔ پھر حق تعالیٰ نے اُن پر یہ مزید احسان فرمایا کہ ہر سال کے دو سفروں کی زحمت سے بھی اس طرح بچا دیا کہ مکہ مکرمہ سے ملے ہوئے علاقہ یمن، تبالہ اور جرش کو اتنا سرسبز اور زرخیز بنا دیا کہ وہاں کا غلہ انکی ضرورت سے زائد ہونے کی بنا پر ان کو اس کی ضرورت پڑی کہ یہ غلات وہاں سے لاکر جدّہ میں فروخت کریں چنانچہ اکثر ضروریاتِ زندگی جدّہ میں ملنے لگیں مکہ والے ان طویل دو سفروں کے بجائے صرف دو منزل پر جاکر جدّہ سے سب سامان لانے لگے۔ آیتِ مذکورہ میں حق تعالیٰ نے مکہ والوں پر اسی احسان و انعام کا ذکر فرمایا ہے۔

فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ، انعامات کا ذکر کرنے کے بعد اُن کا شکر ادا کرنے کے لئے قریش کو خصوصی خطاب کے ساتھ یہ ہدایت فرمائی کہ اس گھر کے مالک کی عبادت کیا کرو۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے رب البیت ہونے کی صفت کو خصوصیت سے اسلئے ذکر فرمایا کہ یہی بیت کعبہ اُن کے تمام فضائل اور برکات کا سرچشمہ تھا

الَّذِىٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ، اس میں قریشِ مکہ کے لئے دُنیا کی اُن تمام عظیم نعمتوں کو جمع فرمادیا ہے جو انسان کے خوش عیش رہنے کے لئے ضروری ہیں اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ میں کھانے پینے کی ضروریات داخل ہیں اور اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ میں دشمنوں ڈاکوؤں کے خوف سے مامون ہونا بھی شامل ہے اور آخرت کے عذاب سے مامون ہونا بھی۔

فائدہ ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ یہی وجہ ہے کہ جو شخص اس آیت کے حکم کے مطابق اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے تو اللہ تعالیٰ اسکے لئے دُنیا میں بھی امن اور بے خوف و خطر رہنے کا سامان فرما دیتے ہیں اور آخرت میں بھی، اور جو اس سے انحراف کرے اُس سے یہ دونوں قسم کے امن سلب کرلئے جاتے ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ، یعنی اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان فرمائی کہ ایک بستی تھی جو مامون و محفوظ اور ہر خطرہ سے مطمئن تھی اسکا رزق ہر جگہ سے وافر آجاتا تھا، پھر اس بستی والوں نے اللہ کے انعامات کی ناشکری کی تو اللہ نے ان کو بھوک اور خوف کی پریشانی میں مبتلا کر دیا اُن کے کرتوت کی بنا پر۔

فائدہ عظیمہ ابوالحسن قزوینی نے فرمایا کہ جس شخص کو کسی دشمن یا اور کسی مصیبت کا خوف ہو اسکے لئے لایلاف قریش کا پڑھنا امان ہے، اس کو امام جزری نے نقل کرکے فرمایا کہ یہ عمل آزمودہ اور مجرب ہے۔ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رہ نے تفسیر مظہری میں اس کو نقل کرکے فرمایا کہ مجھے میرے شیخ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ نے خوف و خطر کے وقت اس سورۃ کے پڑھنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ہر بلا و مصیبت کے دفع کرنے کے لئے اس کی قرارت مجرب ہے۔ حضرت قاضی صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ میں نے بھی بارہا اسکا تجربہ کیا ہے۔

تمت سورۃ القریش بحمد اللہ تعالیٰ

سُورۃ الماعُون

سُورۃ الماعُون مکیّۃ وھی سبع اٰیات

سورۂ ماعون مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی سات آیتیں ہیں

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَرَءَيۡتَ الَّذِىۡ يُكَذِّبُ بِالدِّيۡنِ ۝۱ فَذٰلِكَ الَّذِىۡ يَدُعُّ الۡيَتِيۡمَ ۝۲ وَلَا

تونے دیکھا اُس کو جو جھٹلاتا ہے انصاف ہونے کو سو یہ وہی ہے جو دھکے دیتا ہے یتیم کو اور نہیں

يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الۡمِسۡكِيۡنِ ۝۳ فَوَيۡلٌ لِّلۡمُصَلِّيۡنَ ۝۴ الَّذِيۡنَ هُمۡ عَنۡ

تاکید کرتا محتاج کے کھانے پر پھر خرابی ہے اُن نمازیوں کی جو اپنی

صَلَاتِهِمۡ سَاهُوۡنَ ۝۵ الَّذِيۡنَ هُمۡ يُرَآءُوۡنَ ۝۶ وَيَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ ۝۷

نماز سے بے خبر ہیں وہ جو دکھلاوا کرتے ہیں اور مانگی نہ دیویں برتنے کی چیز

ع ۱ / ۷ ۳۲

خُلاصۂ تفسیر

کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جو روزِ جزا کو جھٹلاتا ہے سو (آپ اسکا حال سُننا چاہیں تو سُنیئے کہ) وہ شخص وہ ہے جو یتیم کو دھکّے دیتا ہے اور محتاج کو کھانا دینے کی (دوسروں کو بھی) ترغیب نہیں دیتا (یعنی وہ ایسا سنگدل ہے کہ خود تو وہ کسی غریب کو کیا دیتا دوسروں کو بھی اس پر آمادہ نہیں کرتا۔ اور جب بندوں کا حق ضائع کرنا ایسا بُرا ہے تو خالق کا حق ضائع کرنا تو اور زیادہ بُرا ہے) سو (اس سے ثابت ہوا کہ) ایسے نمازیوں کے لئے بڑی خرابی ہے جو اپنی نماز کو بُھلا بیٹھتے ہیں (یعنی ترک کر دیتے ہیں) جو ایسے ہیں کہ (جب نماز پڑھتے ہیں تو) ریاکاری کرتے ہیں اور زکوٰۃ بالکل نہیں دیتے (کیونکہ زکوٰۃ کے لئے شرعاً یہ ضروری نہیں کہ سب کے سامنے ظاہر کرکے دے اسلئے اس کو بالکل نہ دینے سے بھی کوئی اعتراض نہیں کرسکتا بخلاف نماز کے وہ جماعت کیساتھ علانیہ ادا کی جاتی ہے اس کو بالکل چھوڑ دے تو سب پر نفاق ظاہر ہوجاوے اسلئے نماز کو محض دکھلاوے کے لئے پڑھ لیتا ہے)

معارف و مسائل

اس سورۃ میں کفار و منافقین کے بعض افعالِ قبیحہ مذمومہ کا ذکر اور اُن پر جہنّم کی وعید ہے، یہ افعال اگر کسی مؤمن سے سرزد ہوں جو تکذیب نہیں کرتا وہ بھی اگرچہ شرعاً مذموم اور سخت گناہ ہیں مگر وعید مذکور اُن پر نہیں ہے اسی لئے ان افعال و اعمال سے پہلے ذکر اُس شخص کا فرمایا ہے جو دین اور قیامت کا منکر ہے اسکی تکذیب کرتا ہے اسمیں اشارہ اسطرف ضرور ہے کہ یہ اعمال جنکا ذکر آگے رہا ہے مؤمن کی شان سے بعید ہیں وہ کوئی منکر کافر ہی کر سکتا ہے، وہ اعمالِ قبیحہ جنکا اس جگہ ذکر اس سورۃ میں فرمایا ہے یہ ہیں، یتیم کے ساتھ بدسلوکی اور اس کی توہین۔ مسکین محتاج کو باوجود قدرت کے کھانا نہ دینا اور دوسروں کو اس کی ترغیب نہ دینا، نماز پڑھنے میں ریاکاری کرنا، زکوٰۃ ادا نہ کرنا، یہ سب افعال اپنی ذات میں بھی بہت مذموم اور سخت گناہ ہیں اور جب کفر و تکذیب کے نتیجہ میں یہ افعال سرزد ہوں تو انکا وبال دائمی جہنّم ہے جیسا کہ اس سورۃ میں اسکو وَیل کے الفاظ سے بیان فرمایا ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ٥ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ٥ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ٥ یہ حال منافقین کا بیان فرمایا ہے جو لوگوں کو دکھلانے اور اپنے دعوائے اسلام کو ثابت کرنیکے لئے نماز تو پڑھتے ہیں مگر چونکہ وہ نماز کی فرضیت ہی کے معتقد نہیں اسلئے نہ اوقات کی پابندی کرتے ہیں نہ اصل نماز کی، جہاں دکھلانیکا موقع ہوا پڑھ لی، ورنہ ترک کردی عَنْ صَلَاتِهِمْ میں لفظ عن کا مفہوم یہی ہے کہ اصل نماز ہی سے بے پروائی اختیار کرے جو منافقین کی عادت ہے، اور نماز کے اندر کچھ سہو و نسیان ہو جانا جس سے کوئی مسلمان یہانتک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی خالی نہیں، وہ اس کلمہ کی مراد نہیں ہے کیونکہ اُس پر وعید ویل جہنم کی نہیں ہو سکتی، اور اگر یہ مراد ہوتی تو عن صلاتھم کے بجائے فی صلاتھم فرمایا جاتا، احادیث صحیحہ میں متعدد مرتبہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے نماز میں سہو واقع ہونا ثابت ہے وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ماعون کے اصل لفظی معنے شئ قلیل و حقیر کے ہیں اسلئے ماعون ایسی استعمالی اشیاء کو کہا جاتا ہے جو عادۃً ایک دوسرے کو عاریۃً دی جاتی ہیں اور جن کا باہم لین دین عام انسانیت کا تقاضا سمجھا جاتا ہے جیسے کلہاڑی پھاوڑہ یا کھانے پکانے کے برتن جنکا ضرورت کے وقت پڑوسیوں سے مانگ لینا کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا اور جو انہیں دینے سے بخل کرے وہ بڑا کنجوس کمبخت سمجھا جاتا ہے۔ مگر آیتِ مذکورہ میں لفظ ماعون سے مراد زکوٰۃ ہے اور زکوٰۃ کو ماعون اسلئے کہا گیا ہے کہ وہ مقدار کے اعتبار سے نسبتۃً بہت قلیل ہے یعنی صرف چالیسواں حصہ، حضرت علیؓ، ابن عمرؓ، حسن بصریؒ، قتادہؒ، ضحاکؒ وغیرہ جمہور مفسرین نے اس آیت میں ماعون کی تفسیر زکوٰۃ ہی سے کی ہے (مظہری) اور اس کے نہ دینے پر جو عذاب ویل جہنّم کا مذکور ہے وہ بھی ترک فرض ہی پر ہو سکتا ہے اشیاء استعمال کا دوسروں کو دینا بہت بڑا ثواب اور انسانیت و مروّت کے لحاظ سے ضروری ہی مگر فرض و واجب نہیں جس کے روکنے پر جہنّم کی وعید ہو، اور بعض روایاتِ حدیث میں جو اس جگہ ماعون کی تفسیر استعمالی اشیاء اور برتنوں سے کی گئی ہے اسکا مطلب ان لوگوں کی انتہائی خسّت کا اظہار ہے کہ یہ زکوٰۃ تو کیا دیتے استعمالی اشیاء جن کے دینے میں اپنا کچھ خرچ نہیں ہوتا اسمیں بھی کنجوسی کرتے ہیں، تو وعید صرف ان اشیاء کے نہ دینے پر نہیں بلکہ زکوٰۃ فرض کی عدم ادائیگی اور اسکے ساتھ مزید بخل شدید پر ہے واللہ اعلم۔

سُورۃ الکوثر

سُورۃ الکوثر مکیۃ و ھی ثلث اٰیات
سورۂ کوثر مکہ میں نازل ہوئی اور اسکی تین آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ ۞ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ ۞ اِنَّ شَانِئَکَ
بیشک ہم نے دی تجھ کو کوثر   سو نماز پڑھ اپنے رب کے آگے اور قربانی کر   بیشک جو دشمن ہے تیرا

ھُوَ الْاَبْتَرُ ۞ ع
وہی رہ گیا پیچھا کٹا

ع ۳۳

خُلاصۂ تفسیر

بیشک ہم نے آپ کو کوثر (جنّت کی ایک حوض کا نام بھی ہے اور ہر خیر کثیر بھی اسمیں شامل ہے) عطا فرمائی ہے (جس میں دُنیا و آخرت کی ہر خیر و بھلائی شامل ہے دُنیا میں دین اسلام کی بقاء و ترقی اور آخرت میں جنت کے درجات عالیہ سب داخل ہیں) سو (ان نعمتوں کے شکر میں) آپ اپنے پروردگار کی نماز پڑھیے (کیونکہ سب سے بڑی نعمت کے شکر میں سب سے بڑی عبادت چاہیئے اور وہ نماز ہے) اور تکمیل شکر کے لئے جسمانی عبادت کیساتھ مالی عبادت یعنی اُسی کے نام کی) قربانی کیجیئے (جیسا دوسری آیتوں میں عموماً نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا حکم ہے اسمیں زکوٰۃ کے بجائے قربانی کا ذکر شاید اسلیئے اختیار کیا گیا کہ قربانی میں مالی عبادت ہونے کے علاوہ مشرکین اور مشرکانہ رسُوم کی عملی مخالفت بھی ہے کیونکہ مشرکین بتوں کے نام کی قربانی کیا کرتے تھے۔ آگے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے قاسم کی بچپن میں وفات پر بعض مشرکین نے جو یہ طعنہ دیا تھا کہ ان کی نسل نہ چلے گی اور اُن کے دین کا سلسلہ جلد ختم ہو جائے گا، اسکا جواب ہے کہ آپ بفضلہ تعالیٰ بے نام و نشان نہیں ہیں بلکہ) بالیقین آپ کا دشمن ہی بے نام و نشان ہے (خواہ ظاہری نسل اس دشمن کی چلے یا نہ چلے لیکن دُنیا میں اسکا ذکر خیر باقی نہیں رہے گا، بخلاف

آپکے کہ آپ کی اُمت اور آپ کی یاد نیک نامی، محبت واعتقاد کے ساتھ باقی رہے گی، اور یہ سب نعمتیں لفظ کوثر کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اگر یسری اولاد کی نسل نہ ہو نہ سہی، جو نسل سے مقصود ہے وہ آپ کو حاصل ہی یہانتک کہ دُنیا سے گزر کر آخرت تک بھی، اور دشمن اس سے محروم ہے)

معارف و مسائل

شانِ نزول ابن ابی حاتم نے سدّی سے اور بیہقی نے دلائل نبوت میں حضرت محمد بن علی بن حسین رضؓ سے نقل کیا ہے کہ جس شخص کی اولاد ذکور مر جائے اُس کو عرب اَبتر کہا کرتے تھے یعنی مقطوع النسل۔ جس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے قاسم یا ابراہیم کا، بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تو کفارِ مکہ آپ کو ابتر کہہ کر طعنہ دینے لگے ایسا کہنے والوں میں عاص بن وائل کا نام خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے اس کے سامنے جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا جاتا تو کہتا تھا کہ اُن کی بات چھوڑو یہ کچھ فکر کرنے کی چیز نہیں کیونکہ وہ اَبتر (مقطوع النسل) ہیں جب اُن کا انتقال ہو جائیگا ان کا کوئی نام لینے والا بھی نہ رہے گا، اس پر سورۂ کوثر نازل ہوئی (رواہ البغوی، ابن کثیر و مظہری)

اور بعض روایات میں ہے کہ کعب بن اشرف یہودی ایک مرتبہ مکہ مکرمہ آیا تو قریشِ مکہ اسکے پاس گئے اور کہا کہ آپ اس نوجوان کو نہیں دیکھتے جو کہتا ہے کہ وہ ہم سب سے (دین کے اعتبار سے) بہتر ہے حالانکہ ہم حجاج کی خدمت کرنیوالے اور بیت اللہ کی حفاظت کرنے والے اور لوگوں کو پانی پلانے والے ہیں۔ کعب نے یہ سُن کر کہا کہ نہیں تم لوگ اس سے بہتر ہو، اس پر یہ سورۂ کوثر نازل ہوئی (ذکرہ ابن کثیر عن البزار باسناد صحیح و قد رواہ مسلم قالہ مظہری)

خلاصہ یہ ہے کہ کفار مکہ جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے یسری اولاد نہ رہنے کے سبب ابتر ہونے کے طعنے دیتے تھے یا دوسری وجوہ سے آپ کی شان میں گستاخی کرتے تھے اُن کے جواب میں سورۂ کوثر نازل ہوئی ہے جس میں اُنکے طعنوں کا جواب بھی ہے کہ صرف اولاد نرینہ کے نہ رہنے سے آپ کو مقطوع النسل یا مقطوع الذکر کہنے والے حقائق سے بے خبر ہیں۔ آپ کی نسل نسبی بھی انشاء اللہ دُنیا میں تا قیامت باقی رہے گی اگرچہ دُختری اولاد سے ہو اور نسل معنوی یعنی آپ پر ایمان لانیوالے مسلمان جو درحقیقت نبی کی اولاد معنوی ہوتے ہیں وہ تو اس کثرت سے ہونگے کہ پچھلے تمام انبیاء علیہم السّلام کی اُمتوں سے بھی بڑھ جائیں گے۔ اور اسمیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اللہ کے نزدیک مقبول اور مکرم و معظم ہونا بھی مذکور ہے جس سے کعب بن اشرف کے قول کی تردید ہو جاتی ہے۔ یہ سب مضمون سورۃ کی تیسری آیت میں آیا ہے۔

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ، امام بخاری نے حضرت ابن عباس رضؓ سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ اُنھوں نے فرمایا کہ "کوثر وہ خیر کثیر ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی ہے"۔ ابن عباس رضؓ کے خاص شاگرد سعید بن جُبیر رح سے کسی نے کہا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کوثر جنت کی ایک نہر کا نام ہے تو سعید بن جُبیرؒ نے جواب دیا کہ (ابن عباسؓ کا قول اسکے منافی نہیں بلکہ) وہ نہر جنت جسکا نام کوثر ہے وہ بھی اس خیر کثیر میں

داخل ہے اسی لئے امامِ تفسیر مجاہد نے کوثر کی تفسیر میں فرمایا کہ وہ دنیا و آخرت دونوں کی خیر کثیر ہے، اسمیں جنت کی خاص نہر کوثر بھی داخل ہے۔

حوضِ کوثر بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے۔ مسلم کے الفاظ یہ ہیں۔

بینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین اظہرنا فی المسجد اذا غفی اغفاءۃً ثم رفع رأسہ متبسماً - قلنا ما اضحکک یا رسول اللہ قال لقد انزلت علیّ آنفاً سورۃ فقرأ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم انا اعطینٰک الکوثر الخ ثم قال اتدرون ما الکوثر قلنا اللہ ورسولہ اعلم قال فانہٗ نہرٌ وعدنیہ ربی عزوجل علیہ خیر کثیر وھو حوض ترد علیہ امتی یوم القیامۃ آنیتہ عدد نجوم فی السماء فیختلج العبد منہم فاقول رب انہ من امتی فیقول انک لا تدری ما احدث بعدک

ایک روز جبکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مسجد میں ہمارے درمیان تھے اچانک آپ پر ایک قسم کی نیند یا بیہوشی کی سی کیفیت طاری ہوئی پھر ہنستے ہوئے آپ نے سر مبارک اُٹھایا، ہم نے پوچھا یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آپ کے ہنسنے کا سبب کیا ہے، تو فرمایا کہ مجھ پر اسی وقت ایک سورت نازل ہوئی ہے پھر آپ نے بسم اللہ کے ساتھ سورۂ کوثر پڑھی، پھر فرمایا تم جانتے ہو کوثر کیا چیز ہے، ہم نے عرض کیا اللہ ورسولہ اعلم، آپ نے فرمایا یہ ایک نہر جنت ہے جسکا میرے رب نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے جس میں خیر کثیر ہے اور وہ حوض ہے جس پر میری اُمت قیامت کے روز پانی پینے کے لئے آئے گی اسکے پانی پینے کے برتن آسمان کے ستاروں کی تعداد میں ہونگے اسوقت بعض لوگوں کو فرشتے حوض سے ہٹا دینگے تو میں کہونگا کہ میرے پروردگار یہ تو میری اُمت میں ہے، اللہ تعالیٰ فرمائیگا کہ آپ نہیں جانتے کہ اسنے آپکے بعد کیا نیا دین اختیار کیا ہے۔

ابن کثیر نے اس روایت کو نقل کر کے مزید لکھا ہے،

وقد ورد فی صفۃ الحوض یوم القیٰمۃ انہ یشخب فیہ میزابان من السماء من نہر الکوثر وان آنیتہ عدد نجوم السماء

حوض کی صفت میں روایاتِ حدیث میں آیا ہے کہ اس میں دو پرنالے آسمان سے گریں گے جو نہر کوثر کے پانی سے حوض کو بھردیں گے اسکے برتن آسمان کے ستاروں کی تعداد میں ہوں گے

اس حدیث سے سورۂ کوثر کا سبب نزول بھی معلوم ہوا اور لفظ کوثر کی صحیح تفسیر بھی یعنی خیر کثیر، اور یہ بھی کہ اس خیر کثیر میں وہ حوض کوثر بھی شامل ہے جو قیامت میں اُمّتِ محمدیہ کو سیراب کریگی۔ نیز اس روایت نے یہ بھی واضح کر دیا کہ اصل نہر کوثر جنّت میں ہے اور یہ حوض کوثر میدان حشر میں ہوگی اس میں دو پرنالوں کے ذریعہ نہر کوثر کا پانی ڈالا جائیگا۔ اسمیں اُن روایات کی بھی تطبیق ہوگئی جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حوضِ کوثر پر اُمّت کا ورود دخول جنت سے پہلے ہوگا، اور اس حدیث میں جو بعض لوگوں کو حوضِ کوثر سے ہٹا دینے کا ذکر ہے یہ وہ لوگ ہیں جو بعد میں اسلام سے پھر گئے یا پہلے ہی سے مسلمان نہیں تھے مگر منافقانہ اظہارِ اسلام

کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان کا نفاق کھل گیا، واللہ اعلم۔

احادیث صحیحہ میں حوضِ کوثر کے پانی کی صفائی اور شیرینی اور اُس کے کناروں کا جواہرات سے مرصّع ہونے کے متعلق ایسے اوصاف مذکور ہیں کہ دُنیا میں ان کا کسی چیز پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

اس سورۃ کا نزول اگر کفار کے طعنوں کے دفاع میں ہو جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ آپ کی اولاد نرینہ فوت ہوجانے کی وجہ سے وہ آپ کو ابتر مقطوع النسل قرار دے کر کہا کرتے تھے کہ ان کا کام چند روزہ ہے پھر کوئی نام لینے والا بھی نہ رہے گا تو اس سورۃ میں آپ کو کوثر عطا فرمانے کا ذکر جس میں حوضِ کوثر بھی شامل ہے ان طعنہ زنوں کی مکمل تردید ہے کہ ان کی نسل و نسب صرف یہی نہیں کہ دُنیا کی عمر تک چلیگی بلکہ اُن کی روحانی اولاد کا رشتہ محشر میں بھی محسوس ہوگا جہاں وہ تعداد میں بھی تمام اُمتوں سے زیادہ ہوں گے اور ان کا اعزاز و اکرام بھی سب سے زیادہ ہوگا۔

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ، انحر، نحر سے مشتق، اونٹ کی قربانی کو نحر کہا جاتا ہے جس کا مسنون طریقہ اسکا پاؤں باندھ کر حلقوم میں نیزہ یا چھری مار کر خون بہا دینا ہے جیسا کہ گائے بکری وغیرہ کی قربانی کا طریقہ ذبح کرنا یعنی جانور کو لٹا کر حلقوم پر چھری پھیرنا ہے۔ عرب میں چونکہ عموماً قربانی اونٹ کی ہوتی تھی اس لئے قربانی کرنے کے لئے یہاں لفظ وانحر استعمال کیا گیا۔ بعض اوقات لفظ نحر مطلقاً قربانی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس سورۃ کی پہلی آیت میں کفار کے زعمِ باطل کے خلاف رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کوثر یعنی دُنیا و آخرت کی ہر خیر اور وہ بھی کثیر مقدار میں عطا فرمانے کی خوشخبری سُنانے کے بعد اسکے شکر کے طور پر آپ کو دو چیزوں کی ہدایت کی گئی ہے۔ ایک نماز، دوسرے قربانی۔ نماز بدنی اور جسمانی عبادتوں میں سب سے بڑی عبادت ہے اور قربانی مالی عبادتوں میں اس بنا پر خاص امتیاز اور اہمیت رکھتی ہے کہ اللہ کے نام پر قربانی کرنا بُت پرستی کے شعار کے خلاف ایک جہاد بھی ہے کیونکہ اُن کی قربانیاں بُتوں کے نام پر ہوتی تھیں۔ اسی لئے قرآن کریم کی ایک اور آیت میں بھی نماز کے ساتھ قربانی کا ذکر فرمایا ہے اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اس آیت میں وانحر کے معنے قربانی ہونا حضرت ابنِ عباسؓ، عطاء، مجاہد اور حسن بصری وغیرہ سے مستند روایات میں ثابت ہے۔ بعض لوگوں نے جو وانحر کے معنی نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنے کے بعض ائمہ تفسیر کی طرف منسوب کئے ہیں اس کے متعلق ابن کثیر نے فرمایا کہ روایت منکر (ناقابلِ اعتبار) ہے۔

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ لفظ شَانِئ کے معنے بغض رکھنے والے عیب لگانے والے کے ہیں یہ آیت اُن کفار کے متعلق نازل ہوئی ہے جو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ابتر مقطوع النسل ہونے کا طعنہ دیتے تھے۔ اکثر روایات میں عاص بن وائل، بعض میں عقبہ، بعض میں کعب بن اشرف اسکے مصداق ہیں۔ حق تعالےٰ نے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کوثر یعنی خیر کثیر عطا کی جس میں اولاد کثیر بھی داخل ہے آپکے لئے اولاد کی کثرت اس لحاظ سے ہے کہ نسبی اولاد بھی آپ کی ماشاء اللہ کچھ کم نہیں اور پیغمبر چونکہ پوری اُمت کا باپ ہوتا ہے اور

پوری اُمّت اُس کی اولاد روحانی اور آپ کی اُمّت پچھلے تمام انبیاء کی اُمتوں سے تعداد میں زیادہ ہوگی۔ ایک طرف تو ان دشمنوں کی بات کو اس طرح خاک میں ملا دیا دوسری طرف یہ بھی فرما دیا کہ جو لوگ آپ کو ابتر ہونے کا طعنہ دیتے ہیں وہ ہی ابتر ہیں۔

عبرت اب غور کیجئے کہ رسولِ مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کے ذکر کو حق تعالیٰ نے کیسی رفعت اور عظمت عطا فرمائی کہ آپکے عہدِ مبارک سے آج تک پوری دُنیا کے چپہ چپہ پر آپ کا نام مبارک پانچ وقت اللہ کے نام کے ساتھ میناروں پر پکارا جاتا ہے اور آخرت میں آپ کو شفاعتِ کبریٰ کا مقام محمود حاصل ہوگا، اسکے بالمقابل دُنیا کی تاریخ سے پوچھئے کہ عاص بن وائل، عقبہ، کعب کی اولاد کہاں اور انکا خاندان کیا ہوا، خود ان کا نام بھی اسلامی روایات سے تفسیر آیات کے ذیل میں محفوظ ہوگیا ورنہ دُنیا میں آج اُن کا نام لینے والا کوئی باقی نہیں ہے۔
فَاعْتَبِرُوْا یٰۤاُولِی الْاَبْصَارِ۔

سُوْرَةُ الْكٰفِرُوْنَ

سُوْرَةُ الْكٰفِرُوْنَ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سِتُّ اٰيَاتٍ

سورۃ کافرون مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝۱ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝۲ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ

تو کہہ اے منکرو میں نہیں پوجتا جس کو تم پوجتے ہو اور نہ تم پوجو

مَآ اَعْبُدُ ۝۳ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝۴ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ

جسکو میں پوجوں اور نہ مجھ کو پوجنا ہے اُسکا جس کو تم نے پوجا اور نہ تم کو پوجنا ہے اسکا جس کو

اَعْبُدُ ۝۵ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝۶

میں پوجوں تم کو تمھاری راہ اور مجھ کو میری راہ

ع ۱ / ۶ / ۳۴

خلاصۂ تفسیر

آپ (ان کافروں سے) کہہ دیجئے کہ اے کافرو (میرا تمہارا طریقہ ایک نہیں ہوسکتا اور) نہ (تو فی الحال) میں تمہارے معبودوں کی پرستش کرتا ہوں اور نہ تم میرے معبود کی پرستش کرتے ہو اور نہ (آئندہ استقبال میں) میں تمہارے معبودوں کی پرستش کرونگا اور نہ تم میرے معبود کی پرستش کروگے (مطلب احقر کے نزدیک یہ ہے کہ میں موحد ہوکر شرک نہیں کرسکتا نہ اب نہ آئندہ، اور تم مشرک ہوکر موحد نہیں قرار دیئے جاسکتے نہ اب نہ آئندہ، یعنی توحید و شرک جمع نہیں ہوسکتے)

تم کو تمھارا بدلہ ملیگا اور مجھ کو میرا بدلہ ملیگا (اس میں اُن کے شرک پر وعید بھی سُنا دی گئی -)

معارف و مسائل

سورت کے فضائل اور خواص حضرت صدیقہ عائشہ رضؓ نے فرمایا کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ فجر کی سنتوں میں پڑھنے کے لئے دو سورتیں بہتر ہیں۔ سورۂ کافرون اور سورۂ اخلاص (رواہ ابن ہشام مظہری) اور تفسیر ابن کثیر میں متعدد صحابہ سے منقول ہے کہ انھوں نے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو صبح کی سنتوں میں اور بعد مغرب کی سنتوں میں بکثرت یہ دو سورتیں پڑھتے ہوئے سُنا ہے۔ بعض صحابہ نے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہمیں کوئی دُعا بتا دیجئے جو ہم سونے سے پہلے پڑھا کریں، آپ نے قل یا ایہا الکفرون پڑھنے کی تلقین فرمائی اور فرمایا کہ یہ شرک سے برات ہے (رواہ الترمذی وابوداؤد) اور حضرت جبیر بن مطعم رضؓ فرماتے ہیں کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جب سفر میں جاؤ تو وہاں تم اپنے سب رفقار سے زیادہ خوشحال بامراد رہو اور تمھارا سامان زیادہ ہو جائے۔ انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ بیشک میں ایسا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ آخر قرآن کی پانچ سورتیں سورۂ کافرون، سورۂ نصر، سورۂ اخلاص، سورۂ فلق اور سورۂ ناس پڑھا کرو اور ہر سورۃ کو بسم اللہ سے شروع کرو اور بسم اللہ ہی پر ختم کرو۔ حضرت جبیرؓ فرماتے ہیں کہ اُسوقت میرا حال یہ تھا کہ سفر میں اپنے دوسرے ساتھیوں کے بالمقابل قلیل الزاد خستہ حال ہوتا تھا۔ جب سے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم پر عمل کیا میں سب سے بہتر حال میں رہنے لگا (مظہری بحوالہ ابو یعلی) اور حضرت علی رضؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بچھو نے کاٹ لیا تو آپ نے پانی اور نمک منگایا اور یہ پانی کاٹنے کی جگہ لگاتے جاتے تھے اور قل یا ایہا الکافرون قل اعوذ برب الفلق، قل اعوذ برب الناس پڑھتے جاتے تھے۔ (مظہری)

شانِ نزول ابن اسحٰق کی روایت ابن عباسؓ سے یہ ہے کہ ولید بن مغیرہ اور عاص بن وائل اور اسود بن عبدالمطلب اور اُمیہ بن خلف رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ آؤ ہم آپس میں اس پر صلح کرلیں کہ ایک سال آپ ہمارے بتوں کی عبادت کیا کریں اور ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں (قرطبی) اور طبرانی کی روایت حضرت ابن عباسؓ سے یہ ہے کہ کفار مکہ نے اوّل تو باہمی مصالحت کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ صورت پیش کی کہ ہم آپ کو اتنا مال دیتے ہیں کہ آپ سارے مکہ میں سب سے زیادہ مالدار ہو جائیں اور جس عورت سے آپ چاہیں آپکا نکاح کر دیں، آپ صرف اتنا کریں کہ ہمارے معبودوں کو بُرا نہ کہا کریں اور اگر آپ یہ بھی نہیں مانتے تو ایسا کریں کہ ایک سال ہم آپکے معبود کی عبادت کیا کریں اور ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کیا کریں (مظہری) اور ابو صالح کی روایت حضرت ابن عباس رضؓ سے یہ ہے کہ کفار مکہ نے باہمی مصالحت کے لئے یہ صورت پیش کی تھی کہ آپ ہمارے بتوں میں سے بعض کو صرف ہاتھ لگا دیں تو ہم آپ کی تصدیق کرنے لگیں گے، اس پر جبرئیل امین سورۂ کافرون لیکر نازل ہوئے جس میں کفار کے اعمال سے برارت اور خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حکم ہے۔

شانِ نزول میں جو متعدد واقعات بیان ہوئے ہیں اُن میں کوئی تضاد نہیں، ہو سکتا ہے کہ یہ واقعات سبھی پیش آئے ہوں اور ان سب کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی ہو جسکا حاصل ایسی مصالحت سے روکنا ہے۔

لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ الآیۃ، اس سورۃ میں یہ چند کلمات مکرر آئے ہیں، اس تکرار کو رفع کرنے کیلئے ایک تفسیر تو وہ ہے جس کو بخاری نے بہت سے مفسرین سے نقل کیا ہے کہ دو کلمے ایک مرتبہ زمانہ حال کے لئے، اور دوسری مرتبہ زمانہ مستقبل کے متعلق آئے ہیں اسلئے کوئی تکرار نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ نہ تو بالفعل ایسا ہو رہا ہے کہ میں تمھارے معبودوں کی عبادت کروں اور تم میرے معبود کی عبادت کرو، اور نہ آئندہ ایسا ہو سکتا ہے کہ میں اپنی توحید پر تم اپنے شرک پر قائم رہتے ہوئے ایک دوسرے کے معبود کی عبادت کریں۔ اسی تفسیر کو حضرت حکیم الامتؒ نے تفسیر بیان القرآن میں اختیار فرمایا ہے جو اُوپر خلاصۂ تفسیر میں آچکی ہے مگر بخاری کی تفسیر میں لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ کی تفسیر دِین بمعنے مذہب اسلام و کفر سے کی ہے اور مطلب یہ قرار دیا ہے کہ مصالحت کی مجوزہ صورت قابلِ قبول نہیں میں تو اپنے دین پر قائم ہوں ہی تم بھی اپنے دین پر مصر ہو تو تم جانو، اسکا انجام تمھیں بھگتنا ہے اور بیان القرآن میں دین کو بمعنے جزا قرار دیا ہے۔

دوسری تفسیر وہ ہے جس کو ابن کثیر نے اختیار فرمایا ہے کہ حرف مَا لغت عرب میں جیسا اسم موصول اَلَّذِیْ کے معنی میں آتا ہے ایسا ہی کبھی مصدری معنی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے کہ وہ جس فعل پر داخل ہو اسکو بمعنے مصدر کر دیتا ہے۔ اس سورت میں پہلی جگہ تو حرف مَا اسم موصول اَلَّذِیْ کے معنے میں ہے اور دوسری جگہ مَا مصدریہ۔ تشریح اسکی یہ ہے کہ پہلے جملہ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ کے معنے یہ ہوئے کہ جن معبودوں کی تم عبادت کرتے ہو میں اُن کی عبادت نہیں کرتا اور جس معبود کی میں عبادت کرتا ہوں اسکی تم نہیں کرتے۔ اور دوسرے جملے وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ میں حرف مَا مصدریہ ہے اور معنے یہ ہیں لا انا عابد عبادتکم ولا انتم عابدون عبادتی، یعنی ہماری اور تمھاری عبادت کے طریقے ہی الگ الگ ہیں، میں تمھارے طرز کی عبادت نہیں کر سکتا اور تم جب تک ایمان نہ لاؤ تو میرے طرز کی عبادت نہیں کر سکتے۔ اس طرح پہلے جملے میں معبودوں کا اختلاف بتلایا اور دوسرے جملے میں عبادت کے طرز و طریقہ کے اختلاف کو ظاہر کیا، حاصل یہ ہوا کہ نہ تمھارے اور ہمارے معبود میں اشتراک ہے نہ طریق عبادت میں، اس طرح تکرار رفع ہوا اور طریقِ عبادت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا وہ ہے جو آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی بتلایا گیا، اور مشرکین کے طریقے خود ساختہ ہیں۔

ابن کثیر نے اس تفسیر کو راجح قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ کلمۂ اسلام لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ سے یہی مفہوم نکلتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور طریقِ عبادت وہ معتبر ہے جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے ہم تک پہنچا ہے، اور لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ کی تفسیر میں ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ جملہ ایسا ہی ہے جیسے دوسری جگہ قرآن کریم کا ارشاد ہے فَاِنْ کَذَّبُوْکَ فَقُلْ لِّیْ عَمَلِیْ وَلَکُمْ عَمَلُکُمْ اور دوسری جگہ ہے لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ اسکا حاصل یہ ہے

کہ لفظ دین کو ابن کثیر نے بھی اعمال دین کے معنی میں لیا ہے اور پھر مقصود اس سے وہی ہوگا جو بیان القرآن میں بیان کیا گیا کہ ہر ایک کو اپنے اپنے عمل کی جزا سزا خود بھگتنی پڑے گی۔

اور بعض مفسرین نے ایک تیسری تفسیر یہ اختیار کی کہ حرف ما دونوں جگہ موصولہ ہی ہے اور حال و استقبال کا بھی فرق نہیں بلکہ یہ دو جملے فی الواقع مکرر لائے گئے ہیں مگر ہر تکرار بُرا نہیں ہوتا، بہت جگہ تکرار تقاضائے بلاغت ہوتا ہے جیسا کہ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا میں ہے۔ یہاں اس تکرار کا مقصد تاکید مضمون بھی ہے اور یہ بھی کہ کفار کی طرف سے چونکہ ایسی مصالحت کی پیش کش متعدد مرتبہ کی گئی تو متعدد جملوں سے اُس کو رد کیا گیا (نقلہ ابن جریر۔ ابن کثیر)

کفار سے معاہدۂ صلح کی بعض صورتیں جائز ہیں بعض ناجائز

سورۂ کافرون میں کفار کی طرف سے پیش کی ہوئی مصالحت کی چند صورتوں کو بالکلیہ رد کر کے اعلان برارت کیا گیا، مگر خود قرآن کریم میں یہ ارشاد بھی موجود ہے وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا، یعنی کفار اگر صُلح کی طرف جُھکیں تو آپ بھی جُھک جائیے (یعنی معاہدہ صلح کر لیجئے) اور مدینہ طیبہ جب آپ ہجرت کر کے تشریف لے گئے تو یہود مدینہ سے آپ کا معاہدہ صلح مشہور و معروف ہے اسلئے بعض مفسرین نے سورۂ کافرون کو منسوخ کہدیا اور منسوخ کہنے کی بڑی وجہ آیت لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ کو قرار دیا ہے کیونکہ بظاہر یہ احکام جہاد کے منافی ہے مگر صحیح یہ ہے کہ یہاں لَكُمْ دِيْنُكُمْ کا یہ مطلب نہیں کہ کفار کو کفر کی اجازت یا کفر پر برقرار رکھنے کی ضمانت دیدی گئی بلکہ اسکا حاصل وہی ہے جو لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ کا ہے جسکا مطلب یہ ہے کہ جیسا کرو گے ویسا بھگتو گے اسلئے راجح اور صحیح جمہور کے نزدیک یہ ہے کہ یہ سورت منسوخ نہیں، جس قسم کی مصالحت سورۂ کافرون کے نزول کا سبب بنی وہ جیسے اُسوقت حرام تھی آج بھی حرام ہے اور جس صورت کی اجازت آیت مذکورہ میں آئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاہدۂ یہود سے عملاً ظاہر ہوئی، وہ جیسے اُسوقت جائز تھی آج بھی جائز ہے۔ بات صرف موقع و محل کو سمجھنے اور شرائط صلح کو دیکھنے کی ہے جسکا فیصلہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرما دیا ہے جس میں کفار سے معاہدہ کو جائز قرار دینے کے ساتھ ایک استثنار کا ارشاد ہے وہ یہ ہے اِلَّا صُلحًا اَحَلَّ حرامًا او حرّم حلالًا، یعنی ہر صلح جائز ہے بجز اُس صُلح کے جس کی رو سے اللہ کی حرام کی ہوئی کسی چیز کو حلال یا حلال کی ہوئی چیز کو حرام قرار دیا گیا ہو۔ اب غور کیجئے کہ کفار مکہ نے صلح کی جو صورتیں پیش کی تھیں، اُن سب میں کم از کم کفر و اسلام کی حدود میں التباس یقینی ہے اور بعض صورتوں میں تو اُصول اسلام کے خلاف شرک کا ارتکاب لازم آتا ہے، ایسی صلح سے سورۂ کافرون نے اعلانِ برارت کر دیا، اور دوسری جگہ جس صلح کو جائز قرار دیا اور معاہدۂ یہود سے اُس کی عملی صورت معلوم ہوئی، اس میں کوئی چیز ایسی نہیں جس میں اُصولِ اسلام کا خلاف کیا گیا ہو یا کفر و اسلام کی حدود آپس میں ملتبس ہوئی ہوں۔ اسلام سے زیادہ کوئی مذہب رواداری، حُسن سلوک صلح و سالمیت کا داعی نہیں مگر صلح اپنے انسانی حقوق میں ہوتی ہے۔ خدا کے قانون اور اُصول دین میں کسی صلح مصالحت کی کوئی گنجائش نہیں۔ واللہ اعلم

سُورَۃُ النَّصر

سُورَۃُ النَّصرِ مَدَنِیَّۃٌ وَّھِیَ ثَلٰثُ اٰیَاتٍ
سورۂ نصر مدینہ میں نازل ہوئی اور اسکی تین آیتیں ہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَ الۡفَتۡحُ ① وَ رَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ
جب پہنچ چکے مدد اللہ کی اور فیصلہ اور تو دیکھے لوگوں کو داخل ہوتے دین میں
اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ② فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَ اسۡتَغۡفِرۡہُ ؕؔ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا ③
اللہ کے غول کے غول تو پاکی بول اپنے رب کی خوبیاں اور گناہ بخشوا اس سے، بیشک وہ معاف کرنیوالا ہے

وقف النبی علیہ السلام — ع ۳۵

خلاصۂ تفسیر

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) جب خدا کی مدد اور (مکہ کی) فتح (مع اپنے آثار کے) آپہنچے اور) اس فتح پر مرتب ہونے والے آثار یہ ہیں کہ) آپ لوگوں کو اللہ کے دین (اسلام) میں جوق جوق داخل ہوتا دیکھ لیں، تو (اُسوقت سمجھئے کہ مقصود دُنیا میں رہنے کا اور آپ کی بعثت کا جو تکمیل دین تھا وہ پورا ہو چکا، اور اب سفر آخرت قریب ہے اُس کے لئے تیاری کیجئے اور) اپنے رب کی تسبیح و تحمید کیجئے اور اُس سے مغفرت کی درخواست کیجئے (یعنی ایسے اُمور جو خلافِ اولیٰ واقع ہو گئے اُن سے مغفرت مانگئے) وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔

معارف و مسائل

یہ سورۃ باجماع مدنی ہے اور اسکا نام سُوْرَۃُ التَّوْدِیع بھی ہے، تودیع کے معنی کسی کو رخصت کرنے کے ہیں اس سورۃ میں چونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات قریب ہونے کی طرف اشارہ ہے اسلئے اس کو سُوْرَۃُ التَّوْدِیع بھی کہا گیا۔

قرآن مجید کی آخری سورۃ اور آخری آیات صحیح مسلم میں حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ سورۂ نصر قرآن کی آخری سورۃ ہے (قرطبی) مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد کوئی مکمل سورۃ نازل نہیں ہوئی بعض آیات کا نزول جو اسکے بعد ہونا بعض روایات میں ہے وہ اس کے منافی نہیں، جیساکہ سورۂ فاتحہ کو قرآن کی سب سے پہلی سورۃ اسی معنی میں کہا جاتا ہے کہ مکمل سورۃ سب سے پہلے فاتحہ نازل ہوئی ہے۔ سورۂ اقراء اور مدثر وغیرہ کی چند آیات کا اس سے پہلے نازل ہونا اس کے منافی نہیں۔

حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ یہ سورۃ حجۃ الوداع میں نازل ہوئی اس کے بعد آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ نازل ہوئی، ان دونوں کے نزول کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں صرف اسّی روز رہے (اسّی روز کے بعد وفات ہوگئی) ان دونوں کے بعد آیت کلالہ نازل ہوئی جس کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف کے کل پچاس دن رہ گئے تھے اس کے بعد آیت لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ الآیۃ نازل ہوئی جس کے بعد عمر شریف کے کل پینتیس ۳۵ روز باقی تھے اسکے بعد آیت اِتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْہِ اِلَی اللّٰہِ نازل ہوئی جس کے بعد صرف اکیس روز اور مقاتل کی روایت میں صرف سات روز کے بعد وفات ہوگئی (قرطبی)

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اس آیت اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ میں فتح سے فتح مکہ مراد ہے، اور اس میں اختلاف ہے کہ یہ سورۃ فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی ہے یا بعد میں، لفظ اذا جاء سے بظاہر قبل فتح نازل ہونا معلوم ہوتا ہے اور روح المعانی میں بحر محیط سے ایک روایت بھی اسکے موافق نقل کی ہے جس میں اس سورۃ کا نزول غزوۂ خیبر سے لوٹنے کے وقت بیان کیا گیا، اور خیبر کی فتح فتح مکہ سے مقدم ہونا معلوم و معروف ہے اور روح المعانی میں بسند عبد ابن حُمیدؒ حضرت قتادہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سورۃ کے نزول کے بعد دو ۲ سال زندہ رہے۔ **اسکا حاصل بھی یہی ہے کہ اسکا نزول فتح مکہ سے پہلے ہوا کیونکہ فتح مکہ سے وفات تک دو ۲ سال سے کم مدت ہے۔ فتح مکہ رمضان ۸ھ ہجری میں ہوئی اور وفات ربیع الاوّل ۱۱ھ ہجری میں**۔ اور جن روایات میں اسکا نزول فتح مکہ یا حجۃ الوداع میں نازل ہونا بیان کیا گیا ہے اُن کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ اس موقع پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ سورۃ پڑھی ہوگی جس سے لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ یہ ابھی نازل ہوئی ہے۔ مزید تحقیق اس کی بیان القرآن میں مذکور ہے۔

متعدد احادیث مرفوعہ اور آثار صحابہ میں ہے کہ اس سورۃ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کا وقت قریب آجانے کیطرف اشارہ ہے کہ اب آپؐ کی بعثت اور دنیا میں قیام کا کام پورا ہوچکا اب تسبیح و استغفار میں لگ جائیے۔ مقاتل کی روایت میں ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو آپؐ نے صحابۂ کرام کے مجمع کے سامنے اس کی تلاوت فرمائی جن میں حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اور سعد بن ابی وقاصؓ وغیرہ موجود تھے سب اس کو سُنکر خوش ہوئے کہ اسمیں فتح مکہ کی خوشخبری ہے مگر حضرت عباسؓ رونے لگے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ رونے کا کیا سبب ہے تو حضرت عباسؓ نے عرض کیا کہ اس میں تو آپؐ کی وفات کی خبر مضمر ہے آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصدیق فرمائی۔ صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضؓ سے یہی مضمون روایت کیا ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ جب اس کو حضرت عمر رضؓ نے سنا تو فرمایا کہ اس سورت کے مفہوم سے میں بھی یہی سمجھتا ہوں (رواہ الترمذی وقال حدیث حسن صحیح۔ قرطبی)

وَرَاَيْتَ النَّاسَ، فتح مکہ سے پہلے بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جن کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور اسلام کی حقانیت پر تقریباً یقین ہوچکا تھا مگر اسلام میں داخل ہونے سے ابھی تک قریش کی مخالفت کے خوف سے یا کسی تذبذب کی وجہ سے رُکے ہوئے تھے۔ فتح مکہ نے وہ رکاوٹ دُور کردی تو فوج فوج ہوکر یہ لوگ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ یمن سے سات سو نفر مسلمان ہوکر پہنچے جو راستہ میں اذانیں دیتے اور قرآن پڑھتے ہوئے آئے۔ اسی طرح عام عرب فوج فوج ہوکر داخل اسلام ہوئے۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ، | جب موت قریب محسوس ہو تو تسبیح و استغفار کی کثرت چاہیئے | حضرت صدیقہ عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ اس سورت کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب کوئی نماز پڑھتے تو یہ دُعا کرتے تھے سبحانک ربنا وبحمدک اللّٰھم اغفرلی (رواہ البخاری)

حضرت اُم سلمہؓ فرماتی ہیں کہ اس سُورت کے نزول کے بعد اُٹھتے بیٹھتے اور جاتے آتے ہر وقت میں یہ دُعا پڑھتے تھے، سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ، اور فرماتے تھے کہ مجھے اس کا حکم کیا گیا اور دلیل میں اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ کی تلاوت فرماتے تھے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس سُورت کے نزول کے بعد رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے عبادت میں بڑا مجاہدہ فرمایا یہانتک کہ آپؐ کے پاؤں ورم کرگئے۔ (قرطبی)

تمت سورة النصر بحمد الله تعالى

سُورَةُ اللَّهَب

سُوْرَةُ اللَّهَبِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ خَمْسُ اٰيَاتٍ

سورۂ لہب مکہ میں نازل ہوئی اور اسکی پانچ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝۱ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝۲

ٹوٹ گئے ہاتھ ابی لہب کے اور ٹوٹ گیا وہ آپ کام نہ آیا اس کو مال اُس کا اور نہ جو اُس نے کمایا

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝۳ وَّامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝۴

اب پڑے گا ڈیگ مارتی آگ میں اور اُس کی جورو جو سر پر لئے پھرتی ہے ایندھن

فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝۵

اُس کی گردن میں رسّی ہے مونجھ کی

ع ۵ ۳۶

خُلاصۂ تفسیر

ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ برباد ہو جائے۔ نہ اُس کا مال اُس کے کام آیا اور نہ اُس کی کمائی (مال سے مراد اصل سرمایہ اور کمائی سے مراد اسکا نفع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی سامان اُس کو ہلاکت سے نہ بچا دیگا، یہ حالت تو اس کی دُنیا میں ہوئی اور آخرت میں) وہ عنقریب (یعنی مرتے ہی) ایک شعلہ زن آگ میں داخل ہوگا، وہ بھی اور اُس کی بیوی بھی جو لکڑیاں لاد کر لاتی ہے (مراد خاردار لکڑیاں ہیں جن کو وہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے راستہ میں بچھا دیتی تھی تاکہ آپ کو تکلیف پہنچے اور دوزخ میں پہنچکر) اُس کے گلے میں (دوزخ کی زنجیر اور طوق ہوگا کہ گویا وہ) ایک رسّی ہوگی خوب بٹی ہوئی (تشبیہ شدّت اور استحکام میں ہے)

معارف و مسائل

ابولہب کا اصلی نام عبدالعزّٰی تھا، یہ عبدالمطلب کی اولاد میں سے ہے۔ سُرخ رنگ ہونے کی وجہ سے

اس کی کنیت ابولہب مشہور تھی۔ قرآن کریم نے اسکا اصلی نام اسلئے چھوڑا کہ وہ نام بھی مشرکانہ تھا اور ابولہب کنیت میں، لہب جہنم سے ایک مناسبت بھی تھی۔ یہ شخص رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا بیحد دشمن اور اسلام کا شدید مخالف، آپؐ کو سخت ایذائیں دینے والا تھا، جب آپؐ لوگوں کو ایمان کی دعوت دیتے یہ ساتھ لگ جاتا اور آپؐ کی تکذیب کرتا جاتا تھا (ابن کثیر)

شانِ نزول صحیحین میں ہے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر آیت وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ نازل ہوئی تو آپؐ نے کوہِ صفا پر چڑھ کر اپنے قبیلہ قریش کے لوگوں کو آواز دی، بعض روایات میں ہے کہ یا صباحاہ کہہ کر یا بنی عبد مناف اور یا بنی عبد المطلب وغیرہ ناموں کیساتھ آواز دی (اس طرح آواز دینا عرب میں خطرہ کی علامت سمجھا جاتا تھا) سب قریش جمع ہوگئے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں تمھیں یہ خبر دوں کہ دشمن (تم پر چڑھ آیا ہے اور) صبح شام میں تم پر ٹوٹ پڑنے والا ہے کیا آپ لوگ میری تصدیق کروگے۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہاں ضرور تصدیق کریں گے، پھر آپؐ نے فرمایا کہ میں تمھیں ڈراتا ہوں ایک عذاب شدید سے (جو شرک کفر پر اللہ کیطرف سے مقرر ہے) یہ سُن کر ابولہب نے کہا تَبًّا لَکَ اَلِھٰذَا جَمَعْتَنَا۔ ہلاکت ہو تیرے لئے کیا تو نے ہمیں اسکے لئے جمع کیا تھا اور آپ کو مارنے کیلئے ایک پتھر اُٹھالیا، اس پر یہ سُورت نازل ہوئی۔

تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ وَّتَبَّ، یَدٌ کے اصلی معنی ہاتھ کے ہیں، چونکہ انسان کے سب کاموں میں بڑا دخل ہاتھوں کو ہے اس لئے کسی شخص کی ذات اور نفس کو یَدٌ سے تعبیر کردیتے ہیں جیسے قرآن میں ہے بِمَا قَدَّمَتْ یَدَاکَ اور بیہقی نے ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ ابولہب نے ایک روز لوگوں سے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد فلاں فلاں کام ہونگے پھر اپنے ہاتھوں کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا کہ ان ہاتھوں میں ان چیزوں میں سے کچھ بھی آیا نہیں پھر اپنے ہاتھوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا تبّا لکما ما اریٰ فیکما شیئاً مما قال محمد، یعنی تم برباد ہو جاؤ میں تمھارے اندر اُن چیزوں میں سے کچھ بھی نہیں دیکھتا جن کے ہونے کی خبر محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) دیتے ہیں اس کی مناسبت سے قرآن کریم نے ہلاکت کو ہاتھوں کی طرف منسوب کیا۔

تَبَّ، تباب سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں ہلاک و برباد ہو، اس آیت میں پہلا جملہ تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ بطور بددُعا کے ہے یعنی ابولہب ہلاک ہو جائے اور دوسرا جملہ یعنی وَّتَبَّ جملہ خبریہ ہے گویا بددُعا کے ساتھ اسکا اثر بھی بتلا دیا کہ وہ ہلاک ہوگیا اور جملہ بددُعا کا مسلمانوں کے شفاء غیظ کے لئے ارشاد فرمایا گیا کیونکہ جس وقت ابولہب نے آپ کی شان میں تبًّا کہا تو مسلمانوں کے دل کی خواہش تھی کہ وہ اس کے لئے بددُعا کریں، حق تعالیٰ نے گویا اُن کے دل کی بات خود فرمادی اور ساتھ ہی یہ خبر بھی دیدی کہ یہ بددُعا اسکو لگ بھی گئی اور وہ ہلاک ہوگیا۔ قرآن نے اسکی ہلاکت و بربادی کی خبر جو پہلے ہی دیدی تھی اُسکا اثر یہ ہوا کہ واقعہ بدر کے سات روز بعد اسکے طاعون کی گلٹی نکلی جس کو عرب عَدَسَہ کہتے ہیں۔ مرض دوسروں کو لگ جانیکے خوف سے سب گھر والوں نے اسکو الگ ڈالدیا یہانتک کہ اسی بیکسی کی حالت میں مرگیا اور تین روز تک اسکی لاش یُونہی

پڑی رہی، جب سڑنے لگا تو مزدوروں سے اُٹھوا کر دبوا دیا۔ اُنھوں نے ایک گڑھا کھود کر ایک لکڑی سے اُس کی لاش کو گڑھے میں ڈالدیا اوپر سے پتھر بھر دیئے (بیان القرآن بحوالہ روح)

مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ، مَا کَسَبَ کے معنے ہیں جو کچھ اس نے کمایا، اس سے مراد وہ منافع تجارت وغیرہ بھی ہو سکتے ہیں جو مال کے ذریعہ حاصل کئے جاتے ہیں جیسا کہ خلاصہ تفسیر میں کہا گیا ہے اور اولاد بھی مراد ہو سکتی ہے کیونکہ اولاد کو بھی انسان کی کمائی کہا جاتا ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان اطیب مآاکل الرجل من کسبہ وان ولدہ من کسبہ یعنی جو کھانا آدمی کھاتا ہے اسمیں سب سے زیادہ حلال طیب وہ چیز ہے جو آدمی اپنی کمائی سے حاصل کرے اور آدمی کی اولاد بھی اسکے کسب میں داخل ہے یعنی اولاد کی کمائی کھانا بھی اپنی ہی کمائی سے کھانا ہے (قرطبی) اسی لئے حضرت عائشہؓ، مجاہدؒ، عطاءؒ، ابن سیرینؒ وغیرہ نے اس جگہ مَا کَسَبَ کی تفسیر اولاد سے کی ہے ابولہب کو اللہ تعالیٰ نے مال بھی بہت دیا تھا اولاد بھی، یہی دونوں چیزیں ناشکری کیوجہ سے اُسکے فخر و غرور اور وبال کا سبب بنیں۔ حضرت ابن عباس رضؓ نے فرمایا کہ جس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کو اللہ کے عذاب سے ڈرایا تو ابولہب نے یہ بھی کہا تھا کہ جو کچھ یہ میرا بھتیجہ کہتا ہے اگر وہ حق ہی ہوا تو میرے پاس مال و اولاد بہت ہے میں اسکو دیکر اپنی جان بچالوں گا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ یعنی جب اس کو خدا تعالیٰ کے عذاب نے پکڑا تو نہ اُس کا مال کام آیا نہ اولاد، یہ تو حال اسکا دُنیا میں ہوا، آگے آخرت کا ذکر ہے۔

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ، یعنی قیامت کے بعد یا مرنیکے فوراً بعد قبر ہی میں یہ ایک شعلہ زن آگ میں داخل ہوگا۔ اسکے نام کی مناسبت سے آگ کیساتھ ذات لہب کی صفت میں خاص بلاغت ہے۔

وَامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ، جس طرح ابولہب کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سخت غیظ اور دشمنی تھی اُس کی بیوی بھی اس دشمنی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی میں اس کی مدد کرتی تھی۔ یہ ابوسفیان کی بہن بنت حرب بن اُمیہ ہے جس کو ام جمیل کنیت کے اعتبار سے کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی اس آیت نے بتلایا کہ یہ بدبخت بھی اپنے شوہر کیساتھ جہنم کی آگ میں جائیگی اسکے ساتھ اسکا ایک حال یہ بتلایا کہ وہ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ہے۔ جس کے لفظی معنے ہیں سوختہ کی لکڑیاں لادنے والی۔ یعنی آگ لگانیوالی، عرب کے محاورات میں چغلخوری کرنے والے کو حمّال الحطب کہا جاتا تھا کہ جیسے کوئی سوختہ کی لکڑیاں جمع کرکے آگ لگانے کا سامان کرتا ہے چغلخور کا عمل بھی ایسا ہی ہے کہ وہ اپنی چغلخوری کے ذریعہ افراد اور خاندانوں میں آگ بھڑکا دیتا ہے یہ عورت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی ایذا رسانی کے لئے چغلخوری کا کام بھی کرتی تھی۔ اس آیت میں ابولہب کی بیوی کو حمّالۃ الحطب کہنے کی تفسیر حضرت ابن عباسؓ، مجاہد، عکرمہ وغیرہ ایک جماعت مفسرین نے یہی کی ہے کہ یہ چغلخوری کرنے والی تھی، اور ابن زید، ضحاک وغیرہ مفسرین نے اسکو اپنے حقیقی معنے میں رکھا ہے جس کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ یہ عورت جنگل سے خاردار لکڑیاں جمع کرکے لاتی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے راستے

میں بچھا دیتی تھی تاکہ آپؐ کو تکلیف پہنچے اس کی اس ذلیل و خسیس حرکت کو قرآن نے حمّالۃ الحطب سے تعبیر فرمایا ہے (قرطبی، ابن کثیر) اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اسکا یہ حال جہنم میں ہوگا کہ اپنے شوہر پر جہنم کے درختوں زقوم وغیرہ کی لکڑیاں لا کر ڈالیگی تاکہ اسکی آگ اور بھڑک جائے جس طرح دُنیا میں وہ اسکے کفر و ظلم کو بڑھاتی تھی آخرت میں اسکے عذاب کو بڑھائیگی (ابن کثیر)

چغلخوری سخت گناہِ کبیرہ ہے | حدیث صحیح میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں چغلخور داخل نہ ہوگا اور حضرت فضیل بن عیاض رح نے فرمایا کہ تین عمل ایسے ہیں جو انسان کے تمام اعمالِ صالحہ کو برباد کر دیتے ہیں روزہ دار کا روزہ اور وضو والے کا وضو خراب کر دیتے ہیں یعنی غیبت اور چغلخوری اور جھوٹ۔ عطار بن سائب فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت شعبیؒ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا ذکر کیا جس میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ لا یدخل الجنۃ سافک دم ولا مشاء بنمیمۃ ولا تاجر یربی، یعنی تین قسم کے آدمی جنت میں نہ داخل ہونگے۔ ناحق خون بہانے والا، اور چغلخوری کرنے والا، اور وہ تاجر جو سود کا کاروبار کرے۔ عطار کہتے ہیں کہ میں نے اس حدیث کا ذکر کر کے شعبی سے بطور تعجب کے دریافت کیا کہ حدیث میں چغلخور کو قاتل اور سود خور کی برابر بیان فرمایا ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ ہاں چغلخوری تو ایسی چیز ہے کہ اس کی وجہ سے قتل ناحق اور غصب اموال کی نوبت آجاتی ہے (قرطبی)

فِیْ جِیْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ، مَسْد بسکون السین مصدر ہے جس کے معنی رسّی یا ڈور بٹنے یا اسکے تار پر تار چڑھا کر مضبوط کرنے کے ہیں اور مَسَد بفتح میم وسین اُس رسّی یا ڈور کو کہا جاتا ہے جو مضبوط بنائی گئی ہو خواہ وہ کسی چیز کی ہو، کھجور یا ناریل وغیرہ سے یا آہنی تاروں سے ہر طرح کی مضبوط رسّی اسمیں داخل ہے (کذا فی القاموس) بعض حضرات نے جو خاص کھجور کی رسّی اسکا ترجمہ کیا ہے۔ وہ عرب کی عام عادت کے مطابق کیا گیا ہے اصل مفہوم عام ہے۔ اسی مفہوم عام کے اعتبار سے حضرت ابن عباس عروہ بن زبیر وغیرہ نے فرمایا کہ یہاں حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ سے مراد لوہے کے تاروں سے بٹا ہوا رسّا ہے اور یہ اسکا حال جہنم میں ہوگا کہ آہنی تاروں سے مضبوط بٹا ہوا طوق اُس کے گلے میں ہوگا۔ حضرت مجاہد نے بھی اس کی تفسیر میں فرمایا ہے مِنْ مَّسَدٍ ای من حدید (مظہری)

اور شعبی اور مقاتل وغیرہ مفسرین نے اس کو بھی دُنیا کا حال قرار دیکر حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ سے مراد کھجور کی رسّی لی ہے اور فرمایا کہ اگرچہ ابو لہب اور اُس کی بیوی مالدار غنی اور اپنی قوم کے سردار مانے جاتے تھے مگر اُس کی بیوی اپنی خسّت طبیعت اور کنجوسی کے سبب جنگل سے سوختہ کی لکڑیاں جمع کر کے لاتی اور اُس کی رسّی کو اپنے گلے میں ڈال لیتی تھی کہ یہ گٹھا سر سے گر نہ جائے، اور یہی ایک روز اُس کی ہلاکت کا سبب بنا کہ لکڑیوں کا گٹھا سر پر اور رسّی گلے میں تھی تھک کر کہیں بیٹھ گئی اور پھر گر کر اسکا گلا گھٹ گیا اور اسی میں مرگئی۔ اس دوسری تفسیر کی رُو سے یہ حال اسکا اس کی خسّتِ طبیعت اور اسکا انجام بد بیان کرنے کے لئے ہے (مظہری) مگر چونکہ ابو لہب کے گھرانہ خصوصاً بیوی سے ایسا کرنا مستبعد تھا اس لئے اکثر حضرات مفسرین نے پہلی ہی تفسیر کو اختیار فرمایا ہے۔ واللہ اعلم

تمّت سورۃ اللھب بحمد اللہ تعالیٰ

سُورَةُ الاِخْلَاص

سُورَةُ الاِخْلَاصِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اَرْبَعُ اٰيَاتٍ
سورۂ اخلاص مکہ میں نازل ہوئی اور اسکی چار آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝۱ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝۲ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝۳ وَلَمْ
تو کہہ وہ اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ کسی کو جنا نہ کسی سے جنا اور نہیں

يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝۴
اُس کے جوڑ کا کوئی

ع ۲۷

خلاصۂ تفسیر

(اس کا سببِ نزول یہ ہے کہ ایک مرتبہ مشرکین نے آپ سے کہا کہ اپنے رب کی صفات اور نسب بیان کیجئے اس پر یہ سورت نازل ہوئی، کذا فی الدر المنثور باسانید متعددہ) آپ (ان لوگوں سے) کہدیجئے کہ وہ یعنی اللہ (اپنے کمال ذات وصفات میں) ایک ہے (کمال ذات یہ ہے کہ واجب الوجود ہے، یعنی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، اور کمال صفات یہ کہ علم قدرت وغیرہ اسکے قدیم اور محیط ہیں اور) اللہ بے نیاز ہے (یعنی وہ کسی کا محتاج نہیں اور اُس کے سب محتاج ہیں) اُس کے اولاد نہیں اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی اُس کے برابر کا ہے۔

معارف ومسائل

شانِ نزول ترمذی حاکم وغیرہ کی روایت میں ہے کہ مشرکینِ مکہ نے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کا نسب پوچھا تھا اُن کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی۔ دوسری بعض روایات میں یہ سوال یہود

مدینہ کی طرف منسوب کیا ہے اسی لئے اس سورت کے مکی یا مدنی ہونے میں اختلاف ہے حضرت عبداللہ بن مسعود، حسن بصری، عطاء، عکرمہ، جابر رضی اللہ عنہم نے اس کو مکی کہا ہے اور قتادہ، ضحاک وغیرہ نے مدنی، حضرت ابن عباسؓ کے دو قول منقول ہیں (قرطبی)

بعض روایات میں ہے کہ مشرکین کے سوال میں یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ کس چیز کا بنا ہوا ہے سونا چاندی یا اور کچھ، ان کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی۔

فضائل سورت امام احمد نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے اس سورت (یعنی سورۂ اخلاص) سے بڑی محبت ہے آپؐ نے فرمایا کہ اس کی محبت نے تمھیں جنت میں داخل کر دیا (ابن کثیر)

ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا کہ سب جمع ہو جاؤ میں تمھیں ایک تہائی قرآن سناؤں گا جو جمع ہو سکتے تھے جمع ہو گئے تو آپؐ تشریف لائے اور قُل ھو اللہ احد الخ کی قرات فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ یہ سورت ایک تہائی قرآن کی برابر ہے (رواہ مسلم فی صحیحہٖ) ابوداؤد، ترمذی، نسائی نے ایک طویل حدیث میں روایتاً کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص صبح اور شام قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اور معوذتین پڑھ لیا کرے تو یہ اُس کے لئے کافی ہے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ یہ اس کو ہر بلا سے بچانے کے لئے کافی ہے (ابن کثیر)

امام احمد نے حضرت عقبہ ابن عامر رضؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم کو ایسی تین سورتیں بتاتا ہوں کہ جو تورات، انجیل، زبور اور قرآن سب میں نازل ہوئی ہیں اور فرمایا کہ رات کو اُس وقت تک نہ سو جب تک ان تینوں (معوذتین اور قل ھو اللہ احد) کو نہ پڑھ لو۔ حضرت عقبہؓ کہتے ہیں کہ اُس وقت سے میں نے کبھی ان کو نہیں چھوڑا (ابن کثیر)

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، لفظ قل میں اشارہ ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کیطرف کہ اُن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کی ہدایت کا حکم ہو رہا ہے اور لفظ اللہ اُس ذات کا نام ہے جو واجب الوجود ہو اور تمام کمالات کا جامع اور تمام نقائص سے پاک ہے۔ احد اور واحد ترجمہ تو دونوں کا ایک ہی کیا جاتا ہے مگر مفہوم کے اعتبار سے لفظ احد کے معنے میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ ترکیب اور تجزیہ سے اور تعدد سے اور کسی چیز کی مشابہت اور مشاکلت سے پاک ہے یعنی وہ کسی ایک یا متعدد مادّوں سے نہیں بنا، نہ اُس میں تعدّد کا کوئی امکان ہے نہ کسی کے مشابہ ہے، یہ جواب ہو گیا اُن لوگوں کا جو اللہ تعالیٰ کے متعلق پوچھتے تھے کہ وہ سونے چاندی کا ہے یا کسی جوہر کا۔ اس ایک مختصر جملہ میں ذات و صفات کے سب مباحث آگئے اور لفظ قل میں نبوت و رسالت کا مسئلہ آگیا، اس میں غور کرو تو یہ ایک مختصر جملہ اُن عظیم الشان مباحث کو حاوی ہیں جو بڑی بڑی جلدوں میں لکھے جاتے ہیں۔

اَللّٰهُ الصَّمَدُ ، لفظ صمد کے بہت سے معنی ہو سکتے ہیں اسی لئے حضرات مفسرین کے اقوال اسمیں بہت ہیں امام حدیث طبرانی نے کتاب السنۃ میں ان تمام اقوال کو جمع کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ سب صحیح ہیں اور انہیں جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ سب ہمارے رب کی صفات ہیں، لیکن اصل معنی صمد کے یہ ہیں کہ جس کی طرف لوگ اپنی حاجات اور ضروریات میں رجوع کریں اور جو بڑائی اور سرداری میں ایسا ہو کہ اُس سے کوئی بڑا نہیں، خلاصہ یہ کہ سب اُس کے محتاج ہوں وہ کسی کا محتاج نہ ہو (ابن کثیر)

لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ، یہ اُن لوگوں کا جواب ہے جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے نسب نامہ کا سوال کیا تھا کہ اس کو مخلوق پر قیاس نہیں کیا جا سکتا جو توالد و تناسل کے ذریعہ وجود میں آتی ہے نہ وہ کسی کی اولاد ہے نہ کوئی اس کی اولاد۔

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ، کفو کے لفظی معنے مثل اور مماثل کے ہیں، معنے یہ ہیں کہ نہ کوئی اُس کا مثل ہے نہ کوئی اُس سے مشاکلت اور مشابہت رکھتا ہے۔

سورۂ اخلاص میں مکمل توحید اور ہر طرح کے شرک کی نفی ہے

اللہ کے ساتھ کسی کو شریک سمجھنے والے منکرین توحید کی دُنیا میں مختلف اقسام ہوئی ہیں۔ سورۂ اخلاص نے ہر طرح کے مشرکانہ خیالات کی نفی کر کے مکمل توحید کا سبق دیا ہے کیونکہ منکرین توحید میں ایک گروہ تو خود اللہ کے وجود ہی کا منکر ہے بعض وجود کے تو قائل ہیں مگر وجوب وجود کے منکر ہیں بعض دونوں کے قائل ہیں مگر کمال صفات کے منکر ہیں۔ بعض یہ سب کچھ مانتے ہیں، مگر پھر عبادت میں غیر اللہ کو شریک ٹھہراتے ہیں، ان سب کے خیالات باطلہ کا رد اَللّٰهُ اَحَدٌ میں ہو گیا، بعض لوگ عبادت میں بھی کسی کو شریک نہیں کرتے مگر حاجت روا اور کارساز اللہ کے سوا دوسروں کو بھی سمجھتے ہیں اُن کے خیال کا ابطال لفظ صمد میں ہو گیا۔ بعض لوگ اللہ کے لئے اولاد کے قائل ہیں اُن کا رد لَمْ يَلِدْ میں ہو گیا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

سُوْرَةُ الْفَلَقِ

سُوْرَةُ الْفَلَقِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ خَمْسُ اٰيَاتٍ

سورۂ فلق مدینہ میں نازل ہوئی اور اسکی پانچ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ﴿۱﴾ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ﴿۲﴾ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ

تو کہہ میں پناہ میں آیا صبح کے رب کی ہر چیز کی بدی سے جو اُسنے بنائی اور بدی سے اندھیرے کی

اِذَا وَقَبَ ﴿۳﴾ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ﴿۴﴾ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ

جب سمٹ آئے اور بدی سے عورتوں کی جو گرہوں میں پھونک ماریں اور بدی سے بُرا چاہنے والے کی

اِذَا حَسَدَ ﴿۵﴾

جب لگے ٹوک لگانے

ع ۵ ۳۸

خلاصۂ تفسیر

آپ (اپنے استعاذہ یعنی اللہ سے پناہ مانگنے کے لئے اور دوسروں کو بھی یہ استعاذہ سکھلانے کے لئے جس کا حاصل اللہ پر توکل اور مکمل بھروسہ کی تعلیم ہے۔ یوں) کہئے کہ میں صبح کے مالک کی پناہ لیتا ہوں۔ تمام مخلوقات کے شر سے اور (بالخصوص) اندھیری رات کے شر سے جب وہ رات آجاوے (رات میں شرور و آفات کا احتمال ظاہر ہے) اور (بالخصوص گنڈے کی) گرہوں پر پڑھ پڑھ کر پھونکنے والیوں کے شر سے اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرنے لگے (اوّل تمام مخلوقات کے شر سے پناہ لینے کا ذکر کرنے کے بعد خاص خاص چیزوں کا ذکر شاید بمناسبت مقام یہ ہو کہ اکثر سحر کی ترتیب اور ترکیب رات کو ہوتی ہے (کذا فی الخازن) تاکہ کسی کو اطلاع نہ ہو اطمینان سے اُس کی تکمیل کرسکیں۔ اور گنڈہ پر دم کرنے والی جانوں یا عورتوں کی مناسبت اس جگہ ظاہر ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سحر اسی طرح ہوا تھا خواہ مرد نے کیا ہو یا عورتوں نے، کیونکہ لفظ نفّاثات کا موصوف نفوس بھی ہوسکتے ہیں جو مرد و عورت دونوں کو شامل ہیں اور عورتیں بھی اس کی موصوف ہوسکتی ہیں۔ اور رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر جو یہودیوں نے سحر کیا تھا اُس کا اصل منشا حسد تھا۔ اس طرح سحر کے متعلقہ جتنی چیزیں تھیں سب سے استعاذہ ہوگیا اور باقی شرور و آفات کو شامل کرنے کے لئے من شرّ ماخلق فرمادیا۔ اور آیت میں جو اللہ کی صفت ربّ الفلق یعنی صبح کا مالک ذکر کی گئی حالانکہ اللہ تو صبح اور شام سبھی چیزوں کا رب اور مالک ہے۔ اس تخصیص میں شاید اشارہ اس طرف ہو کہ جیسے اللہ تعالیٰ رات کی اندھیری کا ازالہ کرکے صبح کی روشنی نکال دیتا ہے اسی طرح سحر کا بھی ازالہ کرسکتا ہے۔

معارف و مسائل

یہ سورت سورۂ فلق اور اس کے بعد کی سورۂ ناس دونوں سُورتیں ایک ساتھ ایک ہی واقعہ میں نازل ہوئی ہیں۔ حافظ ابن قیم رحمہ نے ان دونوں سورتوں کی تفسیر یکجا لکھی ہے اُس میں فرمایا ہے کہ ان دونوں سورتوں کے منافع اور برکات اور سب لوگوں کو اُن کی حاجت و ضرورت ایسی ہے کہ کوئی انسان ان سے مستغنی نہیں ہوسکتا ان دونوں سورتوں کو سحر اور نظر بد اور تمام آفات جسمانی و روحانی کے دُور کرنے میں تاثیر عظیم ہے اور حقیقت کو سمجھا جائے تو انسان کو اس کی ضرورت اپنے سانس اور کھانے پینے اور لباس سب چیزوں سے زیادہ ہے اسکا

واقعہ مسند احمد میں اس طرح آیا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایک یہودی نے جادو کر دیا تھا جس کے اثر سے آپ بیمار ہو گئے۔ جبرئیل امین نے آکر آپ کو اطلاع کی کہ آپ پر ایک یہودی نے جادو کیا ہے اور جادو کا عمل جس چیز میں کیا گیا ہے وہ فلاں کنوئیں کے اندر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں آدمی بھیجے وہ یہ جادو کی چیز کنوئیں سے نکال لائے اُس میں گرہیں لگی ہوئی تھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان گرہوں کو کھولدیا اُسی وقت آپ بالکل تندرست ہو کر کھڑے ہو گئے (اور اگرچہ جبرئیل علیہ السلام نے آپ کو اُس یہودی کا نام بتلا دیا تھا اور آپ اُس کو جانتے تھے مگر اپنے نفس کے معاملے میں کسی سے انتقام لینا آپ کی عادت نہ تھی اسلئے) عمر بھر اُس یہودی سے کچھ نہیں کہا اور نہ کبھی اُس کی موجودگی میں آپ کے چہرۂ مبارک سے کسی شکایت کے آثار پائے گئے (وہ منافق ہونے کی وجہ سے حاضر باش تھا) اور صحیح بخاری کی روایت حضرت عائشہ رضہ سے یہ ہے کہ آپ پر ایک یہودی نے سحر کیا تو اس کا اثر آپ پر یہ تھا کہ بعض اوقات آپ محسوس کرتے تھے کہ فلاں کام کر لیا ہے مگر وہ نہیں کیا ہوتا۔ پھر ایک روز آپ نے حضرت عائشہ رضہ سے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا ہے کہ میری بیماری کیا ہے، اور فرمایا کہ (خواب میں) دو شخص آئے، ایک میرے سرہانے بیٹھ گیا، ایک پاؤں کی طرف، سرہانے والے نے دوسرے سے کہا کہ ان کو کیا تکلیف ہے، دوسرے نے کہا کہ یہ مسحور ہیں، اس نے پوچھا کہ سحر ان پر کس نے کیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ لبید بن اعصم نے جو یہودیوں کا حلیف منافق ہے اُس نے پوچھا کہ کس چیز میں جادو کیا ہے، اُس نے بتلایا کہ ایک کنگھے اور اُس کے دندانوں میں، پھر اس نے پوچھا کہ وہ کہاں ہے تو اُس نے بتلایا کہ کھجور کے اُس غلاف میں جس میں کھجور کا پھل پیدا ہوتا ہے بئرِ ذروان (ایک کنوئیں کا نام ہے) میں ایک پتھر کے نیچے مدفون ہے۔ آپ اُس کنوئیں پر تشریف لے گئے اور اسکو نکال لیا، اور فرمایا کہ مجھے خواب میں یہی کنواں دکھلایا گیا تھا۔ حضرت عائشہ رضہ نے فرمایا کہ آپ نے اسکا اعلان کیوں نہ کر دیا (کہ فلاں شخص نے یہ حرکت کی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اللہ نے شفا دیدی۔ اور مجھے یہ پسند نہیں کہ میں کسی شخص کے لئے کسی تکلیف کا سبب بنوں (مطلب یہ تھا کہ اسکا اعلان ہوتا تو لوگ اسکو قتل کر دیتے یا تکلیف پہنچاتے) اور مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ آپ کا یہ مرض چھ مہینے تک رہا اور بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ جن صحابہ کرام کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ کام لبید بن اعصم نے کیا ہے اُنھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم اس خبیث کو کیوں قتل نہ کر دیں، آپ نے وہی جواب دیا جو صدیقہ عائشہ رضہ کو دیا تھا، اور امام ثعلبی کی روایت میں ہے کہ ایک لڑکا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرتا تھا، اس منافق یہودی نے اُس کو بہلا پھسلا کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا کنگھا اور کچھ اُس کے دندانے اس سے حاصل کر لئے اور ایک تانت کے تار میں گیارہ گرہیں لگائیں، ہر گرہ میں ایک سوئی لگائی، کنگھے کے ساتھ اُس کو کھجور کے پھل کے غلاف میں رکھ کر ایک کنوئیں میں پتھر کے نیچے دبا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دو سورتیں نازل فرمائیں جن میں گیارہ آیتیں ہیں، آپ ہر گرہ پر ایک ایک آیت پڑھ کر ایک ایک کھولتے رہے یہانتک کہ سب گرہیں کھل گئیں،

اور آپ سے اچانک ایک بوجھ سا اُتر گیا (یہ سب روایتیں تفسیر ابن کثیر سے لی گئی ہیں)

سحر کے اثر سے متاثر ہو جانا نبوّت و رسالت کے منافی نہیں جو لوگ سحر کی حقیقت سے ناواقف ہیں اُن کو تعجب ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر کیسے ہو سکتا ہے۔ سحر کی حقیقت اور اُس کے اقسام و احکام پوری تفصیل کے ساتھ سورۂ بقرہ کی تفسیر معارف القرآن جلد اول صلاا۲ تا صلاا۲۲۳ میں بیان کئے جا چکے ہیں وہاں دیکھ لئے جائیں۔ خلاصہ اسکا جسکا جاننا یہاں ضروری ہے اتنا ہے کہ سحر کا اثر بھی اسباب طبعیہ کا اثر ہوتا ہے جیسے آگ سے جلنا یا گرم ہونا، پانی سے سرد ہونا۔ بعض اسباب طبعیہ سے بخار آجانا یا مختلف قسم کے درد و امراض کا پیدا ہو جانا ایک امر طبعی ہے جس سے پیغمبر و انبیار مستثنیٰ نہیں ہوتے اسی طرح سحر و جادو کا اثر بھی اسی قسم سے ہے اس لئے کوئی بعید نہیں۔

معوّذتین ہر قسم کی دُنیوی اور دینی آفات سے حفاظت کا قلعہ ہیں، ان کے فضائل یہ تو ہر مومن کا عقیدہ ہے کہ دُنیا و آخرت کا ہر نفع نقصان اللہ تعالےٰ کے ہاتھ میں ہے بغیر اس کی مشیت کے کوئی کسی کو ایک ذرہ کا نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتا تو دُنیا و آخرت کی تمام آفات سے محفوظ رہنے کا اصل ذریعہ ایک ہی ہے کہ انسان اپنے آپ کو اللہ کی پناہ میں دیدے اور اپنے عمل سے اُس کی پناہ میں آنے کے قابل بننے کی کوشش کرے۔ ان دونوں سورتوں میں پہلی یعنی سورۂ فلق میں تو دُنیاوی آفات سے اللہ کی پناہ مانگنے کی تعلیم ہے اور دوسری سورت یعنی سورۂ ناس میں اُخروی آفات سے بچنے کے لئے اللہ کی پناہ مانگی گئی ہے۔ مستند احادیث میں ان دونوں سُورتوں کے بڑے فضائل اور برکات منقول ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت عقبہ ابن عامر رضؓ کی حدیث ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمھیں کچھ خبر ہے کہ آج کی رات اللہ تعالیٰ نے مجھ پر ایسی آیات نازل فرمائی ہیں کہ انکی مثل نہیں دیکھی یعنی قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ۔ اور ایک روایت میں ہے کہ تورات۔ انجیل اور زبور اور قرآن میں بھی اُن کی مثل کوئی دوسری سورت نہیں ہے۔ ایک دوسری روایت اِنہی حضرت عقبہ رضؓ سے ہے کہ ایک سفر میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کو معوذتین پڑھائی اور پھر مغرب کی نماز میں اِنہی دونوں سورتوں کی تلاوت فرمائی اور پھر فرمایا کہ ان سورتوں کو سونے کے وقت بھی پڑھا کرو اور پھر اُٹھنے کے وقت بھی (رواہ النسائی) اور ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے ان دونوں سورتونکو ہر نماز کے بعد پڑھنے کی تلقین فرمائی (رواہ ابو داؤد والنسائی)

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی بیماری پیش آتی تو یہ دونوں سُورتیں پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر دَم کر کے سارے بدن پر پھیر لیتے تھے۔ پھر جب مرض وفات میں آپکی تکلیف بڑھی تو میں یہ سورتیں پڑھ کر آپکے ہاتھوں پر دَم کر دیتی تھی آپؐ اپنے تمام بدن پر پھیر لیتے تھے۔ میں یہ کام اسلئے کرتی تھی کہ حضرت کے مبارک ہاتھوں کا بدل میرے ہاتھ نہ ہو سکتے تھے (رواہ الامام مالک) (یہ سب روایتیں تفسیر ابن کثیر سے نقل کی گئی ہیں) اور حضرت عبداللہ بن حبیب رضؓ سے روایت ہے کہ ایک رات میں بارش

اور سخت اندھیری تھی ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو تلاش کرنے کے لئے نکلے، جب آپؐ کو پالیا تو آپ نے فرمایا کہ کہو، میں نے عرض کیا کہ کیا کہوں، آپؐ نے فرمایا، قُل ہُوَاللہ احد اور معوّذتین پڑھو، جب صبح ہو اور جب شام ہو تین مرتبہ یہ پڑھنا تمھارے لئے ہر تکلیف سے امان ہوگا (رواہ الترمذی ابو داؤد والنسائی۔ مظہری)

خلاصہ یہ ہے کہ تمام آفات سے محفوظ رہنے کے لئے یہ دو سورتیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا معمول تھیں۔ آگے سورت کے الفاظ کے ساتھ تفسیر دیکھئے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ، فلق کے لفظی معنے پھٹنے کے ہیں مراد رات کی پَو پھٹنا اور صبح کا نمودار ہونا ہے جیسا ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی صفت فالق الاصباح آئی ہے۔ اس کلمہ میں اللہ تعالیٰ کی تمام صفات میں سے اس کو اختیار کرنے کی حکمت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ رات کی اندھیری اکثر شرور و آفات کا سبب بنتی ہے اور صبح کی روشنی اس کو دُور کر دیتی ہے اللہ تعالیٰ کی اس صفت میں یہ اشارہ ہے کہ جو اس کی پناہ مانگے گا اللہ تعالیٰ اُس کی تمام آفات کو دُور فرما دیگا (مظہری)

لفظ شر کے معنی از علامہ ابن قیمؒ | مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ، علامہ ابن قیمؒ نے لکھا ہے کہ لفظ شر دو چیزوں کے لئے عام اور شامل ہے۔ ایک آلام و آفات، جن سے براہِ راست انسان کو رنج و تکلیف پہنچتی ہے دوسرے وہ چیزیں جو آلام و آفات کے موجبات اور اسباب ہیں۔ اس دوسری قسم میں کفر و شرک اور تمام معاصی بھی لفظ شر کے مفہوم میں داخل ہیں۔ قرآن و حدیث میں جن چیزوں سے پناہ کا ذکر آیا ہے وہ ان دونوں قسموں میں سے کسی ایک میں داخل ہوتی ہیں کہ یا تو وہ خود آفت یا مصیبت ہوتی ہیں یا اُسکے لئے سبب موجب ہوتی ہیں۔ نماز کے آخر میں جو دُعاء استعاذہ مسنون ہے اسمیں چار چیزیں مذکور ہیں۔ عذابِ[1] قبر۔ عذابِ[2] نار۔ فتنۃ المحیا[3] والممات[4]۔ انمیں پہلی دو چیزیں خود مصیبت و عذاب ہیں اور آخری دو چیزیں مصیبت و عذاب کے اسباب ہیں۔

مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ کے لفظ میں ساری مخلوقات کا شر داخل ہے اس لئے یہ کلمہ تمام شرور و آفات سے پناہ لینے کے لئے کافی تھا مگر اس جگہ تین چیزوں کو ممتاز کر کے اُن کے شر سے پناہ مانگنے کا علیحدہ ذکر فرمایا جو اکثر آفات و مصائب کا سبب بنتی ہیں۔ پہلے فرمایا مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ اسمیں لفظ غاسق، غسق سے مشتق ہے جس کے معنی اندھیری کا پھیل جانا اور چھا جانا ہے اس لئے غاسق کے معنی حضرت ابن عباسؓ اور حسنؒ اور مجاہدؒ نے رات کے لئے ہیں اور وقب وقوب سے مشتق ہے جس کے معنی اندھیری کے پوری طرح بڑھ جانے کے ہیں معنی یہ ہیں کہ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں رات سے جبکہ اُس کی اندھیری پوری ہو جاوے رات کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ یہی وقت جنات و شیاطین اور موذی جانوروں اور حشرات الارض اور چوروں ڈاکوؤں کے پھیلنے اور دشمنوں کے حملہ کرنے کا وقت ہوتا ہے اور جادو کی تاثیر بھی رات میں زیادہ ہوتی ہے۔ صبح ہوتے ہی ان چیزوں کا تسلط ختم ہو جاتا ہے (ابن قیمؒ) دوسری چیز یہ فرمائی کہ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ، نفّاثات، نفث سے مشتق ہے جس کے معنی پھونک مارنے کے ہیں۔ اور عُقَد عقدۃ کی جمع ہے جس کے معنی گرہ کے ہیں۔ جادو کرنے والے ڈورے وغیرہ میں گرہ

لگا کر اُس پر جادو کے کلمات پڑھ کر پھونکتے ہیں۔ نفّٰثٰت فی العُقَد کے معنی ہوئے گرہوں پر پھونکنے والیاں، مُراد جادو کرنے والیاں ہیں اور لفظ نفّاثات کا موصوف نفوس بھی ہوسکتا ہے جس میں مرد و عورت دونوں داخل ہیں اس صورت ہیں جادو کرنے والیوں سے مراد جادو کرنے والی جانیں ہوں گی اور ظاہر یہ ہے کہ اسکا موصوف عورتیں ہیں، عورتوں کی تخصیص شاید اس لئے کی گئی کہ جادو کا کام عموماً عورتیں کرتی ہیں اور کچھ خلقۃً عورتوں کو اس سے مناسبت بھی زیادہ ہے۔ اور یا اس لئے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر جادو کرنے کا جو واقعہ ان سورتوں کا سببِ نزول ہوا اس میں جادو کرنے والیاں ولید بن اعصم کی لڑکیاں تھیں جنھوں نے باپ کے کہنے سے یہ کام کیا تھا۔ اس لئے اس جادو کی نسبت ان کی طرف کردی گئی۔ اور جادو کرنے والوں سے پناہ مانگنے کو خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنے کی یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ سبب نزول بھی جادو کا واقعہ ہے اور یہ بھی کہ اسکا شر اور ضرر اس لئے زیادہ ہے کہ انسان کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی بے خبری کی وجہ سے اس کے ازالہ کی طرف توجہ نہیں ہوتی، وہ بیماری سمجھ کر دوا دارو میں لگا رہتا ہے اور تکلیف بڑھ جاتی ہے۔

تیسری چیز جو خصوصیت کے ساتھ ذکر کی گئی وہ حاسد اور حَسَد ہے اس کی تخصیص کی وجہ بھی یہی دونوں ہوسکتی ہیں کیونکہ آپؐ پر جادو کرنے کا اقدام اسی حَسَد کے سبب سے ہوا۔ یہود اور منافقین آپؐ کی اور مسلمانوں کی ترقی کو دیکھ کر جلتے تھے، اور ظاہری جنگ و قتال میں آپ پر غالب نہیں آسکے تو جادو کے ذریعہ اپنی حسد کی آگ کو بجھانا چاہا، اور رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حاسد دُنیا میں بے شمار تھے اس لئے بھی خصوصیت سے پناہ مانگی گئی۔ نیز حاسد کا حسد اُس کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتا وہ ہر وقت اس کو نقصان پہنچانے کے درپے رہتا ہے اس لئے یہ ضرر شدید بھی ہے۔

حَسَد کہتے ہیں کسی کی نعمت و راحت کو دیکھ کر جلنا اور یہ چاہنا کہ اس سے یہ نعمت زائل ہوجائے چاہے اسکو بھی حاصل نہ ہو، یہ حسد حرام اور گناہ کبیرہ ہے اور یہ سب سے پہلا گناہ ہے جو آسمان میں کیا گیا اور سب سے پہلا گناہ ہے جو زمین میں کیا گیا، کیونکہ آسمان میں ابلیس نے حضرت آدم علیہ السّلام سے حسد کیا اور زمین پر اُن کے بیٹے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل سے کیا (قرطبی) حسد سے ملتا جُلتا غبطہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ کسی کی نعمت کو دیکھ کر یہ تمنّا کرنا کہ یہ نعمت مجھے بھی حاصل ہوجائے یہ جائز ہے بلکہ مستحسن ہے۔

یہاں تین چیزوں سے خصوصی پناہ مانگنے کا ذکر ہے مگر پہلی اور تیسری میں تو ایک ایک قید کا ذکر کیا گیا۔ پہلی غاسق کے ساتھ اذا وقب فرمایا، اور تیسری میں حاسد کے ساتھ اذا حسد فرمایا، اور درمیانی چیز یعنی جادو کرنے والوں میں کوئی قید ذکر نہیں فرمائی۔ سبب یہ ہے کہ جادو کی مضرت عام ہے اور رات کی مضرت اُسی وقت ہوتی ہے جب اندھیری پوری ہوجائے، اسی طرح حاسد کا حسد جب تک وہ اپنے حسد کی وجہ سے کسی ایذا پہنچانے کا اقدام نہ کرے اُس وقت تک تو اُسکا نقصان خود اُسی کی ذات کو پہنچتا ہے کہ دوسرے کی نعمت کو دیکھ کر جلتا کڑھتا ہے، البتہ محسود کو اسکا نقصان اسوقت پہنچتا ہے جبکہ وہ مقتضائے حسد پر عمل کرکے ایذا رسانی کی کوشش کرے اسلئے پہلی اور دوسری چیز میں یہ قیدیں لگادی گئیں۔

سُورَةُ النَّاسِ

سُورَةُ النَّاسِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ سِتُّ اٰيَاتٍ

سورۃ الناس مدینہ میں نازل ہوئی اور اُس کی چھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ① مَلِكِ النَّاسِ ② اِلٰهِ النَّاسِ ③ مِنْ

تو کہہ میں پناہ میں آیا لوگوں کے رب کی لوگوں کے بادشاہ کی لوگوں کے معبود کی بدی

شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ④ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ

سے اُس کی جو پھسلائے اور چھپ جائے وہ جو خیال ڈالتا ہے لوگوں کے

النَّاسِ ⑤ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ⑥

دل میں جنوں میں اور آدمیوں میں

ع ۲۹

خلاصۂ تفسیر

آپ کہیے کہ میں آدمیوں کے مالک، آدمیوں کے بادشاہ۔ آدمیوں کے معبود کی پناہ لیتا ہوں وسوسہ ڈالنے والے پیچھے ہٹ جانے والے (شیطان) کے شر سے (پیچھے ہٹنے کا مطلب یہ کہ حدیث میں ہے کہ اللہ کا نام لینے سے شیطان ہٹ جاتا ہے) جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے خواہ وہ (وسوسہ ڈالنے والا) جن ہو یا آدمی (یعنی جس طرح میں شیاطین الجن سے پناہ مانگتا ہوں، اسی طرح شیاطین الانس سے بھی پناہ مانگتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں دوسری جگہ جنّات اور انسان دونوں میں شیاطین ہونیکا ذکر ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ)

معارف و مسائل

سورۂ فلق میں دُنیوی آفات و مصائب سے پناہ مانگنے کی تعلیم ہے اور اس سورت میں اُخروی آفات

سے پناہ مانگنے کی تاکید ہے اور جیسا کہ لفظ شر کا مفہوم سورۂ فلق میں بیان کیا گیا ہے کہ آلام اور موجباتِ آلام دونوں کو شامل ہے اس سورت میں اُس شر سے، پناہ مانگی گئی ہے جو تمام گناہوں کا سبب ہے یعنی شیطانی وساوس و اثرات، اور چونکہ آخرت کی مضرت اشد ہے اس لئے اس کی تاکید پر قرآن ختم کیا گیا۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ، رب کے معنی پالنے والے اور ہر حال کی اصلاح کرنے والے کے ہیں اس جگہ رب کی اضافت ناس کی طرف کی گئی اور پہلی سورت میں فلق کی طرف وجہ یہ ہے کہ سورۂ فلق میں ظاہری اور جسمانی آفات سے پناہ مانگنا مقصود ہے اور وہ انسان کے ساتھ مخصوص نہیں۔ جانوروں کو بھی بدنی آفات و مصائب پہنچتے ہیں بخلاف وسوسہ شیطانی کے کہ اسکا نقصان انسان کے ساتھ مخصوص ہے اور جنات بھی اسمیں تبعاً شامل ہیں اسلئے یہاں رب کی اضافت ناس کی طرف کی گئی۔ (مظہری عن البیضاوی)

مَلِكِ النَّاسِ، یعنی لوگوں کا بادشاہ اِلٰهِ النَّاسِ لوگوں کا معبود، ان دو صفتوں کا اضافہ اس لئے کیا گیا کہ لفظ رب جب کسی خاص چیز کی طرف منسوب ہو تو اللہ تعالیٰ کے سوا بھی دوسروں کیلئے بولا جاتا ہے جیسا ربّ الدّار گھر کے مالک کو، ربّ المال، مال کے مالک کو کہا جاتا ہے، اور ہر مالک بادشاہ نہیں ہوتا اس لئے مَلِک کا اضافہ کیا کہ وہ رب یعنی مالک بھی ہے اور مَلِک یعنی بادشاہ بھی، پھر ہر بادشاہ معبود نہیں ہوتا اسلئے تیسری صفت ذکر فرمائی اِلٰهِ النَّاسِ، ان تین صفتوں کو جمع کرنے میں حکمت یہ ہے کہ انمیں سے ہر صفت حفاظت کی داعی ہے کیونکہ ہر مالک اپنے مملوک کی حفاظت کرتا ہے۔ اسی طرح ہر بادشاہ اپنی رعیت کی حفاظت کرتا ہے اور معبود کا اپنے عابد کے لئے محافظ ہونا تو سب سے اظہر ہے۔ یہ تینوں صفتیں صرف حق تعالیٰ میں جمع ہیں اُس کے سوا کوئی ان صفتوں کا جامع نہیں اس لئے اُس کی پناہ حاصل کرنا سب سے بڑی پناہ ہے اور اللہ تعالیٰ سے ان تین صفتوں کے ساتھ پناہ مانگنا دُعا کی قبولیت کے لئے اقرب ہے کہ یا اللہ آپ ہی ان صفات کے جامع ہیں ہم صرف آپ ہی سے پناہ مانگتے ہیں۔ یہاں جبکہ پہلے جملہ میں رَبِّ النَّاسِ آچکا تو بظاہر تقاضا مقام کا یہ تھا کہ آگے اس کی طرف ضمیریں راجع کرنے سے کام لیا جاتا ملکہم و الٰہہم فرمایا جاتا مگر اس لفظ کا بار بار تکرار اسلئے ہے کہ مقام دُعا اور مدح و ثنا کا ہے اسمیں تکرار ہی بہتر ہے۔ اور بعض حضرات نے لفظ ناس کے بار بار تکرار میں یہ لطیفہ بیان کیا ہے کہ اس سورت میں یہ لفظ پانچ مرتبہ آیا ہے۔ پہلے لفظ ناس سے مراد بچے ہیں اور لفظ ربّ اور ربوبیت اسکا قرینہ ہے کیونکہ پرورش کی حاجت سب سے زیادہ بچوں کو ہوتی ہے اور دوسرے لفظ ناس سے جوان مراد ہیں، اور لفظ مَلِک اسکا قرینہ ہے جو ایک سیاست کے معنی رکھتا ہے وہ جوانوں کے مناسب ہے اور تیسرے لفظ ناس سے بوڑھے مراد ہیں جو دُنیا سے منقطع ہو کر عبادت میں مشغول ہوں اور لفظ اِلٰہ اسکا قرینہ ہے جو عبادت کی طرف مشیر ہے اور چوتھے لفظ ناس سے مراد اللہ کے صالح بندے ہیں اور لفظ وسوسہ اسکا قرینہ ہے کیونکہ شیطان نیک بندوں کا دشمن ہے اُن کے دلوں میں وسوسے ڈالنا اس کا مشغلہ ہے اور پانچویں لفظ ناس سے مراد مفسد لوگ ہیں کیونکہ اُن کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے۔

مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ الۡخَنَّاسِ ، اللہ تعالیٰ کی تین صفات ذکر کرکے اب اُسکا بیان ہے جس سے پناہ مانگنا مقصود ہے وہ ہے وسواس خنّاس ، وسواس مصدر دراصل بمعنی وسوسہ ہے یہاں شیطان کو وسواس مبالغۃً فرمایا گویا کہ وہ سراپا وسوسہ ہے اور وسوسہ کے معنی شیطان کا اپنی اطاعت کی طرف ایک مخفی کلام کے ذریعہ بُلانا ہے جسکا مفہوم انسان کے دل میں آجائے اور کوئی آواز سُنائی نہ دے (قرطبی)

خنّاس ، خنس سے مشتق ہے جس کے معنی پیچھے لوٹنے کے ہیں ۔ شیطان کو خنّاس اس لئے کہا گیا کہ اسکی عادت یہ ہے کہ انسان جب اللہ کا نام لیتا ہے تو پیچھے بھاگتا ہے پھر جب ذرا غفلت ہوئی پھر آجاتا ہے پھر وہ اللہ کا نام لیتا ہے تو پھر پیچھے لوٹ جاتا ہے یہی عمل مسلسل جاری رکھتا ہے ۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر انسان کے قلب میں دو گھر ہیں ایک میں فرشتہ رہتا ہے دوسرے میں شیطان (فرشتہ اسکو نیک کاموں کی رغبت دلاتا رہتا ہے اور شیطان بُرے کاموں کی) پھر جب انسان اللہ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب تک وہ ذکر اللہ میں مشغول نہیں ہوتا تو اپنی چونچ انسان کے دل پر رکھ کر اسمیں بُرائیوں کے وسوسے ڈالتا ہے (رواہ ابویعلی عن انس مرفوعاً ۔ مظہری)

مِنَ الۡجِنَّةِ وَالنَّاسِ ، یہ بیان ہے وسواس کا یعنی وسوسہ ڈالنے والے جنّات میں سے بھی ہوتے ہیں ، اور انسانوں میں سے بھی ، تو حاصل اسکا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسُول کو اس کی تلقین فرمائی کہ اللہ سے پناہ مانگیں جنّات شیاطین کے شر سے بھی اور انسانی شیاطین کے شر سے بھی ۔ اگر یہ شبہ ہو کہ وسوسہ جنّاتی شیاطین کیطرف سے ہونا تو ظاہر ہے کہ وہ مخفی طور پر انسان کے قلب میں کوئی مخفی کلام ڈالدیں ، مگر انسانی شیاطین تو کُھلم کُھلا سامنے آکر بات کرتے ہیں اُن کا وسوسہ سے کیا تعلق ہے تو جواب یہ ہے کہ انسانی شیاطین بھی اکثر ایسی باتیں کسی کے سامنے کرتے ہیں جن سے اسکے دل میں کسی معاملے کے متعلق ایسے شکوک و شبہات پیدا ہو جاتے ہیں جنکو وہ صراحۃً نہیں کہتے ۔ اور شیخ عزّالدین بن عبدالسلام نے اپنی کتاب (الفوائد فی مشکلات القرآن) میں فرمایا کہ انسانی شیطان کے شر سے مراد خود اپنے نفس کا وسوسہ ہے ، کیونکہ جس طرح شیطان جن انسان کے دل میں بُرے کاموں کی طرف رغبت ڈالتا ہے اسی طرح خود انسان کا اپنا نفس بھی بُرے ہی کاموں کی طرف مائل ہوتا ہے اسی لئے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے نفس کے شر سے بھی پناہ مانگنا سکھلایا ہے حدیث میں ہے اللّٰھمّ اعوذ بك من شرّ نفسی و شرّ الشیطان و شرکہ ، یعنی یا اللہ میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں اپنے نفس کے شر سے بھی اور شیطان کے شر اور شرک سے بھی ۔

شیطانی وساوس سے پناہ مانگنے کی بڑی اہمیت

ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں انسان کو اس کی تلقین فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ تین صفتیں رب ، ملك ، الٰہ ذکر کرکے اس سے شیطانی وساوس اور وسائس سے پناہ مانگنا چاہیئے ، کیونکہ ہر انسان کے ساتھ ایک قرین (ساتھی) شیطان لگا ہوا ہے جو ہر قدم پر اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ انسان کو تباہ و برباد کردے ، اوّل تو اُس کو گناہوں کی رغبت دیتا ہے ، اور

طرح طرح سے اُس کو بہلا کر گناہوں کی طرف لیجاتا ہے، اگر اسمیں کامیاب نہ ہوا تو انسان جو طاعات و عبادت کرتا ہے اُس کو خراب اور ضائع کرنے کے لئے ریاء و نمود اور غرور و تکبر کے وسوسے دل میں ڈالتا ہے، علم والوں کے دلوں میں عقائد حقہ کے متعلق شبہات پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اسکے شر سے وہی بچ سکتا ہے جس کو اللہ ہی بچائے۔

رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں کوئی آدمی ایسا نہیں جس پر اسکا قرین (ساتھی) شیطان مسلط نہ ہو صحابہ نے عرض کیا یا رسُول اللہ، کیا آپ کے ساتھ بھی یہ قرین ہے۔ فرمایا، ہاں مگر اللہ تعالیٰ نے اُس کے مقابلے میں میری اعانت فرمائی اور اُس کو ایسا کر دیا کہ وہ بھی مجھے بجز خیر کے کسی بات کو نہیں کہتا۔

صحیحین میں حضرت انسؓ کی حدیث ہے کہ ایک مرتبہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مسجد میں معتکف تھے ایک رات بیں اُم المومنین حضرت صفیہؓ آپ کی زیارت کے لئے مسجد میں گئیں واپسی کے وقت رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ ہوئے، گلی میں دو انصاری صحابی سامنے آگئے تو آپؐ نے آواز دیکر فرمایا، ٹھہرو میرے ساتھ صفیہ بنت حیی ہیں، ان دونوں نے بکمال ادب عرض کیا سُبحان اللہ یا رسُول اللہ (یعنی کیا آپ نے ہمارے بارے میں یہ خیال کیا کہ ہم کوئی بدگمانی کریں گے) رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیشک کیونکہ شیطان انسان کے خون کے ساتھ اُس کی رگ و پے میں اثر انداز ہوتا ہے، مجھے یہ خطرہ ہوا کہ کہیں شیطان تمہارے دلوں میں کوئی وسوسہ بدگمانی کا پیدا نہ کر دے (اس لئے میں نے تبلا دیا کہ کوئی غیر عورت میرے ساتھ نہیں)

فائدہ جیسا کہ خود بُرے کاموں سے بچنا انسان کے لئے ضروری ہے اسی طرح مسلمانوں کو اپنے بارے میں بدگمانی کا موقع دینا بھی درست نہیں، ایسے مواقع سے بچنا چاہیئے جس سے لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا ہوتی ہو اور کوئی ایسا موقع آجائے تو بات واضح کر کے تہمت کے مواقع کو ختم کر دینا چاہیئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث نے شیطانی وسوسہ کا بڑا خطرناک ہونا ثابت کیا ہے جس سے بچنا آسان نہیں۔ بجز خدا کی پناہ کے۔

تنبیہ یہاں جس وسوسہ سے ڈرایا گیا ہے اس سے مراد وہ خیال ہے جس میں انسان باختیار خود مشغول ہو، اور غیر اختیاری وسوسہ و خیال جو دل میں آیا اور گزر گیا وہ کچھ مضر نہیں، نہ اُس پر کوئی گناہ ہے۔

لطیفہ، سورۂ فلق اور ناس کے تعوذات میں ایک فرق سورۂ فلق میں تو اللہ تعالیٰ، جس کی پناہ مانگی گئی ہے اُس کی صرف ایک صفت رب الفلق پر اکتفا کیا گیا یعنی رب الفلق، اور جن چیزوں سے پناہ مانگی گئی وہ بہت ہیں جن کو اولاً من شر ما خلق میں اجمالاً ذکر کیا، پھر اُن میں سے خاص تین آفات کو الگ بیان فرمایا، اور سورۂ ناس میں جس چیز سے پناہ مانگی گئی ہے وہ تو صرف ایک ہی ہے یعنی وسواس اور جس کی پناہ مانگی ہے اُس کی اس جگہ تین صفات بیان کر کے پناہ کی دُعا کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کا شر سب شرور و آفات سے بڑھا ہوا ہے، اوّل تو اسلئے کہ اور آفات و مصائب کا اثر تو انسان کے جسم اور دُنیاوی اُمور پر پڑتا ہے بخلاف شیطان کے کہ یہ انسان کی دُنیا و آخرت دونوں کو اور بالخصوص آخرت کو تباہ کرنے کی فکر میں ہے اسلئے اسکا ضرر اشد ہے دوسرے یہ کہ دُنیا کی آفات کا تو کچھ نہ کچھ علاج مادّی بھی انسان کے قبضہ میں ہے اور وہ کرتا رہتا ہے بخلاف شیطان

کے کہ اس کے مقابلے کی کوئی مادّی تدبیر انسان کے بس کی نہیں، وہ تو انسان کو دیکھتا ہے انسان اُس کو نہیں دیکھتا وہ انسان کے باطن میں غیر معلوم طریقہ پر تصرّف کرنے کی قدرت رکھتا ہے اسکا علاج صرف اللہ کا ذکر اور اسکی پناہ لینا ہے۔

انسان کے دو دشمن، انسان اور شیطان اور دونوں دشمنوں کا الگ الگ علاج

انسان کا دشمن انسان بھی ہوتا ہے اور شیطان بھی اسکا دشمن ہے حق تعالیٰ نے انسانی دشمن کو اوّل تو حُسنِ خلق اور مدارات اور ترک انتقام و صبر کے ذریعہ رام کرنے کی تلقین فرمائی ہے اور جو ان تدبیروں سے باز نہ آئے اسکے ساتھ جہاد و قتال کا حکم دیا ہے۔ بخلاف دشمنِ شیطانی کے اسکا مقابلہ صرف استعاذہ اور اللہ کی پناہ لینے سے تلقین کیا گیا ہے۔ ابن کثیر نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں قرآن کریم کی تین آیتیں اس مضمون کی لکھی ہیں جن میں ان دونوں دشمنوں کا ذکر کرکے انسانی دشمن کا دفاع حُسنِ خلق ترکِ انتقام اور اس کیساتھ احسان کا سلوک کرنا بتلایا اور اسکے مقابلے میں شیطان کا دفاع استعاذہ تلقین فرمایا، ابن کثیر نے فرمایا کہ پورے قرآن میں یہ تین ہی آیتیں اس مضمون کی آئی ہیں۔ ایک آیت سورہ اعراف میں ہے کہ اول فرمایا خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ یہ تو انسانی دشمن کے مقابلے کی تدبیر ارشاد فرمائی جسکا حاصل عفو و درگزر اور اُس کو نیک کام کی تلقین اور اسکی برائی سے چشم پوشی بتلائی۔ اسی آیت میں آگے فرمایا وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ إِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ، یہ تلقین دشمنِ شیطانی کے مقابلے میں فرمائی جسکا حاصل اللہ سے پناہ مانگنا ہے۔ دوسری آیت سورہ قد افلح المومنون میں اوّل دشمن انسانی کے مقابلے کے علاج میں فرمایا، اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةَ یعنی برائی کو بھلائی کے ذریعہ دفع کرو پھر دشمن شیطانی کے مقابلے کے لئے فرمایا وَقُلْ رَّبِّ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ وَأَعُوْذُ بِكَ رَبِّ أَنْ يَّحْضُرُوْنِ، یعنی اے میرے رب میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں شیطانوں کی چھیڑ سے اور اس سے کہ وہ میرے پاس آئیں۔ اور تیسری آیت سورہ حم سجدہ کی ہے جسمیں اوّل دشمن انسانی کی مدافعت کے لئے ارشاد فرمایا اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ، یعنی تم برائی کو بھلائی کے ذریعہ دفع کرو اگر ایسا کرو گے تو مشاہدہ ہوگا کہ تمھارا دشمن تمھارا مخلص دوست بن جائیگا۔ اسی آیت میں دوسرا جزء دشمن شیطانی کے مقابلے میں یہ فرمایا وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ إِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ، یہ تقریباً وہی الفاظ ہیں جو سورہ اعراف میں شیطان کے مقابلے کے لئے ارشاد فرمائے ہیں اور حاصل اسکا یہ ہے کہ اسکا مقابلہ بجز استعاذہ کے کچھ نہیں (ابن کثیر)

ان تینوں آیتوں میں انسانی دشمن کا علاج عفو و درگزر اور حُسنِ سلوک سے بتلایا گیا ہے کیونکہ انسانی فطرت یہی ہے کہ حُسنِ خلق اور احسان سے مغلوب ہوجاتا ہے۔ اور جو شریر النفس فطری انسانی صلاحیت کھو بیٹھے ہوں انکا علاج دوسری آیات میں جہاد و قتال بتلایا گیا ہے کیونکہ وہ کھُلے دشمن ہیں، کھُلے ساز و سامان کیساتھ سامنے آتے ہیں انکی قوت کا مقابلہ قوت سے کیا جاسکتا ہے، بخلاف شیطان لعین کے کہ وہ اپنی فطرت میں شریر ہے احسان اور عفو و درگزر اس پر کوئی اچھا اثر نہیں ڈالتا ہے جس سے یہ اپنی شرارت سے باز آجائے اور نہ ظاہری مقابلہ اسکا جہاد و قتال سے ہوسکتا ہے یہ دونوں قسم کی نرم و گرم تدبیریں صرف انسانی دشمن کے مقابلے میں چلتی ہیں شیطان کے مقابلے میں

نہیں چلتی اس لئے اُسکا علاج صرف اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنا اور ذکر اللہ میں مشغول ہو جاتا ہے جو پورے قرآن میں تلقین کیا گیا ہے اور اسی پر قرآن کو ختم کیا گیا ہے ۔

انسانی اور شیطانی دشمن کے مقابلے میں انجام کے اعتبار سے بڑا فرق اوپر قرآنی تعلیمات میں انسانی دشمن کا دفاع اوّل احسان اور صبر جمیل سے بتلایا گیا ہے اگر اسمیں کامیابی نہ ہو تو جہاد و قتال سے اور دونوں صورتوں میں مقابلہ کرنے والا مؤمن کامیاب ہی کامیاب ہے بالکل ناکامی مؤمن کے لئے ممکن ہی نہیں کیونکہ دشمن سے مقابلہ میں یہ غالب آگیا تب تو اس کی کامیابی کھُلی ہوئی ہے اور اگر شکست کھا گیا یا مقتول بھی ہوگیا تو آخرت کا اجر و ثواب اور شہادت کے فضائل اُس کو اتنے بڑے ملیں گے جو دُنیا کی کامیابی سے کہیں زیادہ ہونگے ۔ غرض انسانی دشمن کے مقابلے میں ہار جانا بھی مومن کے لئے کوئی مضرّت نہیں ، بخلاف شیطان کے کہ اس کی خوشامد اور اسکو راضی کرنا بھی گناہ ہے اور اسکے مقابلے میں ہار جانا تو آخرت کو تباہ کرلینا ہے یہی وجہ ہے جس کے لئے دشمن شیطانی کی مدافعت کے واسطے حق تعالیٰ ہی کی پناہ لینا علاج ہے اسکی پناہ کے سامنے شیطان کی ہر تدبیر ضعیف و بے اثر ہے ۔

کیدِ شیطانی ضعیف ہے مذکورہ وجوہ سے کسی کو یہ خیال نہ ہونا چاہیئے کہ شیطان کی طاقت بڑی ہے اسکا مقابلہ مشکل ہے اسی خیال کو دفع کرنے کے لئے حق تعالےٰ نے فرمایا ہے اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ، اور سورۂ نحل میں جہاں قرآن پڑھنے کے وقت استعاذہ کا حکم دیا گیا ہے اُس کے ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ ایمان والوں اور اللہ پر بھروسہ رکھنے والوں پر یعنی اللہ کی پناہ لینے والوں پر شیطان کا کوئی تسلّط نہیں ہوتا ارشاد ہے فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ۝ یعنی جب تو قرآن پڑھنے لگے تو پناہ لے اللہ کی شیطان مردود سے ۔ اسکا زور نہیں چلتا اُن پر جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں اسکا زور تو انہی پر ہے جو اسکو رفیق سمجھتے ہیں اور جو اس کو شریک مانتے ہیں ۔

سورۂ نحل کی تفسیر معارف القرآن جلد پنجم صفحہ ۳۸۷ میں اس آیت کی پوری تشریح اور استعاذہ کے مسائل اور شرعی احکام کی تفصیل گزر چکی ہے اُس کو دیکھ لیا جاوے ۔

قرآن کریم کے فاتحہ اور خاتمہ میں مناسبت قرآن کریم کو حق تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ سے شروع فرمایا ہے جسکا خلاصہ اللہ تعالےٰ کی حمد و ثنا کے بعد اُس کی مدد حاصل کرنا اور اس سے صراطِ مستقیم کی توفیق مانگنا ہے ، اور اللہ تعالیٰ کی مدد اور صراطِ مستقیم یہی دو چیزیں ہیں جن میں انسان کی دُنیا و دین کے سب مقاصد کی کامیابی مضمر ہے ۔ لیکن ان دونوں چیزوں کے حصول میں اور حصول کے بعد اسکے استعمال میں ہر قدم پر شیطانِ لعین کے مکر و فریب اور وسوسوں کا جال بچھا رہتا ہے اس لئے اس جال کو پاش پاش کرنے کی مؤثر تدبیر استعاذہ پر قرآن کو ختم کیا گیا ۔ وبا ختتامہ تمّ بحمد اللّٰہ وفضلہ وکرمہ وعونہ تفسیر القرآن الکریم وللّٰہ الحمد اوّلہٗ وآخرہٗ وظاہرہٗ وباطنہٗ فما کنّا لنہتدی الیہ لولا ان ھدانا اللّٰہ وصلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیر

خلقہ وصفوۃ رسلہ وامام انبیائہ محمد خاتم النبیین وسید المرسلین علیہ وعلیھم صلوات اللہ وسلامہ وعلی آلہ واصحابہ اجمعین ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم وذلک فی الحادی والعشرین من شعبان ۱۳۹۲ھ ضحوۃ یوم السبت ومن غریب الاتفاق ان ھذا الیوم ھو الیوم الذی ولدت فیہ ففی ھذا الیوم تمت من عمر ھذا العبد الضعیف الجانی علی نفسہ سبعۃ وسبعون سنۃ واخذت فی الثامن والسبعین واللہ سبحانہ وتعالی ادعو وارجو ان یجعل خیر عمری آخرہ وخیر عملی خواتیمہ وخیر ایامی یوم القاہ فیہ ببرکۃ کتابہ المبین ونبیہ الامین وان یتقبل منی جھد المقل الذی اتعبت فیہ نفسی فی امراض وھموم وضعف القوی وما ھو الا بتوفیقہ وعونہ وان یغفر لی خطیئاتی وتقصیراتی فی حقوق کتابہ الکریم وان ینفع بہ المسلمین الی امد بعید وان یجعلہ ذخراً الیوم لا بیع فیہ ولا خلال ولا یجدی فیہ مال ولا آل فسبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم

وتم النظر الثانی علی المجلد الثامن من تفسیر **معارف القرآن** یوم الجمعۃ عاشر شوال ۱۳۹۲ھ بعد ما اخذت فیہ لثالث رمضان ۱۳۹۲ھ فکان فی نحو اربعین یوما وللہ الحمد